UNIVERSAL
LIBRARY

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۷۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

نمبر ۱۵۱	ماہ جنوری ۱۹۲۴ء	جلد ۲۶

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵۳

تنقیح

اردو کی بہترین کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اردوئے معلی ۶ر
- عود ہندی ۱۲ر
- دیوان غالب پاکٹ ایڈیشن ۸ر
- نکات غالب عہ

سر سید احمد خان مرحوم
- تفسیر القرآن ۲ جلد عہ
- خطبات احمدیہ ۶ر
- آثار الصنادید للعہ
- تہذیب مضامین الاخلاق للعہ
- مکمل مجموعہ لکچر للعہ
- اسباب بغاوت ہند ۸ر

نواب محسن الملک مرحوم
- تہذیب مضامین الاخلاق للعہ
- مجموعہ لکچر للعہ
- آیات بینات ۳ جلد عہ

مولوی حسان اللہ خان عباسی
- تاریخ الاسلام للعہ
- الاسلام ۶ر
- نشتر سخن زائدہ ۸ر

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات عہ
- دربار اکبری عہ
- سخندان فارس عہ
- نگارستان فارس عہ
- نیرنگ خیال ۲ حصہ عہ
- دیوان ذوق ۶ر

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی مرحوم
- فرہنگ آصفیہ ۴ جلد عہ
- راحت زمانی عہ
- تسخیر شوہر ۱۲ر
- مہا فروز بیگم ۱۲ر
- انشاء ہادی النساء عہ
- لغات النساء للعہ
- علم اللسان ۸ر

مرزا حیرت دہلوی
- سیرۃ الرسول ۶ جلد عہ
- کتاب شہادہ جلد عہ
- قصہ حاجی بابا اصفہانی ۶ر
- روز الیبرٹ کامل عہ
- الف لیلہ دنیازاد عہ
- الف لیلہ شہزاد عہ

مولانا حالی مرحوم
- حیات جاوید مجلد عہ
- یادگار غالب عہ
- حیات سعدی عہ
- دیوان حالی عہ
- مقدمہ شعر و شاعری عہ
- مسدس حالی ۸ر
- جواہرات حالی عہ
- بیوہ کی مناجات ۲ر

مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس ۶ر
- ایشیائی شاعری عہ
- نور جہاں بیگم ۸ر
- ٹیپو سلطان عہ
- حیدر علی سلطان عہ
- اردو کی ڈالی ۳ر
- اردو کا گلدستہ ۴ر

مولانا اسلم جیراجپوری
- حیات حافظ عہ
- حیات جامی ۸ر
- علوم عرب عہ
- خواتین عہ

مولانا نذیر احمد مرحوم
- ترجمۃ القرآن بالمقابل عہ
- حمائل شریف مترجم عہ
- مطالب القرآن عہ
- الحقوق و الفرائض عہ
- اجتہاد عہ
- مبادی الحکمۃ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- موعظہ حسنہ عہ
- ابن الوقت عہ
- ایامی عہ
- فسانہ مبتلا عہ
- مراۃ العروس ۱۰ر
- بنات النعش ۹ر
- توبۃ النصوح ۹ر
- منتخب الحکایات ۶ر
- چند پند ۶ر
- مجموعہ نظم بے نظیر عہ
- مکمل لکچر ۲ جلد عہ

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی
- سیرۃ الصدیق عہ
- علمائے سلف عہ
- اسلامی اخلاق ۸ر

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول مجلد عہ
- سیرۃ النبی جلد دوم مجلد عہ
- آغاز اسلام ۸ر
- الفاروق ۶ر
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم ۶ر
- سفرنامہ مصر و شام و روم ۶ر
- مضامین عالمگیر عہ
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی ۱۲ر
- موازنہ انیس و دبیر عہ
- شعر العجم جلد اول عہ
- شعر العجم جلد دوم ۶ر
- شعر العجم جلد سوم ۶ر
- شعر العجم جلد چہارم ۶ر
- شعر العجم جلد پنجم ۶ر
- مجموعہ کلام شبلی اردو ۱۲ر
- کلیات فارسی ۶ر
- اسلامی حکومت ۴ر
- اسلامی مدارس ۴ر
- مثنوی صبح امید ۴ر

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد عہ
- تاریخ عہد انگلشیہ عہ
- آئین قیصری عہ
- کرزن نامہ ۶ر
- صحیفہ فطرت ۶ر
- محاربات عظیم ۸ر
- تعلیم الانتظام ۸ر
- فلسفہ استدلال عہ
- الجبرا و مقابلہ عہ
- معاون الحساب ۱۲ر

مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی
- الانسان ۶ر
- الاستدلال عہ
- حکمت عملی عہ
- تسہیل البلاغت عہ
- تمنائے دید ۱۰ر

مولوی انشاء اللہ ایڈیٹر وطن
- تزک تیموری عہ
- حالات قسطنطنیہ عہ
- تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ ۶ر
- حالات عراق و عرب و عمان ۶ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ۰   بسم اللہ الرحمن الرحیم   اے ۷۸۴

الناظر

1952

ایڈیٹر: ظفر الملک علوی

جلد ۲۶	ماہ فروری سنہ ۱۹۲۴ء	نمبر ۱۵۲

فہرست مضامین

حدیث دیگران

قیمت فی پرچہ

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر: اسحاق علی علوی

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

قیمت سالانہ للعہ

قیمت فی پرچہ ۶ر

ایڈیٹر ـ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۵۳	ماہ مارچ ۱۹۲۴ء	جلد ۲۶

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۸ر

الناظر پریس لکھنؤ مین چھپا

قیمت فی پرچہ ۶ر

پرنٹر و پبلشر:۔ اسحاق علی علوی

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

قیمت سالانہ للعہ

فی پرچہ ۸ر

ایڈیٹر ظفر الملک علوی

نمبر ۱۵۴ | ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۴ع | جلد ۲۶

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۶

قیمت بیرون ہند ۸

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

پرنٹر و پبلشر اسحاق علی علوی

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہی۔ آج کل سیکڑون اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہون گے مگر ان مین عموماً کونین کی جزو رہتی ہی۔ اس لیے یہ دوائین بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہین۔ مگر جڑ سے آرام نہین کر سکتی ہین۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز مین ایک دم آرام کرنے کا خاص دعویٰ رکھتی ہی اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہی۔ اس مین تین خاص صفتین ہین (۱) ملیریا کے کیڑون کو مار دیتی ہی۔ اس لیے چار یا پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہی (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہی اور اُس کی خرابیون کو مٹاتی ہی (۳) یہ طحال کو گلاتی ہی۔ قیمت فی شیشی کلان عہ شیشی خورد ۱۰ر محصولڈاک شیشی کلان ۸ر اور خورد ۷ر

پُرانے ملیریا بخار کی گولیان

لرزہ بخار پرانا ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہی۔ جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہی اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہی۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہی۔ سانس پھولتی ہی۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہی۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہی۔ کبھی منھ اور ہاتھ پیرون مین ورم آجاتا ہی اور زندگی وبال ہو جاتی ہی۔ ایسی حالت مین یہ گولیان فائدہ کرتی ہین اور چار یا پانچ ہی خوراک مین بخار کا آنا بند ہو جاتا ہی۔ قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ ا ر محصولڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶ر

کونین کی گولیان

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیان بنتی ہین اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ مین ہوتی ہین کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیان پاس رکھیے اِس مین نہ وزن کی ضرورت ہی۔ نہ کھانے مین تلخی ہے قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ عہ محصولڈاک ۶ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۷۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۵۵	ماہ مئی سنہ ۱۹۲۴ء	جلد ۲۶

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہو۔ آجکل سیکڑون اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہون گے مگر ان مین عموماً کونین کی جز و رہتی ہو۔ اس لیے یہ دوائین بخار کو کچھ وقت تک توروک دیتی ہین۔ مگر جڑ سے آرام نہین کر سکتی ہین۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز مین ایک دم آرام کرنے کا خاص دعویٰ رکھتی ہو اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہو۔ اس مین تین خاص صفتین ہین (۱) ملیریا کے کیڑون کو مار دیتی ہو۔ اس لیے چار یا پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہوجاتا ہو (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہو اور اُس کی خرابیون کو مٹاتی ہو (۳) یہ طحال کو گلاتی ہو قیمت فی شیشی کلان عہ شیشی خورد ۱۰ محصولڈاک شیشی کلان ۸ اور خورد ۷

پُرانے ملیریا بخار کی گولیان

لرزہ بخار پرانا ہوجانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہو۔ جسم کا خون پانی سا ہوجاتا ہو اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہوجاتا ہو۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہو۔ سانس پھولتی ہو۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہو تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہو کبھی منھ اور ہاتھ پیرون مین ورم آجاتا ہو اور زندگی وبال ہوجاتی ہو۔ ایسی حالت مین یہ گولیان فائدہ کرتی ہین اور چار پانچ ہی خوراک مین بخار کا آنا بند ہوجاتا ہو۔ قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ ۱۰ محصولڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶

کونین کی گولیان

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیان بنتی ہین اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ مین ہوتی ہو۔ کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیان پاس رکھیے اس مین نہ وزن کی ضرورت ہو۔ نہ کھانے مین قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ عہ محصولڈاک ۶

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ:۔ ڈاکٹر گنگا رام جیتلی۔ چوک لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ا ے ۸ ۷ ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

ایڈیٹر۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۱۵۶ | ماہ جون سنہ ۱۹۲۴ء | جلد ۲۶

فہرست مضامین

الناظر پریس لکھنؤ میں چھپا

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہی۔ آج کل سیکڑون اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہون گے مگر ان مین عموماً کونین کی جزو رہتی ہی۔ اس لیے یہ دوائین بخار کو کچھ وقت تک روک دیتی ہین۔ مگر جڑ سے آرام نہین کر سکتی ہین۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز مین ایک دم آرام کرنے کا خاص دعویٰ رکھتی ہی اور عوام کے فائدہ کو مد نظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہی۔ اس مین تین خاص صفتین ہین (۱) ملیریا کے کیڑون کو مار دیتی ہی، اس لیے چار یا پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہوجاتا ہی (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہی اور اُس کی خرابیون کو مٹاتی ہی (۳) یہ طحال کو گلاتی ہی قیمت فی شیشی کلان عہ شیشی خورد ۱؍ محصولڈاک شیشی کلان ۸؍ اور خورد ۷؍

پُرانے ملیریا بخار کی گولیان

لرزہ بخار پرانا ہوجانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہی۔ جسم کا خون پانی سا ہوجاتا ہی اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہوجاتا ہی۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہی سانس پھولتی ہی۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہی۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہی کبھی منھ اور ہاتھ پیرون مین ورم آجاتا ہی اور زندگی وبال ہوجاتی ہی۔ ایسی حالت مین یہ گولیان فائدہ کرتی ہین اور چار یا پانچ ہی خوراک مین بخار کا آنا بند ہوجاتا ہی۔ قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ ۱؍ محصولڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶؍

کونین کی گولیان

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیان بنتی ہین اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ مین ہوتی ہین کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیان پاس رکھیے اس مین نہ وزن کی ضرورت ہی۔ نہ کھانے مین تلخی ہے قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ عہ محصولڈاک ۶؍

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ:۔ ڈاکٹر گنگا رام جیتلی۔ چوک لکھنؤ

الناظر

نمبر ۱۵۱ جلد ۲۶ ماہ جنوری ۱۹۲۴ء

فیہ مافیہ

(اثر اچلپی)

دسمبر کا آخری ہفتہ ہندوستان کی قومی واجتماعی زندگی مین ایک خاص چہل پہل کا زمانہ ہوتاہی۔ کانگرس سے لیکر میوزک کانفرنس تک، چھوٹی بڑی، بیسیون انجمنون اور مجلسون کے اجلاس، کانگرس کے ساتھ، نیز مختلف مقامات پر منعقد ہوتے ہین۔ ابکی مرتبہ کانگرس کی رہنمائی اُس بزرگ نے کی، جسکی شخصیت نہ صرف اسلامی ہند، بلکہ جملہ اقوام ہند کے لیے مایۂ ناز ہی۔ اور جس سے بہتر، ملک وقوم کے جذبات کا ترجمان گاندھی جی کے بعد اس وقت سارے ملک مین موجود نہین۔ بہ لحاظ انشاء انگریزی و لطافت زبان بہ لحاظ جامعیت مضامین و استقصاء مباحث، بہ لحاظ قوت استدلال و اصابت رائے، غرض ہر پہلو اور ہر حیثیت سے خطبۂ صدارت، عین اُن توقعات کے مطابق تھا، جو ایسے شخص سے قائم ہوسکتی تھین، جو ایک ہی وقت مین صاحب دل بھی ہو، صاحب دماغ بھی، اور صاحب زبان بھی۔

عموماً جو ایڈرس ایسے مواقع پر دیے جاتے ہین، وہ اپنی عمرین بہت قلیل لے کر آتے ہین۔ اُن کی زندگی صرف دوران اجلاس کے چند گھنٹون تک محدود رہتی ہی۔ اسکے بعد کسی کو ان کا خیال تک نہین آتا۔ مولانا

محمد علی کا خطبۂ صدارت اس کلیہ سے استثنا کی مثال ہے۔ وہ ایک مستقل تصنیف کی اہمیت و وقعت رکھتا ہے جسکا مطالعہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے آئندہ طلبہ کے لیے ناگزیر رہے گا۔ کانگرس کی تاریخ مین اس کی یہ خصوصیت بھی ممتاز رہیگی کہ یہ پہلا خطبۂ صدارت ہے جس کا آغاز خداوند رحمٰن و رحیم کے اسم پاک، دور لا غالب الا اللہ کے طغرائے توحید سے ہوا ہے۔ اس سے زائد اس کی بابت کچھ کہنا آفتاب کو مشعل کی مدد سے روشناس کرانا ہے ع

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

خلافت کانفرنس کے صدرنشین، مولانا شوکت علی تھے، جو تنہا مولانا محمد علی کے نہین، بلکہ ساری قوم کے "بھائی جان" ہین۔ ان کا مستانہ اور البیلا خطبۂ صدارت اپنے رنگ مین لاثانی اور اپنی طرز مین اچھوتا تھا۔ بلکہ اگر مولانا محمد علی یہ عرض کرنے کی اجازت دین، تو واقعہ یہ ہے کہ جہان تک آمد مضامین، بیساختہ پن، بے تکلفی، اور سادگی بیان کا تعلق ہے، خطبۂ خلافت کا پلہ خطبہ کانگرس سے جھکتا نہین بلکہ چڑھتا نظر آئے گا۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ محمد علی نے جو کچھ کہا، توقع کے موافق کہا، شوکت علی نے جو کچھ کہا، توقع سے بڑھ کر کہا۔ بہ حیثیت مجموعی دونون کے درمیان محاکمہ کرنا ایک صحیح العقیدہ سنی سے خلفاء اربعہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم) کے درمیان فرق مراتب کرانا ہے۔ روح یکانی دونون مین ایک ہے۔ ایک قالب مین اُس نے گرگ قالب ہے، دوسرے مین صبو۔ نظام الاولیا سلطان المشائخ کے آستانہ پر دو فدا ئیون نے اپنے تئین پیش کیا، ایک کا نام امیر خسرو کی حیثیت سے زندہ ہے، دوسرے نے نصیرالدین چراغ دہلوی کے لقب سے زندگی پائی ہے

مومنان معدود لیک ایمان یکے   جسم شان معدود لیکن جان یکے

ذوقِ ایمان سے بیگانہ، لذت درد سے ناآشنا، بہت سی انسانی ہستیان ایسی بھی ہین جو ان دونون لیڈرون کی تنقیص مین مصروف ہین۔ لیکن محمد و شوکت جس عالم مین ہین ظاہر ہے کہ وہان تک گردِ غبار اُڑ کر بھی نہین پہونچ سکتا ہے

آنکہ جان در روئے او خندد چو قند   از ترش روئی خلقش چہ گزند

با ازل خوش، با ابد خوش، شاد کام　فارغ از تشنیع و طعن خاص و عام
در شب مہتاب مہ را بر سماک　از سگان و عوعو ایشان چہ باک
سگ وظیفۂ خود بجا می آورد　مہ وظیفۂ خود بہ رُخ می گسترد

مجالس سالانہ کے سلسلہ مین ذہن قدرتاً اپنی بزم قدیم، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب منتقل ہوتا ہی جو ایک زمانہ مین زندہ تھی۔ مگر ادھر چند سال سے اس کی زندگی موت کے مرادف تھی پچھلے چند برسون کی طرح ابکی بھی اس نے اپنا اجلاس اپنے مولد و منشا علی گڈھ ہی مین منعقد کیا۔ اور اپنے اور قوم کے خصوصیات مزاجی کا صحیح اندازہ کر کے "نمائش" کا اعلان بہ بانگ دہل کیا۔ اور نمائش کا افتتاح اپنی وفاداری و انگریز دوستی کی روایات قدیم کے موافق، صوبہ کے لاٹ صاحب کے دست مبارک سے کرایا۔ لیکن افسوس ہی کہ یہ افسون بھی کچھ زیادہ کارگر نہ ثابت ہوا۔ اور نمائش کی کشش، لاٹ صاحب کے روے انور کے شوق زیارت، اور احباب و اعزہ مقیم دکن کی سرکاری امداد و اثر کے باوجود بھی باہر سے آنے والے تماشائیون کی تعداد، انگلیون پر گنے جانے کے قابل رہی۔

خیر، کانفرنس، اور کورزی نمائش کا حشر تو وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔ البتہ صدر یار جنگ بہادر (سکرٹری کانفرنس) یقیناً مستحق تہنیت ہین، کہ صدارت کے لیے اُنھون نے انتخاب ایسے شخص کا کیا، جس سے زیادہ اس منصب کی اہلیت اس وقت کسی مین نہ تھی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان آج سے نہین، ایک عمر سے کانفرنس کی روح روان ہین۔ تعلیمی تحریک سے اُنھین شوق نہین عشق ہی، فن تعلیم سے متعلق اُن کا مطالعہ نہایت وسیع ہی، یورپ کے طرز تعلیم کا وہ پورا تجربہ رکھتے ہین، اور اُن کے سیاسی خیالات اور مذہبی رائین جیسی کچھ بھی ہون، اس مین شبہ نہین کہ وہ دیانت و خلوص کے ساتھ اپنے خیالات مین انہماک رکھتے ہین۔ اور اس زمانہ مین یہی بہت غنیمت ہی۔ خدا پرستی الگ رہی، بت پرستی بھی اگر اغراض نفس کی آمیزش سے بغیر، خلوص و دیانت کے ساتھ ہو، تو یہی شے آگے چل کر نزول رحمت و مقبولیت کا باعث بن جاتی ہی۔

صاحبزادہ صاحب کا اُردو خطبۂ صدارت ۲۰ × ۲۶ تقطیع کے ۷۹ صفحہ پر آیا ہی، کاغذ طباعت،

کتابت، سب دیدہ زیب۔ شروع مین ایک مفصل فہرست مضامین بھی ہی جو ہر آئینہ ضروری مفید ہی، جامعیت بحث کا اندازہ ان چند عنوانات سے ہوگا:۔ تعلیم کی اہمیت، سرسید کی یاد (عام خدمات تعلیمی خدمات، سیاسی خدمات، مذہبی خدمات، سرسید کے نزدیک روح و جسم کا تعلق)، مسلمان کا مقصد حیات، ایمان و ارکان، عبدیت و نیابت الٓہی، تعلیمی پستی کا اثر اسلامی ممالک پر، مغربیت کی ترویج۔ باہر جانے والے ہندوستانی طلبہ، عام مسئلہ تعلیم (تعلیم انگلستان، تعلیم اطفال، تعلیم عہد صحوت، مصارف تعلیم)، ثانوی تعلیم، یونیورسٹی کی تعلیم، عہد رجولت کی تعلیم، قومی تعلیم اور ہندوستان، وقس علی ہذا۔ ان مین سے ہر عنوان پر وضاحت کے ساتھ، بلا جھجک اظہار خیال کیا ہی، اور زبان صاف، سلیس وقابل فہم رکھی ہی۔

سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہی کہ مغرب سے مرعوب ہونے کے باوجود بھی، صدر صاحب اسلام اور مشرقیت کو خیر باد نہین کہہ چکے ہین۔ شام کا وقت اگرچہ وہ بجائے مسجد کے پارک کی خوش خرامی مین صرف کرتے ہین، تاہم گھر واپس آکر مغرب کی قضا نماز پڑھ لیتے ہین۔ ایڈرس کا سب سے قابل قدر وہ حصہ ہی، جسکا عنوان اُنھون نے علی گڈھ کی تحریک کا تاریک پہلو رکھا ہی۔ اس ذیل مین فرماتے ہین:۔

"میرے نزدیک اگر واقعی نتائج کی روشنی مین دیکھا جائے تو عبدیت کا عنصر اس تعلیم گاہ کے پیداوارون (جن مین سب سے پہلے مین خود اپنے آپ کو شامل کرتا ہون) کی زندگی اور اخلاق مین کا حصہ نہین ہی۔ سرفانہ انگریزی طرز معاشرت اختیار کرکے ہم نے یوروپین تہذیب وتمدن کا وہ حصہ انتخاب کرلیا ہی، جو مطلق ضروری نہین ہی، بلکہ اس سے حظ نفس کی کمزوری کو مختلف شکلون اور صورتون مین تقویت حاصل ہوتی رہتی ہی"

"فضول خرچی کی عادت ہماری قومی بداخلاقی کی پہلے سے بھی ایک ناگوار خصوصیت تھی، لیکن اس کی موجودہ شکل سراسر تباہ کُن ہی۔ یہ صورت موجودہ ہمارے وقت، توجہ، وآمدنی، کا جزو کثیر ان مشاغل وعادات کی نذر ہوجاتا ہی جو محتاج ہین بڑی بڑی کوٹھیون کے، بیش قیمت فرنیچر کے، پُرتکلف کھانون کے، پارٹیون اور تفریحون اور زمانۂ حال کی دیگر فضول خرچیون کے"

"جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اندر روحانی خودداری و رواداری کا جذبہ پیدا ہو جائے، جو بیرونی وظاہری نمود ونمائش کا تقاضا نہین کرتا رہتا، بلکہ ایثار وخدمت خلق اللہ سے نشوونما وتسکین حاصل کرتا ہے"

کاش خود صاحبزادہ صاحب، اُن کے تمام اخوان طریقت، اور ساری امت اسلامیہ کو ان خیالات زرین کے مطابق عمل کی توفیق ہو۔

اسی طرح مسئلہ تعلیم نسوان کے ضمن مین بھی بعض فقرہ ان کی زبان سے ایسے نکل گئے ہین جو صرف ایک مسلم ہی کی زبان سے نکل سکتے تھے۔ فرماتے ہین:-

"مین ان لوگون سے کلیتہً متفق ہون، جن کو یہ گوارا نہین کہ ہماری لڑکیان وہ مصنوعی ومسرفانہ مذاق، عادات اور طریقہ اختیار کرین، جو مغربی طرز معاشرت کی نامعقول نقل کا نتیجہ ہین۔ جہانتک ممکن ہو ہماری تعلیم وتربیت نسوان کی غرض وغایت، ہماری بچیون کے قلب وسیرت مین ذیل کی آیۂ کریمہ کا مفہوم جاگزین کرنا، ہونا چاہیے"

یا ایہا النبی قل لازواجک ان	اے نبی اپنی بیویون سے کہدو، کہ اگر تم دنیا کی زندگی
کنتن تردن الحیٰوۃ الدنیا وزینتہا	اور آرایش چاہتی ہو تو آؤ مین تھین کچھ فائدہ پہونچا دون
فتعالین امتعکن واسرحکن سراحاً جمیلا	اور اچھی طرح رخصت کر دون۔ لیکن اگر تم خدا، اُس کے رسول،
وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار	اور عقبیٰ کی طلبگار رہو تو خدا نے تم مین سے نیکون کے لیے
الآخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجراً عظیما	اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

سنتے ہین "مسلم یونیورسٹی" کے بعض روشن خیال اساتذہ نے صدر صاحب سے پُرزور مطالبہ کیا ہے کہ یہ جزو ایڈریس سے محو کر دیا جائے!

ایڈریس کے صفحہ ۱۸ سے صفحہ ۲۰ تک اسلامی زندگی کے متعلق جو کچھ ارشاد ہوا ہے، اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے، اور اس حقیقت پر جسقدر بھی اظہار مسرت کیا جائے بجا ہے کہ کانفرنس کی کرسی صدارت سے پہلی بار اس قدر تفصیل کے ساتھ کتاب اللہ کے ساتھ اعتنا برتا گیا۔ لیکن یہ ساری مسرت خاک مین ملجاتی ہے جب آگے

چل کر یہ نظر آتا ہے، کہ ان مقدمات سے نتائج ایسے نکالے گئے ہیں جو اسلامی روح کے سراسر منافی ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے، کہ

"سب سے پہلے اسلام ہم سے اس ذات حقیقی کے لیے جو لایزال رحمن و رحیم ہے، ایک ایسے ایمان وعقیدت کا مطالعہ کرتا ہے جس کی رو سے ہم اپنی خودی وانانیت سے قطعاً دست بردار ہو کر اسے ذات حقیقی کے حوالہ کر دیں"

نیز یہ کہ

"محض ایمان و عقیدہ، خواہ کتنا ہی مخلصانہ و نیازکیشانہ ہو، کافی نہیں، بلکہ عمل صالح بھی ہمارے ایمان کا لازمی جزو ہے"

پھر یہ بھی بالکل مطابق حقیقت ہے کہ

"انسان کو تمام موجودات کے علم و معرفت کی جو اہلیت تفویض کی گئی ہے، وہی اس کے اشرف المخلوقات ہونے اور استحقاق نیابت الٰہی کی اساس حقیقی ہے"

لیکن ان مقدمات سے یہ نتیجہ نکالنا منطق کا غلط استعمال کرنا ہے کہ

"دخانی انجن، تار برقی، طیارے، اور دیگر میکانکی آلات کے اختراع سے یورپ نے اسلامی تعلیم کو عملی جامہ پہنا دیا ہے"

اسلام نے علم و تعلیم کا جو نصب العین پیش کیا ہے اگر اسے بعید سا بعید واسطہ بھی ان آلات مادی کے اختراع و ایجاد سے ہوتا، تو انبیا کرام، سرور کائنات صلعم، خاندان رسول صلعم، صحابہ عظام میں سے اگر سب نہیں تو کچھ تعداد تو یقیناً "موجدین" و "مخترعین" کی ہوتی۔ لیکن کیا صاحبزادہ صاحب اس غیر محدود جماعت میں سے دو چار افراد کا بھی نام بہ حیثیت "موجد" و "مخترع" کے لے سکیں گے؟

صاحبزادہ صاحب ہم سے سوال کرتے ہیں، کہ

"کیا ہم پچھلی تین چار صدیوں کے دوران میں کسی ایک مسلمان فلسفی، ریاضی دان، منجم، سائنٹسٹ، عالم طبیعات، مورخ، سیاح، مخترع، یا موجد کا نام پیش کر سکتے ہیں؟"

ہم اس کے جواب میں ان سے سوال کرتے ہیں کہ آپ پہلی صدی ہجری کے دوران میں کسی ایک

مسلمان فلسفی، ریاضی دان، منجم، سائنٹسٹ، عالم طبیعیات، مورخ، سیاح، مخترع، یا موجد کا نام پیش کر سکتے ہین؟ اگر آپ کوئی نام نہین پیش کر سکتے تو آج بھی ایسا کوئی شخص ہم مین موجود نہوتا تو ہرگز ہرگز ہمارے لیے باعث شرم و ننگ نہین ہو سکتا۔ آپ اپنی تائید مین سیر کے حوالے سے "مسلمانون کی علمی ترقیات" کا ایک باب فخر کے ساتھ باندھتے ہین، لیکن بے ادبی معاف، یہ مسلمانون کی ترقی ہرگز نہ تھی، زوال و انحطاط کا دور تھا۔ اسلام کا مطمح نظر یہ نہین، کہ بڑے بڑے پیمانہ پر میڈیکل کالج کھولے جائین۔ بڑی بڑی فیس وصول کرنے والے ڈاکٹر تیار کیے جائین، بڑے بڑے قیمتی آلات جراحی ڈھالے جائین۔ یہ آئیڈیل یورپ کو مبارک رہے۔ اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ زندگی ہی اسقدر سادہ و موافق فطرت رکھی جائے کہ سرے سے بیماری ہی نہ پیدا ہونے پائے۔

صحابہ کرامؓ کی مجموعی تعداد کسی طرح ایک لاکھ سے کم نہین کہی جا سکتی، ان مین سے کئی ہزار کے حالات زندگی آج بھی محفوظ ہین۔ ان مین سے کوئی ایک بھی مصنف تھا؟ فلسفی تھا؟ ماہر سائنس تھا؟ موجد تھا؟ مخترع تھا؟ یونان کے علوم اُس وقت بھی موجود تھے، روم کا تمدن اس وقت بھی زندہ تھا، ہندوستان کی تہذیب و شایستگی کا آفتاب اس وقت بھی درخشان تھا، مصر کی علمی ترقیون کے آثار اسوقت بھی قایم تھے، پھر کسی صحابی نے کبھی، رکن خاندان رسالت نے، کسی تابعی نے، ان علوم و فنون کی جانب توجہ کی؟ سرور کائناتؐ ہدایت کامل کے لیے مبعوث ہوے تھے، اسلامی زندگی کے جو اجزا ضروری تھے، اُن کے لیے ایسے خفیف جزئیات کی بابت اتنی تصریحات کے ساتھ احکام صادر فرما گئے ہین کہ احادیث کا مبتدی طالبعلم پہلی نظر مین گھبرا اٹھتا ہے، لیکن کسی ایک حدیث مین، قوی نہین ضعیف ہی سہی، صراحۃً نہین اشارۃً ہی سہی، یہ حکم بھی ملتا ہے کہ بڑے بڑے کتبخانے جمع کرو، دوربین تیار کرکے تارون کے فاصلہ کی پیمائش کرو، اور غیرون کے ہاتھ مین اپنی بیشمار دولت دے دے کر تعلیمی نمائش آراستہ کرو؟ ہمارے سامنے جس کا اسوۂ حسنہ ہے، وہ خود حضور سرور عالمؐ کی ذات پاک ہے، اور پھر اُس کے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ، حسنؓ و حسینؓ، ابوذرؓ و بلالؓ، خدیجہؓ و عائشہؓ زینبؓ و فاطمہؓ کی طاہر زندگیان ہین۔ اگر صاحبزادہ صاحب ان زندگیون مین "علم و تعلیم" کے موجودہ مفہوم کی خفیف سی بھی جھلک دکھا سکین، تو بسم اللہ، ورنہ ایک مومن کے سامنے ابن رشد و ابن سینا، فارابی و بیرونی، رازی و شیرازی کی مثالین پیش کرنا تو

قیامت تک لاحاصل رہے گا۔

صاحبزادہ صاحب نے کلام مجید کی تلاوت کی ہی، اور اس لیے ایک خاص حد تک اُن کے خیالات مین صفائی و روشنی آگئی ہی لیکن ابھی وہ روشنی بہت ہی دُھندلی ہی۔ اگر وہ زیادہ غور و تدبر کے ساتھ کلام پاک کا مطالعہ جاری رکھین تو انھین انشاءاللہ خود نظر آجائے گا، کہ قرآن جس علم کی مدح و ستایش کر رہا ہی، وہ اس علم سے بالکل مختلف بلکہ متناقض ہی، جس کی تعلیم موجودہ یونیورسٹیون مین دی جا رہی ہی۔ حضور سرورِ عالم کو حکم ملتا ہی،

قُل رَّبِّ زِدنِی عِلماً (ہم سے طلب کرو کہ اے پروردگار میرے علم کو ترقی دے۔

ظاہر ہی کہ حضور نے اس ارشاد کی انتہائی تعمیل کی، لیکن یہ کبھی نہ کیا، کہ کتاب کھول کر بیٹھے ہون، یا علوم و فنون کے مسائل زبانی ہی کسی سے اخذ کیے ہون۔ اسی سے ثابت ہی، کہ اسلام جس "علم" کی دعوت دے رہا ہی، وہ موجودہ علوم سے بالکل الگ ایک شے ہی۔ اس کی تصریح بھی قرآن ہی مین موجود ہی۔ وہ علم تزکیۂ روح کا ہی، جو لکھنے پڑھنے سے نہین کتب بینی سے نہین، سائنس کی لیبوریٹری مین تجربات کرنے سے نہین، بلکہ زہد و عبادت، تقویٰ و طہارت سے حاصل ہوتا ہی۔ ارشاد ہوتا ہی:-

وَاتَّقُوا اللهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللهُ، وَاللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (بقرہ۔ ع ۳۹) خدا سے ڈرتے رہو، خدا خود ہی تمھین تعلیم دے گا، اور خدا تو ہر شے کا عالم ہی۔

اس علم کے منتہی طلبہ، ریل اور تار، جہاز اور طیارہ ون مین اُلجھے ہوئے نہین رہتے، وہ ایمان مین پختہ ترین افراد ہوتے ہین، اور شب و روز توحید الٰہی مین مست رہتے ہین۔ والراسخون فی العلم یقولون آمنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب (آل عمران ع ۱) "اہل علم" کی شناخت یہ بتائی گئی ہی کہ وہ خدا سے ڈرتے رہتے ہین۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر ۴) "علم" کو "ایمان" کے مرادف استعمال کیا گیا ہی، وقال الذین اوتوا العلم والایمان (روم۔ ع ۶) ارباب علم سب سے زیادہ عبادت گذاری و رکوع و سجود مین مصروف رہتے ہین۔ ان الذین اوتوا العلم من قبلہ اذا یتلی علیھم یخرون للاذقان سجداً (بنی اسرائیل ع ۱۲) حضرت خلیل اللہ کی زبان پر "علم" بہ معنی نبوت و خداشناسی استعمال ہوا ہی۔ یا ابتِ انی قد جاءنی من العلم

عالم یا تک (مریم ع ۳) "علم" بہ اصطلاح قرآن) وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جو صرف انبیاء کرام کے حصہ مین آتی ہے، وکلا اتینا حکماً وعلماً (انبیاء ۔ ۶۶) ڈارون و اسپنسر، فلاطون و ارسطو، فارابی و ابن سینا اِس نعمت سے محروم ہین۔

اڈرس کا سب سے کمزور حصہ وہ ہے جس کا عنوان "سوراج کا نتیجہ" (۵۰-۵۵) رکھا گیا ہے، اور جو گویا انگریزی حکومت و انگریزی تمدن کی منقبت مین ایک نثر کا قصیدہ ہے۔ اس مین صاحبزادہ صاحب نے اپنے چھ عقیدون کو بطور مُسلّم و ناقابل انکار حقایق کے پیش کیا ہے، حالانکہ ان مین سے ہر دعویٰ اسقدر طفلانہ ہے کہ اسے صاحبزادہ صاحب کی جانب منسوب کرتے ہوے بھی تامل ہوتا ہے۔ دعا ہے کہ خدا انھین قرآن پر غور و تدبر کی مزید توفیق مرحمت کرے۔ جون جون بصیرت صاف ہوتی جاے گی، انشاءاللہ ایمان مین پختگی اور اعمال صالحہ مین ترقی ہوتی جائے گی۔ اُن کا دل و دماغ بہت سی خوبیون کا جامع ہے، قوم کی خوش قسمتی ہوگی، اگر وہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم ہوجائین۔

ضرورت ہے

دفتر الناظر مین جولائی لغایتہ دسمبر ۱۹۱۴ء کی جلد الناظر موجود نہین رہی لہٰذا ناظرین الناظر مین سے جن صاحب کے پاس یہ جلد یا اُسکے متفرق پرچے موجود ہون وہ ازراہ کرم مجھے مطلع فرمائین، مین خرید لون گا یا استعار لیکر اپنا کام نکال لون گا۔ اور اس عنایت کے لیے پیش از پیش شکریہ عرض کیے دیتا ہون۔

خاکسار　　ظفر الملک اڈیٹر الناظر لکھنؤ

استبدادادبی کا ایک جدید شکنجہ

یا

علی گڈھ یونیورسٹی کی قلمرو مین ایک پریس ایکٹ

دنیا ابتک جبر واستبداد کے بہ کثرت مناظر دیکھ چکی ہی۔ ایک شخص چمار کے گھر مین پیدا ہوتا ہی اور سنسکرت پڑھ کر ویدون کا علم حاصل کرنا چاہتا ہی لیکن نہین کر سکتا۔ یہ استبداد مذہبی کی مثال ہے۔ ایک شخص کسی صوبہ کے گورنر یا کسی والی ریاست کے طرز عمل پر آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کرتا ہی، اور جیلخانہ بھیج دیا جاتا ہی یا جلا وطن کر دیا جاتا ہی۔ یہ استبداد سیاسی ہوا۔ دنیا ابتک عموماً استبداد کی انھین صورتون سے واقف تھی لیکن حال مین ایک تیسری قسم کے استبداد کا شکنجہ تیار ہوا ہی جسکی تیاری کا فخر خداوندان مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو حاصل ہی اور جس سے دنیا ابتک ناواقف تھی۔

علی گڈھ میگزین، مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کا پرچہ ہی۔ روش وہی ہی جو طلبہ کے میگزین کی ہونی چاہیے۔ مضامین سنجیدہ بھی ہوتے ہین اور شوخ بھی، علمی بھی اور ظریفانہ بھی اور حق یہ ہی کہ ادھر چند سال سے خاص اہتمام وقابلیت کے ساتھ نکل رہا ہی۔ ایڈیٹر پہلے بھی ایک طالبعلم تھے اور اب بھی ایک طالبعلم ہین۔

سابق ایڈیٹر رشید احمد صاحب صدیقی کا نام اُردو کی موجودہ بزم ادب کے لیے بالکل نامانوس نہین۔ اُنھین کے زمانہ سے پرچہ کو خاص ترقی ہوئی۔ اُن کا مذاق سلیم مضامین کے انتخاب وترتیب مین برابر نمایان رہا۔ اُن کا شمار اُردو کے معدودے چند نوعمر انشا پردازون مین ہی۔ اُن کی تحریرین اس امر کا ایک واضح وبین ثبوت ہین، کہ شوخی وظرافت کا استعمال اگر مذاق سلیم کے ساتھ کیا جائے تو سنجیدگی چین بہ جبین ہونے کے بجائے اُس کی بلائین لینے کو تیار رہتی ہی۔ اُن کی اردو دانی کا سکہ خود حاکمان کالج ویونیورسٹی کے دلون پر بھی بیٹھا ہوا ہی، چنانچہ دو سال اُدھر جب یونیورسٹی مین اُردو لکچرر کی جگہ قایم ہوئی، تو اُس عہدہ پر اُنھین کا تقرر عمل مین آیا حالانکہ اُنکے مقابلہ مین کم از کم دو امیدوار اور ایسے تھے جو اُردو ادب وشاعری کے بہت قدیم خدمت گذار ہین۔ کالج مین لکچرر ہو جانے کے بعد پرچہ کی ادارت

ایک ہونہار طالبعلم کے ہاتھ مین آئی، اور رشید صاحب "ارباب حلّ وعقد" کے حکم سے اُس کے سنسر یا نگران مقرر کیے گئے۔[1]

اس تعارف سے دکھانا یہ مقصود تھا کہ خود کالج والون کے نقطۂ خیال سے بھی رشید صاحب کوئی بالکل غیر ذمہ دار شخص، یا شوریدہ سر دشمن کالج نہین ہین۔ انھین رشید صاحب کے قلم سے ایک مضمون "فلسفۂ ازدواج" کے عنوان سے میگزین کے نومبر نمبر مین طبع ہوا۔ پرچہ پریس سے نکلا ہی تھا، اور شاید آدھے درجن کا پیان شایع ہو چکی تھین، کہ کالج اسٹاف کے کسی انگریز رُکن کو اطلاع کی گئی، اور اُس نے اپنے اختیارات سے، غالباً اس دلیل کی بنا پر کہ ہر انگریز (خواہ اُس کی حیثیت تنخواہ دار ملازم ہی کی ہو) انگریزی حکومت کا سا جبروت واقتدار رکھتا ہی، پرچہ کی کل کاپیان ضبط کر لین! باغیانہ مطبوعات کا "بحق سرکار" ضبط ہوجانا اکثر سُنا تھا۔ کسی کتاب یا رسالہ کے "بحق نگراں کالج" ضبط ہوجانیکی میرے علم مین یہ بالکل پہلی مثال ہی!

مضمون مذکورہ الناظر کی اسی اشاعت مین کہین درج ملے گا، اُسے پڑھکر خود فیصلہ کیا جاسکتا ہی کہ اسمین کوئی بات قابل اعتراض تھی؟ اور وہ بھی اس حد تک، کہ پرچہ کا ضبط کرنا لازم آجائے؟ مضمون مین سرکار انگریزی سے بغاوت کی تعلیم تھی؟ مذہب اسلام کی توہین تھی؟ یونیورسٹی یا کالج کے مقاصد کی مخالفت تھی؟ کسی پر ذاتی حملہ تھا؟ کوئی بات فحش یا غیر مہذب درج تھی؟ کوئی عبارت مذاق سلیم کے معیار سے گری ہوئی تھی؟ زبان کے لحاظ سے کچھ نمایان نقائص تھے؟ کالج کے فرنگی و فرنگی نما اساتذہ کی اردو دانی و اردو فہمی کا اندازہ ہم سب کو ہی، لیکن ملک مین اُردو کے جو اچھے لکھنے والے اور سمجھنے والے ہین، ان مین سے کوئی بھی مضمون کو قابل اعتراض ٹھہرا سکتا ہی؟ مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق بی اے، خواجہ حسن نظامی، وغیرہ ادب اُردو کے مشاہیر ارکان مین سے (جنمین کم از کم دو صاحب یونیورسٹی کورٹ کے بھی ارکان ہین) کسی نے بھی مضمون سے متعلق مخالف رائے قائم کی؟ مضمون مین (جیسا کہ ناظرین الناظر خود دیکھین گے) اس سے زائد کچھ نہین کہ متفرنجین یا فرنگیات

[1] رشید صاحب پر فرمان روایان کالج کو جس حد تک اعتماد تھا، اُسکا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہی کہ سنہ ۱۹۱۹ء مین مجھے ایک اخبار کے لیے ایسے مراسلہ نگار کی ضرورت تھی، جو مستقلاً کالج کے صحیح حالات و اخبار سے اطلاع دیتا رہے۔ مین نے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سے استصواب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے انھین رشید صاحب کا نام مجھے لکھ بھیجا، اور اپنے والا نامہ مین اُن کی بہت کچھ توصیف کی۔

مسلمانون کے بعض شعایر پر کسی شوخ پیرایہ مین نکتہ چینی کی گئی ہو، اور اُن کے نامعقول حملون کے مقابلہ مین شعائرِ اسلام کی تائید ہو۔ خداوندانِ کالج کی معدلت گاہ مین اگر یہ جُرم ہو، تو اس کا صاف الفاظ مین اعلان کردینا چاہیے، اگرچہ عملاً اُس کا اعلان تو اس مضمون کی ضبطی سے ہوچکا ہو۔

سُنا ہو، کہ بعض انگریز و انگریز نما اساتذہ کالج نے یہ بھی مطالبہ پیش کیا، کہ مضمون نگار کو فوراً برطرف کردیا جائے۔ اور مضمون نگار نے اپنی ملازمت کے خوف سے دست بستہ معافی بھی مانگ لی۔ اگر یہ روایت صحیح ہو، تو نہایت درجہ افسوسناک ہو، لیکن اس کا اثر چونکہ محض مضمون نگار کی ذات تک محدود رہتا ہو، اس لیے پبلک کو معاملہ کے اس رُخ سے چندان تعلق نہین۔

لیکن پرچہ کا بعد طباعت ضبط ہوجانا ایک اصولی مسئلہ ہو، جسکا تعلق کالج کے طلبہ، کالج کے حکام، اور قوم، سب سے ہو۔ قوم کے سامنے یہ مسئلہ پوری طرح آنا چاہیے، اور اسکے فیصلہ کا حق قوم ہی کو ہونا چاہیے۔ ورنہ حکام کالج کی درازدستی و خودسری روز بروز بڑھتی جائیگی، اور اسکا اندیشہ تو ہی ہو، کہ کچھ روز مین پردہ کی حمایت، تعدد ازواج کی تائید، طلاق کی معقولیت، نماز و روزہ کے فضائل، زکوٰۃ و حج کے مصالح، ہجرت و جہاد کے مناقب، غرض کُل ایسے اسلامی مسائل پر قلم اُٹھانا، جو سفید فام "دانایانِ مغرب" اور اُن کے سیہ فام پرستارون کی محدود عقل و فہم سے بالاترین، اس اسلامی "دار العلوم" کے رسالہ کے اوراق مین ناممکن ہوجائیگا۔ کم از کم موجودہ وایس چانسلر، صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب کے عہد مین اس جدید و عجیب پریس ایکٹ کے نفاذ کی توقع نہ تھی۔ دنیا کے جبر و استبداد کی تاریخ مین یہ واقعہ ایک نمایان و ممتاز حیثیت رکھے گا، کہ عین اُس وقت جبکہ استبداد مجسم برٹش گورنمنٹ ہندوستان سے اپنے عجیب و غریب پریس ایکٹ کو منسوخ کرچکی تھی، اُس کے "یارانِ وفادار"، فرمان روایانِ علی گڈھ کالج نے ایک عجیب تر پریس ایکٹ کا اپنی محدود قلمرو مین نفاذ فرمایا!

سب سے زیادہ حیرت انگیز و قابل تاسف حالت کالج کے طلبہ کی ہو، جن کی غیرت، حمیت و خودداری ایک زمانہ مین ضرب المثل تھی۔ لیکن اب شاید یہ خصوصیات اُن سے یکسر رخصت ہوچکے ہین۔ اور غالباً اُن کی موجودہ بے حسی و جمود اور غلامانہ نفسیت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد ہی فرمان روایانِ کالج کو اس قدر درازدستی کی ہمت بھی ہوئی۔

عبد الماجد

ابر و شبنم

بحری سفر اختیار کرنے مین اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہو کہ اگر جہاز کے اُس حصہ کی طرف جاؤ جسطرف کی ہوا ہو تو مسافر کو یکایک پانی کی بوچھار محسوس ہوتی ہو۔ یہ عارضی بوچھار یا مصنوعی جھالا اُس بھاپ کا نتیجہ ہو جو جہاز کے دود کش سے جاری ہوتی ہو اور اپنی گرد و پیش کی مرطوب ہواؤن سے ٹکرا کر خود بھی سرد ہونے لگتی ہو یہانتک کہ جرم کرر قیق قطرات کی شکل اختیار کر لیتی ہو۔ بارش کا اصلی جھالا بھی اسی طرح کی روش رطوبت سے بنتا ہو۔ مگر فضاے فلکی کے بلند تر درجات مین پہونچکر یہ کیفیت ہوتی ہو۔

بھاپ کی ان سیاہ بدلیون کا دیکھنا بھی نتیجہ خیز ہو جو کھولتے ہوے پانی کی کیتلی کے دہانہ سے اُمڈتی ہوئی بلند ہوتی ہین بہت سی حالتون مین اُس نقطہ معین پر کوئی چیز نہین دکھائی دیتی جہان سے ابخرات نکل رہے ہین۔ ہان ہمیشہ اُس نقطہ سے کچھ اوپر پیازی رنگ کی گھٹائین پہلے پہل نظر آتی ہین۔ مگر چونکہ درمیانی خلا سطح آب اور نوخیز ابخرات کے بیچ مین حتماً واقع ہو، اسی لیے یہ بھی مان لینا پڑے گا کہ وہ خلا بھی آڑے ترچھے ابخرات کا مخزن ہو، یہ دوسری بات ہو کہ ہماری محدود نگاہ آنکھین ان کی جاسوسی نہ کر سکین۔ حقیقت یہی ہو کہ بھاپ یا آبی ابخرات جب تک خالص و غیر مرطوب ہین اُسوقت تک ویسے ہی لطیف، بے رنگ اور مستتر ہین جس طرح وہ ہوا جس مین ہم سانس لیتے یا وہ گیس زباد بسیط کا ایک لطیف جزو جسکو ہم روشن کرتے ہین۔ ہان جب ابخرات کے جزوی حصص اثر برودت قبول کر لیتے ہین۔ ان کی شفاف خالص طبیعت مین خارجی اثر کا دھبہ لگ جاتا ہو صرف اُسوقت ابر نما شکل مین ظاہر ہو جاتے ہین جنکو دنیا عام طور سے "بھاپ" کہتی ہو۔

آبی ابخرات یا بھاپ اپنی پوشیدہ حالت مین کمی و زیادتی کے ساتھ دائمی طور پر حلقۂ فضائی مین موجود رہتے ہین۔ یہ بھاپ ہر ایسے محفوظ قطعہ آب سے نکل کر ہوا مین شامل ہوتی رہتی ہو جو حرارت اجرام فلکی یا دھوپ سے متاثر ہو جاتا ہو۔ جب یہی ہوا خفیف مگر مسلسل تری و نمی کی وجہ سے کافی طور پر سرد ہو جاتی ہو تو اُس کا "بار ابخرات"، جو پہلے پوشیدہ تھا ابر بادل یا کُہرے یا پالے کی شکل مین نظر آنے لگتا ہو۔ اور بہت سے اصول نظام فلکی کے ماتحت ہوا کی سردی اس حد تک بڑھ جاتی ہو کہ اُسکی اندرونی

پوشیدہ نمی قطرات آبی کی شکل مین زمین پر گرنے لگتی ہی۔ غروب آفتاب کے بعد فضا مین پھیلے ہوے پوشیدہ اجزات مقامی تسلی بخش ٹھنڈک پاکر جمنے لگتے ہین اور فوراً رقیق مادہ کے بہترین و لطیف ترین قطرات کی شکل اختیار کر لیتے ہین۔ اور یہی وجہ ہی کہ بعض مقامات پر کبھی کبھی بغیر بادلون کے پانی برس جایا کرتا ہی۔

ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ سمجھتے تھے کہ ابر باران بے حد و شمار ہمین ہمین آبی قربوس یا باریک باریک پانی بھرے ہوے پھکنون (ایک قسم کی تھلی جسے مُنھ سے پھونک کر پانی بھر لیتے ہین) کا خزانہ ہی۔ جو اپنے لطیف جسم اور کھوکھلے ڈھانچون کی وجہ سے ہوا مین مُعلّق رہتے ہین۔ بہرحال یہ بات ضرور قرینہ کی ہی کہ پانی کے انتہائی باریک اجزا، اردگرد والی مرطوب ہوا مین ویسے ہی قائم رہتے ہین جسطرح گرد و غبار کے ذرات معلق رہتے ہین پروفیسر ٹنڈال نے انھین آبی اجزا کا نام "آب گرد" رکھ دیا ہی۔ قیاس کیا جاتا ہی کہ فضائے فلکی کے بلند تر درجات مین قطرہ دار ابر نہایت آزادی سے جمکر برف اولہ یا ژالہ بن جاتے ہین۔ اور اس قیاس کی زبردست پُشت پناہی بعض بادلون کے وہ عالمانہ مشاہدات ہین، جو بلوری عکس کش عینکون یا خاص قوت کی دوربینون کے ذریعہ سے فدائیان علم مناظر و مرایا نے اب تک کیے ہین۔

جب گرم ہوا کا کوئی دھارا، اپنے سر پر بھاپ کی نمی والی گٹھری لیے ہوے فضا ارضی مین بلند درجات تک اوپر کی طرف بہتا ہوا پہونچ جاتا ہی، اُس وقت صعود کرتے ہوے دھارے کا چوٹی والا حصہ اپنی نمی ظاہری شکل مین محفوظ کر دیتا ہی اور اس طرح بادل نظر آنے لگتے ہین۔ جو بذات خود دوسرے پوشیدہ حصص کے سہارے قائم رہتے ہین۔ اگر طبعی حرارت کم ہو جاے یا دھارے کا سلسلۂ رفتار کمزور و سُست ہو جائے تو اُس وقت یہی مُعلّق ابر مائل بہ پستی ہو جاتا ہی۔ اور گرم طبقات مین اُتر کر اپنی ازلی شکل، اجزات کی حیثیت مین پھر ایک بار تبدیل ہو جاتا ہی اور تمام پھیل جاتا ہی۔ اب پھر اگر ہوا کا ایک خفیف سی نمی لیے ہوے گرم دھارا، زیادہ سرد دھارے سے دست و گریبان ہو جاتا ہی تو اُس وقت اول الذکر کی حرارت طبعی کم ہو جاتی ہی اور اس کی نمی کچھ نہ کچھ ضرور محفوظ ہو کر ابر بنجاتی ہی۔

بادلون کے پیش کردہ مناظر ایسے مختلف و ہوشربا ہوتے ہین جو پہلی ہی نگاہ مین علم الاصول و حکمت و سائنس کی سلسلہ بندی و تقسیم و تجنیس کی گتھیان سُلجھا دیا کرتے ہین۔ ۱۸۰۳ء مین اصول شہاب ثاقب و حوادث سماوی و کائنات الجو کے ایک زبردست عالم نے بادلون کی شرح و بسط کے سلسلہ مین نئی لُغت،

جدید فرہنگ مصطلحات نو کو اِس عمدگی سے استعمال کیا کہ ساری مہذب دنیا لوہا مان گئی لفظین ایسی دلکش و عام فہم تعین کہ اتنا زمانہ گذرنیکے بعد بھی ویسی ہی استعمال کی جاتی ہین۔ اکثر فضاء فلکی کے بلند تر طبقات مین دلفریب بالدار مخملی چادر کی طرح محمودی شفاف ابر متوازی خطوط مین تیرتے ہوے دکھائی دیتے ہین۔ اِس قسم کا ہر بادل نہایت آزادی سے بالون یا پرون کی تصویر پیش کرتا ہی۔ اُس کی نسین تار اور ریشے جیسی گھونگھریالی۔ خم در خم۔ پیچ در پیچ ہوتی ہین کہ انھین زبردست فلسفیون نے۔ زلف پیچان۔ طرّہ پرپیچ اور گیسوے خمدار کا لقب دیدیا ہی۔ اِس قسم کے بادل ہمیشہ دور اور بلند ہوتے ہین۔ حتی کہ بعض وقت کُرّہ ارض سے دس میل کے فاصلہ پر نظر آتے ہین۔ ہماری زمین پر جس سمت کی ہوا ہو اُسکے خلاف تیرتے رہتے ہین۔ یہی وہ بادل ہین جن مین آسمانی برف کے باریک اجزا مخلوط رہتے ہین۔ جسوقت یا ابر ہمارے اور آفتاب و ماہتاب کے درمیانی حصہ مین آجاتے ہین اُن سے وہ رنگین حلقے بن جاتے ہین۔ جنھین فلسفہ فطرت والے کنڈل منڈل ہالے کہکے پکارتے ہین۔

زنبیل۔ سبد۔ انبار۔ پہلے بادلون سے بالکل مختلف ہوتے ہین۔ یہ ایسے کثیف ابر ہین جن مین محدب۔ ماہی پشت۔ مُرغ سینہ۔ مقعّر کھوکھلے گڑھے شامل رہتے ہین اور کرسی افق اُن کی شاندار آرام دہ، دلفریب تکیہ گاہ بن جایا کرتی ہی۔

گھنگھور گھٹا۔ ابر غلیظ۔ سیاہ بادل ایسے مرکب آبی ابر ہین جن پر زراعت و نباتات و فواکہات کی موت و حیات، بقا و فنا، کمی و زیادتی کا اندازہ و قیاس و فیصلہ کیا جاتا ہی۔

شامل۔ نگیرد۔ گسترده گہرے آسمانی رنگ کے ابر ہین جن سے عالم ترکیب، دنیا، موجودات، نظام فطرت کے لیے بیش بہا ان گنت فوائد مرتب ہوتے رہتے ہین۔

خمیدہ پشت۔ کمان ابرو۔ قوس کی ترکیب کے شاہانہ الفاظ مجموعہ ابر کے ہر ایسے ڈھیلے ڈھالے منسلک گلدستے کا نام۔ لقب۔ خطاب ہوسکتے ہین جو باد بسیط کے تھپیڑون سے ہر وقت حیران و پریشان و متحرک رہا کرتے ہین۔

جب آبی اجزات فضاء کے بلند تر طبقات مین برودت پذیر ہوتے ہین تو ابر بنتے ہین لیکن اگر سطح زمین کے قریب ہی جمنے لگتے ہین تو اُن سے کہرا یا پالا بن جاتا ہی۔ دریا کی حیثیت بھی کہرے کی مدد سے مقرر کی جاتی ہی۔ ضروری ہی کہ پانی اپنی اوپر والی ہوا سے زیادہ سرد ہوگا یا زیادہ گرم۔ پہلی صورت

مین ہوا کے اجزا ر پانی کے اجزا ر سے ٹکرا کر سرد ہو جاتے ہین اور اُن کی نمی اُن سے جُدا ہو جاتی ہی دوسری شکل مین گرم پانی سے اتنے زیادہ ابخرات برآمد ہوتے ہین جنھین ہوا اپنی موجودہ طبعی حرارت کی بنا ر پر سنبھال نہین سکتی۔

بادبسیط جم جانے کے بعد بادلون کے علاوہ اور دوسری شکلین بھی اختیار کر لیتی ہی اگر آپ سلیقہ کے ساتھ کسی فلزی ظرف مین ایک چشمے سے پانی بھر کر گرم کمرے مین لا کر رکھدیجیے تو چشم زدن مین ظرف کی خارجی سطح پر ایک ہلکا سا دُھندلکا چھا جائے گا۔ اور تھوڑی ہی دیر مین آبی قطرات ٹپکتے ہوے نظر آئین گے۔ یہ صاف ظاہر ہی کہ موجودہ نمی۔ اصل مادہ ظرف سے نہین پیدا ہوئی لہذا طے شدہ بات یہی ہوگی کہ اردگرد والی بادبسیط اُس کی بانی وسبانی ہی۔

کسی سرد سطح پر اس طرح کی محفوظ کی ہوئی نمی۔ جو کُہرا نہ بن سکے شبنم کہلاتی ہی۔ ہر صاف و شفاف شب مین غروب آفتاب کے بعد سبزہ اور اُسی کے دوسرے ہم جنس نباتات اُس گرمی کو اپنے اجسام سے خارج کرتے ہین جو روز روشن مین جذب کر چکے ہین اور جن کے سوکھنے مین مہرتابان ان کا معین رہ چکا ہی۔ اب بازگشت نمی یا تری کی رجعت کے بعد ان کی طبعی حرارت کم ہو جاتی ہی اور اُن کے مقابلہ والی فضائی ہوائین بھی برودت پذیر ہو جاتی ہین۔ یہان تک کہ ان سے اپنا بار سنبھالنے کی طاقت سلب ہو جاتی ہی اور آخرکار نقطۂ شبنم کامیاب ہو جاتا ہی اور اُس کے شفاف موتی جا در گل اور دامن سبزہ پر بکھر جاتے ہین۔

بہت سے درخشان سیارے دوسرے اجرام فلکی کے مقابلہ مین زیادہ نورافشان ہوتے ہین۔ لہذا شبنم کی کمی وزیادتی بھی، نور کی افراط و تفریط پر مبنی و منحصر ہی۔ وہی قوت جو اجرام فلکی کو اپنی ساری گرمی و روشنی ایکبار خارج کرنے سے روکے رہتی ہی محیط شبنم کو بھی سیلانی و طوفانی نہین ہونے دیتی۔

طالب اکبرآبادی

فلسفۂ ازدواج

ایک بزرگ ہین جنھین 'رزق ہر نہ موت' !

مجھ سے اکثر ملتے ہین ان کی وضع اور ہئیت دیکھکر دل مین مختلف قسم کے خیالات آنے لگتے ہین جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے خواہ کتنے ہی متضاد کیون نہ ہون، اکثر و بیشتر صحیح ہوتے ہین، کبھی تو یہ بالکل 'والدین' معلوم ہونے لگتے ہین، معاً خیال آتا ہر کہ یہ صرف معدہ کے مریض ہین اور دیگر امراض کے ایک متروک الایام طبیب - تھوڑی دیر مین یہ ظاہر ہونے لگتا ہر کہ یہ کالج مین کسی جگہ کے امیدوار ہین اور مدا یا ان یونیورسٹی کی آستانہ بوسی کے لیے حاضر ہوے ہین عقل و فکر پر ذرا اور زور دیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف ایک مایوس الحال فلسفی ہین !

ایک روز وہ مجھ سے ملنے آئے، کامل چار گھنٹہ کی نشست رہی جس مین وہ مشکل سے ایک دو چھوٹی نقرے بول سکے - ایک طرف وہ مستقل سوالیہ جملہ کی شکل مین بیٹھے رہے، دوسری جانب مین جملہ معترضہ بنا رہا - اور ہم مین سے ہر ایک کبھی ایسے مسئلہ کو چھیڑنا چاہتا تھا جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ فریق ثانی کو احمق سمجھتا ہر - اکثر جب نشست طویل ہوتی ہر اور کوئی مسئلہ گفتگو کے لیے نہین ملتا تو فریقین کچھ اس طور پر اپنے رُخ اور پہلو بدلتے ہین جس سے ایک تیسرا شخص جس کے موجودگی کا ان دونون کو علم نہ ہو، فوراً اس نتیجے پر پہونچ جاتا ہر کہ دونون احمق ہین بعض وقت فطرت خود اپنے انتہائی ستم ظریفانہ طریقے سے اس مغلطہ کا ازالہ کرتی ہر اور ایک ایسا حادثہ ہوتا ہر کہ دونون گھبرا کر قفل سکوت توڑنے پر تیار ہو جاتے ہین - اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے وقت مین جس طور پر سلسلہ گفتگو چھیڑا جاتا ہر وہ دونون کی حماقت پر آخری لفظ ہوتا ہر، اُس وقت ہم دونون ایک دوسرے کے متعلق جیسا کچھ خیال کر رہے تھے اور اُس کا اثر جیسا کچھ ہماری ظاہری شکل و صورت پر پڑ رہا تھا، اس کا اندازہ اس طور پر ہو سکتا ہر کہ اگر کوئی ستم ظریف ہم دونون کے سامنے ایک ایک آئینہ لا کر رکھ دیتا تو معلوم نہین ہم مین سے کون فریق ثانی پر دست درازی کرنے پر پیش قدمی کرتا !

ان بزرگ کا خیال ہر کہ دنیا اپنا مرکز چھوڑتی جاتی ہر اور میرا خیال ہر کہ یہ اس کی جگہ لینے کے

مخصوص ہو چکے ہین، اُن کا عقیدہ ہر کہ "اس پردۂ زنگاری مین" ممکن ہر کبھی "کوئی معشوق" کارفرما رہا ہو، لیکن اگر وہ کوئی حور نہ تھی تو اب اس کی حیثیت صرف ایک سرکہ جبین اور چیرہ دست بیوی کی رہ گئی ہر۔ مرورِ ایام سے کسی معشوق کا بیوی بن جانا اتنا ہی لازمی ہر جتنا کسی اچھے خاصے نوجوان کا "والدین" مین منتقل ہو جانا۔ پھر ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہین ایک چیرہ دست بیوی اپنے متعلقین (جس کے چیر مین، خواہ ان کی حیثیت الکس آفیشو کی کیون نہو۔ شوہر صاحب ہوتے ہین) کے ساتھ کیتنے دور رس اور زد دار تعلقات روا رکھتی ہر۔ ہر ایسی بیوی تعزیرات ہند پر آخری لفظ ہوتی ہر اور ہر ایسا شخص ضابطۂ دیوانی کا ماہر۔ ہمارے دوست اس طبقے سے تعلق رکھتے ہین جس کا باآدم ہی بیوی ہر۔ انکی فلسفیت کی تاریخ ان کی بیوی ہر، اور ان کی بیوی کی شان نزول وہی نت دیرینہ جو نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ منتقل ہوتی آ رہی ہر۔

میرے دوست کسی مبحث کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہین کہ اس وقت تک جتنی گفتگو ہو چکی ہو اُسے موضوع جدید سے کوئی تعلق نہو۔ لیکن وہ اسے پیش اس انداز سے کرین گے گویا یہ گفتگوئے ماقبل کا جزو لاینفک تھا۔ بیٹھے بیٹھے یک بیک فرمانے لگے "اور کہیئے فلسفۂ ازدواج کے متعلق آپ کا کیا خیال ہر؟"

مین ہمیشہ اُن سے عجیب و غریب کلمات سُننے کا عادی رہا ہون اس لیے مجھے ان کے اس سوال سے تعجب نہین ہوا، مین نے کہا مین سوائے فلسفۂ ازدواج کے ہر فلسفہ کو ایک عاقل اور بالغ مرد کے لیے شامت تصور کرتا ہون! لیکن اگر عقل کی صفت حذف کر دی جائے، اور بسا اوقات اس کے بغیر کوئی چارہ نظر نہین آتا، تو پھر فلسفہ کا تعلق صرف ازدواج سے رہ جاتا ہر اور یہ دونون چیزین مزدوج ہو کر کارآمد ہو جاتی ہین۔

ازدواج کے ساتھ فلسفہ کا ربط ایک طویل سلسلہ کسر و انکسار کی آخری کڑی ہر، سب سے پہلے شعریت ہوتی ہر، اس کے بعد ازدواج اور سب سے آخر مین فلسفۂ ازدواج۔ یہ تقسیم ایک تفصیلی بحث کی محتاج ہر۔ ازدواج سے پہلے ہر امیدوار یہ سمجھتا ہر کہ اُسے جو کچھ پیش آنے والا ہر وہ دنیا مین آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا۔ اس کی وجہ ممکن ہر یہ ہو کہ اس سے پہلے انسان دوران خون

سے عاری تھا، یا صنف نازک کا اس وقت تک انکشاف نہین ہوا تھا، یا پھر دہلی اور لکھنؤ کے اطبا بے کار محض تھے ۔ وہ بھول کر بھی نہین خیال کرتا کہ اگر آج وہ خدنگ نظر، سنان مژگان اور شمشیر ابرو کا قتیل ہی تو وہ دن بھی دور نہین ہی جب اس اسلحہ خانے مین باورچی خانے یا مودی خانے کا سارا اسباب و اثاثہ بھی شامل کر لیا جائے گا۔ اس سے پہلے تو ممکن تھا کہ دوسرے بھی ان کی رفاقت پر تیار ہو جاتے لیکن اب صرف انھین کے جان حزین کو اس سے عہدہ برآ ہونا تھا اور وہ سمجھنے لگتے ہین کہ شہادت، اور زدوکوب، مین کون سی سعادت قابل دست اندازی پولیس ہی۔ ازدواج کا احساس اکثر اسی منزل سے شروع ہو جاتا ہی جب انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہی کہ جس وادی مین اُس نے قدم رکھا ہی وہان وہ تنہا نہین ہی اور جس چیز کو وہ پہلے ایک درس لطیف سمجھتا تھا اس کی دفعات ضابطہ دیوانی اور فوجداری مین بھی موجود ہین۔

شعریت کا دور اکثر دو ہی طور پر ختم ہوتا ہی، بعض اوقات ابتدا ہی یہ محسوس کرنے لگتا ہی کہ اگر اس نے جذبات شعریت کو مزید تقویت پہونچانے کی کوشش کی تو فریق ثانی کے متعلقین اُن کے اعضا و جوارح کی اس طور پر آزمائش کرین گے کہ انھین طبی امداد اور سارٹیفکٹ دونون کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی اور ضرب شدید یا خفیف کی تشخیص مین آلہ دھاردار یا کند معرض بحث مین آئے گا یا پھر گھرون مین بڑی بوڑھیان یک لخت ایسے انہماک اور تگ و تاز کا ثبوت دینے لگین گی جو اُن کے سن و سکت سے بالکل متضاد ہوگا۔ آپ ہزار کہین گے آپ نے تکمیل تعلیم نہین کی ہی، برسر روزگار نہین ہین عُسرت ہی، لڑکی پڑھی لکھی نہین ہی، حسین نہین ہی، پیانو نہین بجا سکتی، کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ اس مین شک نہین یہ اعتراضات اکثر وہ لوگ بھی کرتے ہین جو خود جاہل اور کریہہ المنظر ہوتے ہین اور جنھون نے پیانو صرف گرامفون کے ریکارڈ مین کسی باجے والے کی دوکان پر سنا ہی یا یہ اعتراض کرتے ہین، یہ ایک جھگڑا ہی، میری آزادی مین فرق آئے گا وغیرہ وغیرہ، حالانکہ اکثر یہ وہ لوگ ہوتے ہین جو محلے اور گرد و نواح کی تمام ان لڑکیون سے جن کے والدین ضرورت سے زیادہ آزاد خیال ہوتے ہین عافیت سوز وابستگی رکھتے ہین۔ اُن کے نزدیک آزادی نام ہی اُس حیا سوز بیباکی کا جو اخلاقی قیود اور پابندیون کا شیرازہ بکھیر دے۔ لیکن اس قسم کی شکایت کرنے والے اکثر وہ بزرگ بھی ہوتے ہین جو اپنی ہرزہ سرائیون سے آسمان و زمین سر پر اُٹھا لین گے، لیکن ایک بھی معقول وجہ پیش نہ کرین گے

کہ ایام سفر مین یا پہاڑ دن پر انھین چالیس دن تک کیا کرنا چاہیے اور نہانے اور کھانے مین ایسی کیا کیا باتین ملحوظ رکھنی چاہئین۔

بڑے بوڑھون کے نزدیک لڑکون یا لڑکیون کے شادی کرنے کا بسا اوقات وہ زمانہ ہوتا ہے جب وہ سمجھتے ہین کہ ان کی منزل حیات کے آخری حدود ختم ہو رہے ہین۔ مین اکثر سنتا ہون کہ کہ فلان صاحب کے پاس تار آیا ہے اور شادی کے لیے اُن کی طلبی ہوئی ہے۔ قدیم مسلک کا ہندوستانی ہونے کی وجہ سے مین تار پاتے ہی سراسیمہ ہوجاتا ہون اور مجھے سورۂ یٰسین کا خیال آنے لگتا ہے۔ مین تو خط پاکر بھی پریشان ہوجاتا ہون، اور بیک نظر تمام مضمون مین صرف یہ دیکھ لینا چاہتا ہون کہ کہین کوئی عربی عبارت یا مشیت الٰہی وغیرہ تو نہین لکھا ہے۔ شادی مین کسی کے تار پر طلب کیے جانے کے یہ معنی ہین کہ یا تو کوئی بزرگ دنیا سے ہجرت کرنے والے ہین اور اپنے نورچشم راحت جان کا سہرا دیکھنا چاہتے ہین۔ حالانکہ نوشتہ سے بڑھکر مسخر انگیز ہیئت کسی کی نہین ہوتی، یا دونون خاندان مین اسباب و جائداد کا قضیہ پیش ہے یا پھر دولھا دُولھن مین سے کوئی ایک اپنے حدود سے تجاوز کر رہا ہے۔

ازدواج کا دور اکثر عربی تقویم کے ماتحت، شام سے شروع ہوکر دوسرے دن کے اختتام تک ہوتا ہے۔ حجاب نوعروسان، ممکن ہے شب دیگر تک قائم رہے۔ لیکن شاعر صاحب کے سارے ردیف اور قافیے اس سے پہلے ہی ختم ہوجاتے ہین۔ آنکھین تو عرصہ تک بند رہتی ہین لیکن بصیرت مین معتد بہ اضافہ ہوجاتا ہے، ممکن ہے غالب نے اسی صحبت شب کو مدنظر رکھکر صبح کا نقشہ کھینچا ہو۔

اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے!

انگلستان مین ایک نوکتخدا عورت چھ مہینے تک "عروس" کہلاتی ہے، ممکن ہے اس عقیدے کی بنا مخصوص واقعات یا مشاہدات پر ہو، ہندوستان مین تو جب تک گھر کی بڑی بوڑھیان زندہ رہتی ہین یہ دلھن ہی کہلاتی ہین۔ انگلستان ہر بات کو سائنس کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔ علم خواص الاعضا یا علم المعاشرت کے بنا پر ممکن ہے وہان کے لیے یہی حکم لازم آتا ہو۔ ہندوستان اپنی جہالت کے صدقے کچھ اور ہی رائے رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ازدواج کا مسئلہ ان دونون ممالک مین مختلف نوعیت رکھتا ہے قدامت پسند ہندوستان، انگلستان کے روشن خیالون سے لرزتا ہے لیکن مجھے یقین ہے یہ فضا دیر تک قائم نہ رہے گا۔ ان لوگون سے تو کوئی توقع نہین ہے جو ولایت کا پانی پی کر آئے ہین لیکن اپنی ہندوستانی

گھٹی کو نہین بھُولے ہین، البتہ اُن حضرات سے کچھ اور امید ہے جو انگلستان سے صرف ایک مغلوک الحال نو عیسائی کی شکل لائے ہین۔ اس مین شک نہین وہ اسی کی روٹی بھی کھاتے ہین اور ان کی نا اہلیت کی یہ پردہ پوش بھی ہے۔ اُن کا مسئلۂ ازدواج اشتمال بازی ہے جس پر ان کی تمام شخصیت کا مدار ہے۔ ان کا اصول یہ ہے کہ بیوی ایک سرمایۂ مشترک ہے اور اُس کو کسی خاص مخصوص فرد کی تنہا ملکیت قرار دیدینا شرافت کے خلاف نہین تو مردانگی کے خلاف ضرور ہے۔ لیکن وہ اس کو کیا کرین کہ خمیر مادر مشرقی ہی تھا اور انھین مشرقی اور مغربی عقائد کے درمیانی راستہ پر گامزن ہونے کی ضرورت پیش آئی۔ پردہ کو وہ ازمنۂ جہالت کی ایک وحشیانہ تقلید سمجھتے ہین۔ ان کے نزدیک بیوی کا انتہائی تزئین اور آرائش کے ساتھ مجمع عام مین کسی غیر شخص کے پہلو مین بیٹھنا اور کسی چند آشیان گم کردہ کی مانند گوشہ گیر رہنا انتہائی روشن خیالی اور شرافت نسبی ہے۔

میری ہرزہ سرائیون کا سیماب ابھی صعود ہی کی طرف مائل تھا اور قریب تھا کہ مین ساری داستان اپنے مخاطب کو بزور مُشت سمجھانے پر اُتر آتا میرے ایک اور دوست آ گئے جو ابھی ابھی انگلستان سے واپس آئے تھے، فلسفی بزرگ نے معاً تخفیف تصدیعہ کیا۔ مین نے اضطراراً اپنے دوست کو خوش آمدید کہا۔ دوران تنفس مین کوئی کمی نہ تھی لیکن فلسفی دوست کے چلے جانے سے مجھ پر خود اعتباری کا یہ عالم تھا گویا مین نے اپنے دلائل و براہین سے نہین بلکہ زور بازو سے حریف پر غلبہ حاصل کیا تھا اور داد کا طلبگار رہتا۔ میرے نووارد دوست نے رسمی مزاج پُرسی کے بعد میرے خشونت اور جلال، جس کا اب بھی کافی اثر تھا، کا سبب پوچھا۔ مین نے فاتحانہ انکسار کے ساتھ پہلے تو اسے ایک نہایت معمولی واقعہ قرار دے کر ٹالنا چاہا لیکن اُن کے اسرار پر اور اپنے پندار عالمانہ کو مزید تقویت پہونچانے کے لیے، مختصر روئداد اس تمام داستان کی سُنادی میرے دوست کا مذہب "انگریزیت" ہے، وہ ہر چیز کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہین۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام مین اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ تہذیب اسلام کے بہت سے عقائد اور خصائل کو قابل ترمیم سمجھتے ہین۔ از انجملہ پردہ، تعلیم نسوان، روزہ اور سود ہے۔ مجھ سے اُن سے اکثر مباحثے ہوے ہین اور ہم دونون نے انتہائی رواداری کے ساتھ ایک دوسرے کے خیالات کو گوش گذار کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم دونون روز بروز اپنے عقائد کے اعتبار سے

ایک دوسرے سے دُور ہوتے جاتے ہین۔

چند لمحون تک اِدھر اُدھر کی گفت وشنید رہی۔ اس کے بعد وہی دیرینہ مسائل متنازعہ فیہ معرض بحث مین لائے گئے۔

دوست۔ رشید صاحب، آپ تو شعریت کے اتنے دلدادہ ہین، غور تو فرمایئے صنفِ نازک کے عنصر کو حذف کر دینے سے سوسائٹی کس قدر بے کیف ہو جاتی ہے۔ انگلستان کا سارا نظام سوسائٹی پر ہے یہان کی خواتین کی موجودگی ناگزیر ہے۔ ہندوستانی سوسائٹی چونکہ اس عنصر لطیف سے بالکل معرا ہوتی ہے اس لیے آپ خیال کرتے ہون گے کہ انگلستان مین عورتون کے بے محابا ملنے جلنے سے اخلاق پامال ہوتا ہوگا۔ حالانکہ وہان یہ ایک ایسا عام واقعہ ہے کہ کوئی شخص اُس کے تاریک پہلو کی طرف غور تک نہین کرتا۔ عورتون اور مردون کے بے تکلف ملنے سے ہم کو اپنی شجاعت اور صلابت کو برسرِکار لانے کا موقع ملتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مین۔ مین شعریت کا ضرور دلدادہ ہون اور یہی وجہ ہے کہ مین عورتون کو مردون کی سوسائٹی مین دیکھنا پسند نہین کرتا۔ عورت ایک پیکرِ لطیف ہے وہ ہمارے اُن لطیف اور نازک تخیلات کا پیکرِ محسوس ہے جسے ہم عام نظرون سے محفوظ رکھنا چاہتے ہین۔ عورت کا حجاب اس کا حسن ہے اور اس کا حُسن ایک حباب جو چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ عورت مرد کا راز ہے جسے پردۂ خفا ہی مین رکھنا بہتر ہے۔ عورت اور مرد کے عام تعلقات بالکل جُداگانہ حیثیت رکھتے ہین۔ میرا روئے سخن صرف شریف عورتون کی طرف ہے۔ پیشہ ور عورتین معرض بحث مین نہین ہین۔ ان کا تذکرہ بالکل بے سود ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ہر عورت صرف مان بننے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اگر مان ایک باعظمت اور برگزیدہ ہستی تسلیم کی جاسکتی ہے تو آپ اس سے بھی انکار نہین کر سکتے کہ اس کا ایک پاکباز بیوی ہونا بھی لازمی ہے۔ پاکبازی کے معنی یہ نہین ہین کہ عملی نقطۂ نظر سے باعصمت رہی ہو۔ بلکہ وہ اخلاقاً پاک دامن رہی ہو۔ آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ بدچلنی کے اعتبار سے ہندوستان اور انگلستان دونون ایک سطح پر ہین لیکن یہ فرض بھی کر لیا جائے تو اس سے آپ کو انکار نہین ہو سکتا کہ انگلستان مین اُس کا امکان اور زیادہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ انگلستان اور ہندوستان مین بدچلنیون کے مختلف مدارج ہین۔ انگلستان مین ملنے جلنے کی ایسی آزادی ہے

کہ وہان بد چلنی کا مفہوم بالکل محدود ہوگیا ہو، بہت سی ایسی باتین جو ہندوستان مین صریح بد چلنی سمجھی جائے گی وہان ایک رسمی اور معمولی واقعہ سمجھا جائے گا ضرورت اس بات کی ہو بد چلنی کی تعریف کردی جائے۔ آپ کے نزدیک توصرف تعزیرات ہند کی بعض دفعات اس پر روشنی ڈال سکتی ہین۔ . . . . . .

دوست (بات کاٹ کر) اور کسی قدر خفیف اور آزردہ ہوکر) آپ مذاق پر اُتر آئے مین اس معاملہ مین بالکل 'سیریس' ہون۔

مین۔ مین آپ سے زیادہ سیریس ہون صرف انگریزی نہین بولتا!

اس فقرے پر میرے دوست نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا، جیب سے، سگرٹ کی ڈبیا نکالی سگرٹ جلاکر نیم سوختہ دیاسلائی کو اُگالدان مین ڈالدیا اور ایک لمبا کش لے کر کہا:

"آپ تو رشید صاحب زیادتی کرتے ہین، پردہ کا جھگڑا کسی طرح ختم کیجیے پھر دیکھیے آپ کہان پہونچ جاتے ہین، آپ ذراسی بات پر فلسفیت پر اُتر آتے ہین!"

مین (آپے سے باہر ہوکر) لعنت ہو فلسفیت پر اور تُف ہو مجھ پر، بھلا ایسی لطیف بحث پر مین ایسی بدمذاقی کا مجرم ہوسکتا ہون اگر میرے کسی فقرے سے فلسفیت کی بو آتی ہو تو مین اُسے واپس لیتا ہون۔ پردے کے متعلق آپ کی رائے نہایت دلچسپ ہو مین تو اس کے لیے تیار ہون لیکن خرابی یہ ہو کہ آپ حضرات نے، جو انگلستان سے واپس آئے ہین بے پردگی کا معیار کچھ عجیب سا قائم رکھا ہو، آپ کی بیویان یا تو مجمع عام مین باصرہ نوازی کرتی ہین یا گھر و ن پر صرف ان لوگون کو شرف صحبت کا موقع دیتی ہین جو انگریز ہین یا جنھون نے انگریزون کے ملک کا پانی پیا ہو، یا پھر خانساماں بھنگی، چاردب کش، دھوبی اور درزی کو یہ سعادت بخشتی ہین۔ ہم ٹھیرے ادھوڑی استر جو نیراست آپ ہی بتائیے اگر ہم مسز. . . . . کے لیے بالکل فدوی ہی بنے رہے اور آپ نے منا کی مان کو موٹر پر بٹھا لیا، تو پھر کیا ہوگا۔ مُنا کے باپ توصرف موذن بن کر رہ جائین گے! مجھے تو اپنے دوست آغا حیدر حسن صاحب علیگ کا (جنھین بارگاہ رزین سے تعجب ہو اب تک کوئی خطاب نہین ملا) مقولہ بہت پسند آیا ہو کہ سب لوگ اپنی اپنی بیویان باہر نکالین صرف ہمین البتہ معاف کردین!

دوست۔ آپ تو مذاق پر اُتر آئے، اچھا، خوب یاد آیا۔ اِسی سلسلہ بین مین آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہون کہ تعدد ازدواج کے متعلق آپ کا کیا خیال ہی۔ کیا چار چار بیویان رکھنا انتہائی جہالت (جوش مین آکر) بربریت نہین ہی۔ انگلستان مین لوگ اِس کا خوب خوب مضحکہ اُڑاتے ہین اور اسلام کو جاہلون اور وحشیون کا مذہب قرار دیتے ہین آپ ہی بتائیے کیا یہ محبت کی توہین نہین ہی؟ محبت تو صرف ایک سے ہوسکتی ہی اس کے بعد پھر کچھ ہی کیون نہ ہو پائے ثبات کو لغزش نہ ہونی چاہیے۔ میرے ذہن مین تو چار بیویون کے خیال سے غیظ و غضب کے شرارے اُڑنے لگتے ہین کیا یہ عورتون کے ساتھ انتہائی ظلم نہین ہی اور کیا یہ خود ہماری نفس پرستی اور خود غرضی کا بیّن ثبوت نہین، انگلستان کی خواتین تو اسے دورِ وحشت کا ایک افسانہ تصور کرتی ہین اور اس کا تذکرہ سُن کر چیخ اُٹھتی ہین!

مین۔ خواتین انگلستان کا چیخ مارنا تو کوئی دلیل نہین ہی۔ ان کا چیخ مارنا بھی بے محل ہوتا ہی، جہان اس کی ضرورت ہوتی ہی وہان تو وہ محض ایک تبسم زیرلبی یا مجبوبانہ استغنا کے ساتھ داد شہادت دے جاتی ہین اور جہان اس کی مطلق حاجت نہین ہوتی وہان آسمان و زمین ایک کردیتی ہین۔ حقیقت یہ ہی کہ آپ بیوی، اور معشوق مین کوئی تفریق ملحوظ نہین رکھتے، آپ ہی بتائیے کیا انگلستان مین لوگ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے ہین وہان کی تو عورتین بھی مسئلہ مین کافی آزاد منش ہوتی ہین اسلام کا بس اتنا قصور ہی کہ اُس نے فطرت انسانی کو ملحوظ رکھ کر ان امور کو جائز قرار دیدیا ہی جن کا آپ زبان سے اقرار نہین کرتے لیکن اپنے افعال سے اس کا ثبوت دیتے ہین۔ آپ ہی بتائیے جنگ کی وجہ سے مردون کی تعداد مین جیسی دہشت ناک کمی ہوگئی ہی اور اسی نسبت سے عورتون کی تعداد مین جیسا کچھ اضافہ ہوگیا ہی اُس کا کیا انتظام ہوگا؟ آپ نے اس کا انتظام عیاش اور بدچلن طبقے کے ہاتھ مین دیدیا ہی جس کے نتائج ظاہر ہین۔ اسلام اس کو ایک فریضۂ مقدس قرار دیکر ذمہ داریون مین اضافہ کردیتا ہی۔ آپ خود جانتے ہین اسلام نے اِس کے متعلق کتنے سخت قوانین وضع کیے ہین اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہین کرسکتا لیکن اُن پر عمل کرتا ہی وہ قابل مواخذہ ہی۔

دوست (بات کاٹکر) پھر صرف چار ہی بیویون کی قید کیون لگائی گئی ہی، اس سے زیادہ کیون نہ کی جائین؟ دوسرا اعتراض یہ وارد ہوتا ہی کہ اگر مرد چار بیویان عقد مین لاسکتا تو عورتین اس آزادی سے

کیون نہ فائدہ اُٹھائین ؟

مین ۔ انگلستان کی عورتین تو ماشاء اللہ اس آزادی سے متمتع ہو لیتی ہین۔ آج کل تو لوگ بیوی کے نام سے گھبراتے ہین، ایک یا دو کا سوال تو بعد کو آتا ہے وہ تو کہیے اگلے وقت کے لوگ تھے جن کے دم سے یہ فن شریف روشن تھا۔

دوست۔ مین سمجھتا تھا کہ آپ اس مسئلہ کو اسی طور پر ٹالدین گے اصل یہ ہے کہ واضعانِ قانون ہمیشہ مرد رہے ہین اس لیے ہر قانون مین اُنھون نے اپنا ہی نفع مضمر رکھا ہے۔

مین ۔ نہین یہ تو نہین ہے، اسلام کے قوانین، قوانین الٰہی ہین اور یہی وجہ ہے کہ اس مین حقوق کی کامل نگہداشت رکھی گئی ہے، مین اس کا تو دعویٰ نہین کر سکتا کہ مین جو کچھ کہتا ہون وہ عین منشاء الٰہی کے مطابق ہے۔ اس کے سمجھنے والے اہل دل ہین، مین ٹھیرا کالج کا درنا کیولر اسٹاف، مین تو آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہون کہ اگر آپ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (خدانخواستہ) کامیاب نہ ہو تو آپ کس طرح دوسرے طریقہ پر اُس سے زیادہ روپیہ کما سکتے ہین یا اگر آپ (ایک مرتبہ اور خدانخواستہ) بالکل نااہل ہین تو اپنی ناقابلیت کو کس طرح بزور بازو محض ایک حیثیت ثانوی دے سکتے ہین۔ آپ کو کس کس کی آستانہ بوسی کرنی چاہیے اور مقصد حاصل ہو جانے پر کس طرح اُنھین آستانون کو ٹھکرانا چاہیے۔

دوست (ایک فتحمندانہ تبسم کے ساتھ) کیا آپ کے پاس بس یہی ایک آلۂ مدافعت رہ گیا ہے؟

مین ۔ تو کیا واقعی آپ کو مباحثہ پر اصرار ہے۔

دوست ۔ بشرطیکہ آپ اپنا مذاق ترک کر دین۔

مین ۔ اچھا آپ عریانی خیالات سے برہم تو نہ ہون گے ؟

دوست ۔ بظاہر تو اس کی کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی۔

مین ۔ عورت اور مرد کے ملنے مین فطرت نے کیا راز مضمر رکھا ہے ؟

دوست ۔ توالد و تناسل۔

مین ۔ ایک بچہ کی پیدائش کی مدت طبعی کیا ہے ؟

دوست ۔ نو مہینے۔

مین - فرض کیجے ایک عورت کے سو شوہر ہین، نو مہینے مین بالعموم کتنے بچون کی امید کی جا سکتی ہی؟

دوست ایک

مین - فرض کیجیے ایک مرد کے سو بیویان ہین، نو مہینے مین کتنے بچون کی توقع کی جا سکتی ہی؟

دوست (گھبرا کر لیکن معاً ایک فراشتی، قہقہہ لگا کر) پھر وہی مذاق!

مین (آنکھین نکال کر) مذاق کے کیا معنی؟

دوست - تو پھر چار کے بجائے سو بیویان کیون نہ ہون،

مین - اس کا جواب تو مین پھر دون گا، فی الحال آپ میری پہلی دلیل کا جواب دیجیے۔

دوست (شفقت آمیز دلدہی کے ساتھ) اچھا اچھا دوسرے مسئلہ پر بھی تو کچھ اظہار خیال کیجیے۔

مین - اچھا اس سے تو آپ کو انکار نہین ہو سکتا، کیونکہ اس پر طبی شہادت موجود ہی کہ استقرار حمل کے تین ماہ بعد سے وضع حمل کے تین ماہ بعد تک زن و شو کو اپنے مخصوص فطری تعلقات سے دستکش رہنا چاہیے، ورنہ سنگین اور اندوہناک نتائج کے ظہور پذیر ہونے کا اندیشہ رہتا ہی۔ مین اس مسئلہ پر خالص طبی نقطۂ نظر سے بحث کر رہا ہون!

دوست - ہان اسے مین تسلیم کرتا ہون۔

مین - فرض کیجیے جس حادثہ فطری کا مین نے تذکرہ کیا ہی وہ پہلے ہی دن پیش آجاتا ہی، پہلے تین ماہ تک تو کوئی بات بحث طلب نہین رہتی اس کے بعد طبی نقطۂ نظر سے شوہر پر ۹ ماہ تک پرہیز لازم آتا ہی۔ چوتھے مہینے کے ابتدا مین وہ دوسری شادی کرتا ہی اور رفتہ رفتہ بالامراحل پھر پیش آجاتے ہین، پہلی شادی کے ساتوین ماہ مین وہ تیسری شادی کرتا ہی، یہی واقعات پھر رونما ہوتے ہین، دسوین مہینے کے ابتدا مین وہ چوتھی شادی کرتا ہی اور اس کا بھی وہی انجام ہوتا ہی اب اس کی پہلی بیوی ہی اور وہی لیل و نہار! آپ ہی بتائیے ان حالات کے ماتحت چار بیویون سے زیادہ کی حاجت باقی رہتی ہی یا نہین؟

دوست (اس طور پر ہنستے ہوے گویا میرے سارے دلائل لغو محض تھے۔ سرپرستانہ انداز سے) آپ کی منطق اور ظرافت کا مین قائل ہو گیا۔ فلسفہ، ریاضی، طب اور منطق کا آپ نے خوب ہی

معجون مرکب تیار کیا ہی۔

مین - مجھے آپ کے خیال سے بالکل اتفاق ہی بشرطیکہ آپ مجھے فلسفہ کا مجرم نہ قرار دین، اِس معجون مرکب، سے آپ فلسفہ نکال دیجیے ورنہ مین خودکشی کر لون گا۔

دوست. کیا خوب، آپ نے فلسفیانہ طریق پر تو بحث کی ہی اور فلسفہ کے نام سے چراغ پا ہوتے ہین۔

مین - لیکن آپ جانتے بھی ہین مین کس مشرب سے منسلک ہون؟ مین ان نفوس قدسیہ کا نام لیوا ہون جو فلسفہ کے نام پر سفر محض ہین اور فلسفی ہونے کا دعویٰ کرتے ہین اسلام کے اصول کا استہزا کرتے ہین لیکن تنخواہ مسلمان ہونے کی پاتے ہین، آپ ہی انصاف کیجیے مین کتنا بڑا ایثار کرتا ہون کہ بقول آپ کے فلسفہ چھانٹتا ہون اور فلسفی ہونے سے گریز کرتا ہون۔!

دوست (قطع کلام کرتے ہوے) رشید صاحب، آپ نے جو کچھ اب تک فرمایا ہی ممکن ہی وہ صحیح بھی ہو لیکن مباحثہ کی اسپرٹ کو اگر نظر انداز کر دیجیے تو آپ بھی غالباً اس حقیقت کے قائل ہو جائین گے کہ پردہ وغیرہ کے متعلق جتنی مشرقی یا اسلامی پابندیان ہین وہ کم سے کم جہانتک تعلیم نسوان کا تعلق ہی، ہماری ترقی کے راستہ مین سنگ گران ہین۔ اگر عورتین تعلیم یافتہ ہون تو بہت سی دقتین جن کے لیے ہم ہمیشہ کوشان رہتے ہین خود بخود رفع ہو جائین۔ اگر اور کچھ نہین تو آپ اپنے لوگون کے خیالات کی کافی اصلاح ہو جاسکے معاف فرمائیے گا۔

مین - یہ آپ نے کیسے فرض کر لیا کہ مین تعلیم نسوان کے خلاف ہون۔ یہ البتہ ہی کہ مین تعلیم یافتہ بیوی سے ذرا ڈرتا ہون۔ مین تو لکھی پڑھی بیوی چاہتا ہون لیکن اس شرط کو لازمی نہین قرار دیتا اگر وہ لکھی پڑھی ہو تو بہتر ہی ورنہ مین تو جاہل بیوی کا زیادہ قائل ہون خدا نہ کرے مجھے کسی ایسی بیوی سے سابقہ پڑے جو میز کرسی پر چاء پیتی ہو، اس کے بعد اپنی ڈاک کا مطالعہ کرے صبح و شام ہوا خوری کی عادی ہو۔ شوہر سے ہاتھ ملائے اور اُس کے دوستون سے واقف ہو اور اُن کی پالٹکس مین حصہ لے۔ گرمیون مین شوہر کو چھوڑ کر پہاڑون کی راہ لے اور شوہر آمدنی کی جانچ پڑتال کرے۔ مین نہین چاہتا میری بیوی ملٹن اور شکسپیر کے متعلق میرے مبلغ علم کا جائزہ لے اور فنون لطیفہ مین دخل رکھتی ہو۔ مین تو نری ہندوستانی بیوی چاہتا ہون جو بقول شگفتے باورچی خانہ کا ٹمٹماتا ہوا دیا ہو نہ کہ چاندنی دہلی کا برقی ہنڈا۔ مجھے ملٹن، شکسپیر، غالب، مل، گلیڈاسٹون،

مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی وغیرہ کے متعلق اگر معلومات فراہم کرنی ہون گی تو سر کھپانے کے لیے لٹن لائبریری اور یونین کلب موجود ہین۔ فرقہ بندی بدمذاقی اور بدگوئی کی ضرورت محسوس ہوگی تو کوئی کلب قائم کرون تامدن ان مزخرفات مین گزر سکتا ہی۔ اب گھر مین بھی یہی تذکرے بیوی نے چھیڑے تو اُس کے بعد صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہی، مین کسی بدمذاق فلسفی کو کاٹ کھاؤن، بیوی میکے کا راستہ لے اور مین پاگل خانہ کا!

بیوی کا کام صرف یہ ہی کہ مین پریشان اور خستہ حال مکان مین داخل ہون اور وہ مجھکو پاکر باغ باغ ہوجائے وہ صرف یہ محسوس کرے کہ مجھے تسلی اور عافیت کی ضرورت ہی۔ تمام کام چھوڑ کر ہماری جنبش ابرو کا مطالعہ شروع کردے۔ اسے یہ کبھی نہین پوچھنا چاہیے کہ میری فکر اور پریشانی کا باعث کیا ہی۔ اگر مین اُس سے، اُس کا تذکرہ کرون تو وہ مجھے دفاعی ترکیبون اور سازشون کی صلاح نہ دے۔ وہ صرف یہ کہے "پریشان مت ہو، مونھ ہاتھ دھوؤ کچھ ناشتہ کرلو، تھوڑی دیر آرام کرو، مین خدا سے دعا کرون گی وہ تمھاری مشکلات کو آسان کردے گا، زیادہ فکر و محنت نہ کیا کرو، تمھاری بیکلی دیکھ کر مین پریشان ہوتی ہون، تمھارے لیے پانی دون؟" وہ میرے کپڑون مین ہاتھ لگاتے ہوے کہے "تمھاری اچکن اُتار دون"؟ وہ میرے موزے اور جوتے اتار دے اور سلیپر لاکر سامنے رکھدے، وہ ان باتون کے متعلق جن سے مجھے دلچسپی ہی، دل خوش کن واقعات سنائے اور مجھے رفتہ رفتہ آسایش پزیر ہوتا پاے تو مسرور ہو جائے۔

آپ ان باتون کو سُن کر دل ہی دل مین مضحکہ اُڑاتے ہون گے، آپ خیال کرتے ہون گے کہ مین نے یہ صفات کسی بیوی کے نہین بلکہ خادمہ کے سُنائے ہین لیکن آپ یقین مانیے، ہر شخص اپنی بیوی مین انھین صفات کا متمنی ہوتا ہی یہ اور بات ہی کہ وہ فیشن اور گمراہی کے سبب سے، اس کا اقرار نہ کرے۔ آپ بیوی کو معشوق کی حیثیت دینا چاہتے ہین، یہ دو دن کی چاندنی ہی، عشق و عاشقی سے گھر نہین بستا۔ یہ کاغذی ناؤ ہی، زندگی کے پُر آشوب طوفان مین اس کا پتہ بھی نہ لگے گا۔ معشوق ممکن ہی کچھ دنون تک معشوق بنا رہے لیکن یقین مانیے آپ عرصہ تک عاشقی کا دم نہین بھر سکتے۔ یہ سنگین اور سنگلاخ واقعات اور حقائق ہین تخیل

کی زبان کا ریون کو ان کے سامنے نہ لائیے۔

دوست ۔ "شعریت" اور "ازدواج" پر تو آپ نے اظہار خیالات کیا، لیکن آخری بند کو تو آپ نے ایسا رقت انگیز کر دیا کہ شاید اب "فلسفۂ ازدواج" پر آپ کے گریہ گلوگیر ہونے لگے۔ کہین تجربات عالیہ مین سے تو نہین ہو۔

مین ۔ جی ہان مقام تو یہ رونے ہی کا تھا لیکن یہ کوئی ضروری بات نہین ہو کہ اس کا شمار "تجربات عالیہ" مین ہو، تجربات عالیہ تو بالعموم چالیس سال کی عُمر سے شروع ہوتے ہین جب "ہمہ سارا زور سمٹ کر زبان پر آجاتا ہو" گو آج کل بہت سے نوجوان ایسے بھی ملین گے جو اس لحاظ سے بڑے بڑے سن رسیدون کو بھی نیچا دکھا سکتے ہین۔

دوست ۔ محبت ایک غیر فانی چیز ہو، عمر کی قید بے محل ہو، بہت سن رسیدہ لوگ ایسے ہوتے ہین جنہین میان کی محبت قابل رشک ہوتی ہو آپ کا کیا خیال ہو؟

مین ۔ اس حقیقت سے مجھے انکار نہین ہو لیکن مستثنیات سے اصول نہین وضع کیے جا سکتے فلسفۂ ازدواج کے عمر کی قید ضروری ہو اور اگر آپ اس کے ماننے کے لیے تیار نہین ہین تو کم سے کم یہ تو ضرور تسلیم کر لین گے کہ پہلی شادی کے بعد جب کبھی دوسری یا تیسری شادی کی نوبت آتی ہو اسوقت اُس کی نوعیت بالکل جداگانہ ہوتی ہو۔ مین نے بہت سے بزرگون کو دیکھا ہو جن کی شادی اُن کی فطرت ثانیہ ہوتی ہو اگر پہلی شادی سے کچھ بار آور نتائج برآمد ہوتے ہین تو بالعموم دوسری اور تیسری شادی اس نیت سے کی جاتی ہو کہ گزشتہ حماقت زائیون کے لیے ایک سند جواز حاصل کر لی جائے۔

پہلی شادی بمنزلہ قرض کے ہو، دوسری سود، تیسری سود در سود، چوتھی دیوالہ، پانچوین سوء اجل اور ان سے سبکدوشی یعنی موت۔

فلسفۂ ازدواج اکثر اس وقت سے بھی شروع ہو جاتا ہو جب شادی کی ہر سالگرہ عقیقہ پر ختم ہونے لگتی ہو، اقتصادیات کا یہ ایک عجیب مسئلہ ہو کہ مفلس طبقہ اکثر و بیشتر افزائش نسل مین زیادہ منہمک رہتا ہو لیکن فطرت اس سے بھی زیادہ ستم ظریف ہوتی ہو۔ مشہور تو یہ ہو کہ روزی خدا کے ہاتھ مین ہو لیکن یہ اب تک نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی تقسیم کا کیا اصول ہو، اکثر کھلانے والے ایک

خاندان مین بھیجے جاتے ہین اور روزی دوسرے خاندان مین بھیجی جاتی ہر فلسفۂ ازدواج کا اگر پتا لگانا مقصود ہو تو سب سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ شوہر اور بیوی مین سے کون اس آفت سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے درپے ہر بعض پھلون مین ایک عجیب خاصیت دیکھی گئی ہر یعنی وہ پاک کرنے سے خام ہونے لگتے ہین، یہی حالت ازدواج کی بھی ہر بعض اوقات میان بیوی تمام مراحل طے کرلے کے بعد پھر شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہین، اعلی طبقہ مین اس کی ابتدا تعلیم یافتہ بیوی سے ہوتی ہر اور طبقۂ ادنی مین یہ سعادت شوہر کو نصیب ہوتی ہر اعلی طبقہ مین یہ تعلقات اکثر غیرسرکاری ہوتے ہین جس کے دوسرے معنی ہین "داخلہ پرائیوٹ"، ادنی طبقہ مین اس کا پتا فریق ثانی کو چلتا ہر تو وہ مجرم کو بزور بازو یا بزور زبان راہ راست پر لاتی ہر اعلی طبقہ مین اول تو اُس کی طرف سے لاتجسسوا پر عمل کیا جاتا ہر اور اگر یہ اصول کامیاب نہین ہوتا تو پھر مجرم کو پہاڑ وغیرہ پر اس خیال سے بھیجدیا جاتا ہر کہ شاید وہان کی آب و ہوا راس آجائے . . .

. . . .

گفت و شنید کا سلسلہ منقطع ہی نہین ہوتا تھا، لیکن اب شام ہوچلی تھی اور مین یہ وقت صرف ٹینس کے لیے مخصوص کرچکا ہون اور مجھے سخت کوفت ہوتی ہر اگر اس وقت مجھے کسی دوسرے کام کے لیے طلب کیا جائے یا ٹینس سے باز رکھا جائے بطیب خاطر مین دنیا کا کوئی اور کام اس وقت کرنا پسند نہین کرتا بعض اوقات ایسے مواقع پیش آجاتے ہین کہ ٹینس کو خیرباد کہنا پڑتا ہر لیکن وہ وقت ہوتا ہر جب مجھے برخاست ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہر اور ایسی حالت مین بعض لوگ تو بڑی بڑی قربانیان کرنے پر تیار ہوجاتے ہین، مین صرف ٹینس کا فاتحہ پڑھ لیتا ہون۔ میرے دوست میری اس عادت سے واقف تھے فورن نے "بقیہ آئندہ" کے سلسلہ مین مجھ سے رخصت چاہی اور مین نے تھوڑے سے تصنع کے ساتھ مین رخصت کیا اور پھر ٹیکٹ لے کر ٹینس کورٹ کی طرف چلدیا اور ازدواج کی تمام حماقت زائیون کو فراموش کرکے صرف یہ دعا مانگتا رہا کہ خدا کرے مین جیسے ہی پہونچون میرے پیشتر دوست ختم کردین لیکن میری بدحواسی کی کوئی انتہا نہ تھی جب پہونچنے پر معلوم ہوا کہ آج کسی ٹرسٹی صاحب کے جان بحق ہونے کے سلسلہ مین کھیل بند ہر !

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

رشید احمد صدیقی (علیگ)

انسانی تہذیب کی ترقی

قدرت کے اٹل قانون نے اجناس عالم کے لباس مین درجہ بدرجہ ترقی کی ہی۔ حجر، شجر سے حیوان اور حیوان سے لیکر انسان کی شکل مین اسی ہستی کا ظہور ہوا ہی جس کا شہنشاہ آفتاب کے گرد طواف مین مصروف رہنا امکان سے یقین اور یقین سے ہدایت کا روز روشن پیش کرتا ہی۔ یہ ہستی کے حیرت انگیز مظاہر اپنی شکل وصورت، افعال وخواص کی جداگانگی کے علاوہ اپنی باطنی قوت کی وجہ سے اپنے امتیاز ذاتی کا ایسا عجیب وغریب تماشا پیش کرتے ہین جن سے اہل بصیرت کبھی سیر نہین ہوسکتے۔ اس کارگاہ ہستی کے معمل کا بیش بہا نتیجہ انسان ہی۔ ایک نسبت سے وہ حیوانی سلطنت کا بادشاہ اور دوسری نسبت سے ملکوتی حکومت کا سترا ہی اور ان دونون نسبتون مین ایسا قوی رشتہ ہی کہ ایک نسبت کی اصلاح دوسری نسبت کی اصلاح پر منحصر ہی۔ چنانچہ اب ہم اس کی پہلی نسبت پر غور کرتے ہین۔

اگر جانورون یا پرندون کے سلسلہ پر نظر ڈالی جاے تو معلوم ہوجائے گا کہ وہ ایک دوسرے سے اپنا عندیہ نہین کہہ سکتے۔ اگر وہ اپنے محسوسات کا اظہار کرنا چاہین تو آوازون کے ذریعہ سے اپنا دکھ سکھ امید وبیم کی حالت ایک دوسرے پر ظاہر کرتے ہین۔ مثل انسانون کے وہ باقاعدہ بات چیت کرکے اپنے دل کے حالات نہین کہہ سکتے۔ اللہ عزوجل نے مخلوق کو اپنی حسب منشا بنایا ہی جانورون یا پرندون کو اس قسم کی قدرت عطا نہین کی ہی کہ وہ اپنی حالت کو بڑھا سکین، ترقی کرسکین یا ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کرسکین۔ چھوٹی چھوٹی چڑیون کی سمجھ مین بھی حقیقت مین فرق رکھا ہی۔ ایک چڑیا اپنا گھونسلا بہ نسبت دوسری قسم کی چڑیا کے بہت اچھا اور نہایت صفائی سے بنا سکتی ہی۔ ایک چوپایہ دوسرے چوپایہ سے زیادہ کھیل تماشون کا کام سیکھ سکتا ہی اور چونکہ ان کو بات چیت کرنے کی قدرت عطا نہین کی گئی ہی اس لیے وہ اپنے ہم جنسون سے اپنے معلومات کا اظہار نہین کرسکتے، جو کچھ وہ جانتے ہین وہ اُنھین تک محدود رہتا ہی۔ اسی طرح ہر پرند اور ہر چوپایہ کی نسل مین ابتدائے دُنیا سے وہ ہی عادتین اور وہ ہی خصلتین چلی آتی ہین اور جب تک دُنیا قائم ہی اسی طرح رہین گی۔ دوسرے الفاظ مین اس کا مطلب یہ ہی کہ قدرت کی طرف سے جانورون کو بہت تھوڑی سی عقل عطا کی گئی ہی اور وہ بھی محدود۔ اور اس محدود عقل سے وہ صرف اپنے لیے

تلاش معاش، آرام اور حفاظت کا کام کر سکتے ہین، اور یہ باتین بھی صرف اُسی حد تک کر سکتے ہین جہانتک کہ ان کی گذشتہ نسل ابتداے آفرینش سے کرتی چلی آرہی ہی۔ لیکن وہ اپنی آنے والی نسل سے کسی قسم کی ترقی کے متعلق تبادلۂ خیالات نہین کر سکتے اور نہ گذشتہ نسل سے کسی قسم کا سبق حاصل کر سکتے ہین۔ بیا اور اسی قسم کی دوسری چڑیان اپنا گھونسلا اس قسم کا بناتی ہین کہ اُس کے اوپر چھت ہونے کی وجہ سے وہ دُھوپ اور بارش سے محفوظ رہتی ہین۔ اِس قسم کے نمونہ کا گھونسلا کبھی اُن چڑیون نے نہین بنایا ہی جو کھُلی جگہ مین ابتداے آفرینش سے بناتی چلی آرہی ہین۔

جانورون اور پرندون کے ترقی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہی کہ قدرتی طور سے وہ اپنے مان باپ کی پرورش مین بہت تھوڑے عرصہ تک رہتے ہین، چند ہفتون مین چڑیون کے چھوٹے چھوٹے بچے اِس قابل ہوجاتے ہین کہ اپنے مان باپ کی پرورش سے آزاد ہوجائین۔ قدرت نے چڑیون پر اِس قلیل عرصہ کے لیے ان کی پرورش کا سلسلہ اس لیے قائم کر دیا ہی کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے اس قابل نہین ہوتے کہ اپنی حفاظت کر سکین اور خود تلاش کر کے کھا پی سکین۔ لیکن جب بچے اس قابل ہوجاتے ہین تو اُن کے مان باپ کی مدد کا سلسلہ قطعی منقطع ہوجاتا ہی، اور غالبًا ایک ہی ہفتہ مین بچے اپنے مان باپ سے بالکل اجنبی ہوجاتے ہین۔ بھیڑ، گائے اور گھوڑے کے بچے چند روز تک اپنے مان باپ کے پاس رہتے ہین اور انھین کی حفاظت مین کھاتے پیتے ہین۔ اس عرصہ مین مائین ان کی دیکھ بھال کرتی ہین اور اپنا دودھ پلاتی ہین۔ لیکن جس وقت بچے اس قابل ہوجاتے ہین کہ وہ اپنی حفاظت آپ کر سکین اور خود کھا پی سکین، تو پھر وہ اپنی ماؤن سے علٰحدہ ہوجاتے ہین اور اپنے مان باپ سے وہ روابط جو پہلے اُن کے ساتھ تھے ہمیشہ کے لیے جاتے رہتے ہین۔

اس طرح جانورون کا ہر مختلف طبقہ قدرت کے عام قانون کے مطابق، بالکل اُسی طرح سے رہتا ہی جس طرح اُس کی گذشتہ نسل رہ چکی ہی۔ موجودہ جانورون کی نسل نہ کسی قسم کی ترقی کر رہی ہی اور نہ کر سکتی ہی، جو باتین وہ جانتی ہی اُس کو بھول بھی نہین سکتی، بلکہ اُسی حالت پر رہے گی جس حالت پر ان کی گذشتہ نسل تھی، اور آنے والی بھی اُسی حالت مین رہیگی۔

انسان کی حالت اس سے بالکل مختلف ہی۔ اللہ عزوجل نے انسان کو اپنا ہم شبیہ بنایا ہی۔ اِس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ خالق ارض وسما کی بھی کوئی ظاہری شکل وصورت ہی جس سے انسان شباہت رکھتا ہی

ہرگز نہین. بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ خداوند عالم کی ذات جس نے دُنیا کو پیدا کیا ہو ایک ایسی ذات ہو جو وہم و قیاس مین بھی نہین آسکتی۔ اور اُسی کے نور کے پرتو کا نام روح ہو۔ جب تک آدمی زندہ رہتا ہو اُسی روح کی بدولت وہ ہر کام کر سکتا ہو۔ مرنے کے بعد روح اُس کے جسم سے نکل کر روحانی دُنیا مین چلی جاتی ہو اور جو کچھ اُس نے دُنیا مین کیا ہو اس کی پرسش روح ہی سے ہوتی ہو۔ جب انسان کو اچھائی اور بُرائی کی تمیز عطا کی گئی ہو اور یہ قدرت کی اُن قوتون سے ملتی جلتی ہو جن قوتون کو ہم فرشتہ کہتے ہین تو پھر ایسی صورت مین ناممکن تھا کہ انسان کو ایسی مخلوق کے طبقہ مین رکھا جاتا جو اپنے افعال کی ذمہ دار نہین ہو اور جن کی عقل و تمیز اور سمجھ محدود رکھی گئی ہو۔ اپنی حالت کا نہ اندازہ کر سکتے ہین اور نہ مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنی حالت کو گھٹا بڑھا سکتے ہین۔ انسان کے جسم کے تمام اعضا، روح سے قریبی تعلق رکھتے ہین۔ اگر اُن کو بجا طور پر استعمال کیا جائے تو اُن کی قوت ہر گھڑی ترقی کرتی رہتی ہو۔ اور صرف یہی نہین بلکہ انسانون کے گروہ اور قومین باہمی اتحاد و محبت کی لڑی مین منسلک ہو جاتی ہین اور انہین ترقی کرنے کی وہی قوت ہوتی ہو۔ اگر زمانہ موافقت کرے تو رفتہ رفتہ انسانون کے برہنہ وحشی گروہ طاقتور اور مہذب ہو جاتے ہین۔ انسان کو دن بدن ترقی کرنے کی استعداد قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہو اور اِس استعداد کی بنا پر ہم کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو اور یہ صرف انسانون ہی کا حصہ ہو۔ اچھا! آؤ اِس کو ذرا غور سے دیکھین کیونکہ اس مین وہ حقیقت پوشیدہ ہو جس سے تعجب بھی ظاہر ہوتا ہو اور عظمت بھی۔

اگرچہ انسان کو قدرت کی طرف سے وہی غیر فانی روح عطا کی گئی ہو جس کے متعلق اوپر لکھا جا چکا ہو اور اسی کی وجہ سے اس کو ہر اچھے کام کو اختیار کرنے اور ہر بُرے کام کو نہ کرنے ہر کام مین فیصلہ کرنے اور رد کرنے، ہر بات کا سبب ڈھونڈنے اور اُس کے انجام پر غور کرنے کی قدرت دی گئی ہو۔ ان باتون پر غور کر کے اور سبب دریافت کر کے وہ کسی نتیجہ پر پہونچتا ہو۔ اگر اِس نتیجہ کو بات چیت کے ذریعہ وہ اپنے ہم جنسون پر ظاہر نہ کر سکتا تو یہ امر بالکل بدیہی تھا کہ ہر انسان کے معلومات کی ترقی صرف اُس کے مشاہدات اور صرف اسی کے دلائل تک محدود رہتی لیکن قوت گویائی کے عطیہ سے ہر شخص اس قابل ہوتا ہو کہ جو کچھ ترقی کے خیالات اُس کے دل مین پیدا ہون دوسرون پر ظاہر کر دے اور اِس طرح یہ خیالات جو ایک شخص کے دل مین پیدا ہوے ہین اُسی کے ساتھ محدود نہین رہ جاتے بلکہ ایک اچھی خاصی جماعت کو

اِن خیالات کا علم ہوجاتا ہی اور انھین خیالات مین آئندہ معلومات اور انکشافات سے عموماً حسب ضرورت اور حسب موقع ترقی ہوتی رہتی ہی اور اسی کی بدولت وسیع معلومات کے آدمی اور موجد پیدا ہوجاتے ہین۔ قوت گویائی ہی ایک ایسی چیز ہی جس کے ذریعہ سے ہم چھوٹے چھوٹے بچون کو ہر چیز بتا سکتے ہین اور یہ ہی قوت گویائی ایک ایسی نعمت ہی جس کی وجہ سے انسان جانورون سے اس قدر شاندار امتیاز رکھتا ہی جو اُس کو حاصل ہی۔

انسانی سوسائٹی کی ترقی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہی کہ اُن کے بچے عرصۂ دراز تک اس قابل نہین ہوتے کہ خود کچھ کام کرسکین اور اسی وجہ سے وہ اپنے والدین کی نگرانی اور پرورش کے بہت دن تک محتاج رہتے ہین۔ یہ عموماً دیکھا گیا ہی کہ جس جگہ کھانے پینے کی قدرتی پیداوار کثرت سے ہوتی ہی بچے یہ بھی نہین جان سکتے کہ آیا یہ چیزین کھانے کے کام مین بھی آسکتی ہین یا نہین یہ ہی واقعہ اُن مقامات پر بھی پیش آتا ہی جہان لوگون کا گذارہ جنگلی جانورون کے شکار یا کاشتکاری پر ہوتا ہی۔ یہ ایسے کام ہین جن مین تھوڑی سی ذاتی محنت اور سمجھ کی ضرورت ہوتی ہی مگر بچے جب تک تیرہ یا چودہ برس کے نہین ہوجاتے وہ اُن کامون مین سے ایک کام کو بھی نہین کرسکتے۔ ان واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہی کہ قانون قدرت یہ ہی ہی کہ برخلاف جانورون یا پرندون کے بچون کے انسان کے بچے اس وقت تک اپنے والدین کی پرورش اور نگرانی مین رہین جب تک کہ ان کو اچھی خاصی سمجھ نہ آجائے اور اس دوران مین اُن کے والدین اُن کو مفید مطلب باتین پڑھا اور سکھا نہ دین۔ قدرت کے اس عجیب و غریب انتظام سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہی کہ انسان کے بچے چونکہ اپنے والدین کے ساتھ مدت العمر رہتے ہین اس لیے بچون کو ماں باپ کی محبت دائمی ہوتی ہی اور بچون کی طبیعت مین والدین کی عادات و خصائل کا اثر جذب ہوتا رہتا ہی۔ برخلاف اس کے جانورون اور پرندون کے بچے چونکہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہت کم عرصہ کے لیے رہتے ہین اس لیے اُن کی محبت اپنے ماں باپ کے ساتھ عارضی ہوتی ہی۔

اِن ہی وجوہ کی بنا پر انسان کے [illegible] اپنے والدین سے جُدا ہونے کے لیے کبھی خود کوئی خواہش نہین کرتے بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہی کہ اُسی مکان یا جھونپڑے مین جسمین وہ پیدا ہوتے ہین اپنے ماں باپ کے ساتھ عمر بسر کردیتے ہین اور جب اُن کے والدین بُڈھے ہوجاتے ہین تو اُن کو وہ کما کر کھلاتے ہین۔ اس طرح ایک یا دو خاندان آپس مین ملجاتے ہین اور اُن مین اتحاد و اتفاق قائم ہوجاتا ہے

اور وقت پر ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہین۔ انسانی سوسائٹی کی یہ پہلی منزل ہے۔ اکثر انسانی گروہ نہایت وحشیانہ حالت مین پائے گئے ہین اور ان کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی حالت جانورون کی حالت سے کم نہ تھی۔ دنیا کے بعض حصون مین ایسے لوگ موجود ہین جن کو انسان مشکل سے کہا جاسکتا ہے یہ لوگ کپڑے نہین پہنتے، رہنے کے لیے جھونپڑے یا گھر نہین بناتے۔ اُن کا گذارہ جانورون کے شکار پر ہوتا ہے اور نہایت مکروہ چیزین مثلاً سانپ، مینڈک اور کیڑے مکوڑے تک کھا جاتے ہین۔

اِس ابتر حالت کے علاوہ بھی برخلاف جانورون کے اللہ عزوجل نے انسان کو ایسی قدرت عطا کی ہے جس سے وہ بڑی بڑی ترقیان کرسکتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہی وحشی گروہ مہذب انسان بنجاتے ہین۔ جھونپڑے بناتے ہین جن سے دھوپ کی گرمی اور بارش کی تکلیف سے محفوظ رہتے ہین ہتھیار بناتے ہین جن کی وجہ سے ضرر رسان جانورون سے نجات ملتی ہے۔ حلال جانورون کو مار کر اُن کا گوشت کھاتے ہین اور چمڑا کام مین لاتے ہین۔ اور اُنھین جانورون کو زندہ پکڑ کر پال لیتے ہین۔ رفتہ رفتہ مختلف اسباب سے اُن کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اگر ان چیزون پر محنت اور مشقت کی جائے تو پیداوار مین اور اضافہ ہوگا اور زندگی آرام اور اطمینان سے بسر ہوگی۔ اِس طرح انسانی سوسائٹی کی ترقی تاوقتیکہ کوئی غیر معمولی کاوٹ نہ پیدا ہون جاری رہتی ہے اور آنے والی نسلین حاصل شدہ فوائد کے ساتھ ساتھ دوسرون کو اپنے معلومات سے آگاہ کرتی رہتی ہین۔ اور جو باتین اسلاف کو معلوم نہ تھین اُن کے جاننے کے لیے بھی سرگرم کوشش کرتی رہتی ہین۔

مثال کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تین یا چار وحشیون کے خانہ بدوش آوارہ گرد خاندان ایک جگہ آباد ہوجاتے ہین۔ زمین کو کاشت کرنا شروع کردیتے ہین اور بہت سی جھونپڑیان بنالیتے ہین تو یہ جگہ ایک گانون کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ پھر اُس گانون کے سب آدمی ملکر عموماً اسی آبادی مین سے کسی ایک آدمی کو منتخب کرلیتے ہین تاکہ وہ زمانۂ امن مین اُن کے جھگڑون اور قضیون کا تصفیہ کردیا کرے اور جب کسی دوسرے فرقہ سے کوئی لڑائی یا جنگ چھڑ جائے تو اُن کی سپہ سالاری بھی کرے یہ کیا ہے؟ شخصی سلطنت کی بنیاد کا سلسلہ ہے۔ یا اگر وہان کی آبادی کے ملکی معاملات کسی جماعت یا سن رسیدہ اور صاحب فہم منتخب افراد کے ذریعہ طے پاتے ہین۔ تو یہ کیا ہے؟ جمہوری حکومت کی آغاز کا سلسلہ ہے۔ پھر یہ آبادی کسی نہ کسی صورت مین ایک باضابطہ سلطنت سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہی لوگ ایسے

قوانین بنالیتے ہین جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے لڑبھڑ نہ سکین۔

دوسری ضروری تبدیلیان حسب موقع اور حسب ضرورت ہوا کرتی ہین بے شبہ پہلے پہل جماعت کا ہر فرد درختون کے پھل اور شکار کیے ہوے جانورون کا گوشت جمع کرکے رکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد واقعات نے انھین خود سکھا دیا کہ جس شخص نے جس چیز پر کوئی محنت یا مشقت اٹھائی ہو تو اس کی محنت اور مشقت سے یہ چیز وجود مین آئی ہو۔ اسی طرح اس بات کو تسلیم کرلیا جاتا ہو کہ جس شخص نے جو درخت بویا ہو اُس کے پھلون سے وہ ہی شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہو۔ اور جس شخص نے کسی کھیت مین کوئی چیز کاشت کی ہو وہ ہی اس کو کاٹ بھی سکتا ہو بغیر کسی چیز کے بوئے اور کاشت کیے کوئی چیز نہ اُگے گی۔ اِسی وجہ سے جس شخص نے جو چیز بوئی یا کاشت کی ہو تو اُس کی پیداوار بونے یا کاشت کرنے والے کی محنت کا ثمرہ کہلاتا ہو۔ اسی طرح سے ہر ملک مین جو لوگ جس زمین کو کاشت کرتے ہین وہ انھین کی ملک کہلاتی ہو اور جن لوگون نے جن جنگلون کی نگہداشت کی ہو وہ اُنھین کا علاقہ کہلاتا ہو۔ اگر ایک ملک مین دوسرے ملک کا آدمی آجاتا ہو تو دونون سلطنتون مین جنگ ٹھن جاتی ہو اور پھر حسب دلخواہ شرائط پر صلح ہوجاتی ہو۔ اِس طرح ایک نئی سلطنت اپنے مقبوضات کو اس طریقہ سے بڑھاتی رہتی ہو اور دوسرے فرقہ سے گفت وشنید کرکے اپنے ملک مین معاشرتی قوانین بنالیتی ہو جس کی لوگون کو ہر حالت مین خواہ جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا پیروی کرنی پڑتی ہو۔

انسان کو اپنی وحشیانہ اور ابتدائی حالت سے مہذب انسان ہونے کے زمانہ تک جو دوسرے واقعات پیش آتے ہین وہ بھی بہت اہمیت رکھتے ہین۔ ان واقعات مین نہایت ضروری باشندون کی مختلف فرقہ بندی اور روپیہ پیسہ کے استعمال کی ترویج ہو۔ اب ان بڑی بڑی تبدیلیون کے سمجھانیکی کوشش کی جاتی ہو جو اکثر پیش آیا کرتی ہین۔

ابتدائی حالت مین سوسائٹی کا ہر رُکن ضروریات زندگی کے لیے تمام سامان خاص اپنی ذاتی محنت سے مہیا کرتا تھا۔ یعنی اپنے لیے خوراک خود شکار کرکے حاصل کرتا تھا۔ غلہ صرف اپنے لیے بوتا تھا اور کاٹتا تھا۔ پھل وغیرہ کا مہیا کرنا بھی صرف اپنی ذات کے لیے مخصوص تھا۔ جن جانورون کا شکار کرتا تھا اُن کی کھالون سے صرف اپنے ہی لیے لباس اور جوتہ بنایا کرتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوتا گیا کہ فرض کرو ایک شخص نوجوان ہو چست وچالاک ہو اور اپنی محنت وجانفشانی سے اُس نے شکار کرنے مین خاص

مہارت پیدا کرلی ہر اور دوسرے شخص کی نسبت ہوتے ہوتے یہ معلوم ہوا کہ وہ پہلے شخص سے بھی زیادہ سنجیدہ اور مستقل مزاج آدمی ہر، زمین جوتنے، بونے اور مویشی کے رکھ رکھاؤ مین اچھی خاصی مہارت رکھتا ہر اور تیسرے شخص کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ وہ محنت و مشقت کے کامون سے معذور ہر، غیر مستقل مزاج ہر اور صرف ایسے کام کرسکتا ہر جو گھر مین بیٹھکر انجام پاسکتے ہین مثلاً کپڑے سینے کا کام جوتے بنانے کا کام۔ اس لیے اس مین ان تینون آدمیون کے اغراض پوشیدہ ہین یعنی یہ کہ پہلا شخص سوائے شکار کے اور کوئی کام نہین کرے گا۔ دوسرا شخص کھیتی باڑی کے کام مین مصروف رہے گا اور تیسرا شخص کپڑا سی کر اور جوتا بنا کر اپنی بسر اوقات کرے گا۔ اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہر کہ شکاری، شکار کا گوشت اور چمڑا دیکر کسان سے اپنے اور اپنے بال بچون کے کھانے کے لیے غلہ لے گا۔ اور شکاری اور کسان کو تیسرے شخص سے جوتہ اور کپڑا لینے کے لیے اُس کو گوشت اور غلہ دینا پڑے گا۔ اس طرح سے ہر شخص جُدا جُدا پیشہ اختیار کرکے اپنے کاروبار مین اچھی خاصی معلومات پیدا کرکے اُسے بوجوہ احسن انجام دے سکتا ہر اگر ان تینون آدمیون مین سے ہر ایک شخص شکاری بھی ہوتا، کسان بھی ہوتا اور درزی بھی تو بجائے اس کے کہ وہ اُنھین آسانی اور کامیابی سے کرسکے دو پیشون کو بھی کامیابی اور آسانی سے نہین چلاسکتا تھا۔ چیزون کا اس قسم کا ردوبدل مبادلہ کہلاتا ہر اور یہ ابتدائی قسم کی تجارت کہلاتی ہر جس سے لوگ اپنے مال کا جو اُن کی ضرورتون سے بچ رہا ہر آپس مین مبادلہ کرتے رہتے ہین۔

لیکن زمانہ اور وقت کے لحاظ سے مبادلہ تکلیف دہ معلوم ہونے لگا۔ وہ اس وجہ سے فرض کرو کہ درزی کو اس وقت غلہ کی ضرورت ہر اور کسان کو کپڑے کی ضرورت نہین ہر یا درزی کو اس وقت گوشت یا چمڑے کی ضرورت نہین ہر جس کو شکاری مبادلہ مین دینا چاہتا تھا۔ اس مصیبت کو رفع کرنے کے لیے تمام قومون نے "روپیہ" ایجاد کیا ہر یعنی دھات کو چند چھوٹے چھوٹے حصون مین تقسیم کردیا ہے جن کی کوئی قیمت نہین ہوتی بلکہ انسانون نے تجارتی اغراض کے لیے اُن کی ایک فرضی قیمت معین کرلی ہر۔ ہر ملک مین مختلف قسم کا سکہ چلتا ہر۔ پہلے زمانہ مین بعض ملک مین چمڑے کا سکہ چلتا تھا، بعض مین کپڑے یا لوہے کا۔ مگر اب سونے اور چاندی کو چھوٹے چھوٹے حصون مین تقسیم کرکے اس خاص مقصد کے لیے تمام دُنیا مین رواج دیدیا ہر۔

اس گردش مین رہنے والی تجارت کی فرضی قیمت کا استعمال اور اُس کے فوائد اسطرح سمجھیے!

جیسا پہلے بتایا جاچکا ہی فرض کرو کہ شکاری کو کپڑے کی ضرورت ہی اور درزی کو مبادلہ پر حاصل کرنے کے لیے گوشت کی ضرورت نہین بلکہ غلہ کی ضرورت ہی اور کسان کو اس وقت کپڑے کی ضرورت نہین ہی بلکہ ضروریات زندگی مین سے کسی اور چیز کی ضرورت ہی۔ ان تینون آدمیون مین سے ہر ایک کو اپنے آرام و آسائش کے لیے کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہی اور جو مبادلہ سے دستیاب نہین ہو سکتین اس لیے کہ جن لوگون سے وہ مبادلہ کے ذریعہ چیزین حاصل کرنا چاہتا ہی اُن کو ان چیزون کی مبادلہ پر لینے کی ضرورت نہین ہی۔ لیکن فرض کرو کہ اب روپیہ کا استعمال مروج ہوگیا ہی اور اُس کی قیمت بھی مان لی گئی ہی تو اب یہ تینون شخص روپیہ کے ذریعہ نہایت سادہ طریقہ سے بیوپار کرسکتے ہین۔ شکاری اس وقت شکار کا گوشت یا چمڑا بیچنا چاہتا ہی مگر درزی کو اس وقت اس کی ضرورت نہین ہی لیکن وہ گاؤن مین کسی اور شخص کو پانچ روپیہ مین بیچ دیتا ہی اور پھر درزی کے پاس جاتا ہی۔ اگرچہ اس وقت درزی مبادلہ کے ذریعہ اپنا مال علحدہ کرنا نہین چاہتا مگر اب روپیہ کے عوض بخوشی فروخت کردیتا ہی اور روپیون کو لیکر کسان کے پاس جاتا ہی اور اس سے ضروری چیزین خرید لیتا ہی۔ اب کسان بھی اُس روپیہ سے ضروری سامان خرید لیتا ہی اور جو کچھ روپیہ بچتا ہی اس کو ضرورت کے وقت کام مین لانے کے لیے اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیتا ہی۔

روپیہ کی ایجاد مین رفتہ رفتہ ترقی ہوتی رہتی ہی۔ بہت سے مختلف چیزون کو خرید کر بیچنے کا پیشہ اختیار کرلیتے ہین یعنی چیزون کو خرید کر گران فروخت کرتے ہین۔ یہ طریقہ ہر جماعت کے لیے مفید ہوتا ہی سامان کا اصلی مالک چیزون کو دوکاندارون کو کم نفع سے اس لیے فروخت کردیتا ہی کہ اُس کو گشت لگاکر بیچنے کی تکلیف سے نجات مل جاتی ہی۔ عوام کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہی دوکاندارون سے واجبی قیمت پر خرید لیتے ہین۔

سکے کے رواج پاتے ہی لوگون کے لیے دوسرے واقعات کے ساتھ ساتھ بہت سے کاروبار کھل جاتے ہین اور یہ بات بھی عموماً ظاہر ہوتی ہی کہ سوسائٹی کی ابتدائی منازل مین درجۂ مساوات بہت جلد غارت ہوجاتا ہی بہت سے لوگ سونا چاندی جمع کرکے رکھ لیتے ہین اور امیر ہوجاتے ہین اپنے کاروبار مین مدد لینے کے لیے لوگون کو نوکر رکھ لیتے ہین۔ بہت سے لوگ اپنی کمائی کو فضول خرچیون مین ضائع کرکے مفلوک الحال ہوجاتے ہین اور غلامی کی حیثیت مین زندگی بسر کرنا ہوجاتے ہین بہت سے آدمی عقلمند اور

ہوشیار ہوتے ہین اور اپنی فراست اور دانشمندی کی وجہ سے لڑائیون اور پُرامن زمانہ مین دوسرے لوگون سے ممتاز سمجھے جاتے ہین۔ یہی لوگ ملکی معاملات مین بھی سرآوردہ خیال کیے جاتے ہین۔ دوسرے لوگون کی بڑی تعداد ایسی ہوتی ہو کہ ان مین شجاعت نام کو نہین ہوتی اور صرف پیروی ہر کام چلاتے ہین۔ یہی لوگ ہر قسم کی جدت سے عاری ہوتے ہین۔ موخرالذکر اسی بندش مین رہ کر فنا ہوجاتے ہین مگر دوسرے لوگ جن مین جدت اور سمجھ ہوتی ہر ترقی کرتے کرتے فوجون کے جنرل اور مدبر ہوجاتے ہین۔ علمی ترقی کی خواہش سے اپنے درجہ مین ترقی کرنے کی تمیز آجاتی ہو۔ جو لوگ اپنے ان باپ کی نگرانی مین یا اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہین تو وہی لوگ فرقہ جہلا سے علٰحدہ ہوجاتے ہین اور ایسا امتیازی درجہ اور حالت قائم کرکے اپنے سے کمتر لوگون سے صرف ضروری مراسم رکھتے ہین۔

اس طریقہ سے سوسائٹی کا سارا نظم بدل جاتا ہو اور ایک بڑے خاندان کی یہ حالت ہوجاتی ہو کہ اس مین مساوات کا درجہ قائم نہین رہتا بلکہ یہ خاندان مختلف طبقہ کے لوگون، مختلف جماعتون کے حالات کی بندشون سے مشابہت رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہو۔ ایک قوم اپنی قدرتی اور ابتدائی حالت سے زیادہ پیچ در پیچ طریقون مین ترقی کرتی ہو جس سے اُس کے درجون مین دوسری قومون سے امتیاز پایا جاتا ہو اور یہ طریقہ سوسائٹی یا تمدن کی ترقی کہلاتا ہو۔ اس قسم کی ترقی مین دوسرے انسانی کامون کی مانند بھلائی اور بُرائی بھی شامل رہتی ہو۔ آنے والی انسانی نسلون کی ایجادون اور ترقیون کے لیے یہ لازمی ہو کہ ان مین جلد یا بدیر تغیرات ضرور واقع ہون مگر یہ ہماری خلقی فطرت کا قانون معلوم ہوتا ہو۔

ایک اور دوسری تبدیلی جو متمدن ہونے کے لیے تدریجی ترقی کے نتائج سے برآمد ہوتی ہو وہ بھی بہت کچھ اہمیت رکھتی ہو۔ سوسائٹی کی ابتدائی حالت مین قبیلہ کا ہر شخص جنگجو ہوتا ہو اور اس سے یہ خدمت اس وقت لی جاتی ہو جب ملک کو ضرورت ہو۔ لیکن ہوتے ہوتے فوجی ہنر کم از کم معمولی مواقع پر بھی انھین لوگون کے لیے مخصوص ہوجاتا ہو جو سپاہی کا پیشہ اختیار کرتے ہین اور جن کا یہ کام ہوتا ہو کہ جب ملک کو ضرورت ہو لڑین۔ اس کے صلہ مین اُن کو ملک کی جماعت تنخواہ دیتی ہو۔ اس طریقہ سے ملک کے جو افراد بچ جاتے ہین وہ اپنی مرضی کے مطابق کوئی نہ کوئی پُرامن پیشہ اختیار کرلیتے ہین۔ اس تبدیلی سے ایسے اہم نتائج برآمد ہوتے ہین جن کو ہم سر دست گنوا بھی نہین سکتے۔

یہ بتایا جاچکا ہو کہ وہ اہم تبدیلیان جن سے انسان جھونپڑون اور غارون مین رہنے کے بجاے

محلوں اور شہروں میں رہنا اختیار کرتا ہے اور جہالت اور قعر مذلت میں گرنے کے بجائے سائنس میں معلومات حاصل کرتا ہے اور عناصر کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کی قدرت اللہ عزوجل نے اپنی عنایات سے صرف انسان ہی کو عطا کی ہے۔ اور دوسرے درجہ کی قدرت خالق اکبر نے انسان کو گویائی کی عطا کی ہے جس سے ہم اپنے خیالات کا نتیجہ بات چیت کے ذریعہ ایک دوسرے پر ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ تو صاف ظاہر ہے کہ جب سوسائٹی کی ترقی زبانی روایات پر منحصر ہوگی تو ضرور ہے کہ اسمین بہت سی رکاوٹیں ہوں۔ کہنے والے کے خیالات سننے والا حرف بحرف یاد نہیں رکھ سکتا اور اسی وجہ سے اس میں لغزش کا اندیشہ ہے۔ یہ تو عموماً پایا گیا ہے کہ جب تک فن تحریر ایجاد نہیں ہوا تھا علم نے بہت سست رفتار سے ترقی کی ہے۔ فن تحریر سے گذشتہ نسلوں کے متعلق مقررہ جیتے ہوے اور اصلی حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ جب یہ بیش بہا فن معلوم ہوگیا تو یقیناً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ترقی اور بقاے علم کی بنیاد پڑگئی۔ پرانی تحریریں لوگوں کے پاس سے نکلیں اور ان کو حفاظت سے رکھ دیا گیا تاکہ وہ ضائع نہ جاسکیں۔ یہ تحریرات مختلف لوگوں کی نظروں سے گذریں اور رفتہ رفتہ تبادلۂ خیالات سے اچھی طرح سمجھ لی گئیں۔

فن تحریر سے شدید تبدیلیوں کے خلاف ایک روک تھام قائم ہوجاتی ہے۔ ایسے شدید تغیرات سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں بہت واقع ہوتے ہیں جن سے تمام علوم کے ثمرات اس طرح ضایع ہوجاتے ہیں جیسے آندھی سے درختوں کے پتے۔ مثال کے طور پر یہ سمجھ لو کہ انسان کے ابتدائی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی قوم نے فنون میں خاطر خواہ ترقی کی تھی اور اُس قوم کو کسی طاقتور اور کثیر التعداد قوم نے (گو یہ قوم بہ نسبت مفتوح قوم کے علوم سے بے بہرہ تھی) فتح کرلیا۔ تو صاف ظاہر ہے کہ اس حالت میں وحشی اور جاہل فاتح مفتوح قوم کے علوم و فنون کی کوئی قدر نہ کریں گے۔ اگر مفتوح قوم کے لوگوں کو اپنے علوم و فنون میں سے کچھ زبانی یاد بھی رہا تو وہ رفتہ رفتہ اُن کی یاد سے محو ہوجائے گا۔ اور اگر اُن کے اسلاف نے کارآمد معلومات کو لکھ کر رکھ لیا تھا۔ اِن مسودات پر گو کچھ عرصہ کے لیے توجہ نہ کی جائے اور حوادث زمانہ سے محفوظ رہ سکے تو کوئی نہ کوئی ایسا خوش نصیب وقت ضرور آئے گا کہ غالباً اُن پر توجہ کی جائے گی۔ ایک واقعہ ایسا پیش آبھی چکا ہے یعنی یہ کہ جس وقت سلطنت روم معراج کمال پر پہونچ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور اُس کو دوسرے وحشی گرہ اور قبائل نے آکر فتح کرلیا تو روم کے علوم اجتہاد کے قابل ستائش مسودات جو اسلاف سے

بچ کر پرانے کتب خانون مین محفوظ رہ گئے تھے ان کی آجکل بیحد قدر ہو رہی ہو اس بات کو ایک مستند مقولہ سمجھ لینا چاہیے "کہ کوئی قوم اس وقت تک کارآمد علوم یا تمدن مین کوئی بڑی ترقی نہین کرسکتی جب تک کہ کتابت کی ایجاد سے اُن کی ترقی کے ذرایع مستحکم اور مستقل طور سے محفوظ نہ کرلیے گئے ہون"

ایک دوسرا انکشاف بھی ایسا ہی ضروری ہو جیسا کہ فن تحریر۔ یہ انکشاف پندرھوین صدی علیسوی مین ہوا ہو۔ اس سے مراد چھاپے کی ایجاد ہو۔ ہاتھ سے لکھنے کا کام ہمیشہ سست، مشکل اور زیادہ صرفہ کا ہوتا ہو۔ جب کوئی کتاب ہاتھ سے لکھی جاتی ہو تو وہ کسی کتب خانہ مین کتابون کے انبار مین رکھ دی جاتی ہو۔ جہان ممکن ہو کہ طالبعلمون کی نظر سے نہ گذر سکے یا جس کو چند ہی لوگ دیکھ سکین اور یہ بھی ممکن ہو کہ یہ کتاب کسی نہ کسی حادثہ کی نذر ہو جائے۔ لیکن چھاپے کی ایجاد سے یہ فائدہ ہو گیا ہو کہ ایک مسودہ سے ہزار کتابین تیار ہو سکتی ہین اور بہت کم وقت مین نصف درجن ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابون کی بھی قیمت سے اس مین صرفہ کم ہوتا ہو۔ جب سے چھاپے کی ایجاد کا شاندار انکشاف ہوا ہو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہر قسم کے علوم خانقاہون کی تاریکی سے روشنی مین لائے گئے ہین اور جامعون مین جہان صرف چند طلبہ دن کی خاص روشنی مین علوم سے بہرہ ور ہوتے تھے اب وہان علوم و فنون کا خزانہ ہر شخص کے لیے کھلا ہوا ہو۔

تواریخ کی تحقیقات کے کام ہون یا سائنس کے یا اخلاقیات سے متعلق ہون یا کسی قسم کی دلچسپیون سے چھاپہ خانہ مین چھاپ کر شایع کیے گیے اور اُن کی اشاعت مشرق سے مغرب تک کردی گئی۔ اس کام مین اشاعت کرنیوالون کا فائدہ بھی ہوتا ہو۔ اس طریقہ سے کارآمد فنون کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے یا بڑی بڑی علمی معلومات کے اتلاف کا خدشہ چند ہی سال مین جاتا رہا۔

الغرض چھاپہ ایک ایسی چیز ہو جس سے انسان دوسرے ملک کے آدمیون کو ضروری باتون سے ایک ہی وقت مین آسانی سے مطلع کرسکتا ہو خواہ وہ باتین اچھی ہون یا بری ضبط تحریر مین آئی ہوئی باتون کو انسان بہت آسانی سے سمجھ بھی سکتا ہو۔ تحریر اور تقریر مین بہت بڑا فرق ہو۔ مقرر کی باتین صرف وہ ہی لوگ سن سکتے ہین جو وہان موجود ہون۔ مگر ایک کتاب کے مصنف کا خطاب صرف موجودہ نسل ہی سے نہین ہوتا بلکہ آنے والی نسلین بھی مصنف کے خیال سے آگاہ ہو سکتی ہین اور یہ نسبت مقرر کے کسی کتاب کے مصنف کا درجہ بڑھا ہوا ہو۔

اس مضمون مین عام تمدن کی تدریجی ترقی کو دکھانیکی کوشش کی گئی ہو جو قومون نے گذشتہ

پیدا ہوتا ہی۔ جیسے جیسے قوانین یا تعلیم گاہون مین یا اور دوسرے معاملات مین جو مفید ہون یا نہون ترقی یا تنزل ہوتا رہتا ہی۔ ویسے ویسے انسان ترقی اور تنزل کے اسباب سے نتیجہ نکالتا رہتا ہی کہ آخر اس ترقی اور تنزل کا سبب کیا ہی انسان کو اللہ عزوجل نے اسی لیے قوت تمیز عطا کی ہی اور یہ قوت غیر فانی قوت ہی اور اسی قوت کی بنا پر وہ تدریجی ترقی کرتا رہتا ہی۔ برخلاف اس کے یہی قوت جانورون کو بھی قدرت کی طرف سے عطا کی گئی ہی مگر وہ صرف اُس سے اپنی حفاظت اور تلاش معاش کا کام لے سکتے ہین اور یہ باتین ان مین روز ازل سے چلی آتی ہین اور اسی طرح ابد تک رہین گی۔

محمد نجم الغنی قریشی دار الترجمہ حیدرآباد دکن

خدائے ذوالجلال

اِک یہودی نے کیا حضرت علی سے یہ سوال
کس زمانہ مین ہوا تخلیق رب ذوالجلال

آپ نے یہ فقرۂ گستاخ جب اُس سے سُنا
سُرخ غصّے سے رُخ پر نور حضرت ہو گیا

پھر کہا اے بیخبر از کُنہ ذاتِ کبریا
کیا ضرورت اسکو پیدائش کی تھی وہ ہی خدا

وہ مسبب تھا سبب جس وقت مین کچھ بھی نہ تھا
وہ ہمیشہ سے یونہین موجود تھا کوئی نہ تھا

غیر محدود اُسکی ہین ساری حدین تو کر یقین
ابتدا انتہا اُس پاک کی کچھ بھی نہین

تھا ازل سے پیشتر ہوگا ابد کے بعد بھی
جان لے ہر ایک حد مین آخری حد ہی وہی

سُن کے حضرت سے صفاتِ ذاتِ پاک کبریا
صدق دل سے موسوی آخر مسلمان ہو گیا

حکیم جگر صدیقی زمیندار بسوان

طاؤ (چینیون کا خدا)

مین نے مذاہب قدیمہ اور کتب مقدسہ قدیمہ کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا تو یہ خیال نہ تھا کہ اہل چین کے متعلق بھی کچھ حالات معلوم ہون گے۔ لیکن جو بندہ یابندہ سن عیسوی سے ۶۰۰ برس پہلے یعنی آج سے تقریباً ڈھائی ہزار برس سے پہلے جو توحید چین مین مانی جاتی تھی اُسے ایک فرانسیسی نے اپنی زبان مین لکھا ہے اور پھر اُس کا ترجمہ انگریزی مین ہوا ہے۔ میرا خدا ایک میگزین موسومہ آریہ جلد ا صفحہ ۱۰ ہے۔ ترجمہ مین خیالات کا رد و بدل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی جہانتک معلوم ہوتا ہے چینیون کی توحید جو بودھ مذہب کے پہلے تھی مسلمانون کی توحید سے الگ نہین ہے۔ اہل شریعت ہمہ از اوست کہتے ہین شیخ محی الدین عربی فرط شوق یا مکاشفات روحی سے ہمہ اوست کی طرف جھکے اور اکثر اولیا، اللہ کا یہی مسلک رہا۔ حضرت مجدد الف ثانی ہمہ اوست سے پھر ہمہ از اوست کی طرف پہونچے اور طریقت اور شریعت کو ملا دیا اُن کا قول تھا کہ جو اولیائے کرام ہمہ اوست تک رہ گئے اُن کے کمالات کم تھے وہ شل میرے ترقی کرتے تو وہ بھی اس حد تک پہونچتے۔ ان مباحث کا مقام وحدت وجود اور وحدت شہود ہے۔ علم ظاہر مین اسے زیر بحث نہ لانا چاہیے۔ روحانیات اور باطنیات سے اسے تعلق ہے لیکن ان باتون کا لکھنا یہان اس لیے ضروری سمجھا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ چینیون مین بھی فلسفۂ الٰہی ویسا ہی تھا جس طرح مسلمانون مین ہے اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ وحدانیت کا سمجھنا فطرت انسانی مین داخل ہے۔ تمام علوم مین ترقی ہوئی مگر فلسفۂ الٰہیات ویسا ہی اب بھی ہے جیسا پہلے تھا ہر قرن اور ہر زمانہ مین انسانی دماغ خدائے واحد خالق عالم کو مانتا رہا ہے۔ دلیل اور برہان کی ضرورت نہین ہے۔ دہریت فتور دماغ ہے۔ شرک البتہ قابل اصلاح ہے کہ وہ فتور دماغ نہین ہے امراض قلبی و دماغی سے ہے۔ اور اس مرض کی دوا تعلیم اسلامی ہے مین حکمائے چین کے خیالات مین وحدت وجود اور وحدت شہود دونون کو شامل پاتا ہون۔ اور بہت سے مغلوب الحال اہل سکر مجاذیب فقرا کی بڑ (مقولات لایعنی) کی جھلک بھی پاتا ہون۔ ممکن ہے کہ چینیون مین بھی اس بارے مین اختلاف آرا رہا ہو۔ لیکن اُس فرانسیسی نے اپنے طور پر جو لکھا اُس مین اس فرق کا لحاظ نہ کر کے سب کو یکجا لکھ دیا۔ مین ترجمہ بعینہ ذیل مین لکھتا ہون اور قرآن مجید کی آیتین اور اقوال بزرگان دین

مطابقت کے لیے جا بجا حاشیہ پر تحریر کرتا ہوں۔ ھُوھلل

طاؤ فی الحقیقت وہی ہے جسے تم غیر ملک والے اللہ کہتے ہو طاؤ واحد ہے۔ قل ھو اللہ احد

وہی ابتدا ہے وہی انتہا ہے۔ ھو الاول و ھو الآخر

وہ تمام چیزوں کو محیط ہے۔ واللہ علی کل شئی محیط

اور اُس کی طرف تمام چیزوں کو بازگشت ہے۔ الیہ المرجع والمآب

طاؤ کا کوئی نام نہیں ہوسکتا۔ محض اس لیے کہ وہ ایک ہے۔ وہ یعنی اور کچھ نہیں۔ دکھو طاؤ کیا تم نہیں سمجھتے۔ اچھا سنو۔ وہ ایک حقیقت محض کا وجود ہے جس کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے۔ ہمارے خیال سے وہ بالاتر ہے۔ اس لیے وہ ہمیں اس طرح معلوم ہوتا ہے گویا کچھ نہیں۔ لا تدرکہ الابصار

ہم جو کچھ سمجھ سکتے ہیں اور جو ہمارے لیے ایک نسبتی حقیقت رکھتا ہے فی الحقیقت وہ ایک مظہر ہے اور یقیناً ایک قطعی حقیقت ہے۔ کیونکہ ہر چیز اُسی حقیقت سے نکلی ہوئی ہے اور اُسی کی طرف اُسے عود کرنا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون وانا الی ربنا لمنقلبون

لیکن جو چیز ہماری آنکھوں کو اصلی معلوم ہوتی ہے وہ فی الواقع اصلی نہیں ہے جسے ہم موجود کہتے ہیں، فی الواقع وہ غیر موجود ہے۔ اور جسے ہم غیر موجود کہتے ہیں اصلی معنوں میں وہی موجود ہے۔ اس طرح ہم بڑی تاریکی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جسے ہم حقیقی تصور کرتے ہیں وہ حقیقی نہیں ہے لیکن حقیقی وجود سے اس کا ظہور ہے کیونکہ حقیقتاً ہمہ اوست۔ اس طرح مخلوق اور غیر مخلوق دونوں طاؤ ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ دنیا ایک آواز ہے جو انسانی مخارق کے مُنھ سے نکلتی ہے۔ اور یہ خیال قابل توضیح نہیں ہے۔ تمام چیزیں جو حواس سے معلوم ہوتی ہیں اور تمام خواہشیں تمھارے دلوں کی غیر حقیقی ہیں۔ طاؤ آسمانوں اور زمین کا باعث ہے۔ ھو الذی خلق السموات والارض وما بینھما

ایک نے دو بنایا۔ دو نے تین بنایا۔ تین نے میریاڈ کو بنایا اور میریاڈ پھر عود کرے گا ایک میں اول ما خلق اللہ نوری

تم جانتے ہو کہ درخت۔ پھول۔ پرند۔ سمندر۔ صحرا۔ پہاڑ۔ روشنی اور تاریکی۔ حرارت اور برودت دن اور رات۔ جاڑا اور گرمی۔ اور تمھاری زندگی ان سب کی۔ ۔۔ دیگر گھل کر بقا میں ملجائیں گے۔ انسان

الذی جعل لکم الارض مھدا وجعل لکم فیھا سبلا والذی نزل من السماء ماء بقدر فانشرنا بہ بلدۃ میتا والذی خلق الازواج کلھا

تاریکی سے باہر نکلتا ہے۔ | یوم تکون السماء کالمھل　　وتکون الجبال کالعھن |

روشنی مین ذرا ہنستا بولتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے لیکن ان سب تبدیلیون مین وہی واحد ہے جو خود کو

ظاہر کرتا ہے۔ طاؤ سب مین ہے تیری روح بغور دیکھ تو طاؤ ہے | وفی انفسکم افلا تبصرون　　قل الروح من امر ربی |

غلطی نہ کرو۔ تم جو دیکھتے ہو اس مین طاؤ ہے۔ | ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست |

لیکن اُس شے مین وہ نہین ہے جسے تم دیکھتے ہو۔ یہ خیال نہ کرو کہ تمھاری آنکھون کو طاؤ دکھائی دیگا

طاؤ تمھارے دل مین خوشی بنکر نہین آتا اور نہ طاؤ تمھاری آنکھون سے وہ آنسو پوچھتا ہے جو مصیبت

مین بہتے ہین کیونکہ تمام ولولے اضافی اور غیر اصلی (فانی) ہین۔

دو دیئی

دو دیئی کا ذکر سنو۔ یہ عدم مخالفت ہے اُس اختیاری حرکت کی جو تم مین پیدا ہوتی ہے جیسا کہ طاؤ نے

اُسے پیدا کیا ہے آدمی اُسوقت آدمی ہے جب اپنی زندگی کو محض طاؤ کے حسن سے سمندر کیطرح جوش | مرضی لی از ہمہ اوست |

مارنے اور کلیون کی طرح کھلنے دے۔ ہر آدمی مین خواہش اُس حرکت کی ہے جو طاؤ سے شروع ہوتی ہے

اور طاؤ تک واپس لے جاتی ہے۔ لیکن آدمی اپنی خواہش اور شہوات سے اندھا رہتا ہے وہ جھکتا ہے

غیر اصلی کی طرف۔ وہ ایک واحد کی خواہش مین بہت سی چیزون کی خواہش کرتا ہے بعض وقت وہ

ذی عقل اور اچھے ہونے کی خواہش کرتا ہے اور یہ خواہش سب سے بدتر ہے۔

تنہا علاج یہ ہے کہ اُدھر واپس جانے کی فکر کی جائے جہان سے آتا ہوا۔ طاؤ ہم مین ہے۔ طاؤ

اطمینان قلب ہے۔ یہ خواہشون کے مارنے سے حاصل ہوتا ہے حتیٰ کہ بھلائی اور عقل کی بھی خواہش کی

جائے۔ وہ لوگ جو جانتے ہین کہ طاؤ کیا ہے کہتے نہین اور جو لوگ کہتے ہین وہ جانتے نہین | آنرا کہ خبر شد خبرش باز نہ آمد |

مین تم سے نہ بتاؤن گا کہ طاؤ کیا ہے۔ یہ تمھارا کام ہے کہ تمام خواہشات اور تمناؤن سے الگ ہو کر تنہائی مین

ہو کر اور تمام غیر اصلی کوششون سے الگ ہو کر اُسے دریافت کرو۔

| گوش بند و لب بہ بند و چشم بند　　گر نہ بینی سر حق بر من بخند |

طاؤ کے پاس ہر ایک بغیر کوشش کے ایک لمحہ مین ایسی روانی اور خموشی کے ساتھ پہنچیگا جسطرح

بحر وسیع کی روانی ہے اسی طرح تم طاؤ کے پاس جاؤ گے۔ اور جب تم جاؤ گے تو آپ سے نہ جانو گے۔ کیونکہ

تم خود طاؤ ہو جاؤ گے۔ کوئی طاؤ کا احاطہ نہین کر سکتا۔ غیر فانی روشنی روح کی ہم سب مین جلوہ گستر ہیگا

خیال بھی نہ کرو کہ انسانی کج فہمی ایسی عظیم یا زبردست ہو سکتی ہے۔ واجب الوجود طاؤ ہم سب مین بستا ہے۔ قاتل، بیوہ زن فاحشہ مین اور شاعرون مین وہ یکسان رہتا ہے۔ سب اصل مین اسی طرح یکسان ہین جس طرح پہاڑ کے دو ذرے۔ کوئی شخص طاؤ سے ہمیشہ کے لیے جدا نہو گا۔ کیونکہ طاؤ سب مین ہے۔

اُن کے گناہ غیر حقیقی مثل کُہرے کے ہین۔ وہ بُرے نہین ہو سکتے اور نہ اچھے ہو سکتے۔ مجبوراً اُن کو طاؤ کی طرف جانا ہے جسطرح قطرۂ آب سمندر کی طرف جاتا ہے۔ کوئی جلد جائے گا اور کوئی بتاخیر جائے گا۔ لیکن ایسا ہونا ہے۔ طاؤ نہ اچھا ہے اور نہ بُرا۔ طاؤ حقیقی (واجب الوجود) ہے۔

طاؤ تنہا ہے۔ غیر حقیقی چیزون کی زندگی غلط خیالات اور غلط تعلقات کی زندگی ہے جسکا وجود خود اختیاری نہین ہے اور جو بڑی غلطی کا سبب ہوتی ہے۔ سب سے الگ ہو کر اچھے ہونے کی خواہش نہ کرو۔ اور نہ اپنے کو بُرا کہو۔

کوشش سے بے نیاز اُس طاقت سے جبراً انجام پانے والی شے جو تم مین ودیعت کی گئی ہے وہ موت ہے جو آکر رہے گی۔ نہ اچھے۔ نہ بُرے، نہ چھوٹے ہو۔ نہ بڑے۔ نہ نیچے۔ نہ اونچے تب تم درحقیقت تنہا رہو گے گو دنیا کی معمولی خواہش کے مطابق کہا جاتا ہے کہ تم فنا ہو جاؤ گے۔ جب تم عالم ظاہر سے الگ ہو جاؤ گے اور تمام لذات و خواہشات سے دور رہو گے تو تم اپنی ہی حرکت سے چلو گے اور تم کو امتیاز اس کا نہ رہے گا۔ یہ حرکت زندگی کا سچا اصول ہے۔ اور یہ حرکت آزادانہ بلا تامل طاؤ کی جانب ہو گی۔ اور ایسی آسانی سے بلا امتیاز ہو گی۔ جیسا کہ ابر کے بادلون کا پھٹ جانا۔

حصول عقل کی پیاس کا ذکر نہ کرو۔ بہت جاننے کی خواہش نہ کرو۔ کیونکہ اسی طرح رفتہ رفتہ بذریعہ الہام تم جاننے کے قابل ہو سکتے ہو۔

العلم حجاب الاکبر

علم جو کوشش کرنے سے حاصل ہوتا ہے، غیر طبعی ہوتا ہے۔ اور طاؤ سے دور لیجاتا ہے۔ بالخصوص مسرت کے لیے بہت فکرمند نہ رہو۔ اور نہ بدقسمتی سے ڈرو۔ کیونکہ اُن مین سے ایک بھی اصلی نہین ہ طاؤ طاؤ نہ رہے گا۔ اگر تم اُسے خوشی یا رنج سے اور نصیب اور بدنصیب سے تعبیر کرو گے۔ کیونکہ طاؤ مکمل اور اس مین اختلافات نہین ہو سکتے۔

پھر جب تم اول اول دودیلی ہو جاؤ گے۔ جسے کہ دنیا کی اصطلاح بد مین فنا ہونا کہتے ہین تو تمھا بھلا ہی بھلا ہو گا۔ اور تم ایک لمحہ مین زندگی سے گذر جاؤ گے۔ اُسی طرح خموشی اور طبعی طور سے جسطر

تمھارے سامنے بحر وسیع کی زندگی ہی۔ تمھاری چین مین کوئی انخلل انداز نہوگا۔ تمھاری نیند بغیر خواب کے اور تمھارا جاگنا بغیر ترددات کے ہوگا۔ تم طاؤ کو تمام چیزون مین دیکھوگے اور تم بھی موجودات مین شامل رہوگے۔ تم تمام نیچر کے ساتھ اپنے کو اسی طرح مانوس پاؤگے جس طرح اپنی ذات کے ساتھ مانوس ہو شب و روز گویا وسرا۔ حیات و ممات کی تبدیلیون کو اطمینان سے طے کرتے ہوے ایک دن تم طاؤ مین جا داخل ہوگے جسمین کوئی تبدیلی نہین۔ اُس سے تم بالکل پاک ایک مرتبہ جسطرح نکلے تھے اُسی طرح تم اُس کے پاس عود کروگے۔

محبت

تھین معلوم نہین کہ محبت کیا ہی۔ اور محبت کرنا کیا ہی۔ مین بتاتا ہون محبت طاؤ کا رتھم ہی مین نے تم سے کہا کہ تم طاؤ کے پاس سے آئے ہو۔ اور طاؤ کے پاس تم جاؤگے۔ عورت اپنے کو تم سے چھپاتی ہی تم سمجھتے ہو کہ دہین تک انتہا رتھم ہی۔ لیکن جب وہ عورت مل گئی اور تم اُس کے مس سے متاثر ہو چکے تو تم کو معلوم ہوگا کہ رتھم اب بھی تم مین بحالت بیقراری موجود ہی۔ اور تھین معلوم ہوگا کہ سکون کے لیے تھین آگے بڑھنا چاہیے۔ اسی کو تم محبت کہتے ہو۔ اگر تم کہو تو نام مین کیا رکھا ہی؟ مین اُسی کو طاؤ کہتا ہون۔

حسن زن طاؤ کی غیر صوری حُسن کا ایک موہوم پرتو ہی۔ دلولہ جو وہ تم مین پیدا کرتا ہی یا محویت جو اس حُسن سے تم مین پیدا ہوتی ہی یقین کرو کہ وہ محض طاؤ کا رتھم ہی جسے تم محسوس نہین کرتے۔ عورت مین اپنی خوشی تلاش کرو کہ وہ مظہر ہی طاؤ کا تمھارے لیے۔ وہ نیچر کی سب سے صاف تر صورت ہی جس مین طاؤ جلوہ گر ہوتا ہی۔ وہ ایک طاقت ہی جو طاؤ کا رتھم تم مین پیدا کرتی ہی۔ لیکن وہ عورت بجائے خود مثل تمھارے ایک ناچیز مخلوق ہی۔ وہ تمھارے لیے ویسا ہی منتظر ہی۔ جیسا کہ تم اُسکے لیے ہو۔ یہ طاؤ کا ظہور ہی جو غیر محدود اور غیر مادی ہی اور بیخودی کی حالت تمھاری نظر تم پر طاری کرتی ہی۔ یہ ناگفتنی مضمون اُسی حُسن اور مظہر حُسن یعنی طاؤ سے اتحاد محض ہی۔ تمھاری روح نے اپنے محبوب طاؤ کو چھوڑا ہی جس سے وہ پہلے متحد تھی۔ اور وہ پھر اُس معشوق سے ملنا چاہتی ہی۔ طاؤ سے اتحاد مطلق یا محبت غیر محدود نہین ہی معشوق سے اس طرح ایک ہوجانا کہ بالکل وہ تمھارا اور تم اُسکے ہوجاؤ یعنی اتحاد ایسا مکمل اور دائمی ہو کہ زندگی یا موت جدا نہ کرسکے ایسا باامن اور منزہ اتحاد ہی کہ خواہش تم مین پیدا نہو سکے کیونکہ اعلیٰ خوشی حاصل ہوگئی ہی اب صرف امن مقدس مطمئن اور روشن ہی کیونکہ طاؤ بے پایان و احدا بدی اور بالکل منزہ ہی۔　　ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپوری

رازِ حیات

(۱)

کس نے دیکھی تازگیِ گلشنِ عالم کبھی — جورِ گلچین کا کبھی ماتم خزان کا غم کبھی
ناز سے عیش و تنعم مین کبھی سر ہی بلند — پیش ناکس تنگدستی سے ہی گردن خم کبھی
ہی کبھی ایذا سے دردِ حسرتِ جاہ و نمود — اور نکلتا ہی کسی گلرو کی جفا سے دم کبھی
نذرِ سیلابِ بلا ہی بوریاے فقر گاہ — جانستان ہی تاج کے خونریز تختِ جم کبھی
ہیچ آنکھون مین کبھی دولت ہی صحت کے بغیر — تندرستی مین تہی دستی کا درد و غم کبھی
ہی کبھی علم و ہنر پامالِ جورِ مسکنت — داغِ رسوائی سے بارِ جان زر و درہم کبھی
دل پہ رنجِ بیکسی سے ہی کبھی غم کی گھٹا — صحبتِ ناجنس و دونِ نازک مین ہی سم کبھی
کم زری سے کثرتِ اولاد اک بارِ دوش — آنکھ داغِ حسرتِ فرزند سے پرنم کبھی
الغرض حاصل نہین انسان کو اک دم قرار — دل سے مٹتا ہی نہین یہ رنجِ بیش و کم کبھی

کیا اِسی بے رنگ و بو گلشن کا دم بھرتا ہی تو؟
کیا یہی وہ زیست ہی جسکے لیے مرتا ہی تو؟

(۲)

آہ دلا دون تجھ کو یاد اے مسلمِ نسیان شعار — بھول بیٹھا ہی اگر رازِ حیاتِ مستعار
زندگی سمجھا ہی تو اپنی بقاے فرد کو؟ — عمرِ دو روزہ پہ ہی تیری امیدون کا مدار؟
حرف بے معنی ہین اے نادان یہ مَن مرا تجھے — ہین امانت دوست کی ہو مال و زر یا جانِ زار
زندگی ہی چھوڑ جانا دہر مین نقشِ وفا — اور مٹنا "کسی" پر شبنم و پروانہ وار
تجھ کو جینا ہو تو جا، جگنو کی دلسوزی کو دیکھ — ظلمتِ گیتی مین ہے تا حدِ امکان نور بار
سیکھ جینے کا ہنر جا کر گلِ پژمردہ سے — رنگ و بو سے کر گیا گلزار دشت و کوہسار
زیست سمجھا ہی جسے تو، ہی رحیلِ کاروان — موت کہتا ہی جسے تو، ہی فقط نقلِ دیار

بارہا چون سبزہ برو ئیدی درونی تا ابد — ہفصد و ہفتاد قالب دیدی و بینی ہزار
راہ مین اے آبجو ہو لاکھ حائل سنگِ کوہ — بحرِ مقصد سے تجھے ہونا ہی اک دن ہمکنار
ہی زوالِ شام سے رازِ عروجِ صبح صاف
دل نہ ہار اے مہرِ تو، رہ یون ہی سرگرمِ طواف

مُسلم

جذباتِ ہاشمی

کرب، سُنتا ہون ترے عشق کے آئین سے ہی
بدگمانی نہ مجھے اِس واسطے تسکین سے ہی
بھید یہ تیرا ملا اے ہمہ تن حسنِ نشاط
گر تجھے ہی تو علاقہ دلِ غمگین سے ہی
کی تصور نے ترے آپ ہی ایجادِ بہشت
عشق بالا ہوسِ صنعت و تزئین سے ہی
ہم کو عصیان سے ملا ذوقِ انابت یعنی
چہرۂ زہد کا غازہ مئے رنگین سے ہی
روکے لیتا ہی زبانِ ہاشمی احساسِ قصور
ورنہ فریاد بھی پیرایۂ تحسین سے ہی

سیّد ہاشمی فریدآبادی

اُس سے کس نے کہدیا؟

وہ نادرۂ حسن، شباب کے کس بل مین جھومتی جھامتی، مست رفتار ہوتی ہو تو سیکڑون دل خود بخود پامال ناز و انداز ہوجاتے ہین لیکن اُس سنم پیکر کو اپنی مستانہ ادا کے انہماک و استغراق سے اتنی کہان فرصت کہ یہ معلوم کرنے کی پروا کرے کہ اُس کی نگاہ فتان نے کتنون کو قص مذبوح مین مبتلا کردیا اور کتنے اُس کو للچائی نظرون سے دیکھا کیئے!

دنیا کے جھنجھٹ کے شور و شغب مین، اغراض و مقاصد کے تگ و دو کرنے والون کے ہجوم مین، مین نے ہمیشہ دیکھا اور وہ بھی اس طرح کہ مین رعب حسن سے آڑ ہی مین رہا کہ وہ بیباکانہ انداز سے، بے غل و غش، اپنی ناز آفرینیون اور کافر ماجرائیون کا جلوۂ بے پروا دکھاتی، قصر ہوش و حواس منہدم کرتی چلی جاتی، نگاہ غلط انداز اکثر اس کے نازک خوبصورت پیرون کے بلاگردان رہتی، اور شاہدان قدرت کو بے خبر موقعہ تحسین دیتی!

دھڑکتے دل کو سنبھالتے، ہاتھون سے دبائے مین نے بے محابا استفادۂ نظارہ کی جرأت کی، وہ بت ستمگر اپنی کمسنی اور اطراپنے کے پیرون کی ٹھمکیون سے ہزارون فتنے جگاتی محشر برپا کرتی نکلی، مین نے جھجکتی نظرون سے اُس کے سنہری بھرے بھرے رخسارون کو دیکھا، اُس بت طناز نے اچانک میری بزدل نظرون کا مقابلہ کیا اور فوراً میری طرف سے گھونگٹ کھینچ لیا، مین بیشک اُس پر مرتا ہون لیکن ہائے اُس سے کس نے کہدیا؟

اب وہ ستم آگین جب کبھی مجھ حرمان نصیب کے سامنے سے گزرتی ہو تو اسی طرح ایک ذرا سی جھپ دکھا کے اپنے حسن صبیح کو چھپا لیتی ہو اور مجھے اُس سے زیادہ تڑپا دیتی ہو، لیکن ہو تعجب کہ اُس سے کس نے کہدیا؟ اور دوسرے اُس کی اس فراخدلی سے بے جھجک اکتساب فیض کرتے اور میرے زخمون پر نمک پاشی کا باعث ہوتے ہین!

تو کیا اپنی ہر اُمنگ کو، اپنی ہر تمنا کو اسطرح گھونٹنا چاہیے کہ بے نیازی کی تڑپ سے دل بیچین نہو اور کیا اسقدر احتباس نفس کیا جائے کہ کوئی کسک نہ ہو؟

محمد ظفر

پاسِ محبّت

لارڈ بائرن کی نظم "آل فارلو" کا یہ ترجمہ تو نہین ہے، لیکن مضمون قریباً وہی ہے۔ یورپ کے سفر کے دوران مین فلورنس سے پیسا جاتے ہوے ۱۸۲۱ء مین لارڈ بائرن نے یہ نظم لکھی تھی جو انگریزی ادب مین ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور انگریز نقادانِ سخن اُس کے کلام مین اس کو اور ایسی ہی دوسری مختصر نظمون کو بہتر سمجھتے ہین۔ مین نے پچھلے سال یہ لکھی تھی آج اتفاق سے اس کا مسودہ نظر سے گذرا، تو جناب اطہر ہاپوڑی سے اصلاح لیکر بغرض اشاعت ارسال خدمت کرتا ہون۔

گرچہ ہر دل مین ہوا کرتی ہے شہرت کی طلب
لیکن اس کا نہ مجھے شوق نہ اس سے مطلب

باغِ شہرت کے لگانے کو ہین ایامِ شباب
جن مین سب طرح کے ہوتے ہین مہیا اسباب

جب جوانی ہی مین ثمرہ نہ ملا شہرت کا
وقتِ پیری جو ملا بھی تو ہے پھر فائدہ کیا

گلِ پژمردہ پہ کرتی نہین شبنم تاثیر
گرچہ غنچے کے لیے ایسی ہے جیسے اکسیر

تجھ کو، اے شہرۂ آفاق! کرون کیا لیکر
دل مین باقی نہین اب میرے ہوائے دلبر

تھا جو شہرت کا طلبگار تو مقصود یہ تھا
کہ پہونچ جائے کسی طرح وہان تک چرچا

تاکہ شہرت کو مری سُن کے وہ مسرور بھی ہو
اُس کی محفل مین مرے شوق کا مذکور بھی ہو

میری شہرت بھی خوشی مین ہے اُسی کی پنہان
حالتِ زار مری جسکو ہے مدت سے عیان

اُس کی آنکھون مین نہان ہے مرا رازِ شہرت
وہی قدسی مری وحدت ہے وہی ہے کثرت

اُس کی درگاہ مین مقبول مری اُلفت ہو
یہ اگر ہو تو نہ پھر اور کوئی حسرت ہو

ولی احمد خان (رجب پور)

سفر حجاز کی مختصر روداد

چوتھی منزل

عبدالقادر سکندر ہمارے معلّم لکھنؤ ہی مین مقیم ہین۔ ان کے بڑے بیٹے حسن سکندر بمبئی مین رہ گئے تھے لہ شوال مین حجاج کے ساتھ جائین گے۔ مکہ مکرمہ مین اُن کی اہلیہ اور اعزائے خسرالی موجود تھے اور اُنھون نے اپنے سالے یوسف کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دیدیا تھا گدہے والا پہلے عبدالقادر سکندر کے مکان پر گیا۔ وہان سے حسن کے مکان کا پتہ دیا گیا اور وہین لاکر مجھے اُتارا یوسف موجود نہ تھے اس لیے خرجی کا سامان اُن کے پڑوس مین رہنے والی ایک ہندوستانی بڑھیا کے یہان رکھ دیا اور اپنی بخشش لیکر وہ تو روانہ ہوگیا۔ مین کچھ دیر اُسی بڑھیا کے یہان بیٹھا رہا۔ اُس کے بعد معلّم صاحب کا ایک ملازم آگیا جس نے مجھکو حسن کے مکان مین سامان سمیت پہونچا دیا۔ میرے جیل کے ساتھی میر عبدالعزیز صاحب قنوجی مجھسے پہلے روانہ ہوے تھے اور حسن کی زبانی معلوم ہوچکا تھا کہ وہی اُن کے بھی معلم ہین۔ چنانچہ ذرا دیر کے بعد جب اُن کو میرے آنے کی اطلاع ملی تو وہ خود مجھسے ملنے تشریف لائے۔ وہ بیٹھے ہی تھے کہ یوسف آگئے۔ گدہے کی سواری سے اگرچہ خستگی بہت ہوگئی تھی اور پہلا روزہ بھی تھا مگر شوق زیارت نے ہمت نہ ہاری اور مین معمولی صاحب سلامت کے بعد معلّم صاحب کے ایک کارکن کے ہمراہ زیارت و طواف کعبۃ اللہ شریف کے لیے روانہ ہوا۔ اگرچہ ضروری دعائین جہاز ہی پر یاد کرلی تھین مگر اپنے حافظہ کی خرابی پر مطلع ہونے کی وجہ سے وثوق نہ تھا کہ ہر موقع کی دعا پوری صحت سے اور مقررہ وقت پر پڑھ سکون گا اس لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز کی کتاب زبدۃ المناسک جس سے مین نے دعائین یاد کی تھین چلتے وقت ہاتھ مین لے لی، اور اسی کی ہدایت کے بموجب اپنے رہبر سے درخواست کی کہ باب السّلام سے لے چلین۔ محلہ جیاد سے تقریباً ۳ سو گز کے فاصلہ پر حرم محترم اور باب السلام کچھ زیادہ دور ہے۔ چنانچہ ہم لوگ مختلف گلیون اور بازار کو طے کرتے ہوے باب السّلام پر پہونچے مین دروازہ پر داخلہ کی دعا پڑھتا ہوا حرم شریف مین حاضر ہوا۔ سامنے ہی بیت اللہ شریف پر نظر پڑی تو فوراً دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اُس وقت جو حالتِ دل تھی اُس کا بیان دشوار ہے۔ بیت اللہ شریف کی

زیارت کی ایک مدت سے تمنا تھی گر سمجھتا تھا کہ مجھ جیسے سیہ کار و بدبخت کو جس کی عمر کا بیشتر حصہ لہو ولعب اور عصیان وطغیان مین بسر ہوا ہو یہ دولت کیسے نصیب ہوگی اور اب جو واقعتاً بیت اللہ شریف کی زیارت سے مشرف ہوا تو اللہ تعالے کے کمال فضل واحسان اور غایت لطف وکرم کے احساس نے دل کی عجیب کیفیت کردی۔ اس وقت مین دیر تک دعا مانگنا اور اللہ تعالی کے فضل وکرم پر دلی امتنان ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر میرے رہنما نے جلدی سے ہدایت کی کہ آگے بڑھو اور ساتھ ہی کچھ دعا پڑھوانا شروع کی۔ مین گویا مسحور ہو رہا تھا اور جو حالت ایک عامل کے معمل کی ہوتی ہے بعینہٖ یہی کیفیت میری اپنے رہنما کے ساتھ رہی۔ وہ مجھ کو ساتھ لیے ہوے آگے بڑھا اور باب ابراہیم سے گذرتا ہوا حجر اسود سے کچھ فاصلہ پر کھڑا ہوگیا۔ یہان نیت طواف کرائی گئی۔ پھر حجر اسود کی طرف چلکر گیا۔ استلام کیا اور اپنے رہنما کے ساتھ یکے بعد دیگرے سات بار کعبۃ اللہ شریف کا طواف کیا اور اس اثنا مین جو کچھ وہ باواز لبند پڑھتا رہا مین اُس کی تکرار کرتا رہا۔ طواف کی حالت مین جو ادعیہ ماثور ہین وہ مجھے یاد تھین اور اندر سے دل یہ چاہتا تھا کہ بالکل تنہائی ہوتی۔ حتیٰ کہ کوئی دوسرا طواف کرنے والا بھی نہوتا اور خوب دل کھولکر اور پورے خضوع وخشوع کے ساتھ دعا کی جاتی مگر ایک بے بسی کے عالم مین مین اپنے رہنما کے دوش بدوش انھین الفاظ کو دھراتا رہا جن کا بیشتر حصہ عربی سے ناواقفیت کی بنا پر میری سمجھ سے باہر تھا، لہذا خاتمۂ طواف پر جب ملتزم شریف سے لپٹکر دعا کرنے کا موقع ملا تو مین نے بہت کچھ اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اور جب تک رہنما صاحب نے کئی بار نہ پکارا مین وہان سے نہ ہٹا، باوجودیکہ تمازت آفتاب کی وجہ سے مطاف کی تابش ترقی پذیر تھی ملتزم شریف سے ہٹ کر مقام ابراہیم کو اپنے اور کعبۃ اللہ کے درمیان چھوڑکر دو رکعت سنت طواف ادا کین۔ یہان بھی رہنما نے بہت کچھ عجلت کرنا چاہی گر مین نے نماز کے بعد دیر تک دعا کی۔ پھر رہنما نے ایک اور دعا پڑھوائی اور چاہ زمزم شریف پر لائے۔ در زمزم پر دعا پڑھ کر دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ آب زمزم پیا اور ہاتھون چہرہ اور جسم کے دیگر حصون مین ملا۔ وہان سے نکل کر حرم شریف کے باہر جانے کا قصد کیا۔ باب الصفا پر ہو نکر دعا کے لیے ٹھہرا۔ کچھ لڑکے چاہ زمزم سے نکلتے ہی ساتھ ہولیے تھے۔ اب رہنما صاحب نے ہدایت کی کہ خیرات طواف دو۔ ان لڑکون کو کچھ دیا گیا اُس کے بعد رہنما صاحب نے کچھ اور لوگون کے نام لیے کہ اُن کا حق دو۔ چنانچہ ہلیلون کی ایک گڈی اُن کے نذر کی اور جتنی دیر مین مین نے

دعا مانگی اُنھوں نے اس کی تقسیم خیالی سے فراغت کر لی اور مجھے صفاؔ اور مروہ کے درمیان سعی کرانے کے لیے لیچلے۔ کوہ صفا کے دامن مین جو ایک بے چھت کی محراب دار عمارت ہے اُسکے زینہ اولین پر کھڑے ہو گئے اور کعبۃ اللہ شریف کی طرف منھ کر کے دعا پڑھی اور رہنما کے ساتھ سعی کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ طواف کی طرح سعی کے سانون چکرون مین بھی رہنما صاحب آواز بلند دعائین پڑھواتے رہے اور جب ساتوان چکر مروہ پر تمام ہوا تو وہان جو متعدد حجام بیٹھے ہوے تھے اُن مین سے ایک سے اپنے کاکلون کی ایک جانب کی لٹئین کترواکر اور اُس کی اُجرت دیکر باب السلام کی طرف سے پھر حرم شریف مین حاضر ہوا اور حطیم مین جا کر دو رکعت نفل ادا کین۔ اب گھر جانے کا ارادہ ہوا تو رہنما صاحب نے باب الزیاد پر لیجا کر ٹھہرایا اور کہا کہ آپ کے جاے قیام سے حرم شریف آنے جانے کے لیے یہی دروازہ قریب پڑے گا اور ساتھ ہی صحن حرم مین ایک موقع دکھا کر بتایا کہ بعد عصر یہین عبد القادر سکندر کے حجاج جمع ہو کر روزہ کھولتے ہین اور تم بھی یہین آکر بیٹھنا اور طواف کرنا چاہو گے تو مین ساتھ چل کر طواف کرا دون گا۔ دوپہر کے قریب مین گھر واپس پہونچا اور خستگی رفع کرنے کے خیال سے فوراً لیٹ کر سو گیا۔ کئی گھنٹہ کے بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ حرم شریف مین نماز ظہر ہو چکی ہو گی۔ لہذا وضو کر کے نماز ادا کی۔ اور میر عبد العزیز صاحب کی معیت مین عصر کے وقت حرم شریف مین حاضر ہو کر نماز پڑھی اور صحن حرم کے اُس کونہ مین جو باب الوداع سے قریب ہے حسین اکبر زمزمی کی جا نمازون پر اپنے معلّم کے دوسرے حاجیون کے ساتھ جا بیٹھا۔ حسین اکبر صاحب اور بعض دیگر حجاج سے بھی ملاقات ہوئی۔ افطار و نماز مغرب سے فارغ ہو کر میر صاحب کے ہمراہ گھر واپس آیا۔ اُنھون نے ازراہ محبت میرے لیے کھانے کا انتظام کر لیا تھا لہذا کھانا کھا کر اور حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کر کے پھر حرم شریف گیا اور نماز عشا کے بعد واپس آیا۔ دوسرے دن عمرہ لینے کے لیے جانا تھا، اس لیے میر صاحب نے اپنے ساتھی ظہور کو رہنمائی کی غرض سے میرے ساتھ جانے کی ہدایت کر دی تھی چنانچہ سحری کھا کر مین ظہور کے ہمراہ روانہ ہوا۔ اندھیرا تھا اور مین برہنہ پا۔ راستہ مین بکثرت چھوٹے چھوٹے پتھر پڑے ہوے تھے۔ جا بجا ٹھوکرین کھاتا ہوا نماز فجر کے وقت مسجد تنعیم کے قریب پہونچا۔ یہان جگہ جگہ وضو کرانے والے اور قہوہ خانے نظر پڑے۔ ایک ہلیلہ مین پانی کی ایک صراحی ملتی تھی چنانچہ استنجا کر کے وضو کیا اور مسجد مین جا کر پہلے نماز فجر ادا کی۔ پھر دو رکعت نفل پڑھ کر اور تلبیہ کہہ کے عمرہ کی نیت کی اور

اپنے ساتھی کے ہمراہ واپس ہوا۔ حرم شریف مین حاضر ہو کر طواف کیا اور پھر وہان سے نکل کر سعی کی اور فارغ ہو کر گھر واپس آیا۔ مسجد تنعیم تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ہی اور راستہ ریتلا اس لیے آمد و رفت ہی مین تقریباً تین چار گھنٹے صرف ہوے اور چونکہ اس قدر پیدل چلنے کی عادت نہین کافی خستگی بھی معلوم ہوئی۔ اور رات کو سونے کا وقت بھی کم ملا تھا اس لیے آتے ہی سو رہا۔ ظہر سے قبل اُٹھا نماز حرم شریف مین ادا کی اور واپس آ کر میر عبدالعزیز صاحب سے ملا اور عصر کے وقت اُنھین کی معیت مین حرم شریف مین نماز پڑھی اور پھر اُن کے ساتھ بازار چلا گیا۔ اور مغرب و عشا بدستور حرم مین ادا کی۔

رمضان المبارک مین حرم محترم کا نظارہ عجیب و غریب ہوتا ہی۔ یون تو ایام حج مین حرم شریف کے اندر ہر وقت کافی مجمع رہتا ہی اور خصوصاً نمازون کے اوقات مین ہجوم بہت زیادہ ہو جاتا ہی۔ مگر ماہ صیام کے اجتماع کی جو خصوصیات ہین وہ جُدا گانہ امتیاز رکھتی ہین۔ عصر کے بعد ہی سے جدھر دیکھیے حرم شریف مین لوگ جمع ہین۔ کوئی قرآن شریف پڑھتا ہی کوئی دلائل الخیرات وغیرہ ورد کر رہا ہی۔ کوئی طواف مین مصروف ہی۔ کعبۃ اللہ شریف کا طواف یون تو تقریباً شب و روز مین ہر وقت ہوتا رہتا ہی۔ دن کو تو کبھی اوقات جماعت کے سوا کسی وقت مطاف خالی نہین نظر آتا۔ رات مین شاید کوئی وقت خالی گذرتا ہو۔ لیکن گرمیون مین ہجوم عموماً صبح اور شام ہی کو رہتا ہی۔ رمضان المبارک کے عمرون کی جو فضیلت ہی اُسکے باعث ماہِ صیام مین عمرہ لانے والون کی تعداد کثیر کے لیے طواف لازم ہی اور جو لوگ دن مین تمازت آفتاب کی وجہ سے یا عمرہ لا کر خستہ ہو جانے کے باعث طواف نہین کرتے وہ عموماً سہ پہر ہی کو طواف کرتے ہین۔ عصر کے بعد جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہی مطاف مین اور مصلون پر ہجوم بڑھتا جاتا ہی۔ حجاج اور اہلِ شہر سب اپنے اپنے مذاق کے مطابق افطار کا سامان کرتے ہین۔ صاحبانِ خیر، ارباب ثروت اور اکثر حجاج کی طرف سے سامان افطار کی تقسیم بھی ہوتی رہتی ہی۔ کہین خُرمے بٹ رہے ہین۔ کہین مٹھائیان۔ کہین تربوز کی پھانکین۔ توپ دغتے ہی لوگ باہم ملکر یا الگ الگ افطار کرتے اور نماز مغرب ادا کرتے ہین۔ نماز کے بعد کچھ لوگ کھانا کھانے گھر چلے جاتے ہین اور جو عشا کے بعد کھاتے ہین رہ جاتے ہین۔ مغرب و عشا کے درمیان گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا فصل ہوتا ہی مغرب کے وقت ہی حرم شریف مین برقی روشنی ہو جاتی ہی۔ لیکن عشا کے وقت تک برقی روشنی کے علاوہ سارے صحن مین جگہ جگہ گیس کے لپ اور رنگ برنگ کی لالٹینین پہونچ جاتی ہین۔ کیونکہ نماز عشا کے بعد

حرم شریف مین جابجا تراویح پڑھی جاتی ہے۔ مغرب کے سوا کل نمازون کے اوقات مین بالالتزام جماعتین ائمۂ اربعہ کے نام سے موسوم مصلون پر ہوتی ہین اور انھین مین لپنے اپنے مسلک یا موقع کے لحاظ سے سب لوگ شریک ہوجاتے ہین اور مغرب کے وقت صرف دو جماعتین حنفی اور شافعی مصلون پر پڑھائی جاتی ہین۔ مگر تراویح کے وقت کثیر التعداد جماعتین کھڑی ہوتی ہین صحن کے اکثر حصون مین آگے پیچھے کئی کئی جگہہ تراویح ہوتی ہے۔ اور ہر جماعت کے لیے علیحدہ روشنی کا اہتمام ہوتا ہے۔ مین چونکہ آخری تاریخون مین پہونچا تھا اس لیے اکثر جگہہ قرآن شریف کا ختم تھا ختم کے لیے خاص اہتمام ہر جماعت کے منتظمین کی طرف سے ہوتا ہے۔ مقام جماعت سے قریب قالین یا دری کا فرش بچھایا جاتا ہے اور اس کے گرد گیس کے فانوس اور خوشنما لالٹینین روشن کی جاتی ہین وسط مین سنگ مرمر کی میزون پر خوشنما گلدان وغیرہ رکھے ہوتے ہین۔ نماز تراویح سے فارغ ہوکر لوگ اس مقام پر جمع ہوتے ہین اور شرکا جماعت کے علاوہ منتظمین کے دوست واحباب اور عام حاضرین حرم شریف مین سے بھی کچھ لوگ شریک ہوتے ہین۔ پھر قاری صاحبان اور قرات کے طلبا ختم پڑھتے اور تبرک تقسیم ہوتا ہے۔ مجھے کئی ختم دیکھنے کا موقع ملا مگر مین آخر وقت تک نہ ٹھہر سکا۔ حرم محترم مین معمولاً بھی کچھ کم روشنی نہین ہوتی۔ گو رقبہ کی وسعت یا سابقہ انتظامات کے لحاظ سے کم ہے کیونکہ سوائے مطاف کے جسکے گرد برقی روشنی کا مالا جگمگا تا رہتا ہے صحن اور دالانون مین ذرا فاصلہ سے روشنی ہوتی ہے۔ لیکن ماہ صیام مین مغرب کے بعد سے ختم تراویح تک تو صحن حرم بقعۂ نور معلوم ہوتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے دالانون مین دن کے سوا بہت کم کوئی بیٹھتا ہے اس لیے وہان روشنی کا بھی کوئی خاص اہتمام نہین کیا جاتا۔

رات کو حرم شریف مین ختم قرآن مین شرکت کی وجہ سے کافی دیر ہوگئی تھی نیز اُسی صبح کو رحمت شاہ سامان کے ساتھ آنے والے تھے اس لیے مین عمرہ لینے نہ جا سکا۔ رحمت شاہ طلوع آفتاب سے پہلے ہی پہونچ گئے۔ سامان نہ آنے کی وجہ سے ابتک احرام نہین کھول سکا تھا۔ کیونکہ جدہ سے روانگی کے وقت کپڑے ساتھ رکھنے کا خیال ہی نہین آیا تھا حسن کے مکان مین جہان مین ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم لوگون کی بسر نہین ہوسکتی تھی اور چونکہ میر عبد العزیز صاحب سے گفتگو کے بعد یہ امر طے پا گیا تھا کہ مین اور وہ ساتھ ہی رہین اس لیے جمعیت بھی کافی ہوگئی تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ پانچ اور آدمی تھے جنمین دو عورتین بھی تھین۔ سامان آنے کے بعد مکان بدلنے کی زیادہ فکر لاحق ہوئی۔ یوسف نے کئی مکان دکھلائے اور بالآخر

اُن کے مکان سے قریب ہی ایک مکان تین گنی پر ٹھہر گیا۔ مکان چھوٹا سا تھا مگر یک منزلہ ہونے کی وجہ سے اُس کی کھُلی چھت پر رات کو آرام لیٹ سکتے تھے اِس لیے غنیمت جانا۔ دو چھُوٹے چھوٹے درجے تھے جن مین سے بڑی کوٹھری مین ہم لوگ رہے اور چھوٹی کوٹھری عورتون کو دیدی گئی۔ میر صاحب کا باورچی خانہ بھی اُسی جانب رہا۔ مین عموماً کسی دوکان ہی مین کھانا کھاتا تھا مگر جب کبھی رحمت شاہ کا جی چاہتا تو وہ ہماری کوٹھری کی صحن مین لوہے کے چولھے پر کھانا پکا لیتے۔ میر صاحب نے ازراہِ شفقت بہت اصرار کیا کہ مین اس سفر مین برابر اُنھین کا مہمان رہون اور چونکہ وہ ہندوستان سے کثیر تعداد مین جنس ساتھ لائے تھے اس لیے اُن کا خیال تھا کہ میرے کھانے کے لیے اُن کو نئی جنس خرید کرنا نہوگی۔ اور جو جنس وہ ساتھ لاے تھے ظاہر ہے کہ اُس کو واپس لیجانا اُن کو منظور نہ تھا لیکن مین نے اسے قبول نہ کیا۔ دوسرے دِن مین پھر عمرہ لینے گیا۔ اتفاق سے پاؤن مین موچ آگئی جس کی وجہ سے طواف و سعی کے بعد سو کر اُٹھا تو کافی تکلیف محسوس ہوئی۔ اُس پر طرہ یہ کہ نئے مکان مین سامان بھی منتقل کرنا تھا۔ خدا بھلا کرے رحمت شاہ کا کہ اُن کی وجہ سے سامان کے منتقل کرنے مین مجکو بہت کم محنت پڑی۔ بھاری اشیا تو حمال نے پہونچا دین اور چھوٹی چھوٹی چیزین رحمت شاہ نے اور مین نے مل کر رکھوائین۔ درد کی تکلیف بڑھ رہی تھی اس لیے مین شفا خانہ چلا گیا جو حرم شریف اور ہمارے جاے قیام کے درمیان راستہ ہی مین پڑتا تھا۔ تین بار شفاخانے گیا مگر دوا نہ لگی۔ اس لیے کہ دو بار تو ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے اور تیسری دفعہ ملے تو فرمایا کہ اپنے مطوف کے ساتھ آؤ۔ رمضان المبارک کا صرف ایک دن اور باقی تھا لہٰذا عمرہ کے لیے جانا ضروری تھا۔ لیکن جب سحری کے وقت اُٹھا تو پاؤن کے درد کی وجہ سے پیدل جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ چنانچہ نماز فجر کے وقت ایک گدھا ۸ قرش مین کرایہ پر لیا اور اُس پر سوار ہوکر عمرہ لینے گیا واپس آکر طواف و سعی کرکے اپنے جہاز کے ساتھی میان نظام الدین کے مکان پر چلا گیا۔ اور انھین کے یہان سوتا رہا۔ رمضان کی وجہ سے اِس کا موقع کم ملتا تھا کہ ان لوگون سے ملتا۔ تاہم ایک بار پہلے بھی اُن کے یہان گیا تھا۔ اہل شہر مین اب تک کسی سے ملنے کی نوبت نہین آئی۔ صرف مشہور دہلی کے تاجر حاجی علی جان کی کوٹھی تک جو حرم شریف سے بالکل متصل ہے جا سکا۔ وہ بھی اس ضرورت سے کہ میرے اور میرے ساتھیون کے پاس جو زر نقد تھا اُسے اُن کے یہان بطور امانت جمع کرانا تھا۔ یہ لوگ بڑے صاحب خیر اور خلیق ہین۔ حجاج کو ان کی ذات سے بہت آرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزاے خیر دین۔ دوسرے دن عید ہونیوالی تھی

اس وجہ سے شام کو بعد عصر تین گولے عام اطلاع کی غرض سے چھوٹے. رات کو چونکہ تراویح اور سحری کی فکر نہ تھی اس لیے مغرب اور عشا دونون نمازون کے بعد بازار کی سیر کی۔ ایک خونچہ والے کے پاس بالائی بالکل ہندوستان جیسی جمی ہوئی دیکھکر فوراً طبیعت راغب ہوئی۔ اور باوجودیکہ کھانا کھاچکا تھا اور صرف قہوہ خانے مین چاے پی رہا تھا لیکن ایک پیالہ لیکر چٹ کرگیا۔ مگر کھانے کے بعد جب اسمین ترشی محسوس ہوئی تو بہت پچھتایا معلوم ہوا کہ دہی پر سے بالائی اُتار کر جمع کی گئی تھی۔ (باقی آئندہ)

نظرے خوش گذرے

علی گڈھ میگزین کا وہ مضمون جسے خداوندان مسلم یونیورسٹی نے ضبط کرلیا تھا، ناظرین نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا اور اس کے متعلق مشفقی مولوی عبدالماجد کی تحریر بھی جو اس بنا پر خاص توجہ سے پڑھنے کے لائق ہو کہ صاحب موصوف سیاسیات اور فرقہ بندیون سے آزاد ہین اور خالص علمی وادبی خدمت مین منہمک رہتے ہین۔ اور یہ امید بیجا نہوگی کہ ایسے تمام اصحاب قلم وجرائد جو کسی خاص مجبوری کی وجہ سے معذور نہون اس معاملہ مین ہم آہنگ وہم زبان ہون گے۔

اگرچہ رشید صاحب نے معافی مانگ کر اخلاقی خودکشی کا ارتکاب کیا ہو اور ذاتی حیثیت مین کسی خوددار اہل قلم کو اُن کے ساتھ اظہار ہمدردی کی حاجت باقی نہین رہی۔ لیکن جہانتک کہ اصول کا سوال ہو سب کا فرض ہو کہ کارفرمایان کالج کی اس مطلق العنانی اور عفریت پرستی سے اپنی بیزاری کا اظہار کرین۔

ہمین معلوم ہوا ہو کہ رشید صاحب کو دہمکی دی گئی تھی کہ اُن پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلایا جائے گا اور روایت تو یہان تک ہو کہ کسی حاکم عدالت نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اُن کے روبرو مقدمہ آئے گا تو یقیناً سزا ہوجائے گی۔ رشید صاحب تو علی گڈھ کے گریجویٹ اور پروفیسر تھے۔ اس لیے کوئی تعجب نہین کہ اُنھون نے اپنے شاگردون کو شرافت نفس کے بجائے مصلحت اندیشی کا سبق دینے کے لیے بے گناہ ہونے کے باوجود اپنی گنہگاری قبول کرلی۔ اور اُلٹے اُن لوگون سے جو درحقیقت خدائی مجرم ہین معافی مانگ لی۔ لیکن اگر کارفرمایان کالج یا بعض خودسر ارکان "اسٹاف" کے

نزدیک حقیقتاً یہ مضمون ان مین سے کسی کے لیے توہین آمیز ہو تو وہ شوق سے رشید صاحب کی جگہ ایڈیٹر الناظر کے خلاف مقدمہ چلا سکتے ہین، جو بحیثیت ایک ادنیٰ تارک موالات ہونے کے وعدہ کر سکتا ہو کہ اپنے تحفظ کی کارروائی بھی عدالت مین نہ کرے گا۔

عبدالماجد صاحب کی ساری تحریر سے اتفاق رکھنے کے باوجود اس بات پر اظہار تعجب کیے بغیر نہین رہا جا سکتا کہ وہ طلبا ے کالج مین عزت، حمیت و خودداری کے فقدان پر حیرت و تاسف کرتے ہین۔ جبکہ اُن کے اساتذہ کے کارنامون کے دونون رُخ اُن کے سامنے موجود ہین۔ یہ چیزین غلامون کی قوم کے شایان شان نہین اور نہ علی گڈھ کا دارالعلوم اس غرض سے قایم ہو کہ طلبا کو انسانیت اور آزادی کی تعلیم دے۔

اہل مکہ کے جو حالات ستمبر و اکتوبر کے مشترکہ نمبر مین لکھے گئے تھے، اُن کی بنا پر میرے پاس بہت سے خطوط آرہے ہین۔ افسوس ہو کہ عدم گنجائش کی وجہ سے مین سب کو شائع نہین کر سکتا۔ انشاء اللہ آئندہ نمبر مین بعض تحریرون کے ضروری خلاصے پیش کرون گا اور اگرچہ مین چاہتا تھا کہ اس بحث پر اپنی تمام تحریرون کی اشاعت کے بعد ان اصحاب کی رایون سے بحث کرون لیکن غلط فہمیون کے ترقی پذیر ہونے کے احتمال سے حتی المقدور حسب موقع ساتھ ہی ساتھ اپنے طرز عمل کی تشریح بھی کرتا جاؤن گا۔

اسی ضمن مین مجھے ایک بات اُن ارباب علم سے دریافت کرنا ہو جو علوم مذہبی کی واقفیت تام رکھتے ہین اور یقیناً میری رہنمائی فرما سکتے ہین کہ ساکنان ارض حرم کو خداوند قدوس یا حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن و حدیث مین کسی جگہ عام احکام شرعیہ سے مستثنیٰ قرار دیا ہو یا دوسرے انسانون کی طرح اُن سے بھی پُرسش اعمال ہوگی اور آخرت مین ثواب کی طرح وہ عذاب کے بھی اسی طرح مستوجب ہون گے جسطرح ہم اور آپ۔ کیونکہ اگر یہ طے ہو جائے تو پھر بحث صرف اس مین رہ جائے گی کہ جو کچھ مین نے لکھا ہو وہ صحیح ہو یا غلط۔ جس کی تصدیق و تغلیط دونون کے لیے مین اپنے غضبناک معترضین سے درخواست کرونگا کہ وہ خود ارض مقدسہ حجاز مین حاضر ہو کر تحقیق فرمائین۔

الناظر کے قلمی معاونین کا کہانتک شکریہ ادا کیا جاے کہ اُنھون نے میری ذرا سی تحریک پر

مضامین کا انبار جمع کر دیا ہی۔ فلسفۂ ازدواج اور اُس کے متعلقہ مضمون نے اِس دفعہ ترتیب بھی بگاڑ دی اور مولوی محمد ظفر صاحب کے دلچسپ مضمون کو بھی شایع نہونے دیا جس کا وعدہ کر لیا گیا تھا اور روداد سفر کی چوتھی منزل کے بھی دو ٹکڑے کرنا پڑے۔ الناظر کا موجودہ حجم یقیناً ناکافی ہی اور جلد سے جلد اسمین اضافہ کا خیال ہی۔ قطع نظر اِس کے کہ اس کی مالی حالت کے ذرا بہتر ہونے کا انتظار کر رہا ہون، ایک دشواری یہ بھی ہی کہ ایڈیٹر کے ذمے جتنے کام ہین وہ انتہائی مشقت کے باوجود تنہا انکی انجام دہی سے قاصر ہی کیونکہ صحت کی روز افزون ابتری کے بدولت اب اگلی سی مشقت کا تحمل بھی نہین ہوتا۔ اپنی بے بضاعتی اور کثیر مالی خسارون کے باوجود مین ایک ایسے شخص کی کفالت کے لیے تیار رہون جو محض تنخواہ کے معاوضہ مین نہین بلکہ دلی ذوق سے خدمت زبان کے کامون مین میرے معاون بننا چاہتے ہون اور کافی استعداد رکھنے کے علاوہ محنتی اور مستقل مزاج بھی ہون۔ اخبار مین بھی اعلان دیا جا رہا ہی لیکن سطور ہٰذا کے ذریعہ سے مین اپنے دوستون اور الناظر کے قلمی معاونون اور قدردانون کو خاص توجہ دلانا چاہتا ہون کہ جو لوگ مجھسے واقف ہین اور اس کام سے دلچسپی رکھتے ہین اُن کی اعانت سے یقیناً میرے مقاصد کی بہت کچھ تکمیل ہو سکتی ہی۔

ساتھ ہی مین الناظر کے قدیم و جدید قدردانون سے یہ بھی توقع رکھتا ہون کہ اگر الناظر ان کی راے مین اِس قابل ہی کہ قایم رکھا جائے اور اُس کی خدمات کا دائرہ وسیع کیا جائے تو ان کو حسب فرصت و موقع اپنے دائرۂ احباب مین الناظر کی اشاعت بڑھانا چاہیے۔

میرے ذہن مین اسکی ترقی اور اس کے ذریعہ اُردو کی خدمت کی متعدد تجاویز ہین جنکو مین انشاء اللہ رفتہ رفتہ پیش کرون گا لیکن سب احباب غالباً اس امر مین متفق الخیال ہونگے کہ نہایت ہی محدود اشاعت کی صورت مین کوئی بڑا کام نہین کیا جا سکتا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۲ جلد ۱۵ | ماہ فروری سنہ ۱۹۲۴ء

حدیث دیگران

(۱)

ایک فاضل و محترم بزرگ تحریر فرماتے ہین :-

"اہل حجاز کے اخلاق کی بابت جو بحث چھیڑی گئی ہی اُس سے عبرت ہوئی شریعت نے زنا کی شہادت کا نصاب چار عادل گواہ مقرر کیا ہی۔ یہ ایک شخص کے لیے ہی۔ ایک گروہ اور ایک ملک کے لیئے کتنے گواہ ہونے چاہئیں۔ شہادت بھی وہ جو عین حالت ارتکاب کا مشاہدہ بیان کرے۔ کالمیل فی المکحلۃ۔ مسلم ہی کہ یہ شہادت آپ کے سامنے پیش نہین ہوئی ہی۔ خود ذات گرامی کا نسخہ اصلاح سے مکمل ہو چکا۔ الناظر اہل ہند کے اخلاق کا معیار بلند کر چکا اس سے فارغ ہو کر اب حجاز کی باری ہی

بیا کہ نوبت شیراز دوقت تبریز ست

الناظر مین دو چار مضمون چھپنے سے اصلاح تو معلوم البتہ یہ نتیجہ نقد الوقت ہی کہ آریہ فتنۂ ارتداد مین اس سے کام لیوینگے عیسائیون اور ہندؤن کے کام آے گا۔ سُست عقیدہ مسلمان بھی مستفید ہون گے۔

طریقۂ اصلاح تو یہ تھا کہ آپ اُس سرزمین مین قیام فرماتے خلوص و خیر خواہی کے ساتھ عمر وہان بسر کر کے نصیحت کرتے اور فضل ربانی سے نتیجے کے امید وار رہتے۔

قرب مکہ کا احساس اس سے ہوا کہ بھیک مانگنے والے لڑکے نظر آنے لگے اُس بقعۂ پاک کے قرب کو تو قلوب نے

اُن تجلیات سے محسوس کیا ہی جو اُس کو گھیرے ہوے ہین۔ اگر تجلیات سے دل منور نہو تو کم از کم پاس ادب اور احترام تو واجب ہی۔ ارض مکہ تجلیات جلال کا مظہر ہی۔ غیرت ربانی سے پناہ مانگنی چاہیئے۔

مناسب یہ ہوگا کہ مضامین کا سلسلہ جاری رکھنے سے پہلے جن عالم ربانی سے آپ کو عقیدت ہو اُن کے سامنے پیش کر کے رائے حاصل کر لیجیے۔ جناب مولوی عین القضاۃ صاحب۔ جناب مولوی سید محمد علی صاحب مونگیری۔ جناب مولوی انور شاہ صاحب دیو بند ہر آئینہ اس پایہ کے عالم ہین کہ اُن پر عقیدہ اطمینان کرے"

تحریر بالا اگرچہ محض "خانگی و ذاتی" تھی اور اس کی یہ حیثیت دو واضح لکیرون کے ذریعہ خاص طور پر نمایان کر دی گئی تھی۔ مگر معاملہ کی اہمیت کے لحاظ سے ضروری ہی کہ ان خیالات کی اشاعت کر دی جائے فاضل موصوف مطمئن رہین کہ جس صورت مین یہ تحریر شایع ہو رہی ہی اس مین اُن کا مقصد دلی فوت نہو گا۔

(۲)

عبد الباطن صاحب عتیقی جونپوری نے "ظنوا المومنین خیراً" کے عنوان سے طولانی تحریر ارسال فرمائی ہی جس کے ضروری اقتباسات بجنسہ درج ذیل ہین :-

"مجھے اس مضمون کو دیکھکر نہایت رنج ہوا اور غالباً ہر مسلمان کو جن کے دل مین حرمین شریفین کی وقعت اور ہمسایہ بیت اللہ شریف کی عظمت ہی ضرور صدمہ ہوگا۔ اس لیے کہ آپ سے جہانتک ہو سکا اہل مکہ کے مسموعی ذمائم و عیوب شایع کرنے مین توقف نہین کیا۔ اور بھولے بھالے مسلمان بھائیون کے دلون کو جنمین ارض مقدس اور دار الاسلام کی قدر و منزلت تھی پژمردہ کرنے مین کمی نہین کی۔ مین آپ کے مضمون کو پڑھتا جاتا تھا اور آپ کے تحریر کردہ عیوب پر میرا خون فرط غیظ سے جوش مارتا تھا۔ کہ آپ کیا دنیا مین کسی فرد بشر کی یہ مجال نہین ہی کہ اُس گھر کے رہنے والون کے عیوب کو بر سر بازار بیان کرے اور ان کی تحقیر و تذلیل کے درپے ہو۔ اُسی ارض مقدس اور اُسی پیاری قوم کی ایک اعلیٰ اور بڑی ہستی ہم لوگون کی ہادی اور ظلمۂ ضلالت سے نور ہدایت کی طرف لانے والی ہوئی۔ کیا عربون کو اس کا فخر و شرف حاصل نہین ہی؟ .... جناب نے ان سب محاسن کو کیون بھلا دیا اور مذمومات کو جو صرف سُنی سُنائی ہی اس قدر لے اُڑے۔ کیا خوب کسی نے زمانہ کی حالت بیان کی ہی،

ستم ہی لاکھ نگاہین پڑین جو ہو اک عیب ہنر ہو لاکھ تو اُن پر نظر کسی کو نہو

.... کرمفرما بالفرض اگر جناب کو اہل مکہ کی اصلاح منظور تھی تو بجائے اس ہجو نامے کے خود وہان جا کر خواہ تقریر سے ہو تحریر سے ہو ہر ممکن صورت سے اُن کی اصلاح کرتے اور ہر صورت مین اُن کی نیک نامی ملحوظ خاطر

رکھئے اور اس پہلو سے گریز کرتے جو ان کی بدنامی کا باعث ہو لیکن بہ طریقہ ہدایت جو آپ نے اختیار کیا ہو یعنی اشتہار بازی ہرگز اصلاح کی صورت نہیں ہو بلکہ اہل مکہ کو بدنام اور اہل ہند کو بدگمان کرنے کے اچھے خاصے اسباب ہیں - ابھی آپ اہل مکہ کی ہدایت کی طرف نہ جائیے - بلکہ آپ پہلے اپنے لکھنؤ کی خبر لیجئے اور اصلاح کیجیے کہ وہ اس وقت اغلام بازی کا مرکز اور زناکاری کا مخزن اور جملہ فاحشات کا معدن ہو رہا ہو - مجھے معاف کیجیے گا پہلے گھر کی خبر لیجیے پھر غیر کو سمجھائیے گا - خودرا نصیحت دیگرے را نصیحت کے مصداق نہ بنئیے . . . .

آپ نے اپنی تحریر میں اہل مکہ کی غیبت کی یا ان پر بہتان باندھا یعنی اگر آپ کی تحریر واقعات کے خلاف ہے تو یہ بہتان ہو اور اگر صحیح ہو تو یہ غیبت ہو - (آگے غیبت اور بہتان کے متعلق حدیثیں منقول ہیں) . . . . . .

خدا نے آپ کو اپنے گھر کی اگر خوش قسمتی سے سیر کرائی تھی تو آپ کی مضمون نگاری کے لیے اس پہلو کے علاوہ بھی میدان کشادہ تھا یعنی وہاں کے محاسن حج کا ثواب طواف کی فضیلت زیارتگاہوں کے فضائل وغیرہ بیان کرتے نہ یہ کہ اہل مکہ ہی کو جھاڑنا شروع کیا اور انھیں کی خبر لی - سبحان اللہ - یہ تو بتلائیے کہ دیگر اقوام پر آپ کے اس مضمون کا کیا اثر پڑے گا اور وہ اہل مکہ اور لواطت زنا شراب کو کس نگاہ سے دیکھیں گے - کیا وہ ہماری ہی طرح اس خبر کو محتمل الصدق والکذب پر محمول کریں گے ہرگز نہیں بلکہ وہ ایک تازہ حاجی سے یہ خبر سن کر دلوں سے اسلامی شان اور مسلمانوں کے قبلہ وکعبہ کی عظمت جو اُن کے قلوب پر نقش کالحجر تھی مٹا دیں گے -

مکرمی - اگر آپ حب العرب من الایمان کے جملہ کو نہیں بھولے ہیں تو کیا محبت کے یہی معنی ہیں کہ محبوب کے عیبوں کو اور اُن کی شکایتوں کو غیروں سے بیان کیجیے بلکہ اُن سے خود اس عیب کو ظاہر کر کے اُن کی اصلاح کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے -

مجھے ان سُنی ہوئی باتوں پر ہرگز یقین ہی نہیں ہو کہ ایسے فاحشات کا ارتکاب اہل مکہ سے ہوا اور اُس خیر البلد میں زناکاری اغلام بازی شراب خواری کا بازار گرم ہو جسکے بارہ میں خود حضور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں - حدیث عن عبد الله بن عدی بن الحمراء رضی الله عنه - انه سمع النبی صلی الله علیه وسلم وھو واقف علی راحلته بمکته یقول والله انك لخیر ارض الله واحب ارض الله الی الله ولولا انی اخرجت منك ما خرجت رواه الترمذی والنسائی - جب مکہ معظمہ کو خیر الارض تسلیم کر لیا جائے تو ایسے مقام پر شر ضرور منافی ہوگا - مجھے یقین ہو کہ آپ کا بھی یہی اعتقاد ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں سب سچوں سے بڑھکر سچے تھے اور اس ثقہ بزرگ سے بھی جنھوں نے ان فواحش کی خبر جناب کو دی ہو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم بالاتر صادق الخبر تھے۔ اب مین کہتا ہون کہ جس ارض مقدس کے بارہ مین ارشاد ہو خیر الارض وہان فاحشات مذکورہ بالکل نسبت تضاد رکھتے ہین۔ اگر ایسی جگہ پر شراد رشریر لوگ پائے جائین تو پھر خیر کس بات کا اور اُس زمین کی خوبی کس بات کی۔ دوسرے یہ بھی حدیث ہی کی خبر ہو کہ قیامت تک حرمین شریفین مین دین اسلام رہے گا۔ ایسے اسلامی شہر مین اور مذہبی مسکن مین شراب نوشی اور دیگر افعال قبیحہ بعید از فہم و دور از ادراک ہی۔

گذارش یہ ہو کہ ایسی خبرین جن کی تصدیق و تشہیر شرعاً ممنوع ہو افواہ و کذب ہی پر محمل کرنا بہتر ہو اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث و اقوال کی تاویل کرنے سے بہتر ہو کہ آپ اس ثقہ مخبر کے قول اور خبر کی تاویل کرنے مین مصروف ہو جائیے تاکہ حدیث ظنوا المومنین خیراً پر پوری طرح سے عمل ہو جائے"

× × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

(۳)

ایک محترم کرمفرما جو فاضل و ادیب ہونے کے علاوہ سلسلۂ مشایخ سے بھی تعلق رکھتے ہین اپنے گرامی نامہ مین رقم فرماتے ہین :۔

" نومبر دسمبر کا الناظر پہونچ گیا۔ آپ کے رقم زدہ واقعات اہل عرب کے متعلق جن بزرگ نے نامقبول خانہ فرسائی کی ہو ہفوات و فضولیات سے زیادہ نہین۔ آپ کے جواب پڑھنے سے پہلے ایک خاص جوش پیدا ہوا اور ارادہ کیا کہ اپ سے ۳۰ برس پہلے کے واقعات چشم دید دکھاؤن اوران کو چیلنج دون کہ اگران مین شک ہو تو پھر تکلیف سفر عرب اُٹھائین اور بامعان نظر مین سرسری اور گذران دیکھین لیکن آپ کے جواب کو پڑھ کر وہ جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ اور بیکار باسی کڑھی مین اُبال لانے کی کوشش ملتوی کرنی پڑی کہ بہرحال اس پردہ دری مین شماتت ہمسایہ کی تعلیت ضرور رہی"

میرے عریضہ کے جواب مین صاحب موصوف نے تازہ گرامی نامہ مین وعدہ فرمایا ہو کہ

" ذرا فرصت ہوئے تو حجاز کے متعلق بغیر خوف لومتہ لائم ضرور لکھون گا "

(۴)

شمس العلما مولوی سید محمد امین صاحب کا ایک طویل مضمون اودھ اخبار مورخہ ۶ر جنوری سنہ ۲۴ء مین شایع ہوا ہو اُسی مین فرماتے ہین :۔

" راقم مضمون نے جو حالات کہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لوگون کے لکھے ہین وہ صحیح ہین۔ مجھے ذاتی طور پر ان امور کا

علم ہوا اور افسوس زیادہ اس امر کا ہو کہ اب تک کہ میرے سفر کو تقریباً ۵۴ سال کا زمانہ گزر چکا کوئی اصلاح اہل امور مین نہین ہوئی۔ بلکہ شاید معاملہ برعکس ہو۔ راقم مضمون نے زیادہ تر اعتراضات اہل مکہ پر کیے ہین اور یہ امر ہر طرح بھی واقعی ہے"

(۵)

جناب مولوی عبدالباری صاحب کی ایک تحریر اخبار ہمدم مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۳۰ء مین شائع ہوئی ہو جسمین لکھا گیا ہو:-

". . . . . . . ایک سلسلہ مضامین کا الناظر مین احوال مکہ مین نکلنا شروع ہوا ہو اس کا زیادہ حصہ جسمین اہالی مکہ کی اخلاقی کمزوریان بتائی گئی ہین نہایت دلخراش ہو اور فطرتاً اسکے دیکھنے سے اہل مکہ کو غصہ آتا ہو۔ بلکہ ہر مسلم کے جذبات کو صدمہ ہوتا ہو۔ مکہ کے لوگ معصوم نہین ہین۔ مگر جسقدر اُنھون نے لکھا وہ بھی قرین قیاس نہین ہو۔ اور جس معتبر کے قول پر اُنھون نے اپنی معلومات کی بنا قائم کی ہو وہ بالکل غیر معتبر ہو اور اُس نے یقیناً غلط بیانی کی ہو۔ بھائی ظفرالملک باوجود ادعاے حق گوئی کے اُس کے نام کو بتا نہین سکتے۔ اس خوف سے کہ طرح طرح کے مصائب حتیٰ کہ قتل ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہو کہ یا وہ فرضی ہو یا وہ جھوٹا ہو یا وہ خود مرتکب ہو یا کمزور ہو کہ جسکو حب وطن وحب جان اس درجہ ہو کہ وہ شہادت حق دینے سے جی چُراتا ہو اگر صاحب اس کو بتا دیتے ثواب پاتا۔ اگر قتل کیا جاتا تو شہید ہوتا۔ اگر وہ اس قدر کمزور تھا تو اس کو غیبت اور ہتک حرمت اہل اسلام سے اجتناب لازم تھا . . . . اس مضمون مین صاف صاف اہل مکہ کے اکثر حصہ کو زنا و لواطت سے متہم کیا گیا ہو جو قذف کی حد تک پہونچتا ہو اور ہر اہل مکہ کو حق ہو کہ اس کا مطالبہ کرے کہ ثابت کر سکے۔ اس قدر یا اتفاقی حالت کہ کسی نے خبر دی تو حد قذف کا موجب نہ رہتا۔ اسمین تو بغیر احتمال کے وقوع ثابت کیا گیا ہو"

میرے معروضات

جو اصحاب میری تحریر سے ناراضی کا اظہار فرما رہے ہین مین اُن سے شکایت نہین کر سکتا کیونکہ عقیدت ومحبت کے غلبہ مین اکثر اصلاحی کوششون کا یہی حشر ہوا ہو۔ البتہ جو بحث مذہبی نقطۂ نظر سے ایسے بیانات کے جواز و عدم جواز پر کی جاتی ہو وہ ضرور قابل لحاظ ہو۔ اگرچہ ذاتی طور پر اب تک مین اس بات کا قائل نہین ہون کہ بغیر کسی شخص کو متعین کیے ہوے کسی شہر یا ملک کے عام حالات بیان کرنے پر بھی شریعت کے مطابق شہادت پیش کرنا ضروری ہو۔ لیکن جبکہ اہل علم مین سے بعض افراد کا خیال یہی ہو تو اس کی تحقیق ہو جانا چاہیے۔ اور جن حضرات کے فتاوی پر مین اعتماد رکھتا ہون مین اُن سے مشورہ کر رہا ہون۔

انشاء اللہ آئندہ پرچہ مین اُن کی آرا سے مطلع کرسکون گا اور اگر احکام شرعیہ کی کوئی خلاف ورزی نادانستگی مین مجھ سے ہوگئی ہو تو مین اُس کا اعتراف کرکے اظہار ندامت مین دریغ نہ کرون گا۔ اس لیے کہ احکام شرعیہ کے مقابلہ مین مین اپنی راے کو ہیچ جانتا ہون۔

عام واقعات نگاری کی بحث اس سے جُداگانہ حیثیت رکھتی ہو۔ اور اگرچہ مین دیگر کثیر التعداد ارباب راے کی اصابت پر کوئی حرف گیری نہین کرسکتا۔ لیکن پھر بھی جب کبھی مجھے اپنی راے پر اطمینان ہوتا ہو تو مین اس کا اظہار ضروری جانتا ہون۔ اِس بارہ مین ہر قسم کی رائین موجود ہین جو لوگ اِس مضمون سے ناخوش ہین اُن کے خیالات کے نمونے اور جو اصحاب واقعات کو صحیح یا غلط قرار دیتے ہین اُن کی تحریرین اوپر گذر چکی ہین لیکن بہت سے ایسے اصحاب بھی ہین جو واقعات کی صحت و عدم صحت کی بحث مین پڑنا نہین چاہتے بلکہ میری تحریر کو خلاف مصلحت جانتے یا عبارت کی درشتی پر معترض ہین۔ اندازِ تحریر کی درشتی کا مین معترف ہون۔ مگر شاید یہ ایسی کمزوری ہو جو ہر معترض (مصلح ہو یا متخاصم) مین کم و بیش نظر آئے گی۔ یہ دوسری بات ہو کہ کہین یہ انداز پسندیدہ قرار دیا جاتا ہو اور کہین قابل گرفت۔ ہندوستان کے اخبار نویسون اور اہل قلم حضرات مین مہاتما گاندھی سے زیادہ عدم تشدد کا پابند کون ہوگا مگر ان کی بعض تحریرون کو بھی کم سے کم ایک جماعت درشت و ناملائم کہتی ہو۔ اِس لیے سمجھنا چاہیے کہ نکتہ چین و معترض کی یہ حیثیت قابل معافی ہو۔

اب رہا مصلحت کا سوال تو اس بارہ مین رایون کا اختلاف بالکل قدرتی ہو بر اینہم میرے وہ احباب جن کی رایون کو مین حد درجہ وقیع مانتا اور تا امکان اُن کے مشورون پر عمل کرنا اپنے لیے باعث افتخار جانتا ہون، اگر کوئی صورت ایسی تجویز فرمائین گے جس سے میرے اور اُن کے متحدہ مقصد اصلاح کی صورت پیدا ہو اور ساتھ ہی ساتھ میری تحریر سے جو برافروختگی پیدا ہوگئی ہو وہ رفع ہو جائے تو مین یقیناً اُن کے مشورون پر کاربند ہونے کو اپنے لیے باعث سعادت جانون گا۔ اِس لیے کہ میرا مقصد تحریر کسی کی دل آزاری یا اتحاد اسلامی اور مفاد قومی کو کسی نہج سے بھی نقصان پہونچانا نہ تھا۔ اور اگر خدانخواستہ اس قسم کے نتائج مرتب ہون یا مدبرین قوم کی راے مین اس کا قوی احتمال ہو تو یقیناً خود مجھکو اس کا بہت افسوس ہوگا اور مین یہ سمجھکر ساکت ہو جاؤن گا کہ

گفتن آئین ہوشیاری نیست   لیک دانستن اختیاری نیست

گو مصرعۂ اولیٰ کی پابندی سے اب تک مین ہمیشہ قاصر ہی رہا ہون۔

ظفر الملک

رباعیات

(از منشی محمد مبین نازش بدایونی)

ہے شیوۂ دلفریب شایان مجاز
سرمست مۓ شوق ہین یاران مجاز
انوار حقیقت ہین اِسی پردہ مین
دیرِ صنم آرا ہی شبستانِ مجاز

حیرت آباد ہو خیالِ عنقا
ہو روح کا ادراک مثالِ عنقا
اوجِ پرواز سے نہ ہو کچھ حاصل
ہون وہم و قیاس نقش بالِ عنقا

اے دل نہ تڑپ توصفتِ بلبلِ زار
فانی ہی حُسنِ خوبرویان کی بہار
جس پھول مین بُو نہ ہو وہ ہی ننگِ چمن
جس نخل مین پھل نہ آدین وہ ہی بیکار

اچھی کہی جذبات بُرے ہوتے ہین
کیا مے سے خیالات بُرے ہوتے ہین
پگڑی کو سنبھالے سرِ منبر واعظ
رندانِ خرابات بُرے ہوتے ہین

نیرنگِ فریب ہی کہ ہی بزم جہان
انفاس کی زیب ہی کہ ہی وہم و گمان
آثارِ وجود ہین کہ ہین نقشِ فنا
ہستی کی نمود ہی کہ ہی خواب گران

ہی خوبیٔ اجسام پہ مخلوق کو ناز
حیرت کدۂ خاک ہی سربستۂ راز
چلتا ہوا ساغر ہی کرشمہ گہ مۓ
ڈھلتے ہوے قالب مین ہی پنہان اعجاز

یہ شمع خرابات کے پروانے ہین
بحث حرم و دیر سے بیگانے ہین
سنبھلے ہوے ہین کیون نہ خدا کو مانین
کیا رندِ شراب خوار دیوانے ہین

جب ہاتھ مین جام پُر فضا آتا ہی
پھر آبِ حیات کا مزا آتا ہی
ٹوٹے ہوے خُم ہین یادگارِ عشرت
میخانہ قدیم سے چلا آتا ہی

کھلتے ہین راز بادہ پیمائی مین
لذت ہی خرابات کی رُسوائی مین
آنکھین ہون تو رندون مین خدا کو دیکھے
زاہد نہ چھپے گوشۂ تنہائی مین

ہی قابلِ رشکِ زہد نازش کا اخیر
پیری مین ہی رندانِ خرابات کا پیر
مائل نہین ضعف مین بھی توبہ کی طرف
وہ شے جسے عقل و فہم کہتی ہی ضمیر

یارانِ عدم نہ ہون جُدائی سے ملول
لالہ زارِ جہان کی حسرت ہی فضول
غم کی نیرنگیان ہین بالاے زمین
سنبل مین شکن ہی چاک دامن ہین پھول

ضعفِ پیری کی سحر سازی ہی ستم
جی ہارتے ہین جوان یہ بازی ہی ستم
گر پڑکے اُٹھین وہ تو چھٹے ہاتھ سے جام
رندون کو حیات کی درازی ہی ستم

چشم مغرب ہی حُسن زیبا کی طرف
مشرق کی نظر بام خود آرا کی طرف
اِس دور مین ہر قوم کو یہ دُھن ہی کہ وہ
پستی سے بڑھے عالمِ بالا کی طرف

ہین خسروِ کج کلاہ سرمشقِ عذاب
نشہ ہی غرور کا نہ ہین عیش کے خواب
ہی خاک سے آلودہ کفن مرقد مین
اطلس ہی نہ پرنیان نہ تن پر کمخواب

دنیا مین ذلیل ہون کہ رسوا ہون مین
عقبیٰ مین بھی مایوس تمنّا ہون مین
ایسے ہونے سے تو نہ ہونا اچھا
کیون ہی مجھے ہونیکا گمان کیا ہون مین

سقراط

(۱)

گرچہ ہر قرنے سخن آرے بود لیک گفت سابقان یارے بود

لِکُلِّ قومٍ ھادٍ۔ کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہی؟ ہرگز نہین۔ اس جواب سے میری ہمت بندھتی ہی کہ سطور ذیل مین یونان کے ہادی اعظم کے کچھ حالات پیش کرون تاکہ اُس شخص کی اک دُھندلی سی تصویر آپ کے سامنے آجائے جس کا تیئیس۲۳ چوبیس۲۴ سو سال سے دنیا مین ڈنکا بج رہا ہی، اور کلام ربانی کی حقانیت ہویدا ہو سکے۔

ابھی حضرت مسیح علیہ السلام کو ظاہر ہونے کے لیے چار سو انہتر سال سے کچھ زیادہ باقی تھے کہ یونان کے شہر ایتھنس (Athens) مین ایک بُت تراش سفرونسکوس (Sophroniscus) کے گھر مین ایک لڑکا پیدا ہوتا ہی جس کے شان مین ڈلفی (Delphi) کی زبان غیب یہ اشارہ کرتی ہی کہ اس سے زیادہ دانشمند یونان مین نہین پیدا ہوا۔ اس عجیب و غریب لڑکے کے بچپن کا حال پردۂ خفا مین ہی۔ صحیح طور پر یہ نہین کہا جا سکتا کہ اسکے اخلاقی اور ذہنی ترقی کے اسباب کیا ہوے۔

اسی گمنامی مین اُسے تقریباً چالیس سال گذر جاتے ہین کہ محاصرۂ پوٹیڈیا (Potidia) کا معرکہ پیش آتا ہی جسمین اُسکے جوہر کسی قدر ظاہر ہوتے ہین۔

سُقراط ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے کچھ وجیہہ نہ تھا۔ چھوٹا قد۔ موٹی گردن۔ جسم کسی قدر بلغمی آنکھین اُبھری ہوئی۔ ناک اوپر کو چپٹی دبی ہوئی اور نتھنے کشادہ۔ دہانہ بڑا۔ ہونٹھ بھدے۔ صورت دیکھنے سے ایک شہوت پرست احمق معلوم ہوتا تھا۔ مگر اندرونی صفات یہ بیان کیے گئے ہین۔ اسقدر پرہیزگار تھا کہ بغیر عقل سے استخارہ کیے کوئی کام نہین کرتا تھا۔ اس قدر انصاف پسند تھا کہ کبھی کسی شخص کو نقصان نہین پہونچایا۔ اسقدر اعتدال پسند تھا کہ امر حق پر کبھی عیش و راحت کو ترجیح نہین دی۔ اسقدر دانشمند تھا کہ حق و باطل کی تمیز مین اُس نے کبھی غلطی نہ کی۔

یہ زمانہ یونان کے بڑے صاحب کمالون کا گذرا ہی۔ سنہ ۴۶۰ ق م و سنہ ۴۲۰ ق م مین نظم تاریخ، سنگ تراشی اور فن تعمیر مین ایسے ایسے لوگ گذرے ہین جو آج تک مسلم الثبوت اُستاد کہے جاتے ہین۔ سوفوکلیز (Sophocles) سنہ ۴۹۵ ق م مین پیدا ہوتا ہی۔ یوری پائیڈیز (Euripides) سنہ ۴۸۰ ق م مین پیدا ہوتا ہی اور سُقراط سے سات سال قبل تقریباً سنہ ۴۰۶ ق م مین دونون عالم جاودانی کا سفر اختیار کرتے ہین۔ فی ڈیاس (Phidias) یونان کا مشہور بت تراش سنہ ۴۳۲ ق م مین اس عالم سے رخصت ہوتا ہی۔ پیرکلیز (Pericles) مشہور مدبر و مقرر سنہ ۴۲۹ ق م مین وفات پاتا ہی۔ تھوسی ڈائیڈیز (Thucydides) مشہور مورخ سنہ ۴۷۱ ق م مین پیدا ہوتا ہی اور سنہ ۴۰۱ ق م و سنہ ۳۹۵ ق م کے مابین دنیا سے اُٹھ جاتا ہی۔ اقطینوس (Ictinus) اپنے مشہور پارتھینان (Parthenon) کے بت کو سنہ ۴۳۸ ق م مین تکمیل کو پہونچاتا ہی۔ غرض یہ ایسا زمانہ تھا جسمین سقراط پیدا ہوتا ہی اور اپنا بچپن اور جوانی بسر کرتا ہی۔ خود اتھینس اس وقت ہر قسم کے صاحبان فن کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ یہان رہنا ایک طرح کی تعلیم و تربیت گاہ مین رہنا تھا۔ سقراط خود کہتا ہی کہ اتھینس والے اپنی عقل اور قوت ذہنی کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ ملکی حکومت کی باگ ایک انجمن کے ہاتھ مین تھی جسکی رکنیت اتھینس (Athens) کے ہر باشندے کو حاصل تھی۔ اور ارکین کا اس انجمن مین حاضر ہونا قانوناً لازم کر دیا گیا تھا۔ یہ حکومت نہ تو کیلانہ تھی اور نہ کسی وزیر کے ہاتھ کوئی ذمہ داری کا کام تھا۔ سلطنت اتھینس (Athens) پر خود اُس شہر کے لوگ براہ راست حکومت کرتے تھے۔ ہر باشندۂ شہر قانونی بحثین سنتا اور مُلکی انتظامات مین دخل دیتا تھا۔ اور جنگ و صلح کے مسائل کے طے کرنے مین حصہ لیا کرتا تھا۔ فریقین مقدمہ کی بحثین سنا کرتا تھا جس سے اُن کی ذہانت اور نظر مین وسعت پیدا ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اتھینس (Athens) کی جدت ذہن و ذکاوت کا معیار ایسا بلند ہو گیا کہ کسی دوسری سلطنت مین اُس کی نظیر نہین مل سکتی تھی۔

یہ وہ حالات ہین جنمین سقراط کی زندگی کے پچاس برس بسر ہوئے۔ زینوفن (Xenophon) کہتا ہی کہ وہ اکثر پراڈیکس (Prodicus) کی داستان ہرقل بیان کیا کرتا تھا اور حکمائے سلف جو علم کا اندوختہ چھوڑ گئے تھے وہ بھی اپنے دوستون کے ہمراہ اوسکے مطالعہ مین منہمک رہا کرتا تھا۔ حکمائے سبعہ کے مقولے مثلاً اعرف نفسك وغیرہ اوسکے ذہن مین جگہ حاصل کرتے جاتے تھے۔ اُسے ریاضی۔

طبیعات، حکمت، ہیئت، اور ہندسہ پر خاصا عبور حاصل تھا۔ اپنے پیش رو حکما کے مسائل ہرکلیٹس (Heraclitus) پارمنی ڈیز (Parmenides) اور بالخصوص انکساگورس (Anaxagoras) کے علوم اُس کے خاص مطالعہ مین تھے۔ یہ نہین کہا جا سکتا کہ کسی کے سامنے سقراط نے زانوے شاگردی تہ کیا۔ ۴۳۱ قم و ۴۲۹ قم کے درمیانی زمانہ مین ہم اُس شخص کو پا ئیڈیا (Politaia) کے محاصرہ مین مصروف پاتے ہین۔ اور دیکھتے ہین کہ بھوک پیاس اور جاڑے کی تکلیف خاصکر تھریس (Thrace) کے جاڑے کے سخت مصائب برداشت کرنے مین سقراط کا کوئی مقابلہ نہین کر سکا۔ السی بائیڈیز (Alcibiades) کی جان اُسی معرکہ مین نہایت بہادری کے ساتھ بچاتا ہے۔ اور جرات و بہادری کا انعام بھی اُسی کو دلواتا ہے۔ ۴۳۱ قم مین جنگ ہاے پیلوپونیسس (Peloponnisus) رونما ہوتی ہین اور ۴۲۴ قم مین معرکہ ڈیلیم (Dalium) مین ایتھنس (Athens) کو اہل تھیبا (Theba) کے ہاتھ سے ایک شکست فاش نصیب ہوتی ہے لیکن سقراط اور لاشیز (Laches) اور چند لوگ ایسے نظر آتے ہین جو ہمت نہین ہارتے۔ بن بعد افواج پیلوپنیس (Peloponnisus) کے مقابلہ مین میدان امفی پولس (Amphipolis) مین سقراط پھر شریک جنگ ہوتا ہے اور کارہاے نمایان کرتا ہے۔

جنگ امفی پولس (Amphipolis) کے بعد سوا برس تک سقراط گمنامی اور خاموشی مین بسر کرتا ہے۔ اور یہ نہین معلوم ہوتا کہ وہ کہان اور کس حال مین ہے۔ ۴۰۶ قم مین اہالی ایتھنس (Athens) و لیسی ڈمونیون (Lacedemonian) مین بحری لڑائی آرگی نوسا (Arginusae) پر ہوتی ہے جسمین اول الذکر کو فتح ہوتی ہے۔ جنگ کے بعد، ایتھینی (Athenian) سرداران فوج اپنے مقتولین کی لاشون کو لیجانے اور اپنے بیکار شدہ بعض چھوٹے جہازون کے لوگون کو بچانے سے قاصر رہ جاتے ہین اس سے اہل ایتھنس کو غصہ آتا ہے۔ مردون کی رسمہاے بعد الموت بہت شان و شوکت سے ادا کی جاتی ہین۔ اور سرداران مذکور کو فوراً واپس طلب کیا جاتا ہے کہ اُن پر غفلت کا مقدمہ قائم کیا جائے۔ اُن کا یہ جواب کوئی تسلیم نہین کرتا کہ اُنھون نے اپنے ماتحت افسرون کو ضروری احکام دیدیے تھے لیکن ایسا طوفان آیا کہ اُن احکام کی تعمیل نہو سکی۔ انجمن مین بحث مباحثہ ملتوی ہو جاتا ہے۔ اور اس پر غور کیا جاتا ہے کہ اُن سردارون پر کس طرح مقدمہ چلایا جائے۔ اہل ایتھنس (Athens) کی یہ راے ہوتی ہے کہ الزام

اور جوابدہی دونون کو سُن کر فوراً سب کی راے لینا چاہیے تاکہ یہ آٹھون سردار سب چھوڑ دیے جائین یا سزا پائین۔ یہ رزولیوشن یہی نہین کہ بے انصافی پر مبنی تھا بلکہ خلاف قانون بھی تھا اس لیے کہ معمولی مقدمہ چلانے کے بجاے عوام کی راے لینا پسند کیا گیا تھا۔ اور اُس قانون کے خلاف تھا جسکے رو سے ہر شخص کے متعلق علیحدہ علیحدہ تجویز صادر کرنی لازمی تھی۔ اس وقت سقراط بھی سنٹ (Senate) کا رکن تھا۔ اس سنٹ (Senate) مین پانچ سو اہل شہر تھے جو بذریعہ قرعہ اندازی ایک دن کے لے منتخب کیے گئے تھے۔ اور ہر روز ایک نیا میر مجلس مقرر ہوا کرتا تھا۔ چونکہ رزولیوشن خلاف قانون تھا اس لیے اگر کبھی میر مجلس نے مخالفت کی تو اُسے دھمکا کر چپ کر دیا گیا۔ لیکن سقراط ایسا نہ تھا کہ حق کی جانبداری مین کسی کی دہمکی مین آجاتا۔ اُس نے صاف کہدیا کہ مین قانون اور انصاف کی جانبداری مین خطرون کا مقابلہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہون۔ اور عوام الناس کی غیر منصفانہ تجویز مین اُن کا ہمزبان نہین ہو سکتا لیکن سقراط چونکہ صرف ایک ہی روز کے لیے میر مجلس ہوا تھا اس لیے اُس روز یہ کارروائی ملتوی کر دی گئی اور دوسرے روز ایک کمزور طبیعت شخص کو میر مجلس بنا کر سرداران فوج کے قتل کا حکم لے لیا گیا۔ اور اُنھین قتل کر دیا گیا۔

دو برس بعد ۴۰۴ء ق م مین اہل اتھنس (Athens) کو لیسی ڈمونیون (Lacedemonians) فوج نے شکست دی اور شہر پر دشمنون کا قبضہ اور اتھنس (Athens) کے جمہوری نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کے بجاے اسپارٹی جنرل لسانڈر (Lysander) کی ماتحتی مین تیس منتخب اشخاص کی حکومت قائم ہوئی۔ اور طرح طرح کے مظالم شروع ہوے۔ لوگون کو اختلاف راے اور دولت وحشمت کی وجہ سے بیدریغ قتل کیا جاتا تھا۔ ایک شخص مسمی لیان (Leon) کو بھی حکومت نے اسی غرض کے لیے طلب کیا۔ اور پانچ آدمیون کو جنمین ایک سقراط بھی تھا یہ حکم دیا کہ لیان (Leon) کو پکڑ لائین۔ چار آدمیون نے تعمیل کی مگر سقراط نے کسی خطرہ کی پروا نہ کی اور اپنے گھر چلا گیا۔ اس واقعہ کے متعلق وہ خود کہتا ہو کہ ”مین نے زبان سے نہین بلکہ اپنے فعل سے یہ دکھا دیا کہ مجھے موت کی ذرہ برابر بھی پروا نہین۔ لیکن اس کا مجھے بہت خیال ہو کہ میرے ہاتھ سے کوئی خطا سرزد نہو جائے“۔ اس حکم عدولی سے ناخوش ہو کر کری ٹیاس (Critias) اور اُس کے شرکا حکومت نے اُسے طلب کر کے حکم دیا کہ ملک کے نوجوانون سے قطعاً باتین نہ کیا کرو ورنہ سزاے موت دی جائیگی،

سقراط نے زان تھیپ (Xanthipe) کے ساتھ شادی کی تھی اِس کے تین لڑکے ہوے۔ لمپراکلیز (Camprocles) سفرانسکوس (Sophroniscus) اور منکسی نوس (Menexenus)۔ زان تھیپ (Xanthipe) بڑی بدمزاج عورت تھی لیکن سقراط نہایت تحمل کے ساتھ اُس سے درگذر کرتا تھا مگر کچھ خوش نہ تھا۔ اُس کا قول تھا کہ خدا نے مجھے لوگون سے محاسبہ کرنے کے لیے حکم فرمایا ہی۔ مین کسی طرح خاموش نہین رہ سکتا۔ کیونکہ اگر چُپ رہون تو خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہون گا۔ یہ خیال اُسکے دل مین اس قدر سختی سے جاگزین تھا کہ لوگون کی مخالفت اور نفرت کوئی شے اُسے اِس جادہ سے منحرف نہین کر سکتی تھی، یہ ہم نہین بتا سکتے کہ کس وقت سے اُس نے لوگون کا محاسبہ کرنا شروع کیا۔ اور اِس آلہی فرض کی انجام دہی اپنے سر لی۔ لیکن ۴۲۳ قم مین اپنی وفات سے چوبیس سال قبل اُس کو بہ حیثیت نئے خیالات پیدا کرنے والے کے خاص شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اور یہی قیاس ہو سکتا ہی کہ اس سال کے قبل ہی سقراط نے اپنا آلہی فرض ادا کرنا شروع کر دیا ہو گا۔

محاصرۂ پائیڈیا (Polidea) ۴۳۲ قم لغایتہ ۴۲۹ قم سے پہلے خود اُس نے اپنا محاسبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُس زمانہ مین سوفسطائیون کے تعلیمات کا بہت چرچا تھا۔ مگر اُس کی تعلیم اِس کے بھی خلاف تھی۔ اُس کی تعلیم کا یہ طریقہ تھا کہ وہ نہ تو کسی سے کوئی اُجرت لیتا تھا اور نہ طلبار کو بٹھا کر سبق دیا کرتا تھا۔ اس کی تمام عمر احتساب مین گذری۔ جو کوئی اُس سے مخاطب ہوتا اُس سے فوراً سوالات کرنے اور محاسبہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ کبھی وہ السی بائیڈیز (Alcibiades)، گارجیاس (Gorgeas)، پروٹوگورس (Protogoras) سے باتین کرتا نظر آتا تھا، اور کبھی ایک معمولی مزدور سے۔ غرضکہ وہ ایسے مقامات پر نظر آیا کرتا تھا، جہان دیکھتا کہ لوگ بہت جمع ہوا کرتے ہین اور شہر سے بہت کم باہر جاتا۔ وہ کہتا ہی کہ "مین علم کا شائق ہون جو شہر ہی مین آدمیون سے مجھے مل سکتا ہی، کھیت اور درخت مجھے کچھ نہین سکھا سکتے"۔ اُس نے اپنی تمام توجہ خدائے بزرگ و برتر کی خدمت مین منہمک کر دی تھی۔ اور اپنے خانگی معاملات تک سے غافل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افلاس نے اُسے آگھیرا اور جس وقت اِس مقدمہ کے زمانہ مین اُسے روپیہ کی ضرورت ہوئی تو ایک نقرئی سکہ مینا (معادل تقریباً ۱۱ معہ سکہ عثمانیہ) سے زیادہ اُسکے پاس نہ تھا۔ افلاطون اپنے استاد کی ظاہری حالت کو بیان کر کے کہتا ہی۔

"میں نہیں جانتا کہ تم میں سے کسی نے بھی ایسی ربانی صورتیں دیکھی ہونگی، جو اُس کے اندر تھیں میں نے انھیں دیکھا ہے۔ وہ اس طرح حسین سونے کی طرح جگمگاتی ہوئی علوی صفات عجیب وغریب ہیں کہ جس طرح خدائی آواز کو سن کر لوگ اطاعت کے لیے جھک جاتے ہیں، سقراط کے احکام کو بھی سُنکر جھک جاتے تھے"۔

کبھی کسی شخص نے اُسے شراب پیتے ہوے نہیں دیکھا۔ بڑے بڑے مصائب برداشت کرنیکی اُس میں غیر معمولی طاقت تھی سخت سے سخت جاڑے میں بھی جب تمام عالم غلیظ کُہرے سے گھرا ہوتا اور لوگ سمور پہنے ہوے اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر نکلتے تھے، سقراط اپنے معمولی کپڑوں میں نکلتا تھا۔ اور اس طرح چلتا تھا کہ گویا سردی کا کوئی اثر اُس پر نہیں ہے۔ وہ ننگے پیر برف پر آہستہ آہستہ چلتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ ایک مقام پر کھڑا عالم فکر میں مستغرق ہے۔ دوپہر کو بھی اسی طرح نظر آیا۔ لوگ کہتے تھے کہ سقراط کو دیکھو صبح سے اسی طرح کھڑا سوچ رہا ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات ہوگئی۔ بعض لوگ اُس کے قریب آکر سوگئے اُنھوں نے دیکھا کہ سقراط اُسی طرح بُت بنا کھڑا ہوا ہے حتیٰ کہ تمام رات گذرگئی۔ اور جب آفتاب عالمتاب برآمد ہوا اُس وقت اُسے ہوش آیا، اُس کی مشکل حل ہوگئی اور اُس نے وہاں سے جنبش کی۔ افلاطون جنگ ڈیلیوم (Dalium) کی ہزیمت کے وقت سقراط کا استقلال اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"سقراط کو اُس وقت دیکھنا چاہیے تھا جبکہ ہماری فوج جنگ ڈیلیوم (Dalium) میں شکست کھا کر منتشر ہوگئی۔ یہ ایک دیکھنے کے قابل منظر تھا۔ میں اُس وقت رسالہ کے ساتھ تھا اور وہ پیدل تھا اور سرتاپا لوہے میں غرق تھا۔ جب ہماری فوج کو کامل شکست ہوئی توسقراط اور لیشیز (Laches) دونوں ساتھ ساتھ ہزیمت کرتے نظر آئے۔ میں اتفاق سے وہاں آگیا اور اُن دونوں کو دیکھ کر سلام کیا اور اُن کے ساتھ ہولیا۔ چونکہ میں گھوڑے پر سوار تھا اس لیے اپنی حالت کے متعلق زیادہ تردد میں نہ تھا۔ یہ موقع پاٹیڈیا (Potidia) کے میدان سے بھی زیادہ نازک تھا۔ ایسی حالت میں سقراط کے طور و انداز میں ایک ایسا دلفریب منظر مجھے نظر آرہا تھا جو استقلال طبع اور جرأت میں لیشیز (Laches) سے بدرجہا زیادہ بلند مرتبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک شاہانہ انداز سے طمانیت قلب کے ساتھ قدم اُٹھاتا جاتا اور ہر دو جانب دوست اور دشمن دونوں پر اطمینان سے نگاہ ڈالتا

جاتا تھا۔ حتیٰ کہ دور سے دیکھکر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو کوئی اسپر حملہ کا ارادہ کرے گا اُسے ایک سخت مقابلہ کرنا ہوگا۔ جو لوگ ہزیمت کے وقت منتشر ہوگئے تھے اُن کا دشمنون نے تعاقب کیا اور وہ قتل ہوئے۔ لیکن یہ اور اُس کے ساتھی امن و امان کے ساتھ واپس آئے۔ جو لوگ سقراط کی طرح شکست کے وقت طور و انداز ظاہر کرتے ہین اُنھین لوگ ہاتھ لگاتے ہوے جھجکتے ہین"

اس کے بعد افلاطون تمام بڑے بڑے لوگون کا نام لیکر کہتا ہو کہ اُن سے اور سقراط سے کوئی مقابلہ نہین ہوسکتا۔ اُس مین ایک غیر معمولی شے تھی جو کسی مین نہ تھی خود اُس کی ذات اور اُس کی تقریر اور مقولے ایسے نہ تھے کہ انسان سے اُن کا مقابلہ کیا جاسکے۔

(۳)

۳۹۹ قم مین سقراط پر یہ مقدمہ قایم کیا گیا کہ شہر کے نوجوانون کو خراب کرتا اور ایتھنس (Athens) کے دیوتاؤن کو نہین مانتا ہو۔ پانسو ایک [۵۰۱] آدمیون کا جلسہ عدالت کے لیے بیٹھتا ہو اس مین سے دوسو اکیاسی [۲۸۱] اُس کو مجرم قرار دیتے ہین اور دوسو بیس اُس کو بری کرتے ہین۔ کثرت راے پر فیصلہ ہوتا ہو۔ اور سزاے موت سنائی جاتی ہو مگر ایک مذہبی رسم کی وجہ سے تعمیل مین تاخیر واقع ہوتی ہو اور تیس روز تک قیدخانہ مین رہنا پڑتا ہو۔ اُس کے دوست احباب سب التجا کرتے ہین کہ بھاگ جاے۔ مگر وہ نہین سنتا اور جب موت کا وقت قریب آتا ہو تو خوشی خوشی زہر کا پیالہ ہاتھ مین لیکر پی جاتا ہو۔

ایتھنس (Athenians) والون کی انجمن کے سامنے جو تقریر اُس نے اپنے بچاؤ مین کی ہے اُس مین کہا:۔

"میرے دوستو اگر تم سمجھتے ہو کہ ایک شخص جس کی کچھ بھی قدر و قیمت ہو ایک کام مین ہاتھ ڈالتا اور پھر موت سے ڈرتا جاتا ہو یا اس خیال کے علاوہ کہ آیا وہ حق پر عامل ہو یا باطل پر کوئی اور خیال کرتا ہے تو میرے دوستو تم غلطی کرتے ہو۔ مین اپنا تمام وقت تمھارے بڈھون اور جوانون کے پاس جانے اور اُنھین اس بات پر مائل کرنے کے لیے صرف کرتا ہون کہ وہ لوگ روحانی تکمیل کو اپنا مقصد خاص بنائین اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہوجائے اپنے جسمون اور مال و دولت کی طرف توجہ نہ کرین۔ یہ بھی کہتا ہون کہ نیکی دولت کے ذریعہ سے نہین

حاصل ہوتی بلکہ دولت اور تمام نعمتین جو انسان حاصل کرتا ہی نیکی سے پیدا ہوتی ہین"

کرائٹو (Crito) جب مجلس مین آکر بھاگ جانے کی راے دیتا ہی تو یہ جواب ملتا ہی :-

"ہماری رہنمائی عقل سے ہوا کرتی ہی اور عقل یہ کہتی ہی کہ ہمین صرف ایک سوال پر غور کرنا چاہیے کہ اگر مین بھاگ جاؤن تو آیا مین حق پر ہون گا یا باطل پر اور اگر ہم یہ دیکھین کہ بھاگنے مین غلطی اور باطل کا اتباع ہی تو ہمین موت کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے"

اُس زمانہ کے حالات وقت اور پست اخلاقی حالت پر اگر صرف ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو رائین لوگ قائم کرتے تھے وہ ویسی ہی ناقص ہوا کرتی تھین جیسے کہ خود وہ حالات ناقص اور اصلاح طلب تھے۔ ان حالات کی وجہ سے اُسے بےچینی سی پیدا ہوتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی لگا ہوا تھا کہ خدائے جل وعلی نے لوگون کی اصلاح کا فرض اُس کے سپرد کیا ہی۔ وہ جانتا تھا کہ ان غلط کاریون اور رسوم پرستیون سے جن پر سوفسطائی اپنے نظام کی بنیاد قائم کرتے تھے، وہ رو براہ نہین ہو سکتے۔ باین ہمہ اصلاح کے فرض سے وہ کبھی نہین پیچھے رہا۔ گو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے موت کا سامنا کرنا پڑا جس اصول پر اُس کا مسئلۂ اصلاح مبنی تھا وہ صرف ایک جملہ مین ادا ہو سکتا ہی یعنی اُس حق پر جسکی رہنما عقل ہو وہ انسان کے خیالات کی بنیاد قائم کرنا چاہتا تھا اور جو اصلاحات کہ جذبات جوش وخروش اور عادت کے تابع ہون اُنھین وہ نیکی اور خیر کا باعث قرار نہین دیتا تھا۔ اُس کی پوری تعلیم یہ تھی کہ "علم ہی نیکی اور خیر ہی" پس اگر علم خیر محض ہی تو جہالت شر محض کہی جائے گی۔ وہ خود کہتا ہی کہ اگر نوجوانون کے خراب کرنے کے جرم کا وہ واقعی مرتکب ہوا ہی تو نادانستگی اور جہالت کی وجہ سے ہوگا جب میلیٹوس (Meletus) اس پر بھی نوجوانون کو خراب کرنے کا الزام لگاتا ہی تو خود وہین جواب دیتا ہی کہ میلیٹوس (Meletus) تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ یا تو مین نوجوانون کو خراب ہی نہین کرتا یا اگر کرتا ہون تو بلا وجہ اور اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے کرتا ہون گا۔ اور جس وقت مجھے یہ معلوم ہوگا کہ مین ایک جرم کا ارتکاب کر رہا ہون تو فوراً اُسے ترک کر دون گا۔ جو آدمی حق کا شناسا ہی اُسے ہمیشہ حق بات کرنی چاہیے۔ اور جو اُسے نہین جانتا وہ اسکا عامل ہی نہین ہو سکتا جب کسی فائق ترین شے کو ہم دیکھین تو ہمین اُس سے محبت کرنی چاہیے۔

سقراط اپنے الزام دینے والون کی دو نوعین قائم کرتا ہی۔ پہلی نوع وہ ہی جو اُسے سالہا سال سے بے وجہ الزام دیتے رہے۔ مثلاً ارسطوفونوس (Aristophanes) جس نے ایک ڈراما

"ابر" (Cloud) لکھ کر اُس کی ہنسی اُڑانے کی کوشش کی تھی اور دوسرے میلیٹوس (Meletus) اور اُس کے ساتھی۔ پہلے وہ پہلی نوع کے لوگون کا جواب دیتا ہی۔ یہ لوگ اسے سوفسطائی اور طبیعی ہونے کا الزام دیتے ہین۔ وہ ان دونون کی مخصوصہ صفتین بیان کرتا ہی اور کہتا ہی کہ اِن دونون قسم کے حکما مین سے وہ ایک بھی نہین ہی اُسے لوگ اس لیے ناپسند کرتے ہین۔ کہ اس نے لوگون کے محاسبہ کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ مین علم نہین رکھتا لیکن یہ جانتا ہون کہ علم نہین رکھتا۔ اُس سے علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہی۔ لیکن وہ جس کسی کو ٹٹولتا اور آزماتا ہی کہ اس سے کچھ علم کا پتہ چلے۔ یہی پاتا ہی کہ وہ بھی اس کی طرح علم سے معریٰ ہی بلکہ باوجود علم سے عاری ہونے کے سمجھتا ہی کہ علم سے بہرہ واقعی رکھتا ہی۔ دوسرون مین اور اپنے مین وہ صرف یہی فرق دیکھتا ہی کہ لوگ نہین جانتے اور جانتے ہین کہ خوب جانتے ہین۔ اور وہ خود گو نہین جانتا۔ مگر یہ ضرور جانتا ہی کہ نہین جانتا۔ اسی بنا پر وہ ڈلفی کی غیبی زبان کا لوگون سے ذکر کرتا ہی کہ اگر اُس زمانہ مین کوئی عقلمند آدمی ہی تو وہ سقراط ہی ہی۔ میلیٹوس (Meletus) کی زبان سے اُسے جھٹلا دیتا ہی۔ ایک شخص اُس سے یہ کہتا ہی کہ کیا اپنی جان کو ایک ایسے زندگی کی خاطر جیسی کہ تم بسر کر رہے ہو جوکھون مین ڈالنا اچھی بات ہی۔ سقراط جواب دیتا ہی کہ دنیاوی سرداران فوج نے لڑائی کے میدانون مین جہان اُس کی جگہ قائم کر دی اُسے اُس نے کبھی نہین چھوڑا۔ پھر کیا جس جگہ خدا نے اُسے مامور کیا ہی وہان سے وہ بھاگ جائے۔ یہ نہین ہو سکتا۔ اس لیے کبھی ایسے شرط کے ساتھ جس کے رُو سے وہ لوگون سے محاسبہ کرنے سے باز رہے۔ وہ اپنی برأت نہین قبول کرنا چاہتا تھا۔ اہل ایتھنس (Athens) کو پھر تنبیہ کرتا ہی اور سمجھاتا ہی کہ اُن کو اُس سے ناراض نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کہ اُس نے اُن لوگون کے بیدار کرنے کے لیے اُسے بھیجا ہی۔ اگر وہ لوگ اُسے قتل کر ڈالین گے۔ تو اُس کا جانشین نہ مل سکے گا۔

سقراط کی تمام عمر لوگون کی خدمت گذاری مین بسر ہوئی وہ امور ملکی مین سوائے ایک مرتبہ کے کبھی نہین پڑا۔ اگر پڑتا تو مدتون پہلے لوگ اُسے قتل کر چکے ہوتے۔ اور جو کام وہ کر رہا تھا ادھورا رہ جاتا۔ وہ انجمن تحقیقات کے سامنے علی رؤس الاشہاد کہتا ہی کہ کہان ہین وہ نوجوان لڑکے جنھین مین نے خراب کیا ہی کیون وہ جوان اور سمجھدار ہونے کے بعد آب آکر مجھے الزام نہین دیتے؟ اور اگر وہ خود نہین آنا چاہتے تو ان کے رشتہ دار ہی آئین۔ مگر وہ بھی نہین آتے تو سمجھ لو اس کی وجہ یہ ہی کہ سقراط حق بات بول رہا ہی اور اس کا الزام دینے

اینی ٹوس (Anitus) دروغ گو ہی۔ وہ ججون سے رحم وکرم کی استدعا نہین کرتا کیونکہ اس مین ایتھنس (Athens) کی ذلت ہی، ججون نے قانون کے مطابق عمل کرنے کا عہد وپیمان کرلیا ہی پھر اگر وہ اُن سے رحم وکرم کا خواستگار ہو تو گویا نقض عہد پر آمادہ کرنے کا مُلزم قرار پائے گا۔ اُس پر بیدینی کا الزام لگایا جارہا ہی مگر وہ اپنے تئین بیدین نہین جانتا اور ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنی ذات کو ججون اور خدا کے سپرد کرتا ہی۔

اُس کے بعد جج آپس مین ووٹ لیتے ہین۔ ۲۸۱ ووٹ اسکے خلاف ہوتے ہین اور ۲۲۰ ووٹ اُس کے موافق۔ میلیٹوس (Meletus) پھر ایک تقریر کرتا ہی جسمین سزاے موت کی تائید کرتا ہی پھر سقراط ایک تقریر کرتا ہی جسمین سزاے موت کے بدل کا ذکر کرتا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ مین نے عوام الناس پر احسان کیا ہی اور اولیمپیا (Olympia) کے سورماؤن کی طرح مجھے بھی پرائے ٹینیم (Prytaneum) مین بیت المال سے وظیفہ ملنا چاہیئے۔ اُسے یقین ہی کہ اُس نے کوئی خطا نہین کی وہ نہین کہہ سکتا کہ موت اچھی چیز ہی یا بُری۔ پھر جس شے کو وہ قطعی طور پر بُرا جانتا ہی۔ اسے کیون معاوضہ موت مین تجویز کرے۔ جرمانہ ادا کرنا بُرائی مین داخل نہین ہی۔ لیکن اُس کے پاس زرومال نہین جو جرمانہ ادا کرسکے۔ شاید ایک مینا (Mina یعنی معہ ۱۱۱ سکہ عثمانیہ) ہوگا؛ حاضر ہی۔ اُس کے دوست کہتے ہین کہ تیس مینا (minae) تک دینا قبول کرلو اور وہ سب مل کر ادا کردین گے۔ چنانچہ وہ اُن کی خواہش کے مطابق انجمن کے سامنے تیس مینا پیش کرتا ہے۔ مگر اہل ایتھنس (Athens) اس کے لیے سزاے موت ہی تجویز کرتے ہین۔ جن لوگون نے اُس کے خلاف یہ تجویز کی اُن کو سخت ملامت کرتا ہی۔ اور پیشین گوئی کرتا ہی کہ ایک بڑا سخت عذاب اُن پر نازل ہونے والا ہی اور جن لوگون نے اُسے بُری تجویز کیا تھا اُن سے کہتا ہی کہ آپ سب لوگ ٹھہر جائین مین آپ سے باتین کرنا چاہتا ہون۔ اپنے حالات اور موت کے حالات اُن سے بیان کرتا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ "ایک نیک آدمی کو کوئی نقصان نہین پہونچ سکتا" اور ججون سے آخری استدعا یہ کرتا ہی کہ "جس طرح اُس نے ان کے ساتھ محاسبہ کرکے پریشان کیا ہی اُسی طرح وہ بھی اس کو لڑکون کے ساتھ برتاؤ کرین۔ اور اگر اس کو لڑکے زرومال کو خیر وصلاح پر ترجیح دین اور اپنے تئین بڑا آدمی سمجھین۔ درانحالیکہ وہ بڑے نہ ہون تو اُن کے ساتھ سختی کی جائے۔ وہ اپنے طرز عمل یعنی محاسبہ کی بابت بالکل افسوس ظاہر نہین کرتا۔ اور اہل ایتھنس (Athens) کے مقابلہ مین آستین چڑھا کر کھڑا ہوتا ہی۔ وہ جب اُن سے مخاطبت

کرتا ہی تو ہر شخص سے فرداً فرداً اور من حیث المجموع ہر طرح خطاب کرتا ہی لیکن نہایت محبت اور تلطف سے۔ کسی سے اُس کا لڑائی جھگڑا نہین ہی۔ وہ اُن کی کوتاہیون اور قصورون پر اظہار افسوس کیئے بغیر نہین رہ سکتا۔ یہ بھی اس کے درد دل اور محبت کا تقاضا ہی جو ان کی صلاح اور محاسبہ کے لیے آمادہ ہوتا ہی۔

فیصلہ مقدمہ کے بعد سقراط کو تیس روز تک محبس مین اس لیے انتظار کرنا پڑتا ہی کہ اہل ایتھنس (Athens) ہر سال ڈیلاس (Delas) مین جو اپالو (Appolo) کا بُت تھا اس کی خدمت مین ایک وفد بھیجا کرتے تھے۔ اِس وفد کی غیبت مین ایتھنس (Athens) مین کوئی شخص قتل نہین کیا جا سکتا تھا۔ یہ وفد ابھی روانہ ہوا تھا اور جب تک واپس نہ ہو جاتا سقراط کو سزاے موت نہین دی جا سکتی تھی۔ محبس مین جس استقلال کے ساتھ اپنے احباب کو پند و نصیحت مین اس نے وقت صرف کیا اس کی نظیر نہین مل سکتی۔ اُسی زمانہ مین ایک روز صبح تڑکے کرائٹو (Crito) اس کے پاس پہونچتا ہی۔ سقراط ابھی تک سو رہا ہی۔ کرائٹو معمولی اوقات سے کسی قدر قبل آیا ہی اور ایک ایسی خبر اپنے ساتھ لایا ہی جو سقراط سے زیادہ خود اُس کے لیئے تکلیف دہ ہی۔ وہ خبر یہ ہی کہ جو جہاز دفد کو لیکر واپس آرہا ہی وہ سونیوم (Sonium) تک پہونچ گیا ہی اور بہت جلد بندرگاہ پیریوس (Piraeus) مین داخل ہونے والا ہی۔ اس کے دوسرے روز سقراط کو شربت مرگ پینا ہو گا۔ کرائٹو پھر ایک مرتبہ اپنے عزیز دوست اور استاد کو بھاگ جانے پر آمادہ کرتا ہی اور کہتا ہی کہ یہ کام بہت آسانی سے ہو جائے گا۔ اور اُس کے دوستون کو بھی ضرر نہ پہونچے گا۔ اور اگر سقراط اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھاے گا۔ تو گویا وہ اپنے دشمنون کی من مانی مراد پوری کرے گا۔ اور اپنی اولاد کو لاوارث چھوڑ جاے گا۔ اور اپنے دوستون کے لیے تضحیک و ذلت کا سبب ہو گا۔ سقراط جواب دیتا ہی کہ ہمیشہ عقل نے اُس کی رہنمونی کی ہی۔ جس کے مقابلہ مین اُس نے عوام کی راے کی کبھی پروا نہین کی۔ وہ اس کی پروا نہین کرتا کہ لوگ کیا کہین گے لیکن اُس کا اسے بہت خیال ہی کہ امر حق سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ پس یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اس طریقہ کا فرار امر حق پر مبنی ہو گا یا باطل پر۔ اور کرائٹو (Crito) اور دیگر احباب جو سعادت کرینگے وہ حق کی معاونت کرینگے یا باطل کی اسپر سقراط تفصیل کے ساتھ کرائیٹو سے گفتگو کرتا ہی۔ اور اپنے قدیم محاسبہ اور سوال و جواب کے طریقہ پر بحث کر کے اس نتیجہ پر پہونچتا ہی کہ اگر وہ محبس سے فرار اختیار کرے گا تو ملک کو نقصان پہونچے گا۔ ایک ایسا شہر جس کے عام باشندے اپنی مرضی کے موافق عدالتی فیصلون کو توڑ دیا کرین اور ان کی پروا نہ کیا کرین کبھی باقی

نہین رہ سکتا۔ اِس کی بربادی لازمی ہی۔ ممکن ہی کہ ایک شخص کو بلا وجہ حکم سزا دیا گیا ہو گو اس کے معنی یہ ہین کہ یا تو قوانین خود خراب ہین یا اُن کا استعمال خراب ہی۔ باین ہمہ کسی فرد واحد کو عدالت کے مقابلہ مین قانون اپنے ہاتھ مین لینا نہ چاہیے۔ ہر شخص کا یہ فرض ہی کہ اُس ملک کی خاطر جسمین وہ رہتا ہی اپنی انفرادی راے اور ذاتی مرضی کی پروا نہ کرے اور سب پرسے اپنی ایک ذات کو قربان کردے ورنہ سلطنت قائم نہین رہ سکتی۔ اِن سب باتون پر غور کرنے کے بعد سقراط اپنے دوستون کو سمجھاتا ہی کہ مجھے یہین رہنے اور مرنے دو۔ وہ ایک مظلوم کے مانند دنیا سے جائے گا اور دوسرے عالم مین اُس پر نوازشات ہون گے۔

جس روز وفد کا جہاز بندرگاہ پر پہونچتا ہی۔ فیڈو (Phaedo) اور تمام دیگر احباب دوسرے ہی دن صبح تڑکے سے سقراط کے پاس جاتے ہین۔ اُن کی روایت ہی کہ عمال محبس ہمین سقراط کے پاس پہونچاتے ہین جہان ابھی ابھی اُس کے پیرون سے بیڑیان دور کی گئی تھین اور اس کی بیوی زن تھیپ (Xanthippe) بیٹھی پاس رو رہی تھی۔ زان تھیپ (Xanthippe) کو وہان سے ہٹا دیتے ہین اور سقراط رنج و راحت کے باہمی تعلقات پر گفتگو کرتا ہی۔ رفتہ رفتہ خودکشی کا ذکر آتا ہی جسے سقراط سخت ناپسند کرتا ہی اور مبنی بر باطل ٹھہراتا ہی وہ کہتا ہی کہ ایک حکیم کو ہمیشہ موت سے محبت کرنا چاہیے۔ مگر خودکشی کرنا درست نہین۔ فلسفہ کے معنی در اصل مطالعہ احوال موت کے ہین۔ ایک فلسفی کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ جلد اِس جسمانی قید سے نجات حاصل کرلے۔ اور اپنے مقصود یعنی اس علم کو حاصل کرے جو صرف موت کے بعد نصیب ہوتا ہی۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہین وہ حکمت و دانش سے محبت نہین رکھتے اپنے جسمون اور زر و مال اور عزت کو دوست رکھتے ہین۔ اُن مین اگر جرءت آتی ہی تو ایک بدتر شے کے اندیشہ سے اور اعتدال و میانہ روی کو وہ اس لیے پسند کرتے ہین کہ یہ اعتدال بعض راحتون اور سامان عیش و نشاط سے روکتی رہتی ہی۔ ایسی صفت کو خیر یا نیکی کے نام سے موسوم نہین کرسکتے۔ یہ بالکل جھوٹی نیکی اور غلامانہ صفت ہی۔ حقیقی نیکی تزکیۂ نفس مین مضمر ہی۔ جو لوگ تزکیۂ نفس کرلیتے ہین وہ موت کے بعد بڑے بڑے بزرگون کی صحبت مین پہونچ جاتے ہین۔ یہی وجہ ہی جو سقراط موت سے نہین گھبراتا۔ موت اور بقاے روح کے مسئلہ پر اچھی خاصی گفتگو ہوتی ہی جس کے آخر مین وہ کہتا ہی کہ "آدمی کو چاہیے کہ بجائے جسم کے روح سے لگاؤ پیدا کرے اور موت کا غم نہ کرے کیونکہ موت اس بند سے خلاصی کا نام ہی"۔ چونکہ وقت تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے اس قدر تقریر کرکے خاموش ہوگیا۔ اور غسل کرنے کے لیے اُٹھا تاکہ موت کی تیاری

کرے۔ کرائٹو (Crito) اُستاد سے پوچھتا ہی کہ آپ کی آخری وصیت کیا ہی۔ اور تجہیز و تکفین کس طرح کرنی چاہیے۔ سقراط کہتا ہی کہ احباب کو اختیار ہی جس طرح چاہین اول منزل پہونچا ئین۔ یہ کہکر کرائٹو (Crito) کے ہمراہ غسل کے لیے جاتا ہی اور اپنے بال بچون سے رخصت ہوتا ہی اُس کے بعد بہت کم گفتگو کی نوبت آتی ہی۔ زہر کا پیالہ لایا جاتا ہی اور سقراط اُسے نہایت اطمینان سے پی لیتا ہی۔ اور جلاد سے طالب ہدایت ہوتا ہی جلاد کہتا ہی کہ تھوڑا ٹہلو جب پیر بھاری ہونے لگین تو لیٹ جاؤ۔ سقراط اس کی تعمیل کرتا ہی اور جب اُس کے پیر بھاری ہونے لگتے ہین تو وہ لیٹ جاتا ہی۔ جلاد پیرون کو دبا کر دیکھتا ہی کہ انمین کچھ حس باقی ہی یا نہین۔ اور سقراط سے حال پوچھتا ہی۔ سقراط کہتا ہی کہ کوئی حس نہین رہا۔ یہی بے حسی اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہی نزع روح کے چند لحمہ قبل اُسے ایک بات یاد آتی ہی اور وہ مُنھ پر سے چادر ہٹا کر کرائٹو (Crito) سے کہتا ہی کہ دیکھو اسیلی پیوس (Asclepius) کو میری طرف سے ایک مُرغ دیدینا اُس کے بعد منھ بند کر لیتا ہی اور تشنج کے سی ایک کیفیت کے بعد روح پرواز کر جاتی ہی۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہ راجعون۔

(۳)

سقراط کے پہلے جو حکما تھے وہ بالکل طبیعات اور ما بعد الطبیعات کے دائرہ مین محدود رہا کرتے تھے۔ انھون نے بھی عالم کے معمہ کو حل کرنا چاہا اور اُس کی حقیقت معلوم کرنی چاہی تھی۔ اور اصول ہائے اولین مثلاً ہوا۔ آگ۔ پانی۔ کو دریافت کرنے اور حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ یہ سوال کیا کرتے تھے کہ اشیا کیونکر وجود مین آتی ہین۔ اور کیسے زندہ رہتی ہین۔ اُن مین فساد کیون پیدا ہوتا ہی لیکن پانچوین صدی قبل مسیح مین لوگون کو اُن کی تعلیم سے اطمینان مفقود ہونے لگا۔ اس لیے لوگون نے اُن کی طرف سے بے اعتنائی شروع کر دی۔ مثلاً اہل اتھنس (Athens) کو جن امور کی ضرورت تھی وہ بجائے اسرار عالم کے افراد شخصی اور سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ لوگ انصاف و ظلم۔ حق و باطل۔ خوب و زشت کے معنی مین بحث کرنے لگتے تھے۔ اور پوچھتے تھے کہ انصاف۔ حق اور خوب سے کیا مراد ہی۔ ایک شے کو انصاف کے مطابق کب کہتے ہین ؟ درست اور اچھا کسے کہتے ہین ؟ سقراط سے پہلے کے حکما ان سوالات کا جواب نہین دے سکتے تھے۔ انھین معاملات انسانی سے تعلق نہین رہا تھا بلکہ محض طبیعات اور ما بعد الطبیعات مین انہماک رہا کرتا تھا۔ چونکہ لوگون کی طبیعت اب ادھر سے ہٹنے لگی تھی اور وہ اخلاقی اور سیاسی بحثون مین پڑنا چاہتے تھے۔ اور سوفسطائی اُن کا کسی قدر جواب دیتے اور ان بحثون پر گفتگو کرتے تھے۔ اس لیے اہل اتھنس (Athens)

انھین تنخواہین دے دے کر بیرون ملک سے بلاتے اور نوکر رکھا کرتے تھے۔ مگر اس وقت ہمین سوفسطائیون کے فلسفہ کی تنقیح کرنی مطلوب نہین ہی۔ اِس لیے اُن کی تعلیم کی بھلائی بُرائی کسی کا ذکر کرنا نہ چاہیے۔ صرف اتنا ضرور کہا جاتا ہی کہ جس اخلاق کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ اُن پریشان خیالات اور متضاد تصورات اور بے جوڑ سیاسی مسائل پر مشتمل تھی۔ جن کا ایتھنس (Athens) مین چرچا ہو رہا تھا۔ اور بہت سی معمولی معمولی غیر مربوط و پیچیدہ باتون کی تنقیح و تدقیق کی سخت ضرورت تھی کہ راہ کج سے لوگ راہ راست پر آسکین یہ ایسی شدید ضرورت تھی کہ اُس کو رفع کرنے کے لیے خدائے تعالٰی نے سقراط کو بھیجا جس نے ہر ایک سے محاسبہ کرنا اور اُس کے خیال کی تنقیح کرنا اپنا فرض منصبی قرار دیا اور آخر عمر تک اسی کام مین منہمک رہا۔

اُس کا مقصد یہ تھا کہ لوگون کو حق بات کی تمیز حاصل ہو تاکہ اسی حق کی معیار پر تمدنی اور سیاسی قابلیت کو جانچا جا سکے اور ملک مین غلط اور باطل کو صحیح اور حق کے پردہ مین فروغ نہ حاصل ہو۔ سوفسطائیون کو افلاطون اُس شخص سے مطابقت دیتا ہی جس نے تجربہ سے ایک عظیم الشان اور خطرناک جانور کے مزاج اور ضرورتون کو سمجھ لیا ہی اور یہ جان لیا ہی کہ کس وقت اُس کے قریب جانا چاہیے۔ اور کس چیز سے اُسے غصہ آتا اور کس شے سے وہ راضی ہوتا ہی اور اُس کی مختلف آوازون کے کیا معنی ہین۔ اِس علم کو حاصل کر کے وہ شخص یہ دعوی کرتا ہی کہ یہی حکمت اور دانش ہی۔ اور اُس کو ایک فن بنا کر تعلیم دینا شروع کرتا ہی۔ جس شے سے جانور راضی ہوتے ہین اُس کو وہ حق بتلاتا ہی اور جس سے وہ ناراض ہوتے ہین اُسے باطل قرار دیتا ہی۔ اور یہ بالکل نہین جانتا کہ اُس کی کون سی خواہش اور ضرورت واقعی درست ہی اور کون سی نادرست۔ اسی کی تعلیم کے لیے سقراط دنیا مین آتا ہی۔ سوفسطائیون کی طرح وہ بھی اخلاقی اور سیاسی مسائل سے بحث کرتا ہی۔ زینوفن (Xenophon) کہتا ہی کہ سقراط ہمیشہ ان امور پر گفتگو کیا کرتا تھا جو آدمیون سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ پوچھتا رہتا تھا کہ زہد و تقوی کس کا نام ہی۔ رندی و خرافاتی کسے کہتے ہین؟ شریفانہ بات سے کیا مراد ہی؟ کمینگی کسے کہتے ہین؟ انصاف کیا شے ہی؟ بے انصافی کسے کہتے ہین؟ اعتدال اور میانہ روی سے کیا مراد ہی؟ دیوانگی و جنون کیا شے ہی؟ جرأت کیا ہی؟ بزدلی کیا ہی؟ ملک و ریاست کیا ہی؟ مدبر کسے کہتے ہین؟ حکومت کس کا نام ہی؟ انسان کو حکومت کے قابل کون شے بناتی ہی؟ وغیرہ وغیرہ جو لوگ اِن سوالون کا جواب دے سکتے تھے انھین وہ اچھے لوگ کہتا اور جو جواب نہ دے سکتے انھین کہتا کہ یہ غلامون سے بہتر نہین ہین۔ مختصر یہ کہ حکمائے متقدمین اشیائے فطرت سے انہماک رکھتے تھے۔ اور سقراط خود انسان سے گفتگو کرتا تھا جس شے کے متعلق

کہ سوفسطائی محض قاعدہ اور صورت بتا کر الگ ہو جاتے تھے۔ سقراط اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا جسے، اس زمانہ مین لوگ علم کہا کرتے تھے۔ سقراط اس کی خرابیون اور لغویتون سے خوب واقف تھا وسیع المعنی الفاظ مخصوص معنون مین سمجھے جانے لگے تھے اور وسیع مفہوم کے لفظ کو ایسے الفاظ کے بجائے استعمال کیا کرتے تھے جن کے معنی کا میدان تنگ ہوا کرتا تھا۔ فرد اور جنس کے لیے الفاظ مین تمیز باقی نہین رہی تھی۔ ارسطا طالیس کا بیان ہر کہ سقراط کی طرف دو شے منسوب کی جا سکتی ہین۔ ایک تو طریقہ استقرا دوسرے اصطلاح عامہ کی تعریف۔ اس کے پہلے تک وہ الفاظ جو روزمرہ معمولی معمولی مفہوم کے لیے استعمال ہوتے تھے واضح اور محدود معنی کے ساتھ مخصوص نہ تھے۔ جو شے اُن کے برسون کے جذبات شاعری اقتدار روایات سے پیدا ہو گئی تھی اس کی اصلاح عقل مدرکہ نے اُس وقت تک نہین کی تھی۔ شعرا خود اپنے لفظون کی توضیع نہین کر سکتے تھے۔ صاحبان فن یہ دعویٰ رکھتے تھے کہ چونکہ اُنھین فن کے متعلق کافی علم حاصل ہر۔ اس لیے دیگر اہم امور مین بھی اُنھین واقفیت ہر۔ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جسکے لوگ یہ دعوی نہ کرتے ہون کہ ہمین خاص علم حاصل ہر۔ درانحالیکہ وہ بالکل جاہل ہوتے تھے اور سقراط کی تحدید و محاسبہ کو بے ضرورت موشگافی کہا کرتے تھے۔ غرض کہ جن اصول پر سقراط اُن کی اصلاح کرنا چاہتا تھا وہ

(۱) ایسی حقانیت پر مشتمل تھی جنھین دانش و حکمت کے معیار پر جانچ لیا گیا ہو۔ اور عقل انھین قبول کرتی ہو۔

(۲) جن کے معلوم کرنے کے لیے لوگون کے علوم کی تنقیح اور محاسبہ کی سخت ضرورت تھی۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگون کو ان کی جہالت کے جہل سے بیدار کیا جائے اور اُن کی خامیون کو اُن کے سامنے اُنھین سے تسلیم کرا کے پیش کر دیا جائے۔

سقراط کی طبیعت مین جو سب سے زیادہ شے نمایان تھی وہ اُس کا سخت مذہبی میلان تھا۔ افلاطون کہتا ہر کہ اس کی تمام خصوصیات طبع پر گہرا مذہبی رنگ غالب تھا۔ اُس کے نزدیک مذہب کا مفہوم بُت پرستی یا دیوتاؤن کا سلسلہ نہین تھا۔ یونانی دیوتاؤن کے افسانون مین جو لغو حکایتین ہین انھین وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس وقت لوگون نے اُسے یہ الزام دیا کہ ایتھنس (Athens) کے دیوتاؤن کو وہ نہین مانتا تو گو اُس نے ملحد ہونے سے قطعی انکار کیا مگر اُن کے دیوتاؤن کو ماننے کا بھی اقرار کبھی نہین کیا۔ اس کے جواب الزام کے آخری الفاظ یہ تھے :-

"اہل ایتھنس (Athens) مین خدا کو بیشک مانتا ہون اور اسی طرح مانا کرتا ہون جسطرح میرے الزام دینے والے اپنے دیوتاؤن کو مانا کرتے ہین اور تمھارے اور تمھارے خدا ہی کے سپرد مین اپنے معاملہ کو کرتا ہون۔ جو کچھ تمھارے اور میرے لیے سب سے بہتر ہو وہ تصفیہ کرد"

سقراط کا خدا وہی تھا جو افلاطون کا تھا۔ اس کی صفت خیر ہی اور وہ تمام خیر کا منبع ہی۔ وہ خدا جسے کسی نے نہین دیکھا۔ صرف خدا ہی کی ذات سب اشیار کی دانا بینا ہی۔ وہ خیر کی شر سے محافظت کرتا ہی۔ وہ انسانون پر اپنی مرضی لسانہ غیب کے ذریعہ ظاہر کرتا ہی۔ اُس کے احکام و قوانین سب سے بالاترین اور ہر طرح اُن کی اطاعت کرنی چاہیے۔

سقراط حکمت و دانش کی تلاش اس لیے کرتا ہی کہ خدا نے اُسے اِس کام کے لیے مقرر کیا ہی۔ اس کام کو وہ ہمیشہ خدا کے کام کے نام سے یاد کرتا ہی جسے ہر خطرہ کا مقابلہ کرکے انجام دینا چاہیے۔ اور جس کی راہ سے اُسے پھیرنے والا نہ خوف ہوسکتا ہی اور نہ خطرہ۔ اہل ایتھنس (Athens) کو وہ مخاطب کرکے کہتا ہی کہ مجھے تمھاری بڑی خاطر منظور رہی اور تم سے بڑی محبت کرتا ہون لیکن اطاعت خدا ہی کی کرون گا۔ تمھاری نہین اور اُسی اطاعت الٰہی مین اُس نے جان دے دی۔

سقراط یہ سمجھتا تھا کہ اُسے خدا کی طرف سے ایک قسم کا پیام ایک برہان ربانی کے ذریعہ پہونچتا رہتا ہی۔ اس برہان کو ایک جگہ وہ خدا کی آواز کہتا ہی جو بچپن سے اس وقت تک اس کے ساتھ ہی۔ اور ہمیشہ اُسے چھوٹی سی چھوٹی باتون مین بھی تنبیہ کرتی رہتی ہی۔ یہ آواز ہمیشہ امتناعی ہی اور بعض افعال سے باز رکھتی ہی یعنی جس شے کو خدا چاہتا ہی کہ یہ نہ کرے اُسی برہان کے ذریعہ سے منع کر دیتا ہی اور اگر یہ چاہتا ہی کہ یہ کرے تو اُس طرف سے خاموش رہتا ہی اور کوئی ممانعت نہین ہوتی یہ "برہان ربانی" اُسے لوگون سے محاسبہ کرنے سے منع نہین کرتی۔ اور وہ اس کام سے باز بھی نہین رہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ خداے جل وعلیٰ کی حکم عدولی ہوئی۔ زینوفن (Xenophon) کو اپنے استاد سے باطنی کچھ حصہ نہین ملا تھا۔ اس لیے وہ اسے سمجھ نہ سکا اور اُس کی یہ تاویل کرنے لگا کہ قوت فیصلہ کو فی الفور کام مین لانے کی یہ ایک قوی استعداد تھی جو اشیار کے علم پر مبنی اور تجربہ کی بنیاد پر پختہ ہو گئی تھی۔ اور بغیر آگاہی سلسلہ علت و معلول و اطلاع واسطہ درمیانی کے نتیجہ پر پہونچا دیا کرتی تھی۔ لیکن افلاطون جیسے اُستاد سے باطنی دولت بھی ملی تھی خاموش رہتا ہی اور اُس کی تاویل کرنے سے گریز کرتا ہی۔

سقراط کہتا ہو کہ ہمین بدی کا عوض بدی سے نہین کرنا چاہیے۔ اِس کے ہمعصر اِس قسم کے خیالات کو حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یونانیون کا اخلاق یہ تھا کہ اپنے دوستون سے بھلائی کرو اور اپنے دشمنون کو نقصان پہونچاؤ۔

سقراط بدی کے عوض بدی کرنے کو نادرست کہتا ہو۔ وہ کہتا ہو جب بدی کرنا بجائے خود درست نہین تو کسی صورت مین اُسے درست نہین کہہ سکتے۔ وہ اپنے اہل وطن سے کہتا ہو کہ:۔

"مین تمھین خدا کا گناہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہون۔ مجھے الزام مت لگاؤ۔ اور مین جو تمھارے لیے انعام الٰہی ہون مجھے ردست کرو۔ اگر تم مجھے قتل کردوگے تو میرا جانشین آسانی سے نہ مل سکے گا۔ خدا نے تمھارے شہر مین مجھے بھیجا ہو۔ اگر مجھے خواہش نفسانی ہوتی جیسا کہ سب انسانون مین ہوا کرتی ہو تو مین اپنے ذاتی نفع و نقصان کے باتون کی طرف سے غفلت نہ کرتا۔ اور اپنے خانگی کامون کو اتنے سال تک برباد نہ ہونے دیتا۔ مجھے تمھارے کام نے ہمہ وقت مشغول رکھا ہو، مین تم مین سے ہر ایک کے پاس باپ یا بڑے بھائی کی طرح جاتا ہون۔ اور خیر و صلاح کی طرف مائل کرتا ہون۔ مجھے خدا کی طرف سے ایک بُرہان ربانی عطا ہوا ہو۔ اس خدا کے میلیٹوس (Meletus) تضحیک کرتا ہو۔ یہ بُرہان میرے ساتھ بچپن سے ہو۔ یہ ایک قسم کی آواز ہو جو مین سنتا ہون۔ اور جب مین اُس وقت کرتا ہون اگر نامناسب ہو تو اُس سے مجھے روک دیا کرتی ہو۔ لیکن کسی کام کے کرنے کا حکم نہین دیتی۔ یہی آواز مجھے سیاست مین دخل دینے سے روکتی رہتی ہو۔ ایتھنس (Athens) والو گوش دل سے میرے حالات سُن لو تاکہ تمھین معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص ایسا نہین ہو جو موت کا ڈر دلا دیکر باطل کے ارتکاب پر مجھے مائل کر سکے۔ مین مر جانا پسند کرون گا لیکن باطل پر مائل ہونا پسند نہ کرون گا۔ وہ کہتا ہو کہ موت کوئی بُری شے نہین ہو بلکہ ایک طور پر دکھین تو اچھی شے ہو۔ موت کی حالت دو حال سے خالی نہین۔ یا تو ہستی بالکل معدوم ہو جائے گی۔ اور تمام احساسات باطل ہو جائین گے یا وہ ہو جیسا کہ عام طور پر لوگ یقین کرتے ہین کہ موت سے روح کا ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونا مراد ہو۔ اگر موت سے تمام احساسات کا بطلان مراد ہو اور وہ اس نیند کے مانند ہو جو کسی خواب سے پریشان نہین ہوتی تو یہ ایک عجیب نفع کی چیز ہو اگر کوئی کسی ایک

رات کو کہے کہ مین اِس شب کو اِس طرح سویا کہ کوئی خواب تک نہین نظر آیا۔ اور اُس شب کا
مقابلہ اپنی زندگی کے دوسرے راتون سے کرے اور پھر اس سے پوچھا جاے کہ اس رات
سے زیادہ پُرفرحت تم نے کون سا دن یا رات بسر کی ہو تو میرا خیال ہو کہ کیا راجہ اور کیا پرجا
سب ہی اُس رات یا اُس قسم کی دوسری راتون کو آسانی سے شمار کر کے بتلائین گے۔ اگر یہی معنی
موت کے ہین تو مین اُسے ایک نفع سمجھتا ہون۔ لیکن اگر موت کے معنی ایک مقام سے دوسرے
مقام تک سفر کرنے کے ہین اور عام عقیدہ صحیح ہو کہ جسقدر لوگ آچکے ہین سب اس دوسرے
مقام مین موجود ہین تو اس سے زیادہ بھلائی میرے لیئے اور کیا ہو سکتی ہو مین ایسی موت
دس مرتبہ مرنے کو تیار رہون جو مجھے وہان پہونچا دے جہان بڑے بڑے سب لوگ موجود ہین اور
مین اُن سے ملاقات کر کے علم حاصل کر سکون۔ وہ کہتا ہو کہ اضداد اضداد سے پیدا ہوا کرتی
ہین۔ اس لیے زندگی سے موت پیدا ہوتی ہو اور موت سے زندگی۔ ہمارا تمام علم اِن باتون
کے ایک قسم کی یاد ہو جو کسی زمانہ ماسبق مین ہمین معلوم تھین۔ پس ہماری ارواح ضرور اجسام
مین داخل ہونے سے پہلے زندہ رہی ہونگی۔ روح بہ سبب جسم کے کم فساد پذیر ہو۔ جسم بھی اگر
اُسے حنوط کر کے رکھدیا جاے تو صدیون تک خراب نہین ہوتا۔ اور اُس کے بعض اجزا مثلاً استخوان
قریب قریب ہمیشہ باقی رہا کرتے ہین۔ جب جسم کی یہ حالت ہو تو روح کیا موت کے بعد فنا ہو سکتی
ہو۔ وہ ہرگز فنا نہین ہوتی۔ وہ اپنے سامعین سے مخاطب ہو کر کہتا ہو کہ آپ سب تصورات مجرد
کے وجود کے قائل ہین۔ سقراط کے خیال مین یہ تصورات مظاہر قدرت کے اسباب ہین اشیاء
جمیل کا سبب جمال ہو۔ اور اشیا عظیم کا سبب عظمت ہو۔ وقس علیٰ ہذہ۔ جو تصورات ایک
دوسرے کے متضاد ہین ایک ہی شخص مین وقت واحد مین موجود نہین رہ سکتے۔ اگر یہ کہا جائے
کہ سمیاس (Semmas) لمبا اور چھوٹا دونون ہو اس لیے کہ وہ مجھے (یعنی خود سقراط سے)
لمبا اور فیڈو (Pheado) سے چھوٹا ہو تو کہا جاے گا کہ یہ دونون متضاد صفتین مقابلتہً
جمع ہوئی ہین۔ ایک کے مقابلہ مین وہ لمبا ہو اور دوسرے کے مقابلہ مین چھوٹا۔ چھوٹا اور لمبا دونون
ایک ہی کے مقابلہ مین کوئی نہین ہو سکتا۔ اس نظریہ پر اگر مزید نظر ڈالی جاے تو یہ معلوم ہوگا کہ
ایک تصور یہی نہین کہ اپنے متضاد تصور کے ساتھ رہنا پسند کرے گا۔ بلکہ جو اشیا متضاد تصور کے

جزء لاینفک ہین۔ اُن کے ساتھ بھی رہنا پسند نہین کریگا۔ مثلاً سردی کا ضد گرمی ہی۔ سردی جس طرح گرمی کی برداشت نہین کرسکتی۔ اسی طرح وہ آگ کی بھی برداشت نہین کرسکتی جو حرارت کا جزو لاینفک ہی۔ ایک ہی شی مین حرارت و برودت دونون ایک ساتھ جمع نہین ہوسکتیں یہ حالت زندگی کی ہی جو موت کی ضد ہی۔ حیات و روح دونون باہم جزو لاینفک ہین پس روح اور موت کا ساتھ کہین نہین ہوسکتا اور روح کو کبھی موت نہین آسکتی۔ وہ لازوال ہی اس لیے غیر قابل فساد ہی۔ جب ایک شخص مرجاتا ہی تو اس کی روح محفوظ ڈمون جسم سی منقطع ہوکر چلی جاتی ہی۔ یہان تک بیان کرکے پھر سقراط پوچھتا ہی کہ جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ روح جسم کے بعد بھی زندہ رہتی ہی تو اُس کی طرف سے غفلت کرنا کتنا خطرناک کام ہی

روح را تو سید الله خوشتر است غیر ظاہر دست و پاے دیگر است
روح دارد بے بدن بس کاروبار مرغ باشد در قفس بس بیقرار
باش تا مرغ از قفس آید برون تا بہ بینی ہفت چرخ اندر زبون

حامد علی

جذبۂ قناعت

(از ایڈ ناظم عدالت دلیچو)

رات آخر ہوئی مین نیند سی بیدار ہوا صبح کے چار بجے اور گجر بجنے لگا
لب پہ تھا نام خدا۔ ذکر خدا۔ شکر خدا بند آنکھون مین مگر نیند کا باقی تھا مزا
کسل کہتا تھا ابھی وقت ہی پھر سو جاؤ
دل یہ کہتا تھا کہ سرگرم دعا ہو جاؤ
آخر الامر مین یون صرف مناجات ہوا اے کبیر الکبرا بادشہ ہر دوسرا
مالک الملک ہی عالم پہ ہی قبضہ تیرا تیرے احکام کا پابند ہی ہر ہر ذرا
تو نہ چاہے تو کسی کو کہین کچھ ملتا ہی
بے ترے حکم کے پتہ بھی کہین ہلتا ہی
گو سمجھتا ہی جہان صاحب دولت مجکو فی الحقیقت ہی ابھی اور ضرورت مجکو
قابل شکر ہی بخشی ہی جو عزت مجکو بار خاطر ہی حریفون کی عداوت مجکو

دغدغہ دور ہو عزت بھی سوائی ہو جائے
دشمنون کی جو ذرا چشم نمائی ہو جائے

فضل سے دی نے مجھے اولاد بھی اور نیک نہاد
اب یہ خواہش ہر کہ کثرت سے ہو اُن کی اولاد
آل و اولاد کی جانب سے رہون مین دلشاد
رات دن جلتے رہین آتشِ غم مین حساد

یہ تمنا ہر کہ محسودِ جہان ہوکے رہون
جاؤن دنیا سے تو فردوس مکان ہوکے رہون

گو ہم آغوشِ تشکر تھین دعائین میری
تھی مگر شکر کے جلوون مین جھلک شکوون کی
مین مناجات سے فارغ ہی ہوا تھا نہ ابھی
کان مین ایک سُریلی سی صدا آنے لگی

دلکشی کا عجب انداز اُس آواز مین تھا
عبد و معبود کا اِک راز اُس آواز مین تھا

نغمہ پرداز سرِ بام وہ اِک چڑیا تھی
جسکو شاما بھی کہا کرتے ہین کنڈولی بھی
محوِ تسبیح تھی اور دل تھا وساوس سے بری
نہ کسی قسم کی خواہش نہ شکایت کوئی

کیا بتاؤن کہ ہوئی مجھکو ندامت کیا کچھ
دانے دُنکے پہ تھی چڑیا کو قناعت کیا کچھ

طالبِ جاہ نہ تھی طالبِ توقیر نہ تھی
آرزوے صلۂ خلعت و جاگیر نہ تھی
آشیان کے لیے کچھ خواہشِ تعمیر نہ تھی
دشمنون کے لیے کچھ طالبِ تعذیر نہ تھی

ذوقِ توحید مین تسبیح و ثنا کرتی تھی
شکر خالق کی عنایت کا ادا کرتی تھی

شکر کو اُس کے نہ تھی شکوۂ بیجا سے غرض
ذکر کو اُس کے نہ تھی خواہشِ دنیا سے غرض
اُس کو احباب کی پروا تھی نہ اعدا سے غرض
ہر گھڑی تھی اُسے خوشنودیِ مولا سے غرض

میرے اللہ مجھے بھی یہی دولت دیدے
چاہے کچھ لے لے مگر ذوقِ قناعت دیدے

روح نے بچا لیا

یہ کہانی مسٹر لیڈ بیٹر کی کتاب پرنیوم آف ابجیکٹ سے ترجمہ کی گئی ہے۔ عرصہ ہوا اس کتاب کے ترجمہ کی اجازت مصنف سے لی گئی ہے لیکن کم فرصتی کی وجہ سے یہ ترجمہ مکمل نہیں ہو سکا۔ اسی کتاب کی چند کہانیاں رسالہ شباب اُردو لاہور مین شائع ہو چکی ہین اب کل کتاب کا ترجمہ انشاء اللہ تعالی عنقریب کتابی صورت مین شایع ہوگا۔ قابل مصنف اپنے دیباچہ مین فرماتے ہین کہ یہ واقعات سچے ہین جو کچھ تو اُنکے ذاتی مشاہدات ہین اور بعض اُن کے دوستون کے ذاتی تجربات ہین اس لیے اُن مین کسی شبہ کی گنجائش نہین۔ قابل مصنف ایک صوفی مزاج بزرگ ہین۔ افسوس یہ ہے کہ اب تک مسز اینی بیسنٹ کے پیرو اور معتقد اسلامی تصوف سے بیگانہ محض ہین۔ اسی وجہ سے وہ اپنی کتابون مین اسلام پر بعض جگہ غلط بیانیان کر گئے ہین۔ ممکن ہے کبھی اللہ تعالی مترجم کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ اسلامی تصوف کا آئینہ ان حضرات کے سامنے پیش کرکے اُن کو اُن کی اصلی کیفیت سے آگاہ کرسکے اور پھر وہ اسلامی تجلیون سے چکا چوند مین آجائین۔

(محمد ظفر)

پہلا باب

میرا نام ڈکٹر کنگ نارمن ہے اور اب مین بڈھا آدمی ہون۔ اپنے بچپن کے جن واقعات پر مین قلم اُٹھانے والا ہون اب سے پچاس سال پہلے کی باتین ہین۔ لیکن اس وقت بھی اُنکی یاد میرے لیے دلخراش ہے اور مین واقعات کے اُن پرانے گڑے مُردون کو اُکھاڑ کے اُن کی سنسنی خیز ہوشربائیون کو ہرگز تازہ نہ کرتا اگر ایک معزز دوست کی درخواست نہ ہوتی جن کی خواہش میرے لیے بمنزلۂ قانون ہے۔ اس حکم کی تعمیل مین مین اپنا قصہ شروع کرتا ہون۔ البتہ اس تماشہ کے بعض افراد کے اصلی نام مین نے بدل دیے ہین۔

میرے باپ نارمن کنگ نارمن اپنے شباب مین لندن کے ایک مشہور آدمی تھے اور یہ بہت کچھ بدنام ولیم چہارم کا زمانہ تھا۔ میری مان سے شادی کرنے کے بعد وہ لندن کے آسمان سے جس کا وہ ایک چمکدار تارا تھے یکایک غائب ہوگئے اور نارمن ہال مین جو شمالی علاقہ مین اُن کا آبائی مکان

تھا. سال کا سارا حصہ گذارنے لگے۔

جب ریلون کا چرچا ہونے لگا انھین اُن مین ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اُن کو اُن کا مستقبل بہت عظیم الشان نظر آیا اس لیے اُنھون نے اپنے سرمایہ کا بہت بڑا حصہ اُن مین لگا دیا۔ جب مین تیرھوین سال مین لگا وہ ایک ریل کے جو جنوبی امریکہ مین زیر تعمیر تھی ایک نمایان مہتمم تھے اور اُس کے سلسلہ مین اُنھین اُس براعظم مین جانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دُخانی جہاز پیہ کے ذریعہ چلائے جاتے تھے۔ اندنون یہ سفر بڑا خطرناک تھا۔

وہ اہل وعیال اپنے ساتھ لے گئے جن مین میری ماں. مین خود اور میرا چھوٹا بھائی جو سات سال کا بچہ تھا شامل تھے۔ ہم نے ایک بندرگاہی قصبہ مین جو ایک ریل کا اختتامی مقام تھا مکان لے لیا۔ اس ملک کے قیام کا بہت زمانہ ہم نے اس مین گذارا۔ لیکن میرے والد کو کاروبار کی وجہ سے اندرون ملک مین جہان ریل غیر مکمل تھی اکثر جانا پڑتا تھا۔ میرا خیال ہو کہ ٹھیکہ دار کسی وجہ سے اس کام کو جاری نہ رکھ سکے۔ اس لیے بالآخر میرے والد نے کمپنی کی جانب سے ریل کی تکمیل کا کام اُن کے ہاتھون سے لے لیا۔ کام کی اس تفصیل کے متعلق میرا خیال درست ہو یا غلط بہرحال اتنا مجھے معلوم ہو کہ ابتدائی چند ماہ بعد میرے والد اس قصبہ سے اکثر اور تا دیر غیر حاضر رہتے تھے۔

اِن چند سفرون مین مین نہایت خوش تھا میرے والد مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور ایک مرتبہ جس کا تذکرہ مین کرنے والا ہون میرا چھوٹا بھائی جیرلڈ بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ میری ماں کی متفکر نظرون نے اس چھوٹے بچہ مین طاقت کے گھٹنے کے خفیف آثار جانچ لیے تھے یا ممکن ہو یہ اُن کا محض خیال ہی خیال ہو۔ بہرحال یہ سوچا گیا کہ کھلے میدان مین ڈیرہ ڈال کے رہنے سے تبدیل آب وہوا ہو جائیگی اور اس سے اُس کی صحت پر خوشگوار اثر پڑے گا۔

اُن لوگون کو جنھین جنوبی امریکہ مین رہنے کا اتفاق نہین ہوا اپنا قصہ سمجھانے کے لیے مین ضروری سمجھتا ہون کہ اس عجیب وغریب براعظم کے تمدنی حالات اختصار سے بیان کرون جس علاقہ مین میرا قصہ پیش آیا ہو اس مین چار قومین آباد ہین یا اُس وقت جس کا مین ذکر کر رہا ہون آباد تھین۔

شروع مین ہسپانوی اور پرتغالی فاتحون کی نسلون کا ذکر کرتا ہون۔ یہ نسل مغرور اور

ـــسرت الوجود تھی۔ اس نسل مین خوبیان بھی تھین یہ لوگ صحبت یافتہ اور متواضع تھے لیکن ان مین ایک بہت بڑا عیب یہ تھا کہ دوسری قومون سے خواہ وہ کوئی ہون سخت نفرت کرتے تھے یا اس کا اظہار کرتے تھے۔

ان کے بعد سُرخ رو دیسی تھے جو اس سرزمین کے ابتدائی مالک تھے۔ ان مین سے بہت سے جرگون نے ایک قسم کی ادھ کچری بھدی تہذیب اختیار کر لی تھی۔ لیکن اور بہت سے جرگے اس وقت تک وحشی تھے جو رام نہین ہوئے تھے اور نہ آئندہ کچھ امید تھی۔ جو ہر قسم کے کام کو انتہائی بے عزتی سمجھتے تھے، جو سفید چہرہ والی قوم کو روایتی شدید ترین حقارت سے دیکھتے تھے حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ نیلے خون والے ہسپانوی نیم شرفا سے۔ ان سے بھی زیادہ بیحد نفرت کرتے تھے۔ اس مین شک نہین کہ ہم مین سے بہت سے لوگون کی سمجھ مین یہ بات نہ آئے گی کہ ایک نیم برہنہ وحشی خواہ وہ خود ہم کو کتنا ہی ناپسند کرے ہماری اعلیٰ ترین تہذیب کے متعلق حسد کے علاوہ کوئی اور جذبہ بھی رکھ سکتا ہے۔ لیکن مین یہ کہہ سکتا ہون کہ سفید لوگون کے متعلق سُرخ دیسیون کا حقیقی اور غیر مصنوعی جذبہ خالص اور مکمل نفرت کا تھا۔ یہ ہماری خود بینی کو ناخوشگوار معلوم ہو لیکن یہ بالکل درست ہے۔ اور بعض اوقات ایک بےچین کرنے والا شک دل مین پیدا ہونے لگتا ہے کہ بعض صورتین ایسی ہین کہ اُن کا یہ جذبہ بالکل غیر معقول بھی نہین تھا۔

تیسرے درجہ پر حبشی تھے جو آبادی کا ایک غیر اہم حصہ تھے۔ اور بالخصوص غلامی کی حالت مین تھے۔ حکومت ان علاقون سے اس لعنت کو دور کرنے مین حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ آخر مین بدترین قسم اُن لوگون کی ہے جو دوغلے اور دو مذہبے تھے۔ یہ ایک مخلوط نسل تھی جسمین دوسری ہیچ پیل نسلون کی طرح اُن کے والدین کی نسلون کی تمام بدترین خصلتین اکٹھی ہو گئی تھین۔ دیسی، ہسپانوی اور حبشی سب اُن کو حقیر سمجھتے تھے اور وہ بھی اپنی جگہ دوسرون سے سخت ترین نفرت کرتے تھے۔ یہ جذبات اس درجہ بڑھے ہوئے تھے کہ جب فوج مین بھرتی ہونے کا سوال درپیش ہوا تو دوسری نسلون نے اس پلٹن مین کام کرنے سے انکار کر دیا جسمین یہ دوغلے شامل کر لیے گئے تھے اس لیے ان لوگون کی علٰحدہ پلٹن بنا کے بھرتی کرنا پڑا۔ نظر برین فوجون مین دونون قسمون کے رسالے تھے جن کے جذبات ایک دوسرے کے متعلق حقیقت مین غیر دوستانہ تھے۔

جس زمانہ سے میرے قصہ کا آغاز ہوتا ہے کھلم کھلا مخالفت کے یہ جذبات بالآخر سچ مچ جنگ کی صورت اختیار کر گئے۔ مجھے یہ یاد نہین رہا کہ اس سرکشی کے لیے کیا بہانہ تراشا گیا۔ چند احکام اِن دوغلون کی پلٹنون کو دیے گئے جنکو کسی طرح اُنھون نے اپنی کسر شان سمجھا اور یکایک علانیہ بغاوت شروع ہوگئی۔ ان کی چار پلٹنین ایک شخص مارٹینز نامی کے زیر کمان حرکت مین آئین۔ اس شخص مین تھوڑی بہت قابلیت موجود تھی۔ لیکن اس کی شہرت بیحد بڑہی تھی۔ یہ فوجی قواعد و انضباط کے بار بار توڑنے مین عام طور پر مشہور تھا۔ یہ بات درست ہو یا غلط اتنا ضرور ہے کہ یہ شخص وحشیانہ اور ظالمانہ بیرحم طبیعت کا آدمی تھا۔ بہرحال وہ اچھا لیکن چالیا زسردار تھا۔ اور اُس مین ایک قسم کی جرأت تھی جس سے اس کی قوم کے آدمی خود بخود اُس کی طرف کھنچنے لگتے تھے۔

یہ معاملہ ایک جلدی فرد ہو جانے والی معمولی بغاوت سے زیادہ اہم نہ تھا اور حقیقت مین حکومت ہم لوگون کے دلون مین یہی بات ڈالنا چاہتی تھی۔ جنوبی امریکہ کی ہر ایک ریاست مذبذب حالت مین ہوتی ہے اور اُس کی رعایا کا کثیر حصہ عموماً ادنیٰ ترین بات پر بھڑکنے اور حکومت کا تختہ اُلٹ دینے پر تلا رہتا ہے۔ چنانچہ یہ بے چینی پھیل گئی اور واقعی بغاوت بن گئی۔ جس علاقہ مین ہم تھے وہان اُن باغیون کی نقل و حرکت کی مطلق خبر نہ تھی اور جیسا کہ مین بیان کر چکا ہون یہ حکومت کی حکمت عملی تھی کہ تمام معاملہ کو خفیف ظاہر کر کے ہمین یقین دلائے کہ یہ معاملہ نہایت غیر اہم ہے۔

بعد مین جب معاملہ رفع دفع ہوگیا یہ ظاہر ہوا کہ مارٹینز نے ایک عیارانہ سازش تیار کی تھی اور ہر قسم کے چکنے چپڑے وعدون سے وحشی دیسی فرقون کو اپنے ساتھ ملجانے کی چال کھیلی تھی۔ اس مزید سازش کے دونون فریق ایک دوسرے سے چکی تلے کا ہاتھ نکال رہے تھے۔ دوغلون کا منشا یہ تھا کہ گورون کا اُن سُرخون کی مدد سے قتل عام کر دیا جاے اور بعد مین اپنے اِن شریکون سے خلاف اُٹھ کھڑے ہون اور اُن کو غارت کر کے اپنی طاقت مستحکم کر لین۔ ادھر سُرخون کا یہ ارادہ تھا کہ باغی پلٹنون کی مدد سے گورون کو سمندر مین ڈھکیل دین اور بعد مین آسانی سے دوغلون سے سُلٹ لین اور ملک پر دوبارہ اپنا اقتدار قائم کر لین۔

اِس کا ہمین ذرا بھی اندیشہ نہین ہوا کہ باغیون سے اِس اندرونی علاقہ مین ہمین کوئی گزند پہونچ سکتا ہے۔ جو کچھ لڑائی تھی جنوب کی طرف سے سیکڑون میل دور تھی اور ہمارا سارا علاقہ اس سے

بالکل محفوظ تھا۔ بین ہمہ اس کشمکش کا بہت بڑا حصہ ہمارے حوصلہ سے زیادہ بھی دکھنا لکھا تھا جیسا کہ میرا قصہ ابھی ظاہر کرے گا۔

ریل با وا آدم کے وقت کے جنگل کے بڑے بڑے خطوں سے گذرتی تھی اور جنوبی امریکہ کے جنگل دُنیا مین اپنی نظیر نہین رکھتے۔ دو دو سو فٹ لمبے اور اسی تناسب سے دور دور تک پھیلے ہوے درخت حقیقت مین بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک انبار معلوم ہوتے ہین۔ نیلے سُرخ یا نارنجی رنگ کے گنبد نظر آتے ہین۔ بڑی بڑی بیلین آدمی کے ٹانگ کے برابر موٹی ایک درخت سے دوسرے درخت تک لٹکتی ہوئی عموماً سیکڑون فٹ تک پھیلی اور درختون کے پھولون سے زیادہ خوشنما گاون سے ڈھکی ہوتی ہین۔ یہ بچون کا ایک دلپسند کھیل تھا کہ وہ ان دیو ہیکل بیلون مین ایک ایک کو چُن کے اُن کی اُلجھنون کے باوجود اُس کے سرے تک پہونچنے کی کوشش کرتے۔ جس لڑکے کی بیل سب سے لمبی نکل آتی وہ جیت جاتا۔ یہ سچ مُچ کا ایک بہشت تھا۔ جسکی حیرت انگیز حسن و خوبی کی کوئی نظیر نہین دی جا سکتی۔ لیکن وہ اس قدر گنجان آباد تھا کہ انسانی آسائش مفقود تھی۔

بات یہ ہی کہ چونکہ انسان اس جگہ کم آباد ہی، غیر انسانی باشندے اس درجہ بڑھے ہوے ہین کہ اتنے کہین نہین۔ ان مین سے بہت سے انسان کے لیے خطرناک ہین۔ ان مین بہت سے شاندار مخلوق ہین۔ لیکن کھُلے بندون تکلیف دہ اور حضرت انسان ہمسایہ ہین۔ جنوار ہندوستان کے شیر ببر سے زیادہ خوبصورت اور شاہانہ صورت ہی لیکن اتنا ہی خطرناک ہی۔ بھینچ بھینچ کے اور سکر سکر کے مارنے والا سانپ دنیا مین سب سے بڑا اژدہا تئیس فٹ لمبا اور آدمی کی ران کے برابر موٹا ہوتا ہی۔ گھڑیال سمندر کی شارک مچھلی کے برابر خطرناک ہی دریا اور ڈگی مین بکثرت پائے جاتے ہین۔ یہ سب اور بہت سی اور مخلوق ان حیرتناک جنوبی امریکہ کے جنگلون مین انسانی زندگی ٹیڑھی کھیر بنانے ہین۔

ان مین پرندے بھی بکثرت ہین جن کے رنگ پھُولون سے کچھ کم خوشنما نہین ہین۔ ہر قسم کے طوطے بڑے بڑے چیخنے والے سپکے، سُرخ نیلے اور زرد رنگون سے خوشنما طرح سے مزین چھوٹے چھوٹے بھُنبھنانے والے پرندہ کیڑے قد مین مکھی سے بڑے ہین۔ نیلم اور ہیرون کے رنگ مین چمکتے ہوے سچ مچ کے زندہ جواہرات معلوم ہوتے ہین۔ سیکڑون اور قسمین جو سب کی سب رنگون مین جگمگاتی

لیکن موسیقی سے محروم نہین۔ ایک کمپا نیر و گھنٹی کی سی گہری آواز کے سُر نکالتا ہی۔ ہر قسم کی عجیب النظر مخلوقات رنگ روپ مین حیرت انگیز لیکن اُن مین کوئی نہ کوئی ندرت پائی جاتی ہی جو کسی اور مُلک مین نظر نہین آتی۔

لیکن ان سب سے بڑھ کے کیڑے مکوڑون کی دنیا ہی جو ایک نئے آدمی کی توجہ کو ناخوشگواری سے اپنی طرف کھینچتی ہی۔ زہریلی مکڑی اور سرطان اس دنیا کے سالار اعظم ہین۔ یہ کیڑون مین درست طور سے شمار بھی نہین ہو سکتے۔ بڑی بڑی چیونٹیان لاکھون کروڑون کی تعداد مین کسی مخفی سفر پر روانہ ہوتی اور پھر فضول واپس آجاتی ہین۔ چیغوو تکلیف دہ ننھی مخلوق ہی جو انگوٹھون کے ناخنون مین گھس کے اپنے انڈون سے بھری ہوئی ننھی ننھی تھیلیان رکھ دیتی ہی جن کو سونے سے پہلے ہر روز نوکر کاٹا کرتے ہین۔ فی الواقع یہ کیڑون کی دنیا ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ ہی اور ہم معمولاً تمنا کرتے ہین کہ یہ نہ ہوتی۔!

ان باتون کے باوجود ان قدیم ترین جنگلون پر کسی حملہ کا مطلق خوف نہ تھا کیونکہ ہم اس مین غیر معمولی طور پر موافق حالات مین کام کر رہے تھے۔ مزدورون کی چھوٹی فوج جو اس شاخ کے سرے پر کام کرتی تھی ایک جمعیتہ کا فائدہ دے رہی تھی۔ بڑے وحشی جانورون مین کوئی اتنے بڑے گروہ کے پاس آنے کی جرأت نہین کر سکتا تھا اور ہمین مصیبت ناک تجربون سے چھوٹے وحوش سے مقابلہ کرنے کا ڈھنگ معلوم ہو گیا تھا۔ ہمارے ساتھ ساتھ ہمراہی اور عام ساتھی کے طور پر ہمارا وفادار حبشی ملازم ٹیٹو تھا۔ یہ شخص غلام کی حیثیت سے ہماری نذر کیا گیا تھا لیکن ہم نے اُسے آزاد کر دیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کا رُوان رُوان ہمارا شکر گذار تھا۔

ریل محض ایک خندق تھی جسے جنگل مین سے کاٹ کے بنا لیا گیا تھا اور یہ خط مستقیم تھی کیونکہ اس وقت تک کوئی درمیانی سٹیشن تعمیر نہین کیا گیا تھا۔ اور اگرچہ یہ چند گاؤن کے نواح مین سے گذرتی تھی لیکن ان مین سے کوئی اس جگہ نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس پر برابر چلے جانے مین کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس ذکر سے جسکے متعلق مین نے قلم اٹھایا ہی چند ہفتے قبل ایک دفعہ کی بات مجھے یاد ہی کہ مجھے اسی سڑک پر بہت بوکھلاہٹ کا تجربہ ہوا تھا۔

ایک روز جب ہم اختتامی مقام سے ۷۵ میل اِدھر سڑک کے سرے پر تھے۔ ہمین ایک سقّی کے

بھائی کے ذریعہ اطلاع ملی کہ اختتامی مقام کے دفتر میں بڑا زبردست تغلب ہوا ہے اور خائن خزانچی اپنی لوٹ کے ساتھ یورپ جانے والے دخانی جہاز میں جو اُسی روز روانہ ہونے والا تھا جا رہا ہے یہ خبر اُس دخانی جہاز کی روانگی سے ٹھیک ایک گھنٹہ پہلے ہمیں ملی۔ میرے والد کے ہاتھ پاؤں بھول گئے کہ اب کیا کریں، اُن دنوں کوئی تار نہیں تھا اور ہر کارہ کو یہ منزل اس نوساختہ ریل کی سڑک سڑک طے کرنے میں تین ۳ گھنٹے لگتے۔

ہمارے پاس ایک انجن تھا لیکن یہ ٹھیکہ داروں کے کام کا تھا جو تیز رفتاری کے لیے نہیں بنایا جاتا۔ اور اگر ایسا ہوتا بھی تو اُس کا باقاعدہ چلانے والا اُس روز بخار میں بیمار پڑا تھا اور لڑکا جس کی نگرانی میں اب یہ انجن تھا اگرچہ چند گاڑیوں کو اِدھر اُدھر اچھی طرح لے جا سکتا تھا لیکن وہ اُسے غیر معمولی رفتار سے لے جانے کے ناقابل تھا۔ میرے والد کو انجن چلانے کا طریقہ معلوم نہ تھا اور علاوہ ازیں ایسے موقع پر یہاں سے اُن کا چلا جانا بہت اندیشہ ناک اور مضر تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے میں کلوں سے بچوں کے طبعی شوق کی بدولت انجن سے بخوبی واقف ہو گیا تھا اور میں نے اُسے چھوٹے چھوٹے فاصلوں ہی کے لیے سہی کئی دفعہ چلایا ضرور تھا۔

میں نے فوراً بھاگ دوڑ کے وہاں وقت پر پہونچ کے جہاز رُکوانے کا ارادہ ظاہر کیا اور مجھے کچھ یقین بھی ہوتا جاتا تھا کہ میں اس کام کو انجام دے سکوں گا گو میرے والد اس امر کو بالکل ناممکن تصور کرتے تھے۔ وقت گذرا چلا جاتا تھا اور اب قیل و قال کی مطلق گنجائش نہ تھی چنانچہ وہ میری اس قسمت آزمائی پر رضامند ہو گئے گو اُن کے دل میں میری ناکامی کا خیال ابھی سے پکا ہو گیا تھا۔ انجن کی بھاپ اُٹھا دی گئی تھی اور چند ہی لمحے اُسے کوئلہ سے بھرنے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے حوض لبریز ہیں کافی تھے۔ اُس کے بعد میں اُس لڑکے کے ساتھ جس نے اُسے بھٹی والے کی حیثیت سے پہلے چلایا تھا چل پڑا۔ یہ دوڑ نہایت مضطربانہ تھی۔ میں نے انجن کو اس کی انتہائی طاقت سے چلایا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ سڑک خاصی سیدھی تھی اور مجھے جوڑوں پر رفتار ہلکی کرنے کی کچھ ایسی ضرورت پیش نہ آئی۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ میں نے وقت پر یہ فاصلہ طے کر لیا گو اسمیں شک نہیں کہ جب وہاں پہنچا تو انجن کے پرزے بالکل سُرخ انگارہ ہو رہے تھے۔

جیسے ہی ہم اختتامی مقام پر پہونچے میں کود کے پہاڑی کے اشارہ گھر کی طرف دوڑا گیا

جس کا افسر مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ مین نے خدا کا شکریہ ادا کیا کہ ابھی جہاز خلیج ہی مین کھڑا تھا گو اُس کے لنگر اُٹھ چکے تھے۔ میری ہدایات کے مطابق میرے دوست افسر نے فوراً اشارہ دے کے ضروری حکم دیا کہ جہاز ابھی روانہ نہو اور انتظار کرے۔ اس اثنا مین پہاڑی سے نیچے بندرگاہی حکام کے پاس دوڑا ہوا گیا اور بہت جلد ایک کشتی پولس اور دیگر افسران کی رُعب ڈالنے والی جماعت کے ساتھ جہاز کی طرف جلدی جلدی کھیتی ہوئی چلنے لگی۔

یہ بندرگاہی حکام میرے باپ کو ریل کی سڑکون اور دیگر سامانون کے بڑے بڑے انبارون کے وصول کنندہ کی حیثیت سے اچھی طرح جانتے تھے۔ چنانچہ جب مین اُس مقام پر پہونچ گیا میرا کام بالکل آسان ہوگیا۔ جہاز کا کپتان بھی مجھے جانتا تھا اور جب اُس نے معاملہ کی اہمیت معلوم کی تو اُس نے میری اُس کے کام مین تاخیر ڈالنے کی کارروائی کو معاف کردیا۔ خائن خزانچی فوراً گرفتار کرلیا گیا۔ اگرچہ اُس نے سخت حجت بھی کی۔ اور اُسے ساحل پر قیدخانہ مین ڈال دیا گیا اور تمام روپیہ بخوبی قبضہ مین کرلیا گیا۔ مجھے یقین ہر کہ مین نے بے احتیاطی سے چلانے کی وجہ سے اس انجن کو بہت نقصان پہونچایا لیکن جو رقم خطرہ مین تھی اس معمولی خرابی سے کہین زیادہ تھی۔

میرے والد کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ ریل کی سڑک کے سرے پر ایک چوبی چھوٹی جھونپڑی اپنے لیے بنوالیا کرتے تھے اور جب تک سڑک بن کے اتنے فاصلہ پر نہ پہونچ جاتی جسے وہ سہولت کے لحاظ سے دور سمجھتے، اُس وقت تک اُسی مین رہتے۔ پھر تھوڑے فاصلہ پر اسی طرح کی اور جھونپڑی بنوالیتے۔ لکڑی اس کثرت سے تھی کہ بڑے بڑے لکڑون کو ایک دارالاقامہ سے دوسری تک لیجانا بالکل فضول تھا۔ اگرچہ یہ فاصلہ چند میلون کا ہی ہوتا تھا۔ زمین پر کثرت سے لکڑی کے تنے پڑے ملتے تھے اور چند درخت جلدی سے کاٹ کے نئی جھونپڑی بہت تھوڑی محنت سے بن جاتی تھی۔

معمولاً طریقہ یہ تھا کہ ایک فٹ کی قطر والی لکڑی کے شہتیر منتخب کیے جاتے تھے اور اُن کو لمبائی کی طرف سے آدھم آدھ چیر لیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک اوندھی سیدھی جھونپڑی بن کے کھڑی ہوجاتی تھی جو اُس علاقہ کے وحشی جانورون کے حملہ کو روکنے کے لیے خوب مضبوط ہوتی تھی۔ اس مین شک نہین ان شہتیرون مین بہت سی درازین ہوتی تھین جن مین سے روشنی اور ہوا کافی مقدار مین آتی تھی۔ عام طور پر اس قسم کی جھونپڑی بلا کسی کھڑکی کے بنائی جاتی تھی اور اُس مین صرف ایک

بھدا دروازہ ہوتا تھا جس کے کیواڑ دن مین کوئی قبضہ لگا نہین ہوتا تھا لیکن رات کو اندر گرنے سے روکنے کے لئے ایک بھاری چوبی بلّی سے اُس کو اس کی جگہ پر قائم رکھا جاتا تھا۔ دن مین یہ کیواڑ ایک طرف رکھ دیا جاتا تھا اور یہ کھلی جگہ کھڑکی کا کام دیتی تھی۔ میرے والد کے پاس ایک سادہ معمولی سا میز تھا جس پر وہ دفتری کام کیا کرتے تھے اور ہم لکڑی کی ڈھیون پر یا زمین پر جیسا دل چاہتا بیٹھ جایا کرتے تھے۔

دوسرا باب

دیسیون کا حملہ

جس روز سے میرا قصہ شروع ہوتا ہے اس روز یہ جھونپڑی جنگل مین ایک کھُلی جگہ کے سرے پر بنی ہوئی تھی۔ اس جھونپڑی کے پیچھے اور دونون طرف جنگل بیس گز سے زیادہ نہ تھا لیکن سامنے کی طرف یہ کھُلی جگہ ایک چھوٹے سے چشمہ پر نشیب مین جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ یہ چشمہ اس جگہ سے ڈیڑھ سو گز پرے تھا۔ اس چشمہ سے پرے اس وقت سڑک کا سرا تھا جو درختون کے بڑے جھنڈ دن اور جگہ کی بلندی کی وجہ سے جھونپڑی سے نظر نہ آتا تھا۔ اس جگہ آدمیون کا ایک گروہ اپنے کام مین مصروف تھا۔
دوپہر کو سب آدمی کچھ دیر ملک کے دستور کے مطابق آرام کیا کرتے تھے۔ اور ہم بھی بعض دفعہ آرام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن عادی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کبھی نیند نہ آتی تھی۔ یہ قیلولہ ابھی جاری تھا اور اگر مجھے ٹھیک یاد ہے قریب الختم تھا۔ میرے والد بیٹھے میز پر لکھ رہے تھے اور مین فرش پر لیٹا ایک کہانی پڑھ رہا تھا اور ننھا جیرلڈ ایک کونہ مین کوئی بچون کا کھیل کھیل رہا تھا۔ نوکر ٹیٹو اپنے کسی کام پر چلا گیا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ وہ جھونپڑی مین نہ تھا اور نہ دہان سے وہ نظر آتا تھا۔
قطبی دوپہر کے سکون کو اچانک بندوقون کی ایک باڑ نے توڑا جو نہایت حیرت انگیز بات تھی۔ کیونکہ جہان تک ہمین معلوم تھا کم از کم پچاس میل کے اندر ہمارے علاوہ اور کسی کے پاس بندوق نہ تھی۔ ہم فوراً اُٹھ کھڑے ہوے اور میرے والد دروازہ تک گئے اور میدان مین نیچے کی طرف نظر دوڑائی۔ جیسا کہ مین کہہ چکا ہون وہ جگہ جہان آدمی کام کر رہے تھے ہمارے دروازے سے نظر نہ آتی تھی۔ چونکہ وہان کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ میرے والد نے کونہ سے لگی ہوئی اپنی بندوق اُٹھائی اور معاملہ معلوم کرنے کے لیے باہر نکلے۔ مین نے بھی اپنی بندوق اُٹھائی کیونکہ میرے

پاس بھی ایک بندوق تھی۔ اِس وحشی ملک مین تنہا جیرلڈ بھی اپنی پیٹی مین اپنا ننھا طپنچہ لگائے بغیر باہر نہین نکلتا تھا۔ یہ احتیاطین کسی طرح بیجا نہ تھین کیونکہ وہان کے انسانی باشندون سے قطع نظر قصبون کے اندر تک گھرون کے عین نزدیک خطرناک وحشی جانور دررانہ چلے آتے تھے۔

ہم دروازہ سے بمشکل باہر نکلے تھے کہ ہمارا ایک مزدور چشمہ کے پاس کے درختون کے جھنڈون کے پیچھے سے بے تحاشا بھاگتا ہوا نکلا۔ اُس نے ہمین دیکھتے ہی دور سے کچھ کہا لیکن ہم اس کا مطلب کچھ نہ سمجھ سکے۔ قبل اِس کے کہ وہ پھر کچھ کہنے کا موقع پاتا ایک بندوق اور سر ہوئی اور وہ غریب اپنی بانہین اُدھر کو اُٹھا دہم سے زمین پر بیجان آپڑا۔ اُس کے بعد فوراً ہی اُس میدان کے نیچے کی طرف منقش وحشیون کا ایک ہجوم نکل پڑا۔ جو اپنے ہتھیار ہلا رہے تھے۔ اور خون خشک کرنے والی چیخین مار رہے تھے ہم پر چند گولیان چلائی گئین لیکن خوش قسمتی سے ہمین ایک نہ لگی۔ ہم فوراً جھونپڑی مین چلے آئے اور دروازہ کو اس کی جگہ رکھ کے بھاری بلّی اس کے پیچھے لگا دی۔ پھر میرے والد نے نہایت سکون سے مجھ سے جب کہ مین اُن کے پاس اپنی بندوق ہاتھ مین لیے کھڑا تھا کہا۔ تم دروازہ کا بایان درز سنبھالو۔ مین دایان لیتا ہون۔ پہلے بندوقون سے کام لو۔ پھر طپنچون سے جب تک وہ اس جھونپڑی تک پہونچین ان مین سے جتنے مر سکین ہمین مارنے چاہییے اب تیار ہو جاؤ۔ ہم کو موقعہ ہاتھ سے دینے کی مطلق گنجائش نہین ہو۔

ہمارے پاس اس زمانہ کی جلد چلنے والی بندوقین نہ تھین۔ اُنچائی کی طرف ابھی وہ سُرخ لوگ آدھا راستہ بھی طے کرنے نہ پائے تھے کہ ان مین سے دس لوٹ گئے۔ انھین کوئی حکم دیا گیا اور وہ یک لخت میدان کے دونون طرف پناہ مین ہو گئے اور ایک لحظہ کے لیے ہماری نظرون سے غائب ہو گئے۔ دراز مین سے برابر دیکھتے ہوئے میرے والد نے کہا۔ اِس سے ہمین ایک لمحہ کے لیے دم لینے کا موقع ہاتھ آگیا ہر بندوق پھر بھر لو۔ ہر چیز تیار رکھو اور اپنی کل بارود اپنے پاس رکھو تاکہ چشم زدن مین اسے لے سکو۔ وہ ہم پر ابھی ٹوٹ پڑین گے۔

مین نے کہا لیکن ابا جان یہ کون لوگ ہین اور یہ کیا بات ہو۔ یہ کیون اس پاگلانہ وضع مین ہمارے پیچھے پڑے ہین؟ ہم نے ان کا کچھ نہین بگاڑا۔ میرے والد نے جواب دیا۔ میرے بچے! اِس کی

خود مجھے کچھ خبر نہین اور جہان تک مجھے نظر آتا ہے یہ بھی اغلب نہین معلوم ہوتا کہ ہم اس بات کو کبھی معلوم کر سکین گے۔ ان کی جو کچھ بھی منشا ہو اور جس غرض کے لیئے یہان آئے ہون ہم اتنے بڑے مجمع کے مقابلہ مین اس جگہ دیر تک قائم نہین رہ سکتے۔ ہم جو کچھ کر سکتے ہین یہ ہے کہ اپنی جانون کو گران سے گران قیمت پر فروخت کرین۔ ہم قریب ترین امداد سے سو میل دور ہین اور جب تک وہ یہان پہونچے اس سے کہین پہلے یہ ہمارا قصہ پاک کر چکین گے۔ مجھے اس کی ذرا پرواہ نہین لیکن خیال ہے تو یہ ہے کہ ننھا جیرلڈ ہمارے ساتھ ہے۔ آہ! مین اسے اس موقع پر اور بھی کسی وقت نہین اپنے ہمراہ کیون لایا تھا اور "یہ" تو ہو کے رہے گا۔

مین نے کہا۔ آپ کے خیال مین ہمارے مزدورون کا کیا حشر ہوا؟

میرے والد نے جواب دیا۔ اس باڑ مین جو ہمین سنائی دی وہ سب کے سب مارے گئے ہون گے۔ یہ بالکل صاف ہے کیونکہ اگر اُن مین کوئی بچتا ہمارے ساتھ پناہ لینے کی کوشش کرنے کے لیئے اس طرف ہی دوڑا آتا۔

مین نے اختلاف رائے کرتے ہوئے کہا لیکن میری سمجھ مین نہین آیا کہ اُنھین ان لوگون کو مارنے اور ہم پر نرغہ کرنے کی کیا غرض ہے؟

میرے والد نے کہا۔ میری سمجھ مین بھی کچھ نہین آتا لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ یہ اس وقت اپنے جنگی نقش و نگار بدن پر چھاپے ہوئے ہین جس کے ہمیشہ یہ معنی ہین کہ وہ مارنے کے ارادہ سے نکلے ہین اور وہ مرتے دم تک لڑے جائین گے۔ کوئی اس علت غائی کو نہین بتا سکتا جس پر یہ وحشی لوگ کام کرتے ہین۔

اس موقع پر ایک بلند چیخ نے ہماری باتون کا سلسلہ توڑ دیا اور وحشیون کا پورا دستہ جو جنگل کی پناہ مین ہمارے بہت نزدیک آ گیا تھا دونون طرف سے ہم پر ایک ساتھ ٹوٹ پڑا۔ آدمی پر آدمی زمین پر گرتے گئے لیکن وہ نہایت دلیری سے جھونپڑی تک بڑھتے چلے آئے۔ اور دروازہ پر آ کے ٹکر لگائی۔ خوش قسمتی سے بلّی لگی ہوئی تھی اور جب اُنھون نے دیکھا کہ وہ ہمارا کچھ نہین بگاڑ سکتے اور وہ خود ہماری آتشبازی کی پوری زد مین ہین وہ ایک اور بلند چیخ مار کے دوبارہ آڑ مین گھس گئے۔ اب تک ہمین ذرا بھی چرکا نہ لگا تھا اور اُدھر یہ کیفیت تھی کہ نعشون کی کافی تعداد جھونپڑی کے

گرد پڑی تھی۔ ننھے جیرلڈ نے بھی اپنے برتے سے زیادہ اس جدال و قتال مین حصہ لیا۔ اُس نے کم از کم دو وحشی مار ڈالے تھے اور تیسرے کو زخمی کر چکا تھا۔ میری طرف ایک تُند خُو وحشی نے اپنی بندوق کی نالی ایک درز مین گھسا دی۔ مین پھُدک کے ایک طرف ہو گیا۔ جیسے ہی اُس نے اُسے چلایا مین نے اُسے فوراً پکڑ لیا۔ اور اُس کے اوپر سے اپنا طپنچہ اس کے مالک کے عین مُنھ پر داغ دیا۔ وہ بندوق درز مین گھُسی چھوڑ کے ایک دردناک چیخ مارتا ہوا زمین پر جا رہا۔

اس کی گولی کا دُھوان جھونپڑی مین بھر گیا لیکن ہمین کوئی صدمہ نہین پہونچا۔ جب یہ لوگ جنگل مین بھاگ گئے تو مین نے دروازہ کھول کے بندوق کو اندر لانا چاہا لیکن میرے والد نے اس کی مطلق اجازت نہین دی اور یہ کہا کہ دیسی جنگل سے ہمین بغور دیکھ رہے ہین اور اس سے ہم فضول اپنے آپ کو خطرہ مین ڈال لین گے۔ اس کے علاوہ اُنھون نے بتایا کہ یہ بندوق ہمارے کسی مطلب کی بھی نہین کیونکہ ہم پہلے سے مسلح ہین اور ہمارے چھرے وغیرہ اسمین آ بھی نہ سکین گے یہ عجیب شکل کی پُرانی وضع کی توڑے دار بندوق تھی جو ایک رگڑ پیدا کرنے والی ٹوپی سے چلتی تھی اور میرے والد کے کہنے کے مطابق ہمارے لیے بیکار تھی۔ باین ہمہ مین نے اس مال غنیمت کو بیدلی سے چھوڑا۔ حالانکہ مین یہ جانتا تھا کہ امکانات اس بات کے ہین کہ ہم یہ غنیمت کسی کو دکھانے کے لئے زندہ نہ بچین گے۔ چنانچہ مین نے بندوق باہر ڈھکیل دی اور وہ نعشون کے بیچ مین جا پڑی۔

حقیقت یہ ہے ہم نے حملہ کو پسپا کر دیا تھا اور اب تک ہمین کوئی گزند بھی نہ پہونچا تھا اس کے مقابلے مین دشمن کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ ہمین ایک وقتی فتح حاصل ہو گئی تھی اور ہمین اپنے انجام کے متعلق کوئی دُھوکا نہ تھا۔ ہمارے پاس گولی بارود کا سامان کافی تھا۔ اور جس قسم کے بھاری شہتیرون کی آڑ مین جن پر گولی اثر نہ کرتی تھی ہم لڑ رہے تھے ہم اس قسم کے ایک یا کئی حملون کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ لیکن اسمین بھی شک نہ تھا کہ اگر کسی درز مین سے کوئی گولی نکل چلی آتی تو وہ ہم مین سے ایک کا کام تمام کر سکتی تھی۔ اور ہمارے پاس بسکٹون کے نصف ڈبہ کے سوا کھانے پینے کا سامان بھی نہ تھا اور اس سے بڑی بات یہ تھی کہ صرف آدھی بوتل پانی کی باقی رہ گئی تھی معمولی حالات مین ہمارا کھانا ہمارا غیر حاضر ملازم ٹیٹو پکایا کرتا تھا لیکن اُس کے زمانہ جاہلیت کے باورچی خانہ کے انتظام عموماً کھلے میدان مین یا کسی درخت کے نیچے ہوا کرتے تھے اور اس قسم کے خوراک کے سامان

جیسے ہمارے پاس موجود تھے اُدھر نشیب مین ریل کی سڑک کے قریب چھپ دن مین رہا کرتے تھے ان حالات مین اگر وحشی بیٹھ کے ہمارا محاصرہ شروع کر دیتے تو ہمارا صرف ایک ہی انجام ہوتا۔

جیسا کہ اندازہ لگایا گیا ہوگا ہماری گفتگو مطلق امید افزا نہ تھی۔ صرف ایک بات کا رہ رہ کے میرے باپ کو خیال آرہا تھا اور وہ یہ قلق تھا کہ اُنھون نے میرے چھوٹے بھائی کو اس مصیبت مین لا ڈالا تھا۔ اور اس صدمہ کا غم تھا جو اس ننھے بچہ کی لازمی موت اس کی محبت کرنے والی ماں کے قلب کو پہونچائیگی۔ ہم برابر غور کر رہے تھے کہ ان کم بختون نے ہم پر کیون حملہ کیا اور زیادہ تر یہ کہ اب وہ کیا کرنے والے ہین؟ گو اُن سوالات کے جوابات ہمارے لیے کچھ فائدہ مند نہ تھے ان کے وجوہات کچھ بھی ہون یہ یقینی امر تھا کہ وہ ہمین مارنے آئے تھے۔ بچ نکلنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی اور ہماری جانب سے بس یہی بات ہو سکتی تھی کہ اٹل نتیجہ اُن کے لیے حتی الامکان دشوار تر بنا دین اور ہمپر فتح حاصل کرنے کی قیمت اُن سے حتی المقدور زیادہ سے زیادہ لین۔

اس دفعہ انتظار نے بہت طول کھینچا جو حملہ کے جوش و خروش کی نسبت بہت بےچین کرنیوالا تھا اور میرے پٹھے ڈھیلے ہوتے جاتے تھے ہمارے چارون طرف جنگل مین سناٹا تھا لیکن بدقسمتی سے ہمین یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس خاموشی کے یہ معنی نہین کہ دیسی ہمین چھوڑ کے چلے گئے۔

بڑی دیر کے بعد ہم نے چیرنے پھاڑنے کی آواز سنی۔ ہم حیران تھے کہ ہمارے دشمن کیا کر رہے ہین لیکن ہمین فوراً ہی اس آواز کا مطلب معلوم ہو گیا۔ کیونکہ یک لخت طرفۃ العین مین خاموشی غل غپاڑہ مین بدل گئی۔ وحشی جھونپڑی پر ایک مرتبہ پھر چلاتے ہوے حملہ آور ہوے اور ہماری طرف جلدی جلدی بڑھتے وقت پاگلون کی طرح جھونپڑی پر فضول گولیان چلاتے آتے تھے۔ پہلے کی طرح ہم نے حتی الامکان جلد جلد گولیان چلانا شروع کر دین اور حملہ آورون مین سے بہت سے مار ڈالے اتنے مین میرے والد مجھے للکار کے بولے دیکھو ادھر! ان شہتیر لانے والے آدمیون کو نشانہ بناؤ۔

اس وقت مین نے دیکھا کہ ۶ یا ۸ دیسی اپنے جھرمٹ مین ایک بہت بڑا شہتیر اُٹھائے لا رہے تھے جس سے اُن کا ارادہ ہمارے دروازہ کو پیٹ پیٹ کے توڑ دینے کا تھا۔ اُن کی یہ غرض اس شہتیر کی بدولت آسانی سے پوری ہو سکتی تھی۔ لیکن اُنھین اُس کو صرف ہمین گرانا تھا وہ ہم تک نہ پہونچ سکا۔ میرے والد کی تیز فہمی سے اُن کا یہ ارادہ کم از کم اس مرتبہ ناکام رہا کیونکہ ہم نے

اپنے طپنچوں کا رُخ ادھر کر کے تنا لانے والوں پر آگ برسانا شروع کر دی۔ وہ ابھی آدھا ہی راستہ طے کرنے پائے تھے کہ اُن میں سے آدھے کھیت رہے اور باقیوں کے بس کا اتنا بڑا بوجھ رہا دوسرے ان کی جگہ لینے کے لیے دلیری سے آگے لپکے لیکن اتنی دیر ہو گئی تھی کہ وہ وہاں تک پہونچیں پہونچیں لکڑ دہم سے نیچے آ رہا۔ اور جب یہ زمین پر جا پڑا تو کسی کا اس تک پہونچنا یقینی موت تھا۔ ایک دفعہ پھر ہمارے حملہ آور منتشر ہو کے بھاگ کھڑے ہوے اور ہم پھر عارضی فتح پر خوش ہونے کے لیے تنہا رہ گئے اور اُن کے مقمعہ (ڈھو کنے پیٹنے کے آلہ) کے اوپر اور ادگرد مردوں کا ایک ڈھیر پڑا رہ گیا۔

اس دفعہ ہم بال بال بچے کیونکہ جب میں اور میرے والد اس شہتیر والے آدمیوں کی طرف متوجہ تھے ایک بال دیر لگائے جنگلی جھونپڑی کی پشت پر چپکے سے آ نکلا اُس نے ایک درز میں اپنی بندوق کی نالی بڑا کے ہم پر پیچھے سے گولی داغ دی۔ وہ تو یہ خیر ہوئی کہ وہ نشانہ بال بال خطا گیا ہم نے گولی دروازہ کے برابر والے شہتیر میں گڑی دیکھی ہمارے ننھے جیر لڈ نے اُسے دیکھ کے اُس پر طپنچہ سر کر دیا تھا اور یہ اغلب ہے کہ اس کی خبردار کرنے کی چیخ نے اُس دیسی کا نشانہ خطا کر دیا۔ جیر لڈ نے ہمیں بتایا کہ اُس نے اُس آدمی کو مارا نہیں بلکہ زخمی کیا تھا کیونکہ وہ ڈگمگا کے پیچھے ہٹا اور بہت زخمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن وہ رینگ کے جنگل میں جان سلامت لے جانے کے قابل تھا۔ ہمارے دشمنوں کو ہمیں مغلوب کرنے کے تین حملوں میں بہت نقصان اُٹھانا پڑا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ اس سے ان کا ارادہ اور پختہ ہو جائے گا کہ ہمیں کسی طرح بچ کے نہ نکلنے دیں۔

اب سخت جانکاہ وتعطل کا وقت ہمارے لیے شروع ہوا گھنٹہ کے بعد گھنٹہ گذرا چلا جا رہا تھا اور کوئی نئی بات واقع نہوتی تھی۔ ہم یہ امید نہیں کر سکتے تھے کہ اُنھوں نے اپنے شکار کو ترک کر دیا ہے۔ ہمیں بخوبی معلوم تھا کہ اُن کے سردار اپنے آدمیوں کے اس قتل عام سے گھبرا گئے تھے اور اب اُنھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس وقت تک انتظار کریں جب رات کوئی عمدہ موقع مہیا کرے۔ میں اپنی تو کہتا ہوں کہ میں چاہتا تھا کہ ہم پر وہ دوبارہ حملہ کریں اور حملہ کیے ہی جائیں کیونکہ مجھے اس یقینی موت کے ہولناک انتظار کے مقابلہ میں سب کچھ پسند تھا۔ ہم نے غور کیا کہ ہمارا ٹیٹو کہاں ہو گا اور اُنھوں نے اُسے کس طرح مار ڈالا ہو گا۔ اُنھوں نے کس طرح مزدوروں پر حملہ کیا ہو گا۔ اور نگران کار پر جو ایک قوی ہیکل

سکاٹلینڈی (سکاچ) تھا اور جسے اُنھون نے یقیناً اچانک آلیا ہوگا کیا گذری ہوگی۔ ورنہ وہ اِن وحشیون کو خواہ اُن کی کچھ بھی تعداد ہوتی چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا؟ ہمین گھر والون کا خیال آیا اور حیرت مین تھے کہ کسی طرح ہمارے انجام کی خبر اُن تک بھی پہونچ سکے گی کیونکہ اِس کہانی کے کہنے کے لیے کوئی بھی باقی رہتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

مین سمجھتا ہون ہم وہ آدمی تھے جنھین لوگ مذہبی کہتے ہین۔ لیکن مجھے یاد نہین آتا کہ اِس مصیبت کے وقت ہم نے مذہبی اُمور پر کچھ گفتگو کی ہو۔ البتہ ایک مرتبہ یاد پڑتا ہو کہ میرے والد نے اِن باتون کا ذکر کیا۔ اُنھون نے کہا افسوس بچو! تم ابھی بالکل نئی کونپل ہو۔ تمھارے مرنے کا یہ وقت نہ تھا کیونکہ ابھی تم نے دنیا کا دیکھا ہی کیا ہو۔ مجھے صدمہ ہو تو یہ کہ مین تم کو اپنے ساتھ کیون لے آیا۔ لیکن اب افسوس کرنے کا کیا فائدہ؟ اور کون اِس صورت کا پہلے سے خیال کر سکتا تھا؟ لیکن یاد رکھو کہ ہماری جانین اللہ کے قبضۂ قدرت مین ہین۔ بغیر اس کے علم و مشیّت کے ہمارا بال بھی بیکا نہین ہو سکتا۔ ہمارے لیے جو کچھ بھی ہو اُس کی رضا ہو۔ ہماری اسی مین بہتری ہو اور اگر ہم بہادری سے جان دین جیسا انگریزون کو چاہیے تو تم یقین جانو کہ اِس طرح ہم اُسی کی راہ مین جان دیتے ہین اور جب ہم اس کے بعد اس کی جناب مین حاضر ہون گے اس کی ذرا بھی پروا نہ ہوگی کہ ہم کب اور کس طرح مرے تھے؟

میرا خیال ہو کہ گو ہم بچے تھے لیکن اُن کی حالت سے ہمین عبرت حاصل ہوئی اور ہم مین ہمت مردانہ پیدا ہو گئی اور یہ خیال ہمارے لیے موجب تسکین تھا کہ کچھ بھی ہو ہم سب ایک ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہین۔

وقت گذرا چلا گیا اور آخر کار قطبون کی جلد پھیلنے والی تاریکی ہم پر طاری ہو گئی۔ میرا خیال ہو کہ انتظار کے بوجھ نے ہماری طاقت سلب کر لی تھی۔ مجھے یاد ہو کہ مین کئی مرتبہ اونگھتے اونگھتے سنبھلا اور خیال پڑتا ہے کہ ننھا جیرلڈ کچھ دیر کے لیے غافل سو گیا تھا۔ لیکن میرے والد ایک لمحہ کے لیے بھی پہرہ سے غافل نہین ہوے۔ جب تاریکی طاری ہو گئی اور قطبی رات کی آوازین ہمارے چارون طرف پھیل گئین اُنھون نے شفقت بھرے الفاظ مین ہمارا حوصلہ بڑھایا اور پہلی مرتبہ ایک ترکیب بتائی جو معلوم ہوتا تھا کہ اُمید کی دُھندلی کرن مین سوجھی ہو۔

اُنھوں نے کہا بچو! پتہ نہیں یہ کیا کررہے ہیں لیکن اگر وہ جلد ظاہر نہ ہوئے تو میں حتی الامکان آہستگی سے دروازہ کھول دوں گا اور ہم درختوں میں سے کھسک جانیکی کوشش کریں گے۔

میں نے تردید کے طور پر کہا لیکن اباجان وہ ہمیں ہر طرف سے بھانپ رہے ہوں گے۔ والد نے کہا۔ ہاں۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ بھانپتے ہوں گے لیکن کچھ موقع تو نظر آتا ہے کہ شاید ہم بچ نکلیں۔ زیادہ سے زیادہ خرابی یہی ہے نا کہ اگر ہم کامیاب نہوں تو ہمیں مار ڈالیں گے تو یہ تو یوں بھی یقینی بات ہے کہ اگر ہم یہیں ٹھہرے رہیں تو یہی ہمارے سامنے اسی وقت پیش آئے گا۔

جب اُنھوں نے یہ بات کہی تو میں اس تجربہ کو عمل میں لانے کے لیے نعل در آتش ہو گیا لیکن پھر مجھے یہ ہول سمائی کہ شاید ہم سب نہ بچ سکیں اور ہم میں سے ایک مارا جائے۔ اور فرض کرو وہ والد ہی ہوں تو پھر میں اور جبیر لڑکیا کریں گے؟ یا فرض کرو ننھا جبیر لڑ ہی ہو پھر مجھے جینے میں کیا مزا رہ جائے گا؟ میں نے ان خیالات کا مطلق ذکر نہیں کیا لیکن اس تدبیر کے بارہ میں میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

لیکن ہمارے تند خو دشمنوں نے اس تجویز کو عمل میں لانے کا ہمیں موقع ہی نہیں دیا۔ اچانک تاریکی میں سے آگ کی بوچھار سی آئی اور پھر یکے بعد دیگرے بوچھاریں آنا شروع ہوئیں۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب ہماری چھت پر پڑ رہی تھیں۔ ایک لحظہ تک ہم اس کی نوعیت کا اندازہ نہ لگا سکے لیکن اُس کے بعد فوراً ہماری سمجھ میں آ گیا کہ وحشیوں کو دور کی سوجھی۔ اگرچہ ہماری جھونپڑی کی دیواریں زمین میں بہت نیچے تک دبے ہوئے بھاری ادھورے شہتیروں کی بنی ہوئی تھیں۔ لیکن اسکی چھت کھجور کے پتوں سے پٹی ہوئی تھی۔ ہمارے دشمنوں نے ہمارے کمزور مقام کو تاڑ لیا تھا اور اب وہ تیل میں ڈوبی ہوئی روئی سے بندھے جلتے ہوئے تیر چھت کی طرف چلا رہے تھے۔

چند ہی لمحوں میں ہماری چھت بھڑک اُٹھی۔ جھونپڑی اندھا کرنے والے دھوئیں سے بھر گئی۔ اور جلتے ہوئے ٹکڑے ہمارے ہر طرف گرنے لگے۔ ہم ان ٹکڑوں پر کود کود کے اُنھیں بجھا دیتے تھے۔ ورنہ ہم سب جھلس کے رہ جاتے۔ ہم تو اپنی جانوں کے لیے ان شعلوں سے کشمکش کر رہے تھے اور وحشی اپنے جھونپڑی گر: (مقصد) کی طرف دوڑے اور اُسے اُٹھا کے ہماری طرف ہلہ کرکے آئے۔ زبردست

دھماکہ سے دروازہ اور اس کی تپی اپنے سہاروں سے نکل کے آپڑے اور ایک ہی لحظہ مین ہم اپنے دشمنون کے نرغہ مین آ گئے۔ ہمین دھوئین مین کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن چھت کا بہت سا حصہ گر چکا تھا اور وحشیون کے ہلہ مین شعلے دب کے بجھ گئے۔

میرے والد نے پکار کے کہا۔ کمرے کمر ملالو۔ اور ایک لحظہ مین کسی طرح وہ مین اور ننھا جیرلڈ جھونپڑی کے بیچ مین سُرخون کے تعفن خیز ہجوم کے نرغہ مین جو ہر طرف سے ہم پر ایک ساتھ حملہ کر رہے تھے ایک دوسرے سے مل گئے۔ اُس وقت بھی ہمارے طپنچے گونج رہے تھے۔ مین کہتا ہون کہ ایک یا دو میرے پہلو مین چت ہو گئے۔ لیکن پیچھے سے میرے سر پر ایک زبردست چوٹ پڑی اور پھر مجھے کچھ دیر کے لیے کچھ ہوش نہ رہا کہ کیا ہوا اور کیا نہین ہوا۔

کچھ دیر بعد (مین کسی طرح نہین بتا سکتا کہ کتنی دیر بعد) مجھے ہوش آیا۔ مین دماغ پر زور ڈالتا ہون تو معلوم ہوتا ہے مجھے ہوش بہت آہستہ آیا اور طبیعت مین انتشار تھا۔ پہلے پہل مجھے درد کا عجیب طرح کے متواتر ہچکولون کا، ان ہچکولون کے بند ہو جانے اور سکون سے پڑے رہنے کی خواہش کا موہوم احساس ہوا۔ لیکن یہ جاری رہے اور بے آرامی کا احساس بڑھتا چلا گیا۔ مجھے جلد ہی کچھ یونہی سا ہوش آیا کہ مین کسی طرف چلا جا رہا ہون یا یون کہیئے کہ مجھے کسی عجیب طرح کے بھدے اور بے آرام طریقہ سے لیجایا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہت دیر تک نہ مجھے لڑائی کی یاد سیون کی یا کسی اور بات کی یاد میرے دل سے محو رہی اور مین اس نیم بیہوشی کی حالت مین بہت دیر تک رہا ہون گا۔ یہ مجھے ناقابل اختتام گھڑیان معلوم ہوتی تھین گو سچ یہ ہے کہ دراصل یہ چند ہی لحظے ہون گے (یہ معلوم کرنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہین) لیکن جب میرے ہوش و حواس رفتہ رفتہ عود کرنے لگے تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مین بے طرح گھسٹا اور اوپر سے کسی چیز سے ٹکراتا اور نچتا جاتا تھا اور اُدھر نیچے سے کسی غیر آرام دہ طریقہ سے بندھا ہوا تھا۔

جہانتک مجھسے ہوسکتا ہے مین اپنے ہوش مین آنے کے صحیح جذبات بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہون اور حالت یہ ہے کہ مین پوری طرح ان کا اظہار نہین کر سکتا۔ کیونکہ یہ ہوشمندی من کل الوجوہ ناقابل بیان مبہم اور دھندلی تھی اور مین ان جذبات کی وجوہات قائم کرنے کے یا یہ سمجھنے کے کہ میرے ساتھ کیا پیش آ رہا ہے بالکل ناقابل تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ کسی طرح مجھپر القا ہوا کہ مین کسی گھوڑے یا

جھر کی پشت پر ہوں اور ہچکولے گویا ناہموار زمین پر اُس کے ٹھوکر کھانے سے پیدا ہو رہے ہیں اور خراشیں ان درختوں کی نیچے لٹکی ہوئی شاخوں سے جن کے نیچے سے ہم گذر رہے تھے مجھے آ رہی ہیں۔

میری راے میں جب میرے خیالات نے یہان تک یاری دی تو ایک قسم کی جھر جھری کے ساتھ میرے ہوش و حواس واپس آ گئے اور اچانک میرے اندر بیداری کی سی کیفیت طاری کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ مین اس جانور کی کمر پر بندھا ہوں اور اُس کے ساتھ اسی قسم کے اور بھی جانور ہین جن مین بعض اسباب کے گٹھڑوں سے لدے ہوے معلوم ہوتے تھے اور باقیوں پر دیسی سوار تھے۔ مین نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے دیسی ہمارے اردگرد پیدل تھے۔ پھر ایک صدمہ کے ساتھ میری یاد تازہ ہو گئی اور مجھے معلوم ہوا کہ جلتی ہوئی جھونپڑی مین کسی چوٹ سے مین بیہوش ہوا ہوں گا اور وہین ڈالنے کی بجاے یہ دیسی لوگ مجھے قیدی بنا کے لیے جا رہے ہین۔

ہم جنگل مین اچھی تیز رفتار سے چل رہے تھے اور ان درختوں کے نیچے اندھیرا گھٹا ٹوپ تھا لیکن تقریباً میرے ہوش مین آتے ہی ہم ایک قسم کی کھلی فضا مین آ گئے۔ جہان مین دھندلے مین سوار اور دوڑتے ہوے وحشیوں کو جن مین ہم محصور تھے دیکھا۔ میرا پہلا خیال یہ تھا کیا میرے ابا بھی قید مین اور میرے مُنہ سے ابا کا لفظ زور سے نکلا۔ مین نے تو اُسے چیخ کی طرح نکالنا چاہا تھا لیکن مین بامر واقعہ کے طور پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ بس ایک کمزور چیخ تھی۔ ایک لمحہ تک خوفناک کشمکش و پیچ رہا اور پھر شکر گذاری کی ایک بڑی لہر مجھ مین دوڑی۔ جیسے ہی مین نے ان کی خوش آیند آواز جواب مین اپنے سامنے کے دھندلے انبوہ مین سے کسی جگہ سے آتی سُنی۔ وہ چلاے۔ آہا میرے بچے تم تو زندہ ہو تمھین زیادہ چوٹ تو نہین لگی؟

مین نے جواب مین پکار کے کہا میرا خیال ہے نہین۔ لیکن میرے سر مین گرانی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا آپ کے بھی چوٹ لگی ہے؟

مجھے جواب مین صرف ”نہین“ سننے کا موقع ملا کہ ایک دیسی نے اپنا منہ میرے منہ پر اندر بڑھنے کے وحشیانہ طور سے خاموش رہنے کو کہا۔ اور اسی وقت مین نے اپنے سامنے کسی قسم کی کشمکش دیکھی جس سے مین نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ میرے والد کے گرد حلقہ کر کے اُنھین بھی خاموش کرنے کی کوشش کر رہے ہین۔ جس آدمی نے مجھے روکا تھا ایک قسم کی مخلوط ہسپانوی زبان مین بولا تھا جو آدھی ہسپانوی تھی اور

آدھی پر تعفالی۔ لیکن ایک عجیب موٹے لہجہ اور گلے ہی گلے مین بولا تھا کہ قریب قریب یہ الفاظ ناقابل فہم ہو گئے۔ لیکن جب یہ میرے آس پاس کے بدمعاش آپس مین بات چیت کرتے جو شاذونادر ہی ہوتی تھی وہ اپنی ہی زبان مین بولتے جسے مین ذرا بھی نہین جانتا تھا۔

مین حبشیون سے اُن کی عجیب لنگوافرنیکا مین جو وہ بولتے ہین خوب باتین کرسکتا تھا چنانچہ مین نے اس مین اپنے آس پاس کے دسیون سے یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ ہمین کہان لیئے جارہے ہین اور میرا چھوٹا بھائی کہان ہو لیکن یا تو ان کی سمجھ مین میری باتین نہین آئین یا وہ سمجھنا نہ چاہتے تھے۔ بہرحال اُنھون نے اس سے زیادہ اور کوئی جواب نہین دیا کہ اُنھون نے جب مین نے اپنے والد کو دوبارہ پکارنا چاہا۔ اکھڑے پنے سے مجھے چپ رہنے کا حکم دیا۔ اس کے کچھ دیر بعد تک مین ننھے جیرلڈ کے انجام کے متعلق متفکر تھا لیکن آخرکار جب ہم ایک کھلے میدان سے گذر رہے تھے مجھے اُسے زندہ اور بظاہر بے چوٹ دیکھ کے بڑی خوشی ہوئی۔ ایک شخص جو ان دسیون مین کچھ رتبہ کا معلوم ہوتا تھا سواری کی حالت مین اسے اپنے سامنے اپنے گھوڑے کی گردن پر بٹھائے تھامے ہوے تھا۔ مین نے اُس سے پکار کے پوچھا کہ اُسے کوئی ضرب تو نہین پہونچی اُس نے جواب مین پکار کے کہا "نہین کچھ زیادہ نہین" اور میرا خیال ہو کہ اُس نے میری بابت بھی پوچھا۔ لیکن جو آدمی اُسے تھامے ہوے تھا اُس نے بری طرح جھنجھلا کے چُپ رہنے کا حکم دیا گیا۔ اب جو نکہ میرا دل میرے والد اور بھائی کی حالت سے مطمئن ہو گیا مجھے اپنی حالت پر غور کرنے کی فرصت تھی لیکن یہ غور کرنے پر کچھ بھی واضح نہوئی۔ مین نے دیکھا کہ مجھے بالکل ننگا کر دیا گیا ہو اور نہایت مضبوطی سے میری مشکین کسی ہوئی ہین اور میرے ٹخنے ایک رسّی یا چمڑے کے تسمہ سے جو میرے گھوڑے کی پیٹ کے نیچے سے نکالا ہوا ہی بندھے ہوے ہین۔

میرے آگے کی طرف کمبلون کی گٹھری کی قسم کی کوئی چیز تھی اس سے بھی مین بظاہر ایک رسی سے جو گھوڑے سے بندھی ہوئی تھی کسا ہوا تھا۔ مین بیہوشی کی حالت مین غالباً اس لپٹی ہوئی گٹھری پر اُس سے بندھا ہوا پڑا رہا ہون گا۔ گویا مین خود بھی ایک گٹھری تھا اور اب ہوش آنے پر بھی مین بیٹھنے اور اچھی طرح سوار ہونے یا ان درختون کی جھکی ہوئی شاخون سے جن کے نیچے سے ہم گذر رہے تھے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہاتھ بڑھانے کے بالکل ناقابل تھا۔ میری حالت نہایت سقیم اور غیرآرام دہ

تھی اور جب اس پر یہ امر ستزاد کیا جائے کہ میرا سر اس چوٹ سے جسکے لگنے سے مین بیہوش ہو گیا بُری طرح درد کر رہا تھا تو آپ آسانی سے سمجھ سکین گے کہ مین کسی خاص ہمت افزا حالت مین نہ تھا۔

جہانتک مین مسلسل غور کر سکا مجھے یقین ہو کہ مین نے اپنا کثیر وقت اس حالت پر متحیر ہونے مین صرف کیا جسمین ہم نے اپنے آپ کو پایا۔ یہ دیسی کون لوگ تھے اور اُس وحشیانہ طور سے جیسا انھون نے عمل کیا ہم پر حملہ کرنے اور پھر ہم کو اُسی وقت مار ڈالنے کی بجاے قیدی بنا کے لے جانے سے اُن کی کیا غرض ہو سکتی تھی؟ بہت سی کہانیون کے سننے سے یہ مجھے بخوبی معلوم تھا کہ قید کرنے کا ان کے ہان دستور نہین۔ اور اگرچہ سانس کے ساتھ آس ہے اور یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی کہ اُنھون نے اب تک ہماری جانین بخش رکھی تھین لیکن مین ضرور مانون گا کہ جتنا مین اپنے اغلب مستقبل کے متعلق غور کرتا تھا اتنا ہی مجھے یہ ناخوشگوار نظر آتا تھا۔

ایسی بھیانک اور بے آرام حالت مین یہ یقین کی بات نہین معلوم ہوتی لیکن مجھے یقین ہو کہ مین واقعی سو گیا یا کم از کم اُونگھ گیا کیونکہ مجھے دن طلوع ہونے کی مطلق خبر نہین۔ اس وقت پورا دن نکل آیا تھا جب میرا گھوڑا ایک جھٹکے کے ساتھ رُکا اور مین اس احساس کے ساتھ جاگ اُٹھا کہ آخر کار ہم اس ناقابل اختتام جنگل سے باہر نکل آئے ہین۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مین نے اِن دیسیون کے جھونپڑون کے بجاے ایک لشکر کے خیمے سے دیکھے اور اُس نظارہ سے مجھے امید کی ایک اچانک چمک معلوم ہوئی جس نے حیرت انگیز طریقہ سے مجھے بالکل متوحش کر دیا۔ اگر یہان فوجی خیمے ہین تو یقیناً یہان مہذب لوگ بھی ہون گے کیونکہ یہ دیسی لوگ ہمین مار ڈالنے کی بجاے اِس جگہ لے آئے ہین تو کیا بالآخر بچ نکلنے کی کوئی امید ممکن نہین؟ اس کے جو کچھ بھی معنی ہون اُن سے میرے پہلے خیالات مین کوئی اضافہ نہین ہوا۔ لیکن کم از کم یہ ہماری سواری کے سفر کے اس بھیانک انجام سے بالکل جداگانہ چیز تھا جس کی میرے اندیشے میرے سو جانے کے وقت مجھے توقع کرنے کی تحریک کر رہے تھے

(باقی آئندہ)

محمد ظفر

افادات شاد

نظر ٹھہرا کے دیکھو او نقش باطل دیکھنے والے
سمجھ اس نقش باطل کا بھی حاصل دیکھنے والے

وہ خنجر یون ہزار انداز معشوقانہ دکھلائے
نہ دیکھین گے پلٹ کر سوئے قاتل دیکھنے والے

تغافل کا ترے شکوہ تو ہی سارے زمانہ کو
مگر کچھ اور ہی سمجھے ہین عاقل دیکھنے والے

قیامت کر رہی ہین وہ نگاہین شرم آلودہ
ہوئے جاتے ہین بے شمشیر گھائل دیکھنے والے

لیے جاتا ہی طوفان اور جانب تیری کشتی کو
ذرا آنکھین اٹھا اے سوئے ساحل دیکھنے والے

کوئی جا حسن کے جلوے سے عالم مین نہین خالی
بڑی حیرت ہی کس کس پر ہون مائل دیکھنے والے

ہر اک جلوہ کے پردے مین بھی لاکھون لاکھ جلوے ہین
کرشمے تیرے کیا دیکھین گے جاہل دیکھنے والے

ذرا تقدیر کے بھی مسئلہ کو دیکھ کھول آنکھین
حقارت کی نظر سے سوئے سائل دیکھنے والے

نہ جب تک قیس سا وحشی ملے پردہ نہ اٹھے گا
عبث چلاتے ہین لیلیٰ کی محمل دیکھنے والے

حقیقت مین وجود اپنا بھی ہی ہم بھی معترف ہین
مگر سمجھے ہین یہ بھی زعم باطل دیکھنے والے

وہ شے باقی کہان جس شے کی سب کو بدگمانی ہی
ٹٹولین آکے سینہ کو مرے دل دیکھنے والے

جھلک کچھ کچھ نظر آئیگی گو پردون پہ پردے ہین
ہوس گر ہی تو آئین میرے شامل دیکھنے والے

نہین کچھ خوف رستہ کا اگر اے خضر ڈر یہ ہی
نہ ہمت ہار بیٹھین بعد منزل دیکھنے والے

طلب کرتے نہین ساقی سے گو افراط مے ہی
زبان روکے ہوئے ہین رنگ محفل دیکھنے والے

نہ ان غزلون کو یون ضایع کرو اے شاد رہنے دو
وہ دیکھین گے جو ہین کامل سے کامل دیکھنے والے

ہندوستان کے مشہور شہر اور قصبے

جسکے

حصۂ اول میں اُن مقامات کی فہرست درج ہے جن کی آبادی ۲۰ ہزار یا اس سے زیادہ ہے
حصۂ دوم " " " " " " یا اس سے کم ہے
حصۂ سوم " " " " " جن کی تخمینی آبادی ۵ ہزار یا اس سے کچھ زیادہ ہے

صوبہ جات ہند معہ رقبہ وآبادی

نام صوبہ	رقبہ بحساب میل مربع	آبادی	نام صوبہ	رقبہ بحساب میل مربع	آبادی
برما	۲۳۶۷۳۸	۱۰۲۵۰۰۰۰	بہار واڑیسہ	۱۱۳۰۰	۳۵۰۰۰۰۰۰
مدراس	۱۴۱۷۲۶	۴۱۴۰۵۴۰۴	صوبہ متحدہ	۱۱۲۶۱۶	۴۸۵۰۰۰۰۰
بنگال وآسام	۱۲۶۰۰۰	۴۸۱۲۲۲۰۱	پنجاب وسرحد	۱۱۰۴۰۶	۲۲۰۰۰۰۰۰
بمبئی	۱۲۳۰۶۴	۱۹۶۷۲۶۴۲	سی پی وبرار	۱۰۰۳۴۵	۳۰۰۰۰۰۰۰

رقبے کے لحاظ سے دیکھئے تو ہمارا صوبۂ متحدہ آگرہ واودھ صوبۂ "پنجاب وسرحد" اور صوبۂ "بہار واڑیسہ" کے برابر، صوبہ برما سے بہت چھوٹا، صوبہ مدراس، صوبہ بمبئی نیز صوبہ "بنگال وآسام" سے چھوٹا اور صرف "سی پی وبرار" سے کسی قدر بڑا ہے لیکن کثرت آبادی اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے ان صوبوں میں سے کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ہندوستان کی ۲۰ ہزار سے زیادہ آبادی رکھنے والے ۱۰۰ مقامات میں سے ۴۰ صرف اسی ایک صوبہ میں واقع ہیں۔ باقی ۱۶۰ میں سے ۲۸ مدراس، ۲۲ پنجاب وسرحد، ۱۹ بمبئی، ۱۶ بنگال وآسام، ۱۳ بہار واڑیسہ، ۷ سی پی وبرار، ۴ ریاست حیدرآباد، ۳ صوبہ برما، ۴ ریاست گوالیار، ۳ ریاست بڑودہ، ۳ ریاست اندور، ۲ ریاست میسور، ۲ ریاست کشمیر، ۲ ریاست بھرتپور اور ایک ایک علاقہ دہلی، اجمیر، پانڈیچری، چندرنگر، نیپال نیز ریاستہائے دھولپور، جے پور، اودے پور، بھوپال

جودھپور، بھاونگر، بیکانیر، الور، پٹیالہ، نوانگر، کولھاپور، رام پور، ٹونک، میرج، جوناگڈھ، کوٹہ، رتلام۔ ریوان، ٹراونکور، پوربندر، ودھوان، بوندی، دتیا، جاورہ، مالیرکوٹلہ، قرولی، کچھ اور بھاولپور مین واقع ہین،

حصۂ اول کے ان ۲۰۰ شہرون حصۂ دوم وسوم کے ۳۰۰ اور مقامات بھی شامل کرلیے جائین تو ہمارے صوبہ کا درجہ امتیاز اور بھی زیادہ بلند ہوجاتا ہی کیونکہ ہندوستان کے مشہور شہرون ضلعون اور قصبون کی اس مجموعی تعداد ۵۰۰ مین سے ۱۰۰ یعنی ۱/۵ سے زیادہ صرف اسی ایک صوبہ مین واقع ہین۔ باقی ۲۰۳ مین سے بنگال وآسام مین ۶۴، پنجاب وسرحد مین ۱۵، مدراس مین ۵۴، بہار واڑلیسہ مین ۲۵، سی۔پی مین ۲۳، حیدرآباد مین ۱۱، گوالیار مین ۴، میسور، برودہ، اندور اور بھرتپور مین تین تین کشمیر، بھاولپور اور ریوان مین دو دو باقی مین صرف ایک ایک ہی۔

نمبر	نام شہر	صوبہ	آبادی مع کیفیت	نمبر	نام شہر	نام صوبہ	آبادی مع کیفیت
۱	کلکتہ	بنگال	۱۲۳۲۳۱۳	۱۳	آگرہ	یو۔پی	۱۸۲۴۳۹
۲	بمبئی	بمبئی	۱۰۰۰۰۰۰	۱۴	الٰہ آباد	"	۱۷۵۷۴۸
۳	مدراس	مدراس	۵۱۸۰۰۰	۱۵	امرتسر	پنجاب	۱۶۲۰۰۰
۴	حیدرآباد	دکن	۴۴۶۰۰۰ ریاست	۱۶	دھولپور	دھولپور	۱۶۱۰۰۰ ریاست
۵	دہلی	دہلی	۳۹۱۰۰۰	۱۷	بنگلور	میسور	۱۵۹۰۳۰ ریاست
۶	لکھنؤ	یو۔پی	۲۶۵۰۰۰	۱۸	ہاوڑہ	بنگال	۱۵۲۰۰۰
۷	رنگون	برما	۲۵۰۰۰۰	۱۹	جے پور	جے پور	۱۵۰۰۰۰ ریاست
۸	لاہور	پنجاب	۲۳۰۰۰۰	۲۰	بریلی	یو۔پی	۱۳۷۴۳۳
۹	احمدآباد	بمبئی	۲۱۵۰۰۰	۲۱	پٹنہ	بہار	۱۳۵۰۰۰
۱۰	بنارس	یو۔پی	۲۰۹۰۰۰	۲۲	ناگپور	سی۔پی	۱۳۰۰۰۰
۱۱	کانپور	"	۲۰۰۰۰۰	۲۳	ترچناپلی	مدراس	۱۲۲۱۸۰
۱۲	مانڈلے	برما	۱۸۲۵۰۰	۲۴	سری نگر	کشمیر	۱۲۲۰۰۰ ریاست

۲۵	سورت	بمبئی	۱۲۰۰۰۰	
۲۶	کراچی	سندھ بمبئی	۱۲۰۰۰۰	
۲۷	میرٹھ	یو۔پی	۱۲۰۰۰۰	
۲۸	پونا	بمبئی	۱۱۲۵۸۰	
۲۹	مدورا	مدراس	۱۰۵۵۵۰	
۳۰	گوالیار	گوالیار	۱۰۵۰۰۰	ریاست
۳۱	بردوہ	بردوہ	۹۹۳۴۹	ریاست
۳۲	اندور	اندور	۹۸۷۵۰	ریاست
۳۳	ڈھاکہ	بنگال	۹۱۰۰۰	
۳۴	پشاور	صوبہ سرحد	۹۰۴۴۰	
۳۵	جگناتھ پوری	بہار و اڑیسہ	۸۹۰۰۰	
۳۶	اجمیر	اجمیر	۸۶۲۷۳	
۳۷	سیالکوٹ	پنجاب	۸۱۶۴۸	
۳۸	انبالہ	〃	۸۰۰۰۰	
۳۹	مرزاپور	یو۔پی	۷۹۵۰۰	
۴۰	بھوپال	بھوپال	۷۸۵۰۰	ریاست
۴۱	ملکاپور	سی۔پی	۷۸۴۶۰	
۴۲	رامپور	رامپور	۷۸۲۱۶	ریاست
۴۳	ملتان	پنجاب	۷۶۴۸۰	
۴۴	مرادآباد	یو۔پی	۷۶۴۲۴	
۴۵	شولاپور	بمبئی	۷۶۴۰۰	
۴۶	جبل پور	سی۔پی	۷۶۲۰۰	
۴۷	شاہجہانپور	یو۔پی	۷۶۰۰۰	
۴۸	فیض آباد	یو۔پی	۷۵۰۰۰	
۴۹	بھاگلپور	بہار و اڑیسہ	۷۵۰۰۰	
۵۰	راولپنڈی	پنجاب	۷۵۰۰۰	
۵۱	سالم	مدراس	۷۲۰۰۰	
۵۲	میسور	میسور	۷۱۳۰۰	ریاست
۵۳	گیا	بہار	۷۱۰۰۰	
۵۴	علی گڈھ	یو۔پی	۷۰۱۲۷	
۵۵	حیدرآباد سندھ	بمبئی	۷۰۰۰۰	
۵۶	دربھنگا	بہار	۶۶۰۰۰	
۵۷	سہارنپور	یو۔پی	۶۴۰۰۰	
۵۸	گورکھپور	〃	۶۳۵۰۰	
۵۹	فرخ آباد	〃	۶۳۰۰۰	
۶۰	ہبلی	بمبئی	۶۰۰۰۰	
۶۱	جودھپور	جودھپور	۶۰۵۰۰	
۶۲	چھپرا	بہار	۶۰۰۰۰	
۶۳	جھانسی	یو۔پی	۶۰۰۰۰	
۶۴	بھاونگر	بھاونگر	۶۰۰۰۰	ریاست
۶۵	متھرا	یو۔پی	۵۹۸۶۰	
۶۶	کڈپور	مدراس	۵۹۰۰۰	
۶۷	نگاپٹم	〃	۵۸۵۴۵	
۶۸	بیکانیر	بیکانیر	۵۸۰۰۰	ریاست
۶۹	تانجور	مدراس	۵۸۵۰۰	
۷۰	بلاری	〃	۵۸۰۰۰	

۷۱	الور	الور	۵۶۷۴۰	ریاست
۷۲	پٹیالہ	پٹیالہ	۵۶۴۲۸	ریاست
۷۳	مولمین	برما	۵۶۰۰۰	
۷۴	سراج گنج	بنگال	۵۶۰۰۰	
۷۵	شکارپور سندھ	بمبئی	۵۴۴۱۶	
۷۶	فیروزپور	پنجاب	۵۴۰۰۰	
۷۷	کوئمبوٹر	مدراس	۵۴۰۰۰	
۷۸	پانڈیچری	پانڈیچری	۵۲۶۰۰	فرنچ
۷۹	جلندھر	پنجاب	۵۲۲۰۰	
۸۰	نوانگر	نوانگر	۵۰۸۶۰	ریاست
۸۱	لدھیانہ	پنجاب	۵۰۸۰۰	
۸۲	کوٹھاپور	کوٹھاپور	۵۰۰۰۰	ریاست
۸۳	بھرت پور	بھرت پور	۵۰۰۰۰	ریاست
۸۴	کھٹ پانڈو	نیپال	۵۰۰۰۰	آزاد ریاست
۸۵	امراؤتی	برار	——	
۸۶	کوکونڈا	مدراس	۴۸۵۰۰	
۸۷	آرہ	بہار	۴۸۰۰۰	
۸۸	کانجی درم	مدراس	۴۷۲۰۰	
۸۹	اُدے پور	اُدے پور	۴۵۸۰۰	ریاست
۹۰	ساگر	سی۔پی	۴۵۶۸۰	
۹۱	کاٹنی	"	۴۵۴۰۰	
۹۲	مظفرپور	بہار	۴۵۱۰۰	
۹۳	داناپور	"	۴۵۰۰۰	
۹۴	احمدنگر	بمبئی	۴۵۰۰۰	
۹۵	منگلور	ملیبار مدراس	۴۴۵۶۰	
۹۶	پالگھاٹ	مدراس	۴۴۲۰۰	
۹۷	ویلور	"	۴۴۱۶۰	
۹۸	ہاتھرس	یو۔پی	۴۳۲۰۰	
۹۹	جونپور	"	۴۲۵۰۰	
۱۰۰	سیرام پور	بنگال	۴۰۵۰۰	
۱۰۱	مچھلی پٹن	مدراس	۳۹۴۰۶	
۱۰۲	غازی پور	یو۔پی	۳۹۰۰۰	
۱۰۳	ٹونک	ٹونک	۳۹۰۰۰	ریاست
۱۰۴	بھوانی	پنجاب	۳۸۶۰۰	
۱۰۵	تلی چیری	مدراس	۳۸۵۰۰	
۱۰۶	بدایون	یو۔پی	۳۸۰۰۰	
۱۰۷	اٹاوہ	"	۳۸۰۰۰	
۱۰۸	پٹن	برودہ	۳۶۳۲۰	ریاست
۱۰۹	اجین	گوالیار	۳۶۱۲۴	ریاست
۱۱۰	امروہہ	یو۔پی	۳۶۰۰۰	
۱۱۱	نوساری	برودہ	۳۵۴۸۳	ریاست
۱۱۲	جوناگڈھ	جوناگڈھ	۳۵۰۰۰	ریاست
۱۱۳	مرشدآباد	بنگال	۳۵۰۰۰	
۱۱۴	منگیر	بہار	۳۵۰۰۰	
۱۱۵	وزیگاپٹم	مدراس	۳۵۰۰۰	
۱۱۶	بردوان	بنگال	۳۵۰۰۰	

۱۱۷	پیلی بھیت	یو۔پی	۳۵۰۰۰	
۱۱۸	احمد پور	بہاولپور	۳۵۰۰۰	ریاست
۱۱۹	جمون	کشمیر	۳۴۲۰۷	ریاست
۱۲۰	دھارواڑ	بمبئی	۳۴۰۰۰	
۱۲۱	وزیانگرم	مدراس	۳۳۸۶۴	
۱۲۲	کوٹہ	کوٹہ	۳۳۵۰۰	ریاست
۱۲۳	مدنا پور	بنگال	۳۳۰۰۰	
۱۲۴	میرج	میرج	۳۳۸۲۸	ریاست
۱۲۵	سکھر	سندھ بمبئی	۳۲۵۸۴	
۱۲۶	راجمندری	مدراس	۳۲۴۹۰	
۱۲۷	نڈیاد	بمبئی	۳۱۴۸۳	
۱۲۸	سانتی پور	بنگال	۳۱۰۵۶	
۱۲۹	نیلور	مدراس	۳۰۸۴۰	
۱۳۰	ہردوار	یو۔پی	۳۰۴۰۰	
۱۳۱	کوہاٹ	سرحد	۳۰۴۶۰	
۱۳۲	کنانور	ملیبار مدراس	۳۰۰۰۰	
۱۳۳	چندوسی	یو۔پی	۳۰۰۰۰	
۱۳۴	خورجہ	”	۳۰۰۰۰	
۱۳۵	چٹگام	بنگال	۳۰۰۰۰	
۱۳۶	بارکپور	”	۳۰۰۰۰	
۱۳۷	چنیورہ	”	۳۰۰۰۰	
۱۳۸	ستارا	بمبئی	۳۰۰۰۰	
۱۳۹	برہان پور	”	۳۰۰۰۰	
۱۴۰	سکندر آباد	حیدرآباد	۳۰۰۰۰	ریاست
۱۴۱	ڈیرہ غازی خان	سرحد	۳۰۰۰۰	
۱۴۲	رتلام	رتلام	۲۹۵۸۰	ریاست
۱۴۳	بانکوڑا	بنگال	۲۹۰۰۰	
۱۴۴	ریواڑی	پنجاب	۲۸۸۶۰	
۱۴۵	پانی پت	”	۲۸۶۶۲	
۱۴۶	منڈسور	گوالیار	۲۸۴۶۰	ریاست
۱۴۷	توتیکورن	مدراس	۲۸۱۱۴	
۱۴۸	ٹریونڈرم	ٹراونکور	۲۸۰۰۰	ریاست
۱۴۹	گجرانولہ	پنجاب	۲۷۰۰۰	
۱۵۰	بٹالہ	”	۲۷۰۰۰	
۱۵۱	بہرائچ	یو۔پی	۲۷۰۰۰	
۱۵۲	ڈیرہ اسمٰعیل خان	سرحد	۲۷۰۰۰	
۱۵۳	دتیا	دتیا	۲۷۰۰۰	ریاست
۱۵۴	کرنول	مدراس	۲۶۷۴۵	
۱۵۵	بھج	بھج	۲۶۵۰۰	ریاست
۱۵۶	بیلگاؤں	بمبئی	۲۶۲۳۷	
۱۵۷	اورنگ آباد	حیدرآباد	۲۶۲۶۵	ریاست
۱۵۸	کرشن نگر	بنگال	۲۶۰۵۰	
۱۵۹	ادونی	مدراس	۲۶۰۰۰	
۱۶۰	ڈیرہ دون	یو۔پی	۲۶۰۰۰	
۱۶۱	بندرابن	یو۔پی	۲۶۰۰۰	
۱۶۲	چندرنگر	چندرنگر	۲۶۰۰۰	پرتگال

۱۶۳	سیتاپور	یو۔پی	۲۵۱۱۲	
۱۶۴	ناسک	بمبئی	۲۵۱۰۰	
۱۶۵	ددھوان	ددھوان	۲۵۰۴۲	ریاست
۱۶۶	برہام پور	بنگال	۲۵۰۰۰	
۱۶۷	گنتور	مدراس	۲۵۰۰۰	
۱۶۸	ڈنڈیگل	”	۲۵۰۰۰	
۱۶۹	نگینہ	یو۔پی	۲۴۶۶۰	
۱۷۰	مُرار	گوالیار	۲۴۵۰۰	ریاست
۱۷۱	ریوان	ریوان	۲۴۱۱۸	ریاست
۱۷۲	نیمچ	اندور	۲۴۱۰۹	ریاست
۱۷۳	ٹمیا	بہار	۲۴۰۰۰	
۱۷۴	گدگ	بمبئی	۲۴۰۰۰	
۱۷۵	بجوارٹا	مدراس	۲۴۰۰۰	
۱۷۶	قرولی	قرولی	۲۴۰۰۰	ریاست
۱۷۷	نرائن گنج	بنگال	۲۳۱۲۰	
۱۷۸	حاجی پور	بہار	۲۳۰۰۰	
۱۷۹	باندا	یو۔پی	۲۳۰۰۰	
۱۸۰	دیوبند	”	۲۳۰۰۰	
۱۸۱	بونڈی	بونڈی	۲۲۵۴۴	ریاست

(باقی)

۱۸۲	ہوشیارپور	پنجاب	۲۲۵۰۰	
۱۸۳	کرنال	”	۲۲۵۰۰	
۱۸۴	رائچور	حیدرآباد	۲۲۴۶۰	
۱۸۵	نصیرآباد	اندور	۲۲۴۲۸	ریاست
۱۸۶	جاؤرہ	جاؤرہ	۲۲۴۰۰	ریاست
۱۸۷	جھنگ	پنجاب	۲۲۱۱۵	
۱۸۸	مالیرکوٹلہ	مالیرکوٹلہ	۲۲۱۰۰	ریاست
۱۸۹	سنبھل	یو۔پی	۲۱۸۶۰	
۱۹۰	سری نگم	مدراس	۲۱۸۰۰	
۱۹۱	فتحپور ہسوہ	یو۔پی	۲۱۵۰۰	
۱۹۲	رانچی	بہار اڑیسہ	۲۱۵۰۰	
۱۹۳	جہلم	پنجاب	۲۱۵۰۰	
۱۹۴	مظفرنگر	یو۔پی	۲۱۱۸۰	
۱۹۵	بندھرپور	بمبئی	۲۱۱۱۰	
۱۹۶	اکولہ	سی۔پی برار	۲۱۰۰۰	
۱۹۷	نجیب آباد	یو۔پی	۲۰۱۲۰	
۱۹۸	پوربندر	پوربندر	۲۰۰۶۲	ریاست
۱۹۹	اعظم گڑھ	یو۔پی	۲۰۰۰۰	تقریباً
۲۰۰	مین پوری	”	۲۰۰۰۰	تقریباً

حسرت موہانی بی اے

اللہ اکبر

رسالہ ہمایون کا معیار ادب

ہر آرزو کہ ابروے پُر خم کو دیکھئے ۔۔۔ اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

برگیڈ میجر مولوی عطاء الرحمن صاحب بی اے کی ایک پُرلطف اور دلچسپ کہانی تقاضائے محبت "معیار ادب پر پورے اُترنے کے بعد) جنوری ۲۶ء کے ہمایون مین نذر ناظرین ہو چکی ہی، اسمین شک نہین کہ میجر صاحب کا دماغ (اگر صاحب موصوف کچھ اُردو بھی جانتے ہوتے) اُردو کی فضائے انشا پردازی مین مسرت خیز طوفان پیدا کر کے اُردو علم ادب کے ساتھ وہی کرتا جو ساون کی جی کو تڑپا دینے والی کالی کالی گھنگھور گھٹائین اور رکنوار کی جواہر ریزو گوہر بیز بوندین کلّرا در بنجر زمین یا سیپی کے ساتھ کرتی ہین،

کہانی صاف طور پر فسانہ نگار کی دماغی قابلیت کا اعتراف کر رہی ہی۔ لفس مضمون حلف اُٹھانے کو تیار ہی کہ وہ کسی زبردست تخیل زاد دماغ کا نتیجہ ہی۔ واقعہ بلندی خیال اور علوے فکر کا شاہد ہی۔ مگر فسوس عبارت اور زبان، زبانِ شکایت ہی کھولے ہوے نہین بلکہ محوِ فریاد و فغان ہی۔ اور ہی بھی بجا۔ بقول غالب ؎

آگ سے پانی مین بجھتے وقت اُٹھتی ہی صدا ۔۔۔ ہر کوئی درماندگی مین نالے سے ناچار ہی

اُردو کی بدقسمتی کو کیا کیا جاے؟ ایسے ایسے لوگ اس کی حمایت کو تیار، ایسے ایسے دماغ اُس کی خدمت کو آمادہ، اور ایسی ایسی زبردست شخصیتین اُس کی ترقی کی خواہان ہین لیکن آخر کار نتیجہ کیا نکلتا ہی؟ محض ناکامی اور محض ناکامی ہی نہین بلکہ الٹا تنزل:۔

اُردو انشا پردازی کی باگ اس وقت انگریزی خوان فیشن ایبل طبقہ کے ہاتھ مین ہی، چونکہ وہ خود انگریزی تمدن کے عاشق، انگریزی طرز زندگی کے شیدا، اور انگریزی شان و شکوہ پر مفتون ہین، اسلیے اُن کی تقریر و تحریر بھی انگریزی رنگ مین رنگی ہوئی ہی۔ وہ جب کبھی اتفاقاً کسی سے اُردو مین ہم کلام ہوتے ہین تو یا انگریزی اُردو ہو جاتی ہی یا بچاری اُردو کو انگریزی جونی مین داخل ہونا پڑتا ہی، بات ایک ہی ہی۔ یہی حال تحریر کا ہی۔ آپ کسی فیشن ایبل انشا پرداز کی تحریر کو پڑھین۔ اگر اُردو پر انگریزی کا دھوکہ نہ ہو تو میرا ذمہ۔ مضمون زیر تنقید بھی اسی صنعت سے مرصع ہی۔ ہر ہر قدم پر انگریزی قواعد نے اُردو

صرف و نحو کو شکست فاش دی ہو۔ ہر ہر سطر مین اسی بات کا لحاظ رکھا گیا ہو کہ کہین اُردو انگریزی پر غالب نہ آجائے۔ یقین ہو کہ اُردو لشکر اس سے پہلے کسی سے ایسی شکست کھا کر پسپا و نابود نہ ہوا ہوگا۔ ملاحظہ ہو

(۱) "مجھے جانتا ہو" لڑکی نے حیران ہوکر کہا

(۲) "اصل مین معاملہ اس طرح ہو" الفاظ اس کے منھ سے رُک رُک کر نکلتے تھے۔

(۳) نوجوان نے ایک قہقہہ لگایا "اس نے کام مار لیا استاد"

(۴) "نہین یہی مناسب ہو" نوشیروان نے دیا جواب

(۵) "اور حُسن اتفاق سے رستم جی اُس سے واقف تھا" اس کا نام رستم جی ہو۔

(۶) جب وہ دوبارہ اس کی طرف آئی تو اُس کے چہرہ پر خلاف معمول اظہار نہ تھا جب اس نے کہا آپ کے نقرہ سے مین اپنی سزا کو بہو نچ گیا"

(۷) "ارے کیا سچ" تو پھر کمال کیا ہو ظالم نے۔ کا ہن جی نے زور سے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور ہنستے ہنستے لوٹ گیا!

(۸) اس کی پیشانی پر بل آگئے اور وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی "آؤ مین اُسے دیکھون تو سہی"

اس کے علاوہ عبارت ذیل قابل ملاحظہ ہو۔

"وہ اندر مکان مین آئی تو نوشیروان جی اُس کے بھائی کے ساتھ کونے مین کھڑا باتین کر رہا تھا پھر کسی نے بلیرڈ کھیلنا تجویز کیا جو بہت اچھا کھیل ہو۔ لیکن جس مین اگر کھیل کی طرف دھیان نہ ہو تو میز کی ربڑ کے کنارے پر ہاتھ رکھکر کھڑا ہونا عقلمندی سے بعید ہو۔ وہ رستم جی کا ہاتھ تھا اور پتھر جیسی سخت گیند کے پورے زور مین اس پر لگنے کا لطف وہی شخص سمجھ سکتا ہو جس نے خود چکھا ہو۔ چوٹ اتفاقیہ معلوم ہوتی تھی۔ اور نوشیروان جی نے جو کھیل رہا تھا کئی مرتبہ معافی طلب کی بلیکن اس ہلچل کے اثنا مین جو فوراً کمرہ مین پیدا ہوگئی۔ تارا کی آنکھ نوشیروان کی ظاہرا بے گناہ آنکھ سے ملی۔ اور وہ منھ کے آگے رومال رکھ کر دوسرے کمرہ مین بھاگ گئی۔ ایسی حالت مین نہ رک سکنے والی ہنسی کا اسی کمرہ مین اظہار اچھا نہین معلوم ہوتا"

"وہ اندر مکان مین الخ" سے لیکر "اچھا کھیل ہو الخ" تک تو خیر لیکن بعد کی سطور کے سمجھنے کیلیے کسی ہنٹلمین انشا پرداز کی ضرورت پڑے گی۔ "وہ رستم جی کا ہاتھ تھا" کون سا؟ اس سے پہلے تو کسی ہاتھ کا کہین ذکر ہی نہین

یا ممکن ہو کسی مہمل گو شاعر کے شعر کے مطلب کی طرح خود فسانہ نگار صاحب کے دل مین ہو۔ بہر حال مین اس چیستان کے سمجھنے سے قاصر ہون۔

"اور تیھر جیسی سخت گیند سے کے پورے زور مین اُس پر لگنے کا لطف وہی شخص سمجھ سکتا ہو جس نے خود چکھا ہو"

بیشک ہو تو ایسا ہی لیکن مین نہین سمجھ سکتا اس جگہ اس کے اظہار کا کیا موقع تھا۔ علاوہ اس کے پورے زور مین اُس پر لگنے الخ" کو شاید اردو مین اِس طرح کہین گے "پورے زور سے اس پر لگنے")

"چوٹ اتفاقیہ معلوم ہوتی تھی"

پھر مجھے یہی عرض کرنا پڑتا ہو کہ کون سی "چوٹ"؟ کس کے "چوٹ"؟ کیسی "چوٹ"؟ فعل موجود فاعل اور مفعول دونون غائب! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہو؟

"اور نوشیروان جی نے جو کھیل رہا تھا کئی مرتبہ معافی طلب کی"

مین بھی ہزار بار "معافی طلب" کر کے فسانہ نگار صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہون کہ "نوشیروان جی نے جو کھیل رہا تھا" کس سے معافی طلب کی اور کس بات کی معافی طلب کی؟ سیاق عبارت تو اس بات کا جواب دینے کے لیے تیار نہین۔

"لیکن اِس ہلچل کے اثنا مین جو فوراً کمرہ مین پیدا ہو گئی"

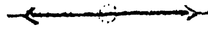
غالباً فسانہ نگار صاحب یہ بتانا بھول گئے کہ کون سا حادثہ دلخراش وقوع پذیر ہوا جس کے باعث فوراً کمرہ مین ہلچل پڑ گئی؟

"ایسی حالت مین نہ رک سکنے والی ہنسی کا اُسی کمرہ مین اظہار اچھا نہین معلوم ہوتا"

مہربانی فرما کر بتایا جائے کہ یہ کس نے کہا؟ ناصح کون تھا؟ اور نصیحت کس کو کی گئی؟ وعلیٰ ہذا لقیاس۔ عبارت ذیل کے لیے بھی سوائے اِس کے اور کیا کہہ سکتا ہون؟ کہ "کس نگشود و نکشاید بحکمت این معمارا" ملاحظہ ہو۔

"اِسی لیے تو مین یہان آیا ہون مین شبومل کی دوکان مین کام کرتا ہون۔ ہمارا رستم اپنی ہونے والی بی بی کو ایک چھوٹا سا تحفہ علی الحساب دینا چاہتا ہو۔ وہ پھر ہنسا اور جیب کو ٹٹولنے لگا یہ لو اور ایک رسید لکھ دو کہ گلوبند جو پسند کرانے کی غرض سے لے گیا تھا وہ واپس وصول ہوا۔

اُس نے آنکھ ماری - بھئی کیا کہین رستم جی اپنے فن مین یکتا ہی وہ دوسرے آدمی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا اور اُس کی آنکھون مین ایک خفیف سے فکر کی جھلک تھی - وہ لڑکی کو یہ رسید دیکر سودا پختہ کیا چاہتا ہی"



اِس کے علاوہ فقرات ذیل بھی قابل ملاحظہ ہین - ممکن ہی کہ ناظرین ہمایون والناظر مجھ سے زیادہ سمجھ سکین -

(۱) ساتھ والے ہوٹل مین ص۲۴
(۲) ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ سے دیکھا ص۲۵
(۳) اُس کی پیشانی پر بل آگئے ص۲۵
(۴) تو کیا آپ کے خیال مین میرے بھائی نے غلطی کھائی ص۲۶
(۵) اور مین مشکور رہون گا ص۲۷
(۶) اگر آپ مجھے اجازت دین کہ جتنا عرصہ وہ اِس مکان مین ٹھہرے ص۲۷
(۷) شبوِل صراف کے کاروبار کے کئی حصے ہین جن مین سے ایک روپیہ قرض دینا ہی ص۲۸
(۸) اُنھون نے اس کے عوض پانچسو روپیہ دے دیا تھا - ص۲۹
(۹) پُرادب انداز اور بے طرح سی مسکراہٹ ص۲۵
(۱۰) تو رستم جی صاحب کیا بالکل کچھ بھی نہین ہو سکتا ص۳۱
(۱۱) اُسے صرف ایک خیال کا احساس تھا کہ اُس کے مُنھ پر تھپڑ مارے - ص
(۱۲) ایسی حالت مین نیند آجانا گو بُری بات ہو لیکن مزے دار ضرور ہوتا ہی ص
(۱۳) لیکن کاہن چند نے پوچھا رستم جی نے مجھے ٹیلیفون کے ذریعہ سے خود کیون نہ کہدیا ص۳۴
(۱۴) اب آنے والے واقعات کا خیال اُس کے گلے مین اٹک گیا - ص۳۵
(۱۵) یہ بدمعاش لوگ بھی کس قدر دلیر ہوتے ہین شبوِل کی دوکان کے چوکیدار کے منھ مین کپڑا ٹھونس دیا اور راہ ہر چور بیشک قابل افسوس ہی ص۳۶
(۱۶) غمزدہ سی مسکراہٹ سے دیکھا ص۳۷

(۱۷) لیکن اسی لحہ اُس کے ہاتھ کو ایک لوہے سے سخت ہاتھ کی ضرب لگی ۳۳

(۱۸) "ہمارا آپ سے کتنی مدت سے دوستانہ تھا؟" ۳۶

(۱۹) "باریک بین آنکھ کے لیے تو ظاہر ہی لیکن اس معاملہ مین مجھے کچھ اندرونی علم بھی ہی"

(۲۰) "مس تارہ کو یہ لفافہ بھیجنے والے نے اس معاملہ مین ایک اور کاغذ بھی بھیجا تھا"

یہ چند فقرے بطور مثال لکھے گئے ہین ورنہ کل افسانہ ایسے ہی جملون سے بھرا پڑا ہی،

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہی وہ یہ کہ صفحہ اول کی پہلی سطر مین جمشید تارا کا بڑا بھائی معلوم ہوتا ہی، اٹھائیسوین صفحہ کی آٹھوین سطر تک اس کا یہ عہدہ برابر قایم رہتا ہی، نوین سطر مین (بموجب مسئلہ ارتقا) جمشید تارا کا خاوند، اور بارھوین سطر مین (بموجب مسئلہ زوال یا آواگون) بیٹا یا چھوٹا بھائی یا کوئی اور ــــ ہوجاتا ہی۔

اختتام پر مین مسٹر صاحب سے اس صریحی گستاخی کی معافی چاہتا ہون۔ سچ عرض کرتا ہون کئی مرتبہ خیال آیا کہ قلم کو ہاتھ سے رکھدون اور اس تنقیدی خیال کو دماغ سے نکال دون۔ ممکن ہی کہ صاحب مذکور اپنے دل مین اس تنقید سے کوئی اور خیال قائم نہ کرلین۔ اس لیے کہ خطا بزرگان گرفتن خطاست لیکن اس کے ساتھ ہی صاحب موصوف کے علم و فضل اور انصاف پر نظر جاتی تھی تو بے اختیار غالب کا یہ شعر زبان سے نکل جاتا تھا۔ اور بار بار گنگناتا تھا ؎

اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہی — ہی ہی خدانخواستہ وہ اور دشمنی

مین ایڈیٹر صاحب ہمایون سے بھی معافی کا طلبگار ہون اس لیے کہ جس مضمون یا افسانہ کو بموجب قاعدہ نمبر ۲ صاحب مذکور معیار پر پورے اُترنے کا سرٹیفکٹ عطا فرما چکے اُس مین مین نے دخل درمعقولات کرکے یقینی طور پر صاحب مذکور کے دماغ کو منغص کیا ہوگا۔

مجھے یقین ہی کہ ایڈیٹر صاحب از راہ عنایت مجھے معاف فرمائین گے۔ اس لیے کہ

منظور ہی گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہین مجھے

ا۔ ق۔ ی۔ علوی

کلامِ حسرت

شوق کہان آرزدِ شوق ہر (۱) جس سے جہان مستِ ذوق ہر
درجہ ترے عشق فسون کار کا حسن کے رتبہ سے بھی مافوق ہر
گردنِ حسرت مین پئے امتیاز
خوب غلامی کا ترے طوق ہر

حُسن کے ہم ہلاک دید بھی ہین (۲) یعنی شاہد بھی ہین شہید بھی ہین
خانہ زادِ جفائے مختص دوست طالبِ شدتِ مزید بھی ہین
باوجودِ علائق کثرت عصرِ توحید کے وحید بھی ہین
ہوش گم کردۂ سبیل رشاد عقل کے پیر و رشید بھی ہین
کامیاب مرادِ غم حسرت
شادیٔ شوق کے مُرید بھی ہین

جذباتِ ہادی

چمک اُٹھتے ہین میرے داغ دل شبہائے غربت مین
یہی دو چار تارے کام آتے ہین مصیبت مین
مبارک تم کو ذوقِ کامرانی بزمِ عشرت مین
کہ ہین مانوس غم ہون جی بہلتا ہی مصیبت مین
نہ اب دل ہی نہ دلمین داغ الفت کی ضیا باشی
کبھی اک شمع روشن تھی شبستان محبت مین
پتہ ملتا نہین کچھ دل کے اجزائے پریشان کا
کہانتک کوئی ڈھونڈھے در ہامی دشت غربت مین
مری مایوسیان رونق فزائے خلوت دل ہین
یہ شمعین جلوہ آرا ہین شبستان محبت مین
رفیق رنج تنہائی ہی میری بیکسی کیا ہی
خدا رکھے یہ اکثر ساتھ دیتی ہی مصیبت مین
سُن اے محو طرب نا آشنائے سوز ناکامی
ہزار دن نغمہائے درد ہین ساز مسرت مین
تمناؤن کی بربادی پہ اتنا رنج و غم ہادی
ارے نادان کبھی ایسا بھی ہوتا ہی محبت مین

سفرِ حجاز کی مختصر روداد

عید کی نماز کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ سویرے ہی ہو جاتی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ مجمع زائد ہوگا اس لیے نماز فجر سے پہلے ہی کپڑے بدل لیے گئے اور حرم شریف میں پہونچا تو اس وقت بھی کافی ہجوم تھا۔ بہر حال مجھے بغیر کسی دقت کے مقام ابراہیم کے سامنے ممبر سے قریب ہی بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ آفتاب نکلنے کے بعد ہی خوشنما گنگا جمنی علم جسمین زرکار پھریرے لگے ہوے تھے لاکر ممبر کے دونوں جانب لگا دیے گئے۔ ممبر تقریباً ۴، ۵ گز لمبا ہے اور نشست کے مقام پر ایک برجی بنی ہوئی ہے۔ اور لوگوں کا بیان ہے کہ اس کے بنانے میں ایسی صنعت کی گئی ہے کہ خواہ کوئی موسم ہو کبھی خطیب کے چہرہ پر دھوپ نہیں پڑتی۔ برجی سے نیچے زینا ہے جس پر پوشش پڑی ہوئی تھی۔ ممبر کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے۔ صرف جمعہ کے دن یا عید کے موقع پر کھلتا ہے۔ دروازہ کے قریب ہی چند خوجے کھڑے ہوے تھے۔ تھوڑی دیر میں مجمع میں کسی قدر حرکت پیدا ہوئی۔ اور بعض لوگ کھڑے ہو گئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ شریف مکہ اپنے مصاحبین و مقربین خاص کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد نماز ہوئی۔ اور نماز کے ختم ہوتے ہی چاروں مصلوں کے امام ممبر پر گئے اور حنفی خطیب نے خطبہ پڑھا۔ خطیب صاحب کی آواز اگرچہ بہت بلند نہیں تھی لیکن اُن کا انداز تقریر ایسا تھا کہ ایک ایک لفظ سنائی دیتا تھا۔ کم سے کم اُن لوگوں کو جو بہت دور نہ ہوں۔ خطبۂ اولیٰ کے بعد جب خطبۂ ثانی پڑھا جا رہا تھا تو حضرات خلفاے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے نام نامی لینے کے بعد خطیب صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ شریف صاحب کا نام لیا اور اس موقع پر سب حاضرین کھڑے ہو گئے۔ غالباً شریف کے اشارہ سے ایسا ہوتا ہوگا۔ ورنہ تعظیم کے زیادہ مستحق اُن اصحاب کے اسماے گرامی تھے جو شریف کے نام سے پہلے لیے گئے تھے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا غنیمت ہے کسی نے مجھے ٹوکا نہیں خطیب صاحب کے خطبہ کا پورا اثر تو عربی دان اشخاص ہی پر پڑ سکتا ہے مگر عربی زبان کی دلکشی اور خطیب صاحب کا موثر انداز ہر شخص پر کچھ نہ کچھ اثر انداز ضرور ہوتا ہوگا۔ نماز کے بعد ہندوستان کی طرح عام طور پر بغلگیر ہونے کا دستور نہیں ہے البتہ اکثر لوگ باہم معانقہ کرتے ہیں اور خطیبوں کی دست بوسی کے لیے بھی بہت لوگ منتظر رہتے ہیں۔ میرے قریب چونکہ شناساؤں میں سے کوئی نہ تھا اس لیے میں جلدی سے اُس دروازہ کی طرف گیا جدھر

شریف کی نشستگاہ ہی مگر میرے وہان تک پہونچنے مین اتنی دیر لگی کہ شریف کی واپسی ہو چکی تھی۔ البتہ سڑک پر شرطون (پولس) کی جمعیت صف آرا تھی، جو تھوڑی دیر کے بعد ضابطہ فوجی کے مطابق منتشر ہوگئی۔

حرم شریف سے باہر نکلا تو دیکھا کہ بازار بند ہی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ تین روز تک عموماً بازار بند رہین گے صرف کہین کہین اشیاے خوردنی فروخت ہو رہی تھین۔ مین تھوڑی دیر پولیس کی جمعیت کے قریب کھڑا رہا اور اُن کی قواعد دیکھتا رہا۔ اور صفون کے منتشر ہو جانے کے بعد گھر آیا۔ ساتھیون سے تبادلۂ تہنیت کے بعد رحمت شاہ کے ساتھ اس جستجو مین روانہ ہوا کہ کہین کچھ کھانا میسر آئے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ اور کلچون۔ پکوڑیون اور حلبنی پر قناعت کرنا پڑی۔ ایک شخص سے تھوڑی آئس کریم لیکر کھائی تو اگرچہ آئس کریم خود کچھ زیادہ مزے دار نہ تھی لیکن تشنگی کے عالم اور گرمی کے موسم مین بہت بھلی معلوم ہوئی۔ پہلے مجھے کسی قدر حیرت ہوئی کہ یہان جب برف نہین ہی تو آئس کریم کیسے تیار ہوتی ہی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ چند مشینین یہان ہین جن مین شورے وغیرہ کی امداد سے آئس کریم تیار ہوتی ہی۔ شام کو ایک مرشد زادہ سے جو مکہ معظمہ مین مقیم ہین اور طبابت کرتے ہین ملا۔ بڑے اخلاق و محبت سے ملے اور ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا۔ میرے پاؤن کا درد ابھی تک نہین گیا تھا۔ انھون نے حال سنکر دوسرے روز دوا دینے کا وعدہ کیا۔

ایک روز عصر کے بعد حرم شریف مین ایک جگہ کچھ حضرات جمع تھے۔ اتفاق سے میرے ایک ہموطن تاجر بھی وہان بیٹھے تھے۔ مین اُدھر سے گذرا تو انھون نے یہ کہہ کر کہ تمھارا ہی ذکر ہو رہا تھا مجھے اُن اصحاب سے ملایا۔ جناب مولوی محب الدین صاحب خلیفہ جناب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی بھی وہان تشریف فرما تھے۔ بڑی عنایت و محبت سے پیش آے اور اپنے مصلے پر بٹھا کر دیر تک مزاج پرسی فرماتے رہے اور رخصت ہوتے وقت بہت کچھ دعائین دین۔ ایک صاحب جو وہین کے مدرسہ مین مدرس ہین اور اتفاق سے میرے ہمنام ہین بہت اخلاص سے ملے اور میرے ساتھ ہی اُٹھے اور فرمانے لگے کہ حضرت شاہ ابو سعید صاحب مجددی کے صاحبزادون کے یہان جا رہا ہون مین بھی چونکہ اسی سلسلہ کا غلام ہون اس وجہ سے اُن کے ہمراہ چلا گیا اور صاحبزادگان سے قدمبوسی حاصل کرکے بہت محظوظ ہوا۔ اُن کے یہان اُس وقت قرآن خوانی ہو رہی تھی مجھے بھی اُسمین شرکت کا موقع ملا اور صاحبزادہ صاحب سے پھر قدمبوسی حاصل کرنے کا وعدہ کرکے واپس آیا۔

عید کے دوسرے دن مرشد زادہ سے ملکر پاؤن مین لگانے کی دوا لی تو انھون نے کہا کہ زیادہ چلنا پھر

نہ چاہیے۔ اگرچہ اس کی پابندی مشکل تھی اس لیے کہ مدینہ منورہ کا قافلہ شوال میں جانے والا تھا اور مجھے اس سے پہلے پہلے تمام ضروری انتظامات سفر کرنا تھے تاہم عید کی وجہ سے چونکہ بازار بند تھے اس لیے کسی قدر سکون کا موقع ملا۔ ظہر کے بعد اتفاق سے میرے ہمنام صاحب پھر حرم شریف میں مل گئے تو اُن کے ہمراہ اُن کے مدرسہ کے مدرس اعلیٰ کے یہاں حاضر ہوا۔ وہاں بھی قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ قرآت سے لذت اندوز ہونے کا چونکہ مجھے اپنے پیر و مرشد کے طفیل میں یہاں اکثر موقع ملتا ہے اس وجہ سے میں ایسے مواقع کا مشتاق رہتا ہوں اور عربوں کی قرآت تو ہے بھی حد درجہ وجد آور۔ حرم محترم میں متعدد مقامات پر چھوٹے چھوٹے لڑکے اور بعض نابینا قاری قرآت سنایا کرتے ہیں اور اگرچہ یہ امر مجھے پسندیدہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ قرآت سنانے کو حصول خیرات کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں تاہم میں اکثر اُن کی قرآت سنا کرتا تھا۔

عید کے دنوں میں چونکہ تین دن تک برابر لوگ اپنے احباب و اعزہ سے ملتے رہتے ہیں اس وجہ سے اپنے ہمنام کے ساتھ جن مدرس صاحب کے یہاں گیا تھا اُن کے یہاں بہت سے اصحاب سے ملاقات ہوئی اور یہیں پہلی بار یہ بات دیکھنے میں آئی کہ مہمانوں کے سامنے علاوہ چائے کے ایک خوشنما شیشے کے ظرف میں انگریزی مٹھائی پیش کی گئی جس میں سے ہر شخص نے ایک دو ڈلیاں لے لیں۔ یہ مٹھائی چونکہ ابتداً شام کی طرف سے آتی تھی اور غالباً وہاں بنتی بھی ہوگی اس لیے شامی مٹھائی کہی جاتی تھی حالانکہ اب عام طور پر یورپ سے آتی ہے اور ہارٹن کے مشہور انگریزی کارخانہ کی بنی ہوتی ہے۔

اُسی روز اُن کرم فرماسے بھی پہلی بار ملاقات ہوئی جن کے پتہ پر میں نے اپنی ڈاک منگائی تھی اور اپنے خطوط وغیرہ پاکر بہت خوش ہوا۔ یہیں ضیاء الاسلام صاحب سے ملاقات ہوئی جو علی گڈھ کالج کے تعلیمیافتہ ضلع مظفرنگر کے رئیس اور خلافت کمیٹی کے ممتاز عہدہ دار ہیں اور دونوں صاحبوں سے ہندوستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔

دوسرے روز صبح کو بازار کی طرف گیا تو اگرچہ بازار بند تھا مگر صفا اور مروہ کے درمیان جہاں سعی کرتے ہیں ایک جگہ جلسہ کا ساز و سامان دیکھ کر کچھ دیر اس خیال میں ٹہلتا رہا کہ جلسہ کی کارروائی دیکھ سکوں لیکن زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے پاؤں میں درد محسوس ہوا اس لیے چلا آیا۔

عید کے ایام مسرت ختم ہوگئے اور بازار کھل گئے تو سامان سفر کی خریداری پر متوجہ ہوا چونکہ میں یہ سن چکا تھا کہ مدینہ منورہ میں قافلہ کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے حتیٰ کہ چالیس نمازیں بھی حرم نبوی میں نہیں

پڑھنے کا موقع ملتا اور مین تو آستانۂ رسالت پناہی پر زیادہ دنون تک جبہہ سائی کا آرزومند تھا اور متمنی تھا کہ حتی الامکان پورے چالیس روز کی حاضری کا موقع ملے اس لیے مین نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ مین جاؤن گا پہلے قافلہ کے ساتھ اور واپس آؤن گا سب سے آخری قافلہ کے ہمراہ لہذا اس امر کی کوشش کی گئی کہ یک طرفہ اونٹ کا انتظام ہو جائے۔ مگر جتنے اصحاب سے دریافت کیا سب نے مایوس کن جواب دیا۔ اور ہمارے مطوف صاحب کے کارکن یوسف نے وعدہ بھی کیا تو بالآخر اس کا ایفا نہ کر سکے بلکہ اُن کا بیان تھا کہ اونٹ والا اس شرط سے راضی تھا کہ نصف کرایہ سے ایک اشرفی زائد دی جائے مگر جب شیخ المطوفین کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو اُنھون نے اجازت نہ دی، بہرحال مین مجبور ہو گیا۔

اب دشواری پیش آئی کہ مین تنہا تھا۔ ساتھیون مین سے کسی کے اونٹ پر جگہ نہ تھی۔ اور رحمت شاہ خرچ کی قلت کے باعث مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ وہ تو اس خیال سے آئے تھے کہ یہین مکہ معظمہ مین نوکری کر کے رہ پڑین گے۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر ہی زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے نوکری سے مایوس ہو گئے۔ اس لیے اُن کا خیال ہوا تھا کہ حج کر کے ہندوستان واپس جائین گے۔ ہمارے جہاز کے ساتھی میان نظام دین کو جب یہ معلوم ہوا تو اُنھون نے ازراہ فیاضی اُن سے کہا کہ جو روپیہ تمھارے پاس ہو اُس سے مدینہ منورہ کی زیارت تو کر آؤ۔ واپسی کے مصارف کا انتظام وہ کر دین گے۔

پس رحمت شاہ اس سفر مین بھی میرے ہمراہ رہے۔ اور ہم دونون کے لیے ایک اونٹ کر لیا گیا۔

اگرچہ اس ملک کا عام سکہ چاندی کی مجیدی (ترکی روپیہ) اور رائج سکے قرش ہین لیکن حکومت کی طرف سے اونٹون کا کرایہ ۸ گنی ۲ مجیدی مقرر کیا گیا تھا چنانچہ عـــہ/۱۲ کے حساب سے گنیان اور رقم مین مجیدی لیکر مین نے کرایہ ادا کیا اور اس رقم کے علاوہ ہے فی کس شقدف کا کرایہ للعہ فی کس حق ترجمانی اور ہر منازل مین مشعل جلانے کی اجرت یعنی مجموعۂ ۱۰/عــہ دینا پڑے۔ رحمت شاہ نے چونکہ گنیان بعد مین لین اس وجہ سے اُنھین معـــہ/ کے حساب سے لین۔ مگر اتفاق سے حق ترجمانی اور اُجرت مشعل کی رقم سے وہ بچ گئے۔ ترجمان کی اُجرت کی یہ بنا ہے کہ ہر معلم کی طرف سے ایک شخص حاجیون کے ساتھ جاتا ہے جو راستہ مین حجاج اور بدوؤن کے درمیان ترجمانی بھی کرتا ہے اور عام طور پر حجاج کی راحت رسانی کا معین رہتا ہے۔

ہم لوگون نے اپنا کل روپیہ علی جان کی کوٹھی مین جمع کرا دیا تھا۔ چلنے سے قبل اُن کے یہان سے ایک ایک حوالہ مدینہ منورہ مین اُن کے نمائندے کے نام لے لیا اور راستہ کے مصارف کے لیے کافی روپیہ مجیدیان اور فرش سب طرح کے سکے رکھ لیے۔ سامان سفر کچھ بہت زیادہ درکار نہ تھا اس لیے کہ ہم مین سے ہر شخص مسافر ہی تھا۔ مگر اپنا کل سامان ساتھ لے جانا منظور نہ تھا۔ دوسرے تشغدف کے لیے بعض اشیا کی ضرورت تھی اور مدینہ منورہ تک کے لیے جنس بھی ساتھ لینا تھی۔ شفقی میر عبدالعزیز صاحب تو ہندوستان ہی سے جنس ساتھ لائے تھے۔ ہم لوگون کو جنس خریدنا پڑی۔ جو چند روپیہ مین فراہم ہوگئی۔ خیال تھا کہ اشیاے خوردنی بہت گران ملین گی اور اگرچہ اکثر چیزون کا نرخ ہندوستان کے مقابلہ مین دگنا تھا تاہم جب اس امر پر نظر کی جاے کہ یہ اجناس بالعموم ہندوستان، مصر، عراق جیسے دور دراز مقامات سے آتی ہین تو ہرگز گران نہ معلوم ہونگی۔ اجناس کی خریداری مین ایک صاحب کی وجہ سے بہت آسانی ہوئی جو دفتر الناظر کے ایک کارکن مولوی جعفر علی صاحب کے دور کے رشتہ دار ہین اور جن کے والدین عرصہ ہوا ہندوستان سے ہجرت کر گئے ہین۔ شغدف کے لیے ہین اشیاء ذیل درکار تھین صراحیان، چٹائیان، زنبیل اور مشکیزے۔ ان چیزون کے لیے مرشد زادہ صاحب سے عرض کیا کہ کسی واقف کار شخص سے منگوا دین اُنھون نے ازراہ محبت انتظام تو کر دیا مگر جو شخص چیزین خرید کر لایا اُس نے شرارت سے یا ممکن ہو کہ نادانی سے تقریباً دوگنے دام صرف کرا دیئے۔

لکھنؤ سے روانگی کے وقت بعض اصحاب نے کچھ رقوم خیرات میرے حوالے کر دی تھین۔ جو رقوم مخصوص لوگون کے لیے تھین اُن کے متعلق تو مجھے صرف اسی قدر اہتمام کرنا پڑا کہ جلد سے جلد اُن لوگون سے مل کر دیدون۔ البتہ جو رقوم یہ کہکر دی گئی تھین کہ مستحق لوگون مین تقسیم کر دی جائین۔ اُن کو مستحق لوگون تک پہونچانے مین بہت تگ و دو کرنا پڑی۔ چنانچہ مکہ معظمہ مین جسقدر رقم تقسیم کرنے کی تھی اُس کا بڑا حصہ مرشد زادہ کے ساتھ ایک ایک گھر پر جا کر دیا گیا اور بقیہ حصہ ایک دوسرے بزرگ کی معرفت اُسی طریقہ پر صرف کیا گیا۔ مرشد زادہ ہی کی معیت مین جناب شیخ حسام الدین بخاری کی خدمت مین حاضر ہوا آپ کا عرف شیخ سینی ہو۔ اور طریقہ نقشبندیہ کے بزرگ ہین آپ کا دولت خانہ حرم محترم سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہو اور جتنے لوگون سے ذکر آیا سب نے بالاتفاق آپ کی بزرگی و عظمت کا اقرار کیا۔ آپ کی عمر بہت زیادہ ہو۔ اندازاً سو برس سے اوپر۔ مگر ضعیفی کے باوجود روزانہ نماز فجر اول وقت جماعت شافعی کے

ساتھ حرم شریف مین ادا کرتے اور اُس وقت سے لیکر طلوع آفتاب تک وہین حلقہ فرماتے ہین۔

اہل عرب کی مہمان نوازی اس قدر مشہور ہو کہ یہان اس کا تذکرہ فضول ہوگا۔ مکہ معظمہ مین کسی کے یہان جایئے تو چاے کی ضیافت ضروری ہو حقہ سگریٹ بھی اکثر لوگ پلاتے ہین۔ اور سوکھے پانون کی گلوریان بھی کہین کہین ملتی ہین۔ شیخ کے یہان بھی جب کبھی حاضری کا اتفاق ہوتا تو کثر ایسا ہوتا کہ کہ چاے فواکہات یا کھانے کے بغیر وہ رخصت ہونے دیتے۔ ناوقت اوقات مین بھی وہ اکثر اصرار فرماتے اور مجھے مجبور ہونا پڑتا۔

حرم شریف مین تو جسقدر ممکن ہوتا ہو آب زمزم پیا جاتا ہو۔ چاہ زمزم پر ہر وقت سقے موجود رہتے ہین جو صبح سے لیکر عشا کے وقت تک پانی پلاتے رہتے ہین۔ اس کے علاوہ صحن حرم مین جا بجا لوگ صراحیان لیے ہوے پھرتے اور پانی پلاتے رہتے ہین اور بہت سے حجرون مین مختلف سبیلون کے مہتمین کی طرف سے پانی جمع رہتا ہو اور حجاج کے زمزمیون کی طرف سے بھی حرم شریف مین شام کے وقت پانی پلایا جاتا ہو اور گھرون پر بھی آب زمزم کی صُراحیان بھیجی جاتی ہین۔ آب زمزم اگرچہ ذائقہ کے لحاظ سے شیرین نہین اور عموماً ٹھنڈا پینے کو نہین ملتا لیکن اس مین عجیب عجیب برکتین ہین اس لیے جسقدر ملتا پیا جاتا۔ شہر مین نہر زبیدہ کا پانی عام طور سے ملتا ہو جو نہایت شیرین اور لطیف ہو۔ عام صرف کیلیے اکثر لوگ کنوئین کا کھاری پانی بھی لیتے ہین۔ مین پانی عادتاً زیادہ نہین پیتا۔ اگر مکہ معظمہ مین کچھ تو موسمی حرارت وخشکی کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ چلنا زیادہ پڑتا تھا، بکثرت پانی پیتا تھا اور بجاے اسکے کہ نقصان پہونچتا صحت کے لیے وہان کے پانی سے زیادہ کوئی چیز مفید معلوم نہین ہوئی۔ کیونکہ جسقدر غذا نا موافق ملتی تھی اُسی قدر قوت ہاضمہ اُس سے کم متاثر تھی۔ بلکہ سچ یہ ہو کہ ایسی ناموافق غذا یہان رہ کر ہضم ہی نہین ہو سکتی۔

مرشد زادہ کی معیت مین جنت المعلیٰ کی حاضری بھی دے آیا۔ میر عبدالعزیز صاحب تو دیگر زیارتگاہون پر بھی ایک صاحب کے ساتھ حاضری دے آئے تھے۔ مگر مین نے مدینہ منورہ سے واپسی پر زیارتگاہون پر حاضری ملتوی رکھی۔

۹ رشوال (۵ مئی) ہماری روانگی کا دن متعین تھا۔ مگر جب عصر کے وقت تک اونٹ نہ آے تو ہم لوگ مطمئن ہو گئے کہ آج روانگی نہ ہو سکے گی۔ شام کے قریب دفعتاً اونٹون کے آجانے کی اطلاع ملی اور جلدی جلدی شغدفون پر سامان رکھا گیا۔ سامان رکھکر ہم لوگ حرم شریف چلے گئے جہان نماز مغرب کے بعد

طواف وداع کیا اور باب الوداع کی طرف سے رخصت ہوئے۔ ہمارے اونٹ حرم شریف کے باہر ہی کھڑے تھے اس لیے فوراً سوار ہو کر ایک گھنٹہ مین شہدا، پہونچ گئے۔ یہ مقام مکہ معظمہ کے نواح مین تقریباً دو کوس کے فاصلہ پر مسجد تنعیم سے قریب ہی۔ شہر سے تمام قوافل یہان آکر جمع ہوتے ہین اور ایک دو دن کے بعد جب قافلہ پورا ہوجاتا ہی تو روانہ ہوتا ہی۔ قوافل کا یہ اجتماع ''تبریز'' کی اصطلاح سے موسوم ہی۔ شغدف پر پہلی بار سوار ہونے کا اتفاق ہوا تھا، اس لیے یہ مختصر سفر بجائے تکلیف دہ ہونے کے بہت فرحت کا موجب ہوا۔ میرے شریک شغدف رحمت شاہ ماشا، اللہ بہت تندرست و توانا تھے لہذا شغدف کا وزن برابر کرنے کے لیے جنس کا بڑا حصہ میرے شغدف پر رکھ دیا گیا تھا جسکی وجہ سے مجھے جنبش تک کا موقع نہ تھا۔ شہدا، پہونچ کر سب سے پہلے پانی کی فکر ہوئی۔ تلاش سے ایک کنوان ملا جہان پانی بھر کر وضو کیا گیا اور نماز کے بعد شغدف کے سامنے زمین پر بچھونا بچھا کر پڑ رہے۔ صبح کو مین اور دو ساتھی مکہ معظمہ واپس آئے۔ بعض ضروری چیزین رہ گئین تھین اُن کو گھر اور بازار سے لیکر ساتھیون کو تو مین نے دوپہر ہی کو رخصت کردیا اور مین نماز کے بعد اپنے مہتمم ڈاک کی خدمت مین حاضر ہوا۔ اتفاق سے گھر کے خطوط اور اخبارات آگئے تھے۔ عجلت مین خطوط کے جواب تو لکھدیے مگر اخبارات لینا بھول گیا اور ایک گدھا کرکے سہ پہر تک قافلہ مین آکر ملگیا۔ یہان میدان مین دھوپ کی تمازت سے لوگ بدحواس ہو رہے تھے اور پانی کی قلت مزید ستم ڈھا رہی تھی۔ عصر کا وقت قریب تھا اور وضو کے لیے ساتھیون کے پاس ایک قطرہ پانی کا نہ تھا۔ قریب ہی اگرچہ بازار بسا ہوا تھا۔ جہان ضروری اشیائے خوردنی ملتی تھین مگر پانی کہین بھی نہین ملتا تھا البتہ کنوئین پر سقے بھر رہے تھے مگر وہ بات بھی نہین سنتے تھے۔ آخر بعد تلاش بسیار ایک کنوان ملا۔ جہان کوئی سقہ نہ تھا اور مین نے اور رحمت شاہ نے مل کر پانی بھرا۔ وضو کیے اور ایک ایک ٹین بھر کر اپنے مقام تک لائے۔ اس قسم کی جسمانی محنت کا مین بالکل نااہل ہون اس وجہ سے پانی کا ٹین لانا گویا ایک عظیم الشان مہم تھی۔ اور اگرچہ بالآخر مین اس مہم کو سر کرسکا مگر پانی کا ایک معقول حصہ ضایع ہوگیا اور میرے کپڑے شرابور ہوگئے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے اگرچہ فی الجملہ اس کی کوئی تکلیف نہین ہوئی لیکن بہت پست ہوگیا۔ نماز عصر سے فارغ ہونے کے بعد روانگی کی تیاری شروع ہوئی۔ عین اُسی وقت دیکھا کہ شریف کی سواری آرہی ہی۔ سبزہ گھوڑے پر شریف سوار تھے اور ان کے پیچھے ایک دو آدمی اور گھوڑون پر سوار اور جلو مین مختصر سی جماعت خدام اور محافظین کی تھی۔ شریف ایک پہاڑی کے دامن مین

گھوڑے سے اُترے پہاڑی کے ایک حصہ پر جو زیادہ بلند نہ تھا ایک جگہ کسی قدر ہموار تھی یہاں چند اونی دریان بچھا دی گئین اور شریف معہ دو ایک ساتھیون کے وہین جاکر بیٹھ گئے اور بقیہ ہمراہیون مین سے کچھ تو نیچے گھوڑون کے پاس کھڑے رہے یا بیٹھ گئے اور کچھ شریف کے عقب مین بیٹھ دن کی آڑ مین ہوگئے۔ ایک کرسی شریف کے قریب شاید اُن کے بیٹھنے کے لیے رکھی گئی تھی مگر وہ دری پر بیٹھے۔ ایک دوربین اُن کے پاس تھی اُس کے ذریعہ سے کبھی وہ قافلہ کا نظارہ کرتے اور کبھی اُس کو کرسی پر رکھ کر ساتھیون سے بات چیت کرتے۔

مین نے اس سے قبل شریف کو نہین دیکھا تھا اس لیے مین غور سے دیکھتا رہا اور اگرچہ فاصلہ زیادہ تھا اور میری نگاہ بھی کمزور رہی تاہم مین ان کی حرکات وسکنات کو بخوبی دیکھ سکا۔ اب قافلہ روانہ ہونے لگا اور مختلف جوانب مین شغدف اونٹون پر کسے جانے لگے جسکی وجہ سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ بپا ہوگیا۔ ادھر ہمارے بدوؤن نے آکر شغدفون پر سامان رکھنے کا تقاضا کیا۔ ہمارے ترجمان صاحب ہمارے ساتھ نہین آئے تھے بلکہ عصر کے قریب ہمارے مطوف کے وکیل عبدالرحمٰن پتشاس کے ساتھ آئے۔ یہ صاحب تنہا ہمارے قافلہ کے ترجمان نہ تھے بلکہ ایک اور مختصر قافلہ دوسرے مطوف کے حاجیون کا بھی ان کے تحت مین تھا۔ وکیل صاحب نے ہر اونٹ کے کرایہ مین سے دو دو گنیان ہمارے پاس اس غرض سے جمع کین کہ یہ رقم مدینہ منورہ پہونچ کر اپنے بدوؤن کو دیدین۔ یہ کل رقم میر عبدالعزیز صاحب کے پاس جمع کرادی گئی کہ ہمارے مختصر قافلہ کے سردار وہی تھے۔

دوسرے شغدفون کے مقابلہ مین میرے یہان سامان زیادہ تھا۔ اس پر ہمارا بدو عبدالرحمٰن بہت جز بز ہوا۔ دیر تک حجت ہوتی رہی۔ مین کہتا تھا کہ راستہ مین ناقص جنس خریدنا مجھے منظور نہین اس لیے مین نے مدینہ منورہ تک کے لیے سامان یہین سے ساتھ لے لیا ہی۔ البتہ اگر بدو اس پر رضامند ہو کہ اُس کو راہ مین کھانا نہ دیا جائے تو مجھے کچھ عذر نہو گا اگر نصف جنس یہین چھوڑ دی جائے۔ بدو پہلے تو بہت ناراض ہوتا رہا اور جیسا کہ غصہ ور لوگون کا قاعدہ ہی بہت قسمین بھی کھاتا رہا۔ لیکن بالآخر وکیل صاحب نے جب یہ تصفیہ کر دیا کہ مین ایک روپیہ اُس کو دیدون تو وہ راضی ہوگیا۔ نماز مغرب پڑھ کر جب ہم اونٹون پر سوار ہوے اور ہمارا قافلہ چلا تو عبدالرحمٰن کے بجاے ایک دوسرا بدو میرے اونٹ کے ساتھ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ عبدالرحمٰن کا بھائی ہی اور اُس کا نام عمار ہی۔ (مکہ معظمہ کے حالات مین اس وجہ سے بہت اختصار کرنا پڑا ہی کہ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد زیادہ دنون وہان حاضر رہنے کا موقع ملا اور اُس کا مفصل ذکر انشاء اللہ آئندہ کیا جائے گا)۔

ظفر الملک

نظرے خوش گذرے

جناب محمد حنیف صدیقی نے اپنے گرامی نامہ مین توجہ دلائی ہر کہ سفر حجاز کی روداد کے گذشتہ نمبر مین یہ عبارت درج ہر :-

"در زمزم پر دعا پڑھ کے دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ آب زمزم پیا اور ہاتھون پیرون اور جسم کے دیگر حصون پر ملا"

حالانکہ بعد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہر کہ "نماز ظہر سے قبل کا وقت اور آپ کا روزہ تھا جو آپ نے آب زمزم پیا"

صاحب مذکور کی اس عنایت کا شکریہ۔ دراصل وہان پیا کے بجاے لیا کا لفظ ہونا چاہیے کیونکہ مین نے روزہ کی وجہ سے افطار تک آب زمزم نہین پیا۔ یقیناً کاتب نے یا خود مین نے سہواً لکھدیا۔

مکہ معظمہ سے ایک محترم کرمفرما اپنے تازہ گرامی نامہ مین تحریر فرماتے ہین :-

"نومبر و دسمبر کے الناظر مین سید مقبول احمد صاحب الہ آباد سے" اہل مکہ کے اخلاق "کے عنوان سے جو ریمارک فرماتے ہین اس مین اُنھون نے حسن شیبی (کلید بردار خانۂ کعبہ کے فرزند) کو اپنا شناسا اور دوست ہی نہین ظاہر فرمایا بلکہ اپنا مہمان بھی لکھا جس سے ناظرین الناظر کو یہ شبہہ ہوسکتا ہر کہ حسن شیبی الہ آباد مین ہر اور سید صاحب کا مہمان ہر مگر جب ناظرین الناظر یہ سنین گے کہ حسن شیبی اس وقت مکہ معظمہ مین موجود ہر تو سید صاحب کی نسبت کیا خیال کرین گے۔ اور خود حسن شیبی سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا کہ الہ آباد مین کوئی عرب صاحب حسن شیبی بن کر سید صاحب ایسے باخبر مہمان نواز بزرگ کی پُرلطف میزبانی کا لطف اُٹھا رہا ہر تو وہ سید مہنسا اور سید صاحب کی باخبری اور وسعت معلومات کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ معلوم نہین جب خود سید صاحب اپنے عزیز مہمان کی اس مکاری سے واقف ہون گے تو اپنے عزیز مہمان کو جو ان کا شناسا اور دوست ہر کس نظر سے دیکھین گے"۔

مکہ معظمہ کے ایک تاجر جن سے جدہ مین ایک صاحب کے یہان ملاقات ہوئی تھی اور جہاز مین میرے

ہمراہ ہندوستان آئے ہین ابھی دو مہینہ کے قریب لکھنؤ مین رہ کر گئے ہین، انھون نے بھی سید مقبول احمد صاحب کی تحریر کو پڑھ کر فرمایا تھا کہ حسن شیبی ہندوستان نہین آئے۔ سید صاحب اپنے مہمان کی شخصیت کے متعلق مزید تحقیق کرلین تو بہتر ہوگا۔

ہمارے ایک محترم شفیق نے اپنے کم عمر سہ ماہی رسالہ مین اُس زمانہ مین جبکہ ایڈیٹر الناظر زیارت حرمین شریفین کے لیے گیا ہوا تھا...... الناظر پر اظہار رائے فرماتے ہوے اپنے ناقابل تقلید انداز تحریر مین میری شوخ نگاری پر ملامت کی اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ لکھنؤ مین کوئی علمی رسالہ نہین ہی۔ مین سنجیدگی و متانت کا ادعا نہین رکھتا اور نہ اس خام خیالی مین مبتلا ہون کہ الناظر اُس معیار کے مطابق نکل رہا ہی جو خود میرے خیال مین ایک علمی رسالہ کا ہی جس کی وجہ بھی ظاہر ہی کہ مین خود اپنے شفیق مکرم کی طرح عالم و فاضل نہین کہ تمامتر ارباب علم کو رسالہ کی قلمی اعانت پر متوجہ کرسکون۔ جو لوگ ذاتی سرمایہ رکھتے یا کسی مجلس قومی کے منتظم ہین اُن کو جو آسانیان حاصل ہین میرے لیے موجودہ بے سروسامانی مین وہ بھی مفقود ہین۔ لیکن موقر معاصر کی تازہ اشاعت دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ وہ اپنی سنجیدہ و علمی رفعت سے رفتہ رفتہ اُتر کر اُسی سطح پر آرہا ہے جو الناظر جیسے بھکاریون ہی کے لیے موزون ہوسکتی ہی۔

سب سے پہلے تو کھسیانی بلی کھمبا نوچے، کا شوخ عنوان پڑھ کر حیرت ہوئی اُسکے بعد یہ پڑھکر افسوس ہوا کہ مشہور علمی پرچہ معارف، کے فاضل ایڈیٹر کے رکیک اور عامیانہ زبان مین حملہ کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی کوشش مین یہ شوخی انداز نمودار ہوا ہی۔ حالانکہ معارف کے جس نوٹ پر یہ نمائش بیزاری ہی اُسے بار بار پڑھنے پر بھی کوئی رکیک اور عامیانہ زبان مین حملہ نظر نہ آیا۔ اور اس اندیشہ سے کہ میری کوتاہ نظری کا قصور ہو مین اُس نوٹ کو یہان بجنسہ نقل کرتا ہون۔ وہو ہذا۔

"رسالہ...... مین ایک صاحب شعر العجم پر مسلسل تنقید لکھ رہے ہین، اس تنقید کی آخری قسط اکتوبر کی اشاعت مین شایع ہوئی ہی اغلاط کا بیشتر حصہ نامون اور سنون کے الٹ پھیر اور اختلافات پر مبنی ہی، اس آخری قسط کے آخر مین شعر العجم مین عمر خیام کے متعلق جو کچھ ہی اُس پر تنقید کی گئی ہے، مضمون نگار صاحب نے اس تنقید کی تحریر کی نسبت ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا

پروفیسر ادبیات فارسی اورنٹیل کالج لاہور، شاگرد پروفیسر براؤن کی طرف کی ہی، مرحوم مصنف نے تو سیکڑون برس کے مردہ اشخاص کے نامون مین غلطیان کی ہین، مگر ہمارے زندہ تنقید نگار کی صحیح البیانی یہ ہی کہ وہ زندہ اور معاصر اشخاص کے نامون مین بھی التباس اور تشابہ سے محفوظ نہین پھر مردون کی داد و فریاد کون سنتا ہی، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا (مشہور شاعر) اور ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی (ماہر ادبیات ایران) شاگرد پروفیسر براؤن پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور دو مستقل ہستیون کے علحدہ علحدہ نام ہین، حضرت مسیح نے سچ کہا ہی، "تم کو دوسرون کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہی مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہین آتا"

یک زندہ دل نہ رفت سلامت زعیب جو — کاین ماجرا بہ خضر علیہ السلام رفت"

ناظرین الناظر مین سے جو اہل علم اسے ملاحظہ فرمائین انھین اگر تلاش و تجسس سے وہ رکیک اور عامیانہ زبان مین حملہ نظر آجائے تو مجھے بھی بتائین مین شکر گذار ہون گا۔ حدیث دیگران کے سلسلہ مین اوپر عرض کر چکا ہون کہ ہر نکتہ چین و معترض کا انداز تحریر درشت معلوم ہوتا ہی اور کہین یہ انداز پسندیدہ قرار قرار پاتا ہی اور کہین قابل گرفت، مرزا غالب نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہی ؎

ہم جو چُپ ہون تو ہین سودائی — شیخ چپ ہو تو توکل ٹھہرے

اور حضرت مسیح کا یہ قول جس کی تصدیق اسی مضمون مین ہمارے محترم اور عالم و فاضل دوست نے بھی فرمائی ہی بے شبہ بالکل سچ ہی کہ

"تم کو دوسرون کی آنکھون کا تنکا نظر آتا ہی مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہین آتا"

میرے شفیق مکرم کو میدان صحافت مین تشریف لائے ہوے ابھی زیادہ زمانہ نہین گذرا ہی اس لیے اگر مرزا داغ کے الفاظ مین یہ عرض کیا جائے کہ ؎

ابھی سن ہی کیا ہی جو بیباکیان ہون — اُنھین آئین گی شوخیان آتے آتے

تو غالباً رکیک اور عامیانہ حملہ نہ قرار پائے گا۔ اور اگر یہ دخل در معقولات طبع عالی پر گران گذرے تو مجھے عادی مجرم جان کر میرے شفیق محترم معاف فرمائین۔ ان کی عظمت و منزلت میرے دل مین جس قدر ہی اُس کے اعادہ کی یہان حاجت نہین لیکن فطرت انسانی کی کمزوریون سے مجبوری ہی۔

اسی رسالہ مین صاحب مطبع کا ایک معذرت نامہ ہی جسمین اُنھون نے محترم ایڈیٹر کی خواہ مخواہ نقل کی ہی جسکے متعلق صرف اتنا عرض کرنا کافی ہی کہ ع ایاز قدر خود بشناس۔ ایڈیٹر صاحب کو اپنی ذمہ داری بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۵۳ جلد ۲۶ | ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء

فیہ مافیہ

(اثر: چلبی)

جنوری کے الناظر مین، ان اوراق مین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڈھ) کے جلسہ سالانہ ونمائش سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا تھا اُس مین ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "تماشائیون کی تعداد انگلیون پر گنے جانے کے قابل تھی"۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ اس کی تردید کرتا ہے، اور لکھتا ہے، کہ حاضرین کی معقول تعداد موجود تھی۔ راقم سطور نہایت مسرت سے اس تردید کو قبول کرتا ہے، اور بلا تامل اپنے فقرۂ مذکورۂ بالا کو واپس لیتا ہے۔ پچھلے معلومات کی بنیاد "ہمدم" کے نامہ نگار خاص کا بیان تھا۔ لیکن گزٹ کا سرکاری بیان یقیناً اُس سے زیادہ قابل وقعت ہے۔ "چلبی" کو انشاء اللہ آئندہ بھی کبھی اپنی غلطی کے احساس کے بعد اس کے اعتراف مین تامل نہوگا۔ وما توفیقی الا باللہ

الناظر کی اسی اشاعت مین، صدر صاحب تعلیمی کانفرنس کے خطبۂ صدارت پر تبصرہ کی ضمن مین ایک مقام پر یہ فقرہ بھی سپرد قلم ہوا تھا، کہ

"سنتے ہین کہ مسلم یونیورسٹی کے بعض روشن خیال اساتذہ نے صدر صاحب سے پُرزور مطالبہ کیا ہے کہ ایڈریس کے اس جزو کو محو کر دیا جائے"۔

اِسکے متعلق مُسلم یونیورسٹی گزٹ ایک انداز خاص کے ساتھ، جسمین سادگی کے بہ نسبت شاید دلربائی زیادہ ہی، ہم سے "ثبوت" کا مطالبہ کرتا ہی! اس مطالبہ کا بہترین جواب آج سے کئی صدی پیشتر صاحب اپنے مشہور فقرہ مین دے گئے ہین. یعنی

"شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد"!

غریب رشید صدیقی کے "فلسفۂ ازدواج"، پر اس "دار العلم" کی چاردیواری کے اندر جیسی کچھ لے دے ہوئی، اُس نے یہ تو ثابت ہی کر دیا تھا، کہ ادب لطیف و شوخ نگاری کے داخلہ کی روک تھام کے لیے خدایان یونیورسٹی نے بڑے زبردست پھاٹک تیار کر رکھے ہین، مگر اب یہ روایت بھی حد تواتر تک پہونچ چکی ہی کہ عنقریب اُردو شاعرون کی ساری آبادی کو قانونی نوٹس دیا جانے والا ہی کہ وہ "طول شب فراق" کو "نا قابل پیمایش" قرار دے کر کالج کے مشہور پروفیسر ریاضیات کی کھلی ہوئی اور نا قابل برداشت توہین کر رہے ہین! ایک دوسری روایت یہ بھی سننے مین آئی ہی کہ بہت بڑی تیاریون کے ساتھ ایک ادر استغاثہ بھی دائر ہونے والا ہی، جسمین "مستغیث" کارکنان مسلم یونیورسٹی و کارپردازان مسلم یونیورسٹی گزٹ" ہون گے، اور ملزم کا اسم گرامی حضرت "ہاتف غیبی" ہی!

رسالہ اُردو کو معارف سے گلہ ہی، کہ اس کی زبان "رکیک و عامیانہ" ہو گئی ہی، قدرت کی ستم ظریفی یہ ہی کہ جس تحریر مین یہ گلہ درج ہی اس کا نہایت ہی شایستہ و سنجیدہ عنوان حسب ذیل ہی:-

"کھسیانی بلی کھمبا نوچے"

کہتے ہین، کہ معارف والون نے اس "شتر گربہ" کی داد دینے سے قبل جب ایک اُردو دیوان سے تفاؤل کیا تو پہلا شعر یہ برآمد ہوا ؎

سامنے غیر کے تم فتنہ نہ مجھے کہتے ہوا — چھائی جاتی ہے یہ دیکھ تو سلا پاکس پڑا

کانفرنس کی جماعت عاملہ کے ایک سربرآوردہ رکن، مولوی طفیل احمد صاحب سب رجسٹرار ہین جن کی ایک عمر سودی دستاویزون کی تحریر مین صرف ہو چکی ہی، اور اس نے اس معاملہ مین اُنھین اتنا دلیر بنا دیا ہی کہ وہ علانیہ "جواز سود" کی تبلیغ فرمانے لگے ہین. چنانچہ متعدد رسایل و مضامین کی اشاعت کے علاوہ پچھلی کانفرنس مین بھی

(اس کانفرنس میں جسکے نام کا جزو اول "مسلم" ہی) اسی قسم کی تحریک موصوف کے ایما سے پیش ہوئی۔
اُن کا فرمانا یہ ہی کہ جس سود کی ممانعت اسلام نے کی ہی وہ مہاجنی سود (یوژری) ہی تجارتی سود (انٹرسٹ) ممنوع نہین لیکن اُن کا خود اپنے مشغلۂ ملازمت، سب رجسٹراری کے عہدہ سے متعلق کیا فتویٰ ہی جہان عموماً تمامتر سود کی اسی صنف سے متعلق دستاویزون کی کتابت ہوتی رہتی ہی جو خود اُن کے نزدیک بھی ممنوع ہی؟ انھین شاید سرور کائنات صلعم کے اس قول مبارک کا خیال نہین رہا جسمین سود لینے والے

عن جابر رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٰکل الربٰوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدہ وقال ھم سواء (مسلم)	سود دینے والے، سودی دستاویز لکھنے والے معاملہ سود کی گواہی دینے والے سب کو مساوی درجہ کا مستحق لعنت قرار دیا گیا ہی۔

طفیل احمد صاحب نے اس بحث مین بڑکر عجیب عجیب اجتہادات فرمائے ہین، جن مین سب سے زیادہ دلچسپ و پُرلطف اُن کے اجتہادات لغت وزبان سے متعلق ہین فرماتے ہین کہ ربوٰ اور ربح دو بالکل مختلف مفہوم رکھتے ہین، اسلام نے اول الذکر کو حرام قرار دیا ہی اور آخرالذکر کو جایز۔ ربوٰا اور ربح کا یہ فرق ممکن ہی جناب ممدوح کی نظر سے کسی ایسے لغت مین گذرا ہو جس تک صرف کانفرنس آفس والون کا دسترس ہوسکتا ہی ورنہ جو کتب لغت متداول ہین ان مین تو ربح کے معنی ہی سود کے درج ہین۔

ربح و ربَح۔ (بالکسر وبہ فتحتین) سود۔ (صراح)
تجارۃٌ رابحۃٌ۔ خرید و فروخت یا سود۔ (ایضاً)
ربح۔ بالفتح سود کردن و بالکسر سود۔ (منتخب)
ربح۔ بالکسر۔ نفع وسود۔ (غیاث)

علیٰ ہذا موصوف کو اپنے اس اجتہاد پر بھی ناز ہی کہ "ربوٰ" کے معنی عام مسلمان جو مطلق اضافہ زر یا بڑھوتری کے سمجھ رہے ہین، یہ غلط ہی، بلکہ اس کے مفہوم مین صرف مہاجنی سود (یوژری) داخل ہی۔ ربوٰ کے یہ محدود معنی قرار دینا، تمامتر جناب موصوف ہی کا اجتہاد ہی، ورنہ ارباب لغت کا بالکل واضح وغیر مشتبہ حکم موجود ہی کہ ربوٰ کے معنی مطلق بڑھوتری یا زیادتی کے ہین۔

ربَا۔ زادَ ونَمَا (قاموس)

ربا۔ ربو۔ فزونی وفزون شدن۔ (صراح)
الربو۔ آن زیادتی گرفتن است در دام وبیع۔ (ایضاً)
ربو۔ بالیدن وافزون شدن۔ (منتخب)
ربا۔ زیادہ شدن ونشو ونما کردن وزیادہ گرفتن در دام وبیع۔ (غیاث)

اجتہاد فی اللغت سے بھی زیادہ پرلطف حضرت کا اجتہاد فی المنطق ہی۔ ارشاد ہوتا ہی، کہ قرآن مجید مین چونکہ حرم الربوٰا آیا ہی، حرم السود نہین آیا ہی، اس لیے سود کی ممانعت بالکل ثابت نہین ہوتی۔ سبحان اللہ! اگر اجتہادات استدلالی مین اسی رفتار سے ترقی ہوتی رہی تو صبح شام مین اس فتوی کو بھی شایع شدہ سمجھنا چاہیے، کہ چونکہ کلام مجید مین ہر جگہ اقیموا الصلوٰۃ وارد ہوا ہی، اقیموا النماز کہین بھی وارد نہین ہوا ہی، اس لیے "نماز" کو اپنے اوپر فرض کر لینا نہ صرف ناجائز بلکہ کھلی ہوئی بدعت اور احداث فی الدین کی معصیت ہی۔ علیٰ ہذا خدا کی خدائی و یکتائی، محمدؐ کی پیغمبری، فرشتون کا وجود، نیکی و بدی کی پرسش، روزہ کا وجوب، شراب کی حرمت، چوری اور حرام کاری کی ممانعت، غرض وہ تمام مسایل جن کے مجموعہ سے ہندوستان مین اسلام و ایمان عبارت ہی، سب کالعدم و باطل ثابت ہون گے، اس لیے کہ ان کے متعلق ٹھیک انھین الفاظ مین کوئی بھی نص وارد نہین ہوئی ہی!

جناب طفیل احمد صاحب کو حضرت فاروق اعظمؓ کے اس قول گرامی سے گویا اپنی تائید مین ایک بڑی قیمتی دستاویز ہاتھ آگئی ہی، کہ "رسول خدا صلعم دنیا سے تشریف لے گئے اور ہم نے آپ سے سود کے بارہ مین کچھ دریافت نہین کیا" اور اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ سود کی تفصیلات (معاذ اللہ) سیدنا فاروق اعظمؓ کے نزدیک بھی مشتبہ تھین۔ لیکن اگر تحقیق و دیانت سے کام لیا جاتا، تو انھین حضرت فاروقؓ کا یہ صریح و مشتبہ قول بھی کتب حدیث مین مل جاتا کہ سب سے آخرین آیت ربوٰا تری،

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ان آخر ما نزلت آیۃ الربوٰا وان رسول اللہ صلعم قبض ولم یفسرھا لنا فدعوا الربوٰا والریبۃ	رسول خدا صلعم دنیا سے تشریف لے گئے اور ہمارے لیے آیت ربوٰا کی تفسیر نہین کی تو سود اور جس مین سود کا شبہ ہو سب کو چھوڑ دو،

اللہ اللہ! حضرت خلیفۃ الرسول کو تو یہ احتیاط، کہ جس شے کا سود ہونا مشتبہ بھی ہو، اُس کو ترک کرو، اور ہمارے سب رجسٹرار صاحب کی یہ بیباکی، کہ اسی مقدس شخص کو وہ تائید جواز سود مین اپنے گواہ کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہین! راقم سطور کا ان کی خدمت مین نہایت عاجزانہ ومخلصانہ مشورہ ہی کہ اپنی اس جسارت پر فوراً توبہ کرین، اور غیرت فاروقی کو نا قابل التفات نہ سمجھین، ورنہ خدانخواستہ وہ وقت آکر رہے گا، جب حسرت وندامت سب لاحاصل ہوگی۔

تجارتی سود اور مہاجنی سود کی جو طبعزاد تفریق قائم کی گئی ہی، بالفرض وہ صحیح ہو بھی، تو اسلام کی تعلیم ایسے مشکوک ومشتبہ مواقع کے لیے کیا ہی؟ حضرت فاروق اعظمؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا ارشاد ابھی گزر چکا۔ اب سرکار رسالتؐ کا فرمان بھی سُن لینا چاہیے:-

دع ما یریبک الی ما لا یریبک | چھوڑ دو اُس چیز کو جو مشتبہ ہو، اور اختیار کرو اُسکو جو غیر مشتبہ ہو۔

یہ معلم دوجہان کا ارشاد اقدس تھا، اور صحابہ کرامؓ کی زندگیان تمامتر اسی سانچہ مین ڈھلی ہوئی تھین۔ جس شے مین ذرا بھی شبہ محسوس ہوتا تھا، اس کو یہ حضرات بلاتامل ترک فرما دیتے تھے، خواہ اس ترک سے اپنے اوپر کتنی ہی تکلیف لازم آئے۔ آثار واحوال صحابہ کی کتابین اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہوئی ہین۔ ذیل مین اُردو کی ایک مستند کتاب سے ایک عبارت کسی قدر اختصار کے ساتھ، مخصوص اسی باب سے متعلق نقل کی جاتی ہی:-

سود خواری سے اجتناب

اسلام نے سود خواری کی ممانعت ایسے سخت قیود کی پابندی کے ساتھ کی ہی کہ اگر ذرا سی غفلت و بے پروائی کی جائے تو معمولی معاملات داد وستد وبیع وشرا بھی سود کی صورت مین داخل ہو جائین۔ صحابہ کرام ان تمام قیود کا لحاظ رکھتے تھے، اور ان سے نہایت احتیاط کے ساتھ بچتے تھے۔ ایک بار حضرت مالک بن اوسؓ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے بیع صرف کرنا چاہی (یعنی اشرفی کے بدلہ روپیہ لینا چاہا) اور سو اشرفیان اُن کے سامنے رکھدین، اُنھون نے اُن کو اُٹھا لیا، اور کہا کہ خزانچی آجائے تو روپیہ دلا دون۔ حضرت عمرؓ سُن رہے تھے۔ بولے "بغیر لیے ہوے ہرگز واپس نہ جانا، رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہی کہ سونے کے بدلے مین چاندی اگر دست بدست نہ لیجائے تو سود ہی۔

حضرت سعدؓ بن عبد اللہؓ نے اپنے غلام کو ایک صاع گیہون دیا کہ اسکے بدلے مین جَو لے آئے۔ وہ لایا تو ایک صاع سے کچھ زیادہ تھا، آپ کو خبر ہوئی تو بولے "اِس کو فوراً جا کر واپس کرو، مین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو کہ غلہ کو مثلاً بمثلٍ خریدنا چاہیے" لوگون نے کہا کہ بازار مین صرف جَو کا رواج ہو، گیہون نہین مل سکتا۔ بولے مجھے خوف ہو کہین یہ سود کے مشابہ نہو جائے

(اسوۂ صحابہ جلد اول صفحہ ۱۱۲-۱۱۳ مولفہ مولانا عبد السلام ندوی)

یہ ایک آدھ واقعہ نمونہ کے طور پر درج کر دیا گیا، ورنہ تلاش و جستجو سے اِس قسم کے واقعات کا پورا دفتر پیش نظر ہو سکتا ہو۔

ابن ماجہ مین ایک طویل حدیث آتی ہو، جس کا خلاصہ یہ ہو کہ حضرت عبادہ بن صامتؓ جب امیر معاویہؓ کی معیت مین مُلک روم مین پہونچے، تو دیکھا، کہ وہان سونے کی اشرفیون اور چاندی کے درہمون کی باہمی داد و ستد کا کاروبار جاری ہو۔ آپ نے فرمایا کہ لوگو تم سود کھاتے ہو۔ مین نے رسول خدا صلعم کو

یا ایہا الناس انکم تاکلون الربوا سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تبتاعوا الذھب بالذھب الا مثلاً بمثلٍ لا زیادۃ بینھما ولا نظرۃ	یہ فرماتے ہوے سنا کہ سونے کی خرید و فروخت سونے کے ساتھ نہ کرو، مگر بالکل برابر یعنی نہ اُن مین کمی بیشی ہو نہ اُدھار ہو نہ وعدہ ہو،

امیر معاویہؓ کو اس بنا پر اس رائے سے اختلاف ہوا، کہ اس مین نہ اُدھار تھا نہ وعدہ۔ مگر حضرت عبادہؓ کو یہ اختلاف سخت ناگوار گزرا، اور برہمی کے ساتھ کہا کہ مین تم سے رسول خدا صلعم کا قول بیان کرتا ہون،

اُحدثک عن رسول اللہ صلعم وتحدثنی عن رایک لئن اخرجنی اللہ لا اساکنک بارض لک علی فیھا امرۃ	اور تم اپنی رائے و قیاس کو دخل دیتے ہو۔ اگر خدا مجھے یہان سے بخیریت واپس لے گیا تو بخدا مین اُس سرزمین مین تمھارے ساتھ نہین رہنے کا جسمین تمھاری حکومت ہو گی۔

چنانچہ روم سے واپسی کے بعد حضرت عبادہ بجائے اپنے وطن کے جہان امیرؓ موصوف کی حکومت تھی، سیدھے مدینہ منورہ پہونچے۔ خلیفۃ الرسول فاروق اعظمؓ نے حال دریافت کیا۔ اُنھون نے پوری سرگذشت کہہ سنائی، ارشاد ہوا، کہ بلا تامل اپنے وطن کو واپس جاؤ اور امیر معاویہؓ کے نام دربار خلافت سے یہ فرمان پہونچا کہ

لا امرۃ لک علیہ واحمل الناس	عبادہ پر تمھاری حکومت نہ چلنے پائے گی۔ لوگون کو اسی پ

علیٰ ما قال فانہ ھوالامر	آمادہ کرد، جو کچھ انھوں نے کہا، اس لیے کہ وہی امر حق ہے۔

ایک لطیفہ اور سننے کے قابل ہے۔ مولوی طفیل احمد صاحب اپنی تحریروں میں جا بجا مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتوی کا بھی (بغیر اُس کے الفاظ کو نقل کیے ہوے) اپنی تائید میں حوالہ دیتے ہیں، اور شاید عوام کے مرعوب کرنے کے لیے اس قدر کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن انھیں عوام میں اُنھیں اُن اشخاص کے وجود کو بالکل نظر انداز نہ کرنا چاہیے تھا، جو اصل فتوی کی جانب رجوع کر چکے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ طفیل احمد صاحب کا سارا زور "سود لینے" پر ہے نہ کہ سود دینے پر۔ وہ اپنی تحریروں میں بارہا اسی کی اہمیت کو نمایاں کرتے رہے ہیں، بلکہ محض سود دینے کو قطعاً مضر بھی فرما چکے ہیں، مگر لطف یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کا فتوی محض "سود دینے" سے متعلق ہے، اور سود لینے کی بابت استفتا میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں۔ استفتا کی عبارت صرف اس قدر ہے:—

"سود دادن بحربیان درست است یا نہ؟"

سود لینے کا ذکر ہی نہیں، صرف سود دینے کی بابت سوال ہے، وہ بھی صرف حربیوں کے ساتھ مخصوص ومقید، نہ یہ کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ باہم سود کا کاروبار کرے! خدا طفیل احمد صاحبؒ کی اس جسارت کو معاف کرے کہ وہ خواہ مخواہ جوازِ سوا زسود کی تائید میں ایک ایسے برگزیدہ بزرگ کے نام نیک کو بدنام کرتے ہیں، جسے اُن کے پیش کردہ دلائل ومقدمات کے کسی جزو سے بھی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ شاہ صاحبؒ کے فتوے کے آخری الفاظ بھی قابلِ غور ہیں:—

درگرفتن ودادن فرق بسیار گو در اصل وزر ہر دو شریک اند	سود لینے اور دینے میں بڑا فرق ہے، اگرچہ اصل گناہ میں دونوں برابر ہیں۔

ربوٰ سے متعلق کلام مجید واحادیث نبوی میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں، وہ اسے دیگر معاصی کبیرہ، چوری، زناکاری، شراب خواری، قماربازی وغیرہ سے کہیں زیادہ اہم وشدید بتا رہی ہیں، ایسی حالت میں یہ کس آئین دانش کا اقتضا ہے کہ تاویلات باردہ واحتمالات بعیدہ کی بنا پر اس کی ہیٔت ایک خاص صورت تک کے نام سے فرض کی جائے، اور پھر اُس کے جواز پر اصرار کیا جائے؟ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا

قلب، انگریزیت سے مرعوب ہونے کے با وجود بھی الحمدللہ کہ نور اسلام سے بیگانہ نہین، اور مولانا حبیب الرحمن خان شروانی (صدر یار جنگ بہادر) تو شیخ الاسلام دکن ہونے کے علاوہ اپنے صوبہ مین بھی ماشاء اللہ ایک ممتاز عالم دین کی حیثیت رکھتے ہین۔ حیرت، اور حیرت سے زیادہ عبرت کا مقام ہے کہ ان دونون بزرگون نے "مسلم" کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ترویج سود خواری کی تحریک کو جائز رکھا! اللھم اھد قومی انھم لا یعلمون۔

یہ ساری گفتگو مذہبی حیثیت سے تھی۔ اگر تمدنی و معاشری حیثیت سے دیکھا جائے تو طفیل احمد صاحب کے کل دلائل، مغالطات مادی و سوری سے لبریز نظر آئین گے۔ ان کا یہ دعویٰ، جو اُن کے استدلال کا مقدمہ بنیادی ہے کہ سود خوار قومین مطمئن و مرفہ الحال ہین، سرے سے غلط مشاہدات اور ناقص معلومات پر مبنی ہے۔ اول تو کثرت زر، اطمینان و مسرت کے مرادف ہونا کیا معنی، اکثر صورتون مین اُن کے منافی ہوتی ہے۔ پھر اس کثرت زر کی بے ثباتی اور ناپائداری کا اِن سود خوار قومون مین یہ عالم ہے کہ آج ایک کمپنی بڑے بڑے دعوون کے اعلان کے ساتھ قائم ہوتی ہے، اور کل ٹوٹ جاتی ہے۔ صبح تک الائنس بنک (شملہ) کی ساکھ لندن سے لیکر سیلون تک قائم تھی، شام کو تار آتا ہے کہ بنیک دیوالیہ ہوگیا۔ جو لوگ انگلستان کے روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات کا بہ نگاہ غایر مطالعہ کرتے رہتے ہین، وہ جانتے ہین کہ دولت کا یہ فوری اُتار چڑھاؤ متمدن سود خوار قومون مین کس کثرت سے مختلف جرائم و حوادث کے وقوع کا باعث ہوتا رہتا ہے۔ قتل، خودکشی، جعلسازی، دیوانگی، وغیرہ کے بہ کثرت واقعات کی ذمہ داری محض ربوٰ "ربح" کا رواج ہے۔ خدا ان "برکات" ربوٰ و ربح سے اسلامی ممالک کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔ کیا طفیل احمد صاحب نے عرب کی تاریخ مین یہ نہین پڑھا ہے کہ مسلمان ایک زمانہ مین تجارت مین بھی بہت ممتاز رہ چکے ہین، اور چونکہ سود خواری سے محترز تھے اس لیے صدیون تک اُن کی تجارتین چلتی تھین، آج کل کے سود خوار تجار بمبئی کا سا حال نہ تھا، کہ آج اگر لاکھون روپیہ کی کاغذی دولت کے مالک ہین، تو کل گھر مین کھانے کا بھی ٹھکانا نہین۔ بہ فرض محال کوئی نص قطعی اس خاص جزئیہ (ربح) سے متعلق نہ بھی موجود ہو تو اُس کا اس قدر بے ثبات و متلون ہونا بجائے خود اسلام کی پسندیدہ اسپرٹ کے قطعاً منافی ہے۔ اسلام ہر قسم کی قمار بازی کا دشمن ہے، اور سود کی یہ صورت سیم و زر کی کھلی ہوئی قمار بازی ہے۔

"سرمایہ داروں کی غلامی" سے نجات دلانے کا یہ عجیب و غریب طریقہ تجویز کیا گیا ہے کہ خود غلاموں کو "سرمایہ دار" بنا دیا جائے۔ خیریت اتنی ہے کہ طفیل احمد صاحب نے اس وقت تک مسایل طب پر اپنے ذہن کو متوجہ نہیں کیا ہے ورنہ یقیناً یہ ہدایت شایع ہو چکی ہوتی کہ جس شخص کو دیوانہ کتا کاٹے، اُس کا بہترین علاج یہ ہے، کہ وہ بھی پلٹ کر کتے کو کاٹ کھائے!

سرمایہ داری، تمدن جدید کی بدترین لعنت ہے اسکے اثرات سے اگر محفوظ رہنا مقصود ہے تو اس کی صرف یہی تدبیر ہو سکتی ہے، کہ تا بہ امکان اس نظام سے علٰحدگی اور بے تعلقی برتی جائے اور طرز معاشرت اس قدر سادہ اختیار کی جائے کہ سرمایہ داروں کے آستانۂ ناز پر سر نیاز خم کرنے کا موقع ہی نہ پیش آئے کفایت، قناعت، سادگی، متمدن زندگی سے حتی الامکان علٰحدگی دنیا سے بے لوثی، سیم و زر کی عدم محبت دولت کی بے وقعتی، توکل، اعتماد علی اللہ، یا ایک جامع لفظ میں "اسلامی زندگی" ہی وہ سپر وحیدہ ہے، جسپر زر پرستی و شیطان پرستی کے تمام موجودہ و ماضی جدید و قدیم حربوں کو کامیابی کے ساتھ رو کا جا سکتا ہے خداوند کریم، اس حقیقت کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق طفیل احمد صاحب راقم سطور اہل کانفرنس اور ہر کلمہ گو کو عطا کرے۔

تصحیح

(۱) جنوری کے الناظر میں "ابرو شبنم" کے عنوان سے جو مضمون صفحات ۱۳-۱۶ پر شایع ہوا تھا اُس کے آخر میں راقم مضمون کا نام طالب اکبرآبادی چھپا ہے حالانکہ صاحب موصوف کا وطن "الہ آباد" میں ہے۔

(۲) اسی مضمون کے صفحہ ۱۴ سطر ۳ میں "بادلوں" کی جگہ "اولوں" چھپا ہے اور سطر ۲۴ میں "کائنات الجو" کی جگہ "کائنات الو" چھپا ہے۔

ایڈیٹر

رہروئ منزلِ حق

جو کبھی ویران نہ ہو، ہے دہ سرائے دل یہی
چرخ سے جو غم ہو نازل سب کی ہے منزل یہی

گھٹ کے آخر مر گئی طولِ شب غم سے اُمید
ہجر مین یکتی تھی زندہ حق ہو یا باطل، یہی

دانے آنکھون نے نہ دیکھا برگ و بارِ کشتِ سعی!
ایک حسرت لہلہا دل مین ترا بسمل یہی

پینے والو! ایک مین گر اُٹھ گیا تو اُٹھ گیا
مے یہی ہو گی، یہی دور قدح، محفل یہی

ہو گئی جان صرفِ صحرائے محبت، مرحبا!
رہ نوردِ شوق کا جادہ یہی منزل یہی

خوفِ گرداب فنا کیا آشنائے عشق کو
ہے یہی موجِ بلا، مقصود کا ساحل یہی

کر دیے آباد خرمن تخم نے ہو کر فنا
مزرعِ خونِ شہیدان کا بھی ہے حاصل یہی

منزلِ حق سب کو ہے معلوم، رہبر ناپدید
خود نکال لے اے رہرو راہین کہ ہے مشکل یہی

دستِ ہمت کو خجل کرتی ہے استمدادِ غیر
خضر سے پوچھو تھی یا لغز سکندر گل یہی

کاروان کو بھول کر ہے محوِ فکر ذات تو
ہے ترا رہزن یہی، غولِ رہِ منزل یہی

توڑ دے دستِ یقین سے تار و پودِ وہم کو
حاجبِ لیلیٰ یہی ہے، پردۂ محمل یہی

نذرِ جانِ خستہ مسلم ترے قابل نہین
شرم مارے ڈالتی ہے خنجرِ قاتل یہی

مسلم

پیام امن

"انسانیت ایک زندہ وجود ہے دنیا بیان ہین جو اسے محض ایک لفظ سمجھتے ہین"

"جو تعلق فرد کو خاندان سے ہوتا ہے، خاندان کو شہر سے، شہر کو صوبہ سے اور صوبہ کو ملک سے' وہی تعلق اب ملک کو مجموعۂ ممالک (دنیا) سے ہونا چاہیے بلکہ کو صرف اپنی ہی زندگی کی نہین' بلکہ اس سے زائد کی بھی پروا ہونا چاہیے افراد و اقوام دونون کے لیے یہی اخلاق کا صحیح قانون اور یہی فلاح و نجات کا سیدھا راستہ ہے"

"جو تعلق فرد کو قوم سے ہے وہی قوم کو عالم انسانی سے ہے۔ اس بنا پر جسطرح فرد کے لیے قوم کے فرائض ہین اسی طرح اُس کے حقوق بھی ہین۔ وقت آگیا ہے کہ جن حقوق کے مطالبہ کی عزت فرد کی جانب سے سب سے پہلے فرانس کو حاصل ہوئی، انھین حقوق کا اعلان اب اقوام سے تعلق بھی کیا جائے اور فرد سے متعلق جن حقوق ثلثہ کو فرانس کے دست سیاست نے موجودہ تمدن کے دروازہ پر کندہ کردیا ہے وقت آگیا ہے، حقوق اقوام کا خلاصہ بھی انھین تین لفظون مین در مستقبل پر آویزان کردیا جائے۔۔۔۔ (۱) حریت (۲) مساوات (۳) اخوت"

"کوئی قوم کسی حصہ زمین مین آباد ہو سب کو ایک ہی منزل تک پہونچنا ہے کیون نہ موت سے پیشتر زندگی ہی مین ایک دوسرے کو متحد سمجھین"

"امن کوئی ایسی شے نہین جو من وسلوی کی طرح آسمان سے نزول کرے بلکہ انسان کے احساس انسانیت کا نتیجہ ہے۔۔۔۔"

"امن کا جنگ سے اور نرمی کا سختی سے پیدا ہونا محال ہے۔۔۔۔ اگر علاج بالمثل کے اس مہمل اصول مین کچھ بھی صداقت ہوتی، تو مدت ہوئی دنیا سے جنگ رخصت ہوچکی ہوتی"

"دنیا کی صلح وہ صلح نہین جس کے شرائط فاتح یا قوی ترین فریق مرتب کرے۔۔۔۔ بلکہ۔۔۔ جس کے شرائط خود انسانیت کے ایما سے مساویانہ تمام اقوام کو املا کیے جائین گے"

"امن کا مولد و منبع قلب انسانی ہے۔ جنگ کا منبع بھی قلب انسانی ہے۔ انسان کا قلب ہی وہ سرچشمہ ہے جہان سے سیلاب خون نکلکر تمام کرۂ ارض پر جوش زن ہوتا ہے۔ اسی سرچشمہ کو خشک کردینے سے دنیا سے جنگ کا وجود رخصت ہوسکتا ہے۔ تاوقتیکہ انسان کے باطن مین "انسان کے نفس مین اصلاح نہوگی تمام خارجی تدابیر تمام بیرونی

کوششین لاحاصل رہین گی اور امن وصلح کے ظاہری قالب کے اندر جنگ وبدامنی کی روح حرکت کرتی رہیگی"
"آہ جنگ کے شدائد ومصائب!...... کیا شکل انسانی کے عقب مین کوئی اژدر پوشیدہ ہی......
یہ واقعات ممکن کیون ہین؟ محض اس لیے کہ دنیائے متمدن کے ہر شہر ہر قصبہ ہر گانون مین مدارس موجود ہین...
وہان استاد یہ درس دیتا ہی کہ انسان کا اہم ترین فرض یہ ہی کہ قومی اغراض کی پاسداری کرے اور اگر قومی اغراض
اسی کے مقتضی ہون تو اپنے ہمجنسون کا گلا کاٹنا اُسکے لیے کار ثواب ہوجاتا ہی"
"جسوقت تک قانون نفس بشری کی عظمت اور حیات انسانی کا احترام مجرمون تک مین نہ تسلیم کریگا،
جسوقت تک تعزیرات کا نفاذ خود جرائم کی شکل مین ہوتا رہیگا، جسوقت تک کسی خونی کے پوشیدہ جرم کے
جواب مین دوسرا خون علانیہ اور بکمال بیدردی کیا جاتا رہیگا، اُسوقت تک اُس خون کی چھینٹین جسے جلاد کی
جنبش شمشیر نے بہایا ہی بارش کے قطرات بنکر تمام عالم پر برستی رہین گی اور خونی کو جو قتل کی سزا دی جاتی ہی اُس
سزا کی سزا مین جنگ کا دیوتا لاکھون بے گناہون کی جان لیتا رہیگا"

پال رچرڈ

اقتباسات بالا زیر تعارف رسالہ" پیام امن" کے جستہ جستہ مقامات ہین۔" پیام امن" ملک کے
مشہور مترجم مولوی عبدالماجد کے رشحات قلم کا ایک ثمر تازہ ہی۔ یہ رسالہ فرانس کے مشہور اہل قلم پال رچرڈ کی
شہرہ عالم کتاب کا ترجمہ ہی جو عین دوران جنگ مین اقوام محاربہ کو مخاطب کر کے لکھی گئی تھی، اور اس رعایت
سے اس کا انگریزی نام "ٹو دی نیشنس" ہی، جسکا لفظی ترجمہ "الی الاقوام" ہوتا۔ مترجم کے مذاق سلیم نے
موضوع سخن کی مناسبت سے "پیام امن" نام رکھکر گویا کتاب کو اپنا لیا۔ بجاے الفاظ کے مفاہیم کے
ترجمہ کا اصول جو "پیام امن" کے دو لفظی ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہی، تمام تر کتاب کے صفحات وابواب کو حاوی ہی
اور اس لیے بہ قول مترجم "اِس مجموعۂ اوراق کو محض ترجمہ کے بجائے تالیف سمجھا جائے تو شاید واقعیت کے
زیادہ خلاف نہو"

"پیام امن" ۱۸۰ صفحات کو محیط ہی۔ اصل کتاب کا ترجمہ ۸۵ صفحات پر ختم ہوجاتا ہی۔ باقی ۹۵
صفحون پر مترجم کا "تبصرہ" اور حواشی پھیلے ہوے ہین اور اس طرح امن کی پیام رسانی مین مترجم موصوف
مصنف کے، کہنا چاہیے، شریک غالب ہین۔
اصل کتاب کا پیرایہ بیان جیسا کہ اقتباسات بالا سے ظاہر ہوتا ہی، تمام تر خطیبانہ ہی۔ عنوانات ابواب

مثلاً نشۂ شب، خمار صبح، آہ مظلوماں، شام حسرت، صبح سعادت وغیرہ سے صاف ظاہر ہی کہ ان کے ذیل مین کیا ہوگا۔ مترجم موصوف کی رنگین بیانی کا شائبہ حذف کردینے کے بعد بھی ساری کتاب مین نثر کی شاعری ہی باقی بچتی ہی (کہتے ہین) دعوت و تبلیغ کا یہ قدرتی قالب ہی ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہین ہی بادہ و ساغر کہے بغیر

لیکن اس ستانہ خطبہ مین، منطقی استدلال ترتیب مضامین اور تسلسل خیال کی جو کمی تھی وہ مترجم مین اب کہنا چاہیے مولف کی کاوش فکر نے تبصرہ مین پوری کردی اور اب "پیام امن" سنجیدہ طبقۂ مخاطبین کے لیے بھی بے اثر نہ رہیگی۔ اس تبصرہ کے اضافہ نے پیام امن کو جامع و کامل بنا دیا۔

پال رچرڈ کی وسیع المشربی اُن کے دعوی کی بنا پر بلندی کے اُس نقطہ پر نظر آتی ہی جہاں پہونچکر امتیازات مرزبوم آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہین اور ملتین مٹکر اجزاے ایمان ہوجاتی ہین، اُن کے صلح کل، امن پرستی کے کیش مین خونریزی سے بڑھکر (خواہ تعزیراً ہی کیون نہ ہو!) کوئی گناہ نہین انھین خیالات کو مصنف نے مختلف خط و خال کے ساتھ بار بار ادا کیا ہی اور عصر جدید کی غفلت کیشی کا جا بجا رونا رویا ہی۔ غرضکہ ساری کتاب ع یک کاش کہ بود کہ صد جا نوشتہ ایم، کی مصداق ہی۔

اس کے برعکس مولف کا تبصرہ مدلل ہی مرتب ہی مسلسل ہی غیر ضروری تکرار و اعادہ کے عیوب سے پاک ہی۔ مؤلف کی نظر کے سامنے امن کا مسئلہ ذیل کی تنقیحات مین ٹوٹ کر آتا ہی:-

(۱) امن کیا ہے؟
(۲) نقض امن کے اسباب کیا ہین؟
(۳) امن ابتک قائم کیون نہوا؟
(۴) کیا اب کسی عنوان ممکن ہی؟

ان تنقیحات پر مؤلف نے جدا جدا باب باندھے ہین اور بحث کی داد دی ہی۔ تنقیح اول کے متعلق مولف کا فیصلہ امن کی حسب ذیل تعریف ہی:-

"امن نام ہی اُس حالت کا جسمین داخلی حیثیت سے انسان سکون خاطر محسوس کرتا ہی اور خارجی حیثیت سے جسمین قانون و آئین کی عملداری ہوتی ہی"

یعنی مفہوم امن کے دو پہلو ہین (۱) سکون خاطر (داخلاً) (۲) آئین داری (خارجاً)

یہان ایک سوال پیدا ہوتا ہی کہ آیا قانون کی عملداری، اور سکون خاطر مین رابطہ علت ہی یا نہین۔ اگر نہین ہی تو کیا کسی دوسرے مشترک سبب کے ماتحت، نتیجہ کی حیثیت سے ان دونون کا ساتھ ساتھ پایا جانا ضرور ہی یا نہین۔ اگر ایسا ہی تو آخر وہ سبب مشترک کیا ہی تاریخ عالم پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے ہم کو اکثر ملک ایسے ملتے ہین جہان قانون و آئین کی بڑی دھوم دھام ہی، عدالتون کی گرم بازاری ہے، قانونی کتابون کا نمبر سیکڑون سے ہزارون اور قانونی دفعات کا نمبر لاکھون سے لیکر کرورون تک پہونچ گیا ہی، مگر ملک مین سکون خاطر کی جگہ صفر ہی۔ اس کے برخلاف ہر ملک اور ہر زمانہ مین ایسی ہستیان بھی ملتی ہین جو باوجود قانون وقت کے ناقص ہونے باوجود ملکی بدعملی و بدامنی کے کمال طمانیت و سکون خاطر کے ساتھ شگفتہ اس دار فانی کو خیرباد کہکر چلی جاتی ہین یہ کیون؟

اصل یہ ہی کہ ماہیت امن کا مایہ خمیر عدل ہی اور قیام امن اسی شرط واحد کے دامن سے وابستہ ہی۔ حیات اجتماعی کی شیرازہ بندی' اگر عدل سے خالی ہی تو محض قانون و آئین کی نمائش لاحاصل ہی، ایسے قوانین و آئین کی عملداری' معین امن ہونے کی جگہ الٹی مخل امن ہوتی ہی۔ امن کی شرط عدل ہی نہ کہ قانون، جسکے بغیر امن کا وجود حیات اجتماعی مین ناممکن ہی۔ قانون بے عدل نقش زیادہ ہی حیات اجتماعی کا امن، شخصی زندگی کے سکون خاطر کا سبب نہین ہی، مگر اگر سبب غیر مخل نہو تو فی الجملہ معین ضرور ہوتا ہی۔ شخصی زندگی کے سکون خاطر کا سبب ہی تو پھر یہی عدل ہی۔ جو ہستیان اپنے دنیاوی معاملات مین عدل سے کام لیتی ہین' دوسرون اور نیز اپنے نفس کے ساتھ عدل کا برتاؤ کرتی ہین' وہ ہمیشہ آئے دن کے مناقشات سے محفوظ رہتی ہین اور قابل رشک مرنجان مرنج زندگی بسر کرتی ہین۔ الغرض عدل ہی وہ سبب مشترک معلوم ہوتا ہی جو سکون خاطر اور آئین داری پر یکسان چھایا ہوا ہی۔ سکون خاطر اور مراسم آئین بعد کی چیزین ہین، اصل شے عدل ہی۔ اگر کسی کو عدل پر عمل کیے بغیر نام نہاد سکون خاطر حاصل ہی تو وہ معیار انسانیت سے گرا ہوا ایک لذت پرست حیوان ناطق ہی اور یا فاتر العقل ہی اور اس لیے خارج از بحث ہی۔ یا پھر اگر کسی ملک کے آئین و قوانین کے پردہ مین عدل کا جلوہ نہین تو وہ جاندار حکومت نہین بلکہ مردار شین ہی، جسکو خود خبر نہین کہ کیا کرتی ہی اور کس لیے۔ پس امن کی تعریف مین ابتدا ہی سے عدل کے ضروری جوہر سے غض بصر کرنا، آئندہ چلکر بہت سی غلط فہمیون کا باعث ہوگا۔ لہذا آغاز بحث ہی مین اس کی جانب اعتنا ضروری ہی،

دوسرے باب مین مولف موصوف نے نقض امن کے اسباب گنائے ہین جو معروف عالم زر، زن، زمین کی خصومت آفرینیون سے لیکر، جذبہ انتقام، خواہش ناموری، توسیع مملکت، ہوس زراور تعصب وغیرہ پرمنتہی ہوتے ہین۔ ان محرکات کی تقسیم چونکہ بنیاد واحد کے اصول پر مبنی نہین ہر اس لیے تقسیم تام حاصل نہین ہوتی ہر، اور انواع کی خصوصیات مین تفریق کی بجاے اشتراک پایا جاتا ہر جو منطقی نقطۂ نظر سے تقسیم کا نقص بھی تصور کیا جاتا ہر۔ مگر مولف کا شاید یہ منشا بھی نہین ہر، اُن کا مقصد تمثیلاً، چند محرکات بدامنی گنا دینا معلوم ہوتا ہر، نہ کہ منطقی حیثیت سے اُن کا استقصا کرنا۔

لیکن ہم اوپر دیکھ آئے ہین کہ امن کا راز عدل گستری مین مضمر ہر۔ لہذا نقیض امن کی علت بھی نقیض عدل مین ملے گی۔ جسطرح عدل امن کا سبب ہر اسی طرح ظلم بدامنی کا سبب ہر۔ واقعات شاہد ہین اور قیاس گواہ ہر کہ بدامنی کی علت قریب و صحیحہ ظلم ہر نہ کہ جذبۂ انتقام و ہوس زر وغیرہ۔ اگر ظلم کی تمثیل کی تحلیل کی جائے تو اس کے اندر بدامنی کی تسبیب کا سامان سرتاسر پایا جاتا ہر، برخلاف اس کے جذبۂ انتقام و ہوس زر وغیرہ اگر ظلم پر منتہی نہون تو بدامنی پیدا کرنے سے قاصر ہین۔ وہ زیادہ سے زیادہ تائیدی محرکات ہین۔ اُن کو علت کا مرتبہ دینا، امن و بدامنی کے عام فہم فلسفہ کے متعارض ہر۔ ظلم و عدل کا مسئلہ اس باب مین اصطلاحی حقانیت کے علاوہ فہم عام سے بھی معاً تصدیق کا اقرار لیتا ہر،

تیسرے باب مین مولف نے اشاعت امن اور بدامنی کے سدباب کے بارہ مین "اہل تدبیر کی واماندگیان" دکھائی ہین اور پھر چوتھے باب مین منطق کے قلم اور معقول کی روشنائی سے "نسخۂ شفا" لکھا ہر۔ چونکہ اس مسئلہ مین مولف موصوف، اور ہمارا نقطۂ خیال کیسر مختلف ہر، لہذا تشخیص اور نسخہ، دونون سے اتفاق نہین کر سکتے۔ مولف موصوف کے نزدیک "خودی" امن کی علت صحیحہ ہر۔ انسان کا دوست خود اُس کی ذات سے زیادہ کون ہر۔ وہ سب سے لڑتا ہر مگر نہین لڑتا تو آپ سے۔ ازان بعد یہ خودی جس شے سے متعلق ہوجاے، مثلاً اولاد، قوم، ملک، مذہب، وہ سب امن کے دامن مین آجاتے ہین۔ لہذا امن عامہ کی علت، اِسی خودی کی تعمیم ہر۔ یہان تک کہ خودی (بیخود ہوکر) "ہمہ اوست" ہوجاتی ہر اور ہر شے کے پردہ مین خودی ہی کا جلوہ نظر آنے لگتا ہر!!

افسوس ہر کہ ہمارا عقیدہ اس تلقین پر نہین جمتا۔ ہمارے اعتقاد مین نفرت، عداوت، خصومت مناقشت، بدامنی، خونریزی کی جڑ ہر تو یہی خودی، انانیت اور "ہم چو من دیگرے نیست" کا نجس جذبہ گاڑھے

دوستون مین جب چلتی ہی تو اُس کا سبب ۹۹ فی صدی اسی خودی تعلی یا انانیت کا باہمی تصادم ہوتا ہی
حکومتون کے درمیان جب جنگ چھڑتی ہی تو اس کو طول اور شہ دینے والی چیز بھی عزت نفس اور خودداری
کا خناس ہوتا ہی۔ خودی کی تعمیر مین سرتاپا خرابی کی صورت مضمر ہی۔ پھر اس سے کس طرح امن پیدا ہوسکتا
ہی۔ خودی کے تصور مین اس کی چھوٹی مقدار سے لیکر بڑی مقدار تک "اپنے پرائے" کا تخیل داخل ہی
مولف موصوف "خودی" کو عالم کائنات سے متعلق کرکے اُس کی کمیت کو ترقی دے سکتے ہین، لیکن اسکی
کیفیت جو اس کے مفہوم و ماہیت کا مایہ خمیر ہی، (اگر "خودی" کو عام ہوکر بھی خودی ہی رہنا ہی) تو اپنے
اُسی حال پھر برقرار رہیگی، جو حال اس کا اسوقت تھا جبکہ وہ ذات واحد سے وابستہ و متعلق تھی مقیاس الحرارت
مین کسی شے کی کمیت کی تبدیلی اسکی کیفیت کی تبدیلی کو مستلزم نہین۔ برف کا سیر بھر کا ٹکڑا اور سون کی
سل ایک ہی نقطۂ حرارت یعنی نقطۂ انجماد دکھائے گی، اس کی ذاتی برودت مین کچھ اضافہ نہوگا یعنی اگر
اپنی ذات مین خود پرستی قابل نفرین ہی تو ذات عالم مین بھی مستحق آفرین نہین ہوسکتی اور جسطرح انفرادی
خود پرستی مین نفرت و عداوت کا بیج موجود ہی اسی طرح اجتماعی خود پرستی بھی بدامنی کے اسباب سے
تہی دامن نہین ہی۔ نپولین کی خودی نے بھی تمام عالم کو اپنا کہا تھا اور قیصر جرمنی کی خودی بھی بڑے
پیار سے سارے عالم کو اپنا بتاتی تھی لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ جنگ و جنگ عظیم۔

اور کیون صاحب، اگر آپ کی خودی نے غیریت کے پردہ کے ساتھ غیرت کا نقاب بھی اُلٹ دیا تو
پھر اس سندان خودی کے ساتھ شیشۂ ننگ و ناموس کا خدا ہی حافظ ہی،

لیکن خودی اور امن کے درمیان رابطۂ علت ثابت کرنے مین مولف موصوف نے منطق استقرا
کے ایک چھوڑ تین تین طریقون کا زور لگایا ہی، موصوف فرماتے ہین:۔

(۱) خودی کا تعلق جب تک اپنی ذات سے رہا اپنی ذات سے محبت رہی،

(۲) خودی کا تعلق جب اولاد سے ہوگیا اولاد سے محبت پیدا ہوگئی،

(۳) خودی کا تعلق جب اپنے اعزہ سے ہوگیا تو اُن سے محبت پیدا ہوگئی،

(۴) خودی کا تعلق جب اپنے احباب سے ہوگیا تو اُن سے محبت پیدا ہوگئی،

(۵) خودی کا تعلق اپنی قوم، مذہب، وطن، جماعت، جس کسی سے ہوا اُس سے محبت پیدا ہوگئی (ص۲۳)
غور کیجیے تعلقات خودی کی مذکورۂ بالا فہرست کی ہر شق کے ساتھ "من و تو" کا سوال وابستہ ہی

یا نہین اور اُس کے پہلو بہ پہلو ہمین حسب ذیل مثالین ملتی ہین یا نہین ؟

(۱) جب خودی کا تعلق اپنی ذات سے رہا سوائے الذات سے جنگ رہی۔

(۲) جب خودی کا تعلق اولاد سے ہوگیا تو دوسرون کی اولاد کو دیکھ کر جلنے لگے۔

(۳) جب خودی کا تعلق اپنے اعزہ سے ہوگیا تو "غیر پھر غیر ہی" کا احساس پیدا ہوگیا

(۴) جب خودی کا تعلق احباب سے ہوگیا، تو دوست کے دشمنون کا بھی اپنے دشمنون کی فہرست مین اضافہ ہوگیا۔

(۵) جب خودی کا تعلق اپنی قوم مذہب وطن جماعت سے ہوگیا، تو ساتھ ہی اس کے مذہبی تعصب اور اپنی پارٹی کی پچ کی داغ بیل پڑ گئی۔

مولف موصوف نے تصویر کا ایک رُخ دیکھا، اس امر کو قطعی نظر انداز کیا کہ جذبہ خودی محبت آفرینی کے ساتھ نفرت آفرین بھی ہی بلکہ بسا اوقات خودی کا پیار اور محبت سے جو لگاؤ ہی اُس کی مثال ویسی ہی ہی جیسے کہ ایک فوج مین اتحاد و اُلفت کا پایا جانا جس کا منشا غنیم کی فوج کے ہر متنفس کو تلوار کے گھاٹ اُتارنا ہوتا ہی۔

منطق استقرا کی اصطلاح مین اس قبیل کی لغزش کو "مغالطہ تصور مشاہدہ"[ل] کہتے ہین یعنی جب کہ علل و معلولات کے استقصا مین محقق کی نظر چوک جاتی ہی۔ مولف کی فکر رسا نے ہمارے خیال مین یہان بھی خطا، اجتہادی کی ہی۔

علاوہ بریں غور کیجیے خودی نے پیدا کیا کیا ؟ محبت۔ کس کے دل مین ؟ خود صاحب خودی کے دل مین تو محبت کا استقرار پانچون حالتون مین صاحب خودی کا نفس ہوا خارج مین خودی کے تعلق سے نہ محبت کا وجود ہوا نہ امن کا ورود دنیائے اپنی زندہ ہے محبت کرنے سے یہ کب لازم آتا ہی کہ اس کے گھر مین، صلح و آشتی اور امن و آسودگی کے جذبات بھی پائے جاتے ہین منطقی حیثیت سے بس آپ یہ حکم لگا سکتے ہین کہ وہ خود گرفتار محبت ہی۔ اس سے آگے قدم رکھنا خود مغالطہ مین پڑنا اور دوسرون کو مغالطہ مین ڈالنا ہی۔

خودی کے اندر اگر اپنون کے ساتھ پیام امن ہی تو اُسی کے ساتھ غیرون کے ساتھ پیام جنگ بھی ہی

ل Fallacy of Non-observation

اس کے مقابلہ مین ہم عدل کے مقبول عام تخیل کو لیتے ہین اور اس کو امثال بالا پر لگا کر دیکھتے ہین: طریق[۱] طرد کے مطابق حسب ذیل تشکل قائم ہوتی ہر:

(۱) جب عدل کا برتاؤ اپنے نفس و خواہشات نفس کے ساتھ رہا سکون خاطر حاصل رہا۔ امن رہا۔

(۲) جب عدل کا برتاؤ اولاد سے رہا، گھر خانہ جنگیون سے محفوظ رہا امن رہا۔

(۳) جب عدل کا برتاؤ اعزہ سے رہا لطف و یگانگت قائم رہی، امن رہا۔

(۴) جب عدل کا برتاؤ احباب سے رہا، دوستی قائم رہی۔ امن رہا۔

(۵) جب عدل کا برتاؤ اپنی قوم، وطن، جماعت سے رہا، سب خوش رہے، امن رہا۔

(۶) حتیٰ کہ جب عدل کا برتاؤ غیر افراد و اقوام سے رہا، تعلقات خوشگوار رہے، امن رہا۔

دیکھیے خودی کا رشتہ اغیار سے قائم نہین ہوسکتا، لیکن عدل کا تعلق ہمہ گیر ہر۔ ملاحظہ ہو شق ششم۔

تائید کے لیے طریق عکس[۲] کو بھی عدل و امن کے رابطۂ علت پر لگا کر دیکھو تو اُس کا فتویٰ بھی عدل کے حق مین ہر۔

(۱) امن و صلح کی جتنی مثالین ملین سب مین عدل کا وجود مشترک پایا۔

(۲) عدم امن و صلح کی جتنی مثالین ملین، اس مین سے کسی مین عدل موجود نہ پایا۔

اصل یہ ہر کہ خودی کو جتنا مٹایا جائے، انسان اسی قدر امن و صلح کے قریب ہوتا ہر۔ ع

یہ کھویا ہے ہونے نے نہ ہوتا مین تو کیا ہوتا

امن و بدامنی کے اسباب کی سُراغرسانی کی بحث مین اس قدر کفایت کرتا ہر۔ رہا یہ کہ باوجود اسباب امن دریافت ہو جانے کے، جنگ کا خاتمہ کیون نہین ہوگیا۔ تو یہ حضرت انسان کے مان کی بات نہین۔

---

[۱] Method of Agreement جب واقعہ زیر تحقیق کی چند مثالون مین ایک ہی جزئیہ مشترک ہو تو یہ جزئیہ واقعہ مذکور کا سبب ہوگا یا نتیجہ یا پھر رابطہ علت"

[۲] Method of Difference اگر ایک مثال مین ایک واقعہ موجود ہو اور دوسری مثال مین نہ ہو اور ان دونون مثالون مین کل عوارض مشترک ہون بجز ایک کے جو پہلی مین موجود ہر اور دوسری مین نہین تو وہی واقعہ مذکورہ کی علت یا معلول یا رابطہ علت ہوگا۔

فلسفہ اخلاق کی یہ ایک حقیقت ہی کہ خیر مطلق اور شر مطلق الفاظ بے معنی اور اسما بے مسمی ہین خیر بے شائبہ شر اور شر بے شائبہ خیر عالم اخلاق کا عنقا ہی یہ اس عالم شہود کی ترکیب کا اقتضا ہی۔ چنانچہ جنگ بھی خالصاً شر ہی شر نہین بلکہ اس کے عیبون کی طویل فہرست مین متعدد ہنر بھی نظر آتے ہین ع

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

حیاتیات[1] کے اسرار شناسون سے پوشیدہ نہین کہ جنگ لازمۂ حیات ہی۔ کشاکش حیات[2] کیا ہی کسی جسم[3] کی اپنے ماحول[4] سے آویزش جو حیات کے ساتھ شروع ہوتی ہی، حیات تک قائم رہتی ہی اور حیات ہی کے ساتھ ختم ہوتی ہی۔

مولف نے جنگ کا سد باب کرنے مین یورپ کو بے بس خیال کیا ہی لیکن ہم تمام عالم کو اس معاملہ مین عاجز یقین کرتے ہین۔ اصل مین عقدہ اس سوال کا ایک اور گرہ مین بند ہی۔ اس خاندان ارضی کا نام عالم کون و فساد ہی۔ اس کے قوام و نظام کے لیے فساد بھی اسی قدر ضروری ہی جسقدر کہ "کون"۔

حکماے سلف، عوام سے حکمت کے اسرار شاید اس مصلحت سے مخفی رکھتے تھے کہ حقائق اشیا معلوم کرکے اُن کی ہمتین پست نہو جائین اور ولولے سرد نہ پڑ جائین۔ مین ایک راز کی بات کہتا ہون، کیا انسان یہ سن کر اور جان کر کہ وہ مجبور محض ایک بے اختیار وجود ہی، پھر کچھ کرنے کا حوصلہ کرے گا؟

المختصر یہ تمام مقتضیات فطرت ہین جو انسان کی قدرت سے باہر اور اُس کے علم سے ماورا ہین۔ انسان فطرت کے کسی شعبہ خاص پر استقرا چلا سکتا ہی، لیکن کنہ کائنات کا فلسفہ مرتب کرنے سے قاصر ہی اور ہمیشہ قاصر رہے گا۔ الٰہیات، کونیات[5] مابعد الطبیعات، یہ بس! ع

خواب نہ دیدہ را ہمہ تعبیر میکنند

اگر نظر کو وسعت دیجیے، تو جنگ جسد عالم کے لیے فصد کی مثال ہی، جو خون فاسد کے اخراج اور مزاج عالم کے اعتدال کے لیے ازبس ضروری ہی، اور اُس کا نتیجہ آخر عالم و عالمیان کے حق مین مفید ہی ثابت ہوتا ہی۔

---

[1] Biology
[2] Struggle for existence
[3] Organism
[4] Environment
[5] Cosmology

دور کیون جائیے موجودہ جنگ کو لیجیے جنگ سے قبل ممالک متحاربہ مین آبادی کا سوال پیدا ہو چلا تھا۔ علمائے عمرانیات کے نزدیک جنگ کی ایک بہت بڑی برکت آبادی کے مسئلہ کو قدرتی طور پر بہ آسانی حل کر دینا ہی اور تاریخ شاہد ہی کہ اسی قبیل کے دشوار و پیچیدہ مسائل کے متعلق جنگ کا فیصلہ ہمیشہ ناطق رہتا ہی۔ علاوہ برین دنیا کے موجودہ زاویہ نگاہ کے مطابق کسی ملک کے لیے سب سے بڑی برکت جمہوریت اور سب سے بڑی نحوست استبداد اور غلامی خیال کی جاتی ہی۔ اب دیکھیے کہ موجودہ جنگ نے طبقۂ اولی کو اوپر اُچھالنے مین کس قدر مدد دی۔ روس مین لینن[1] جنگ سے پہلے بھی تھا۔ مسولنی[2] بھی اطالیہ مین جنگ سے پہلے بود و باش رکھتا تھا۔ مصطفے کمال پاشا ٹرکی مین اور مسٹر رامزے میکڈانلڈ انگلستان مین تھے، لیکن روس مین سودیٹ حکومت (اشتراکیت) اٹلی مین فیشزم[3] انگورہ مین دستوریت اور انگلستان مین عمالی حکومت، جنگ سے پہلے نہ تھی، جنگ کے بعد ہوئی۔ کیا یہ اس جنگ عظیم کی سنہری برکات نہین ہین اور کیا اس آزادی و جمہوریت سے نسل انسانی کی موجودہ و آئندہ نسلین جو استفادہ کرین گی، اُس سے، خون کے اُن چند قطرون کی جو بالکل تقضائے فطرت و حکمت بہے تلافی نہین ہو جاتی ہی؟ اُن مقاصد گرامی و عزائم عظیمہ کے مقابلہ مین جو حکیم مطلق مستقبل کائنات کے متعلق پیش نظر رکھتا ہی، چند جانون کا ضایع ہونا کیا مال ہی۔ رہا اتلاف زر و مال تو وسیع النظری اس کو اتلاف کب کہے گی، جب مال دنیا کا دنیا مین اور انسان کا انسانون ہی کے پاس رہا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہیے کہ نقل مکان و ملکیت ہوا۔ اتلاف کیا؟

یورپ مین جنگ کو روکنے کی سب سے پہلی باقاعدہ کوشش ہیگ کانفرنس تھی، لیکن تاریخ گواہ ہی کہ جس شہنشاہ[4] نے اس کے اہتمام و انتظام مین سب سے زیادہ دلچسپی لی تھی وہی اسکے بعد جنگ مین سب سے بڑا حصہ لینے والا ثابت ہوا۔ ہیگ کانفرنس نے فنا ہو کر لیگ آف نیشنز کی شکل مین چولا بدلا، لیکن ابھی کل کی بات ہی کہ اٹلی نے باوجود اس کا عضو خاص ہونے کے مسولنی کے ایما سے اسکے اقتدار کو ٹھکرا دیا۔ غرضکہ

---

[1] روس کا قائد اعظم۔ اشتراکیت کا بانی۔ Lenin

[2] Mousoolini

[3] Fascism فیشزم یا سینڈیکالزم اٹلی کا موجودہ نظام حکومت ہی۔ ہر طبقہ طبقیت کی جداگانہ باضابطہ انجمنین ہین اور پھر مرکزی انجمن مین ان کے باضابطہ نائب حتی کہ ملازمین سرکاری بھی ایک باضابطہ انجمن ہی اور وہ اپنی تجاویز پر مرکزی انجمن مین اپنے نائبین کے ذریعہ سے مباحثہ کرا سکتے ہین

[4] شاہ آسٹریا

ہیگ ہو یا لیگ ہو یا کسی اور مرکزی مجلس کا خواب ع

این خیال است ومحال است وجنون

جنگ بالکل ایک مقتضائے فطرت اور لابدی چیز ہی، جس کا روکنا انسان کے حیطۂ امکان سے بالکل باہر ہی، اور باہر رہیگا۔

چونکہ امن کو عدل سے وابستگی خاص حاصل ہی یعنی اس کا قیام عدل پر مبنی ہی اس لیے بیجا نہوگا اگر چند کلمات حقیقت عدل کے متعلق عرض کیے جائین۔

اس قبیل کے تصورات کلیہ کا مفہوم متعین کرنے کے متعلق سقراط کا دستور تھا کہ وہ کلیہ زیر بحث کو اسکے جزئیات محسوسہ پر لگا کر دیکھتا تھا کہ وہ اپنی متعدد مادی مثالون مین کیا معنی دیتا ہی۔ پھر وہ اُن جداگانہ مخصوص مفاہیم کا قدر مشترک نکال لیتا تھا اور یہی اس تصور کلیہ کا مفہوم ہوتا تھا۔ مل نے اپنے "رسالہ افادیت" مین عدل پر بحث کی ہی اور اُس کے مفاہیم مختلفہ پر غور کیا ہی۔ ذیل مین ہم اُن پر نظر کرین گے اور انہی امثال کا گویا ذو اضعاف اقل مشترک، ماہیت عدل کو مشتمل ہوگا۔

اولاً، کسی شخص کو اس کی ذاتی آزادی یا اس کے مملوکات یا کسی چیز سے جسکا وہ قانوناً مالک ہی محروم کرنا، عدل کے خلاف سمجھا جاتا ہی یعنی کسی شخص کے قانونی حقوق کا پاس کرنا عدل اور انکا نظر انداز کرنا خلاف عدل یا ظلم ہی۔

ثانیاً، اگر یہ قانونی حقوق کسی ناقص قانون سے اخذ کیے گئے ہین تو اُن کے احترام وعدم احترام کے متعلق، محققین مقننین کے درمیان اختلاف خیال ہی۔ بعض کہتے ہین کہ قانون کی خلاف ورزی خواہ وہ قانون کیسا ہی بُرا ہو کسی حال مناسب نہین اس لیے کہ اس مثال عملی سے جہلا کے دل سے قانون کی عظمت اُٹھ جانے کا اندیشہ ہی اور اُس کو رفاہ عام کے حق مین ایک فتنہ عظیم سمجھنا چاہیے۔ اگر آپ کو کسی قانون سے اختلاف ہی تو قانونی طور پر اُس کی اصلاح کی کوشش کیجیے۔ دوسرا فریق اس کے علی الرغم کہتا ہی کہ نہین ایک ناقص ومضر قانون کی علانیہ خلاف ورزی کرنا چاہیے۔ ہر قانون انسان کے واسطے ایک پابندی عائد کرتا ہی پس وہ تقیید جس کا مقصد بہبودی انسان نہین ہی ناجائز ہی اور اُس کا توڑنا جائز۔

کسی قانون کے خلاف عدل ہونے کے وہی معنی ہین جو کسی فعل کے خلاف عدل ہونے کے ہوتے ہین۔

ہم کسی فعل کو خلاف عدل اُس وقت کہتے ہین جب کہ اُس سے کسی کی حق تلفی ہوتی ہو،

اسی طرح اگر کسی قانون سے رعایا کی حقوق کی پامالی منصور ہو تو وہ بھی خلاف عدل ہو اگرچہ آخر الذکر صورت مین قانونی حقوق پامال نہون گے، بلکہ اخلاقی حقوق۔

چنانچہ عدل کی دوسری شکل، انسان کے اخلاقی حقوق کا احترام ہو اور اُن کو نظر انداز کرنا شرط انصاف نہین ہو۔

ثالثاً۔ عدل کا ایک عام مفہوم "مکافات عمل" کا تخیل ہو۔ ہر شخص کو اُس کے عمل کا بدل ملنا چاہیے، ہر قصور سزا پر ختم ہونا چاہیے۔ اگر بھلائی کے عوض مین کسی کے ساتھ بُرائی کی گئی تو یہ عدل کے خلاف ہوگا بلکہ اس تقدیر پر بُرائی کے عوض بھلائی کرنا بھی عدل کے خلاف ہو۔ ایسا عموماً اُسوقت ہوتا ہو جب جذبہ عدل پرستی، دیگر محرکات عالیہ سے مغلوب و معطل ہو جاتا ہو، اور اس لیئے مستحسن خیال کیا جاتا ہو،

رابعاً۔ معاہدہ شکنی یا اُن توقعات کا توڑنا جو ہم نے لوگون کے دلون مین اپنے قول و فعل سے قائم کیے تھے، انصاف کے خلاف تصور کیا جاتا ہو۔

خامساً۔ عدل بسا اوقات غیر جانبداری کے مفہوم مین مستعمل ہوتا ہو۔ بالفرض آپ کو کسی سرکاری ملازمت کے لیے ایک امیدوار انتخاب کرنا ہو، اگر آپ بلا لحاظ قابلیت و استحقاق، اپنے آوردہ کو منتخب کر لیتے ہین تو یہ ضرور عدل کے خلاف ہوگا۔ لیکن مل کہتا ہو کہ "اپنے احباب و اعزہ کے ساتھ جانب داری برتنا ہر حال مین مذموم نہین، بلکہ بہ اکثر حال محمود ہو۔ اگر اپنے کسی عزیز یا دوست کا انتخاب کسی فرض خاص سے متعارض نہین ہو، یا جس سے کسی کی حق تلفی نہین ہوتی ہو تو ایسی صورت مین اخلاقاً اپنون پر پرایون کو ترجیح دینا قابل ملامت سمجھا جائے گا نہ کہ قابل ستایش"

سادساً۔ غیر جانب داری کے تخیل کے ساتھ، عدل کا ایک عامتہ الورود مفہوم "مساوات" ہو جو عدل کا جزو لاینفک تصور کیا جاتا ہو، او بعض کے نزدیک عین عدل یہی اصول مساوات ہو۔ حتیٰ کہ وہ قومین جو حقوق کے اندر عدم مساوات کی مدعی ہین آقا و غلام، شاہ و گدا، امیر و غریب کے درمیان ادنیٰ و اعلیٰ حقوق کی تفریق کرتی ہین، وہ بھی اس کی قائل ہین کہ غلام کے حقوق کا احترام، خواہ یہ حقوق کتنے ہی پست و ادنیٰ کیون نہ ہون اتنا ہی واجب و لازم ہو جتنا کہ آقا کے حقوق اعلیٰ کا۔ کسی کی ہو، حق تلفی ہمیشہ عدل کے خلاف ہوگی۔

ہم دیکھتے ہین کہ عدل اور واجبات عدل اکثر اُن امور سے متعلق ہوتے ہین جو تعزیر قانون کی دسترس سے باہر ہوتے ہین۔ کوئی شخص اپنی خانگی زندگی مین قانون کا تسلط برداشت نہین کر سکتا، تاہم روزمرہ، ہر موقع محل پر انصاف کے نقطۂ خیال سے چھوٹی چھوٹی باتون مین بھی اعمال پر جرح وقدح کیا جاتا ہی اور ادنیٰ درجہ کے معاملات مین بھی انصاف کے خون کا احساس اس تخیل کو اپنے ساتھ لیے رہتا ہی کہ کاش اس باب مین بھی کوئی قانون ہوتا۔ ہم فطرتاً چاہتے ہین کہ انصاف کے خلاف کرنے والے کو کچھ سزا ملے اگر قانوناً نامناسب ہی تو رائے عامہ کی سہی۔ اگر یہ بھی ممکن نہین تو ملامت ضمیر ہی کی سہی۔

یعنی عدل کے اندر قانونی تعزیر کا تخیل داخل ہی، مگر یہ کچھ واجبات عدل پر موقوف نہین بلکہ تمام فرائض اخلاق کا یہی حال ہی۔ فرض گویا ایک فرض ہی جو بہر حال ہمین ادا کرنا ہی۔ یہان تک عدل اور دیگر مکارم اخلاق، مشترک ہین۔ لیکن آگے چلکر مقننین نے فرائض کی دو قسمین کر دی ہین، ایک فرائض ناقصہ اور دوسرے فرائض کاملہ۔

فرائض ناقصہ وہ ہین، جن کی ادائی، مطلقاً، ہر حال اور ہر موقع پر واجب تصور نہین کی جاتی ہی بلکہ اس مین ہماری مرضی کو دخل عظیم حاصل ہی۔ مثلاً سخاوت ہمارا فرض ہی مگر یہ فرض نہین کہ کسی خاص وقت یا کسی خاص شخص کے ساتھ بالضرور اُسے برتا جائے اور نہ برتین تو مستوجب ملامت وتعزیر ٹھہرین۔ فرائض ناقصہ کا مضاف الیہ حقوق نہین ہوتے ہین۔ یعنی کوئی شخص بر بنائے حق، ہم سے سخاوت کا طلبگار نہین ہو سکتا۔

برخلاف اسکے، فرائض کاملہ اپنے مقابل حقوق کو مستلزم ہین اور یہی امر خاص اخلاق عامہ اور عدل کے درمیان مابہ الامتیاز ہی، پچھلی تمام مثالون پر غور کیجیے۔ عدل کے ساتھ ہر جگہ حق کا تخیل موجود ہی، جو کسی فرد یا افراد کو دوسرے فرد یا افراد پر حاصل ہی اور جو باختلاف مدارج، مثال اول کے "قانونی حق" کے مشابہ ہی جب ہم کسی کا مال غصب کرتے ہین، یا جب ہم معاہدہ خلافی کرتے ہین یا یہ کہ نیکی کا بدلہ بدی سے دیتے ہین یا یہ کہ مساوات کی جگہ "ترجیح بلا مرجح" کے مرتکب ہوتے ہین۔ ان مین سے فرداً فرداً ہر صورت مین ہم کوئی نہ کوئی حق تلفی کرتے ہین۔ کسی کا مال چھینا، اُس کی حق تلفی کی، کسی سے معاہدہ کر کے ہم نے اُس کے ایفا کی توقع کا اُسے حق دیدیا تھا، وعدہ خلافی کی، حق تلفی کی، زید نے ہمارے ساتھ نیکی کر کے ہمارے اوپر یہ حق حاصل کر لیا تھا کہ ہم بھی اُس کے ساتھ نیکی کرین، اگر ہم نے نیکی کے عوض میں بدی کی۔ ہم نے زید کی

حق تلفی کی۔ اگر ہم نے کسی نا اہل کو کسی سرکاری عہدہ کے لیے انتخاب کر لیا تو ہم نے دوسرے قابل امیدوارون کی صریح حق تلفی کی۔ اگر ہم نے اپنی اولاد ذکور مین سے ایک کو بلا وجہ جائداد کا ایک ثلث اور دوسرے کو دو ثلث تقسیم کیا تو اس عدم مساوات کے پردہ مین ہم نے اول الذکر فرزند کی حق تلفی کی۔

غرضکہ عدل کے جتنے مظاہر و شئون ملین گے ان مین ہمیشہ ایک شے یعنی حق کی پاسداری و احترام کو مشترک پائے گا اور ظلم کی جملہ اشکال و مصداقات مین بلا استثناء حق تلفی پائی جائے گی۔

اگر کوئی یہ اشکال وارد کرے کہ مثلاً سخاوت طلبی اگرچہ کسی خاص فرد کا حق نہین لیکن نوع انسان بہ حیثیت مجموعی سخاوت کی حقدار تصور کی جا سکتی ہی، تو اس تقدیر پر ہم کہین گے کہ سخاوت عدل کا جزو بن گئی تفضیلات عامہ اور عدل کے درمیان سے حق کی تمیز رفع کر دینا، اخلاق کو عدل کے اندر جذب کر دینا ہی۔ چنانچہ کینٹ کا نظریہ اخلاق یہی تھا وہ کہتا ہی "تمھارے اعمال ایسے ہونا چاہیے کہ اگر تمھارے دستور العمل کی تعمیم کی جائے تو وہ جمیع بنی نوع انسان کے لیے قانون کا مرتبہ اختیار کر سکے"

اسکے نزدیک اعمال حسنہ اور اعمال سیئہ مین ما بہ الامتیاز یہی امر ہی کہ اول الذکر اگر ایک عالمگیر قانون کی شکل اختیار کر لین تو کوئی استحالہ لازم نہین آتا، برخلاف اُن کے دنیا کو اعمال سیئہ کی صلائے عام تمدن و معاشرت کے لیے ایک فتنہ ثابت ہوگی۔

الغرض، عدل اور امن کے درمیان رابطہ علت اسقدر عیان ہی کہ اس کی مزید توضیح تفصیل حاصل معلوم ہوتی ہی۔ انصاف کا فیصلہ، اگر جذبات کے خلاف ہوتا ہی تو بھی حق پسندی کے اثر اور انصاف پرور رائے عامہ کے دباؤ سے، چون و چرا کی گنجائش اور نقض امن کا امکان باقی نہین رہتا۔

بہر طور مسطورۂ بالا اختلاف خیال کے ساتھ شرط انصاف ہی کہ مولف موصوف کے اجتہاد فکر، ذوق توجیہ و تعلیل، جدت خیال، ندرت ادا، تسلسل بیان، قدرت کلام اور صفائی زبان کی داد دیجائے۔

مولوی عبدالماجد صاحب، ملک کے اُن ہونہار فرزندون مین سے ہین، جنھون نے تھوڑی عمر مین ملک کی سب سے زیادہ علمی خدمت کی ہی، خدا ان کی عمر مین برکت دے ملک کی بہت سی امیدین انکی ذات سے وابستہ ہین، دیگر مستقل تصنیفات کے علاوہ آپ کے تراجم، "تاریخ اخلاق یورپ" اور "تاریخ تمدن" قابل ذکر ہین۔ اصل یہ ہی کہ لیکی اور بکل اُردو مین ان مباحث پر لکھتے تو مترجم موصوف ہی کی زبان اختیار کرتے۔ ترجمہ مین، کہین ترجمہ پن نہین معلوم ہوتا، بیان مین وہی روانی اور خیالات مین وہی قدرتی ترتیب،

جو کسی بلند پایہ مصنف کی مادری زبان کی تصنیف میں ہونا چاہیے یہی خوبی "پیام امن" کا طرۂ امتیاز ہے۔

ناظرین کرام، ہمیں معاف کریں گے، اگر ہم اُن کی توقع کے خلاف، اصل کتاب پر عرض خیال کرنے سے باز رہے، اِس لیے کہ اہل نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ پیام امن کے ۱۰۱ صفحوں کی ضخامت میں جو کچھ تھا وہ یہی مولف کا تبصرہ تھا، جو کہ موضوع تنقید رہا۔ ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ رابرٹ آون[1] کے مقلد و اتباع، مثل پال رچرڈ، جو سرے سے تعزیر کے لغت ہی کو قانون کی ڈکشنری سے نکال دینا چاہتے ہیں، کہاں تک قابل اعتنا ہو سکتے ہیں۔

عدم تعزیر کا غیر سنجیدہ تخیل فلسفے کے لباس میں جس قدر دلفریب اور پرفریب معلوم ہوتا ہے اتنا ہی شاعری کی زبان سے کس قدر بھلا لگتا ہے۔ پال رچرڈ کے فلسفہ کو ہمارے ملک کے فلسفی شاعر غالب کی زبان سے سنیے، سچ ہے، "ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد"، کیا خوب کہہ گیا ہے

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

ظفر حسن ہمان

[1] انگلستان کا معروف زمانہ اشتراکی مقنن جو فرقہ سوشلسٹ کا سرخیل تھا۔ اس کے انوکھے خیالات میں سے ایک عقیدہ تعزیر کا تھا۔ ۱۷۷۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۸ء میں، کثیر تعداد میں اپنے مقلد چھوڑ کر مر گیا۔ پال رچرڈ اس باب میں ان ہی کے خوشہ چینوں میں سے ہے۔

انقلاب سیرت

میں نے پوچھا یہ ایک عارف سے　　"آج عالم میں کیا قیامت ہے
جس کو دیکھو ہے دور مذہب سے　　جو ہے، ناواقف طریقت ہے
جس کو دیکھو ہے خُلق سے عاری　　جو ہے محروم آدمیت ہے
آگے تھی آدمی میں جو خو، بو　　اب وہ خُو ہے، نہ اب وہ خصلت ہے

نہ تو چھوٹوں میں ہے بڑوں کا ادب
نہ بڑوں میں، بڑوں کی سیرت ہے

آج لفظِ وفا ہے بے معنی
ایک فقرہ، خلوص نیت ہے

فلسفی کی بنائے خُلق ہے "غرض"
خود غرض کی، یہ فلسفیت ہے

صوف پیکر ہے، صوفی صافی
صوفیت آج وضع و ہیئت ہے

خوب ہے زاہدِ فرشتہ خصال
یعنی محروم آدمیت ہے

عالمِ بے عمل ہیں مولانا
آپ کا دم بڑا غنیمت ہے

ہم تو ہیں پھر عوام کالانعام
خاص لوگوں کی جب یہ حالت ہے

آخر اس کا کوئی سبب ہے حضور!
یہ تو مانا، خدا کی قدرت ہے

ہے یہ دُنیا تو عالمِ اسباب
"عالم اس پر دلیل و حُجّت ہے"

سُن کے عارف نے یہ کہا، "سُن لے
شاکیِ دہر اک حماقت ہے"

آج بھی ہے وہی نظامِ عمل
اور وہی کائناتِ فطرت ہے

آج کہتا ہے تو جسے محشر
یہ تو خود خواستہ مصیبت ہے

اس کا باعث ہے مغربی تعلیم
مادہ جس کا، مادیت ہے

کر دیا ہے خدا سے دور تجھے
مادہ پردۂ حقیقت ہے

تعدیہ ہر وبا کا خاصہ ہے
یوں ہمہ گیر مادیت ہے

یہی تعلیم، ہاں یہی تعلیم
باعثِ انقلابِ سیرت ہے

تو نے جو چاہا وہ ملا گویا
"کامیابی، بقدرِ ہمت ہے"

سید ضامن حسین گویا جہان آبادی

ذات بحت۔ روح۔ تقدیر

حقائق معرفت کے متعلق ذات باری تعالیٰ، روح اور تقدیر کی حقیقتوں کا علم تمام مذہبی مباحث علمی کی اصل ہی۔

ذات باری تعالیٰ کا علم جاننے والے کی ذاتی استعداد پر منحصر ہی۔ حضرت موسیٰ اور گڈریے کی حکایت جو مثنوی مولانا روم مین ہی بہت مشہور ہی۔ یہ قول فیصل ہی کہ خدا کو بجمیع صفات خالق مطلق اور قرآن کو برحق جاننا ایمان اجمالی کے لیے کافی ہی۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خواجہ خضرؑ کی گفتگو جو قرآن مین مذکور ہی وہ اس امر پر شاہد ہی کہ خدا کے تمام معارف پر عبور حاصل کرنا غیر ممکن، محال یا مشکل ہی۔ مین خدا کو اس طرح سمجھتا رہا کہ ہر ایک کی پندار کا ایک دائرہ ہوتا ہی کسی کا چھوٹا اور کسی کا بڑا۔ خدا مسبّب اسباب ہی۔ اور یہ دائرے معلومات کے بلحاظ مقدار علم اسباب کے ہین۔ اور انکی وسعت ہر شخص کے ذاتی معلومات کے اعتبار سے کم اور بیش ہی۔ ہر شخص کے ذاتی پندار کے دائرے جہان ختم ہوتے ہین، وہین سے اُس کے لیے دائرۂ الوہیت شروع ہوجاتا ہی۔ بوجہ اپنی بے بضاعتی علمی کے ان خیالات کے اظہار کی مین جرأت نہ کرتا تھا۔ لیکن الحمدللہ کہ حضرت مجددؒ کے تصانیف سے میری تشفی ہوئی اور معلوم ہوا کہ اصطلاح تصوف مین ان چھوٹے بڑے دائرون کی سیر قلب۔ روح۔ سر خفی اور اخفی کے پہلو سے محاط بیان کی گئی ہی۔ اور ان کے بعد یا ماورا الورا ذات بحت، بیچون وبیچگون و بے کیف و بے مکان و بے زمان ہی اور مقام خداشناسی مین جہل ہی جہل اور حیرت ہی حیرت عین معرفت ہی۔

روح کے متعلق میرے خیالات تھے کہ اُس کی حقیقت کما حقہ معلوم نہین ہوسکتی۔ عقلا، حکما اور فلاسفہ کے اقوال جتنے ہین سب ظنیات پر مبنی ہین اور باہم متضاد ہین اور اُن کا عجز اور اُن کے عجز کی حقیقت اُن کے کلام سے ظاہر ہی۔ اِس عجز معرفت روح کا بیان قرآن مجید مین قل الروح من امر ربی سے جس بلاغت سے کیا گیا ہی اس کی مثال کہین اور نہین ملتی۔ میرا خیال تھا کہ پیغمبر خدا نے کچھ علوم باطن شریعت ظاہری کے خلاف اپنے ان اصحاب کو سمجھائے تھے جنھین سمجھنے کی استعداد

تھی اور ممکن ہو کہ معارف روح بھی اِس تعلیم باطنی مین شامل ہون۔ لیکن تصانیف حضرت مجددؒ سے یہ معرفت مجھے حاصل ہوئی کہ حقیقت شریعت کے متعلق ایسے معارف شاید نہین ہین جو قرآن اور حدیث مین مذکور نہین ہوسے ہان یہ ضرور ہو کہ حقیقت شریعت کا سمجھنا استعداد سامعین پر منحصر ہو اور صحبت نبوی کو اس کے سمجھانے مین بڑا دخل تھا۔ اسی لیے طبقۂ اولی کے مسلمان طبقات مابعد کے مسلمانون سے افضل سمجھے جاتے ہین۔ اور اِس نعمت کے حصول کے لیے علما صلحا اور مشایخ کی صحبتین بھی جو صحبت نبی کا پرتو رکھتی ہین اکتساب علوم دین کے بعد ازبس ضروری ہین۔ مرید ہونا حصول صحبت کے لیے کافی نہین ہو۔ بلکہ صحبت سے فیضیاب ہونا ضروری ہو۔ اب مجھے شبہ پیدا ہوتا ہو کہ شاید ماہیت روح کی تعلیم صحبت نبوی مین بھی نہین ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مجھے اِس کا جہل ہو۔ اور ایک کا کشف دوسرے کے لیے سند نہین ہو۔ لیکن مجھے اِس مین شبہ نہین ہو کہ صفات وکیفیات روح کے متعلق اصحابؓ رسولؐ فیض صحبت نبیؐ سے بے انتہا معارف حاصل کرکے مالامال ہوگئے تھے۔ اور اُن کے ذریعہ سے مشایخ مابعد تک مسلسل یہ معارف پہونچتے رہے۔ صوفیا انھین معارف کے ذریعہ سے روح اور روحانیت سے بحث کرتے ہین۔ اور شریعت کے علاوہ شریعت کی حقیقت بیان کرتے ہین اور اِس حقیقت کے دریافت کرنے کے راستہ کا نام اُنھون نے طریقت حقیقت رکھا ہو۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ شریعت۔ حقیقت اور طریقت ان تینون کی اہمیت تکمیل اسلام مین تسلیم کرتے ہین لیکن حقیقت اور طریقت مین اتنا غلو کہ دامن شریعت چھوٹ جاسے وہ پسند نہین کرتے۔ طریقت کے راستون مین دیگر مشایخ سے کچھ کچھ فروعی اختلاف بھی وہ کرتے ہین۔ اور اپنے خاص انکشافات کو بھی کچھ دخل دیتے ہین۔ لیکن اِن باتون سے دیگر سلسلہ کے بعض مشایخ گو شروع مین مخالف تھے۔ مگر اصل حقیقت کے جاننے کے بعد مخالف نہین رہے۔

تقدیر الٰہی اور لوح محفوظ (مظہر تقدیر الٰہی) کا جیسا مین پہلے قائل تھا اب بھی قائل ہون۔ شروع سے میرا خیال تھا اور اب بھی ہو کہ قرآن مجید مین اِس کے متعلق متضاد احکام جو ہین وہ بظاہر تقدیر الٰہی کی حقیقت سمجھانے کے لیے نہین ہین بلکہ اِس لیے ہین کہ انسان کو وہ مقام رضا وتسلیم تک پہونچائین اور اِسطرح انسان کو دونون جہان کی مسرت عطا کرین اور باعث اس کے اطمینان قلب کے ہون۔ نفس مطمینہ کا حاصل ہونا بڑی نعمت ہو۔ تمام علماے شریعت اور صوفیون نے حقیقت قضا وقدر

بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ماحصل سب کا یہی سمجھا کہ مقام رضا و تسلیم تک پہونچانے کے لیے یہ اقوال مختلف استعداد والون کے لیے مختلف ذرایع ہین۔ مجدد صاحبؒ نے لکھا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہین ہوتا تو کوئی اُس قادر مطلق سے یہ نہین پوچھ سکتا کہ تونے یہ کیون کیا؟ ایسا سوال کرنا شان بندگی سے ازبس بعید ہے۔ دیگر اکابر کی تحریرون کا بھی یہی ماحصل ہے لیکن حضرت مجددؒ کی تحریر نے مجھ پر ایک خاص اثر ڈالا۔ شریعت اور طریقت دو جدا جدا چیزین نہین ہین لیکن ان کے اصطلاحات جدا جدا ہین۔ قاضی ثناءاللہ پانی پتی دونون علوم کے ماہر مشترکہ زبان بولتے ہین۔ شریعت والون کے لیے حقیقت اور طریقت کا سمجھنا آسان ہو جائے اِس لیے مین قاضی صاحبؒ کی ارشاد الطالبین سے کچھ اقتباس کرتا ہون:-

ایک اجنبی نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ خدا کی عبادت تو اس طرح کرے کہ گویا تو خدا کو دیکھتا ہے۔ اور اگر نہین دیکھتا تو یہ جان کہ وہ تجھے دیکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقاید اور اعمال کے سوا ایک کمال احسان بھی ہے اور اسی کمال کو اصطلاح صوفیہ مین ولایت کہتے ہین۔ صوفیون پر جب محبت الٰہی غالب ہوتی ہے تو اُسے وہ اپنی اصطلاح مین فنائے قلب کہتے ہین اور اُس وقت اُن کے دل اللہ کے سوا دوسری چیز کی طرف متوجہ نہین ہوتے۔ خدا کو دیکھنا عادۃً محال ہے لیکن صوفی پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ گویا وہ خدا کو دیکھتا ہے۔ حدیثون کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی محبت کرتا ہے اللہ اُس کی محبت کرتا ہے۔ اللہ جس کی محبت کرتا ہے اُس کا درجہ ولایت خاصہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اولیا بعد فنا کے معارف ذات بحت مین ترقی کرتے ہین اور پھر وہ عروج سے نیچے اُترتے ہین۔ لیکن اُن کی جو حالت فنا کے قبل تھی اُس تک یہ اُتر کر پھر واپس نہین آتے ورنہ محبت رائیگان ہو جائے۔

اولیا سے خرق عادات بھی ظہور مین آتے ہین۔ خرق عادت کی ایک قسم کشف بھی ہے۔ ایک کشف کشف کونی ہوتا ہے اِس کی مثال مین کتب سیر سے حضرت عمرؓ کا وہ کشف پیش کیا جاتا ہے جو حالت خطبہ مین مقام مدینہ ایک موقع پر ایک جنگ کے افسر حضرت ساریہؓ سے آپ نے کہا "کہ پہاڑ کی طرف سے ہوشیار رہو" حالانکہ وہ مقام مدینہ سے بہت دور تھا۔ کشفی نظر سے عالم مثال مین دیکھنا کشف کی دوسری قسم ہے۔ اسی کو الہام بھی کہتے ہین۔ الہام اور وسوسے مین یہ فرق ہے کہ الہام سے صوفی کا قلب سلیم

اطمینان حاصل کرتا ہے اور وسوسہ نا قابل اعتبار ہوتا ہے۔ اولیا کا کشف یا الہام پھر بھی ظنی ہے۔ دو شخصون کا کوئی کشف باہم متفق ہو جائے تو ظن غالب مین اس کا شمار ہوتا ہے۔ اولیار کے کشف مین خطا بھی ہوتی ہے۔ وہی کشف لایق قبولیت ہے جو شرع کے مخالف نہو۔ صاحب صحو کا کشف صاحب سُکر کے کشف سے اولی ہے۔ خرق عادت ولایت کے لوازم سے نہین ہے۔ بہت سے صحابہؓ ہین۔ جن سے خرق عادات مروی نہین ہے۔ لیکن ادنی اصحابؓ بھی اُن اولیاؒ سے افضل ہین جن سے خوارق بہت سے مروی ہین۔ ثواب کا تعلق صرف عبادت اور قرب آلہی سے ہے۔ اسی لیے محدثین نے اصحابؓ رسول صلعم کے کرامات مناقب مین درج نہین کیے ہین بلکہ کرامات کا ذکر معجزات کے بعد رکھا ہے۔

ولی کی علامت یہ ہے کہ ظاہراً شرع شریف کا پورا پابند ہو۔ کیونکہ اللہ تعالی فرماتا ہے "ان اولیاءہ الا المتقون" یعنی نہین ہین خدا کے اولیا مگر متقی لوگ۔ حدیث مین آیا ہے کہ اولیار اللہ کی علامت یہ ہے کہ اُن کی زیارت سے خدا یاد آئے۔

مقام قرب تقوی سے قرب آلہی حاصل ہوتا ہے۔ تقوی یہ ہے کہ کوئی امر عقائد و اخلاق سے متعلق خدا تعالی کی مرضی کے خلاف واقع نہو۔ کمال تقوی بغیر ولایت کے ممکن نہین ہے۔ اس لیے طلب طریقت اور حصول کمال باطنی کے لیے کوشش کرنا واجب ہے اور علم باطن مین اضافہ چاہنا فرض ہے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے "وقل رب زدنی علما" یعنی کہہ اے محمد! کہ اے پروردگار میرا علم بڑھا دے"۔ معلوم ہوا کہ مراتب قرب سے قناعت کرنا جسطرح ناقصون پر حرام ہے کاملون پر بھی حرام ہے۔

جب کمالات باطن کا طلب کرنا واجبات سے ہے۔ تو ایسے پیر کا تلاش کرنا ضروری ہوا جو کامل بھی ہو اور کامل بنا دینے والا بھی ہو۔ اگر کوئی شخص شیخ کی خدمت مین مدت تک حسن اعتقاد سے رہا۔ اور اُس کی صحبت مین تاثیر نہین پائی تو اُس پر واجب ہے کہ اُسے چھوڑ کر دوسرے شیخ کو تلاش کرے۔

اولیا کو علم غیب نہین ہوتا۔ ہان بعض غائب چیزون کے متعلق خرق عادات کے طور پر کشف یا الہام سے انھین کچھ علم دیا جاتا ہے۔ یہ کہنا کفر ہے کہ اولیا کو غیب کا علم ہے

اولیا معدوم کو پیدا کرنے یا موجود کو نابود کرنے پر قادر نہین ہین۔ پیدا کرنے۔ نابود کرنے۔

رزق پہونچانے۔ اولاد دینے۔ بلا دور کرنے مرض سے شفا بخشنے وغیرہ کے لیے مدد طلب کرنا کفر ہی۔

دعا ایک عبادت ہی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ "الدعا ھو العبادۃ" مثلاً یہ کہنا "یا شیخ عبدالقادر جیلانی! شیئاً للّٰہ" جائز نہین ہی بلکہ شرک و کفر ہی۔ ہان یہ کہنا جائز ہی کہ اے اللہ بحرمت شیخ عبدالقادر جیلانی میری حاجت روا کر۔

کسی ولی یا آنحضرت محمدؐ کا بھی ذکر خلاف شرع کرنا جائز نہین ہی۔ مثلاً بجائے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے یا محمد یا محمد کہنا جائز نہین ہی۔

شرعی پابندی سے کوئی ولی یا نبی مستثنیٰ نہین ہی۔ مگر وہ مجذوب جو بالکل عقل نہین رکھتا اُس پر شرعی پابندیان ساقط ہین۔

عصمت یعنی تقصیر سے پاک ہونا ابنیا کا خاصہ ہی۔ عصمت سے مراد ہی صغیرہ و کبیرہ گناہ کا عمداً یا سہواً سرزد ہونا۔ ابنیا مین فطور عقل ہونا۔ غفلت کا ہونا بہکی بہکی باتین کرنا یا نشہ مین ہونا ممکن نہین ہی۔ لیکن ابنیا کے سوا کسی اور سے عصمت کو منسوب کرنا خلاف اجماع ہی۔

صحابہؓ اولیاے اُمت سے افضل ہین۔

اولیا کی قبرون کا بلند کرنا۔ ان پر گنبد تعمیر کرنا۔ عرس وغیرہ رسوم کا کرنا اور چراغان کرنا یہ سب بدعت ہین۔ ان مین سے بعض حرام ہین اور بعض مکروہ ہین۔ حدیث مین آیا ہی کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہی کہ میری قبر کو عید اور مسجد نہ بنانا۔

قبرون کے پاس جاکر یہ کہنا سنت ہی۔ "السلام علیکم اے قبرون مین رہنے والے مومنو اور مسلمو! انشاء اللہ ہم بھی تمھارے پاس آنے والے ہین۔ ہم اللہ سے اپنے لیے اور تمھارے لیے عافیت چاہتے ہین۔"

پیغمبر خدا صلعم اور اولیاے کرام کے مقابر کی زیارت کرنے کا مستحب طریقہ یہ ہی کہ طہارت کاملہ کے ساتھ درود شریف پڑھے اور اپنے کسی عمل صالح کا جو خالص نیت سے کیا گیا ہو ثواب بخشے۔ صاحب نسبت کو صاحب قبر سے فیض حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرنا جائز ہی۔ اگر کوئی کامل کسی دوسرے کو اپنے آپ سے زیادہ کامل دیکھے تو چاہیے کہ اُس سے فیض حاصل کرے۔ بلکہ کم درجے والے مین بھی کوئی خصوصیت یا خوبی دیکھے تو اُس سے بھی حاصل کرے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے حاصل کیا تھا۔

اولیا کو جائز ہی کہ جو انعامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر قرب الٰہی کے متعلق ہون اُنھین ظاہر

کرین۔ حدیث مین کہ ہر خدا کی دی ہوئی نعمت کا ذکر کرنا بھی شکر ہر۔ غوث الثقلین کے قصائد، مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور شیخ اکبر کے تصانیف ان شکرون سے بہ ہین۔

قرب الٰہی کا موجب جذب لعینی خدا کا اپنے بندے کو اپنی طرف کھینچنا ہر۔ یہ جذب کبھی بواسطہ ہوتا ہر تو اُسے اجتبا کہتے ہین اور اگر با واسطہ ہو تو عبادت یا کسی کامل کی صحبت واسطہ ہوتی ہر۔ جو جذب عبادت کے ذریعہ سے ہو اُسے ثمرۂ عبادت کہتے ہین۔ جو بذریعہ صحبت ہو اُسے تاثیر شیخ کہتے ہین۔ غرضکہ ناقصون کو کسب لعینی عبادات و ریاضات اور جذب کے لیے شیخ کامل لعینی صحبت شیخ کامل کی ضرورت ہر۔ جذب کے قبل سلوک شروع ہوتا ہر اسی لیے سلوک کو جذب پر اکثر اولیا مقدم جانتے ہین۔

سالک مجذوب کی ابتدائی سیر۔ سیر آفاقی کہلاتی ہر۔ اس سیر کے لطائف مین انوار ظاہر ہوتے ہین۔ قلب کو نور زرد۔ روح کو نور سرخ۔ سر کو نور سیاہ۔ خفی کو نور سپید اور اخفی کو نور سبز کہتے ہین۔ یہ سیر دور دراز ہوتی ہر۔ انتہاے سیر کے قبل اگر صوفی مرگیا تو ناکام رہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خواجہ نقشبند کو سلوک پر جذب کے مقدم کرنے کا الہام فرمایا۔ اس سلسلے کے مشائخ مرید کو اول توجہ کے ذریعہ سے لطائف عالم امر مین ذکر کا القا کرتے ہین۔ یہانتک کہ قلب۔ روح۔ سر۔ خفی اور اخفی اپنے اصول مین فانی ہوجاتے ہین۔ اس سیر کو سیر انفسی کہتے ہین۔ اور اُسی سیر انفسی کے ضمن مین سیر آفاقی بھی حاصل ہوجاتی ہر۔ اس سالک کو مجذوب سالک اور سیر کو اندراج النہایت فی البدایت کہتے ہین۔

بعض اکابر یہ فرماتے ہین کہ جس عبادت مین محنت اور مشقت ہو وہ عبادت رذائل نفس کے دور کرنے مین پوری تاثیر رکھتی ہر۔ اسی لیے ذکر جہر چلّے اور خلوت وغیرہ دیگر امور نکالے گئے ہین اور برخلاف اسکے حضرت خواجہ نقشبندؒ فرماتے ہین کہ جو عبادت سنت کے موافق ہر وہی نفس کی برائیون کو دور اور تصفیہ عناصر اور حصول قرب الٰہی کے لیے زیادہ مفید ہر اور اسی لیے وہ بدعت حسنہ سے بھی بدعت سیئہ کی طرح بچتے ہین۔

جذب مطلق جسے اجتبا کہتے ہین عوام کے حق مین متصور نہین ہر۔ مگر ایسے شخص کے توسط سے یہ درجہ حاصل ہوسکتا ہر جو باطن مین خدا سے اور ظاہر مین بندون سے مناسبت رکھتا ہر۔ یہ درجہ رسول کا تھا یا اب نائب رسول کا ہر۔ علماے ظاہر و باطن انبیا کے وارث ہین۔

بعض قوی استعداد والے بھی پیغمبر یا کسی ولی کی روح سے فیض حاصل کرکے درجۂ ولایت تک

پہونچ جاتے ہین۔ اُن کو اویسی کہتے ہین۔ کیونکہ حضرت اویس رضؓ قرنی نے بغیر شرف صحبت حاصل کیے ہوے آنحضرت صؐ سے فیض حاصل کیا تھا۔

جذب مطلق یعنی اجتبا جیسا کہ ابنیا کو سید فیاض کے ساتھ مناسبت رکھنے کے باعث حاصل ہی ویسا ہی اولیا کو بھی درجہ اخیر مین حاصل ہو سکتا ہی۔ ولی حب رسولؐ کی متابعت سے مقام محبوبیت تک پہونچکر محبوب خدا ہو جاتا ہی تو اسکے بعد جو ترقیان ہوتی ہین انھین سیر مرادی کہتے ہین۔

کبھی اس جذب مطلق یعنی درجہ اجتبا کے حاصل ہونے کے بعد پیر سے مرید افضل ہو جاتا ہی لیکن شیخ کا حق تربیت اسکی گردن پر برابر رہتا ہی۔

جاننا چاہیے کہ برکات عبادات سے قوت وسعت اور قربیت حاصل ہوتی ہی۔ لیکن اس طرح سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک یعنی ولایت صغری سے ولایت کبری پھر ولایت علیا اور پھر کمالات نبوت تک درجہ بدرجہ ترقی نہین ہوتی۔

ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپور

کاش رتبہ اپنے مالک کا مین یون پہچانتا

غوث اعظم نے یہ فرمایا کسی دن وقت پند　　نکتۂ موزون سراپا خیر و برکت دلپسند
ایک دولتمند مالک نے خریدا اک غلام　　باتمیز و بردبار و پاکباز و نیک نام
دیکھکر مالک اُسے دل مین نہایت خوش ہوا　　اسکو پھر عزت سے گھر لاکر کیا شکر خدا
اور پوچھا اے غلام نیک تو کیا کھائیگا　　عرض کی اُس نے کہ تو جو کچھ مجھے کھلوائے گا
اُس نے پوچھا کون سا پانی تجھے مطلوب ہے　　عرض کی جو تو پلائے مجھکو وہ مرغوب ہے
اُس نے پھر پوچھا تجھے درکار ہے کیسا لباس　　عرض کی اُس نے پنھائے تو مجھے جیسا لباس
اُس نے پوچھا اور کیا سامان ہو تیرے لیے　　عرض کی اُس نے تری مرضی جو ہو میرے لیے
اُس نے پوچھا کس جگہ گھر مین کریگا تو قیام　　عرض کی اُس نے جہان تو حکم دے اے نیکنام

اُس کی باتین سُن کے مالک رو کے یہ کہنے لگا
"کاش رتبہ اپنے مالک کا مین یون پہچانتا"

حکیم جگر صدیقی زمیندار سیوان

حضرت مخدوم الملک

شمس العلما نواب سید امداد امام صاحب نے بہار ریسرچ سوسائٹی جرنل مین یہ مضمون شایع کرایا تھا جسکا ترجمہ اردو دان اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے نذر الناظر ہے

مترجم

آپ کا نام احمد تھا۔ آپ کی پیدائش چھ سو باسٹھ (۶۶۲) ہجری مین ہوئی تھی اور آپ کی جاے پیدائش منیر ہے۔ یہ آپ کے والد کی خاندانی جگہ تھی۔ جس وقت آپ پیدا ہوے تھے اُس وقت دہلی کے تخت پر شہنشاہ نصیر الدین ولد سلطان شمس الدین التمش تخت نشین تھے اور بغداد مین حاکم خلافت کرتے تھے۔ یہ سب بادشاہ گذر گئے لیکن آج اُن کا نام کسی کی زبان پر نہین ہے اور مخدوم الملک آج بھی زندہ ہین اور اُس وقت تک زندہ رہین گے جب تک اسلام کے ماننے والے صوبہ بہار مین موجود ہین۔ آپ کا نام صرف بہار ہی مین محدود نہین ہے بلکہ ہندوستان کے بعید ترین گوشون مین جہان کہین بھی مسلمان رہتے ہون آپ کا نام لیا جاتا ہے۔

آپ کے آبا و اجداد مخدوم الملک اپنے والد کی طرف سے شیخ تھے۔ آپ کے والد اپنے خاندانی سلسلہ کو حضرت عبد المطلب سے ملاتے ہین۔ آپ کی والدہ ایک سیدانی تھین اور اُن کا نام بی بی رضیہ تھا۔ حضرت کے آبا و اجداد مین پہلے شخص جو ہندوستان مین آے اُن کا نام تاج فقیہہ تھا۔ یہ بہت بڑے فقیہ گذرے ہین۔ آپ ہی نے منیر مین قیام فرمایا۔ اور اسی وجہ سے یہ جگہ بہت مشہور ہو گئی۔ اور یہان علم اور ریاضت کی پیاس بجھانے کے لیے دور دور سے شائقین فن آنے لگے۔ آپ ہی کی اولاد مین مخدوم شیخ پیدا ہوے جن کی شادی پیر جگ جوت کی لڑکی سے ہوئی۔ اُن سے چار بیٹے ہوے۔ حضرت مخدوم الملک بہاری انھین کے صاحبزادے تھے۔

آپ کی تعلیم آپ کی ابتدائی تعلیم منیر ہی مین ہوئی تھی اور آپ کے استاد شیخ شرف الدین ابو توامہ ہین۔ اتفاقاً شیخ مخدوم کسی سیاسی پیچیدگی کی وجہ سے دہلی چھوڑ کر بنگال جا رہے تھے اور اثناے سفر مین آپ کا قیام مخدوم الملک کے والد کے یہان ہو گیا تھا۔ اُسی دوران قیام مین مخدوم الملک کو اُن سے شناسائی

ہوگئی اور جب شیخ شرف الدین منیر سے سونر گاؤں کی طرف چلے تو مخدوم الملک بھی ساتھ ہو لیے۔ اپنے طالبعلی کے بارہ برس سونر گانوں مین بسر کئے اور یہین عربی کی پوری تعلیم کی تکمیل ہوگئی۔

آپ کی شادی اور منیر کی طرف مراجعت | آپ نے اپنے دوران قیام مین شیخ شرف الدین ابوتوامہ کی صاحبزادی سے شادی کرلی تھی۔ اس شادی سے آپ کے تین لڑکے ہوئے۔ زندہ صرف ایک ذکی الدین رہے جب مخدوم الملک کو معلوم ہوا کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا ہے تو انھون نے فوراً منیر کی طرف مراجعت کی۔ آپ کی اہلیہ کا بھی انتقال ہوچکا تھا اس لیے صرف ذکی الدین کو ساتھ لے لیا۔ آپ نے منیر مین پہونچکر چند مہینون تک اپنی والدہ کی خدمت کی اُس کے بعد والدہ کی اجازت سے پیر کی تلاش مین روانہ ہوے۔

بیعت | مخدوم الملک دہلی روانہ ہوے اور وہان اپنے تئین نظام الدین اولیا کی خدمت مین پیش کیا لیکن حضرت نے مخدوم الملک کو بیعت مین لینے سے انکار کردیا۔ اسکے بعد مخدوم الملک شاہ شرف الدین کے یہان پانی پت گئے لیکن وہان بھی ناکامیابی ہوئی۔ اس دوسری ناکامیابی نے آپ کو نہایت دل شکستہ کردیا تھا آپ اسی حالت مین تھے کہ آپ کے بڑے بھائی نے آپ کو دہلی جانے کی ہدایت کی تاکہ حضرت نجیب الدین فردوسی سے بیعت حاصل کرنے کے لیے کوشش کرین۔ یہان آپ کو کامیابی ہوئی اور آپ حضرت فردوسی کے مرید ہوگئے۔

آپ کی ریاضت | حضرت مخدوم الملک نے دہلی سے واپس آکر اپنے صوبہ مین اقامت اختیار کرنا چاہی لیکن آپ مین تصوف کا ولولہ اسقدر موجزن تھا کہ جب آپ بھیا کے جنگل مین جو ضلع شاہ آباد مین ہے پہونچے تو آپ پر ایک زبردست بیخودی طاری ہوئی اور اپنے بھائی جلال الدین سے علٰحدہ ہوکر آپ نے جنگل کی راہ لی۔ کہا جاتا ہے کہ بھیا کے جنگل مین آپ پر یہ کیفیت مسلسل طاری رہی۔ اُسکے بعد آپ راجگیر کے پہاڑون پر گئے اور جنگلون مین گھوما کیے۔ اس زمانہ کے بہت سے کرامات کے قصے زبان زد خلایق ہو رہے ہین۔ جب یہ دور ختم ہوا تو آپ نے راجگیر پہاڑ پر جانا کم کردیا۔

بہار کی اقامت اور وعظ و پند کا سلسلہ | بہار شریف مین آپ اکسٹھ [61] برس مقیم رہے اور روزانہ آپ کا معمول یہ تھا کہ عربی علوم و فنون مین درس و تدریس کیا کرتے۔ علم کی پیاس خود آپ کی بھی کم نہ ہوئی۔ تصوف آپ کا اصل میدان تھا۔ اور اُسی علم مین آپ سارے عالم اسلامی مین نہایت عزت کی نگاہون سے دیکھے

جانتے تھے۔ آپ کا علم آپ کی پاکیزگی، آپ کا اخلاق حمیدہ اور تمام دنیا سے روگشی ایسی تھی جس نے حق کے متلاشیون کو تمام عالم اسلامی مین آپ کا گرویدہ کر لیا تھا۔ آپ کے مریدون کی تعداد بہت تھی۔ حضرت جولائی اور مولانا مظفر بلخی آج تک نہایت عزت کی نگاہون سے دیکھے جاتے ہین۔

آپ کا تصوف باوجود صوفی ہونے کے آپ خدا کو خدا اور انسان کو انسان بتاتے رہے اور آخیر زندگی تک آپ وحدانیت کے اصل الاصول سے علٰحدہ نہین ہوے۔

آپ کا علم وفضل | مخدوم الملک اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے، چنانچہ ان کی کتابین آج بھی شہادت دیتی ہین اور علاوہ دیگر علوم کے فلسفہ کے بھی ماہر تھے۔ ارسطو کے فلسفہ سے آپ کو پوری واقفیت تھی۔ مذہبی عقاید مین آپ پر ابن سینا کے فلسفہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ آپ اسلام کی وحدانیت کے سب سے بڑے موید گذرے ہین۔

انتقال | آپ کا وصال ۷۸۲ھ ہجری مین ہوا اور اُس وقت آپ کا سن شریف ایک سو اکیس (۱۲۱) سال ماہ قمری کے حساب سے ہو چکا تھا۔

سید محمود شبیر بی اے

لہ کوئی صوفی خدا کو انسان اور انسان کو خدا نہین مانتا۔ اور جو مانے وہ صوفی نہین بلکہ مجنون کہا جائے گا۔ اڈیٹر

—— ⁎ ⁎ ——

بس اک اشک دم آخر مین دنیا نے فغان کہدی | اسی اک لفظ مین دل نے کتاب داستان کہدی
سکون یاس مین بھی ہر وہی انداز بیتابی | یہ کس نے دل کے ہر ذرے مین اک برق تپان کہدی
ہمین تو بیخودی عشق مین مقصود تھا سجدہ | یہان یہ ہوش تھا کسکو کہ پیشانی کہان کہدی
فسانہ ہو چکا تھا عہد دشمن تو نے اے صیاد | نظر کے سامنے کیون لا کے خاک آشیان کہدی
مری اس لغزش مستانہ پر ہشیاریان صدقے | جبین شوق بہر سجدۂ پیر مغان کہدی
بہار آتے ہی آتے اس جنون فتنہ سامان نے | ہر اک گوشہ کے دل مین وسعت کون و مکان کہدی

رہ الفت مین ثاقب بخته کاری کا یہ عالم تھا
نہ اُٹھی عمر بھر اُس در سے پیشانی جہان کہدی

سید ابو محمد ثاقب (ناظم بزم ادب کانپور)

بشاشت

مین ہمیشہ خوشی پر بشاشت کو ترجیح دیتا ہون۔ مین اول الذکر کو ایک فعل اور موخرالذکر کو خصلت طبعی خیال کرتا ہون۔ خوشی ایک فعل ہوتا ہی اور بشاشت مستقل اور دائمی ہوتی ہی جن لوگون کو اکثر انتہائی خوشی ہوتی ہی انھین لوگون کو اُسی نسبت سے غم مین بھی مبتلا ہونا پڑتا ہی۔ برخلاف اسکے بشاش رہنے سے گو ہم کو وہ بات نصیب نہین ہوتی جو خوشی سے حاصل ہوتی ہی مگر ایک بڑا فائدہ یہ ہی کہ ہم غم کے گڑھے مین گرنے سے بچ جاتے ہین۔ خوشی بجلی کی چمک کے مانند ہوتی ہی جو ذرا سی دیر کے لیے بادلون مین چمک کر غائب ہو جاتی ہی۔ بشاش رہنے سے دماغ مین ایک قسم کی پائدار روشنی قائم رہتی ہی اور ہم مستعد اور ہمیشہ متین رہتے ہین۔

وہ لوگ جو اُسولون کی سختی سے پابندی کرتے ہین خوشی کو آزمائش کی حالت کا سخت ترین موقع سمجھتے ہین اس وجہ سے کہ خوشی کے وقت انسان کے دل مین ایک قسم کا جوش اور ایک خاص قسم کی شوخی پیدا ہو جاتی ہی اس لیے یہ حالت زندگی کی اُس حالت سے مختلف ہوتی ہی جسمین ہر لحظہ بڑے سے بڑے خطرہ مین مبتلا ہو جانے کا خدشہ لگا رہتا ہی۔

بشاش رہنے کے لیے ان اقسام کی ذمہ داریون مین سے کوئی استثنا نہین ہی۔ یہ سنجیدگی اور اطمینان کی قسمون مین سے ایک قسم ہی۔ یہ طبیعت کو انسانیت کی موجودہ اطمینانی حالت سے نامناسب حالت کی طرف بھٹکنے نہین دیتی اور اُن لوگون کے کیرکٹرون مین یہ ایک ضروری چیز سمجھی جاتی ہے جو بُت پرستون مین فیلسوف مانے جاتے ہین اور اُن لوگون کے لیے بھی یہ ایک معروف چیز ہی جنھون نے عیسائیت مین بزرگی اور پارسائی کا رتبہ پایا ہی۔

اگر ہم بشاش رہنے کے مسئلہ پر تین نسبتون سے غور کرین یعنی اپنی نسبت، دوسرون کی نسبت جن سے ہم بات چیت کرتے ہین اور اللہ عزوجل کی نسبت تو یہ مسئلہ اِن تینون نسبتون مین سے ہر ایک پر پورا اُترتا ہی۔ ایک شخص جسکو اعلیٰ درجہ کی طبیعت عطا ہوئی ہی اُس کے خیالات صرف اعلیٰ ہی نہین ہوتے بلکہ اُسکو اپنی روح کے تمام شعبون کی قوتون پر کامل قدرت حاصل ہوتی ہے،

اُس کا تخیل سلجھا ہوا ہوتا ہی اور اُس کا فیصلہ ناقابل تنسیخ۔ اُس کے مزاج مین یکسانیت اور توزان پایا جاتا ہی یہ سب باتین اُس مین ہر وقت پائی جاتی ہین خواہ وہ مصروف ہو یا تنہا۔ قدرت نے جو نیک کام اُس کے لیے بنائے ہین وہ اُن کو ضرور کرتا ہی ہر جائز خوشی سے فائدہ اُٹھاتا ہی اور اُن غمون سے جنمین اتفاقی طور پر وہ مبتلا ہو جائے اپنے آپ کو زیادہ متاثر نہین ہونے دیتا۔

اگر ہم اُس شخص کو اُن لوگون کے زمرہ مین شمار کرین جن سے وہ بات چیت کرتا ہی تو معلوم ہوگا کہ اُس سے لوگون کو قدرتی محبت پیدا ہو جاتی ہی اور لوگ اُس کی نسبت اچھی رائے قائم کرتے ہین۔ بشاش رہنے والا شخص صرف صاحب مروت اور ممنون ہونے والا ہی نہین ہوتا بلکہ جن لوگون سے وہ گفتگو کرتا ہی اُن کو بھی اپنا ہی جیسا بنا لیتا ہی۔ ایک شخص اپنے آپ کو بہت خوش پاتا ہی اُسے یہ نہین معلوم ہوتا کہ اس کا سبب کیا ہی مگر اس کا سبب اُس کے ساتھی کا بشاش رہنا ہی۔ بشاشت ایک قسم کی اچانک روشنی ہوتی ہی جو طبیعت مین پوشیدہ خوشی کو نامعلوم طریقے سے پیدا کر دیتی ہی۔ دل خود بخود خوشی سے لبریز ہو جاتا ہی اور قدرتی طور سے دوستی اور خیر خواہی کے لیے اُن لوگون کی طرف بڑھتا ہی جنھون نے اُس پر ایسا اثر ڈالا ہو۔

جب مین بشاش رہنے کے مسئلہ کی تیسری نسبت پر غور کرتا ہون تو دل یہ چاہتا ہی کہ مین قدرت کی مسلسل شکر گذاری مین جیسا کہ کرنا چاہیے مصروف رہون۔ اندرونی طور سے بشاش رہنا ہی قدرت کی مکمل عبادت اور شکر گذاری مین داخل ہی ہم کسی حالت مین بھی ہون مگر اس سے ایک قسم کی تسلیم و رضا ظاہر ہوتی ہی اور اس طریقہ سے گویا انسان پوشیدہ طور سے قدرت کی رضا جوئی کرتا رہتا ہی۔

میری رائے مین صرف دو چیزین ایسی ہین جو یقیناً ہم کو بشاش رہنے سے محروم کر دیتی ہین ایک ان مین سے ایک گناہ کی طرف مائل ہونا ہی۔ وہ شخص جسکا میلان بدی کی طرف ہوتا ہی اُس کو سکون اور اطمینان قلب نصیب نہین ہوتا جس پر روح کی صحت کا انحصار ہی اور جو نیکی اور معصومیت کا قدرتی وسیلہ ہی۔ بدکار آدمی سے بشاشت کوسون دور رہتی ہی۔ اگر بدکار آدمی کے لیے بشاشت کے مرادف کوئی لفظ زبان مین ڈھونڈھا جائے تو نہین مل سکتا بلکہ ایسا لفظ تلاش کرنا چاہیے جو سیکڑون درجہ حماقت یا دیوانگی سے بڑھا چڑھا ہو۔

دہریت یعنی خدا کی ہستی سے انکار کرنا۔ یہ بات بھی ایسی ہی جس سے انسان بشاش رہنے سے بالکل محروم ہو جاتا ہی۔ خدا کی ہستی کو نہ ماننا فطرت انسانی کے لیے ایک ایسا خاص قسم کا سخت ترین جرم ہی

جس کی تشریح ناممکن ہر بلکہ حیرت ہوتی ہی کہ بظاہر بڑے بڑے سمجھدار لوگون کے دل مین اس قسم کے خیالات کیونکر پیدا ہو جاتے ہین یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہر کہ خدا کی ہستی ایک ایسی ہستی ہر جس کے متعلق ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہین ہر اور صرف یہ ہی ایک ایسی برحق ہستی ہر جسپر ہم کو یقین واثق رکھنا چاہیے - یہ ہی حقیقت مین وہ ہستی ہر جسکا پر تو ہم ہر چیز مین ہر واقعہ مین اور ہر خیال مین پاتے ہین اگر ہم خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے گروہ کے ہر فرد کے کیرکٹر کو غور بین نگاہون سے دیکھین تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ ہر شخص غرور، غصہ اور بات بات پر نکتہ چینی کے خمیر سے بنا ہوا ہر - دراصل یہ تعجب کی بات نہین ہی اگر لوگ کسی قسم کی اندرونی بے چینی رکھتے ہون تو ایسا دوسرون کے ساتھ کیون ہو اور ایسے شخص کے لیے جس کی ہستی ہر وقت خطرہ مین رہتی ہی، یہ کس طرح ممکن ہر کہ وہ خود اسقدر بے چین نہ ہو - ایسے شخص سے کسی کو کوئی نفع بھی نہین پہونچتا -

بدکار اور خدا کی ہستی کے منکر اگر بشاش رہنے کے لیے نامعقول جد و جہد بھی کرین تو یقین مانیے کہ اُن کو اس کا شائبہ تک نصیب نہین ہو سکتا - وہ لوگ جو اسی سبب سے عذاب، بربادی اور بدبختی مین مبتلا رہتے ہین اُن کے لیے یہ ناممکن ہر کہ وہ کسی حالت مین خوش رہ سکین اور دنیا کی لذتون سے فائدہ اُٹھا سکین -

دو بڑے اصول جو بیان کیے گئے ہین یہ فطرتاً اور اصولاً بشاش رہنے کے منافی ہین - انکے بعد مین کسی اور دوسری چیز کو ان کے مماثل نہین سمجھتا جو بدکار آدمی کے دل سے اس عجیب وغریب چیز کو نکال سکین - دکھ درد، شرم، ملامت، افلاس اور ضعیفی، یہ ہی نہین بلکہ خود موت کا بھی اگر خیال کیا جاے اور ان سب چیزون کے قیام کے انحصار پر غور کیا جاے اور ان سے جو نفع یا نقصان پیدا ہوتا ہی اُسپر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب چیزین بھی برائی کے نام سے موسوم کیے جانے کی مستحق نہین ہو سکتین - اچھی سمجھ رکھنے والا آدمی ان سب باتون کو صبر وشکر، حلم و بردباری سے اور ہشاش بشاش رہ کر برداشت کرے گا - سمندر کا خطرناک سے خطرناک طوفان بھی اُس کو مایوس نہین کر سکتا اسوجہ سے کہ وہ جہاز مین اطمینان سے بیٹھا ہوا ایک خوشگوار بندرگاہ پر پہونچنے کے لیے قدرت سے لو لگائے ہوے ہر اور اُسکے ساتھ یقین کامل بھی رکھتا ہر -

ایک شخص جو قدرت کی مشیت پر صحیح اُصولون پر کاربند رہ کر چلتا ہر اُس کے لیے بشاش رہنے کے

دوامی ذرایع اپنی آغوش کھولے رہتے ہین. ایک یہ ہو کہ وہ اپنی ناچیز ہستی پر غور وخوض کرتا رہے اور دوسرے یہ کہ اللہ عزوجل کی عبودیت کا ہر حالت مین اقرار کرتا رہے اگر اپنی ہستی پر غور کیا جائے تو ہمکو اس بات سے حقیقی مسرت ہوگی کہ جو ہستی قدرت نے ہم کو عطا کی ہو وہ لاتعداد ہستیون کے گذر جانے کے بعد بھی ایک نئی ہستی ہو جب اس کی ابتدا اور انتہا پر غور کیا جاتا ہو اور دوسرے شعبون پر نظر غائر ڈالی جاتی ہو کہ اپنی ابتدا سے چند ہی سال مین اُنھون نے کسی قدر حیرت انگیز ترقی کی ہو اور یہ ترقی اُن شعبون کی تکمیل کا باعث ہوگی اور اس تکمیل سے خوشیون مین اضافہ ہوگا تو خدا کی شکر گذاری اور اپنے لیے مبارکباد کے بےانتہا جذبات دلمین خود بخود پیدا ہو جاتے ہین. راست باز آدمی کو اس قسم کی آہ ہی سے دائمی روحی مسرت ہوتی ہو اور یہ باتین اُس کو ہر لمحہ خوش وخرم رکھتی ہین مگر اُس کو یہ علم ہونے نہین پاتا کہ وہ کیون اس قدر خوش وخرم رہتا ہو۔

سمجھدار آدمی کے لیے بشاش رہنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہو کہ اللہ عزوجل کا خیال دل مین رکھے. یہ وہ بزرگ وبرتر ہستی ہو جسکی صرف ادنی سی جھلک کا گو دنیا وما فیہا ایک کرشمہ ہو اور یہ اُس کے نزدیک بالکل معمولی بات ہو مگر ہم کو یہ سب باتین کسقدر شاندار، پرشوکت اور ہر دل عزیز معلوم ہوتی ہین خالق اکبر ہم کو ہر جگہ اپنی عنایتون سے سرفراز کرتا رہتا ہو اور یہی چاہتا ہو کہ ہم کو ہر طریقے سے خوش وخرم رکھے اور اُسکی برتری، سچائی اور مشیت یہ ہی چاہتی رہتی ہو کہ اُن لوگون کو جو اُس سے نیکی کی توفیق چاہتے ہین ہمیشہ شادان وفرحان رکھے۔

یہانتک جو بیان ہوا ہو اس مین بشاشت کے متعلق انسان کی طبعی خصلت پر غور کیا گیا ہو اور ساتھ ہی اس کے ایسے اسباب بیان کیے گئے ہین جن پر انسان اگر کاربند رہے تو ہشاش بشاش رہ کر اپنی روح کو تروتازہ اور زندہ رکھ سکتا ہو. اچھا! آؤ اب بشاشت کی فطری حالت پر غور کرین اور ان اسباب پر روشنی ڈالین جن کا اچھائی بُرائی سے کوئی تعلق نہین ہو۔

بشاشت کا سب سے پہلا کام یہ ہو کہ انسان کی صحت کو ترقی دیتی ہو. برخلاف اس کے کُڑھن اور اندرونی رنج وغم دل ودماغ کے اعضائے رئیسہ کے ریشون کو نامعلوم طریقے سے صدمہ پہونچاتے رہتے ہین اور اس صدمہ سے جسم کی مشین کو بتدریج نقصان پہونچتا رہتا ہو! اسکے علاوہ ان چیزون سے خون مین ایک قسم کا تیز تلاطم اور حیوانی جذبات مین جو اُرکاوٹین پیدا ہوتی رہتی ہین اُن کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہو۔

میری نظر سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا بڈھا آدمی گذرا ہوگا جسکے چہرہ پر بشاشت ہو اور طبیعت مین کسی حد تک لاپروائی سی نہ ہو یعنی اگر اُسمین بشاشت نہوگی تو کم از کم اُس کی طبیعت مین لاپروائی تو ضرور ہوگی۔ واقعہ یہ ہو کہ صحت اور بشاشت اس فرق کے ساتھ ایک دوسرے سے پیدا ہوتے رہتے ہین اگر ہم بشاش نہ رہتے ہون تو ہم کو اچھی صحت کا درجہ شاذ ہی نصیب ہو سکتا ہو لیکن ہم بیشتر یہ دیکھتے ہین کہ جن لوگون کی صحت اچھے حال مین نہین ہوتی وہ بھی اکثر بشاش بشاش رہتے ہین۔

بشاشت کا جیسا گہرا تعلق جسم سے ہو ویسا ہی طبیعت سے بھی ہو۔ یہ تمام تفکرات اور پریشانیٔن کو رفع کرتی ہو، غصے کے خذبات کو ٹھنڈا کرتی ہو اور روح کو دائمی حالت سکون مین رکھتی ہو لیکن اس آخری خیال کے متعلق کہنے سے پہلے مین یہ کہون گا کہ جس دنیا مین ہم پیدا کیے گئے ہین اُس مین ایسی چیزین بیشمار موجود ہین جن سے ہم اپنی طبیعت کو خوش و خرم رکھ سکتے ہین۔

اگر ہم خیال کرین کہ دنیا انسان کے قبضہ مین ہو تو یقینی یہ خیال ہو گا کہ دنیا ہمارے ہی واسطے بنائی گئی ہو۔ اگر ہم اس کی قدرتی خوبصورتی اور دلچسپیون کے متعلق خیال کرین تو اس سے یہ بھی نتیجہ نکلے گا کہ دنیا ہمارے عیش و آرام کے لیے بنائی گئی ہو۔ سورج جو دنیا کی سب سے بڑی جاندار شے ہو ہماری زندگی کے لیے ہر قسم کی ضروری چیز مہیا کرتا ہو اور یہ انسان کی طبیعت کو بشاش رکھنے اور دل کو خوش رکھنے کا ایک خاص ذریعہ ہو۔

وہ مختلف جانور جو دنیا مین پیدا کیے گئے ہین جن سے ہماری پرورش بھی ہوتی ہو اور ساتھ ہی اسکے اُن کے خوش کن نغمون سے جنگل گونجتے رہتے ہین۔ ان نغمون سے ہمارے دلمین ایک قسم کی خوشی پیدا ہو جاتی ہو اور اُن کو دیکھ کر ہماری طبیعت بیحد مسرور بھی ہوتی ہو۔ چشمے، دریا اور جھیلون کے منظر سے طبیعت مین ایک قسم کی ایسی تازگی پیدا ہو جاتی ہے جیسی زمین کے اُن حصون کو دیکھنے سے جن پر وہ بہتے ہین۔

بڑے بڑے مبصرون نے دلائل سے ثابت کیا ہو کہ تمام دنیا بہ نسبت اور رنگون کے سبز رنگ سے بھری ہوئی ہو اور سبز رنگ روشنی اور سایہ کا ایک ایسا صحیح مرکب ہو جس سے بصارت کو کسی قسم کا نقصان یا کمزوری پہونچنے کے بجائے اُس کو آرام اور تقویت پہونچتی ہو۔ اسی وجہ سے بہت سے مصور اپنی آنکھون کے سامنے سبز کپڑا لٹکائے رہتے ہین جس سے اُن کی بینائی کو خواہ وہ اپنے فن مین کتنی ہی

محنت کیون نہ کرین کوئی نقصان نہین پہونچتا۔ سرازاک نیوٹن نے اس کے وجوہ جو بیان کیے ہین وہ حسب ذیل ہین :۔

"تمام رنگ جو زیادہ شوخ ہوتے ہین اُن حیوانی جذبات کو جن کا تعلق بصارت سے ہوتا ہی مغلوب اور پریشان کرتے رہتے ہین۔ برخلاف اسکے وہ رنگ جو زیادہ دُھندلے ہوتے ہین اُن سے حیوانی جذبات کافی طور پر متاثر نہین ہوتے۔ جب کرنون کے دیکھنے سے ہمارے تخیلہ مین سبز رنگ کا خیال پیدا ہوجائے تو اس صورت مین کرنین بصارت پر ایسی مناسب نسبت سے گرتی ہین کہ جذبات حیوانی یکسان حالت مین کام کرتے رہتے ہین اور کرنون اور جذبات حیوانی مین برابری کی حیثیت سے کشمکش ہوتی رہتی ہی جس سے طبیعت مین خوشی اور خرمی کے احساسات پیدا ہوجاتے ہین"

اس کے اسباب خواہ کچھ ہی ہون مگر اس کا نتیجہ یقینی ہی۔ اسی وجہ سے شعرا سبز رنگ مین خاص طور سے طبیعت کو خوش کرنے والی صفت بیان کرتے ہین۔

قدرت کے کامون مین ان دونون اغراض پر نظر کرنے کے لیے کہ وہ کیسے مفید ہوتے ہین اور اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اُن کو اپنے دل کی طرف کیسا کھینچتے ہین۔ ہم کو نباتی دنیا پر غور کرنا چاہیے۔ ان کے نہایت ضروری حصے بہت ہی لطیف اور خوبصورت ہوتے ہین اور وہ تخم ہوتے ہین جن سے پودون کی نسل چلتی اور بڑھتی ہی اور اسی وجہ سے وہ پھولون یا کلیون مین رہتے ہین۔ معلوم ہوتا ہی کہ قدرت نے اس مین اپنے اس ارادہ کو پوشیدہ رکھا ہی کہ ظاہر مین اُن کی سرسبزی اور شادابی مین مصروف رہے اور ساتھ ہی اسکے اپنی بقا کا راز بھی اسی مین مضمر رکھے۔ اسی طرح ایک کسان یا باغبان یہی چاہتا ہی کہ ملک کو باغ بنادے اور اسکے باغ کا ہر درخت پھلتا پھولتا رہے، مگر اس کے دل مین صرف یہ ہی خیال ہوتا ہی کہ فصل اچھی ہو اور اُسکے نفع مین اضافہ ہو۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہی کہ وہ معمولی چیزین مثلاً پہاڑون کی قدرتی سرسبزی اور شادابی، آبشار، صحرا اور اسی قسم کے قدرتی مناظر جن کی نسبت ہمین معلوم ہوتا ہی کہ ان چیزون سے کوئی فائدہ نہین پہونچ سکتا۔ قدرت نے ان ہی چیزون مین ایک قسم کی ایسی دلربایانہ کشش پیدا کردی ہی اور اس خصوص مین اس احتیاط سے کام لیا ہی کہ یہی چیزین انسان کی طبیعت مین بشاشت اور خرمی پیدا کردیتی ہین۔ وہ لوگ جنھین فلسفہ مین دخل ہی جب وہ یہ دیکھتے ہین کہ اگر کوئی چیز اپنے

اصلی خواص مین نظر آتی ہی تو اُس سے کوئی خوشی حاصل نہین ہوتی۔ مگر جب وہ اِس بات پر غور کرتے ہین تو اِس خیال کو بہت بلند کرسکتے ہین "کہ قدرت نے ان چیزون کو ایسی قوت کیون دی ہی جو ہمارے دل مین اُن کے ذائقہ، رنگ، آواز خوشبو، سردی اور گرمی سے تخیلی ذوق پیدا ہو جاتا ہی"۔ اِس سے قدرت کا سوا اِس کے اور کیا مقصد ہوسکتا ہی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ حیثیت رکھنے والے آدمی کی طبیعت مین بھی ان چیزون کی خیالی صفات سے خوشگوار جذبات پیدا ہون۔ البتہ تمام دنیا اس قسم کی چیزون سے بھری پڑی ہی جن کے دیکھنے سے یا اُن کے تصور سے انسان کے دل مین خوشی، خرمی اور ستائش کے جذبات پیدا ہو جاتے ہین۔

دن اور رات کے تغیرات، موسمون کی تبدیلی اور اُس تبدیلی سے جو قدرتی انقلاب واقع ہوا کرتے ہین، انسان اپنے ذاتی خیالات سے ان باتون پر غور کرکے اِس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہی کہ یہ سب باتین انسان کی طبیعت مین یکے بعد دیگرے کیسے کیسے مسرت کے خیالات پیدا کرتی رہتی ہین۔

مین یہان دلچسپی کے مصنوعی سامانون کا جو دوستی سے کتابون سے، گفتگو سے اور زندگی کے اتفاقی مشاغل سے حاصل ہوتے رہتے ہین ذکر نہین کرون گا اِس وجہ سے کہ مین یہان خوشی پیدا کرنے والے اُنھین اسباب کا ذکر کرنا چاہتا ہون جو ہر مرتبہ کے شخص کو میسر آسکتے ہین تاکہ مین اُن سے کافی وضاحت کے ساتھ ثابت کرسکون کہ قدرت نے دنیا مین انسان کو اس لیے پیدا نہین کیا ہی کہ وہ اپنی طبیعت مین اندرونی پیچ وتاب غم وغصہ اور کراہن رکھے یا اُس کی طبیعت ملول اور رنجیدہ رہے۔

ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی طبیعت کو برائی کی طرف نہ بھٹکنے دے اور ساتھ ہی اُسکے دلمین پاکیزہ خیالات رکھے جن سے طبیعت مین اطمینان اور سکون پیدا ہو اور اُس کو اِس قابل کردے کہ اگر کسی مصیبت یا آفت مین بھی وہ اتفاقاً مبتلا ہو جائے تو اُس کو ہشاش بشاش رہ کر برداشت کرسکے۔ اِن خیالات کی اصولی ترقی سے انسان کی طبیعت مین آسودگی، خرمی اور لازوال خوشی پیدا ہو جائیگی۔

بیشتر اسکے کہ مین ناظرین کو دنیا کی انتہائی خوبیون کی طرف متوجہ کرون مجھے اِس بات کا اقرار ہی کہ دنیا مین برائیان بھی بہت سی ہین جو اُنھین اچھائیون سے جو ہمین میسر ہین قدرتی طور پر پیدا ہوتی رہتی ہین۔ اطمینان اور آسودگی سے زندگی بسر کرنے کے جن طریقون کو بیان کیا گیا ہی اگر انسان اُن پر اصولاً کاربند ہو کر چلے تو یہ برائیان انسان کی طبیعت کو متاثر نہین کرسکتین۔ قدرت کے کامون مین

اچھائی اور برائی، خوشی اور غم کے متعلق مسٹر لوک نے اپنے ایک مضمون مین جو قدرتی وجوہ بیان کیے ہین وہ سب ذیل ہین :-

"قطع نظر اور سب باتون کے ہم کو ایک دوسرا سبب یہ بھی ملتا ہی کہ خدا نے ان تمام چیزون مین جن کا ہمارے خیالات اور احساسات سے تعلق ہی خوشی اور غم کے نشیب و فراز کیون پیدا کر دیے ہین اور اُن کو ایک دوسرے مین کیون مخلوط کر دیا ہی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ ہم اُن تمام خوشیون کو جو ہمین دنیا مین حاصل ہوتی ہین، ناکافی، غیر تشفی بخش اور سچی خوشی سے معرا سمجھکر اللہ عزوجل سے لو لگائین جسکے پاس لازوال خوشیون کا انمول خزانہ ہی"

(ترجمہ) **محمد نجم الغنی قریشی** دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

مسلم لیگ

لیگ را گفتم کہ اے لیلاے اقلیم عدم
شہر خاموشان ز شور عشق تو بیدار باد

سر بر آر از گنبد مدفن بپا کن فتنۂ
گنبد گردان بضرب پاے تو ہموار باد

باز می خواہی خرامیدن بہ گلزار وجود
اے کہ تشریف تو ارزان بر گل و بر خار باد

گفت بعث و نشر من موقوف روز محشر است
صبر بر فرقت نصیب عاشقان زار باد

تا قیامت بر مزار مراقب بودہ باش
ذاکر و شاغل بہ تکرار مناقب بودہ باش

تپش خورجوی

روح نے بچا لیا

تیسرا باب

مارٹینز کے کیمپ میں

اب دلسیون نے گھوڑوں سے سامان اُتارنا اور اُنھیں چرنے کے لیے ہنکانا شروع کر دیا۔ اور رسیوں کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے وہ رسی بھی کھول ڈالی جس سے میں اپنے سامنے کی گٹھری کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور وہ بھی جس سے میرے ٹخنے گھوڑے کے پیٹ سے کسے ہوئے تھے لیکن اُنھوں نے وہ رسی نہیں کھولی جس سے میری کلائیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے مجھے دوسرے گٹھڑوں میں معمولی طور سے ڈال دیا اور پھر میری طرف بہت ہی کم توجہ کی۔ شاید یہ میرے لیے اچھا تھا کیونکہ میں خیال کرتا ہوں میں مشکل ہی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا اور میں کچھ دیر وہیں زمین پر بیٹھا رہنا پسند کرتا تھا۔ تاکہ میں اپنے چکراتے ہوئے سر کو ذرا سنبھالوں اور اپنے کسے اور بھنچے ہوئے پٹھوں کو پھیلا لوں۔

میرے والد اور جیرلڈ بھی اسی بے تمیزی سے گھوڑوں سے اُتار دیے گئے تھے لیکن میرے والد کے جو زمین پر بیٹھے ہوئے تھے دونوں طرف ایک ایک آدمی کھڑا تھا۔ اگرچہ ہماری کلائیاں بندھی رکھنے کے علاوہ اُنھوں نے اور کسی طرح ہمیں جکڑ بند کرنے کی فکر نہیں کی لیکن یہ ظاہر تھا کہ ہماری بڑی احتیاط سے نگرانی کی جا رہی تھی اور دلسیون کا ہماری طرف سے غافل ہونے یا ہمیں اُنکے پاس سے کھسک جانے کا موقع دینے کا مطلق ارادہ نہ تھا۔ بایں ہمہ اُنھوں نے میرے والد کو میرے پاس آنے سے نہیں روکا۔ وہ میرے پاس آ کے میرے برابر بیٹھ گئے لیکن ان کے پہرہ دار بھی ان کے ساتھ ساتھ لگے چلے آئے۔ میرے والد نے اُن دلسیون سے جو سربرآوردہ نظر آتے تھے اپنی بہترین ہسپانوی زبان میں (جو میں مانتا ہوں مشکل سے ہی سمجھ میں آتی ہے) پوچھا کہ ہمیں اس طرح گرفتار کرنے اور اس ہتک آمیز طریقہ پر ہم سے سلوک کرنے سے اُن کا کیا منشا ہے؟ دلسیون نے مطلق توجہ نہیں کی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ دراصل اُنھوں نے کچھ نہ سمجھا۔ گو وہ معمولی طور سے یہ سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے تھے کیونکہ اُنھوں نے

تھوڑی ہی دیر مین میلے کچیلے پونچوؤن کا ایک جوڑا ہم پر ڈال دیا۔ دنیا کے اِس حصہ مین دیسیون کا پونچو ایک کمبل ہوتا تھا جسکے بیچ مین ایک سوراخ ہوتا تھا جسمین سے مغرور پہننے والا اپنا سر باہر نکال لیتا تھا۔ لباس کے لحاظ سے یہ چیزین بالکل ناکافی تھین تاہم وہ نہونے کے مقابلہ مین بہت غنیمت تھین گو اس مین شک نہین کہ ہم نے ان کپڑون کی غلاظت پر ناک بھوئین بہتیری چڑھائین۔

میرے والد نے نزدیک ترین خیمہ مین جانے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ کسی مہذب شخص سے بات چیت کر سکین۔ لیکن دیسیون نے اس کی مطلق اجازت نہین دی اور اُنھون نے اپنا ارادہ کُھلم کُھلا ظاہر کر دیا کہ جس جگہ ہم بیٹھے تھے ہمین وہین رکھنے کے لیے وہ جبر و تشدد اختیار کرنے پر آمادہ تھے اِس لیے ہم یہ بات مان گئے کہ ہم اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہین اور واقعات کا انتظار کرین کیونکہ یہ بات بخوبی عیان تھی کہ اُن کا ارادہ ہمین جان سے مار ڈالنے یا اور زیادہ دق کرنے کا نہ تھا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ اب تک پڑاؤ بیدار نہ ہوا تھا کیونکہ سوائے چند سنتریون کے کوئی چہل پہل نہین رہا تھا۔

ہم سے نزدیک ترین خیمہ بڑا سا تھا جو اورون سے الگ لگا ہوا تھا اور جنگل کے کنارہ پر زیادہ اونچائی پر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے خیال آیا کہ ہمارے سامنے کا نظارہ اس جنگل کے چھوٹے قلعہ سے بہت کچھ مشابہ تھا جسمین ہماری جھونپڑی پڑی تھی۔ فرق یہ تھا کہ یہ بہت بڑا تھا۔ جنگل ہمارے پشت پر تھا اور جس بڑے خیمہ کا مین ذکر کر رہا ہون اُس کی طرف اُس کی پشت تھی بالکل اسی طرح جیسے ہماری جھونپڑی تھی۔ اُسکے سامنے نیچے کی طرف ایک چوڑا میدان تھا جسمین سپاہیون کے خیمے نصب تھے۔ اور دور تہ مین مجھے ایک چشمہ کا چھلکتا ہوا پانی نظر آرہا تھا۔ یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہ تھا کہ یہ خیمہ سپہ سالار یا جو کچھ بھی اُس فوج کے کمان والے کا عہدہ ہو اُس کا تھا کیونکہ ایک خاص سنتری اُس کے سامنے تھوڑی سی زمین پر گشت کر رہا تھا۔

چند لحظہ مین ایک لمبا دیسی پرون کا ایک شاندار گچھا لگائے نمودار ہوا جس کو مین نے فوراً پہچان لیا کہ گذشتہ رات یہ ہم پر حملہ کرنے والون مین شامل تھا جیسے ہی وہ نزدیک آتا گیا اور مین اُسے بغور دیکھ سکا، مجھے یہ محسوس ہوا کہ مین نے اُسے پہلے بھی دیکھا ہے گو اسوقت وہ معمولی دیسی لباس مین تھا مین نے اُسے جنگی نقش و نگار اور پرون مین گذشتہ رات نہ پہچانا تھا۔ شہر کی گلیون مین مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ شخص بڑے زور کا ہے لیکن اُس کی شہرت نہایت خراب ہے۔ یہ اُس ملک کے تمام دیسیون کا سردار

ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنے آپ کو انتی ناہول کہلاتا ہے جس کے معنی مجھے "سورج کا شیر" بتلائے گئے ہین اور وہ اپنے آپ کو بیروسکے قدیم ملکاس کی اولاد بتاتا تھا۔ میری معلومات کا یہ نتیجہ ہے کہ اُس کے دعوے کی کوئی بنیاد نہ تھی اور نہ بیروسکے دیسی اس بات کو مانتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مین نے بیرو مین اُس شخص کو دیکھا تھا جسے لوگ اسکی جایز اولاد مانتے تھے۔ اگرچہ میرے پاس اُن دونون حریفون کے دعاوی کا فیصلہ کرنے کا کوئی مصالحہ نہین ہے۔ مین کم ازکم یہ کہہ سکتا ہون کہ وہ شخص شریف، شاندار اور شاہانہ معلوم ہوتا تھا اور اس شخص کا چہرہ گو قوت کا اظہار کرتا تھا لیکن ظالمانہ بیرحمی اُس مین کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔

مجھے انتی ناہول کے شناخت کرنے کا پورا پورا اطمینان نہین ہوا کیونکہ جو کچھ مین نے اسکی بیرحمی کے متعلق سُنا اگر وہ اس کا آدھا ہی ہوتا تو مجھے حیرت تھی کہ اس کے ہاتھ مین پھنس جانے پر بھی ہم زندہ تھے۔ کچھ بھی ہو ہم تھے زندہ اور خیمے اِس بات کی شہادت دیتے تھے کہ اس بے رحم وحشی کے علاوہ ہمین کسی اور سے بھی بھگتنا ہے اس لیے ہم حتی الامکان صبر وتحمل سے انتظار کرنے لگے۔ ہمارے محافظون اور دوسرے لوگون کے بار بار اس بڑے خیمہ پر نظر ڈالنے سے یہ قرین قیاس معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے لیے کسی کے برآمد ہونے کا انتظار ہے۔ شاید اس فوج کے جرنیل کے جاگنے کا انتظار ہو۔

تھوڑی دیر مین آہستہ آہستہ پڑاؤ اپنی نیند سے بیدار ہوا۔ ہم نے درشت منظر سپاہیون کو مختلف خیمون سے باہر نکلتے اور باہم باتین کرتے دیکھا۔ ہمین یہ اُسی وقت نظر آگیا کہ جس نظام تربیت کی توقع ہونی چاہیے تھی وہ اس جگہ مفقود تھی۔ آدمیون کو کسی ڈھول یا بگل سے ایک دفعہ ہی نہ جگایا جاتا تھا بلکہ وہ جسوقت چاہتے اُٹھتے تھے۔ اُن مین سے کسی نے ہماری طرف نظر نہین کی اور نہ ہمارے پاس ہمین دیکھنے کوئی آدمی آیا جس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ دیسیون کو اُن کے جنگی نقش ونگار مین دیکھنے کے پورے پورے عادی ہون گے ورنہ اس کا نظارہ دوغلے یا ہسپانوی باشندون کو معمولاً بہت زیادہ متوحش بنادے۔

تھوڑی دیر مین ہم نے دیکھا کہ کچھ آدمی افسرون کے لباس مین ان مین شامل ہین اور کچھ ترتیب سی اُن مین ظاہر ہونے لگی۔ کچھ آدمی دریا کی طرف ڈولون سمیت قطار مین جاتے نظر آئے۔ کچھ دیر بعد ایک شخص جو دیسیون کا سرگروہ معلوم ہوتا تھا ڈیرون مین گیا اور ہم نے اُسے ایک بڑے سردار سے

باتین کرتے دیکھا۔ کچھ دیر باتین کرنے کے بعد وہ پہاڑی پر اکٹھے چڑھنے لگے اور وہ اس خیمہ کے پاس پہنچ گئے جسے ہم نے سپہ سالار کا خیمہ تصور کیا تھا۔ سنتری سے جس نے اُنھین سلام کیا کچھ پہرے کے خفیہ لفظ ادا کر کے وہ سردار خیمہ کا پردہ اُٹھا کے اندر گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک سبزی مائل زرد رنگت کے گٹے آدمی کے ہمراہ باہر نکلا۔ بظاہر وہ ابھی جگایا گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اُسے یہ بُرا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کرنیل کے لباس پہنے تھا جسے وہ نہایت بے پروائی اور پھوہڑپن سے پہنے تھا۔ باہر نکلتے ہوے وہ تلوار کمر کے اردگرد باندھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ نمودار ہوا انتی ناہول جو میرے خیال مین اس عرصہ مین کہین پیچھے کی طرف تھا آگے بڑھا اور اُسکو ایک شاندار طریقہ سے سلام کیا جسکا اُس نے اُسی طرح جواب دیا۔

ہم نے دونون کو باتین کرتے دیکھا۔ اُن کے ہماری طرف بار بار دیکھنے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمارا ذکر کر رہے ہین۔ ہمارے نزدیک ترین خیمہ کے اس حصہ مین اسوقت تک سپاہیون کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا یہ ظاہر تھا کہ اُنھون نے یہ خیال کیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہے لیکن اُن مین سے کوئی اُس خیمہ کے یا اُس گروہ کے جو اُس خیمہ کے آگے باتین کر رہا تھا بہت قریب پہونچنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ جو سردار دیسی افسر کے ہمراہ پڑاؤ سے آگے تھا اُس نے اُن کی طرف مُڑ کے چلا کے کوئی حکم دیا جسکے سنتے ہی اُسکے آدمیون مین سے چار نکل کے اُس کی طرف لپکے اور چند ہدایتی الفاظ سن کے جلدی سے وہ ہماری طرف آئے اور اُنھون نے ہمین اُٹھنے اور اُن کے ہمراہ چلنے کا اشارہ کیا۔ اُنھون نے کسی طرح درشتی سے ہمین ہاتھ نہین لگایا۔ لیکن اُن مین سے دو میرے والد کے ایک ایک طرف ہو لیے تیسرے نے مجھے حراست مین لے لیا اور چوتھے نے ننھے جیرالڈ کو سنبھالا۔ اس طرح وہ ہمین اُس گٹے آدمی کے سامنے جو صریحاً اُس عجیب الہیئت بے نظام فوج کا سپہ سالار تھا چڑھاتے لے گئے۔

ہم یقیناً کچھ اچھی ہیئت مین نہ تھے۔ اپنے گندے پونچون کے علاوہ ہم بالکل ننگے تھے اور کچھ صاف بھی نہ تھے کیونکہ اُن درختون کی شاخون نے جب ہم اُن کے بیچ مین سے بھاگم بھاگ سوار چلے آ رہے تھے چوٹین اور رگڑین لگا لگا کے ہمین کھرونچون اور کھرنڈون سے ڈھک دیا تھا اس لیے ہم نہایت کریہ المنظر ہو رہے تھے۔ بایں ہمہ جیسے ہی ہم سپہ سالار کے سامنے کھڑے کیے گئے میرے والد نے اس پر نہایت حقارت آمیز شکایات کی بوچھاڑ شروع کر دی کہ کس طرح ہمارے ساتھ سلوک کیا گیا تھا۔ اُنھون نے

دیسیون کو اپنے مزدوروں کے قتل کا ملزم قرار دیتے ہوے ان سب لینے والون کو برطانوی حکومت کے انتقام سے ڈرایا۔

اُن کی ہسپانوی زبان جیسا کہ مین کہہ چکا ہون، صریحاً ناقص تھی۔ اُن کے غیظ و غضب کا اثر اس بات سے بہت کچھ گھٹ گیا کہ جس جس مقام پر وہ بہت زیادہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے وہ الفاظ کے لقمہ کے لیے عموماً میری طرف مڑ کے دیکھنے لگتے تھے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہو کہ حبشیون اور دیسی ملازمون مین برابر بھاگ دوڑ کرتے رہنے سے مین اُن کے مقابلہ مین ملک کی زبان کو زیادہ جانتا تھا۔ اس پستہ قد سپہ سالار نے اس لعنت ملامت کو آخر تک سُنا۔ اور اُس نے مین مانتا ہون قابل تعریف لحاظ و احترام سے جواب دینا شروع کیا۔ اُس نے اُس حادثہ پر جو ہمین پیش آیا سخت افسوس کا اظہار کر کے یقین دلایا کہ یہ محض غلطی کا نتیجہ تھا۔

میرے والد نے گرج کے کہا غلطی! تو یہ ایسی غلطی ہو جسکے لیے کسی نہ کسی کو سخت خمیازہ اُٹھانا پڑیگا۔ شاید تمنے یہ محسوس نہین کیا کہ آدمیون کی ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی ہو جو ستر اسی آدمی ہونگے۔

چھوٹے سپہ سالار نے اپنے کندھے چڑھاے اور اپنے ہاتھ آگے کو پھیلاے اور ہمین یقین دلایا کہ اپنے دیسی دوستون کے اِس وحشیانہ جوش پر اُس سے زیادہ اور کسی کو رنج نہ ہوگا۔ لیکن لڑائی مین ایسی چھوٹی غلطیان وقتاً فوقتاً ہوا ہی کرتی ہین۔ اور کچھ بھی ہو یہ سب کچھ ہو چکا اور وہ اب پلٹ نہین سکتا۔

میرے والد زیادہ متنفر ہو جاتے تھے لیکن اُنھون نے دیکھا کہ یہ معاوضہ یا بدلہ کے سوال کا موقع نہین ہو اِس لیے اُنھون نے اُن سے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ ہمین فوراً آزاد کر دیا جاے اور ہمارے کپڑے واپس کر دیے جائین کیونکہ مین برطانوی رعایا ہون اور اسطرح سلوک کیا جانا پسند نہین کرتا۔

چھوٹے سپہ سالار نے صبر و تحمل سے جو واقعی اُس کے لیے جس قسم کا وہ آدمی تھا حیرت انگیز تھا جواب دیا کہ یہی کیا جاے گا لیکن ایک چھوٹی سی رسم ہو جو ویسے کچھ بھی نہین ہو ہمین پہلے وہ ادا کرنی ہوگی۔ اُس نے کہا کہ مین نے اکثر انگریزون کا ذکر سُنا ہو اور اُن کی حیرت انگیز بہادری کی عجیب و غریب کہانیان سنی ہین۔ جہان مجھے اس بات کا سخت غم و قلق ہو کہ میرے دیسی رفیقون نے تمھین ہسپانوی سمجھنے کی حماقت آمیز غلطی کی اور تمھین اِس تاسف انگیز تکلیف مین مبتلا کیا وہان یہ میری خوش قسمتی ہو جو تم لوگون کو میرے پاس لے آئی تاکہ تم میری تدابیر عمل مین لانے مین میرے مددگار رہو۔

اُس نے سنجیدگی سے میرے والد کو اپنی چار پلٹنون مین سے ایک کی سپہ سالاری اس شرط پر پیش کی کہ ہم اُس سے ملجائین اور اُسکے ساتھ وفادار رہنے کا حلف اُٹھالین۔ اُس نے ہمین بتایا کہ مین جنرل مارٹینز ہون اور جس ناقابل برداشت بیرحمی اور ہسپانوی میرے اور میری قوم کے ساتھ سلوک

کر رہے ہین اُس نے مجھے اُٹھنے اور ان کا جوا کندھے سے اُتار پھینکنے پر مجبور کر دیا ہو۔ اور جب واقعی ہم آزاد ہو جاینگے تو مین خود اُس جنگی جمہوریت کا جو مین قائم کرون گا صدر یا حاکم ہون گا۔ لیکن آپ یقین کیجیے کہ اِس مدد کے عوض جو آپ مجھے دین گے مین آپ کو اپنی اس آئندہ سلطنت مین بڑا عہدہ دون گا۔

اِس کے اِس سکون آمیز تیقن نے ہمین اپنے ان حالات مین بڑا لطف دیا لیکن اِس بات نے میرے والد کو اور بھڑکا دیا۔ اُنھون نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی کے باوجود اپنے جواب کا لب لباب نہایت واضح طور پر پیش کر دیا۔ اُنھون نے ظاہر کیا کہ ایک غیر ملکی ہونے کی وجہ سے ملک کی مقامی پیچیدگیون سے اُن کا کچھ تعلق نہین اور اُنھون نے کسی طرف سے کسی کے شریک کار ہونے سے قطعی انکار کر دیا اور نہ وہ اُس شخص کی وفاداری کا حلف کسی حالت مین اُٹھا سکتے ہین جو اس ملک کی جائز حکومت کا باغی ہو۔ مجھے نظر آیا کہ چھوٹا سپہ سالار قطعی بگڑتا جا رہا ہو۔ اس کا ہاتھ اندیشہ ناک طور سے بار بار تلوار کے قبضہ پر پڑتا تھا۔ با ایں ہمہ اُس نے اپنی طبیعت پر حیرت انگیز طور پر جبر کیا۔ اُس نے میرے والد کو سمجھایا کہ اسمین تھین پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی اختیار نہین ہو۔ اُس نے کہا کہ اس اصرار کرنے پر مجھے خود افسوس ہوتا ہو لیکن کیا کرون۔ مین اپنے دشمنون پر چپکے سے جا پڑنا چاہتا ہون۔ مین اُن کے تعاقب سے کترا کے اُن کو بے معلوم اس سے کہین شمال مین جہان انھین میری فوجون کا گمان ہو اپنی فوجین لے آیا ہون اور اب میرا ارادہ اس شہر پر جو ہماری ریل کا آخری اسٹیشن ہو ایک اچانک ضرب لگانے کا ہو۔ مین اندرون ملک سے اس سمت مین حملہ آور ہونا چاہتا ہون جہان کسی قسم کا کوئی استحکام نہین ہو۔ مین ان پر بالکل اچانک جا پڑون گا۔ اب چونکہ اتفاق وقت سے جسکا مجھ سے زیادہ کسی اور کو افسوس نہ ہوگا تم لوگون کو میری خفیہ تدابیر معلوم ہو گئی ہین جو دنیا مین کسی زندہ آدمی کو معلوم نہ ہونی چاہیے تھین۔ اس لیے (اس نے پھر اپنے کندھون کو چڑھایا اور اپنے ہاتھ پھیلاسے) گو مین آپ کی آزادی مین اس بظاہر خلل پڑنے سے سخت افسردہ اور اندوہگین ہون، مین آپ لوگون کو اگر آپ میرے ساتھ ملجانے سے انکار کرین فوراً قتل کر دینے پر مجبور ہون۔

اس وقت تک میرے والد حقارت سے انکار کرتے رہے اور بار بار یہ کہتے رہے کہ بحیثیت ایک انگریز ہونے کے ان معاملات مین مجھے حصہ لینے سے انکار ہو۔ چھوٹے سپہ سالار کا صبر و تحمل اب جواب دیتا جا رہا تھا۔ آخر وہ بہت تیزی سے فیصلہ کن آواز مین بولا حضرت! اب مین زیادہ وقت

ضایع نہین کرسکتا۔ تم ایک بات پسند کرلو۔ یا تو تم مجھ سے وفاداری کا حلف ہمارے انداز و قاعدہ سے اُٹھاؤ یا تم ایک گھنٹہ کے اندر اندر مرنا پسند کرو۔

پھر وہ اپنے افسر کی طرف مڑا اور اُسے اسکے خیمے سے حلف اُٹھانے کا ضروری سامان لانے کا حکم دیا۔ وہ سپاہی فوراً وہان سے ایک چھوٹی سی میز، ایک بڑی کتاب، ایک دوات اور ایک قلم لے آئے اور اُسی وقت وہ افسر ایک بڑی منقش چوبی صلیب جو صریحاً کسی گرجا سے چُرائی ہوئی تھی لے آیا اور اُسے ہمارے آگے زمین پر ٹیک دیا۔

اس چھوٹی سی چیز کی موجودگی کی وجہ موجہ بیان کرنے کی غرض سے مجھے اس خوفناک پستہ قد شخص کی عجیب وغریب خصلتون مین سے ایک بتانی پڑے گی۔ اپنے آدمیون کے آگے اُس نے جو کچھ بھی مانا عقلمندی خیال کی ہو وہ اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ سفید چمڑے کے آدمیون کو سمندر مین ڈھکیل دینے کا کام کوئی معمولی بات نہ تھی اور وہ اس مقصد کے حاصل کرنے کی امید اس صورت مین کرسکتا تھا کہ وہ اپنے پیروؤن کی محدود تعداد مین سے ہر ایک کی نہایت گرمجوش وفاداری قائم رکھے۔ علاوہ ازین وہ اپنے پیروؤن کو بخوبی جانتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ توہم پرستی انکی گھٹی مین پڑی ہے۔ وہ رومن کیتھولک عقیدہ کے کاہنون کی اس زبردست گرفت سے بھی کامل طور سے واقف تھا جو اُنھین اس نیم مہذب ملک مین اپنے گرجا کے افراد پر حاصل تھی۔

عیسائیت جس شکل مین جنوبی امریکہ کے ان اندنون پھیلی ہوئی تھی اتنی مکروہ اور رذلیل تھی کہ اس کی مثال روئے زمین پر اور کہین نہین لسکتی تھی۔ لیکن اس سے اس معاملہ مین کوئی فرق نہ آتا تھا کہ درحقیقت ملک پر ان کاہنون کی حکومت تھی، اور اُن کا الو کسی نہ کسی طرح ہمیشہ سیدھا ہو جاتا تھا اُسے اس کا بھی کافی علم تھا کہ گرجے کا رسوخ اس کے خلاف تھا۔ اتنا اس وجہ سے نہین کہ وہ مشہور بدمعاش تھا جتنا اس وجہ سے تھا کہ کاہن لوگ صورت حالات سے نہایت مطمئن تھے اور وہ اُس حکومت مین کسی قسم کا خلل پسند نہ کرتے تھے جو تمام وکمال ان کی مٹھی مین تھی۔

اس مذہبی رسوخ کو توڑنے کے لیے اُس نے ایک تدبیر سوچی تھی جسمین کوئی خوبی تو نہ تھی لیکن دلیرانہ اور عیارانہ ضرور تھی۔ اُس نے حیرت انگیز کفر ولامذہبی سے بادشاہ بنوکدنضر کے مشہور اعلان کی نقل کی تھی اور وہ اپنے ہر ایک ساتھی سے پختہ قسم لیتا تھا کہ جب تک لڑائی ختم ہو اور ملک اُن کے ہاتھ مین آجائے وہ کسی

پادری سے بات نہ کریں گے، کسی عبادت گاہ میں داخل نہوں گے اور سوائے اس کے خدا یا انسان سے کوئی درخواست نہ کریں گے۔ ہر شخص کو یہ حلف خود مارٹینز کی موجودگی میں اٹھانا پڑتا تھا اور اُس کے آبائی مذہب کے عارضی ترک کرنے کی علامت کے طور پر ہر ایک سے صلیب پر پاؤں رکھوایا جاتا تھا۔ اس مخلوط گروہ کے ہر ایک فرد نے یہ رسم ادا کی تھی اور اب مارٹینز یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ہم بھی ایسا ہی کریں۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کی کوئی حرکت کرنے کا ہمارا مطلق ارادہ نہ تھا۔ ہم انگریزی کلیسا کے پیرو تھے۔ پاپائے روم کے مقلد نہ تھے۔ بایں ہمہ میری والدہ ڈاکٹر پوسی کی پکی مرید تھیں جن سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ میں بھی عادۃً ایک چھوٹی سی آبنوسی نقرئی صلیب اپنے گلے میں کپڑوں کے نیچے ڈالے رہتا تھا۔ یہی ایک چیز تھی جو اُنھوں نے میرے جسم پر چھوڑی تھی کیونکہ میرے خیال میں اُنھوں نے اُسے عیسائیوں کا ساحرانہ نشان سمجھا اور شاید اس کی طاقت سے ڈر گئے۔ اس لیے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس جرنیل کی اس ناپاک تجویز کو کس خوف و وحشت سے دیکھا ہوگا۔ گو میرے خیال میں اسمیں کسی شک کی گنجائش نہ تھی کہ اگر اس معاملہ میں صلیب کا بھی واسطہ نہوتا تو بھی ہم زبردستی ایسے کام میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کیے جا سکتے تھے جس سے ہمیں کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی۔

مارٹینز نے میرے والد کے حقارت آمیز گو خلاف قواعد زبان انکاروں اور رجحتوں کی ذرا پروا نہ کی بلکہ خشک مزاجی سے صلیب پر پاؤں رکھنے اور مقررہ قسم کھانے کا حکم دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ خیال میرے دل میں گذر رہا تھا کہ دیکھیے اب میرے والد کیا کرتے ہیں؟ کیونکہ اس بات کا امکان خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ ایسے پاجیانہ مطالبہ کی تعمیل کرنے پر آمادہ ہو جائینگے۔ لیکن اُنھوں نے جو کچھ کیا اُس کے لیے بھی میں ایسا ہی ناطیار تھا جیسے وہ لوگ جو وہاں موجود تھے۔ یہ یاد رکھیے کہ اس تمام قیل و قال میں اُنھوں نے ان رسیوں کو ذرا بھی ڈھیلا نہ کیا تھا جن سے ہماری مشکیں بندھی ہوئی تھیں اس لیے آپ میری اُس پُر وحشت حیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس سے میں نے اپنے والد کو دیکھا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھے۔ گویا وہ صلیب پر پاؤں رکھنے والے ہیں۔ اچانک گویا ایک جادو تھا اُنھوں نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور اس گٹے سپہ سالار کے منہ پر اس زور سے گھونسہ مارا کہ وہ فوراً چاروں شانوں چیت گر پڑا۔ پھر وہ اُس کے پچھڑے ہوئے جسم کے اوپر سے پھلانگ کے اُس کے پیٹھ پیچھے کے جنگل میں غائب ہو گئے۔

یہ سارا معاملہ ایسا اچانک ایسا چونکا دینے والا اور ایسا فرحت دار رہا کہ اُسوقت کے خوف و خطر

کے باوجود مین زور وشور سے قہقہہ لگانے لگا اور ننھے جیرلڈ نے اِس مین میرا ساتھ دیا۔ چند لمحون کے لیے ایک ابتری سی پھیل گئی۔ افسر لوگ اپنے نیم بیہوش سپہ سالار کو اُٹھانے کے لیے لپکے اور اُس کے بیٹھنے کے لیے ایک تپائی اُٹھا لائے۔ پیچھے پڑاؤ کے آدمی حیرت سے چیخ اُٹھے اور گو مین یہ یقین سے نہین کہہ سکتا لیکن مجھے اس کا بہت بڑا شک ہے کہ میرے قہقہہ کا ان مین سے بعض نے ساتھ دیا تھا۔

چند لمحے جو مارٹینز کے ہوش آنے مین لگے۔ کسی کو بھی اتنا خیال نہ آیا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ غالباً اُس سپہ سالار کا نائب موجود نہ تھا۔ عجیب۔ کچھ بھی ہو اُس وقت ہوا کچھ نہین مین سمجھتا ہون کہ سپہ سالار کے خوب پانی پینے اور اکھڑے ہوے سانس کو قائم کرنے اور بیدمی کی حالت مین بُرا بھلا کہنے کے بعد کوئی پانچ منٹ اور لگے ہون گے جب وہ اِس قابل ہوا کہ کچھ بول سکے۔

جب اُس مین طاقت گویائی آئی تو اُس کی زبان کچھ شائستہ نہ تھی۔ اُس کا چہرہ قرمزی ہو گیا اور غصّہ کے مارے اُس کا سانس پھولا جاتا تھا۔ وہ کھینچ تان کے کھڑا ہوا گو شروع مین وہ میز پر اپنا ہاتھ ٹیک کے کھڑا ہو سکا۔ اُس نے اپنی تلوار سونت لی جسے اُس نے ہوا مین چمکایا اور جو نظرین اُس نے اپنے افسرون پر ڈالین اُن سے ایسی وحشت برستی تھی کہ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِس تلوار کو استعمال کرے گا۔

اُس نے چلا کے کہا۔ وہ بدمعاش کہان گیا؟

افسرون نے دم بخود ایک دوسرے کا مُنھ تکنا شروع کیا کیونکہ مین سچ کہتا ہون اُس وقت تک کسی کو بھی اس مفرور کے تعاقب کرنے کا خیال نہ آیا تھا۔ مارٹینز بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ دہاڑ کے بولا۔ این! کیا تم نے اُسے جانے دیا۔ نامردو! نالائقو! فوراً اُس کا پیچھا کرو۔ ... فوراً، مین کہتا ہون! میری ہتک کی گئی ہے، مین ضرور اُس کا خون لون گا۔ جلد جلد تعاقب کے کچھ انتظام کیے گئے، سپاہیون کے ایک یا دو گروہ جلدی سے درست کر کے جنگل کی خاک چھاننے کے لیے بھیج دیے گئے۔ اُن کے جاتے ہی مارٹینز نے اپنا غصہ مجھ پر اُتارنا شروع کیا۔ اُسکے مُنھ مین کف بھرے ہوے معلوم ہوتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اُسکے الفاظ اُس کے دانتون کے بیچ مین سنسناتے تھے گویا وہ جسمانی طور سے ابھی پھٹ جائے گا۔ اُس نے کہا۔ بدمعاش کے بچے! ایک گھنٹہ کے اندر تو اپنے بدذات باپ کو اس درخت پر لٹکا دیکھے گا!

مین نے ہنس نے کہا۔ مین مانتا ہون میری یہ ہنسی عقل کی بات نہ تھی۔ کہ تم پہلے انھین پکڑ تو لو۔ لیکن مین اپنے والد کے بچ نکلنے پر اس قدر خوش تھا کہ مجھے ہنسی کے جا و بیجا ہونے کا مطلق خیال نہین آیا۔ مجھے اس کا بھی کچھ خیال نہین آیا کہ اگر وہ بچ نکلے ہین تو مین یقیناً نہین نکل سکا۔

اُس نے کف اُڑاتے ہوے کہا او بیحیا منہ زور کتے کے بچے! (حقیقت یہ ہے کہ جو محاورہ اُس نے استعمال کیا مین اُس کا ترجمہ نہین کر سکتا۔ وہ اس سے بھی بُرا تھا) کم از کم تجھ کو حلف اُٹھانا ہی پڑے گا بہتر ہے کہ ایسا ابھی کر ورنہ سمجھ لے کہ مین تیری جیتے جی کھال کھینچ لون گا۔

مجھے پھر ہنسی آگئی۔ یہ میری بے تمیزی تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ وہ اپنے بے بسی کے غصہ مین کچھ بہت ہی مضحکہ انگیز نظر آتا تھا۔ ایسی حالت مین کہ جہان آنکھون کے بیچ مین میرے والد نے اُسکے ان کے مکہ رسید کیا تھا وہان ایک گومڑا اُبھرتا آرہا تھا

مین نے کہا۔ مین ایسا کام بالکل نہین کرون گا۔ اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو یاد رکھو میرے والد آنکے تم کو اس کا مزا چکھا دین گے۔

اُس نے اپنی تلوار کو آدھا اُٹھایا ایک لمحہ کے لیے بہت قریب معلوم ہوتا تھا کہ میری زندگی بس ختم ہوا چاہتی ہے۔ لیکن کسی طرح اُس نے اپنی طبیعت پر جبر کیا اور اُس کی ایک قابل کار آنکھ مین (دوسری مکہ کے اثر سے بند ہوئی چلی جا رہی تھی) یا جیانہ چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے مڑکے انتی ناہول کو پکارا۔

اُس نے کہا شاید تمھارے آدمی اس اُلّو کے پٹھے کو ہموار کر سکین۔ کیون ایسا ہو سکے گا؟

حقارت آمیز سی مسکراہٹ انتی ناہول کے چہرہ پر گذر گئی کہ شاید وہ ایسا کر سکین۔ اُس نے اپنے آدمیون کو اشارہ کیا جنھون نے آکے مجھے گھسیٹنا شروع کیا۔ مارٹینز نے اُس سے اور کچھ نہین کہا بلکہ وہ میرے ننھے بھائی جیرلڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

اے شیطان کے بچے! تو تو کم از کم اپنا پانون اس صلیب پر رکھ کے جو کچھ مین تجھے کہون کہتا رہے گا۔ جیسے لوگ مجھے کھینچے لیے جا رہے تھے مین نے جیرلڈ سے چلا کے کہا۔ جیرلڈ ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اگنیس ڈلی کو یاد رکھنا۔

گھر سے روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پہلے ہماری والدہ نے ہمین ایک رومی تیرہ سالہ کنواری اگنیس ڈلی کا

قصہ سنایا تھا جو اپنے ضمیر کے خلاف قربانی کی کوئی رسم ادا کرنے کے مقابلہ میں اپنے مذہب پر خود قربان ہو گئی۔ یا شاید اُس نے ایک ایسے شخص سے جسے وہ بُت پرست کہتی تھی منسوب ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اتنے زمانہ کے بعد مین ٹھیک نہین بتا سکتا کہ کیا بات تھی لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ قصہ ہم نے تازہ سُنا تھا اور ہم دونون نے اس چھوٹی لڑکی کی دلیری کی بڑی تعریف کی تھی۔

مین نے زور لگا کے اپنے آپ کو اتنا ڈھیلا کر لیا تھا کہ مُڑ کے دیکھ سکون کہ اس ننھے بچے نے کیا کیا۔ اُس نے مارٹینز کے تند چہرہ پر بہادری سے نظرین گاڑ کے اپنے صاف طفلانہ تیز لہجے مین کہا مین ایسا نہین کر سکتا۔ تو بڑا بدمعاش ہے۔

اِس کے بعد کیا ہوا مین کہنا نہین چاہتا۔ گو اب مین درحقیقت تہ دل سے یہی یقین کرتا ہون کہ یہ جنون کا نتیجہ تھا۔ مارٹینز نے اُس کے سر پر تلوار گھمائی اور جیسے وہ کھڑا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اُس کو کاٹ کے زمین پر گرا دیا۔ جب اُس نے اس ننھے جسم کو اپنے سامنے پڑا دیکھا میرا خیال ہے وہ بھی نادم ہوا۔ کیونکہ اُس نے اپنی تلوار پھینک دی اور ایک طرف کو کچھ بڑبڑاتا ہوا گویا اُس کا ارادہ ایسا کرنیکا نہ تھا مڑ گیا۔ اُسکے افسرون کے جو قسی القلب بدمعاش تھے چہرون پر بھی کچھ نفرت سی ظاہر ہوئی۔ جیسے ہی مارٹینز لپک کے اپنے خیمہ مین گیا وہ بھی سب وہان سے ہٹ گئے۔

اُس کا مرنا میرے لیے جو اُس چھوٹے بھائی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا کیا چیز تھا میرے لیے اس کا بتانا محال ہے۔ جو کچھ مجھ سے ظاہر ہوا اُس کو مین جائز نہین قرار دے سکتا۔ مین آپ کو اتنا بتا سکتا ہون کہ غم و غصہ سے مین بھی نیم دیوانہ ہو گیا۔ گو مین ان بیرحم وحشیون کے ہاتھون مین اسیر تھا اور بظاہر حالات مجھے اگلا روز بھی دیکھنا ممکن نہ تھا لیکن مین نے بھڑکتی ہوئی نفرت کے زبردست جوش و خروش مین سنجیدہ قسم کھائی کہ جب تک مین اپنے بھائی کی موت کے انتقام مین مارٹینز کو نہ مارلون گا اُس کا پیچھا نہ چھوڑون گا۔ فی الواقع مین غلطی پر تھا لیکن مین نادان لڑکا تھا اور طیش بہت زبردست تھا۔

اِس اثنا مین مجھے اپنی ہی فکر دامن گیر ہو گئی۔ دیسی مجھے دھینگا مشتی سے جنگل کے کنارہ پر لے گئے اور تھوڑی جستجو کے بعد اُنھین جس چیز کی تلاش تھی دستیاب ہو گئی ——— دو نوعمر اور لچکدار درخت جو ایک دوسرے سے چند ہی گز کے فاصلہ پر اُگے ہوئے تھے چار پانچ نے اپنے آپ کو

ہر ایک درخت پر ڈال کے اپنے مجموعی بوجھ اور طاقت سے اُن کی چوٹیون کو جھکا ڈالا حتی کہ وہ تقریباً باہم مل گئین۔ اس کے بعد اُنھون نے مجھے ان دونون چوٹیون کے بیچ مین باندھنا شروع کیا۔ سیدھی بانہہ اور ٹانگ ایک سے اور اُلٹی بانہہ اور ٹانگ دوسرے سے۔ جب وہ اپنے اطمینان کے مطابق باندھ چکے اُنھون نے درختون کو چھوڑ دیا جو جہان تک اُن سے ہوسکا فوراً اوپر کو اُٹھ گئے اور مجھے اپنے درمیان مین لٹکا لیا۔ زمانۂ وسطی کے محکمۂ احتساب کے شکنجہ کا یہ کیا خوب ابلیسانہ جدت آمیز جنگلی قائم مقام تھا۔

اس حالت مین ایسی اعضا شکن کھینچا تانی مین گھنٹون لٹکے رہنا ایسا ماجرا ہے جسکے بیان کرنے کی مین کوشش کرنا بھی پسند نہین کرتا۔ نہ مجھے اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت ہے کہ جب مین ہوا مین معلق کسی نادیدنی صلیب پر لٹکا رہا تھا وہ کس طرح نیچے کھڑے مجھ پر آوازے کس رہے تھے اور منھ چڑا رہے تھے اور میرے دُکھتے جسم پر کس طرح ٹوٹی ہوئی بوتلون کے ٹکڑے مار رہے تھے یا مجھے بیلدار درختون کی لمبی لمبی ٹہنیون سے جو اُنھون نے پاس کے درختون سے توڑ لی تھین نیچے سے کسطرح زد و کوب کر رہے تھے۔ مین آپ کے جذبات کو ان نامعلوم الاسم اور ناقابل بیان عذابون کے ذکر سے جو اُنھون نے اس تمام اُچاٹ دن مین مجھ پر توڑے ٹھیس پہونچانا نہین چاہتا۔ لیکن مین اتنا تو بتا سکتا ہون کہ سارے دن جو کچھ بھی سخت سے سخت مصیبتین اُنھون نے مجھے پہونچائین۔ سب سے غالب ایک جذبہ میرے دل و دماغ مین لحظہ بلحظہ زیادہ سوزش پیدا کر رہا تھا۔ یعنی مارٹینز سے سخت ترین نفرت اور اپنے بھائی کی موت کا اُس سے انتقام لینے کا ارادہ۔ مین اس ادھیڑبن مین اسقدر محو تھا کہ مجھے یقین ہے کہ مین نے زیادہ تر اُن کے اُن متواتر سوالات کا کہ کیا اب بھی مین مطلوبہ قسم کھانے کو تیار ہون۔ کچھ جواب نہین دیا لیکن یہ جانتا ہون کہ بعض اوقات مین اُن کا جواب اُن کی جانون پر لعنت بھیجنے اور اُن کو سخت ترین پاداش مین مبتلا ہونے سے ڈرانے کی صورت مین دیتا تھا۔ اس پر پردہ ڈال دینا ہی بہتر ہے۔ اتنا مین ضرور کہون گا کہ اُن کی جدت طرازی ابلیسانہ تھی اور اُن کے وسائل غیر محدود معلوم ہوتے تھے۔

مین سمجھتا ہون کہ وہ آخر کار مجھ سے تنگ آ گئے کیونکہ مین نے اُن کا کہا ماننے کی کوئی علامت ظاہر نہین کی اور اب اُنھون نے محسوس کیا کہ اُن کو معاملہ رو براہ لانے کے لیے انجام پر پہونچانے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ اُنھون نے ایک رسی کو میرے گندھون کے نیچے سے نکال کے مجھے ایک درخت کے ٹہنے سے لٹکا دیا اور میرے پانؤن کے نیچے آگ جلانا شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر مین میرے

پاؤن بُری طرح جل گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گرم ہوا اور دُھوئین نے مجھے ادھموا کر دیا اور ظاہر ہے کہ مین بیہوش ہو گیا ہون گا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے وہ گھبرا گئے کیونکہ اُن کو میرے مار ڈالنے کا حکم نہ تھا اس لیے اس رات وہ اپنے بیرحم کام سے باز رہے۔ لیکن اس کا حال مجھے بالکل معلوم نہین۔

چوتھا باب

فرار

مجھے آہستہ آہستہ اور پراگندہ طور سے ہوش آیا۔ مجھے ہمہ گیر درد و کرب کا عجیب اور خوفناک احساس آنا شروع ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا اس سے لبریز ہے۔ رفتہ رفتہ سخت تکلیف کی دنیا گھٹنے لگی اور ٹھیک اور مستقل صورت پر آ گئی حتی کہ بالآخر مجھے اپنے متعلق محسوس ہونے لگا کہ مین عالم اجسام مین جیتا جاگتا چھوٹا سا لڑکا ہون اور شدید تکلیف مین مبتلا ہون۔ مین نے اپنے آپ کو جنگل کے عین کنارہ پر جو مارٹینر کے خیمہ سے کچھ دور نہ تھا ایک درخت کے ساتھ ایک رسی سے جسکے میرے اور درخت کے گرد کئی بل پڑے ہوے تھے بندھا ہوا پایا جو بطور خود میرے لیے ایک سہارے کا کام دے رہی تھی جسکے بغیر مین ضرور گر پڑتا کیونکہ میرے پاؤن کے تلوے اس بُری طرح جلے تھے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی میرا اُن پر کھڑا ہونا قطعی ناممکن تھا۔

اُس وقت رات تھی اور پڑاؤ میرے سامنے بالکل سنسان پڑا تھا۔ البتہ ادھر اُدھر گشت کرنیوالے سنتریون کی آہٹ آتی تھی۔ اُن مین سے دو مجھسے کچھ دور نہ تھے۔ ایک تو سپہ سالار کے خیمہ کے آگے ٹہل رہا تھا اور دوسرا خیمون کی قریب ترین قطار کے ذرا باہر ایک خاص حصہ پر ذرا لمبی گشت لگا رہا تھا۔ خاص طور سے میری کوئی نگرانی نہین کر رہا تھا۔ حقیقت مین یہ بالکل غیر ضروری بات تھی کیونکہ مین صرف خوب کسا ہوا تھا بلکہ اگر مین کھلا بھی ہوتا تو ایک گز بھی ہل نہین سکتا تھا۔

جیسا کہ آسانی سے خیال کیا جا سکتا ہے میرے خیالات نہایت غمگین تھے۔ میرا بھائی میری آنکھون کے سامنے قتل ہوا تھا۔ میرے والد ایک ایسے لق و دق جنگل مین مفرور تھے جس کی مین جانتا تھا کہ وحشی حیوانون سے بھرا ہوا ہے اور اسکے علاوہ اُن کا تعاقب جان توڑ کے ایسے لوگ کر رہے ہین جو رحم کا نام بھی نہین جانتے۔ یعنی موت کے سوا اور کوئی توقع ہو ہی نہین سکتی تھی اور موت بھی وہ جو نہایت وحشت انگیز اور دردناک ہو۔ اس لیے شاید مجھے یہ اعتراف کرتے ہوے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہین کہ

کچھ عرصہ کے لیے مین بالکل مایوس ہوگیا اور رہ رہ کے ایک تمنا ستانے لگی کہ اسی وقت موت آ کے میری مصیبتون کا خاتمہ کر دے۔ حالات ہر طرح ایسے خراب تھے کہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ ان سے زیادہ اور خراب نہین ہو سکتے مین درحقیقت موت کی دعا مانگ رہا تھا کہ اب مجھ مین مزید برداشت کی تاب نہین۔

لیکن مین اُس سخت کمزوری اور مایوسی کے وقت مجھے کچھ چیز نظر آئی جس نے اُس لحظہ کے لیے وہ جانکنی کی کیفیت بھی میرے دل سے بھلا دی۔ کیونکہ وہان ٹھیک میرے آگے میرا بھائی جیرلڈ کھڑا تھا جسے مین نے چند ہی گھنٹے پہلے مارٹینز کی تلوار سے قتل ہوتے دیکھا تھا! حقیقتہً اس بے رحم وار کا نشان اب بھی اسکے سر پر آرپار موجود تھا ——— ایک بڑا کریہہ زخم تھا جس نے کھوپری کو چیر کے الگ کر دیا تھا اس پر بھی وہ کچھ دہشت ناک نہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ چہرہ کا بشرہ اسقدر خوشگوار تھا کہ زخم کے پیدا کردہ اثر پر وہ بالکل غالب آگیا تھا۔ وہ میرے سامنے اُسی طرح کھڑا تھا جیسے زندگی مین۔ بڑا ڈک کی دور کی روشنیون کی ٹمٹماتی چمک پوری طرح اُس پر پڑ رہی تھی۔ علاوہ ازین اُس کی شکل بھی اپنی علٰحدہ ہلکی روشنی سے گھری معلوم ہوتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت مین ڈالنے والی چیز چہرہ کا بشرہ تھا۔ یہ وہی طفلانہ چہرہ تھا جس سے مین بخوبی واقف تھا جسمین کوئی تبدیلی نہ آئی تھی لیکن پھر بھی وہ کچھ ظاہر کر رہی تھی جو پہلے کبھی ظاہر نہین کیا تھا۔ یہ کہ وہ بذاتہ خوش تھا ——— نہایت ہی خوش اور بالکل آرام وسکون مین تھا ——— ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی شک نہین کر سکتا تھا۔ پھر بھی آنکھون مین حسرت (لیکن یہ حسرت صرف میرے لیے تھی، اپنے لیے بالکل نہین) اور میری حوصلہ افزائی اور ہمت آفرینی کی خواہش بھری ہوئی تھی۔ مین نے بولنا چاہا مگر نہ بول سکا۔ لیکن اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا اُس کا چہرہ محبت کی مُسکراہٹ سے چمک اُٹھا اور اُس نے اپنا ہاتھ میرے سینہ پر پیار سے رکھا۔ اور پھر، ایک لحظہ مین، پیشتر اس کے کہ سنتری جو اپنی گشت کے سرے پر پہونچ گیا تھا پھر اپنا چہرہ ہماری طرف کرے، وہ غائب تھا!

میرے لیے اس اثر کا جو اس خوبصورت ننھی روح نے مجھ مین پیدا کیا بیان کرنا مشکل ہے۔ میری تمام گوناگون تکالیف اب بھی اسیطرح قائم تھین ——— میرا تمام جسم جانکنی کے ایک لوتھڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن میری دماغی حالت اس لمحہ مین پہلے سے بالکل برعکس ہوگئی تھی۔ یاد رکھیے کہ اس وقت مین عالم ملکوت سے بالکل ناواقف تھا۔ نہ مجھے موت کے بعد زندگی کے امکانات کا حال معلوم تھا۔ اس لیے میرے نزدیک ایک خاص غیبی ہدایت تھی، خدا کی جانب سے ایک خاص اشارہ تھا جس نے میرے بھائی

کی روح کو نہ نظر آنے والی دنیا سے واپس آنے کی اجازت دے تھی تاکہ وہ مجھے میری تکلیف مین تسلی دے اور دل بڑھائے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجھے یہ یقین آنے لگا کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہون کسی نہ کسی طرح انجام بخیر ہوگا۔ یا تو گو یہ ناممکن نظر آتا تھا مین کسی طرح بچ نکلون گا اور اچھا ہو جاؤن گا یا اگر مجھے مرنا ہی ہے تو مجھے اطمینان تھا کہ مین جلد اور بلا تکلیف مر جاؤن گا اور پھر اپنے بھائی سے جا ملون گا۔ چونکہ ظاہر حالات بالکل غیر تبدیل شدہ تھے۔ یہ سمجھنا نہ مشکل ہے کہ میری مایوسی ایسی اڑ گئی تھی گویا تھی ہی نہین اور اب مین پُر شوق انتظار کی حالت مین تھا ۔۔۔ یہ انتظار کہ اب کچھ واقع ہونے والا ہے یا تو موت یا کسی قسم کی رہائی۔ موخر الذکر کیا صورت اختیار کرے گی مین بالکل اندازہ نہین لگا سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ صورت حالات پر مین نے غور کیا اور کوئی ایک معقول تدبیر بھی ذہن مین نہ آئی۔

اگر میری یاد درست ہے تو مین خیال کرتا ہون مین نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی قسم کی مدد آسکتی ہے تو ممکن صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی غیر متوقع طریقہ پر حکومت کو اسکی مجبورانہ نقل و حرکت کا حال معلوم ہو گیا ہو جسکے متعلق مارٹینز کو گمان تھا کہ اُسے خبر نہین ہے اور اُس نے بجائے خود ایک فوج اُس کو روکنے اور گھیرنے کے لیے بھیجدی ہو۔ مین جانتا تھا کہ یہ قطعی ناممکن ہے لیکن اور خیالات اس سے بھی زیادہ ناممکن نظر آتے تھے تو یا یہ بات ہو کہ ملائکہ براہ راست میری کچھ مدد کرین۔ مین یہ جانتا تھا کہ اس زمانہ مین یہ بات نایاب ہے لیکن مجھے یقین تھا کہ ضرور کچھ نہ کچھ واقع ہونے والا ہے یا تو مین مارا جاؤن گا یا مین رہا ہو جاؤن گا اور جب کچھ واقعہ ہوا اگرچہ ایسے طریقہ سے ہوا جس کی مجھے ایک لحظہ کے لیے بھی توقع نہین ہو سکتی تھی تو مین کم از کم اس وقت اچنبھے مین رہ گیا۔

مین نے ایک ہاتھ کی مس محسوس کی جو سرکا درخت کے پیچھے سے بڑھا تھا اور فوراً بعد مین مجھے معلوم ہونے لگا کہ جس رسی سے مین اس تکلیف دہ سختی سے کسا ہوا تھا ڈھیلی ہونے لگی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دل مین یہ خیال گذرا کہ میرا درخت کے پیچھے والا نامعلوم دوست غالباً بےخبر ہے کہ مین کھڑے ہونیکے بالکل ناقابل ہون اور جیسے ہی رسی نکل جائے گی مین دھم سے زمین پر جا پڑون گا۔ اس طرح اس کے خیر خواہانہ ارادے پورے نہون گے کیونکہ سنتری کی توجہ اس طرف ہو جائے گی۔ لیکن اس کا صحیح پہلے اندازہ کر لیا گیا تھا۔ میرے نجات دہندہ نے انتظار کیا حتی کہ قریب ترین سنتری کی پشت ہماری طرف

ہوگئی اور پھر جیسے ہی رسّی ڈھیلی ہوئی ایک بانہہ بڑھی جس نے مجھے پکڑ کے جلدی سے کھینچا اور چپکے سے درخت کے پیچھے کر لیا۔ مجھے اتنا وقت مِل گیا کہ مین نے دور کی روشنی کے دُھندلکے مین پہچان لیا کہ میرے بچانے والے میرے والد اور حبشی نوکر ٹیٹو ہین۔ ٹیٹو نے مجھے اپنی گود مین اُٹھا لیا اور ہم جلد جلد جنگل مین خاموشی سے بھاگنے لگے۔

جب ہم تقریباً دو سو گز جنگل مین گھُس لیے ٹیٹو نے مجھے زمین پر ڈال دیا اور اپنا بڑا بند ہونے والا چاقو نکال کے وہ رسیان کاٹ ڈالین جن سے اب تک میری کلائیان بندھی ہوئی تھین۔ لیکن میرے بازو کھُل جانے کے باوجود بیکار محض تھے۔ کیونکہ وہ کئی گھنٹے کسے رہنے سے بُری طرح دب اور کچل گئے تھے۔

ہم نے جلد جلد چند کلمے ایک دوسرے سے کہے۔ والد میری تکلیفون پر کُڑھے۔ مین نے اُن کی بات کاٹ کے اُن سے پوچھا کیا آپ کو معلوم ہو کہ جیرلڈ کا کیا حشر ہوا اور ساتھ ہی ساتھ مین نے اُن کو یقین دلایا کہ مرنے کے بعد وہ مجھے نظر بھی آ چکا ہو۔ میرے والد کی سمجھ مین یہ بات نہین آئی شاید اُنھون نے مجھے ہذیان مین سمجھا ہو اور واقعی جو کچھ مجھپر گذری تھی اُس کو دیکھتے ہوے یہ کوئی عجیب بات بھی نہ تھی خیر، اُنھون نے کہا کہ مجھے جیرلڈ کی موت کا حال معلوم ہو۔ لیکن ہمین باتون مین دیر نہ لگانی چاہیئے۔ بلکہ ہمارے بھاگنے کا حال معلوم ہونے سے پہلے پڑاؤ سے جتنی دور ہم سے نکلا جا سکے نکل جانا چاہیے۔ مین اُن کے لیے ایک فضول بارِ گران تھا کیونکہ ایک قدم بھی نہین چل سکتا تھا۔ اور اگرچہ ٹیٹو مجھے سنبھالے ہوے احتیاط سے لیے جا رہا تھا لیکن مجھے لئے چلنے کی حرکت سے اُس حالت مین بھی سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

اِس گھنے جنگل مین گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور یہ ضروری بات تھی کہ حتی الامکان ہم خاموش اور دبے پاؤن چلین۔ اِس لیے ہماری پیش قدمی لازمی طور سے نہایت سُست تھی۔ لحظہ لحظہ ہمین ڈر تھا کہ خبر ہو کے غُل مچ جائے گا اور ہمین تعاقب شروع ہو جانے کی آواز آنے لگے گی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ سنتری کو میرے غائب ہو جانے کا علم نہ ہو سکے گا کیونکہ جس درخت سے مین بندھا تھا وہ اُس سے کچھ فاصلہ پر تھا اور جنگل کے کنارہ پر ذرا سایہ مین تھا اور پڑاؤ کی روشنیان جو اُس جگہ پر ایک دو گھنٹہ پیشتر اُجالا ڈال رہی تھین اُس وقت گُل ہوتی جا رہی تھین۔ وقت گذرتا گیا اور کوئی بات واقع نہین ہوئی اور جتنا ہم بڑھ سکے بڑھتے چلے گئے۔ اگرچہ ہماری انتہائی رفتار بھی ناخوشگوارانہ نہایت سُست تھی مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ ہم کدھر کو جا رہے ہین کہ محض یہ خیال ہمارے پیش نظر تھا کہ ہمارے اور پڑاؤ کے

درمیان جتنا فاصلہ بھی ڈالا جاسکے ڈالدینا چاہیے۔ تھوڑی دیر مین ہمین زمین اُٹھتی ہوئی معلوم ہوئی جو بعض مقامات پر بہت کچھ ڈھلاؤ کے ساتھ تھی۔

ہمارے مقصد کے خلاف دن جلد نکل آیا اور زمین نے تاریک رات سے اس تیزی سے جو قطبون کی خصوصیت ہو روشن مین جست کی۔ صبح کا ذب کے نظر آتے ہی ٹیٹو نے مجھے آہستگی سے نیچے اُتارا اور میرے والد سے کہا کہ وہ میرے پاس ٹھہر جائین اس اثنا مین وہ خود کوئی چھپ رہنے کی جگہ ڈھونڈے گا کیونکہ یہ بالکل ظاہر تھا کہ ہم ڈیرہ کے اتنے نزدیک تھے کہ اگر ہم کوئی چھپنے کی جگہ نہ ٹٹولین ہم گرفتار ہو سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ مین تھکان سے بیہوش اور غافل ہوتا چلا جا رہا تھا اور ٹیٹو اُنے جو دوا دریل سے جس صورت مین کہ وہ حبشیون مین رائج تھی کچھ واقفیت رکھتا تھا۔ میرے لیے اب آگے بڑھنا خطرناک سمجھا۔

تھوڑی تلاش کے بعد اُسے ایک جگہ مل گئی جو ہمارے لیے خوب موزون تھی۔ وہ مجھے وہان لے جانے کے لیے پلٹ آیا۔ ایک نامعلوم زمانہ کا ایک پُرانا بڑا درخت تھا جو اندر سے بتدریج کوکھ ہو گیا تھا اور اسمین ایک کمرہ سا بن گیا تھا جس کی تہ مین گلی ہوئی لکڑی کا ملام چُورا یعنی ایک قسم کا قدرتی بُرادہ اکٹھا ہو کے گدگدے فرش کا کام دے رہا تھا۔ ویسے دیکھنے مین باہر سے یہ درخت اپنے آس پاس کے درختون کی طرح مضبوط اور درست نظر آتا تھا۔ اس شجری کمرہ مین داخل ہونے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ اس پر اندازاً پندرہ فٹ چڑھ کے ایک گڑھے مین جہان سے ایک گڑھا ایک صدی پیشتر ٹوٹ کے گر پڑا تھا اُتر پڑین۔ اب سوال یہ تھا کہ مجھے اس مین کس طرح لیجائین لیکن یہ کام ضرورت کا تھا۔ اس لیے آخرکار یہ پورا ہو گیا۔

میرے والد نے پوچھو جو اُنھین ایک روز پیشتر دیا گیا تھا اُتار ڈالا مجھے اُسپر لٹا دیا گیا۔ اور اسکے کونے باہم باندھ کے اسکو ایک قسم کا ہنگولا بنا دیا گیا۔ ٹیٹو نے اسمین اُس رسی کا پھندا ڈالا جس سے مین درخت کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور جسکو وہ اپنی مآل اندیشی سے اپنے ساتھ لیتا آیا تھا کہ ایسے مصیبت کے وقت مین تنکا کا بھی سہارا ممکن ہو۔ اسکے بعد وہ اُس درخت پر کچھ اونچائی تک چڑھ گیا۔ والد نے اُس رسی کا سرا اس کی طرف اُوپر کو پھینکا۔ اُس نے آہستہ آہستہ اور نہایت احتیاط سے مجھے زمین سے کھینچنا شروع کیا حتی کہ مجھے تنے اور بڑے پھل نما درخت کے ٹہنے کے بیچ مین جما دیا۔ پھر اُس نے اتر کے والد کو چڑھایا اور اُن کو اندیشہ تاکہ

صورت میں ٹہنے کو پکڑے ہوے اور مجھے سبنھالے ہوے چھوڑکے خود ذرا اور اونچا چڑھ گیا اور گڑھے کے برابر پانوں جمانے کی جگہ کرکے رسی کے ذریعہ مجھے اوپر کھینچا اور اپنے برابر کرلیا۔ پھر وہ آہستگی سے اس چوڑے پر کودا جس نے اندر کا فرش زمین کی سطح سے بہت بلند کر رکھا تھا اُس کے بعد والد بقیہ فٹ اوپر چڑھے اور اُنھوں نے مجھے احتیاط سے جھکا کے ٹیٹو کی گود میں دیدیا۔ اُس کے بعد جلدی سے انھوں نے مجھے فرش پر لٹا دیا۔ اتنی دیر تک تکلیفیں جھیلنے اور مصیبتیں اُٹھانے کے بعد اس ہموار جگہ پر لیٹنے میں مجھے بڑا آرام معلوم ہوا۔

میں سونا چاہتا تھا لیکن مجھے بخار چڑھ آیا تھا۔ مجھے یقین ہو کہ دن میں زیادہ تر مجھے شاید ہی ہوش رہا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی مجھپر ہذیان طاری ہوجاتا تھا۔ مجھے حالات گردوپیش کا مطلق ہوش نہیں رہا۔ لیکن والد نے مجھے بعد میں بتایا کہ جیسے ہی ہمنے یہاں دم لیا ڈیرون کی طرف سے بڑے شوروغل کی آواز سنائی دی اور کچھ چیخ پکار رہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کھلبلی مچ گئی ہو۔ وفادار ٹیٹو نے اپنے اس درخت کی چوٹی پر چڑھ کے یہ سب کچھ دیکھا کیونکہ اُٹھی ہوئی زمین کی وجہ سے اُسے پڑاؤ کا بہت سا حصہ نظر آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ بڑی گڑبڑ اور ہڑبونگ مچ رہی ہو اور سپاہیوں کے بڑے بڑے دستے جنگل کے مختلف اطراف میں سرگرم ہماری تلاش میں بھیجے جا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ ہماری گرفتاری مارٹینز کی تدابیر کے لیے نہایت ضروری تھی۔ جو فوجیں حکومت نے اُس کے تعاقب میں بھیجی تھیں اُن سے وہ کامیابی کے ساتھ کترا کے نکل آیا تھا۔ چند روز کی ناقابل یقین مجبورانہ نقل وحرکت کے بعد وہ اپنے آدمیوں کو ایسی جگہ لے آیا تھا جہاں سے وہ آسانی سے کسی بڑے اہم قصبہ پر حملہ کرسکتے تھے۔ اس کی نقل وحرکت کا حکومت کو شان و گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔ جو اس جگہ میں آگئی تھی کہ وہ اس کے برعکس سمت میں بڑھ گیا ہو۔ اصل میں حکومت اس چھوٹے دستہ کو مغلوب کرنے میں مصروف تھی جسکو اُس نے وہاں اُسے دھوکہ دینے کے لیے چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُسے یہ خیال گذرنے لگتا تھا کہ بس یہی اُس کی کل جمعیت ہو۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو اس مقام پر ٹھہرا رکھا تھا جہاں ہماری اُس سے ملاقات ہوئی۔ اس جگہ وہ اُن کو اس مجبورانہ نقل وحرکت کے بعد اس شہر پر حملہ کرنے سے پہلے چند روز آرام دینا چاہتا تھا۔ اس بیابانی علاقہ میں قرین عقل تھا کہ وہ کسی کو نظر نہ آئے اور نہ اُس کی وہاں موجودگی کی کسی کو خبر ہو۔

لیکن اگر مین اور میرے والد یا ہم مین کوئی ایک بھی بچ نکلے اور کسی ناقابل یقین طریقہ سے قریب ترین مکان یا گاؤن مین پہونچ کے ساحلی شہر مین یہ خبر پہونچا دے تو مارٹینز کی یہ تمام برتری وترقیت خاک مین ملجائے۔ اور چونکہ اُس نے اس دلیرانہ چال پر اپنی ساری بازی لگا رکھی تھی ہم کہہ سکتے ہین کہ نہ صرف میدان اُس کے ہاتھ سے نکل جائے بلکہ اُس کی جان بھی بلاشبہ جاتی رہے۔ اس لیے ہم لوگون کا کسی طرح بھی ہو گرفتار کر لیا جانا اس کے لیے نہایت ضروری تھا اِس لیئے اُس نے اپنے آدمیون کو منسوبہ آرام لینے کے بجائے ہماری تلاش مین جنگل کا چپہ چپہ ڈھونڈھنے پر لگا دیا۔ اور یہ بخوبی معلوم تھا کہ ہم کچھ دور نہ گئے ہون گے کیونکہ اُسے اسکا علم تھا کہ کم از کم مین بُری طرح زخمی تھا۔ اور میرے والد کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ نہ اُسے اس کا وہم وگمان ہو سکتا تھا کہ ہم اُن لاکھون کروڑون خطرون سے جن مین ہم اِس جنگل مین گھرے ہوئے تھے ایک دِن کے لیے بھی بچ سکتے ہین۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ ٹیٹو کی بیش قیمت امداد تھی جو ان سب باتون کو جانتا تھا اور جنگل مین اپنی حفاظت کرنے اور اس مین سے خوراک حاصل کرنے کے طریقون سے واقف تھا۔

اُنھون نے مجھے بتایا کہ سپاہیون کے گروہ بار بار اس درخت کے پاس سے جسمین ہم چھپے ہوے تھے گذرے۔ اُن کو ان کی گفتگو کا کچھ کچھ حصہ بھی سنائی دیا۔ اور ٹیٹو نے جو ان کی زبان بخوبی جانتا تھا بتایا کہ وہ زیادہ تر جادو اور امداد غیبی کا ذکر کرتے تھے۔ اُن کی گفتگو سے یہ عیان تھا کہ مارٹینز کے دِل مین بھی توہمات پیدا ہو رہے تھے اور وہ سخت خوف وہراس مین تھا۔ وہ سوچتا تھا معلوم ہوتا ہے اُس کے کسی افسر نے یہ بات اُس سے کہی تھی کہ جیرلڈ کو مار ڈالنے سے اُس نے اپنے آپ کو نحوست اور شامت اعمال کا نشانہ بنا دیا ہے۔ اُس کی سمجھ مین اور اصل مین اسکے سب ساتھ والون کی سمجھ مین یہ بات نہ آتی تھی کہ میرے والد جبکہ وہ صاف طور پر ایسی مضبوطی سے بندھے ہوے تھے کس طرح اچانک کھُل کے بچ نکلے اور وہ میرے غائب ہو جانے کو جبکہ مین حقیقت مین قریب المرگ تھا مافوق العادۃ تصرف تصور کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میرے والد نے کہا کہ ایک دفعہ کچھ سپاہی ہمارے درخت کے عین پاس دم لینے کے لیے بیٹھ گئے۔ ٹیٹو نے اُن کی گفتگو کو بڑے شوق سے کان لگا کے سنا کیونکہ اُس کو یہ خیال تھی کہ شاید کوئی مطلب کی بات ہاتھ آجائے جس سے ہمین فائدہ پہونچے۔ اور میرے والد کو یہ خوف مارے

ڈالتا تھا کہ مین اپنے ہذیان کی ہلکی بڑبڑ سے اپنی جائے پناہ کو نہ ظاہر کر دون۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہوا اور تیسرے پہر کے عمل مین مین گہری پر سکون نیند مین ہو گیا۔ جس سے اُنھون نے مجھے اس وقت جگایا جب اندھیرا چھا گیا تھا اور وہان سے روانہ ہونے کا موقع تھا۔

اِس اثنا مین ٹیٹو نے کئی دفعہ اپنی جائے پناہ سے باہر نکل کے اپنی جان خطرہ مین ڈالی تاکہ میرے لیے پانی لائے اور ایسے پتے تلاش کرے جن کو وہ پہچانتا تھا۔ ان پتون کو اُس نے چبا کے لئی سا بنایا اور اسے میرے جلے ہوے پاؤن اور چند گہرے زخمون پر لگایا۔ مجھے معلوم نہین کہ وہ کیا دوا تھی لیکن درد کے دور کرنے مین اُس نے جادو ہی کیا کیونکہ جب مجھے شام کو جگایا گیا تو اگرچہ مین اس وقت بھی کمزور اور حالتِ کرب مین تھا۔ لیکن مین صبح کے مقابلہ مین بہت اچھا تھا اور اس وقت بخار کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ سپاہی رات پڑنے سے پہلے ہی اپنے ڈیرون کو چلے گئے تھے لیکن جو کچھ ہم اُن کی گفتگو سُن پاے تھے اِس سے بلا شبہ ترشح تھا کہ جستجو اگلے روز بھی جاری رکھی جائے گی۔ مجھے اپنے ملائم بستر کے چھوڑنے کا بڑا قلق ہوا اور سچ یہ ہے کہ وہان سے سرکنے کو ایسی صورت مین کہ ہمین ایسی عمدہ جائے پناہ میسر آگئی تھی قرینِ مصلحت سمجھنے مین مجھے تامل تھا۔ لیکن ٹیٹو اور میرے الدکے دلون کو یہ لگی ہوئی تھی کہ جب تک وہ پڑاؤ سے بہت دور نہ نکل جائین وہ چین نہ لین۔

انھون نے اپنی اس جائے پناہ سے مجھے زیادہ تر اُسی طریقہ سے نکالا جس طرح وہ مجھے اندر لے گئے اور ہم پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ زمین کی افتاد بلندی ہی کی طرف معلوم ہوتی تھی اور چند مرتبہ ہم رات کے عرصہ مین چھوٹی چھوٹی کھلی جگہون مین آئے جہان سے ہم اپنے دشمنون کے پڑاؤ کی روشنیون کو دیکھ سکتے تھے جو ہم سے بہت نشیب مین تھین۔ جو جو ہم اُوپر کو چڑھتے گئے درخت کسی قدر کم گنجان ہوتے گئے اور ہماری رفتارِ ترقی کچھ بھی ہو خاصی تیز تھی۔ یا یون کہنا بہتر ہوگا کہ پہلے سے کم آہستہ تھی۔ پھر کبھی اور ٹیٹو چھپنے کی جگہ ڈھونڈھنے لگا۔ لیکن اس دفعہ کوئی معقول کھوکھلا درخت نہ مل سکا۔ ہم جنگل کے عظیم الشان درختون کے خطہ مین تھے جن کے بیچ بیچ مین اکثر چوڑے چوڑے میدان تھے۔ لیکن وہ اتنے بڑے بڑے تھے کہ اگرچہ اُن کے تنے ایک دوسرے سے سو سو دو دو سو گز کے فاصلہ پر تھے لیکن اُن کی شاخین ہمارے سرون پر بہت اونچائی پر باہم مل گئی تھین۔ ان دیوہیکل درختون پر چڑھنا غیر ممکن ہوتا لیکن تقریباً ہر درخت کے ساتھ بڑے بڑے مہاگنی قسم کے درخت جن کے تنے ان سرد شمالی سرزمینون کے بہت سے درختون کے تنون جتنے

بڑے ہوں گے ان کے شاندار تنوں کے گرد لپٹتے ہوئے چلے گئے تھے۔ جن کی وجہ سے ان پر چڑھنا کسی پھرتیلے آدمی کے لیے مقابلتہً آسان ہو گیا تھا۔

جب ٹیٹو چھپنے کی جگہ ڈھونڈھتا پھر رہا تھا اُسے خیال آیا کہ ان بڑے درختوں میں سے کسی پر چڑھ کے دیکھے کہ ہمارے دشمن کیا کر رہے ہیں۔ بغیر کچھ ایسی دقت کے اُسے ایسی جگہ مل گئی جہاں سے پڑاؤ اب بھی صاف نظر آتا تھا گو بعد فاصلہ کی وجہ سے اب چھوٹا سا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے پہلی سی بھاگ دوڑ اور تیاری اور نوجون کی روانگی دیکھی۔ لیکن اگرچہ اُسے کوئی انوکھی بات نہیں نظر آئی۔ تاہم اُسی وقت اس نے کوئی آواز سنی جس سے تیر کی طرح نیچے اُتر پڑا اور ہمارے پاس دوڑتا ہوا آیا۔ اُس کے چہرہ کا رنگ عجیب طرح کا سیسہ جیسا ہو رہا تھا جو قریب قریب وہ رنگ ہے جب حبشی خوف کے مارے سفید ہو جاتا ہے۔

اُس نے کہا۔ میرے آقا! کتے! اُنھوں نے ہم پر غلاموں کے کتے چھوڑے ہیں سنیئے! جب ہم نے کان دھر کے سنا تو واقعی دور سے ایک کھوجی کتے کے زور سے بھونکنے کی آواز سنی۔ ہمیں معلوم تھا کہ ان بڑے کتوں کو اندرون ملک میں بعض غلاموں کے مالکوں نے مفرور غلاموں کا کھوج لگانے کے لیے پال رکھا ہے لیکن یہ مارٹینز کے کیسے ہاتھ لگے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تو یہی قیاس کر سکا ہوں کہ اُس کے آدمیوں میں کوئی ایسا شخص ہو گا جسے کسی اندرونی آبادی میں اس نسل کی موجودگی کا حال معلوم ہو گا۔ اور اُس نے اس کی خبر اپنے افسر کو کی ہو گی اور جب مارٹینز کو ان کا حال معلوم ہوا ہو گا اُس نے کچھ آدمی ان کتوں کو مانگنے کے لیے بھیجے ہوں گے گو ایسا کرنے سے اس بستی کے کم از کم چند آدمیوں کو اس جگہ اس کی موجودگی کا حال معلوم ہو گیا ہو گا۔ اصل میں مجھے اس کی خصلت معلوم ہونے کی وجہ سے اور بھی اندیشہ ہے۔ اس نے شاید ہر فرد و بشر کو خاموش کر دینے کا خوفناک مؤثر طریقہ اختیار کیا ہو۔ شائد قتل عام کیا گیا ہو۔

کچھ بھی ہوا ہو کتے آ رہے تھے اور اُن کے ہمارا کھوج نکال لینے میں کس کو شبہ ہو سکتا تھا۔ اُنھیں نہ صرف ہماری پہلی چھپنے کی جگہ معلوم ہو جائے گی بلکہ وہ جگہ بھی جہاں اب ہم کھڑے تھے۔ ہمارا اُن سے بچ نکلنے کا بہت ہی کم موقع نظر آتا تھا۔ میں نے اس نسل کی غیر مانوس و ناقابل رام تناسی اور کھوج کو آخر تک پہنچا دینے کی ہٹ دھرمی کی کہانیاں سُنی تھیں۔ ہم نے چھپنے کی جگہ ڈھونڈھنی چھوڑ دی بلکہ بے تحاشا یوسانہ پہاڑوں کی چوٹی کی طرف چڑھتے چلے گئے۔ لیکن ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہمارے تعاقب کرنیوالوں کی

رفتار ہمسے کہین زیادہ تیز ہوگی اور اب ہم گرفتار ہونے سے کسی طرح نہین بچ سکتے۔
ٹیٹو کو کسی حد تک نیم وہم و باطل پرستی کی وجہ سے ایک خیال آیا کہ خون کی بُو کتون کی سونگھنے کی تیزی کو ضائع کردیتی ہی اس لیے اُس نے اپنا بڑا چاقو نکالا اور اُس سے اپنے بازو مین ایک چھوٹا سا گھاؤ کیا۔ خون جو کثرت سے نکلا اُس نے اُس جگہ جہان ہم کھڑے تھے چارون طرف چھڑک دیا۔ اِس طریقہ پر اُس کا اعتقاد تھا گو اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بعض کتون پر یہ عمل بے اثر رہا ہی۔ اس لیے یہ ہماری امیدون کی عمارت کو سنبھالنے کیلئے ایک کمزور سینک معلوم ہوئی۔ ہم اسوقت ایک قسم کی چوٹی کے سرے پر تھے۔ ہمارے آگے زمین پھر ڈھلاؤ ہوگئی تھی اور ایک قسم کا غار بن گیا تھا جس کی تہ مین ایک پایاب چشمہ بہ رہا تھا۔ چشمہ کے دوسری طرف زمین پھر اونچی ہوگئی تھی اور پہاڑی کا دامن ہمارے سامنے پھیلا چلا گیا تھا۔ جیسے میرے والد مجھے اپنی بانہون مین سنبھالے ہوے تھے میرے دل پر ایک قسم کا القا ہوا۔ مین نے جوش کی حالت مین کہا۔ ابا! کیا آپ کو اسکاٹلینڈ کی تاریخ یاد نہین رہی؟ آپکو یاد ہوگا کہ رابرٹ بروس کا کس طرح ایک مرتبہ کھوجی کتون نے تعاقب کیا اور وہ کس طرح پانی مین چل کے اپنا کھوج گم کرکے اُن سے بچ کے نکل گیا۔
امید کی ایک جھلک میرے والد کی آنکھ مین نظر آئی۔ اُنھون نے کہا۔ کیون نہین۔ مین نے وہ قصہ سُنا ہی۔ اس کو عرصہ ہوا جب مین مدرسہ مین تھا۔ ہم اُس کی کم از کم آزمائش کرسکتے ہین۔
اُنھون نے جلدی جلدی ٹیٹو کو یہ طریقہ سمجھایا جس کی شروع مین کچھ سمجھ مین نہین آیا۔ لیکن جب یہ خیال اُسکے ذہن نشین ہوگیا اُس نے کہا۔ یہ ٹھیک ہی۔ واقعی بو پانی مین نہ رہے گی۔ لیکن پھر کیا ہی ہم دریا مین تو نہین پڑے رہ سکتے۔ اور جب ہم پھر باہر نکلین گے کتے ہماری پھر بو لے لین گے۔
مین نے کہا نہین ٹیٹو یہ بات نہین ہی تم دریا مین چلے چلو یہانتک کہ تمھین اُس پر لٹکتی ہوئی کوئی بڑی شاخ نظر آئے پھر تم زمین چھوئے بغیر شاخ کے ذریعہ باہر آجاؤ۔
والد نے کہا۔ یہ بات ہی! آؤ اسے کرکے دیکھین۔ شاید اس سے کام نکل جائے اور اس کے سوا اور کوئی صورت بھی تو نہیں ہی۔
میرے خیال مین ٹیٹو کو اس مین تامل تھا کیونکہ اُس کے دل مین ان خوفناک کتون کی جایز دہشت تھی۔ لیکن ہم غار مین اُترے چلے گئے۔ پھر پایاب چشمہ مین پڑکے سنبھل سنبھل کے چلنے لگے۔

اُن کو تھوڑی دور چلنا پڑا۔ (مین نہین کہہ سکتا کیونکہ مین اس تمام عرصہ مین سوار ہی رہا اور مین درد و تاسف سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری وجہ سے اس جماعت کو خطرہ کتنا بڑھا ہوا تھا) قبل اسکے کہ ہم کو موقع کی کوئی شاخ ملے جسے ٹیٹو حصول مقصد کے لیے ممکن سمجھے۔ لیکن اس پر بھی وہ دو مین شاخین جو ہمارے لیے موزون ہو سکتی تھین چھوڑتا چلا گیا کیونکہ وہ ایسے بڑے بڑے درختون کی تھین جو الگ تھلگ کھڑے تھے اور وہ ایسی جا ستا تھا جس سے بچ نکلنے کے لیے ایک سلسلہ درختون کا ہاتھ آ جائے۔ اس اثنا مین کتون کی بھونکنے کی آواز ہاتھ پاؤن پھیلانے کے لیے نزدیک آ گئی لیکن آخر کار ہم ایک ایسی شاخ کے پاس پہونچ گئے جو ٹیٹو کی باریک بین اور روہی طبیعت کے مطابق تھی کیونکہ وہ ایسے درخت کی تھی جسکی شاخین دوسرے درختون کی شاخون سے گتھی ہوئی تھین اس طرح کہ ہمارے لیے (بندرون کی طرح) اس جگہ پر جو جنگل کی دوسری منزل کہلاتی ہے راستہ بنانا ممکن تھا۔ شاخ موٹی اور مضبوط تھی لیکن کودنے سے بھی ہاتھ نہ آ سکتی تھی اور پھر ایک اور مشکل پیش آئی چشمہ گھٹنے گھٹنے گہرا تھا اور اُس مین چلنا ہمارے لیے آسان تھا۔ لیکن اگر میرے والد اسکے کنارہ پر مجھے لٹا دیتے تو ان بیرحم حیوانون کو جو ہمارا تعاقب کر رہے تھے ہمارا کھوج معلوم ہوتا تھا۔

محمد ظفر

مین اس کو دیکھتا ہون وہ ہو جلوہ گر کہین
زاہد مری نگاہ ہی تیسری نظر کہین

عیار بھی ہو شوخ بھی ہو خود نما بھی ہو
تم دیکھتے کہین ہو نظر ہی مگر کہین

پروانے کی طرح نہ کلیجا جلائیے
بجھ جائے دل نہ صورت شمع سحر کہین

دل کو طریق عشق مین سمجھا ہی بنے خضر
گمراہ کر نہ دے مجھے یہ راہبر کہین

وہ دل کو دیکھتے ہین ہم اُن کی نگاہ کو
اُن کی نظر کہین ہے ہماری نظر کہین

آگے بڑھے نہ راہ محبت مین مجھ سے دل
پیچھے نہ چھوڑ جائے مرا ہمسفر کہین

وہ جلوہ گر قریب سے ہونگے کہ دور سے
یہ فیصلہ بھی اُٹھ نہ رہے حشر پر کہین

تاثیر اسپہ وحشت دل کی ہی پڑ رہی
دیوانہ ہو نہ جائے مرا چارہ گر کہین

پیمان شکن کے قول پہ اترا رہے ہو تم
اور آج بھی نہ آسکے وہ آئینہ اگر کہین

[illegible]

نظرے خوش گذرے

۹ مارچ کو علی گڈھ مین جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد تھا۔ اِس قومی درسگاہ کے شوق زیارت سے بیتاب ہوکر خاکسار ایڈیٹر بھی چلا گیا۔ وہان سے ایک دوسری زیارت گاہ پر جبین سائی کرتا ہوا ایک ہفتہ کے بعد لکھنؤ واپس آیا۔ علی گڈھ ہی مین سردی کھا گیا تھا مسلسل بدنظمی اوقات اور بدعنوانی غذا کے باعث طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اور اس وقت سے باوجود علاج باقاعدہ کے ابتک صحت نہین حاصل ہو سکی ہی۔ الناظر پر صرف اِس کا یہی اثر نہین کہ کچھ دیر سے شائع ہوگا بلکہ سفر حجاز کی روداد بھی اِس دفعہ تیار نہو سکی۔ انشاء اللہ آئندہ نمبر مین اِس کی تلافی کردی جائے گی۔

"استبداد ادبی کا ایک جدید شکنجہ" مطبوعۂ الناظر ماہ جنوری کے جواب مین مسلم یونیورسٹی گزٹ نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب وائس چینسلر مسلم یونیورسٹی کا سرکاری جواب ۲۰ فروری کی اشاعت مین چھاپا ہی اُس مین مضمون "فلسفۂ ازدواج" کے اقتباسات دیکر اعتراف کیا گیا ہی کہ

"جسوقت میگزین کا یہ نمبر (جو مضمون 'فلسفۂ ازدواج' کی وجہ سے بحق یونیورسٹی ضبط کیا گیا تھا) طبع ہوا اور اس کی چند کاپیان یونیورسٹی مین تقسیم ہوئین تو چند مسلمان پروفیسرون کو جو انگلستان کے تعلیمیافتہ ہین اور جن کے خیالات اور طرز عمل پر مذکورہ بالا فقرون کے مضمون کا اطلاق ہو سکتا تھا سخت شکایت ہوئی اس سبب سے باقی ماندہ نمبرون کی اشاعت روکدی گئی۔"

جسکے صاف و صریح معنی یہ ہین کہ اساتذۂ یونیورسٹی کو خود ذمہ دار منتظمین کی طرف سے رخصت نہین بلکہ ترغیب و تحریص دلائی جاتی ہی کہ وہ علی الاعلان شعائر اسلامیہ اور شریعت محمدیہ سے انحراف کرین۔

اِس اعتراف سے مسلم یونیورسٹی کی شرع کا یہ کلیہ بھی اخذ ہوتا ہی کہ کالج کی چاردیواری مین کسی امر واقعہ کا بیان کرنا جرم ہی۔ کیون نہو جبس حکومت کے ظل عاطفت مین یونیورسٹی ہی جب حق گوئی کے صلہ مین وہ مہاتما گاندھی جیسے بے نفس اور برگزیدہ شخص کو مجرم قرار دیدیتی ہی تو یونیورسٹی کیا اتنا بھی حق نمک ادا نہ کرے کہ سچی باتون کی اشاعت کو روکدے اور سچ کہنے والے کو مجرمین شرع اسلامیہ سے معافی مانگنے پر مجبور کرے۔ فتدبرو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

النّاظر

نمبر ۱۵۴ جلد ۲۶ — اپریل ۱۹۲۴ء

فیہ مافیہ

(اثر: چلپی)

فطرت کی نیرنگیان اکثر آنسوون کے دامن مین مسکراہٹون کو چھپائے رہتی ہین۔ بڑے سے بڑا پُر درد واقعہ عموماً اپنے پہلو مین بعض پر لطف و دلچسپ مناظر رکھتا ہی چنانچہ عزل خلیفہ و شکست خلافت کا حادثہ عظمیٰ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہین۔

اس سلسلہ مین ایک خاص طور پر پُر لطف تماشہ فرنگی محل کی "محلسرا" مین کئی ہفتون سے ہو رہا ہے۔ شریف مکہ کے اعلان خلافت کرتے ہی فرنگی محل کے نامور عالم گاندہی جی کے مشہور "پس رو" نے اپنی پیش روی کے ثبوت مین اُن کے نام تہنیت کا تار روانہ کیا اور اس کی نقل اخبارات مین بھی شایع فرمائی۔ اکولہ (برار) کے ایک کارکن خلافت، اور روزنامۂ خلافت (بمبئی) کی جانب سے اعتراض شایع ہوا، کہ ایک غدار و باغی کو جامع الشروط خلیفہ تسلیم کر لینا کیا معنی؟ جواب نکلا کہ تار کا مضمون انگریزی مترجم کی غلطی سے مسخ ہو گیا لیکن نفس تہنیت و مبارکباد کی تردید اب بھی نہ ہوئی۔ اتنا جزو تصحیح کے بعد بھی بدستور ہون کا تون رہا۔

یہان تک بھی غنیمت تھا اصلی پُر لطف شے وہ پُر غضب سلسلۂ مضامین ہے، جو

مضمون نگارون کے مختلف اسماء گرامی، لیکن طرز انشا و ضعف استدلال کی یکسانی کے ساتھ، ان بدبخت معترضین کے خلاف شایع ہو رہا ہی اور پھر بھی جذبات غیظ و غضب کی تسکین نہین ہوتی۔ ان مضامین مین قہر و خشم ہے، اور طنز و تعریض، ڈراوے ہین اور دھمکیان۔ تاویلات ہین اور ادعا آت، معترضین کی تجہیل ہے اور تفسیق، اور یہ سب کچھ صرف اس معصیت کبیرہ کی بنا پر کہ ان شامت زدون نے اُس ہستی پر تنقید کی جسارت کی، جو تنقید سے ماورا، اعتراض کی زد سے برتر، اور بشری کمزوریون سے پاک و منزہ ہے!

ان خوش ظرف عقیدتمندون سے تو نہین، البتہ خود جناب مولانا کی خدمت مین بہ صد خلوص و نیاز التماس ہے، کہ پبلک زندگی صرف اُن لوگون کے لئے ہی جو ہر قسم کے اعتراضات سُننے کا تحمل، اور نکتہ چینی کی برداشت کی قوت رکھتے ہون۔ نہ یہ کہ ادہر کسی بے ادب کی زبان چون وچرا پر کھلی، اور اُدھر اُس پر مریدون و معتقدون کی جماعت نے یورش کردی، کہ بدنیتی کا پردہ فاش کردیا جائیگا" ریشہ دوانیون" کی "پردہ دری" کرکے رکھدی جائیگی، وقس علی ہذا۔ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے، ممکن ہے، کسی وقت اُس غریب کو بھی یہ شعر یاد آجائے ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ دامن کی حکایت،
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ!

اُس وقت "ترکھ" پیسار" اور "بڑے گاؤن" کے خوش عقیدہ لیکن نو مشق مضمون نگارون کے لئے جنبش قلم شاید اسقدر آسان و خوشگوار نہ رہجائے۔ خدائے تعالی سے دعا ہے کہ وہ جناب مولانا کو اپنے نادان دوستون سے محفوظ رہنے اور اپنے حقیقی مخلصین اور خیر اندیشون کی شناخت کی توفیق عطا کرے۔

عزل خلیفہ ہی کے سلسلہ مین ایک دوسری دلچسپ خبر یہ ہے کہ مسلمانان ہند کو

ہیجان غم و ہجوم بلا میں محصور دیکھکر ان کے دیرینہ کرمفرما و غمخوار، صوبہ متحدہ کے سابق خداوند حکومت، لارڈ مسٹن بہادر، بالقابہ العظیمہ، سے بالاخر ضبط نہ ہوسکا اور لارڈ موصوف نے اپنے قلم کو حرکت دے ہی دی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ آیندہ بجائے بیرون ہند کے منصب خلافت کو اندرون ہند، زیر سایہ عاطفت مملکت برطانیہ منتقل کردیا جائے، اور اس عہدہ کے لئے اسلامی ہند کے سب سے بڑے مسلمان رئیس کا نام بھی پیش فرمادیا گیا ہے۔ خداوند قدوس و تعالیٰ کی خلافت کے مسئلہ مین ظاہر ہے کہ "خداوند مجازی" کے "خلیفہ برحق" سے بڑھکر کس کا فتوےٰ مستند ہوسکتا ہے، اس مین تو چون وچرا کی گنجایش ہی نہین ہوسکتی، البتہ بعض "دانایان راز" کا قول ہے، کہ کسی دوسرے کا نام پیش کرنا محض ممدوح کے خلقی انکسار کا تقاضا، اور طبعی ایثار کا ثمرہ ہے، ورنہ درحقیقت، اس بار عظیم کے تحمل کی صلاحیت، اگر کسی فرد بشر مین ہوسکتی ہے، تو وہ خود لارڈ مسٹن ہی کی ذات ستودہ صفات ہے، جس نے واقعہ مسجد کانپور مین ثابت کردیا تھا، کہ فقہ اسلامی مین اگر کوئی شخص مرتبہ اجتہاد رکھتا ہے، تو وہ اُسکی، اور صرف اسی کی ذات گرامی ہے ؎

کب مد مقابل آئینہ تھا،
تم نے اپنی طرف نظر کی!

نیویارک سے خبر آئی ہے، کہ شکاگو (امریکہ) کے شفاخانہا مین مین اب ہر ہفتہ ڈیڑھ سو نئے داخلہ ہونے لگے ہین۔ ڈاکٹر جیمس ہال، صدر انجمن تحقیقات جنون کی تحقیق مین، دیوانون کی تعداد مین یہ خوفناک اضافہ نتیجہ ہے مے نوشی کا۔ ڈاکٹر موصوف فرماتے ہین کہ شراب کے زہریلے اجزا، نظام بشری مین رفتہ رفتہ سرایت کرکے جسم و دماغ دونون کو مسخ کردیتے ہین، اور اچھے بھلے انسانون کو چور، نقب زن، آبرو باختہ، بے حیا، اور خطرناک دیوانہ بنادیتے ہین۔
یہ مغربی تمدن کی ایک برکت خود ایک "مغربی محقق" کی زبان سے ظاہر ہورہی ہے، "مشرقی مقلد" کا اس پر تحشیہ و تبصرہ دونون بے محل ہوگا۔

اسی خبر کے پہلو بہ پہلو فرانس سے آئی ہوئی اس تازہ اطلاع کو بھی سن لینا چاہیے، کہ وہان کے ایک ماہر کیمیائیات مارسل رابرٹ نے الکحل کا سفوف تیار کر دینے کا اعلان کیا ہے۔ یعنی کسی کیمیاوی ترکیب سے شراب کو خشک کر کے سفوف کی صورت مین تبدیل کر دیا جائیگا، پڑیہ جیب مین پڑی رہیگی، اور گرم پانی کے گلاس مین ڈالتے ہی چھلکتا ہوا جام مئے تیار ہو جائیگا، جو رنگ، بو، ذائقہ، غرض جملہ خصوصیات، اصل شراب کے رکھیگا، اور جن ممالک مین علانیہ مے نوشی کے لیے قوانین امتناعی جاری ہو رہے ہین، وہان یہ جوہر لطیف شیدایانِ دخترِ رز کے لیے حرزِ جان کا کام دیگا۔

"غیرون" کی اس ترقی پر "اپنون" کو زیادہ رشک کا موقع نہین۔ ہندوستان مین علوم جدیدہ کی توسیع اشاعت کے ساتھ عنقریب یہان بھی وہ ساعت سعید آنے والی ہے، جب اسی دل و دماغ، اسی دانائی و زیرکی، اسی ذہانت و ذکاوت کے موجدین، مکتشفین و مخترعین پیدا ہونے لگین گے۔ وہ نسل اب تقریباً مٹ چکی ہے، جو اَھلُ الجَنَّۃِ بُلہٌ پر ایمان رکھتی تھی۔ موسیٰ کے صدق وصفا، دین و تقویٰ کا زمانہ گذر چکا، اب سامری کے ذہن و ذکا، ایجاد و اختراع کا دور دورہ ہے اور ہر اس فتنہ کا ظہور لازمی ہو گیا ہے جو عقل و نفس سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ع

زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

تنہا مے نوشی پر انحصار نہین، اخلاق کے جسقدر بھی شعبہ اب تک مشرق کو عزیز تھے، چشم بد دور، ہر شعبہ مین عقلیت و روشن خیالی کے ہی جلوے نظر آ رہے ہین۔ مرکز تمدن، امریکہ، کے صرف ایک شہر شکاگو مین، صرف ایک سہ ماہی کی مدت (یعنی ۱۹۲۳ء کی اول سہ ماہی) مین طلاقون کی تعداد ۵۸۸ تک پہونچی ہے! اور یہ معلوم ہے کہ متمدن عدالتون مین طلاق صرف بدچلنی کا جرم ثابت ہو جانے پر ملتی ہے!

یہان تک پہونچ چکے ہین، تو آئیے انگلستان کی شریفانہ معاشرت سے بھی کیون بیگانہ رہجائین۔ پچھلی ششماہی مین انگلستان و ویلس کے رجسٹرار جنرل کے دفتر نے جو اعداد شائع

کئے ہین وہ اب اگرچہ کسی قدر پرانے ہوچکے ہین، تاہم حالت کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہونگے۔
سنہ ۱۹۲۰ء مین افتراق ازدواجی کی مجموعی تعداد، جو ہر پچھلے سال سے زائد تھی ۱، ۹۰، ۲۹ تک پہنچی تھی، سال مابعد، سنہ ۱۹۲۱ء مین مزید ترقی ہوکر ۳۵۲۲ ہوگئے!

طلاق وافتراق کی اس ترقی کے ساتھ، شرح پیدایش مین ترقی معکوس ہوئی، یعنی پیدا ہونے والے بچون کی شرح گھٹتے گھٹتے ۲۲،۴ فی ہزار رہگئی۔ اتنی گھٹی ہوئی شرح سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد سے (باستثنا سنین جنگ عظیم) اور کبھی نہین رہی تھی۔ ان پیدا ہونے والون مین ناجائز (ہمارے "تنگ وتاریک معیار" کے بموجب نہین، بلکہ ان کے "وسیع وروشن معیار" کے مطابق ولد الحرام) ولادتون کی شرح ۴۵ فی ہزار رہی!

اعداد خاموش کی اس زبان گویا کے بعد کسی مزید تبصرہ کی حاجت باقی رہجاتی ہے۔؟

برکات تمدن کے ان مبارک مناظر سے اگر طبیعت ابھی نہ آسودہ ہوئی ہو، تو ایک اچٹتی ہوئی نظر اپنے ملک کے متمدن ترین شہر بمبئی پر بھی کرتے چلین۔ جسکے نصیب مین قدرت نے علمبرداران تہذیب وشایستگی کے اولین خیر مقدم پیش کرنے کا شرف رکھا ہے۔ سرکاری رپورٹ کا بیان ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء مین صیغہ پولیس پر، جسکا مقصد وحید، نظم وامن کا قیام اور جرائم کا انسداد ہے، ایک کرور ۳۹ لاکھ صرف ہوا، جو سال ماسبق (سنہ ۱۹۲۰ء) کے مقابلہ مین بقدر ۱۵ لاکھ کے زائد تھا۔ یہ صرف کس حد تک حق بجانب تھا، اس کے جواب مین اعداد ذیل ملاحظہ ہون:-

سال	تعداد جرائم
سنہ ۱۹۱۷ء	۳۳۶۶۸
سنہ ۱۹۱۸ء	۳۹۳۱۱
سنہ ۱۹۱۹ء	۴۷۰۶۹
سنہ ۱۹۲۰ء	۴۱۴۰۶
سنہ ۱۹۲۱ء	۴۴۰۱۷

لیکن یہ تمام واقعات واعداد، دلایل وشواہد، حقائق وبصایر، ایک طرف، اور فطرت کا قانون دوسری طرف۔ جو لوگ سالہا سال کی بداعمالیون اور بدکرداریون سے اپنے قلوب کو سیاہ، اور اپنی فطرت سلیم کو مسخ کر چکے ہین، اُن کے نزدیک پند وموعظت، عبرت وبصیرت کا یہ سارا دفتر، غرق مے ناب اولی۔

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا (انعام ۳)

یہ لوگ ساری کی ساری نشانیان دیکھ لین، تو بھی ایمان لانے والے نہین۔

بدیہی سے بدیہی آیات وشواہد پر بھی ان کی مسخ شدہ فطرت کوئی نہ کوئی عذر

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (حجر ۱)

یقیناً تلاش کر ہی لیتی ہی اور ہر آیت کے جواب مین قوت اعظم ان مجرمون کے دلون مین کوئی شرارت ڈال ہی دیتی ہی اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی اگلون سے یہ ریت چلا آیا ہے۔

مشیت الٰہی نے ملکوتیت وقدوسیت کی طرح بہیمیت ومادیت، ضلالت وخباثت کی قوتون کو بھی پورے نشو ونما کا موقع دے رکھا ہے۔ ان قوتون کو جس شخصیت مین جمع کر دیا ہے، اسکا نام قرآنی اصطلاح مین ابلیس ہے، اور اس کی زیرکی ودانائی، فرزانگی وہمہ دانی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے، کہ مذہبی لٹریچر مین اس کا لقب ایک "معلم الملکوت" چلا آتا ہے۔ اس سب سے بڑی ذہین، زیرک ہستی نے روز ازل ہی صاف صاف کہدیا تھا،

قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ (اعراف، ع ۲)

کہ مین خلقت کو گمراہ کرنے مین کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھون گا۔ ان کے پاس سامنے سے بھی آؤن گا، اور پیچھے سے بھی، داہنے سے بھی اور بائین سے بھی، اور ان مین سے اکثر دن کو گمراہ کر کے رہون گا۔

حکومتون کے ایوانات شاہی اور وزارت خانہ، کونسلین اور سیاسی مجلسین، دارالعا

ودار الفنون، یونیورسٹیاں اور سائنس کی لیبوریٹریاں (تجربہ گاہیں) سب کی سب الا ماشاء اللہ اسی قوت شیطانی کے upto date مظاہر ہیں۔

آج سے ٹھیک ایک سال قبل ان اوراق مین جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ کے سالانہ جلسہ کا ذکر آیا تھا، اور اس سلسلہ مین ڈاکٹر پی سی رے کے خطبہ پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی گئی تھی۔ آج پھر وہی موقع ہے۔ ابکی مرتبہ جلسہ سالانہ کی صدارت مولانا مارما ڈیوک محمد پکتھال ایڈیٹر بمبئی کرانیکل نے کی، جو ایک انگریز مسلم ہین۔ مولانا موصوف نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، وہ ہر طرح اُن توقعات کے مطابق تھا، جو کرانیکل کے فاضل ایڈیٹر سے کی جاسکتی تھین۔ سال گذشتہ جامعہ نے جو شدید غلطی ڈاکٹر رے سے ایڈریس پڑھوا کر کی تھی، الحمد للہ کہ اس معصیت کا کفارہ ایک بڑی حد تک مولانا پکتھال کے ایڈریس سے ہو گیا۔

پکتھال کو اسلام کی حلقہ بگوشی مین آئے ہوے ابھی بہت زیادہ عرصہ نہین گذرا، لیکن اس قلیل مدت مین اس نے اسلام سے جسقدر صحیح واقفیت حاصل کر لی ہے، وہ مسلمان عوام کے لئے، صدہا مسلمان علمار کے لئے باعث رشک ہے۔ وہ صدرا و شمس بازغہ کے چکر مین نہین، نہ قدوری و درمختار مین اُلجھ کر رہگیا ہے، اور نہ جلالین وکمالین کا مطالعہ اپنے لئے معراج کمال سمجھتا ہے۔ اس کی نظر قرآن اور صرف قرآن پر ہے۔ اور اسی کی برکت ہے کہ جتنی بصیرت اسے حاصل ہو گئی ہے، اس کی عشر عشیر بھی ہمارے اکثر خاندانی علماء کو نصیب نہین۔ چند جزئیات مین یقیناً گفتگو کی گنجایش ہے، مثلاً بعض احادیث نبوی جن الفاظ مین نقل کی ہین، ان صورتون کے ساتھ ان کی صحت کم از کم مشتبہ ضرور ہے تاہم بحیثیت مجموعی جس خوبی و وقت نظر کے ساتھ تعلیمات اسلامی کی توضیح وتشریح کی گئی ہے، اس کے اعتبار سے ایڈریس ہر طرح قابل دید و قابل داد ہے، اور داد یہی ہے، کہ اس پر عمل کیا جائے۔ جامعہ کے کارکنان اس مرتبہ کے انتخاب صدارت پر ساری دنیائے اسلام کی جانب سے یقیناً مخلصانہ تہنیت کے مستحق ہین۔

نغمۂ نعت

(از سید محمد علی عرش ملیح آبادی مرحوم)

پھیلی ہوئی وہ شمع مدینہ کی ضیا ہے
جس نخل کو دیکھو شجرِ طور بنا ہے

یہ دل ہوسِ دیدِ پیمبر میں مٹا ہے
اس سر میں بھری دشتِ مدینہ کی ہوا ہے

سر میں جو سرِ زلفِ شہِ عقدہ کشا ہے
نالہ بھی رسا ہے، مری قسمت بھی رسا ہے

جاتا ہے مدینہ کی طرف قافلۂ عمر
میرا نفس سرد نہیں بانگِ درا ہے

تسکین ہوئی عرش کی جس سے شبِ اسریٰ
مسجودِ ملائک وہی نقشِ کفِ پا ہے

گر ناخنِ حضرت کا اڑا یا نہیں حنا کا
پھر کیوں مہِ نو آج تک انگشت نما ہے

آتا ہے اگر حشر تو پروا نہیں کوئی
دیوانۂ احمد کی سزا ہے نہ جزا ہے

موت آئی یہاں جس کو وہ ہے زندۂ جاوید
صحرائے مدینہ بھی عجب روح فزا ہے

اُس رحمتِ عالم کی شفاعت کے مقابل
اے عرش خطاؤں کا نہ ہونا بھی خطا ہے

جلیل قدوائی آنادی

عربی شاعری کی خصوصیات

(۱)

ادبیات عجم کا لذت آشنا رنگا رنگ جواہرات مضامین کی تلاش مین جب کلام عرب کے دریا مین غوطہ لگاتا ہے تو جو کچھ اُسکے ہاتھ آتا ہے اُس کو عجیب نگاہ سے دیکھتا ہے - زبان عربی کی مالداری اور قدامت و شہرت، اسلام کی تہذیب و تمدن اور جاہ و جلال اور سب سے بڑھکر اس کا مذہبی تقدس و احترام اُسے اس شبہہ مین ڈال دیتا ہے کہ یہ موتی اگرچہ ہماری آنکھون مین خوش آب نہین دکھائی دیتے لیکن ہون گے گران بہا - ان کی قیمت کا اندازہ لگانے مین وہ اپنے آپ کو نالائق سمجھتا اور اپنے تردد کو قدر ناشناسی کا ملزم قرار دے لیتا ہے - لیکن میرے خیال میں کلام عرب مین (جس سے میری مراد کلام جاہلیت ہے) شستگی زبان اور عجمی تخیلات کی باریکیان ڈھونڈھنا یا ثابت کرنا ویسا ہی ہے جیسے شکسپیر اور ملٹن کے کلام سے کمر اور دہن کی نفی اور زلف کے دل عاشق کا دھوان ہونے کا اثبات - ایک غیر مہذب، جاہل، مفلس، صحرا نشین قوم کو نہ وہ باریک خیالات میسر آسکتے ہین نہ اُن کی تشکیل کے لیے الفاظ مل سکتے ہین جو شائستہ، متمدن، تعلیم یافتہ، دولتمند اقوام کی قدرتی خصوصیات ہین - بادیہ نشین اقوام کی شاعری کا طرۂ امتیاز اگر کوئی چیز ہوسکتی ہے تو اُس کی سادگی و بے تکلفی، اصلیت اور سچائی جیسے ہندوستان کے کسی گاؤن مین چرواہے کا گیت، جس مین دہقانی لڑکی کی محبت کا صاف صاف تذکرہ ہوتا ہے - چشمے یا تالاب پہ اُس کے کپڑے دھونے کی تصویر، بھینس کا دودھ دوہنے کی ادا، اُپلے تھاپنے کی شان اور اور مکھن نکالنے کا بیان ہو - عاشق چرواہے سے اس کی بیلوتی، ارہر کے کھیت مین جھینکا جھوری (دہا ڈھاپائی) لاکھ کی موٹی موٹی سرخ چوڑیون اور کنگنون کا ٹوٹ جانا، اور مرغ (ہرن) کی طرح طرارے بھرتے ہوئے اُس کا نکل جانا وغیرہ روستائی زندگی ہین اس لئے پسند آتی ہے کہ وہ ہماری معاشرت سے جداگانہ، سادہ، بے تکلف اور قدرتی

ہوتی ہے۔ اب کوئی اجنبی قوم اس قسم کے گیت ہماری ادبیات میں کہیں دیکھ پائے اور اُن سے وہ نکات و لطائف پیدا کرے جو مہذب و اعلیٰ ادبیات کی خصوصیات ہوں تو آپ اس کی سخن فہمی کے متعلق کیا رائے قائم کرینگے؟

چھٹی صدی عیسوی کے اوائل کے شعرا کے کلام کو کلام عرب کا نمونہ قرار دیں تو جو چیز ہم سے خراج تحسین وصول کرتی ہے وہ اس کی سادگی اور بے ساختہ پن ہے جو بے تکا پن کے درجے تک ہے۔ جو خیال شاعر کے ذہن میں آتا ہے اسے بے دھڑک بیان کر دیتا ہے۔ ہماری طرح عامیانہ، رکیک، سوقیانہ۔ یا فحش تک کی پروا نہیں کرتا۔ وہ اس کے چال چلن کا اصلی رنگ اور صحیح واقعہ ہوتا ہے۔ ہم اس کی داد اس لیے دیتے ہیں کہ شاعر پر جو کچھ گذرتی ہے بلا پروائے لوم لائم صاف صاف کہہ دیتا ہے اور اس طرح ہم اس کے کلام میں اس کی زندگی، مشاغل، اور جذبات کی صحیح تصویر دیکھ لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عرب اپنے عشق اور اس کے اظہار میں بے باک ہوتا ہے اور کامیابی کے لیے سر ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے۔ اس کا عشق نفسانی ہے۔ عجمی عشق مجازی (جس کا برعکس نام "حقیقی" رکھا گیا ہے) یا عشق ناکام کو عرب کے دماغ میں دخل نہیں۔ وہ ایک طرف شرابخواری و عیاشی کا پتلا ہے، دوسری طرف ایثار کا مجسمہ۔ وہ جان کو کوئی چیز نہیں سمجھتا، مال کی پروا نہیں کرتا، آن پر جان دیتا اور مہمان پر گھر کی دولت نثار کر دیتا ہے۔ ان مردانہ بدوی خصائل سے ماورا کوئی لطیف جذبہ نہ وہ رکھتے تھے نہ ہمیں مل سکتا ہے۔ اگر یہ خصائص دریافت کرنا ہوں تو کلام عرب ان سے معمور اور بھرپور ملیگا۔ نمونہ کے طور پر ہم جابجا سے دلچسپ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

امرؤ القیس

شعرائے معلقات میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول شاعر امرؤ القیس سنہ ۵۴۰ع کے قریب انقرہ (انگورہ) میں اپنی دلیرانہ عشقبازی کی بدولت زہر سے ہلاک ہوا اور بقول ابن قتیبہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے چالیس سال پہلے گذرا۔ اس نے ان اشعار میں اپنی عشقبازی کی کتنی جیتی جاگتی اور مردانہ وار تصویر کھینچی ہے:-

الا رُبَّ یومٍ کانَ منهنَّ صالحٍ ولا سیّما یومٌ بدارةِ جُلجُلِ

وَيَوْمَ عَقَرْتُ لِلْعَذَارَى مَطِيَّتِي (فَيَا عَجَبًا مِنْ كَوْرِهَا الْمُتَحَمَّلِ)
فَظَلَّ الْعَذَارَى يَرْتَمِينَ بِلَحْمِهَا وَشَحْمٍ كَهُدَّابِ الدِّمَقْسِ الْمُفَتَّلِ
وَيَوْمَ دَخَلْتُ الْخِدْرَ خِدْرَ عُنَيْزَةٍ فَقَالَتْ لَكَ الْوَيْلَاتُ إِنَّكَ مُرْجِلِي
تَقُولُ (وَقَدْ مَالَ الْغَبِيطُ بِنَا مَعًا) "عَقَرْتَ بَعِيرِي يَا امْرَأَ الْقَيْسِ فَانْزِلِ"
فَقُلْتُ لَهَا سِيرِي وَأَرْخِي زِمَامَهُ وَلَا تُبْعِدِينِي مِنْ جَنَاكِ الْمُعَلَّلِ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شاعر محبوبہ کے ترک کئے ہوئے خیمہ گاہ کے نشان لہ پر کھڑا ہوا ایام وصل کی لذتوں کو یاد کرتا ہے۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے کہ تالاب دارۃ الجلجل پر میرا گذر ہوا جہاں دوشیزہ لڑکیاں نہا دھو رہی تھیں! ان کی ضیافت کے لیے مینے اپنی سواری کا اونٹ قربان کر دیا جس کا کجاوہ وغیرہ انھیں کے اونٹوں پر لادا گیا۔ وہ شوخ لڑکیاں گوشت اور چربی کھاتی بھی جاتی تھیں اور ایک دوسری پر پھینک پھینک کر کھیلتی اور بربادی کرتی جاتی تھیں۔ جب چلنے کی نوبت آئی تو مین عنیزہ کے ساتھ اُس کے کجاوے مین جا بیٹھا۔ وہ بولی تیرا ناس ہو تو مجھے پاپیادہ چلائیگا؟ (یعنی میرا اونٹ بوجھ سے مر جائیگا اور پیدل چلنا ہوگا) جب ہمارے بار سے ہودج ایک طرف کو جھکنے لگا تو وہ دلربا بولی اونٹ کی پیٹھ تو تو نے زخمی کر دی۔ تو اُتر جا۔ مینے کہا اُونٹ کی نکیل ڈھیلی کر دو اور چپ چاپ چلی چلو اور مجھے اپنے ثمر اور اپنے پھل چکھنے (بوسون) سے محروم نہ رکھو۔"

اپنی ایک محبوبہ کا سراپا جو امراء القیس کھینچتا ہے کس قدر قدرتی اور دلکش ہے! کوئی استعارہ بعید نہین۔ ہر تشبیہ اپنے دیس کی اور آس پاس سے ہے۔ تصنع کا نشان نہین۔

لہ ملک ویران بیابان ہونے کے باعث بدوی عرب پانی اور سبزی کی جستجو مین تمام صحرا کی خاک چھانتے پھرتے تھے جہان پانی مل گیا ڈیرے ڈال دیئے۔ جبتک پانی رہا مقیم رہے۔ جب خشک ہو گیا ڈنڈے خیمے اُٹھا کر دوسری طرف نکل گئے۔ اسی لئے ان کی زندگی ہمیشہ سے خانہ بدوش رہی جہان اوتر پڑے وہی وطن ہے۔ ابھی ایک خطہ ایک قبیلہ سے آباد ہے ابھی اُس کے رخصت ہوتے ہی ویران پھر چولھے کی اینٹون یا خیمہ کی گرداگرد نالی کے سوا کوئی نشان نہین رہتا۔ شاعر عموماً انہین نشانات سے منزل جانان کو پہچان کر اپنے عیش گذشتہ کا نوحہ پڑھتا ہے جو اُس کے قصیدہ کی تشبیب ہوتا ہے۔

هَصَرْتُ بِفَوْدَيْ رَأْسِهَا فَتَمَايَلَتْ — عَلَيَّ هَضِيمَ الْكَشْحِ رَيَّا الْمُخَلْخَلِ
مُهَفْهَفَةٌ بَيْضَاءُ غَيْرُ مُفَاضَةٍ — تَرَائِبُهَا مَصْقُولَةٌ كَالسَّجَنْجَلِ
كَبِكْرِ الْمُقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصُفْرَةٍ — غَذَاهَا نَمِيرُ الْمَاءِ غَيْرُ مُحَلَّلِ
تَصُدُّ وَتُبْدِي عَنْ أَسِيلٍ وَتَتَّقِي — بِنَاظِرَةٍ مِنْ وَحْشِ وَجْرَةَ مُطْفِلِ
وَجِيدٍ كَجِيدِ الرِّئْمِ لَيْسَ بِفَاحِشٍ — إِذَا هِيَ نَصَّتْهُ وَلَا بِمُعَطَّلِ
وَفَرْعٍ يَزِينُ الْمَتْنَ أَسْوَدَ فَاحِمٍ — أَثِيثٍ كَقِنْوِ النَّخْلَةِ الْمُتَعَثْكِلِ
غَدَائِرُهَا مُسْتَشْزِرَاتٌ إِلَى الْعُلَى — تَضِلُّ الْعِقَاصُ فِي مُثَنًّى وَمُرْسَلِ
وَكَشْحٍ لَطِيفٍ كَالْجَدِيلِ مُخَصَّرٍ — وَسَاقٍ كَأُنْبُوبِ السَّقِيِّ الْمُذَلَّلِ
وَتَعْطُو بِرَخْصٍ غَيْرِ شَثْنٍ كَأَنَّهُ — أَسَارِيعُ ظَبْيٍ أَوْ مَسَاوِيكُ إِسْحِلِ
تُضِيءُ الظَّلَامَ بِالْعِشَاءِ كَأَنَّهَا — مَنَارَةُ مُمْسَى رَاهِبٍ مُتَبَتِّلِ
إِذَا قَامَتَا تَضَوَّعَ الْمِسْكُ مِنْهُمَا (۱) — نَسِيمَ الصَّبَا جَاءَتْ بِرَيَّا الْقَرَنْفُلِ
إِلَى مِثْلِهَا يَرْنُو الْحَلِيمُ صَبَابَةً — إِذَا مَا اسْبَكَرَّتْ بَيْنَ دِرْعٍ وَمِجْوَلِ

"میں نے اس کی زلفیں پکڑ کر اپنی طرف جھکائیں تو وہ میری طرف جھک گئی۔ اس کی کمر پتلی اور پنڈلی پُرگوشت تھی، پتلی کمر، گورا چٹا جسم، پیٹ برابر (کشمیری توند نہیں) سینے آئینہ کی طرح چمکدار۔ اس کا رنگ سیب کی طرح زردی مائل، یا اس موتی کی طرح جس نے صاف شفاف پانی میں پرورش پائی ہو۔ منھ پھیرتی ہے تو بھی اسکے نرم نرم گال دکھائی دیتے ہیں (یعنی چھوٹے چھوٹے ابھرے ہیں)۔ اور صحراے وجرہ کی بچہ والی ہرنی کی سی آنکھ سے آڑ کر لیتی ہے۔ (ہرنی اپنے بچے کو جس آنکھ سے دیکھتی ہے اس کی دلربائی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، مقام کی تعیین نے اصلیت کا لطف بڑھا دیا)۔ اس کی گردن سپید براق ہرنی کی سی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گردن اٹھانے کے وقت ویسی لمبی بے ڈول نہیں ہو جاتی نہ ویسی زیوروں سے ننگی ہے۔ اس کے بال اس کی پیٹھ پر

(۱) یہ بیت اسی قصیدہ کے ایک دوسرے مقام سے ماخوذ ہے جہاں شاعر اپنی دو محبوبوں کی صفت بیان کر رہا ہے۔

پڑے بہار دکھاتے تھے، کوئلے کی طرح سیاہ، کھجور کے خوشہ کی طرح گھنے گھونگر والے، لٹیں اوپر کو گندھی ہوئی تھیں اور جوڑا گندھے اور بے گندھے بالوں میں غائب تھا۔ اس کی کمر اونٹ کی نکیل کی طرح پتلی اور پنڈلی سینٹھے کی طرح نرم۔ جب کوئی چیز پکڑتی ہے تو اس کی نرم و نازک انگلیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسی وادی ظبی کے کیڑے (جن کے جسم سفید اور سرخ ہوتے ہیں) یا درخت اسحل کی پتلی پتلی سڈول مسواکیں۔ وہ اپنے حسن و جمال سے رات کی تاریکی کو یوں روشن کردیتی ہے جیسے گوشہ نشین راہب کا بلند چراغ۔ وہ نازنین جب کھڑی ہوتی ہیں تو ان کے جسم سے مشک کی ایسی لپٹ آتی ہے، جیسے صبا کے ہلکے جھونکے لونگ کی خوشبو لاتے ہیں۔ جب وہ محرم کسکر اور کرتی پہنکر سیدھی تنکر کھڑی ہوجاتی ہے تو عقل سے متین اور ثقہ مرد اسے پیار کی نظر سے تکتا رہ جاتا ہے۔

امراءالقیس اپنے معلقہ سے اگر ایک طرف بزم عیش کا نقشہ سا بھی نظر آتا ہے تو دوسری طرف عرصۂ رزم کا رقم۔ اپنے گھوڑے کی تعریف میں، شاعری کی بدولت اس کو ایک ہیرو بنا چھوڑا ہے۔ ہر صفت اصلیت کا پتہ دیتی ہے۔ ایک ایک شعر پڑھیں جری گھوڑے کی تصویر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔

وَقَدْ أَغْتَدِي وَالطَّيْرُ فِي وُكُنَاتِهَا　　بِمُنْجَرِدٍ قَيْدِ الْأَوَابِدِ هَيْكَلِ
مِكَرٍّ مِفَرٍّ مُقْبِلٍ مُدْبِرٍ مَعًا　　كَجُلْمُودِ صَخْرٍ حَطَّهُ السَّيْلُ مِنْ عَلِ
كُمَيْتٍ يَزِلُّ اللِّبْدُ عَنْ حَالِ مَتْنِهِ　　كَمَا زَلَّتِ الصَّفْوَاءُ بِالْمُتَنَزَّلِ
عَلَى الذَّبْلِ جَيَّاشٍ كَأَنَّ اهْتِزَامَهُ　　إِذَا جَاشَ فِيهِ حَمْيُهُ غَلْيُ مِرْجَلِ
دَرِيرٍ كَخُذْرُوفِ الْوَلِيدِ أَمَرَّهُ　　تَتَابُعُ كَفَّيْهِ بِخَيْطٍ مُوَصَّلِ
لَهُ أَيْطَلَا ظَبْيٍ وَسَاقَا نَعَامَةٍ　　وَإِرْخَاءُ سِرْحَانٍ وَتَقْرِيبُ تَتْفُلِ

صبح سویرے جب چڑیاں اپنے گھونسلوں میں ہوتی ہیں میں ایک بلند قامت چھوٹے بالوں والے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا ہوں، جو جنگلی جانوروں کا شکار کیا کرتا ہے۔ پھرتی سے حملہ کرنے والا، جھٹ مڑ جانے والا، ایک دم میں آگے بڑھ جانے اور پیچھے

ہٹ جانے والا - گویا ایک عظیم الشان چٹان ہے جسے سیلاب نے بلندی سے نیچے لڑھکا دیا ہو - رنگ کمیت ہے - اس کا زین اس کی پیٹھ سے پھسل پھسل جاتا ہے - جیسے چکنے سنگ مرمر سے بارش کے قطرے پھسل جاتے ہین - لاغری کے باوجود رفتار کے وقت یہ جوش دکھاتا ہے کہ اُس سے اُبلتی ہوئی ہانڈی کی آواز نکلتی ہے - ایسا تیز رو ہے جیسے لڑکون کی پھرکی کہ ایک تکل کے بیچ سے ڈورا ڈالکر اسے باری باری دونون ہاتھون سے بٹتے اور گھماتے ہین - اس کی کمر ہرن کی پنڈلی شتر مرغ کی جھپٹ بھیڑیے کی اور رفتار لومڑی کی ہے -"

عمرو بن کلثوم تغلبی

عمرو بن کلثوم کا معلقہ داستان عشق کی دل آویزی مین امرء القیس تک تو نہین پہونچتا مگر بدوی شجاعت و حریت کے جذبات و عادات کی زیادہ کامل اور جاندار تصویر ہے - کہتے ہین کہ عمرو بن ہند فرمانروائے حیرہ (۵۵۴ تا ۵۶۸ء) نے ایک روز اپنے مصاحبون سے پوچھا "تم کسی عرب کا پتا سکتے ہو جسکی مان میری مان کی خدمت سے انکار کی جرأت کرے؟" انھون نے کہا "ہان ایک عرب - عمرو بن کلثوم تغلبی کی مان" پادشاہ نے اس دعوے کی تصدیق کے لیئے عمرو تغلبی اور اُس کی مان کی دعوت کی - عمرو پادشاہ کے حضور مین بٹھایا گیا اور اس کی مان حرم سرا مین پادشاہ کی مان کے پاس - لونڈیان کنارے کر دی گئی تھین - پادشاہ کی مان لیلی سے نے دسترخوان پر کسی برتن کی طرف اشارہ کرکے کہا "ذرا ادھر بڑھا دینا" بڑھیا نے جواب دیا لتقم صاحب الحاجۃ الی حاجتھا "حاجتمند اپنی حاجت آپ اٹھکر پوری کرلے" لیلی نے بار بار مانگا - اس پر بڑھیا پکار اٹھی "وا ذلاہ یا لتغلب!" عمرو بن کلثوم مان کی آواز پر اُٹھ کھڑا ہوا تلوار نکال کر وہین پادشاہ کا سر اوڑا دیا -

پھر تو دونون طرف سے خوب معرکہ آرائی ہوئی - عمرو بن کلثوم کے معلقہ مین اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے - اس کی یاد مین شاعر اس طرح بھر جاتا ہے کہ معرکہ کارزار پیش نظر ہو جاتا ہے - یہان تک کہ عمرو بن ہند کو مخاطب کرکے للکارتا ہے یہی اشعار

سلہ کتاب الاغانی ج ۹ ص ۱۸۲

اس معلقہ کا مایۂ ناز ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حصۂ قصیدہ عمرو بن ہند کی زندگی میں نظم ہو چکا، باقی حصہ شاعر نے بعد کو پورا کیا ہے۔

أَبَا هِنْدٍ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْنَا　　وَأَنْظِرْنَا نُخَبِّرْكَ الْيَقِينَا
بِأَنَّا نُورِدُ الرَّايَاتِ بِيضًا　　وَنُصْدِرُهُنَّ حُمْرًا قَدْ رَوِينَا
وَأَيَّامٍ لَنَا غُرٍّ طِوَالٍ　　عَصَيْنَا الْمَلْكَ فِيهَا أَنْ نَدِينَا
وَسَيِّدِ مَعْشَرٍ قَدْ تَوَّجُوهُ　　بِتَاجِ الْمُلْكِ يَحْمِي الْمُحْجَرِينَا
تَرَكْنَا الْخَيْلَ عَاكِفَةً عَلَيْهِ　　مُقَلَّدَةً أَعِنَّتَهَا صُفُونَا
أَلَا لَا يَعْلَمِ الْأَقْوَامُ أَنَّا　　تَضَعْضَعْنَا وَأَنَّا قَدْ وَنِينَا
أَلَا لَا يَجْهَلَنْ أَحَدٌ عَلَيْنَا　　فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِينَا
بِأَيِّ مَشِيئَةٍ عَمْرَو بْنَ هِنْدٍ　　نَكُونُ لِقَيْلِكُمْ فِيهَا قَطِينَا
تُهَدِّدُنَا وَتُوعِدُنَا رُوَيْدًا　　مَتَى كُنَّا لِأُمِّكَ مَقْتَوِينَا
فَإِنَّ قَنَاتَنَا يَا عَمْرُو أَعْيَتْ　　عَلَى الْأَعْدَاءِ قَبْلَكَ أَنْ تَلِينَا
وَنُوجَدُ نَحْنُ أَمْنَعَهُمْ ذِمَارًا　　وَأَوْفَاهُمْ إِذَا عَقَدُوا يَمِينَا
وَنَحْنُ غَدَاةَ أُوقِدَ فِي خَزَازٍ　　رَفَدْنَا فَوْقَ رِفْدِ الرَّافِدِينَا
عَلَى آثَارِنَا بِيضٌ حِسَانٌ　　نُحَاذِرُ أَنْ تُقَسَّمَ أَوْ تَهُونَا
أَخَذْنَ عَلَى بُعُولَتِهِنَّ عَهْدًا　　إِذَا لَاقَوْا كَتَائِبَ مُعْلَمِينَا
لَيَسْتَلِبُنَّ أَفْرَاسًا وَبِيضًا　　وَأَسْرَى فِي الْحِبَالِ مُقَرَّنِينَا
يَقُتْنَ جِيَادَنَا وَيَقُلْنَ لَسْتُمْ　　بُعُولَتَنَا إِذَا لَمْ تَمْنَعُونَا
إِذَا مَا الْمَلْكُ سَامَ النَّاسَ خَسْفًا　　أَبَيْنَا أَنْ نُقِرَّ الذُّلَّ فِينَا

"اے عمرو بن ہند ہمارے معاملہ میں جلدی نہ کر۔ ذرا صبر کر کہ ہم تجھے کچھ سچی باتیں بتا دیں۔ ہم وہ ہیں کہ اپنے نیزے دشمنوں کے سینوں میں سفید براق اتارتے ہیں اور اسے خون سے سرخ و تر کھینچتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے مشہور دن ہیں جن میں ہم نے بادشاہ کی اطاعت کے عوض سرکشی کی ہے۔ بڑے بڑے زبردست صاحب تاج و تخت سرداروں پر جن کی

حمایت و پناہ ڈھونڈھی جاتی تھی ہم نے تاخت کرکے اپنے گھوڑے اُن میں لا کھڑے کر دیے اور اُن کی باگیں اُن کے گھروں میں ڈالدیں (یعنی قید کر لیا) کوئی یہ نہ سمجھے کہ اب ہم ذلیل و کمزور ہوگئے ہیں۔ ہاں کوئی ہم سے اجڈپن نہ کرے ورنہ ہم سوا جڈوں کے ایک و جڈ ہیں اور اُجڈپن دکھا دیں گے۔ اے عمرو بن ہند بتا دے کہ تو نے ہم میں کون سا ضعف دیکھا ہے کہ ہم پر اپنا گورنر متعین کرکے ہمیں اسکا غلام بنانا چاہتا ہے؟ تو ہمیں دھمکاتا اور ڈراتا ہے بھلا ہم نے کب تیری ماں کی غلامی کی ہے؟ اے عمرو بن ہند ہمارے نیزے ایسے نہیں کہ تجھ سے پہلے کبھی کسی دشمن کے مقابلے میں نرم پڑے ہوں۔ پس اب بھی ان سے کوئی نرمی کی توقع نہ رکھ۔ ذمہ اور حقوق کے ادا کرنے اور وعدے وفا کرنے میں ہم سب سے سخت ہیں۔ جس دن اعلان جنگ کے طور پر کوہ خزار پر آگ روشن کی گئی تھی تو ہم نے سارے مددگاروں سے زیادہ مدد کی تھی۔ میدان کارزار میں ہمارے پیچھے ہماری خوبصورت عورتیں ہوتی ہیں جن کے قید ہونے لونڈی بنائے جانے اور ذلیل ہونے کا ہمیں بڑا خیال رہتا ہے جب ان کے شوہر نشان لگا لگا کر مقابلے کو نکلتے ہیں تو یہ اُن سے عہد لیتی ہیں کہ دشمنوں کے گھوڑے اور ہتھیار چھین لائیں، اور قید یوں کو رسیوں میں باندھ لائیں۔ یہ ہمارے اصیل گھوڑوں کی خدمت کرتی ہیں اور ہم سے کہتی ہیں کہ اگر تم نے ہم کو دشمنوں سے نہ بچایا تو تم ہمارے شوہر نہیں۔ جب بادشاہ خلق کو ذلت پر مجبور کرے تو ہم اسے قبول نہیں کرتے۔"

طرفہ بن العبد

طرفہ بن العبد اپنے معلقہ میں زنانہ ہودوں والی قطار شتر کو کتنی اچھی تشبیہ دیتا ہے۔

كَاَنَّ حُدُوْجَ الْمَالِكِيَّةِ غُدْوَةً — خَلَايَا سَفِيْنٍ بِالنَّوَاصِفِ مِنْ دَدِ

عَدَوْلِيَّةٌ اَوْ مِنْ سَفِيْنِ بْنِ يَامِنٍ — يَجُوْرُ بِهَا الْمَلَّاحُ طَوْرًا وَيَهْتَدِيْ

يَشُقُّ حَبَابَ الْمَاءِ حَيْزُوْمُهَا بِهَا — كَمَا قَسَمَ التُّرْبَ الْمُفَائِلُ بِالْيَدِ

صبح وداع کو قبیلہ مالکیہ کے کجاوے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے وادی دد کے دھارے میں ابن یامن کی عدولی کشتیاں چلی جا رہی ہوں کہ ملاح کبھی انھیں

سید ھا چلا تا ہے کبھی ٹیڑھا۔ یہ کشتیان موجون کو اسطرح چیرتی چلی جاتی ہین جیسے لڑکے کوڑی چھپوا کھیلنے مین مٹی کے دو حصے کر دیتے ہین۔ اسی سلسلہ حدوج کی تشبیہ لبید نے بھی خوب پیدا کی ہے۔ کہتا ہے :۔

حُفِزَتْ وَزَایَلَهَا السَّرَابُ کَاَنَّهَا اَجْزَاعُ بِیْشَةَ اَثْلُهَا وَرِضَامُهَا

یہ اونٹ روانہ ہوگئے۔ سراب درمیان ہین حائل تھا اس لئے دور سے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ادی بیشہ کی چوٹی کی چٹانون یا جھاؤ کے درختون کی قطار۔ اسی مضمون کو زہیر بن ابی سلمی نے بھی کیسی پیاری تشبیہ سے رونق دی ہے !

کَاَنَّ فُتَاتَ الْعِهْنِ فِیْ کُلِّ مَنْزِلٍ نَزَلْنَ بِهٖ حَبُّ الْفَنَا لَمْ یُحَطَّمِ

جہان جہان یہ ہودج نشین لڑکیان مقام کرتی تھین ان کے ہودج کے توڑے (یالائی چالی) کے سرخ سرخ اونی ٹکڑے اس بھری معلوم ہوتے تھے۔

طرفہ اپنے معلقہ مین تین تمناؤن کا پرجوش اظہار کرتا ہے جو بدوی جذبات کا خلاصہ ہین۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ اُس نے سزاے موت بھگتنے وقت کہا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو ان کے سچے اور مخلصانہ ہونے مین کوئی شک نہین رہتا :۔

فَلَوْلَا ثَلٰثٌ هُنَّ مِنْ لَذَّةِ الْفَتٰی وَجَدِّكَ لَمْ اَحْفِلْ مَتٰی قَامَ عُوَّدِیْ
فَمِنْهُنَّ سَبْقِی الْعَاذِلَاتِ بِشَرْبَةٍ کُمَیْتٍ مَتٰی مَا تُعْلَ بِالْمَاءِ تُزْبِدِ
وَکَرِّیْ اِذَا نَادٰی الْمُضَافُ مُحَنَّبًا کَسِیْدِ الْغَضَا نَبَّهْتَهُ الْمُتَوَرِّدِ
وَتَقْصِیْرُ یَوْمِ الدَّجْنِ وَالدَّجْنُ مُعْجِبٌ بِبَهْکَنَةٍ تَحْتَ الْخِبَاءِ الْمُعَمَّدِ

”اگر زندگانی کی تین لذتین نہ ہوتین تو تیرے دادا کی قسم مین موت کی پروا نہ کرتا۔ ان مین سے ایک (۱) شراب ناب ہے کہ پانی ملانے سے جھاگ لائے اور حضرت ناصح کی ملامت سے پہلے اُسے اوڑا جائے (۲) جب کوئی لڑائی مین گھر جائے اور مجھکو حالت اضطرار مین پکارے تو بھرے ہوے پیاسے بھیڑیے کی طرح اُس کے دشمن پر ٹوٹ پڑنا (۳) ابر و باران کے دن کہ نہایت خوشگوار سمان ہوتا ہے کسی گداز بدن سیمبر کے ساتھ خیمہ مین بیٹھکر یون وقت گذاردون کہ خبر نہ ہو کب صبح ہوئی کب شام۔“

زہیر بن ابی سلمیٰ

اصحاب معلقات میں سے ایک زہیر بن ابی سلمیٰ ہمارے کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے معلقہ میں اس اعلیٰ و لطیف تخیل کا پتہ ملتا ہے جو اس کے معاصرین کے کلام میں ناپید ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ شخص توریت و انجیل وغیرہ کے مطالعہ اور اہل کتاب کی صحبت سے دیندارانہ میلان رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا منتظر تھا اور اپنے بیٹوں کو وصیت کر گیا تھا کہ نبی موعود جس کے دیدار مسعود سے میں محروم رہا اگر تمھارے زمانہ میں ظاہر ہو تو فوراً اس پر ایمان لانا۔ مشہور مادح نبوی کعب بن زہیر جن کے قصیدہ بانت سعاد کو حضورؐ نے شرف قبول بخشا اسی زہیر کے بیٹے تھے۔ اس شعر سے زہیر کے ایمان بالغیب و قیامت پر استدلال کیا جاتا ہے:

فَلَا تَکْتُمُنَّ اللّٰہَ مَا فِی صُدُوْرِکُمْ ۔۔۔ لِیَخْفٰی وَمَھْمَا یُکْتَمِ اللّٰہُ یَعْلَمِ
یُؤَخَّرْ فَیُوْضَعْ فِی کِتَابٍ فَیُدَّخَرْ ۔۔۔ لِیَوْمِ الْحِسَابِ اَوْ یُعَجَّلْ فَیُنْقَمِ

جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اسے اللہ سے نہ چھپاؤ کہ اللہ سے کوئی بات چھپائی جائے تو وہ جان لیتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں یا انتقام میں جلدی کی جائے یا دیر۔ اگر دیر کی جاتی ہے تو قیامت کے لیے نامۂ اعمال میں لکھ رکھا جاتا ہے اور اگر جلدی کی جاتی ہے تو فوراً بدلہ لے لیا جاتا ہے۔

غرض اس شاعر کا مذاق جاہلین عرب سے بالکل مختلف نظر آتا ہے وہ صلح کی مدحت اور حرب کی مذمت میں کہتا ہے۔

وَمَا الْحَرْبُ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ وَذُقْتُمُوْا ۔۔۔ وَمَا ھُوَ عَنْھَا بِالْحَدِیْثِ الْمُرَجَّمِ
مَتٰی تَبْعَثُوْھَا تَبْعَثُوْھَا ذَمِیْمَۃً ۔۔۔ وَتَضْرَ اِذَا ضَرَّیْتُمُوْھَا فَتَضْرَمِ
فَتَعْرُکُکُمْ عَرْکَ الرَّحٰی بِثِفَالِھَا ۔۔۔ وَتَلْقَحْ کِشَافًا ثُمَّ تُنْتَجْ فَتُتْئِمِ
رَاَیْتُ الْمَنَایَا خَبْطَ عَشْوَآءَ مَنْ تُصِبْ ۔۔۔ تُمِتْہُ وَمَنْ تُخْطِئْ یُعَمَّرْ فَیَھْرَمِ
وَمَنْ یُوْفِ لَا یُذْمَمْ وَمَنْ یُّھْدَ قَلْبُہٗ ۔۔۔ اِلٰی مُطْمَئِنِّ الْبِرِّ لَا یَتَجَمْجَمِ
وَمَنْ یَّجْعَلِ الْمَعْرُوْفَ فِیْ غَیْرِ اَھْلِہٖ ۔۔۔ یَکُنْ حَمْدُہٗ ذَمًّا عَلَیْہِ وَیَنْدَمِ

وَمَنْ یَعْصِ اَطْرَافَ الزِّجَاجِ فَاِنَّهٗ　　یُطِیْعُ الْعَوَالِیْ رُکِّبَتْ کُلَّ لَهْذَمِ
وَمَنْ لَا یَذُدْ عَنْ حَوْضِهٖ بِسِلَاحِهٖ　　یُهَدَّمْ وَمَنْ لَا یَظْلِمِ النَّاسَ یُظْلَمِ
لِسَانُ الْفَتٰی نِصْفٌ وَّنِصْفٌ فُؤَادُهٗ　　فَلَمْ یَبْقَ اِلَّا صُوْرَةُ اللَّحْمِ وَالدَّمِ

"جنگ کو تم سمجھ چکے اور اس کا مزا چکھ چکے ہو یہ کوئی ظنی و قیاسی بات نہیں کہتا اگر تم اسے چھیڑ دوگے تو بُرا ہوگا۔ جب اسے اُکسا دوگے تو سخت مشتعل ہوگی تمھیں چکی کے آٹے کی طرح پیس ڈالے گی۔ اُس اونٹنی کی طرح جو پے در پے حاملہ ہو بارور ہوتی ہے اور ایک بار دو دو بچے جنتی ہے۔ اور جو بچے جنتی ہے وہ سارے کے سارے قوم عاد کے احمر (ناقہ صالح کے قاتل) کی طرح بدبخت ہونگے پھر انھیں دودھ پلا پلا کر پالیگی یعنی نتائج جنگ کا نشو و نما ہوگا۔ جب جنگ طول کھینچے گی تو اس سے اتنی کثیر پیداوار ہوگی کہ عراق کے گاؤں میں بھی میسر نہیں یعنی بے شمار مضرتیں لاحق ہونگی۔ موت شب کور اونٹنی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتی ہے جو اسکی زد میں آگیا مرگیا جو بچ گیا بڑھاپے تک جیا۔ جو عہد کو پورا کرتا ہے کوئی اُسے بُرا نہیں کہتا اور جس کے دل کو اللہ خالص نیکی کی ہدایت کرتا ہے وہ دیکر بات نہیں کرتا۔ جو کوئی نااہل کے ساتھ احسان کرے گا اُس کی نیکی اُس کے حق میں بُرائی بن جائیگی اور نادم ہوگا۔ جو شخص نیزے کی جڑ (صلح) سے راضی نہ ہوگا اُسے نیزے کی انی کی اطاعت کرنا پڑیگی یعنی جو بات سے راضی نہ ہوگا وہ لات کھائیگا۔ جو دشمن کو اپنے حوض سے ہتھیار لیکر مار نہ ہٹائیگا اُس کا حوض ڈھا دیا جائیگا۔ اور جو دوسروں پر ظلم نہ کرے گا اُس پر دوسرے ظلم کریں گے۔ آدمی دو چیزوں کے مجموعے سے عبارت ہے، زبان اور دل۔ باقی گوشت اور خون کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

عنترہ بن شداد العبسی

تمام شعرائے جاہلیین میں عنترہ کا کلام عربی فطرت مردانہ کی کامل ترین تصویر ہے۔ عنترہ کے دیوان سے ایک منتخب تائیہ قصیدہ جو اس کے کلام کا ایک عمدہ نمونہ کہا جا سکتا ہے اور اور اس کا منظوم ترجمہ جس میں میں نے اصل متن کی کیفیت اور زور پیدا کرنے کی کوشش

کی ہے درج ذیل ہیں :-

إِذَا قَنِعَ الْفَتَىٰ بِذَمِيمِ عَيْشٍ ... وَكَانَ وَرَاءَ سَجْفٍ كَالْبَنَاتِ

وَلَمْ يَهْجُمْ عَلَىٰ أُسْدِ الْمَنَايَا ... وَلَمْ يَطْعَنْ صُدُورَ الصَّافِنَاتِ

وَلَمْ يَقْرِ الضُّيُوفَ إِذَا أَتَوْهُ ... وَلَمْ يُرْوِ السُّيُوفَ مِنَ الْكُمَاةِ

وَلَمْ يَبْلُغْ بِضَرْبِ الْهَامِ مَجْدًا ... وَلَمْ يَكُ صَابِرًا فِي النَّائِبَاتِ

فَقُلْ لِلنَّاعِيَاتِ إِذَا بَكَتْهُ ... أَلَا فَاقْصِرْنَ نَدْبَ النَّادِبَاتِ

وَلَا تَنْدُبْنَ إِلَّا لَيْثَ غَابٍ ... شُجَاعًا فِي الْحُرُوبِ الثَّائِرَاتِ

دَعُونِي فِي الْقِتَالِ أَمُوتُ عِزًّا ... فَمَوْتُ الْعِزِّ خَيْرٌ مِنْ حَيَاتِي

لَعَمْرِيَ مَا الْفَخَارُ بِكَسْبِ مَالٍ ... وَلَا يُدْعَى الْغَنِيُّ مِنَ السَّرَاةِ

سَتَذْكُرُنِي الْمَعَامِعُ كُلَّ وَقْتٍ ... عَلَىٰ طُولِ الْحَيَاةِ إِلَى الْمَمَاتِ

فَذَاكَ الذِّكْرُ يَبْقَىٰ لَيْسَ يَفْنَىٰ ... مَدَى الْأَيَّامِ فِي مَاضٍ وَآتٍ

وَإِنِّي الْيَوْمَ أَحْمِي عِرْضَ قَوْمِي ... وَأَنْصُرُ آلَ عَبْسٍ عَلَى الْعُدَاةِ

وَآخُذُ مَالَنَا مِنْهُمْ بِحَرْبٍ ... تَخِرُّ لَهَا مُتُونُ الرَّاسِيَاتِ

وَأَتْرُكُ كُلَّ نَائِحَةٍ تُنَادِي ... عَلَيْهِمْ بِالتَّفَرُّقِ وَالشَّتَاتِ

ترجمہ

کسی بدبخت کو گر خستہ حالی پر قناعت ہو ... عفیفہ کی طرح محتاجِ امن و خفا و راحت ہو

پلنگِ مرگ کی صورت سے اس کے دل کو دہشت ہو ... سنانِ تشنہ کو خونِ جوانمرداں کی حسرت ہو

کوئی مہمان آجائے تو اُس پر اک مصیبت ہو ... نہ خوگر ہو بلاؤں کا، نہ غم سہنے کی عادت ہو

نہ سینوں میں اسے برچھی چبھونے کی مہارت ہو ... عدو کے کاسۂ سر کا نہ سر پر تاجِ عزت ہو

اگر کرتی ہو کوئی نیکبخت اُس کے لئے ماتم ... کہو اُس سے "لٹاتی مفت کیوں ہو آبِ اشکِ غم

بہائے اُس پہ آنسو جس نے رنجِ جنگ جھیلے ہیں ... سدا جس شیر نے شمشیر و خوں کے کھیل کھیلے ہیں"

مجھے تو چھوڑ دو لڑنے کو رن میں جاں نثاری سے ... ہے مرگِ آبرو بہتر حیاتِ عجز و خواری سے

ستم ہے جان کی عزت نہین کچھ مالداری ہے
غنی کہلا نہین سکتا کوئی سکہ شماری سے
نفیر غزوہ جب جب دیکی مرگ عام کی دعوت
ستم دیدہ کرین گے یا دمجھکو بے قراری سے
نہین چلتا فنا کا زور اپنے کارنامون پر
یہی اک شے ہے ایمن دہر کی بنیاں شعاری سے
مین وہ ہون عزت اپنی قوم کی محفوظ رکھتا ہون
بچاتا ہون اسے دشمن کے آگے شرمساری سے
ہمارے پاس جو دولت ہے حرب کی بدولت ہے
ہمارے پاس جو کچھ مال ہے مال غنیمت ہے
عدو کی فوج کو میدان مین چھوڑ آتے ہین یون ہم
کہ رونے والیان کرتی ہین اُنکے حال پر ماتم

عنترہ کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہون :-

مَاءُ الحَیٰوۃِ بِذِلَّۃٍ کَجَھَنَّمٍ وَجَھَنَّمٌ بِالعِزِّ اَطْیَبُ مَنْزِلٍ

ذلت کے ساتھ اگر آب حیات بھی ملے تو جہنم کے برابر ہے اور عزت کے ساتھ جہنم بھی ہو تو سب سے اچھی جگہ ہے -

اُرَاعِی نُجُومَ اللَّیْلِ وَھِیَ کَاَنَّھَا قَوَارِیرُ فِیْھَا زِئْبَقٌ یَتَرَجْرَجُ

رات کے تارون پر نظر جماتا ہون تو وہ شیشے معلوم ہوتے ہین جن مین پارہ پڑا تھر تھرا رہا ہو۔

متفرق شعرا حماسہ مین ایک قطعہ منقول ہے۔

مَا اَنَا بِالسَّاعِیْ اِلٰی اُمِّ عَاصِمٍ لِاَضْرِبَھَا اِنِّیْ اِذًا لَجَھُوْلُ
لِیَ الْبَیْتُ اِلَّا فِتْنَۃً سُنِّیْھَا اِذَا کَانَ مِنْ ضَیْفٍ عَلَیَّ نُزُوْلُ

مین اپنی بیوی (ام عاصم کو زدوکوب کرنا نہین چاہتا - اگر ایسا کرون تو میری نادانی ہے "بیوی - سُن لو یہ گھر تمھارا ہے جو چاہو کرو لیکن جسوقت کوئی مہمان آجائے تو اُسے میرے حوالہ کردو - پھر تمھارا کچھ دخل نہین "

امیہ بن الصلت نے اپنے ممدوح کی مدح مین کتنا نازک خیال ادا کیا ہے!

اَاَذْکُرُ حَاجَتِیْ اَمْ قَدْ کَفَانِیْ حَیَاءُکَ اِنَّ شِیْمَتَکَ الْحَیَاءُ

مین اپنی حاجت بیان کرون یا تیری حیا میرے لیے کافی ہے؟ کیونکہ حیا تیری خصلت ہے-

عمرو بن الاطنابہ من بنی الخزرج (الجاھلی) کہتا ہے-

اِنِّیْ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ اِذَا ابْتَدَوْا ۔ بَدَءُوْا بِحَقِّ اللّٰہِ ثُمَّ النَّائِلِ
اَلْمَانِعِیْنَ مِنَ الْخَنَا جَارَاتِہِمْ ۔ وَالْحَاشِدِیْنَ عَلٰی طَعَامِ النَّازِلِ
وَالْخَالِطِیْنَ فَقِیْرَہُمْ بِغَنِیِّہِمْ ۔ وَالْبَاذِلِیْنَ عَطَاءَہُمْ لِلسَّائِلِ
وَالْقَاتِلِیْنَ لَدَی الْوَغٰی اَقْرَانَہُمْ ۔ اِنَّ الْمَنِیَّۃَ مِنْ وَرَاءِ الْوَائِلِ
وَالْقَائِلِیْنَ فَلَا یُعَابُ کَلَامُہُمْ ۔ یَوْمَ الْمَقَامَۃِ مِنْ قَضَاءِ الْفَاصِلِ
لَیْسُوْا بِاَنْکَاسٍ وَلَا مِیْلٍ اِذَا ۔ مَا الْحَرْبُ شُبَّتْ اَشْعَلُوْا بِالشَّاعِلِ

میں اس قوم سے ہوں جو مجلس میں بیٹھتی ہے تو واجب حقوق سے ابتدا کرتی ہے پھر نفل حقوق ادا کرتی ہے۔ اپنی ہمسایہ عورتوں کو فحش سے باز رکھتی ہے اور دستر خوان پر مہمانوں کو جمع رکھتی ہے۔ اس کے محتاج دولتمندوں کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں۔ سائلوں کو خیرات دیتی ہے۔ رزم میں اپنے برابر کے مقابلوں کو مارتی ہے اور موت بھاگنے والوں ہی کا پیچھا بھی کرتی ہے۔ ایسے سخنگو ہیں جن کے کلام میں بزم سخن میں کوئی ناقد عیب نہیں نکالتا۔ نہ وہ کنجوس ہیں نہ ضعیف و ناتوان۔ جب آتش جنگ گرم ہوتی ہے تو پرجوش جنگ آوروں کے ساتھ یہ بھی شعلہ افگن ہوتے ہیں۔

عروہ بن الورد العبسی (الجاہلی) کہتا ہے:-

اِنِّیْ امْرُؤٌ عَافِیْ اِنَائِیَ شِرْکَۃٌ ۔ وَاَنْتَ امْرُؤٌ عَافِیْ اِنَائِکَ وَاحِدُ
اَتَھْزَاُ مِنِّیْ اَنْ سَمِنْتَ وَاَنْ تَرٰی ۔ بِوَجْھِیْ شُحُوْبَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ جَاھِدُ
اُقَسِّمُ جِسْمِیْ فِیْ جُسُوْمٍ کَثِیْرَۃٍ ۔ وَاَحْسُوْ قَرَاحَ الْمَاءِ وَالْمَاءُ بَارِدُ

میں وہ شخص ہوں کہ میرے دستر خوان سے شریک بہرہ ور ہوتے ہیں اور تو اپنے دستر خوان کا اکیلا حصہ دار ہوتا ہے۔ پھر کیا تو میرا مذاق اڑاتا ہے کہ تو موٹا ہے اور حق خدمت گذاری کے شدائد سے میرے چہرہ کا رنگ متغیر دیکھتا ہے؟ بات یہ ہے کہ میں اپنے جسم کو بہت سے جسموں میں تقسیم کرتا ہوں اور ٹھنڈے پانی پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۲)

آثار زوال

ان اقتباسات سے ہم نے عربی شاعری کی خصوصیات امتیازی پیش کرنے کی کوشش کی ہے موجودہ متمدن اقوام کی شاعری کے مقابلہ میں اس کی سادگی اور اصلیت کس قدر اچھوتی اور دلکش نظر آتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی روشن کردینا ضروری ہے کہ آج ہمارے تمدن و تکلف کی نسبت سے یہ کلام خواہ کیسے ہی سادہ اور موثر معلوم ہوں لیکن حقیقۃً جس عہد کی شاعری کے نمونے ہم نے دکھائے ہیں اس میں کلام عرب کی حقیقی سادگی اور بے تکلفی باقی نہ رہی تھی۔ ظہور اسلام اور نزول قرآن مجید نے اس شاعری میں جو انقلاب پیدا کیا وہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ آغاز اسلام سے پہلے ہی چھٹی صدی عیسوی کے شروع میں جب یہ متداول قصائد نظم ہوئے ہیں عربی شاعری میں اصلیت کی کمی اور نقالی کی زیادتی شروع ہوگئی تھی۔ شجاعت، سخاوت، غیرت، تعشق وغیرہ مضامین پامال ہوتے ہوتے ایسے عامیانہ بن گئے تھے کہ اپنی تازگی و شگفتگی اور تاثیر بہت کچھ کھو چکے تھے۔ موجودہ فارسی اردو تغزل کی طرح یہ صرف نظم سخن کا ایک ڈھرا بن گئے تھے۔ حماسہ کو اٹھا کر دیکھیے ایک ہی سے مضامین متعدد شعراء کے کلام میں بکثرت نظر آئینگے۔ مثلاً باب الاضیافات المدیح میں پہلی نظم جو عتیبہ بن مجیر المازنی کی ہے وہی باب کے تمام شعرا کا مضمون ہے:-

ومستنبح تهوى مساقط راسه	الى كل شخص فهو للسمع اصور
يُصَفِّقُهُ انفٌ من الريح باردٌ	ونكباءُ ليلٍ من جمادى رصهر
حَصَنَاتُ له نارى فابصرَ ضوءَها	وما كاد (لولا حضأةُ النار) يبصر
فلمّا اضاءت شخصَه قلت مرحبًا	هَلُمَّ ‹‹ وللضالين بالنار البشرا ››
وقمت بنصل السيف والبركُ هاجدٌ	بهازرةٌ والموت فى السيف ينظر
فباتت رُحَابٌ جَوْنَة (من لحامها)	وفوها (بما فى جوفها) يتغرغر

یعنی اکثر شب زدہ مسافر جو آبادی کی تلاش میں گوش برآواز رہتا ہے اور جاڑوں کی سرد اور تند ہواؤں کے جھونکے اسے طمانچے لگاتے ہیں ایسے وقتوں میں میں نے اپنے

ہاں آگ روشن کی ہے جس نے اِس مسافر کی رہنمائی کی ہے اور اس کے بغیر اُس کی رہنمائی کی کوئی تدبیر نہ تھی - جب روشنی میں اس کی شکل نظر آئی تو میں نے اسے اور اُس کے ساتھ والوں کو خوش آمدید کہا - میں تلوار لیکر اُٹھ کھڑا ہوا اور سوتے ہوئے اونٹوں کے گلے میں گھسکر خونریزی شروع کر دی اور ایک بڑا سا دیگ گوشت سے بھر کر چولھے پر چڑھا دیا جو جوش کھانے لگا" ازین قبیل مضامین شعراء جاہلیین سے لیکر اسلامیین تک نظم کرتے چلے آئے ہیں اور صرف مضامین نہیں ڈھلے ڈھلائے الفاظ اور بندش تک قریب قریب علی حالہٖ نقل ہوتی چلی آئی ہے جیسے دیکھئے مہان نوازی کے مضمون میں لفظ مُستَنبِح یا نابح سے ابتدا کرتا ہے جس کے معنی کتے کی آواز پر کان لگانے یا کتے کی طرح بھونکنے والے کے ہیں۔[۲۷] ایسے مضامین کی مشابہت و مماثلت کے اظہار کے لئے طویل اقتباسات درکار ہوں گے - ذیل کے منتخب ابیات سے دونوں باتوں کا موازنہ ہو سکتا ہے اور اسی پر دوسرے شعراء کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے - ان میں تشابہ لفظی اس قدر نمایاں ہے کہ ترجمہ کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی -

عتیبہ بن بجیر المازنی کہتا ہے:-

وَمُستَنبِحٍ (بَاتَ الصَّدَى یَستَتِیهُهُ ... اِلی کل صوتٍ) فهو فی الرحل جانح
فَقُمتُ وَلَم اَجثِم مَکَانِی وَلَم تَقُم ... مع النفس علات البخیل الفواضح

دوسرا شاعر کہتا ہے:-

وَمُستَنبِحٍ (قَالَ الصَّدی مِثلَ قَولِہٖ ... حضأت لہ نارًا لھا حَطَبٌ جزل
فَقُمتُ اِلَیہِ مُسرِعًا فَغَنِمتُہٗ ... مَخَافَۃَ قَومِی اَن یَّفُوزُوا بِہٖ قبلُ

ایک اور شاعر کہتا ہے:-

وَمُستَنبِحٍ بَعدَ الھُدُوءِ دَعَوتُہٗ ... بِشَقرَاءَ مِثلِ الفَجرِ ذَاکٍ وُقُودُھَا
فَقُلتُ لَہٗ اَھلًا وَسَھلًا وَمَرحَبًا ... بِمُوقِدِ نَارٍ مُحمِدٍ مَن یَّرُودُھَا

نمری کہتا ہے:-

وَدَاعٍ دَعَا بَعدَ الھُدُوءِ کَاَنَّمَا ... یُقَاتِلُ اَھوَالَ السُّرَی وَتُقَاتِلُہٗ

فقلت لہ اہلاً و سہلاً و مرحبا رشدت ولم اقعد الیہ اسائلہ
وقمت الی برک ہجان اعدّہ لوجبۃ حق نازل انا فاعلہ

حماس بن ثامل کہتا ہے -

ومستنبح فی لجّ لیل دعوتہ بمشبوبۃ فی رأس صمد مقابل
وقلت لہ اقبل فانّک راشد وانّ علی النار الندی و ابن ثامل

اسی سلسلہ مین ایک اور مضمون آتا ہے - شاعر کی بیوی میان کو اس کے اسراف اور فاقہ مستی پر ملامت کرتی اور اپنی اور بچون کی حالت زار کی طرف متوجہ کرتی ہے - میان اپنی سخاوت کے زعم مین بیوی کو جھڑک دیتا ہے - یہ بھی مضمون مذکورہ بالا کی طرح تختۂ مشق شعرا بن گیا -

× سوادۃ الیربوعی کہتا ہے :-

الا بکرت میّ علیّ تلومنی تقول الا اہلکت من انت عائلہ
ذرینی فانّ البخل لا یخلد الفتی ولا یہلک المعروف من ہو فاعلہ

میری بیوی میّ یا میّہ صبح کو میرے پاس یون ملامت کرتی آئی "ہائے تونے اپنے گھر والون کو ہلاک کر ڈالا !" مین نے کہا "چل دور ہو - بخل سے انسان کو زندگی جاوید نہین ملا کرتی اور نیکی نیکوکار کو ہلاک نہین کرتی "

اس مضمون کے لیے بھی الفاظ کا مین ڈھانچا ہے - مثلاً الا بکرت ام فلان ..... یا ...... وعاذلۃ .... تلومنی .... ذرینی وغیرہ کلمات ضرور استعمال ہوتے ہین - مثلاً بنی سعد کا ایک شاعر کہتا ہے :-

الا بکرت امّ الکلاب تلومنی تقول الا قد ابکا الدرّ حالبہ "
تقول الا اہلکت مالک ضلّۃ ؟ " وہل ضلّۃ ان ینفق المال کاسبہ "

عبد اللہ بن حشرج الجعدی کہتا ہے -

الا بکرت تلومک امّ سلم وغیر اللوم ادنی للسداد
وما بذلی تلادی دون عرضی باسراف (امیم) ولا فساد

حاتم (الجاهلی) کہتا ہے۔

وَعَاذِلَةٍ قامَتْ عَلَیَّ تَلُومُنِی   کَأَنِّی إِذَا أَعْطَیْتُ مَالِی أُضِیمُهَا

"أَعَاذِلَ إِنَّ الجُودَ لَیْسَ بِمُهْلِکِی   وَلَا مُخْلِدٌ النَّفْسِ الشَّحِیحَةِ لُؤْمُهَا

قصائد مین عمومًا شاعر کے کسی ویران مقام پر کھڑے ہوکر جہان کبھی اُس کی محبوبہ کے خاندان کا پڑاو تھا اُس کی یاد مین گریہ وزاری سے ابتدا ہوتی ہے۔ پھر اس زمانہ کا تذکرہ ہوتا ہے جب وہان پر محبوبہ کا قیام تھا اور عشق بازی کی پینگین دونون طرف سے چلا کرتی تھین۔ اس سلسلہ مین ایام وصل کے سارے کوائف کا پوست کندہ بیان، بیوفائی کا شکوہ پھر وداع کا سمان مذکور ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک نہایت تیز ناقہ کی تلاش ہوتی ہے جو اسے چشم زدن مین منزل جانان تک اوڑا لے جائے۔ اس جانور کی تعریف و توصیف پر بیسیون شعر وقف ہوتے ہین۔ اس سے گریز کرکے اپنی شہسواری، جفاکشی، دلیری، مہمان نوازی، شرافت نسلی کے فخر پر قصیدہ تمام ہوتا ہے اور اصل مقصود بھی یہی تفاخر ہوتا ہے یہی مضامین ہر پھر کر اس طرح ان کے کلام مین آتے ہین کہ ساری سادگی تکلف و تصنع بن جاتی ہے اور غلامانہ پابندی رسم سے سامع کے دل مین ویسی ہی کراہت پیدا ہو جاتی ہے جیسے اردو کی عام عاشقانہ غزلون سے سبعہ معلقہ مین بھی یہی غلامانہ طرز نمایان ہے۔ زہیر اور عنترہ نے کسی قدر علٰحدہ روش نکالی ہے۔ باقی سب ایک ہی راگ الاپتے ہین بعض اوقات تو صرف تکرار مضامین ہی نہین بلکہ ادنی تصرف سے الفاظ بھی ایکسے ہی استعمال کیے گئے ہین طرفہ کہتا ہے۔

وُقُوفًا بِهَا صَحْبِی عَلَیَّ مَطِیَّهُمْ   یَقُولُونَ لَا تَهْلِکْ أَسًى وَتَجَلَّدِ

امرؤ القیس اس سے پہلے کہہ چکا ہے۔

وُقُوفًا بِهَا صَحْبِی عَلَیَّ مَطِیَّهُمْ   یَقُولُونَ لَا تَهْلِکْ أَسًى وَتَجَمَّلِ

صرف قافیہ کے اختلاف کے سبب ایک لفظ کا فرق ہے۔

ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ ایک شاعر اپنے پیش رو کی تشبیہ بعینہ نقل کرلیتا ہے لبید کہتے ہین۔

أَدَرُجُعُ وَاشِمَةٍ أُسِفَّ نُؤُورُهَا   کِفَفًا تَعَرَّضَ فَوْقَهُنَّ وِشَامُهَا

"منزل محبوبہ کے مٹے مٹائے نشانات سیلاب سے اس طرح نمایاں ہو گئے ہیں جیسے کسی عورت کا گودنا جس کے حلقوں میں نیل بھرا ہوتا ہے اور امتداد زمانہ سے ہلکا پڑ جانے کے بعد دوبارہ سیاہی بھر کر نمایاں کر دیا جاتا ہے" - زہیر ابن ابی سلمٰی بھی یہ تشبیہ لا چکا ہے۔

[وَدَارٌ لَهَا بِالرَّقْمَتَيْنِ كَأَنَّهَا مَرَاجِيعُ وَشْمٍ فِي نَوَاشِرِ مِعْصَمِ]

"رقمتین میں منزل محبوبہ کا بچا کھچا نشان ایسا ہے جیسے پہونچے پر گودنے کا مکرر نشان"

زہیر کہتا ہے:-

أَمِنْ أُمِّ أَوْفَى دِمْنَةٌ لَمْ تَكَلَّمِ بِحَوْمَانَةِ الدَّرَّاجِ فَالْمُتَثَلَّمِ
وَقَفْتُ بِهَا مِنْ بَعْدِ عِشْرِينَ حِجَّةً فَلأْيًا عَرَفْتُ الدَّارَ بَعْدَ تَوَهُّمِ
فَلَمَّا عَرَفْتُ الدَّارَ قُلْتُ لِرَبْعِهَا أَلَا انْعَمْ صَبَاحًا أَيُّهَا الرَّبْعُ وَاسْلَمِ

"کیا دراج واقع متثلم کی سرزمین میں یہ ام اوفی (محبوبہ) کے پڑاؤ کا نشان ہے جو میری بات کا جواب نہیں دیتا؟ اس جگہ پر میں آج بیس برس کے بعد کھڑا ہوا ہوں اور اس کھنڈر کو بڑے غور کے بعد پہچانا اور پہچان لیا تو اس سے یوں مخاطب ہوا" اے نشان یار ہر آفت سے محفوظ و سلامت رہ"۔

عنترہ کہتا ہے:-

[هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمِ أَمْ هَلْ عَرَفْتَ الدَّارَ بَعْدَ تَوَهُّمِ
يَا دَارَ عَبْلَةَ بِالْجِوَاءِ تَكَلَّمِي وَعِمِي صَبَاحًا دَارَ عَبْلَةَ وَاسْلَمِي]

"کیا شعراء نے تیرے لیے بھی کوئی مضمون چھوڑا ہے؟ کیا تو نے نشان یار کو غور و فکر کے بعد پہچانا؟ اے وادی جوا میں عبلہ (معشوقہ) کے نشان! بات کا جواب دے اور اے عبلہ کے کھنڈر ہر آفت سے محفوظ رہ"۔ شاعر نے پہلے مصرعے میں اپنی تقلید و تتبع کے لیے جو دفع دخل مقدر کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسے صرف یہ فکر رہی کہ مضمون تازہ ہو اور دوسروں کا پس خوردہ نہ ہو۔ اپنے حقیقی جذبات کے اظہار کی چنداں فکر نہیں۔ اس شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سارے مضامین پامال ہو چکے ہیں غرض ظہور اسلام سے کچھ پہلے ہی حقیقی عربی شاعری کا زوال شروع ہو چکا تھا بدیلتہ

بھی عرب کا بہترین نمونہ شاعری نہین معلوم ہوتا۔ ہان شعراے معلقات کے عہد سے پہلے کا کلام اگر میسر آسکتا تو یقین ہے کہ ہمین عربی شاعری کا حقیقی نمونہ ہاتھ آتا اور عربی زندگی وجذبات کی زیادہ صحیح تصویر دکھائی دیتی۔

عہد معلقات سے پیشتر کے نمونون کی جستجو مین کچھ اجزا ملتے بھی ہین تو وہ زیادہ تر وہ صنف ہے جسے رجز یا لحبہ کہتے ہین۔ کاہنون کی پیشین گوئیان اسی طرز مین ہین۔ یہ آٹھ دس شعرون کی ایک مسلسل نظم ہوتی تھی جس کے ہر مصرع مین ایک ہی قافیہ کی قید ہوتی تھی۔ ابن ہشام نے سیرۃ رسول اللہؐ مین اس قسم کے بول جا بجا نقل کئے ہین۔ یہ نمونے اپنی قدامت و بدویت پر صاف دلالت کر رہے ہین۔ صورت و معنی مین ان گھڑ روڑون کو معلقات کی رنگی وشستگی سے کوئی نسبت نہین۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی کڑیان غائب ہین۔ عربی شاعری کے منازل ارتقائی جن مین عرب کے زیادہ قدرتی اور صحیح جذبات، طرز معاشرت، عادات واطوار دکھائی دیتے نظر سے پوشیدہ ہین۔ فرانسیسی مصنف موسیو ہوارٹ قسطنطنیہ کے حاکم سینٹ نیلس کا قول نقل کرتا ہے، جس کا زمانہ ۴۰۰ء کے لگ بھگ ہے "صنعاء کے عرب اپنا طویل اور خطرناک سفر تمام کر کے کسی چشمہ پر پہنچتے تھے تو فرط خوشی مین وہ فی البدیہہ اشعار گاتے تھے۔ اس قسم کے کلام کا کوئی نمونہ اب باقی نہ رہا" یعنی ۴۰۰ عیسوی مین ہی معدوم ہو چکا تھا۔ اسی طرح موسیو موصوف ایک یونانی مصنف سوزومن سے جس نے پانچوین صدی عیسوی مین ایک تاریخ مذاہب لکھی تھی ناقل ہے "۳۷۲ عیسوی مین ماویہ یا مادیہ ملکۂ عرب نے فلسطین اور فونیشیا مین رومانی افواج کو شکست دی تھی جسکی یادگار مین عربون نے بہت کچھ سخن سرائی کی تھی اور مدت تک اپنے کلام مین اس واقعہ کا فخریہ تذکرہ کرتے رہے۔ اب کسی کا نشان نہین ملتا۔"

محمد مسلم (از ہزاری باغ)

کلام عزیز

عشق سے صرف ایک سوز دل مجھے حاصل ہوا / وہ بھی صرف گرمی ہنگامۂ محفل ہوا
عشق میں طے اس طرح ہر جادۂ منزل ہوا / پیچھے پیچھے موت آگے آگے میرا دل ہوا
داستان زندگی کہنے کی فرصت ہو کسے / مختصر یہ ہو اب اُن کے رحم کے قابل ہوا
روح کی خلقت کا پیکر میں وہی ہنگام تھا / دل ازل میں جب نگاہ ناز سے بسمل ہوا
عکس تیرے خال رخ کا ظاہر و باطن فروز / بن گیا دل میں سویدا پتلیوں میں تل ہوا
ہجر میں اخفائے راز عشق تھا کار محال / آنکھ سے جو اشک ٹپکا ترجمان دل ہوا
سوز باطن کی تسلی ہو گئی آخر عذاب / دل میں دوزخ کے بھڑکتے ہی سکون حاصل ہوا
عشق نے قالب بنایا روح پھونکی درد نے / جوش بیتابی تسلی سے رکا اور دل ہوا
اس محیط عشق میں جبکہ کنارہ ہی نہ تھا / ڈوب کر اوبھرا تو اور دریا کے لئے ساحل ہوا
اپنی تصویروں سے خود آراستہ اک بزم کی / دل میں کیا آئی کہ پھر برہم زن محفل ہوا
اک نگاہ واپسیں اس سے بہت کچھ کہہ گئی / پھر بھی اس حسن بلاغت کا نہ وہ قائل ہوا
بعد میرے آنیوالے مطمئن شاید رہیں / مجھکو تو اک سانس لینا بھی یہاں مشکل ہوا
تو بھی رہنما نہ ہوا اے پچھلے پہر کی خامشی / کشتۂ ضبط محبت جس طرح غافل ہوا
دیکھ لو حسرت بھری آنکھوں کو سرکا کے کفن / ابتو شاید مرنے والا رحم کے قابل ہوا
میرے دل کی آیتوں سے ہی بہت کچھ کھلا / یوں تو سب پر یہ صحیفہ عشق کا نازل ہوا

گلشن ہستی ہی میرے واسطے زندان عزیز
سرو کے مانند آزادی میں پا در گل ہوا

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زمان از غیب جانے دیگر ست

سلطان ارباب مشاہدہ۔ پیشوائے اصحاب مجاہدہ۔ مستغرق ذات حضرت علیم۔ شہید تیغ رضا و تسلیم۔ گذشتہ ہستی یخدا یار۔ محبوب حق خواجہ قطب الدین بختیار قدس سرہ العزیز کمل عرفا و زمانہ۔ خاصان خدا اور مردان روزگار مین سے تھے خواجہ غریب نواز خواجہ خواجگان اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سجادہ نشین و خلیفہ برحق تھے۔ دلیل العارفین مین خود فرماتے ہین کہ ایک روز پنجشنبہ کو مسجد جامع اجمیر مین خواجہ غریب نوازؒ نے ارشاد فرمایا کہ "ما را اینجا آوردہ اند مدفن ما اینجا خواہد بود و میان چند روز ما سفر خواہیم کرد بعدازان شیخ علی سنجریؒ را فرمان شد کہ مثال بنویس تا قطب الدین در دہلی رود کہ خلافت سجادہ قطب الدین را دادیم و دہلی مقام اوست" چنانچہ آپ خلافت و تبرکات بزرگان ماسبق حاصل کرکے دہلی تشریف لائے اور وہین مقیم ہوئے رشد و ارشاد فرمایا اور وہین انتقال فرمایا

آپ کے والد ماجد کا اسم مبارک سیر العارفین اور مراۃ الاسرار کے بموجب کمال الدین احمد بن موسیٰ تھا اور قصبہ اوش کے رہنے والے تھے جو دیار فرغانہ صوبہ ماوراء النہر مین واقع تھا۔ کاکی آپکا لقب تھا جسکی وجہ تسمیہ آگے آئے گی مگر مراۃ ضیائی اور صاحب نفحات العنبریہ نے آپ کا سلسلہ نسب یہ بیان کیا ہے بہ۔

خواجہ قطب الدین اوشیؒ بن سید موسیٰ۔ بن سید احمد اوشی بن سید کمال الدین بن سید محمد بن سید احمد بن سید اسحاق حسن بن سید معروف بن سید احمد چشتی بن سید رضی الدین بن سید حسام الدین بن سید رشید الدین بن سید جعفر بن حضرت امام محمد تقی الجواد تا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ۔

سیر العارفین صاحب مراۃ الاسرار کے بیان مین اور اس مین تھوڑا فرق ہے۔ اس مین آپکے والد ماجد کا نام سید موسیٰ بیان کیا ہے۔ اور حضرت عبدالرحمن چشتیؒ مولف مراۃ الاسرار

کمال الدین فرماتے ہین۔ نفحات عنبریہ کے شجرہ مین سید احمد اوشیؒ کے والد ماجد کا نام سید کمال الدین درج ہے۔ مگر ان کے اجداد مین سید موسیٰ کوئی نہین گذرے جو یہ خیال ہوسکتا کہ اہل عرب کے طریقہ کے بموجب چند پیڑھیان حذف کرکے صرف ایک جد کا نام لکھدیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ سید موسیٰ کے کوئی صاحبزادے سید کمال الدین ہون اور صاحب نفحات عنبریہ کو تحقیق نہ ہوسکی ہو۔ کتاب فردوسیہ اور جواہر فریدی مین آپ کا شجرۂ نسب حسب ذیل درج ہے :۔

سید قطب الدین بن سید کمال الدین بن سید محمد بن سید اسحاق ۔ بن سید معروف بن سید احمد بن سید رضی الدین بن سید حسام الدین بن سید رشید الدین بن امام محمد جواد بن امام علی موسیٰ رضا الخ

اس شجرہ کے مطابق بھی آپ کے والد ماجد کا نام نامی سید کمال الدین ہے اور یقیناً یہی صحیح معلوم ہوتا ہے مگر اس شجرہ مین چند پیڑھیان کم ہین جو اک معمولی سی بات ہے۔

آپ کی ولادت باسعادت قصبہ اوش مین سیدون کے ایک عالی خاندان مین شب دوشنبہ کو واقع ہوئی۔ نفحات العنبریہ مین سنہ ولادت ۵۸۲ھ لکھا ہے۔ مگر صاحب مراۃ الاسرار آپ کی عمر کے متعلق تین روایتین بیان فرماتے ہین ایک قول کی رو سے آپ کی عمر شریف باون سال کی ہوتی ہے۔ دوسرے قول سے پچاس سال کی اور تیسرے قول کی رو سے ترسٹھ سال کی ہوتی ہے ۔ سنہ وفات اخبار الاخیار اور مراۃ الاسرار مین چھ سو تینتیس ہجری درج ہے لیکن نفحات عنبریہ مین چھ سو چونتیس ۶۳۴ھ درج ہے اور عمر باون سال لکھی ہے۔ اس لیے مراۃ الاسرار کے مطابق آپ کی ولادت ۵۸۱ھ یا ۵۸۳ھ یا ۵۶۸ھ مین ہوئی۔

مراۃ ضیائی مین ۶۳۳ھ سنہ وفات درج ہے اور غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ التمش کی اور آپ کی وفات کا سال ایک ہی ہے اور اسی سنہ مین شمس الدین التمش بادشاہ دہلی نے انتقال کیا ہے۔

سیر العارفین مین ہے کہ جب آپ کی عمر ڈیڑھ سال کی ہوئی تو آپ کے والد ماجد خواجہ کمال الدین احمد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا والدہ ماجدہ نے آپ کی پرورش فرمائی ۔ جب

پانچ سال کی عمر ہوئی تو پڑوس کی ایک معلمہ کے پاس پڑھنے کو بٹھایا۔ اتفاقاً ایک روز ایک پیر مرد نورانی صورت تشریف لائے اور لڑکے کو گود میں لیکر پیار کیا اور شیخ ابوالحفص اوشی کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ اس بچے کو اچھی طرح تعلیم دیجیے۔ انشاء اللہ تعالی یہ اپنے زمانہ کے اولیائے کبار میں سے ہوگا۔ شیخ نے بدل وجان قبول فرمایا اور تعلیم شروع کی خیرالمجالس میں حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلی فرماتے ہیں کہ شیخ ابوالحفص کی صحبت میں خواجہ قطب الدین بختیار نے اخلاق ظاہری و باطنی کی تہذیب اور شریعت و طریقت کے اداب حاصل کیے اور آراستگی ظاہر و باطن نصیب ہوئی حتیٰ کہ ایک لمحہ بھی ریاضت و مجاہدہ کے بغیر آپ کو چین نہ آتا۔ رات دن میں اندازاً ڈھائی سو رکعت نماز ادا فرماتے اور ہمیشہ مشغول بحق رہتے اسی اثنا میں بغداد شریف کا سفر پیش آیا اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردی۔ شیخ اوحدالدین کرمانی۔ شیخ برہان الدین چشتی اور شیخ محمود اصفہانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی صحبت نصیب ہوئی اور انہیں صاحبوں کی حضوری میں حضرت خواجہ خواجگان خواجہ بزرگ معین الحق والدین چشتی قدس سرہ سے شرف بیعت حاصل کیا اور خواجہ بزرگ کے فیض صحبت اور کمال مہربانی اور تلطف سے چندہی روز میں سیر سلوک تمام فرما کر مقام ارشاد پر فائز اور حضرت کے شرف خرقہ و خلافت سے بہرہ مند ہوے۔ اکثر کتب میں یہی درج ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں آپ نے شرف بیعت حاصل فرمایا اور بیس سال کی عمر میں مریدان با اخلاص کی تربیت فرمانے لگے۔

صاحب مراۃ الاسرار بحوالہ سیر الاولیا یہ نقل بیان کرتے ہیں کہ خواجہ قطب الاسلام سوتے وقت تین ہزار بار درود بھیجتے پھر سونے جاتے تھے۔ اوش میں جب آپکی شادی ہوئی تو یہ معمول تین رات ناغہ ہوگیا۔ آپ کے مریدوں میں ایک صاحب تھے جنکا نام رئیس تھا انھوں نے جناب رسالتمآب صلعم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں "سلام من بہ بختیار کاکی برسان وبگو ہر شب تحفہ کہ برمن میفرستادی میرسیدی۔ سہ شب است کہ نمی رسد" جب وہ خواب سے بیدار ہوے تو حضرت صلعم کا یہ پیام خواجہ صاحب کو پہونچا دیا۔ خواجہ قطب الدین نے اسی وقت بی بی کو بلا کر مہر ادا کیا اور طلاق دیدی کہ اُن کی وجہ سے یہ غفلت ظہور میں آئی تھی۔

حضرت خواجہ بزرگ سے رخصت ہوکر آپ عازم ہندوستان ہوئے اور اول ملتان مین آکر شیخ بہار الدین ذکریا ملتانی اور حضرت شیخ جلال تبریزی سے ملاقات کی۔ سیر الاولیا مین حضرت سلطان المشائخ کی زبانی نقل ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ قطب الاسلام شیخ بہار الدین ذکریا اور شیخ جلال الدین تبریزی تینون بزرگ ملتان مین تھے کہ لشکر کفار فصیل شہر کے نیچے تک پہونچ گیا۔ قباچہ بیگ والی ملتان ان بزرگوارون کی خدمت مبارک مین حاضر ہوا اور دعا ہمت کا خواستگار ہوا۔ خواجہ قطب الاسلام نے ایک تیر قباچہ بیگ کے ہاتھ مین دیا اور فرمایا کہ اسے لشکر کفار کی طرف پھینکدو۔ اُس نے حکم کی تعمیل کی چنانچہ فضل الٰہی نے صبح کے وقت یہ کرشمہ دکھایا کہ محاصرین کی فوج مین سے ایک کا بھی وجود نہ تھا سب محاصرہ چھوڑکر چلے گئے تھے۔ یہین ملتان ہی مین حضرت گنج شکر پہلی مرتبہ آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے۔

چند روز کے بعد خواجہ قطب الاسلام ملتان سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب دہلی کے قریب پہونچے سلطان شمس الدین التمش نے آپ کے قدوم میمنت لزوم کو موجب سعادت خیال کیا اور کمال اخلاص وصدق کے ساتھ خدمت مین حاضر ہوا اور ہفتہ مین ایکبار حصول قدمبوسی اپنا معمول کرلیا۔ شیخ جمال الدین محمد نظامی اس زمانہ مین دہلی کے شیخ الاسلام تھے۔ وہ اور شیخ محمد عطا معروف بہ قاضی حمید الدین ناگوری برابر حاضر خدمت مبارک ہوا کرتے تھے۔ شیخ حمید الدین ناگوری کو بغداد ہی سے خلوص واتحاد حاصل تھا۔ یہان آنے کے بعد اور بڑھ گیا۔ دونون کبھی کبھی ملکر سفر کیا کرتے تھے۔ سیر الاولیاء مین ایک مرتبہ کا حال مذکور ہے کہ آپ اور قاضی حمید الدین ناگوری ایک موقع پر ہم سفر تھے۔ ایک دریا کے کنارے پہونچے تو یہ حال دیکھا کہ ایک بڑا بچھو دریا کی طرف گیا اور اس مین داخل ہوا انہون نے اسکا تعاقب کیا۔ دوسرے کنارے پر یہ دیکھا کہ ایک شخص درخت کے تلے پڑا سو رہا ہے اور ایک سانپ اُسے ڈسنے والا ہے کہ اتنے مین یہ بچھو پہونچا اور جست مار کر سانپ پر حملہ آور ہوا اور اُسے ہلاک کر ڈالا۔ ان دونون کو شوق ہوا کہ دیکھین یہ کون سعادتمند ہے جس کی اس طرح حفاظت کی جاتی ہے

جب نزدیک پہونچے تو ایک شخص نظر آیا۔ شراب پئے ہوے۔ قے کئے بیہوش پڑا ہے
انھیں تعجب ہوا کہ یہ شخص ایسی نافرمانی کرتا ہے اور حق تعالیٰ ایسی نگہبانی فرماتا ہے۔ اس
تعجب پر ہاتف نے آواز دی کہ اے عزیز و اگر ہم صرف صالحون اور پارساؤن ہی کی
حفاظت کیا کرین تو مفسدون اور گنہگارون کی نگہبانی کون کرے گا۔ یہ دونون اسی
عالم مین تھے کہ وہ شخص ہوشیار ہوا اور یہ کل حال سنکر بہت شرمندہ ہوا توبہ کی اور
واصلان حق مین سے ہوگیا ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را | در سنگلاخ بادیہ پیا بریدہ اند
ناامید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش | ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

اس حکایت کے بعد خواجہ قطب الاسلامؒ فرماتے ہین کہ "اے درویش چون
وقت درآید و نسیم لطف وزیدن گیرد صد ہزار خرابا تی را صاحب سجادہ گرداند۔ و اگر
مبادا نسیم قہاری وزد صد ہزار سجادہ نشین را براند و بہ خرابات افگند" یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ
وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ۝

شیخ بدرالدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو جنھون نے آپ کے حالات بہت لکھے ہین
یہین دہلی مین آپ سے شرف بیعت و خرقہ حاصل ہوا۔ چنانچہ آپ کے حالات مین ایک
جگہ لکھتے ہین کہ خواجہ قطب الاسلامؒ نے غلبہ شوق ملازمت سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ
حضرت خواجہ خواجگانؒ کی خدمت مین عریضہ ارسال کیا کہ اگر اجازت ہو تو اجمیر حاضر ہو کر شرف
قدمبوسی حاصل کرون حضرت خواجہ بزرگؒ نے اُسیوقت جواب لکھوایا کہ المرءُ مع
من احب۔ قرب جانی اگر ہو تو بعد مکانی سے کچھ نہین ہوتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم خود
اس طرف آئین گے۔ چنانچہ آپ تشریف لاے۔ اس زمانہ مین شیخ نجم الدین صغرا
شیخ الاسلام دہلی تھے۔ خواجہ قطب الاسلام کی طرف لوگون کی بہت رجوعات دیکھکر
وہ حسد کرنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ خواجہ بزرگؒ سے بھی باوجود خراسان کی ملاقات کے ملنے
آئے۔ خواجہ بزرگؒ نے کمال اخلاق و فروتنی سے خود ہی سبقت فرمائی اور شیخ نجم الدین
صغرا سے ملنے گئے مگر وہ بے پروائی سے ملے خواجہ صاحب نے فرمایا کہ نجم الدین

کیا شیخ الاسلامی نے تمھارا مزاج بدل دیا ہے۔ اُنھون نے شرما کر جواب دیا کہ آپ نے ایک ایسے شخص کو یہان رکھ چھوڑا جو میری شیخ الاسلامی کو بالکل چلنے نہین دیتا۔ خواجہ بزرگ نے تبسم فرمایا اور کہا کہ اطمینان رکھو قطب الدین کو مین اپنے ہمراہ لیے جاتا ہون خواجہ بزرگ نے جب روانگی کے وقت قطب صاحب کو ہمراہ لیا تو تمام شہر اُمڈ آیا اور لوگون نے فریاد کرنی شروع کی۔ حضرت خواجہ خواجگان نے اسقدر لوگون کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا اور یہ کہکر قطب صاحب کو واپس کر دیا "بابا قطب الدین ہمدرین مقام باش کہ خلائق از بیرون آمدن تو در اضطراب وخراب اند۔ روا ندارم کہ چندین دلہا خراب وکباب باشند برو این شہر را درپناہ تو گذاشتیم" اُدہر کچھ عرصہ بعد شیخ نجم الدین صغری حضرت جلال الدین تبریزی کو جھوٹی تہمت لگانے کی علت مین موقوف ہو گئے اور شیخ الاسلامی حضرت غوث بہاء الدین ذکریا کے خادمون مین سے کسی ایک کو ملی۔

سیر العارفین مین ہے کہ آخر عمر مین قطب صاحب نے دہلی مین شادی کی اور دو صاحبزادے تولد ہوے ایک کا نام شیخ احمد تھا جن کی قبر آپ کے پہلو مین ہے۔ شیخ عبدالرحمن چشتی صاحب مراۃ الاسرار ان صاحبزادے صاحب کے حال مین فرماتے ہین کہ "صاحب جذبات عظیم وواردات غریبہ بود۔ اورا خواجہ احمد تماجی نیز گویند رحمۃ اللہ علیہ و او بعد از انتقال شیخ تا زمان سلطان المشائخ درقید حیات بود" دوسرے صاحبزادے کا نام شیخ محمد تھا لیکن ایام طفلی ہی مین آپ کا انتقال ہو گیا تھا۔

خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ تاہل کے بعد بھی بہت کم فتوح لیتے تھے چنانچہ آپکے گھر مین ہمیشہ تنگی رہتی تھی۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہین کہ قطب صاحب کو خواجہ بزرگ نے پانسو دینار تک قرض لینے کی اجازت دی تھی کہ اگر ضرورت لاحق ہو تو اسقدر قرض لیکر خرچ کرو۔ جب گھر مین دو ایک دن فاقہ گذرتا تو بی بی صاحبہ شرف الدین بقال سے جو ہمسایہ تھا کسیقدر قرض لے لیتین اور گھر بار کا خرچ چلتا۔ ایک روز بقال نے کہا کہ اگر مین ہمسایہ مین نہ ہوتا تو ان لوگون کا کیا حال ہوتا۔ بی بی صاحبہ کو یہ بات ناگوار گذری اور حضرت قطب صاحب سے معروضہ کیا آپ نے ارشاد فرمایا کہ آج سے

قرض ہرگز مت لینا۔ اور حجرہ مبارک میں ایک طاق تھا اس طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اگر ضرورت پڑے تو بسم اللہ کہکر اسمین ہاتھ ڈالنا۔ جو چاہوگی مل جائیگا۔ اس روز سے بی بی صاحبہ اس طاقچہ مین سے گرم گرم کلچے لے لیا کرتین اور اپنے اور متعلقین کے لئے کام مین لاتین۔ بقال کو جب آپ کی یہ بے تعلقی معلوم ہوئی تو شرمندہ ہوا اور اپنی بیوی کو دریافت حال کے لئے بھیجا۔ حضرت شیخ نے اس کرامت کی اطلاع اسے فرما دی۔ خواجہ صاحب کی اسی کرامت کی وجہ سے لوگ آپ کو کاکی (کاک بمعنی کلچہ۔ روٹی کی ٹکیہ) کہنے لگے۔ بختیار بھی آپ کا لقب تھا جو حضرت خواجہ بزرگ رح نے عطا فرمایا تھا صاحب مرۃ الاسرار فرماتے ہین کہ "خواجہ بزرگ اورا از راہ مہربانی اکثر قطب الدینؒ بختیار گفتے ازانجہت اورا بختیار لقب شد۔"

شیخ عبدالحق محدث دہلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہین کہ خواجہ قطب الدینؒ "از اکابر اولیا واجلۂ اصفیاست قبولے عظیم داشت و بغایت ترک تجرید و فقر و فاقہ موصوف بود و دائماً استغراق داشت در یاد مولی۔ چون کسے بزیارت او آمدے زمانے بایستے تا بخود باز آمدے آنگاہ بہ آن مشغول شدے اگر از حال خود یا حال آیندہ چیزے بگفتندے بعد گفتے مرا معذور دارید و باز بحق مشغول شدے و اگر یکے از اولاد بمردے اور از ان خبر شدے مگر بعد از ان بزمانے۔ حضرت سلطان المشائخؒ کی غالبًا روایت سے حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے یہ حال لکھا ہے نیز اسیطرح کی ایک اور روایت شیخ محمد نوربخش سے منقول ہے۔ حضرت شیخ ممدوح سلسلۃ الذہب مین قطب صاحب رح کے حالات مین تحریر فرماتے ہین کہ بختیارؒ اوشیؒ اولیا، سالکین و مرتاضین زمانہ مین سے تھے۔ مجاہدہ خلوت و عزلت کے اوصاف سے متصف۔ اور قلت طعام۔ قلت منام۔ قلت کلام۔ ذکر دوام اور چلہ کشی مین ممتاز تھے اور اہل مکاشفہ مین احوال باطن کے لحاظ سے آپ کی شان بہت بلند و مرتبہ بہت بڑا تھا۔

حضرت سلطان المشائخؒ سیر الاولیا مین نقل فرماتے ہین کہ عید کا روز تھا اور خواجہ قطب الاسلام صبح کی نماز پڑھکر واپس آ رہے تھے کہ اس مقام پر پہونچے جہان آج آپ کا روضہ متبرکہ ہے اسوقت وہان جنگل تھا اور کسی قبر و گنبد کا نشان نہ تھا۔ خواجہ قطب الاسلامؒ

اس مقام پر پہونچکر کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر خاموش رہے - ہمراہیون نے عرض کیا کہ آج عید کا روز ہے اور خلق اللہ ملازمت کی منتظر ہے بہتر ہو گا اگر مکان تشریف لے چلیں فرمایا کہ مارا ازین زمین بوے دلہای آید - اسی وقت زمین کے مالک کو بلا کر اپنے مدفن کے لئے جگہ خرید فرمائی - حضرت سلطان المشائخ جب اس کلام کو بیان فرماتے تو آنکھون مین آنسو بھر لاتے" اور فرماتے کہ سبحان اللہ کون کون سے بزرگ وہان آسودہ ہون گے جو خواجہؒ نے فرمایا تھا کہ" ازین زمین بوے دلہامی آید"

دلیل العارفین سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت مین خواجہ قطب الاسلامؒ نے خواجہ بزرگؒ کی حیات مبارک مین اجمیر شریف کا قصد فرمایا تھا اور وہان جا کر بعد حصول اجازت دہلی تشریف لائے تھے - اس کے بیس روز بعد خواجہ بزرگ نے اس عالم فانی سے عالم بقا کی طرف ارادہ فرمایا اور خواجہ قطب الاسلام کچھ عرصہ تک قید حیات مین رہے پھر آپ نے بھی انتقال فرمایا -

نفحات عنبریہ مین ہے کہ آپ کو روحانیت اقدس حضرت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم ہوا کہ نعمت و اجازت سلسلہ چشتیہ حضرت خضر رومی قلندر کو جو ملک مغرب سے آئے ہین دو تو حضرت خواجہ صاحب نے اپنا خرقہ حضرت خضر رومیؒ کے سامنے پیش کیا - خواجہ صاحبؒ کی عمر کم تھی اور حضرت خضر رومی قلندرؒ کی بہت زیادہ تھی...... قلندر صاحب نے فرمایا کہ یاران بہ بینید کہ این طفل بابا بازی می کند - پھر حضرت قطب صاحبؒ کو یہ اشارہ ہوا کہ محفل سماع گرم کر کے حالت وجد و سکر مین اونکو یہ نعمت دینا چاہیئے - چنانچہ مجلس برپا کی گئی اُس حالت مین حضرت خواجہ صاحبؒ نے پھر فرمایا اور قلندر صاحب نے وہی جواب دیا مگر بعدہٗ روح پاک نبویؐ صلعم و روح جناب سیدنا علی کرم اللہ تعالی وجہہ کے اشارہ سے قلندر صاحب نے لے لیا اور اذکار چشتیہ بھی اخذ کئے اور جب اُن اذکار کو اپنے یہان کے اذکار سے ملایا تو بہت سہل پایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ چشتیان خدا را مفت یافتند اسی مقام پر یہ بھی مذکور ہے کہ قطب صاحب کو بھی بالمبادلہ سلسلہ عالیہ قلندریہ کی اجازت حضرت خضر رومی قلندرؒ سے تھی -

فوائد السالکین میں حضرت گنج شکرؒ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے ایک مرتبہ دولت پابوس خواجہ قطب الاسلامؒ حاصل ہوئی۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ۔ مولانا علاء الدین کرمانیؒ سید نورالدین مبارکؒ۔ شیخ شرف الدینؒ۔ شیخ محمودؒ موئینہ دوز اور مولانا فقیہ حدادؒ حاضر تھے۔ ان میں سے ہر اک ایسا بلند مرتبہ تھا کہ عرش سے سری تک اُسکے سامنے حجاب نہ تھا جج کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اس تقریر کے دوران میں آپ کی ایک عظیم الشان کرامت ظاہر ہوئی جو فوائد السالکین اور مراۃ الاسرار میں مفصل موجود ہے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت گنج شکر فرماتے ہیں کہ میں اٹھا اور زمین بوس ہو کر ہانسی جانے کی ۔۔۔۔۔ اجازت طلب کی۔ خواجہ قطب الاسلامؒ نے جب مجھے دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور قبل اس کے کہ میں کچھ زبان سے نکالوں آپ نے فرمایا۔ بابا فرید کیا تم جاؤ گے؟ میں نے پھر زمین پر سر رکھا اور عرض کی کہ جو ارشاد مبارک ہو۔ فرمایا جاؤ تقدیر الٰہی یونہی ہے کہ جسطرح میں خواجہ بزرگؒ کے انتقال کے وقت موجود نہ تھا تم بھی میرے سفر آخرت کے وقت موجود نہ رہو۔ یہ فرماکر آپ کو مصلیٰ اور عصا عطا فرمایا اور دوگانہ ادا کرنے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ سجادہ و دستار و خرقہ و نعلین قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے سپرد کر جاؤں گا۔ چوتھے یا پانچویں روز تمھیں دیدیں گے انھیں احتیاط سے رکھنا اور تمھارا مقام وہی ہوگا جو میرا مقام ہے۔ حضرت گنج شکر اسی حکایت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ اس کلام کو سنکر اہل مجلس میں شور پیدا ہوا۔ آپ نے پھر یہ ارشاد فرمایا کہ مرید کو اپنے پیران طریقت کی سنت پر چلنا لازمی ہے۔ ذرہ برابر اس سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ قیامت کے روز ان کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ اس کے بعد میری طرف منھ کرکے فرمایا کہ بابا فرید تم دین و دنیا میں میرے ساتھی ہو یاد رکھو کبھی غافل نہ رہنا۔ اہل سلوک فرماتے ہیں کہ طریقت کا راستہ بہت پر خوف و خطر ہے جس کسی نے اس راہ میں قدم رکھا ہے وہ اسی طریق سے منزل مقصود کو پہونچا ہے جو اہل طریق نے بتایا ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ جل شانہ کے دروازے پر آئیں گے تو جب تک بلا و امتحان کے ہاتھ سے اس دروازے کو نہ کھٹکھٹائیں گے یہہ دروازہ نہ کھلیگا اور جب تک ندامت کے ساتھ اندوہ ایمان نہ کریں گے اور دل کو قدم

بناکر اس راہ مین نہ چلین گے اس وقت تک منزل مقصود تک نہ پہونچین گے۔ پھر فرمایا کہ تیس سال تک میرا یہ حال رہا کہ ہر ہر زبان سے بار پانے کی درخواست کرتا تھا۔ اور ہر ہر ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹاتا تھا اور ہر ہر قدم سے اس راہ مین چلتا تھا مگر منزل گاہ عزت تک رسائی نہ ہوتی تھی لیکن جب ہلاکے ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا اور زبان اندوہ سے باریابی چاہی تو اجازت ملی اور اس مرتبہ تک رسائی ہوئی۔ جب خواجہ صاحب نے یہ فوائد ختم فرمائے تو تمام اصحاب زمین بوسی کرکے رخصت ہونے لگے۔ حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہین کہ جب مری نوبت آئی تو آپ نے بغلگیر کرکے فرمایا ھٰذا فراق بینی و بینك جاؤ خدا کے سپرد کیا۔

سیر العارفین مین حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز سے منقول ہے کہ خانقاہ شیخ علی سنجریؒ مین مجلس سماع گرم تھی اور بہت سے درویش صاحب حال و اہل کمال تشریف فرما تھے۔ خواجہ قطب الدینؒ بھی تشریف فرما تھے کہ قوالون نے شیخ احمد جام قدس سرہ کی ایک مشہور غزل گانی شروع کی۔ جب اس شعر پر پہونچے ؎

کشتگانِ خنجر تسلیم را　　ہر زمان از غیب جانے دیگر ست

تو آپ کو کیفیت شروع ہوئی اور اس حد تک کیفیت ہوئی کہ ہوش و حواس بجا نہ رہے۔ شیخ محمد عطا عرف قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ بدر الدین غزنویؒ آپ کو مکان پر لے آئے قوال بھی ساتھ ساتھ آئے۔ خواجہ صاحب تین شبانہ روز اسی حال مین مستغرق رہے اور قوال وہی شعر پڑھتے رہے۔ تیسرے روز استغراق کا غلبہ بہت ہوا۔ قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ بدر الدین غزنویؒ نے عرض کیا کہ اپنے خلفا مین کسے جانشین فرمایا جاتا ہے ارشاد ہوا کہ دستار و خرقہ و مصلی و نعلین چوبین جو خواجہ بزرگؒ سے مجھے ملی تھین شیخ فرید الدین مسعود کو پہونچا دینا۔ وہی میرے جانشین ہین۔ اس ارشاد کے بعد جان بحق تسلیم فرمائی ؎

گفت کسے خواجہ سنائی بمرد　　مرگ چنین خواجہ نہ کاریست خورد
کاہ نبود او کہ بہ بادے پرید　　آب نبود او کہ بہ سرما فشرد

شانہ نبود او کہ بموئے شکست دانہ نبود او کہ زمینش فشرد
گنج زرے بود درین خاکدان کودو جہان را بجوے می شمرد
قالب خاکی سوے خاکی فگند جان و خرد سوے سموت برد

شیخ بدرالدین غزنویؒ فرماتے ہین کہ جس شب خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے وفات فرمائی مجھپر ایک طرح کی غنودگی طاری ہوی - اس حالت مین کیا دیکھتا ہون کہ حضرت آسمان کی طرف جارہے ہین اور فرماتے ہین کہ اے بدرالدین دوستان حق مرا نہین کرتے جب میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ خواجہ وفات فرما چکے ہین - اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۵ آپ کی وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ (سنہ چھ سو تنتیس ہجری) کو واقع ہوئی - اور سلطان شمس الدین التمش نے نماز جنازہ پڑھائی اور مہرولی مین دہلی کے قریب دفن کیا - آپ کا روضہ مبارک ابتک عام وخاص کا زیارت گاہ ہے -

آپ کے خلفا کے نام یہ ہین :- حضرت فریدالدین گنج شکرؒ - مولانا بدرالدین غزنویؒ شیخ برہان الدین بلخیؒ - شیخ ضیاءالدین رومیؒ - سلطان شمس الدینؒ التمش - شیخ بابا بحری بحر دریا - مولانا فخرالدینؒ حلوائی - شیخ احمد تماجیؒ - شیخ حسینؒ - شیخ فیروزؒ - شیخ بدرالدین موے تابؒ بدایونی - حضرت سید خضر رومی قلندر - شیخ سعدالدینؒ - شیخ بیرؒ - شیخ محمدؒ بہاری - مولانا احمد عاجزیؒ - سلطان نصیر الدینؒ - قاضی حمیدالدین ناگوریؒ - شیخ محمدؒ شیخ برہان الدین حلوائیؒ - شیخ صوفی بدہنیؒ - مولانا خضر معینؒ - شیخ جلال الدین ابوالقاسمؒ شیخ نظام الدین ابوالموئیدؒ - شیخ تاج الدین منورؒ - شیخ جلال الدین تبریزیؒ - قدست اسرارہم (کذا فی نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ)

آپ کا ارشاد ہے کہ شیخ مین اسقدر قوت دل اور صحت ضمیر ہونی چاہیئے کہ اپنے مرید کے سینہ کے زنگار اور آلودگی آلایش دنیاوی کو اپنی قوت باطن سے پاک کرسکے تاکہ کوئی کھوٹ - دغا - فریب - حسد - برائی اور کدورت دنیاوی باقی نہ رہے پھر اس کا ہاتھ پکڑکر اسرار معرفت سے واقف کرے اور اگر اتنی قوت نہ ہو تو یقین جانو کہ پیر و مرید دونون گمراہی کے جنگل مین راہ بھٹکتے پھرین گے -

آپ نے ایک درویش کے حال مین بیان فرمایا کہ اس نے چالیس سال مجاہدے پر مجاہدے کئے لیکن کوئی روشنی اپنے آپ مین نہ پائی لیکن جب سے کم خوردن وکم خفتن وکم گفتن کم آمیختن با خلق - ان چار چیزون پر عمل کیا تب سے اسقدر روشنی حاصل ہوئی کہ وہ کہتا ہے کہ اگر آسمان کی طرف کسی وقت دیکھتا ہون تو عرش عظیم تک پردہ نہین رہتا اگر زمین کی طرف نگاہ کرتا ہون تو تحت الثریٰ تک صاف نظر آتا ہے -

آپ فرماتے ہین کہ اگر کوئی درویش خالق کے لیئے نہین بلکہ خلق کیلئے عمدہ لباس پہنے تو وہ درویش نہین بلکہ رہزن راہ سلوک ہے - اور جو درویش نفس کے لئے عمدہ کھانا کھائے تو وہ دروغ گو اور خود پرست ہے اور جو درویش دولتمندون کی ہمنشینی کرتا ہے وہ مرتد طریقت ہے اور جو خواہش نفسانی کے مطابق خوب جی بھر کر سوتا ہے اسے یقیناً اس نعمت سے کوئی حصہ نہین ملا ہے -

آپ فرماتے ہین کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان آلائش نفسانی بھی رکھے اور بارگاہ الٰہی مین باریاب بھی ہو - پھر فرماتے ہین کہ درویش کو مجرد رہنا چاہیئے - اور ہر روز ایک ملک سے دوسرے ملک مین سیر کرنا چاہیئے - حضرت کی مراد مجرد ہونے سے تجرید عن الدنیا اور ماسوائے اللہ کو دل مین جگہ نہ دینا ہے - اور ملکون کی سیر سے ملک جان کی سیر کرنی مراد ہے اس ارشاد کے بعد حضرت قطب صاحبؒ ایک درویش صاحب فکر کا حال بیان کرکے آنکھون مین آنسو بھر لائے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک درویش سے مین نے یہ مثنوی سنی تھی

ہر آن ملکے کہ واپس میگذارم دوصد ملکے دگر در پیش آرم

اسی سلسلہ مین پھر ارشاد فرمایا کہ اہل سلوک و تحیر کے نزدیک درویش کو راہ سلوک مین روزانہ ایک لاکھ ملکون سے گذر کرنا چاہیئے اور پھر بھی قدم آگے بڑھتا رہے

اسی موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ جو اولیا اسرار کو ظاہر کرتے ہین وہ غلبات شوق سے مجبور ہوتے ہین مگر بعض ایسے کامل وپختہ احوال ہوتے ہین کہ کسی حال مین کوئی بھید ظاہر نہین کرتے پس سالک راہ کا حوصلہ وسیع ہونا چاہیئے تاکہ اسرار الٰہی کو پوشیدہ رکھ سکے آپکا ارشاد ہے کہ اگر شیخ منصور حلاج کامل ہوتے تو ہرگز دوست کا بھید ظاہر نہ کرتے

اس راہ مین ایسے ایسے لوگ بھی ہین کہ اسرار کے لاکھون دریا پی جاتے ہین اور معلوم بھی نہین ہوتا بلکہ ہل من مزید کی فریاد کرتے ہین

آپ کا ارشاد ہے کہ جب تک درویش سب سے بیگانہ نہ ہوجائے اور ہر وقت مجرد نہ رہے اور آلایش دنیاوی سے ذرا سا بھی اس مین باقی رہے اُس وقت تک قرب کے مقام کو نہین پہونچتا۔ راہ درویشی چلنا اور بات ہے اور ذخیرہ جمع کرنا اور بات ہے۔ یا درویش بن یا ذخیرہ ہی جمع کر۔ اے برادر اس راہ مین بے غم نہ رہنا۔ جن لوگون نے سلوک کے تمام درجے طے کر لئے اور کمال کو پہونچ گئے ہین وہ بھی ہر وقت فراق کے ڈر اور خوف سے محزون وحیران رہتے ہین کیونکہ کسیکو نہین معلوم کہ انجام کیونکر ہونے والا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ سالک وہ ہین جو سرتاپا دریاے محبت مین غرق رہین۔ اور کوئی لحظہ وساعت ایسی نہ ہو کہ باران عشق اُن پر نہ برستا رہے اور عارف وہ شخص ہے کہ ہر لحظہ اس مین عالم اسرار سے ہزارہا اسرار پیدا ہوتے رہین اور وہ عالم سکر مین رہے اور اگر اس حالت مین اٹھارہ ہزار عالم اسکے سینہ مین ڈالدیے جائین تب بھی اُسے خبر نہ ہو۔

آپ فرماتے ہین کہ جو شخص محبت کا دعویٰ کرے اور مصیبت کے وقت فریاد کرے وہ جھوٹا ہے۔ دوستی اس بات کا نام ہے کہ جو کچھ دوست کی طرف سے آئے اسپر راضی رہے اور لاکھون شکر بجالائے کہ اِسی بہانہ خیر یاد تو ہوئی۔ اہل معرفت کے نزدیک۔ بلاے دوست رضاے دوست ہی۔ جس روز بلاے دوست ہمپر نہین نازل ہوتی ہم سمجھتے ہین کہ کوئی نعمت ہم سے چھین لی گئی ہے

آپ کا ارشاد ہے کہ اگر راہ گیر ایک سمت خاص پر چلتا رہے اور یقین کامل و امید حصول کمال رکھے تو یقیناً وہ درجۂ کمال کو پہونچ جائے گا۔

آپ نے فرمایا کہ بزرگون کی مجلس مین جو کوئی آئے جہان جگہ خالی پائے وہین بیٹھ جائے۔

آپ نے فرمایا کہ دعا دو قسم کی ہوتی ہے نیک و بد کسی کے حق مین بد دعا نہ کرنی

چاہیئے مگر نیک دعا بہت اچھی ہوتی ہے خصوصًا وہ جو بزرگون کی زبان سے نکلی۔
پھر شمس الدین التمش کا یہ قصہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ شیخ معین الدین سنجری شیخ اوحدالدین کرمانیؒ اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ اور دعاگو (یعنی خود قطب صاحب) ایک جگہ بیٹھے ہوے تھے اور انبیا کا تذکرہ ہو رہا تھا شمس الدین التمش جو ابھی بارہ سال کا تھا ہاتھ مین پیالہ لئے ہوے جا رہا تھا کہ بزرگون کی نگاہ اسپر پڑی فوراً خواجہ معین الدین سنجریؒ کی زبان مبارک سے نکلا کہ یہ لڑکا جب تک دہلی کا بادشاہ نہ ہوجاے گا خدا اسے دنیا سے نہ اُٹھاے گا۔ چنانچہ خداے کریم نے اپنے فضل وکرم سے ایسا ہی کیا۔
آپ نے فرمایا کہ بیعت دوبارہ ہوسکتی ہے یعنی اگر کوئی بیعت سے پھر جاسے یا اُس کی تو بہ مین شک پڑ جاسے تو از سرِ نو بیعت کرلینی چاہیئے اور اگر پیر نہ ہو تو شیخ کا جامہ ہی سامنے رکھ لے اور بیعت کرے۔ شیخ معین الدینؒ بھی اسی طرح بیعت کیا کرتے تھے اور مین بھی اسیطرح کرتا ہون۔ مرید کو اپنے پیر کی موجودگی مین یکسان خدمت کرنی چاہیئے جس طرح اس کی زندگی مین خدمت کرتا تھا اسی طرح انتقال کے بعد بھی خدمت کرتا رہے بلکہ مناسب ہی کہ اس سے زیادہ کرے۔
آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک سماع مین کچھ ایسا ذوق ہی کہ اور کسی چیز مین اتنا نہین ہے۔ جو لوگ صاحب طریقت و مشتاق حقیقت ہین اُنھین سماع سے گویا بدن مین آگ لگ اُٹھتی ہے اور اگر یہ نہ ہوتا تو لقا کہان ہوتا اور لقا کا لطف ہی کیا حاصل ہوتا
ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جو اولیاء اللہ کہ مرتبہ کے شروع ہی مین کشف حال کردیتے ہین اُنھین کامل نہین کہا جا سکتا۔ کامل وہ لوگ ہین جو تمام مدارج طے کرنے تک کشف و کرامت کی ایک بات بھی ظاہر نہین ہونے دیتے اور جب تمام مدارج طے کرنے کے بعد کشف حال ہوتا ہی تو عین وہی ہوتا ہے جو وہ کہتے ہین اور اُن کی دعا ضایع نہین ہوتی۔۔ اولیاء اللہ کی دعاؤن مین فرق آجانیکی یہی وجہ ہے۔
پھر آپ نے فرمایا کہ دائرہ محمدیہ مین ایسے مرد بھی ہین جو تمام مدارج مقررہ طے کرکے لاکھون درجے اور طے کرتے جاتے ہین اور پھر بھی اپنے دوست کا بھید ذرہ برابر ظاہر نہین کرتے

انھیں خود اپنے آپ کی خبر نہیں ہوتی کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں اور جب یہ حالت ہوتی ہے تو ایک مقام سے دوسرے مقام تک برابر ترقی کرتے جاتے ہیں اور جون جون ترقی کرتے ہین عالم تحیر مین پڑجاتے ہین اور جب عالم تحیر مین پڑتے ہین تو ان کا فراق وصل سے بدل دیا جاتا ہے۔

آپ کا ارشاد ہی کہ اگر مرید نماز نفل پڑھ رہا ہو اور پیر بلائے تو نیت توڑکر چلا جانا چاہیے کیونکہ یہ امتثال امر پیر نفل نماز دن سے افضل ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جب آدمی توبہ کرے تو پھر اُن لوگون سے میل جول نہ رکھنا چاہیے جن سے وہ پہلے رکھتا تھا مبادا پھر اسی گناہ مین مبتلا نہ ہو جائے کیونکہ انسان کے لئے بُری صحبت سے بڑھکر اور کوئی چیز بُری نہین ہے۔ اور خود بھی جس چیز سے توبہ کرے اُسے ہمیشہ اپنا دشمن خیال کرتا رہے۔ سالک کے لئے دنیا سے بڑھکر کوئی حجاب نہین۔ کوئی شخص اس وقت تک خدارسیدہ نہین ہوتا جب تک وہ دنیا مین مشغول رہتا ہے۔ دنیا سب کی دوست ہے لیکن درویشون کی نہین کیونکہ انھون نے اسے رد کر دیا ہے۔ درویشی مین بڑا آرام ہے اور دنیا دی آفتون سے درویش محفوظ ہین لیکن اس کام مین سختی بہت ہے۔ معراج الفقرا فی لیلۃ الفاقہ۔

پھر آپ نے فرمایا کہ درویش کا فاقہ اُس کے اختیار مین رکھا گیا ہی۔ دنیا اُسے دی گئی ہے کہ جس طرح چاہے خرچ کرے وہ اپنے واسطے بھی خرچ کرسکتا ہے مگر ایسا نہین کرتا اور دوسرون کو دیتا ہے اور خود فاقہ کرتا ہے اور اس سے اس کے کام مین ترقی ہوتی ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ چار چیزین گوہر نفس ہین (۱) درویشی جو تونگری نظر آئے۔ (۲) گرسنگی جو سیری نظر آئے (۳) اندوہگینی جو شادی نظر آئے (۴) اور باوجود دشمنی کے دوستی کا برتاؤ کرنا۔

آپ کا ارشاد ہی کہ جہان جاؤ کانٹا نہ بن جاؤ اور جہان رہو مردہ دار رہو۔

آپ کی طرف ایک دیوان بھی منسوب ہی مگر وہ آپ کا کلام نہین۔ آپ کو استغراق سے اتنی فرصت کہان تھی جو شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوتے۔

اے ترا با ہر دمے رازِ دگر ہر گدا را بر درت نازِ دگر
در ربابِ عشق بیش از تار نیست ہست ہر سو نغمۂ و سازِ دگر

عبداللہ

نوٹ ۔ آپ کے حالات حسب ذیل کتابون مین ملتے ہین :-

سیر الاقطاب ۔ خیر المجالس ۔ سیر الاولیا ۔ مراۃ الاسرار ۔ اقتباس الانوار ۔ سیر العارفین ۔ نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ ۔ مرآۃ ضیائی ۔ سیر العارفین ۔ کتاب فردوسیہ ۔ جواہر فریدی ۔ اخبار الاخیار ۔ دلیل العارفین ۔ فوائد السالکین ۔

زمین

زندگی موت مین انسان کے لئے گھر تو ہی اے زمین قابلِ تعظیم ہماری تو ہے
تیری مٹی سے جو اس کو نہ سنوارا ہوتا اے زمین قالبِ خاکی نہ ہمارا ہوتا
اے زمین گھر تھا عدم چھوڑ کے آئے تجھ مین تیری مٹی سے بنے اور سمائے تجھ مین
جسم خاکی کے لئے خاک بھی تو دیتی ہی اور جب مرتے ہین تو گود مین لے لیتی ہی

تیرے فرزند ہوے نامور و پاک اساس
گود مین تیری پلے آدمؑ و شیثؑ والیاسؑ

انبیا اور بھی با جاہ و حشم آئے ہین احمدؐ پاک کے بھی تجھ پہ قدم آئے ہین
عہد صدیقؓ تے بنیادِ ضلالت ڈھائی تو نے فاروقؓ کی بھی دیکھی ہی عدل آرائی
عہد فاروقؓ مین اسلام کی شانین دیکھین باغ فردوس کو جاتے ہوئے جانین دیکھین
تاجور سیکڑون بے سر نظر آئے تجھکو تیغ اسلام کے جوہر نظر آئے تجھکو
زورِ اسلام نے بنیادِ ضلالت توڑی خسرو و قیصر و فغفور کی ہمت توڑی
حال اُس روز کا کیا یاد ہی کیا بھول گیا جنگ یرموک کا دن یاد ہی یا بھول گیا
سیفِ حق خالدِ غازیؓ نے اٹھائی تلوار فتح لاکھون پہ ہزار دن کو ہوئی آخر کار
تو نے عباسیون کی شانِ حکومت دیکھی

رشک تھا جس پہ زمانے کو وہ شوکت دیکھی

کام اقبال سے ہارون کا دلخواہ بنا / گنبد چرخ برین گنبد درگاہ بنا
اے زمین تجھ پہ شگفتہ ہوا باغ اسلام / اب یہ دن آئے کہ بجھتا ہے چراغ اسلام
اب ٹھکانا کہین بجز گوشۂ مدفن نہ رہا / جو محمدؐ نے کھلایا تھا وہ گلشن نہ رہا
قرطبہ کے جو محل سنتے ہین افسانے ہین / روتے ہین بیٹھ کے ہم ہند کے ویرانے ہین

اے زمین تجھ مین کہین گلشن دل آرا ہین
کہین دریا ہین رواں اور کہین صحرا ہین

تو نے سرسبز نباتات کی دنیا پائی / کہین گلہائے گلستان سے بڑھی زیبائی
وادیون مین تری سامان دل آرائی ہے / قابل دید شگفتہ گل صحرائی ہے
بستیان ہین کہین تجھ مین کہین ریگستان ہے / کہین آباد ہے تو اور کہین ویران ہے
راحت و رنج ترے دور مین یون توام ہے / نہ خوشی کی ہے خوشی تجھکو نہ غم کا غم ہے
جشن شادی کا ہے برپا کسی گلشن مین کہین / قبر کھدتی ہے کسیکی ترے دامن مین کہین
شور نغمے کا کہین جشن کہین ہوتے ہین / مرنے والے کے لئے لوگ کہین روتے ہین

گردشین دہری تجھے دی ہین یہ فطرت نے
اے زمین گول بنایا ہے تجھے قدرت نے

دور گردش سے نہ بہتی ہے نہ تو گرتی ہے / گرد خورشید کے پروانہ صفت پھرتی ہے
نور اس نے ترے سفر کے لئے دلخواہ ملا / مشعل رہ کی ضرورت تھی تجھے ماہ ملا

اے زمین تجھ مین جو بے گنتی ہین رہنے والے
گندمی رنگ ہین کچھ گورے ہین کچھ ہین کالے

کوئی کم فہم ہے ان مین تو کوئی دانا ہے / ایک سے دوسرے کی شکل جدا گانہ ہے
نور کی شکل کسی نے وہ کہین پائی ہے / چشم خوبان جہان جس کی تماشائی ہے

اے زمین دیکھنے دیدار جگر جاتے ہین
حسن کے چاند جہان ان کو نظر آتے ہین

(حکیم جگر صدیقی)

بقاے دوام

اب سے ہزار دو ہزار برس قبل بلکہ اُس وقت بھی جسکا حال ہم بذریعۂ تاریخ نہین جان سکتے آفتاب کرۂ زمین کو اسی طرح گرمی و روشنی پہونچاتا تھا جیسے اِس وقت ابر و باد کا وجود اُس زمانہ مین بھی ویسا ہی تھا جیسا اب۔ دریا و کوہ اپنی روانی و بلندی سے دنیا کو جب بھی محو حیرت بناتے تھے اور اب بھی بناتے ہین۔ دنیا قوانین طبعی کی سرگزشت بھی ایسی ہی آماجگاہ تھی جیسی آج۔ لیکن کیا زمانۂ قبل از تاریخ اور قرون وسطیٰ مین کوئی فرق نہ تھا؟ اور کیا قرون وسطیٰ اور زمانۂ حال بالکل ایک سے ہین؟

یہ سچ ہے کہ دنیا اپنی رفتار سے چل رہی ہے۔ روز و شب، بہار و خزان موسمون کی تبدیلی اور فطرت کی صناعیان اب بھی ویسی ہی ہین جیسی زمانۂ گذشتہ مین تھین لیکن باوجود اس کے صفحۂ ہستی اب ایسا سادہ نہین رہا جیسا پہلے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جیسے جیسے تہذیب و تمدن کی منزلین طے کرتا گیا اُس نے اپنی اختراعات و ایجادات سے دنیا کو کہین سے کہین پہونچا دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا گروہ انسانی کا ہر فرد اس کا اہل تھا کہ وہ اپنی اور اپنے ہمجنسون کی حالت درست کرتا اور اپنی دماغی قوتون سے بنی نوع انسان کو راحت پہونچاتا۔ زمانۂ قبل از تاریخ سے اس وقت تک لاتعداد ہستیان اس عالم مادی کے تماشہ گاہ پر آئین۔ اُن مین سے اکثر ایسے تھے جنھون نے کوئی کام ایسا نہ کیا جس سے دوسرے ان کی مدح و ستایش کرتے اور اُن کے افعال کو بہ نظر تحسین دیکھتے اُن کی زندگی صرف کھانے پینے اور زندگی کی دیگر ضروریات مہیا کرنے ہی مین صرف ہوگئی اور آج وہ گمنامی اور خود فراموشی کی لحد مین خاموش سو رہے ہین۔ زمانہ نہین جانتا کہ وہ کون تھے۔ تاریخ اُن کے حالات پر روشنی نہین ڈالتی اور ہم اگر اُن کی زندگی کے حالات معلوم کرنا چاہین تو نہین معلوم کر سکتے۔

لیکن انھین مین بعض ہستیان ایسی بھی تھین جنھون نے معمولی ضروریات زندگی کے حاصل کرنے کو کافی نہین خیال کیا۔ بلکہ اس کو حیوانی زندگی سے تعبیر کیا۔ یہی وہ لوگ تھے جنھون نے زمانہ کو علم، عقل، فلسفہ، سائنس، اور مذہب وغیرہ کی مشعل دکھائی اور اپنے ہمجنسون کو اس راستہ پر چلایا جسکی بدولت آج دنیا شاہراہ ترقی پر تیزی سے گامزن ہے۔

اِن راہنماؤن مین سے ہر ایک نے اپنے سامنے ایک خاص مقصد رکھا تھا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھون نے مال و دولت، دنیاوی آرام و آسایش، نمائشی عزت و حرمت وغیرہ مین سے کسی کا پاس نہین کیا۔ ذاتی مفاد کا خیال بھی اُن کے پاس بھٹکنے نہین پایا۔ ان بے مثال قربانیون کا نتیجہ ان کی حسب مرضی نکلا۔ وہ دنیا کو ایک خاص راستہ پر چلانا چاہتے تھے، وہ بنی نوع انسان کو ایک سچے مذہب کی تعلیم دینا چاہتے تھے، وہ زمانہ کو اپنا فلسفہ سکھانا چاہتے تھے اور قدیم ضعیف الاعتقادات دیو کا پردہ چاک کرنا چاہتے تھے۔ اس مین وہ پورے طور پر کامیاب ہوے۔ زمانہ نے ان لوگون کو آنکھون پر بٹھایا۔ دنیا نے اُن کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ ان کے نام صفحات تاریخ پر اب تک موجود ہین اور اسوقت تک موجود رہین گے جب تک اس عالم اسباب کا شیرازہ قائم ہو۔

یہ سچ ہو کہ شہرت، بقاے دوام، اور دولت وغیرہ کے حصول مین انسانی کوششین صرف ایک حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہین اور اصل مین قدرت نے ان چیزون کو بڑی حد تک اپنے قبضہ مین رکھا ہو۔ لیکن یہ کہکر کہ جب انسانی طاقت قضا و قدر کے سامنے کوئی وقعت نہین رکھتی تو انسان کے لیے جد و جہد کرنا فضول ہو، کوئی شخص بچ نہین سکتا۔ انسان کو حصول مقصد کے لیے حتی الامکان کوشش کرنا چاہیے۔ اگر کامیابی ہو تو سبحان اللہ ورنہ درصورت دیگر کم از کم دل کو یہ اطمینان تو رہتا ہو کہ ہم اپنی طاقت بھر کوشش کر چکے اب کامیابی نہین ہوتی تو ہم پر کوئی الزام نہین۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہو کہ فطرت سے بقاے دوام کا تاج بغیر دقتون کے اُٹھاے کوئی شخص نہین حاصل کر سکتا۔ بانیان مذاہب، فلاسفہ، مصلحین اور دیگر مشاہیر مین سے قریب قریب ہر ایک کو ایسی مصیبتین اُٹھانا پڑی ہین اور ایسی دقتون کا سامنا کرنا پڑا ہو کہ معمولی آدمی کسی طرح اُن کو برداشت نہین کر سکتے۔

صرف یہی نہین۔ ایک طرف تو ان لوگون کو مصائب اور سختیان برداشت کرنا پڑین اور دوسری طرف اپنے عادات و اطوار کو ایک سانچے مین ڈھالنا پڑا اور دنیا ان کی بزرگی پر اُس وقت تک ایمان نہین لائی جب تک وہ اُس معیار پر پورے نہین اتر لیے۔

اِن برگزیدہ ہستیون اور باکمال افراد مین سے ہر فرد کا الگ الگ ایک مقصد تھا۔ کسی نے دنیا کی اخلاقی حالت درست کی۔ کسی نے فلسفہ و حکمت کی روشنی پھیلائی۔ کسی نے مذہب کی شمع سے

لامذہبی کی تاریکی کو زائل کیا لیکن چند باتین ایسی ہین جن کا خیال اس گروہ کے ہر ہر فرد کو کرنا پڑا اور واقعہ یہ ہو کہ ان کا لحاظ کیے بغیر کامیابی ذرا مشکل سے ہوسکتی تھی۔ ہر وہ شخص جسکو بقائے دوام کی دولت نصیب ہوئی اپنے اصول کا پابند تھا۔ بانیان مذاہب نے اپنے زمانہ کی بُری رسمون فاسد عقیدون کو نہین مانا بلکہ ان کی جگہ اپنے خیالات کی تعلیم شروع کی۔ لوگون کو رائج شدہ باتون کی خرابی دکھائی اور اُن کو صحیح راستہ پر لانے کی کوشش کی۔ فلاسفہ نے قدیم اور فرسودہ مسائل کی تکذیب کی اور اپنے نئے فلسفہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مصلحین نے سوسائٹی کی کمزوریون کا علاج کیا۔ تاجدارون نے انصاف وعدل کا ڈنکا بجایا لیکن ان لوگون کو نہ تو اپنے خیالات کی اشاعت مین آسانی ہوئی نہ خراب رسمون کا آسانی سے استیصال ہوسکا۔ اور نہ عدل وانصاف بغیر مشکلات کے قایم ہوسکا۔ مگر مشاہیر مین سے کسی نے بھی دقتون سے گھبرا کر اور سختیون سے عاجز آکر اپنا کام کو چھوڑا نہین۔ بلکہ مستقل مزاجی سے مصائب کے طوفان کا مقابلہ کیا اور اپنے استقلال کی بدولت آخر مین کامیاب ہوئے۔

دوسری بات یہ تھی کہ مشاہیر مین سے ہر ایک نے ایک خاص بات کو اپنا مقصد حیات قرار دے لیا تھا۔ اُس کے تعین کر لینے پر انھون نے دل وجان سے اُس کے حصول کی کوشش کی اور نہایت ایمانداری سے مستقل طور پر محنت وجانکاہی کرتے رہے۔ فلاسفہ جب مسائل فلسفہ کی تعلیم کو اپنا مقصد حیات قرار دے چکے تو اُس کے بعد اُنھون نے روپیہ پیسہ دھن دولت کسی چیز کی پرواہ نہین کی اور اپنے کام سے کام رکھا۔ بانیان مذاہب نے لوگون کے طعنے سنے، جسمانی تکالیف برداشت کین لیکن اپنے مقصد سے نہ ہٹنا تھے نہ ہٹے۔ اسی محنت، جفاکشی، اولعزمی، ایثار اور صداقت کا اثر تھا کہ آج مشاہیر کے کارنامے صفحات تاریخ پر آب زر سے لکھے جاتے ہین۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تاریخ صرف مشاہیر کے کارنامون اور افسانون کا مجموعہ ہے اور اگر ان لوگون کے حالات تاریخ سے الگ کر دیے جائین تو تاریخ ایک جسم بے روح، ایک لفظ بے معنیٰ اور ایک دربے آب ہو جائیگی۔

لیکن ابھی یہ سوال باقی ہو کہ عوام اگر مشاہیر کی پیروی کرین تو کس حد تک کامیاب ہوسکتے ہین؟ سچ یہ ہو کہ مشاہیر کے حالات جمع کرنے کا مقصد یہی ہو کہ لوگ اُن کی تقلید کرین۔ اُنکے کارنامون کو پڑھکر معمولی آدمیون کے دلون مین ولولے پیدا ہون اور اپنی بساط کے موافق وہ بھی مشاہیر کی تابعت کرین۔ یہ بہت ممکن ہو کہ عوام مین سے کوئی شخص بھی اُس حد تک ترقی نہ کرے لیکن

یہ فائدہ کیا کم ہے کہ لوگون کو صحیح طریقہ پر کوشش کرنے کا خیال پیدا ہو جاے گا اور ممکن ہے کہ آئندہ اس کی کوششین بارآور ہون اور وہ کوئی ممتاز حیثیت پیدا کر کے اور آگے بڑھ سکے۔

عالی لکھنوی

غزل

دشت پُرخار کبھی روضۂ رضوان ہوگا ہند کا باغ بھی اک روز گلستان ہوگا
عوضِ حور جو اے بُت ترا خواہان ہوگا سارے محشر مین وہی ایک مسلمان ہوگا
خوب دیکھی ہے یہ انداز لگاوٹ والے وہ پھنسے گا تری باتون مین جو نادان ہوگا
پارساؤن کے سوا رند نہ پائین گے شراب شیخ میخانے مین جس دن سے نگہبان ہوگا
ہان ذرا ایک نظر دیکھ لے ہنس کر مجھکو پیار سے دیکھنے والے ترا احسان ہوگا
وہ یہ سمجھین گے شکایت یہ مری کرتا ہے آسمان کے جو ستم سے کوئی نالان ہوگا
میری تربت کو وہ ٹھکرا کے بڑھے گا آگے گذر اُس کا جو سوے گورِ غریبان ہوگا
ہان مرا پیرِ خرابات اسی قابل ہے کون پھر بادہ کشو تیرا نگہبان ہوگا
پھول کا دور صراحی کے گلے مین گجرے رند میخانہ سمجھین گے چمنستان ہوگا
پرسشِ حشر کے طوفان سے بچانے والا اپنی امت کا محمدؐ ہی نگہبان ہوگا
اور رہنا ہے کہان تجھکو مرے دل کے سوا ہوگا برباد جو دل گھر ترا ویران ہوگا
کیون رُلاتے ہو غضب ڈھائیگا رونا اپنا اشک جو آنکھ سے نکلے گا وہ طوفان ہوگا

ننگ کیون کرتا ہے اس طرح مین بیکار خلیل
اس زمین مین تو نہ آتش سا غزلخوان ہوگا

محمد خلیل الرحمن خلیل زمیندار رسولن

سفر حجاز کی مختصر روداد

پانچوین منزل

شہدا سے نکلکر مسجد تنعیم کے آگے اونٹ رک گئے۔ یہان ایک جانب حکومت کے کارکن ڈیرہ ڈالے پڑے تھے اور گیس کی تیز روشنی مین اونٹون کا شمار کر رہے تھے۔ ہمارے معلم کے کارکن یوسف نے اپنے سب اونٹ شمار کرادیے اور ضروری مراسم تحریر ادا ہوگئے تو وہان سے رخصت ہوکر آہستہ آہستہ قافلہ روانہ ہوا۔ اور دن بھر کی ماندگی کے اثر سے فوراً نیند آگئی۔ مگر شغدف پر مسلسل سونا اور وہ بھی پہلی رات قطعاً ناممکن تھا اس لئے کہ جمال (شتربان) بار بار میزان میزان کے آوازے لگاکر مسافرون کو اپنے اپنے شغدفون کا توازن برقرار رکھنے کی ہدایت کرتے تھے اور چونکہ اونٹون کی دو تین قطارین پاس پاس چلتی تھین اس وجہ سے کبھی آگے پیچھے کے شغدف ٹکرا جاتے تھے اور کبھی برابر برابر چلنے والے شغدف باہم الجھ جاتے تھے۔ نصف شب کے بعد دور سے روشنی دکھائی دی تو ہم نے سمجھا کہ منزل قریب آگئی ہے۔ چنانچہ تقریباً ۲ بجے رات کو

۲۷ مئی روز یکشنبہ

پڑاؤ پر پہونچے جمالون نے فوراً ہی انزل انزل کہکر اوترنے کا تقاضا شروع کیا۔ جلدی جلدی آنکھیں ملتے ہوئے اوترے شغدفون کو انھون نے ہم لوگون کی مدد سے بعجلت تمام اوتار پھینکا اور اونٹون کو لیکر چلتے بنے۔ ہمنے امداد باہمی سے اپنے اپنے شغدفون کا سامان اوتارا۔ زمین پر چٹائیان اور بچھونے بچھائے کہ اتنے مین آواز آئی "حطب" فوراً تھوڑی سی لکڑی خریدی گئی اور پھر جب "میاہ میاہ" کی صدا لگاتے ہوئے مرد عورتین اور بچے مشکیزون اور ٹین کے کنسترون مین پانی لائے تو ضرورت کے مطابق پانی لیا گیا۔ وقت اتنا نہ تھا کہ سوتے لہذا تھوڑی دیر باتون مین گذار کر نماز فجر ادا کی مین نے اپنے ساتھیون سے طے کرلیا تھا کہ لکڑی اور پانی کی فراہمی اور بازار کے دوسرے کام میرے متعلق رہین گے۔ کھانا پکانا یا پکوانا اور جائے قیام پر دوسرے امور کی نگرانی

دہ کرین گے ۔ لکڑی اور پانی چونکہ بآسانی فراہم ہوگئے تھے اور روہ لوان چیزون کے بیچنے والے مسلسل آتے رہتے تھے اس لیے نماز فجر کے بعد ہی مین نے پڑاو کا گشت لگایا اور بازار کا پتہ چلایا ۔ ہمارا قافلہ ایک بلندی کے دامن مین تھا اور دور تک شغدف ہی شغدف نظر آتے تھے ۔ ہر معلم کے حجاج کی الگ الگ ٹولی تھی اور عموماً اُن کے شغدف پاس پاس ایسے طریقہ پر رکھے گئے تھے کہ دائرہ یا نصف دائرہ کی صورت بن جائے درمیانی میدان مین لوگ اپنے بچھونے بچھاتے اور چولھے چڑھاتے ۔ جن لوگون کے ساتھ راوٹیان یا نمگیرے تھے اُنھون نے شغدفون سے کچھ فاصلہ پر ڈیرے جمائے تھے ۔ یہ سلسلہ بلندی کے اوپر تک چلا گیا تھا مین گھومتا ہوا ادہر پہونچا تو دیکھا کہ بلندی کے اُس جانب نہر روان ہے ۔ جس کے کنارے بکثرت اونٹ اور آدمی جمع ہین ۔ یہ نہر وہی ہے جو نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا پانی مکۂ معظمہ مین پیا جاتا ہے ۔ اس کا اکثر حصہ پٹا ہوا بیان کیا جاتا ہے ۔ مگر یہان دور تک کھلی ہوئی ہے ۔ نہر کا عرض بہت ہی کم ہے کسی جگہ تین چار فٹ ہی ورنہ عموماً دو فٹ سے زیادہ نہین ۔ بڑے بڑے الونیم کے تسلے اونٹون کے سامنے رکھے ہوے تھے اور جمال چمڑے کے ڈولون سے پانی بھر بھر کر پلا رہے تھے ۔ پاس ہی سیکڑون آدمی غسل کر رہے تھے جس مین مرد وعورت کی کچھ تمیز نہ تھی ۔ یہ لوگ عموماً ملک جاوہ کے رہنے والے تھے ۔ ان لوگون مین لحاظ حیا د غیرت کا نام نہین ہے ۔ جس طرح ہندوستان مین دریاؤن کے گھاٹون پر ہندو مرد وزن ملکر اشنان کرتے ہین، بعینہ یہی حالت جاویون کی تھی ۔ بعض لوگ نہر کے اندر نہا رہے تھے ۔ اور چونکہ نہر کا عمق بھی بہت کم ہے اسوجہ سے مرد وزن سب برہنہ یا نیم برہنہ نظر آتے تھے ۔ نہر کے کنارہ دور تک کھیتی اور نخلستان دکھائی دیتے تھے کنارہ سے ذرا ہٹکر ایک سمت کو بازار لبا ہوا تھا ۔ یہان اونٹ گائے، بکری اور دنبہ کا گوشت، انڈے، روٹیان، سبزی، خربزے، تربوز، جنس، تیل، چائے، شکر اور تمباکو وغیرہ ضرورت کی سب چیزین بک رہی تھین ۔ بازار جھونپڑیون کا بنا ہوا تھا اور بیلون سے منڈھے ہونے کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتا تھا کھانے کی دکانین

اور قہوہ خانے متعدد تھے۔ میں چونکہ گھومتا ہوا پہونچا تھا اس وجہ سے ذرا دیر میں پہونچا ورنہ ہمارے مقام سے ایک فرلانگ سے زائد فاصلہ نہ ہوگا۔ واپس آکر ساتھیوں کو ہاآسے اور کھانا کھانے کی فکر ہوئی۔ آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا۔ تمازت بڑھ رہی تھی اور ہوا کی حدت ترقی پر تھی۔ دن اسی بے پناہ میدان میں بسر کرنا تھا لہذا لیٹنے بیٹھنے اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ بنانا ضروری تھی۔ مگر ناواقفیت اور پہلے سے اس کا خیال نہ آنے کی وجہ سے ہمارے شغدف بہت ناموزون رکھے گئے تھے۔ بہرحال موقع کے لحاظ سے پانی بھرنے کی ستلیوں اور چادر و رضائی کی مدد سے ایک جگہ ایسی بنائی گئی جہاں سایہ رہ سکے اور کھانا کھا کر سو رہے۔ ظہر کے قریب اٹھا تو ایک شخص خرمے بیچنے لایا۔ یہ خرمے بہت ہی خوش ذائقہ تھے۔

صبح ہی کو ہمارے شغدفوں سے قریب عراقیوں کی جو جماعت خیمہ زن تھی اسمیں سامان غسل و کفن ہو رہا تھا۔ شام کو ہمارے سامنے کے قافلہ میں ایک حاجی نے انتقال کیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عصر کے وقت میں ضیاء الاسلام صاحب کے یہاں بیٹھا تھا کہ دفعتہً آندھی چلنے لگی دن بھر کی تپش اور لو کے بعد اگرچہ اس سے بہت کچھ فرحت ہوئی مگر اس خیال سے کہ کہیں بارش نہ ہو جائے بعجلت اپنے مقام پر واپس آیا۔ آندھی دیر تک رہی۔ کچھ ترشح بھی ہوا باقی غنیمت ہے کہ بارش کی نوبت نہیں آئی۔

ہمارے قافلے نے یہاں ایک دن مقام کیا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بہت جمالوں کے گھر قریب ہی ہیں اس لئے وہ اپنے گھر والوں سے ملنے گئے ہیں شام کو ہم بعد مغرب کھانا کھا رہے تھے کہ میرا جمال عبدالرحمان آگیا۔ اور میری دعوت پر وہ بھی کھانے میں شریک ہو گیا اور کھانے سے فارغ ہو کر بخشش کا ذریعہ جو ہمارے کو احتیاطاً نہیں دیا گیا تھا لیکر کہیں چلا گیا۔

۲۸- مئی روز دو شنبہ　دوسرے دن چاشت کے وقت بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے کہا کہ ایک بورے میں تمام جنس اور بھاری سامان باندھکر مجھے دو میرے پاس کوئی فاضل بورا نہ تھا لہذا اس کے ساتھ جا کر بازار سے خرید کیا اور واپس آکر بھاری اور غیر ضروری سامان بورے میں رکھکر اس کے حوالہ کیا۔ ہمارے ساتھیوں نے بھی اپنا زائد سامان اپنے جمالوں کو

دیدیا۔ ہمارے پانچ اونٹ تھے۔ جس میں سے تین میر صاحب کے۔ ایک میرا اور ایک ہمارے اُن پنجابی ساتھی کا جو میر صاحب کی اجازت سے مکہ معظمہ میں ہمارے مکان کے بیرونی حصہ میں رہتے تھے۔ یہ تین آدمی تھے۔ دو بہنیں اور ایک بھائی۔ ایک بہن جو پہلے ایک بار حج کر چکی تھی غربت کی وجہ سے شغدف کا کرایہ نہ دے سکتی تھی۔ لہذا وہ شہدائے وادی فاطمہ تک جھیکر پیادہ پا چلی آئی اور یہاں ہمارے قافلہ کے سردار سے گفتگو کرکے منیٰ میں آمد و رفت کا کرایہ طے کرلیا۔ باقی دونوں نے ایک اونٹ مع شغدف کرلیا تھا۔ ان پانچوں اونٹوں میں سے چار کے جمال ہم قبیلہ تھے۔ مگر عبدالرحمن کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عبدالرحمن کے پاس چار اونٹ تھے جنمیں ایک میری سواری میں تھا اور دو جادیوں کی سواری میں تھے۔ چوتھا جو کوتل چلتا تھا جادیوں ہی کے قافلہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اسی پر زائد سامان جاکر باندھ دیا گیا۔

چاشت ہی کے وقت قافلہ میں ہر طرف تحی تحی کی صدا بلند تھی اور مختلف ٹولیاں شغدف رکھ رکھ کر روانہ ہونے لگی تھیں۔ دوپہر کے قریب ہمارے جمال اونٹ لائے اور آتے ہی یہاں بھی تحی تحی کہکر شغدف لادنے کی جلدی مچانا شروع کی۔ ہم لوگ بھی تیار بیٹھے تھے۔ لہذا ظہر سے قبل ہم روانہ ہوگئے۔ راہ میں جا بجا کہیں شربت کہیں تربوز کہیں چاے بکتی جاتی تھی۔ بدوی دوڑ دوڑ کر شغدف سواروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے اونٹ سے اُترا تو میدان میں ایسی تپش تھی کہ الامان والحفیظ۔ نماز پڑھنے سے قبل اپنے شغدف سے کچھ آگے نکل گیا تھا۔ جتنی دیر میں نماز پڑھی اونٹ نے وہ راستہ طے کیا اور کچھ آگے بڑھ گیا اور مجھے اُس تک پہونچنے کے لئے ذرا تیز چلنا پڑا۔ زمین کی ریت جو چلنے میں جوتہ کے اندر بھر گئی تھی اسقدر گرم تھی کہ اُسکی وجہ سے پاؤں جھلسے جاتے تھے۔ ہوا گرم و تند کے طمانچوں سے چہرہ بدحواس تھا اور آنکھوں سے گویا شعلے نکل رہے تھے۔ شغدف میں پہونچکر جان میں جان آئی اور کئی گھنٹہ تک دم لینے کے بعد جب عصر کے وقت قدرے ٹھنڈا ہوا تو پھر نماز کے لئے اُترنا چاہا۔ رحمت شاہ پہلے اُترنا چاہتے تھے۔ اُترنے میں اُن کا تہمد شغدف میں اُلجھ گیا

اور اُن کے بوجھ سے اُن کا شغدف زمین سے جا لگا۔ اونٹ برابر چل رہے تھے۔
اس لئے جبتک جمال کو اطلاع ہو اور دوڑ کر آئے اور اونٹ کو کھولے ہمارا ایک شغدف
زمین بوسی کی حالت میں اور میں دونوں شغدفوں کے درمیان معلق رہا۔ یہ چند منٹ
اس قدر خطرہ کی حالت میں گذرے کہ عبدالرحمن نے دوڑ کر شغدف کو ابھار کے درست
کردیا۔ مگر پھر بھی طبیعت کی بدمزگی اور افسردگی زائل نہ ہوئی جب مغرب کے وقت
قافلہ چند منٹ کے لئے رکا تو شغدفوں کو اتروا کر از سرِ نو اونٹ پر کسوایا۔ پھر بھی آرام
سے نیند نہ آئی عبدالرحمن و عمار کو اس بات پر غصہ میں آکر بہت ڈانٹا کہ وہ ہمارے شغدف
چھوڑ کر جادیوں کے اونٹوں سے جا ملے تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو ہمارے ساتھ
ہونا چاہیئے تھا۔ عبدالعزیز ہمارے ترجمان نے سمجھا کر اطمینان دلایا کہ آئندہ شغدف
بہت مضبوطی سے کسے جائیں گے اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی یہ منزل طولانی تھی اوپر
یہ حادثہ۔ مشکیزے جو کہ مکہ معظمہ سے ساتھ لائے تھے اُن میں وادی فاطمہ میں پانی بھرا گیا تو
معلوم ہوا کہ سب ٹپکتے ہیں۔ صرف دو صراحیاں دونوں شغدفوں پر تھیں۔ لہذا پانی ٹپک گیا
رات میں سوتے سے آنکھ جو کھلی تو خشکی سے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ کسی نے
موبا موبا کی صدا لگائی تو ایک قرش دے کر ایک گلاس پانی لیا اور جلدی میں غٹ
غٹ چڑھا گیا۔ بمشکل دو حصہ پانی ہوگا باقی ریت ہی ریت تھی۔ خدا خدا کر کے صبح کو
۳ بجے قافلہ منزل پر پہونچا۔

۲۹ مئی روز شنبہ پڑاو کی زمین کسی قدر ناہموار تھی۔ بہرحال جلدی جلدی شغدف
اوتارے گئے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اونٹ پر سے پھینک دیے گئے اور شغدفوں
کے سامنے بچھونے بچھا کر ذرا دیر لیٹ گئے۔ نماز فجر کے بعد میں وظیفہ پڑھتا
ہوا بازار کی طرف گیا۔ طلفان کا بازار اچھا خاصا ہے۔ یہاں غلہ بہت فروخت ہوتا ہے۔
دوکانیں عموماً پٹی ہوئی ہیں۔ تربوز۔ خربوزہ۔ بیگن۔ ککڑی۔ لیموں وغیرہ بکثرت ملتے
ہیں۔ کھانے اور چائے کی دوکانیں بھی ہیں۔ مگر پکی ہوئی روٹی نہیں نظر آئی بہت سے کنوئیں
قریب ہی تھے۔ جن میں سے دو چوبالیوں کی وضع کے پختہ بنے ہوئے تھے بہت بڑے

اور کسی قدر بلندی پر تھے کہ اُن پر سے چڑھ کر سارے پڑاؤ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر پانی وادی فاطمہ جیسا شیرین و سبک نہ تھا اور نسبتاً گران بھی ملا۔ جمالون نے شغدف اُتار رکھنے کے وقت تو میری ہدایت پر چندان توجہ نہ کی تھی لیکن وادی فاطمہ پر شغدفون کے آگے پیچھے رکھے ہونیکی وجہ سے جو تکلیف ساتھیون کو ہو چکی تھی اُس کی بنا پر سب لوگون نے بالاتفاق طے کر لیا تھا کہ آئندہ سے شغدف بالمقابل رکھے جائین۔ چنانچہ ہم لوگون نے خود اپنے اپنے شغدف اٹھا کے مقابل مین کر لئے تھے اور بازار سے آکر جیسے ہی قنات بند ہوا اور تمازت نا قابل تحمل ہو گئی، رضائیان نکال کر شغدفون کے درمیان باندھ دی گئین جسکے سایہ مین کھانا بھی پکا لیا گیا اور آرام سے لیٹ بیٹھ بھی سکے۔ وادی فاطمہ مین ٹھہرنا زیادہ پڑا تھا اور یہان قیام مختصر تھا اس وجہ سے کھچڑی کھا لی گئی اور شام کے لئے روٹی پکا لی گئی* ظہر کے قریب قافلہ روانہ ہوا۔ منزل چھوٹی تھی۔ راہ مین شربت چائے تربوز بکثرت فروخت ہو رہے تھے۔ ایک روز قبل کے تجربہ کی بنا پر مین نے طے کر لیا تھا کہ اب عصر سے قبل شغدف سے نہ اُترون گا۔ کیونکہ ہوا سے گرم و تند اور آفتاب کی جھلس دینے والی تپش کے مقابلہ مین مَین بہت نحیف و زار تھا۔ ہمارے اونٹون کا رُخ اگرچہ مغرب جانب ہونے کی وجہ سے آفتاب پشت کی جانب تھا لیکن ہوا کے گرم کے لوکے شغدف کے اندر بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ اس لئے سامنے کے رُخ پر رضائی کا پردہ باندھا گیا اور پشت پر باوجودیکہ شغدف مین چٹائی کسی ہوئی تھی لیکن دونون شغدفون کے درمیان جو حصہ کھلا رہتا تھا اُس سے دھوپ اور ہوا کے گذر کو بند کرنے کے لئے بھی ایک مختصر پردہ باندھنا پڑا۔ پھر بھی ہوا کی تیزی اور اونٹ کی بے ڈھنگی چال کے باعث جب کسی جانب کا پردہ کھل جاتا تو ہوا کا وہ تھپیڑ لگتا کہ معلوم ہوتا کسی نے آگ سے داغ دیا ہے۔ شغدف مین پردون کے باندھ دینے کی وجہ سے جہان ہوا کے تھپیڑون سے نجات مل گئی تھی وہان حبس بھی ہو گیا تھا جسکی وجہ سے دم گھٹنے لگتا پیاس کی شدت تھی۔ جو صراحیان سامنے کی طرف تھین اُن کا پانی پیتے رہے اس لئے کہ پشت کی طرف جو صراحیان تھین اُن کا پانی تمازت آفتاب سے پک گیا تھا۔ عصر کے وقت

* اتنے مین کچھ لوگ آ گئے جو گرد و پیش کے عرب قبائل کی طرف سے چوکیداری وصول کرتے تھے۔ ۵ قرش فی شغدف کے حساب سے چوکیداری ادا کی گئی

جبکہ آفتاب بالکل شغدف کے اُس جانب آگیا جدھر چٹائی کسی ہوئی تھی اور ہوا کی تیزی و گرمی میں بھی کمی ہوئی تو پشت کا پردہ کھولا گیا۔ شام کو روٹی اور کھجور اور وطن کا پکوان کھایا۔ اور یہی یہ دکھ دیدیا۔ عشا پڑھکر کچھ دیر سوئے نصف شب کو منزل پر پہونچے۔ چونکہ پورا قافلہ آگے پیچھے روانہ ہوتا۔ چلتا اور منزل پر پہونچتا ہے اس لیئے جو لوگ پہلے پہونچ کر آباد ہو چکتے ہیں اُن کے پڑاؤ کی مشعلوں کا نظارہ دور سے شغدف میں بیٹھکر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے پڑاؤ پر پہونچنے سے پہلے جتنی مسافت قافلہ کے گرد طے کی جاتی ہے اُس میں میلہ کی سیر کا لطف آتا اور چونکہ پانی اور لکڑی فروخت کرنے والوں کی کثیر تعداد مویا مویا اور حطب حطب کے آوازے لگایا کرتی اس لیئے ایک عجیب قسم کا ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ شغدف سے اُترتے ہی فوراً پانی خریدا گیا۔ اور چند منٹ کے اندر بستر بچھا کے سو رہے۔

نظرِ خوش گذرے

گذشتہ پرچہ میری علالت کے باعث بتاخیر شایع ہوا تھا۔ مسلسل بانتظامی اشاعت میں چونکہ الناظر کے سابق کاتب صاحب کی کم اتفاقی کو بھی دخل تھا اس لیئے مارچ نمبر کی اشاعت کے بعد ہی الناظر کی کتابت دوسرے زود نویس کاتب صاحب کے سپرد کی گئی۔ چنانچہ وسط رمضان تک الناظر کی ۳/۴ کتابت ہو چکی تھی اور امید تھی کہ عید سے قبل پرچہ تیار ہو جائے گا جس کے بعد ماہ بماہ رسالہ کا وقت پر شایع کرنا ممکن ہوگا مگر شہر میں آب و ہوا کی خرابی سے جو امراض پھیلے ہوئے ہیں نئے کاتب صاحب دفعۃً اُن میں مبتلا ہو گئے اور تقریباً تین ہفتہ تک کام بند رہا۔ اس لیئے یہ پرچہ مزید تاخیر کے ساتھ اور کسی قدر کم حجم کا شایع کیا جا رہا ہے۔ منشی امیر علی صاحب رقم جو برسوں تک الناظر لکھتے رہے ہیں اب پھر الناظر کی کتابت کے لیئے معین کیئے گئے ہیں اور مئی نمبر لکھ رہے ہیں امید ہے کہ ان کے عہد کتابت میں مثل سابق اغلاط

پوری پابندی کے ساتھ شایع ہوسکے گا جدید انتظام سے توقع ہے کہ اس ششماہی کے اختتام تک پرچہ اپنے وقت پر نکلے گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ عذر گناہ کی بدتر معصیت سے راقم الحروف کو نجات ملجاے گی۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

حضرت چلبی نے عزل خلافت کے سلسلہ مین جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے رسالہ ہذا کے ناوقت شایع ہونے کی وجہ سے افسوس ہے کہ اُن کا لطف کم ہوگیا۔ مگر چونکہ اخبار حقیقت کے ذریعہ ان خیالات کی وقت پر اشاعت ہوچکی ہے اس لیے اطمینان ہے کہ چلبی صاحب کا مقصد فوت نہین ہوا۔ اور اُنھین غالبًا اس بات کے علم سے مسرت ہوگی کہ اصحاب متعلقہ نے اُن کے مشورہ کو رد نہین فرمایا۔

جناب سید طفیل احمد صاحب جائنٹ سکریٹری آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی "تبلیغ سود" کے متعلق چلبی صاحب نے جو کچھ لکھا تھا اُس کے جواب مین صاحب موصوف کا ایک مراسلہ وصول ہوا تھا، جو چلبی صاحب کی تشریحات کے ساتھ انشاء اللہ مئی نمبر مین شایع ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ سید صاحب موصوف کو یہ اطلاع پہونچ جانے کے باوجود کہ اُن کی تحریر شایع ہوگی۔ اُنہون نے اس مراسلہ کو متعدد اخبارات مین شایع کردیا۔ اگر چلبی صاحب کی تشریحات کا اضافہ نہ ہوا ہوتا تو ان حالات مین اس مراسلہ کو الناظر مین درج کرنا نہ گوارا کیا جاتا۔ سید صاحب کا جوش تبلیغ اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ انھون نے اس بات پر ذرا توجہ نہین فرمائی کہ الناظر جیسے ماہوار رسالہ کو جس کا موجودہ حجم اُسکے معاونین قلمی کے علمی و ادبی مضامین ہی کے لیے کافی نہین ایسے مضامین کی قطعًا حاجت نہین ہے جو اخبارات مین شایع ہوچکے ہون۔ قضیہ زمین برسر زمین پر نظر کرکے اگر الناظر مین اُن کا مضمون شایع کیاجارہا تھا تو اُن کو دوسرے اخبارات مین نقول بھیجنے سے احتراز فرمانا چاہیے تھا۔ اور اگر اس بحث مین وہ آئندہ حصہ لین تو ازراہ کرم ان معروضات پر نظر رکھین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۵۵ جلد ۲۶ — ماہ مئی سنہ ۱۹۲۴ء

فیہ ما فیہ

(اثر : جلیلی)

بعض "یاران طریقت" جو کل تک "ناصح مشفق" کی حیثیت رکھتے تھے، شکست منصب خلافت کے ساتھ ہی اُس کے "ہمدرد" و "غمگسار" بن کر ایک بار پھر دُنیا کے سامنے رُونما ہوے ہیں۔ ان غمگساروں میں سب سے زیادہ قابل ذکر برطانیہ کے مشہور و معروف سابق وزیر اعظم، لائڈ جارج بہادر بالقابہ ہیں، جو ایک مدت تک، کروروں مسلمانوں کی گویا قسمت کے مالک رہے ہیں۔ آپ کا ایک مقالۂ گرامی "زوالِ خلافت" پر ڈیلی کرانیکل میں شایع ہوا ہے، جو یوں تو از سرتاپا مرصع ہے لیکن بہ لحاظ صحتِ معلومات حسب ذیل جواہر پارے، خصوصیت کے ساتھ قابل قدر ہیں :-

"وفد خلافت ہند کے سردار، ہندوستان کے ایک قابل ترین و کامیاب ترین بیرسٹر مسٹر محمد علی تھے۔ انکی وکالت کی آمدنی شاید ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ ہے"

"یہ نامور مسلمان مقنن" (یعنی مولانا محمد علی)

"مشرق کا یہ فاضل ترین و ممتاز قانون پیشہ شخص"۔

اسی خاکِ پاکِ انگلستان کے ایک نامور صحافی (جرنلسٹ) سر علی امام کے سفر انگلستان کے متعلق اظہار خیالات فرماتے ہوئے، موصوف کے متعلق......... مندرجۂ ذیل الفاظ میں گہر افشانی فرماتے ہیں:-

"یہ بہار کے وزیر اعظم ہیں"

آگے چل کر سر علی امام کو "نظام" قرار دیا جاتا ہے، اور زبان قلم یوں نغمہ سرا ہوتی ہے:-

"نظام، لیبر پارٹی کے ارکان وزارت سے برابر ملاقاتیں کر رہے ہیں، اور اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں، کہ ہندوستان اور برطانیہ کے مشاہیر کے تعلقات باہمی میں ترقی ہو۔"

"انکی (یعنی نظام سر علی امام کی) دولت حد شمار سے فزوں ہے۔ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ صرف ہیرے اس تعداد میں ہیں، کہ چھ آدمی انکے ڈھیر میں مدفون ہو سکتے ہیں۔ مگر باوجود اس ثروت کے نظام پختہ مسلمان ہیں، اور روپئے کو سودی کاروبار میں لگانے سے مذہبًا محترز ہیں۔"

غریب مشرقی اپنی داستان طرازی و اختراع دماغی کی سب سے بڑی معراج یہ سمجھتا تھا کہ نالۂ "نارسا" کو "رسا" فرض کر لیتا، قدِ یار کو سرو و شمشاد سمجھنے لگتا، زلفِ سیاہ پر افعی کا گمان کرنے لگتا، اور ان منازل کمال کے طے کرنے کے بعد پکار اُٹھتا کہ

غلطیہائے مضامین مت پوچھ!

لیکن مغرب کی متمدن و ترقی یافتہ قوت تخیل کے لیے ان حدود کے اندر مقید رہنا باعث ننگ و عار ہے۔ اسکے شاعروں نے نہیں، اسکے افسانہ نویسوں نے نہیں، سنجیدہ مدبرین سلطنت اور ذمہ دار اخبار نویسوں نے، اس بابِ خاص میں بھی، ترقی و کمال کے وہ مدارج عالیہ طے کر لیے ہیں، کہ غریب مشرقی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ محمد علی ہندوستان کے کامیاب ترین بیرسٹر ہیں، انکی وکالت کی آمدنی سب سے بڑھی ہوئی ہے، انکی قانونی قابلیت کے شہرے تمام ملک میں ہو رہے ہیں۔ سر علی امام صوبۂ بہار کے وزیر اعظم ہیں، نظام ہیں، خزانۂ قارون کے مالک ہیں، وقس علیٰ ہذا۔ یہ وہ الہامات ہیں، جو علم و عقل، تحقیق و تدقیق، ثقاہت و دیانت کے فلک الافلاک سے نازل ہوئے ہیں۔ پیش شامت ہر

اُس بدبخت مشرقی کی، جو انکے قبول کرنے میں ادنیٰ تردد و تذبذب کو دخل دے! مشرق گو ابتک اپنی الف لیلہ، طلسم ہوش رُبا، و داستان امیر حمزہ پر نازاں تھا، چشم فلک اس امتیاز کو بھی نہ دیکھ سکی اور بالآخر مغرب کے ذمہ دار وزرا، اور ارباب قلم اسے اس میدان میں بھی زیر کرکے رہے۔

الناظر کے عنوان فیہ ما فیہ کے تحت میں جو کچھ عرض خیال کیا جاتا ہے، اس پر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا سرکاری آرگن اکثر نقد و تبصرہ کرتا رہتا ہے۔ ادھر اُس کے لب ولہجے سے کچھ ایسا مترشح ہوا کہ شاید وہ سطور ہذا کے راقم کو ارکان مسلم یونیورسٹی کا مخالف یا دشمن سمجھتا ہے۔ اور اسکے نزدیک گویا راقمِ سطور کو یونیورسٹی اور منتظمین یونیورسٹی پر نکتہ چینی میں لطف آتا ہے۔ اگر فی الواقع اربابِ یونیورسٹی کے ذہن میں اس قسم کا خیال ہے، تو اس سے زیادہ غلط و بے بنیاد خیال ممکن نہیں۔ علیگڈھ کالج کے بانی کی نیک نیتی و محبت اسلام یقیناً شک و شبہہ سے ارفع ہے۔ محسن الملک کا درد قوم مسلم ہے۔ وقار الملک کی صحیح اسلامی زندگی قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرتی رہی۔ حاجی اسحٰق خاں کو ذاتِ رسالتؐ کے ساتھ جو والہانہ شیفتگی تھی وہ بہت سے علما و مشائخ کے لیے باعث رشک ہے۔ اسی طرح آج بھی صاحبزادہ صاحب کی ذات بہت سے خصائل حمیدہ کی جامع، اور انکی نیت اغراض ذاتی کی آمیزش سے ماورا ہے۔ لیکن ان تمام مناقب شخصی کے باوجود (جنکے اعتراف میں نہ کبھی پیشتر تامل ہوا ہے نہ انشاءاللہ آیندہ ہوگا) یہ ایک امر واقع ہے کہ تحریکِ علیگڈھ شروع سے اس راہ پر چل رہی ہے، جو یثرب و بطحا نہیں، پیرس و لندن پہونچ کر ختم ہوتی ہے۔ اسکے در و دیوار بارہا اسٹریچی و مسٹن، مارگولیس و مارسین کے نعرہاے استقبال سے گونج چکے ہیں، لیکن حاجی وارث علی و فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، محمود الحسن دیوبندی اور محمد نعیم فرنگی محلی کے ورود کی سعادت ایک مرتبہ بھی اسکے نصیب میں آئی؟ اس نے اب تک صدہا بلکہ ہزارہا کامیاب اور مشہور بیرسٹر، وکیل، حکام سرکاری، ڈاکٹر، انجینیر، ماہر ریاضیات، ماہر فلسفہ وغیرہ پیدا کردیے، لیکن کوئی ایک مفسر، کوئی ایک محدث، کوئی ایک فقیہ بھی پیدا کرسکا ہے؟ یہ بھی نہ سہی، اگر علیگڈھ نے اپنی نصف صدی کی زندگی میں اپنے اثر سے، کوئی ایک بھی پختہ مسلمان پیدا کردیا ہو، تو خدارا اُسکی مثال پیش کی جائے۔

جب اس کی فضا میں اسلامیت کا اس قدر قحط ہو، جب اس کا ماحول ایمان و روحانیت سے اس درجہ بیگانہ ہو، تو اگر اُسے کبھی کبھی ان فراموش شدہ فرائض کی جانب توجہ دلادی جایا کرے، تو کیا کوئی معصیت ہے؟ کوئی بداخلاقی ہے؟ یا پھر رنجش و برہمی کی کوئی وجہ بن سکتی ہے؟ ہر کلمہ گو اس پر مامور ہے، کہ اپنے ہر ہم عقیدہ کو حق و صدق، صبر و خلوص کی دعوت دیتا رہے، اور وَتَوَاصَوا بِالحَقِّ وَتَوَاصَوا بِالصَّبرِ سب مل کر ایک دوسرے کو نیکی پر آمادہ کرتے رہیں۔ خدا اس کی توفیق ہر پیرو اسلام کو دے، کہ اپنے بھائی کی اصلاح کے لیے، اس کی ہر برائی پر اُسے ٹوکے، اور ہر اچھائی پر اُس کی حوصلہ افزائی کرے۔ اور اس لعنت سے محفوظ رکھے، کہ کسی قومی کام کی مخالفت، اپنی نفسانیت یا کسی کی ذاتی کدورت کی بنا پر کی جائے۔ علیگڈھ پر مسلمانوں کی بیشمار دولت اب تک خرچ ہو چکی ہے، اور ہر سال لاکھوں کی رقم اب بھی اُٹھ رہی ہے۔ اسکے ارباب حل وعقد اُس گھڑی سے ڈریں، جب ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا، اور بتانا پڑے گا، کہ کس قدر رقم خدا کی راہ میں خرچ ہوئی، اور کس قدر نفس و شیطان کی راہ میں۔ (مذہبی اصطلاح میں ہر بُری شے کا نام شیطان ہی ہے)

حاشا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں، اور نہ ہو سکتا ہے، کہ یہ یوم احتساب صرف علیگڈھ ہی کو پیش آنا ہے۔ اس کا پیش آنا جس طرح علیگڈھ کے لیے برحق ہے، اُسی طرح جامعہ ملیہ کے لیے، فرنگی محل کے لیے، ندوہ کے لیے، خلافت کمیٹی کے لیے، دارالمصنفین کے لیے، قومی اخبارات کے لیے، اور ان سطور کے تحریر کرنے والے کے لیے، سب کے لیے یقینی وقطعی ہے۔ دعا ہے، کہ وہ غفار و ستّار، رحمٰن و رحیم، حلیم و کریم، ذات بے نیاز، اُس بڑے اور کڑے امتحان کے وقت، اُس نازک گھڑی میں، اُس بے پناہ مصیبت کے موقع پر، ہم سب کا پردہ ڈھنکا ہوا رکھے، اور ہم میں سے کسی کو رسوا نہ کرے۔ آمین، یا مجیب السائلین، بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

مارچ نمبر میں طفیل احمد صاحب، مولف رسالۂ جواز سود کی سعی ترویج "ربح" کی بابت جو کچھ عرض کیا گیا تھا، افسوس ہے کہ وہ انھیں ذرا بھی قبول خاطر نہیں ہوا، اور انھوں نے ناگواری کے ساتھ

اس کا جواب لکھ کر ارسال فرمایا ہے، جو اسی پرچے میں، راقم سطور کے حواشی و تعلیقات کے اضافہ کے ساتھ درج ملے گا - ہر بحث جب چھڑ جاتی ہے، تو عموماً فریقین ضمنی بلکہ غیر متعلق مسائل پر اظہار خیال کرنے لگتے ہیں، اور اس طرح سلسلۂ بحث بجائے سمٹنے کے ہمیشہ پھیلتا ہی جاتا ہے - اگر اس سے احتیاط برتی جائے، تو ہر بحث کا خاتمہ چند الفاظ میں ہو سکتا ہے -

---

مجھے جو کچھ اس عنوان پر کہنا ہے، اس کا ماحصل دفعات ذیل میں آ سکتا ہے :-

(۱) سود (ربٰو) اسلام میں ایک شدید ترین معصیت ہے، جس پر متعدد نصوص قرآنی و احادیث صحیحہ دال ہیں -

(۲) جو شے نہایت درجہ قابل نفرت ہوتی ہے، انسان نہ صرف اُس سے، بلکہ اُن چیزوں سے بھی بچتا ہے، جو اُس سے ملتی جلتی ہوتی ہیں - دق چونکہ مہلک مرض ہے، اس لیے اُن امراض سے بھی پوری احتیاط برتی جاتی ہے، جو دق کے مماثل ہوتے ہیں - ہر معمولی سمجھ کا انسان، زندگی کے ہر شعبے میں اسی قانون پر عامل رہتا ہے -

(۳) سود کے متعلق، اس عام انسانی قاعدے کے علاوہ، حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی تصریح موجود ہے کہ

فدعوا الربٰو والریبۃ - (ابن ماجہ - مشکوٰۃ) سود اور مشتبہاتِ سود دونوں سے بچو -

متعدد صحابۂ کرام کا عمل اسی کے مطابق منقول ہے - سردار دو عالمؐ کی ہدایت ہر مشتبہ موقع پر طریق احتیاط پر قائم رہنے کی ہے -

(۴) طفیل احمد صاحب اسکے مدعی ہیں، کہ ربح، ربٰو سے علیحدہ ایک مستقل شے ہے، اس لیے مسلمانوں کو بلا تامل اس سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے - یہ دعوی اول تو ابتک وہ ثابت نہیں کر سکے ہیں، یعنی ربح و ربٰو کے امتیاز پر کوئی دلیل شرعی نہیں لا سکے ہیں - اور پھر اگر اس فرق کو تسلیم بھی کر لیا جائے، تو ایسے مشتبہ موقع پر عقل و نقل دونوں کا کیا فتوی ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اسکے ترک کا، نہ اسکے اختیار کا۔

(۵) احادیث کے مطالعہ سے ذہن اسی جانب جھکتا ہے، کہ ربح بھی ربٰو ہی کی ایک صورت کا نام ہے - مثلاً ایک حدیث میں صاف ارشاد ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں ربٰو عالمگیر ہو کر رہیگا

عن ابی ہریرۃ عَنْ رَسُولُ اللہ صلعم قَالَ لَیَاتِیَنّ علی الناس زمانٌ لَایَبْقٰی اَحَدٌ الا آکلُ الربٰو فان لم یا کلہ اصابہٗ من بخارہ اوغبارہ

جہان پر چھا جائے گا، یہاں تک کہ جو شخص براہِ راست سود نہیں لیتا، وہ بھی اس کے غبار سے محفوظ نہ رہے گا۔

(ابن ماجہ - ابو داؤد - مشکوٰۃ)

ظاہر ہے کہ ربٰو تو ابھی اس قدر عام نہیں، البتہ وہ تجارتی سود، جس کے جواز پر صاحب جوازِ سود اس قدر مصر ہیں، سارے جہانِ متمدن پر پوری طرح مسلط ہو چکا ہے، یہاں تک کہ اسکے اثرات سے بڑے بڑے متقیوں کی آمدنی بھی بمشکل ہی محفوظ نکلے گی۔

(۶) غرض ایسی حالت میں، ربح، اگر ربٰو کے حکم میں ہے (جیسا کہ اغلب ہے)، تو اُس کی معصیت شدید کھُلی ہوئی ہے۔ اگر نہیں ہے (جیسا کہ ایک ضعیف احتمال ہو سکتا ہے) تو بھی ازروے عقل و نقل احتیاط و ترک اولیٰ ہے۔

(۷) تمدنی حیثیت سے، سرمایہ داری کا دارومدار اسی تجارتی سود پر ہے، اور چونکہ سرمایہ داری ہی دورِ حاضرہ کے اکثر مفاسد کا سرچشمہ ہے، اسلیے تجارتی سود کا انسداد کرنا، ایک فتنۂ عظیم کا سدِ باب کرنا، اور دُنیا کو ایک بہت بڑی لعنت سے نجات دلانا ہے۔

(۸) بالفرض، ربح بالکل جائز بھی ثابت ہو جائے، تو بھی اس کی حیثیت مباح سے زائد نہیں ہو سکتی۔ حیرت ہے، کہ ہزارہا فرائض، واجبات، و سُنن کے ہوتے ہوے ایک ایسے امر کے پیچھے، اپنی قوت اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ صرف کیا جائے، جس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک فعل مباح کی ہو سکتی ہے۔ اسلام کے جو کھُلے ہوے فرائض ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وغیرہ۔ انکی پابندی نجاتِ اُخروی ہی نہیں، فلاحِ دنیوی کی بھی ضامن ہے۔ انھیں چھوڑ کر ایک ایسی شے کی ترویج پر سارا زور صرف کر دینا، جو بعض کے نزدیک حرام قطعی، بعض کے نزدیک مشتبہ اور خود مجوز صاحب کے نزدیک محض مباح ہے، خدا معلوم کس آئین دانش کے مطابق ہے۔

طفیل احمد صاحب بصد تاسف وتحسر دیکھ رہے ہیں، کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے تجارت نکلی جا رہی ہے، صنعت و حرفت جا چکی ہے، ملازمت کے دروازے بند ہوتے جاتے ہیں، غرض مالی

د معاشی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ اور اغیار انکی جائدادوں پر بید عڑک قابض ہوتے جاتے ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پیشتر متمول و باثروت منکرین نے (جن کے تمول و ثروت کا اندازہ غالبًا انکی سود خواری ہی ہوگا) غریب و بے ساز و سامان ایمان والوں کے مقابلے میں فخر و پندار کے ساتھ کہا تھا کہ

اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا

(مریم - ع ۵)

بھلا، دیکھو تو، ہم دونوں فریقوں میں لطف معاشرت و رونق محفل کے لحاظ سے کس کی حالت بہتر ہے؟

ظاہر ہے کہ آج جو برقی لمپ، برقی پنکھے، برقی قمقمے، ٹیلیفون، فرنیچر، مخملی گدے، "صاحب" کے بنگلے میں نظر آتے ہیں، غریب و فاقہ کش، بوریہ نشین و خاکسار نمازیوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں، تاہم بندوں کے فخریہ کا جواب اُس زبان سے ملتا ہے، جسکے اختیار میں "صاحب" کی بھی موت و حیات ہے۔ اور وہ جواب یہ ہے، کہ ان شامت زدوں کی تو کیا حقیقت ہے، انکے اگلے جو ساز و

وَکَم اَہلَکنَا قَبلَہُم مِن قَرنٍ ہُم اَحسَنُ اَثَاثًا وَرِئیًا۔ قُل مَن کَانَ فِی الضَّلٰلَۃِ فَلیَمدُد لَہُ الرَّحمٰنُ مَدًّا، حَتّٰی اِذَا رَاَوا مَا یُوعَدُونَ، اِمَّا العَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَۃَ، فَسَیَعلَمُونَ مَن ہُوَ شَرٌّ مَکَانًا وَّ اَضعَفُ جُندًا۔

(مریم - ع ۵)

سامان، قوت و مرتبت میں، ان سے کہیں بڑھے چڑھے ہوئے تھے، ان میں سے کتنوں کو ہم نے ہلاک کر مارا۔ تو لے پیمبر، انھیں خبر دیدو، کہ جو کوئی حیات مادی کے پھیر میں پڑ کر گمراہ ہو جاتا ہے، خداوند رحمٰن اُسے ڈھیل پر ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے، یہانتک کہ عذاب الٰہی یا یوم قیامت اُسے آ دبائیگا۔ اور اُسوقت اُن لوگوں سے سوال ہوگا کہ بدتر حالت کس کی اور کمزور پارٹی کس کی ہے؟

طفیل احمد صاحب "قوم کے لیے باعزت زندگی کی سبیل" ڈھونڈھنے نکلے ہیں۔ لیکن "باعزت زندگی" کا مفہوم انکے خیال میں وہی ہے، جو انکے مغربی اُستادوں نے انھیں بتا رکھا ہے۔ ورنہ ایک مسلمان کے نزدیک، بندے کی عزت کیسی؟ عزت و کبریائی تو صرف اُسی ایک ذات یکتا و بے ہمتا کو سزاوار ہے۔ عزت ساری کی ساری مَن کَانَ یُرِیدُ الْعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ جَمِیْعًا۔ اِلَیْہِ

يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ

(فاطر ۔ ع ۲)

صرف اسی کی ہے ۔ البتہ بندے بھی اگر اس منزل تک رسائی چاہتے ہیں، تو اُن کے لیے اعمال صالحہ کا راستہ مقرر کیا گیا ہے ۔

اسلام نے "باعزت زندگی" کا جو معیار قائم کیا ہے، اُسکے لیے کواپریٹو سوسائیٹیوں (انجمن ہائے امدادی)، تجارتی کمپنیوں، مشترکہ دوکانوں، کارخانہ سازیوں، اعلیٰ مشاہروں میں سے کسی ایک شے کی بھی ضرورت نہیں ۔ اسکے لیے صرف اس قدر کافی ہے، کہ انسان زبان وقلب دونوں سے توحید کا قائل ہو، ہر قسم کے خود ساختہ معبودوں کا منکر ہو، اُس کے رسول برحق کو صرف کانفرنس کے اسٹیج پر نہیں بلکہ گھر کی تنہائیوں میں بھی برحق یقین کرے، قرآن کے متعلق اپنی تحریروں ہی میں نہیں، دل میں یہ عقیدہ رکھے، کہ وہ ماضی، وحال، واستقبال، ہر ملک، ہر قوم، ہر زمانہ کی ضروریات کے لیے بالکل کافی ہے ۔ اور اپنے اعمال میں تقوےٰ، طہارت، ایثار، بےنفسی، دیانت، و اتباع سنت کو تابہ امکان اپنے اوپر حاوی کرلے ۔

مولف رسالہ جواز سود کا دین وایمان تجارت ہے، وہ تجارت جس نے انگلستان کو امیر کبیر بنا دیا ہے، وہ تجارت جو ترقیِ تمدن کے متلازم ہے، وہ تجارت جس کا مظہر بڑی بڑی کوٹھیاں اور بڑے بڑے بینک ہیں ۔ لیکن اسلام ایک دوسری تجارت کی جانب دعوت دے رہا ہے ۔ جس میں سیم و زر کے لین دین کے بجائے نماز وزکوٰۃ کے سکّے کا چلن ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۔

(فاطر ۔ ۴)

جو لوگ کلام الٰہی کی تلاوت کرتے رہتے ہیں، اور نماز پابندی کے ساتھ پڑھتے اور راہ خدا میں خفیہ وعلانیہ صرف کرتے رہتے ہیں، وہی ایسی تجارت میں لگے ہوے ہیں جو اس قدر مضبوط ہے کہ نہ کبھی اُس میں خسارہ ہوگا اور نہ کبھی اسکے دیوالہ نکلنے کا اندیشہ ہے ۔

اسلام اور خدائے اسلام، جس تجارت کی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے، وہ راک فیلر و کارنیگی والی تجارت نہیں ۔ وہ فورڈ اور راتھچائلڈ والا لین دین اور بیوپار نہیں ۔ یہ وہ تجارت ہے،

جس کے سب سے بڑے بیوپاری ابراہیم خلیل، اور اسمٰعیل ذبیح، موسیٰ کلیم اور صاحب خُلقِ عظیم ہوئے ہیں۔ یہ وہ سودا ہے جسے حمزہ نے جنگ احد میں، اور حسینؓ نے میدان کربلا میں اپنے خون کے قطروں سے خرید کیا تھا

یا ایہا الذین آمنوا ہل ادلکم علیٰ تجارۃٍ تنجیکم من عذابٍ الیم، تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاہدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم، ذٰلکم خیرٌ لکم ان کنتم تعلمون۔

(الصف - ع ۲)

اے ایمان والو میں تمہیں اُس تجارت کی راہ بتا دوں، جو عذاب الیم سے نجات دلانیوالی ہے؟ (یہ تجارت اُن دُکانوں کی نہیں جو کو آپریٹیو اسٹور کھولتے ہیں نہ ترویج سود کی انجمنیں قائم کرنے کی مرادت ہے) اُسکا طریقہ یہ ہے کہ اللہ اور اُسکے رسول پر دل سے ایمان لاؤ، اور خدا کی راہ میں اپنے جان و مال کو قربان کرتے رہو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے، اگر تم واقعی علم و عقل رکھتے ہو۔ اور یہی تمہارے حق میں "فوز عظیم" ہے۔

اشکِ ندامت

نہ عامل ہوں شریعت پر نہ پابندِ طریقت ہوں
کہوں کس منہ سے اظہر مستحقِ شانِ رحمت ہوں

مجھے اے ساکنانِ عرش مت خاک سمجھو
بڑا رتبہ ہے میرا خادمِ ختمِ رسالتؐ ہوں

بتوں کے آستانے پر مرا سر جھک نہیں سکتا
عنایت سے تری ہمرنگِ محرابِ عبادت ہوں

مرا جلوہ مری صورت ہر اک شے میں نمایاں ہے
تعمق کی نظر ڈالو تو میں کثرت میں وحدت ہوں

مری تردامنی تحقیر کے قابل نہیں زاہد
کہ میں اپنے عمل کا آپ ہی اشکِ ندامت ہوں

ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ ہی اور غوثؓ و اجمیریؒ
انہیں کے دردِ فرقت کی میں اک غمگیں حکایت ہوں

نہ ہو گر فطرۃً دار و رسن میں فاش یہ کردوں
حقیقت کیا ہے میری اور میں کس کی حقیقت ہوں

تو ہی ہے لایزال و لم یزل اے خالقِ اکبر
تجھی سے ہر گھڑی میں طالبِ اکرام و رحمت ہوں

مرا سر اٹھ نہیں سکتا ہے گو عصیاں سے اے اظہر
مگر لاتقنطوا پر میں طلبگارِ شفاعت ہوں

اظہر نعمانی رُدولوی

کُہرا - پالا - برف

(خاص الناظر کے لیے ترجمہ کیا گیا)

اک شور ہوا بزمِ فطرت میں بہار آئی محسوس ہوئی سب کو جاڑے کی مسیحائی
چشم و دلِ نرگس نے تسکین و ضیا پائی

اُفتادہ زمینوں کو کُہرے نے کیا زندہ بے رنگ تھے جو پودے سب ہوگئے تابندہ
لینے لگے تن تن کر انگڑائی پہ انگڑائی

کیا چیز ہے تو کہرا - کیا تیری حقیقت ہے دامن میں ترے آخر کس ملک کی دولت ہے
قوت ہے اٹل تیری طاقت میں ہے یکتائی

سیال دغا پرور عاجز ہے اُڑانے میں دم تیرا صبا بھرتی پھرتی ہے زمانے میں
پتے ترے دیوانے کلیاں تری سودائی

پورب ہو کہ پچھم ہو، چھائی ہوئی طاقت ہے ہے رات کا سناٹا اور تیری حکومت ہے
جمنے لگی خود فطرت ٹھنڈی جو ہوا کھائی

شب بھر ترے جادو نے دکھلائے عجب نقشے پیکر تھے خیالی سب موہوم تھے سب خاکے
ٹھنڈک ہوئی روحوں میں آنکھوں نے ضیا پائی

دنیا کو جگایا جب سورج کی لگاوٹ نے تجھکو بھی کیا ماندہ شب بھر کی تھکاوٹ نے
انگڑائیاں لیں تو نے سو رہنے کی ٹھہرائی

ہمارے نزدیک برفستانی فصل کی دو مخصوص نعمتیں ہیں - ایک کُہرا، دوسرے پالا - اس موسم میں ہم آپ عموماً - ان تمام نہروں کو، مُہر بہ لب، انگشت بدنداں، قفل بہ دہن پائیں گے - خیر ابھی کچھ ہی دنوں پہلے، پت جھاڑ کے موسم میں، برہنہ ڈالیوں کی دُکھ بھری چھاؤں میں بہتی ہوئی طفلانہ سادگی سے - غم خیز ترنم ریزیاں کر رہی تھیں - اور خزاں خوردہ سُنہری زرد پتیوں کو، اپنی چھاتی سے لگائے ہوئے بے پایاں سمندر کی طرف رواں دواں تھیں، دن کے وقت سورج کی آڑی ترچھی

کرنیں ایک ہلکے سے دھندلے میں، لپٹی ہوئی رہتی ہیں۔ گر شام کے جھٹ پٹے اور رات کے سناٹے میں خوش مزاج کہرا۔ زمین کے ابخرات کو دور کر دیتا ہے۔ اسوقت بے ساختہ اقرار کرنا ہی پڑتا ہے کہ۔

بیاضِ آسمانی بن گئی اک نور کی چادر — وہ نظارہ نظر آیا کہ آنکھیں ہو گئیں ششدر
کئی سورج کئی چاند اور کئی دنیا کئی دریا
اودائل کو ندکر کرتی ہے پیہم گوہر افشانی — ستاروں کی چمک ہے یا کوئی سرپوش نورانی
بنا ہے اس قطب سے اس قطب تک نور کا بقعہ

بیچاری چڑیاں، جنھیں کھلے ہوئے میدانوں میں ہر قسم کی عمدہ غذائیں مفت ملجاتی تھیں اب حیران ہیں پریشانی سے طوطی آئینہ بن گئی ہیں۔ ہر چیز منجمد ہو کر سخت ہو گئی ہے انکی ہڈی والی نکیلی چونچیں، جو رس بھری، جھربیری اور گھاس کے بیج پر نہایت کامیابی سے چلا کرتی تھیں۔ اب بے بس ہیں، بیکار ہیں۔ پہلی دو چیزیں جم کر کڑی ہو گئی ہیں۔ فولادی دانت ہوں تو ایسے لوہے کے چنے چبائے جائیں۔ اور تیسری غذا آسمانی برف کی سفید گھونگھٹ میں چھپی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پردار مخلوق، بھوک کے ہاتھوں تنگ ہو کر، انسانوں کی بستی میں آ گئے ہیں، جہاں، انگیٹھیوں کی دہک اور گرم کمروں کی لپک۔ برف میں بھی جمائی ہوئی آس پاس والی سطح زمین کو نرم و گداز بنائے رکھتی ہے۔ اور دن میں کئی بار، دسترخوان کا چورہ چارہ ڈیوڑھیوں پر پھینک دیا جاتا ہے۔ وحشی بطیں اپنی ان نہروں کو چھوڑ چلی ہیں، جن کا رقیق پانی اب سیال نہیں رہ گیا جن میں اب وہ تیر نہیں سکتیں، اور ہوا میں ایک سیدھی لکیر بنائی ہوئی اُتر کی طرف ٹولیوں میں اس انداز سے چلی جا رہی ہیں کہ دیکھنے والے، تصویر مسرت و مجسمہ حیرت بنجاتے ہیں۔

پانی ان تمام اثرات کا ذمہ دار ہے جن کی بدولت نظام فطرت میں نت نئی الٹ پھیر ہوا کرتی ہے۔ جب اس میں ایک معینہ حد کی حرارت پہونچ جاتی ہے تو سیال موجیں، جسم منجمد کی شکل میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں۔ آسمانی برف پانی کی "بھاپ" ہے جو ایکا ایکی جم گئی ہو، اور برف مصنوعی۔ آب منجمد کا دوسرا نام ہے۔ سیال سے منجمد ہو جانے میں، پانی، شان استثنا رکھتا ہے۔ گو اصول اسکے خلاف ہے۔ پانی معینہ سردی پا کر پھیلتا ہے۔ یہاں تک کہ تبدیل ہو کر اولے یا ژالہ کی شکل اختیار کر لے۔ عملی ثبوت: لوہے کی ایک ٹھنڈی چھڑ کسی دھات یا پتھر کے سوراخ میں ڈال

دیجیے - اب فولادی سلاخ گرم کرنے کے بعد اس سوراخ سے باہر نہ آسکے گی - مگر پانی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے - اس تشریح سے پہلے بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سردی کیا چیز ہے اور گرمی کیا بلا ہے؟ گرمی ایک خاص صفت رکھنے والی طاقت ہے، جس کا اندازہ صرف اسکے اثرات سے ہوتا ہے، جو اجسام غیر میں پیدا ہو جائیں، سردی گرمی کی نفی ہے، عدم حرارت اس کا دوسرا نام ہے - اس کا اندازہ بھی اثرات متباین و معکوس سے کیا جاتا ہے -

ہم لوگ معمولی حرارت پیما آلات میں، ایک سیال مادہ، سیماب بھر دیتے ہیں جس سے سموئے ہوئے پانی یا غسل خانے کی حرارت کا پتہ ٹھیک ٹھیک چل جاتا ہے - گرمی پانے سے پارہ پھیل جاتا ہے اور گرمی علیحدہ ہوجانے پر سکڑ جاتا ہے - سیال چیزوں میں جکڑنے کی ایک حد معین ہے - مگر باد بسیط آزاد محض ہے -

کلورائن (نمک والی ہوا) ہائڈروجن (وہ لطیف مادہ جس میں پانی کا ایک جزو لاینفک شامل رہتا ہے) کاربونک ایسڈ (وہ جزو جس کی مدد سے کوئلہ سرخ کرکے تیزاب نکالا جاتا ہے) گرمی پانے سے ایک جیسے متاثر ہو جاتے ہیں مگر روح شراب (شراب کا ست) پارے سے چھ گنا زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے - اسی طرح سیسہ لوہے کی نسبت سے تین گنا زیادہ تاثیر قبول کرتا ہے - اس بارے میں بھی پانی کی شان مخصوص ہے -

ایک علمی بلوری شربہ لیجیے - اور قریب قریب لبریز کر لیجیے - گلے پر ٹھیک اسی جگہ لکیر کھینچ دیجیے جہاں تک پانی بھرا ہوا ہو، اب کسی گہرے ظرف میں تھوڑا سا "جمانے والا مصالحہ" ہم پہونچائیے - گلے تک برف و نمک سے توپ کر شربے کو ظرف کے اندر جما دیجیے - اگر شربے کا پانی ۶۰ ڈگری سے زیادہ کا ہوگا (جیسا عموماً ہر گھر میں تھوڑی دیر رکھنے کے بعد ہو جاتا ہے) تو آپ دیکھیے گا کہ پانی جکڑنے - سکڑنے لگا ہے - یہاں تک کہ اپنی اصلی حد حرارت ۴۰ ڈگری تک آجائے - اب پھر بتدریج پھیلے گا - یہاں تک کہ خود بھی جم کر ٹھوس مادہ کی شکل اختیار کرلے - اس کا گھٹنا بڑھنا اسی لکیر سے معلوم ہو جائے گا جو شربے کے گلے پر کھینچ دی گئی ہے - تکمیل مشاہدہ کے واسطے پانی میں ایک چھوٹا سا حرارت پیما لگا دیجیے - تاکہ خفیف سی خفیف تلون مزاجیاں بھی نکتہ سنج نگاہوں سے چھپ نہ سکیں - جمانے والا مصالحہ نہ مل سکے تو خود بنا لیجیے: آسمانی یا دکانی برف دو حصے

نمک ایک حصہ جسے کیمیا والے کھارا سوڈا کہتے ہیں دُکانی برف پیشے والوں سے نہ ملے تو گھر پر بنا لیجیے: نوسادر ۵ حصے کھاری مٹی ۵ حصے (پوٹیش) گندھک کا ملا ہوا سوڈا آٹھ حصے۔ پانی ۱۶ حصے

اسی تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۰ ڈگری والی حرارت اصلیہ میں پانی کثیف رہتا ہے معینہ حد کی گرمی یا سردی پاکر بڑھے یا کم ہو۔ مگر دونوں حالتوں میں پھیلے گا۔

اگر ہم ۴۰ ڈگری والے پانی سے ایک شیشہ بھرلیں، اور اسکو اس طرح سربمُہر کردیں کہ اندر والا سیال مادہ باہر نہ آسکے۔ اب اسے گرم کردیں یا سرد تو یقیناً تڑاق سے پھٹ جائیگا۔ اس لیے کہ دونوں چیزیں پانی کی موجودہ جسامت کو پھیلا کر زیادہ کردیں گی۔ نتیجہ لطیف یہ نکلا کہ برف ہر اُس پانی سے جس کی حرارت ۴۰ ڈگری سے کم ہو ہلکی ہوتی ہے۔

اسی طرح کہرے کی تحت میں مادی اجسام کا پھیلاؤ نقاش فطرت کا ایک عجیب طلسمی انتظام ہے۔ اگر پانی بھی دوسری سیال چیزوں کی طرح سردی پاکر جاڑتا جاتا اور اُس کی جسامت کثیف تر ہوتی جاتی تو ہماری ہی جھیلیں جو موسم سرما میں سرف سطحی طور پر وقتی اعتبار سے جمی رہتی ہیں کلیت منجمد ہوکر برف کے ٹھوس تودے بن جاتیں۔ جھیلوں کی گرمی، جاڑے کی مرطوب ہوائیں اُڑا لیتیں جو انکی سطح پر ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ کثیف تر اجزائے آبی وزنی ہوکر نیچے اُترتے جاتے گرم اجزاء اُبھرتے آتے تاکہ اپنی باری سے کہرے والی ہواؤں کا نشانہ ناز، برف انداز بن سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ یہی سلسلہ جاری رہتا، اور تمام و کمال پانی کی حرارت طبعیہ گھٹ کر ۳۲ ڈگری کے اندر آجاتی۔ اور پوری جھیلیں برف کی سخت چٹانیں بن جاتیں۔ چاہے اسکی اندر والی ہزارہا ذی روح ہستیاں برباد ہوجاتیں مگر اس کی روک تھام، خود فطرت میں موجود ہے۔ اگرچہ پانی کی اصلی حرارت سردی پاکر ۴۰ سے کم ہوجاتی ہے مگر اب اس کے سیال اجزاء میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی وہ اجزاء جو زیادہ سردی پاتے ہیں سبک ہوکر سطح آب پر دوڑتے رہتے ہیں۔ اور وہ حصص آبی جو مقابلۃً زیادہ گرم ہیں ویسے ہی سیال و رقیق حالت میں قائم و باقی رہتے ہیں۔ پانی حرارت کا غریب سرمایہ دار ہے۔ لہذا حرارت اصلیہ اسکے اندرونی طبق سے کبھی کسی حالت میں مفقود نہیں ہوتی خواہ سطح آب منجمد ہوکر برف کی چادر ہی کیوں نہ بن جائے۔ برف ایک سرے سے سرمایہ دار ہی نہیں ہے۔ لہذا مرطوب ہوائیں جب تک نہ ہلکی اور ہلکی سطح پر دوڑتی پھریں جھیل کے اندرونی طبق والے اجزاء

اسی طرح گرم و سیال رہیں گے - گو شنیدہ کے بود مانند دیدہ -

ایک گلدان مہیا فرمائیے - دہانے کا قطر ۶ - یا ۷ - انچ کا ہو - نچلے حصے میں ریتی سے اتنا بڑا سوراخ بنائیے کہ اُس میں دو انچ قطر والا اور پانچ انچ لمبا نلکی دار پیمانہ آ جائے - پیندے میں ایک چکلا پایہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ پیمانہ اسپر ٹک سکے - پیمانے کو گلدان کے نچلے حصے میں اس طرح جما دیجیے کہ اُس کی نگر گلوے ظرف سے ½ انچ باہر دکھائی دے - ایک گز مضبوط نواڑ اس جگہ کس کر لپیٹ دیجیے جہاں گلدان اور پیمانے کے نچلے حصے میں تھوڑا سا فصل ہے - نواڑ پر پیرس کے پلستر کی آٹھ دس موٹی تہیں جما دیجیے - انتظار کیجیے کہ پلستر سوکھ کر مضبوطی سے جم جائے - گلدان کے اوپری درمیانی فاصلے میں مصنوعی یا آسمانی برف " جمانے والے مصالحہ میں لیپ کر بھر دیجیے - شرط یہ ہے کہ اس کا ایک قطرہ بھی پیمانے میں نہ گرے - اب معمولی حرارت کا پانی پیمانے میں اُنڈیلیے - مگر سطح آب سے ایک انچ باہر رہے - خیال رکھیے کہ ہم اس تجربے میں پانی کو سردی پہونچا رہے ہیں جس طرح فطرت سطح آب کو مرطوب ہواؤں سے ٹھنڈک پہونچاتی ہے - اب آپ دیکھیے گا کہ سطحِ آب جم جانے کے بعد بھی پانی کی طبعی حرارت ۴۰ یا ۵۰ ڈگری سے زیادہ اونچی رہتی ہے - ایک بار حرارت پیما پانی میں ڈبو دیا جائے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ پہلے سارا پانی گھٹ کر ۴۰ ڈگری پر آ گیا - اب اسکی روانیاں بند ہو گئیں یا غیر محسوس ہو گئیں - مگر نچلے اجزاء اپنی اصلی حرارت پر قائم رہے - جب اس میں پوری کثافت آ جاتی ہے تو سردی کی دوڑ دھوپ ختم ہو جاتی ہے مگر ہاں صرف ان اجزا میں سلسلۂ اثر باقی رہتا ہے جو خط محاذ مخالف پر واقع ہیں - مشاہدۂ معکوس یوں ہے کہ گلدان کا اوپری حصہ خالی کر دیجیے - اور اسی شان سے نچلا حصہ برف سے بھر دیجیے - تو سارا پانی منجمد ہو کر برف کا ڈھیلا بن جائے گا - اس لیے کہ ۴۰ ڈگری سے کم والی حرارت میں جمے ہوے کثیر اجزا ہلکے ہو کر اوپر آتے جائیں گے - دوسرے گرم جزو نیچے اُترتے جائیں گے - اور پھر اپنی باری سے سطح آب پر تیرتے ہوے نظر آئیں گے - یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں سب کا سب پانی جم کر برف کی قاش ہو جائے گا -

پانی میں پھیل جانے کا خاصہ اتنا زیادہ موجود ہے کہ جاڑوں میں اسکی وجہ سے اکثر دھتیر نلکیاں اور فولادی برتن پھٹ جاتے ہیں - کہا جاتا ہے کہ ۱۳ - انچ قطر کی اور ۲ ۱/۲ انچ دبیز توپ جسکی

نال پانی سے لبریز تھی۔ جس کے اوپری دہانے اور نچلے سوراخ میں لوہے کی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ مقام کناڈا میں۔ اثر سردی قبول کرتے کرتے، تانبے کے ساتھ پھٹ گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ اندر والا پانی سردی پاکر جم جانے کے لیے اتنا پھیلا کہ محدود نال تاب نہ لا سکی۔

یہی خاصہ کسانوں کے لیے مایۂ ناز ہے۔ کھیتوں کی نرم مٹی، گلابی جاڑوں میں برسا ہوا پانی اتنا جمع کر لیتی ہے کہ ہر دَرَج، ہر درار لبریز ہو جاتا ہے۔ جو سال بھر برابر کام دیتا رہتا ہے۔ جب کہرا پڑتا ہے تو یہی آب محفوظ خود پھیل کر ذرات کو منتشر کر دیتا ہے۔ سختی جاتی رہتی ہے اور مٹی کی سخت ہنڈیاں نرم پھپھوندیاں بن جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ پانی بھی جو نظر سے پوشیدہ کھوہ میں چھپا رہتا ہے یکایک سردی سے پھیل کر دیو سے زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ اور بڑی بڑی پتھریلی چادروں کو لڑھکا کر گہری وادیوں میں رول دیتا ہے۔ اسی طلسمی اثر سے ہمارے گھروں کا مضبوط گارا اور دبیز قلعی بھی جاڑوں میں جگہ جگہ سے چٹک جایا کرتی ہے۔

برف میں حفاظت کا ایک عجیب خاصہ ودیعت ہے۔ جس کی بدولت اسکے اندر کی تمام چیزیں بربادی سے محفوظ رہتی ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں ایک عظیم الجثہ جانور کی لاش، ملک سوئٹزرلینڈ میں ایک برف کی ڈھلکی ہوئی پہاڑی سے آہستہ آہستہ ابھرتی ہوئی دکھائی دی۔ اس زمانے کے "عالم حیوانات" اُس کا نام بھی نہیں جانتے۔ گوشت پوست بالکل اپنی اصلی حالت میں تھا جسے بھیڑیوں نے مزے سے چکھ لیا۔

جنوبی روس میں اسی فصل میں تازہ گوشت برف بھرے ہوئے برتنوں میں رکھ کر غیر ممالک کو تجارتاً طور پر بھیجا جاتا ہے۔ یوں ہی اسکاٹ لینڈ کی سلمن مچھلی کی تجارت بھی ہوتی ہے جو شمالی امریکہ کی مخصوص مچھلیوں کا کمیاب تحفہ سمجھی جاتی ہے۔

آسمانی برف کی تہیں آسمان سے اسی موسم میں گرتی ہیں۔ آیئے ذرا سیر بین سنبھالیے اور دیکھیے تو اس کی اجلی تہیں کتنی پیاری اور سہانی ہیں۔

ہم سیں جو آسماں سے اُجلی بھلی پھواریں	پہلے تو تھیں تہیں وہ اب بن گئی ہیں بریتیں
پہیم زمیں کے اوپر پڑتیں برس رہی ہیں	دن ہو چکا ہے دھندلا آنکھیں ترس رہی ہیں
مٹی میں جان آئی۔ کھیتوں نے شاد ہو کر	اوڑھی ہے سرد اونی خالص سفید چادر

آسمانی برف! پانی کی وہ بھاپ ہے جو یکایک جم گئی ہو - اگر یہ دکھینا مد نظر ہے کہ برف کی یہ چادریں فطرت کی نازک کلی میں کس طرح بنتی ہیں تو آئیے ایک خوشگوار سفر کرکے لیپ لینڈ سے چلے چلیں - وہاں کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی کمرے کا دروازہ جس کے اندر لوگ بیٹھے ہوں یکایک کھل جاتا ہے تو اندر والی ہوائیں بھی، مرطوب ابخرات کے تھپیڑے کھاتے ہی برف کی ہلکی نرم تہوں میں بدل جاتی ہیں -

آسمانی برف بھی حرارت کی غریب ترین سرمایہ والی ہے اسی لیے مصور فطرت نے اسکو نرم و نازک نباتات کی حفاظت کے لیے طلسمی محمودی چادر قرار دے دیا ہے -

گیہوں کے نازک پودے - پھلتے پھولتے ہوئے پودے - اسی چادر میں لپٹے لپٹائے اُگتے اور بڑھتے رہتے ہیں - ورنہ انکی معصوم پتیلی ڈنڈیاں کہرے کی بیدرد مرطوب کنیٹھیاں کھاتے ہی کٹ کر الگ ہو جائیں -

طالب - الہ آبادی

رعنائی پہ تیری جسے ایماں نہیں ہوتا
وہ منکرِ اعجازِ مسلماں نہیں ہوتا

قرباں نہ ہو سو جاں سے جو ہر آن پہ تیری
جو کچھ بھی کہو اُسکو وہ انساں نہیں ہوتا

شعلہ بھڑک اُٹھتا ہے کوئی آتشِ گل کا
تو صحن گلستان میں خراماں نہیں ہوتا

کرتا ہوں تصور میں شغل زلف سے تیری
پنجۂ گل میں مرے میرا گریباں نہیں ہوتا

بربادیٔ پیہم سے مجھے ہو چکی تسکیں
جب تک کہ غبارِ رہ جاناں نہیں ہوتا

زنداں میں بھی رہ آئے بیاباں کو بھی دیکھا
شوریدہ سری کا کہیں درماں نہیں ہوتا

چلتا رہے دن رات گلے پر مرے خنجر
بے حکم خدا کچھ بھی مری جاں نہیں ہوتا

تا خیر ہے شاید ابھی کچھ موسم گل میں
گلرنگ لہو سے مرا داماں نہیں ہوتا

کیا دَیر میں دیکھا ہے خدا جانے تپش نے
کمبخت کسی طرح مسلماں نہیں ہوتا

عبداللہ خاں تپش
خورجوی

روح نے بچالیا

(بسلسلۂ النّاظر ماہ فروری ۲۴ء)

اُنکی مرضی مجھے پانی میں بٹھانے کی نہ تھی ——— وہ ایسا سہولت سے کر سکتے تھے۔ کیونکہ میں اپنا سر اس کی سطح سے اونچا کیے اس میں بیٹھ سکتا تھا ——— اس وجہ سے کہ پتوں کی پٹی جو ٹیٹو نے بنائی تھی اب تک میرے زخمی بازوؤں پر لپٹی ہوئی تھی۔ اور اُس نے ظاہر کیا کہ اگر اسے ہٹایا گیا تو سوزش شروع ہو جائے گی۔ اس لیے میرے والد بیچارے کو میرا بھاری بوجھ اپنے بازوؤں پر سنبھالے کھڑا رہنا پڑا۔ اس عرصے میں ٹیٹو احتیاط سے اُنکے اوپر چڑھ کے اُنکے کندھوں پر کھڑا ہو گیا۔ اسکے بعد اُس نے یونہی ذرا اُچک کے شاخ پکڑ لی اور اوپر کو سرک کے وہ اُس پر چڑھ گیا۔ پھر اُس نے رسی کو جو کمر کے گرد لپیٹ رکھی تھی کھول کے اُسکے ذریعہ مجھے اپنے پہلو میں کھینچ لیا اور مجھے تھوڑی دور ایک دوشاخے تک لے گیا جس میں وہ مجھے بحفاظت بٹھا سکتا تھا۔ پھر اُس نے واپس جا کے اُسی رسی کے ذریعے والد کو اوپر کھینچ لیا۔ ہم نے اپنے آپ کو ایسے ٹہنے پر پایا جو کئی درختوں کے تنوں کے برابر بڑا تھا۔ اور ہم اُس کے اوپر سے بآسانی دیوہیکل تنے کی طرف بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخوں پر جو اس میں اُپجی ہوئی تھیں اور پیچیدہ بیلدار درختوں پر جو ہمارے چاروں طرف لٹک رہے تھے اپنے آپ کو سہارا دیتے ہوئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ ہم جلد اس تنے پر پہونچ گئے اور اس سے چمٹ کے رینگتے ہوئے دوسرے کنارے کی طرف ٹہنے پر جا پہونچے۔ پھر اُس سے ہٹ کے دوسرے درخت کے اتنے ہی بڑے ٹہنے پر جو اس پہلے درخت سے گتھا ہوا تھا پہونچ گئے۔ اس طرح ہم چشمے سے اب خاصے فاصلہ پر اور پہاڑی سے بہت کچھ بلندی پر پہونچ گئے تھے۔

اس تیسرے درخت پر کچھ دور چڑھ کے ٹیٹو کو ایسی جگہ مل گئی جہاں دو ٹہنے تنے سے برابر برابر نکلے چلے گئے تھے اور ایک آرام دہ چبوترہ بن گیا تھا جس پر ہم سب کے بیٹھنے کے لائق کافی جگہ تھی جس پر میں لٹایا جا سکتا تھا گو اتنی نرمی و ملائمت سے تو نہیں جتنی پہلے دن کے درخت

کے تنے میں میسر آئی تھی لیکن تھوڑا بہت آرام یہاں بھی تھا - ہم عین وقت پر اس جگہ پہونچے تھے - ہم درخت پر اتنی اُنچائی پر تھے کہ ہم پہاڑی کے اوپر نظر ڈال سکتے تھے - فوراً ہی سپاہیوں کی ایک جماعت نظر آئی جن کے آگے آگے کھوجی کُتے تھے جو ایسا ایک زنجیر میں بندھے ہوئے تھے - اور سرگرمی سے آگے کو کھینچے لئے جاتے تھے - وہ اس جگہ پہونچ گئے جہاں غریب ٹیٹو نے فضول اپنا خون بہایا تھا لیکن اس نے انھیں روکنے میں کچھ بھی اثر نہ دکھایا - وہ ایک لحظے تک سونگھتے رہے اور پھر تندی سے بھونکنے لگے - میرے خیال میں اس خون کی بُو سے - لیکن انھوں نے فوراً کھوج پر چلنا شروع کردیا - اور بولتے ہوے پہاڑی کے اوپر سے ہوتے ہوے نیچے چشمے تک آ گئے - اس جگہ وہ ٹھہر گئے لیکن سپاہی پانی میں گھُس کے انھیں پار آنے پر آمادہ کرنے لگے - جب وہ دوسرے کنارے پر پہونچے تو رُک گئے اور بے بتہ اور کھوئے کھوئے معلوم ہونے لگے - سپاہیوں نے کہا "وہ اوپر یا نیچے کی طرف مُڑ گئے ہیں "

جماعت فوراً منقسم ہوگئی - ہر ایک گروہ نے اپنے ساتھ کُتا لیا - ایک دریا کے اوپر شمال کی جانب گیا اور دوسرا نیچے جنوب کی جانب - جو اوپر کی طرف چلے وہ فی الفور اُس درخت کے پاس سے گذرے جہاں سے ہم پانی میں سے اوپر چڑھے تھے - لیکن کُتے نے کوئی علامت ظاہر نہیں کی اور سپاہی نکلے چلے گئے - کچھ دیر بعد وہ چشمے کے دوسرے کنارے پر واپس آئے - بظاہر اُن کو یہ خیال گذرنے لگا کہ ہم نے شاید اسے عبور ہی نہ کیا ہو - اسکے بعد وہ کھوج پر واپس آگئے اُن دوسروں کو پکارنے لگے جو نیچے کی طرف گئے تھے - اور پھر اُنکے پیچھے اُنھوں نے آدمی دوڑایا - فوراً ہی ہم نے اس ٹولی کو چشمے کے دوسرے کنارے پر واپس آتا دیکھا - پھر مشورہ کیا گیا - اور یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُنکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے -

اسکے بعد ہی افسر مہم نے کچھ حکم دیا اور آدمی پراگندہ ہوگئے - بظاہر آس پاس جستجو کرنے کے لیے - لیکن مجھے وہ بہت آہستہ اور بیدلی سے جاتے معلوم ہوے - اُن میں سے بعض ہمارے درخت کے نیچے سے گذرے اور ہم نے پھر اُنھیں جادو کا ذکر کرتے اور یہ کہتے سُنا کہ ہمیں تلاش کرنا بیفائدہ ہے کیونکہ شیطان ہمیں بظاہر اُڑا لیگیا ہے - اس وجہ سے کہ ہم کافر تھے یہ بات اُن لوگوں کی زبان سے مجھے پرلطف معلوم ہوئی جنھوں نے کم ازکم اس وقت کے لیے

عیسائی مذہب کھلم کھلا خود ہی چھوڑ دیا تھا اور عملی طور سے اپنے آپ کو اس بھتنے مارٹینز کی پرستش کرنے کا پابند کرلیا تھا۔ انھوں نے مارٹینز کی خفگی اور اسکے وحشت آمیز قسمیہ عہد و پیمان کا بھی ذکر کیا کہ جس طرح سبنے ہمکو گرفتار کرلیا جائے۔ انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ دہشت سے پاگل ہوگیا ہے۔ اور دراصل میرا بھی یہ خیال ہے کہ وہ پاگل ہوگیا ہوگا۔

یہ ناممکن بات معلوم ہوتی تھی کہ انکو یہ خیال ہی نہ آئے کہ ہم شاید کسی درخت میں چھپے ہوے ہوں۔ لیکن صریحًا انھیں یہ خیال ہی نہیں آیا۔ میرا یقین یہ ہے کہ اگر ان میں اتنی عقل ہوتی کہ اپنے ساتھ چند دیسی لے آتے تو ہمارا یہ معمولی سا عقدہ کھل گیا ہوتا۔ لیکن ہماری خوش قسمتی سے ان اتحادیوں میں رقابت و بدظنی کے جذبات خوب بھڑکے ہوے تھے۔ اور اسی وجہ سے مارٹینز صریحًا اس کام کے اپنے ہی آدمیوں سے سرانجام پائے جانے پر تلا ہوا تھا۔ سارا دن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سپاہی ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے افسروں کے حکم سے مجبور ہو کے چل پھر رہے ہیں لیکن انکے دل کہہ رہے تھے کہ ہمارا یہ کام بے نتیجہ اور فضول ہے۔ اور صرف یہ کہنے کے لیے بیدلی سے اسکو کیے جارہے تھے کہ ہم نے کچھ نہ کچھ کام کیا ہے۔ وقتًا فوقتًا ہمیں انکی گفتگو کہیں کہیں سے سنائی دے جاتی تھی لیکن اس کا مضمون وہی ایک تھا۔ یعنی مارٹینز کی خفگی کا خوف یہ خیال آرائی کہ وہ اب کیا کرے گا؟ اور ما فوق العادۃ باتوں کے گمان اور تذکرے۔

دن آہستہ آہستہ گذر رہا تھا۔ اس دفعہ میٹو نے ایک لحظے کے لیے بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی جرأت نہیں کی۔ کیونکہ پتوں کی ذرا سی حرکت سے ان کی توجہ کا اس طرف ہوجانا ممکن تھا۔ اس حالت میں کہ اتنے تلاش کرنے والے اس انعام لینے کے شوق میں گھوم رہے تھے جسکے متعلق ہمنے ان کو کہتے سنا کہ مارٹینز نے اس شخص کو دینے کا وعدہ کیا ہے جو ہمیں ڈھونڈھ نکالے۔ پہلے روز وہ دو جنگلی پھلوں کے ایک دو گچھے لے آیا تھا لیکن آج ہمیں کچھ بھی نصیب نہ ہوا۔ اور وہ اور میرے والد دونوں بھوک کے مارے بیتاب تھے کیونکہ آج تیسرا دن تھا کہ انکو کوئی قابل ذکر کھانے کی چیز ملی ہو۔ میرے لیے اپنی اس کمزوری کی حالت میں کچھ عرصہ بلا خوراک رہنا غالبًا اچھا تھا لیکن اب اسوقت کہ بخار سے مجھے کچھ آرام تھا مجھے بھی کچھ کچھ بھوک لگنی شروع ہوگئی تھی۔ مجھے پانی نہ ملنے کی ضرور تکلیف تھی۔ کیونکہ دن میں پھر خفیف بخار ہوگیا تھا۔ لیکن خاموش رہنے اور اپنے آپ کو ظاہر ہونے

سے بچانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

جب سورج اُفق کے قریب ہونے لگا تو افسر نے اپنی جماعت کو جمع کیا اور وہ کتوں سمیت پہاڑی کے نیچے اُترنے لگے۔ لیکن بد دلی بخوبی سے ترشح ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ واپس جانا اور ناکام لوٹنے پر ٹارٹینز کی خفگی کا سامنا کرنا نہ چاہتے تھے۔ کسی چال کے امکان کے خوف سے ہم اپنے چھپنے کی جگہ سے نکلنے سے پہلے اُنکو دُور تک چلے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اِسوقت ٹیٹو جلدی سے نیچے اُترا تاکہ اس جگہ کا جائزہ لے اور اندھیرا چھا جانے سے قبل کھانے کی چیز تلاش کرے۔ خوش قسمتی سے اسے کچھ امرود اور جنگلی کیلے اور کچھ دیر بعد روٹی پھل (جنوبی جزائر میں ایک پھل ہوتا ہے جو بھوننے سے روٹی کا معمولی کام دیتا ہے) نظر آگئے۔ اور اُسی وقت اُس نے کھود کے ہمارے لیے گانٹھ دار جڑیں نکالیں جن کا ہلکا میٹھا ذائقہ تھا۔

میں ان میں سے بہت تھوڑا کھا سکا لیکن میرے والد اور ٹیٹو نے خوب مزے سے کھایا۔ اگرچہ یہ کھانا کچھ دلپسند نہ تھا لیکن پہلے روز کے قلیل کھانے سے کہیں بہتر تھا۔

میں احتیاط سے درخت سے نیچے اُتارا گیا۔ اور ہم نے پھر راہِ فرار اختیار کی۔ جب پھر صبح ہوئی ہم پہاڑ کے دامن مین پہونچ گئے تھے۔ ٹیٹو پھر سب سے اونچے درخت پر جو وہاں نظر پڑا سپاہیوں کی نقل و حرکت دریافت کرنے کے خیال سے چڑھ گیا۔ اب اُسے پڑاؤ نظر نہ آتا تھا لیکن خوب کان لگا کے سننے سے وہ یہ اطمینان کر کے اُترآیا کہ ہمیں فی الحال کسی طرح کا خدشہ نہیں ہے۔ خاصکر کتوں کا مطلق خوف نہیں ورنہ اُنکی آوازیں اس وقت صبح کی پُرسکون ہوا میں دُور سے سنائی دیتیں۔

ان حالات میں ٹیٹو نے کچھ دیر دن میں بھی ہمیں اپنی فرار جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اب بھی ہم درختوں کے سائے کے نیچے نیچے نشیب کی سمت میں بڑھے چلے جا رہے تھے حتیٰ کہ تقریبًا گیارہ بجے پانی کے ایک چھوٹے چشمے کے کنارے پر ہم نے ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے والد اور میں لیٹ کے سو گئے اور ٹیٹو پہرہ دیتا رہا۔ جب اُسے کوئی بات اندیشہ ناک معلوم ہوئی تو وہ بھی اپنی باری سے جبکہ میرے والد ایک گھنٹہ بعد جاگ کے اُٹھ بیٹھے لیٹ کے سو گیا۔

اسوقت ٹیٹو نے ہمت کر کے پتوں کی ٹٹی ہولے ہولے ہٹو ڈالی اور میرے زخموں کو دیکھنے لگا

کیونکہ اب اُسے اسی قسم کے اور پتے مل سکتے تھے جن کو وہ دوبارہ لگا سکتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ زخموں کی حالت اچھی ہے یعنی اتنے اچھے تھے جتنی توقع ہو سکتی تھی۔ اور پاؤں کو بھی آرام بتایا اگرچہ میں نے اسے والد سے یہ شبہہ ظاہر کرتے سُن لیا۔ حالانکہ وہ اپنے خیال میں میری حدودِ سماعت سے دور تھا کہ شاید میں پھر پاؤں سے چل پھر نہ سکوں۔ اُس دن ہم پہلی مرتبہ اطمینان سے بات چیت کرنے کے قابل ہوے اور مجھے اپنے والد کی روئداد سننے کا موقع ملا۔ ان کے بچ نکلنے کے ظاہرہ معجزہ کی توجیہ اصل میں نہایت آسان تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیسیوں نے انکے ہاتھ گیلی کچی کھال کی رسی سے باندھنے کی غلطی کی تھی۔ اور رات کے وقت جنگل میں سواری کے لمبے سفر میں اُنھوں نے متواتر زور ڈال ڈال کے اُسکو حتی الامکان کھینچ تان لیا تھا حتیٰ کہ وہ اس میں سے اپنا ہاتھ نکال سکتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے عقلمندی سے اپنے گرفتار کنندوں کو اس سے مطلع نہ ہونے دیا۔ اور اُس پر معمولی دباؤ ڈالے رہنے سے اُن کا یہ خیال قائم رکھا کہ وہ مضبوطی سے کسے ہوے ہیں۔

لیکن وہ اس تمام عرصے میں اپنا موقع تکتے رہے اور جب اُنھوں نے مارٹینز کے خیمے کی زیب دیکھی اور جنگل کو اس کے پیچھے اس قدر قریب دیکھا اُنکو خیال گذرا کہ یہ موقع بچ نکلنے کا تھا جس سے ایک دلیر آدمی بجلی کی سی تیزی سے چلنے والا فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ اُنھیں یہ نظر آتا تھا کہ اسوقت اُنھیں اپنے بچوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے اُنھوں نے اس معاملے میں قدم نہیں اُٹھایا حتیٰ کہ یہ بالکل ظاہر ہو گیا کہ مارٹینز اپنی ضد نہیں چھوڑ سکتا۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھے مطلق یہ توقع نہ تھی کہ مجھے ایک منٹ کی بھی مہلت مل جائے گی۔ قبل اسکے کہ میرا تعاقب کیا جائے اور مجھے یہ کُل معاملہ پُریاس و حرمان اور جان پر کھیلنے کا معلوم دیا۔ لیکن اور کچھ کرنے دھرنے کی کوئی صورت بھی نہ تھی۔ اور چونکہ یہی ایک صورت تھی اس لیے میں نے اسی کو اختیار کیا۔

جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں یہ تمام واقعہ کچھ ایسا خلافِ توقع تھا اور ایسی کچھ ایسی ہڑبونگ اور ابتری پھیلی کہ اُنھیں واقعی پانچ منٹ کی مہلت مل گئی اور اُنھوں نے اس وقفہ کو رائیگاں نہ کیا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ دوڑ کے اُن آدمیوں کو جن کے پاس گھوڑے تھے تھکانے کا ارادہ ایک خیالِ خام تھا۔ اس لیے شروع ہی سے اُنھوں نے دوڑتے ہوے چھپنے کی جگہ تلاش کی

تعاقب اکثر انکے قریب تر پہونچ پہونچ گیا اور چھ مرتبہ اُن کا پتہ قریب قریب چل گیا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنا پیچھا کرنے والوں کی آنکھوں میں خاک ڈال ڈال کر بچ نکلے - اور کچھ دیر بعد درخت پر چڑھنے کا خیال اُنھیں اس طرح آیا کہ انکے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلنے سے چند بندر چونک کے فوراً درخت پر چڑھ چڑھ کے آن واحد میں بالکل غائب ہو جاتے تھے - حالانکہ وہ ان سے صرف چند ہی گز کے فاصلے پر ہوتے تھے -

انھوں نے خیال کیا کہ اگر یہ ایسا کر سکتے ہیں تو یقیناً آدمی بھی اسی طرح کر سکتا ہے - چنانچہ متجسس سپاہیوں کے دوبارہ آنے سے پہلے ایک بڑے درخت میں اُنھیں نشیمن مل گیا - جب سپاہی دوسری مرتبہ گذرے چلے گئے اور انکو خیال گذرا کہ وہ اسوقت تو محفوظ ہیں انھیں ایک حبشی نظر آنے سے بڑا وہم ہوا جو جنگل مین دبے پاؤں صریحاً کسی چیز کی تلاش میں پھر رہا تھا - اُنھیں بڑا ڈر تھا کہ ان ہی کی تلاش میں نہ ہو -

دراصل یہی معاملہ تھا کیونکہ یہ وفادار ٹیٹو تھا جسے جھونپڑی پر حملہ کی خبر مل گئی تھی لیکن محاصرہ کرنے والے دیسیوں کے گھیرے نے اسے اس تک پہونچنے سے روکے رکھا - وہ نواح مین اس امید سے چھپا کھڑا رہا کہ شاید کوئی پہلو اپنے آقا کو مدد دینے کا نکل آئے - اُس نے اُسے گرفتار ہوتے دیکھ لیا تھا - اور ساری رات اس گروہ کے نقش قدم پر دوڑا چلا آیا تھا - اس نے اپنے آپ کو جنگل کے کنارے میں پوشیدہ کر لیا - اس نے اپنے آقا کو بچ نکلتے اور جیرلڈ کو مرتے دیکھ لیا تھا اور جو کچھ مجھ پر بیتی کچھ تماشا اس کا بھی وہ دیکھ چکا تھا - وہ اس حالت میں کہ سپاہی ابھی جنگل ہی میں تھے اپنے آقا کے پاس پہونچنے میں خطرہ محسوس کرتا تھا - کیونکہ انھوں نے ایک قسم کی وسطی جائے اجتماع اُس درخت سے بالکل قریب جو والد نے اپنے چھپنے کے لیے منتخب کیا تھا معین کر لی تھی جہاں انکی مختلف ٹولیاں آ آ کے جستجو کے نتیجے سے مطلع کرتی تھیں -

سپاہیوں کے بالآخر ہٹ جانے کے بعد وہ اُترا اور جنگل کے اس حصے میں اپنے آقا کی تلاش میں ادھر اُدھر پھرنے لگا اور اگرچہ اُن کا اسے مطلق پتہ نہ چلا وہ خود انھیں نظر آگیا - اور جیسے ہی میرے والد کو اسکی صورت کا بخوبی اطمینان ہو گیا اُنھوں نے اسے پکارا - اسکے ملنے کی خوشی جیرلڈ کی دردناک موت کی خبر نے جو ٹیٹو نے اُنھیں پہونچائی مکدر کر دی - پھر انھوں نے مشورہ

کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے - اور فیصلہ کیا کہ اگرچہ اس بات سے دل پاش پاش ہوا جاتا تھا کہ وہ دن کے وقت کچھ بھی نہیں کر سکتے لیکن اگر میں شام تک زندہ رہ گیا تو اُنھیں رات کو بچا لینے کی اُمید کی جھلک نظر آئی جیسا کہ حقیقت میں اُنھوں نے کیا بھی -

میں نے بھی اپنے بھائی کی روح کا واقعہ سنایا اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ٹیٹو کو اس کا بالکل یقین آ گیا - کیونکہ اُس نے کہا "بچہ جیرلڈ دنیا میں ایک فرشتہ تھا اور اب بھی یقیناً وہ فرشتہ ہی ہے - اور خدائے برتر اپنے فرشتوں کو مصیبت زدوں کی امداد کے لیے بھیجتا رہتا ہے۔"

میرے والد کو اس قسم کا کوئی عقیدہ نہ تھا - اُن کا دل صرف اسی قدر قبول کر سکا: "بیٹے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں - لوگ یہ ضرور کہتے ہیں کہ خدا اپنے نیک اغراض کے لیے بعض اوقات مُردوں کو دُنیا میں آنے کی اجازت دیتا ہے - چنانچہ سیموئیل اور عین دور[1] جادوگرنی کی حکایت موجود بھی ہے - اور ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض اولیا دوبارہ زندہ نمودار ہوئے ہیں - کچھ بھی ہو - خواہ جیرلڈ وہاں آیا ہو یا نہ آیا ہو - ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ خدا ہی نے تمھاری تسلی کے لیے یہ خوابِ بیداری تمھیں دکھایا کیونکہ یہ عین وقت پر تمھیں نظر آیا اور اس سے تم میں جب تک ہم تمھیں بچانے کے لیے پہونچیں برداشت کی قوت آ گئی -

اپنے فرار کا باقی ماجرا بالتفصیل مجھے سنانے کی ضرورت نہیں - اُس وقت کے بعد سے ہم دن میں سفر کرتے اور رات کو آرام کرتے - میرے والد اور ٹیٹو باری باری پہرہ دیتے - رفتہ رفتہ اپنے اس پہاڑ کے دوسری طرف اس کی تلہٹی کے گرد ہوتے ہوئے ہم نیچے آ گئے تھے - اُس وقت ہم نہایت حزم و احتیاط سے قدم اُٹھاتے تھے - مبادا ہماری مارٹنیز اور اُس کے لشکر سے مڈبھیڑ ہو جائے لیکن خوش قسمتی سے ہم کو اُن میں سے کوئی نظر نہیں آیا - ہم روزانہ خوراک کے طور پر کچھ نہ کچھ ڈھونڈھ نکالتے - اگرچہ یہ میوہ اور جڑوں ہی پر مشتمل ہوتا تھا -

---

[1] جب فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کی لڑائی ہوئی تو ساؤل فلسطینیوں کی جمعیت دیکھ کر گھبرا گیا - اُس نے اپنے امرا سے کہا کہ کوئی عورت ایسی تلاش کرو جس کا یار دیو ہو - درباریوں نے بتایا کہ عین دور میں ایسی عورت موجود ہے - چنانچہ ساؤل اسکے پاس گیا - اس عورت نے ساؤل کی حسب خواہش سموئیل کی روح کو بلایا جس نے ساؤل کو بتایا کہ خدا تم سے ناراض ہے اور تو فلسطینیوں کے مقابلے میں پامال ہوگا - چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا - محمد ظفر

مجھے سب سے بڑا غم یہ تھا کہ اس تمام عرصہ میں میں دوسروں کے لیے بار گردن بنا ہوا تھا کیونکہ میں ایک قدم بھی چل نہ سکتا تھا - اسی وجہ سے ہماری رفتار اس قدر سست تھی - شاید یہ وجہ ہو کہ کم خوراک اور کھلے میدان کی زندگی میرے زخموں کے اندمال کی واقعی بہترین صورت بن گئی ہو - ٹیٹو بڑے مزے میں تھا لیکن میرے والد کو جنھیں انگلستان میں دق کی کسک ہوگئی تھی تبدیل آب ہوا و لباس کی جس کے وہ عادی تھے کمی نے بڑا نقصان پہونچایا - کیونکہ اُنکے جسم پر گندے پرانے پونچو کے سوا جو اُنھیں دیا گیا تھا اور کچھ نہ تھا - گو یہ پونچو اب گندہ نہ رہا تھا کیونکہ ٹیٹو نے اسے ایک چشمے میں خوب دھو دیا تھا - ٹیٹو اس لحاظ سے کچھ بہتر تھا - کیونکہ اُسکے جسم پر قمیص اور لٹھے کا پاجامہ تھا جو وہ حملے کے وقت پہنے تھا - اور میں تو سراسر بری حالت میں تھا کیونکہ میرے جسم پر کچھ بھی نہ تھا !

میرا خیال ہے کہ گیارہویں دن کچھ اُٹھتی جگہ سے ہمیں ایک مکان کی چھت نظر پڑی - فوراً ہم اُسی طرف چل کھڑے ہوے - پھر میں اور والد چھپ گئے اور ٹیٹو جانچتا جائزہ لیتا آگے چلا - وہ گھر ایک دہقانی کا مکان نکلا - اور جیسے ہی وہ مالکِ مکان کے سامنے پہونچا اور اپنی رام کہانی سنائی اس نیکدل شخص نے بڑے تاسف کا اظہار کیا - اور وہ ٹیٹو کے ساتھ یہ دیکھنے کے لیے دوڑا ہوا چلا آیا کہ ہماری کیا مدد کی جا سکتی ہے ؟

اس لمحے سے ہماری تکالیف کا زمانہ ختم ہوگیا - ہمارے قابل دوست اور اُسکی نہایت مہربان بیوی نے ہمارے ساتھ نہایت خاطر مدارات کا برتاؤ کیا - یہ نیکدل بی بی میری حالت پر بڑی کڑھتی تھی - گو اب میں قدرے رو بصحت تھا اور میں نے بستر پر جانے اور اپنے پاؤں کو نسبتاً کم دقیانوسی طریقے سے دھلوانے اور بندھوانے پر اصرار کیا - جب میری سرگذشت مفصل طور سے انکے سامنے بیان کی گئی تو مارٹینیز کے وحشیانہ سلوک پر وہ بڑے زور و شور سے نفرین کرنے لگے - ہمارا میزبان جو بہت سے دیگر دیہاتی کوٹھی والوں کی طرح سال کا بڑا حصہ اپنی مِلک پر گوشہ نشینی کی حالت میں بسر کرتا تھا - مارٹینیز کی اس نواح میں موجودگی سے بالکل بے خبر تھا - دو یا زیادہ مہینے میں وہ عموماً اپنا ملازم یا بیشتر دو یا تین ملازموں کی ٹولی نیچے بندرگاہی قصبے میں اگر اسکے خطوط ہوتے اُنکو لانے اور اُن چیزوں کے ذخیرے کے خریدنے کے لیے جو اسکی جائداد میں میسر نہ آتی تھیں بھیجا کرتا تھا -

ہمیں یہ خیال کرنے کا کہاں ہوش تھا کہ ہمارے فرار کے ایام میں کیا واقعات رونما ہورہے ہوں گے - ہمیں تو یہ اندیشہ تھا کہ مارٹینیز نے بیخبری میں شہر جا لیا ہوگا - اس لیے ہمارے میزبان نے اپنے ملازموں کو جمع کیا اور جو خبر ہم لائے تھے اُنھیں سُنائی اور رضاکاروں کی ضرورت ظاہر کی جو ساحل پر جا کے صورتِ حالات معلوم کریں - اسکے بعض آدمیوں نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں جن میں سے اُس نے دو نوجوانوں کو منتخب کیا جسکی وجہ اُس نے یہ بتائی کہ یہ کہنا نا ممکن ہے کہ انکی غیر حاضری میں اس کوٹھی پر کوئی حملہ نہ ہوگا - اور وہ جہاں تک ممکن تھا بڑے سے بڑا محافظ دستہ وہاں رکھنا چاہتا تھا - پھر یہ دونوں جوان نہایت حزم و احتیاط برتنے کی بہت سی ہدایات کے ساتھ روانہ کیے گئے - اور اُنھیں یہ بھی بتایا گیا کہ وہاں پہونچ کے وہ حسب عادت سیدھے شہر میں گھُسے نہ چلے جائیں مبادا وہ باغیوں کے قبضے میں ہو -

ہمارے میزبان نے ہمیں بتایا کہ اگر اُنھیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو وہ ایک ہفتے میں بخوبی واپس آجائیں گے - اور اب ہمارے لیے سوا اسکے اور کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ اپنا وقت اسکے ساتھ بسر کریں - اگرچہ اس نے یہ توقع ظاہر کی کہ اگر ہمیں نیک خبر ملی تو ہم اسکے مکان کو اپنے زیادہ قیام سے زینت بخشیں - ہم نے اُسکے مہمان نوازانہ ارادے کا دلی شکریہ ادا کیا لیکن ہم نے اُسے بتایا کہ میری والدہ کے پاس حتی الامکان جلد ہم سب پہونچ جانا چاہتے ہیں تاکہ اُنھیں معلوم ہو جائے کہ کچھ بھی ہوا ہو وہ اپنے دونوں بیٹوں اور شوہر سے محروم نہیں ہوگئیں - دراصل میرے والد نے ایک خط اُنکے نام لکھ کے اُن دو قاصدوں کے حوالے کردیا تھا - جس میں اپنی سرگذشت کا ایک معمولی خاکہ کھینچ دیا تھا - اور یہ کہ اب ہم صحیح سالم ہیں اور عمدہ ترین لوگوں میں ہیں - ہمارے میزبان نے بھی اُنکو اپنے ایک دوست کے نام چٹھی دی تھی - جو اُس شہر میں ایک معزز عہدہ دار تھا - جس میں اُسے مارٹینیز کی موجودگی کی خبر دی تھی اور اُسے مشورہ دیا تھا کہ اگر پانی سر سے نہیں گذر گیا تو شہر کی فوراً حفاظت کا سامان شروع کردے -

اس خوشگوار ہفتے میں ہماری حالت پہلے سے بہتر ہوگئی - میرے والد کی کھانسی جو اُنھیں تکلیف دے رہی تھی اب پہلے سے کچھ کم تھی - یہ کمبخت دراصل پورے طور سے ان سے نہیں گئی اور آخر چند سال بعد انگلستان میں دق بن کے اُنکی جان لے کے ٹلی - میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ

اگر ہارٹمینز ابلیس سے ہمیں سابقہ نہ پڑا ہوتا اور اسکی حرکات سے میرے والد کو ان تکالیف کا سامنا نہ ہوتا تو وہ کئی برس زندہ رہتے۔ رہا میں۔ اُسوقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری نوجوانی رخصت ہوئی۔ میں چلنے پھرنے کی طرف مائل نہ تھا۔ میں صرف لیٹا ہی رہنا چاہتا تھا۔ میں بیشتر وقت بستر پر ہی صرف کرتا گو ہر روز کچھ دیر کے لیے وہ مجھے بڑی بیٹھک میں اُٹھا لیجاتے جہاں۔ مجھے ایک قسم کی تکیہ دار چوکی پر بٹھا دیا جاتا یا بعض اوقات مجھے باغ میں لیجاتے اور درختوں کے نیچے ایک لمبی جعفری کی کرسی میں لٹا دیتے۔

آخر کار جب قاصد واپس آکے یہ اطمینان بخش خبر لائے کہ شہر کو ہارٹمینز اور اُس کی نقل و حرکت سے ذرا بھی واسطہ نہیں پڑا۔ میں حیران تھا کہ اس خبر سے خوش ہوں یا رنجیدہ۔ ہمارے میزبان کے سرکاری دوست نے اسکے پاس بیس سپاہیوں کا ایک دستہ اُسکی کوٹھی پر حملے کی صورت میں حفاظت کرنے کے لیے بھیجدیا۔ اور اسی سلسلے میں اس نے اس اطلاع پر دلی شکریہ ادا کیا اور مطلع کیا کہ شہر کی مدافعانہ طاقت بعجلت درست کردی گئی ہے اور اندرون ملک میں ہارٹمینز اور اور اُس کی تھوڑی سی سپاہ کا پتہ لگانے کی کوشش کے لیے مخبر روانہ کردیے گئے ہیں۔

ہمارے میزبان اور میزبانہ نے جب تک حملہ ختم ہو اور ہارٹمینز شکست کھائے ہمارے اُنکے ہی پاس ٹھہرے رہنے پر اصرار کیا۔ کیونکہ اُنھیں یقین تھا کہ اس کشمکش کا نتیجہ ہارٹمینز کی شکست کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن میرے والد نے محسوس کیا کہ اُنکی بیوی کے پاس اُن کا موجود رہنا اُن کا فرض ہے۔ اسلیے بہت سے دلی شکریوں کے ساتھ اُنھوں نے اُنکی یہ تلطف آمیز درخواست نامنظور کردی۔ ہمارے دوست نے میرے لیے ایک پالکی بنوائی اور تجویز کی کہ ہمارے ساتھ ساتھ ساحل تک وہی دونوں قاصد جائیں جو پہلے وہاں ہو آئے تھے۔ بعد ازاں اس نے ہمیں سپاہیوں کا نصف دستہ اپنے ہمراہ بطور محافظ رکھنے پر مجبور کیا۔ میرے والد کسی طرح یہ بات نہ مانتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس حالت میں کہ ہمیں ہارٹمینز کی حالت کا مطلق حال معلوم نہیں کوٹھی پر حملے کا اندیشہ تھا۔ اور ایک ایک آدمی اس کی حفاظت کے لیے درکار تھا۔ لیکن اُنھوں نے خوشی سے اُن دونوں جوان نوکروں کے پالکی اُٹھا لے چلنے کی تجویز کو قبول کرلیا اور ساحل پر صحیح سالم پہونچنے کی صورت مین انھیں معقول انعام دینے کا وعدہ کیا۔

ہمارے میزبان نے سپاہیوں کے متعلق اصرار کیا اور آخر کار یہ فیصلہ ٹھہرا کہ ہمارے ساتھ صرف اُن میں سے تین چلیں - اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو خوشدل ہمراہی اور کار آمد رفیق ثابت کیا - جب نوکر پالکی لیکر چلتے چلتے تھک جاتے وہ خود اُسے اُٹھا کے چلتے اور انکو دم لینے کا موقع دیتے - اس طرح انکی وجہ سے آدھا وقت آرام لینے کی بجائے جو کیفیت بصورت دیگر ضرور پیش آتی برابر خاصی رفتار سے ہم چلتے رہے - ان میں سے ایک بڑا چابکدست آدمی تھا - اُس نے ایک تدبیر نکالی جس کی وجہ سے پالکی دو گھوڑوں کے بیچ میں لٹکتی چلتی - اس حالت میں جب ہم ہموار زمین کے لیے قطعے میں آتے تو بہت آسانی اور تیزی سے ہم قدم بڑھائے چلتے - اس طرح ہم سفر کرتے رہے اور کوئی واقعہ ہمیں پیش نہیں آیا - اور آخر کار ہم کوٹھی سے روانہ ہونے کے چھٹے دن اپنے گھر پہونچ گئے -

والدہ ہم سے ملیں - اُنھیں اپنے مرنے والے بچے کا واقعی بڑا غم ہوا لیکن اتنے خوفناک واقعات کے بعد اپنے باقیماندہ بچے اور اپنے شوہر کا جو گو بالکل تندرست تو نہ تھا لیکن سلامت تو تھا خیر مقدم کرنے پر وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھیں - مارٹمینر کے پنجے سے بچ نکلنے کے چھ ہفتے بعد میں زمین پر پانوٗں دھرنے کے قابل ہوا - اسپر بھی مدت تک مجھے بڑی احتیاط سے اور ایک وقفہ میں بہت تھوڑا چلنا پڑتا تھا -

مارٹمینر اور اُس کی تدابیر کا کیا حشر ہوا ہمیں صاف صاف کچھ نہ معلوم ہوا - میری والدہ کا برابر یہ اعتقاد تھا کہ میرے بھائی کے پاجیانہ قتل سے ایک طرح کا خدائی قہر اُسپر مسلط ہو گیا ہے اس لیے وہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہا - میرے والد کا زیادہ تر میلان خیال یہ تھا کہ ہمارے بچ نکلنے سے اُس کا دل ٹوٹ گیا - کیونکہ اُس کی رائے میں ہم ضرور اُسکی موجودگی کا حال ساحلی شہر تک پہونچا سکیں گے - اور اس طرح اُس کی تدبیر خاک میں ملا دیں گے - بہت بعد مبہم سی افواہیں سُنیں کہ اُسکی جماعت میں بدظنی پھیل گئی ہے - اُسکی بیرحمی کے خلاف بغاوتیں ہونے لگی ہیں اور اُسکے آدمیوں میں عام طور سے یہ رائے پھیلی ہوئی ہے کہ اُسکی جرأت اور اقبال مندی اُس سے رخصت ہو گئی ہے - یہ سب کچھ سہی لیکن واقعہ یہ ہے کہ بندرگاہی شہر پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا - اسکی بجائے مارٹمینر اپنے ساتھیوں سمیت اندرون ملک میں غائب ہو گیا اور تقریباً

تین مہینے تک اسکے متعلق کوئی تحقیق خبر نہ معلوم ہوسکی۔

پھر یہ خبر آئی کہ اُس نے ملک کے اندر ایک چھوٹے شہر پر حملہ کیا اور اُن تمام باشندوں کو جنھوں نے اسکی اطاعت کا حلف نہیں اُٹھایا تھا قتل کرکے اُسپر قبضہ کرلیا۔ اور اُسکی قلعہ بندی کردی۔ اس خبر کی تصدیق ہوتے ہی فوجی علقوں میں ہر طرف چہل پہل نظر آنے لگی۔ جو رسالے موجود تھے اُنکو فراہم کرکے انھیں جنگی حلیہ میں کیا گیا اور شہر کی مجلس نے رضاکاروں کے لیے ایک اعلان شایع کیا۔ چونکہ سپاہیوں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے وہ نہایت متفکر تھی کہ آرمینز کو کچلنے کے لایق کافی جمعیت فراہم ہونے میں ذرا بھی تذبذب نظر نہ آئے۔

میرے والد اپنی ریل کی تکمیل میں دیر ہو جانے سے بہت پیچ بجبیں تھے لیکن انھوں نے مزدوروں کی کوئی جماعت مہیا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک آرمینز اور اُسکے دیسی اتحادی قطعی طور پر کسی نہ کسی طرح نپٹ نہ لیے جائیں وہ کسی شخص کی زندگی وہاں جنگل میں خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ جیسے ہی رضاکاروں کا دستہ تیار ہونے کی بھنک اُنکے کان میں پڑی اُنھوں نے میری والدہ کی مرضی کے سخت خلاف فوراً اپنے آپ کو پیش کیا۔ انکی خدمات قبول کرلی گئیں۔ اور انھیں ایک رسالے کی جو تیار ہوگیا تھا میرے خیال میں بالخصوص انکے انگریز ہونے اور انکے بچے کی موت کے دردناک قصے کی وجہ سے کمان دیدگئی۔ اس عہدے کو انھوں نے بڑے شوق سے قبول کیا کیونکہ رضاکار زیادہ تر شریف لوگ تھے جن میں سے بعض پہلے سے اُن کے واقف تھے۔ میں بھی اگرچہ پوری طرح تندرست نہ ہوا تھا اپنی خدمات پیش کرنے میں پیش پیش تھا اور گو میری والدہ میرے سپاہی بھرتی ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھیں لیکن والد کے ساتھ ساتھ سوار چلنے کی اجازت دینے سے وہ انکار نہ کرسکیں۔

آخری باب میں میں آپ کو یہ بتاسکے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا اور ہمیں اس اندرون ملک کی اس مہم میں کیا پیش آیا اپنے قصے کو ختم کرسکوں گا۔

پانچواں باب

انتقام

اب تک جو کچھ پیش آتا رہا میں اُسکے دوران میں ایک لحظے کے لیے بھی اپنے مقصد اپنے بھائی

کی موت کے انتقام میں مارٹنیز کو قتل کرنے کے مصمم ارادے کو نہ بھولا تھا۔ میں نے اس کے متعلق والد اور والدہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ میں نے اسکو ایک قسم کی مذہبی رنگ دی ہوئی بات کی طرح اپنے دل کے مکنون خانوں میں رہنے دیا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس کو سرانجام دینا میرے لیے کیسے ممکن ہوگا اور میرے لیے کب کوئی راستہ نکلے گا۔ لیکن اسکے متعلق کہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا اور میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا مجھے ذرا بھی شبہہ نہیں ہوا۔ اور جب میں نے اس رضا کاروں کے رسالے کی ترتیب کا حال سُنا تو مجھے فوراً محسوس ہوا کہ میرے لیے یہ طریقہ ہے اور قدرت مجھے راستہ دکھا رہی ہے۔ یہ وجہ تھی کہ میں فوراً اس میں شامل ہونے پر آمادہ ہو گیا اور اپنے بھرتی ہونے کے متعلق والدہ کی نارضامندی نے مجھے ذرا بھی پریشان نہیں کیا۔ بلا شبہہ میں نے اُنکی خواہش پوری کی کہ بھرتی نہ ہوا لیکن میں زبردست تیقن سے جانتا تھا کہ یا انہیہ کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکل آئے گی کہ میں اس دستے کے ہمراہ چلا جاؤں گا۔ اور جب چلتے وقت میری والدہ نے مجھے گلے لگایا اور ہر طرح کے خطرے سے بچنے کی احتیاط برتنے کی قسم دلائی تو میں نے اُن سے سکون آمیز تیقن کے ساتھ جس سے وہ بھی متاثر ہوئی ہونگی کہا "اماں! آپ ڈریں نہیں۔ میں آپ کے پاس صحیح و سالم واپس آؤں گا۔"

میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے آپ کو خدائی انتقام کا ایک آلہ یقین کر لیا ہوگا۔ ان تمام ولولہ انگیز موقعوں پر میری نقل و حرکت ایسی تھی جیسے کوئی شخص عالم خواب میں ہوتا ہے۔ اس وقت مجھ پر نیم خواب کی سی کیفیت طاری تھی جو اُس دس دن کی دوڑ دھوپ میں تھی جب کبھی میرے والد اور کبھی ٹیٹو مجھے اُٹھائے لیے چلے جاتے تھے۔ سُدھ کی خبر تھی نہ بُدھ کی، نہ کسی چیز کا کوئی فکر تھا ہر بات برداشت کر رہا تھا کیونکہ میں اس تمام عرصے میں اپنے آنے والے وقت کا منتظر تھا۔ اُس لمحے کا مجھے انتظار رہا جب میرا انتقام عالم وجود میں آجائے گا۔ دل کی یہ کیفیت کچھ عجیب تھی۔ میں مانتا ہوں کہ سقیم حالت تھی۔ میں اپنی صفائی کر رہا ہوں۔ میں تو اپنے دل کی اسوقت کی کیفیت حتی الامکان من و عن بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جب فوجیں باغیوں کی تلاش میں بادیہ پیمائی میں مصروف تھیں میں روزانہ اسی دلی کیفیت کے ساتھ اپنے ٹٹو پر اپنے والد کے برابر چڑھا چلا جاتا تھا۔ کوچ کے ان ایام کی تفصیل نے مجھ پر

مطلق اثر نہیں کیا۔ میرا ذہنی تصور صرف ایک صورت پر جو آرٹمینز کی تھی جما ہوا تھا اور روز افزوں غیر متبدل نفرت سے اُس کا خیال کرتا تھا۔ پھر بھی اتنی نفرت نہ تھی جتنا تقدیر کا پُرسکون تیقن —— یہ علم کہ میں قسمت کا لکھا پورا کردوں گا اور وہ نوشتۂ تقدیر اس ظالم کو قتل کرنا تھا۔

آخرکار وہ دن آگیا جب ہمارے رہنماؤں نے ہمیں بتایا کہ ہم اُس شہر کے قریب ہوتے جا رہے ہیں جس پر آرٹمینز نے قبضہ کرلیا ہے اور ہمیں شام تک اسکے نظر آنے کی اُمید ہے۔ بہرحال آرٹمینز ہمارے لیے تیار تھا۔ وہ ہمارے مقابلے کے لیے باہر بھی نکل آیا تھا اور ہمارے لیے ایک گھات لگا رکھی تھی جس میں ہم فوراً پھنس گئے۔ کیونکہ اس نے ہمارے سلسلۂ راہ کے جنگل میں اپنی سپاہ رکھی تھی اور اس نے ہم پر جبکہ ہمیں اس کی بہت ہی کم توقع تھی شدید ترین آتشباری شروع کردی۔

یہ ہسپانوی امریکی فوجیں آتشباری کی زد میں عمدہ سے عمدہ موقعوں پر بھی بہت مضبوط اور مستقل نہیں رہتیں۔ اسوقت تو اور بھی پتلا حال ہوتا ہے جبکہ آتشباری حادثۃً ناگہانی کے طور پر پیش آئے۔ ہماری فوج کا اگلا حصہ اسکی زد میں متزلزل ہوکے تتر بتر ہونے لگا۔ اسوقت رضاکار فوج کا فائدہ ظاہر ہوا۔ جسکے افراد جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں زیادہ تر پیدائشی شریف لوگ تھے۔ بندوقوں کی آواز سن کے اور اگلے حصے کی بوکھلاہٹ دیکھ کے میرے والد نے اپنے دستے کو للکارا۔ اور ایک لحظے میں ہم استقلال اور تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ باقی رضاکار رسالہ ہمارے ساتھ لگا چلا آیا۔ اس چھوٹے کھلے میدان میں جہاں ہمارے آدمیوں کی اگلی صفیں گولیوں کا نشانہ بن رہی تھیں یا جہاں سے وہ درہم برہم ہوکے بھاگ رہی تھیں گھُسے چلے جانے کے بجائے ہم فوراً دونوں پہلوؤں پر بکھر گئے۔ اور خود جنگل میں لپک کے آرٹمینز کے چھپے ہوئے سپاہیوں پر جا پڑے۔ جن کو اس طرح بغل میں پڑ جانے سے مُڑ کے اپنے آپ کو بچانا پڑا۔

رضاکاروں کے اس حملے نے باقاعدہ فوجیوں کے قدم بھی جما دیے۔ اور وہ بھی چند ہی لمحوں میں اس مقابلے میں شریک ہونے لگے۔ لیکن یہ کوئی باقاعدہ جنگ نہ تھی اور ہمیں صفیں مرتب اور یکجا کرکے لڑنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ یہ دست بدست مقابلوں کے سلسلوں پر مشتمل تھی جو درختوں کے بیچ میں جاری تھے۔ دوست اور دشمن اس بُری طرح گڈمڈ ہو رہے تھے کہ باہم تمیز کرنا عموماً آسان کام نہ تھا کیونکہ اگرچہ رضاکار خوش پوش اور صاف ستھرے نظر آتے تھے لیکن

اکثر سرکاری سپاہی نارٹینر کے پھٹے حال اور غیر منظم بھاڑے کے ٹٹو سپاہیوں سے دیکھنے میں کچھ ایسے اچھے نہ تھے۔

باغی بہادری سے لڑے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنی جانوں کے لیے اور نیز اُن تمام اوٹ پٹانگ خیالی انعاموں کے لیے جن کا نارٹینر نے اُن سے وعدہ کیا تھا لڑ رہے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہی ذی بیقیاس دولت اور قدرت کی جو اُنکی منتظر تھیں داستانوں پر کس حد تک یقین کرتے تھے۔ شاید وہ اپنر کامل طور سے ایمان لے آئے تھے۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر تو ایسے جاہل تھے کہ کسی بات پر یقین کرنے کی بھی تہ بر نہ سمجھتے تھے۔ لیکن بہرحال اُنھیں معلوم تھا کہ شہر پر قبضہ کرنے کے بعد جو قتل و غارت انھوں نے کی حکومت اسکی وجہ سے اینر جو اُسکے ہاتھ آ جائیں ذرا بھی رحم نہ کریگی۔ سرکاری سپہ سالار کو اپنی تعداد کے کثیر ہونے کی اُمید تھی۔ دیسیوں اور باغی رسالوں کو شمار رکھتے ہوئے کسی طرح یقین نہیں آتا کہ اسے تعداد میں کوئی تفوق حاصل تھا۔ لیکن ایسی جنگ میں جو اس بقاعدہ طریقے سے اور ایسے غیر معمولی حالات میں جاری تھی کسی قسم کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

جنگل میں کئی کھلے میدان تھے۔ اس بقاعدہ کشمکش میں میں دو مرتبہ حملہ میں شامل ہوا جسنے ہر دفعہ میدان کو باغیوں سے خالی کر دیا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو لڑائی کا عادی نہ ہو یہ عجیب و غریب تجربہ تھا کہ وہ آدمیوں کے ایک ایسے دستے میں اپنے آپ کو شریک دیکھے جن کا صرف ایک ہی خیال ہو، جو اپنے آس پاس جس چہرے کو دیکھے اُسے مہیب عزم بالجزم سے تنا ہوا دیکھے جن کو سوائے اسکے اور سب ارادے بھولے ہوے ہوں کہ بس دشمن پر ٹوٹ پڑیں اور اُسے پامال کر دیں یا بھگا دیں اور پھر چونک کے حیرت میں ہو کہ کہیں اُسکے چہرے کا بھی تو یہی رنگ نہیں ہے۔ اس کے بعد للکار کی آواز آتی ہے اور جوش میں ترتیب سے حملہ ہوتا ہے اور پھر بندوقوں کی گڑگڑاہٹ یا یا فولاد کی جھنکار آتی ہے۔ دشمن و دوست برابر مُردوں پر سے پھاندتے چلے جاتے ہیں اور یہ بھی خیال نہیں آتا کہ وہ کون ہیں۔ اور صرف ایک خیال ہوتا ہے کہ بڑھے چلو، بڑھے چلو۔ اور پھر میدان جیت لیا جاتا ہے اور ہم ٹھہر کے ایک لحظہ کشتوں کے پشتوں کو دیکھتے ہیں۔ تمام سبزہ گھاس پامال اور خوف آلودہ نظر آتی ہے۔ پھر بھی خوف و گھبراہٹ کا وقت ہے نہ کسی اور بات کا لیکن اب بھی صرف ایک ہی خیال، وہ کہاں ہیں جن کو ہمیں مغلوب کرنا ہے؟ بڑھے چلو، بڑھے چلو۔

کم از کم میرا تو یہی حال تھا - اس لڑائی کے ابتدائی حصے میں اپنے والد کے پہلو میں رہا شروع میں ہی میرا ٹٹو گولی کھا کے میرے نیچے گر پڑا - لیکن میں کود کے الگ ہو رہا اور ایک بے سوار کے گھوڑے کی جیسے ہی وہ میرے پاس سے گذرا لگام میں نے پکڑ لی اور فوراً اچھل کے اسکی کمر پر جا بیٹھا (وہ میرے لیے بہت اونچا تھا) اور پھر اس جدال و قتال کی طرف اسکو پھیر دیا - لیکن ایسا کرنے سے میں ایک لحظے کے لیے اپنے والد سے الگ ہو گیا اور فوراً ان کے پہلو میں نہ پہونچ سکا - چنانچہ میں لڑائی میں گھس گیا اور ہر جگہ اس آدمی کو تلاش کرنے لگا جسکو میں جانتا تھا کہ مجھے ضرور ملے گا - میں سمجھتا ہوں میں نے اپنا بہرہ فرض ادا کیا - مجھے معلوم ہے کہ جہاں کہیں مجھے کوئی باغی یا دیسی ملتا میں اس پر گولی چلا دیتا اور میرا خیال ہے کہ میری کوئی ہی گولی خالی گئی ہوگی -

لیکن تھوڑی ہی دیر میں میرا بڑا گھوڑا بھی ٹٹو کی طرح گر پڑا (میرے خیال میں جب میں اوپر چڑھا وہ زخمی ہو رہا تھا) اور اس مرتبہ میں زمین پر دھم سے جا پڑا - اور مجھے حواس ٹھیک کرنے میں چند لحظے لگے - میری بندوق گرنے سے بگڑ گئی - اس کا کوئی جوڑ ٹوٹ گیا - چنانچہ جب میں نے اسے چلانا چاہا تو نہ چل سکی - میں نے اسے پرے پھینک دیا - اور اسکی بجائے قریب ترین پڑے ہوے ہتھیار کو اٹھا لیا - یہ ایک لمبی برہنہ تلوار تھی جو میرے سامنے زمین پر پڑی تھی - میرا خیال ہے کسی افسر کے ہاتھ سے گر پڑی تھی جو گر کے مر گیا تھا یا محض زخمی ہو کے جنگل میں رینگ کے چلا گیا تھا - میں نے اسکے متعلق سوچنے کے لیے ذرا توقف نہیں کیا - میں نے اس بڑی تلوار کو اٹھا لیا - جو میرے جثے کے مقابلے میں چلانے میں بہت بھاری تھی - اور میں پیدل اس شخص کو ڈھونڈھتا ہوا جسے میں جانتا تھا کہ مجھے ضرور ملے گا پھر چل کھڑا ہوا -

اب اس وقت لڑائی کا نتیجہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگا تھا - ہر جگہ سرکاری فوجیں باغیوں کو برابر پیچھے ڈھکیل رہی تھیں - جن میں سے بہت سے رو بفرار تھے - اس کا بعد میں تذکرہ ہوا اور میں اس پر پورا یقین کرتا ہوں کہ یہ کامیابی بڑی حد تک میرے والد کی شعلہ صفت دلیری کا نتیجہ تھی - رضا کاروں کے دستے کی کمان والا کرنیل لڑائی کے شروع میں بری طرح زخمی ہو کے گر پڑا - میرے والد نے فوراً کمان خود لے لی اور پلٹن کو فتح و نصرت کی منزل پر بڑھاتے لیے چلے گئے - اس دستے میں انکی طرح اور بھی ایسے ہی معمولی درجے کے لوگ تھے لیکن کسی نے انکی کمان لینے پر

ایک لحظے کے لیے بھی قیل وقال نہیں کی۔ ان مقامات میں انگریزوں کی بہادری اور جنگی قابلیتوں کی بڑی منزلت کی جاتی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ انکے لیے ایک انگریز کا اقتدا کرنا مقتضائے فطرت تھا۔ کچھ بھی ہو اُنھوں نے انکی پیروی کی اور گو میرے والد ایک مدنی آدمی تھے اور انکو فوجی معاملات کا کوئی تجربہ بھی نہ تھا لیکن انھوں نے غیر متزلزل جرأت و تہور سے سپہ سالاری کی اور وہ اُنھیں فتح و نصرت تک اُنکی رہنمائی کرتے لے گئے۔ اگر انھیں جنگی چالون کا علم نہ تھا اور واقعی اُنکو ہوگا بھی نہیں تو مضائقہ نہیں۔ جنگل کی اس عجیب و غریب دست بدست لڑائی میں مقابلۃً اس کی کچھ چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ اس جگہ ذاتی دلیری اور تہور کا کام تھا۔ اور یہ دونوں اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

میری توانائی میں ابھی بہت کچھ کسر تھی اور میں لڑائی میں چند گھنٹوں سے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔۔۔۔ اور لڑائی دنیا کی سب سے زیادہ تھکا دینے والی چیز ہے تاہم مجھے تھکنے کا مطلق خیال نہ تھا اور نہ تھکن محسوس کرنے کی فرصت تھی۔۔۔۔۔ کیونکہ کوئی احساس کوئی خیال ایک لحظے کے لیے بھی میری توجہ اس تیقن سے متزلزل نہیں کر سکتا تھا کہ خدا میرے لیے کوئی انتقام کی صورت پیدا کر دے گا۔ میں دیر تک مارٹنیز کو ہر جگہ ڈھونڈھتا رہا اور محض اسی باطنی تشفی کی وجہ سے میں نے ہمت نہیں ہاری۔ لیکن مجھے کامل طور سے معلوم تھا کہ وہ مجھے ضرور ملے گا اور یہ تمام سہم جنگ محض پیش خیمہ ہے۔ میں نے ایک لحظے کے لیے بھی تامل نہیں کیا نہ ایک لمحے کے لیے مجھے کچھ شک ہوا۔ اور آخر کار وہ مجھے نظر آگیا۔

وہ ایک بڑے درخت کے نیچے اُس سے اپنی کمر لگائے کھڑا تھا اور دو سرکاری سپاہی اس پر حملہ کر رہے تھے۔ اس وقت تک یہ چھوٹی سی جماعت سب سے الگ معلوم ہوتی تھی۔ شاید مجھے ہی وہ الگ نظر آتے تھے کیونکہ میں صرف ایک ہی صورت کو دیکھ رہا تھا۔ بایں ہمہ میرے خیال میں یہ صحیح ہے کہ ارد گرد چند گز تک مُردے ہی مُردے پڑے تھے۔ دونوں سپاہی بڑی دلیری سے ٹوٹے پڑتے تھے اور وہ اُسی تلوار سے مقابلہ کر رہا تھا۔۔۔۔۔ وہی تلوار میں نے نفرت و حقارت سے جس کا میرے جسم میں اُبال اُٹھ رہا تھا خیال کیا وہی تلوار جس نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا۔ لیکن وہ ابتدائی زمانے میں فوج میں بہترین شمشیر زن مشہور تھا بعض کہتے تھے

کہ جنوبی امریکہ بھر میں وہ بہترین شمشیر زن تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے حملہ آور سپاہیوں میں سے ایک اُس کے قدموں میں جا رہا اور اُس کے بعد فوراً ہی دوسرا۔ اور وہ اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اُسکی آنکھوں سے لڑائی کی روشنی جھلک رہی تھی۔

اور پھر ——— اس نے جیسے ہی میں اُس کی طرف لپکا مجھے دیکھ لیا۔ اُس کا چہرہ متغیر ہوگیا اور اُس پر ابلیسانہ نفرت کی جھلک چھا گئی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسکے ساتھ ہی خوف بھی ٹپکنے لگا۔

وہ ڈونکا "ایں! کیا تو بھی یہاں ہے؟ تیری ہی وجہ سے میری شامت آئی۔ تیری۔ تیرے لعنتی باپ اور بھائی کی بدولت!"

میں نے جواب دیا "ہاں، میں بھی آگیا ہوں اور میں تجھ کو قتل کروں گا"

میں سیدھا اُس پر پل پڑا۔ میں اُسکو دُور سے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن میں اسکو تلوار سے مارنا چاہتا تھا جس طرح اُس نے جیرلڈ کو مارا تھا۔ میں نے اسکی آنکھوں سے خوف بھانپ لیا تھا۔ مجھے اس کا قطعی یقین ہے۔ لیکن اب وہ یہ دیکھ کے کہ میں صرف ایک بھدی پرانی تلوار سے مسلح ہوں اور وہ خود ایک زبردست تلوار بھتے حقارت کی ہنسی سے میری طرف متوجہ ہوا۔ آنِ واحد میں ہم گتھم گتھا ہوگئے۔ میں نے مدرسے میں کچھ پہلوانی سیکھی تھی لیکن اس نازک وقت پر اُسکے کچھ کارآمد ہونے میں مجھے کلام تھا۔ میں عقل و طبیعت سے لڑ رہا تھا علم و تجربے سے نہیں۔ باینہمہ میں واقفیت سے بڑھ چڑھ کے لڑ رہا ہوں کیونکہ جو بھاری تلواریں باہم بار بار ٹکراتی تھیں وہ وہ میں اُس کی آنکھوں میں ایک تغیر دیکھتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فاخرانہ خبث باطنی جاتی رہی ہے اور پیہم خوف مترشح ہونے لگا۔ کیونکہ شاید کسی عجیب غیر متوقع طریقے سے وہ فوراً مجھے مار کے گرا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اُس نے مجھے اپنی توقع کے خلاف قریب قریب اپنا مقابل پایا۔

میرے خیال میں وہ مجھ سے کچھ لمبا نہ تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ ٹھنگنا آدمی تھا۔ لیکن اُسکی دسترس طویل تھی اور ہتھیار سے اس کی کامل واقفیت کا مقابلہ ہی کیا ہو سکتا تھا۔ میری ہمت پہلے کی طرح غیر مغلوب تھی لیکن میرا بازو شل ہوتا جا رہا تھا اور اُسکے بجلی کے سے تابڑ توڑ واروں اور چوٹوں کو رد کرنے کے لیے اس بھاری تلوار کے عین وقت پر اُٹھانے میں مجھے نہایت شدید محنت اور مشقت اُٹھانی پڑتی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ بھروسے کے ساتھ میری تلوار کے قبضے پر

چوٹ لگا کے توڑ رہا تھا اور اگر واقعی قبضہ ٹوٹ گیا تو بس میرا خاتمہ تھا۔ آخر کار زبردست واروں کی بوچھاڑ کے بعد اُس نے میرے دل پر ایک بجلی کی سی اچانک ضرب لگائی۔ میں نے وار خالی دینا چاہا لیکن میرا تھکا ہوا بازو جتنی جلد اُس کو اُٹھنا چاہیے تھا اُس سے ایک ثانیہ کے خفیف ترین حصے کی دیر سے اُٹھا۔ میں نے تلوار کے پھل کو نیچے کی طرف جھٹک دیا لیکن کافی فاصلہ پیدا نہ کر سکا دل سے جسکو اُس نے نشانہ بنایا تھا ہٹ کے یہ ران کے گوشت دار حصے میں جا لگا۔ پہلوان کی طرح ضرب لگا کے پیچھے کی طرف اُچھلنے پر ہارمینز کا پاؤں درخت کی جڑ میں پھنس گیا اور وہ چاروں شانوں چت جا پڑا۔ اور اُس کی تلوار اُسکے ہاتھ سے گر پڑی۔ طرفۃ العین میں میں کود کے اُس پر جا چڑھا۔ اپنا پاؤں اُس کے سینے پر رکھ کے اپنی تلوار کی نوک اُسکے گلے پر رکھدی۔ وہ رحم کے لیے چلایا۔ شاید میں نے اٹک اٹک کے کیونکہ لڑائی کی زبردست کشمکش سے میرا سانس پھول رہا تھا، کہا "رحم! تو نے کو نسا رحم میرے بھائی پر کیا؟" اور میں نے تلوار کی نوک اُس کے گلے میں گڑو دی۔ پھر بھی وہ رحم کے لیے چلاتا رہا۔ کشمکش کے کسی ابتدائی مرحلے میں کسی طرح میری قمیص کا آنکا پھٹ گیا تھا۔ اور ننھی نقرئی اور آبنوسی صلیب جو میری والدہ نے میرے گلے میں باندھ دی تھی میرے اُسکے اوپر جھکنے کی حالت میں باہر نکل کے لٹکنے لگی۔ اُس نے کہا "رحم! اس مسیح کا واسطہ جسکی مورت تم لگائے ہوئے ہو!"

اس مرتد کی زبان سے جس نے چاہا تھا کہ میں صلیب کو اپنے پاؤں سے روندوں اس بات کو سُن کے مجھے ادھوری سی ہنسی آگئی کہ جس مسیح کی مورت کی یہ توہین کیا کرتا تھا اب اُسی کے واسطے سے اپنی جاں بخشی چاہتا ہے۔ لیکن میں اس بات سے بھی اپنے ارادے سے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

اس وقت تک میرا سانس قائم ہو چکا تھا اور میں نے قطعی طور پر بھونکنے کے لیے اپنا بازو پیچھے ہٹایا کہ اچانک میرا ہاتھ روک لیا گیا۔ ایک مرتبہ پھر میرے پہلو میں میرا بھائی کھڑا ہوا میرے منہ کو التجا کی نظروں سے تک رہا تھا۔ اور ہاتھ کو جو اُس کا انتقام لے چکا ہوتا اپنے ننھے ہاتھ سے پیچھے کی طرف ہٹا رہا تھا۔ کم از کم اس دفعہ یہ کوئی دھوکا نہ تھا کیونکہ ہارمینز نے بھی اُسے دیکھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں وحشت بھری گھبراہٹ دیکھی۔ میں نے اُسکے چہرے کو جب وہ

ڈر کے مارے بڑبڑایا خوف سے پسینے پسینے ہوتے دیکھا۔ لیکن میں نے مرے ہوئے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا۔ میرے بھائی کا ہاتھ میرے بازو پر تھا۔ اور وہ سنجیدگی سے منت و لجاجت سے سفارش کے طور پر میرے منہ کو تک رہا تھا۔ اب میں اُسکے قاتل کو نہیں مار سکتا تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنی تلوار پھینکی اور دل کے عجیب خالی خالی احساس کے ساتھ پیچھے کو ہٹا تو نہایت پیاری اور محبت بھری مسکراہٹ میرے چہرے پر نمایاں ہوئی اور پھر وہ پہلے کی طرح غائب ہو گیا۔ جوں ہی میں پچھڑے ہوئے آرٹمینز سے الگ ہوا اُس نے اپنے لمبے چرمی بوٹ کی ٹانگ میں سے چاقو نکال کے مجھ پر ہٹتے ہوئے بھی چلایا۔ میں خود بخود اُچک کے ایک طرف کو ہو گیا اور قبل اسکے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سرکاری سپاہیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ دوڑتا ہوا آیا اور اُس کی طرف لپکا۔ اُس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا اور اُسے گرفتار کر لیا۔

میں اپنے اس عجیب خالی احساس کی ہی حالت میں مڑا اور خدا جانے کدھر جانے کو تھا کہ انٹی ناہول کا مکروہ چہرہ جھاڑی کے اوپر سے ایک بندوق سے مجھ پر نشانہ لگانے کی حالت میں نظر آیا۔ میری نقل و حرکت علت و غایتہ کے بجائے عقل و طبیعت کی پابند تھی۔ دیرینہ مشق کی سی تیزی کے ساتھ میں نے اپنی پیٹی میں سے طپنچہ نکالا اور سر ہونے کی دو آوازیں آئیں۔ مجھے اپنے دائیں بازو میں ایک سُن کر دینے والا جھٹکا لگا اور طپنچہ اُس سے چھوٹ کے زمین پر گر پڑا۔ قبل اس کے کہ میں بھی اُسکے برابر زمین پر گر پڑوں مجھے انٹی ناہول کی پیشانی میں جیسے ہی وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑا کے گرا ایک ہلکا نیلا، لمحہ بھر نیلا قبل اسکے کہ اُس میں سے خون نکلے، سوراخ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میں بھی گر پڑا کیونکہ میری ران کے زخم سے خون بہہ رہا تھا اور بندوق کی گولی کا دھچکا اسپر مستزاد ہو گیا تھا۔ اس طرح کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے میں بالکل بے خبر ہو گیا۔

جب میں ہوش میں آیا تیرہ و تار رات تھی اور میں کچھ دیر پڑا پڑا تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اب بھی مشکل سے ہوش تھا، اپنی موجودہ حالت کے سوچنے کی مشکل سے طاقت تھی۔ نہ مجھے آیندہ کا کچھ خیال تھا۔ صرف ایک چیز کا مجھے خاص طور پر احساس تھا۔ وہ شدت کی پیاس تھی جو جسم سے بہت سا خون نکل جانے کی وجہ سے لگ رہی تھی۔ میں نے اپنی داستان

کی مختلف منزلوں میں بڑی تکلیفیں برداشت کی تھیں جیسا کہ آپ نے اب تک اندازہ کیا ہوگا لیکن میرے خیال میں اب تک جو کچھ مجھ پر بیتی اس سے زیادہ اس پیاس میں جانکنی نہ تھی جتنی اب اس پیاس میں مجھے معلوم ہو رہی تھی جبکہ میں تاروں کے نیچے بے یار و مددگار پڑا ہوا تھا۔ رات مجھے طوالت میں برسوں بڑی معلوم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی میں چند لحظوں کے لیے بیہوش ہو جاتا تھا اور پھر میں اس یقین کے ساتھ جاگ اٹھتا کہ میں ایک سالم دن سوتا رہا اور اب دوسری رات آگئی ہے اور پھر جب میں تاروں کو دیکھتا تو وہ جہاں کے تہاں نظر آتے تھے۔

مجھے وقت کا مطلق شما... نہ رہا لیکن اس اثنا میں جو مجھ پر صدیوں کی طرح گذر رہی تھی مجھے مبہم طور سے محسوس ہوا کہ چند لالٹینیں قریب آ رہی ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں خوشی سے چونک کے میں نے اپنے والد کی آواز سنی اور اُن کا چہرہ اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ میں نے چلا کے اُن سے پانی مانگا اور آن واحد میں اُنھوں نے میرے لبوں سے ایک بوتل لگا دی۔ اور پھر میرا خیال ہے کہ پیاس بُجھ جانے کی سچی خوشی میں میں دوبارہ بیہوش ہوگیا۔ فوراً ہی میرے زخم باندھ دیے گئے۔ اور مجھے نہایت آہستگی سے میدان سے اُٹھا لے گئے۔

اس جگہ من کل الوجوہ میری داستان ختم ہو جاتی ہے۔ اس تمام ذکر سے کیا فائدہ کہ میں کس طرح آہستہ آہستہ تندرست ہوا اور مجھ میں توانائی آئی۔ ملک کی حکومت نے میرا اور میرے والد کا کس قدر شکریہ ادا کیا اور اس فتحیابی پر جو حکومت نے لجاجت آمیز پیرائے میں زیادہ تر ہماری دلیری کا نتیجہ قرار دی ہمیں کیا کیا اعزاز ملے۔ مجھے ایک ماہ بعد ایک روز کا ذکر کرنے کی البتہ ضرورت ہے جبکہ میں نے ایک انبوہ کے بیچ میں جو لعنت ملامت کی بوچھاڑ کرتا آ رہا تھا کھڑے کھڑے خاموشی سے دیکھا کہ پایۂ تخت کے وسیع کنج میں تارمنیز گولی سے مار دیا گیا۔ نفرت مرنے والے کے چھوتے ہی میرے دل و جان سے بالکل جاتی رہی تھی، قطعی مٹ گئی تھی۔ نہیں، مرنے والے کی نہیں بلکہ زندہ کی۔ کیونکہ میں نے اپنے بھائی کی آنکھیں دیکھی تھیں اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اور مجھ سے اب بھی محبت کرتا ہے۔ اور اس طرح مجھے صبر و سکون آگیا تھا۔ اگرچہ مجھے اس مسرت خیز نوشتۂ تقدیر کا مطلق حال نہ معلوم تھا جس کی بدولت پندرہ برس بعد ایک دوردراز ملک میں میرا بھائی عالم وجود میں آ جائے گا جو مجھے میری زندگی ہی میں دوبارہ ایک نئے جسم میں جنم

دیگی، جو ہم دونوں کو باہم پہچان لینے اور یہ محسوس کرنے کے قابل بنائے گی کہ موت اُن روحوں کو جو سچی محبت کرتی ہوں کبھی جدا نہیں کرسکتی -

محمد ظفر

حلم و ضبط

اور

خیر خواہیِ اسلام کی قابلِ تقلید مثال

فتنۂ مصر تھا اسلام میں پہلا رخنہ — کھل گئیں جس سے فسادات کی راہیں اکبار
آہ وہ دن تھا مسلمانوں میں اور آج کا دن — جب سے اُٹھی ہے میاں ہی میں نہیں آئی تلوار
مصر کی خاک سے شورش کا وہ اُٹھا طوفاں — کہ ہوا کاخِ امارت کا سنبھلنا دشوار
باغی اس طرح ہوے خانہ برانداز چمن — نظر آنے لگے گلشن میں خزاں کے آثار
خانۂ پاک میں محبوس ہوے ذوالنورینؓ — تیرہ بختوں نے کیا قصرِ خلافت کا حصار
کردیا جس نے کنواں وقف مسلمانوں پہ — اُس کو اک بوند بھی پانی کی تھی ملنی دشوار
جیشِ عسرت کا کیا تھا سروساماں جس نے — عسرت اُسکی تھی مُعیں۔ بے سروسامانی یار
کی تھی جس نے حرمِ مصطفوی کی توسیع — تھا نہ اُس بقعۂ پُرنور میں ممکن اُسے بار
جب یہ عقدہ نہ ہوا ناخنِ تدبیر سے وا — در پہ حاضر ہوے اصحابِ نبیؐ آخر کار
عرض کی سب نے کہ اے گلبنِ باغِ اسلام — تیرے جلوے پہ بہارِ چمنِ دہر نثار
خیریت کی نظر آتی نہیں صورت کوئی — شر پہ بے طرح کمر باندھے ہوے ہیں اشرار
دوستوں کو ہے اگر فکر تو بس اتنی ہے — دشمنوں کو نہ پہنچ جائے اچانک آزار
تین باتوں میں سے اک بات گوارا کیجے — ہے یہی مصلحتِ وقت۔ یہی چارۂ کار

یا تو میداں میں رفیقوں کی جماعت لے کر
چلیے اعدا کے مقابل میں برائے پیکار

ورنہ پھر شام میں رہیے کہ ہے جائے محفوظ
میرِ شام آپ کا ہے بندۂ فرماں بردار

یہ نہ منظور ہو تو لیجیے کعبے میں پناہ
کہ وہی ہے حرمِ امن، وہی دارِ قرار

کر چکے عرض جو یہ مشورہ اصحابِ رسولؐ
ہر یا سخ ہوئے وا لعلِ لبِ گوہر بار

کہ دل اپنا کسی تجویز پہ آمادہ نہیں
گرچہ ہمدردیٔ احباب کا ہوں شکر گزار

جنگ ان اہلِ ستم سے نہیں منظور مجھے
کہ ہے خوں ریزیٔ مسلم سے طبیعت بیزار

شام کو جا نہیں سکتا کہ سوادِ طیبہ
ہے مرے غنچۂ خاطر کے لیے صبحِ بہار

داخلِ کعبہ بھی ہو جاؤں تو یہ اہلِ خروج
حرمتِ کعبہ نہ برباد کریں آخرِ کار

ہو کے خاموش اُدھر چل دیے اصحابِ کرامؓ
ختمِ حجت کو ادھر بام پہ آئے سرکار

اپنے احسان جو تھے عالمِ اسلامی پر
کر دیا آپ نے ایک ایک کا ان پر اظہار

جادۂ حق پہ مگر آئے نہ باطل والے
گرچہ تھا آپ کی عظمت کا برابر اقرار

ہو کے مایوس اُتر آئے جنابِ عثمانؓ
تھا مگر حرفِ شکایت نہ زباں پر زنہار

گھر میں اک روز تھے مصروفِ تلاوت حضرت
پشت کا شانہ سے ناگاہ گھس آئے غدار

چار جانب سے کیا پھول پہ کانٹوں نے ہجوم
چار جانب سے کیا نور کا ظلمت نے حصار

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ تھا وردِ لبِ پاک
اسی آیت پہ گرے خون کے قطرے کئی بار

حرمِ خاص بچانے کو بڑھیں نائلہ لیکن
انگلیاں کٹ کے گریں اور ہوئے ہاتھ فگار

مچ گئی دھوم ہوئے قتل امیرِ اسلام
پڑ گیا شور ہوئے ذبح امامِ ابرار

اس قدر ظلم اُٹھائے مگر اللہ رے حلم
لب پر آیا نہ کبھی شکوۂ ظلمِ اشرار

رَحِمَ اللّٰهُ عَلَى الشَّيْخِ أَمِيرِ الْإِسْلَامِ
رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الشَّيْخِ إِمَامِ الْأَخْيَارِ

لَقَدْ أَمْسَى مَثَلًا بَيْنَ كِرَامِ الْعَصْرِ
فِي سَخَاءٍ وَحَيَاءٍ وَوَقَارٍ

جَمَعَ الرَّبُّ لَهُمْ حُسْنَ ثَوَابِ الدَّارَيْنِ
فَلَهُمْ زَهْرَةُ الْأُولٰى وَلَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ

ضیاء احمد ضیائی ایم اے بدایونی

مکاتیب اکبر

بنام

عبدالسلام رفیقی

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب!

سلام مسنون! اس زمانے میں جبکہ ہزاروں سال کے مُردے قبروں سے نکالے جاتے ہیں۔ اگر میں دس بارہ سال کی مُردگی کے بعد پھر زندہ ہوجاؤں تو جائے تعجب نہیں۔ بہت کم اصحاب کو اس امر کا علم ہوگا کہ مجھے اُردو میں حضرت اکبر سے تلمذ تھا۔ چنانچہ اس آوارہ گردی کی حالت میں اُستاد مرحوم کے خطوط میری دلجمعی کا سبب ہوتے رہے لیکن آپ کو میری ایک دوسری تحریر سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ کہ کس طرح اُن خطوط کا مجموعہ میرے ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہ صرف سنہ ۱۹۱۴ء کے تین خطوط باقی رہ گئے ہیں، جن کی نقول مع شان نزول ارسال خدمت کرتا ہوں۔ امید کہ الناظر میں درج فرمائیں گے۔

عبدالسلام رفیقی

---

(۱)

جب مرحوم کی کلیات تازہ طبع ہوئی تو میں نے ایک خط میں عرض کیا تھا کہ فلاں جگہ میرے للعہ باقی ہیں۔ وصول کرکے ایک جلد روانہ فرمائیے۔ جواب مندرجہ ذیل کا خط ملا:

الہ آباد۔ عشرت منزل

۲۱۔ جنوری سنہ ۱۹۱۴ء

مکرمی!

میں نے ایک یتیم لڑکے کو متعین کیا۔ وہ للعہ وصول کرلایا۔ بے وضع کرکے باقی اُسکو دیدیا۔ اُس کی طرف سے دعا اور جزاک اللہ اور میری طرف سے سبحان اللہ سبحان اللہ آپکے

لٹریری مذاق اور قدردانی پر - خدا خوش رکھے کاموں میں برکت دے - رسید لکھیے اور اپنی خیریت - آپ کی اُردو بہت کھری[1] ہے روانہ کرتا ہوں ایک پیکٹ ہر دو جلد کلیات کا رجسٹری کرا کے روانہ کرتا ہوں -

[1] میری کشمیریت کے لحاظ سے - رفیقی -

اکبرحسین

(۳)

عرض کیا - کہ بعض میرے اُردو مضامین پر بھی نظر اصلاح ڈالی جائے - وغیرہ - جواب آیا:-

الہ آباد - ۱۵ - مارچ ۱۹۱۴ء

مکرمی! آپ اللہ کے نیک بندوں میں ہیں - مذاق بھی نہایت بلند - اور ارادے بھی بہت نیک - اس کی جزا آخرت میں پائیے گا دنیا تو کچھ نہیں - مجھ پر جو حوادث گذرے اُنھوں نے بالکل دل شکستہ کر دیا - دُنیا سے بالکل بے تعلق ہو گیا ہوں - خدا کی یاد ہے انتظار اجل ہے اور تنہا ہوں - اللہ تعالیٰ آپ کو فراغ خاطر عطا فرمائے - یہ بڑی نعمت ہے - لیکن کم ملتی ہے - اسلامی درس گاہوں میں تو اسوقت ہندوستان میں میری نظر میں مدرسہ دیوبند ضلع سہارنپور سے بہتر کوئی مدرسہ نہیں ہے - وہ لوگ خدا پرست - باادب - قانع اور طاعت گزار ہیں

. . . .

مجھ کو خود کیا آتا ہے - لیکن کبھی کوئی مضمون آئے گا تو دیکھ لوں گا - زندگی شرط ہے - آپ کو ضرورت ہی کیا ہے - اللہ پر بھروسا رکھیے - اُسکو یاد کر لیا کیجیے - دنیا کی زندگی فانی ہے - بات کی بات میں گذر گئی - اور گذر جائے گی -

خاکسار دعاگو سید اکبرحسین

(۴)

[illegible] کا ابتدائی زمانہ تھا - میں دنیا کے ایک مشہور شہر کے ایک دلکشا باغ میں بیٹھا ہوا ایام بہار کی آمد آمد کے دن گزر رہا تھا کہ خیال مسلمانوں کی حالت کی طرف گذرا - اس باغ میں سوائے میرے اس موقع پر تمام حاضرین یوروپین یا امریکن تھے - ان لوگوں کے حالات ترقی اور مسلمانوں کے تنزل کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا - بعد غور اس نتیجے

پہ پہونچا کہ اگر ہم میں بجائے قول کے عمل ہوتا تو یہ درگت نہ ہوتی ۔ سب کچھ ہمارے ہی
قامت ناساز کا قصور ہے ۔ بے اختیار غالب کا مصرعہ زبان پر آگیا کہ

"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

چند منٹ میں مندرجہ ذیل قطعہ موزوں ہوگیا :-

میں نے کہا یہ اُس مس یورپ سے ایک دن — اے تو کہ زندہ کرتی ہے مُردوں کو دیکھ کر
اعجاز عیسوی ہے تری بات میں نہاں — ہے سامری کا فن تری آنکھوں سے جلوہ گر
الطاف تیرے عام نوازش تری وسیع — مسلم پہ بھی کبھی تو عنایت کی ہو نظر
کہنے لگی وہ ہنس کے کہ غالب ہیں کہہ گئے
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سب سے پہلے میں میں یہ نظم میں نے استاذ مرحوم کی خدمت میں روانہ کی ۔ جسکے جواب
میں مندرجہ ذیل عنایت نامہ موصول ہوا :-

الہ آباد ۔ ۱۲ مئی ۱۴ء

مکرمی ! آپ کی رائے نہایت صحیح ہے ۔ اور آپ کی نظم ایسی اچھی اور دلکش ہے کہ میں بہت
خوش ہوا ۔ میرا مطلب قناعت اور آخرت اور عبادت کی طرف متوجہ کرنا ہے ۔ دنیا کی حکومت
اور عیش کی طلب میں عمر کو کھونا اچھا نہیں ۔ غافلوں اور متکبروں اور خدا کے نہ ماننے والوں
سے بیزاری ہے اور تقلید اور نقل فضول سے احتراز ۔ اگرچہ شاعرانہ رنگ ایشیائی بھی کچھ ہے ۔
اور کہیں ظرافت بھی ہے ۔ لیکن اصل مقصود وہی ہے جو عرض کیا ۔ آپ کل کتاب کو تھوڑا تھوڑا
بغور دیکھیں ۔ بالخصوص اول حصہ اور آخر کے ضمیمے تو آپ کو کچھ معلوم ہوگا کہ میرا میلان خیال
کیا ہے ۔ ایک غزل ہے چنگیز ہے تو پھر کیا، انگریز ہے تو پھر کیا ۔ اسکے جملہ اشعار کو بغور ملاحظ
فرمائیے گا ۔

موجودہ گروہ مسلم بلحاظ اپنے مذاق طبیعت اور اعمال کے بلا شبہ کسی طرح دربار فطرت
[redacted] انتخاب نہیں ہے ۔ آپ کی رائے بہت صحیح ہے ۔ لیکن میں آپ کو داد اسی بات کی
دیتا ہوں کہ وہ رائے کیا عاشقانہ اور لطیف پیرائے میں ظاہر کی گئی ہے ۔

آپ کا خوب مشرب ہے - جو اللہ کا وہ میرا - خدا آپ کو ترقیات ظاہر و باطن عطا فرمائے -
میں اب دُنیا سے سیر ہو گیا ہوں - خدا عاقبت بخیر کرے -

میں تو مساکین اور یتامیٰ اور بیواؤں کو بہت قابل رحم و امداد قرار دیتا ہوں اور وہ ہر جگہ ہیں - البتہ ذوی القربیٰ یعنی محتاج رشتہ داروں کو ترجیح ہے -

اکبر حسین

جو اپنی عمر کی گھڑیوں کا اعتبار کرے
تمہارے وعدۂ فردا کا انتظار کرے

شگفتہ دل کو اگر وہ نگاہِ یار کرے
مری خزانِ تمنا کو نوبہار کرے

نفس کی آمد و شد ایک دم کا قصہ ہے
کوئی شمار کرے بھی تو کیا شمار کرے

ترے خیال کو آنکھوں سے کیا عداوت ہے
کہ ایک دم کو بھی آئے تو اشکبار کرے

وہ نشہ ہی نہیں جس میں نہ کیفیت غفلت ہو
وہ درد ہی نہیں جو دل کو بیقرار کرے

ہے میری زندگیِ مستعار ہی کتنی
جفا سے یار کو لازم ہے اختصار کرے

نہاں ہے اُنکے تبسم میں ریشخندِ خزاں
گلوں پہ فخر نہ اس درجہ نوبہار کرے

رہے گی پھر وہی سوزش اگرچہ دیدۂ تر
جگر کی آگ کو ٹھنڈا ہزار بار کرے

تمہاری آنکھ کو جب تحمل اک نظرے بھی ہو
تو کیوں کسی کو وہ ناحق امیدوار کرے

ہماری سوزش پنہاں بھی کیا تماشا ہے
دلِ حزیں سے جو نکلے تو اشکبار کرے

نہ دیکھی جائے گی دولت یہ غیر کی مجھ سے
میں ترک شوق کروں اور وہ اختیار کرے

جسے تڑپتے ہوئے ایک عمر گذری ہو
وہ خو سکون کی اب خاک اختیار کرے

تمہارے وعدۂ فردا سے کب توقع ہے
کہ میرے شوق کو مصروفِ انتظار کرے

مجھے تو ذکر مصیبت سے کام ہے ہادی
وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے

ہادی مچھلی شہری

نقد و تبصرہ

(از "ناظر")

(الف) مذہب

(۱) **فلاح الدارین**، مرتبۂ مولانا عبدالماجد بدایونی، ضخامت ۱۱۳ صفحہ۔ تقطیع ۱۸ + ۲۲۔ ناشر: عثمانی پریس بدایون۔

مولانا عبدالماجد بدایونی کا نام تحریکِ خلافت و فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل چکا ہے، لیکن کم لوگوں کو معلوم ہوگا، کہ موصوف محض ایک اعلیٰ خطیب ہی نہیں، بلکہ سنجیدہ مصنف بھی ہیں۔ اور صاحبِ زبان ہونے کے ساتھ ہی صاحبِ قلم بھی ہیں۔ "فلاح الدارین باتباع سید الکونین" اُنکے افاداتِ قلم کا تازہ ترین ثمرہ ہے، جس میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی دینی و دنیوی فلاح تمامتر، اتباع حضرت سرور کونین صلعم سے وابستہ ہے، اعتقادات، عبادات، اخلاق، وغیرہ سے متعلق احادیث نبوی کو مع ترجمۂ اُردو یکجا کر دیا ہے، کُل احادیث کی تعداد ڈھائی سَو سے اوپر ہے۔

ترجمے کی زبان صاف و سلیس ہے۔ جس قدر احادیث نقل کی ہیں، وہ سب بجائے خود مفید و ضروری ہیں۔ البتہ ترتیب ابواب تھوڑی توجہ سے بہتر و جامع تر بنائی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی قابل گزارش ہے کہ احادیث نبوی کے جو ماخذ درج کیے گئے ہیں، وہ ہر موقع پر مساوی مرتبۂ استناد نہیں رکھتے، مثلاً جہاں بہت سی احادیث بخاری و مسلم سے منقول ہیں، وہاں بہت سی ایسی بھی ہیں جن کی سند احیاء العلوم سے آگے نہیں بڑھتی، اور بعض تو سرے سے بے سند ہیں۔ اُمید ہے کہ طبع ثانی میں ان فروگذاشتوں کی اصلاح پر ضرور توجہ فرمائی جائے گی، کہ حدیث نبوی کی خدمت جس قدر باعثِ اجر ہے، اُسی قدر احتیاط کی بھی محتاج ہے۔

(۲) **عورت اور قرآن** - مولفۂ مولانا عبدالماجد بدایونی۔ ضخامت ۱۰۸ + ۱۸ صفحات تقطیع ۱۸ + ۲۲۔ قیمت ۸؎ ناشر:۔ عثمانی پریس، بدایوں۔

یہ بھی مولانا بدایونی کا ایک تازہ افادۂ قلم ہے۔ موضوع کی تشریح خود کتاب کے نام سے ہو رہی

ہے۔ عورت کی اخلاقی، مذہبی، معاشری، زندگی سے متعلق جو کچھ کلام مجید مین وارد ہوا ہے، ان تمام آیات کو مع ترجمہ اُردو یکجا کر دیا ہے۔ جا بجا حواشی و تبصرہ کا بھی اضافہ کیا ہے۔

عورت کی پیدایش، امہات المومنین، عورتوں پر مردوں کے حقوق۔ مردوں پر عورتوں کے حقوق، مرد و عورت کے تعلقات، نکاح و متعلقاتِ نکاح، محرمات، مہر، طلاق، عدت، خلع، ایلاء، ظہار، قذف، زنا، پردہ، وراثت، ان عنوانات سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ ہوگا۔ پردہ سے متعلق، علاوہ آیاتِ قرآنی کے متعدد احادیث و اقوال انبیاء و اولیا بھی نقل کیے ہین۔

جو لوگ عورت کے بارے میں اسلام کی صحیح تعلیمات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں، اُنکے لیے کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ دَورِ جدید کی خواتین اس کے مطالعہ سے خاص طور پر فائدہ اُٹھا سکتی ہیں بشرطیکہ فائدہ اُٹھانا چاہین۔

زناکاری کے سلسلے میں ایک مختصر آیۂ کریمہ ولا تقربُوا الزنا (بنی اسرائیل ع ۴) فاضل مؤلف سے نظر انداز ہوگئی ہے، جس کے مفہوم پر اگر غور کیا جائے، تو تمام اُن حالات کے سدباب کا حکم جو براہ راست یا بالواسطہ بدکاری و بے عصمتی میں معین ہوسکتے ہیں، قرآن ہی سے مل جاتا ہے۔

(۳) **صحابیات** - مولفہ نیاز فتحپوری۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ تقطیع ۲۰ + ۲۶ - ناشر: صوفی پرنٹنگ پریس، پنڈی بہاءالدین۔ پنجاب۔

جناب نیاز فتحپوری اُردو کی دنیائے ادب مین ایک خاص قسم کی شہرت رکھتے ہین۔ اُن کی یہ تازہ تالیف عین اسی شہرت کے مطابق ہے۔ کتاب فی الجملہ مفید و دلچسپ ہے۔ حواشی ذیلی (فٹ نوٹس) میں مستند کتب حدیث و تاریخ کے حوالے بکثرت درج ہیں۔ شروع میں ۱۵، ۱۶ صفحہ کا ایک مفصل مقدمہ ہے جسکے جزو غالب کو "صحابیات" کے موضوع سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔

اُردو مین صحابیات سے متعلق اس سے پیشتر بھی متعدد تالیفات شایع ہوچکی ہیں، مثلاً اُسوۂ صحابیات (مولانا عبدالسلام ندوی)، سیر الصحابیات (مولوی محمد سعید انصاری)، وغیرہ۔ اور بعض ازواج رسول صلعم کی مستقل سوانح عمریاں بھی چھپ چکی ہیں، مثلاً سیرت عائشہ (مولانا سید سلیمان ندوی) لیکن نیاز صاحب شاید اپنے کسی معاصر کی سعی و محنت کا اعتراف اپنے قلم کے لیے باعث عار خیال فرماتے ہیں۔ کم از کم قلب "نیاز" سے اس "شان" "ناز" کی توقع نہ تھی۔ دوسری کتابین تو اُنکے نزدیک

سرے سے ناقابل اعتنا ہیں، لے دے کے وہ صرف ایک موقع پر سیرت عائشہ کا ذکر فرماتے ہیں، وہ بھی اس وقت جب انھیں ایک اعتراض و گرفت کا موقع ہاتھ آجاتا ہے!

ٹائیٹل خوشنما ہے۔ طباعت، کتابت، کاغذ، درجۂ اوسط۔ بحیثیت مجموعی صحابیات کو پڑھکر ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ گویا سیر الصحابیات کا "نقش ثانی" پیش نظر ہے۔ خدا کرے محض بدگمانی ہو، اور اسکے عقب میں کوئی ناقابل افشا حقیقت مستور نہ ہو۔

(۴) **سوامی دیانند جی کی لائف پر مکمل ریویو** ۔ مولفۂ مولوی قاضی غلام امیر صاحب رئیس و مختار، بدایوں۔ ضخامت ۷۶ صفحہ۔ قیمت ۹ر

فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں آریہ سماج اور اسکی کارروائیوں کے چرچے اکثر مسلمانوں میں رہنے لگے ہیں، لیکن بہت کم مسلمان ایسے نکلیں گے، جو آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند، انکی معاشرت، اور انکے اصول و تعلیمات سے صحیح واقفیت رکھتے ہوں۔ قاضی غلام امیر صاحب بدایونی یقیناً تمام قوم کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے اس فرض کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کردیا۔ پیش نظر رسالے میں انھوں نے عموماً آریوں ہی کی مسلم و معتبر کتب سے ضروری معلومات اخذ کرکے سوامی دیانند کے حالات، سوانح و تعلیمات کا ایک قابل دید مرقع تیار کردیا ہے۔ جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی بہ غایت سنجیدہ بھی ہے۔ شروع سے آخر تک کوئی فقرہ ایسا نہیں، جو فریق مخالف کیلیے دلآزار کہا جا سکے۔ ان کی کتاب نے اردو خواں جماعت کی ایک بڑی ضرورت کو بوجہ احسن پورا کردیا ہے، اور ان کی یہ خدمت ہر پہلو سے ہمت افزائی، داد، و ستایش کی مستحق ہے۔ کتاب کی معنوی خوبیوں، نیز ضخامت پر نظر کرتے ہوئے، قیمت بہت ہی ہلکی ہے۔

(ب) ادب

(۱) **کرشمۂ عشق المسمی بہ تنویر الخیال** ۔ از تصنیف لطیف عوارف و معارف دستگاہ طریقت و شریعت پناہ فائض الفوائز پیر شیر محمد صاحب عاجز صدیقی چشتی نظامی دام اللہ فیوضہ" ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ تقطیع ۱۸ × ۲۲۔ قیمت ۸ر مصنف سے محکمہ خرد، ڈاکخانہ: جلال آباد، ضلع فیروزپور کے پتے پر ملے گا۔

پنجاب کی زعفران زار سرزمین اکثر ارباب ذوق کے ضیافت ادبی کا سامان کرتی رہتی ہے۔

اس سال ان لطف کی تازہ قسط دیوان کرشمۂ عشق کی صورت میں موصول ہوئی ہے، جسکے مصنف، بہ قول خود "شاعر نازک خیال مصور فطرت حضرت شاہ .... " ہیں - اور جسکے سرورق پر انھیں، عوارف و معارف دستگاہ،" طریقت و شریعت پناہ اور سب سے بڑھ کر "فائض الفوائز" کے القاب مجیبہ سے ملقب فرمایا گیا ہے۔

ریویو نگار کے تنقید و تبصرہ سے کہیں بہتر ہو گا، کہ کلام کا کچھ نمونہ، بجنسہ "فایض الفوائز" صاحب کے الفاظ میں نقل کر دیا جائے - زیر خط الفاظ خصوصیت کے ساتھ داد طلب ہیں : -

تصویر تری نور کے سانچے میں ڈھلی ہے　　ایسا تو نہ ہوگا کوئی جانانہ کسی کا
رکھا تھا مرے پاس بھلا اسکے سوا کیا　　دل ہو گیا پہلے ہی سے نذرانہ کسی کا
جب اُٹھا بنیاد سے سرِ حسن کی دیوار کا　　جھک کے چوما اوج عرش نے قدم معمار کا
تیری فرقت میں ہوا یں ملے یہ دیوانہ وار　　دل ہوا وحشت نما ہر کوہ و دشت ادیار کا
بھائی کا بھائی ہو دشمن یار ہی مشکل غیر　　اقتضا ہی بس ہی اس وقت ناہنجار کا
فرہاد شیفتہ ہیں مرے نونہال پر　　کیا کیا بزرگ مرتے ہیں اس خورد سال پر
سیکڑوں بلکہ ہزاروں ہو گئے عاشق شہید　　اُس گلِ رعنا کی جب نکلی سواری رات کو
صدمۂ فرقت سے ہم تو مرمٹے جان جہاں　　آہ دل نے کھینچدی سندیہ آری رات کو
تم عدو کے گھر پڑے او رہم ہوئے پامالِ غم　　ہو سوال وصل پورا ایک باری رات کو
شاد کرنا عاشق بیتاب کا کیا ہے محال　　دیکھ لو بستر پہ آکر ایک باری رات کو
جان لب ہوں ہجر میں مرے ہوئے صاحب فراش　　ہے ثواب آکر کرو تیمارداری رات کو

ایک شعر جو صفحہ ۴۱ پر درج ہے، بہتر ہوتا کہ اسے ٹائٹل پر جلی قلم سے لکھ دیا جاتا ؎

جمع ہیں اس میں خیالات پریشاں عاجز
نام دیوان کا ہے اپنے پریشاں آباد

"عاجز" کا تخلص، بہت ممکن ہے، اس مناسبت سے اختیار کیا گیا ہو، کہ جناب فائض الفوائز صاحب اُردو زبان کے قواعد کی پابندیوں سے عاجز آچکے ہیں۔

(۲) مکاتیب نواب محسن الملک مہدی علی خاں و نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرتبہ

مولوی محمد امین زبیری مارہروی - ضخامت ۱۴۰ صفحہ تقطیع ۲۰ × ۲۶ - قیمت عہ
ہر وہ شخص جو تحریکِ علیگڈھ کی بابت کچھ بھی جانتا ہے، یقیناً محسن الملک و وقار الملک سے بھی واقفیت رکھتا ہے، جن کے اسماء گرامی سرسید کے رفقاء و انصار میں ایک نمایاں و ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ محسن الملک مہدی علی خان کی وفات ۱۹۰۶ء میں ہوئی، اور وقار الملک مولوی مشتاق حسین کی ۱۹۱۶ء میں۔ اور دونوں انیسویں صدی کے ربع آخر سے لے کر اپنے وقت وفات تک اپنی زبردست شخصیتوں کے لحاظ سے اسلامی ہند کے، ایک بڑی حد تک "تاریخ گر" رہے۔ پیش نظر رسالہ ان دونوں حضرات کے بعض اہم و دلچسپ مکاتیب کا مجموعہ ہے محسن الملک بہادر کے خطوط ص ۶۸ تک آئے ہیں، باقی نصف حصے میں وقار الملک بہادر کی تحریریں ہیں۔ جو لوگ دونوں بزرگان قوم کی حیدرآبادی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، یا علیگڈھ کی قدیم تاریخ سے باخبر رہنا چاہتے ہیں، اُنکو یہ رسالہ یقیناً ملاحظہ کرنا چاہیے۔

عام ناظرین کے لیے رسالہ کی دلکشی اور حیثیت افادی بہت بڑھ جاتی، اگر مکاتیب کی ترتیب و تہذیب میں زیادہ سلیقہ مندی سے کام لیا جاتا، مثلاً شروع میں ایک فہرست دینا تھی، ہر خط کے مکتوب الیہ کے نام کی پوری وضاحت کرنا تھی، مختلف تفصیل طلب واقعات کی مختصر توضیح حاشیے پر کرنا تھی، وقس علیٰ ہذا۔ ادبی حیثیت سے رسالہ اب بھی عام ناظرین و طلبہ کے مطالعہ کے قابل ہے۔ وقار الملک مرحوم کے خطوط سے جس اسلامی درد اور سیرت میں عناصر خلوص و صداقت کے غلبے کا اظہار ہوتا ہے، وہ نوجوانان قوم کے لیے اُسوۂ حسنہ کا کام دے سکتا ہے۔

(۴) **نگارستان** - مولفہ نیاز فتحپوری - ضخامت ۲۷۲ - تقطیع ۱۸ + ۲۲ - قیمت ۱۲؍ ناشر: دفتر نگار، بھوپال۔

جناب نیاز فتحپوری کے "مخصوص ادبی رنگ کے مضامین کا مجموعہ" - ۲۱ مضامین پر مشتمل ہے۔ جو مختلف اوقات میں نقاد، کہکشاں، و نگار میں شایع ہو چکے ہیں۔

حضرت نیاز جس "مخصوص رنگ" میں زبان و ادب کی خدمت فرما رہے ہیں، اُس کے اندازے کے لیے ذیل کے فقرے، ترکیبیں، اور عبارتیں کافی ہیں:-

"ایک نور پاش، خراماں پیکر آتش، ... ایک گلابی رنگ میں ڈوبی ہوئی برق متحرک، مجھ میں اپنے

اشارۂ مبہم سے ایک انجذاب مضطر پیدا کر رہی ہے۔ اور میں ہوں کہ اُس قوت مجہول کی طرف کھنچا جا رہا ہوں"

"روشنی کی تیز کرنیں اک موذب فاصلہ پر رو رکے ہوئے تڑپ رہی ہیں" "یہ نزہت با ہستی بصفا ترکیب عناصر، میرے وجود کو، میری روح لرزاں کو مسحور کر رہا ہے، اپنی آنکھوں کے خندۂ سیال سے، اپنے بالوں کی بوئے شگفتگی سے، اپنے خرام وقار سے"

"فی الحقیقت وہ آئینہ سیما لڑکی، اپنی عفت وشرم میں وہ محافظ رکھتی تھی"

"تھوڑا سا دو قوت یقیناً عقل و فراست کا ایک جزو ہے جو ایک ستارہ سے دوسرے ---- ستارہ تک اپنا کام کر رہا ہے۔ یہ خمیر تمام اشیاء میں شامل ہے۔ بیوقوفی کی خاطر عقل تمام چیزوں میں ملی ہوئی ہے"

"نیلے زیر واکے آسمان۔ اب میرے لیے معصومیت یہی ہے کہ یہاں کوئی تار و پو د فراست نہیں ہے، اور یہ کہ تو ہی آلہانہ امکانات کے لیے میرا صحن رقص ہے، اور تیری فضا آلہانہ قمار خانے کی کھلی ہوئی بساط"

جو لوگ اس عجیب و غریب طرز انشاء کو زبان اُردو کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں، توقع ہے کہ وہ اس مجموعہ کی خاطر خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔

(ج) مسائل حاضرہ

(۱) **کنایات**۔ موسوم بہ اسم تاریخی، خیالات جدید مولوی سبحان اللہ۔ مولفہ مولوی سبحان اللہ گورکھپوری۔ مطبوعہ مطبع حکیم برہم، گورکھپور۔ ضخامت ۳۲ صفحہ۔ تقطیع ۱۸ + ۱۲۔ غالباً مفت۔ ڈیڑھ جزو کے اس عجیب و غریب رسالہ کے مؤلف کا اسم گرامی، سرورق پر پوری پانچ سطروں کی عبارت میں مندرج ہے، جس میں سے القاب ذیل خصوصیت کے ساتھ پُر لطف ہیں:-

"از قلم زود رقم" (گویا مصنف صاحب کاپی نویس ہیں!)

"زمانہ شناس"

"ادا نواز سیاست حاضرہ"

"منجملہ منتخب لیڈران ملک و قوم"

"رئیس ابن رئیس اعظم"

رسالہ کے مضامین و عنوانات بیشک انھیں توقعات کے مطابق ہیں، جو ایک "رئیس ابن رئیس اعظم" کے "قلم زود رقم" سے قائم ہو سکتی ہیں۔ بہترین و جامع ترین ریویو جو اس رسالہ پر ہو سکتا ہے، وہ اتفاق سے، جناب مولف کا اسم گرامی ہی ہے، یعنی "سبحان اللہ"!!

(د) فلسفہ

(۱) **ابن رشد** - مولفۂ مولانا محمد یونس مرحوم فرنگی محلی۔ ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحہ۔ تقطیع ۲۰ + ۲۶ - طابع و ناشر:- دار المصنفین، اعظم گڈھ۔ قیمت ہے

اُردو زبان میں ہر سال ایک ہی آدھ کتاب ایسی نکلتی ہے، جسے دوسری علمی زبانوں کی بہترین مطبوعات کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ سال رواں کی مطبوعات اُردو میں تالیف پیش نظر اسی درجے اور مرتبے کی ہے۔

مولانا محمد یونس فرنگی محلی، ملک کے ممتاز عالم، ایک ہونہار مصنف، اور ایک نکتہ رس محقق تھے۔ مختلف رسائل، خصوصاً معارف (اعظم گڈھ) میں انکے متعدد بیش بہا مضامین فلسفیانہ عنوانات پر شایع ہوتے رہے۔ روح الاجتماع کے نام سے ایک فلسفیانہ کتاب کا عربی و انگریزی سے ترجمہ کرکے شایع کیا، عثمانیہ یونیورسٹی دکن میں تفسیر قرآن کے اُستاد ہو گئے تھے، کہ پیام اجل آ پہونچا، اور ۲۶ سال کی عمر میں مرحوم اپنے بدنصیب معاصرین و احباب کو داغ مفارقت دے کر گلگشت جناں میں مصروف ہو گئے۔ ابن رُشد اسی نوعمر فاضل کی تحقیق و کاوش کی آخری یادگار ہے۔

ابن رُشد کا شمار دنیا کے مشاہیر فلسفہ میں ہے، اور کم از کم مسلمانوں کا ایک گروہ تو اسے اپنے ہاں کا سب سے بڑا فلسفی تسلیم کرتا ہے۔ یورپ میں مدتوں اس کی پرستش، بحیثیت شارح ارسطو کے ہوتی رہی۔ اُردو کی بدنصیبی سے، اب تک اس میں اس جلیل القدر حکیم سے متعلق (بجز مولانا شبلی کے ایک مضمون کے) تقریباً کچھ بھی موجود نہ تھا۔ مولوی محمد یونس مرحوم نے اس بڑی ضرورت کو پورا کر دیا، اور اس خوبی سے پورا کیا، کہ بظاہر اب اس پر اضافہ دشوار ہے۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے، ابن رشد کا تذکرہ، ابن رشد کے نظریات، فلسفۂ ابن رشد کی تاریخ

حصۂ اول، ابواب ذیل پر مشتمل ہے - اندلس کی علمی ترقی کی تاریخ، ابنِ رشد کے سوانح زندگی، ابنِ رشد کی سیرت پر تبصرہ - حصۂ دوم، ابواب ذیل کا جامع ہے، ابنِ رشد اور علم فقہ، ابنِ رشد اور علم کلام، ابنِ رشد اور فلسفہ، فلسفۂ ابن رشد پر نقد و تبصرہ - حصۂ سوم میں مباحث ذیل ملتے ہیں، فلسفۂ ابن رشد یہودیوں میں - یورپ میں فلسفۂ ابن رشد کی ترویج، یورپ پر فلسفۂ ابن رشد کا اثر۔

تصنیف کی ابواب و حصص میں اس قدر صحیح، جامع، اور منطقی تقسیم بجائے خود مؤلف مرحوم کی اصابت فکر و نکتہ سنجی کی دلیل واضح ہے - اب چند تحتانی مباحث کے عنوانات ملاحظہ ہوں :۔ اسپین میں مسلمانوں کی حالتِ علمی - ابن رشد کی تباہی کے اسباب، ابن رشد کی تصنیفات، فقہ سے ابن رشد کا تعلق، ابن رشد کے علم کلام پر تفصیلی نظر، ابن رشد اور امام غزالی، ماہیت مادہ و تخلیقِ عالم، ابن رشد کا علم النفس، ابن رشد کا علم الاخلاق و علم السیاسۃ، ابن رشد کے فلسفہ کی غلطیاں، ابن رشد اور ابن سینا، وقس علیٰ ہذا۔

مؤلف مرحوم چونکہ انگریزی و عربی دونوں سے واقف تھے، اس لیے انکے سامنے ابن رشد کے سوانح و فلسفہ سے متعلق مشرقی و مغربی دونوں ماخذ موجود تھے، اُنھوں نے دونوں سے دل کھول کر فائدہ اُٹھایا، اور اس نے اُنکی کتاب کو تبحر و وسعتِ نظر کا ایک زندہ نمونہ بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی وہ چونکہ محض جامع واقعات یا ناقل روایات نہیں، بلکہ خود بھی فلسفی تھے، اس لیے واقعات کی تنقید، اور مسائل کے تبصرے میں، قدم قدم پر اپنی نکتہ سنجی کا ثبوت دیتے گئے ہیں۔

طرز بیان اس قدر صاف و سلیس ہے کہ کسی فلسفیانہ کتاب میں اس سے زائد کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اقتباس ذیل سے نمونہ ظاہر ہوگا۔ مسئلۂ جبر و قدر سے متعلق ابن رشد کے خیال کی تشریح مقصود ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"ارادہ انسان کی ایک کیفیت نفسی ہے، جس کا اقتضا یہ ہے کہ انسان سے کچھ افعال صادر ہوں، لیکن انسان کے ارادے کی پیدایش اُسکے اندر سے نہیں ہوتی، بلکہ اسکی پیدایش چند خارجی اسباب پر موقوف ہوتی ہے، اور صرف یہی نہیں کہ ان بیرونی اسباب سے ہمارے ارادے میں استحکام پیدا ہوتا ہو، بلکہ ہمارے ارادے کی تبدیلی و تحدید بھی انھیں اسباب پر موقوف ہے ..... اس کی مثال یہ ہے، کہ جب کوئی خوشنما چیز ہماری نگاہ کے سامنے آتی ہے، تو ہمیں خواہ مخواہ اُسکی

جانب میلان ہوتا ہے، یا جب کسی بد نما یا پر ہیبت شے پر نگاہ پڑتی ہے، تو طبیعت خواہ اُسکی جانب کھنچتی ہے - یہی ہرب و انجذاب کی کیفیت ارادہ ہے - لیکن جب تک کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی تھی، جو ہمارے ارادے کو اُکساتی، اُس وقت تک خود ارادے کا بھی وجود نہ تھا - لیکن یہ بیرونی اسباب بھی خود بے ترتیب تفرع پذیر نہیں ہوتے، بلکہ اپنی بیرونی علتوں کے تابع ہوتے ہیں - تو اس بنا پر ہمارے اندر ارادے کی کیفیت بھی بے ترتیب اور بے وقت نہیں پیدا ہو سکتی، بلکہ سلسلۂ اسباب کی طرح ارادوں کا بھی ایک مرتب سلسلہ ہوگا، جسکی ہر کڑی سلسلۂ اسباب کی طرح بیرونی کڑی سے ملی ہوگی - اسکے علاوہ خود ہمارا نظام جسمانی بھی، جس پر ایک بڑی حد تک ہمارے ارادوں کا مدار ہے، ایک خاص نظام کے ماتحت ہے، اور یہ تینوں سلسلۂ اسباب و مسببات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اسی کا نام قضا و قدر ہے....."

(صفحہ ۱۸۲-۱۸۳)

بلحاظ جامعیت یہ بیان کرنا مبالغہ کی آمیزش سے خالی ہے، کہ ابن رشد، فلسفۂ ابن رشد، اور مباحث متعلقہ کی بابت جس قدر معلومات اس کتاب میں یکجا و فراہم ملیں گے، اتنے فارسی و عربی تو کجا، انگریزی کی بھی ایک کتاب میں میسر نہیں آ سکتے - اُردو خواں طبقہ اس کتاب سے بے التفاتی برت کر اپنی ہی بد مذاقی و ناقدر شناسی کا ایک مزید ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرے گا -

---

رسید کتب

کتب ذیل وصول ہوئی ہیں - انشاء اللہ آیندہ ریویو کیا جائے گا -

کلام شاد - قیمت ۳ و ۱۲ (انجمن ترقی اُردو - پٹنہ)

اخبار الاولین - (مصنفہ نیاز فتحپوری) قیمت عہ (مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ)

اُردو شاعری پر ایک نظر - (پروفیسر رشید احمد صدیقی بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

انتخاب میر (مسٹر نور الرحمن بی اے) قیمت عمر (مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ)

کتاب الحدائق حصہ اول - قیمت ۱۲ (دھن بیں نرسری سہارن پور)

مسئلہ سود اور الناظر لکھنؤ

(ایڈیٹر کا نوسٹ)

مضمون ذیل چلپی صاحب کی تعلیقات متعلق بہ مضمون ہذا کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے چونکہ فقہ اسلامی کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے اس وجہ سے اُن اصحاب کو اس بحث کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے جو اپنی مذہبی معلومات کی بنا پر اظہار رائے کے لئے زیادہ موزون ہیں۔ جہانتک ہمین علم ہے جواز سود کی صرف ایک ہی صورت معتمد علمائے مذہب کے نزدیک ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا جائے لیکن جمہور علما کا یہ مسلک چونکہ نہین ہے اس بنا پر محض اقتصادی اور تمدنی خرابیون کے انسداد کی غرض سے راقم مضمون کا یہ اجتہاد بہت بڑی جسارت ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانون کا افلاس روز بروز بڑھتا جاتا ہے لیکن اگر تشخیص مرض کے ساتھ ہی ساتھ اُن اسباب پر بھی غور کیا جاتے جن کی بنا پر یہ مرض پیدا ہوا ہے تو شائد جواز سود پر اصرار کرنے کے بجائے دوسری تدابیر اختیار کرنے کی تحریک کی جاسکے۔

کلکتہ بمبئی اور دوسرے تجارتی شہرون مین مسلمانون نے تجارت کے ذریعہ سے بیشمار دولت پیدا کی لیکن جنھون نے دولت پیدا کی تھی کبھی خود اُن مین سے بعض نے اور زیادہ تر اُن کے ورثا نے عیاشی، اسراف اور کاروبار سے بے توجہی کرکے ساری کمائی گنوا دی۔ سود کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ یہی نفع پہونچ سکتا ہے کہ جن لوگون کے پاس روپیہ ہو وہ اُس کو بڑھا سکین یا جن کے پاس روپیہ نہ ہو وہ سودی قرض لیکر کاروبار کرسکین مگر جن کے مصارف کے لیئے اپنے بزرگون کی جمع کردہ دولت اور موروثی جائدادین کافی نہ ہون اُن کے لئے یہ ذرائع آمدنی بھی چندان مفید نہین ہوسکتے۔

قوم میں کتنے افراد ایسے ہیں جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کی بدولت سابقہ عزبت سے نجات پائی اور آج بڑے بڑے مشاہرون اور آمدنیون پر متصرف ہیں۔ مگر کیا اون میں ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جنکی کثیر آمدنیان بھی اُن کی روزافزون ضروریات کے لیے کفایت نہیں کرتیں۔

مسلمانون کی فلاح کے لئے خدائے بزرگ و برتر نے جو نسخۂ اکسیر تجویز کیا تھا اسکو اگر آج بھی استعمال کیا جائے تو انشاءاللہ تعالیٰ مسلمانون کو نہ صرف افلاس بلکہ تمام امراض سے نجات مل جائے گی۔ سورۂ مومنون (پارہ ۱۸) ملاحظہ ہو:-

قد افلح المومنون الذین ھم	ایمان والے اپنی مراد کو پہونچ گئے (اور)
عن صلاتھم خاشعون ۝	وہ (لوگ) ہیں جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں
والذین ھم عن اللغو معرضون ۝	اور وہ جو نکمی باتون کی طرف رخ نہیں کرتے
والذین ھم للزکوۃ فاعلون ۝	اور وہ جو زکوۃ دیا کرتے
والذین ھم لفروجھم حٰفظون ۝	...... اور وہ جو اپنی شرمگاہون کی حفاظت کرتے
والذین ھم لامٰنٰتھم وعھدھم	اور وہ جو اپنی امانتون اور اپنے عہد کا
راعون ۝	پاس ملحوظ رکھتے۔
والذین ھم علیٰ صلوٰتھم یحافظون	اور وہ جو اپنی نمازون کے پابند ہیں۔
اولٰئك ھم الوارثون ۝ الذین ھم	یہی لوگ آدم کے اصلی وارث ہیں جو
یرثون الفردوس ھم فیھا	بہشت بریں کی میراث پائینگے اور وہ اس میں
خٰلدون ۝	ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

اور اگر کسی کو اسمیں شک ہو کلام الٰہی ہونے میں نہیں بلکہ نسخۂ اکسیر ہونے میں تو اُن لوگون کے حالات زندگی کا مشاہدہ کرکے اطمینان حاصل کرلیا جائے جو قرآنی احکام پر عملاً کاربند ہون۔ ایسے لوگ موجودہ زمانہ میں کم ضرور ملین گے مگر ابھی خدا کا شکر ہے کہ عنقا نہیں۔

کاش ہمارے مصلحین اپنے اجتہادات پر اعتماد کرنے کے بجائے اُس خدا کے

کلام برحق پر بھروسا کرین جسکی ذات پاک پر ایمان بالغیب رکھنے کے مسلمان مدعی ہین -

مین سالہا سال سے خود اپنے اہل خاندان اور اعزاے وطن کی روز افزون حالت زبون دیکھ دیکھ کر اس مسئلہ پر غور و خوض کرتا رہا ہون اور بالآخر اسی نتیجہ پر پہونچا ہون کہ صرف آیات الٰہی کی رہنمائی قبول کرنے ہی مین جملہ مسلمان افراد و اقوام کی فلاح و بہبود متصور رہے ورنہ سوائے خسارہ اور بربادی کے کوئی نتیجہ برآمد نہین ہو سکتا -

سود خوار افراد نہ اقوام کی ظاہری دولت و ثروت پر نہ جائیے - انگریزی کی مثل مشہور ہے کہ "ہر چمکتی چیز تو سونا نہین"

بلکہ اُن کے مآل کار اور عواقب پر نظر کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نتیجۃً وہ غریب و مفلس اُن سے فائدے مین رہتے ہین جو خدا کا خوف کرتے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوے طریقون پر چلتے رہتے ہین -

اگر آپ کو مرض قومی کی تشخیص و علاج کا شوق ہے تو برائے خدا اپنے گرد و پیش کے حالات سے چشم پوشی نہ کیجیے - قریہ قریہ مین آپ کو برباد شدہ خاندان اور تباہ حال افراد ملین گے - آپ اِن کے خاندانی و ذاتی حالات کی تفتیش کیجیے تو انشاء اللہ ہر دفعہ تحقیق ہو جاے گا کہ بربادی کا اصلی سبب سود خواری سے اجتناب نہین بلکہ قوانین الٰہی کی خلاف ورزی ہے - غالب نے اپنے ایک شعر مین احکام الٰہی کی کیا خوب تفسیر کی ہے -

دولت بغلط نبود از سعی پشیمان شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

رسالۂ الناظر کے ماہ مارچ کے اڈیٹوریل مین [a] تحریر ہے کہ گذشتہ ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ کے جلسہ مین مسئلہ سود کے متعلق طفیل احمد کے ایماء سے کوئی تحریک

---

[a] یہ صحیح نہین کہ مضمون مذکور "اڈیٹوریل" مین درج ہے -

پیش ہوئی"، تعجب ہے کہ ایسی بے بنیاد خبر بغیر تحقیق کے ایسے معزز پرچہ میں کیوں شایع کی گئی۔ دران حالیکہ کانفرنس کے رزولیوشن جنوری گذشتہ میں اخبارات میں تمام وکمال شایع ہو چکے ہیں سود کی تحریک نہ پیش ہوئی نہ پروگرام میں درج ہوئی نہ سبجیکٹ کمیٹی

۵۲ کانفرنس کی طرف سے جو فہرست "رزولیوشنہائے" طبع و شایع ہوئی ہے اسکی دفعہ (۱۰) الفاظ ذیل میں درج ہے:-

یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ ہر ضلع میں امداد باہمی کے اصول پر تعلیمی جماعتیں بنائی جائیں۔ جو کواپریٹو سوسائیٹیز ایکٹ کی ماتحت رجسٹرڈ ہوں - ان کی ذمہ داری محدود ہو، اور ان کا سرمایہ یا منافع محض تعلیمی معاملات پر صرف ہو"......

کیا یہ ' امداد باہمی ' کی جماعتیں ' اور ان کا ' سرمایہ ' اور ان کا "منافع" سود سے غیر متعلق ہوں گے؟

رزولیوشن نمبر (۱۱) اس سے بھی زائد صاف و صریح الفاظ میں سود خواری کی تعلیم دے رہا ہے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"اسلامی بنک تعلیمی بلکہ ہر شعبہ زندگی کا دار و مدار بہت کچھ قوم کی اقتصادی حالت پر ہے۔ اقتصادی حالت کی درستی و ترقی کے لئے ضرورت ہے کہ صوبہ متحدہ کے لئے ایک اسلامی کواپریٹو بنک قائم کی جائے"

اس "اسلامی بنک" میں شاید "سود" کا کاروبار حرام ہوگا!

دو شہادتیں یہ ہوئیں۔ تیسرے شاہد ناطق آپ کے ہم مشرب و ہم نوا، خان بہادر جعفر حسین ہیں - ۱۶ جنوری کے ہمدم میں آپ کا ایک طویل مراسلہ مولانا عبداللہ انصاری کے نام شایع ہوتا ہے جس کا عنوان نہایت جلی قلم سے "بنک کے سود کا مسئلہ" لکھا ہوا ہے۔ اس مراسلہ کے ابتدائی سطور حسب ذیل ہیں:-

"۳۱ - دسمبر کے اسلامی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں جب مسلم یونیورسٹی میں طلبہ کی دوکان تجارت کو آپریٹو سوسائیٹی کے اصول پر قائم کرنے کا مسئلہ پیش تھا" الخ

اس مراسلہ میں اس امر کی بھی تصریح ہے کہ رزولیوشن مذکور کو مولانا عبداللہ انصاری نے جواز سود پر مبنی سمجھا، اور محض اسی بنا پر اس کی مخالفت میں تقریر کی اور یہ ارشاد فرمایا کہ تا وقتیکہ مولانا شروانی جواز سود کی

میں پیش ہوئی۔ تحریک پیش ہونا درکنار۔ اس کا میرے ذہن میں خیال بھی نہیں گذرا۔
باقی رہا سود کی وجہ سے مجھے "جو مستحق لعنت" قرار دیا گیا ہے میں اُس سے بھی بدتر الفاظ کا مستوجب ہوں۔ گر میرے کم حیثیت۔کم علم اور گنہگار ہونے سے نفس مضمون پر کیا اثر پڑے گا؟ انصاف تو اس امر کا مقتضی ہے کہ اُنظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال پر عمل کیا جائے اور میرے ذاتی عیوب سے چشم پوشی کی جائے۔

تائید میں فتاویٰ بہم نہ پہونچا لیں۔ "مسلم یونیورسٹی میں سود کا کاروبار جاری کرنا مناسب اور اچھا نہیں معلوم ہوتا" ایک طرف یہ متعدد شواہد و واقعات ہیں، اور دوسری طرف جناب کا یہ ارشاد گرامی ہے، کہ کانفرنس میں سود کا مسئلہ کسی حیثیت سے پیش ہونا تو الگ رہا، اس کا خطرہ تک جناب کے قلب مبارک پر نہیں گذرا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ "بغیر تحقیق" نہیں، "بعد تحقیق" ان دونوں دعووں میں سے "بے بنیاد" کا لفظ کس کے متعلق استعمال ہو سکتا ہے۔

۳ کیا یہ واقعہ نہیں، کہ مسلم کانفرنس کو جناب اسوقت سے بیشتر بھی اپنے اشاعت خیالات کا آلہ بنا چکے ہیں؟ چنانچہ ترویج سود کی تائید میں جناب نے ۲۵ جون ۱۹۲۳ء کو جو طویل لکچر دیا تھا وہ کانفرنس ہال ہی میں دیا تھا، اور پھر اس کی اشاعت کانفرنس ہی کے ماہوار رسالہ کانفرنس گزٹ کے ذریعے سے فرمائی تھی! اور اس طرح عمل میں آپ اپنے نقطہ نظر سے بالکل حق بجانب تھے، اس لیے کہ آپ اپنے مختلف رسائل میں ترویج سود کی انجمنیں قائم کرنے، اور مسلمان طلبہ میں سود کا رواج دینے کو تو اپنا خاص مشن قرار دے چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کانفرنس سے زیادہ محفوظ اسٹیج آپ کو اور کہاں مل سکتا تھا!

۴ ہذا بہتانٌ عظیم۔ حاشا وکلا، یہ لفظ نہ میں نے اپنی طرف سے استعمال کیا ہے، نہ کر سکتا ہوں، بجز اس صورت کے کہ جو شخص جواز سود و ترویج سود جیسی کھلی ہوئی معصیت شدیدہ کی جسارت کریگا، وہ حسب فرمان خداوند کریم و رسول اسلام، یقیناً "مستحق لعنت" ہوگا۔

۵ یقیناً اسی طرح اثر پڑے گا جس طرح آپ شاہ عبدالعزیز کے علم و فضل، زہد و تقویٰ سے اپنی تائید میں اثر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۶ خدائے اسلام بیشک بہت بڑا ستار ہے، لیکن ساتھ ہی پردہ در بھی ہے۔ ؎

لطف حق با تو مواسا ہا کند — چونکہ از حد بگذرد رسوا کند

پیش ہوئی"۔ تعجب ہی کہ ایسی بے بنیاد خبر بغیر تحقیق کے ایسے معزز پرچہ مین کیون شایع کی گئی۔ دران حالیکہ کانفرنس کے رزولیوشن جنوری گذشتہ مین اخبارات مین تمام وکمال شایع ہوچکے ہین۔ سود کی تحریک نہ پیش ہوئی نہ پروگرام مین درج ہوئی نہ سبجیکٹ کمیٹی کے

کانفرنس کی طرف سے جو فہرست "رزولیوشنہائے" طبع وشایع ہوئی ہی اسکی دفعہ (۱۰) الفاظ ذیل مین درج ہے :-

یہ کانفرنس تجویز کرتی ہی کہ ہر ضلع مین امداد باہمی کے اصول پر تعلیمی جماعتین بنائی جائین۔ جو کوآپریٹو سوسائیٹیز ایکٹ کی ماتحت رجسٹرڈ ہون۔ ان کی ذمہ داری محدود ہو، اور ان کا سرمایہ یا منافع محض تعلیمی معاملات پر صرف ہو"۔....

کیا یہ 'امداد باہمی' کی جماعتین، اور ان کا 'سرمایہ' اور ان کا "منافع" سود سے غیر متعلق ہون گے ؟

رزولیوشن نمبر (۱۱) اس سے بھی زائد صاف وصریح الفاظ مین سودخواری کی تعلیم دے رہا ہے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہون :-

"اسلامی بنک تعلیمی بلکہ ہر شعبہ زندگی کا دار ومدار بہت کچھ قوم کی اقتصادی حالت پر ہی۔ اقتصادی حالت کی درستی وترقی کے لئے ضرور ہے کہ صوبہ متحدہ کے لئے ایک اسلامی کوآپریٹو بنک قائم کی جائے"۔

اس "اسلامی بنک" مین شاید "سود" کا کاروبار حرام ہوگا !

دو شہادتین یہ ہوئین۔ تیسری شہادت آپ کے ہم مشرب وہم نوا، خان بہادر جعفر حسین ہین۔ ۱۶ جنوری کے ہمدم مین آپ کا ایک طویل مراسلہ مولانا عبداللہ انصاری کے نام شایع ہوتا ہے جس کا عنوان نہایت جلی قلم سے "بنک کے سود کا مسئلہ" لکھا ہوا ہے۔ اس مراسلہ کے ابتدائی سطور حسب ذیل ہین :-

"۳۱ دسمبر کے اسلامی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مین جب مسلم یونیورسٹی مین طلبہ کی دکان تجارت کو کوآپریٹو سوسائیٹی کے اصول پر قائم کرنے کا مسئلہ پیش تھا" الخ

اس مراسلہ مین اس امر کی بھی تصریح ہے کہ رزولیوشن مذکور کو مولانا عبداللہ انصاری نے جواز سود پر مبنی سمجھا، اور محض اسی بنا پر اس کی مخالفت مین تقریر کی، اور یہ ارشاد فرمایا کہ تا وقتیکہ مولانا شروانی جواز سود کی

میں پیش ہوئی۔ تحریک پیش ہونا درکنار۔ اس کا میرے ذہن میں خیال بھی نہیں گذرا۔[۵۳]

باقی رہا سود کی وجہ سے مجھے "مستحق لعنت"[۵۴] قرار دیا گیا ہے میں اُس سے بھی بدتر الفاظ کا مستوجب ہوں۔ مگر میرے کم حیثیت۔کم علم اور گنہگار ہونے سے نفس مضمون پر کیا اثر پڑے گا[۵۵]؟ انصاف تو اس امر کا مقتضی ہے کہ اُنظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال پر عمل کیا جائے اور میرے ذاتی عیوب سے چشم پوشی کی جائے[۵۶]۔

تائید میں فتاویٰ بہم نہ پہونچا لیں۔ "مسلم یونیورسٹی میں سود کا کاروبار جاری کرنا مناسب اور اچھا نہیں معلوم ہوتا" ایک طرف یہ متعدد شواہد و واقعات ہیں، اور دوسری طرف جناب کا یہ ارشاد گرامی ہے، کہ کانفرنس میں سود کا مسئلہ کسی حیثیت سے پیش ہونا تو الگ رہا، اس کا خطرہ تک جناب کے قلب مبارک پر نہیں گذرا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ "بغیر تحقیق" نہیں، "بعد تحقیق" ان دونوں دعووں میں سے "بے بنیاد" کا لفظ کس کے متعلق استعمال ہوسکتا ہے۔

۵۳ کیا یہ واقعہ نہیں، کہ مسلم کانفرنس کو جناب اسوقت سے بیشتر بھی اپنے اشاعت خیالات کا آلہ بنا چکے ہیں؟ چنانچہ ترویج سود کی تائید میں جناب نے ۲۵ جون ۱۹۲۳ء کو جو طویل لکچر دیا تھا وہ کانفرنس ہال ہی میں دیا تھا، اور پھر اس کی اشاعت کانفرنس ہی کے ماہوار رسالہ کانفرنس گزٹ کے ذریعے سے فرمائی تھی! اور اس طرز عمل میں آپ اپنے نقطہ نظر سے بالکل حق بجانب تھے، اس لیے کہ آپ اپنے مختلف رسائل میں ترویج سود کی انجمنیں قائم کرنے، اور مسلمان طلبہ میں سود کا رواج دینے کو تو اپنا خاص مشن قرار دے چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کانفرنس سے زیادہ محفوظ اسٹیج آپ کو اور کہاں مل سکتا تھا!

۵۴ ہٰذا بہتانٌ عظیم۔ حاشا و کلا، یہ لفظ نہ میں نے اپنی طرف سے استعمال کیا ہے، نہ کرسکتا ہوں، بجز اس صورت کے کہ جو شخص جواز سود و ترویج سود جیسی کھلی ہوئی معصیت شدیدہ کی حمایت کریگا، وہ حسب فرمان خداوند کریم و رسول اسلام، یقیناً "مستحق لعنت" ہوگا۔

۵۵ یقیناً اسی طرح "اثر پڑے گا جس طرح آپ شاہ عبدالعزیز کے علم و فضل، زہد و تقویٰ سے اپنی تائید میں اثر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۵۶ خدائے اسلام بیشک بہت بڑا ستار ہے، لیکن ساتھ ہی پردہ در بھی ہے۔ ؎

لطف حق با تو مواسا ہا کند　　چونکہ از حد بگذرد رسوا کند

بہرحال ذاتیات کو چھوڑ کر مجھ سے جن امور کی متعلق جواب طلب کیا گیا ہے اُنھیں واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

(۱) یہ امر ظاہر ہے کہ پہلے زمانے میں ہر قسم کے سود کے لیے دنیا بھر میں صرف ایک لفظ تھا انگریزی میں یوزری اور عربی میں ربٰوا۔ اور یہ مسلم طور پر بنی نوع انسان کے لیے مضر سمجھا جاتا تھا۔ اور جملہ مذاہب میں ممنوع تھا۔ تجارتی اور صنعتی ترقی سے یورپ میں ایک جدید چیز انٹرسٹ کے نام سے پیدا ہوئی جو تجارت کی جان ہے اور جسے جملہ دیگر مذاہب نے مفید اور جائز قرار دیا اُسکے لیے اب تک کوئی لفظ عربی یا اُردو میں نہیں ہے۔ میں نے اُسکے لیے ربح تجویز کیا ہے اگر جناب مولوی صاحب کے نزدیک یہ لفظ درست نہیں ہے تو کوئی اور لفظ تجویز فرمائیں مگر انٹرسٹ کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ ضرور تجویز کرنا پڑے گا۔[۵۷]

(۲) جبکہ یوزری اور انٹرسٹ دو جداگانہ چیزیں ہیں تو جس قدر احادیث رسول اللہ صلعم اور آثار صحابۂ کرام جناب مولوی صاحب نے نقل فرمائے ہیں اُنکی نسبت میں عرض کروں گا کہ وہ یوزری (ربٰوا) کی ممانعت میں ہیں، نہ کہ انٹرسٹ (تجارتی سود) کی ممانعت میں[۵۸]۔ کیونکہ

آپ اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ سودی دستاویزات کی رجسٹری کر کر کے؛ ربح نہیں، ربٰوا، انٹرسٹ نہیں یوزری، مشتبہ و زیر بحث نہیں بلکہ قطعی و متفقہ صورت سود کی ترویج میں صرف فرمانے کے بعد، مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک مصلح مت کا جامہ پہنکر تشریف لاتے ہیں، اور پھر جب آپ کے کارناموں کو کسی قدر بے نقاب کیا جاتا ہے تو آپ کی جبین تحمل پر شکن پڑجاتی ہے، اور آپ اسے محض "ذاتی" کمزوری قرار دے کر اسکے متعلق مسلمانوں سے "چشم پوشی" و سکوت کے متوقع ہوتے ہیں! قسم ہے خدائے قدوس و بے نیاز کی، کہ آپ کی یہ جسارت و دیدہ دلیری عبرت کے قابل ہے! پبلک میں آپ کا نام لقب "مولانا" کے اضافے کے ساتھ برابر پیش ہوتا رہا، آپنے اسپر کبھی بے اطمینانی نہ ظاہر فرمائی۔ لیکن جب آپکے اصلی خط و خال کی نشاندہی کیجانے لگی تو آپ اپنی مظلومیت پر فریاد و برپا کرنے لگے! خدا آپ پر رحم کرے۔

۵۷ تجارت سے جو مالی فائدہ ہوتا ہے، اُس کے لیے اُردو میں ہمیشہ سے "نفع" "منافع" و "منافع تجارت" کے الفاظ موجود ہیں، اور ہر اُردو داں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

۵۸ دعوی بلا دلیل ہے۔ سود، خواہ اجناس و اسباب پر ہو، خواہ سیم و زر پر، بہرحال ربٰو ہے، اور ربٰو حرام قطعی۔

اُس زمانے میں تجارتی سود کا وجود بھی نہ تھا[۹]۔ اور تجارتی سود صاف الفاظ میں بعض آیات قرآنی کی رو سے جائز ہے[۱۰] جسکو میں نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں ظاہر کر دیا ہے[۱۱]

(۳) جناب مولوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ مشکوک اور مشتبہ مواقع سے بچنا مناسب ہے، اور انٹرسٹ وغیرہ چونکہ جناب کے نزدیک مشتبہ چیزیں ہیں اس لیے اُن سے بچنا چاہیے۔ از فقہا اور چند علما نے ضرورت کا احساس کر کے بعض صورتوں میں رِبوٰ کی بھی اجازت دیدی ہے۔ چنانچہ شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لَا رِبوٰا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیِّ فِی دَارِ الْحَرْبِ کی بنا پر ہندوستان میں جوازِ ربوٰا کا فتوےٰ دے دیا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ گذشتہ ۶۰ برس میں مسلمانوں نے اُس پر عمل نہ کر کے اپنے کو تباہی اور بربادی کے درجے پر پہونچا دیا

(۴) جناب مولوی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب نے صرف سود دینے کا فتوٰی دیا ہے، جسکے معنی یہ ہیں کہ صرف سود دینے کی اجازت دی ہے[۱۲] اور لینے کی اجازت نہیں دی۔ حالانکہ انھوں نے اس کے برعکس ارشاد فرمایا ہے اور سود دینے میں احتیاط کرنے کی

---

[۹] ہمارے آپ کے اختلاف کا اصلی و مرکزی باعث یہی ہے۔ ہم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن مجید و مجموعۂ احادیث ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے، یعنی اُسکی تعلیمات ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ آپکے خیال میں یہ ہدایت نامہ صرف جہلاے عرب کے لیے تھا، اور "عقل و علم" کی "جدید ترقیوں" نے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے، اُسکے لیے ضرور ہے، کہ کانفرنس کے پنڈال یا سب رجسٹراری کے دفتر سے، جدید احکام شایع و نافذ کیے جائیں۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ

[۱۰] سبحان اللہ و بحمدہ! ابھی یہ دعوی کہ تجارتی سود کی مخالفت سے شریعتِ اسلام خالی ہے، اس لیے کہ "اُس زمانے میں تجارتی سود کا وجود ہی نہ تھا" اور معاً یہ ارشاد بھی! کہ "تجارتی سود، صاف الفاظ میں بعض آیات قرآنی کی رُو سے جائز ہے"! کیا منطقی اب بھی اجتماع نقیضین کے محال ہونے پر مُصر رہیں گے؟

[۱۱] جناب کی تالیف لطیف کا نام "جواز سود" ہے، اور سود کو ہر اُردو داں رِبوٰا کے معنی میں لیتا ہے۔ گویا آپ کی گردشِ قلم سے کم از کم ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے، کہ آپ مطلقاً جوازِ ربوٰا کے قائل ہیں، ورنہ آپ جیسے صاحبِ قلم کے لیے کچھ بھی دشوار نہ تھا، کہ آپ اپنے رسالہ کا نام "جوازِ ربح" یا "جواز نفع تجارت" رکھ دیتے۔

[۱۲] گذشتہ پرچے میں سرکار رسالت کا فرمان صریح، اور صحابہ کرام کے اقوال مبارک اس باب میں درج ہو چکے ہیں۔ انکے مقابلے میں کسی فقیہ یا عالم کا قول پیش کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا۔

ہدایت کی ہے[۱۲] ۔ شاہ صاحب کے فتوے کے الفاظ یہ ہیں :-

"سوالات بشرطیکہ در دار الحرب ۔۔ روایات فقہ مذکور است ملاحظہ باید نمود چنانچہ برسنے ازاں ثبت خواہد شد ۔ در ایں اقلیم آں شروط را قیاس باید کرد اگر محقق شد ندپس دار الحرب قرار یافت و بحکم اذا ثبت الشیٔ ثبت بلوازمہ ہرگاہ دار الحرب شد ربوٰا گرفتن و دادن بہ کفرہ آنجا جائز شد زیرا کہ در ہدایہ مذکور است لا ربوٰا بین المسلم والحربی فی دار الحرب و قاعدہ مقرر است کہ الاطلاق فی الروایات نفی عن تقییہ پس ہر دو صورت اخذ و اعطا در نفی داخل شد ۔ لیکن مسلمان را باید کہ در دادن سود بحربی احتیاط کند بے ضرورت نہ دہد" (صفحہ ۳۲ فتاویٰ عزیزی)

یعنی یہ کہ غیر مسلموں سے سود کا لینا اور دینا دونوں جائز ہیں مگر چاہیے کہ سود دینے میں احتیاط کرے۔

(۵) جناب مولوی صاحب کا ارشاد ہے کہ سرمایہ داری دنیا کی بدترین لعنت ہے ۔ اسکی نسبت یہ عرض ہے کہ جدید آلات کے ذریعے سے انسانوں کو شکار کرنا بھی بدترین لعنت ہے لیکن اگر ملک کی دوسری قومیں جدید آلات کے ذریعے سے مسلمانوں کو شکار کرنے لگیں تو کیا مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض یہ نہ ہوگا کہ حفاظت نوع کے لیے وہ بھی جدید آلات کا استعمال کریں ؟[۱۴] چنانچہ اسی بنا پر دار الحرب میں جواز سود کا فتویٰ دیا گیا ہے[۱۵] ۔ اسکے علاوہ خود جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے :- "اَنّ النفس بالنفس والعین بالعین والانف بالانف والاُذن بالاُذن

[۱۳] یہ فتویٰ (بشرطیکہ نقل الفاظ میں دیانت سے کام لیا گیا ہو) آپ کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ آپ خود ہی اس امر کے شد و مد سے قائل ہیں، کہ ربوٰ اور ربح دو بالکل مختلف چیزیں ہیں - نیز یہ کہ اول الذکر کی حرمت سے آخر الذکر کی حرمت کسی طرح نہیں ثابت ہو سکتی ہے - اگر یہ صحیح ہے تو خدا معلوم منطق کے کس قانون سے آپ جواز ربوٰا کو جواز ربح کی دلیل میں پیش کر سکتے ہیں ؟

[۱۴] سرمایہ داری کو آلات شکار پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق ہے ۔ آلات شکار شکاری کو تباہ نہیں کرتے بخلاف اسکے نظام سرمایہ داری، خود سرمایہ داروں کو تباہ و برباد کر کے رہتا ہے ۔

[۱۵] دعوئے بلا دلیل - دار الحرب میں جواز سود کے جو اسباب ان فقہا کی نظر میں آئے، وہ تفصیل کے ساتھ کتب فقہ و فتاویٰ میں درج ہیں - ان سے رجوع کرنے کے بعد آپ کے قلم سے غالباً یہ الفاظ نہ نکلتے ۔

والسن بالسن والجروح قصاص[6]"

(۶) یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زمانے کا سب سے زیادہ کاری آلہ سرمایہ ہے۔ سرمایہ سے اہل یورپ نے ہندوستان کو فتح کیا، مصر کو مغلوب کیا، طرابلس، ٹیونس، الجزائر، ایران، اور عراق کو اپنے زیر اثر بنایا[7]۔ اب تک غیر سلطنتوں نے مسلمانوں کو غلام بنایا تھا مگر ہندوستان میں رعایا قوموں کے سرمایہ دار بھی مسلمانوں کو غلام بنا رہے ہیں۔ اور روپئے کے زور سے مسلمانوں کی اشدھی کر رہے ہیں۔ اب خود جناب مولوی صاحب تجویز فرمائیں کہ "سرمایہ داری کی زد سے بچنے کی کیا تدبیر ہے[8]؟

(۷) اس میں شبہہ نہیں کہ "سرمایہ داری دُنیا کی بدترین لعنت ہے" اس لیے کہ سرمایہ جب چند افراد میں جمع ہو جاتا ہے تو اُس سے غربا، کو اور کاریگروں کو غلام بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔ سرمایہ داروں کے مقابلے میں یورپ سے ایک تحریک غربا، کو اُبھارنے اور سرمایہ داروں کے چنگل سے اُنھیں رہا کرنے کی شروع ہوئی ہے۔ وہ انجمن ہائے امداد باہمی اور کواپریٹو اسٹور ہیں[9]۔ اُس کا کام بھی بغیر تجارتی سود کے نہیں چل سکتا بلکہ اُس کی بنیاد ہی تجارتی سود پر ہے۔ مین اپنے مضامین اور کتابوں میں مسلمانوں کو توجہ دلا رہا ہوں کہ وہ اس میں شامل ہوں۔ کیونکہ ایک طرف تو سرمایہ دار مسلمانوں کو پیس رہے ہیں۔ دوسری طرف غربا، کے اُبھرنے کی جو تحریک ملک میں پھیل رہی ہے اگر اُس میں بھی مسلمان شریک نہ ہوے تو پھر اُنھیں بھیک بھی نہ ملیگی۔

[6] بھلا اس آیت کا یہ کیا محل تھا؟ جن ایڈیٹر صاحب نے اپنے دست مبارک سے یہ آیت آپ کے مسودہ میں درج فرما دی، بہتر ہوگا، اُنھیں سے آپ اسکے معنی وسیاق وشان نزول بھی دریافت فرمائین۔

[7] مسلمانوں کو زوال صرف اس وجہ سے ہوا کہ وہ اسلام پر ثابت قدم نہ رہے۔ سرمایہ تو سب سے بڑی لعنت خود سرمایہ دار کے لیے ہے۔ یورپ نے جس قدر دوسروں کو غلام بنایا، اُس سے کہیں بڑھ کر وہ خود حرص وآز، مکر وفریب، کذب ودروغ، کا غلام ہو کر رہگیا ہے۔

[8] تدبیر صرف یہی ہے، کہ تا بہ امکان، اس سے دور رہا جائے۔

[9] یہ اسٹور وغیرہ قائم کرنا، سب آستین میں شہد لگا کر گس رانی کرنا ہے، ہم مسلمانوں کے نزدیک یورپ کے سرمایہ داروں اور آپ جیسے ہمدرد مصلحین کے درمیان فرق صرف اسی قدر ہے، جتنا کہ اُستاد ذوق کے ایک مشہور مطلع میں "ترقعنا"

پس جو "اسباب" تجارتی سود اور اس قسم کے کاروبار کو دنیا کی بدترین لعنت قرار دیتے ہیں وہ ذرا سمجھیں اور غور کریں کہ وہ قوم کو کس طرف لیے جارہے ہیں؟

(۸) میں نے اپنی کتابوں میں یہ عرض کیا ہے کہ ابتدا میں تجارت مسلمانوں کا بہترین ذریعہ معاش تھی۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے "تم تجارت اختیار کرو کیونکہ اس میں رزق کا ۹/۱۰ حصہ ہے"۔ اب تجارت کے طریقوں میں تبدیلی ہوگئی اور اسکے لیے تجارتی سود لازمی ہوگیا۔ جس سے بچنے کی وجہ سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے تجارت نکل رہی ہے[۵۲]۔ ملازمت مسلمانوں کو اس لیے نہیں ملتی کہ اول تو اُن کے پاس تعلیم کے ذرائع نہیں۔ اور اگر تعلیم پاتے ہیں تو دوسرے لوگ اُنھیں پاس نہیں آنے دیتے۔ صنعت و حرفت کا دارومدار سرمایہ پر ہے جسکو جناب مولوی صاحب لعنت قرار دیتے ہیں۔ تو اب فرمائیے کہ سات کروڑ مسلمان کس طرح زندگی کے دن پورے کریں[۵۲]؟

(۹) ۵۰ سال سے مسلمان قومی ترقی اور قومی حیات کے لیے مختلف تدبیریں کر رہے ہیں۔ وہ تدبیریں سب اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں مگر جبکہ ایک مریض کے جسم سے مسلسل خون جاری ہو تو جب تک خون بند نہ ہوگا کوئی دوا یا غذا اُس مریض میں قوت نہیں پیدا کرسکتی۔ بجنسہٖ یہی مثال مسلمانوں کے قومی جسم پر صادق آتی ہے۔ وہ ہزار تدبیر کریں مگر جب تک کہ

اور "پر تیر قضا" کے درمیان ہے۔

۵۱۹ یہ لفظ مسودے میں یوں ہی درج تھا، غالباً "اصحاب" مراد ہے۔ (ایڈیٹر)

۵۲۰ ظاہر ہے کہ اس مبارک تجارت سے ہر تجارت مراد نہیں ہوسکتی، ورنہ شراب کی تجارت، نیز وہ تجارت جس میں ربٰوا کا لین دین ہو، سب کی فضیلت ماننا پڑیگی۔ جس تجارت میں رزق کا ۹/۱۰ حصہ ارشاد فرمایا گیا ہے، اس سے مراد صرف اُس تجارت سے ہے جسکا نمونہ سرور کائنات نے قبل بعثت دکھا دیا تھا، اور جسکے مطابق متعدد صحابہ کرام عمل کرتے رہے۔

۵۲۱ دعوی بلا دلیل۔ جو مسلمان معاملت کے کھرے، بات کے پکے، زیادہ حرص سے بچنے والے اور معارف میں کفایت برتنے والے ہیں، وہ آج بھی بفضل خدا تجارت پر قابض ہیں۔ ضرورت صرف اسکی ہے، کہ انکی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

۵۲۲ جس طرح محمد بن عبداللہ (روحی فداہ)، ابوبکر بن قحافہ، عمر بن الخطاب، عثمان ابن عفان، علی ابن ابی طالب اور اُنکے ہزارہا رفقا نے زندگی بسر کی تھی۔

قدم قدم پر سود دیتے رہیں گے وہ ہرگز نہیں پنپ سکتے۔[۲۳]

(۱۰) اور یہ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں[۲۴] اور اس کو میں تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں دکھا چکا ہوں کہ نہ کفایت شعاری سے سود دینا بند ہوگا نہ سادگی اختیار کرنے سے۔ سود صرف اُسوقت بند ہوگا جبکہ خود مسلمان آپس میں تجارتی سود کا رواج دیں گے۔

(۱۱) میں آخر میں عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے تمام ذرائعِ معاش بند ہو رہے ہیں اُنکے لیے صرف یہ تدبیر باقی ہے کہ جس قدر روپیہ اُن کے افراد کے پاس ہے یا وہ پیدا کریں اُس میں سے بچا کر دوسرے مسلمانوں کو معین منافع یا تجارتی سود پر دیکر اُن سے دکانیں کھلوائیں۔ کارخانے قائم کرائیں۔ اُن سے دستاویزات لکھائیں اور ان طریقوں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ بازاروں، منڈیوں۔ اور کارخانوں میں پہونچا دیں۔ اسی طریقے سے وہ کفایت شعار بنیں گے اور اسی طریقے سے ملک میں شرح سود گھٹے گی اور ربوٰا اس ملک سے نیست و نابود ہوگا[۲۵]۔

(۱۲) جو تدابیر میں نے عرض کی ہیں اگر وہ صحیح نہیں ہیں تو اس سے اپنے دماغ کو گرم کرنے اور پھر غصہ کرکے مجھ پر ذاتی حملہ کرنے سے قوم کا کیا فائدہ ہوگا[۲۶]۔ قوم کا تو اس میں نفع ہے کہ عزت و آبرو سے زندگی کے دن کاٹنے کی اُسے سبیل بتائی جائے[۲۷]۔

(۱۳) میرے نزدیک مسلمانوں کے لیے زندگی بسر کرنے کے جو طریقے ہیں وہ میں نے اپنے رسالوں میں درج کیے ہیں۔ جو صاحب اُنھیں دیکھنا پسند کریں وہ میرے پاس نصف آنے کا

---

۲۳ الحمد للہ کہ بالآخر ایک کلمۂ حق آپ کی زبان سے بھی نکلا۔ اسلام میں سود دینا اور لینا دونوں مساوی درجے کی معصیت ہیں۔

۲۴ دعوے کے بجائے دلیل پیش کرنا شاید زیادہ مفید ہوتا۔

۲۵ دوراز کار مزعومات و مفروضات کے پیش کرنے سے توشیخ چلی کے ساتھ منصوبہ باندھتے رہنا بہتر ہے۔

۲۶ یہ کیا کم فائدہ ہے، کہ قوم کے ایک حصے کو تو گرگ پر پاسبان کا دھوکا نہ ہوگا۔

۲۷ یہ سبیل، پوری تفصیل کے ساتھ ساڑھے تیرہ سو برس اُدھر بتائی جا چکی ہے، اور جو لوگ آج اُس عقیدے پر پختہ ہیں، الحمد للہ اُنھیں کسی جدید سبیل کی تلاش نہیں۔

ٹکٹ بھیجکر یا بیرنگ بھیجنے کی اجازت دے کر مجھ سے طلب فرمالیں۔

طفیل احمد۔ ولایت منزل۔ علی گڈھ

ناظر ہر مسلمان کے پاس آپ کے رسائل سے کہیں بہتر، جامع تر، صحیح تر، پاکیزہ تر، ایک صحیفہ موجود ہے جس کی جانب وہ بغیر "بیرنگ" یا "نصف آنہ کے ٹکٹ" کے جھگڑے کے ہر وقت اور ہر آن رجوع کرسکتا ہے۔ آپ اپنے رسائل کی جانب دعوت دیے جائیں، اور آپ کا یہ خادم اسی صحیفہ کامل کی جانب۔ ایک روز آئیگا جب انشاء اللہ ہم آپ دونوں دیکھ لیں گے، کہ دونوں میں سے کس کی دعوت سچی اور کس کی دعوت اچھی ہے۔

صلائے عیش

دیدم ببزمے نغمہ گر رقاصۂ نو خاستہ
گو ہر بو آراستہ گُل در گلو پیراستہ

کا فر صفت در خودسری ساحر بفنِ دلبری
جانہا بحسرت سوختہ دلہا بخوں اندا ختہ

زلفِ معنبر بر رخش، تا بانیِ لعلِ لبش
از شمع دود انگیختہ از گُل شرر افراختہ

ما وُ شما در انجمن گردِ صنم چو ں برہمن
گاہے بما آمیختہ گہ با شما پرداختہ

گفتم یا و لے دلربا! ایں حسن و ایں شرم و حیا
اے وائے چوں تو مہ لقا بیہرہ عصمت باختہ

گفتا کہ خاموش اے تپش بگذشت دورِ سرزنش
ساغر بگیر وے کش با دلبرے دلخواستہ

آں مفتیِ عالی نسب واں قاضیِ والا حسب
و مصلحِ سید لقب فتوے نو بنگاشتہ

گویدخدا لاتا کلو، فرماید او بر رغم او
سود و قمار و رشوۃ، فی الجملہ جائز داشتہ

انوارِ مغرب جلوہ گر مشرق بظلمت مستتر
ملت زملت خوب تر، رخصت بحرمت ساختہ

تپش خورجوی

سفرِ حجاز کی مختصر روداد

(سلسلۂ الناظر ماہ اپریل سنہ ۲۳ء)

۳۰ مئی روز چہار شنبہ

رات کو کسی قدر شبنم پڑی جس سے سارا بستر تر ہوگیا، اور صبح کو خفیف سی خنکی بھی محسوس ہوئی۔ سویرے حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا۔ ذوقت کا بازار مختصر ہے۔ گو سفری ضرورت کی سب چیزیں ملتی ہیں۔ پچھلی منزلوں میں گرمی سے پیاس کی شدت رہی تھی اس لیے آج تربوز لیکر کھایا۔ میں معدہ و جگر کے ضعف کی وجہ سے وطن میں رہکر، تربوز شاذ و نادر کھاتا ہوں مگر یہاں کی گرم و خشک آب و ہوا میں تربوز کا کھانا مفید ہے۔ کوئیں یہاں زیادہ اور بڑے ہیں۔ پانی کسی قدر کھاری تھا اور گراں ملا۔ وادیِ فاطمہ میں دو سے لیکر چار قرش فی ٹین پانی کی قیمت دی گئی۔ اطفان میں چھ سے آٹھ قرش تک اور یہاں آٹھ سے بارہ قرش تک۔ اس قافلے میں کم و بیش چھ ہزار اونٹ تھے، جو دو ٹکڑیوں میں آگے پیچھے روانہ ہوتے تھے۔ یعنی نصف قافلہ جب ایک پڑاؤ سے گذر جاتا تو بقیہ نصف قافلہ دوسرے روز وہاں پہونچتا۔ ہم لوگ دوسرے قافلے میں تھے۔ ہر ٹکڑی میں کچھ کوتل اونٹ بھی ہوتے تھے لیکن زائرین کی مجموعی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اور جمالوں، اُن کے سرداروں اور دیگر ہمراہیان کو ملاکر یہ سارا قافلہ تقریبًا پندرہ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے قافلے کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے کے باوجود بھی جب ایک حصہ پڑاؤ پر مقیم ہوتا تو وہاں ایک اچھے خاصے قصبے کے برابر آبادی ہو جاتی۔ اس سارے مجمع کو سیراب کرنے کے لیے ایک دو کنوئیں کیا کافی ہو سکتے تھے۔ کنوؤں سے متصل بڑے بڑے حوض یا تھالے بنائے جاتے تھے تاکہ اونٹوں کو پانی پینے میں آسانی رہے۔ ہر وقت متعدد گراریوں پر سے بڑے بڑے چرمی ڈولوں میں پانی کھینچا جاتا تھا اور سقوں، پانی بیچنے والوں، اور غریب زائرین کا جو اپنے مقام پر پانی نہیں خرید سکتے تھے ان کنوؤں کے گرد ایک ہجوم رہتا تھا۔ سقے جو عمومًا سوڈانی عرب ہوتے تھے صرف ڈول کھینچتے رہتے تھے۔ پانی بیچنے والے مرد، عورتیں اور بچے اُنھیں سے اپنی

مشکیں، مشکیزے، اور ٹین بھرواتے اور دوڑ دوڑ کر پڑاؤ والوں کے ہاتھ جا کر فروخت کرتے۔ جو لوگ اپنے مقام پر پانی کی گراں قیمت نہیں دے سکتے تھے وہ اپنے اپنے ٹین یا مشکیزے لا کر انھیں سقوں سے براہِ راست بھروا لیتے تھے۔ پانی کی قلت اور گرانی اور اُسکے حصول کی دشواریاں سب بجائے خود اگرچہ ہمت شکن ہوتیں مگر جب اُس ملک کے قدرتی حالات پر نظر جاتی تو شکوہ و شکایت کا کوئی موقع باقی نہ رہتا تھا۔ اور جب اُس نعمت عظمیٰ کی لذت کا دھیان آتا جسکے حصول کی تمنا کشاں کشاں اس انبوہ کثیر کو لیے جا رہی تھی تو بے اختیار زبان سے نکل جاتا تھا کہ

نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

چوکیداری کی فیس ۵ قرش ادا کیے گئے اور ٹھیک دوپہر کو قافلہ روانہ ہوا۔ گرمی کی شدت میں کوئی کمی نہ تھی مگر تربوز کی بدولت پیاس کم معلوم ہوئی۔ وُقت میں تھوڑے لیموں خرید لیے تھے۔ شام کو شغدف پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا شربت بنا کے پی لیا۔ جس سے مزید تسکین ہوئی اور راستہ بخیر و خوبی کٹ گیا۔ منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد پہونچ گئے۔ اور نماز عشا پڑھ کے سو گئے۔

۳۱۔ مئی روز پنجشنبہ | خذیمہ یا خذیفہ کا بازار جو ذرا بلندی پر واقع ہے، پختہ ہے اگرچہ کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ اسکے ایک جانب بہت سے کچے کنوئیں بنے ہوئے تھے۔ ان کا پانی میٹھا ہوتا تو قافلے والوں کو بہت آسانی ہوتی۔ مگر میٹھے پانی کے پختہ کنوئیں ذرا فاصلے پر تھے۔ ہمارا پڑاؤ دوسری جانب تھا۔ اور نہایت مسطح زمین پر تھا۔ اور چونکہ دوسرے مقامات کی طرح دور تک کسی قسم کی بلندی، ٹیلہ یا پہاڑی نہ تھی اس لیے جگہ بہت کھلی ہوئی اور پرفضا معلوم ہوتی تھی۔ حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا تو دیکھا کہ بازاروں میں کھانے کی دوکانیں بھی ہیں جہاں مچھلی کا گوشت بکثرت بک رہا تھا معلوم ہوا کہ سمندر یہاں سے بہت قریب ہے۔ اور تھوڑی دیر میں تازی مچھلیاں بھی بکتی نظر آئیں۔ آفتاب بلند ہو جانے کے بعد میں قافلے سے ذرا دور رفع حاجت کے لیے گیا تو ایک طرف ایسا نظر آیا کہ سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اور دُھندلے سے نشانات کشتیوں کے بھی دکھائی دیے۔ یہ خیال کر کے کہ ساحل قریب ہے اور ابھی قافلے کی روانگی میں بہت دیر ہے، میں نے چاہا کہ ساحل کی سیر کر آؤں۔ پڑاؤ پر آکر ڈنڈا اُٹھایا اور ساتھیوں سے یہ کہہ کر کہ ساحل قریب ہے میں ذرا سیر کر کے ابھی آتا ہوں، نکل کھڑا ہوا۔ اور جس طرف سمندر کی

موجیں نظر آتی تھیں اُسی طرف روانہ ہوا۔ چلتے چلتے جب سامنے نظر کرتا تو جھلملاتا ہوا پانی دکھائی دیتا۔ اور میں سمجھتا کہ ساحل کے قریب پہونچ رہا ہوں۔ اور جیسے جیسے آفتاب بلند ہوتا جاتا اور روشنی تیز ہوتی جاتی کشتیاں قریب ہوتی نظر آتیں۔ دیر تک چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ قافلے سے بہت دور نکل آیا ہوں اور ساحل جتنے فاصلے پر پہلے تھا اب بھی اُسی قدر دُور ہے۔ میدان میں کوئی شخص ایسا نہ نظر آیا جس سے پوچھ سکتا۔ کہیں کہیں کوئی بدو عورت بکریاں یا اونٹ چراتی ہوئی نظر آجاتی اور اُس سے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دریافت کرتا تو وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ تا آنکہ میں چلتے چلتے تھک گیا۔ اور قافلے سے اتنی دوری ہوگئی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی بدو تنہا دیکھ کر حملہ آور نہ ہو۔ ناچار واپس ہوا۔ مگر مُڑ مُڑ کر بار بار دیکھتا جاتا تھا اور عجیب بات تھی کہ جس جگہ پہلے سمندر کی موجیں نظر آتی تھیں وہاں اب پہاڑی دکھائی دیتی تھی۔ اپنے مقام پر پہونچکر لوگوں سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ ساحل یہاں سے اتنا قریب نہیں کہ دکھائی دے اور جو پانی کی سی چمک دکھائی دیتی تھی وہ دراصل ریت کے ذرے تھے جو آفتاب کی کرنوں سے جگمگا اُٹھے تھے۔ اور کشتیاں جو نظر آتی تھیں وہ دراصل کشتیاں نہ تھیں بلکہ بگولے تھے کہ ہوا پر اُڑ رہے تھے۔

بگولہ اور سراب کی ماہیت سے تو واقفیت تھی مگر اُنکے نظارے کا کبھی موقع نہ آیا تھا۔ پہلی دفعہ قدرت کے یہ کرشمے دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔ منزل طولانی تھی لہذا چاشت ہی کے وقت روانگی ہوگئی۔ راستے میں ابر محیط رہا۔ سمندر کے کنارے کنارے قافلہ چل رہا تھا۔ اس لیے برابر ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔

اس منزل میں چوروں کی کثرت ہے۔ اس کی اطلاع روانگی سے پہلے ہی کردی گئی تھی اور شام کے قریب پھر عبدالعزیز ترجمان اور ہمارے بدووں نے آکر کہا کہ بہت ہوشیاری سے رہنا۔ شام ہوتے ہی جمالوں نے حرامی۔ حرامی (چور۔ چور) پکار کر غل مچانا شروع کیا۔ ہر بدو اپنے اپنے اونٹ کے ساتھ چلتا تھا اور ذرا ذرا دیر کے بعد پکارتا جاتا تھا۔ ہم لوگوں سے بھی تاکید کی گئی تھی کہ سوئیں نہیں اور اپنے سامان سے خبردار رہیں کہ مبادا پیچھے سے کوئی چور کچھ اُڑا نہ لیجائے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی رقوم میرے ہینڈ بیگ میں رکھی ہوئی تھیں اس لیے مجھے احتیاط و ہوشیاری کی

تاکید مزید کی گئی تھی۔ یہ بیگ ڈبل ٹین کا تھا اور اگرچہ بمبئی سے اُسکو ساتھ لے لینے کی وجہ سے مجھے بہت کچھ آرام ملا تھا مگر وزنی ہونے کی وجہ سے شغدف میں اس کا رکھنا سخت دشوار تھا۔ شروع میں تو ایک دو دن تک بہت ہی زحمت رہی۔ کبھی اونٹ کی پیٹھ پر ڈوری سے کسا جاتا تھا، کبھی شغدف کے کسی کونے میں باندھا جاتا تھا۔ کئی بار اُس سے چوٹ بھی کھائی اور اس بات پر افسوس کیا کہ چمڑے کا بیگ کیوں نہ لیا۔ اس منزل میں گرمی کی تکلیف نہیں ہوئی۔ اگرچہ رات کو عموماً یہ تکلیف جاتی رہتی تھی۔ لیکن یہاں ساحلی ہوا کی وجہ سے زیادہ ٹھنڈک ملی اور باوجود جمالوں کے شور اور چوری کے خطرے کے میں گہری نیند سویا۔ اگرچہ روانگی سویرے ہوئی تھی مگر منزل اتنی طولانی تھی کہ صبح کو جب آفتاب کافی بلند ہوگیا تب کہیں جاکر رابق پہونچے۔

نظرے خوش گذرے

علی گڈھ میگزین کا وہ دَور ختم ہوگیا جب خواجہ منظور حسن صاحب ایڈیٹر تھے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون شایع ہوا تھا۔ جدید دور کا پہلا نمبر بابت ماہ جنوری و فروری موصول ہوا تو اُس میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ "ڈالی کا جوگ" کے عنوان سے ایک افسانہ جو سات آٹھ برس ہوئے الناظر میں چھپا تھا بغیر کسی قسم کے حوالے کے شایع کیا گیا ہے۔ اتفاق سے صاحب مضمون نے اسی فسانے کے متعلق چند ماہ اُدھر بعض خطوط لکھے تھے جن کی وجہ سے اس مضمون کی سُرخی حافظے میں محفوظ رہ گئی۔ اور میں نے الناظر کی پُرانی جلد نکال کر شروع کے ایک دو صفحے ملائے تو ہو بہو وہی مضمون تھا۔ صرف کہیں کہیں الفاظ بدلے گئے تھے۔

قوم میں اس وقت جہاں اور ہر قسم کے جرائم و معاصی کا رواج عام ہوتا جاتا ہے وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے مُلک کے اہلِ قلم جنھیں اپنی اعلیٰ مثال سے دوسروں کی رہنمائی کرنا چاہیے تھی عجیب عجیب طریقوں پر اپنی جرائم پیشگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ تعلّی، خود بینی و خود نمائی سے شعرائے قدیم کا دامن بھی پاک نہ تھا۔ مگر اب یہ خیال اتنا بڑھ گیا ہے کہ مسّہ بن کر حد درجہ بدنما معلوم

ہونے لگا ہے - ہر نوجوان جو چار شعر جوڑ سکتا ہے چاہتا ہے کہ لوگ اُسے میر و غالب، آتش و ناسخ داغ و امیر، حالی و اکبر سے کم نہ جانیں۔ اور بعض حضرات تو اہل ملک کی اس بدمذاقی سے بھی شکوہ رکھتے ہیں کہ ان اساتذۂ فن کو زمانۂ حال کے باکمال شاعر سے نسبت دی جائے۔ شاعروں کی جو حالت بیان کی گئی بعینہ یہی کیفیت نثر لکھنے والوں کی بھی ہوتی جاتی ہے۔ اور غالباً اسی کا تقاضا ہے کہ ایک مضمون کی نقلیں ایک ہی وقت میں متعدد اخبارات و رسائل کو بھیجی جاتی ہیں یا ایکدفعہ شایع ہو چکنے کے بعد دوبارہ پھر اُسکو چھپوانے کی ضرورت خیال کی جاتی ہے۔

الناظر میں اور شاید اُردو کے ہر رسالہ میں اس قسم کے مضامین علی سے چھپ جاتے ہیں۔ اور نے اسی پر قیاس کرکے علی گڈھ میگزین کے جدید ایڈیٹر صاحب کو اس بارے میں توجہ دلائی۔ میں نہیں جانتا کہ اُنھوں نے مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی سے جن کا وہ مضمون تھا کیا کہا۔ بہرحال اُن کا ایک عتاب نامہ موصول ہوا ہے جس کے چند فقرات اُنکے کمال انشاپردازی کے اعتراف میں نہیں بلکہ اس غرض سے شایع کیے جاتے ہیں کہ قومی اخلاق میں جو تغیر عظیم آہستہ آہستہ ہوا اور ہو رہا ہے اُس کا کچھ اندازہ کیا جا سکے۔ وہو ہذا:۔

"آج آپ میرے متعلق یہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کے رسالہ میں سے کسی اور شخص کا مضمون اپنے نام سے شایع کر دیا (حالانکہ صرف یہ لکھا گیا تھا کہ یہ مضمون الناظر میں شایع ہو چکا ہے) یہ کس قدر شرمناک بات ہے۔ اس امر کو اچھی طرح ذہن میں رکھیے کہ آپ جیسے ادیب اور ایڈیٹر اگر دس سال تک مجھ سے استفادہ کریں تو بھی طفلِ مکتب رہیں گے۔ آپ نے جہالت کی انتہا کر دی۔ آپ جانتے ہیں کہ خود آپ کے مضامین میں میرے مضامین کے الفاظ اور فقروں کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ اس پر آپ اس قدر جسارت کیونکر کر سکے کہ مجھ پر کسی مضمون کی چوری کا الزام لگانے کی جرأت کی۔"

اس پر غالباً کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ اور ہو تو مجھے افسر صاحب سے درس لینے کی مہلت دی جائے۔

الناظر کے قلمی معاونین میں علی گڑھ کالج کے ایک لائق وطباع گریجویٹ مسٹر احتشام حسین ہیں۔

جنھوں نے عید سے ایک روز قبل عین نوجوانی کے عالم میں صرف ایک ہفتے کی علالت کے بعد اپنے وطن بریلی میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موت کا وقت ایسا معین ہے کہ کہ اُس میں لحظہ بھر کا فرق نہیں ہوسکتا اس لیے یہ کہنا تو بالکل بے موقع ہے کہ موت قبل از وقت ہوئی۔ لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ یہ حادثۂ عظیم وقت معین پر واقع ہوا ہے اُنکے اعزا و اقارب احباب و شناسا مجبور ہیں کہ اُنکی اس قدر جلد جدائی پر مغموم ہوں۔ کیونکہ اُنکی ذات سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔

مرحوم کے والدین اور اعزائے قریب کی توقعات کا کیا ذکر ہے اُنکی ذہانت و اہلیت اور اُنکے پسندیدہ اخلاق نے ہر اُس شخص کے دل میں طرح طرح کی امیدیں پیدا کر دی تھیں جس سے اُن کا تھوڑا بہت میل جول تھا۔

میری اسیری کے زمانے میں وہ کچھ دنوں تک اخبار مدینہ کے ایڈیٹر رہے تھے اور اگرچہ اس بارے میں ذاتی واقفیت کا مجھ کو موقع نہیں ملا لیکن بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مدینہ اُنکی وجہ سے چمک گیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار نویسی کے لیے اُنکی طبیعت زیادہ موزوں تھی۔

خداوند کریم اُن کی روح کو اعلی علیین میں جگہ دیں۔ اور اُنکے والدین اور نوجوان بیوہ کو توفیق صبر عطا فرمائیں۔ آمین۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس دن احتفاظ حسین مرحوم کے انتقال کی خبر ملی اُسی روز ڈاک میں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ میرے دیرینہ کرم مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی کی اہلیہ دو ننھے ننھے بچے چھوڑ کر وفات پا گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں مرحومہ کے لیے دعائے بخشش و نجات اور اپنے کرم فرما کی اس مصیبت میں دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔ اللہ تعالی ان معصوم بچوں کی پرورش و تربیت کی اہم ذمہ داری سے جو عورت کا مخصوص حصہ ہے اُنھیں باحسن وجوہ سبکدوش کریں۔ آمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۵۶ جلد ۲۶ ۱۰ جون سنہ ۱۹۳۴ء

فیہ ما فیہ

(از : چلپی)

جناب طفیل احمد صاحب کی تحریک جواز سود سے متعلق الناظر (بابت مارچ مئی) نیز ہمدم (مورخہ یکم جون) میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ مذہبی حیثیت سے طالبانِ ہدایت کے لیے بالکل کافی ہے لیکن عقلی و تمدنی حیثیت سے ابھی چند سوالات اُن سے کرنا، اور اُنکے طرز استدلال کی نمایاں کمزوریاں دکھانا باقی ہیں۔ ان کا اہم ترین اور مرکزی دعویٰ یہ ہے کہ مسلمان سود نہ لینے ہی کے باعث پستی و زوال میں ہیں۔ یہ دعویٰ ہے، مگر اس پر کوئی دلیل اُنھوں نے قائم کی ہے؟ افسوس ہے، کہ ان کا سارا تبلیغی لٹریچر پڑھ جانے کے بعد اس دعوے پر کوئی دلیل موجود نہیں ملتی۔ محض اپنے دعوے کی تشریح و توضیح، وہ مختلف صورتوں میں مختلف عبارتوں کے ساتھ کرتے چلے گئے ہیں، لیکن کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت اُنھیں غالباً نہیں محسوس ہوئی۔ انکے مختلف بیانات پر یکجائی نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگر انھیں منطقی شکل میں مرتب کیا جائے، تو غالباً انکی تائید میں استدلال حسب ذیل قائم ہو سکے گا۔

(۱) دنیا کی جو جو اقوام سود لیتی ہیں، ترقی کر رہی ہیں،

(۲) جو قوم سود نہیں لیتی (یعنی مسلمان) ترقی بھی نہیں کر رہی ہے،

(نتیجہ) اس لیے ترقی کی علت سود خواری ہے۔

اگر یہی استدلال ہے، تو کہنا پڑتا ہے، کہ اس سے زیادہ ناقص، اس سے زیادہ ضعیف، اس سے زیادہ غلط، استدلال تصور میں بھی بمشکل آسکتا ہے۔ اس میں وہ متعدد مغالطات منطقی جمع و فراہم کر دیے گئے ہیں، جو متفرق طور پر کسی ایک دلیل میں مل سکتے ہیں۔ پہلا اہم تر تو یہ ہے، کہ استدلال کا یہ طریق ہی سرے سے غلط ہے۔ مولف رسالہ جواز سود نے یہاں صرف یہ کیا ہے، کہ دو ہمزمان واقعات کے محض اجتماع کو علیت کے مرادف سمجھ لیا ہے۔ ایک مثال میں انھیں ترقی اور سود خواری کیجا نظر آئی، اور دوسری مثال میں تنزل و عدم سود خواری۔ محض اس کیجائی کی بنا پر اُنھوں نے سود خواری کو تنزل کی علت قرار دے لیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صورت استدلال سراسر مہمل ہے۔ ورنہ استدلال ذیل کی صحت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا جو بداہتہً باطل ہے:۔

(۱) دنیا میں جو سفید رنگ کی اقوام ہیں، وہ ترقی کر رہی ہیں۔

(۲) جو سفید رنگ کی اقوام نہیں، وہ ترقی بھی نہیں کر رہی ہیں،

(نتیجہ) لہذا سفید رنگ کا ہونا، ترقی کی علت ہے۔

یا پھر یہ استدلال:۔

(۱) کانگریس کے اجلاس جب منعقد ہوتے ہیں کرسمس کا زمانہ ہوتا ہے،

(۲) کانگریس کے اجلاس جب منعقد نہیں ہوتے، کرسمس کا زمانہ بھی نہیں ہوتا۔

(نتیجہ) انعقاد کانگریس، آمد کرسمس کی علت ہے۔ (یا اسکے برعکس)

غرض اسی طرح کوئی سے بھی دو غیر مربوط و غیر متعلق، مگر ہمزماں واقعے لیے جاسکتے ہیں، اور سید طفیل احمد صاحب کی اتباع میں انھیں ایک دوسرے کا علت و معلول خواہ مخواہ فرض کیا جاسکتا ہے۔

یہ مغالطہ طریق استنتاج میں تھا، اس سے قطع نظر کرکے مقدمہ اول میں جو دعویٰ کیا گیا ہے، کیا وہ کسی لحاظ سے، اور کسی معنی میں بھی صحیح ہے؟ کیا دنیا کی ہر سود خوار قوم خوشحال و ترقی پذیر ہے؟ جرمنی نے تو سود خواری میں کبھی احتیاط نہ کی۔ پھر آج کیوں اُس کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے؟ آسٹریا نے تو دل کھول کر لین دین جاری کر رکھا تھا، پھر آج کیوں اُسکے خزانۂ عامرہ میں خاک اُڑ رہی ہے؟ روس نے تو سود کھانے میں کبھی ایک لمحے کے لیے تامل نہیں کیا تھا، پھر آج کہیں اُسکی دولت قارون

کا نشان باقی ہے؟ چین، بلجیم، اسپین، پرتگال، ان میں سے کون سی قوم سود سے محترز رہی، پھر کیوں ان سب کی مالی ساکھ (انکے حاکمانہ اقتدار کے زوال کے ساتھ) اکھڑی ہوئی ہے؟ اور تو اور، فاتح جنگ عظیم مملکتِ فرانس، اور اس سے بڑھ کر ہماری "سرکار ابد قرار و دولت مدار" برطانیہ کی، جسکے رگ و ریشہ میں ایک سود خوار مہاجن کے خصوصیات موجود ہیں، کیوں روز بروز قرض سے زیر بار، اور دیوالیہ پن کے متصل ہوتی جا رہی ہیں؟ اگر محض سود خواری کسی قوم کو بام ترقی پر پہونچانے کے لیے کافی ہوتی، تو آج کیوں ان سود خوار قوموں کو یہ روز بد دیکھنا پڑتا؟

پھر، خدا معلوم، لفظ "ترقی" کا مفہوم کیا لیا گیا ہے؟ اگر اسکے مفہوم میں عزت و حکومت بھی داخل ہیں، تو یہودیوں کی بابت کیا ارشاد ہوگا، جو دنیا کی سب سے بڑی سود خوار قوم ہیں مگر ساتھ ہی سب سے زیادہ ذلیل و خوار بھی ہیں؟ ہندوستان کے پیشہ ور ساہوکاروں، رستوگیوں، اور مہاجنوں کی بابت کیا رائے قائم کی جائیگی، جو باہمہ فراوانیِ زر و افراطِ دولت، اپنے ہی ملک میں، دوسری قوموں کے مقابلے میں عزت و حکومت، وقعت و وجاہت سے یکسر محروم ہیں؟ اگر "ترقی" سے محض مالی ترقی، اور آسودہ حالی مراد لی جائے، تو بھی واقعات و مشاہدات اس کی تمامتر تردید کر رہے ہیں۔ سید صاحب نے مسلمانوں کے اتلاف جائداد سے متعلق اعداد و معلومات فراہم کرنے میں کچھ وقت صرف فرمایا ہے، مگر کیا انھوں نے اس تحقیقات کے لیے بھی کبھی وقت نکالنا ضروری سمجھا، کہ بڑے سے بڑے سرمایہ دار اشخاص کیوں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں؟ بڑے بڑے بنک کس طرح ٹوٹ جاتے ہیں؟ بڑی بڑی کمپنیاں اور تجارتی کوٹھیاں کس کثرت سے بیٹھ جاتی ہیں؟ بڑے بڑے مہاجن کس تعداد میں بالآخر دیوالیے ہو جاتے ہیں؟ سود خواری اگر بجائے خود فلاح مالی کی ضمانت کے لیے کافی ہوتی، تو دنیا میں اس طرح کے بکثرت واقعات، آخر شب و روز کیوں پیش آتے رہتے ہیں؟

"ترقی کے مفہوم پر ذرا اور غور کیجیے۔ فرض کیجیے، ایک شخص کی آنکھیں، پیشانی، لب، دہن، رخسار، اپنی اپنی ساخت میں خوبصورت و خوشنما ہیں۔ لیکن ناک بہت ہی بھدی، بد قطع، اور بیڈول واقع ہوئی ہے، آپ اس چہرے کو حسین کہیں گے؟ ہرگز نہیں، اس لیے کہ مجموعہ کے بعض [illegible]

اس قدر ناقص ہونا "حسن" کے منافی ہے۔ ایک اور شخص ہے، جس کا معدہ درست و قوی ہے، ہاتھ پیروں میں بھی قوت و توانائی ہے، لیکن قلب نہایت کمزور واقع ہوا ہے، آپ ایسے شخص کو صحیح و تندرست کہیں گے؟ قطعاً نہیں، اسلئے کہ "صحت" کے تخیل میں کل اعضاء کی فعلیت طبعی داخل ہے۔
ٹھیک اسی طرح، اب اگر کوئی قوم ایسی ہے، جسکے پاس روپئے کی فراوانی ہے، سامانِ راحت کی افراط ہے، دنیا کے بازار میں سب سے زیادہ مانگ اُسی کی مصنوعات کی ہے، بڑے بڑے بندرگاہ اُسکے قبضے میں ہیں، لیکن دوسری طرف وہ قوم شرافت کے اعلیٰ اخلاق سے محروم ہے، زیردستوں اور کمزوروں پر رحم کرنا نہیں جانتی، اور اپنے اغراض کے سامنے حق و ناحق کے امتیاز کو نظرانداز کردیتی ہے، تو ایسی قوم کو، یعنی جس کا مادی پہلو روشن، اور اخلاقی و روحانی پہلو تاریک ہو، ترقی یافتہ کہنا صحیح ہوگا؟ پھر، کیا آج جن "ترقی یافتہ" قوموں کی نظیر پیش کرکے ہمیں سود خواری کی ترغیب دی جارہی ہے، اُن کا بجنسہ یہی حال نہیں؟

اسکو بھی جانے دیجیے۔ مخالف کہہ سکتا ہے کہ "تم نے 'ترقی' کا بہت بلند معیار رکھا۔ صرف مادی ترقی کو پیش نظر رکھنا چاہیے"۔ بہتر ہے، ہم بھی ترقی کے معیار کو گھٹا کر اس سے مراد صرف مادی ترقی لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے، کہ سود خوار قوموں کی دولت کے فوری اُتار چڑھاؤ اور اُسکے اثرات کا آپ نے کبھی اندازہ کیا ہے؟ نہیں کیا ہے، تو اب چند ہفتوں تک انگلستان کے کسی روزانہ اخبار کا مطالعہ کے بعد کیجیے۔ آج ایک شخص کی ساکھ سارے ساہوکارہ میں جمی ہوئی ہے، کل اُس شخص کو چند روپئے بھی قرض دینے پر کوئی آمادہ نہیں۔ صبح کو ایک شخص لاکھوں کے تجارتی حصے ٹیلیفون پر خرید رہا ہے، شام کو اس فکر میں مبتلا ہے کہ صبح کے ناشتے تک کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ ابھی ایک شخص کو ہم نے ایک بہت بڑے بنک کے مینیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے دیکھا تھا، پلٹ کر جو دیکھتے ہیں، تو وہی حضرت عدالت دیوانی میں مدعا علیہ کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ غرض ثبات و پائداری جس شے کا نام ہے، اُسے دولت و ثروت کے معاملے میں "ترقی" یافتہ یورپ نے بالکل اسم بے مسمیٰ کردیا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ اس صورت حال سے لازمی طور پر قلوب میں رشک و حسد، مقابلہ و مسابقت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اور طبائع میں خیانت و سرقہ، تغلب و غبن، جعل و استحصال

بالجبر، وغیرہ جرائم کثیرہ کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ عدالتوں کی رونق، وکیلوں کی گرم بازاری، اور جیل خانوں کی آبادی میں ہرسال اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بسا اوقات، فطرت اس سے بھی زائد سخت سزائیں، کبھی قتل، اقدام قتل، اور خودکشی کی صورت میں، اور کبھی دیوانگی، جنون، اور دق وسل کی صورت میں نازل کرتی ہے، اور سود خوارانہ "ترقی" کے برکات سے قبرستان، شفاخانے، پاگل خانے، سب اپنی اپنی جگہ پر پوری طرح مستفید ہوتے ہیں۔

کیا یہی وہ مبارک اور خوش آیند ترقی ہے جس کی جانب اُمتِ اسلامیہ کو دعوت دی جارہی ہے؟

اسی طرح استدلال بالا کا مقدمہ ثانی (جسے اصطلاح منطق میں صغریٰ کہیں گے) بھی ایک غلط مشاہدے کی غمازی کر رہا ہے۔ "سود نہ لینے والے مسلمان ہر جگہ پستی و تنزل کی حالت میں ہیں" یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ افغانستان کے مسلمان سود سے اسی قدر محترز ہیں، جتنے ہندوستان اور دوسری جگہوں کے مسلمان ہیں، باایں ہمہ وہ سید صاحب کے معیار کے مطابق اچھی خاصی رفتار سے ترقی کر رہے ہیں۔ سود خواری کے لحاظ سے ترکی جہاں آج سے دس برس پیشتر تھی وہیں آج بھی ہے، باایں ہمہ مصطفیٰ کمال کے زیرِ سیادت، ترک، حسبِ معیار سید صاحب، شاہراہِ ترقی پر گامزن ہیں۔ غرض مسلمانانِ عالم کے حالات کا اگر صحیح مطالعہ کیا جائے، تو صاف نظر آئے گا، کہ انکی ترقی و تنزل کو سود کے لینے نہ لینے سے مطلق واسطہ نہیں، بلکہ وہ تمامتر دوسرے ہی اسباب کے ماتحت ہے۔

ایک اور بڑا اہم مغالطہ جو سید صاحب کے تمام مضامین و رسائل میں پیوست کیے ہوئے ہے، یہاں ذرا اسے بھی کھول دینا ہے۔ ان کا دعویٰ جوازِ ربح کا ہے نہ کہ جوازِ ربوٰا کا۔ وہ جس شے کی ترویج کا مبلغ اپنے تئیں ظاہر کرتے ہیں، وہ سودِ تجارت ہے، نہ کہ سودِ مطلق۔ لیکن جہاں کہیں وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کچھ بھی واقعات و اعداد پیش کرنے لگتے ہیں، وہاں ربح و ربوٰا، انٹرسٹ اور یوزری، سود تجارتی اور سود مہاجنی کی تفریق کو بالکل نظرانداز کر جاتے ہیں، اور اُن خاندانوں کی مثالیں پیش کرنے لگتے ہیں، جو ربح سے نہیں، ربوٰا سے، سود تجارتی سے نہیں، سود مہاجنی سے محترز رہ کر (بہ قولِ اُنکے) تباہ و برباد ہوگئے! یہ کیسا عظیم الشان ظلم ہے، کہ دعوے تو نقصاناتِ ترکِ ربح کا

کیا جائے، اور اسکی تائید وتمثیل کے وقت ایک بالکل مختلف وجداگانہ شے یعنی نقصانات ترکِ ربوا سے استناد کیا جائے!

جناب سید صاحب احکام منقولی سے غالبًا غیر متاثر رہتے ہیں، بہتر ہوگا، کہ دلائل معقولی کی روشنی میں وہ اپنے خیالات پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ امید ہے، کہ ان کا باطل ہونا ان پر روشن ہو کر رہے گا۔

سیر و سفر، تمدنی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے۔ ہر سفید فام "پردیسی" جس کی جیب ریل اور جہاز کے کرایہ سے بارِ دار ہوتی ہے، سیہ فام "دیسیوں" کے وطن کی زیارت پر حریص ہوتا ہے، اور اگر "بالفعل" ممکن نہیں، تو کم از کم "بالقوۃ" تو عجائب زارِ مشرق کے ایک محقق سیاح کی حیثیت بہرحال رکھتا ہے

اسلام بھی سفر و سیاحت کا حامی ہے۔ قرآن میں بعض گروہوں کو مخاطب کر کے سفر و سیاحت کی بار بار تاکید آئی ہے۔ البتہ اسلام Pleasure Trips کا حامی نہیں۔ اس نے مقصدِ سفر یہ نہیں بتایا ہے، کہ "جنتِ نگاہ" و "فردوس گوش" کی طلب میں خدا کی دی ہوئی دولت برباد کر دی جائے پست و محکوم اقوام کے درمیان گھوم پھر کر تہذیب و شائستگی کی جنس گراں کی دلالی کی جائے، یا یہ کہ "تاریک" اقطاع عالم کو اسراف، قماربازی، مئے نوشی و حرام کاری کے انوار سے منور کر کے دنیا کے سرمایۂ طغیان و عدوان، کفران و خسران میں اضافہ کیا جائے۔ بلکہ مقصد سفر یہ بتایا ہے، کہ منکروں کے انجام سے عبرت حاصل کرو، گمراہوں کی کج روی و بد اعمالی کا نظارہ کرو، اور انکے پاداشِ عمل، کیفرِ کردار، و سوء عاقبت کو سوچو، دیکھو، اور درس بصیرت حاصل کرو!

قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین (انعام - ع ۲)
قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المجرمین (نمل - ع ۲)
نیز سورہ روم و عنکبوت وغیرہ

آپ اسی ارشاد کی تعمیل میں غالبًا سفر دہلی کا قصد فرمائیں، کہ وہاں چپے چپے پر آثارِ عظمت کے ڈھیر، اقبال گذشتہ کے سنسان کھنڈر، اور صحبت شب کی بجھی ہوئی شمعیں، عبرت و بصیرت کا وعظ

خاموش سناتی ہوئی ملیں گی - لیکن آیئے ہم آپ کو ایسے لالہ زار عبرت کا پتہ دیں، جسکے بعد آپ دہلی کے اُجڑے ہوے ویرانے کی جانب رخ کرنا بھی گوارا نہیں فرماسکتے - مُردہ قوم کے اس مُردہ پایۂ تخت کو چھوڑیے، جسکی سب سے بڑی دولت، اسکے چند بوسیدہ و شکستہ قبرستان ہیں - زندہ اقوام کے زندہ مراکز حکومت پر توجہ فرمائیے، جہاں شب و روز جسم کے نہیں، روح کے مزارات تیار ہوتے رہتے ہیں، جہاں صبح و شام انسان کے اعضا و جوارح مادی کا نہیں، نیکی و شرافت، پاکیزگی و انسانیت کا جنازہ اُٹھتا رہتا ہے، اور جہاں خزاں و بہار کی ہر فصل میں، سرما و گرما کے ہر موسم میں طلوع و غروب کے ہر دورے میں، شمس و قمر کی ہر گردش میں، حیا و غیرت، توکل و قناعت، عصمت و عفت، کی تکفین و تدفین اہتمام خاص کے ساتھ عمل میں آتی رہتی ہے - آپ بزرگان دہلی کے مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے لیے جا رہے ہیں، لیکن خدارا لنڈن کی عدالتوں میں، مجالس سیاسی میں، دفاتر سرکاری میں، حق و صداقت، ایمان و دیانت، صدق و امانت، حریت و مساوات، کی فاتحہ خوانی سے تو پہلے فرصت کرتے جائیے - آپ کا دل بیگمات دہلی کی بدنصیبیوں کے تصور سے بھر آتا ہے لیکن للہ ذرا پیرس کے ہوٹلوں، پارکوں، ناچ گھروں، تھیٹروں، تماشاگاہوں، عشرتکدوں، بلکہ اچھے اچھے شریف و معزز گھرانوں کا تو ایک سرسری جائزہ لیتے چلیے، کہ انکے اندر حد شمار و بیان سے خارج کتنی عصمتیں مدفون ہیں - آپ ہمایوں و شاہجہاں، دارا و ظفر پر ماتم کے لیے بیقرار ہو رہے ہیں لیکن برلے خدا نیویارک کے ایک ایک بینک پر، ایک ایک کمپنی پر، ایک ایک دوکان پر، ایک ایک کارخانے پر - ایک ایک ساہوکارے پر، ایک ایک صراف خانے پر تو اشک بہاتے چلیے، کہ ان میں سے ہر ایک حرص و طمع، ظلم و غضب، سود خواری و رشوت ستانی، مکر و فریب، قماربازی و میخواری کی کتنی مہیب و عظیم الشان یادگار، اور پُرحسرت مزار کی حیثیت رکھتا ہے!

پھر کیا آپ بجائے دہلی کے مصر کا انتخاب فرمائیں گے؟ بیشک یہاں فرعون کی نعش کی زیارت ہوگی، جس نے ہزارہا سال ہوے تخت شاہنشاہی پر بیٹھ کر خدائی کا دعوی کیا تھا، اور بنی اسرائیل کو طرح طرح کے آزار پہونچائے تھے؟ لیکن ازراہِ عنایت، ذرا اور ہمت کرکے سفید رنگ کی آبادی کے حدود کے اندر داخل ہو جائیے - ایک نہیں، ہزارہا؛ مردہ نہیں، زندہ، ڈوبی

ہوئی لاش کی صورت میں نہیں، اچھے خاصے چلتے پھرتے، اور باسامان نہیں بے سامان، فرعون آپ کو قدم قدم پر ملیں گے۔ جنکے حلق و دہن سے نہیں، ہر بُنِ مُو سے صدائے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی بلند ہو رہی ہوگی، جنکی فرعونیت عقلی و مالی، اکیلے ہارون و موسیٰ نہیں، جملہ انبیاء و رسل، جمیع مذاہب و شرایع، سائر روحانیت و حقانیت کے خلاف جنگ و جدل، رد و قدح، مقابلہ و مقاتلہ تضحیک و استخفاف کے لیے آمادہ ملیگی، اور جو ایک قوم بنی اسرائیل ہی نہیں، بلکہ مصر و سوڈان، طرابلس و زنجبار، عراق و عرب، فلسطین و شام، ایران و ترکستان، افغانستان و بلوچستان، برما و تبت، چین و ہندوستان، غرض اپنے کو چھوڑکر، باقی ساری انسانی آبادی سے ناصیۂ آزادی کو اپنے نشان غلامی سے داغدار کرنے پر سرگرم کار، اور بجائے خدائے لاشریک لہ کی عبادت و پرستش کے ساری خدائی کے سر اپنی بارگاہِ قوت و اجلال پر خم کرانے کی دُھن میں مست و سرشار نظر آئیں گے!

پس درس عبرت و بصیرت کے لیے جو بہترین مدرسہ اسوقت سطح ارض پر ہو سکتا ہے، وہ عشرت آباد یورپ ہے۔ اور جو شخص قلب سلیم، دیدہ بینا، و گوش شنوا، کے انعامات الٰہی سے بہرہ مند ہو، اور پھر زادِ سفر سے بھی محروم نہ ہو، اُسپر اس گلستان فرنگ کی گلگشت ایک فریضۂ مذہبی کا حکم رکھتی ہے۔ کون گلستاں؟ وہ جس کی شان میں اسی قفس کے ایک آزاد شدہ بلبل نے کہا ہے ؎

گلستانے لالہ زار عبرتے　　　چوں گلِ کاغذ سرابِ نکہتے

قاضی عبد الغفار بی اے مراد آبادی (جو ایک زمانے میں مولانا محمد علی کے دست و بازو رہ چکے ہیں) یقیناً ساری قوم کی جانب سے شکریۂ و تہنیت کے مستحق ہیں کہ کم از کم اُنھوں نے اس فرض کفایہ کو ادا کر دیا۔ یاد ہوگا، کہ ۱۹۲۰ء میں "سرکار معدلت مدار" نے جس وفد خلافت کو لندن میں باضابطہ دعوت دی تھی، اور جو سر آغا خاں، سید حسن امام، اور سیٹھ چھوٹانی پر مشتمل تھا، اُسکے سکرٹری قاضی صاحب موصوف تھے۔ فرنگستان کا سفر صدہا مسلمان نوجوان کر چکے ہیں، متعدد اشخاص اپنے مشاہدات و تجربات سے بھی اپنے ابنائے وطن کو بہرہ اندوز فرما چکے ہیں، لیکن قاضی صاحب کا سفر سب سے نرالا، اور اپنی نوعیت میں بالکل پہلا تھا۔ اُنھوں نے وہی دیکھا، جو دیکھنا چاہیے تھا،

وہی سنا جو سننا چاہیے تھا، وہی محسوس کیا جو محسوس کرنا چاہیے تھا، اور بالآخر اُس کا اظہار بھی ٹھیک اُنھیں الفاظ میں کیا، جن میں کرنا چاہیے تھا۔

"نقش فرنگ" اُنکے محسوسات و مشاہدات کے مجموعۂ اوراق کا نہایت صحیح و موزوں نام ہے۔ یہ خشک واقعات سفر کا روزنامچہ نہیں، جہازوں کے کرایہ، ہوٹلوں کی فہرست، مسافروں کے ٹھہرنے کے مقامات، اس قسم کے معلومات ٹامس کُک کے دفتر سے بآسانی فراہم ہو سکتے ہیں، اور معلوم ہے کہ قاضی صاحب اس کمپنی کے تنخواہ دار یا اعزازی کسی قسم کے بھی ایجنٹ نہیں۔ انکی کتاب ایک آئینہ ہے، جسکے ہر ہر صفحے میں فرنگیوں کی ملکی و معاشرتی، دونوں زندگیوں کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے، ایک نگارخانہ ہے، جس میں ڈرائنگ روم (کمرۂ ملاقات) بڈ روم (خوابگاہ)، آفس (کمرۂ دفتر) سب کے مرقعے، بہ کمال حسن و جمال اپنی اپنی جگہ پر آویزاں ملتے ہیں۔ بہ لحاظ واقعیت، مورخین مغرب کی تمام معاصرانہ تاریخوں سے صحیح تر، بلحاظ جامعیت معلومات، تمام مغربی سیاحت ناموں سے مفید تر، اور پھر حسن زبان و لطف بیاں کے لحاظ سے اس درجہ دلآویز، کہ کہیں سے کوئی صفحہ کھول لیجیے، بغیر کتاب ختم کیے دل بیقرار رہے گا۔ قاضی صاحب اب تک محض اخبار نویس یا صحافی تھے، بحیثیت ادیب و مصنف کے یہ غالباً انکی سعی اول ہے، لیکن جب نقش اول کہنہ مشق لکھنے والوں کے لیے باعث رشک ہے، تو نقش ثانی و ثالث یقیناً انھیں محسود بنا کر رہے گا

ایں سعادت بزور بازو نیست۔ الخ

بارگاہ حسن و ناز کے ابتدائی حدود، بمبئی میں جہاز پر قدم رکھتے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ ذرا دیکھنا، نقش فرنگ کا یہ نقاش معانی، کس حسن و لطافت کے ساتھ ناظرین کے سامنے اس متحرک پرستان کا ایک دلفریب نظارہ پیش کرتا ہے:۔

"کرشموں اور تجلیوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے، جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے۔ یوں تو جہاز مغرب کے بعد ہی بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے، مگر پھر بھی عرشے کے بہت سے کونے تاریک رہتے ہیں! جب بجلی کی روشنی میں باریک ریشم کے اندر سفید جسم جھلک جھلکیں،

اور کھلے ہوئے سینوں پر جواہرات اپنی ولمک دکھا چکیں، تو پھر تاریک گوشوں کا سکون کسقدر عزیز ہوتا ہے! شب کے دسترخوان پر جہاز کی ساری پونجی سفید کھال، باریک کپڑے، خوبصورت بال، درخشاں جواہرات، ان سب کی ڈھیریاں لگی ہوتی ہیں، ہر کرسی ایک چھوٹی سی دکان ہوتی ہے، اور اُس دوکان پر ہر قسم کی جنس رکھی ہوتی ہے۔ ایک نیکبخت کو روز دیکھتا تھا، کہ وہ ہر وقت اپنے کھلے ہوئے سینے کو نہایت باریک جالی کے بالشت بھر ٹکڑے سے چھپانے کی کوشش فرماتی تھیں، مگر وہ جالی کا ٹکڑا ہر دفعہ انکے شانوں سے پھسل کر نیچے گرنے پر اصرار کرتا تھا۔ بس برابر بیٹھنے والے مرد کا اخلاقی فرض ہوتا تھا، کہ وہ اس ٹکڑے کو اُٹھائے، اور اُنکے سڈول شانوں پر ڈال دے۔" (ص۱۱)

ایک خضر راہ کی معیت میں آپ یورپ تک پہونچ چکے ہیں، تو آئیے، عروس البلاد پیرس کی معاشرت کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیں:-

"یہ مقام رسم ورواج کی آزادیوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ایک ایشیا نژاد جب سورج کی روشنی میں مَردوں اور عورتوں کی بے تکلفیوں کو سرراہ دیکھتا ہے، تو ایک سرسری نظر کے بعد اُس کا دل اُس سے پوچھتا ہے، کہ اگر بداخلاقیاں اور عیش پرستیاں قوموں کی تباہی کا بڑا سبب ہوتی ہیں، تو پھر یورپ کیوں زندہ ہے؟ ..... تھیٹروں اور ناچ گھروں میں جانے کی زحمت کیوں گوارا کیجیے۔ شب کو سرراہ رقص کی محفلیں جمی ہوتی ہیں، ایک دو نہیں، سارے شہر میں سیکڑوں۔ ان میں رقاصہ کا ہلکا ریشم کا لباس بھی اُسکے جسم صندلیں سے بغاوت کرتا ہے۔ اور پھر گویا ملک کا کوئی قانون نہیں، جو حوا کی ان بیٹیوں پر عائد ہوسکے۔ لباس کا ہر ٹکڑا سوئی کے ٹانکوں سے جھگڑا کرتا ہے۔ موزوں کی باریکی اور جسم کی رنگت میں تمیز کرنا ممکن نہیں۔ لباس کی تیاری میں اگر کفایت شعاری یوں ہی بڑھتی رہی، تو عجب نہیں، کہ یورپ کی صنف نازک پھر ایک دفعہ فطرت کے اُس لباس سے آراستہ نظر آئے، جسکا نہیں اُلٹا سیدھا۔" (ص۹۷)

یہ نمونہ "معاشرت" کا تھا۔ "سیاست" کا نظارہ اس سے کہیں زائد دلکش و سبق آموز ہے۔ اور

جس قلم نے یورپ کی خانگی زندگی کی، اس صحت و صفائی کے ساتھ نقاشی کی ہے، اُس نے اسکی ملکی زندگی کے مرقع کو کہیں زائد عبرت انگیز صورت میں پیش کیا ہے۔ اُردو میں غالباً یہ پہلی، اور نہایت کامیاب کوشش ہے، جسکے ذریعے سے طلسم زارِ فرنگ کی اندرونی اسرار کی جھلک اہل مشرق کو دکھائی گئی ہے۔ پورا لطف اصل کتاب ہی کے مطالعے سے آسکتا ہے۔ کتاب دارالاشاعت، پنجاب، لاہور سے عہ میں مل جاے گی۔

کلام عزیز

خودکشی غم میں کوئی بات بھی ہے		ہمت اے دل۔ اندھیری رات بھی ہے

یوں نہ ظالم مٹا کہ اس دل میں		میری اور تیری کائنات بھی ہے

میری افسردگی کے ہیں اسباب		تم خفا ہو تو کوئی بات بھی ہے

واعظوں کو خبر نہیں شاید		رندِ صد شیوہ مست ذات بھی ہے

نیند آجاے سلے فلک دم بھر		تیری گردش میں ایسی رات بھی ہے

موت ہے گر حیات کو لازم		موت کے واسطے حیات بھی ہے

جادۂ عشق ہے عزیز عزیز
مر مٹو گر تو ایک بات بھی ہے

عزیز لکھنوی

انبیاے بنی اسرائیل

راقم الحروف نے حال میں ایک مختصر کتاب انبیاے بنی اسرائیل کے احوال میں تالیف کی ہے اُس کا دیباچہ الناظر کی نذر کیا جاتا ہے۔

عربستان کی عصیاں آلود سرزمین پر کفر و سیہ مستی کی وہ دھواں دھار گھٹا چھائی تھی کہ تمام عالم تیرہ و تار ہو رہا تھا۔ ملتِ ابراہیمی کا چراغ عرصہ ہوا کہ گُل ہو چکا تھا۔ شعلۂ طُور کی تجلی زمانہ گذرا کہ تہ خاک ہو چکی تھی۔ اور اعجاز عیسوی کا فانوس مدت سے گرد و غبار کے دامن میں روپوش تھا۔ یکایک رحمت حق کی بجلی چمکی، اور ایسا حیرت انگیز نور عالم افروز وجود میں آیا کہ شرق سے غرب اور عرش سے فرش تک سارا جہان دمکنے لگا اور حجاز کا نافرمان ریگستان سجدہ گاہ خلائق بنگیا۔

وہ نورکامل ایک کرشمۂ قدرت تھا جس کا نہ کوئی مشابہ ہے نہ مماثل۔ ایک جاہل اور غیر متمدن قوم میں پیدا ہوا اور ایک صنمکدے کے مجاروں میں پرورش پائی۔ نہ علوم و فنون کا برادران وطن میں چرچا تھا کہ اُنکے فیض صحبت سے خیالات پر صیقل ہوتی اور نہ دولت و سامان معیشت سے فراغت تھی کہ سیر و سیاحت کے مشاہدات سے دماغ میں روشنی آتی۔ اُسکے قبیلے میں نہ تو کوئی بادشاہ ہوا تھا کہ اُسکے نقش قدم پر چلنے کی آرزو دل میں ہوتی۔ لیکن ایک عجیب و غریب روحانی قوت اُسکے صدر مبارک میں ودیعت تھی جو غار حرا کی خود ساختہ درس گاہ میں جلگا اُٹھی۔ اور اُسکے پند و نصائح میں وہ برقی تاثیر پیدا ہوئی کہ قیصر و کسریٰ کے ایوان لرزنے لگے اور دنیا کی تاریخ کا تاریک ورق اُلٹ گیا۔

جبکہ اُس مہر منور پر تصدق ہونے والے ستارے نان شبینہ کو محتاج تھے، نہ جانبازوں کے قبضے میں تلوار تھی اور نہ جاں نثاروں کو کفن کی آس۔ اُنکو یہ مژدۂ جاں فزا سنایا گیا: "اللہ تم کو روے زمین پر خلیفہ بنائے گا" سلطنت و حکومت کا اُنھوں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اپنے نفوس کو بیچکر جنت خریدنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اُسی وقت یہ بیش بہا نکتہ بھی ذہن نشیں کیا گیا کہ "اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے" اور وہ سوختگان عشق تعمیل

ارشاد کے لیے اس قدر نرم ہوئے کہ حالت کا کیا ذکر ہے صورت بھی بدل گئی۔ تصرف حق نے حمایت کی اور وعدۂ ایزدی پورا ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ شمع عنبری اور خواب مخمل کے کاشانۂ صد نعمت میں یہ وعید فراموش ہو گئی کہ "اللہ مالک الملک ہے جسکو چاہتا ہے سلطنت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے"

سرچشمۂ نور نے اپنے تشنۂ ذہنوں کو اُمم سابقہ کی سرگذشت بار بار سنائی تھی اور بنی اسرائیل کی عبرتناک داستان بہ تکرار بیان فرما کر تلقین کیا تھا کہ "غفلت و ناشکری تباہی کا پیش خیمہ ہے" متواتر ارشاد ہوا تھا کہ "بنی اسرائیل! اُن نعمتوں کو یاد کرو جو تمھارے حال پر تھیں"۔ اور اس سے مقصود شمع ہدایت کے پروانوں کو سمجھانا تھا کہ کبھی بادشاہ دوجہان اولادِ یعقوب پر بھی ایسا ہی مہربان تھا جیسا کہ آج تم پر ہے۔ جس طرح تم کو خلافت ارض کی نوید سنائی جاتی ہے اُسی طرح اُن سے بھی کسی دن ارض مقدس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ ظاہری سامان کچھ موجود نہ تھا مگر وہ اقرار حرف بحرف پورا ہوا۔ اسی طرح جو بشارت تمکو دی جاتی ہے اُس میں بھی سرمو فرق نہ ہوگا۔ لیکن نشۂ دولت کی مستی میں تم بنی اسرائیل کی تقلید نہ کرنا ورنہ تمکو بھی وہی روز بد دیکھنا نصیب ہوگا جو تمھارے بنی اعمام کو پیش آیا۔ وہ حکومت پاکر ناشکری کی معصیت میں گرفتار ہوے۔ پہلے تو اُن کو معمولی فہمائش کی گئی جب ہوش نہ آیا تو وہ سخت مصائب میں گرفتار ہوے۔ بابل کے بادشاہ نے اُنکے وطن میں قتل عام کیا۔ اور بقیۃ السیف کو غلام بنایا۔ بڑی حسرت وعبرت کا وہ وقت تھا جب پیغمبروں کی اولاد اپنے وطن سے کوسوں دُور جابرا ور متکبر بادشاہوں اور امیروں کو شراب پلانے کی خدمت پر مامور تھی۔ چند سال کے بعد قصور معاف ہوا اور پھر سلطنت عطا فرمائی گئی۔ تو نافرمانی کا جوش اُسکے ساتھ ساتھ آیا۔ اس ہیجان کو دور کرنے کے لیے رومیوں کو انکے ملک میں تاخت و تاراج کی اجازت دی گئی کہ انھوں نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

تیسری بار رحمت حق نے باگ ڈھیلی کی اور اپنے عزیز بندوں کو فارغ البالی عطا فرمائی لیکن

ع یار بالیں پہ جب آیا تو قضا بھی آئی - پھر بد اطواری شروع ہوئی - اور عصیاں شعاری نے ایسا دلیر کیا کہ معصوموں کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے کا شوق ہوا تو منتقم حقیقی کی سرکار سے آخری سزا کا فرمان صادر ہوا یعنی ہمیشہ کے لیے غلامی کا طوق پہنایا گیا اور اُنکی تسلی کا کوئی ذریعہ بجز انتظار

مسیح موعود کے باقی نہ رہا۔ عرب کی اقبالمندی اپنے عروج کے وقت یہود کے ساتھ ادنیٰ مشابہت کو بھی فال بد تصور کرتی ہوگی۔ لیکن آج تیرہ سو برس کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں قوموں نے عروج و زوال میں ایک ہی قسم کے منازل طے کیے ہیں اور دونوں قافلے ایک ہی عبرتناک وادی سے گذرے۔

بنی اسمٰعیل کو بھی کفران نعمت میں چند روز تک اُسی طرح تنبیہیں کی گئیں جیسے کہ بنی اسرائیل کو ہوتی رہی تھیں۔ کبھی قرامطہ نے ستم کے تیر برسائے اور کبھی افرنجیوں نے ظلم و جور کا نشانہ بنایا۔ جب ان چھینٹوں سے خواب غفلت دُور نہ ہوا تو یہ بھی دو سخت آفتوں میں مبتلا کیے گئے۔ پہلے مشرق سے اُٹھ کر ہلاکو نے دجلے کو لہو کی ندی بنایا۔ اور

خون فرزندان عم مصطفٰے شد ریختہ بر ہماں خاکے کہ سلطانان نہادندے جبیں

دوبارہ مغرب کی بعض اقوام نے حاکم وقت کو قصر سلطانی میں محبوس کرکے دنیاے اسلام کو بیچراغ کردیا۔ اور اسیری بابل کی وہ دردناک تصویر پیش نظر کی کہ اُسکی تفصیل بیان کرنے کی قلم کو تاب نہیں ہے۔

اب ان مراحل کے بعد تیسری منزل میں قدم ہے جسکو بنی اسرائیل کے افاقۃ الموت کا مقابل سمجھنا چاہیے۔ غلامی کی زنجیر کھڑک رہی ہے اور حکماے حاذق نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ ذرا اعتدال میں فرق ہوا اور طوق مذلت گردن میں ڈالدیا گیا۔ پھر مسیح آسمان چہارم سے اُتر کر علاج کریں تو سبحان اللہ سبحان اللہ۔ ورنہ انا للہ!!!

المختصر امت موسوی کی ترقی و تنزل کی داستان مسلمانوں کی سرگذشت سے اس قدر مطابق ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے ہم کو فطرتاً دلچسپی ہونا چاہیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ علماے یہود نے اپنی نافرمانیاں چھپانے کے لیے کتب آسمانی میں اس قدر تحریف کردی ہے کہ جو واقعات و سوانح ان میں اسوقت درج ہیں وہ عرب کی مقدس کتاب سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتے۔ اور اگر صرف قرآن شریف کی آیات سے استدلال کیا جائے تو بنی اسرائیل کی مکمل تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ عرب کے بعض اہل سیر کتب یہود کی قریب قریب کل روایات کو مستند سمجھے اور بعض اہل علم اُنکی ہر ایک حکایت کو ناقابل اعتماد تصور فرماتے رہے۔ دونوں گھاٹیوں کے بین بین چلنے والی جماعت جس کا مسلک

"خذ ما صفا ودع ما کدر" تھا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے مُنہ موڑ بیٹھی۔ اُس نے انبیاے یہود کے حالات تو بڑے زور وشور سے لکھے لیکن قوم کی داستان سے خاموشی اختیار کرلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج عربی و فارسی میں انبیاے سلف کے احوال کا تو بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، لیکن سارا اسلامی لٹریچر ایک مکمل اور مستند تاریخ یہود سے محروم ہے۔

اگر علم تاریخ سے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے اور گذشتہ نسلوں کے کارنامے شاہراہ ہدایت کی رہنمائی کرسکتے ہیں تو یقیناً اسوقت مسلمانوں کو تاریخ یہود کے مطالعے کی سخت ضرورت ہے۔ انگریزی میں کافی سرمایہ امت موسوی کے عروج وزوال کا موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ تفاسیر واحادیث سے اسکی تطبیق و تلخیص کی جائے اور بنی اسرائیل کی مفصل داستان ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے مدون ہوکر اُردو زبان میں شایع ہو۔ آیندہ اوراق میں ایک خاکہ اُس تصویر کا پیش کیا جائیگا جس میں صرف وہ نقوش درج کیے گئے ہیں جو مسلمانوں کی مستند کتابوں سے ثابت ہوتے ہیں اور جن کو جمہور اہل اسلام صحیح باور کرتے ہیں۔ اُس میں رنگ بھرنے اور نقش ونگار بنانے کے لیے کتب یہود سے مدد لینے کی احتیاج ہے۔ بہتر ہے کہ کوئی برادر وطن جو السنۂ عبرانی ویونانی سے بھی آشنا ہو اس امر خطیر کا بیڑہ اُٹھائے اور بنی اسرائیل کی مکمل تاریخ مرتب کرکے اس خاکے میں جان ڈال دے۔

جو مسودہ اسوقت نذر ناظرین کیا جاتا ہے وہ صرف انبیاے بنی اسرائیل کے احوال وفضائل سے روشناس کریگا اور ضمناً قوم کے عروج وزوال کی طرف اشارہ کرتا جائے گا کیونکہ اس رسالہ کا ماخذ کلام مجید ہے۔ اور یہ پیشتر عرض کیا جاچکا ہے کہ آیات قرآنیہ سے بغیر امداد کتب یہود کے بنی اسرائیل کی تاریخ مرتب نہیں ہوسکتی۔ اس مختصر کتاب میں انبیا علیہم السلام کے معجزات اور خلاف عادات سوانح اسی طریقے سے بیان کیے جائیں گے جس طرح کہ علماے اہل اسلام اُنکو تحریر کرتے آئے ہیں۔ نہ معجزات کی تاویل کیجائے گی اور نہ عقل ونقل کی مطابقت کی کوشش۔ البتہ تناقض روایات اور متضاد حکایات میں صحیح ترین اخبار کو ترجیح دی جائیگی۔ فلسفیانہ دلائل اور مختلف فیہ مسائل سے پرہیز کیا جائیگا اور اہل کتاب کی تحریف شدہ حکایات ممتنع الامکان اس جزو میں شامل نہ ہونے پائیں گی۔ کتاب کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہوگی تاکہ ہر طبقے کے لوگ اسکو سمجھ سکیں اور قصوں اور کہانیوں کے پیرایے میں انبیاے سلف کے حالات ہندوستان کے ہر گوشے میں پہونچ جائیں۔ اس مختصر کتاب کی ترتیب

کے لیے یوں تو بیسیوں ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی۔ لیکن شرط انصاف کے خلاف ہے اگر میں اس مقام پر صاحبِ تفریح الاذکیا فی احوال الانبیا[۱] کا تذکرہ نہ کروں جن کی بے نظیر تالیف اُردو زبان میں اس موضوع پر بہترین مجموعہ ہے اور جس میں تمام تفاسیر و احادیث متعلقہ کا اقتباس اس خوبی سے یکجا کردیا گیا ہے کہ اسکے مطالعہ کے بعد اس بحث پر کسی دوسری تصنیف کی طرف رجوع کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

جامع الاوراق کی نیت صرف انبیاے بنی اسرائیل کا احوال بطورِ قصص و حکایات تالیف کرنے کی تھی۔ لیکن احباب نے مجبور کیا کہ دوسرے پیغمبروں مثلاً نوحؑ و صالحؑ و ہود وغیرہم کے حالات بھی اسی پیرایے میں بہ زبان اُردو آجانا بہتر ہے۔ لہذا اس رسالہ کے ساتھ ایک جزوِ ثانی انبیاے سلف کے نام سے اور بڑھانا پڑا۔ جزوِ اول جس کا تعلق انبیاے بنی اسرائیل سے تھا شایع کیا جاتا ہے۔ اور جزوِ ثانی بعد کو نذر ہوگا۔

جزو اول ایک مقدمہ اور چار باب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں حضرت ابراہیمؑ۔ اسحقؑ اور یعقوبؑ کے حالات ہیں جو بنی اسرائیل کے اجداد تھے۔ باب اوّل میں حضرت یوسفؑ کا تذکرہ ہے جو بنی اسرائیل میں پہلے نبی تھے۔ اور جن کی داستان کو بادشاہِ دوجہاں کی سرکار سے "احسن القصص" کا خطاب عطا ہوا ہے۔

باب دوم میں حضرت موسیٰ کے حالات ہیں جو بنی اسرائیل کے نبیوں میں سب سے زیادہ عالی مرتبت تھے۔

باب سوم۔ بنی اسرائیل کے عروج کا زمانہ ہے۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت سلیمان تک انبیاء کا تذکرہ ہے۔

باب چہارم۔ انحطاط کا عہد ہے اور بقیہ انبیاے بنی اسرائیل کے حالات ہیں جنکا تذکرہ قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد توقیع قبول روزیش باد	مشیر احمد علوی

[۱] مولوی ابوالحسن حسن علوی کاکوروی المتوفی ۱۳۰۵ھ

شیخ بو علی سینا

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

مشاہیر عالم کے حالات حوالۂ قلم کرنے سے بالعموم یہ مقصود ہوا کرتا ہے کہ بنی آدم کی حالت جمود میں جوش پیدا کیا جائے، اور انسان جسکو قدرت نے اشرف المخلوقات کے معزز لقب سے ممتاز فرمایا ہے بیدار ہو۔ ان علمبرداران علم و فضل میں وہ ہستیاں بھی نظر آئیں گی جنکو دنیا مسلمان کہتی ہے۔ جنھوں نے کبھی اپنے ذہنی و دماغی کمالات دکھا کر ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا اور بلا لحاظ مذہب و ملت سب سے یکساں خراج تحسین وصول کیا تھا۔ وہ جنکے نمایاں کارنامے صدیوں تک متلاشیان علوم و فنون کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے رہے۔ وہ گرامی وجود جس کا نام نامی زیب عنوان ہے، صدیوں تک اپنے چشمۂ فیض سے ایک عالم کو سیراب کرتا رہا، اور جسکی ذات مثل آفتاب عالمتاب قرون وسطیٰ میں یورپ کی بہت سی درسگاہوں پر ضیا پاشی کر چکی ہے۔ دور حاضرہ کے مسلمانوں کا اپنے اسلاف کی ان قابل قدر روایات کا عملی قائم رکھنا تو کجا، وہ انکے کارنامے تک دفتر طاق نسیاں کر چکے ہیں۔ زمانے کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ پرانی باتوں میں اگر کوئی جدت کا پہلو پیدا کر دے تو وہ بدعت سیئہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اور موجد ہمیشہ مطعون اور آماجگاہ اعتراضات ہوا ہے۔ ہر قوم کی تاریخ اس قسم کے سیکڑوں شواہد پیش کر سکتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ ہستی اپنے معاصرین کے طعن و تشنیع کا ہدف نہ بنتی۔ چنانچہ زمانۂ حیات میں کبھی ملحد و بد دین کہلائی تو کبھی زندیق کا خطاب ملا اور اسکے روشن کارناموں پر کسی نے ٹھنڈے دل سے غور نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی معلومات اور تحقیقات سے فائدہ حاصل کرنے کے بجائے انکو بنظر حقارت ٹھکرا دیا اور وہ نمایاں موشگافیاں جو اس قابل احترام ہستی نے میدان عمل میں کیں جاذب نظر ثابت نہ ہوئیں۔ صفحات قرطاس جو ان نتائج و حقائق کے حامل تھے کچھ تو نذر آتش ہوئے اور کچھ نا اتفاقی کے ہاتھوں اغیار کے ہاتھ لگے۔ اسکی فلسفیانہ تحقیقات اور طبی انکشافات کو غیروں نے سر آنکھوں پر لیا اور اپنے اس فیض سے

محروم رہے

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

قوم پر انحطاط و جمود کی جو ناگفتہ بہ حالت طاری ہے اُسے دیکھتے ہوے یہ اُمید نہیں کہ اس زمانے میں بھی اُس پر کچھ توجہ کی جائے گی اور وہ اُس علامۂ زماں کے مساعی سے بہرہ اندوز ہو کر گذشتہ غفلتوں کی تلافی کرے گی۔ مادی زندگی کی دلچسپیوں اور دلفریبیوں نے عقلیات و روحانیات کو ٹکسال باہر کر دیا ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دیگر ممالکِ اسلامی اسی زندگی کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ علمی مشاغل بیکار اور فضول محض خیال کیے جاتے ہیں۔ بوعلی ہی جیسی ہستیاں تھیں جن کی طرف مولانا حالی مرحوم نے ازراہِ تفاخر اپنے مسدس میں اشارہ کیا ہے

ارسطو کے مُردہ فنوں کو جِلایا فلاطوں کو پھر زندہ کر کے دکھایا
ہر اک شہر و قریے کو یوناں بنایا مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
کیا برطرف پردہ چشمِ جہاں سے
جگایا زمانے کو خوابِ گراں سے

لیکن کیا اس دورِ پستی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ درست ہے؟ اب تو یہ پُر فخر کارنامے افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ مگر نہیں۔ تاریخ کے صفحات اس دعوے کی صداقت پر شاہد ہیں۔ اور جب تک دنیا میں فنِ تاریخ باقی ہے انکو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری بد مذاقی اور انحطاط علمی اسکی تصدیق میں حائل ہوں۔ افسوس مسلمانوں نے اس مقتدر ہستی کی قدر نہ کی۔ لیکن اہل مغرب نے تا بہ امکان اسکی تصانیف کو گوشۂ گمنامی سے بکوشش بلیغ تلاش کیا اور حواشی و شروح سے مزین کر کے دنیا کے روبرو پیش کیا۔ کیا اس حسرتناک منظر سے شیخ کی روح نہ تڑپ گئی ہوگی اور عالم یاس میں نہ کہتی ہوگی

پڑھی نماز جنازے کی میرے غیروں نے
مرے تھے جنکے لیے وہ رہے وضو کرتے

کس قدر افسوسناک امر ہے کہ اگر شیخ کی تصنیفات ممالک اسلامی میں تلاش کی جائیں تو مشکل

سے دستیاب ہوئی لیکن یورپ نے نہ صرف اکثر تصانیف کو حلیۂ طبع سے آراستہ کیا بلکہ بہت سے مسودات بھی جمع کیے جو انکے کتبخانوں کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ خیر اب اس یاس انگیز داستان کو زیادہ پھیلانا طول کلام کا باعث ہوگا اس لیے اصل مقصود کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ سردست شیخ کی مختصر سوانح عمری سپرد قلم کرنا مدنظر ہے اگر وقت نے مساعدت کی تو اُسکے علمی کارناموں پر تنقید و تبصرہ کسی آیندہ موقع پر کیا جائیگا۔

شیخ کا پورا نام ابوعلی الحسین بن عبداللہ ابن سینا ہے۔ ۳۷۰ھ میں بمقام افشینہ واقع ولایت بخارا تولد ہوا جہاں شیخ کے والد نے بلخ سے آکر سکونت اختیار کی تھی اور ایک بخاری نژاد عورت سے شادی کرلی تھی۔ باپ فارسی نژاد اور مذہب اسماعیلی کا پیرو تھا۔ اور سامانی خاندان کے حکمراں امیر نوح پسر منصور کے یہاں محصلی کی خدمت پر متعین تھا۔ چونکہ باپ کی مالی حالت اچھی نہ تھی اس لیے سلسلۂ تعلیم خاطر خواہ جاری نہ رہ سکا ابتدا میں شیخ کی اُستادی کا فخر شیخ اسماعیل زاہد کو حاصل ہوا۔ مذہبی تعلیم اور تصوف کے رموز ان سے سیکھے۔ دس سال کی عمر میں علوم مروجہ میں کافی دستگاہ حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید بھی حفظ کرلیا۔ بقول ابن خلکان اسی عمر میں قرآن مجید کے نکات و غوامض پر خاصی دسترس ہوگئی۔ ایک سبزی فروش سے حساب کے ابتدائی مسائل سیکھے۔ عبداللہ ناتلی ایک خانہ بدوش عالم سے مختلف فنون و علوم سرسری طور پر اخذ کیے۔ منطق، اقلیدس المجسطی پر اپنی ذاتی کوشش سے قدرت حاصل کی۔ فن طب میں عیسیٰ بن یحییٰ البغدادی کی شاگردی کی۔ الہیات میں بہت کچھ دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ شیخ کا بیان ہے کہ میں نے ارسطو کی ما بعد الطبیعات کو چالیس بار پڑھا۔ اگرچہ کل کتاب ازبر ہوگئی لیکن اُس کے مفہوم و مطالب سے بیگانہ رہا۔ حسن اتفاق سے ابونصر فارابی کی بوسیدہ شرح ارسطو ایک کتب فروش کے یہاں تین درہم میں مل گئی جس میں اُن مسائل دقیقہ کا مل موجود تھا۔ اور اس طرح شیخ کی یہ مشکل رفع ہوگئی۔ طب کے ابتدائی مسائل کی عیسیٰ بن یحییٰ سے تکمیل کرنے کے بعد شیخ نے خود اپنے ذہن رسا سے کام لیا اور بلا امداد اُستاد وہ کمال حاصل کیا جس نے اقران و اماثل میں امتیازی حیثیت پیدا کردی۔ عنفوان شباب میں یہ یگانۂ روزگار جامع علم و فن تھا۔ ابھی عمر کی سترھویں منزل تھی کہ اسکی شہرت نے والیان ملک کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ چنانچہ نوح بن منصور سامانی جلد

نے خود اپنے علاج کے واسطے طلب کیا۔ شفائے کلی حاصل ہوئی۔ اور شیخ مورد الطاف شاہی ہوکر ندمائے خاص میں شامل کیا گیا۔ اور شاہی طبیب کی خدمات تفویض ہوئیں۔ نوح علم دوست حکمراں تھا اُسکے یہاں ایک کتبخانہ تھا جس میں نوادر کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود تھا۔ یہ کتبخانہ خاص طور پر شیخ کی توجہ کا جاذب ہوا۔ چنانچہ امیر نے شیخ کو اسکے استعمال کے پورے پورے اختیارات دیدیے۔ اب شیخ کتبخانے کا بھی نگراں تھا۔ یہاں اُسکو وہ وہ نادرۂ روزگار ذخائر نظر آئے جو اس سے پہلے کبھی نظر سے نہ گذرے تھے۔ بدقسمتی سے تھوڑے ہی عرصے کے بعد کتبخانے میں آگ لگ گئی۔ اور وہ جل کر خاکستر ہوگیا۔ بدخواہ پہلے ہی سے موقعہ کی تاک میں تھے۔ شیخ کے سر آتشزدگی کا الزام لگا دیا کہ اس نے عمداً ایسا کیا ہے تاکہ سوائے اسکے دوسرے لوگ اُس سے مستفید نہ ہوں۔ شیخ نہایت بد دل ہوا۔ اور سامانی دربار سے یکلخت طبیعت برداشتہ ہوگئی۔ اکیس سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور اس حادثۂ جانکاہ نے امور خانہ داری کا بار شیخ کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اسی سال سلسلۂ تصنیف شروع کیا۔ اس اکیس سالہ زندگی کے سوانح شیخ نے خود اپنے ہاتھ سے قلمبند کیے ہیں جو علامہ ابن اصیبعہ نے اپنی کتاب طبقات الاطبا میں بجنسہٖ نقل کردیے ہیں اب خاندان سامانی کا سبکتگین کی چیرہ دستی اور ہوس ملک گیری نے خاتمہ کردیا تھا۔ ناچار شیخ کو بخارا چھوڑنا پڑا۔ علی بن مامون والی خیوا کے دربار میں باریابی ہوئی۔ وزیر سلطان ابوالحسن احمد بن محمد جوہر شناس شخص تھا۔ اُس نے نہایت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ تنخواہ مقرر کردی اور ارباب فضل وکمال کے مجمع میں شیخ کی زندگی بسر ہونے لگی۔ علاوہ دیگر علما وحکما کے پانچ شخص امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ ابوعلی سینا۔ ابوسہل مسیحی۔ ابونصر عراقی۔ ابوالحسن خمار۔ اور ابوریحان البیرونی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ ایک طرف اگر فضل وکمال شیخ کے ہم عناں تھے تو دوسری جانب گردشِ دوراں ہمرکاب تھی۔ بدقسمتی نے یہاں بھی وہی سامان فراہم کردیے جن سے محفوظ رہنے کی خاطر شیخ نے ترک وطن کیا تھا ع ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا است۔

سبکتگین کے بعد محمود غزنوی سریرآرائے تخت غزنی ہوا۔ محمود کی چیرہ دستیوں اور فتوحات نے ایک عالَم کو خوفزدہ بنا دیا تھا۔ اسکے معمولی خطوط ونامہ جات تاجداروں کو لرزہ براندام کردیتے تھے۔ ہر فرماں روا امتثالِ امر کو اپنی سلامتی کا وسیلہ تصور کرتا تھا۔ محمود میں جہاں جوع الارض

تھی وہاں شوق علم و ہنر پروری بھی تھا۔ اپنے دربار میں بہت سے ارباب علم و فن جمع کر رکھے تھے اور جہاں کسی اہل کمال کا پتہ ملتا فوراً طلب کرتا تھا۔ محمود کو جب معلوم ہوا کہ علی کے دربار میں یہ لوگ رہتے ہیں تو بدست خواجہ حسین علی میکائیل نامہ بدیں مضمون ارسال کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کی مجلس میں چند یگانۂ زمانہ اہل فضل و کمال ہیں مثلاً فلاں فلاں اشخاص۔ آپ کو چاہیے کہ اُنکو ہمارے دربار میں روانہ کرکے شرفیابی کا موقعہ دیں۔ ہم منتظر و امیدوار ہیں کہ اظہار منت میں کوتاہی نہ کیجائیگی۔ علی بن مامون نے ہر پنج اشخاص کو تخلیے میں محمود کے منشاء سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی اپنی مجبوری ظاہر کردی۔ ابوالحسن۔ ابوریحان۔ ابونصر تو جانے پر راضی ہوگئے لیکن شیخ اور ابوسہل نے انکار کیا۔ مگر یہ خوب جانتے تھے کہ دعوتِ محمود کا رد کرنا ضرور رنگ لائیگا۔ اس لیے راتوں رات دونوں وہاں سے فرار ہوئے اور صبح کو پندرہ فرسنگ دُور نکل کر دم لیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی ہے۔ یکایک طوفان ابر و باد نے آلیا اور وہ آفت برپا ہوئی کہ الامان والحفیظ۔ آخر خدا خدا کرکے طوفان نے ذرا دم لیا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ ابوسہل ان مصائب و صعوبات کی تاب نہ لاسکا اور اُس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔ اب شیخ یکہ و تنہا تھا۔ آخر بحال تباہ براہ ابیورد و طوس و نیشاپور جرجان پہونچا۔ جو اسوقت شمس المعالی قابوس بن وشمگیر دیلمی والی طبرستان کے زیر نگیں تھا۔ شیخ جرجان کی ایک سرائے میں اقامت گزیں ہوا۔ مطب شروع کردیا۔ خوب ترقی ہوئی۔ آمدنی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اتفاق سے اُسی زمانے میں قابوس کا ایک عزیز بیمار ہوا۔ جسکے معالجے کے واسطے شیخ طلب ہوا اور بیمار نے شفا پائی[1]۔ اس حیرت انگیز طریقۂ علاج کو دیکھ کر

[1] اس موقعہ کے متعلق نظام الملک عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں جو دلچسپ حکایت لکھی ہے اُس کا خلاصہ بادنیٰ تغیر درج ذیل ہے:-

شاہی خاندان کا ایک شہزادہ بیمار تھا۔ اطبا علاج سے عاجز ہوگئے۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ایک خادم نے قابوس سے عرض کیا کہ فلاں سرزمین سے ایک نووارد طبیب مقیم ہے اُسکے علاج سے چند مریض شفا یاب ہو چکے ہیں اگر اُسکو دکھایا جائے تو مناسب ہوگا۔ قابوس نے طلبی کا حکم صادر کردیا۔ شیخ آیا۔ بیمار کی نبض دیکھی۔ قارورے کی جانچ کی۔ کہنے لگا کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو مملکت کے تمام شہروں کے نام جانتا ہو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور ایک شخص نے نام بتانا شروع کیے۔ ایک خاص شہر کا نام سنکر مریض کی (دیکھیے صفحہ ۳۶۲)

قابوس نہایت متعجب ہوا اور طبیب کو بہ نگاہ قدر دیکھنے لگا۔ ابھی تک یہ نہ معلوم تھا کہ یہ طبیب کون ہے؟ لیکن تھوڑی ہی دیر میں حقیقت بے نقاب ہوگئی۔ یہ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سلطان محمود نے علی بن مامون سے پانچ اشخاص طلب کیے تھے۔ تین نے دعوت سلطان قبول کرکے خواجہ حسین علی میکائیل کی رفاقت میں دار الخلافہ کا رخ کیا اور دربار سلطانی میں پہونچے۔ شیخ اور ابوسہل مسیحی نے جانے سے انکار کیا۔ اور مخفی طور پر فرار ہوگئے۔ چونکہ محمود سب سے زیادہ شیخ کا خواہاں تھا اُس نے ابونصر مصور کو حکم دیا کہ ابوعلی کی تصویر تیار کیجائے اور دربار کے دیگر نقاش اُسکی چالیس نقلیں تیار کریں۔ چنانچہ یہ تصویریں مختلف حکمرانوں کے پاس بایں حکم ارسال کی گئیں کہ اس شکل وصورت کا آدمی بوعلی نامی جہاں ملے اُسکو دربار غزنی میں روانہ کردیا جائے۔ ایک تصویر قابوس کے پاس بھی روانہ کی تھی۔ جس وقت شیخ قابوس کے سامنے آیا اُس نے فوراً تصویر کی مدد سے اُسے پہچان لیا۔ اُس وقت کے فرماں رواؤں میں قابوس کریم النفسی و ہنر پروری میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا اور علوم وفنون پر اُسے خاصی دسترس حاصل تھی۔ اس نے شیخ کو بجائے غزنی روانہ کرنے کے اپنے دربار میں جگہ دی۔ لیکن برگشتگی قسمت نے یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کچھ مدت گذری ہوگی کہ قابوس کی معزولی عمل میں آئی۔ اور بالآخر فوج کے باغیوں نے ۴۰۳ھ میں فاقوں سے کام تمام کردیا۔ اس سانحۂ جانگداز نے شیخ کے دل و دماغ

نبض میں حرکت پیدا ہوئی۔ شیخ نے کہا کہ اب ایسے ایک شخص کی ضرورت ہے جو اس خاص شہر کے محلوں اور گلیوں کے نام سے واقف ہو۔ چنانچہ ایسا شخص حاضر ہوا اور اُس نے محلوں اور گلیوں کے نام شمار کرنا شروع کیے۔ ایک خاص گلی کے نام پر پھر وہی حرکت مریض کی نبض میں پیدا ہوئی۔ طبیب نے کہا اب ایسا شخص چاہیے جو اس گلی کے مکانات کا کماحقہٗ علم رکھتا ہو۔ چنانچہ اس وصف کا شخص آیا اور مکانات کے نشانات بتانا شروع کردیے۔ ایک خاص مکان کا نام سنکر مریض پر پھر وہی حالت طاری ہوئی۔ طبیب نے کہا بس علاج ہوچکا۔ اس شخص کی دوا اُس لڑکی کا روئے تاباں ہے جو اُس مکان میں رہتی ہے۔ مریض نے شرم سے نظر نیچی کرلی۔ لیکن ساتھ ہی حقیقت کا اعتراف کیا اور بعد ازاں شیخ کے مشورے سے اُن دونوں کی شادی ہوگئی۔ قابوس یہ طبی کرامت سن کر متحیر ہوا۔ اور طبیب کو باریابی بخشی۔ تصویر محمودی کے ذریعے سے پہچان لیا کہ ابوعلی ہے۔ تخت سے اُتر کر استقبال کیا اور بڑے جوش سے بغلگیر ہوا۔ اور اپنے پاس سریرشاہی پر جگہ دی۔

پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ اُس نے مقتول قابوس کا ایک مرثیہ نہایت پُر درد لہجے میں لکھا ہے جس میں اپنے متعلق بھی اشارہ کیا ہے۔

لما عظمت فلیس مصر واسعے　　　　لما غلا ثمنی عدمت المشتری

(جب میری عظمت بڑھی تو کسی شہر نے میرے لیے وسعت نہ پیدا کی جب میرا نرخ بالا ہوا تو میرا خریدار ہی نہ رہا)

اسی اثنا میں شیخ خود بھی صاحب فراش ہو گیا۔ اور جرجان میں اپنے ایک دوست ابو محمد کی وساطت سے ایک مکان خرید کر وہاں فروکش ہوا۔ اسوقت وہ پورے انہاک سے درس و تدریس و تصنیف میں مشغول تھا۔ کتاب قانون لکھنا شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ منطق وغیرہ فنون کی تعلیم دیتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اُسکی سیماب صفت طبیعت نے پلٹا کھایا اور جرجان سے رخت سفر باندھ کر اورے و قزوین ہمدان پہونچا۔ اتفاق وقت کہو یا شیخ کی عارضی خوش قسمتی، شمس الدولہ والی ہمدان اُسوقت مبتلاے درد قولنج تھا۔ دربار میں رسائی ہونے پر شیخ نے علاج کیا۔ مریض کو صحت کلی حاصل ہوئی بہت کچھ اعزاز و اکرام پایا۔ طبیب خاص سے بتدریج وزارت تک پہونچ گیا اور اب مشاغل علمی کے پہلو بہ پہلو مہمات سلطنت انجام دینے لگا۔ لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹائے؟ انقلاب دوراں نے پھر رنگ بدلا۔ نوشتۂ تقدیر نے پھر وہی سامان گردش پیدا کر دیے۔ فوج کی بغاوت کی بدولت وزارت سے معزولی تک نوبت پہونچی اور حوالۂ زنداں ہوا۔ زمانے نے پھر کروٹ لی اور امیر کو درد قولنج کی شکایت پیدا ہوئی۔ شیخ طلب ہوا۔ علاج کیا۔ صحت یاب ہونے پر امیر نے معافی مانگی۔ اور شیخ پھر وزیر بنایا گیا۔ یہ زمانہ شیخ کی انتہائی انہاک و مشغولیت کا تھا۔ دن کو امور سلطنت انجام دیتا تھا اور شب کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں بسر کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی طبیعت کو انتظام ملکی سے لگاؤ نہ تھا۔ پھر وزارت میں ناکامی ہوئی۔ بددل ہو کر تمام مناصب سے دستکش ہوا۔ اور اس خیال سے کہ مبادا معتوب شاہی ہو ایک عطار کے مکان میں روپوش ہو کر تصنیف میں مشغول ہوا۔ شیخ کو خوف تھا کہ اگر امیر کو سراغ مل گیا تو یقیناً گرفتار ہو کر سزا بھگتنا پڑیگی اسلیے امیر اصفہان ابو جعفر علاء الدولہ سے خفیہ خط و کتابت شروع کر کے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ بدقسمتی سے یہ وہ فاش ہو گیا۔ اور شمس الدولہ نے گرفتار کرا کے سپرد زنداں کر دیا۔ اب کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ ناچار فراری کے منصوبے گانٹھے اور بصد مشکل بھاگ کر علاء الدولہ کے یہاں پناہ گزیں ہوا جہاں شاہی

طبیب اور مشیر خاص کے فرائض انجام دیتا رہا اور اپنی عمر کی آخری دس منزلیں اسی دربار میں طے کیں۔ علاء الدولہ شیخ کا نہایت گرویدہ تھا اور اُسکے اعزاز واکرام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا یہاں شیخ کو پورے طور پر طمانیت قلب حاصل تھی اور وہ بڑی سرگرمی و تن دہی سے اپنی تصنیفات میں مشغول رہتا تھا۔ امیر نے ان سرگرمیوں کی بڑی قدر کی۔ اور اکثر اُن مجالس میں جو شیخ کی نگرانی میں منعقد ہوتی تھیں خود بھی حاضر ہوتا تھا۔ بالعموم یہ جلسے رات کو ہوتے تھے اور بیسا اوقات امیر ہی صدر ہوا کرتا تھا۔ ۴۲۸ھ میں علاء الدولہ عازم ہمدان ہوا۔ شیخ بھی ہمرکاب تھا۔ راستے میں موت نے کام تمام کر دیا۔ ۵۸ سال کی عمر میں یہ آفتاب علوم و فنون ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ اور ہمدان ہی کے ایک نخلستان میں سپرد خاک ہوا۔ سچ ہے

بوعلی سے بھی ہزاروں آئے دنیا میں طبیب
موت کی دارو کہیں سے پر نہ لائے چل بسے

اسی اٹل وقت کی نسبت شیخ نے پہلے ہی اپنی زبان سے کہدیا تھا:۔

از قعرِ گلِ سیاہ تا اوجِ زحل کردم ہمہ مشکلاتِ گیتی را حل
بیروں جستم ز قید ہر مکر و حیل ہر بند کشادہ شد مگر بند اجل

یوں تو شیخ کی ذات جامع علوم مختلفہ و فنون متنوعہ ہے لیکن فلسفہ و طب میں اُس کی حیثیت فرد اکمل کی تھی۔ ممالک شرقی میں شیخ کی عظمت و شان کا مدار زیادہ تر اسکی طب یونانی میں عدیم المثال ہر "قانون" کو اس فن میں الہامی کتب کی سی عظمت حاصل ہے۔ غالباً طب یونانی کا کوئی ایسا ضروری مسئلہ نہیں ہے جو اس ضخیم کتاب میں موجود نہ ہو۔ وہ امام طب ہے اور اس میدان میں امتیازی و استثنائی حیثیت کا مالک ہے۔ اسکو "الشیخ الرئیس" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ممالک مغربی میں فلسفی اور طبیب ہر دو حیثیت سے وہ ممتاز نظر آتا ہے۔ اسکی مبسوط کتاب قانون بارہویں صدی سے سترہویں صدی عیسوی تک یورپ کے مختلف ممالک میں زیر درس رہی ہے اور بطور مستند کتاب کے تسلیم کی جاتی تھی۔ فلسفے میں اُسکی تصنیف الشفا بڑی ضخیم ہے جو بتدریج معرض وجود میں آئی اور نہایت پریشانی کے زمانے میں تصنیف کی گئی۔ اس مبسوط کا خلاصہ خود شیخ نے "نجات" کے نام سے

لکھا ہے۔ مجد الدین سنائی نے جو مشہور نعتیہ قصیدہ لکھا ہے اُسکے ایک شعر میں انھیں ہر دو کتب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کاں نجات و کاں شفا ار باب سنت جستہ اند　　　بو علی سینا نیارد در "نجات" و در "شفا"

دوسری مشہور تصنیف فلسفے میں "اشارات" ہے جس کا پورا نام کتاب الاشارات والتنبیہات ہے اور جس کی شرح و تحشی نصیر الدین محقق طوسی نے کی ہے۔ شیخ کی تصانیف کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکی۔ بیشتر کتب دستبرد زمانہ کی نذر ہوئیں۔ بہت سی کتابوں کو حسین غوری جہاں سوز کی سفاکیوں نے نذر آتش کیا۔ وزیر جمال الدین القفطی نے تصنیفات کی تعداد حسب ذیل بتائی ہے۔ اکیس ضخیم کتب اور چوبیس رسائل جو فلسفہ۔ طب۔ مذہب۔ اقلیدس۔ ہیئت و الکیمیا وغیرہ پر لکھی گئی ہیں لیکن علمائے یورپ نے بڑی کد و کاوش سے ۹۹ کتابوں کا پتہ لگایا ہے۔ مشرقی فلاسفۂ اسلام میں سے اگر کسی کا نام شیخ کا ہم پلہ ہو سکتا ہے تو وہ الفارابی المتوفی ۳۳۹ھ و ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی ہیں۔ شیخ نے فلسفہ میں جو نہایت ہی مفید کام انجام دیا وہ اُسکی باقاعدہ ترتیب و تنظیم ہے۔

بالعموم شیخ کی تصانیف عربی میں ہیں۔ البتہ بوجہ فارسی نژاد ہونے کے فارسی سے بھی اُسے طبعی ذوق تھا۔ چنانچہ اس زبان میں بھی کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ علاء الدولہ کی فرمائش سے "حکمت علائیہ" اسی زبان میں لکھی اور امیر کی نسبت سے "حکمت علائیہ" نام رکھا۔ کتاب البر والاثم بھی فلسفۂ اخلاق پر فارسی میں ہے۔ چونکہ شیخ کا مذاق فلسفیانہ تھا اس لیے وہ ہمیشہ مورد لعن و طعن رہا۔ یہ وہ عہد تھا جبکہ فلسفہ کفر و الحاد کا مرادف تھا۔ اور تعصب فقہا نے عوام کو برگشتہ کر رکھا تھا۔ یا۔ ہاشیخ کو اپنے خیالات کے باعث مصائب برداشت کرنا پڑے اور قوم کی زبان سے ملحد و زندیق کے خطاب ملے۔ اکثر تصنیفات سپرد آتش ہوئیں۔ لیکن شیخ اپنے ارادے میں راسخ تھا اور کبھی جادۂ اعتدال سے نہ ہٹا۔ شیخ نے ارسطو و افلاطون کے فلسفے کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ وہ جرم تھا جو اُس وقت کی مذہبی عدالت میں ناقابل عفو تھا۔ اگر آج اہل یورپ اُن پر عیاذاً کو محفوظ نہ رکھتے تو وہ ہمیشہ کے لیے دنیا کی نظر سے غائب ہو جاتے۔ مستشرقین مغرب نے حق المقدور اکی تصانیف کو گوشہ ہائے عالم سے فراہم کرکے زمانے کے تباہ کن ہاتھوں سے ایک بڑی حد تک بچا لیا۔ شیخ

کی اکثر کتب کو اگر مشرقی کتبخانوں میں تلاش کیا جائے تو ناکامی ہوگی لیکن مغرب کے مرکز علوم میں نظر آتی ہیں - ترجمان حقیقت ڈاکٹر اقبال نے بالکل سچ کہا ہے ؎

حکومت کا تو رونا کیا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو انکو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

اسی مغربی خوان کی زلہ ربائی کا طفیل ہے جو آج مغرب فلسفہ و حکمت میں پیش پیش نظر آرہا ہے جسکو مذہبی غلط فہمی نے بے دینی و الحاد سے تعبیر کیا وہی اغیار کے لیے سرمایہ روشن خیالی ثابت ہوا - اور اس کا اہل مغرب کو دل سے اعتراف ہے -

امام غزالیؒ کے زمانے تک فقہا و محدثین کے اقوال فرمودہ الٰہی کی شان رکھتے تھے۔ اسلیے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس طرف توجہ کرے - امام صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے مقاصد الفلاسفہ لکھ کر علم اختلاف بلند کیا - اور اگرچہ اپنی کتاب تہافتہ الفلاسفہ فلاسفہ کے رد میں لکھی لیکن ساتھ ہی منقذ من الضلال میں اعتراف کیا کہ سوائے الٰہیات کے چند مسائل کے فلسفے کی اور کوئی شاخ منافی اسلام نہیں - نیز اُنھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ اسکی تعلیم کا اسلام مخالف نہیں - بہت سے مسائل میں امام صاحب شیخ کے ہم آہنگ نظر آتے ہیں - مگر ابھی تک فقہا نہ جبر و استبداد باقی تھا - حتیٰ کہ باین تقدس امام صاحب کی بھی مخالفت کی گئی -

شیخ کی اکثر تصانیف کا ترجمہ مغربی زبانوں میں ہو گیا ہے اور ازمنہ وسطی میں یورپ کی اکثر درسگاہوں میں شیخ ہی کا فلسفہ رائج تھا - شیخ کی وفات کے کم و بیش ایک صدی کے بعد ہی سنہ ۱۱۳۰ع میں طلیطلہ (طلیطلہ) میں محکمۂ ترجمہ قائم ہوا - اس محکمے کے ارکان تمام تر یہودی علما تھے - اور متعدد تصنیفات لاطینی میں منتقل کی گئیں - اور پھر یہاں سے یورپ کی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوئیں - شیخ کی کتب کا ترجمہ لاطینی میں ابن رشد کی کتابوں سے پہلے ہوا ہے - اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شیخ کے خیالات پر فلسفیانہ رنگ چڑھا ہوا ہے جسکے باعث وہ اس قدر مطعون ہوا لیکن فقہانے کبھی یہ جرأت نہ کی کہ بالمواجہ اور براہ راست اُسکے فلسفے کی تردید کرتے - البتہ اپنی کمین گاہوں سے کفر و الحاد کے تیر چلاتے رہے - دنیا میں محاسن و معائب

سری کرشن جی

(پروفیسر ٹی - ایل - وسوانی کی کتاب "سری کرشن" سے [illegible] ملخص کیا گیا)

(۱)

"میرے الفاظ دراصل آنسو ہیں !
میں اپنے وطن قدیم کے بُت کو
تباہ و برباد، شکستہ و ریختہ دیکھ رہا ہوں،
اے دیوتاؤ ! آج کل نہایت خوں ریز جنگ برپا ہے،
کرشن جی خود قسمتوں سے برسرِ پرخاش ہیں،
اور اقوامِ عالم اس جنگ و جدل کا بغور مطالعہ کر رہی ہیں۔
کیا اُمید، اعتقاد، اور قدیم الایام پژمردہ محبت کو فنا ہو جانا چاہیے ؟
یا ہندوستان ایک آسمانی سرزمین مقدس ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے ؟

(۲)

پُرانی پہاڑیاں اب تک پاک اور محترم تصور کی جاتی ہیں
دریا اور سمندر اب تک پُرانے راگ گا رہے ہیں
اور وہ ستارے جو قرونِ اولیٰ میں درخشاں تھے اب بھی روشن ہیں۔
وہ ستارے جو بُدھ کی ولادت کے وقت، اور
حضرت عیسیٰ کی ہندوستان میں آمد کے وقت درخشاں تھے۔
فطرت اب بھی محیر العقول خزانوں سے مالامال ہے
لیکن اے انسان ! تو نے اپنے آپ کو نہایت مفلس بنا لیا ہے
تجھ میں تیرے آبائی آباؤ اجداد کی پاک آتش سرد ہو چکی ہے۔

(۳)

کرشن جی قسمتوں سے برسرِ جنگ ہیں
میں اپنے دل میں ایک آواز سُن رہا ہوں!
میرا خیال ہے کہ یہ صدا اُسکی ہے جس نے عرصہ ہوا
بھائیوں کی جنگِ عظیم میں گاڑی چلادی تھی
ساتھیو! کیا تم میرا ساتھ دوگے؟
اور یا تم دنیاداری کو پسند کروگے؟
موت یا حیات ——— ؟ انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے
لیکن موت غیر فانی ہستیوں کا جہیز ہے "

پانچ ہزار سال کا زمانہ گذرا جب کرشن جی نے اس ارض کثیف کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشی تھی، اور کُل عالم کو اپنی تابناک طلعت ریزیوں سے یوسف زار بنا دیا تھا، اُنکی ولادت مہتم بالشان انقلاب کا پیش خیمہ تھی، صفحات تاریخ دیکھو سرزمین ہند میں کیے بعد دیگرے سینکڑوں سلطنتیں قائم ہوئیں، اور اپنی مدت حیات ختم کرتے ہی پارہ پارہ ہوکر نیست و نابود ہوگئیں، لیکن کرشن جی کی عالیشان سلطنت اب بھی قائم ہے کیونکہ اُسکی بنیادیں مضبوط اور اُسکے در و دیوار مستحکم ہیں انقلاب فرانس ایک سیاسی ہولناک واقعہ تھا، اور انقلاب انگلستان میں محض اقتصادی پہلو نمایاں تھے، لیکن فرانس میں آزادی نے کُشت و خون اور غارت گری کی صورت اختیار کی، اور انگلستان میں اقتصادیات نے سرمایہ داروں کی فتح و ظفر کا جامہ پہنا، اسکے برخلاف کرشن جی ایک روحانی سلطنت کے بانی ہوئے، جسکا فیض کرم ہند کے ہر گوشے میں اب تک جاری و ساری ہے، اور جسکی بدولت زمانۂ ماضی میں ہندوستان نے ایک فاتح اولوالعزم اور طاقتور قوم کی صورت اختیار کی تھی کرشن جی نے اپنی مُرلی پر راگ گانا شروع کیے جسکے بعد سے آریہ ورت میں ایک نئے تصور ایزدی کا دور شروع ہوا، اُس خدا کے بزرگ و برتر کا جو حسین و جمیل، اور ازلی و ابدی ہے۔ کرشن میں خداوندی اوصاف موجود تھے، وہ "آنند" اور آزادی کا ایک سچا عاشق زار تھا، اور وہ حسن و جمال کا پیکر لطیف تھا، اور اُس محبت و الفت کا سرچشمہ جسکی ذی روح ابتدا ابدیت ہے۔

ایک وہ بھی زمانہ تھا جسکو زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب ہندوستان نے مغربی اثرات کو قبول کرنا شروع کیا تھا، اور مادیت کی تاریک گھٹائیں اُفق ہند پر نمودار ہونے لگی تھیں، اور تعلیمیافتہ طبقے میں کرشن جی کا نام کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا تھا، لیکن امتدادِ زمانہ نے پتھر کو جوہر کردیا، اور وہی تاریک قلوب جو مغرب کی کورانہ تقلید کو اپنا دین وایمان تصور کرتے تھے رفتہ رفتہ راہِ راست پر آنے لگے، اور آج وہ زمانہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے سرگرم مرد وعورتیں بھی کرشن جی کی حیات کا حُسن و جمال رفتہ رفتہ دیکھنے لگے ہیں، اور یہ دستور اُٹھتا جاتا ہے کہ اُس حیات کو جو ایک انوکھی دلآویزی اور خوبصورتی سے معمور ایک لغو داستانِ پارینہ سمجھیں، ایسے افراد کی اب کمی نہیں ہے جو ابتدائی زمانے میں اُس پر لعن طعن کرتے تھے اب اُسکی عزت اور عظمت کرنے لگے ہیں؛ اور اس نتیجے پر پہونچ چکے ہیں کہ اُسکی تعلیم جو درحقیقت دلوں کو منور کرنے والی ایک تابناک ضیاہے فصیح تھی دنیاوی دانشمندی سے بھی مملو تھی۔

یہی کرشن جی جو بانسری بجاتے اور میدان جنگ میں راگ گاتے تھے بار بار کہتے آئے ہیں کہ زندگی اور تنہائی دو متضاد امور ہیں، اور ان دونوں میں کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا، دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے بَن باسی سنیاسی درحقیقت زندہ افراد کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ زندگی نام ہے عمل کا، اور زندہ رہنا تعبیر ہے میدان عمل میں گوے سبقت لے جانے کی، کوئی فرد باطنی خوبیوں کا مالک نہیں بن سکتا جب تک وہ سوسائٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے حیات بیرونی کی ضروریات کو پورا نہ کرے۔ گیٹے نے بھی کہاہے کہ ابتداے حیات عمل سے ہوتی ہے، لیکن کرشن جی روشن الفاظ میں بتاگئے ہیں کہ ہم کو اپنے عمل کے ذریعے سے نفس کے ارذل طبقے کی نمایش نہیں کرنا چاہیے بلکہ روح کے عمیق ترین حصے کو متحرک کرنا چاہیے جہاں محبت وعشق کا دریا موجزن ہوتاہے۔ پس ضروری ہے کہ ہمارا عمل نفس عالیہ کو ظاہر کرے نہ کہ پوشیدہ، اور اسی وجہ سے آئیڈیل اور حقیقی حیات میں ایک لامتناہی کشمکش موجود رہتی ہے۔

لیکن یہ کشمکش جسکو ایک دائمی جنگ کہنا غلط نہ ہوگا کبھی اس قدر مہلک نہیں ہوئی جس قدر کہ آج کل ہے کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب اقوام عالم جدال وقتال کی اس قدر خوگر ہوں جیسی حالت کہ اس دور میں ہے، زمین وآسمان ہی نہیں بلکہ زمین کے نیچے کا پانی بھی اس دور میں مسلح نظر آرہاہے، تیغ وتفنگ نہ صرف کرۂ ارض پر بلکہ تحت الثریٰ میں بھی ایک طوفان برپا کیے

ہوئے ہیں، اور میلوں کی بلندی پر سے آتش برسائی جاتی ہے تاکہ غنیم کا متاع جنس و مال بھی جل کر خاک سیاہ ہو جائے اور ہر چہار جانب تباہی و بربادی کا محشرستان پامالی پر رونق ہو جائے، کاش ایسی روح فرسا حالت میں جب ہندوستان کا شیرازہ منتشر ہو چکا، اور چپے چپے پر عناد و بغض، کینہ پروری و جنگجوئی کا بازار گرم ہے کرشن جی کی موسیقی موجزن ہوتی، اور وہ محبت و الفت کا پیام لاتی جو کرشن جی کا مقصد حیات تھا، اور جسکی تعلیم دینے وہ دنیا میں مبعوث ہوئے تھے۔

لیکن عوام کا یہ خیال خام محض بے بنیاد ہے کہ وہ دیوتا از سر نو نمودار ہوگا، اور منصۂ شہود کو اپنی جلوہ گری کا مطلع انوار بنائے گا، ہر پاک دل اور ہر امنگوں سے لبریز روح خدائے بزرگ و برتر سے روحانی سطح پر وصل حاصل کر سکتی ہے، اس لیے خداوندی شان کے منافی ہے کہ وہ اپنے سطح نظر سے نیچے قدم ڈالیں اور پھر آکر گنہگار بندوں میں شامل ہو جائیں، آن واحد کے لیے وہ مقدس ہستیوں کو اپنے پاس تک بلا سکتی ہیں اور شراب الوہیت پلا سکتی ہیں۔ مزید براں خدا انسان کا عمیق ترین نفس ہے، اس لیے ان دونوں کا جدا ہونا ایک ناممکن الوقوع امر ہے جسکا کبھی خوف نہ ہونا چاہیے، ایک پاک وصاف دل میں اور اُس اطاعت شعاری میں جو صداقت کی خاطر تکالیف برداشت کرنیکے بعد حاصل ہوتی ہے، اور اُس روزانہ پرستش میں جو ہم محبت کے مندر میں ہر صبح سنا کرتے ہیں ہم اُس دلفریب آقا کی موسیقی سُن سکتے ہیں۔ چرواہوں کے جھرمٹ میں وہ راگ اب بھی ہوا کے پروں پر رواں ہیں، کاش ہماری دنیا کا مختصر سا دروازہ کھلے اور ہم اُس آب و ہوا میں سانس لے سکیں جہاں حسن ایزدی کی درخشاں جلوہ فرمائیاں موجود ہوتی ہیں، دراصل دل کا صاف ہونا ایک بدیہی شرط ہے، اسکے بعد اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تخصیص نہیں، ہر فرد پیامات الٰہی سُن سکتا ہے، اور اُن نورانی شعاعوں سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جو صرف برگزیدہ ہستیوں کی باصرہ نوازی کرنے کے لیے تخلیق کی گئی ہیں۔

میں نے اُسکو اولیں مرتبہ ایک حسین مگر خاموش و پرسکون موضع میں دیکھا تھا جہاں ایک میلہ میں قرب و جوار کے مرد، عورتیں اور بچے جمع ہوئے تھے، اور چونکہ وہ کرشن جی کی ولادت کا یوم سعید تھا اس لیے کل مجمع رنگا رنگ کے ملبوسات سے مرصع و مزین تھا۔ سیاہ آنکھوں والی لڑکیاں

ایک بے خبر مستانہ پن میں مصروف قتل و غارت گری تھیں سن رسیدہ مرد اور عورتیں گھر کے ساز و سامان کی خریداری میں مصروف کار تھیں، بچے کھلونے اور مٹھائی کے حصول میں کوشاں تھے، لیکن اُس جم غفیر میں صرف ایک ذات ایسی تھی جس نے میری توجہ اپنی جانب منعطف کی، وہ اپنی بانسری بجا رہا تھا، اُس کے لحنِ داؤدی کو سُن کر میں نے اپنے دل کی کھڑکیاں کھول دیں تاکہ اُسکے دلآویز نغمے اُس میں پناہ گزیں ہوں۔

وہ ماہر موسیقی باہزاراں عشوہ گری وہاں موجود رہا، پری تمثال لڑکیاں گرداگرد آکر جمع ہوگئیں اور جام محبت پی پی کر سرشار ہونے لگیں۔ نوجوان لڑکے آتے اور اُس کی وجد آور سحر طرازی سُن سُن کر مست و بیخود ہو جاتے، لیکن وہ کسی معمولی کلونت کی طرح انعام و اکرام کا متمنی نہ تھا، وہ لب راہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ میلے کے بعد ایک روز میں اُس سے ملنے گیا اُس کی روح ایک بچے کی طرح پاک اور بے لوث تھی گو دماغ عقل و ہوش سے معمور تھا۔ وہ اپنی بانسری بجانے میں شدت سے محو تھا جسکو وہ مکان میں کھیت میں، سڑک پر، شاہراہ پر، میلے میں، بازار میں بجاتا پھرتا تھا، میں پھر ایک روز شام کے وقت اُسکے پاس گیا، اُس نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ دَوران مکالمہ میں میں نے دریافت کیا کہ اُس عظیم الشان بڑائی اور اہمیت کا راز کیا ہے جس کی جستجو میں افراد و اقوام سرگرداں ہیں؟

"بڑائی"؟" بانسری بجانے والے نے کہا "محض ایک نقاب ہے جو چھوٹے دماغوں پر آویزاں ہوتا ہے۔ برادر من! محبت کرنا سیکھو، اور بڑائی کا خیال دل سے نکال دو"

لیکن سیاسی مبصر کہتے ہیں اور بار بار زور دیتے ہیں کہ ہندوستان کو اقوام عالم کے زمرے میں بڑا ہونا چاہیے۔ اور ترقی و تمدن کے میدان میں گوئے سبقت لیجانا چاہیے"

"سیاسی مبصر بسا اوقات محب وطن نہیں ہوتے، بڑائی کی جستجو دورحاضرہ کی جمہوریت پر ایک سیاہ ترین داغ ہے، اُس کی محرک ملک گیری و ہوسناکی ہے، اور اس کا ذریعۂ حصول جنگ و غارت گری۔ ہندوستان کو بڑا نہ ہونے دو بلکہ بنی نوع انسان کا ایک ادنیٰ ترین خدمتگذار"

"اس خدمتگذاری کا راستہ کون سا ہے؟"

مُرلی منوہر بہت سفر کر چکا تھا، اور بہت سے عقلا و فضلا سے ہمکلام ہوا تھا، اُس نے کتاب فطرت

کا مدتوں مطالعہ کیا تھا، اور کُل عالم کی مستند تاریخیں بغور پڑھی تھیں جو خدا کے باغیوں کے شکستہ خوابوں سے تعبیر ہوتی ہیں ——— صداقت، حُسن، اور آزادی کے خواب جن کو قوت پُرتمکنت شوکت آنِ واحد میں پریشان کر دیتی ہے۔

بانسری بجانے والا کچھ دیر رُکا اور کہنے لگا "خدمت کا طریقِ افضل صرف یہ ہے کہ غلط خیالات اور لغو اعتقادات کو نیست و نابود کیا جائے، ہر زمانے میں غلط فہمیاں ہوتی چلی آتی ہیں، اور بعض اوقات دنیاوی ترقی محض ایک غلط فہمی سے دوسری غلط فہمی تک جست کا نام ہوتا ہے تہذیب و تمدن کا خوابِ خیال اس زمانے میں خاص طور سے اہم ہے جس نے انسان کی زندگی میں خاص حصہ لیا ہے۔ تم سب مغرب کی تہذیب کے موافق شائستگی حاصل کر رہے ہو، تمھاری سیاست یورپ کی سیاست کی ایک صدائے بازگشت ہے۔ کیا کوئی غیر ملکی سیاسی مشین تمھارے ملک کے جسم مردہ میں روح پھونک سکتی ہے؟

حُسن کی دل فریبیاں بھدّی ہو جاتی ہیں اگر وہ غلط تصورات اور خیالات میں پوشیدہ رہیں اس آلایش کو دُور کرو، پھر تاریخ کی روح اور قوم کا اصلی اور واحد تخیل تمھارے سامنے ہوگا۔ روپیہ، شہرت، خطابات، قوت اُن انسانوں کا مقصد حیات ہیں جو علم سے دُور اور جہالت کی تاریک وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کیا تم دورِ موجودہ کی نہ ختم ہونے والی جنگ آرائیوں میں حسن و جمال کا مشاہدہ کر سکتے ہو؟ اگر نہیں تو تم نے ہندوستان سے محبت کرنا نہیں سیکھا، اور خدمت گزاری کے صراطِ مستقیم سے دُور رہے"۔

میں اُسکو دیکھتا تھا اور فرطِ حیرت و استعجاب سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے دریافت کیا کہ تم نے کس طرح علم سیکھا، کس طرح مغنی کی کامل مہارت حاصل کی، اور حُسن کے پُجاری بنے؟

جسکے جواب میں وہ بجوّد ہو کر مجھے ایک داستانِ درد سُنانے لگا اسوقت مجھے معلوم ہو سکا کہ کس طرح ایک المناک درد اُسکے پہلو میں جاگزیں ہوا، اور اُس درد نے رفتہ رفتہ نغمے کی صورت اختیار کی۔ وہ فتنۂ دوراں بچپن تھا اور چاہتا تھا کہ کسانوں، مزدوروں، اور دیہاتیوں کو راگ گا گا کر سنائے، اور اُنکے قلوب کو نازک اور لطیف تاثرات کا مدفن بنا دے۔ اسی درد

سے اُس نے اپنے آرٹ کی تعمیل کی، اور رنج والم کے سیاہ ترین سمندر میں اُس نے حسنِ ایزدی کا حسین ترین پر تو دیکھا۔

رخصت ہونے سے قبل اُس پیکرِ ناز و انداز نے پھر ایک مرتبہ بانسری بجائی، اور ایک ایسا حیرت انگیز نغمۂ درد چھیڑا کہ میرے نظامِ عصبی میں ارتعاش پیدا ہونے لگا، اور میں مضطرب ہو کر پوچھنے لگا کہ اس جادوگری کا مفہوم کیا ہے؟ ۔جس کا جواب یہ تھا۔

"اُس جگہ چلو جہاں یہ بانسری رہنمائی کر رہی ہے، اُس مقدس سرزمین میں جہاں ناکام تمنائیں اور ناشاد مرادیں رہا کرتی ہیں، اور جہاں ربِّ اتھر با ہزاراں جاہ و جلال جلوہ فگن ہوتا ہے صرف رنج و محن کی حسن و خوبی ہر ذی حس کی حیات کو مالا مال، قوی، اور آزاد بنا سکتی ہے"

میں صرف وہی کہنا چاہتا ہوں جو تم بارہا سُن چکے ہو لیکن بدقسمتی سے جو ہم نقش و نگار طاقِ نسیاں بنا چکے، تم نے اُس سرزمین کی کرشمہ سازیاں اور حیرتناکیاں مطالعہ کی ہیں جو تمھاری آرزوؤں کا گہوارہ، تمھارا ملجا و ماویٰ، یعنی تمھارا وطن ہے۔ تم نے کرشن جی کی ترنم ریزیوں کو توصفحۂ دل سے حرفِ غلط کی طرح محو کر دیا، اس لیے تمھاری بیکسی و بے بسی، ثقاہت و مصیبت ضرب المثل ہو چکی۔ تمھارا خیال غلط ہے کہ تمھارے پاس نہ دولت ہے اور نہ عزت ہے۔ تم ایک وسیع اور پُرشوکت میراث کے مالک ہو، تم میں لامتناہی خزانے مدفون ہیں، اور تمھارے دلوں میں ابدی الہام کا ایک وسیع سرچشمہ موجزن ہے۔ کاش تم کو اپنی اس پوشیدہ حشمت و سطوت کا پورا پورا احساس ہوتا اور تم محسوس کر سکتے کہ کائنات بھی تمھاری فتوحات کے لیے ناکافی ہے۔

دلوں کا وہ کونسا عزیز ترین راز تمھارے قلوب میں مخفی تھا جسکو کرشن جی کی مُرلی نے طشت از بام کر کے عناصر میں ہلچل ڈال دی، اور جسکے مقناطیسی اثر سے سادہ لوح گوپیاں مست الست ہو جاتیں، اور اُس آقا کی خدمت اپنا مقصدِ وحید تصور کرنے لگتیں۔ بیشک کرشن جی کے نازک نغموں میں سچی خوشی پوشیدہ ہوتی تھی جو مکمل آزادی کی روشن ترین دلیل ہے۔ وہ جو حریص اور خود غرض ہیں، جو جبروت و سطوت کے مکانات تعمیر کرتے ہیں، اور جو قلیل عرصے میں

قید خانے بجاتے ہیں، اور روح کو اپنی گرفت میں مقید کر لیتے ہیں۔ ہم قوت، رتبہ، اور سونا خریدتے ہیں، لیکن اس خرید و فروخت میں ہم اپنا متاعِ آزادی دے ڈالتے ہیں۔ یہ ہماری نہایت عبرتناک کوتاہ اندیشی اور کم بینی ہے کہ ہم سونے کی جگمگاہٹ پر فریفتہ ہو جائیں، حکومت کی ابلہ فریبیوں کو ما لِ زندگی تصور کر لیں، اور اُس جوہرِ عزیز سے دست بردار ہو جائیں جو ہماری خودداری، عزت اور جاہ و جلال کا بنیادی پتھر ہے۔ حیف!

آثارِ حیات بالعموم کیا ہیں؟ یعنی زندگی عبارت ہے کس سے؟ دراصل زندگی نام ہے تحریک حاصل کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کا۔ پودھا اُسوقت ضایع ہو جاتا ہے جب اُس میں روشنی، ہوا، اور پانی کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ ایک مُردہ پھول موسم کے تغیرات اور آب و ہوا کی گوناگوں تبدیلیوں سے قطعاً بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ کُتا مُردہ ہے جو اپنے آقا کے کلمات محبت سے غیر متاثر رہے اور اثرات ماحول سے مستغنی ہو۔ پس اُس شخص کو مردہ تصور کرنا چاہیے جو اپنے اعزا و احباب کے محبت آمیز اثرات قبول کرنے کا اہل نہ ہو اور دنیا و ما فیہا کی کرشمہ سازیوں سے بالاتر ہو جائے۔ تمھارا جسدِ خاکی جسکے اندر طائرِ روح موجود ہے ایک عظیم الشان میراث ہے جو تمھارے آبا و اجداد سے تم تک پہونچی ہے، اور تمھارا ذہن اور دماغ اُس سوسائٹی کا مرہونِ احسان ہے جس میں تم شرکت کرتے ہو، اور موجود رہتے ہو۔

گیتا میں کرشن جی نے دو باتوں پر خاص توجہ دلائی ہے۔ یعنی "تپسیہ" اور "یگین"۔ تم نے زندگی کا بڑا حصہ چین و آرام، آسایش و زیبایش میں بسر کیا ہے، اس لیے میں تم کو تپسیہ کے راستے پر چلانا چاہتا ہوں۔ قوموں کی تدریجی ترقی کے کارنامے پڑھو، ممالک کی تاریخیں دیکھو، وہ صرف تپسیہ کرنے والے اصحاب کے آہنی ارادے تھے جو تاریخ کو وجود میں لائے اور عالم کے کاروبار میں انقلابِ عظیم پیدا کر گئے۔ تم دولتمند اور مالدار آدمیوں کا تعاقب کرتے ہو اس اُمید موہوم میں کہ شاید اُنکے خوانِ کرم سے کوئی ریزہ گر جائے، اور تم اُس سے لطف اندوز ہو سکو۔ یہ طرزِ عمل آزادی کے لیے سم قاتل ہے۔ اور خودداری کے منافی۔ کیا خود غرض رؤسا نے کبھی تمھارے ملک کی مدد کی، اور فاقہ کشوں کے دامانِ حاجت کو گوہرِ مراد سے بھرا؟ میں معمولی اصحاب کی چاپلوسی اور دنیا دار عقلا کی خوشامد کو اپنا پیشہ بنانا نہیں چاہتا، اور اُنکی توہین بھی میرا مقصد نہیں ہے،

لیکن یہ میں جانتا ہوں اور بہ زور کہنا چاہتا ہوں، کہ ملک و ملت کا اصلی سرمایۂ فخر و نازش غرباء و بیکس فقراء ہیں جن کے صاف و شفاف دلوں پر کرشن جی حکومت کرتے تھے اور جن سے وہ بطیب خاطر متوجہ ہوتے تھے۔ گوکل اور بندرابن کے نادار چرواہے اور مفلوک الحال گوپیاں مذہبی ہنگامہ آرائیوں میں دل و جان سے شریک ہوتی تھیں۔ جن کے خیالات سنجیدہ، جذبات پاکیزہ اور عقائد درست ہوتے تھے۔ تپسیہ سے ہندوستان کو بڑی قوت پہونچے گی کیونکہ اس سے منکسر المزاجی صلاحیت، خدمت کی عادت اور الفت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی وہ اوصاف ہیں جن کی ہند کو شدید ضرورت ہے۔ ایک دولتمند اور عالم شخص آرٹ اور تبحر علمی پر زور و شور سے گفتگو کرنے لگتا ہے لیکن تمھارے دل مطلق اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایک سادھو آموجود ہوتا ہے اور چند سادے فقرے زبان سے کہکر اپنا شیدائی بنا لیتا ہے۔ یہ کیوں؟ سادھو تپسیہ کا بندہ ہے۔ اور اُسکے فعل اور اُسکے گفتار میں تپسیہ کا جوہر موجود ہوتا ہے۔

تپسیہ میں "گینا" کا اضافہ کردو۔ "گینا" کوئی علمی اور بیرونی رسم نہیں ہے۔ "گینا" صرف وہی شے ہے جو خدا کے حضور میں پیش کرتے ہو۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اُس خداوند کون و مکاں کے روبرو کیا پیش کرسکتے ہیں جسکے دربان سلیمان نوازی پر قادر ہوں؟ لیکن خدائے جل شانہٗ چھوٹی سی چھوٹی اور حقیر سے حقیر شے قبول کرلیتا ہے بشرطیکہ وہ خلوص اور محبت کے ساتھ پیش کی جائے۔ اور حضور قلب سے بصد خضوع و خشوع اُس دربار عالیہ میں گذرانی جائے جہاں محمود و ایاز ہمرتبہ نظر آتے ہیں۔ امداد کا ایک چھوٹا سا خیال، ہمدردی کا ایک حقیر ارادہ، مہربانی کا ایک مختصر سا کام، محبت و الفت کا ایک ناچیز کرشمہ، یہ تمام امور اُس رب غفور کی نگاہ میں بہت اہم ہیں اور اس لیے خاص طور سے قابل التفات۔

محمد عبدالشکور بریلوی

اے دل نفسے بیادِ رحمٰن نشدی		وز کردۂ خویشتن پشیمان نشدی
صوفی و فقیہ و عالم و دانشمند		این جملہ شدی مگر مسلمان نشدی

شیخ ابوسعید ابو الخیر

کلامِ حسرت

نہ ہوے آپ آشنائے خلوص — نہ سنی میری التجائے خلوص
ہم ہیں بیمارِ کبر و عُجب و ریا — کیوں نہ درکار ہو دوائے خلوص
طے کر اے دل بہ زورِ علم و عمل — راہِ بیم و رجا بپائے خلوص
زہد، حیرانِ کارِ عشق ہوا — ہم میں پاکر نہ کچھ سوائے خلوص
بڑھ چلی اُن کی بے رُخی، گویا — تھی سزائے ہوس جزائے خلوص
تم دعا کو بھی التجا سمجھے — تھی وہ حالانکہ اک صدائے خلوص

زہد و تقوائے ریاضت و عزلت — بن گئے جبکہ دست و پائے خلوص
نفس و شیطان و خلقت و دنیا (ق) — سب پہ غالب ہوئی دعائے خلوص

دل کا تقوائے ہے خیرخواہیِ خلق — ہو بشرطیکہ بر بنائے خلوص

فکرِ رزق و مصائبِ تقدیر — عارضِ حال تھے بجائے خلوص
سو بصبر و توکل و تفویض (ق) — بن گئے شیوۂ رضائے خلوص

توبہ و علم و حمد و شکر ہیں باب — شہر ہے شہرِ پُرفضائے خلوص
بلکہ ذکر و فکر و ریاض و صوم و صلوٰۃ — سارے جھگڑے ہیں اک برائے خلوص
اور حقیقت میں انکے سب کے سوا — عشق ہے اصل مدعائے خلوص

اُنکو اب ضد یہ ہے کہ حسرت بھی
شوق ظاہر کرے بجائے خلوص

منزل قرب

عُجب — عُجب

ریا — ریا

جنکا علاج اخلاص ہے

موانع → خلوص ۲

خوف ۳

عمل ۴

علم (۱)

قضاہاے الٰہی — جنکا دافع شیوۂ تسلیم و رضا ہے

ہجوم مصائب — جنکا دافع صبر ہے

وسوسۂ کاروبار — جنکی دافع تفویض ہے

فکر رزق — جس کا دافع توکل ہے

عوارض

نفس → کو بذریعہ تقوی مغلوب کرنا چاہیے

شیطان → ریاضت مجاہدہ سے مغلوب ہوتا ہے

خلقت → عزلت (علاج)

دنیا → ترک دنیا بذریعہ زہد برائے درستی عبادت و دنیائی ثواب (علاج)

عوائق

۵ در توبہ → توبہ بغرض حصول توفیق و قبول

۶ باب علم → علم توحید شریعت طریقت

حرام و فضول حلال سے بچنا تقوی ہے

کان ۲

دل ۳

زبان ۴

کبر ۱ — نخوت ۲ — حسد ۳ — طول امل

واعظوں سے التماس

مذہبی ضرورت کے لیے تعلیم قرآن سے آغاز تعلیم ہوا۔ پھر اسکے بعد صحبت اور اقوال و افعالِ رسولؐ سے قرآن کا سمجھنا اور اصولی مسائل سے فروعی مسائل کی تعلیم شروع ہوئی۔ جب کوئی بات جماعت کے سمجھانے کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی تو وہ خطبے یعنی اسپیچ کی ذریعے بیان کی جاتی تھی۔ مدینۂ منورہ میں خلافت اربعہ تک تعلیم مذہب کا یہی ڈھنگ رہا۔ مدینۂ منورہ کے باہر جو صحابہ یا تابعین جاتے تھے اُنکے گرد لوگ آنحضرت محمد صلعم کے حالات سننے کو مشتاقانہ جمع ہو جاتے تھے اور بیان کرنے والے اپنی قلت معلومات کی وجہ سے یا لوگوں کو اپنی طرف گرویدہ کرنے کے لیے کبھی کبھی بیان میں مبالغہ بھی کرتے تھے۔ اور بعض یہ بھی سوچتے تھے کہ اگر اچھی بات سکھانے میں کچھ مبالغہ بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ یہیں سے وضعی حدیثوں کی ابتدا ہوئی۔ اور یہ عیب خلیفۂ دویم نے اول اول محسوس کرکے اپنے عاملوں کو تاکید کرنا شروع کی کہ غیر مقامات پر جاکر تم تعلیم قرآنی کے بجاے حدیث نبویؐ کے بیان میں غلو نہ کرنا۔ یہاں تک غنیمت تھا۔ لیکن خلیفۂ سیوم کے آخر عہد میں جب مسلمانوں میں سیاسی جھگڑے شروع ہوے تو وضع حدیث کی طرف لوگ بدنیتی سے رجوع ہوے اور خطبے نے وعظ کا رنگ اختیار کیا۔ حضرت علیؓ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ واعظوں کے جلسوں کو منتشر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ کا وعظ روکنے کے لیے حضرت علیؓ خود موقع پر گئے تو بیانات وعظ کو صحیح اور مناسبِ حال پاکر فرمایا کہ ایسے واعظ کا میں مخالف نہیں ہوں"۔

حضرت معاویہؓ اور اُنکے مابعد زمانے میں موضوع حدیثوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ بڑی مشکل سے صحیح حدیثیں الگ کی گئیں۔ اہل سنت و جماعت کے نزدیک چھ کتابیں حدیث کی جو صحاح ستہ کے نام سے مشہور ہیں زائد معتبر ہیں۔ لیکن انکے اعتبار کے بھی مدارج ہیں۔ یہ مضمون حدیثوں کے متعلق نہیں ہے، اسلیے زائد لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ جو حدیثیں سیاسیات کے متعلق ہیں اُنکے متعلق ذی علم کو زائد تر غور و فکر کے ساتھ رائے قائم کرنا چاہیے۔

غرضکہ واعظین کا گروہ جو حضرت علیؓ کے وقت میں قائم ہو چکا تھا وہ روز بروز بڑھتا گیا۔ محدثین اس جماعت کو "قصاص" سے تعبیر کرتے ہیں۔ واعظ کا لفظ زمانہ ما بعد میں اختیار کیا گیا ہے۔ واعظوں کی جماعت ہر قرن میں رہی اور اشاعت مذہب میں ان سے مدد ملی۔ لیکن یہ کہنا کہ ان سے کبھی نقصان نہیں پہونچا، صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ جب سیاسیات کے متعلق انکے ذریعے سے بیجا بناوتیں پھیلیں یا پادشاہ کی نامناسب خواہشوں کی تائید انکے ذریعے سے کی گئی تو ظاہر ہے کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔ اور تاریخیں بتاتی ہیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ضرور ہوا۔ اور جن وعظوں میں واعظوں کے ذاتی اغراض شامل تھے یا واعظوں کی مذہبی ناقابلیت شامل حال تھی وہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔

اس زمانے میں بھی واعظوں کی کثرت ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو محض حصول ثواب کی غرض سے وعظ کہتے ہیں لیکن دُنیا ان سے خالی نہیں ہے۔ انھیں میرے خیال میں مجاہدین اسلام میں شمار کرنا چاہیے۔ ان واعظین کے عقائد درست ہوں اور مذہبی معلومات کافی ان کے پاس ہوں تو یہ امام قوم ہیں۔ انکے بعد وہ واعظین ہیں جو اکتساب رزق کے لیے پیشۂ واعظی اختیار کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قوم سے بذریعہ توکل وقناعت صدقہ یا ہدیہ پائیں یا کسی جماعتِ مسلمین کے تنخواہ دار ملازم ہوں۔ میں اس قسم کے پیشے کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں اس کے کہنے کو تیار ہوں کہ یہ پیشہ بہت سے مروجہ پیشوں سے اچھا ہے۔

عام طور پر یہ شکایت ہے کہ واعظوں سے نفع نہیں پہونچتا۔ میرے نزدیک یہ شکایت صحیح نہیں ہے۔ نفع ضرور پہونچتا ہے لیکن نہ اتنا جتنا پہونچنا چاہیے۔ نفع نہ پہونچنے کی وجہ یہ ہے کہ واعظین کا طریقہ وعظ بگڑا ہوا ہے۔ میں اس مضمون میں اُن نقائص کا بیان کرتا ہوں جنکی اصلاح ہونا چاہیے اور پھر وہ طریقہ لکھنا چاہتا ہوں جس پر عمل کرنا چاہیے۔

بعض واعظ ایسے اوامر بیان کرتے ہیں جن کے وہ خود پابند نہیں ہیں یا ایسی باتوں سے منع کرتے ہیں جن سے وہ خود اجتناب نہیں کرتے۔ ایسے واعظوں کا وعظ باعث ہدایت نہیں ہوتا باعث تضحیک ہوتا ہے۔ واعظوں سے یہ فرمایش کرنا کہ وہ اتباع سنت کا خود نمونہ دکھائیں بے سود ہے۔ لیکن یہ تو اُن سے کہا جا سکتا ہے کہ جن امور کے آپ خود پابند ہوں اُنھیں کی بابت

دوسروں کو ترغیب دیجیے اور جن عیوب میں آپ خود مبتلا ہیں اُن سے دوسروں کو نہ ڈرائیے۔ واعظین کے نزدیک سامعین کا ہنسانا یا رُلانا غایت وعظ گوئی ہے۔ حالانکہ یہ تھیٹر کے تماشوں کی شان یا بھانڈوں کا شیوہ ہے۔ واعظوں کی غرض تبلیغ احکام مذہب ہے۔ ہنسانا یا رولانا ان کا کام نہیں ہے۔ یہ خلافتِ انبیا کے فرائض ہیں۔ انھیں ہیبت سکون اور وقار سے انجام دینا چاہیے۔ شعرخوانی گو متقدمین کا شعار وعظ نہ تھا لیکن اگر اعتدال کے ساتھ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں مگر مجلس وعظ کو بزم مشاعرہ بنا دینا جلسۂ مذہبی کی توہین کرنا ہے۔ تعلیم اور تلقین احکام مذہبی کے سوا اگر کوئی اور غرض واعظوں کے مدنظر ہو تو یہ مجلس وعظ کا بدنام کرنا ہے۔ احکام قرآن اور حالات رسول کے سوا مجلس وعظ میں اور باتیں بیان کرنا بیکار اور کبھی کبھی منجر بہ ضلالت ہوتا ہے۔ ہاں انبیا علیہم السلام کے قصص اور علما و مشائخ امت محمدی کے حالات جو اتباع سنت نبوی سے مناسبت رکھتے ہوں بیان کیے جائیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ یہ سنتِ نبوی کا بیان کرنا ہے۔ معائب شرعی کی توہین مجلس وعظ میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر روے سخن حضارِ مجلس کی طرف ہو تو چنداں مضائقہ نہیں۔ ایسے موقع پر مداہنت سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن طرز بیان اور الفاظ ایسے ہوں کہ حضار جلسہ کو بیان سے تنفر نہ پیدا ہونے پائے۔ اور اگر واعظ کو اپنی زبان پر قابو نہیں ہے تو اُسے اُس وقت تک کہ سامعین کے دلوں پر وُسعت و قعت پورے طور پر نہ جم جائے نفرت انگیز مضامین سے گریز کرنا چاہیے۔ اور جب سامعین معتقد ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہے سمجھائے۔ یہ بڑا نازک مقام ہے۔ واعظ کو اعلاے کلمۃ الحق میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ لیکن اُسکے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ سامعین منتشر نہ ہوں۔ کیونکہ وعظ تو آدمیوں کے سُنانے کے لیے ہوتا ہے۔ در و دیوار کو سنانا مقصود نہیں ہوتا۔

جتنی باتیں اوپر بیان کی گئیں ان سے زائد تر اہم محل اور موقع کا پہچاننا ہے۔ ایک مرتبہ میں ایک مجلس میلاد شریف میں گیا۔ بیان کرنے کے لیے ایک مولوی صاحب منتخب ہوے تھے۔ رطب و یابس اقوال کے بجاے اُنھوں نے وعظ بیان کرنا شروع کیا۔ میں سمجھا کہ مولوی صاحب موجودہ طرز کو بدعت سمجھ کر خدا اور رسول کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

یہ حالت دیکھ کر میں ہمہ تن گوش ہوا۔ مولوی صاحب نے وہ آیۂ قرآنی پڑھی جو حضرت عائشہؓ کی براءت میں نازل ہوئی تھی اور سارا وقت اور ساری قابلیت اسکی تفسیر بیان کرنے میں صرف کردی۔ باہر مرد اور پردے میں عورتیں تھیں۔ میں نہایت ہی بے کیف ہوا اور دوسرے لوگ بھی بدحظ ہوسے۔ خیر یہ تو انتہائے بے عقلی تھی۔ لیکن درس اور وعظ میں واعظین عموماً فرق نہیں سمجھتے۔ درس دینے کا یہ طریقہ ہے کہ وقت و مقام معین پر احکام مذہب بیان کیے جائیں۔ ایک کے بعد دوسرا بیان مسلسل ہو اور جب سلسلہ ختم ہو تو پھر اس کا دَور شروع ہو۔ بیان زبانی ہو یا کسی کتاب کے ساتھ مخصوص ہو۔ پچھلی صورت میں سامعین کے ہاتھوں میں کتابیں ہوں تو مضائقہ نہیں۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ سامعین میں سے ایک پڑھے اور دوسرے سنیں۔ اور درس دینے والا مفہوم سمجھاتا جائے۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدرس ہی پڑھے، معنی کہے، مفہوم سمجھائے۔ سامعین کے ہاتھ میں کتابیں ہوں یا نہ ہوں، بیان سے وہ فائدہ اُٹھائیں۔ یہ طریقہ درس کا متقدمین میں تھا۔ اسکی مثال میں نے اپنے بچپن میں پٹنہ میں دیکھی تھی۔ بے انتہا میں نے پسند کیا۔ میں نے چاہا کہ اسکی مثالیں اور شہروں میں بھی قائم ہوں مگر نہ ہوئیں۔ اور قاضی رضا کے مرنے پر پٹنہ میں بھی یہ طریقۂ درس قائم نہ رہا۔ دوسرا طریقہ وعظ و نصیحت کا ہے۔ وعظ میں مقامی ضرورت اور سامعین کی حالت کا خیال رکھنا از بس ضروری ہے۔ وعظ اور درس میں واعظین ذرا بھی فرق نہیں کرتے۔ اور اس لیے اُن کے وعظ کا وہ اثر نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ مثلاً انجمن اسلام گورکھپور میں برسوں سے سالانہ جلسے ہوتے ہیں اور واعظین جمع ہوتے ہیں۔ بڑا مجمع بڑی دھوم ہوتی ہے۔ تمام شہر میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ اور جب سے یہ خیال ہوا کہ آریہ صاحبوں کے جلسے سے اسلامی جلسہ شان و شوکت میں بڑھا ہوا ہے تب سے تو اور بھی جلسوں کی شان بڑھ گئی ہے۔ لیکن ان جلسوں سے کوئی معتدبہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ مذہبی معلومات تو ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ ایسے نہیں ہوتے کہ مذہبی معلومات پر معتدبہ اضافہ کریں۔ میں اسکے بھی خلاف ہوں کہ ایک ہی جلسے میں کئی اشخاص یکے بعد دیگرے کھڑے ہوکر اپنی خوش بیانی کا نمونہ دکھائیں۔ مجلس وعظ کو مولویوں کی نمائش گاہ بنانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ گو بظاہر مولویوں کے لیے مضمون علیحدہ علیحدہ

مقرر کر دیے جاتے ہیں لیکن تقریر کے وقت انھیں موضوع کا خیال نہیں رہتا۔ ہر مولوی اسی بات پر آ جاتا ہے جسے وہ بہتر جانتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معلومات کا دائرہ بہت چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ ایک نقص یہ بھی ہے کہ ان واعظوں کو پہلے سے اطلاع نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے اپنے مضامین کے لیے تیار ہو جائیں۔ کتنا ہی متبحر عالم ہو لیکن اپنا وعظ مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے پہلے تیار نہ کرلے تو معتد بہ فائدہ سامعین کو اپنے فوری بیانات سے نہیں پہونچاتا۔

وعظ میں مقامی ضرورتوں کا لحاظ نہ رکھتے ہوے گفتگو شروع کرنا بیکار ہے۔ مثلاً جہاں نفس اسلام سے بے اعتنائی ہو وہاں نماز روزے کے احکام کا بیان کرنا بے سود ہے۔ واعظ یا مہتمم مجلس وعظ کو مقامی ضرورتوں کی یادداشت پہلے مرتب کرنا چاہیے اور پھر اسی کے متعلق وعظ ہوتا چاہیے۔ اگر کسی مقام پر شرک و بدعت سیئہ کا رواج ہو تو واعظ کی کوشش پہلے انکے رفع کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ جہاں انگریزی صحبت یا انگریزی تعلیم کی وجہ سے وحدانیت اور رسالت میں لوگوں کو شبہات ہوں وہاں متکلموں کے طریقے پر وعظ کہنا چاہیے۔ جہاں مذہبی جہالت کی وجہ سے ارکان مذہب سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ وہاں وضو۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج کے احکام اور انکے فوائد کا مصرح بیان ہونا چاہیے۔ جہاں عورتوں کے حقوق وراثت اور نکاح ثانی پامال ہوتے ہوں وہاں ان باتوں کے متعلق وعظ کہنا سب سے زیادہ مقدم ہے۔ جہاں شراب خواری، عیاشی اور دیگر بداخلاقیاں ہوں وہاں سب سے زیادہ انکی برائیوں کے ظاہر کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ پیشہ وروں اور تاجروں کی جماعت میں وعدہ خلافی اور دروغ گوئی کا رواج ہو تو راستی کے فوائد اور دروغ کے نقصانات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ جہاں لوگ اپنے گھروں میں اور اپنے پڑوسیوں سے لڑنا باعث فخر جانتے ہیں، وہاں اتفاق کی خوبیاں اور نفاق کی برائیاں جماعت میں بیان کرنا اور پھر لوگوں سے فرداً فرداً مل کر اتفاق باہمی قائم کرا دینا واعظ کے لیے بہت آسان اور بڑے ثواب کا کام ہے۔ اور واعظین سمجھیں تو یہ انکے لیے حصول زر میں بھی معین ہوگا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں واعظین ادھر متوجہ نہیں ہوتے بلکہ جہاں بدقسمتی سے وہ مختلف الخیال واعظ پہونچ جاتے ہیں وہاں اور نئے مذہبی جھگڑے پیدا کرا دیتے ہیں۔

ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی (گورکھپور)

اجل

قائل ہے ہر اک کافر و دیندار اجل کا   ملحد کو تہِ دل سے ہے اقرار اجل کا
خالی نہیں جاتا ہے کبھی وار اجل کا   جاں نذر میں لے لیتا ہے دیدار اجل کا
سمجھے جو کوئی زیست کو تمہید اجل کی
ہو عید سے کچھ کم نہ اُسے دید اجل کی

ممکن کسی صورت سے نہیں موت کا چارا   جیتا رہے تاحشر کسی کو نہیں یارا
دے جان خوشی سے کوئی یہ کب ہے گوارا   سچا ہے جو سچ پوچھیے یہ قول ہمارا
کچھ دم کا بھروسا نہیں۔ آئے کہ نہ آئے
توبہ کا بھی موقعہ کوئی پائے کہ نہ پائے

ہو جاتے ہیں سب وقت پہ دنیا سے روانہ   چلتا ہی نہیں موت سے کچھ حیلہ۔ بہانہ
مرنے پہ ہے ہر شخص کا تربت ہی ٹھکانا   مجبور ہیں، معذور ہیں، شاہانِ زمانہ
وہ بھی نہ بچے پنجۂ صیادِ اجل سے
خاموش تہِ خاک ہیں بیدادِ اجل سے

پردیس میں بیمارِ وطن کرتا ہے نالے   اُٹھنے نہیں دیتے ہیں قدم پاؤں کے چھالے
کانٹے ہیں پڑے حلق میں ہیں جان کے لالے   ایسے میں کوئی ایسا نہیں ہے جو سنبھالے
ہمدرد کوئی۔ اہلِ وطن بھی نہیں ملتا
دو گز اُسے مرنے پہ کفن بھی نہیں ملتا

بندہ ہو کہ آقا ہو۔ گدا ہو کہ تونگر   شاعر ہو۔ سخن سنج۔ سخن گو کہ سخنور
زاہد ہو۔ ولی ہو۔ وہ نبی ہو کہ پیمبر   کچھ فرق نہیں۔ پیشِ اجل سب ہیں برابر
اے موت جو تو کھینچتی ہے اُنکو یہاں سے
جاتے ہیں وہیں۔ لوگ یہ آئے تھے جہاں سے

شیریں ہو۔ زلیخا ہو کہ لیلا سے زمانہ — تھی حسن میں یکتا۔ کوئی خوبی میں یگانہ
اے تیر اجل تونے کیا سب کو نشانہ — آخر کو ملا گوشۂ مرقد میں ٹھکانا
شیریں نہیں ملتی کہیں لیلا نہیں ملتی
اے خاکِ لحد اب وہ زلیخا نہیں ملتی

ہو زندۂ جاوید تو مرنے سے ضرر کیا — عاصی نہیں بندہ ہے تو پھر خوف و خطر کیا
تقدیر میں لکھا ہے جو کچھ اس سے حذر کیا — رحمت کرے عاصی پہ بھی مولا۔ یہ خبر کیا
ممکن ہے۔ دم مرگ۔ کوئی کام ہو اچھا
ممکن ہے کہ آغاز سے انجام ہو اچھا

انجام سے غافل نہ ہو اے مست جوانی — تڑپائے گا پیری میں تجھے سوز نہانی
اس عالم فانی کی ہر اک چیز ہے فانی — ڈھونڈھے سے نہ تو زیست کی پائیگا نشانی
باسط یہی لازم ہے۔ کرے کام خدا کا
رہ جائے گا ایک روز فقط نام خدا کا

باسط (بسوانی) شاگرد حکیم جگر

لو مل گیا صلہ مرے ذوق نیاز کا — پردہ وہ اُٹھ رہا ہے حریم مجاز کا
احساس تک رہا نہ ترے امتیاز کا — اللہ رے فریب طلسم مجاز کا
دیتا ہے میرے قلب کو روحانیت کا درس — ذکر جمیل تیرے رُخ جلوہ ساز کا
کُل کائنات نغمۂ درد آفریں بنی — اُف رے اثر یہ تیرے غم جانگداز کا
ہستی کو جب مٹا نہ سکا اپنی بے خبر — پھر کیوں خیال شاہد ہستی نواز کا
جلوے سے اُس نے تیرے ہم آغوش کر دیا — ممنون ہوں میں حیرت بیگانہ ساز کا
ہستی و نیستی کی بھی منزل ہوئی تمام — لیکن کھلا نہ راز طلسم مجاز کا
تنہائی فراق کی راتیں بھی کٹ گئیں — ممنون ہوں میں اس دل افسانہ ساز کا
آئینہ دیکھتے ہی میں سجدے میں گر پڑا — بیہوشیوں میں ہوش تھا کب امتیاز کا
ثاقب اس انجمن میں جہان خراب کی — محرم تھا کون خلوت شبہائے راز کا

جناب ثاقب [illegible]

مسئلہ سود

مضمون ذیل مولانا ابوالکلام صاحب کے ایک طولانی مضمون مندرجہ الہلال کلکتہ سے ابتدائی و تمہیدی حصے کو حذف کر کے نقل کیا جاتا ہے۔ منشی طفیل احمد صاحب نے مسئلہ سود کو جس حیثیت میں پیش کر کے جائز قرار دیا ہے اگرچہ اس مضمون میں اُس سے بحث نہیں ہے لیکن مولانا نے سود لینے والوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس سے عبرت ہونا چاہیے ہمیں امید ہے کہ آیندہ کسی وقت میں ہم تجارتی سود کے متعلق بھی مولانا کے خیالات شایع کر سکیں گے۔

ربح اور ربوا، تجارتی سود اور مہاجنی سود میں مصالح کی بنا پر خواہ کیسا ہی باریک فرق کیوں نہ پیدا کیا جائے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں صورتوں میں سود کا لین دین ہوتا ہے۔ فرق اگر ہے تو شرح سود کی کمی و بیشی کا۔ لیکن جس طرح قلیل سے قلیل مقدار میں شراب استعمال کرنے سے اگرچہ متوالا پن پیدا نہیں ہوتا، لیکن خلاف ورزی شرع کی معصیت ضرور عائد ہوگی بعینہ اسی طرح کم سے کم شرح پر سود لینا بھی علمائے شریعت کے نزدیک جائز نہیں قرار پا سکتا۔

سود کے متعلق قرآن کریم میں جو سخت وعید مذکور ہے اُس کی تفسیر اس مضمون میں موجود ہے۔ اور اُس سے عیاں ہونا چاہیے کہ حرمت سود کی علت غائی کیا ہے۔

منشی طفیل احمد صاحب کے نزدیک بھی حرمت ربوا مسلم ہے۔ اب اگر وہ حرمت کی علت غائی پر نظر فرمائیں اور ربح یا تجارتی سود کا جن صورتوں میں لین دین دنیا میں چل رہا ہے اُن پر اُس کا انطباق کریں تو شاید وہ بھی یہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ربح یا ربوا کی نوعیت میں اگرچہ فرق ہو مگر حقیقت و غایت جدا نہیں ہے۔ نذیر

میں نے ہمیشہ اس امر پر غور کیا کہ قرآن کریم نے انسانی معاصی و جرائم کے متعلق طریق علاج کی

وعیدیں فرمائی ہیں، لیکن سود کے متعلق ایک ایسا لفظ کہ دیا ہے جس سے سخت تر وعید اور کسی سخت سے سخت جرم و معصیت کی نسبت بھی نہیں آئی۔ اس کا سبب کیا ہے ؟

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربٰوا، ان کنتم مومنین۔ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (۲ : ۲۷۸)

مسلمانو! اگر تم صاحب ایمان ہو تو اللہ سے ڈرو اور تمہارے پچھلے لین دین میں جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو۔ (پھر) اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور رسول کے ساتھ لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ کہ یہ فی الحقیقۃ اللہ اور اُسکے رسول کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں سود کے لینے پر اصرار کو حرب من اللہ ورسولہ سے تعبیر کیا ہے کہ اسکے لینے والے اللہ اور اُسکے رسول سے لڑنے کے لیے مستعد رہیں" !

بظاہر یہ تشدد تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے، انسان کی وحشیت اور بہیمیت نے دنیا میں کیسی کیسی عجیب معصیتیں کی ہیں اور وہ حب سبعیت و درندگی پر آجاتا ہے تو اُسکے اعمال کس درجہ خوفناک ہو جاتے ہیں، لیکن یہ کیوں ہے کہ قرآن کریم نے کسی انسانی معصیت کو بھی "حرب من اللہ ورسولہ" سے تعبیر نہیں کیا اور اس وعید کے لیے صرف سود ہی کو کہ محض ایک لین دین اور معاملت کی چیز ہے اور زیادہ سے زیادہ انسانی خود غرضی کا (ایک ظہور) تمام رذائل انسانیہ میں سے منتخب کیا؟

حرب من اللہ ورسولہ

یہاں اسکی تفسیر مقصود نہیں مگر اشارہ ضروری ہے۔ سود کے کاروبار کی اگر کوئی تاریخ مرتب

لہ " فاذنوا بحرب من اللہ " مفسرین نے مختلف اقوال جمع کیے ہیں کہ اس سے مقصود کیا ہے؟ آذنوا کو بعض نے بکسرہ ذال وہمزہ بروزن آمنوا پڑھا ہے، اور بعضوں نے بفتح ذال، لیکن مقصود دونوں سے یہی ہے، کہ معلوم کر لو اور خبردار ہو جاؤ۔ حرب من اللہ سے بعض مفسرین نے حقیقی معنی لیے ہیں یعنی جو سود لیں گے اُنسے اللہ اور اُسکا رسول قتال کریگا اور وہ اس سے خبردار ہو جائیں۔ لیکن فی الحقیقت یہاں حرب سے مراد واقعی جنگ نہیں ہے بلکہ وعید و عقاب اور تشدید و ترہیب میں مبالغہ مقصود ہے۔ یعنی اس فعل کو باوجود نہی ترک نہ کرنا ایک ایسا جرم قرار دیا گیا ہے جو گویا اللہ اور اُس کے رسول کے مقابلے میں حریف جنگ بننے کے معانی ہے۔ اسی لیے ترجمے میں ہم نے اسکو واضح کر دیا ہے۔ (منہ)

کی جاتی تو میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت کی بہتر سے بہتر تفسیر خود بخود ہو جاتی۔ طلب نفع اور خود غرضی سے اس دنیا کے عجیب ترین جانور کا (جسکو انسان کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) کوئی فعل خالی نہیں اور اگر خالی ہے تو صرف وہ فعل جو اس سے بحیثیت مخلوق حیوانی کے صادر نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکے اندر کی وہ روح انسانیۃ کیرہ اور معنی خلافۃ الٰہیہ کام کرتی ہے جو مقام ملکوتیۃ سے بھی ارفع، اور دربار مقام قدوسیت اعلےٰ ہے۔ مذہب، قانون، اخلاق، سوسائٹی، اور اسی طرح کی تمام بندشیں صرف اس خود غرضی ہی کے مظاہر شدیدہ کو روکنے کے لیے ہیں۔ اور اگر اس خوفناک جانور کے پاؤں میں اتنی بوجھل بیڑیاں نہ ہوتیں، تو اغراض و استجلاب نفع کا تصادم دنیا کو شیطان کا تخت اور دوزخ کا نمونہ بنا دیتا: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل سافلین، الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات فلہم اجر غیر ممنون (۹۶: ۶)

انسانی خود غرضی کا مہیب ترین ظہور

اس خود غرضی کا ایک بدترین ظہور، جمع و حصول مال کی بھوک ہے جسکو پیاس کہنا چاہیے، اگر استسقا کی تشبیہ اس پر راس آ جائے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اعمال انسانیہ میں اس مرض کا کوئی ظہور اس درجہ انسان کے ملکوتی خصائل کے لیے مہلک، اسکی بہیمیت و سبعیت کے لیے قوی، ہیئت اجتماعیہ اور مجامع انسانیہ کی صحت مدنی کے لیے سم قاتل اور عالم مخلوقات کے اس جمیل ترین مخلوق یعنی انسان کو خوفناک درندہ بنا دینے کے لیے ایک عمل السحر نہیں ہے، جیسا کہ سود اور سود خواری کی زندگی کی مختلف شکلیں۔

اخلاق و خصائل انسانیہ کا آبگینہ تو اس قدر نازک ہے کہ تجارت اور کاروباری معیشت کی زندگی کی ٹھیس کا بھی متحمل نہیں ہوتا، اور ہمدردی و مروت کا چشمہ کچھ نہ کچھ مکدر ہو ہی جاتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ اسکے لیے سود (جس سے بغیر حق محنت حصول نفع کا اصول غیر طبعی قائم ہو جاتا ہے) کس درجہ مضر ہوگا؟

یقیناً تمام انسانی معاصی میں صرف یہی معصیت "حرب من اللہ و رسولہ" ہے، کیونکہ اور کسی معصیت میں انسان خدا کے بندوں کے لیے اس درجہ بے رحم اور خونخوار نہیں ہو جاتا، جس درجہ سود کو اپنا وسیلۂ معاش بنا لینے کے بعد از سر تا پا مجسمۂ شقاوت و قساوت و غلظت و صلابت ہو جاتا ہے۔ اور

خدا کے بندوں کے آگے بیرحمی سے مغرور ہونا، فی الحقیقت خدا کے آگے مغرور ہو کر آمادۂ جنگ و پیکار ہونا ہے۔

انسان کے اُن تمام بڑے بڑے جرائم پر، جنکو اسکی خود غرضی کا دیو اسکے اندر انجام دیتا ہے، اپنے سامنے لاؤ اور ایک ایک کرکے دیکھو! بڑے بڑے عادی مجرموں کو تم دیکھوگے کہ بارہا انسانی مظلومی اور بیکسی نے انکی آنکھوں کو اشکبار اور اُنکے دلوں کو دو نیم کر دیا ہے۔ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو اور قاتل کی نسبت بھی تم سُن سکتے ہو کہ اُس نے عین اپنی بے رحمی و قساوت کے کسی عمل کو انجام دیتے وقت ایک بُڑھیا عورت کی فریاد، ایک بیکس عورت کی گریۂ وزاری، اور ایک یتیم بچے کے مضطربانہ نعرۂ الغیاث پر، اپنی کھنچی ہوئی تلوار پھینکدی۔ اور چند لمحوں کے لیے اُسکی بھولی ہوئی معنی انسانیت اُسے یاد آگئی۔

تاریخ اور مُلکی روایات نے اُن ڈاکوؤں کے حالات قلمبند کیے ہیں، جو ایک طرف تو دولتمندوں کو لوٹتے، اور مال و دولت سے بھرے ہوے قافلوں کو تاخت و تاراج کرتے تھے، دوسری طرف صدہا بیوہ عورتیں اور بیکس و مسکین خاندان تھے جن کو ایک فیاض طبع دست کریم، اور ایک دریائے بخشش بادشاہ کی طرح امداد و اعانت سے مالامال کر دیتے تھے۔ انگلستان کے قرون متوسطہ اور ہندوستان کے گذشتہ زمانے کے بڑے بڑے ڈاکوؤں کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے قصبات و دیہات کی بیکس عورتوں کے لیے باقاعدہ وظائف و مشاہرے مقرر کر دیے تھے۔ اور روم کے ایک مشہور ڈاکو نے ٹیٹس سے کہا تھا "میرا مجرم ہاتھ بادشاہ کے مقدس ہاتھ سے زیادہ غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرتا ہے، مگر وہ بادشاہ اور میں ڈاکو ہوں"

یہی حال تقریبًا انسان کے بڑے بڑے جرائم کا ہے اور فضیلت انسانیت ہر بڑی سی بڑی زندگی کی تاریکی میں بھی کبھی نہ کبھی اپنی روشنی بے نقاب کر دیتی ہے۔

لیکن اسکے مقابلے میں ایک سود خوار زندگی کو لاؤ۔ وہ چور نہیں ہے، وہ ایک ڈاکو کے نام سے ذلیل و حقیر نہیں کیا جاتا، لوگ اُس سے پناہ نہیں مانگتے بلکہ اُسکو ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ پہاڑوں کے غاروں، اور گنجان جنگلوں کے گوشوں میں مجرموں کی طرح نہیں چھپتا، وہ سوسائٹی سے مردود و مطرود نہیں ہے، اُس نے بادشاہ کے قانون توڑنے اور انسانوں کے آداب و مراسم کی حقارت کا

کبھی جرم نہیں کیا۔ وہ ایک شہری ہے جو مثل ایک شریف باشندۂ شہر کے انسانوں میں رہتا اور جسم اجتماعی میں عضو صحیح کی طرح شامل ہے۔ با اینہمہ، اُسکے اعمال کا کیا حال ہے؟ وہ ڈاکو سے بڑھکر آبادی کو غارت کرتا، وہ قاتل سے زیادہ انسانی حیات کو موت سے تبدیل کرتا، وہ عادی مجرم سے زیادہ سوسائٹی کو تباہ کرتا، وہ ایک درندے سے بھی خوفناک تر خوں آشام، اور بھیڑیے اور جنگلی سوّر سے بھی بڑھکر حیات انسانی کا دشمن ہے۔ پھر ان سب سے زیادہ یہ کہ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو کی آنکھوں سے بھی کبھی نہ کبھی رحم کا ایک قطرۂ اشک ٹپک پڑتا ہے، پر یہ محال قطعی ہے کہ اسکی شقاوت و قساوت کبھی بھی کسی تڑپتے ہوئے جسم اور کسی پکارتی ہوئی زبان پر ایک لمحے، ایک دقیقے، اور ایک عشر دقیقہ کے لیے بھی ترس کھائے!!

(شکسپیر) کے ایک (شائیلاک) کا ذکر بے سود ہے، دنیا میں اسوقت تک کتنے ہزار شائیلاک گذر چکے ہیں اور کتنے ہمارے سامنے موجود ہیں!!

ایک اہم نکتہ

اگر ایک شخص چور ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے، تو قانون اُسکو قتل کرے گا، اور انسانی آبادی اُس سے پناہ مانگے گی، لیکن ایک سود خوار جو کہتا ہے کہ "انما البیع مثل الربوٰ" اُسکا کیا علاج ہے؟ اس نے تجارت کی ایک دوکان کھول دی ہے۔ اور ضرورت و احتیاج انسان کے ہوش و حواس کو معطل کردیتی ہے۔ ڈاکو سے انسان بھاگتا ہے لیکن "شائیلاک" کے پاس تو اُس کا مظلوم قربانیاً خود ہی دوڑکر گیا تھا۔ پس فی الحقیقت قتل و غارت کسی قانون اور مذہب کے لیے اس درجہ سختی کے مستحق نہیں ہوسکتے، جس قدر کہ سود اور سود خواری کی مہیب زندگی۔

پھر کیا "حرب من اللہ و رسولہ" سے اسکی تعبیر صحیح نہیں؟ اور کیا تمام مذاہب عالم میں اسلام کی یہ سب سے بڑی خصوصیت نہیں کہ اس نے باوجود جاہلیت عرب کے اس میں غرق ہونے کے سود خواری کو سب سے بڑا جرم اور معصیت کبیرہ قرار دیا؟ ۔ تجارت اور لین دین کی بے رحمیوں، اور عام بے رحمیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ انسان کے تمام مظالم اور بے رحمیاں ایسی ہیں، کہ انسان کے لیے کوئی دام اور کشش اپنے اندر نہیں رکھتیں، وہ از سرتا پا نفرت اور مبغوضیت ہیں۔ لوگ ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ لیکن روپے کا لین دین ایک ایسی شے ہے کہ خواہ کیسے ہی

خدا کے بندوں کے آگے بیرحمی سے مغرور ہونا، فی الحقیقت خدا کے آگے مغرور ہو کر آمادۂ جنگ و پیکار ہونا ہے۔

انسان کے اُن تمام بڑے بڑے جرائم پر، جنکو اسکی خود غرضی کا دیو اسکے اندر انجام دیتا ہے، اپنے سامنے لاؤ اور ایک ایک کرکے دیکھو! بڑے بڑے عادی مجرموں کو تم دیکھوگے کہ بارہا انسانی مظلومی اور بیکسی نے انکی آنکھوں کو اشکبار اور اُنکے دلوں کو دونیم کردیا ہے۔ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو اور قاتل کی نسبت بھی تم سُن سکتے ہو کہ اُس نے عین اپنی بے رحمی و قساوت کے کسی عمل کو انجام دیتے وقت ایک بڑھیا عورت کی فریاد، ایک بیکس عورت کی گریۂ وزاری، اور ایک یتیم بچے کے مضطربانہ فغانِ الغیاث پر، اپنی کھنچی ہوئی تلوار پھینکدی۔ اور چند لمحوں کے لیے اُسکی بھولی ہوئی معنی انسانیت اُسے یاد آ گئی۔

تاریخ اور ملکی روایات نے اُن ڈاکوؤں کے حالات قلمبند کیے ہیں، جو ایک طرف تو دولتمندوں کو لوٹتے، اور مال و دولت سے بھرے ہوے قافلوں کو تاخت و تاراج کرتے تھے، دوسری طرف صدہا بیوہ عورتیں اور بیکس و مسکین خاندان تھے جن کو ایک فیاض طبع دست کریم، اور ایک دریائے بخشش بادشاہ کی طرح امداد و اعانت سے مالامال کردیتے تھے۔ انگلستان کے قرون متوسطہ اور ہندوستان کے گذشتہ زمانے کے بڑے بڑے ڈاکوؤں کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے قصبات و دیہات کی بیکس عورتوں کے لیے باقاعدہ وظائف و مشاہرے مقرر کردیے تھے۔ اور روم کے ایک مشہور ڈاکو نے ٹیٹس سے کہا تھا "میرا مجرم ہاتھ بادشاہ کے مقدس ہاتھ سے زیادہ غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرتا ہے، مگر وہ بادشاہ اور میں ڈاکو ہوں"

یہی حال تقریبًا انسان کے بڑے بڑے جرائم کا ہے اور فضیلت انسانیت ہر بڑی سی بڑی زندگی کی تاریکی میں بھی کبھی نہ کبھی اپنی روشنی بے نقاب کردیتی ہے۔

لیکن اسکے مقابلے میں ایک سود خوار زندگی کو لاؤ۔ وہ چور نہیں ہے، وہ ایک ڈاکو کے نام سے ذلیل و حقیر نہیں کیا جاتا، لوگ اُس سے پناہ نہیں مانگتے بلکہ اُسکو ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ پہاڑوں کے غاروں، اور گنجان جنگلوں کے گوشوں میں مجرموں کی طرح نہیں چھپتا، وہ سوسائٹی سے مردود و مطرود نہیں ہے، اُس نے بادشاہ کے قانون توڑنے اور انسانوں کے آداب و مراسم کی حقارت کا

کبھی جرم نہیں کیا۔ وہ ایک شہری ہے جو مثل ایک شریف باشندۂ شہر کے انسانوں میں رہتا اور جسم اجتماعی میں عضو صحیح کی طرح شامل ہے۔ با اینہمہ، اُسکے اعمال کا کیا حال ہے؟ وہ ڈاکو سے بڑھکر آبادی کو غارت کرتا، وہ قاتل سے زیادہ انسانی حیات کو موت سے تبدیل کرتا، وہ عادی مجرم سے زیادہ سوسائٹی کو تباہ کرتا، وہ ایک درندے سے بھی خوفناک تر خون آشام، اور بھیڑیے اور جنگلی سوّر سے بھی بڑھکر حیات انسانی کا دشمن ہے۔ پھر ان سب سے زیادہ یہ کہ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو کی آنکھوں سے بھی کبھی نہ کبھی رحم کا ایک قطرۂ اشک ٹپک پڑتا ہے، پر یہ محال قطعی ہے کہ اسکی شقاوت و قساوت کبھی بھی کسی تڑپتے ہوئے جسم اور کسی پکارتی ہوئی زبان پر ایک لمحے، ایک دقیقے، اور ایک عشر دقیقہ کے لیے بھی ترس کھائے!!

(شکسپیر) کے ایک (شائیلاک) کا ذکر بے سود ہے، دنیا میں اسوقت تک کتنے ہزار شائیلاک گذر چکے ہیں اور کتنے ہمارے سامنے موجود ہیں!!

ایک اہم نکتہ

اگر ایک شخص چور ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے، تو قانون اُسکو قتل کرے گا، اور انسانی آبادی اُس سے پناہ مانگے گی، لیکن ایک سود خوار جو کہتا ہے کہ "انما البیع مثل الربٰو" اُسکا کیا علاج ہے؟ اس نے تجارت کی ایک دوکان کھول دی ہے۔ اور ضرورت و احتیاج انسان کے ہوش و حواس کو معطل کر دیتی ہے۔ ڈاکو سے انسان بھاگتا ہے لیکن "شائیلاک" کے پاس تو اُس کا مظلوم قرضدار خود ہی دوڑ کر گیا تھا۔ پس فی الحقیقت قتل و غارت کسی قانون اور مذہب کے لیے اس درجہ سختی کے مستحق نہیں ہو سکتے، جس قدر کہ سود اور سود خواری کی مہیب زندگی۔

پھر کیا "حرب من اللہ و رسولہ" سے اسکی تعبیر صحیح نہیں؟ اور کیا تمام مذاہب عالم میں اسلام کی یہ سب سے بڑی خصوصیت نہیں کہ اس نے باوجود جاہلیت عرب کے اس میں غرق ہونے کے سود خواری کو سب سے بڑا جرم اور معصیت کبیرہ قرار دیا؟ ۔ تجارت اور لین دین کی بے رحمیوں، اور عام بے رحمیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ انسان کے تمام مظالم اور بے رحمیاں ایسی ہیں، کہ انسان کے لیے کوئی دام اور کشش اپنے اندر نہیں رکھتیں، وہ از سرتا پا نفرت اور مبغوضیت ہیں۔ لوگ ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ لیکن روپے کا لین دین ایک ایسی شے ہے کہ خواہ کیسے ہی

سخت سے سخت عنوان ظلم سے ہو لیکن چونکہ احتیاج اور ضرورت کو وقتی اور فوری طور پر دور کرنے والی ہے اس لیے انسان اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ بلکہ پناہ مانگنے کی جگہ خود ہی اسکی طرف دوڑتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سود خوار ایک بے رحم ڈاکو اور خونخوار درندہ ہے لیکن جنگل کے ڈاکو سے نفرت کرتا اور اس شہری ڈاکو کے آگے عاجزی سے ہاتھ جوڑتا ہے تاکہ وہ اسے اپنے دام ظلم میں پھنسانے کے لیے چن لے۔ اور اسکو مجروح تیغ قساوت و بے رحمی کرنے سے انکار نہ کرے!!

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اور تمام ہزارہا انسانی بے رحمیاں کسی آبادی کو اس طرح نقصان نہیں پہونچا سکتیں۔ جس درجہ پورے شہر میں ایک "سود خوار" کا وجود پہونچا سکتا ہے۔ یہی ہے کہ قرآن کریم اُس کو سب سے بڑی وعید الٰہی کا مستحق قرار دیتا ہے۔

اسکی علت اصلی

اصل یہ ہے کہ کسی خود غرضی کے عمل اور بے رحمی کے کام میں اس درجہ استمرار اور مداومت نہیں ہے جیسی کسی کاروباری بے رحمی میں۔ قاتل ایک شخص کو چند لمحوں میں قتل کر ڈالیگا ڈاکو ایک گھنٹے کے اندر ایک قافلے کو لوٹ لے گا، لیکن سود خوار کا عمل ظلم دائمی، اور انسانی عمروں، خاندانوں، اور نسلوں تک جاری رہتا ہے۔ وہ جس شکار کو پکڑتا ہے اُسکی مظلومی و بیکسی کا نظارہ برسوں تک دیکھتا رہتا ہے، اور جب تک ہمیشہ کے لیے اُسکے تڑپنے لوٹنے اور کراہنے کے نظارے کا تحمل اپنے اندر پیدا نہ کرلے، وہ سود خوار نہیں بن سکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسکی قساوت و بے رحمی سب سے زیادہ سخت، اور تمام جرائم کے عادیوں سے زیادہ مستقل و محکم ہوتی ہے۔ وہ چونکہ ہمیشہ اپنی بیرحمی کے شکاروں کی مظلومی کو دیکھتا رہتا اور اُنکی بیقراریوں کے معائنے کا اپنے دماغ کو عادی بناتا رہتا ہے اس لیے رفتہ رفتہ اُسکے تمام قوائے ملکوتیہ پر ایک عالم ممات طاری ہو جاتا ہے اور رحم و ہمدردی کے جذبات اس طرح بیکار و معطل ہو جاتے ہیں کہ کوئی قوی سے قوی محرک بھی اُنکو زندہ نہیں کرسکتا۔

یہ کیا بات ہے کہ ڈاکو رحم کرتا، مگر سود خوار کی آنکھیں ہمیشہ خشک رہتی ہیں؟ اس کا

سبب یہی ہے کہ ظلم کا استمرار اور بے رحمی کی مداومت ڈاکو کو ویسی نصیب نہیں جیسی اور جس درجہ کی بے رحمی میں ایک سود خوار کی تمام زندگی بسر ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کی ایک تشبیہ

کیا نہیں دیکھتے کہ اسی حالت مخصوص کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے جبکہ اُس نے سود خوار کی زندگی کا المنفق فی سبیل اللہ کے بعد ذکر کیا جو اسکا ضد حقیقی ہے:

الذین یاکلون الربوا لایقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس ذلک بانہم قالوا انما البیع مثل الربوٰ (۲ : ۲۷۶)	جو لوگ کہ سود کھاتے ہیں، وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اُس پاگل کی طرح، جسکو شیطان کے اثر نے مخبوط الحواس بنا دیا ہو، اور یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ضرور بیع وشریٰ بھی مثل سود ہی کے ہے۔

افسوس ہے کہ عام (متداول) مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اس امر پر بالکل توجہ نہیں کی کہ سود خوار کی زندگی کو اس تمثیل کے ساتھ کیوں بیان کیا گیا؟ اور پھر اس تمثیل اور حالت کا سبب " ذلک " کہکر انکے اس قول کو کیوں قرار دیا کہ " بیع بھی مثل سود کے ہے " ؟

اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اُن بزرگوں میں سے اکثر نے اس بیان حالت کو بعض آثار مرویہ کی بنا پر صرف قیامت کے دن ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے اور اسکی تفسیر یوں کی ہے کہ " لایقومون ای یوم القیامۃ من قبورہم " یعنی یہ حالت صرف قیامت کے دن ہی کی نسبت بیان کی گئی ہے۔ اور سود خوار قیامت کے دن قبروں سے اس طرح اُٹھائے جائیں گے جیسے کوئی مصروع اور آسیب زدہ پاگل ہوا کرتا ہے۔ اور پھر اس کی مختلف توجیہات قرار دی ہیں۔

فی الحقیقت قرآن کریم کے حقائق و معارف کے متعلق آج ایک اہم بحث ارباب نظر کے لیے یہ بھی ہے کہ اسکے اکثر ارشادات و تمثیلات و بیانات، جن میں اسی دنیا کی زندگی اور انکے اعمال و نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، صرف قیامت اور بعد الممات کی زندگی کے لیے مخصوص سمجھ لیے گئے ہیں، اور سخت ضرورت ہے کہ اس بحث پر نظر ڈالی جائے۔

میں انشاء اللہ ماہوار رسالے میں "سود" کے مسئلے پر ایک بسوط مضمون لکھوں گا۔ کہ اسکے متعلق بعض خاص مباحث پیش نظر ہیں، اور اس موقع کی تفصیل بھی بہتر ہے کہ اسی وقت کے لیے ملتوی کر دی جائے۔ لیکن یہاں اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ درحقیقت اس آیۂ کریمہ کی تفسیر وہی امور ہیں، جن کو اوپر بغیر کسی ترتیب کے لکھ چکا ہوں۔

مفسرین صحابہ کی جو روایات اس بارے میں موجود ہیں، وہ یقیناً مستحق قبولیت ہیں، یہ میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر میں لغت عرب اور صحابہ کی تفسیر ہی دو چیزیں اصل ہیں اور اگر صرف ان ہی دو اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے تو آج تمام مشکلات و غرائب قرآن کا خاتمہ ہے۔ لیکن تاہم آخرت کی زندگی بھی دنیا کی زندگی ہی کا نتیجہ ہے، اور جو کچھ کل ہونے والا ہے اسکی مثال آج چشمہائے بصیرت اور دیدہ ہائے اعتبار کے لیے ہمارے سامنے کر دی گئی ہے۔ پھر کیا ضرور ہے کہ ہر نتیجۂ عمل کو صرف قیامت ہی کے دن پر اٹھا رکھا جائے، اور خود دنیا میں جس شئے کا سراغ لگ سکتا ہے، اسکے لیے صرف دنیا سے باہر ہی کا نظارہ کریں؟

ایک تفسیری اشارہ

اصل یہ ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں ایک سود خوار کی زندگی، اسکے عادات و خصائل، اسکے اعمال و افعال، اور انکے نتائج کی جیسی جامع و بلیغ تشبیہ دی گئی ہے وہ گویا اس مسئلے کی ایک پوری کتاب ہے۔ اہل عرب کا خیال تھا کہ شیطان اور جن کی ضرب سے انسان مجنون و لایعقل ہو جاتا ہے، اور صرع (مرگی) کی بیماری دراصل ایکطرح کا آسیب ہوتی ہے۔ (مس) جنون کے معنی میں بولا جاتا ہے، اور "ممسوس" پاگل کو کہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں سود خوار کی زندگی کو ایک آسیب زدہ پاگل اور ایک مصروع کے حالات و خصائص سے تشبیہ دی ہے، اور مقصود اسکے وہی حالات ہیں، جو اسے دنیا کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔

ایک شخص جو پاگل ہو گیا ہو، ایک مجنون جس کی عقل و دانش بالکل معطل ہو، ایک مخبوط الحواس، جسکے ہوش و حواس کا کارخانہ بگڑ گیا ہو، ایک "مصروع" جو مرگی کے اشتداد

سے اپنے اوپر ملکوت نہ رکھتا ہو - غور کرکے دیکھیے کہ اُسکی حالت کیا ہوتی ہے؟ وہ عام انسانوں کی طرح ایک کامل و سالم انسان ہوتا ہے - اُسکے تمام اعضا و جوارح صحیح ہوتے ہیں، اُسکے تمام امیال و جذبات بالکل ایک تندرست آدمی کی طرح درست ہوتے ہیں - وہ بظاہر بیمار نہیں ہوتا - چلتا ہے، پھرتا ہے، بھوک کا اظہار کرتا ہے، اور پیاس سے ویسا ہی بیقرار ہو جاتا ہے، جیساکہ دنیا کا ہر حیوانی مخلوق - تاہم وہ انسان نہیں ہوتا، کیونکہ انسانوں میں ایک سب سے بڑی قیمتی چیز ہے جو اُس میں نہیں ہوتی -

یہی حال ایک سود خوار کی زندگی کا ہے - بظاہر اُس میں کوئی بُرائی نہیں ہوتی - وہ سوسائٹی کا ایک جزو، اور شہر کا ایک جائز باشندہ ہے - عام تاجروں کی طرح اسکی بھی ایک تجارت ہوتی ہے - وہ مبادلۂ اشیاء کی تجارت نہیں کرتا تو کیا ہوا؟ ایک ہی جنس کو دیتا اور لیتا ہے، تو کیا نقصان لازم آگیا؟ پھر بھی تو ایک کاروبار اور بیع و شراء ہی ہے - وہ ڈاکو کی طرح لوٹتا نہیں ہے، اور چور کی طرح چھپ کر چُرانے نہیں آتا - جائز لین دین میں پہلی شرط فریقین معاملہ کا راضی ہونا اور جبر و اکراہ کا نہ ہونا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ وہ جب کبھی معاملہ کرتا ہے تو اُن ہی سے کرتا ہے جو اُسکی شرائط کو بخوشی منظور کرتے، اور اُسکے معاملے پر اپنی پوری رضا ظاہر کرتے ہیں - وہ تلوار لیکر لوگوں کو نہیں دھمکاتا کہ اس سے روپیہ لیں، اور اسکی شرائط کے آگے سر جھکا دیں - پس ایک شریف انسان، ایک با امن شہری، ایک جائز کاروباری آدمی میں جو کچھ ہونا چاہیے، اُس میں ہوتا ہے، اور کوئی بات بظاہر اسکے خلاف نظر نہیں آتی -

لیکن ان تمام بظاہر انسانیت و مدنیت کے ساتھ، دوسری طرف دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہے، مگر ایک شریف انسان اور ایک کاروباری شہری میں سب سے زیادہ ضروری جوہر جو ہونا چاہیئے اُس میں نہیں ہے - وہ باوجود انسان ہونے کے ایک خونناک درندہ ہے - وہ باوجود شریف زندگی ہونے کے رذالت و سفاہت اور بہیمیت و بربریت کا ایک پیکر مجسم ہے - وہ باوجود ایک جائز باشندۂ شہر ہونے

کے درندوں کے بھٹ اور وحشیوں کے جنگل کا ایک جانور ہے۔ اس نے گو تجارت کی دوکان کھول دی ہے، مگر وہ ایک ڈاکو ہے جو خود تاجروں کو لوٹتا اور بے رحم چوروں کی طرح ان کے صندوقوں کو خالی کر دیتا ہے۔!!

ایک پاگل آدمی باوجود انسان صورت ہونے کے انسان نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا نظام حواس و ادراک درہم برہم ہو جاتا ہے، اور یہی شے انسان کا اصلی جوہر شرف ہے۔ بالکل اسی طرح ایک سود خوار باوجود ایک جائز باشندۂ شہر اور شریف زندگی ہونے کے شریف نہیں ہوتا، کیونکہ اُسکے تمام جذبات و عواطفِ ملکوتیہ اور فضائل حضائل و اخلاق معطل ہو جاتے ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو معطل ہو جائیں تو

فلم یبق الا صورت اللحم والدم!

اور زیادہ اس تشبیہ پر نظر ڈالیے! ایک مصروع آدمی کھاتا ہے، پیتا ہے، عقل و حواس کی باتیں کرتا ہے، بالکل ایک بھلے چنگے آدمی کی طرح آپکے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوتا ہے۔ لیکن دفعتاً اسکی حالت میں ایک انقلاب عظیم ہو جاتا ہے۔ اسکے ہاتھ پاؤں کھنچنے لگتے ہیں، اعصاب میں تشنج ہونے لگتا ہے، خون کا دوران جاری و ساری یکایک بند ہو جاتا ہے۔ بالکل اُس مشین کی طرح جس کا انجن یکایک پھٹ گیا ہو، اسکے ہوش و حواس کے کیل پُرزے بند ہو جاتے ہیں، وہ چکرا کر زمین پر گر جاتا ہے، احتضار موت کی سختیوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہے، منہ سے کف جاری ہو جاتا ہے، اور دیکھنے والے متحیر و متعجب ہو کر رہ جاتے ہیں کہ چند لمحوں کے اندر، ایک صحیح و سالم، مضبوط و توانا، ذی حس و صاحب ہوش و حواس انسان کی حالت میں یہ کیا انقلاب عظیم ہو گیا؟

بعینہٖ یہی حالت سود خوار کی بھی ہوتی ہے۔ عالم جذبات و عواطف کی دنیا بھی اجسام و جوارح انسانی کا ایک پرتو ہے۔ ٹھیک مثل ایک مصروع کے دنیا کے سامنے وہ نمودار ہوتا ہے۔ اس میں از فرق تا بہ قدم کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی، جو ایک شریف اور شہری زندگی کے مخالف ہو۔ وہ ڈاکوؤں کی طرح جنگل کے پوشیدہ

گوشوں اور پہاڑوں کے تاریک غاروں کو تلاش نہیں کرتا، بلکہ ہر مدنی وجود کی طرح شہر اور انسانی آبادی کا خواستگار ہوتا ہے۔ وہ عین آبادی کے وسط میں مکان بنا کر رہتا ہے۔ وہ کسی شریف شہری کی طرح بازاروں میں خرید و فروخت، اور گھر کے اندر ملاقات و صحبت میں مصروف نظر آتا ہے تم اسکو ہر طرح ایک شریف آدمی کی طرح پاتے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ نرمی و محبت سے باتیں کرتا، تمہارے استقبال کے لیے خوش آمدید کہتا، تم کو لطف و وداد کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتا، تمہارے ساتھ کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے۔ لیکن باایں ہمہ، جب کہ تم ان مظاہر انسانیۃ سے متاثر، ان علائم امیال و عواطف سے مطمئن اور ان ابرازات تمدن و حضریت سے خوش وقت ہوتے ہو، تو یکایک اس کے نظام جذبات و خصائل میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہونے لگتا ہے۔ مصروع کے جن کی طرح سود خواری کا شیطان اس میں حلول کر جاتا ہے۔ اس کی طبیعت ثانیہ کے ہیجان کا ابال اس کے دل کے اندر جوش کھا کھا کر اٹھنے لگتا ہے۔ اس کی صورت متغیر ہو جاتی ہے۔ رحم و انسانیت کی لینت و نرمی کی جگہ وحشیت و سبعیت کے آثار و علائم سے اسکی پیشانی مکروہ بن جاتی ہے۔ اس کا چہرہ جو چند لمحہ پیشتر ایک انسان کی طرح حسین تھا، دفعۃً ایک خونخوار درندے کی طرح مہیب ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں قساوت و بے رحمی کی سرخی پھر جاتی ہے اس کی ناک کے نتھنے ہیجان غیظ و غضب سے خوں آشام درندوں کی طرح پھڑکنے لگتے ہیں۔ اس کا دماغ معطل ہو جاتا ہے، اور تمام جذبات و عواطف انسانیۃ دفعۃً اس کے صفحۂ ذہن سے یکلخت محو ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک مصروع اور آسیب زدہ مریض کی طرح وہ اپنے قابو میں نہیں ہوتا اور نہ اس کے ہوش و حواس اس کے اختیار میں ہوتے ہیں، اس کے سامنے صرف "سود" کا شیطان ہوتا ہے، جو اس کو مسمریزم کے معمول کی طرح اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ اس کی آنکھ اور کان، دونوں انسانیت کی حکمرانی سے باغی ہو کر صرف شیطان کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔ پھر نہ وہ سود کے سوا کچھ دیکھتا ہے، اور نہ سود کے سوا کچھ سنتا ہے جس طرح ایک آسیب زدہ کسی مجہول و غیر مرئی وجود کو دیکھ کر اس کو پکارتا اور اس کی طرف اشارہ کرتا ہے اسی طرح وہ صرف "سود" ہی کی طرف اشارہ کرتا، اور صرف "سود" ہی کی آواز کو سننا چاہتا ہے۔ اس کا صید قہر و ظلم اس کے سامنے خاک پر لوٹے، زخمیوں کی طرح چیخے یا جانکنی میں تڑپنے والوں کی

طرح تڑپے، پر اُس کو کچھ نظر نہیں آتا - وہ مدہوش اور پاگل کی طرح ان سب باتوں سے بے پرواہ بے علم، صرف "سود، سود، سود" کہہ کر پکارتا، اور اُس کے لینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے!!

الذین یاکلون الربٰوا لا یقومون الا کما یتخبطہ الشیطان من المس !!

اس ٹکڑے کو کہاں تک طول دوں؟ الہلال کے صفحات ان مباحث کے لیے محل موزوں نہیں جس قدر زیادہ غور کرتے جائیے گا، اور دونوں حالتوں کو اپنے سامنے لائیے گا، اتنا ہی اس تشبیہ کی جامعیت اور احاطہ کا انکشاف ہوتا جائے گا - یہ صرف سرسری اشارات ہیں، جن سے ایک فکر سلیم اندازہ کر سکتی ہے، کہ امثال و تشبیہات قرآنیہ اپنی ہر مختصر سی مختصر تشبیہ کے اندر بھی مطالب عالیہ، غوامض حکمیہ اور سرائر فطریہ کا ایک بحر بے کنار، بل اوقیانوس حکم و معارف بیکراں ہے - فہم انسانی اُس کے سُراغ میں نکل سکتی ہے پر اُس کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ:

تقاصر عنہ افہام الرجال

اور پھر یہ اس کا فضل ہے کہ جس خوش نصیب کو چاہے اپنے کلام حکیم کے چند قطرات معارف سے سیراب کرنے کے لیے چن لے - اس کے لیے محض علم و فضل اور مطالعۂ علوم کا دعویٰ بیکار ہے: کہ بل هو ایات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم، وما یجحد بایاتنا الا الظٰلمون (۲۹ : ۴۸)

ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام، والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر، ما نفدت کلمات اللہ، ان اللہ عزیز حکیم! (۳۱ : ۲۶)

یہ زمین پر لاکھوں اور کروڑوں درخت جو تم دیکھ رہے ہو، اگر ان سب کی شاخوں کو قلم بنا دیا جائے، اور تمام بے کنار سمندروں سے سیاہی کا کام لیا جائے، اور وہ بھی اس طرح کہ جب سمندر ختم ہو کر خشک ہو جائیں، تو ویسے ہی سات نئے عظیم الشان سمندر ان کی جگہ آموجود ہوں، اور اس طریقے پر اللہ تعالیٰ کے کلمات و آیات کو لکھا جائے، پھر بھی یقین کرو کہ وہ کبھی تمام نہ ہوں گے کیونکہ وہ حکیم و عزیز ہے" !!

هر کس کہ بود سیم و زر و زیب و فرش
باشد پس مرگ ناگذیر از سفرش

بنگر چہ بود جامۂ زربافت کفن
سوزند در آتش از پے سیم و زرش

(مرزا محمد افضل سرخوش)

ایڈیٹر الناظر کی گرفتاری

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ — اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

جیل خانہ میں اکیس ۲۱ مہینے نہایت درجہ راحت و آرام سے بسر کرنے کے بعد اگرچہ زنداں میرے لیے موجب وحشت نہیں ہو سکتا لیکن حق یہ ہے کہ اسیری کے سکون بے شغلی کے بعد موجودہ آزاد زندگی کی کشاکش نہایت کلفت انگیز ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ درحقیقت میری رہائی سبب گرفتاری و اسیری بن گئی ہے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

اپنی گرفتاری خاطر کے جملہ اسباب کی تشریح صرف اس بنا پر غیر ضروری اور بے موقع سمجھتا ہوں کہ ناظرین "الناظر" اس سے مکدر ہوں گے اور میری پریشانیوں میں اُس سے کوئی کمی واقع نہ ہوگی لیکن کم سے کم ایک سبب ایسا ہے جس کے اظہار میں مزید تامل و تذبذب جائز نہیں۔

الناظر جولائی ۱۹۰۹ء سے جاری ہے اور اس وقت تک کہ پندرہ سال گذرے ہیں سوائے گذشتہ دو سال کے جبکہ میری اسیری کی وجہ سے مجبوراً بند رہا باقی تمام مدت میں وہ آپ کی اور زبان اُردو کی خدمت میں برابر مصروف رہا ہے۔ میں اُس کی خدمات کے متعلق ایک لفظ نہیں عرض کرنا چاہتا۔ یہ ناظرین کرام، محترم قلمی معاونین اور معزز معاصرین کا کام ہے کہ وہ الناظر کی گذشتہ زندگی پر تنقید کر کے اُس کے حسن و قبح کے بارہ میں کوئی رائے قائم کریں۔ البتہ یہ بات از راہ تفاخر نہیں بلکہ محض بطور اظہار واقعہ عرض کرنا غالباً نامناسب نہ ہو کہ الناظر سے پہلے جس قدر علمی و ادبی رسائل مُلک میں شائع ہوتے تھے آج دلگداز اور زمانہ کے سوا اُن میں سے کوئی جاری نہیں ہے اور اُس کے بعد جو نئے رسالے جاری ہوئے اُن میں سے بھی درجنوں کی تعداد میں شمار کرائے جا سکتے ہیں جو کچھ دنوں یا چند سال تک آب و تاب کے ساتھ شائع ہونے کے بعد بند ہو گئے۔

الناظر کو اتنی مدت تک قائم رکھنے میں جن جن دشواریوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے اُن کا اندازہ کچھ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جن کو اُس قسم کے کاموں کا عملاً تجربہ ہے بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اس اثنا میں جو مالی نقصانات محض الناظر کی وجہ سے ہوئے ہیں اُنھیں کی مقدار سات ہزار روپیہ کے قریب ہے۔ اور آج بھی دوسری تمام پریشانیوں اور کلفتوں سے زیادہ جو فکر و تشویش مجھے بے چین رکھتی ہے

وہ الناظر ہی سے متعلق ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ پریس اور بک ایجنسی کے کار بار کو جو نقصانات میری غیر حاضری میں پہنچ گئے ہیں اُن کی بدولت اب یہ امر میرے حیطۂ امکان سے باہر ہو گیا ہے کہ آیندہ الناظر کے کثیر نقصانات کی کفالت کر سکوں۔

الناظر کی اشاعت کبھی بہت زیادہ نہ تھی۔ اگرچہ اشاعت کم ہونے کے باوجود اسکی شہرت شاید اُن رسائل سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے جو ممکن ہے کہ مالی حیثیت سے کامیاب ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ شہرت اُس مالی نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی جو ہر مہینہ اُس کی وجہ سے اُٹھایا جاتا ہے۔ نقصان کا اندازہ اِس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ محض طباعت و اشاعت کی مد میں ہر ماہ پچاس روپیہ کی کمی پوری کی جا رہی ہے۔

ایڈیٹر الناظر ایک بے بضاعت شخص ہے اور اگر خدا کے فضل و کرم سے پریس اور بک ایجنسی کے کار و بار کو گذشتہ سالوں میں کافی کامیابی نہ حاصل ہوئی ہوتی تو یقیناً اب سے بہت پہلے وہ اِس اگرال سے سبکدوشی حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا ہوتا۔ جہاں تک کہ پریس کا تعلق ہے مشین فروخت ہو جانے کے بعد اب اُس میں کوئی آمدنی باقی نہیں رہی بلکہ اگر الناظر کو کسی دوسرے پریس میں چھپوانے کا قابل اطمینان انتظام ممکن ہوتا تو پریس کو اُس وقت تک کے لیے بند ہو جانا چاہیے تھا کہ پھر اُس کے لیے مشین فراہم کی جا سکے۔

بک ایجنسی اب بھی بفضلہ نفع بخش ہے اور اُس کو جو نقصانات پہنچے تھے اُن کی تلافی گذشتہ دو سال کے اندر ہو جاتی اگر ایک نعلبی گھونسے نے اُس کے تمام نظام کو مضمحل نہ کر دیا ہوتا۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ میری اسیری کے زمانہ میں ایک عزیز دوست اِس کار و بار کے نگران رہے۔ اُن کے اخلاص و محبت، ہمدردی و اخوت کے مظاہرے دیکھ دیکھ کر میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرتا تھا کہ اس پُر آشوب زمانہ میں جب کہ ہر طرف نفسانیت اور خود غرضی کی گرم بازاری ہے مجھے ایک ایسا مخلص رفیق عطا ہوا ہے جو صحیح معنوں میں

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

کا مصداق ہے۔

عزیز موصوف اور میں پانچ سال سے یکجا رہتے تھے اور اس مدت میں ہمارے روابط و تعلقات

اس قدر گھرے ہو گئے تھے کہ فی زمانہ دو حقیقی بھائیوں میں بھی عام طور پر اس قدر اتحاد و اتفاق نہیں ہوتا اس لیے جب میں نے گرفتاری کے وقت اپنے دفتر کی کنجیاں اُن کے حوالے کیں تو مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ نہایت ہی قابل اعتماد ہاتھوں میں کاروبار چھوڑ گیا ہے مگر افسوس کہ انھوں نے میری تباہ حالی و زیر باری پر پوری طرح مطلع ہونے کے باوجود اس کاروبار کے تمام نظم و نسق سے واقف ہو جانے کا یہ فائدہ اٹھایا کہ اسی نہج پر اپنا جداگانہ کاروبار قائم کر دیا اور بسبب اس کے کہ ماشاءاللہ وہ صاحب سرمایہ ہیں جس رفتار سے اُن کا کاروبار ترقی کر رہا ہے اُسی رفتار سے الناظر ایجنسی کا کاروبار روبہ تنزل ہے۔ اور میں نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ کے عذاب الیم میں گرفتار۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ الناظر کی مزید کفالت کا بار ایجنسی کے ذمہ نہیں ڈالا جا سکتا۔

یہ ہے وہ کاری ضرب جس کی وجہ سے نہ صرف الناظر ایجنسی طرح طرح کی پیچیدگیوں میں مبتلا ہے بلکہ الناظر کا وجود بھی معرض خطر میں ہے اور اگر ایسے وقت میں الناظر کے قدردان اور میرے احباب نے توجہ نہ فرمائی تو میرے لیے چارہ نہیں کہ الناظر کو بند کر دوں اور ہو سکے تو اس کاروبار سے بھی دستکش ہو جاؤں اس لیے کہ الناظر کے بعد اس کاروبار میں میرے لیے کوئی دلکشی باقی نہیں رہ جاتی۔

الناظر کے متعلق سردست کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر قدردانان الناظر اور دیگر بہی خواہان ملک و قوم کی رائے میں الناظر کا وجود مفید ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے تو ان پر لازم ہے کہ اُس کی اشاعت کم سے کم اتنی بڑھا دیں کہ الناظر کی آمدنی اُس کے مصارف طباعت و اشاعت کے لیے کافی ہو جائے۔

الناظر کے خاص خادم اور کارکن ہونے کی حیثیت سے میرے اوپر جو ذمہ داری عاید ہے میں اُس سے غافل نہیں ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ تنہا میری کوشش سے کچھ نہ ہوگا۔ البتہ مصارف میں مزید کفایت کے خیال سے بعض انتظامات تجویز کیے گئے ہیں جن پر آئندہ انشاءاللہ عمل درآمد ہو سکے گا۔

الناظر کے آمد و صرف کو برابر کرنے کے لیے اس وقت دو سو نئے خریداروں کی ضرورت ہے اگر الناظر کے جملہ خریداران و قلمی معاونین متوجہ ہو جائیں اور ہر شخص کم سے کم ایک خریدار فراہم کرے تو ایک ہفتہ کے اندر دو سو سے زائد خریدار مہیا ہو سکتے ہیں۔

لیکن تجربہ کی بنا پر میں سمجھ سکتا ہوں کہ ہر شخص اتنی زحمت نہ گوارا کرے گا۔ اسی لیے میں خریداران و قلمی معاونین میں سے اُن اصحاب سے جو الناظر کو جاری رکھنا پسند فرماتے اور اس وقت اُس کی امداد کرنا چاہتے ہوں یہ درخواست کروں گا کہ سب صاحب کم سے کم پانچ خریدار فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح جن اصحاب کی خدمت میں میں یہ استدعا پیش کر رہا ہوں اگر اُن میں سے بیس فیصدی بھی میری استدعا قبول کریں گے تو الناظر انشاء اللہ قائم رہے گا۔

گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

آئندہ پرچہ میں ان معروضات کے نتائج سے انشاء اللہ ناظرین مطلع کیے جائیں گے اور اسی وقت میں اپنے آخری فیصلے کا اعلان کر سکوں گا۔ خاکسار ظفر الملک

(نوٹ)

الناظر کے سرورق پر "خریداران الناظر سے خاص رعایت" کا جو اعلان شائع ہو رہا ہے، ناظرین کرام کے ملاحظہ سے گذرتا ہوگا۔ الناظر بک ایجنسی کی طرف سے اس بات کی مستقل کوشش رہے گی کہ آئندہ جس قدر کتابیں ایجنسی کے زیر اہتمام شائع ہوں اُن میں سے بالاکثر خریداران رسالہ کو خاص رعایتی قیمتوں پر دی جائیں۔ پس جو اصحاب اپنے دوستوں سے خریداری رسالہ کی تحریک کریں وہ اُنھیں خاص طور پر یہ بتا سکتے ہیں کہ الناظر کی خریداری پر جس قدر سالانہ رقم صرف کی جائے گی اُسکا ایک معقول حصہ کتابوں کی رعایتی قیمتوں کی صورت میں خریداروں کو واپس مل جائے گا۔ اور اس طرح سب اگر نہیں تو بہت سے خریداروں کے لیے تو رسالہ تقریبًا بالکل مفت ہوگا۔

الناظر کے ساتھ اس سے پہلے بھی بعض مستقل کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں اور اب پھر یہ سلسلہ شروع ہونیوالا ہے۔ الناظر کے ایک ممتاز قلمی معاون نے حال ہی میں یورپ کے ایک مشہور عالم رینان کی کتاب ابن رشد اور ابن رشدیہ (یہ کتاب کے نام کا لفظی ترجمہ ہے) کو اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور از راہ محبت الناظر میں اس کتاب کے شائع کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک دوسرے فاضل اہلِ قلم نے اغانی کے دلچسپ مباحث کا ترجمہ بالاستیعاب الناظر میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

ان کے علاوہ متعدد عالمانہ مضامین بھی الناظر کے لیے فراہم کیے جا رہے ہیں جن میں سے ایک مضمون میں جرمنی کے مشہور فلسفی آئنسٹین کے اس حیرت انگیز نظریہ کی تشریح بیان کی گئی کہ نیوٹن کے وقت سے آج تک جو علمائے سائنس کشش ارض کے قائل ہیں اُن کے دعاوی باطل اور دلائل غلط ہیں۔

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ جولائی ۱۹۲۴ء

نمبر ۱۵۷ جلد ۲۷

مطبوعات جدیدہ

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہے۔ آج کل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہونگے مگر ان میں عموماً کونین کی جزو رہتی ہے۔ اس لیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہیں مگر جڑ سے آرام نہیں کر سکتی ہیں۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز میں ایک دم آرام کرنے کا خاص دعوے رکھتی ہے اور عوام کے فائدہ کو مد نظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ اس میں تین خاص منفعتیں ہیں (۱) ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتا ہے، اس لیے چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہوجاتا ہے (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے اور اس کی خرابیوں کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں ۱۲ شیشی خورد ۱۰ محصول ڈاک شیشی کلاں ۸ اور خورد ۷

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

لرزہ بخار پرانا ہوجانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہے۔ جسم کا خون پانی سا ہوجاتا ہے اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہوجاتا ہے۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے۔ کبھی منہ اور ہاتھ پیروں میں ورم آجاتا ہے اور زندگی وبال ہوجاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں اور چار ہی پانچ خوراک میں بخار کا آنا بند ہوجاتا ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱۰ محصول ڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶

کونین کی گولیاں

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیاں بنتی ہیں اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں پاس رکھیے۔ اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخی ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱۲ محصول ڈاک ۶

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

ایجنٹ:۔ ڈاکٹر گنگا رام جبتلی چوک لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۴ء

نمبر ۵۸ ———— جلد ۲۷

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء

نمبر ۱۵۹ جلد ۲۷

مطبوعات جدیدہ

معراج الکلام (جلد اول)

جانشین مرزا دبیر مرزا محمد جعفر اوج مرحوم کا کلام جس میں ۱۴ مرثیے، سلام اور رباعیات ہیں۔ اور شروع میں مرزا صاحب کے ذاتی و خاندانی حالات اور عکسی تصویر۔ قیمت ۲ر

بانگ درا

ڈاکٹر اقبال کا مجموعۂ کلام جسمیں قدیم و جدید ہر قسم کا شایع شدہ اور غیر مطبوعہ کلام ہے۔ شایع کنندگان نے شاید معقول معاوضہ دینے کی وجہ سے یا صرف اقبال کی عظمت و مقبولیت پر نظر کرکے تاجروں کے لیے اگرچہ مجموعہ کی فراہمی کو بجائے خود ایک مرحلہ بنا دیا ہے۔ تاہم الناظر کے محترم ناظرین کے لیے کچھ نسخے حاصل ہوگئے ہیں۔ شائقین فوراً منگالیں۔ کتاب کی خوشنما جلد بندھوادی گئی ہے۔ قیمت صہ

نقش فرنگ

مصنفہ قاضی عبد الغفار مرادآبادی سابق اڈیٹر ہمدرد و صدائے قوم وغیرہ جس کا تعارف فیہ مافیہ کے ذیل میں کرایا جاچکا ہے۔ اور جس میں یورپ کے موجودہ تمدن کا نہایت دلچسپ مرقع پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

جدید دنیائے اسلام۔ جس کا مفصل ریویو گست کے الناظر میں درج ہوچکا ہے۔ اگر کسی صاحب کو درکار ہو تو منگالیں۔ قیمت عہ

عمرو بن عاص رضہ

مشہور صحابی، جنھوں نے مصر فتح کیا۔ مولانا اسلم جیراجپوری نے انکی سوانحعمری تالیف کی ہے قیمت عہ

جاپان اور اسکا تعلیم نظم و نسق

نواب مسعود نواز جنگ بی اے ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن کچھ عرصہ ہوا ریاست کی طرف سے جاپان بھیجے گئے تھے کہ وہاں کے تعلیمی حالات کا مطالعہ کریں۔ واپس آکر انھوں نے جو دلچسپ رپورٹ بزبان انگریزی مرتب کی انجمن ترقی اردو نے اہل ملک کے نفع کے لیے اسکو اردو میں شایع کیا ہے

سوانحعمری مہاراجہ اشوک

مہاشے پرکاش دیوجی آنجہانی جنکی تصانیف "سوانح حضرت محمد صلعم" اور "مہاتما بدھ" وغیرہ بہت مقبول ہوچکی ہیں۔ یہ کتاب بھی انھیں کی تالیف ہے جسمیں ہندوستان کے مشہور و معروف مہاراجہ اشوک کے حالات لکھے گئے ہیں۔ قیمت ۱۲ر

مقتل فریب مغربی معمل خانے

از سید طالب علی طالب الہ آبادی۔ مغربی ممالک کے سائینس دان اپنے تجربات کس طریقہ پر کرتے ہیں؟ اس کا دلچسپ خاکہ اس رسالہ میں پیش کیا گیا ہے۔ اسلوب بیان ایسا رکھا گیا ہے کہ کتاب افسانہ بنگئی ہے۔ قیمت ۴ر

ملنے کا پتہ:- الناظر کتبخانہ لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۲۶ء

نمبر ۱۰، ۱۱ — جلد ۲۷

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہے۔ آج کل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہوں گے مگر ان میں عموماً کونین کی جز و رہتی ہے۔ اس لیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تو روک دیتی ہیں مگر جڑسے آرام نہیں کرسکتی ہیں۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز میں الیکدم آرام کرنے کا خاص دعویٰ رکھتی ہے اور عوام کے فائدہ کو مد نظر رکھ کر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ اس میں تین خاص صفتیں ہیں (۱) ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے۔ اس لیے چار یا پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے اور اسکی خرابیوں کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں ۱۲ر شیشی خورد ۱۰ر محصولڈاک شیشی کلاں ۸ر اور خورد ۷ر

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

لرزہ بخار پڑا آتا ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہے۔ جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے۔ کبھی منہ اور ہاتھ پیروں پر ورم آجاتا ہے اور زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں اور چار ہی پانچ خوراک میں بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱۰ر محصولڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶ر

کونین کی گولیاں

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیاں بنتی ہیں اور سفری ٹینٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں پاس رکھیے۔ اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخی ہے قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۴ر محصول ڈاک ۶ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

ایجنٹ :- ڈاکٹر گنگارام جتیلی - چوک لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۴ء

نمبر ۱۶۲ — جلد ۲۷

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہے - آج کل سیکڑون اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہوں گے مگر ان میں عموماً کونین کی جز و رہتی ہے - اس لیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہیں مگر جڑ سے آرام نہیں کر سکتی ہین - ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز میں ایک دم آرام کرنے کا خاص دعویٰ رکھتی ہے اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے - اس میں تین خاص صفتیں ہین (۱) ملیریا کے کیڑوں کو مار دیتی ہے - اس لیے چار ہی پانچ خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے (۲) یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے اور اُسکی خرابیون کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے - قیمت فی شیشی کلان عہ ر شیشی خورد ۱۰ ر محصول ڈاک شیشی کلان ۸ ر اور خورد ۷ ر

پُرانے ملیریا بُخار کی گولیان

لرزہ بخار پُرانا ہو جانے پر باری سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہے - جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہے - تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے - سانس پھولتی ہے - کھانے کی خواہش اور قوت بہت گھٹ جاتی ہے - تلّی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے - کبھی منہ اور ہاتھ پیروں میں ورم آ جاتا ہے اور زندگی وبال ہو جاتی ہے - ایسی حالت مین یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں اور چار ہی پانچ خوراک میں بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے - قیمت پچیس گولیون کی ڈبیہ ۱۰ ر محصول ڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶ ر

کونین کی گولیان

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیاں بنتی ہیں اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ میں ہوتی ہین - کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیان پاس رکھیے - اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخی ہے - قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۃ ر محصولڈاک ۶ ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ - کلکتہ

ایجنٹ :- ڈاکٹر گنگارام چیلی - چوک لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۵۷ جلد ۲۷ — ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء

فیہ ما فیہ

(از: چلبی)

تحریم سود تجارت

سید طفیل احمد صاحب کے برپا کردہ فتنۂ جواز سود پر سب سے پیشتر انھیں اوراق میں تنقید کی گئی تھی، الحمد للہ کہ وہ کمزور آواز بے اثر نہ ثابت ہوئی۔ متعدد اہل علم حضرات نے اس مسئلے پر توجہ فرمائی، مختلف اخبارات و رسائل نے فتوائے جواز کی تنقید، نقلی و عقلی، ہر پہلو سے کی، اور اس فتنۂ عظیم کے بانی نے جس قدر مغالطہ پر ورطرز استدلال اختیار کیا تھا، نقل احادیث میں جو تحریف کی تھی، استشہادِ آیات قرآنی میں جس تدلیس سے کام لیا تھا، یہ ساری چیزیں منظر عام پر آ گئیں۔ سید صاحب کسی معقول گرفت کے جواب میں اپنی صفائی نہ پیش کر سکے، اور نہ انھیں اپنے جرائم کے اعتراف کی توفیق نصیب ہوئی۔ بلکہ افسوس ہے کہ بعض ادنیٰ جذبات سے متاثر ہو کر انھوں نے غیر متعلق بحث و مباحثہ کا سلسلہ قائم کر دیا، اور اپنے معترضین پر ذاتی حملہ کر کر کے انکی زبانیں بند کرنے کی کوشش کی۔ البتہ اس نقد و نظر کا ایک خوش آیند نتیجہ یہ ضرور نکلا، کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس فتنۂ عظیم میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہو گئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل داد مولانا عبد السلام ندوی کا وہ عالمانہ مضمون ہے جو رسالۂ معارف (اعظم گڈھ) میں نکل رہا ہے، اور جس میں تجارتی سود کے جواز کو ہر پہلو سے

باطل کیا گیا ہے۔ کاش، خدائے کریم، اب بھی قوم کے گمراہ افراد کو راہ ہدایت نصیب کرے۔

موت کے بعد!

علیگڈھ کی قدیم "قومی" جماعت میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی ذات، اکثر حیثیات سے قابل عزت ہے۔ اُن کا حُبِ اسلام مسلّم، اور انکا خلوص غیر مشتبہ ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر صدمہ ہوتا ہے، کہ اُن کا قلب انگریزیت سے اس درجہ متاثر ہے، کہ یہی شے اُنکے نزدیک معیارِ حقیقت بن کر رہ گئی ہے، اور وہ دین و دنیا، علم و عمل، عقل و نقل، غرض ہر شے کو اسی انگریزی پیمانہ سے ناپنے لگے ہیں، یہاں تک کہ "انگریزی زندگی" سے گذر کر اب "انگریزی موت" تک اُنھیں اپنی قوم کے لیے پسند آنے لگی ہے!

غالب نے انتہائی کفر دوستی و اسلام بیزاری کے موقع پر، عالم تخیل میں، یہ تمنا کی تھی، کہ زندگی کافروں کی، اور موت مسلمانوں کی، نصیب ہو، ع

حیف کافر مردن، و آوخ مسلماں زیستن!

لیکن صاحبزادہ صاحب انتہائی اسلام دوستی اسکو سمجھتے ہیں، کہ مسلمان کو موت بھی "صاحب" کی طرح نصیب ہو اور گویا قفس عنصری سے آزاد ہونے کے بعد اُسے آخری آرام گاہ بجائے جوار حرم یا جنۃ البقیع کے لنڈن کے جنوبی و مشرقی حصہ کے انگریزی گورستان میں نصیب ہو!

ابھی چند ہفتے کا ذکر ہے، کہ لنڈن سے اُنکا ایک مکتوب گرامی شایع ہوا ہے، جس میں وہ لنڈن کے جنوبی و مشرقی حصہ کے گورستان کے محامد و مناقب تحریر فرماتے ہیں، کہ اسکی عمارت نہایت وسیع و عالیشان ہے، دروازے پر اعلیٰ قسم کی شاندار وردیاں پہنے ہوئے دربان ہیں باہر سے قبرستان پر کسی رئیس اعظم کے باغ کا دھوکا ہوتا ہے، اندر ایک صاف و آراستہ سڑک ہے، ہر طرف ایک نظر فریب چمن کھلا ہوا ہے، مقابر تمام تر سنگین ہیں، بعض سنگ سفید کے، اور اکثر اعلیٰ و نفیس سنگ مرمر کے، وقس علیٰ ہذا۔ اس نمونہ کو وہ اپنی قوم کے سامنے پیش فرماتے ہیں، اور چاہتے ہیں، کہ یہاں کے مزارات کے متولی و سجادہ نشین بھی یہی طرز اختیار کریں، کہ شاید مردہ قوم کے زندوں میں، زندہ قوم کے مُردوں کی تقلید سے کچھ آثار حیات پیدا ہو جائیں۔

یقینی ہے، کہ صاحبزادہ صاحب نے یہ مشورہ خالص ہمدردی کی بنا پر پیش فرمایا ہے لیکن یہ بھی یقینی ہے، کہ اگر اُنکا مذہبی مطالعہ اُسی قدر وسیع ہوتا جس قدر اُنکے تعلیمی معلومات ہیں، تو اُنکا مشورہ اس سے بالکل مختلف ہوتا۔ اسلام نے دنیا کے اس سب سے زیادہ یقینی واقعہ (موت) سے متعلق جزئی سی جزئی ہدایات اپنے پیرووں کو دے رکھی ہیں "اس لیے ایک مسلم کے لیے اس باب میں کسی بیگانہ قوم سے درس ہدایت لینے کی مطلق گنجایش نہیں۔ احکام اسلام، مسئلہ مقابر میں بالکل صاف و واضح ہیں، ضرورت صرف اسکی ہے، کہ امانت داران توحید کو اُن پر عمل کی توفیق ہو۔ اسلام پختہ مقابر، سنگین مزارات، اور بلند گنبدوں کا دشمن ہے۔

(۱) عن جابرؓ قال نھی رسول اللہ صلعم ان تجصیص القبور وان یقعد علیہ وان یبنی علیہ (مسلم - کتاب الجنائز)

جابرؓ سے روایت ہے، کہ رسول خدا صلعم نے منع فرمایا قبروں کو پختہ کرنے سے، اُن پر بیٹھنے سے، اور اُن پر کچھ تعمیر کرنے سے۔

(۲) عن جابرؓ قال نھی رسول اللہ صلعم عن تجصیص القبور (مسلم - ابن ماجہ)

جابرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے قبروں کے پختہ کرنے کی ممانعت کی۔

(۳) عن ابی سعیدؓ ان النبی صلعم نھی ان یبنی علی القبر۔ (ابن ماجہ)

ابو سعیدؓ خدری سے روایت ہے، کہ حضورؐ نے قبر پر عمارت بنانے سے منع فرمایا۔

عالیشان عمارات، اور سنگین مزارات الگ رہے، اسلام اس تک کا روادار نہیں، کہ قبریں سطح زمین سے زیادہ بلند ہوں۔

عن ثمامہ بن شفی حدثہ قال کنا مع فضالۃ بن عبید بارض الروم برودس فتوفی صاحب لنا فامر فضالۃؓ بقبرہ فسوی ثم قال سمعت رسول اللہ صلعم یامر بتسویتھا (مسلم - کتاب الجنائز)

ثمامہؓ بن شفی راوی ہیں، کہ ہم حضرت فضالہؓ کے ہمراہ ملک روم کے جزیرہ روڈس میں تھے، کہ ہمارے ایک رفیق کا انتقال ہوگیا، تو فضالہؓ نے کہا کہ انکی قبر برابر کردی جائے۔ اور انھیں نے فرمایا کہ میں نے رسول خدا صلعم کو حکم فرماتے سنا کہ قبریں برابر کردی جائیں۔

سرکار رسالتؐ کا فرمان صریح ہے، کہ بلند قبروں کو زمین کے ہم سطح کر دیا جائے۔

عن ابی الھیاج الاسدی قال قال لی علیؓ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلعم ان لا تدع

ابو الھیاجؓ اسدی کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں تم کو اُس کام پر بھیجتا ہوں جسپر مجھے رسول خدا صلعم نے بھیجا تھا۔ وہ یہ

تمثالاً (او صورۃً) الا طمستہ ولا قبراً مشرفاً الا سویتہٗ (مسلم - کتاب الجنائز)

کہ ہر تصویر کو مٹا کر، اور ہر بلند قبر کو زمین کے برابر کر کے رہوں۔

اسلام، قبرستان کو محض قبرستان رکھنا چاہتا ہے۔ پارک بنا دینا نہیں چاہتا، جہاں انسان سیر و تفریح کے لیے جاتا ہے، اور سبزہ اور بنچوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرتا ہے، اور نہ پھر مسجد کی شکل میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، جہاں انسان پرستش و عبادت، رکوع و سجود کی غرض سے جاتا ہے۔

(۱) عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلعم لان یجلس احدکم علیٰ جمرۃٍ فتحرقہ خیرلہ من ان یجلس علیٰ قبرٍ۔ (ابن ماجہ)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ تم میں سے اگر کوئی ایک چنگاری پر بیٹھ جائے، اور وہ اسکو جلائے تو یہ اس سے بہتر ہے، کہ قبر پر بیٹھا جائے۔

(۲) عن ابی مرثد الغنوی قال قال رسول اللہ صلعم لا تجلسوا علی القبور ولا تصلوا الیہا (مسلم - کتاب الجنائز)

ابو مرثد غنویؓ سے دو طریقوں سے یہ مروی ہے، کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ قبروں پر نہ بیٹھو اور نہ انکی طرف نماز پڑھو۔

(۳) وعنہ قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول لا تصلوا الی القبور ولا تجلسوا علیہا۔

اسی طرح قبرستان کو مسجد بنا لینے، اور قبروں پر نماز پڑھنے کی ممانعت میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ یہود و نصاریٰ جو اپنے بزرگان کرام کے مزاروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اُن پر رسول اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری، کتاب الجنائز۔ مسلم، کتاب المساجد۔ ابن ماجہ، باب کروہ مقامات نماز۔ وغیرہ)

ٹھیک اسی طرح مقابر پر کتبات درج کرنے کی بھی ممانعت آچکی ہے۔

(۱) عن جابرؓ قال نہی رسول اللہ صلعم ان یکتب علی القبر شیٔ۔ (ابن ماجہ)

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم نے منع فرمایا قبر پر کچھ لکھنے سے۔

(۲) عن جابرؓ قال نہی رسول اللہ صلعم ان یجصص

جابرؓ سے روایت ہے، کہ رسول خدا صلعم نے منع فرمایا

القبور وان یکتب علیھا وان توطا (ترمذی) | قبروں کو پختہ کرنے سے، اُنپر کچھ لکھنے سے، اور انکو پامال کرنے سے۔

غرض مقابر، شریعتِ اسلامی کے مطابق، محض مقابر ہیں۔ نہ تفریح گاہیں ہیں، نہ عبادت خانے۔ بلکہ محض عبرت کے خزائن، موعظت کے دفائن، اور یادِ آخرت کے ذخائر۔ یہ ظن و قیاس نہیں، احکام صریح کی ترجمانی ہے۔

(۱) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم زوروا القبور فانہا تذکرکم الاخرۃ (ابن ماجہ۔ باب زیارت قبور) | ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا، کہ قبروں کی زیارت کرو، کہ یہ تمھیں آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

(۲) عن ابن مسعود ان رسول اللہ صلعم قال کنتُ نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروہا فانہا تزہد فی الدنیا وتذکر فی الآخرۃ (ایضاً) | ابن مسعودؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا، کہ میں نے پہلے تمکو زیارت قبور سے روکا تھا، لیکن اب جائز ہے، قبروں کی زیارت کرو، کہ اس سے دنیا کی جانب سے نفرت اور آخرت کی جانب رغبت پیدا ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کے واسطے سے ایک اور حدیث منقول ہے، جسکا آخری ٹکڑا یہ ہے، کہ فزوروا القبور فانہا تذکر الموت | قبروں کی زیارت کرو، کہ یہ شے موت کو یاد دلاتی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہوگیا ہوگا، کہ عالیشان عمارتیں، سنگین مزارات، بلند گنبد، خوشنما طغرے، مؤثر کتبے، ان میں سے کوئی شے بھی اسلام و شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پسند کردہ آئین و دستور کے موافق نہیں۔ مومن کی قبر باہر سے نہیں، اندر سے آراستہ ہوتی ہے۔ ایک ارشاد کے مطابق مُردے کے ہمراہ قبر تک تین چیزیں آتی ہیں، اُسکے اعزہ، اُسکا مال، اور اُسکے اعمال۔ پہلی دونوں چیزیں واپس چلی جاتی ہیں، اور آخری شے ساتھ دیتی ہے۔ قبر کے اوپر نقش و نگار، زینت و آرائش، سبزہ و گل کا انتظام اعزہ و احباب کرسکتے ہیں، لیکن ایک تیرہ و تار، تنگ و عمیق گڑھے کو روشن، و فراخ، ہوادار و آرام دہ، دلکش و نشاط انگیز، چمن و گلزار بنا دینا اعمال صالحہ پر منحصر ہے۔ خداے تعالیٰ و قدوس، اپنے فضل و کرم سے ہر کلمہ گو کو آخری خوابگاہ ایسی ہی نصیب کرے! صاحبزادہ صاحب تو خیر ایک حد تک معذور کہے جا سکتے ہیں، ان سے کہیں زائد قابل تاسف حالت ہمارے علما و مشائخ کی ہے، جن کی تعداد کثیر نے قبر پرستی اور اُس کے مراسم متعلقہ کو اپنا مستقل ذریعۂ معاش بنا لیا ہے۔

ہمارا قبرستان

صاحبزادہ صاحب نے اپنے وطن سے ہزارہا میل بعید ایک قبرستان پر توجہ فرمائی لیکن تعجب ہے، کہ خود انکے قلمرو خاص کا قبرستان اب تک اُنکی نگاہِ التفات سے محروم رہا۔ اتفاق سے مین اسی زمانے میں انکے "قایم مقام" صاحب نے (جنکی ایک عمر "قائم مقام" رہنے میں صرف ہوچکی ہے) مسلم یونیورسٹی کے قبرستان پر اپنی توجہ مبذول فرمائی ہے، اور اُسکی "نہایت خراب" اور "نہایت افسوسناک حالت" کا نقشہ پیش کرکے، یونیورسٹی سے نہیں، بلکہ یونیورسٹی کے "بہی خواہوں، عہدہ داروں، اور کارکنوں" سے فراہمی سرمایہ کی اپیل اس معقول بنا پر کی ہے، کہ

"حالت موجودہ میں یونیورسٹی پر اس کا بار ڈالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا"

اور اپنی طرف سے "سو روپے" کی رقم جسے وہ اپنے پچھلے چندوں اور عطیوں کے مقابلے میں "رسماً و انکساراً" نہیں، واقعۃً "ناچیز" سمجھنے پر مجبور ہیں، اس "کارخیر" میں پیش فرمادی ہے۔

اس "کارخیر" سے متعلق زیادہ کرید اور جستجو کا حق یقیناً ہم "اغیار" و "اجانب" کو حاصل نہیں، لیکن اگر یہ استفسار بالکل ہی سوءِ ادب میں داخل نہ ہو، تو کیا "خلوتیان راز" و "محرمان خاص" میں سے کوئی بزرگ یہ بیان فرمادیں گے، کہ جو شاہ خرچ انسٹیٹیوشن، ایک سال کے اندر تعمیرات پر ۶۲ ہزار خرچ کرسکتا ہے، ۱۵ ہزار محض مرمت پر لگا سکتا ہے، ۲۵ ہزار کی اراضی خرید سکتا ہے، ایک نہیں چار چار جدید شعبہ جاتِ تعلیم کھول سکتا ہے، جو ارکانِ اسٹاف کے اضافے اور اُنکے مشاہروں کی ترقی میں بیدھڑک صرف کرسکتا ہے، جو مصارف اسپتال کے لیے ایک گراں قدر رقم منظور کرتا ہے، جو پریس، بک ڈپو وغیرہ مختلف متعلقات یونیورسٹی کی سرپرستی کے لیے آمادہ و مستعد ہے، جو حکام و امرا کے مصارف استقبال میں دل کھول کر داد فیاضی دے سکتا ہے، اور جو خود اپنی ہی مقرر کردہ مجلس تخفیف مصارف کے مشوروں کو ناقابل قبول پاتا ہے، اُسکا خزانۂ عامرہ صرف اس ایک "کارخیر" کے جو اسلام اور یونیورسٹی دونوں کی شان کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے "بار" اٹھانے کے کیوں ناقابل ہوجاتا ہے؟ یا یہ ساقی کا اعجاز ہے، کہ وہ "تہی ساغری" اور "لبریزی" دونوں کے کرشمے ایک ہی وقت میں دکھا سکتا ہے؟

پرستانِ فرنگ!

اودھ کے ایک نامور تعلیم یافتہ ہندو بزرگ، جو انگریزی حکومت، انگریزی تعلیم، انگریزی تمدن اور انگریزی علوم و فنون کے ساتھ موالات کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں، اور ایک نہایت ممتاز سرکاری عہدہ پر سرافراز بھی رہ چکے ہیں، کچھ روز ہوئے سیر فرنگ کی غرض سے تشریف لے گئے ہیں۔ اور اپنے مشاہدات و تجربات سے لکھنؤ کے ایک اردو روزنامہ کو مشرف فرماتے رہتے ہیں، حال میں "شام پیرس" سے متعلق انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ اس قدر صحیح، دلچسپ، وسبق آموز ہے، کہ ان اوراق میں اسکا تذکرہ ضروری ہوگیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"آج سے چھ سو سال قبل خواجہ حافظ نے رندانہ زندگی کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ آج چودھویں صدی ہجری میں حرف بحرف پیرس کا مصداق ہو رہا ہے، جہاں بادی النظر میں بجز عیش و مسرت کے کوئی کام ہی نہیں دکھائی دیتا۔ ......

پیرس کے گلی کوچوں میں پھرو، یا بڑے بازاروں کی سیر کرو، خواہ سربفلک منارہ جات کی آخری منزل پر ہوا کھاؤ، یا زمین دوز ریلوے کے گوشے میں پناہ گزیں ہو، تمہیں چپے چپے پر حسن و عشق کے کرشمے، ناز و نیاز کی سرگوشیاں، اور مشرب رندانہ کے دھول دھپے کے تماشے نظر آئیں گے ...... کوئی چوراہا ایسا نہ ملے گا جہاں جیرٹ اپنا سودا چکانے میں مصروف نہ ہوں، کوئی لمپ یا ستون روشنی سڑک پر ایسا نہ پاؤگے جہاں ان برق وشوں کا شعلۂ حسن نہ چمکتا ہو۔"

مغربی تہذیب و تمدن سے متنفر و بیزار نہیں، اُسکا عاشق و شیدائی، مغربی ترقیوں کا منکر نہیں اُنکا قصیدہ خوان، مغربی حکومت کو باعثِ لعنت نہیں، باعثِ برکت قرار دینے والا، آگے چل کر اپنے تئیں الفاظ ذیل قلمبند کرنے پر مجبور پاتا ہے :-

"جشن انبساط اگرچہ عام طور پر ہر گلی کوچہ میں نظر آئے گا، لیکن شوہائے اقابین، اپیرا، اون پارٹ، شانز الیزی، اور وغیرہ میں ازدحام کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ شانہ سے شانہ چھلتا ہے۔ اسٹریٹ بینڈ یا جز بینڈ کے ترانے جابجا قہوہ خانہ سے نکل رہے ہیں۔ رعنائی و دلربائی کی مجسم صورتیں جلوہ آرا ہیں۔ برقی روشنی سے در و دیوار جگمگا رہے ہیں۔ تمام عالم

بقعۂ نور نظر آ رہا ہے۔ عرش سے فرش تک جدھر نظر جاتی ہے، حُسن و ادا کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں۔ زاہد صد سالہ بھی کنج تنہائی سے نکل کر اس اندر کے اکھاڑے کو دیکھتا ہے ......

منارۂ آئیفل تقریباً ایک ہزار فٹ بلند ہے ..... دنیا میں یہ منارہ بلند ترین ہے ....

فرانسیسیوں کی بوالہوسی و بیفکری دیکھو کہ اس بلند ترین منارے پر جہاں جاتے ہوئے کمزور طبائع کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جام و سبو میں مصروف ہیں۔ شب ہجراں کے شکوہائے رنج والم مشرق کے لیے مخصوص ہیں۔ عشرتکدۂ پیرس میں شب وصال و یوم عید کے سوا کوئی تذکرہ ہی نہیں ..... یہاں چکلے اور قمار خانے جائز ہیں، اور لوگوں کو کامل آزادی ہے کہ جب چاہیں سیہ روئی کو جائیں ؎

مرقع تہذیب و تمدن ناتمام رہ جائے گا، اگر ترقی و روشن خیالی کی لطیف ترین صنعتِ عالیہ کا منظر زیر پردہ رہ گیا۔

"ان قہوہ خانوں کو چھوڑ کر پیرس کے اکثر حلقوں میں تعلیم گاہ رقص بھی موجود ہیں ..... ۸ بجے شب سے ۱۰-۲ بجے تک کیک روی کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔ ہر تعلیم گاہ میں ایک مینخانہ بھی موجود ہے ..... ۹ بجے بینڈ بجنے لگتا ہے، اور اس کی آواز پر چاروں طرف سے پرے کے پرے ٹولیاں پڑتے ہیں، جو اپنے جوڑے کے ساتھ تھرکنے لگتے ہیں۔ مرد کا بایاں اور عورت کا دایاں ہاتھ سینہ سے زاویۂ قائمہ بناتا ہوا اوپر کو اُٹھا ہوتا ہے۔ مرد کا سیدھا ہاتھ عورت کے شانے پر اور عورت کا بایاں ہاتھ مرد کی پشت یا کمر پر ہوتا ہے۔ سینہ سے سینہ پیوست ہوتا ہے ..... نیم برہنہ جامہ جو خرید کے باریک تاروں سے بنا گیا ہے، زیبائش ستر کے لیے ہر جگہ نظر آئے گا۔ برہنہ شانہ، نیم برہنہ سینہ، نیم برہنہ پشت پر برقی روشنی پھسلی پڑتی ہے۔ شربتی موزے ساق سیمیں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ گداز پنڈلی باہر نکلی ہوئی ہے۔ اونچی ایڑی کا کامدار جوتہ پیروں میں ہے۔ سر پر ایک کامدار یا مصنوعی مرصع کارومال بالوں کو سنبھالے ہوئے ہے"

اُردو کے غزلیت ناسخ نے بغیر پیرس کی جھلک دیکھے ہوئے ایک بار کہا تھا، ع

جو اُجڑا لکھنؤ، کچھ غم نہیں، پیرس تو باقی ہے۔

اور اس طرح گویا پیرس کو لکھنؤ کا قائم مقام یا بدل قرار دیا تھا، لیکن آج وہ زندہ ہوتے، تو یقیناً اپنی غلطی کو تسلیم کرتے۔ لکھنؤ بیچارہ اپنی رونق و ترقی کے نہایت شباب کے وقت بھی پیرس کے حریف و مقابل بننے کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔

ایک دوسرا پہلو

برکات تمدن جدید کا ایک پہلو تو یہ تھا، جو ابھی نظر سے گزرا۔ دوسرا پہلو وہ ہے، جسکے متعلق حال میں روس سے اطلاع آئی ہے۔ زار اعظم کی اس عظیم الشان یادگار میں نوے بڑے شہر ہیں۔ ان میں سے ستر کے متعلق اطلاع یہ ہے، کہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں، ان میں بے روزگاروں کی تعداد ۲۰۰۰۰۰ تھی، فروری ۱۹۲۴ء میں ان کا شمار بڑھکر ۱۲۸۰۰۰ تک پہونچ گیا۔ باقی بیس شہروں کی حالت کا بھی اندازہ کرکے، حزب العمال مغربی کا مرکزی ہفتہ وار جریدہ انڈسٹریل اینڈ لیبر انفارمیشن لکھتا ہے، کہ یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو کل مملکت روس میں بے روزگاروں کی مجموعی تعداد کسی طرح ۱۲۳۰۰۰۰ سے کم نہیں ہو سکتی، بلکہ اغلباً اس سے زائد ہوگی!

ہماری قوم کے "طبیب حاذق" سید طفیل احمد صاحب جو مسلمانوں کے افلاس و تہیدستی کا درمان محض سود خواری کو قرار دے رہے ہیں، کیا ازراہ غریب نوازی ملک روس میں تشریف لیجا کر اپنے تیر بہدف علاج کی آزمایش کریں گے؟ متعصب مسلمان اپنی جہالت و تاریک خیالی سے ایسے محسن قوم کی پوری قدر نہ کر سکے، روشن خیال و ترقی دوست روس، اُمید ہے کہ انکے حق میں اپنی پوری قدرشناسی کا ثبوت دیگا۔

حق کی ناکامی

گاندھی جی کی تحریک کا بالآخر وہی حشر شروع ہو گیا ہے، جو دنیا میں اب تک تقریباً ہر تحریک حق و صداقت کا ہوتا آیا ہے۔ حضرت نوحؑ صدہا سال تک پیام حق کی منادی کرتے رہے اور کسی نے نہ سنا۔ حضرت ابراہیم خلیلؑ نے صدائے توحید بلند کی، تو آگ میں ڈالے گئے۔ حضرت موسیٰؑ ایک محکوم قوم کو ظالم حکومت کے پنجہ سے رہائی دلانے کے تشریف لائے، تو خود اپنی ہی قوم کی طرف سے مسلسل مخالفتوں اور نافرمانیوں کو برداشت کرنا پڑا۔ حضرت مسیحؑ نے راہ ہدایت دکھانا چاہی، تو دار و رسن کے مستوجب قرار پائے۔ حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت لوطؑ، جس جس نے صراط مستقیم کی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی، تقریباً سب کو اپنی قوم کی طرف سے جواب انکار و استکبار، تمسخر و استہزا کی شکل میں ملا ہے۔ جب ان پیامبران برحق، و

وہادیان مرسل کا یہ حال رہا کیا ہے، تو گاندھی بیچارے میں تو ان انبیاء کرام کی عشر عشیر بھی قوت نہیں، اُسکی تبلیغ کو کامیابی کی (اُس کامیابی کی جسے دنیا "کامیابی" کہکر پکارتی ہے) کیا توقع ہوسکتی تھی؟ نتیجہ یہ ہے کہ داس و نہرو، کیلکار و پٹیل، سب ایک ایک کرکے ساتھ چھوڑ رہے ہیں، اور موسیٰ و سامری کے راستے روز بروز ایک دوسرے سے دُور اور الگ ہوتے جارہے ہیں!

انبیاء، اور اُنکے منکرین، کی تاریخ، درحقیقت تاریخ کائنات کا عطر ہے، حق و باطل، نور و ظلمت، روح و مادہ کی جنگ ازل سے قائم ہے، اور ابد تک رہیگی۔ موسیٰ کلیم و فرعون، ابراہیم خلیلؑ و نمرود، ختم رسل و ابوجہل کی تاریخ ایک جام جم ہے، جس میں گذشتہ و آیندہ ہر واقعہ کا عکس نظر آجاتا ہے، صرف دیدۂ بصیرت چاہیے۔ سامری حضرت موسیٰؑ ہی کا ایک لشکری تھا، کوئی بیرونی مخالف نہ تھا۔ ادھر حضرت کی ذات مبارک آنکھوں سے اوجھل ہوئی، اُدھر اُس نے ایک گوسالہ بناکر کھڑا کردیا، اور ایک ظاہر پرست دنیا کلیم اللہ کی تعلیم کو بھول کر اُسکی پرستش میں لگ گئی۔ ہارونؑ موجود تھے، روک تھام کی کہ اے میری

یا قوم انما فتنتم بہ، وان ربکم الرحمٰن فاتبعونی واطیعوا امری۔ (طٰہٰ ۵)

قوم کے لوگو! یہ تم کیسے سخت فتنہ میں مبتلا ہوئے۔ کیا اپنے پروردگار خدائے رحمٰن کی تعلیم کو بھول گئے، اُسے یاد رکھو اور میری اتباع کرو، کہ میں اُسی کا رسول ہوں۔

قوم نے ایک نہ سُنی۔ اور عذر یہ پیش کیا کہ

لن نبرح علیہ عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ (ایضاً)

موسیٰ کی واپسی تک تو ہر صورت ہم کو نہ روکو، اور اس کی پرستش کرنے دو۔

بالآخر حضرت ہارونؑ بھی اس خیال سے خاموش ہورہے، کہ یہ لوگ تو باز آنے والے نہیں، کہیں

انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی (ایضاً)

ایسا نہ ہو، کہ قوم میں تفریق و انتشار پیدا کردینے، اور حضرت موسیٰؑ کے حکم کے انتظار نہ کرنے کا الزام بھی میرے سر ڈالا جائے۔

رجع موسیٰ الی قومہ غضبان اسفا ... ان الذین اتخذوا العجل سینالہم غضب من ربہم وذلۃ فی الحیوۃ الدنیا (اعراف ۱۸)

حضرت کلیمؑ نے واپس آکر یہ ماجرا دیکھا، تو سخت غصہ و قلق پیدا ہوا۔ ان کا غصہ غضب الٰہی کا مقدمہ تھا، چنانچہ ان گمراہوں کے لیے قہر الٰہی کی وعید شدید نازل ہوئی، اور یہ حکم ہوا، کہ اسی دنیا میں انھیں ذلت نصیب رہے گی۔

کیا اس سارے واقعہ سے ہماری رہنمائی کے لیے کوئی درس ہدایت نہیں نکلتا؟

گاندھی جی کے جیل خانے جانے سے پیشتر داس و نہرو انکے خاص دست و بازو سمجھے جاتے تھے۔ گاندھی جی کا میدان عمل سے ہٹنا تھا، کہ ان لوگوں نے کونسلوں کا ایک گوسالہ بنا کر کھڑا کیا، اور اپنی سعی و توجہ کا سارا مرکز اسی کو ٹھہرا لیا، حالانکہ یہ خوب جانتے ہیں کہ آج تک کوئی محکوم قوم نہ کونسلوں کی مدد سے آزاد ہوئی ہے، نہ کوئی کونسل کسی قوم میں روحانی و اخلاقی قوت پیدا کر سکتی ہے۔

الم یروا انہ لا یکلمھم ولا یھدیھم سبیلا۔ (اعراف - ۱۸۰)

وہ یار مخلصین جو باقی تھے، یا جو (محمد علی کی طرح) بعد کو چھوٹ کر آ گئے، انھوں نے اپنی والی روک تھام کی، لیکن سوراجیوں کی طرف سے یہی عذر پیش ہوا، کہ مہاتما جی کو باہر آنے دو۔ اور پھر ان لوگوں نے بھی محض اتفاق و اتحاد قائم رکھنے، اور قوم کو تفرقہ و انتشار سے بچانے کے لیے سکوت اختیار کر لیا۔ رفتہ رفتہ یہی گوسالہ پرستی تمام قوم پر مسلط ہو گئی، اور نوبت یہ پہونچ گئی، کہ آج جب خدا کا یہ نیک بندہ، جسے خدا نے ایک غلام قوم کو آزاد کرانے کے لیے بھیجا ہے، خدا کا نام لیکر قوم کو جد و جہد، سعی و عمل کی دعوت دیتا ہے، تو ٹھیک اسی لب و لہجہ میں جواب ملتا ہے، جو سرکش و متمرد قوم یہود نے اپنے نبی برحق کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا، کہ

فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون (مائدہ - ۴) | تم اور تمہارا خدا جا کر معرکہ سر کر آئیں۔ ہم تو یہیں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔

جب سب نے رفاقت چھوڑ دی، تو اس سچے پیغمبر نے جناب باری میں عرض کی

رب انی لا املک الا نفسی واخی فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین (مائدہ ۴) | کہ اے پروردگار، مجھے تو صرف اپنے اور اپنے بھائی کے اوپر اختیار رہے، اور بس، اب ہم میں اور اس نافرمان قوم میں تو ہی فیصلہ کر دے۔

اس نافرمانی کی پاداش میں بالآخر سزا یہ ملی، کہ

قال فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ یتیھون فی الارض (ایضاً) | چالیس برس کی مدت تک یہ گمراہ گروہ جنگل بیابان میں بھٹکتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ باشندگان ہند کو بھی دشت غلامی و صحرائے محکومی میں کتنے برسوں بھٹکنا اور ٹھوکریں کھانا باقی ہے!

چرخے کے فضائل سرور عالم کی زبان سے

کانگرس کمیٹیوں کے جو مسلمان ارکان اپنے اپنے عہدوں سے اس بنا پر استعفے دے رہے ہیں کہ چرخہ کاتنا اور سوت نکالنا اپنے لیے ناقابل تحمل پاتے ہیں، انکی خدمت میں عرض ہے کہ سرور کونین صلعم

کے مندرجۂ ذیل ارشادات پر ایک نظر کر لیں، قبل اسکے کہ چرخہ اور سُوت کے ساتھ تمسخر و استہزاء شروع کریں۔

(۱) نعم لهو المومنة فی بیتها المغزل — مومنہ کے لیے بہترین تفریح اُسکے گھر میں چرخہ ہے۔

(۲) خیر لهو للمرأة المغزل — عورت کے لیے بہتر تفریح چرخہ ہے۔

(۳) نعم لهو المرأة مغزلها — عورت کے لیے اس کا چرخہ اُسکی بہتر تفریح ہے۔

(۴) عمل الابرار من النساء الغزل — نیک بیویوں کا کام سوت کاتنا ہے۔

(۵) اعمال الابرار من النساء الغزل — نیک بیویاں سوت کاتا کرتی ہیں۔

(۶) زینوا مجالس نسائکم بالمغزل — اپنی عورتوں کی مجلسوں کو چرخہ سے آراستہ کرو۔

(۷) حدثنا زیاد بن السکن قال دخلت علی ام سلمه وبیدها مغزل تغزل به فقلت کلما اتیتک وجدتک فی یدک مغزلاً فقالت انه یطرد الشیطان ویذهب حدیث النفس وانه بلغنی ان رسول الله صلعم قال اعظمکن اجراً اطولکن طاقة۔ — زیاد بن سکن سے روایت ہے کہ میں اُم المومنین ام سلمہؓ کے پاس حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ چرخہ کات رہی ہیں۔ میں نے کہا، کہ میں جب آتا ہوں، آپ کے ہاتھ میں چرخہ ہی دیکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شیطان کو بھگاتا ہے اور وسوسہ نفسانی کو مٹاتا ہے۔ اور مجھے یہ خبر پہونچی ہے، کہ رسول خدا صلعم کا ارشاد تھا، کہ تم میں سب سے زیادہ اجر اُس عورت کو ملیگا جسکی سوت کی پٹری سب سے زیادہ بڑی ہوگی۔

(۸) علموهن المغزل وسورة النور — عورتوں کو چرخہ اور سورۂ نور کی تعلیم دو۔

(۹) عن زیاد بن عبد الله القرشی قال دخلت علی هند بنت المهلب ابن ابی صفرة وهی امرأة الحجاج بن یوسف فرأیت فی یدها مغزلاً فقلت أتغزلین وانت امرأة امیر قالت سمعت ابی یقول قال رسول الله صلعم اطولکن طاقة اعظمکن اجراً وهو یطرد الشیطان ویذهب حدیث النفس۔ — زیاد بن عبد اللہ قرشی کہتے ہیں کہ میں ہند بنت مہلب بن ابی صفرہ کے پاس گیا جو حجاج بن یوسف کی بیگم تھیں۔ اور انکے ہاتھ میں میں نے چرخہ پایا۔ پس میں نے کہا کہ آپ امیر وقت کی بیوی ہوکر چرخہ کاتتی ہیں؟ وہ بولیں کہ میں نے اپنے والد کی زبان سے رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد سنا ہے، کہ جس عورت کے سُوت کی پٹری سب سے بڑی ہوگی، وہی اجر بھی سب سے زیادہ پائے گی۔ اور چرخہ شیطان کو بھگاتا ہے، اور وسوسۂ نفس کو مٹاتا ہے۔

امام جلال الدین سیوطی نے چرخہ کے فضائل میں ایک مختصر رسالہ الاجر الجزل فی الغزل کے نام سے

مرتب کیا ہے، جس میں اسکے متعلق آثار و اخبار کو مع اسناد جمع کر دیا ہے۔ اقتباسات بالا اسی رسالہ سے ماخوذ و منقول ہیں۔

بعض نادہند قرضدار

علیگڈھ کالج میں مدت سے ایک انجمن القرض قائم ہے، جو نادار طلبہ کو اس شرط پر وظائف دیتی رہتی ہے، کہ وہ لوگ جب کمانے کے قابل ہو جائیں گے، تو کل رقم بہ اقساط اس انجمن کو واپس کر دیں گے تاکہ وہ دوسرے طلبہ کے کام میں آئے۔ علیگڈھ کے بہت سے سابق طلبہ جو اِسوقت ملک میں مختلف حیثیا سے ممتاز ہیں، انکی تکمیل تعلیم اسی ذریعہ سے ہوئی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کسقدر افسوس ہوتا ہے، کہ ان میں سے متعدد تعلیمیافتہ حضرات ایسے ہیں، جو بڑی بڑی معقول آمدنی رکھتے ہیں، اور متعدد تقاضوں کے باوجود آج تک اس قرض کی ادائی پر ذرا بھی متوجہ و ملتفت نہیں ہوے ہیں، مجبوراً انجمن مذکور کو انکے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا فیصلہ کرنا پڑا ہے۔

علیگڈھ سے ہم کو جو اصولی اختلافات ہیں، اُن کا اظہار ان اوراق میں برابر ہوتا رہتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس غیر شریفانہ طریقے سے اُسے جو نقصان عظیم پہونچایا جا رہا ہے، اس سے کسی کو ذرہ برابر ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ان نادہند قرضداروں کے قلوب گویا تعلیم اسلام و جذبات شرافت سے بالکل خالی ہیں، اسکے خلاف جو سخت سے سخت کارروائی بھی عمل میں لائی جائے اُسکی تائید ہر معقول انسان کریگا۔

چلپی صاحب کی تحریر میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، مگر "حق کی ناکامی" کے ذکر میں اُنکی تمثیل و تشبیہ تشنہ رہ جائیگی، اگر پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر سی آر داس کے اسمائے گرامی کے ساتھ جناب حکیم اجمل خاں صاحب بالقابہ کا نام نامی ملا کر تثلیث مکمل نہ کر دی جائے۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد نہ صرف اہل ہند کو بلکہ خود مہاتما جی کو بھی اُمید اور یقین تھا کہ کانگریس کے تعمیری نظام کو مقبول بنانے اور اہل ملک کی اس بارہ میں پوری پوری رہنمائی کرنے میں حکیم صاحب مہاتما جی کی جانشینی کا حق ادا فرمائیں گے۔ مگر ملک کی بدقسمتی اور رفقائی قتدار کی خوش قسمتی نے ہمارے مسیحا کو خود کونسلوں کا بیمار بنا دیا۔ اور یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ آج تحریک ترک موالات کے نیم جاں ہو جانے سے قومی امیدوں کا لہلہاتا باغ مرجھا گیا ہے اور ہندو مسلم تنازعات کی گرم بازاری نے تمام ہوا خواہان ملک کو افسردہ و پریشان اور متحدہ قومیت کے نظام کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

ایڈیٹر

پیام امن

تقریظ، تالیف، تصنیف، قریب قریب مساوی درجے کے مشکل فن ہیں۔ مؤلف اور مصنف کو اگر اپنے پریشاں خیالات کی جمع و ترتیب میں دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے، تو ریویو نگار کو بھی کچھ کم عرق ریزی کرنا نہیں پڑتی، بلکہ ایک حیثیت سے آخرالذکر کا کام زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ مصنف کا کام جمع و ترتیبِ خیالات ہے، ریویو نگار یہ مجتمع اجنبی خیالات منتشر کر دیتا ہے، اپنے پراگندہ خیالات ان میں مزج کرتا ہے، پھر دونوں کے مقابلہ و موازنہ کے بعد اُنھیں ذہن میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ مشکل موضوعِ بحث جس طرح کتاب کے مصنف اور مؤلف کے لیے موجبِ ابتلاء ہوتا ہے، اُسی طرح ریویو نگار کے لیے بھی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آج "پیامِ امن" کے ریویو نگار کو بھی یہی دشوار گزار مرحلہ درپیش ہے، جسے اُس کا مصنف اور تبصرہ نگار تو کامیابی سے طے کر گیا ہے مگر ریویو نگار کو تمام دشواریاں ابھی طے کرنا باقی ہیں۔

"پیامِ امن" ایک چھوٹی سی کتاب بلکہ رسالہ ہے جو کل ۱۸۱ صفحے میں ختم ہو گیا ہے۔ ۸ صفحے میں مشہور شاعر ڈاکٹر رابندرو ناتھ ٹیگور کا مقدمہ ہے۔ ۵، صفحے اصل کتاب کے ہیں اور ۹۴ صفحے میں فاضل مترجم مولوی عبدالماجد صاحب بی، اے کا تبصرہ اور ضمیمے ہیں۔ اتنی چھوٹی کتاب کی تقریظ کچھ مشکل نہ تھی، لیکن جس دقیق اور نازک موضوع پر اس میں بحث کی گئی ہے اُس نے ریویو نگار کے لیے سخت مشکلات پیدا کر دی ہیں۔

"پیامِ امن" کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے "امن" ہے، جو فی نفسہ اپنے اندر ذرا بھی نزاکت یا پیچیدگی نہیں رکھتا۔ ہر شخص جانتا اور تسلیم کرتا ہے کہ امن نہایت ضروری اور پسندیدہ چیز ہے اور جنگ و خوں ریزی حد درجہ ناروا اور قبیح ہے، سب کو پُرامن رہنا چاہیے، لڑنا جھگڑنا خلافِ انسانیت ہے۔ بلاشبہ اپنے اجمال میں یہ موضوع بالکل صاف، سادہ، اور آسان ہی نہیں بلکہ محتاجِ بحث بھی نہیں ہے۔ لیکن تفصیل شروع ہوتے ہی پیچیدگیوں کا ایک سلسلہ شروع

ہو جاتا ہے، اور بحث کا جو قدم آگے بڑھتا ہے، راہ میں نئی نئی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے انسان درماندہ اور مایوس ہو کر کہنے لگتا ہے اس مسئلہ کا کوئی حل ممکن نہیں۔

"امن" ضروری ہے، لیکن اگر کوئی مجھے بلا وجہ مارنے لگے، میری روزی چھیننے لگے، میری عزت کے درپے ہو جائے، تو؟ کیا اُس وقت بھی مجھے پُر امن رہنا چاہیے؟ اچھا تو نتیجہ کیا ہوگا؟ شریروں کی عید ہو جائے گی، ہر طرف سے پُر امن لوگوں پر ٹوٹ پڑیں گے، جان و مال لیں گے، آبرو پر دست درازی کریں گے۔ دیکھو کیسی پیچیدہ حالت ہے! اس صورت میں قانون امن کا کیا فیصلہ ہوگا: اگر پُر امن رہتے ہیں؛ برباد ہوتے ہیں، مقابلہ کرتے ہیں؛ امن کا دامن ہاتھ سے جاتا ہے؟!

کہا جا سکتا ہے اس صورت میں بھی امن شکنی نہ کرو، شریر کا خود مقابلہ نہ کرو، حکومت تمہاری حمایت کریگی۔ لیکن یہ صورت تو امن کی نہ ہوئی، ہم شریروں سے لرزاں، شریر حکومت سے خائف، فیصلہ وہی طاقت کے ہاتھ رہا۔ فرق یہ ہوا کہ طاقت خود ہم نے استعمال نہ کی، شریر نے کی، شریر نے نہ کی؛ حکومت نے کی، ایک طاقت کے زور نے دوسری طاقت کے زور کو اُبھرنے سے روک دیا، گویا التوائے جنگ ہو گیا یا ایک جبری عارضی صلح ہو گئی، اندر جنگ کی چنگاریاں موجود ہیں، صرف سطح سرد ہو گئی۔ مگر امن کا جو مفہوم ہر شخص کے ذہن میں ہے، اس مخفی حالت جنگ سے کس قدر مختلف ہے!

یہ تو انفرادی حالات ہیں، لیکن جب سوالات کا رخ جماعت و قوم کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تو اُلجھنیں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ کوئی قوم کسی قوم کے حقوق پامال نہ کرے، جنگ نہ کرے، مسلّم ہے۔ لیکن اگر کوئی کسی پر زیادتی کر بیٹھے، کیا بیگناہ قوم کو خاموش رہنا چاہیے اور ظالموں کو موقعہ دے دینا چاہیے کہ بے کھٹکے اپنا ظلم توڑیں؟ پھر اسکے بعد؟ بربادی، غلامی، شرمناک زندگی! مثلاً ہندوستان کو لے لو، انگلستان نے اس ملک پر ظالمانہ قبضہ کر لیا ہے، اب ہم کیا کریں؟ پُر امن رہیں تو موجودہ غلامی کیونکر دُور ہوگی؟

معنویات میں آؤ، ایک مذہب ہے جسے ہم حق سمجھتے ہیں، اور لوگ اُس کی مخالفت و استیصال پر کمربستہ ہیں، یا اسکی منادی سے روکتے ہیں۔ اب ہم کیا کریں؟ حمایت حق میں تلوار اُٹھائیں یا

پُرامن رہ کر دنیا کو باطل و ضلالت ہی میں پڑا رہنے دیں؟

اخلاق میں آؤ، ایک شخص بھڑکتا ہوا شعلہ ہاتھ میں لیے جا رہا ہے کہ اُس گھر کو آگ لگا دے جس میں سو یتیم پرورش پا رہے ہیں۔ اب ہمارا اخلاقی فرض کیا ہے؟ ان سو یتیموں کی جان بچانے کے لیے اس ایک پاگل کی جان لے لینا یا دامن امن تھامے اس کے وحشیانہ فعل کی تکمیل میں اپنی خاموشی سے معین ہونا؟

غرضکہ بے شمار مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن میں عقل حیران رہ جاتی ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ قانون امن کی عالمگیری و ہمہ گیری عملاً کیونکر تسلیم کریں اور کس طرح گوناگوں جزئیات پر اُسے منطبق کریں؟ اسی کا نتیجہ تھا کہ انسانی عقول اس سب سے ضروری اور صاف مسئلہ میں بھی متفق نہ ہو سکیں اور مختلف سمتوں میں چلی گئیں۔ ایک گروہ نے تو گویا قانون امن کے ماننے ہی سے انکار کر دیا اور عام اجازت دیدی کہ شر کا مقابلہ شر سے کرو، تلوار کا جواب تلوار سے دو: "دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ"! یہ افراد کے لیے، قوموں کے حق میں اس نے اور بھی زیادہ وسعت اختیار کی بلکہ قانون امن کے کلیۃً شکست کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اُس نے کہا "غیر قوموں پر حملہ میں پیش قدمی کرو، مخالفوں کو انتہائی بیرحمی سے قتل کرنے میں ثواب سمجھو"۔ توراۃ کی یہی تعلیم ہے، اور دنیا کے تمام خونریز فاتح کم و بیش اسی اصول کے پیرو تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بنی اسرائیل ایک محدود اور مذہبی دائرہ کے اندر یہ سب کرتے تھے اور سفاک فاتح بے قید تھے اور ہوس ملک گیری سے خوں ریزی کرتے تھے۔ دوسرے گروہ نے افراد کے لیے تو اکثر حالتوں میں ہر طرح پُرامن رہنا مستحسن قرار دیا ہے، لیکن قوم و جماعت کے لیے حالت تعدی میں شر کا مقابلہ شر سے کرنے کو ضروری بتایا اور بقدر ضرورت خوں ریزی کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن ایک تیسرا فریق بھی ہے جو کہتا ہے "خوں ریزی ہر حال اور ہر شکل میں حرام ہے، بد اخلاقی ہے، خلاف انسانیت ہے؛ افراد کے لیے بھی اور قوموں کے لیے بھی"۔ ہر گروہ کے دلائل ہیں، جو مذکورۂ بالا مشکلات اور خاص خاص نفسی نظریات پر مبنی ہیں۔

اس اجمالی بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ "پیام امن" کا موضوع باوجود صاف ہونے کے کس قدر دقیق اور نازک ہے، حتیٰ کہ خود آسمانی مذاہب بھی اس کی گتھیاں سلجھانے

میں باہم سخت متخالف ہیں۔ پس اس پر تقریظ لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ان بے شمار خیالات اور متعدد مذاہب پر تنقیدی نظر ڈالی جائے، پھر دکھایا جائے کہ مصنف نے جو مسلک اختیار کیا ہے کس نوعیت کا ہے، صحیح ہے یا غلط؟ ظاہر ہے اس طویل و عریض بحث کے لیے نہ "الناظر" کے محدود صفحات کافی ہیں، نہ مخاطبین اُسکے سننے کے لیے طیار رہیں اور نہ خود ریویو نگار کو اتنی مہلت ہے، تاہم ایک سرسری نظر ضروری ہے۔

اس بحث میں جتنی گتھیاں ہیں اُنکے سلجھانے کی کوئی صورت نہیں جب تک اُس بُنیادی گتھی کو نہ سُلجھا لیا جائے جو تہ میں پڑی ہوئی ہے۔ اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ شر کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے۔ بلکہ اصلی سوال خود فطرت انسانی کے متعلق ہے۔ فطرتِ انسانی اصل میں ہے کیا؟ خیر ہے یا شر؟ صرف اس ایک سوال کے حل ہو جانے سے تمام گتھیاں سُلجھ سکتی ہیں اور بحث کا کامیاب خاتمہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس طرف گئے کہ فطرتِ انسانی اصل میں شر ہے، یا شر کی آمیزش رکھتی ہے، اُنھوں نے حکم لگا دیا کہ جب شر انسان کی جبلت میں ہے یا جبلتاً اُس میں موجود ہے تو ضرور ہے کہ وہ شر اور بدی کا اظہار کرتا رہے۔ اس فیصلہ کے بعد البتہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ پھر اس بدی کے مقابلہ میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے یہ گروہ صرف یہی جواب دے سکتا تھا کہ شر کا مقابلہ شر ہے، بدی کا توڑ بدی سے، جان کے بدلے جان، تلوار کا جواب تلوار، کیونکہ صرف یہی طریقہ شر اور بدی کے روکنے کا ہے اور صرف اسی ذریعے سے دوسروں کی جانیں بچ سکتی ہیں۔

یہ طریقہ تو اُن لوگوں کا ہے جو فطرت انسانی کو شر یا مجموعۂ خیر و شر قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو فطرتِ انسانی کی طرف سے مایوس نہیں ہے۔ وہ فطرت کو خیر اور عمل انسانی میں شر کو محض عارضی بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے شر کا مقابلہ شر سے نہ کرو، کیونکہ اس سے شر دُور نہیں ہوتا اور زیادہ بڑھتا ہے، پھر ایسا کرنے سے خود تمھارے اندر بھی شر کی نشو و نما ہوتی ہے، اور بعینہ اُسی جرم کے تم خود بھی مرتکب ہو جاتے ہو جسے بُرا سمجھ کر دور کرنا چاہتے ہو۔ شر کا مقابلہ خیر سے کرو، کیونکہ انسان کی فطرت خیر ہے۔ خیر ہی کا اُس پر اثر پڑتا ہے اور خیر ہی کے ذریعہ شر کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ اس گروہ کا چونکہ یہ مسلک تھا، اس لیے اس نے ہر حال میں اور ہر صورت میں پُر امن رہنے کی دعوت دی اور کہا تم صرف اسی طرح شریر کے شر کو نہ صرف اپنے سے بلکہ خود اُسکے دل سے بھی دور کر سکتے ہو۔

"پیام امن" کا مسلک اسی آخری گروہ کا مسلک ہے۔ وہ فطرت انسانی کو خیر قرار دیتی ہے، شر کے مقابلہ میں شر کو جائز نہیں رکھتی اور بلا استثنا ہر قسم کی جنگ و خون ریزی کو حرام قرار دیتی ہے۔ "پیام امن" درحقیقت خود ایک اعلان جنگ ہے جنگ کے خلاف اور اُس نے اپنے صفحات کے اندر جنگ کے مقابلے میں ایک ایسا میدان کارزار ترتیب دیا ہے جسکے مشاہدے سے نہ آنکھیں سیر ہوتی ہیں نہ دل گھبراتا ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمانوں کے اوپر کوئی فرشتہ ہے جو اپنی دلکش روحانی آواز میں ہمیں مخاطب کرتا اور "قتل نہ کرنا" کے الٰہی اصول کی طرف مادی انسان کو ایسی دل آویزی کے ساتھ بُلا رہا ہے کہ مسحور ہو کر اُسکی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ اس "پیام" کا پیامبر اور اس دعوت کا داعی ایک فرنچ نوجوان "پال ریچرڈ" ہے جس میں "رچرڈ شیر دل" کی سی شیر دلی پوری طرح نمایاں ہے، مگر امن کے مقابلہ میں نہیں، بلکہ جنگ کے مقابلہ میں۔ یہ فرنچ نوجوان نپولین بونا پارٹ کی سی لیلاریں تو کرتا ہے، مگر اٹلی اور مصر کے میدانوں میں خون بہانے کے لیے نہیں، بلکہ لندن، پیرس اور روم کے خونی ایوانہائے حکومت سے ہمیشہ کے واسطے ہتھیار رکھا لینے کے لیے۔ یہ صدا اگرچہ نئی صدا نہیں ہے کہ امن کے متلاشی انسان کو اجنبی یا عجیب معلوم ہو، بلکہ بعینہٖ وہی صدا ہے جو ہر زمانہ میں اللہ والے محبان انسانیت بلند کرتے رہے ہیں، اور روس کے مشہور ربانی حکیم کونٹ ٹالسٹائے کا زمانہ تو ابھی کل کی بات ہے اور اُسکی صدائیں اب تک کانوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اِس فرنچ کی صدا جتنی موثر اور دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی ہے، اُتنی شاید کبھی سننے میں نہیں آئی۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سے پہلے کسی داعیِ امن نے ایسی مہیب خوں ریزی اور خونریزی کے ایسے مہیب اور عالمگیر نتائج نہ دیکھے تھے جیسے اِس فرنچ فلسفی نے دیکھے اور جن سے متاثر ہو کر اُس نے یہ صدا بلند کی جو قلب کے ساتھ دماغ کو بھی مسخر کیے لیتی ہے۔

"پیام امن" میں جہاں اور بہت سی خصوصیات ہیں، اُس کی ایک یہ خصوصیت بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کا مقدمہ نگار اور تبصرہ نگار، دونوں باوجود اصل موضوع یعنی ضرورتِ امن کے قائل ہونے کے، مصنف سے اصولی اختلاف رکھتے ہیں؛ اور وہ وہی اختلاف ہے جو فطرتِ انسانی کے خیر یا شر ہونے کے بارے میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کی شخصیت

بڑی ہے ، اور اُن پر کوئی سخت تنقید شاید طبائع پر گراں گذرے ، لیکن ریویو نگار کی محدود واقفیت کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی فلسفیانہ تحریریں کامیاب نہیں ہوتیں - وہ مطالب کو اس طرح اُلجھا دیتے ہیں کہ اُنکی شخصیت سے غیر مرعوب آدمی کو شبہہ ہونے لگتا ہے کہ وہ خود اپنی تحریریں سمجھتے ہیں یا نہیں ؟ پیام امن پر جو مقدمہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اُسکی بھی یہی حالت ہے ، بے ربط باتیں جمع کر دی ہیں ، جن میں بعض غیر مفہوم اور بعض غیر مسلّم اور قابل اعتراض ہیں - تاہم ہمارے موضوع کے لیے اس میں کافی اشارے موجود ہیں جو ڈاکٹر صاحب کا مسلک صاف ظاہر کر رہے ہیں - کہ وہ فطرت انسانی اور خیر محض کے وجود و قیام سے قطعاً مایوس اور اس بارے میں مصنف سے کلّی اختلاف رکھتے ہیں - چنانچہ لکھتے ہیں :

"ہمیں اعتراف ہے کہ سرشت انسانی میں ذمائم ودیعت کیے گئے ہیں ، اور باوجود قوانین اخلاق پر اعتماد اور ضبط نفس کی تعلیم کے یہی افراد بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے رہیں گے ، انھیں جس قدر کامیابی ہوتی جاتی ہے اُسی قدر ہمت عصیاں بھی بڑھتی جاتی ہے .... بدی کا خاتمہ پوری طرح کبھی بھی نہ ہوسکے گا - جس طرح شعلہ روشن رہتا ہے اسی طرح یہ ایک مسلسل کیفیت ہمارے تمدن میں قائم رہے گی - مقصدِ آفرینش اس سے زائد اور کچھ نہیں کہ لا زوال مرتبۂ مسعودیت اور اُسکے حصول کی عملی ناکامی کے درمیان جو تناقض ہے اُسکو رفع کیا جاتا ہے "

فاضل تبصرہ نگار کو اس غلط نظریہ میں ، جو باری تعالیٰ کے کمال میں شبہہ پر مبنی ہے ، ڈاکٹر کا اتنا تو غلو نہیں لیکن اصرار ضرور ہے - فرماتے ہیں :

"کامل نیکی کا بلا شائبۂ بدی دنیا میں وجود ہر شخص محال تسلیم کرے گا تاہم ہر شارع مذہب اور ہر حکیم اخلاق دنیا کو اسی کی دعوت دیتا ہے "

لیکن "پیام امن" کا مصنف اس بارے میں بالکل مطمئن ہے ، وہ فطرت انسانی کے خیر محض ہونے کا قائل ہے اور اسی لیے جنگ و خونریزی کے قطعی انسداد اور کامل امن و امان کے دائمی قیام کی دعوت دیتا ہے - وہ اس حقیقت میں شک کرنے والوں کو یوں مخاطب کرتا ہے :

"انسانیت ایک زندہ وجود ہے ، وہ نابینا ہیں جو اسے محض ایک لفظ سمجھتے ہیں - افراد و اقوام کی طرح وہ ایک حقیقی وجود رکھتی ہے اور اپنے وجود کا احساس رکھتی ہے - خواہ اقوام و افراد

اس کے وجود سے بیخبر ہوں۔ سب کی اصلی ماں وہی ہے جو اپنے بطن سے سب کو پیدا کرتی ہے
.... اس کا قلب زندہ ہے، مگر اسوقت افراد کے قلوب میں سو رہا ہے، اس لیے کہ ابھی
ان میں عام محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا ہے ..... وقت آ گیا ہے کہ اس زندہ جسم کا
ایک غور کرنے والا دماغ بھی پیدا کیا جائے ..... اسوقت جبکہ انسانیت میں تنظیم پیدا ہو
چکے گی، جبکہ انسانیت خود اپنی قسمت کی مالک ہو چکی ہوگی .... اُسوقت وہ "انسانِ
جدید" کو پیدا کریگی، جسکی آمد کا فطرت کو انتظار ہے، اُسوقت موجودہ بیدار مان خوابوں
کی تعبیر نکلے گی"

پھر دوسری جگہ بے اختیار ہوکر فطرت انسانی کو پکار اُٹھتا ہے :-

"او سلے روح ربانی! تو اس وقت افراد و اقوام سب کے نفوس میں حالت خواب میں ہے،
تیری بیداری کا وقت آگیا، اب بیدار ہو! بیدار ہو!"

ایک اور جگہ اِس حقیقتِ منتظرہ کو کہ خیر محض و امنِ کامل ایک دن ضرور قائم ہو جائے گا، اس
طرح ظاہر کرتا ہے :

"وہ مقصد جسے بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے مذاہب زمانۂ ماضی میں پورا نہ کرسکے، جسکے
انجام دینے میں زمانۂ حال کا تمدن ناکام رہا، مگر جسکی طیاریاں تمام گذشتہ صدیاں کرتی
آئی ہیں وہ ایک شے اور صرف ایک شے سے ابھی انجام کو پہونچ سکتا ہے۔ وہ شے کیا ہے؟
انسان میں انسانیت کا احساس، جزو کو کُل کا شعور؛ اُس وقت انسان کے قلب سے
امن عالم کی پیدائش ہوگی!"

ایک اور جگہ کہتا ہے :

"وہ دن آنے والا ہے جب ان چیزوں کا خاتمہ ہوگا، اس لیے کہ "ہلاک نہ کرنا" کی صدا
اب کسی غیر کی، کسی باہر والے کی صدا نہیں رہی ہے، یہ صدا خلقت کے قلب سے بلند ہو رہی
ہے، انسانیت کا یہ پیغام اب نفوس میں زندہ ہو رہا ہے، اور دنیا کو ایک نئی ہدایت کر رہا ہے،
اسکی تعلیم ایک بلند تر فرض، فریضۂ انسانیت کی تعلیم ہے"

متشککین کا قیام امن اور خیر محض کے وجود کے برخلاف سب سے بڑا استدلال یہ ہے

کہ باوجود اتنی کثیر اور طویل کوششوں کے اب تک وہ ممکن نہ ہوا، دنیا میں ہمیشہ ایسے انبیا و مصلحین پیدا ہوتے رہے جنھوں نے امن اور نیکی کے لیے دعوتیں دیں مگر کسی نے بھی اُنکی نہ سُنی۔ وہ کہتے ہیں اس امر واقع سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جنگ اور بدی کا جذبہ انسان میں فطرتاً موجود ہے اور کسی طرح بھی کلیۃً زائل نہیں ہو سکتا۔

ہمیں اُنکے استدلال کے دونوں حصوں پر اعتراض ہے۔ اول تو اس صورت واقعہ سے اُن کا استدلال صحیح نہیں۔ جس چیز کو وہ "فطرت" کہتے ہیں، حقیقت میں "عادت" ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے، فطرت بدلتی نہیں، عادت بدل جاتی ہے۔ خوں ریزی اور بدی کی عادت سے فطرتِ انسانی پر حکم لگانا خلاف انصاف ہے، کیونکہ ایک سے زیادہ ایسی انسانی عادات کا ہمیں علم ہے جو فطرت معلوم ہوتی تھیں مگر امتداد زمانہ سے بدل گئیں۔ ایک زمانہ تھا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا، اور اس ذوق وشوق سے کھاتا تھا کہ آدم خوری انسانی فطرت معلوم ہوتی تھی، اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ فعل خلافِ فطرت ہے؟ صدیوں پر صدیاں گذر گئیں یہاں تک کہ اب ایک زمانہ آیا جب یہ عادت متمدن انسان سے کلیۃً زائل ہو گئی اور اب اسکا تصور بھی ہمارے لیے خلافِ فطرت ہو گیا۔ اسی طرح جنگ و خوں ریزی، بدی اور شرارت کی عادت کو قدامت کی بنا پر فطرت قرار دینا سخت غلطی ہے۔ اگر یہ فطرت ہوتی تو خدا اپنے انبیاؑ و مرسلین کے ذریعے اسکے خلاف کبھی بھی تعلیم نہ بھیجتا۔ مذہبی روایات کہتی ہیں کہ انسان میں خوں ریزی کی بنا اُس دن پڑی جب آدم کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی پر اُسکی قربانی مقبول ہو جانے کی وجہ سے حسد کیا اور جوش انتقام میں اُسے قتل کر ڈالا۔ متشککین کہتے ہیں کہ اگر خوں ریزی کا جذبہ انسانی فطرت میں نہ ہوتا تو بغیر کسی کی ترغیب وتعلیم کے یہ اولین قاتل کیونکر مرتکب قتل ہوتا؟ ہمارے خیال میں اُن کا یہ استدلال بھی غلط ہے، یہ اولین قتل اور ہر قتل ایک فوری اور عارضی جوش کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے بعد ہی مجرم، شرم وندامت میں ڈوب جاتا ہے۔ آدم کے بیٹے کا ارتکابِ قتل اُسکی فطرت کا عمل نہ تھا، ہاں وہ شرم وندامت جو اس فعل کے بعد اُس میں پیدا ہوئی، اُس نفرت کا مظہر تھی جو باری تعالیٰ نے فطرت انسانی میں خوں ریزی کے خلاف ودیعت کر دی ہے۔ اس بحث میں اتنی دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کے خود ہی فیصلہ

کر سکتا ہے۔ قتل و خونریزی، بلکہ شر اور بدی کے جتنے واقعات بھی ہوتے ہیں، ہر مرتکب محسوس کرتا ہے کہ اُسکے عارضی ہیجان طبع کا نتیجہ تھے، پھر اُس انفعال و تاثر کو بھلا کون بیان کر سکتا ہے جو ہر بدی کے بعد انسان اپنے قلب میں محسوس کرتا ہے۔ ضمیر کی خاموش لعنتوں کا پتھراؤ اُسے پاش پاش کر ڈالتا ہے، نظریں زمین میں گڑ جاتی ہیں اور اسکی زبان حال اعلان کرنے لگتی ہے کہ "میں مجرم ہوں!" یہ تأثر ہے انسانی فطرت، نہ وہ عارضی ہیجان طبع جو خارجی اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔

پھر یہ کہنا کہ امن اور نیکی کی دعوتیں اب تک کامیاب نہیں ہوئیں، شدید کو رَبصری ہے۔ اول تو تین چار ہزار سال کی معلوم تاریخ کو انسانیت کی عمر کے مقابلہ میں زیادہ یا کافی مدت بتانا نادانی ہے، انسانیت کی عمر کے آگے یہ مدت تین چار دن سے زیادہ نہیں۔ پھر یہ دعویٰ کہ ان دعوتوں کو کامیابی نہیں ہوئی، بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ کیونکہ اُن کے ایک حصہ کو ہم عملاً کامیاب دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر کسی دعوت کی کامیابی ہی اُسکے حق ہونے کی دلیل ہے تو اس دعوت کے اس حصے کی کامیابی، جو ایک عظیم الشان کامیابی ہے، بلا تردد اُسکے حق ہونے پر بطور دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔

ہزاروں برس انسان نے اس حالت میں گذارے ہیں کہ آدمی آدمی کا دشمن تھا، خونخواری پر فخر کرتا تھا، قتل کو ہنر سمجھتا تھا، بات بات پر تلوار کو حکم بناتا تھا اور کمزور کی جان و مال زبردست کے لیے مباح تصور کرتا تھا۔ مگر امن و نیکی کی ان دعوتوں کا یہ اثر ہوا کہ بتدریج اِن وحشیانہ خیالات و عادات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اب وہ زمانہ آگیا کہ بلا استثنا تمام متمدن انسانوں نے اپنی انفرادی زندگی میں امن و نیکی کی تعلیمات کو عقلاً پوری طرح تسلیم کرلیا اور عملاً بھی بڑی حد تک تسلیم کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کامیابی عظیم الشان سے عظیم الشان کامیابی ہے جو تین چار ہزار سال کی قلیل مدت میں کوئی دعوت حاصل کر سکتی تھی۔ بلا شبہہ ہمیں تسلیم ہے کہ قوموں نے اپنی اجتماعی زندگی میں اب تک یہ تعلیمات عملاً قبول نہیں کی ہیں، لیکن حالات کی رفتار بتا رہی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب قومیں بھی انکے سامنے سر جھکا دیں۔ کوئی اجتماعی انقلاب بغیر تمام انسانوں میں ذہنی و اجتماعی انقلاب اچانک واقع نہیں ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں

انتظار نہ سے گھبرانا نہیں چاہیے، انقلاب افراد سے شروع ہوتا ہے اور قوموں سے گذر کر پوری نوع انسانی کو گھیر لیتا ہے۔ ہمارا یہ انقلاب بھی افراد سے گذر کے اب قوموں کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے، جسکے بعد پوری نوعِ انسانی کی باری بھی آجائیگی۔

"پیام امن" کا مصنف بھی اُنھیں لوگوں میں ہے جو اِس دعوت حق کی جلد یا بدیر کامیابی پر پختہ ایمان رکھتے ہیں، وہ اسے فطرت کی دعوت بتاتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ باوجود بیشمار موانع کے، رفتار زمانہ بلکہ خود انسان کی بدی اور شرارت اس دعوت کو آگے بڑھا رہی ہے اور قوموں کو بڑی سختی کے ساتھ اسکی طرف ڈھکیلے لیے جا رہی ہے۔ مصنف کہتا ہے:

"اقوام کی ا۔ری تاریخ اپنی منزل کی جانب لیے جا رہی ہے۔ وہاں تک پہونچنے کے لیے بیشک بہت زیادہ سعی و کوشش کی ضرورت ہے، لیکن جنگ و صلح کی کشمکش سے نکل کر قومیں اس منزل کے قریب آتی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو گلے لگاتی جاتی ہیں، وسعت ارض اُنکے لیے تنگ ہوتی جاتی ہے اور دنیا میں یکسانیت پیدا ہوتی جاتی ہے، انکے فضائل و رذائل دونوں سب میں مشترک ہوگئے ہیں ... علم و فن، حکمت و ادب، کسی قوم کی مخصوص ملکیت نہیں، ان سب کے عقائد، تمدن، خاندان وغیرہ صدیوں کی جنگ و صلح کے بعد آپس میں مخلوط و مدغم ہوگئے ہیں۔ اسی طرح انکے رذائل نے بھی ان میں اتحاد ہی پیدا کیا ہے۔ ہر میدان جنگ میں خواہ فاتح خواہ مفتوح کی حیثیت سے اُنھوں نے اپنی لاشیں ایک ہی جگہ چھوڑی ہیں، اور ایک ناخوشگوار مواخاۃ کی عمارت اُنھوں نے اپنے خون سے تعمیر کی ہے۔ نفرت، محبت ہی کی شکل معکوس کا نام ہے اور محبت ہی کا پہلا اور دُھندلا پیام ہے ... نفرت بھی بالآخر منزلِ اتحاد ہی کی طرف لے جاتی ہے، گو اسکے راستے تاریک و پُرپیچ ہوتے ہیں۔ ایک روز وہ دن آکر منرور رہتا ہے جب انسان خود اُس شے سے نفرت کرنے لگتا ہے جس نے اُسے ایک دوسرے سے نفرت کرنا سکھایا تھا۔"

آگے بڑھ کر لکھتا ہے:

"مستقبل کی قوت اُن سے فعلاً یہی کام لیتی ہے جنھیں اس کی خدمتگذاری سے انکار ہوتا ہے، البتہ چونکہ وہ ان سے اپنا کام لے چکتی ہے، اُنھیں ختم بھی کر دیتی ہے، ماضی کی ٹھٹھی ٹرح

پُرہیبت و جلال سلطنتوں سے اُسنے اُنکی نادانستگی میں یہی کام لیا اور کام لے چکنے کے بعد اُنھیں برباد کر دیا، یہی حشر موجودہ سلطنتوں کا بھی ہوتا ہے، اپنے جبر و ستم اپنی ناانصافیوں کے ذریعہ سے یہ قومیں اپنے مقصد و ارادہ کے خلاف مستقبل کا بھی مقصد پورا کرتی رہتی ہیں کہ نوعِ انسانی میں باہم اتحاد قائم ہو مستقبل کی قوت اُنکے ذریعے سے یہ کام نکال کر اب خود اُن پر اپنا عمل کر رہی ہے، یعنی ان قوموں کے جو جو حالات اس مقصدِ اتحاد کی راہ میں حائل ہونگے اُنھیں وہ فنا کریگی..."

اور یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر مصنف گذشتہ عالمگیر جنگ اور موجودہ التوائے جنگ (کیونکہ حقیقتاً التوائے جنگ ہی ہے) کو بھی حصول امن کا ایک طبعی راستہ بتاتا ہے:

"یہ جنگ نہ صرف طبعی اسباب کی بنا پر ناگزیر تھی بلکہ اخلاقی قوانین کے لحاظ سے بھی اسکا وقوع لازمی تھا، کہنا چاہیے کہ مشیت غیبی کا منشا بغیر اسکے پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا،..... اس جہنم کا ایک بار برپا ہونا لازمی تھا کہ جو قومیں اسکی آفرینش کا باعث ہوئی ہیں اُنھیں تزکیہ حاصل ہو۔ اس غدر و شورش کا وقوع لازمی تھا کہ جدید عمارت کے لیے سطح ہموار ہو اور ایک جدید زمین و جدید آسمان کی تخلیق ہو'.... اس جنگ سے جو کچھ بھی فتوحات و کامیابیاں کسی فریق کو حاصل ہونگی وہ وہ نہیں ہونگی جو اُسکی آرزوؤں کے مطابق ہونگی بلکہ وہ ہونگی جو اُن قوموں کی مجموعی بربادی کے باعث دنیا کے لیے پُرمنفعت ثابت ہوں گی'..... یہ جنگ جس طرح سب کے معاصی کا نتیجہ ہے اُسی طرح سب کی اصلاح و ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ متحاربین مشیت غیبی کے سامنے بے بس تھے جس کا منشا ان سب کو سزا دینا تھا"

مصنف کا جنگ اور بدی کو امن اور نیکی کا ایک قدرتی راستہ بتانا تعجب انگیز نہیں کیونکہ وہ اس رائے کے ماننے والوں میں ہے کہ نور اور خیر کا پورا پورا ظہور و غلبہ اُسی وقت ہوتا ہے جب ظلمت اور شر کا عروج کامل ہو جاتا ہے اور یہ کہ شر اپنی فطرت میں خود اپنے آپ سے جنگ کرنے کا مادہ رکھتا ہے، جب جب اُس کا ٹھہراؤ اور جماؤ پورا ہو جاتا ہے اور سامنے تصادم کے لیے کچھ اور باقی نہیں رہتا، تو خود اُسکے عناصر باہم ٹکرانے لگتے ہیں؛ یہاں تک کہ پاش پاش ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی خیر کا ظہور ہوتا ہے کیونکہ شر کی بربادی ہی کا دوسرا نام خیر ہے چنانچہ گذشتہ جنگ کے متعلق کہتا ہے:

"یہ جنگ درحقیقت غیر مرئیات کی جنگ ہے، یہ وہ جنگ ہے جو نظامِ قدیم خود اپنے اوپر کر رہا ہے اور خوں ریزی و غداری کی طاقتوں کو ایک دوسرے سے اُلجھا کر ان سب کو فنا کر رہا ہے۔"

معترضین، جنگ و خوں ریزی کے وجود سے فطرتِ انسانی پر حکم لگاتے ہیں، مگر کبھی نہیں سوچتے کہ جنگ و خوں ریزی بند کیونکر ہو، جبکہ پوری سوسائٹی باوجود نفرت کے اُسکے سانپ کو دودھ پلا پلا کے پالنے اور مختلف طریقوں سے موٹا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ جنگ و خوں ریزی کیونکر موقوف ہو جبکہ پیدایش سے موت تک ہمیں برابر اسکی تعلیم دی جاتی ہے۔ گھروں میں بزرگوں کی سفاکی کی روایات بچوں کو بطور کارناموں کے سنائی جاتی ہیں، مدرسوں میں سفاکوں کی داستانیں پڑھائی جاتی ہیں، کتبِ تاریخ میں خوں ریزوں کو نوعِ انسانی کا ہیرو بتایا جاتا ہے، شہروں میں مجسمے کھڑے کرکے اُنکی تقلید کی دعوت دی جاتی ہے'.... علما کا گروہ قتل و سفاکی کو جائز و خوشنما بنانے کے لیے طرح طرح کے اصول و نظریے قائم کرتا اور عقلی و نقلی دلائل سے اُنھیں حق ثابت کرتا ہے ... ظاہر ہے اس حالت میں اُس کا جاری رہنا کچھ بھی تعجب انگیز نہیں، البتہ بند ہو جانا ضرور تعجب انگیز تھا۔

کہا جائے گا اگر خوں ریزی کا جذبہ فطری نہ ہوتا تو اُسکی بقا کے لیے انسان یہ سب نہ کرتا، انسان کا بغیر کسی مجبوری کے ایسا کرنا اس جذبے کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن یہ دلیل جسقدر مغالطہ ہے محتاجِ بیان نہیں۔ بعینہٖ یہی دلیل ہر بداخلاقی کے فطری ہونے پر پیش کی جا سکتی ہے، چوری، ڈکیتی، جھوٹ، زنا، غرضکہ جملہ معائب سے انسان ہر زمانہ میں آلودہ رہا ہے اور اب تک آلودہ ہے، لیکن اُسکی یہ آلودگی کسی طرح بھی ان بداخلاقیوں کے فطری ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اگر جنگ و خوں ریزی کا جذبہ فطری ہے، اگر "تنازع للبقاء" کا وحشیانہ اصول حق ہے، تو پھر آسمانی اور دنیاوی قوانین قاتلوں اور قزاقوں کو لائقِ تعزیر کیوں قرار دیتے ہیں؟ پیامِ امن کا مصنف اس صورتِ حال کو دکھاتے ہوئے کہتا ہے:

"خود ہی تو ایک جنگلی درندے کو آزاد چھوڑ دیتے ہو اور پھر اُس سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ انسانیت کے حدود میں رہے گا!"

جنگ و خوں ریزی کا اب تک موجود رہنا حامیانِ جنگ سے زیادہ حامیانِ امن کے لیے حجت ہے۔ دونوں میں تنازع کیا ہے؟ اصلی نزاع اس میں نہیں ہے کہ جنگ موقوف ہو یا جاری رہے۔ اس

خواہش میں تو دونوں یکساں طور پر شریک ہیں کہ جنگ موقوف ہونا چاہیے، اصلی نزاع اس خواہش کے بعد شروع ہوتی ہے،" حامیان جنگ" کہتے ہیں چونکہ اتنی بیشمار کوششوں پر بھی جنگ نہ رُکی، اس لیے وہ فطری ہے اور باوجود ہماری نفرت کے برابر یوں ہی جاری رہیگی۔ حامیان امن اسکے برخلاف کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں چونکہ تم نے اب تک جنگ کو جنگ سے اور شر کو شر سے روکنے کی کوشش کی اس لیے جنگ نہ رُکی بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ شر کبھی بھی شر کے ذریعہ دور نہیں ہو سکتا، فطرت انسانی خیر ہے، اس لیے نیکی اور نرمی ہی موثر ہو سکتی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ تشدد اور سختی نے آج تک کچھ بھی فائدہ نہیں پہونچایا۔ مصنف کہتا ہے:

"بڑی بڑی سلطنتوں نے ہمت کی کہ دنیا میں امن قائم کر دیا جائے، بڑے بڑے فاتحوں نے منصوبہ باندھا کہ اپنے زور و قوت سے دنیا میں امن قائم کر کے رہیں گے، لیکن ان ہمتوں کو زرہ آہنی کے بار نے توڑ توڑ دیا اور یہ خواب ہمیشہ کے لیے جھوٹے ہی نکلے، اس لیے کہ امن کا جنگ سے اور نرمی کا سختی سے پیدا ہونا محال ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ جنگ سے صلح پیدا ہو سکے"۔

طاقت اور تشدد کو یہ ناکامی کیوں ہوئی؟ وجہ بالکل ظاہر ہے اور اوپر بیان کی جا چکی، یعنے چونکہ فطرتِ انسانی خیر ہے، اس لیے خیر ہی اس پر موثر ہو سکتی ہے، شر ہمیشہ شر کو بڑھاتا ہے، ایک آگ دوسری آگ کو کبھی نہیں بجھاتی، اور زیادہ بھڑکا دیتی ہے۔ مصنف کہتا ہے:

ہر جبر ایک دوسرے جبر کی تخلیق کرتا ہے، جس طرح ایک لکۂ ابر کو دوسرے لکۂ ابر کی طرف کشش ہوتی ہے، اسی طرح ہر قوت دوسری قوت کا باعث ہوتی رہتی ہے...."

پھر زمانۂ حال کے حوادث بطور مثال کے پیش کر کے بتاتا ہے کہ ایک خونریزی کیونکر دوسری خوں ریزی کا باعث ہوئی ہے:

"مثال کے طور پر ۱۹۱۰ء کے معرکۂ مراکو کو لیجیے۔ کیا جنگ طرابلس اس کا لازمی نتیجہ نہ تھی؟ پھر کیا جنگ طرابلس ہی ٹرکی کو کمزور کر کے جنگ بلقان کا پیش خیمہ نہیں ثابت ہوئی؟ اور پھر کیا جنگِ بلقان ہی روس و آسٹریا کے درمیان رقابت پیدا کر کے جنگِ جہاں سوز کا باعث نہیں ہوئی؟"

حضرت عیسیٰؑ کا ارشاد کیا ہی خوب ہے "جو تلوار اُٹھاتے ہیں تلوار ہی سے کاٹے جائیں گے" (اوکما قال)

پھر قیامِ امن کا کون ذریعہ ہے؟ اگر طاقت ناکام رہی تو وہ کون چیز ہے جو اُسے قائم کر سکتی ہے؟ جواب بالکل صاف ہے:

"امن کا ذریعہ صرف امن ہے، جنگ کے خونیں میدانوں میں امن کی تلاش، شب دیجور میں آفتاب کی تلاش ہے۔ امن کی جستجو کے لیے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں، وہ تمھارے بالکل قریب ہے، تمھارے پہلو میں موجود ہے، وہ خود تمھارا قلب ہے جسکے اندر امن کا گنجینہ مدفون ہے، اُسے نکالو، اور وہ نکل آئے گا: امن کا مولد و منبع قلب انسانی ہے.... انسان کا قلب ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے سیلاب خون نکل کر تمام کرۂ ارض پر جوش زن ہوتا ہے۔ اسی سرچشمے کو خشک کر دینے سے دنیا سے جنگ کا وجود رخصت ہو سکتا ہے، تاوقتیکہ انسان کے باطن میں، انسان کے نفس میں اصلاح نہ ہوگی، تمام خارجی تدابیر، تمام بیرونی کوششیں لاحاصل رہیں گی اور امن و صلح کے ظاہر قالب کے اندر جنگ و بدامنی کی روح حرکت کرتی رہیگی"

باطن کی اصلاح کے کیا معنی؟

"ہر قوم کی روح کی قلب ماہیت اور سب کے قلوب میں ایک جدید نظام کائنات کا احساس پیدا ہونا لازمی ہے"

اس "احساس" سے کیا مقصود ہے؟

انسان میں انسانیت کا احساس، جزو کو کُل کا احساس! اُس وقت انسان کے قلب سے امن عالم کی پیدائش ہوگی"

ابھی سوسائٹی کے دل و دماغ میں کیا خرابیاں ہیں جن کے دور کرنے کی ضرورت ہے؟ وہ کون سی بیماریاں ہیں جو انسان کو خون پلاتی ہیں؟ چند بنیادی خرابیاں ہیں جن میں ہمارا حکیم سب سے زیادہ خطرناک "انانیت" کو قرار دیتا ہے:

"انانیت ہی وہ مخفی محرک ہے جو سب کو ایک دوسرے سے لڑاتی رہتی ہے، خودغرضی کا آخری نتیجہ ہمیشہ ہیلے نہ جنگ و جدل ہوتا ہے، امن و صلح کی لاکھ کوشش کی جائے لیکن خودغرضی کبھی بغیر مقاتلہ و خوں ریزی تک پہونچائے رہ نہیں سکتی"

لیکن ایک عجیب و غریب نسخۂ شفا جس تک مؤلف کے پاک ذہن کو رسائی ہوئی اور جس پر حقیقتاً دُنیا

کی نجات موقوف ہے اور جو ہر شخص کی سمجھ اور استعمال میں بلا کسی غلطی کے آسکتا ہے، یہ ہے کہ افراد و اقوام کے لیے ضابطۂ قانون ایک ہونا چاہیے۔ یہی وہ بڑی غلطی ہے جو اب تک سوسائٹی میں موجود ہے۔ ابھی حالت کیا ہے؟ افراد و اقوام دو جداگانہ اخلاقی ضابطوں پر عمل پیرا ہیں، بہت سی باتیں جو افراد کے حق میں جرم، معصیت اور بد اخلاقی سمجھی جاتی ہیں، اقوام کے لیے مباح ہیں۔ جھوٹ، ڈکیتی، غصب، مکاری .... افراد کے لیے شرمناک اور موجب عقاب ہیں، لیکن قومیں علی الاعلان انکی مرتکب ہو رہی ہیں اور کوئی ملامت نہیں کرتا۔ دنیا کی تمام گذشتہ و موجودہ مصائب کی علت العلل یہی خرابی ہے کہ افراد و اقوام کا ضابطۂ اخلاق جداگانہ ہے۔ اگر ایک طاقتور فرد کے لیے ناجائز ہے کہ "تنازع للبقا" کے اصول پر عمل کر کے کمزور فرد کا مال چھین لے تو زبردست قوم کے حق میں یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ کمزور کے ملک و دولت پر قبضہ کر لے؟ اگر فرد کو قانون اجازت نہیں دیتا کہ اپنے حقوق طاقت کے زور سے حاصل کرے تو جماعت اور قوم کو ایسا کرنے کا کیوں اختیار دیا جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا یہ اصول تسلیم کر لے تو اپنے تمام مصائب و آلام سے آج ہی نجات پا جائے۔ مصنف نے اس مسئلے پر خوب بحث کی ہے جو قابل دید ہے۔ کہتا ہے:-

"افراد اور اقوام کے لیے قانون اخلاق ایک ہی ہے، ہر قوم کو اپنے تئیں اسی نظام اخلاق کا پابند رکھنا چاہیے جس کی پابندی کی توقع وہ افراد سے رکھتی ہے، جو شے فرد کے جرم کا حکم رکھتی ہے، وہ ملک و قوم کے لیے بھی جرم قرار پانا چاہیے۔ خود غرضی، حرص و طمع، غصب اموال، تشدد، اور قتل اگر افراد کے لیے شدید ترین معاصی ہیں تو جماعت و قوم کے لیے بھی ان افعال کو مساوی درجے کے معاصی قرار دینا چاہیے، آخر قومی شرافت کا معیار، شخصی شرافت سے مختلف کیوں ہو؟ اگر کوئی قوم قتل و غارت، بد عہدی و تشدد سے علانیہ اپنی بے عزتی و پستی کا ثبوت دے چکتی ہے تو کیا اسلحہ کی مدد سے وہ عزت و بلندی قائم رکھ سکتی ہے؟ ... فرد کے لیے اخلاق نے قانون یہ مقرر کیا تھا کہ اسے وہ عمل کرتے رہنا چاہیے جس کی نظیر کو سب قبول کر سکیں، یہی ضابطۂ اخلاق قوم کے لیے بھی ہونا چاہیے، گویا قوم کو ایسے ہی اعمال کرتے رہنا چاہیے جو افراد کے لیے قابل تقلید ہوں۔ اگر اس اصول کی صحت سے انکار ہے تو کس حق سے ہر قوم اپنے ہاں کے مجرموں کو قابل تعزیر قرار دیتی ہے، اور سرے سے کسی کو مجرم قرار دینے کا اسے کیا حق ہے؟

کیونکہ یہ تمام نہاد "جرائم" تو وہی ہوتے ہیں جن کا ارتکاب قوم علانیہ کرتی رہتی ہے! ..... دنیا میں اسکی کوئی بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ کوئی باشندۂ ملک اپنے ملک سے زیادہ دیانتدار ہو! پھر آخر یہ کیا ہے کہ افراد اُن جرائم کی سزا بخوشی قبول کرلیتے ہیں جن کا ارتکاب اُنکا ملک و وطن علانیہ و فخریہ کرتا رہتا ہے! ...... جو تعلق فرد کو خاندان سے ہوتا ہے، خاندان کو شہر سے، شہر کو صوبہ سے اور صوبہ کو ملک سے، وہی تعلق اب ملک کو مجموعۂ ممالک (دنیا) سے ہونا چاہیے، ملک کو صرف اپنی ہی زندگی کی نہیں بلکہ اس سے زائد کی بھی پروا ہونا چاہیے۔ افراد و اقوام دونوں کے لیے یہی اخلاق کا صحیح قانون ہے اور یہی فلاح و نجات کا سیدھا راستہ ہے۔"

اس پُرپیچ بحث کے بعد ہی ایک اور پُرپیچ بحث سامنے آجاتی ہے۔ اگر جنگ و خوں ریزی غصب و تعدی حرام ہیں، اگر تمام افراد و اقوام کو پُرامن اور مِل جُل کر رہنا چاہیے، تو یہ بھی صاف ہوجانا چاہیے کہ افراد و اقوام کے حقوق کیا ہیں کہ جن کا لحاظ و احترام سب پر فرض ہے؟

افسوس اسوقت ہم اس بحث کو پھیلا نہیں سکتے۔ مختصر یہ کہ جب افراد و اقوام کے لیے ضابطۂ اخلاق ایک ہے تو دونوں کے حقوق بھی ایک ہونے چاہییں۔ انقلابِ فرانس نے افراد کے حقوق منضبط کرکے قائم کیے، جن میں دو حق بنیادی اور اٹل ہیں: "حریت اور مساوات" ہر فرد اپنے دائرے میں آزاد ہے اور ہر فرد اپنے بنی نوع کے ساتھ زندگی اور قانون کے اندر مساوی درجہ رکھتا ہے۔ کم سے کم قوموں کو بھی اتنا حق ضرور ملنا چاہیے، ہر قوم آزاد رہے اور ہر قوم جب تک قوانینِ اخلاق پر قائم ہے دوسری قوم کے مساوی اور ہم رتبہ ہو۔ اگر انسانی سوسائٹی اس اصول کو تسلیم کرلے تو آج ہی امن و امان قائم ہوا جاتا ہے۔ مصنف نے اس پر بہت زور دیا ہے اور نہایت مؤثر پیرائے میں بحث کی ہے جو اصل کتاب ہی میں قابلِ دید ہے۔

یہ جو کچھ لکھا گیا "پیامِ امن" کی حیثیت سے بہت کم ہے، ایسی کتابیں نہ صرف اُردو بلکہ فرنچ اور انگریزی جیسی مالا مال زبانوں کے لیے بھی قابلِ صد ناز ہیں، مولوی عبدالماجد صاحب نے اسے اُردو کا جامہ پہنا کر ملک کی ایک بہت بڑی علمی، اخلاقی اور ادبی خدمت کی ہے۔ ضرورت تھی کہ اصل کتاب کے بعد فاضل مترجم کے تبصرے پر بھی (جو بجائے خود ایک تصنیف ہے) ایک نظر ڈالیجاتی، مگر اب اس صحبت میں اسکی گنجایش نہیں، اگر کبھی مہلت ملی تو اس ٹکڑے پر بھی گفتگو کی جائیگی، تاہم اتنا ظاہر کردینا ضروری ہے کہ ریویونگار کو تبصرہ نگار سے بڑی حد تک اتفاق ہے۔ **عبدالرزاق۔ ملیح آبادی**

پارسی مذہب

دنیا کے قدیم مذاہب میں ایک پارسی مذہب بھی ہے۔ حکیم زردشت اس مذہب کے داعی اور پیغمبر تھے۔ زردشت کا زمانہ مسیح سے گیارہ سو چہتر برس قبل خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ایران میں بت پرستی کا رواج تھا۔ معبدوں میں ستاروں کی ہیکل بنا کر انھیں پوجا جاتا تھا۔ زردشت ان میں پہلے شخص تھے جنھوں نے اہل فارس کو وحدانیت کا سبق دیا۔ انکی آسمانی کتاب کا نام اَوِستا ہے۔ ایک اور کتاب ژند بھی انکی طرف منسوب کیجاتی ہے۔ اور اسے بھی آسمانی سمجھا جاتا ہے، لیکن وہ دراصل اَوِستا کی شرح و تفسیر ہے۔ اسکو پارسی مذہب کی کتاب الاحادیث سمجھنا چاہیے۔ موبدوں نے اسکی بہت سی شرحیں بھی لکھیں، اور بعد میں شرحوں کی بھی شرحیں لکھی گئیں۔ لیکن سنہ ۳۳۴ ق م میں جب سکندر نے ایران پر قبضہ کیا تو یہ سارا دفتر برباد کر دیا۔ اَوِستا، ژند اور اسکی شرحیں پاژند کے کچھ نسخے بچ بچا گئے۔ اور جب عہد عباسی میں ایرانی علوم و معارف کا ترجمہ شروع ہوا تو یہ چیزیں بھی ترجمہ کی گئیں۔ مسعودی اور اصفہانی نے اپنی آنکھوں سے انکے عربی ترجمے دیکھے ہیں۔ مسعودی کا بیان ہے کہ سیستان میں ایک شخص کو پورا سلسلہ حرف بحرف یاد تھا۔ اصفہانی اپنی کتاب تاریخ سنی الملوک میں جگہ جگہ اَوِستا کے عربی ترجموں کے حوالے دیتا ہے۔

سکندر نے زردشتیوں کی مذہبی کتابیں ہی نہیں برباد کیں، بلکہ خود انھیں بھی بری طرح پامال کیا، انکے علما کو پھانسیاں دیں، موبدوں کو قتل کیا، اور انکے معبدوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ آتشکدہ ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن خدا کی وحدانیت کی آگ جو دلوں میں روشن ہو چکی تھی وہ کسی طرح نہ بجھ سکی۔ لوگ گھر سے بے گھر ہوگئے، مصیبتوں کے پہاڑ سروں پر ٹوٹ پڑے، لیکن مذہب کی خاطر سب تکلیفیں برداشت کیں، اور اپنی طیاریوں میں لگے رہے۔ آخر سنہ ۲۵۲ ق م میں آذر نے حملہ کیا، اور یونانیوں کو شکست دے کر اپنے ملک پر دوبارہ قبضہ کیا۔ بگڑے ہوئے گھروں کو سنوارا، ٹوٹے ہوئے معبدوں کی تعمیر کی، آتشکدوں کو روشن کیا، اور علمائے مذہب کو جمع کرکے

مذہبی تنظیم کی۔ یہ مذہب اس بارے میں نہایت خوش قسمت تھا کہ اسے ابتدا سے ملک و سلطنت کی حمایت و پیروی حاصل رہی، مرقیون، مزدک، اور مانی نبوت کے بڑے بڑے دعوے لیکر اُٹھے، لیکن قبول عام نے کسی کو زندگی نہ بخشی، سب وقتی زندگی پاکر رخصت ہوگئے، اور زرتشتی سکہ ہمیشہ چلتا رہا۔

سنہ ۶۴۱ء میں ایران کی زمام حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں آئی تو ایران پر اسی مذہب کی حکومت تھی۔ گو مسلمان فاتحوں نے اُنکے مذہب کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو عام فاتح مفتوحوں کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن حکومت کے مٹنے سے اُن کا سارا شیرازہ بکھر گیا۔ فاتح لاکھ مساوات برتیں، مگر وہ جو اپنی حکومت کی ایک شان و شوکت ہوتی ہے پرائی حکومت میں میسر نہیں آسکتی۔ بہت سے پارسی ہندوستان کی طرف نکل آئے اور بہت سے دوسرے ممالک میں جا بسے۔ جو تھوڑے بہت وہاں رہے وہ رفتہ رفتہ اسلام میں جذب ہوگئے، لیکن جو نکلے تھے وہ بھی غیر مذاہب کے اثر سے متاثر ہوے بغیر نہ رہے، بمبئی کا صوبہ ایران سے نکلنے کی تاریخ سے اب تک ان کا مرکز ہے۔ یہاں کے باشندوں سے اس طرح گھل مل گئے، کہ اب پارسی فارس کے زردشتی نہیں، ہندوستان کے زردشتی ہیں۔

ہندوستان میں جب اسلامی حکومت نے قدم جمائے تو یہ لوگ پھر ڈرے، مگر مسلمان نہایت استمالت سے پیش آئے، تیموری خاندان کے مشہور فرزند اکبر نے تو انکے موبدوں کو دربار میں بھی دعوت دی، معبدوں کے لیے روزینے مقرر کیے، اور اُنکی مذہبی کتابیں جمع کیں، اور اہل حکومت ہر خاص و عام سے بہ تواضع پیش آنے لگے۔ آذر کیوان جو اُس زمانہ میں زردشتی مذہب کا بڑا عالم اور سب سے بڑا موبد تھا، مسلمان علما و فضلا اُس سے ملتے تھے، وہ علوم عربی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اور ہر قسم کے مسائل پر خوب بحثیں کرتا تھا۔ ایک مولوی صاحب نے کہا "آپ لوگ جانوروں کو مارنا حرام کیوں سمجھتے ہیں؟" بولا "آپ لوگ کعبے کا احرام باندھ کر جانوروں کو نہیں مارتے، ہم کعبۂ دل کا احرام باندھتے ہیں اس لیے جانوروں کو نہیں مارتے"۔ آذر ایسا زاہد، متورع اور صاحبدل تھا کہ بڑے بڑے صوفی اُس سے ملتے اور اُسکی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اُس نے اپنی کتاب جو بھیجی تھی اُسکی نسبت مآثر الامرا میں لکھا ہے:

"نامہ از مولفات خود کہ مشعر ستایش کواکب و مجردات متضمن نصائح و علم بود فرستاد"

دبستان مذاہب میں اور موبدوں کے حالات بھی لکھے ہیں، از انجملہ ایک موبد سروش کا ذکر ہے، جو زردشت کی نسل سے تھا، عربی، فارسی، ہندی، اور ژند و پاژند میں کامل مہارت رکھتا تھا، اُس نے کئی کتابیں لکھیں، ایک کتاب صرف توحید پر ہے، جس میں ۲۶۰ دلیلوں سے خدا کے وجود کو ثابت کرکے اُسکی وحدانیت پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔

بیچ کا زمانہ ذرا سخت گذرا۔ مذہبی احساس بہت کچھ مردہ ہو گیا تھا، رسم و رواج میں میں بالکل ہندیا گئے تھے، احکام و عبادات کے اصولی مسائل میں ایسا خلط ملط ہو گیا تھا کہ اصول نے فروع کی اور فروع نے اصول کی جگہ لے لی تھی۔ اوستا پڑھنے اور سمجھنے والے صرف چند ہی لوگ تھے۔ باقی سب طوطے کی طرح پڑھ جاتے اور مطلب ذرا نہ سمجھتے تھے۔

انگریزی حکومت قائم ہوئی تو اس نے اُنھیں اپنے اندر جذب کرنا شروع کیا، خیالی حیثیت سے بہت کچھ عیسائی اثر میں آگئے، انگریزی مدرسوں میں پڑھتے، اور انگریزی تمدن و معاشرت اختیار کرتے چلے گئے۔ اس سے اُن میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی، تجارت اور سیاست میں اپنے زور دکھانے لگے، لیکن اب تک مذہبی رنگ ہلکا تھا، اور اس طرف اُنھیں کچھ زیادہ توجہ بھی نہ تھی، مگر مسیحی پادریوں نے یہ بات بھی پیدا کر دی، جو لڑکے مشنری اسکولوں میں پڑھتے اُنھیں وہ اپنے مذہب کی تعلیم کرتے، اور آہستہ آہستہ زردشتیت سے برگشتہ کرتے جاتے۔ اس سے دو لڑکے عیسائی ہو گئے۔ اس واقعہ سے تمام قوم میں اک ہیجان پیدا ہو گیا، اُنھوں نے اپنی مذہبی تحقیقات کی۔ مقدس کتابوں کے انگریزی میں ترجمے کیے، علما اور پیشوایان دین کی سوانح عمریاں مرتب کیں، اور اپنے دینی و دنیوی معاملات کی تنظیم کرکے، اپنے تئیں دنیا کی مہذب اقوام کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنا لیا۔ ہندوستان کے باشندوں میں اسوقت بھی سب سے زیادہ تیز رفتار اور متمدن ہیں۔

اس مختصر سی تاریخ کے بعد، اجمالاً اُنکے اعتقادات بھی سُن لینے چاہیئے۔ زردشت کی تعلیمات کا اصل الاصول خدائے واحد کی پرستش ہے، وہ خدا جو زمین و آسمان، شمس و قمر، آب و آتش کا ضامن ہے، جس نے دنیا کو پیدا کیا، اور جس کے ہاتھ میں سارے جہان کی موت

زیست، رنج و خوشی ہے۔ وہی قابل عبادت ہے، التجا کرنے والوں کو اُسی سے التجا کرنی چاہیے۔ اُسکے سوا نہ کوئی انسان کا مددگار ہے، نہ کسی سے اُسکو فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

شرک کے متعلق اس مذہب کا بھی وہی فتویٰ ہے جو اسلام کا ہے۔ وہ کہتا ہے جو کسی اور خدا کو مانتا ہے وہ مشرک ہے، اسے ایک خدا کو ماننا چاہیے، اور اپنے گناہوں پر توبہ کرنی چاہیے، ورنہ اُسے بہت سخت عذاب دیا جائیگا، اُس پر ہمیشہ دوزخ کا عذاب ہوتا رہے گا۔

خدا کی جسمیت کے متعلق بھی اس کی تعلیم اسلام سے ملتی جلتی ہے۔ وہ اُس کی شکل وصورت، رنگ روپ کا منکر ہے۔ کوئی ایک جگہ بھی متعین نہیں کرتا اور ہر جگہ اُسے موجود بتاتا ہے۔ وہ ہمارے وہم وخیال سے بلند و برتر، اور ہماری تخیلی صورت آرائیوں سے پاک و منزہ ہے۔ وہ یکتا ہے کوئی دوسرا اس کا شریک و نظیر نہیں، ایسا پُرشوکت ہے کہ ہم اُسکی شوکتوں کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ایسا قوی ہے کہ اُسکی قوتوں کا احاطہ کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ اُسکا حال بیان کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ ہمیں بغیر سوچے سمجھے، اور بغیر اُسکی کُنہ پر غور کیے اُسکی عبادت کرنی چاہیے۔

آوستا میں خدا کے ایک ہزار نام لکھے ہیں، لیکن ایک سو ایک عام طور پر مروج ہیں۔ یہ سب ایسے نام ہیں جن سے اُسکی صفات اور قدرتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً یزداں، داور، ہرمزد، پروردگار، عادل، رزاق،

پارسیوں کے متعلق جو یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ یہ آگ کی عبادت کرتے ہیں، غلط ہے۔ در اصل سورج، چاند، آگ، پانی، اور ستارے بمنزلہ قبلہ کے ہیں، یہ اُنھیں محترم خیال کرتے ہیں ژند وپاژند میں صاف لکھا ہے کہ خدا نے آگ اور پانی، چاند اور سورج میں اپنا جلوہ دکھایا ہے، ان چیزوں سے اُس کی شان و شوکت نمایاں ہوتی ہے، انکی طرف رخ کرکے ہمیں اُس پاک و برتر کی عبادت کرنی چاہیے۔

پارسی عقائد و عبادات کے نمایاں احکام یہ ہیں: خدائے واحد پر ایمان لاؤ، زردشت کو اس کا برگزیدہ پیغمبر، اور اُسکے نوشتوں کو آسمانی سمجھو۔ مذہبی احکام کی تمام وکمال پابندی کرو، دن میں پانچ وقت خدا کی عبادت کرو، عبادت کے وقت رخ کسی روشن چیز کی طرف

ہو۔ برائیوں سے بچو، نیک بننے کی کوشش کرو، موت کو برحق جانو۔ قیامت اور روز حشر اٹل ہیں، مرنے کے چوتھے روز حساب کتاب ہوگا۔

اس وجہ سے کوئی گناہ نہ کرو کہ زردشت تمہاری شفاعت کریں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار و جواب دہ ہوگا۔ جو جیسا بیج بوئے گا ویسا ہی پھل پائے گا۔ نیکی کرو گے جنت ملیگی، بدی کروگے دوزخ میں جاؤگے۔ لیکن اگر اچانک کوئی گناہ ہو جائے تو خدا خود اُسے معاف کر دے گا۔ وہ ظالم نہیں ہے۔ ظالم تم خود ہو۔

صدق، انکسار، تواضع، حیا، مروت، شیریں کلامی، عصمت و عفت، ہر شخص کے ساتھ نیکی کرنا، دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، بھیک نہ مانگنا، حاجت مندوں کی مدد کرنا نیکی ہے۔ یہ سب کام خدا کی عبادت میں داخل ہیں۔

عداوت، دشمنی، وہم پرستی، ضدی پن، بے حیائی، ظلم و زیادتی، حرص و طمع، کاہلی، بھکاری پن، میلا کچیلا رہنا، محنت سے جی چرانا، دوسروں کی کمائی پر نظر رکھنا، اپنے سے بہتر کو دیکھ کر حسد کرنے لگنا، مقدرت سے بڑھ کر چلنا، اپنے ہم مذہبوں کو حقیقی دوست اور عزیز نہ سمجھنا، لہو و لعب اور مکر و فریب میں مبتلا رہنا، بنی نوع کے ساتھ نیک سلوک نہ کرنا، یہ سب ایسے گناہ ہیں جیسے چوری اور زنا۔ کوئی شخص اگر پانچوں وقت عبادت کرتا ہو اور ان میں سے کسی ایک گناہ کا مرتکب ہوتا ہو، تو اُسے اپنی نجات کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ خدا ایسے لوگوں سے بہت سخت ناراض ہوتا ہے جو اُسکے حکموں پر پوری پوری طرح نہیں چلتے، اور اپنے ظاہر کو عوام فریب بنا کر، باطن کو غلیظ و کثیف رکھتے ہیں۔ عبادت کا پہلا مقصد دل کی پاکی ہے۔ دل پاک نہ ہو تو عبادت مقبول نہیں ہوگی، خواہ ایسی عبادت میں کتنی ہی مشقت کیوں نہ کی گئی ہو۔

قسمت کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ ایک مقررہ چیز ہے۔ اس میں نہ اسباب کو دخل ہے نہ تدبیر کو۔ خدا جسکو چاہتا ہے نوازتا ہے، جسکو چاہتا ہے رد کر دیتا ہے۔ اسکے لیے نہ کسی قابلیت کی ضرورت ہے نہ استحقاق کی۔ وہ بالکل خود مختار ہے، اُسکے انتظام میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اُسکی طرف سے جو کچھ ہو جائے اُسی پر خوش رہے۔

کسی بات کو بُرا نہ سمجھے، کیونکہ اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اُسی کی طرف سے ہوتا ہے، بُرا سمجھنے کے یہ معنی ہونگے کہ انسان بندہ ہو کر خدا کے ملکوں کو غلط اور بُرا سمجھتا ہے۔ اعلیٰ ترین بندگی کا اولین اقتضا یہ ہے کہ انسان راضی برضائے الٰہی رہے۔ مقدس زرتشت کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ: وہ مالک ہے، سب کا مختار ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جو چاہے گا کرے گا۔ ہمیں اُسکے معاملوں میں دم مارنے کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بغیر اُسکی مرضی کے ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ سارا عالم اُسکے منشا وارادہ پر چلتا ہے۔ اس لیے اچھائی یا بُرائی جو کچھ ہو، ہمیں ہر حال میں صابر وشاکر اور خوش وخرم رہنا چاہیے۔

ناظر۔ دہلوی

غزل

(دبطر: قدیم)

طاقت گھٹتی جاتی ہے اور درد دل بڑھتا جاتا ہے
پہلے غش پر غش آتا تھا، اب مشکل سے ہوش آتا ہے
میں آگ میں اپنی جلتا ہوں، میں آپ ہی اپنا شیدا ہوں
پروانے اپنے ہوش میں رہ، کیا مجھ کو عشق سکھاتا ہے
ٹھنڈی سانسیں بھرتے بھرتے، دل کی یہ حالت ہے، جیسے
غنچہ کوئی کھلتے کھلتے، ڈالی میں مرجھا جاتا ہے
کیا صرف آہوے وحشی ہی، مانوس ہیں مجھ دیوانے سے؟
میرے صحرا میں اکثر مجنوں دل بہلانے آتا ہے
اک گونہ تسکیں ہوتی ہے، دل کی آشفتہ بیتابی میں
سینہ کوٹا کرتا ہوں جب سینے میں دم گھبراتا ہے

اثر

مہینوں کی فضائی آسمانی تقسیم

جنوری

چھوٹے بڑے بے شمار تارے پوری سج دھج سے بانکپن سے
سرگرم سفر ہیں آسماں میں رہرو ہیں فضائے لامکاں میں

جاڑے کی ٹھنڈی، سہانی راتیں، کیسی ستھری اور بھلی ہوتی ہیں۔ اُجلی فضا میں ایک بدلی بھی نہیں دکھائی دیتی۔ دھندلی بھاپ ہماری زمین سے نکلتی ہے۔ مگر تیز ہوا کے بیدرد جھونکے اس بیچاری دکھیاری کو پریشان کر دیتے ہیں، چٹکیوں میں اُڑا دیتے ہیں۔ ستاروں کی پاکیزہ چمک دمک، مہرعذار قطب کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے، اور چھوٹے بڑے گوناگوں تارے سمت الراس کی آفتابی چوٹی سے دامنِ افق تک بکھرے ہوئے ہیں۔ غرض جہاں تک نگاہیں جاتی ہیں، ہر کہیں تارے ہی تارے دکھائی دیتے ہیں، جن میں بعض بے انتہا چمکیلے ہیں، بعضوں میں دھندلی چمک ہے، بعض افق کی طرف جھکے ہوئے ہیں، مگر انکی بہت بڑی تعداد اپنے بلند مکانوں سے، جھانک جھانک کر، سوتی دنیا کے اچھوتے سکون کو دیکھ رہی ہے۔ تاروں بھری خاموش رات کے سناٹے میں کہیں کہیں کچھ لوگ سنسان گلیوں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، اور بے اختیار کہہ گزرتے ہیں "آج ضرور پالا پڑیگا"۔ انکے ساتھی جواب دیتے ہیں "جی ہاں ذرا دیکھیے تو ستارے کیسے چمک رہے ہیں"۔ کچھ حضرات اپنے نرم بچھونوں پر آرام سے لیٹے ہوئے نازک کھڑکیوں کے بلوری شیشوں سے روشن تاروں کی دلکش سیر دیکھ رہے ہیں، انکی غلافی آنکھیں فضائے فلکی کی وسعت و بلندی پر حیران ہیں۔ دل میں امنگیں اٹھ رہی ہیں کہ ہم ہر روشن ستارے کا نام جان لیں، انکے باہمی رشتہ ناتہ سے آگاہ ہو جائیں۔ ہم انھیں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔ آنکھیں اٹھائیے، اُتر کی طرف نگاہیں دوڑائیے۔ وہ دیکھیے سمت الراس کی چوٹی پر جدیِ اعظم چمک رہا ہے۔ یہی ایک پیارا روشن، مجمع النجوم یا اکاش دیا تارا منڈل ہے جو اپنے ایسے اور بہت سے ساتھیوں کی جان پہچان کا سبب بنجاتا ہے۔

یہ تارامنڈل بہت آسانی سے پہچان لیا جاتا ہے۔ اسکی انوکھی جھرمٹ فضائی ٹولیوں میں نمایاں شان رکھتی ہے۔ اس میں دوسرے درجے کی جسامت رکھنے والے سات مشہور تارے شامل ہیں۔ ان میں سے چار اس طرح سنوارے گئے ہیں کہ انکی مجموعی حالت ہمارے سامنے ایک بے ترتیب مربع کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اور دوسرے میں تارے اس طرح قائم ہیں کہ ان سے ایک منفرجہ مثلث بنجاتا ہے۔

اس غرض سے کہ آپ کو کافی سہولت سے ان تارامنڈلوں کا سچا حال معلوم ہو جائے جو ان مہینے میں دکھائی دیتے ہیں یا اور مہینوں میں نظر آتے ہیں آپ کے لیے لازمی ہے کہ نصف کرہ کا ایک کاتبی خاکہ اپنے سامنے رکھ لیجیے، جو کم سے کم اتنا بڑا ضرور ہو کہ اُس میں پہلے اور دوسرے درجے والے ستارے صاف صاف بکھرے ہوئے دکھائے جا سکیں۔

جدی اعظم والے ساتوں ستاروں کے جھرمٹ کا مقابلہ اپنے دوسرے تارامنڈلوں سے کیجیے جو آپ کے خاکے میں موجود ہیں۔ اور آپ کی آنکھیں "ج د" سے بہت جلد مانوس ہو جائینگی۔ اب آپ اسی جھرمٹ کے اردگرد والے تاروں کو غور سے دیکھیے۔ اور آپ انکے لیے بھی آسانی سے تگ و دو کر سکیں گے۔ ہم مشہور کی لفظ اس لیے کہتے ہیں کہ بعض نجم النجوم عام طور سے دلکش ثابت ہو چکے ہیں۔ ایک بار انگلستان کے زبردست شاعر ملٹن نے اپنی روحانی کیفیت، وجدانی حالت میں مشتری کو ایک تیز دار مگر غمگین کھلائی سے تشبیہ دیکر جدی اعظم کو یوں مخاطب کیا تھا۔

جاڑے کی آدھی رات میں۔ میرے غریب مہینے　　برج فضا میں چین سے۔ کاش دکھائی دیں مجھے
دیکھ سکوں جدی کو میں۔ آنکھوں سے اپنی بار بار　　جنمیں ہیں تین سبزہ رو۔ اور جوان تارے چار
آنکھوں کا نور ہے ہر ایک۔ دل کا سرور ہے ہر ایک
کیسے گلے لگاؤں میں۔ مجھ سے تو دور ہے ہر ایک

ہمارے سادہ دل، سادہ مزاج دیہاتی بھائیوں نے۔ اس جھرمٹ کا نام اپنی زبان میں ارہٹ رکھ دیا ہے۔ اس لیے کہ چاروں بڑے تارے گاڑی کے چار پہیے معلوم ہوتے ہیں۔ اور تینوں چھوٹے ستارے عربی ٹانگن کی طرح دکھائی دیتے ہیں ان سب کی شان اور سبھوں سے نرالی ہے۔ کوئی تارا ان کی انوکھی سج دھج کو پہونچتا ہی نہیں۔ انھیں کی مدد سے بہت سے چرواہوں نے جاڑوں کی تاروں بھری رات میں وحشی جھاڑیوں کے اندر اپنا راستہ پا لیا ہے۔ سفید و شفاف برف کی گھری ہوئی بستیں

جمی رہیں مگر وہ بیچارے صحیح سلامت اپنے اپنے جھوپڑوں تک پہونچ گئے۔

اچھا اب آپ اُن دونوں تاروں کو دیکھیے جن سے اس اربانہ کے پچھلے پیے بنے ہوئے ہیں اور اپنی نگاہ انھیں کی سیدھ میں وہاں تک لیجائیے جہاں دوسرے درجے والا ایک اکیلا تارا اپنے دیدہ زیب مسکن میں تن تنہا چمک رہا ہے۔ اسکا نام قطب تارا ہے۔ یہ کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔ آنکھیں بھر کے دیکھیے تو آپ کو فوراً اُتر کی سمت معلوم ہو جائے گی۔ یہ مشاہدہ کہنہ و فرسودہ سہی، پھر بھی اشاروں میں بتا دینا فائدے سے خالی نہیں کہ اس حالت میں فطرتی طور پر پورب داہنے ہاتھ اور پچھم آپ کے بائیں پہلو پر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم قطب تارے کو ٹھیک ٹھیک اپنے داہنے شانے پر رکھ لیں تو ہمارا منہ عظیم المرتبت خانۂ کعبہ کی سیدھ میں آجائے گا۔ اور ہم خلاق عالم کی حمد و ثنا و عبادت سچائی اور عمدگی سے ادا کرسکیں گے۔

پیارا ہے قطب تارا انوکھی شان ہے — سنجیدہ ہے ضو اسکی پاکیزہ جسامت ہے
ان سب کا ہے محور گرد اسکے جو ہیں تارے — یہ نقطۂ مرکز ہے گردش میں ہیں سیارے
سیارے بھی تعمیل میں قانون اطاعت کے — کرتے ہیں ادا خدمت ہوش اور لیاقت سے
دن رات گزرتے ہیں لیکن وہ نہیں تھکتے — ہنس ہنس کے بتاتے ہیں صاف و مجلی رستے
رُکتے ہیں یہ حیفہ میں اور ہادیٔ محور ہیں — اُجلی ہیں گذرگاہیں نقطے کی یہ رہبر ہیں
نقطہ ہے قطب تارا۔ محور ہے قطب تارا — خادم ہیں یہ سب اسکے۔ افسر ہے قطب تارا
اقلیم میں رہنے کی گر وہ نہ اجازت لے — پھر کیا ہے مجال انکی رہ جائیں یہ بیچارے
سب اسکی رعیت ہیں وہ صاحب عزت ہے — اس حلقۂ زریں میں صرف اسکی حکومت ہے

اللہ مبارک ہو یہ راج یہ تاج اُسکو
سیارے قیامت تک دیتے رہیں باج اُسکو

جدی اکبر و جدی اصغر سے زیادہ اور کسی تارا منڈل کی یادگاریں ہماری یادداشت میں نہیں ہیں۔ یہی دونوں بہادروں کے انیس ہیں، سیاحوں کے جلیس ہیں۔ بہتیرے جہازی مسافر انھیں سے آنکھیں لڑا کر آنے والی مصیبتوں سے بالکل محفوظ رہ گئے ہیں۔

اب اگر آپ جدی اکبر کے سرے سے ایک سیدھی لکیر اس طرح کھینچیے جو جنوبی نصف النہار کو کاٹتی

ہوئی گزر جائے اور نور اسی شمالی مشرقی کونے کی طرف مڑ جائے تو اُسکا دوسرا سرا ٹھیک ٹھیک ثریا والی مشہور جھرمٹ کے پاس جاکر ختم ہو جائے گا جس میں پانچ ستارے شامل ہیں۔ سب سے قریب آتش مزاج عطارد ہے، اُسکے پاؤں پر غریب زہرہ کا سر ہے۔ پہلو میں بھولی بھالی حوت دس بجے رات کو دامنِ افق میں محو تماشا ہوتی ہے۔ انقلاب پرست مریخ سب سے زیادہ بلندی پر ہے۔ پردار گھوڑے کے پائین با خوبصورت راج ہنس اُسوقت دکھائی دیتا ہے جب ہماری زمین اپنے انجرات سے خالی ہو! ایک طرف نازک اندام پروین گوہر افشاں ہے۔ دوسری طرف ملکس اور مثلث دائرہ منطقۃ البروج کی طرف جھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ مجمر النجوم کی ہنسکھ جھرمٹیں قوس، عقرب، ثور، جوزا، سرطان و اسد کے لیے گھونگھٹ ہیں۔ یہاں تک کہ معصوم سُنبلہ کے گول مول شانے اور بھرے بھرے رخسار بھی چھپے ہوئے ہیں۔

جدی اعظم اور قطب تارے کے پہلوؤں میں ترنم ریز سرود، بل کھائی ہوئی ناگن، حور منش شہزادی دلفریبیاں دکھا رہی ہیں۔ چٹاپٹی اور جھلا جھلی والی جھرمٹیں بھی پورے شباب پر ہیں۔ آس پاس مضطر صفت اور سیماب مزاج سیارے بھی موجود ہیں۔ نصف النہار کے قریب اسد صغر، اسی کے قریب ربط اور دلو کے داہنے پہلو میں شیر گاؤ جلوہ نواز ہے۔

دائرہ منطقۃ البروج کے نیچے، پورب پچھم کے درمیان ماہی شیرزا، نہنگ دریا، شاہین صغر و کبیر اور مار دہرا سر بکھرے ہوئے ہیں۔ دکھن کی جانب بحیرہ سماوی موجزن ہے اور وادی افق کے قریب نار خرد دکھائی دیتا ہے۔

آیئے دائرہ منطقۃ البروج کی سیر بھی ہو جائے۔ کُتب سیر و تواریخ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر، منجم، اور موسیقی داں حضرات مختلف سیاروں کو اب تک دلچسپی سے دیکھتے رہے ہیں جو اپنی اپنی باری سے حلقہ رقص یا دورا ہتزار کی تنظیم و تکمیل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا بلند ہونا فصل کٹ جانے کا نشان، یا بندہ وقت پرندوں کی واپسی کا پیام، اور پھولوں کے لیے نوید مسرت ہے منطقۃ البروج کا لفظ زبانِ فرانسہ سے معرب کیا گیا ہے۔ جہاں اسکے معنی درندے کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی ہیبت و جلالت کی وجہ سے کوئی دوسرا ثابت یا سیارہ سوا دلو یا جوزا کے اسکے پاس تک پہونچ نہیں سکا ہے۔ یہ دائرہ ساری فضاء فلکی میں پھیلا ہوا ہے۔ اسکے دامن میں ایک نور افشاں نمایش

امانت ہے موسوم طریق الشمس (آفتاب کی خیالی گذرگاہ) اسکو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔
جنوری کی خاص ملکیت ڈول ہے۔ اس تارے کا کام محض اتنا ہے کہ اپنے نورانی ظرف میں اہتزازی کرنوں کے جزر و مد سے فائدہ اُٹھاکر بادلوں کی سوتی بھری نہر سے آب شفاف بھرے اور اُسکو "خزینۂ نیساں" تک پہونچا دے۔

طالب

قلب سوزاں دیدۂ پُرنم نہیں تو کچھ نہیں
زندگی صرفِ بلائے غم نہیں تو کچھ نہیں

اور ہی کچھ شے ہے ظالم قدردانی کی نگاہ
تیری بزمِ ناز میں اک ہم نہیں تو کچھ نہیں

لطف ہی کیا جب دل آویزی کی صورت ہی نہیں
زلفِ جاناں میں جو پیچ و خم نہیں تو کچھ نہیں

رنج۔ غم۔ بے اختیاری۔ بیکسی۔ آشفتگی
سب اسی پر منحصر ہے دم نہیں تو کچھ نہیں

کون پوچھے گا تجھے اس عالمِ بے کیف میں
اے وفورِ بیقراری ہم نہیں تو کچھ نہیں

یوں تو ہو تجکو مبارک نغمۂ چنگ و رباب
سازِ محفل نالۂ پُرغم نہیں تو کچھ نہیں

ہر نئی حالت میں ملتا ہے نیا دل کو مزا
رنج میں احساسِ بیش و کم نہیں تو کچھ نہیں

تیری زلفوں کی پریشانی ہے جانِ صد حیات
مرگِ حسرت پر مری برہم نہیں تو کچھ نہیں

دامنِ الفت پہ دھبہ ہے خیالِ گاہ گاہ
دل میں تیری آرزو ہر دم نہیں تو کچھ نہیں

چارہ سازِ مدعا کیونکر بنے وہ تیغِ ناز
ایک دم کا ہے سہارا دم نہیں تو کچھ نہیں

ترجمانِ دردِ دل بننے کی یہ صورت نہیں
دیدۂ حیراں مرا پُرنم نہیں تو کچھ نہیں

لوگ کہتے ہیں تسلّی کو بنائے زندگی
دردِ دل کا ہے مقولہ ہم نہیں تو کچھ نہیں

کون ہوگا قدرداں بے رنگ کی تصویر کا
خونِ دل میرا شریکِ غم نہیں تو کچھ نہیں

وہ کوئی آنسو ہیں جو جذبِ تسلی ہو سکیں
دیدۂ تر چشمۂ زمزم نہیں تو کچھ نہیں

ساری دنیا ہے فقط وابستۂ تارِ نفس
دم نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو کچھ نہیں

ایسی باتوں کے تسلسل ہی میں ہے ہادیؔ مزا
شورِ نالہ ہجر میں پیہم نہیں تو کچھ نہیں

ہادی۔ مچھلی شہری

جلاوطنی

(از روسی مصنف چیکوف)

بوڑھا سیمین، عرف لال جھکڑ، اور ایک نوجوان تاتاری جس کا نام کسی کو بھی معلوم نہ تھا، دریا کے کنارے آگ کے گرد بیٹھے تھے۔ باقی تین کشتیبان جھونپڑی میں سو رہے تھے۔ سیمین کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی۔ وہ اگرچہ بدہیئت اور دبلا تھا، مگر اسکے شانے کشادہ اور چہرہ سے صحت کے آثار نمایاں تھے۔ اسوقت وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ وہ کبھی کا سو چکا ہوتا اگر اسے ڈر نہ ہوتا کہ وہ جھونپڑی میں گیا، تو کہیں اسکے ساتھی بھی اسکی شراب کی بوتل میں سے حصہ نہ طلب کریں۔ تاتاری بیمار اور تھکا ہوا تھا۔ اپنے بوسیدہ کپڑوں میں لپٹا ہوا، وہ سمبرسک کی شاندار زندگی اور اپنی بیوی کے حسن و رعنائی کی یاد تازہ کر رہا تھا۔

لال جھکڑ بولا "ظاہر ہے کہ یہ بہشت تو ہے نہیں۔ ایک نظر میں تم یہاں کے پورے گرد و پیش کا جائزہ لے سکتے ہو۔ بجز پانی، دریا کے کناروں، اور کیچڑ کے یہاں دھرا کیا ہے۔ برف پڑنے کا زمانہ مدت ہوئی ختم ہو چکا، پھر بھی دریا جما ہوا ہے، اور آج ہی صبح برف پڑی ہے"

تاتاری وحشت سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کراہ رہا تھا "آفت! آفت!"

دس قدم کے فاصلہ پر دریا، سرد و سیاہ، تیزی سے سمندر کی طرف بہتا ہوا اونچے ریتیلے کنارے سے ٹکرا رہا تھا۔ کنارے کے قریب ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ دریا کے اس پار چھوٹے چھوٹے آتشیں سانپ کبھی رینگتے، کبھی چھپتے، کبھی پھر چمکتے نظر آ رہے تھے۔ یہ پچھلے سال کی گھاس تھی جو جل رہی تھی۔ آگ کے سانپوں کے پیچھے پھر اندھیرا تھا۔

تاتاری نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ اسکے وطن میں بھی اتنے ہی تارے تھے، اسی قدر اندھیرا تھا۔ لیکن یہاں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ سمبرسک میں تارے زیادہ چمکدار تھے اور آسمان بھی یہاں سے مختلف تھا۔

وہ پھر کراہا، "آفت! آفت!"

لال جھکڑ نے ہنس کر کہا "تم رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤ گے! ابھی تم نوجوان اور کم عقل ہو۔ تمہارے

منہ سے ابھی اس کے دودھ کی بو آتی ہے۔ تمھاری بیوقوفی ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ مجھ سے زیادہ بدقسمت اور کوئی نہیں۔ ایک وقت آئیگا کہ تم کہوگے، "خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!" مجھے دیکھو، ہفتہ بھر میں دریا کھل جائے گا؛ کشتیاں چلنے لگیں گی، تم سب سائبیریا کا رستہ لوگے۔ میں یہاں اسی طرح کشتی کھیتا ہوا دہ جاؤں گا جس طرح بائیس سال سے تمنے دن کھیے رہا ہوں۔ اور یہاں پانی تلے مچھلیوں کے سوا اور زمین پہ میرے علاوہ کوئی نہ رہے گا۔ اسکے باوجود، خدا کا شکر ہے، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے"!

تاتاری نے آگ میں کچھ لکڑیاں لگائیں، اور اسکے قریب سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا "میرا باپ بیمار ہے۔ جب وہ مرجائے گا، تو میری ماں اور بیوی میرے پاس آجائیں گی۔ وہ مجھ سے وعدہ کرچکی ہیں"

لال بھیکڑ نے پوچھا "ماں اور بیوی کو تم کیا کروگے؟ ارے میاں، اس حماقت میں مبتلا نہ ہو۔ یہ وسوسے شیطان نے تمہارے دل میں ڈال دیئے ہیں۔ اسکی ایک نہ سنو۔ اگر وہ عورتوں کے بارے میں گفتگو کرے، تو کہہ دو مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر وہ آزادی کا ذکر چھیڑے تب بھی یہی جواب دو۔ تمھیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؛ نہ ماں، نہ باپ، نہ آزادی، نہ گھر نہ وطن۔ خدا ان سب کو غارت کرے!۔ تمھیں ان میں سے کسی کی بھی حاجت نہیں!" لال بھیکڑ نے اپنی بوتل میں سے ایک گھونٹ پیا اور پھر بولنا شروع کیا، "بھائی، میں معمولی زمیندار نہیں ہوں۔ میرا باپ پادری تھا، اور جب میں کرسک میں رہتا تھا، تو میں بھی نفیس کپڑے پہنتا تھا۔ مگر اب میں نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے کہ زمین پہ ننگا سو رہتا ہوں، اور ضرورت پڑے تو گھاس پر گزارہ کرنے کو تیار ہوں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، مجھے کسی کا ڈر نہیں، اور میں اپنے سے زیادہ مالدار اور آزاد دنیا میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ جوں ہی میں یہاں بھیجا گیا، میں نے پہلے دن سے ارادہ کر لیا کہ میں کسی چیز کی ضرورت نہیں محسوس کروں گا۔ شیطان نے مجھے بھی بیوی، گھر، آزادی کے نام لے لے کر ورغلانا چاہا، مگر میں برابر یہی جواب دیے گیا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اور میں اس خیال پر قائم رہا۔ نتیجہ تم خود دیکھ لو: میں کیسی اچھی اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ شیطان کا ذرا سی بات میں کہا مانا، اور تم کہیں کے نہ رہے۔ دلدل میں دھنس جاؤ گے اور پھر کبھی نہ ابھر سکوگے۔ ہم دہقان لوگ ہی شیطان کی چالوں میں نہیں آتے، خاندانی پڑھے لکھے لوگ بھی آجاتے ہیں۔ کوئی پندرہ سال کا ذکر ہے

کہ ایک شخص جلاوطن ہو کر یہاں پہونچا۔ بھائیوں میں تقسیم جائداد اور جعلی وصیت کا کچھ جھگڑا تھا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ ضرور کوئی شہزادہ یا کسی جاگیردار کا لڑکا ہے۔ مگر ممکن ہے معمولی سرکاری ملازم ہو۔ کسی کو کیا معلوم؟ بہرحال، وہ یہاں پہونچا اور آتے ہی اُس نے اپنے لیے ایک مکان اور کچھ زمین خرید لی۔ اُس نے تہیہ کیا کہ "میں اپنے پسینہ کی کمائی پر گذارہ کروں گا۔ میں اب معزز آدمی نہیں رہا، معمولی جلاوطن ہوں" میں نے کہا "خدا تمھارے نیک ارادے میں برکت دے!"

وہ اُسوقت نوجوان تھا، اور اُسکے مزاج میں دوڑ دھوپ کا ولولہ تھا۔ وہ خود ہل چلاتا، خود مچھلیاں پکڑتا۔ گھوڑے پر ساٹھ میل کی سواری اُسکے لیے معمولی بات تھی۔ مگر یہ زمانہ زیادہ عرصے تک نہ رہا۔ پھر مصیبت آئی۔ پہلے ہی سال سے اُس نے دستور بنا لیا تھا کہ روزانہ گھوڑے پر گریتو کے ڈاک خانے جاتا تھا، میری کشتی پر وہ کھڑا ہو جاتا، اور ٹھنڈا سانس بھر کر کہتا "سیمین، خبر نہیں گھر کے لوگ روپیہ بھیجنے میں دیر کیوں لگاتے ہیں؟" میں کہتا "ویسلی سرجی ورچ، تمھیں روپے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم روپے کا کیا کروگے؟ پرانے زمانے کو بھول جاؤ گویا وہ کبھی تھا ہی نہیں، اور زندگی نئے سرے سے شروع کرو۔ شیطان کی ایک نہ سنو! وہ تمھارے درپے ہے۔ اُسکے کہے میں آئے تو یاد رکھو ضرور تمھیں سولی پر لٹکوا کے چھوڑے گا۔ ابھی تو تم صرف روپیہ چاہتے ہو، رفتہ رفتہ کچھ اور چاہو گے۔ پھر تمھیں کسی اور چیز کی ضرورت ہوگی اور پھر کسی اور چیز کی… اگر تمھیں خوشی مطلوب ہے، تو میرا کہا مانو اور کسی چیز کی خواہش نہ کرو۔ اگر قسمت نے ہمارے ساتھ برا سلوک کیا ہے، تو ہم کیوں اُس کے آگے سر جھکائیں اور بھیک مانگیں؟ ہمیں تو چاہیئے کہ اُس سے نفرت کریں، اُس پر ہنسیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ عرصہ میں وہ ہماری ہنسی میں شریک ہونے لگے گی" میں اُسے اسی قسم کے مشورے دیتا… وہ ایک سال بعد مجھے پھر اُسے دریا پار کرانے کا اتفاق ہوا۔ وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ اُس نے کہا "میں اپنی بیوی کو لینے جا رہا ہوں۔ آخر اُسے میری حالت پر رحم آ ہی گیا، اور اُس نے میری التجا قبول کرلی۔ وہ کتنی بھلی اور مہربان ہے!" اُس سے اپنی خوشی ضبط نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک آدھ دن کے بعد وہ اپنی بیوی سمیت واپس ہوا۔ وہ ایک نوجوان حسین عورت تھی، اور اُسکی گود میں ایک ننھی بچی تھی، ویسلی سرجی ورچ اُسکے ادھر اُدھر منڈلا رہا تھا۔ اپنی نگاہیں

وہ اُسکے چہرے سے نہ ہٹا سکتا تھا۔ اپنی بیوی کی تعریف میں اُس کی زبان قاصر تھی۔

وہ مجھ سے کہنے لگا "بھائی سیمین، زندگی سائبیریا میں بھی بے لطف نہیں گذرتی!" میں نے اپنے دل میں کہا "ہاں، یہ خیال چند روزہ ہے"۔ اُس روز سے وہ ہر ہفتے گرینو جانے لگا کہ روس سے اُس کا روپیہ تو نہیں آیا۔ روپے کی اُسے بیحد وحساب ضرورت رہتی۔ مجھ سے ایک دن اُس نے کہا "میری خاطر اُس نے اپنی جوانی اور حُسن کو سائبیریا میں گویا دفن کر دیا ہے، اور میرے ساتھ بے آرامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس احسان کے بدلے مجھ پر لازم ہے کہ جس قدر ہو سکے اُس کی دلچسپی کا سامان مہیا کروں"۔ زندگی کو اُسکے واسطے دلچسپ بنانے کے لیے اُس نے مقامی افسروں اور طرح طرح کے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کی، پھر اُنکے لیے کھانے پینے کے انتظام کی ضرورت ہوئی۔ ایک پیانو خریدا گیا، اور ایک چھوٹا سا کتا۔ خدا اُسے غارت کرے! الغرض ہر طرح کے ٹھاٹھ اور فضول خرچی ہونے لگی۔ اس پر بھی وہ بیگم صاحبہ کچھ زیادہ عرصہ تک اُس کے ساتھ نہ رہیں۔ اور رہتیں بھی کس طرح؟ چاروں طرف کیچڑ اور پانی، سردی، اور جاہل، غیر مہذب، شرابی لوگوں کے علاوہ یہاں تھا کیا؟ اُنھیں تو شہر کی زندگی کا چسکا تھا، وہ یہاں کہاں سے آتی؟ اسکے علاوہ میاں کی حیثیت بھی اب پہلے سے گر گئی تھی، ایک جلا وطن کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔

تین سال گذر گئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن شام کے وقت پرلے کنارے سے مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں کشتی لے کر اُدھر پہونچا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بیگم صاحبہ کانوں تک لپٹی ہوئی کھڑی ہیں، اور ساتھ ایک جوان افسر ہے، اُنکے ساتھ ایک گاڑی بھی تھی۔ میں نے اُنھیں دریا پار کرا دیا، وہ گاڑی میں بیٹھ کر آگے روانہ ہو گئے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی اُسوقت کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگلے دن صبح کو وسیلی سرجی وچ گھبرایا ہوا گھوڑے سے اُترا اور مجھ سے پوچھنے لگا "سیمین، میری بیوی تو کسی عینک والے آدمی کے ساتھ دریا کے پار نہیں گئی؟" میں نے جواب دیا "ہاں، اب وہ تمھارے ہاتھ آ چکے!" پانچ دن اُس نے اُنکا تعاقب کیا۔ جب وہ واپس آیا، تو بے دم ہو کر میری کشتی میں گر پڑا اور اپنا سر کشتی میں دے دے مارتا تھا۔ آخر سسکیاں لیتا ہوا بولا "میں نے یہ پھل پایا"! میں نے مسکرا کر اُسے یاد دلایا کہ "زندگی سائبیریا میں بھی کچھ بے لطف نہیں گذرتی!" وہ برابر آہ و زاری کیے گیا۔ اسکے بعد اُسے آزادی کی ضرورت ہوئی۔

اُسکی بیوی، روس پہونچ چکی تھی، اور وہ اُس سے ملنے کے لیے بیتاب تھا تاکہ اُسے پھر اپنے ساتھ لاسکے۔ اُس دن سے وہ صبح وشام ڈاک خانے سے مقامی حکام کے ہاں آتا جاتا رہتا۔ روس جانے کی.... اجازت حاصل کرنے کے لیے اُس نے عرضیوں پر عرضیاں بھیجیں، صرف ایک تار پر اُسکے ستّر روبل خرچ ہوے۔ اپنی زمین اُس نے بیچ دی، اپنا مکان یہودیوں کے ہاتھ رہن کر دیا۔ اُسکے بال سفید ہوگئے، شانے جھک گئے، اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ جیسے کسی دق کے مریض کا۔ بات کرتے کرتے اُسکا دل بھر آتا اور آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔

اس طرح اُس نے آٹھ سال بسر کیے۔ آخر ان واقعات کا صدمہ ہلکا ہو گیا، اور اُس نے گویا از سر نو زندگی پائی۔ اُسے ایک تسکین کا ذریعہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ اُسکی بیٹی جو اب سمجھدار ہو گئی تھی، وہ اُس پر جان فدا کرتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ تھی بھی وہ خوب صورت، سیاہ آنکھوں والی اور طرحدار۔ ہر اتوار کو وہ اُسے گرجا میں لیجاتا۔ دونوں کشتی میں پاس پاس کھڑے ہو جاتے، وہ مسکراتی ہوئی اور اُس کا متوالا باپ اُسکے چہرے پر نظریں جمائے ہوے، وہ کہتا "بیشک، سیمین، سائبیریا میں بھی زندگی کچھ بے لطف نہیں گذرتی، یہاں بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ دیکھو میری لڑکی کتنی پیاری ہے! اس سے زیادہ دلکش لڑکی تمھیں ہزار میل ادھر اُدھر نظر نہیں پڑیگی" میں جواب دیتا "بیشک، تمھاری لڑکی بہت پیاری ہے" اور دل میں کہتا "ذرا صبر کرو..... یہ نوجوان ہے، اس کا خون گرم ہے، اسے دلچسپ زندگی کی تلاش ہے، یہاں اسکی دلچسپی کا کیا سامان ہے؟"

بہرحال، لڑکی گھلنی شروع ہوئی، اور آخر بیمار پڑ گئی، اور اب بمشکل بستر سے اُٹھ سکتی ہے۔ ڈاکٹروں نے دق تشخیص کی ہے۔ یہ ہے حاتی سائبیریا کی پُر لطف زندگی! خیر تو اب ڈاکٹروں کی تلاش ہوئی جہاں کسی ڈاکٹر یا نیم حکیم کا پتہ چلا اور وسیلی سرجی وچ اُسے لینے پہونچا۔

میں نہیں بتا سکتا کہ ڈاکٹروں پر وہ کتنا روپیہ خرچ کر چکا ہے۔ اس سے زیادہ مناسب تو یہ ہوتا کہ وہ یہ روپیہ شراب خواری میں اُڑا دیتا۔ لڑکی کا مرنا تو ہر حال میں یقینی ہے۔ اُسے اب کوئی ڈاکٹر نہیں بچا سکتا۔ اور پھر وہ بالکل بے یار و مددگار رہ جائے گا، اور یا تو نا اُمید ہوکر خودکشی کریگا یا روس بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ اگر فرار ہوا، تو ضرور پکڑا جائے گا؛ پھر وہی مقدمہ حبسِ دوام، ممکن ہے سولی...

"یہ خوب رہا" تاتاری نے منہ ہی منہ میں سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

"کیا خوب رہا؟"

"بیوی، بیٹی ... ناامیدی یا حبسِ دوام کی کیا حقیقت ہے جب اُسے اپنی بیوی، اپنی بیٹی کی صحبت نصیب ہو چکی؟ ... تم کہتے ہو انسان کو کسی چیز کی خواہش نہیں ہونی چاہیے، یہ بدبختی کی علامت ہے۔ اُس کی بیوی اُسکے ساتھ تین سال تک رہی، یہ خدا کی رحمت تھی، کچھ بھی نہ ہونا، بدبختی ہے۔ دو تین سال تو لطف سے گذرے، تم ذرا نہیں سمجھتے"

سردی سے لرزتے ہوئے، اور اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے صحیح روسی الفاظ تلاش کرتے ہوئے، تاتاری نے کہا کہ "میں تو دعا مانگتا ہوں کہ خدا مجھے غیر ملک کی موت سے بچالے۔ میری بیوی میرے پاس آجائے، دن بھر کے لیے، گھنٹہ بھر کے لیے، اسکے عوض مجھے ہر طرح کی اذیت قبول ہے۔ خوشی کا ایک دن ہمیشہ کی محرومی سے بہتر ہے۔"

اور اُس نے پھر اپنی خوبصورت اور عاقل بیوی کا ذکر کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ اپنا سر اُس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اُس نے سیمین کو یقین دلایا کہ "میں بے قصور ہوں، میرے ساتھ ناانصافی برتی گئی۔ میرے بھائیوں اور چچا نے گھوڑے چرائے تھے اور گھوڑے والے کو ادھ موا کیا تھا، میں بے گناہ ہوں۔ ہم تینوں بھائیوں کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا اور ہمارا مالدار چچا صاف چھوٹ گیا۔"

"رفتہ رفتہ تم اس زندگی کے عادی ہو جاؤ گے" سیمین نے تحمل کے لہجے میں کہا۔

تاتاری نے کچھ نہیں کہا، اور اپنی اشک آلود آنکھوں سے آگ کی طرف دیکھنے لگا، اُسکے چہرے سے حیرانی اور مظلومیت ٹپک رہی تھی، گویا اُسے نہیں معلوم کہ کیوں وہ سائبیریا کی سردی و تاریکی میں پھینک دیا گیا ہے۔ لال بھبوکا وہ آگ کے قریب لیٹ رہا، اور پہلے مسکرایا، پھر آپ ہی آپ کچھ گنگنانے لگا۔

اور تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر بولنا شروع کیا "تم کہتے ہو اُسے تسکین ضرور ہے، مگر تم کو اُس سے کیا تسکین؟ وہ اُسے بڈھے، بھوت، چڑچڑے، اپنی کیا حاجت؟ اُسے تو جوان کی حاجت ہے، اور عورت گی، اور فاقہ کی"

سیمین نے دقت کے ساتھ اٹھتے ہوئے، ایک آہ کھینچی۔

بوتل ختم ہو گئی؛ بس اب سونے کا وقت ہے۔ کیوں بھائی؟ میں تو چلا ...'

تنہائی میں تاتاری نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں لگائیں، اور شعلوں پر ٹکٹکی باندھے اسکی نظروں میں اپنے گاؤں اور اپنی بیوی کا تصور بندھ گیا۔ ایک مہینے، ایک دن کے لیے وہ میرے پاس آجائے، تو مجھے ذرا ملال نہ ہوگا اگر وہ پھر چلی بھی گئی۔ خوشی ایک مہینہ، صرف ایک دن، ہمیشہ کی محرومی سے بہتر ہے۔ فرض کرو اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اور وہ آبھی گئی، تو میں اس کا خرچ کس طرح اٹھاؤں گا، اس کی سکونت کا یہاں کیا انتظام ہے؟ سوچتے سوچتے اسکے منہ سے نکلا' کھانے کو نہ ہوگا تو زندگی کس طرح ہوگی؟' دن رات کشتی چلانے پر بھی اسکی آمدنی دس بارہ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ بخشش کے طور پر اسے کبھی کبھار کچھ مل جاتا تھا، مگر اسے دوسرے کشتیبان آپس میں بانٹ لیتے تھے، اور تاتاری یوں ہی رہ جاتا تھا۔ بلکہ وہ اس کا الٹا مذاق اڑاتے تھے۔ اور پھر بھوک پیاس اس کی بیوی سے کس طرح برداشت ہوگی؟

اب کہ وہ مارے سردی کے تھر تھر کانپ رہا تھا، اور اس کے عضو عضو میں درد تھا، چاہیے تھا کہ وہ جھونپڑی میں جاکر لیٹ رہتا، مگر وہاں باہر سے بھی زیادہ سردی ہوتی، کیونکہ اسکے پاس اوڑھنے کو کچھ نہ تھا۔ باہر بھی اگرچہ اوڑھنے کو کچھ نہ تھا، مگر آگ تو تھی۔ ہفتہ بھر میں پانی اتر جائے گا اور کشتیاں چلنے لگیں گی۔ اور سوائے سیمین کے دوسرے کشتیبانوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ تب تاتاری گاؤں گاؤں نوکری ڈھونڈتا اور بھیک مانگتا پھرے گا۔ اس کی بیوی صرف سترہ سال کی تھی خوبصورت نازک، اور شرمیلی۔ کیا وہ بھی بے شرمی کے ساتھ در بدر بھیک مانگتی پھرے گی؟ نہیں، نہیں، اس قسم کا خیال بھی اسکے تصور میں نہ آسکتا تھا۔ صبح ہو چلی تھی، کشتی، درخت، دریا صاف نظر آنے لگے تھے۔ ایک طرف رتیلی ڈھلان، اس کی تہ میں چھپر، اور ان سے پرے گاؤں کی جھونپڑیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔

سرخ رتیلی ڈھلان، کشتی، اجنبی، غیر متواضع لوگ، بھوک، پیاس، بیماری۔ شاید ان چیزوں کا کوئی وجود نہ ہو۔ شاید یہ سب خواب ہو' تاتاری نے خیال کیا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سو رہا ہے اور اپنے خراٹوں کی آواز اسکے کان میں آرہی ہے۔ وہ پھر خواب میں اپنے وطن پہونچا؛ ادھر اس نے اپنی بیوی کو آواز دی، ادھر وہ آئی ... اور اسکی ماں پاس کے کمرے میں تھی ... لوگ کہیے

درو ناک خواب دیکھتے ہیں! تاتاری نے آنکھیں کھولیں، یہ کون ساد رہا ہے؟ والنگا؟ برف پڑ رہی تھی دریا کے دوسرے کنارے سے کوئی شخص چلا رہا تھا 'کشتی لاؤ، کشتی!'

تاتاری چونک کے اُٹھ بیٹھا، اور اپنے ساتھیوں کے پاس پہونچا۔ پھٹے ہوئے لبادے پہن کر، اپنی کرخت، خواب آلود آواز میں بُرا بھلا بڑبڑاتے ہوئے، کشتیبان دریا کے کنارے پہونچے۔ میٹھی نیند کے بعد دریا کی تیز سرد ہوا کچھ بہت خوشگوار نہ تھی۔ فوراً سب کشتی میں سوار ہوئے۔ تاتاری اور تین دوسرے کشتیبانوں نے چپو سنبھالے جو اندھیرے میں کیکڑے کے پنجوں کے مانند نظر آتے تھے۔ سیمین پیٹ کے بل کشتی کے اگلے حصے میں لیٹ گیا۔ دوسرے کنارے سے چیخنے چلانے کی آواز بدستور آ رہی تھی، دو مرتبہ طپنچہ چلنے کی آواز بھی سنائی دی۔ جو کوئی بھی چلا رہا تھا، اُسے خیال ہو گا کہ شاید کشتیبان سو رہے ہیں یا گاؤں کے شراب خانے میں گئے ہوئے ہیں۔

'سُن لیا! آخر ایسی کیا گھبراہٹ ہے؟' لال بھبکڑ نے ایسی آواز سے کہا جس سے ٹپکتا تھا کہ اس دنیا میں جلدی کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ ایک بےمعنی حرکت ہے۔

لمبی چوڑی، بدقطع کشتی آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی، سوائے اسکے کہ کنارے کے درخت چلتے ہوئے نظر آئیں کشتی بالکل ساکت معلوم ہوتی تھی۔ کشتیبان اطمینان کے ساتھ جچے تُلے ہاتھوں سے چپو چلا رہے تھے۔ لال بھبکڑ لیٹا ہوا، ہوا میں کمان بنا رہا تھا، کبھی اس طرف کو جھکتا تھا کبھی اُس طرف کو۔

'جلدی کرو، جلدی!' اجنبی اُس کنارے سے بیتابانہ چیخ رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد کشتی زور سے کنارے سے جا لگی۔ سیمین برف کے گالے اپنے منہ سے پونچھتے ہوئے بڑبڑایا 'برف ہے کہ پڑے جاتی ہے، پڑے جاتی ہے، خدا معلوم اتنی برف کہاں سے نازل ہوتی ہے۔'

کنارے پر ایک دُبلا پتلا مختصر سا آدمی لومڑی کی کھال کا چھوٹا کوٹ پہنے اور سفید اونی ٹوپی پہنے کھڑا تھا۔ غمگینی و ازخود رفتگی اُسکے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے ناقص حافظے پر اُسے غصہ آ رہا ہے۔

جب سیمین نے قریب پہونچ کر مسکراہٹ کے ساتھ تعظیماً اپنی ٹوپی اُتاری، تو وہ جلدی جلدی کہنے لگا 'میں انسکھو کا جا رہا ہوں، میری لڑکی کی حالت نہایت نازک ہے۔ سنا ہے وہاں کوئی نیا

ڈاکٹر مقرر ہوا ہے"۔

گاڑی کشتی میں ڈھکیلی گئی اور کشتیبانوں نے کشتی کھینی شروع کی۔ اجنبی، جسے سیمین ویسیلی سرجی وچ کہتا تھا، بالکل ساکت کھڑا ہوا اپنے بھرے بھرے ہونٹوں کو چباتا اور ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔ گاڑی بان نے اُس سے سگرٹ پینے کی اجازت مانگی، تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔

سیمین تعریفیًا بولا" زندگی سائبیریا میں بھی کچھ بے لطف نہیں گذرتی۔" اُسکے چہرے پر فاتحانہ رنگ جھلک رہا تھا، گویا وہ خوش ہے کہ واقعات نے وہی صورت اختیار کی جیسی اُس نے پیشین گوئی کی تھی۔ ویسیلی سرجی وچ کی غمناک، بے سبانہ حالت پر وہ نہایت مسرور تھا۔" اس موسم میں سفر بہت تکلیف دہ رہے گا۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے"۔ جب گھوڑے جوتے جا رہے تھے تو اُسنے پھر کہا" تمھیں چاہیے تھا کہ آٹھ دس دن ابھی اور ٹھہرتے تاکہ زمین خشک ہو جائے۔ اس سے بھی بہتر یہ تھا کہ تم سفر ہی نہ اختیار کرتے۔ آخر سفر سے حاصل؟ سال بسال لوگ اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں، اور نتیجہ دیکھو، تو۔ صِفر! تمھارا کیا خیال ہے؟" ویسیلی سرجی وچ چُپ چاپ کشتیبانوں کو انعام دے کر گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔

"پھر وہی ڈاکٹر کی تلاش!" سیمین حرارت پیدا کرنے کے لیے ہاتھ ملتے ہوے بولا" یہاں معقول ڈاکٹر کا دستیاب ہونا اُتنا ہی آسان ہے جتنا جنگل کی ہوا یا شیطان کی دُم کا۔ خدا اُسے غارت کرے!۔ ہاتھ آنا۔ لوگ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں۔ خدایا، ایک مجھ سے گناہگار کو معاف کر!"

تاتاری لال بھبوکا قریب پہونچا، اور لمحہ بھر کے لیے اُسکو نفرت اور بیزاری کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر سردی میں کانپتے ہوے، حالتِ غیظ و غضب میں تاتاری الفاظ استعمال کرتے ہوے، اُس نے کہنا شروع کیا: "وہ ایک نیک آدمی ہے۔ نیک۔ اور تم خبیث ہو خبیث! اُس کی روح پاک ہے، اور تمھاری پلید! وہ زندہ ہے، اور تم مُردہ! خدا نے انسان کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ خوشی اور رنج اور ناکامی سے آشنا ہو؛ مگر تمھیں کوئی آرزو نہیں۔ تم ایک پتھر ہو، ایک مٹی کی مورت! پتھر کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ تمھیں ہے۔ خدا کو اُس سے

محبت ہے، تم سے نہیں!' سب کشتیبان ہنس پڑے، اور تاتاری نے ایک بیکبارگی حرکت کے ساتھ اپنے پھٹے ہوئے کپڑے... بدن پر لپیٹ لیے اور آگ کے قریب چلا گیا، سیمن اور دوسرے کشتیبان جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔

ایک مجرم خشک گھاس پر لیٹتے ہوئے کرخت آواز میں بولا 'کیسی سردی پڑ رہی ہے!' دوسرے نے کہا 'واقعی غضب کی سردی ہے۔ ہے بھی تو مجرموں کی زندگی!'

سب لیٹ گئے۔ ہوا کی تیزی سے جھونپڑی کا دروازہ کھل گیا، اور برف اندر بھی پہونچنے لگی۔ کسی میں مارے سردی اور کاہلی کے اتنی ہمت نہ تھی کہ اُٹھ کر دروازہ بند کر لیتا۔

سیمن غنودگی کا جھونکا آنے سے پہلے بولا 'میں تو آرام سے ہوں۔ خدا سب کو ایسی زندگی نصیب کرے!'

'تم سات دفعہ سزا پاؤ، شیطان پھر بھی تمہاری ناپاک روح کو نہ قبول کریگا!' باہر سے نفرت اور غصہ میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔

'کیا ہے؟ کون ہے؟'

'تاتاری! بڑبڑا رہا ہے، عجب بے وقوف ہے!'

'رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔' اور یہ کہکر سو گیا۔ باقی مجرم بھی تھوڑی دیر میں سو رہے، دروازہ کھلا رہا۔

(ترجمہ)

(خواجہ) منظور حسین (علیگ)

"احفاد"

تیرا ایک کج فہم خادم اس کو باور کرنے کے لیے ہرگز طیار نہیں کہ اے جان آرزو! تونے اپنی مخصوص دلفریب شان دلربائی کے باوجود ردائے ہستی اُتار دی، اور ہم نیاز کیشوں سے خفا ہو کر عدم آباد [illegible] وادی میں پناہ لی۔ کیا درحقیقت کائنات کا گوشہ گوشہ تیری طلعت ریزیوں سے

خالی ہے، اور کیا اس عالم کا کوئی خطہ ایسا نہیں جسکی آب و ہوا تیری نغمہ سنجیوں سے مربوط مسرت و شادمانی بنی ہوئی ہو؟

وہ فرشتۂ موت کیسا شقی القلب ہوگا جس نے تجھ جیسے ہونہار یکتائے روزگار، اور لائقِ رشک فرزند کو عین عالم شباب میں تیرے ضعیف والدین سے جدا کیا، اور ایک پرستارِ محبت، عاشق صادق، اور پیکرِ وفا کو اسکی نئی نویلی بیوی کے آغوش محبت سے آن واحد میں ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا۔

اے ملکِ عدم کو آباد کرنے والے! کیا تجھے خبر ہے کہ تیرے حلقہ بگوشان محبت کس درد اور اضطراب سے تیری جدائی میں آتش بجاں ہیں، اور کس بےچینی اور مایوسی کے عالم میں تیرے حرماں نصیب والدین اور تیری سوگوار بیوی دم بخود و سر بگریباں ہیں!

سرزمین بریلی کو تیرے وطن ہونے کا فخر تھا، لیکن اُس قریۂ ویراں کے در و دیوار سے وحشت برسنے لگی ہے جب سے اے روح لطافت! تو نے منہ موڑا۔ اور وہ دربارِ دُر جو تیری کا فراوانی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا تیرہ و تاریک ہے جب سے اے روح تمنا! تیری ضیا پاش ہستی وہاں سے رخصت ہوئی!

اُف رے!! ہم حاشیہ نشینانِ مسندِ احقاد! تجھے اب کہاں ڈھونڈیں، اور کہاں پائیں؟

اے خاندان کے سرمایۂ صد نشاط! اور اے احباب کے وجہ حیات!! کیا تیری نازک کلامی اور بذلہ سنجی جو تیرا اور صرف تیرا حصہ تھی اب قصۂ پارینہ ہو چکی؟ اور کیا ہم تمام عمر چشم براہ رہیں گے، اور تو کبھی نہ آئے گا؟ صد حیف یہ کیسا جاں گسل واقعہ ہے جس کی تکذیب کے لیے میں اپنی بہترین آرزوؤں کی قربانی کر سکتا ہوں۔

ہند کے صحائف مدتوں تیرے کلکِ گہر ریز کی جنبش جمیل سے دیبائے مشجر بنے، ملت کی پاکیزہ مجالس تیرے جذبات آفریں کلام سے ایک عرصہ دراز تک مسحور و بےخود رہیں، اور دربار دُر کے شیدائیوں نے سالہا سال تیری نغمہ سرائی گوش حقیقت نیوش سے سنی۔

آہ! تو اب مٹی کے تودے کے نیچے محوِ خواب ہے، اور ہم مجروح و زار، خدائے بزرگ و برتر تجھے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور ہم تشنہ کامانِ محبت کو صبر جمیل۔

تیرا ایک ادنیٰ ترین پرستار

محمد عبد الشکور

سفرِ حجاز کی مختصر رُوداد

(سلسلۂ الناظر ماہ مئی)

یکم جون روز جمعہ — رابغ یا رابق قربِ ساحل کی وجہ سے تجارتی منڈی بنگیا ہے - جدہ سے کشتیوں پر سامانِ تجارت یہاں آتا ہے اور وسطِ حجاز کے بدو قبائل میں تقسیم ہوتا ہے - یہاں کا بازار وسیع اور پٹا ہوا ہے جس میں عام ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے - مکہ معظمہ سے رخصت ہونے کے بعد اب تک جہاں جہاں قافلہ ٹھہرا تھا وہاں کسی مستقل آبادی کے نشان نہ تھے - مگر یہاں بازار کے علاوہ مختصر سی مستقل آبادی بھی ہے جسکے خام مکانات دونوں جانب اور نیز کچھ فاصلہ سے ایک ٹیلہ پر بنے ہوئے ہیں - ایک جانب ایک سنگی مگر شکستہ قلعہ ترکی عہد حکومت کی یادگار ہے - بازار میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک مسجد ملتی ہے جس میں اگرچہ بلحاظ تعمیر مسجد کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی لیکن اوقات نماز میں پانچوں وقت اذاں ہوتی اور نمازیوں کا اچھا خاصہ مجمع ہو جاتا ہے - قافلے کے لوگوں کو عام طور پر مسجد کا پتہ نہیں چلا لیکن جن لوگوں کو سراغ مل گیا وہ مسجد تک پہونچ گئے - بازار کے ایک سرے پر قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے اجناس کے علاوہ پکا ہوا کھانا اور روٹی وغیرہ بھی یہاں مل سکتی ہے - قربِ ساحل کی بدولت تازہ مچھلی بھی ملجاتی ہے اور شلجم، مولی، لیموں وغیرہ بھی نظر آئے - دوکانوں پر زیادہ تر قوا جناس ہی فروخت ہوتی ہیں اس لیے کہ بدوی زندگی کی سادگی نے ضروریاتِ زندگی کی تعداد کو اس قدر محدود بنا دیا ہے کہ دوسری عام اشیائی مانگ بہت کم ہے، تاہم کپڑے، بساطخانہ اور دواؤں کی دوکانیں بھی یہاں موجود ہیں - میرے ہمراہیوں میں سے ایک صاحب کو پیچش ہوگئی تھی لیکن راستے میں کسی مقام پر کوئی دوا نہ مل سکی - یہاں اسبغول خریدا گیا تو ایک روپے میں غالباً دو تین تولہ سے زائد نہیں ملا - پھر بھی غنیمت معلوم ہوا کہ مل تو گیا -

بدوؤں کا لباس بہت سادہ ہے - ایک لمبا کرتہ ستر پوشی کے لیے - ایک رومال کمر میں اور ایک سر پر - اور بعضوں کے پاس ایک اُون کی عبا بھی ہوتی ہے جو کبھی کُرتے کے اوپر زیب بدن کیجاتی ہے اور کبھی اونٹ کی پیٹھ پر بستر ے کا کام دیتی ہے - پاجامہ پہننا یا تہمد باندھنا بدوی معاشرت میں

ایک شدید بدعت ہے - اگرچہ شہروں میں آمد و رفت کی وجہ سے بعض ایسے بدو جن کو مسلسل اونٹ یا گھوڑے پر سوار رہنا پڑتا ہے کُرتے کے نیچے جانگھیا پہن لیتے ہیں - اسی سبب سے کپڑے کی دوکانیں زیادہ بارونق نہیں ہیں -

بساط خانہ کا بھی یہی حال ہے کہ صابون، تمباکو، دیا سلائی وغیرہ چند اشیاء کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا - ہر بدو مسلح رہتا ہے - کم سے کم ایک تیز چُھری ہر شخص کی کمر میں کھنسی رہتی ہے، ورنہ تلوار یا بندوق یا دونوں ہوتی ہیں - بازار میں ایک شخص دو بندوقیں اور ایک سات نل کا طپنچہ فروخت کر رہا تھا - قیمت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہت کم قیمت پر بک رہی ہیں - ایک بندوق کی قیمت تقریباً بیس روپے دینا پڑتے -

بازار کے عین وسط میں ایک بہت بڑا پختہ کنُواں بنا ہوا ہے جس کا پانی اگرچہ دیکھنے میں بہت صاف و شفاف ہے مگر ذائقے میں بالکل تلخ - اس لیے قافلے والوں کے پینے کے لیے اُن چھوٹے چھوٹے کچے کنوؤں کا پانی آتا ہے جو بازار کے ایک سمت قبرستان سے قریب بنے ہوئے ہیں - ان کا پانی عموماً گندلا تھا اور کسی کسی کا میٹھا نکلتا ورنہ کچھ نہ کچھ کھاری پن موجود ہوتا - جس کی وجہ سے کھانا پکانے میں سخت دقت واقع ہوئی - چونکہ رابغ میں ایک شبانہ روز کا قیام تھا اس لئے خیال تھا کہ کھانا اہتمام سے تیار ہوگا - مگر پانی کی خرابی نے سارا انتظام برباد کر دیا - دن بھر نہایت تیز ہوا چلتی رہی - اگرچہ ہوا میں تپش کم تھی مگر گرد اس قدر اُڑتی تھی کہ الامان - شام کو دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں سے ڈاک جا سکتی ہے، اس لیے رات کو دیر تک خطوط لکھتا رہا - بمبئی سے جو بنڈل کے بنڈل موم بتیوں کے ساتھ لایا تھا اُنکی اب تک تو کوئی ضرورت نہیں پڑی تھی - رات کو خط لکھنے کے واسطے روشنی کی ضرورت ہوئی تو موم بتیاں کام آئیں - اب چونکہ مٹی کا تیل ہر پڑاؤ پر ملتا ہے اس وجہ سے حجاج کو چاہیے کہ موم بتیوں کے بجائے ایک لالٹین ساتھ رکھیں - اور اس خیال سے کہ شقدف کی حرکت یا ٹکر سے ٹوٹ نہ جائے چمنی کے گرد تاروں کا جال بندھوالیں - جن جاویوں یا ہندوستانیوں کے پاس لالٹین تھی اُن کو بہت آرام ملا -

ڈاک کا اہتمام یہاں یہ ہے کہ ایک دوکان پر تمام خطوط جمع کر دیے جاتے ہیں - ضرورت ہو تو وہیں سے کاغذ، لفافہ مول لیلیے - محصول ڈاک نقد جمع کرنا ہوتا ہے - اُس دوکان کا مالک گویا ڈاک کے مہتمم صاحب کا

ایجنٹ ہے جن کا مستقر قلعہ میں بتایا گیا لیکن تلاش کے باوجود اُنکی صورت نہ دکھائی دی۔ ظاہر ہے کہ ڈاک کا یہ انتظام کچھ قابلِ اطمینان نہیں مگر اس خیال سے دل کو کسی قدر تسلی ہوگئی کہ خط بھیجنے کی ذمہ داری سے سبکدوشی تو حاصل ہوئی۔ مکتوب الیہ تک نہ پہونچے تو اسکے ذمہ دار کارکنانِ قضا و قدر ہیں۔

رات کو کافی ٹھنڈک رہی اس لیے خوب نیند آئی۔ مگر وسطِ شب میں دفعۃً چور چور کا غل ہوا ہمارے ساتھ کے قافلے کی ایک عورت کا زیور رابغ کی منزل میں راستے سے اُڑ گیا تھا جسکی وجہ سے مترجم، جمالون، اور اُس قافلے کے حجاج کے درمیان مسلسل تکرار و بحث ہوتی رہی۔ اس رات میں ہمارے ایک ساتھی کی بھی ایک گھڑی غائب ہوگئی۔ راستے میں نگہبانی کے ذمہ دار تو جمال ہیں لیکن پڑاؤ پر نگہبانی کا فریضہ اُس جماعت پر عائد ہوتا ہے جو چوکیداری وصول کرتی ہے۔ اور ہمارے مترجم صاحب نے اطمینان دلایا کہ یہ لوگ مال تلاش کرکے یا تو واپس پر آپ کو مال دیں گے ورنہ اُسکی قیمت ادا کریں گے۔ سب جانتے تھے کہ یہ باتیں محض دفع الوقتی کی ہیں۔ مگر کرتے کیا۔ دنیا بامید قائم۔ غریب ظہور حسین کا یہ سامان تھا صبر کرکے بیٹھ رہا۔

میرا نیا جوتہ چند ہی روز میں جواب دے گیا۔ پُرانا پہلی ہی منزل میں رخصت ہوگیا تھا۔ اس لیے اب مجھے فکر لاحق ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہاں ایک موچی بھی ہے۔ مگر باوجود کوشش بلیغ اُس سے ملاقات نہ ہوئی۔ بالآخر بدوؤں کے پہننے کا ایک چپل خریدا گیا۔ بدو اس چپل کو پہن کر کس آسانی سے ریتلی اور پتھریلی زمین پر چلتا ہے ۔ مجھے تو اسکو پہنکر چار قدم بھی چلنا مشکل ہوتا تھا۔ تاہم ضرورت نے اسی پر قناعت کرنے کے لیے مجبور بنا دیا۔

۲-جون-روز شنبہ | رابغ میں عادت کے خلاف دونوں وقت گوشت کھایا تھا اس لیے صبح اُٹھتے ہی سوءِ ہضم کی شکایت محسوس ہوئی۔ غذا ہضم کرنے کے خیال سے دیر تک ٹہلتا رہا۔ چاشت کے وقت کچھ تھوڑا سا کھانا کھا کر روانہ ہوے۔ رابغ سے نکلے تو دُور تک نخلستان میں اونٹ چلتے رہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے ساحل سے بہت دُور ہوگئے تو دھوپ اور لُوہ کے تھپیڑوں سے سامنا رہا۔ رات کو عشا کے وقت مستورہ پہونچے۔ شغدف سے نیچے اُترے تو دیکھا کہ ساتھیوں کے اونٹ نہیں ہیں۔ خیال ہوا کہ پیچھے آرہے ہونگے۔ جمال تو شغدف پھینک کر الگ ہوگیا۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا مگر ساتھیوں کے اونٹ نہ آئے اس لیے بہت پریشان ہوا۔ ادھر اُدھر ڈھونڈھنا چاہا مگر رات کا وقت اور چاروں طرف قطار در قطار

شغدف رکھے ہوئے۔ پتہ چلانا مشکل ہوا۔ دشواری تمام تقریبًا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے تک پھرنے کے بعد میر صاحب وغیرہ ملے۔ مترجم اور مقوم پر بہت کچھ اظہار غیظ و غضب کرکے میں نے چاہا کہ اپنے شغدف کو یہیں اُٹھوالاؤں لیکن اب اپنا شغدف تلاش کرنے میں سخت دشواری پیش آئی۔ مترجم صاحب جو ہمراہ تھے آخر زچ آکر واپس چلے گئے۔ میں نے تنہا گھوم پھر کر اپنا شغدف تلاش کیا اور اپنے ساتھی رحمت شاہ کو لیکر پھر اُسی جگہ آیا جہاں میر صاحب تھے۔ شغدف مع کل سامان کے جمال کے پاس چھوڑا صرف بیگ ساتھ لے لیا کہ اُس میں اپنا اور سب ساتھیوں کا زر نقد تھا۔

۳۔جون روز یکشنبہ | صبح سویرے اپنا شغدف بھی اُٹھوالیا۔ مگر جمال کی اس حرکت کی وجہ سے رات کو جس قدر زحمت ہوئی تھی اُس کا غصہ ہنوز باقی تھا۔ اور اس غرض سے کہ جمال آیندہ ایسی کارروائی نہ کرے میں نے اُسکی مقررہ بخشش کے دینے میں تامل کیا۔ بالآخر مترجم نے درمیان میں پڑکر صفائی کرائی اور جمال سے پختہ وعدہ لیا گیا کہ اب کبھی میرا اونٹ ساتھیوں کے اونٹوں سے الگ نہ کریگا۔ مستورہ میں ایک بڑی پختہ باؤلی بنی ہوئی ہے مگر اس کا پانی گندلا اور کھاری ہے۔ کہیں فاصلے سے میٹھا پانی بھی آتا ہے مگر ہم لوگوں کو باوجود کوشش دستیاب نہ ہوا مجبورًا اسی پانی پر قناعت کی گئی لیکن دال کچی رہ گئی جسکی وجہ سے غریب رحمت شاہ کو پیچش شروع ہوگئی۔

مستورہ میں بازار بھی بہت مختصر تھا۔ اگرچہ مدینۂ منورہ کے کھجور عمدہ اور عمدہ ملے۔ میں ساتھ کے ساتھیوں کی تلاش میں بہت خستہ ہوگیا تھا اس لیے خلاف عادت بازار میں زیادہ نہ ٹھہرا اور تھوڑی کھجوریں لیکر واپس آیا۔ تمازت آفتاب بھی مستورہ میں زیادہ محسوس ہوئی اور دوپہر ہونے پائی تھی کہ نہایت تیز لُوہ چلنے لگی جسکی وجہ سے میر صاحب کی طبیعت بدمزہ ہوگئی۔ خدا خدا کرکے ظہر پڑھ کر روانہ ہوئے۔

۴۔جون روز دوشنبہ | مستورہ سے چلے تو گرمی اور ہوا کی تیزی سے پریشان تھے۔ راستہ میں اگرچہ تپش کا وہی عالم رہا مگر ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا اس لیے لُوہ سے زیادہ تکلیف نہ ہوئی۔ پانی کی خرابی کا یہ علاج کیا کہ ہر دفعہ پیاس کے وقت شربت گھولا جاتا۔ نماز فجر کے وقت بیر شیخ پہونچے۔ یہاں کا بازار بھی مستورہ کی طرح مختصر ہے۔ اور کنواں بھی صرف ایک ہے مگر اس کا پانی شیریں اور صاف ہے۔ اگرچہ ۸ درہم فی ٹین کے حساب سے دام کسی قدر گراں دینا پڑے۔ بیر کنوئیں کو کہتے ہیں۔ دن کو یہاں بھی

تپش اور لُوہ سے سامنا رہا۔ مگر خوش ذائقہ پانی نے گرمی کی تکلیف زیادہ محسوس نہیں ہونے دی عصر پڑھکر روانہ ہوے۔ راستے میں خبر ملی کہ جو قافلہ ہم سے آگے روانہ ہوا تھا اُسے اگلے پڑاؤ پر بدوؤں نے روک لیا ہے۔ نصف شب کو ہمارا قافلہ بھی بیر حسانی پہونچ گیا۔

۵- جون سہ شنبہ صبح کو بعد نماز فجر حسب معمول بازار کی طرف گیا تو دیکھا کہ واقعی قافلے کا وہ حصہ جو ہم سے آگے تھا یہاں پڑاؤ کیے ہوے ہے۔ اب گویا پورا قافلہ ایک جگہ ہوگیا۔ یہاں کا بازار بہت فراخ و وسیع ہے کچھ حصہ پٹا ہوا ہے اور کچھ ابتدائی پڑاؤ نکے مانند جھونپڑوں کی تشکل میں ہے۔ ترکاری کے سوا اور سب چیزیں ضرورت کی ملتی ہیں۔ کنوئیں متعدد ہیں اس لیے پانی بہت ارزاں ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہے۔ وادی فاطمہ کے بعد سے جو لوگ نہیں ملے تھے اُن میں سے بعضوں سے اب ملاقات ہوئی۔ جن بدووں نے قافلے کو روکا تھا اُن سے گفتگو کرنے کے لیے جمالوں کے سردار گئے ہوے تھے۔ دوپہر کو مترجم نے اطلاع دی کہ دو مجیدی فی شندف وینا طے پایا ہے۔ کل قافلہ روانہ ہوگا۔ ہمارے قافلے کے ایک افغانی کا یہاں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یوں تو ہر منزل پر کچھ نہ کچھ لوگ مرتے تھے مگر ہمیں کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ تجہیز و تکفین و تدفین کا کیا انتظام ہوتا ہے۔ افغانی ساتھی کے متعلق سارے انتظامات آنکھوں کے سامنے ہوے تو معلوم ہوا کہ قبر کھودنے کے لیے وہی تکروری جو مشکیں بھر بھر کر پانی بیچتے ہیں بلائے جاتے ہیں اور چند روپیوں کے خرچ سے سب کام نکل جاتا ہے۔ مکۂ معظمہ میں سنا تھا کہ امیر کابل کے پیر صاحب بھی حج کے لئے آئے ہیں۔ مجھے اُنکی زیارت کا شوق تھا مگر وہاں کہیں پتہ نہ چلا۔ اور انتظامات سفر سے فرصت ہی کب ملی۔ وادی فاطمہ پر اُن کا خیمہ دکھائی دیا تھا مگر قبل اسکے کہ میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوں وہ روانہ ہوگئے۔ یہاں اُن کا خیمہ نظر پڑا تو مغرب کے قریب میں بھی حاضر خدمت ہوا۔ آپ کا اسم گرامی حضرت شمس المشائخ بتایا گیا۔ جوان آدمی ہیں اور صورت سے عابد و مرتاض معلوم ہوتے ہیں۔ نقشبندی ہیں۔ کچھ دیر اُن سے گفتگو رہی۔ معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اپنے بدوؤں سے طے کرلیا ہے کہ مدینۂ منورہ میں دس روز قیام کریں گے۔ ....

.... اُنکے ہمراہ سترہ اٹھارہ اونٹ تھے اور ولایتیوں کی ایک جماعت ہر وقت اُنکو گھیرے رہتی تھی۔ ایک سفری پلنگ بچھا ہوا تھا اور خیمے میں دریوں اور قالین کا فرش تھا۔ جسکو دیکھکر یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ حالت سفر میں ہیں۔ مغرب کے

وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ امامت ایک دوسرے صاحب نے کی جو مقرب خاص معلوم ہوتے تھے۔ جب ہمارے افغانی ساتھی کے دفن کا وقت آیا تو اُنکو اطلاع دی گئی۔ اُنکی جماعت کے اکثر لوگ آکر نماز جنازہ میں شریک ہوے اور اپنے افغانی بھائی کو اخیر منزل تک پہونچا آئے۔

۶- جون روز چہارشنبہ | ہمارے قافلہ کا کچھ حصہ بیر شیخ میں یہ سنکر ٹھہر گیا تھا کہ بیر حسانی میں قافلہ روکا گیا ہے۔ آج وہ بھی اُس قافلہ سے آملا۔ میر صاحب کا جو سامان اُنکے جمال کے کوتل اونٹ پر بندھا رہتا تھا اُس میں ایک ٹین گھی کا بھی تھا۔ یہ کسی صورت سے ٹوٹ گیا اور سارا گھی بہ گیا۔ بیر حسانی میں جب اس سے آگاہی ہوئی تو میر صاحب بہت پریشان اور اپنے جمال سے ناخوش ہوے۔ مگر کرتے کیا۔ بازار میں بہت تلاش کیا کہیں گھی نہ ملا۔ ۲ مجیدی فی شغدف کے حساب سے بدوؤں کی نذر کرکے بیر حسانی سے بعد ظہر روانہ ہوے۔ قافلہ میں بعض لوگ اس زائد خرچ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اس لیے اُنھوں نے اپنے شغدف یہیں چھوڑ دیے اور اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوے۔ خالی اونٹوں سے جن پر شغدف یا شبری نہ ہو بدو کچھ نہیں لیتے۔ نصف شب کے بعد ایک پتلی وادی میں جسکے دونوں جانب بلند پہاڑیاں ہیں قافلہ ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ آج بھی میرا اونٹ ساتھیوں سے الگ ہو گیا ہے۔ جمال پر غصہ تو بہت آیا مگر میدان کی تنگی اور راستے کی ناہمواری کی وجہ سے ستورہ کی طرح یہاں اس کا موقع نہ تھا کہ ساتھیوں کو تلاش کرتا اس لیے مجبور ہو کر رات وہیں بسر کی۔ اس مقام کا نام شفاعیہ یا شفنیہ بتایا گیا۔

۷- جون روز پنجشنبہ | صبح کو مترجم نے کہدیا کہ میر صاحب کے جمالوں کا مکان یہاں سے قریب ایک دوسری سمت میں ہے اور وہیں وہ چلے گئے ہوں گے۔ اس لیے تلاش بے سود سمجھی گئی۔ یہاں کوئی بازار بھی نہ نظر آیا اس وجہ سے کھچڑی پر قناعت کی۔ مگر کھانا کھا کر جب میں نکلا تو قریب ہی میر صاحب کے شغدف مل گئے۔ راستہ ایسا تنگ تھا کہ شغدف وہاں نہ لایا جا سکتا تھا اس لیے خاموش ہو رہا۔ اور جمال کو بخشش دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ عصر کے بعد قافلہ روانہ ہوا تو ایک بلند پہاڑی پر چڑھنا پڑا۔ جب پہاڑی طے کرکے مسطح میدان میں تھوڑی دیر چلے ہونگے تو یہ اطلاع ملی کہ آگے بدو راستہ روکے پڑے ہیں۔ ناچار کچھ دیر رُکے رہنے کے بعد قافلہ پھر اپنی جگہ پر واپس آیا۔ اب سب ساتھی پھر یکجا ہو گئے۔ اور رات وہیں بسر ہوئی۔ مترجم نے بہت کچھ گفت و شنید کے بعد کچھ روپے مجھ سے قرض لیکر بدو کو دیدیے۔

۸- جون روز جمعہ | آج معلوم ہوا کہ عوفیوں کے قبیلہ نے ساڑھے پانچ مجیدی فی شغدف طلب کیے

ہیں۔ دن میں اور قافلہ والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ خصوصاً حیدر آباد کے قافلہ میں ہمارے لکھنؤ کے ایک کرم فرما تھے اُن سے ملا۔ حیدر آباد کے قافلہ سالار ایک تونسی عرب تھے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ چاے پلائی۔ اور بہ اصرار کہا کہ جس قسم کی ضرورت ہو بے تکلف کہیے۔ رقم مطلوبہ ادا کر کے بعد نمازِ ظہر روانہ ہوے۔ پہاڑی طے کر کے جب مسطح میدان میں آگئے تو میرے جمال نے پھر اونٹ کو ساتھیوں کے اونٹ سے جدا کر کے اُن جاویوں کے اونٹوں سے جا ملایا جو اُسکے دوسرے اونٹوں پر سوار تھے۔ مجھے یہ امر بہت ناگوار گذرا کہ مستورہ میں اور پھر شفعیہ میں پختہ عہد و پیمان ہو جانے کے باوجود جمال نے مجھے میرے ساتھیوں سے جدا کر دیا۔ چونکہ دن کا وقت تھا اس لیے مجھکو فوراً خبر ہو گئی۔ اب میں نے اپنے جمال کے خلاف ستیاگرہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میرے ساتھی رحمت شاہ کو چونکہ برابر پیچش ہو رہی تھی اس لیے اُنھیں تو میں نے اُترنے کا مشورہ نہیں دیا مگر میں خود اونٹ سے اُتر پڑا۔ اور اپنے ساتھیوں کے اونٹوں کے پاس پہونچ گیا۔ مترجم اور جمال دونوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ مجھ کو پیدل چلنا گوارا ہے مگر اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بالآخر جمال کو اپنی ضد چھوڑ کر اونٹ وہیں لانا پڑا اور میں پھر سوار ہو کر روانہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمّال نے پھر اونٹ کو جدا کر دیا۔ میں پہلی دفعہ پیدل چلنے کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا اس لیے چُپ ہو رہا۔ کچھ وقفہ کے بعد عصر کی نماز کے لیے اونٹ سے اُترا اور نماز پڑھکر جب دوبارہ اونٹ پر سوار ہونے لگا تو عجیب اتفاق ہوا۔ ہمارا اونٹ ذرا رُکا، جس سے آگے والے اونٹ کو بھی جس پر جاوی سوار تھے رُکنا پڑا۔ وہ اونٹ بدمزاج تھا، اس لیے بگڑ گیا۔ اور ایسا بگڑا کہ باوجود جمال اور اُسکے بھائیوں کی کوشش کے قابو میں نہ آیا اور قافلہ سے الگ ہو کر اُس نے شقدف کو گرا دیا جس سے اُن جاویوں کے سخت چوٹ آئی جو اُس پر سوار تھے۔ اس پر جمال اور اُسکے بھائی مجھ سے بہت بگڑے اور غصہ میں بہت کچھ سخت وسُست کہا۔ اور ایک نے تو تلوار نیام سے ذرا باہر کر کے مجھے دھمکایا۔ جاویوں کے جو مترجم صاحب تھے وہ بھی طیش میں آکر میری طرف دوڑ کے آئے اور لگے سخت کلامی کرنے۔ تو میں نے اُن کو اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ڈانٹا۔ اور کہا کہ آپ اپنی راہ لیں مجھ سے کچھ آپ کا تعلق نہیں ہے۔ آخر اُنکے ہوش درست ہو گئے تو وہ جمالوں پر خفا ہوے اور اُنھیں مجبور کیا کہ میرے اونٹ کو کھول کر میرے ساتھیوں کے اونٹوں کے ساتھ ملا دیں۔

مغرب کے بعد قافلہ پھر رکا۔ میر صاحب کا اونٹ ذرا آگے تھا اُنھوں نے مجھے بُلوایا اور مقوم کا یہ پیام سُنایا کہ دو مجیدی فی شندف یہاں راستے میں بدوؤں کا امیری قبیلہ طلب کررہا ہے۔ میں اسکو مقومین کی شرارت سمجھتا تھا، کیونکہ مانگنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اسلیے میں نے رقم دینے میں عذر کیا۔ جس پر مقوم صاحب آئے اور اُنھوں نے کہا کہ جو رقم نہ دے گا اُس کا شندف یہیں چھوڑدیا جائیگا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ میرا شندف یہیں چھوڑ دیجیے۔ مگر میرے پاس مجیدیاں نہیں ہیں اور یہ واقعہ تھا کہ شفعیہ میں مجیدیاں دیدینے کے بعد اب میرے پاس کوئی مجیدی باقی نہیں رہی تھی بہرحال میر صاحب نے ہم سبھوں کی طرف سے مجیدیاں دیدیں۔ عشاکے اول وقت کچھ فاصلہ پر روشنی دکھائی دی تو ہم سمجھے کہ منزل آگئی۔ مگر کہیں دو تین گھنٹے کے بعد تراع یا تراہ پہونچے۔ معلوم ہوا کہ ہم بلندی پر تھے اور تراہ نشیب میں تھا اس لیے روشنی دُور سے دکھائی دینے لگی تھی۔

۹-جون روز شنبہ | صبح کو حسب معمول بازار کی طرف رُخ کیا۔ یہاں کوئی باقاعدہ بازار اگرچہ نہیں ہے تاہم ایک جانب بلندی پر بہت سی دوکانیں نظر پڑیں۔ کنواں یہاں ایک ہی ہے اس لیے پانی گراں ملا۔ رحمت شاہ کو پیچش کی شکایت تو کئی روز سے تھی لیکن یہاں پہونچکر تکلیف بڑھ گئی۔

دن بھر خوب گرمی رہی اور لُو بھی چلی۔ کچھ قافلہ بیرعباس میں ٹھہرا ہے جو تراہ سے شاید کوس بھر کے فاصلہ پر ہوگا۔ ہمارا جمّال عبدالرحمن کل سے جو بگڑا ہے تو اُس نے نہ شام کو معمول کے مطابق کھانا لیا اور نہ آج دوپہر کو آیا۔ کھانا نکال کر اُسکے لیے رکھدیا گیا۔ اُس نے اپنے بھائی کو بھیجا۔ مگر جب اُس سے کہا گیا کہ عبدالرحمن کو بھیجدو یا اپنے برتن لاؤ تو وہ بھی جاکر بیٹھ رہا۔ مجھے تمباکو پینے اور کھانے کی عادت دیرینہ ہے۔ حُقہ یا چرٹ کا استعمال کیے بغیر قبض ہوجاتا ہے۔ اس واسطے برسوں کا معمول ہو کہ صبح کو لازمًا تمباکو پیتا ہوں۔ البتہ جیل میں یہ تجربہ ہوا کہ دماغی محنت نہ کرنا ہو یا کم پڑے اور مشقی یا ورزش کرنے کا موقع ملے تو پھر تمباکو کی حاجت نہیں۔ چنانچہ فتح گڈھ جیل میں باوجود سرکاری اجازت اور سامان کی موجودگی کے میں نے تقریبًا ڈیڑھ سال تک حُقہ نہیں پیا۔ بمبئی سے روانہ ہوتے وقت میں نے کئی بکس چرٹ کے لے لیے تھے۔ جو جہاز پر اور مکہ معظمہ میں برابر استعمال کرتا رہا۔ جب مدینۂ منورہ کی روانگی کا وقت آیا تو میں نے تہیہ کیا کہ اس سفر میں چرٹ یا سگریٹ کا استعمال نہ کروں گا۔ مگر بعد کو اس خیال سے کہ بدو سگریٹ کے عادی اور شائق ہیں میں نے اپنے بدو کے لیے ایک پاؤنڈ

تمبا کو اور سگریٹ بنانے کا کاغذ لیکر رکھ لیا۔ راستہ میں برابر عبدالرحمٰن اور اُسکے بھائیوں کو تھوڑا تھوڑا دیتا رہا۔ یہاں عبدالرحمٰن تو نہیں مگر اُسکا بھائی عبدالعبیر تمبا کو مانگنے آیا تو میں نے کہا کہ کل تو تم لوگ مجھے گالیاں دے رہے تھے آج تمبا کو مانگنے آئے ہو؟ اس پر وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔ شام کو کچھ قافلہ اور آکر اُترا اور یہ خبر معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کو بیرحسانی سے اس وقت تک کل ۸ مجیدیاں فی شغدف دینا پڑیں۔ جن میں سے تین ابھی مقوموں کے پاس جمع ہیں جو یہاں دی جائیں گی۔ حالانکہ ہم ۹½ مجیدیاں فی شغدف دے چکے تھے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ دو جاویوں کو راہ میں مجیدیاں نہ دینے کی بنا پر بندوق سے مار دیا۔

۱۰۔ جون روز یکشنبہ آج صبح کو ضیاءالاسلام صاحب کو تلاش کیا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ اُن کے پاس دواؤں کا کافی ذخیرہ ہے اور کچھ طبابت میں بھی اُنکو دخل ہے۔ جب وہ نہ ملے تو حیدرآبادی قافلہ میں جاکر حکیم غلام احمد مدنی کو جو اُس قافلہ کے طبیب تھے لایا اور رحمت شاہ کو دکھایا۔ ضیاءالاسلام صاحب کی تلاش میں مختلف پڑاوں پر جانا پڑا۔ کل جو نیا قافلہ آیا تھا اُس میں بعض میرے جہاز کے بنگالی ہمراہی بھی تھے جن سے اب ملاقات ہوئی۔ وہ بیحد پریشان و مضطرب نظر آئے بہت سمجھایا بجھایا تب اُنکی تسلی ہوئی۔ حکیم صاحب نے صبح کو ایک دوا دی تھی مگر کچھ نفع نہ ہوا۔ شام کو دوسری دوا دی۔ مگر رات بھر غریب کو دست آتے رہے اور سخت اُلجھن رہی۔

۱۱۔ جون روز دوشنبہ آج حکیم صاحب نے رحمت شاہ کو پھر دیکھا۔ اب اُنکو بخار تھا۔ مگر حکیم صاحب نے غسل تجویز کیا۔ اور دوا بدل دی۔ غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت کچھ سنبھلی۔

بدو کا مزاج خدا خدا کرکے اب درست ہوا۔ تو اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دو دن کے کھانے کی قیمت دی جائے۔ مگر یہ خلافِ انصاف تھا اس لیے اُس نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا۔ اور دونوں وقت کا کھانا لیکر راضی ہو گیا۔ جسکے بعد پھر ہمارے تعلقات دوستانہ ہو گئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ قبیلۂ ظواہر کے لوگ ایک مجیدی فی شغدف پر راضی ہو گئے ہیں مگر احمدی قبیلہ سے ابھی تک کچھ تصفیہ نہ ہو سکا۔ اس لیے ابھی قیام رہے گا۔ وادی فاطمہ اور بیرحسانی پر ایک ایک روز زیادہ ٹھہرنا ہی کچھ کم ناگوار نہ گذرا تھا کہ نہ صرف منزل مقصود پر پہونچنے میں دیر ہو رہی تھی بلکہ میری تمنا یہ تھی کہ آستانۂ رسالت پناہی پر ایک ماہ تک حاضر رہوں۔ اور جتنی دیر راہ میں ہوتی تھی اُسی قدر میری حاضری

کے دنوں میں کمی ہونے کا احتمال تھا۔ اس وجہ سے مجھ پر یہ تاخیر بہت شاق تھی۔ مگر بے بس تھا۔ قافلہ میں ایک ہنگامہ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے بدوؤں میں عجب شور و غوغا رہا۔ کنوئیں پر جو تکروری (حبشی) پانی بھرتے تھے اُن سے اور ایک جمال سے کسی بات پر تکرار بڑھی۔ زبانی تو تو میں میں کے بعد مار پیٹ کی نوبت آگئی۔ یہاں تک کہ ایک بدو کی تلوار نے اُس تکروری کو واصل بحق کردیا۔ بہت سے با اثر بدوؤں اور مقوموں کے درمیان میں پڑنے سے اُسوقت تو تصفیہ ہیں ختم ہوگیا مگر رفتہ رفتہ یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ تکروریوں کی جماعت کثیر انتقام لینے کے منصوبے کر رہی ہے۔ اب جہاں دیکھیے کچھ لوگ بیٹھے اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جمالوں کی ٹولیاں الگ اسی مبحث پر بحث و گفتگو میں مصروف ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جذباتِ انتقام زیادہ اُبھرتے نہ پائے اور پھر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

اتفاق سے آج میری طبیعت بھی کسی قدر بدمزہ رہی۔ کھچڑی ذرا کچی رہ گئی تھی۔ شام کو حیدرآبادی قافلہ میں اپنے لکھنؤ کے کرم فرما فقیر محمد خاں صاحب کے پاس گیا تو اُنکے ایک دوست نے فروٹ سالٹ اور ست لیموں کا شربت پلا دیا۔ جس سے طبیعت ٹھیک ہوگئی۔

۱۲۔ جون روز سہ شنبہ | آج اطلاع ملی کہ پندرہ مجیدی فی شنذف یہاں دینا ہوں گے جن میں سے ایک مجیدی قبیلۂ ظواہر کی جس کی خبر کل ملی تھی، ۱۳ مجیدیاں احمدیوں کےلیئے اور ایک اماناً مقوم کے پاس رہے گی کہ راستے میں بیر درویش اور مدینۂ منورہ کے درمیان کے بدوؤں کو دی جائے۔ ہم لوگوں کے پاس نہ اب مجیدیاں باقی تھیں نہ روپئے۔ حیدرآباد کے قافلہ سالار عبداللطیف تونسی نے شنفعیہ میں چونکہ یہ کہا تھا کہ روپیہ کی حاجت ہو تو ہم قرض دیدیں گے۔ اس لیے اُن سے صورت حال بیان کی مگر اُنکے پاس صرف دو اشرفیاں نکلیں، جن سے ہمارا کام نہیں نکل سکتا تھا۔ مجبوراً جمالوں کی جو اشرفیاں مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت ہمارے سلم کے وکیل عبدالرحمٰن بشناس نے اماناً میر صاحب کے پاس رکھا دی تھیں اور جو انھیں مدینہ منورہ پہونچکر دینا تھیں اُنکو بھنا کر دس مجیدی فی گنی کے حساب سے لیں اور مقوم کے حوالہ کیں۔ ہمیں تبادلہ کے اس نرخ سے بہت نقصان پہونچا مگر کیا کرتے سوا اسکے کوئی چارہ نہ تھا۔ اور جتنے ملنے والے تھے وہ اس قافلہ میں نہ تھے۔ رحمت شاہ دوپہر تک اچھے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ اُلجھن بڑھنے لگی اور شام تک بدحواسی بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ نصف شب کے بعد اچھی خاصی سرسامی حالت ہوگئی اور بیہوشی کے عالم میں وہیں بستر پہ دست آتے رہے۔ اُن کی

اس حالت کی وجہ سے رات بھر ہم لوگ سخت پریشان رہے اور میں تو بالکل نہ سو سکا۔
۱۲۔جون روز چہار شنبہ | آج سورت کے ایک حکیم صاحب کو بُلا کر لایا۔ اور حضرت شمس المشائخ سے جاکر اس پریشانی کا ذکر کیا تو اُنھوں نے ایک تعویذ مرحمت فرمایا۔ حکیم صاحب نے ازراہِ لطف دوا بھی عنایت کی۔ صبح کو غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت ذرا ٹھہری ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے دھوپ بڑھتی گئی طبیعت بگڑتی گئی۔ بعد ظہر جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو وہ شقدف سے باہر نکلے اور بیدم ہوکر زمین پر لیٹ گئے۔ مُنہ میں پانی ٹپکانے سے کچھ طبیعت اُبھری تو کئی آدمیوں نے مل کر انکو بمشکل شقدف پر سوار کیا۔ قافلہ روانہ ہوا اور عصر کے وقت بیر عباس پہونچ کر رُک گیا۔ اب جو شقدف سے رحمت شاہ کو اُتارنا چاہا تو انکی حالت متغیر نظر آئی۔ لہذا اونٹ کو بٹھاکر شقدف وہیں کھولدیا گیا۔ اور میں ضیاءالاسلام صاحب کی تلاش میں دوڑا گیا۔ وہ ملے تو بہت متاسف ہوے۔ مگر اب اُنکے پاس دواؤں کا ذخیرہ ختم ہوچکا تھا اس لیے کہ سولہ سترہ دن میں بکثرت لوگ بیمار ہوے اور وہ ہر اُس شخص کو جو اُن تک پہونچا برابر دوا دیتے رہے تھے۔ بہرحال اُنھوں نے تھوڑا سا جواہر مہرہ دیا کہ اسکو پلانے سے طبیعت اُبھر آئے تو پھر علاج کی فکر کی جائے۔ لیکن بمشکل چند قطرے حلق سے اُترے ہونگے کہ روح نے قالبِ خاکی سے جدائی اختیار کی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔
میرے لیے یہ تمام دن کلفت و پریشانی کے تھے۔ لیکن جب تک امیدِ حیات باقی تھی باوجود اپنے ضعف و بے سروسامانی کے جو کچھ بن پڑا کرتا رہا۔ مگر خدا کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔ ہمارے مختصر قافلہ میں متعدد ایسی ضعیف، ناتوان اور مریض عورتیں تھیں جنکو حرکت کرنا مشکل تھی اور معمولی حاجات ضروریہ کے رفع کرنے کے لئے دوسروں کی مدد درکار ہوتی تھی۔ مگر موسم کی سختی، سفر کے صعوبات سب کچھ جھیل گئیں۔ اور یہ نوجوان جو اپنی جسامت اور توانائی کے لحاظ سے ایسا نمایاں تھا کہ جہاز پر اور نیز اس سفر میں ہر شخص کی نگاہ اس پر پڑتی تھی آٹھ روز کے اندر ختم ہوگیا۔ العظمۃ للّٰہ۔ میری ہمت نے اگرچہ فی الواقع اب جواب دیدیا تھا لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اپنے رفیق کی لاش کو ساتھیوں کے سر چھوڑ کر میں بیٹھ رہتا۔ لہذا پھر ہمت باندھکر تجہیز و تکفین کے لیے اُٹھا۔ ضیاءالاسلام صاحب جس قافلہ میں تھے اُسی میں ہمارے اودھ کے کچھ لوگ تھے جن میں دو ایک حجام بھی تھے۔ انکو بلا کر غسل دلوایا۔ ایک تکروری نے قریب ہی قبر کھودی۔ ساتھیوں میں سے مبین خان نے کفن عنایت کیا۔ اور بالآخر عشا کے بعد غریب رحمت شاہ کو سپرد خاک کردیا۔

نظرے خوش گذرے

ایک عزیز اطلاع دیتے ہیں کہ رسالہ زمانہ بابت ماہ مئی ۱۹۲۳ء میں اعظمی صاحب نے جو تنقید حضرت احسن مارہروی کی کتاب تخمیس پر لکھی ہے اُس میں ایک غلطی یہ کی ہے کہ کتاب کے شروع میں جو مقدمہ ہے اُسکو بھی احسن صاحب کا نتیجۂ طبع سمجھا۔ حالانکہ دراصل وہ جناب منشی امیر احمد علوی بی اے کا ایک مضمون تھا جو مدت گذری احسن صاحب کے رسالۂ فصیح الملک میں شایع ہوا تھا۔ اور اسکی صراحت تخمیس میں کر دی گئی ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو اعتراف کرنا چاہیے کہ تنقید نگار صاحب سے ایک بڑی فروگذاشت ہوگئی ہے۔ مگر یہ زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ لاہور کے ایک رسالہ نے جس کا جوشِ شباب ہر مہینہ نئے نئے رنگ میں جلوہ افروز ہوتا رہتا ہے حال ہی میں فن تنقید میں ایک نئے اجتہاد کی طرح ڈالی ہے۔ یہ رسالہ چشم بد دور وائسرائے ہند، گورنران صوبہ، اور والیانِ ریاست کی طرح ایک وسیع اسٹاف رکھتا ہے۔ جسکے ارکان کے اسمائے گرامی ہر ماہ رسالہ کے سرورق پر صف آرا کیے جاتے ہیں۔ مئی کے پرچہ میں اُنکی تعداد بشمول اسسٹنٹ ایڈیٹر حصہ نسواں نصف درجن ہے اور پھر بھی ایک جگہ خالی رہ گئی ہے۔ اگر کوئی صاحب اپنا نامِ نامی درج کرانا چاہیں تو ہم اپنے معاصر سے بجوشی سفارش کرنے کے لیے تیار ہیں کہ جب تک کوئی دوسرا مستحق امیدوار نہ پیدا ہو نقطوں کی جگہ ان صاحب کا نام درج کر دیا جائے۔

اسی پرچہ میں ایک فاضل جائنٹ ایڈیٹر صاحب نے جو ماشاءاللہ ایم اے، ایل ایل بی وکیل" سب ہی کچھ ہیں، شذرات کے زیر عنوان تاریخ عرب مصنفہ موسیو سیدیو پر سطور ذیل میں اپنی رائے گرامی، ریویو، یا تنقید تحریر فرمائی ہے:۔

"ہم اپنے معزز و ممتاز ہمعصر جناب ظفر الملک علوی ایڈیٹر "الناظر" لکھنؤ کے نہایت مشکور رہیں کہ آپ نے کتاب خانہ شباب کو ایک جلد تمدن ہند عطا فرمائی۔ اسے ایک فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاولی بان کی اصل تصنیف سے شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم ایم اے۔ جیسے فاضل ہندی عالم نے ترجمہ کر کے تمدن ہند نام رکھا ہے۔ ہمارے خیال میں ایسی جامع کتابیں آج تک بہت کم لکھی گئی ہیں۔ یہ ایک آئینہ ہے۔ جس میں ہندوستان کی تاریخ قدیم و جدید ایک مجسم صورت میں نظر آجاتی ہے

قیمت قسم خاص مجلد چرمی سات روپیہ آٹھ آنہ ہے۔ اور قیمت عام مجلد پانچ روپیہ ہے۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے دستیاب ہوگی"۔

اس تحریر میں صرف ابتدائی اور آخری سطریں اُس کتاب سے تعلق رکھتی ہیں جس پر اظہار رائے کیا گیا ہے، باقی ساری عبارت "ایک آئینہ ہے" جس میں ہمارے معزز معاصر کے عہد شباب کی شوریدگی و بدمستی "مجسم صورت میں نظر آجاتی ہے"۔ رسالہ کے سرورق پر اگر فارسی کا یہ شعر بھی لکھ دیا جائے تو بہت مناسب حال ہوگا:

ساقیا مرنج از من، عالم جوانی ہاست   گہ نہم سبو بر سر، گہ بہ پائے خود رقصم

مئی کے الناظر میں صفحہ ۱۶ پر حضرت تپش خورجوی کی ایک غزل تھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا

کرتا ہوں تصور میں شغل زلف سے تیری

شغل میں "غین" کی حرکت کے متعلق ایک صحبت میں گفتگو آئی تو متعدد سخن سنج و سخن فہم احباب نے اسکو غلط بتایا۔ پرچہ چھپ چکا تھا لہذا اشتہار کے صفحات میں جگہ نکال کر ایک نوٹ لکھدیا گیا۔ تپش صاحب نے اُس نوٹ کو ملاحظہ فرما کر غیاث اللغات کا حوالہ دیا۔ غیاث اللغات کے علاوہ صراح بھی اُن کے دعوے کی مؤید ہے۔ اور ہم اس سند کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن تپش صاحب غالباً اسے تسلیم کریں گے کہ یہ صورت نامانوس ہے اور اساتذۂ اُردو نے "غین" کی حرکت کو پسندیدہ نہیں سمجھا۔ اگر وہ اساتذہ کے کلام سے بھی کوئی سند پیش کر سکیں تو بہتر ہے۔ جن احباب نے شغل کی حرکت کو غلط بتایا تھا اُنکی رائے بھی معلوم ہونا چاہیے۔

لکھنؤ میں جو انجمن اُردو بنائی گئی ہے اُسکے متعلق الناظر کے کسی نمبر میں اپنے معروضات پیش کر چکا ہوں۔ اُسکے بعد انتخاب عہدہ داراں کی منزل آئی اور جس بات کا ابتدا ہی سے اندیشہ تھا وہی ہوا یعنی ایسے اشخاص کا انتخاب کیا گیا جو اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے۔ شمس العلما مولوی کمال الدین ایم اے پروفیسر عربی لکھنؤ یونیورسٹی بہت واجب الاحترام ہیں مگر انجمن اُردو کی معتمدی کے لیے موزوں نہ تھے۔ اسی طرح جناب عبداللہ یوسف علی آئی سی ایس انگریزی کے مشہور ادیب ہیں مگر انجمن اُردو کی صدارت کے لیے اس سے زیادہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال شمس العلما صاحب ترقی پاکر اپنے وطن مشرقی بنگالہ میں پہونچ گئے ہیں اور اب اُنکی جگہ ہمارے شہر کے فاضل ادیب جناب مرزا محمد عسکری بی اے کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ صاحب موصوف ایک خاموش کام کرنیوالے بزرگ ہیں اس لیے اُمید ہے کہ بہت جلد انجمن اُردو اُنکی توجہ سے ایک کام کی مجلس بن جائے گی۔

الناظر کا مستقبل

جون کے الناظر میں جو معروضات پیش کیے گئے تھے خدا کا شکر ہے کہ بے نتیجہ نہیں ثابت ہوے اور قدردانانِ الناظر میں سے متعدد اصحاب نے فوراً توجہ فرمائی۔ چنانچہ اعدادِ ذیل سے اُن کے مساعیِ جمیلہ کا اندازہ ہوجائے گا:-

۱	مولوی سید ہاشمی فرید آبادی	نے اب تک	۳	خریدار دیے ہیں
۲	مولوی محمد مسلم عظیم آبادی	"	ایک	"
۳	مولوی عبدالماجد دریابادی	"	۲	"
۴	نواب جعفر علی خاں آثر لکھنوی	"	۳	"
۵	منشی یوسف علی قدوائی سندیلوی	"	۲	"
۶	منشی محمد ظفر وکیل گرگانوہ	"	۴	"
۷	مسٹر ظفر عمر بی اے	"	۵	"
۸	مولوی محمد سلیمان رئیس بدایوں	"	۳	"
۹	قاضی غلام امیر مختار بدایوں	"	۱	"
۱۰	مسٹر سلطان حیدر جوش	"	۷	"
۱۱	مولوی معشوق حسین خاں	"	۱۲	"

اور اُمید ہے کہ آیندہ اور نام بھیجیں گے۔

انکے علاوہ مولوی محمد حبیب اللہ ایم اے، جناب عزیز لکھنوی، مسٹر بدرالحسن رودولوی، سید اظہر علی ایم اے دہلوی، وامق بدایونی، قاضی تلمذ حسین ایم اے نے خریدار فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

لیکن ابھی بہت سے اصحاب کی توجہ اس طرف منعطف نہیں ہوئی ہے۔ خصوصاً اُن حضرات سے خاص توجہ کی استدعا ہے جنھوں نے الناظر کے ابتدائی دور میں اسکے ساتھ گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا تھا۔

ناظرینِ الناظر کو مخاطب کرنے کے علاوہ میں نے ایک گشتی عریضہ اُن معاصرین کرام اور قلمی معاونین کی خدمت میں بھی بھیجا تھا جو الناظر کو سالہا سال سے مطالعہ فرماتے رہے ہیں۔ ان اصحاب سے الناظر کے متعلق اُن کی رائے گرامی دریافت کی گئی تھی اور نیز مشورہ طلب کیا گیا تھا کہ الناظر کو بہتر اور مفید تر بنانے کے لیے کیا مزید فکر کرنا چاہیے۔ بعض اصحاب نے مصلحتاً یا اتفاقاً جواب نہیں لکھے۔ مگر اکثر اصحاب کے جوابات وصول ہوئے اور دو صاحبوں نے میرے اُس خانگی مراسلہ کو اپنے اخبارات میں بھی شایع کر دیا۔ سب صاحبوں نے الناظر کو قائم رکھنے کی ضرورت ظاہر کی، بعض نے اسکی خدمات کو میری توقعات سے بہت زیادہ سراہکر حوصلہ افزائی فرمائی، بعض نے مناسب نکتہ چینی فرماکر مفید اور کارآمد مشورے دیے۔ اور ایک صاحب نے جو الناظر کی ایک تنقید سے صد درجہ بیزار ہیں الناظر کے وجود کو قطعاً ناقابلِ برداشت قرار دیا۔ میں ان سب اصحاب کا بہ دل ممنون ہوں اور متوقع ہوں کہ جن حضرات نے اب تک جواب نہیں بھیجے ہیں وہ اب توجہ فرمائیں گے۔

احباب کی ہمدردی و توجہ نے الناظر کو قائم رکھنے اور پہلے سے زیادہ مفید بنانے کا ولولہ پھر پیدا کر دیا ہے۔ اور اب میں ہمیشہ سے زیادہ الناظر کی خدمت پر متوجہ ہوں۔ خدا کی مرضی ہے تو تھوڑے ہی دنوں میں نہ صرف الناظر کی مالی مشکلات رفع ہو جائیں گی بلکہ اُسکی ظاہری و معنوی حالت بھی پہلے سے بہتر و برتر ہو جائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ایک کرم فرمانے اُس تحریر کو پڑھکر یہ اندیشہ کیا کہ الناظر دفعتًہ بند نہ کر دیا جائے۔ اور تحریر فرمایا کہ ایسی صورت میں توسیع اشاعت کی کوشش میں کیا کامیابی ہو سکتی ہے۔ جو پرچہ بند ہونے والا ہو اُسکا خریدار کوئی کیوں بنے۔ ان صاحب کی تشفی کے لیے خانگی تحریر کافی ہوگی مگر ممکن ہے کہ اور اصحاب کے دل میں اسی قسم کے خیالات پیدا ہوے ہوں لہذا اُنکے دفعیہ کے لیے بصراحت عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میری تحریر کا یہ منشا نہیں کہ مالی پریشانیوں سے تنگ آکر الناظر کو بند کر دینا چاہتا ہوں بلکہ مقصود صرف یہ تھا کہ میرے احباب قدر دانانِ الناظر اس صورت حال سے مطلع ہو کر اُس وقت کے آنے سے پہلے کہ پانی سر سے گذر جائے الناظر کے بقا و استحکام کی کوشش میں میرا ہاتھ بٹانے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور مجھے اُمید کامل ہے کہ جن اصحاب نے ابتک توجہ نہیں فرمائی ہے وہ اس ابتدائی کامیابی کا حال پڑھکر بخیلے نہ ہو جائیں گے۔ توسیع اشاعت کی کوششوں کے نتایج اوپا انشاءاللہ درج الناظر ہوتے رہیں گے تا آنکہ الناظر کی طرف سے اطمینان کلی حاصل ہو جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۵۸ جلد ۲۷ — اگست سنہ ۱۹۲۴ء

فیہ مافیہ

(از: چلبی)

دیرآمدی اے نگارِ سرمست!

رئیس صحافت، محمد علی نے بالآخر ایک بار پھر قلم ہاتھ میں لینے کا تہیہ کر لیا۔ ممکن ہے، کہ سطور ہذا کے وقتِ طبع تک ہمدرد و کامریڈ کی باقاعدہ اشاعت شروع بھی ہو چکی ہو۔ لُو کی لپیٹ اور گرمی کی تپش کے بعد پانی کا چھینٹا کس قدر خوشگوار ہوتا ہے! برسات کی اُمس اور حبس کے بعد ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے کیسی نعمت ثابت ہوتے ہیں! اس وقت قوم جس انتشار میں مبتلا ہے، طبائع میں جو افسردگی پیدا ہو گئی ہے، اخباری دُنیا جس بدمذاقی کا شکار ہو رہی ہے، قلوب جس ردِ عمل سے متأثر ہو رہے ہیں، مخالفین کا پروپیگنڈا جس قوت و اہتمام کے ساتھ جاری ہے، بدی پر پردہ ڈالنے، اور نفسانیت پر وارنش کرنے کی جو پیہم و سرگرم کوششیں عمل میں آ رہی ہیں، ان تمام حالاتِ مخالف و کیفیاتِ ناموافق کے درمیان، یہ مژدہ کس قدر روح نواز و جاں پرور ثابت ہوگا، کہ کوچہ چیلاں، دہلی، کا اُجڑا ہوا نشیمن ایک بار پھر آباد ہو رہا ہے۔ اب پھر

وہی جام ہوگا وہی صراحی، وہی محفل وہی ساقی، وہی ذوق وہی خمار، وہی سوز وہی گداز، پس پاک ہے وہ ذات، جو مُردہ کو زندہ کرتی ہے، تاریکی کو نور سے تبدیل کرتی ہے، اور مایوسیوں کے بعد اُمید کو پھر تازہ کرتی ہے! فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔

جو خوش نصیب ہمدرد کا مریڈ کے شیفتگان قدیم میں ہیں، وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں، کہ نقاش کا "نقش ثانی" "نقش اوّل" سے کتنا بہتر و محبوب ہوگا۔ نوگرفتاروں کو یہ سمجھ لینا کافی ہوگا، کہ دونوں پرچوں کی ادارت اُس شخص کے ہاتھ میں ہوگی جسے اللہ نے اپنے فضل و کرم سے دل و دماغ دونوں کی اعلیٰ قوتوں کا جامع بنایا ہے، جو انگریزی و اُردو دونوں کے ادب و انشا کا مالک ہے، جسکے کمالِ فن کا اعتراف صحافتِ انگلستان کے بہترین ناقدین کر چکے ہیں، اور جو ایک ہی وقت میں قوم کا خادم بھی ہے اور مخدوم بھی، ناصح تلخ گفتار بھی ہے اور یارِ غمگسار بھی۔ قوم کی بدنصیبی ہوگی، اگر اس مخلصِ چارہ ساز کی عملی قدردانی دل کھول کر نہ کی گئی۔ آسمانِ صحافت کے یہ آفتاب و ماہتاب بڑے اشتیاق و انتظار کے بعد طلوع ہورہے ہیں، نہ ہو کہ خدانخواستہ غروب ہونے میں عجلت کر جائیں۔ ع

زود رفت نہ دہیم دامن از دست

"رُوگروہ از ما یک طرف" کامریڈ و ہمدرد کے اجرا کے تذکرہ کے ساتھ ذہن قدرۃً اُن احباب کی جانب منتقل ہوتا ہے، جو کل تک "یارانِ بزم" تھے، اور آج "حریفانِ رزم" کی حیثیت سے صف آرا ہو رہے ہیں۔ کل تک جنکی زبانیں مہاتما جی کا کلمہ پڑھنے میں مصروف تھیں، آج اُنھیں کے ہاتھوں میں علمِ بغاوت بلند ہے۔ کل تک جنکا فتوےٰ تھا، کہ کونسلوں میں شرکت معصیتِ کبیرہ ہے آج اُنھیں اس "معصیت" پر سکوت نہیں، اصرار ہے۔ اس جمعیت عالیہ کے سالار لشکر، جو الہ آباد کے ایک نامور ہندو لیڈر ہیں، سُنا ہے کہ کامریڈ و ہمدرد کے "زہر" کے لیے تلاش تریاق میں ہمہ تن سرگرم کار ہیں، اور بمبئی کرانیکل کو اپنا بنا چکے ہیں۔ کلکتہ، پہلے ہی سے اُنکا تھا، چلیے بمبئی بھی اُنکا ہوگیا، کلکتہ و بمبئی کے بعد دہلی اور لکھنؤ کی باری آئی، اور چشم فسوں ساز کی ایک گردش سے ان مقامات

کی بھی ممتاز انگریزی و اُردو صحافت اس جماعت کی "زر خرید" بن گئی۔ ایک طرف ان روٹھے ہوئے، اور یارانِ قدیم کی طرف سے مُنہ پھیرے ہوئے،

انگندہ کاکل یک طرف، زلفِ چلیپا یک طرف

دوستوں کا دَل بادَل لشکر صف بستہ ہو رہا ہے، جسکے پاس سرمایۂ و تنظیم جیسے زبردست وکارگر آلاتِ حرب موجود ہیں، دوسری طرف کا مرٹڈ و بے یارو مددگار ہیں، جن کے پاس بجز توکل و حق پرستی کے کسی قسم کا سامان موجود نہیں۔ وکفیٰ باللہ وکیلا۔

کہتے ہیں، کہ فرعون کے قبضۂ اقتدار میں ساحروں کی ایک پوری جماعت تھی، جنھوں نے اپنی قوت تدبیر و تنظیم کی مدد سے بہت سے خطرناک سانپ بنا کر چھوڑ دیے۔ اُدھر تنہا ذاتِ کلیم تھی، اور اُن کا عصا۔ لیکن وہ ایک عصا، حق و صداقت کا اژدر بن کر سرمایۂ و تنظیم کے تمام سانپوں کو نگل گیا، فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَأْفِکُوْن۔ کیا اس وقت بھی ایک فریق کو کچھ ایسا ہی خطرہ درپیش ہے؟

"اک دلِ پوشیدہ اور کافر کھلا"!

زلیخا کے محبوب کا کمالِ حسن یہ تھا کہ عورتیں جلوہ دیکھ کر بیخود ہوگئیں، اور اپنے ہاتھ چھریوں سے کاٹ لیے۔ خداوندِ عالم کے محبوب کا اعجازِ جمال یہ ہے کہ اہلِ ذوق، جلوہ دیکھ کر نہیں، محض تذکرہ سُن کر، بیخود ہو جاتے ہیں، اور معتقدات آبائی کے زنجیر و بند کو عشق و محبت کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ نجاشی، شاہِ حبشہ نے تثلیث پرستی کے آغوش میں آنکھیں کھولیں، مگر جب بند کیں، تو جمیلِ کائنات کے رُخِ انور کی حسرتِ دید پیش نظر تھی۔ اویس قرنی کو زیارتِ جمال ایک بار بھی نہیں حاصل ہوئی، لیکن شیفتگی و فریفتگی کے لحاظ سے یہ عاشقِ نادیدہ آج سارے گروہ عشاق کا سرتاج سمجھا جاتا ہے۔

یہ مثالیں پُرانی ہو چکیں، کیا دورِ حاضرہ میں، اس قسم کی، اعلیٰ یا ادنیٰ، کوئی مثال نہیں مل سکتی؟ سکے جواب میں ایک سکھ سرفروش کھڑا ہوتا ہے، اور دربارِ رسالتؐ میں عشق و محبت، خلوص و نیاز، احترام و عقیدت کا ہدیہ، چند اوراقِ مرتب کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ خدا اُسکی اس نذر کو قبول کرے

یہ شخص آبائی مسلمان نہیں، ایک غیر مسلم خاندان کا رُکن ہے۔ کسی اسلامی دارالعلوم کا نہیں،

انگریزی یونیورسٹیوں کا تعلیم یافتہ ہے۔ سا دھو یا جوگی نہیں، بیرسٹر ہے۔ قیام کسی اسلامی آبادی میں نہیں، خاص شہر لنڈن میں رکھتا ہے۔ شغلۂ قلم، کسی مسلمان رئیس کی قصیدہ نگاری نہیں، ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار ہند کی اڈیٹری ہے۔ اللہ کی شان کے قربان جائیے، کہ اس شخص کو ان حالات مخالف کے اجتماع میں، ہدایت نصیب ہوتی ہے، اُسکی روح نورِ ایمان سے روشن ہوتی ہے، اسکے قلب کو سرور عالمؐ کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے، اس کا پیارا ثمرہ یہ "رسولِ عربی" کے پیارے نام سے قلمبند کرتا ہے"، اور اسے ۱۸ + ۲۲ کی تقطیع پر ۱۲۵ صفحوں کی ضخامت کے ساتھ، دفتر دار المصنفین اعظمگڈھ سے شایع کرتا ہے۔ جو لوگ طلسم ساز فطرت کی گہری حکمتوں اور مخفی صنعتوں کا تماشا، شب و روز، چشمِ بصیرت و دیدۂ عقیدت سے دیکھتے رہتے ہیں، اُنکے لیے یہ واقعہ ایک معمولی بات ہے، لیکن ظاہر پرستوں کو اسپر جس قدر بھی حیرت ہو، بجا ہے۔

گورودت سنگھ دارا، بی اے، بی، ایل، ایڈوکیٹ، لاہور، و بیرسٹر، واڈیٹر ہند (لنڈن) کا نام قومی حلقوں میں نامانوس نہیں، البتہ مصنفِ "رسول عربی" کے نام سے شاید وہ پہلی بار دنیا کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اُردو کے ادیب یا کوئی مشاق مضمون نگار نہیں، اس لیے انکی تحریریں ادب اُردو کا چٹخارہ تلاش کرنا خود اپنی غلطی ہوگی۔ ہندی اور بھاشا کے الفاظ قدرۃً وہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں، با ایں ہمہ سوز و گداز، درد و اثر سے انکی کوئی سطر خالی نہیں۔ حضور انورؐ کی سیرت مبارک کے تقریباً پورے واقعات اُنھوں نے معتدل اختصار کے ساتھ قلمبند کیے ہیں، اور کسی اہم واقعۂ زندگی کو نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ اس جامعیت کے ساتھ دلاویزی کا سر رشتہ کسی مقام پر بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا ہے۔ سکھ قوم سرفروشی و جاں بازی کے لیے مشہور ہے، اس گلدستہ میں بھی ایک ایک لفظ سے پریم اور شوق کے پھولوں کی مہک آ رہی ہے۔ اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں :-

"مگر کیا کہوں اے عرب! رب کے رنگ نیارے ہیں، داتا۔ جسے چاہے دیدے، ورنہ تیرے ہاتھ آسکے یہ دولتِ محمدی! تجھے نصیب ہو یہ جمال احمدی! تجھے ملے یہ رسول عربی! کیا کہوں عرب! اللہ بے نیاز ہے۔ اے ہالہ کی چوٹیو! تم ہی کچھ کہو، سیکڑوں رشیوں نے تمھاری

شفقت اور پیار کی گود میں نواس کیے، صدہا جوگیوں نے تمھارے چہلوے محبت میں جوگ کمائے .... مگر سچ کہنا، کہیں دیکھا، تم نے وہ مکہ کا راج دُلارا، کہیں نظر پڑا تمھیں وہ مدینہ کا پیارا ...... اے موج آب گنگا، جس کسی کی آنکھیں تجھ سے دو چار ہوئیں، تو نے ایسے کٹک منتر پڑھاکے چھوڑا، مگر اے اب رود گنگا، مجھے اتنا تو بتا، کہیں اُس آب زمزم والے سے بھی تیری آنکھ لڑی، کہیں اُس ملی مرنی نے بھی تجھ سے کوئی گنگا جلی بھری ...... اے بھارت تیرے یہ اونچے اونچے محل اور کوٹ اور انکی شان، اے ہند تیری دلنگار روتی، اور تیرا آگرہ، اجمیر و ملتان، تیرے گل و گلزار اور انکی یہ سدا بہار، یہ رہی اور رہے گی، نہ مٹائے مٹی، نہ مٹے گی۔ داتا نے اپنی دیا سے تجھے ہر طرح سرور کیا، مگر اس مدن کا مکہ، اور وہ موہن کا مدینہ، وہ کعبۂ اسلام و قبلۂ انسان، وہ تجھے حق نے نہ دیا، پر نہ دیا۔"

ایک اور مقام :-

اے رسول عربی! تو خود ہی ہند کی بیچارگی دیکھ، اور ہندیوں کی چارہ سازی کر۔ اے احمدؐ تیرے عشق نے ایک ہندی کے دل پر زخم کاری لگائے ہیں، تو آ، اور دلنوازی کر! چودہ صدیاں شاہد ہیں کہ کوئی یوسف تیرے پایہ کا کسی مصر میں کبھی عزیز نہ بنا۔ نہ کسی کی گرم بازاری نے یہ رونق پکڑی جو حسن حقیقت نے تجھے عطا کی۔ پھر کون ہے جو تیرا شہرۂ خوبی اپنے گوش ہوش سے سنے اور تیری کشش حسن سے بچ نکلے! اے پریتم پیارے، میرے بھاگ تو کہاں کہ تیرے درشن کیے ہوتے، پھر تو ہی نے کوئی ایسا جھروکہ بنایا ہوتا کہ جہاں سے تیرا نظارہ نظر پڑتا، مگر یہ کہاں! میری شومئی بخت!"

سیرتِ مبارک کے تمام جزئیات، سوانح و وقائع، اسی والہانہ انداز کلام میں بیان کیے گئے ہیں۔ امید ہے کہ ہر کلمہ گو اس پیاری کتاب کی عملی قدر شناسی، اور مصنف کی حوصلہ افزائی اپنا فرض ایمانی سمجھے گا۔

شیخ الجامعہ کا دست طلب

ہمارے ایک مشہور شاعر نے "ایک مسجد کے زیر سایہ خرابات" کا خواب

دیکھا تھا۔ شکل معکوس میں تعبیر نکلی، کہ خرابات کے زیر سایہ ایک مسجد تعمیر ہوگئی، یعنی شاہ خرچ نیم سرکاری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے پہلو میں فقر نواز قومی جامعۂ اسلامیہ کی بنیاد پڑ گئی۔ سنہ ۲۱ء سے یہ جامعہ قائم ہے، اور اس اثنا میں اپنی خدماتِ جلیلہ کا کافی سے زائد ثبوت دے چکی ہے، اس قلیل عرصہ میں متعدد مفید مطبوعات و تالیفات شایع کر چکی ہے، ایک قابل قدر و سنجیدہ ماہوار رسالہ جامعہ کے نام سے نکال رہی ہے، اسکے طلبہ کا طرز زندگی سادگی و ایثار کا نمونہ ہے، اسکے بعض اساتذہ اور کارکن بڑی بڑی آزمایشوں سے گذر چکے ہیں۔ اس کا نصب العین اسلامی معیار سے بہت ہی قریب ہے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن قوم کی جانب سے' اب تک عملاً اسکی کتنی ہمت افزائی کی گئی ہے؟ اسکے جواب میں دفتر جامعہ کے رجسٹر نہایت مایوس کن اعداد پیش کرتے ہیں، اور اسی لیے اب شیخ الجامعہ (خواجہ عبد المجید' سابق بیرسٹر) کو اسکی اعانت و امداد کے لیے ایک پُر زور اپیل شایع کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ روزنامہ خلافت (بمبئی) میں اُنھوں نے تفصیل کے ساتھ اپنی ضروریات کو بیان کیا ہے' اور اپنے گذشتہ کارناموں کا مفصل ذکر کرکے اپنے حقوق جتلائے ہیں۔ جامعہ کے سالانہ مصارف کا تخمینہ ۶۴ ہزار ہے، کیا ایک اسلامی درس گاہ کے لیے اس قدر رقم کا صرف قوم کے لیے ناقابلِ تحمل ہے؟

جامعہ کے حقوق امرا سے کہیں زیادہ غربا و طبقۂ متوسط پر ہیں۔ جامعہ ہر قسم کے سرکاری و نیم سرکاری تعلق سے آزاد ہے۔ جامعہ مین طرز معاشرت دولتمند فرنگیوں کی نہیں، غریب مشرقیوں کی سکھائی جاتی ہے۔ جامعہ کے درودیوار "حکام والا مقام" کے نہیں، خادمانِ قوم و ملت کے استقبال کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔ جامعہ کے پاس دفاتر کی دومنزلہ عمارات نہیں، صرف ایک مختصر کمرہ ہے، سکرٹری کا دفتر بھی وہی ہے' اور رجسٹرار کا بھی وہی' اور پرنسپل کا بھی وہی۔ جامعہ کے سامنے زندگی کا نمونہ لٹن و مارسین کا نہیں، محمود حسن و محمد علی کا ہے۔ جامعہ کے طلبہ بیش قیمت میز و کرسی، کوچ اور سوفے کے نہیں' معمولی دری اور چٹائی، بلکہ کھُرّی زمین تک پر بیٹھنے کے عادی ہیں۔ جامعہ کا مطمح نظر سرکاری ملازم یا نیم ملازم نہیں، قوم و ملت کے خادم پیدا کرنا ہے۔ جامعہ کا نصاب' درس غلامی کی تکرار کے لیے نہیں' احساس خودداری کے لیے ہے۔ جامعہ کو فخر و امتیاز اپنی عالیشان و شاہانہ عمارتوں پر نہیں، بلکہ اُن طلبہ

کی اخوت اسلامی و قوت اخلاقی پڑ رہے ' جو شکستہ و بوسیدہ مکانوں میں گذر کیا کرتے ہیں۔ جامعہ کے پاس بڑے بڑے لکچر روم نہیں' بہت سے طلبہ درختوں کے سایہ کو سقف و بام کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ جامعہ کے پاس کوئی الگ ڈائننگ ہال نہیں' کوئی اسٹرکچی ہال نہیں' کوئی نظام میوزیم نہیں' صرف ایک خس پوش عمارت ہے' وہی مسجد کا بھی کام دیتی ہے' دینیات کا درس بھی وہیں ہوتا ہے' اور کھانا بھی طلبہ وہیں کھاتے ہیں۔ کیا اس قسم کی درس گاہ کو مسلمان زندہ رکھنا چاہتے ہیں؟ اس کا جواب زبان سے نہیں، زبانِ عمل سے ملنا چاہیے۔

ایک افسوسناک وفات

ماہ گذشتہ میں ایک افسوسناک واقعہ سید افتخار عالم مارہروی کی وفات کا ہوا۔ دوسری تحریروں سے قطع نظر کرکے مرحوم کا ایک یادگار کارنامہ ضخیم و دلچسپ حیات النذیر ہے۔ آخر عمر میں کئی سال سے امیر خسروؒ کے حالات و سوانح جمع کرنے میں مصروف تھے' اور ایک معتد بہ ذخیرہ فراہم بھی کر لیا تھا۔ مرحوم کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا' تصوف سے بھی لذت آشنا تھے' اور اپنے اخلاق میں ایسی خوبیاں جمع رکھتے تھے' کہ ان کا شمار اگر اہل دل میں کیا جائے' تو بیجا نہ ہوگا۔ خدائے غفور و رحیم انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا!

ماہ گذشتہ کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ یہ ہے' کہ اس کے وسطایں نیاز کیشان ازل و وفا شعاران قدیم نے عرصۂ دراز کے سکوت کے بعد ایک بار پھر اپنی قوم کی تعلیمی فلاح و بہبود کے لیے' (اپنی ہی اصطلاح میں) ایک "عاجزانہ عرضداشت" پیش کی۔ خداوند ذوالجلال کی پیشگاہ میں نہیں' خالق ارض و سما کے حضور میں نہیں' بارگاہ رب العزت میں نہیں' بلکہ اُس آستان مقدس پر' جو انکی نظر میں مرشد کل و ہادی سُبل' قبلۂ حاجات و کعبۂ آمال کا حکم رکھتا ہے' جو اُن کے عقیدہ میں انکی قسمتوں کا مالک و مختار' اور قومی موت و زیست کا متصرف بااختیار رہے، اور جس کے ایک گوشۂ چشم پر وہ اپنی عزت و وقار، دولت و خودداری سب کچھ نثار کر دینے کو حاضر رہتے ہیں۔ نینی تال و شملہ کے عظمت و قوت دیوتاؤں کے بڑے بڑے کہن سال پرستار، بڑے بڑے پرانے پجاری، ایک بار پھر ملی گڈھ سے آگرہ کا سفر کرکے' پھر عبدیت و معبودیت کے مندر میں اکٹھے ہوئے' اور انتہائی خضوع و خشوع کے ساتھ

نینی تال کے سفید دو تا کے آستانۂ قدس پر اپنی جبین نیاز کو گھسا۔ لیکن خدا معلوم، اکلی برہمن سے ساعت بتانے میں کیا غلطی ہوگئی، اور کیسی نحس ساعت بھینٹ چڑھانے کے لیے مقرر کی گئی، کہ سارا خضوع و خشوع بے اثر رہا، اور بجائے اسکے کہ آثار مقبولیت و پذیرائی ظاہر ہوں، بچارے خوش عقیدہ پرستاروں کو روکھے پن کے ساتھ اُلٹے پاؤں واپس کر دیا گیا۔!

سُنا ہے کہ اس جمعیت عالیہ کے ایک بزرگ، اس حادثۂ المناک و دردانگیز کو غالب کے اس شعر کی نحوست پر محمول کرتے ہیں۔ ؎

اب کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا!

لیکن اسی درس گاہ عشق و وفا کے ایک پروفیسر صاحب اس دل و گُردہ کے ہیں، جن کی جبیں پر شکن تک نہیں پڑی ہے، اور وہ ہندوستان کے اصنام صغیرہ کو غیر ملتفت پاکر انگلستان کے صنم اکبر کی زیارت کے لیے فی الفور روانہ ہوگئے ہیں۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان بزرگ سے کیمبرج و وگٹنگن یونیورسٹیوں میں ریاضیات کے بعض مقامات ناتمام رہ گئے تھے، اب کی سفر میں ان کی تکمیل ہوایٹ ہال و ڈاؤننگ اسٹریٹ میں ہوگی!

ایک خوش آیند مراجعت

مقام مسرت ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ واپس آگئے، اور اب مستقل قیام کریں گے۔ انکا قیام، کام کے مرادف ہے۔ انکی واپسی سے امید ہے کہ علیگڈھ کی بہت سی ابتریاں دُور ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ کسی اہم و اصولی تغیر کی اُن سے توقع نہیں ہو سکتی، تاہم جسقدر جزئی اصلاحات بھی اُنکے زمانہ میں ہو سکتی ہیں، انکی جماعت کے کسی دوسرے فرد سے اسقدر بھی توقع نہیں۔ ان کا عہدِ امارت، ایک مسلمان کا عہد امارت ہوگا، گو وہ مسلمان بجائے قرن اُولیٰ کے سرسید کے زمانہ کی تجدید چاہتا ہو۔ ان کے زمانہ میں انشاءاللہ مسجدیں ویران نہ رہیں گی، اور اعلیٰ ملازمین کالج اپنے تئیں پابندیِ فرائض سے مستثنیٰ نہ سمجھیں گے۔ اس آفتاب کے طلوع ہونے سے کم از کم، فضا اس قدر تو تیرہ و تار نہ رہے گی، کہ سلیمان ندوی کو کورٹ کی رکنیت کے ناقابل سمجھا جائے، اقبال کو اعزازی ڈگریوں کے لیے نااہل، اور نواب صاحب .... کو اہل قرار دیا جائے اور محمد علی کو قوم و ملت کا دشمن کہا جائے۔

جدید دنیائے اسلام

حال ہی میں ایک جمعہ کی شام کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ بمبئی میں پادری ڈاکٹر سیموئیل زویمر نے "جدید دنیائے اسلام" پر تقریر کی - آنریبل سر ایل لے شاہ چیف جسٹس بمبئی ہائیکورٹ نے صدارت فرمائی - پادری صاحب نے فرمایا کہ آج اس خودمختاری کے دن اس نمایاں و مقتدر لوگوں کے مجمع کے روبرو تقریر کرنا میرے لیے عزت کا باعث ہے جبکہ امریکہ نے تمام قوموں اور نسلوں کی مساوات کے متعلق دعوت مقابلہ دی تھی جسے جدید دنیائے اسلام نے اپنے شوق جمہوریت میں قبول کر لیا ہے - اسلام سے اتحاد و استحکام کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے جغرافیائی اتحاد بھی ٹپکتا ہے - مسلمانوں نے ساتوں سمندروں کو پار کر لیا ہے اور وہ دنیا کے ہر حصہ میں آباد ہو گئے ہیں - شمالی امریکہ کے محنت مزدوری کے مرکزوں میں گیارہ ہزار مسلمان رہتے ہیں اور جنوبی امریکہ میں دو لاکھ - آسٹریلیا میں بین ہزار مسلمان ہیں اور برطانوی گائنا میں ڈیڑھ کروڑ مسلمان آباد ہیں - ہندوستان میں ماسوائے لنکا کے ۶۸۷۳۵۲۳۳ اسلامی آبادی ہے - نظر بریں یہ نئی اسلامی دنیا ہے جو دنیا کی آبادی کا ساتواں حصہ ہے - آج محققانہ علم و فضل اور مسلمان عالموں اور مشہور فاضلوں کے اس مقدس ملک کو تجسس و تفحص کرنے کی بدولت عرب کی اصلی تصویر دنیا کے پیش نظر ہو گئی ہے آج دنیا میں قرآن مجید کے ۲۵ ترجمے ہیں جن میں سے پانچ انگریزی میں، گیارہ جرمنی میں اور چھ اطالوی زبان میں ہیں - اسلامی علم ادب ماضی کی طرح اب گرد و غبار اور دھندلکے میں نہیں بلکہ اب اس میں زور و شور اور آب و تاب ہے - دنیا کو نئی روشنی اور نیا انکشاف عطا کر رہا ہے - سرکاری اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچاس سال پہلے مسلمانوں میں افسوسناک جہالت تھی لیکن اب زبردست تعلیمی احیا ظہور میں آ گیا ہے - جو ایک ملک یا مرکز تک محدود نہیں بلکہ تمام دنیا پر پھیلا ہوا ہے - نسائیت کی مساوات اور آزادی کے لیے ایک نیا دن طلوع ہو گیا ہے - اسلام کی یہ زبردست پیشقدمی بڑی حد تک اسلامی مبلغ کی جد و جہد اور بین الاسلامی تحریک کا نتیجہ ہے - اسلام سیاسیات کا سلسلہ نہیں ہے - نہ یہ کوئی معاشرتی انضباط ہے بلکہ سراپا توحید و خدا پرستی ہے - یہ خدا سے روشناس کرتا اور اسکی رفاقت و موجودگی کا سبق دیتا ہے

جدید دنیائے اسلام کی اہمیت اب دنیائے مغرب کے مدبروں اور مصنفوں کے ہر وقت پیش نظر رہتی ہے۔ اس زبردست تقریر کے علاوہ ایک اور کتاب ہمارے سامنے ہے جس کا نام "جدید دنیائے اسلام" ہے۔ یہ امریکہ کے ایک مشہور ماہر سیاسیات ڈاکٹر لوتھراپ سٹاڈرڈ کی تصنیف ہے جسے منشی محمد جمیل الدین صاحب بدایونی بی اے (علیگ) ڈپٹی کلکٹر نے اردو کا جامہ پہنایا ہے اور سچ یہ ہے کہ اُنھوں نے ترجمہ میں بہت جانفشانی سے کام لیا ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ ایک مرتبہ جب وہ اس ترجمہ کا مسودہ مطبع کو دینے والے تھے تو دوران سفر میں وہ سارا مسودہ جاتا رہا اور اُنکو پھر ترجمہ کی زحمت اُٹھانی پڑی، بلکہ اس لیے بھی کہ ترجمہ میں بڑا غور و فکر کیا ہے۔ گو اس جانفشانی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ترجمہ ادق اور عام فہم سے بالا ہو گیا ہے لیکن مترجم کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ ایک خاص طبقہ تک محدود رہے۔

مصنف امور اسلامی سے بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے اور جہاں اُس نے مغربی تعصب کا خفیف سا اظہار بھی کیا ہے وہاں فاضل مترجم نے اپنے مفصل حاشیوں سے اُسکی کافی گوشمالی کردی ہے۔ مثلاً عام یورپی مصنفوں کی طرح اُس نے عرب کے یکایک غفلت و جہالت سے اس بام ترقی پر پہونچ جانے کا جس سے ایک عالم حیران ہے سہرا حضرت رسول کریمؐ کی معجز نمائی کے سر نہیں باندھا بلکہ یہ لکھا ہے کہ عرب میں جدید معلومات اور ترقی کی قابلیت پیدا ہو گئی تھی اور مواد پک رہا تھا کہ آں حضرتؐ کے دعوے رسالت سے اُس میں سرعت پیدا ہو گئی۔ فاضل مترجم نے اس رسلے کی غلطی اپنے حاشیہ میں دکھا کے اسے درست کیا ہے۔

فاضل مصنف نے دیباچہ اور مقدمہ کے علاوہ اپنی کتاب کو نو فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے بتایا ہے کہ اسوقت دنیائے اسلام سخت ہیجان میں ہے اور اُس میں نئی نئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ اور نئی نئی اُمنگیں نشو و نما پا رہی ہیں۔ اس کتاب میں اس ارتقا کو مختلف یعنی تمدنی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی پہلوؤں سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے وغیرہ۔

مقدمہ میں قدیم اسلامی دنیا کے انحطاط و زوال کا ذکر ہے۔ اسلام کی ترقی کا مختصر تذکرہ کرکے وہ اس طرح اپنے مضمون کو ختم کرتا ہے:۔

"عرب اپنی حکومت کے مستحکم کرنے کے طریقے خوب جانتے تھے۔ یہ کوئی خون کے پیاسے

وحشی نہ تھے جو لوٹ مار اور غارت گری کے خواہشمند ہوتے۔ برخلاف اسکے وہ جبلی طور پر مذاوا
اور صانت سے متصف اور اُن شائستہ صفات کو جو قدیم تہذیبوں سے حاصل ہوسکتی تھیں
سیکھنے کے متمنی تھے۔ فاتحین اور مفتوحین ایک ہی مذہب کے پیرو ہو گئے۔ ایک دوسرے
سے مناکحت کرنے لگے۔ لہذا سرعت کے ساتھ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ اس اختلاط سے
ایک جدید تمدن یعنی عربی (سارسنک) تہذیب پیدا ہوئی۔ عرب کی طبعی قوت نے یونانی
رومی اور ایرانی تہذیب کو مستحکم کردیا اور عربی ذہانت اور سامی روح نے اس پر جلا کرکے
اپنی تہذیب میں ملا لیا۔ پہلی تین صدیوں (۷۵۰-۱۰۰۰ء) میں بلاد اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ مہذب اور سب سے
زیادہ ترقی یافتہ حصے تھے۔ ان میں جابجا بارونق شہر، عالیشان مسجدیں، اور پُرسکون درسگاہیں
تھیں۔ ان درسگاہوں میں دنیائے قدیم کی حکمت کی حفاظت اور قدر کی جاتی تھی۔ نصرانی مغرب
سے جو ازمنۂ مظلمہ کی تاریک شب میں چھپا ہوا تھا اسلامی مشرق کا کُھلا ہوا تقابل تھا۔"

عربی تمدن کے تنزل کے اسباب مصنف نے یہ بتائے ہیں کہ "اولاً گروہ بندی کا مستقل جذبہ عود کرنے لگا
جو ہمیشہ سے قبائل عرب کے لیے تباہ کُن تھا" اسکے بعد مصنف اپنے مضمون میں اسقدر جذب ہوا کہ اُس نے
جس طرح اسباب کو گِن کے بتانے کی فکر کی تھی اُسے وہ بھول گیا۔ اور مضمون سے مضمون پھیلتا چلا گیا۔
اس مقدمہ کے مطالعہ سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس سبب کے علاوہ مذہبی اختلافات
اور سیاسی مناقشات، معقول و منقول کا جھگڑا، جمہوریت کے بجائے مطلق العنانی کا زور اس انحطاط
کے باقی وجوہ ہیں۔ اس مقدمہ میں اسلامی تاریخ کا ایک مجمل خاکہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ خلفائے
راشدین کی خلافت کیا تھی اور اُنکے بعد بنی اُمیہ و بنی عباس کے ہاتھوں اسکی کیا گت بنی؟ کس طرح
یہ خلافت ہسپانیہ اور مصر میں پہونچی اور پھر کس طرح ترکوں کے ہاتھوں میں آئی۔ یورپی ممالک میں
اسلامی پیشقدمی کا اس میں ضمناً ذکر آگیا ہے جو نفس مضمون کے لحاظ سے دلچسپ ہے۔ اس انحطاط
میں مغربی ارتقا شروع ہوگیا جس نے اب تمام مشرق پر اپنا تسلط جمالیا۔ اس مقدمہ کو فاضل مصنف
نے اس طرح ختم کیا ہے۔

"ان فتوحات کا آخری درجہ جنگ عظیم میں ظاہر ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر جو صلح نامہ کے شرائط لکھے گئے اُن سے ترکی
سلطنت کا خاتمہ ہوگیا..... اسلامی دنیا کی مغلوبیت کم از کم کا فذ پر تو مکمل ہوگئی..... مغربی تمدن کے رونا فزون

سیلاب نے آخرکار خوابیدہ مشرق کو بیدار کر دیا اور اسلام بالآخر اپنی کمزوری سے واقف ہوا اس واقفیت کے ساتھ پچیس کروڑ پیروان اسلام میں مراکش سے لے کر چین تک اور ترکستان سے لیکر کانگو تک ایک ایسا ہیجان پیدا ہو گیا کہ جس نے اگرچہ خاص شکل اختیار نہیں کی ہے تاہم اسکی قوت اور شدت میں کلام نہیں ہو سکتا .... آج اسلام بڑی طاقتوں کے ساتھ ایک جدید اسلامی دنیا کی تعمیر کے لیے بیچین ہے۔ اسلامی مستقبل کی تعمیر میں کون کون سی طاقتیں بروے کار ہیں؟ اس سوال کے حل کرنے اور صحیح اندازہ کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

اس بیداری کو خود مسلمان بھی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ اس جگہ مسلم اوٹ لاہور مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۲۴ء کے ایک مدیری مقالہ کا ترجمہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"انڈین ڈیلی میل بمبئی کے ایک خاص تار میں کنٹربری کے لاٹ پادری کی ایک تقریر کا خلاصہ آیا ہے جو انھوں نے چند عیسائی مبلغوں کے خیر مقدم کے وقت فرمائی تھی اپنی تقریر کے اثنا میں پادری صاحب یہ فرماتے بتائے جاتے ہیں کہ "زیادہ تر یہ جنگ اسلام کی دیواروں کے منہدم کرنے کی ذمہ دار ہے" اگر یہ الفاظ جو غلط ہونے کے علاوہ خبثِ باطن کا اظہار کرتے ہیں کسی غیر ذمہ دار پادری کی زبان سے ادا ہوتے تو ہم اُن سے ایسا حقارت آمیز سکوت برتتے جسکے وہ مستحق ہوتے لیکن چونکہ یہ ایسے شخص کی زبان سے نکلے ہیں جو انگلستان کے بادشاہوں کی تاجپوشی میں نمایاں حصہ لیتا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ان پر نفرت کا اظہار کیا جائے۔ پادری صاحب اپنے مذہب کے جوش میں اس قدر وارفتہ ہوے کہ صداقت اور ہوشمندی کے سب اصولوں کو بالاے طاق رکھ دیا۔ اس لڑائی کے بعد اسلام پہلے سے زیادہ گردن افراز ہے۔ ایک نہ ایک بہانہ سے ہلالی ممالک مغربی طاقتوروں نے ہڑپ کر لیے ہیں لیکن ان ملکوں کے مسلمان باشندے اپنی ضروریات سے خوب آگاہ ہیں اور قریب ترین موقعہ پر آزاد ہونے پر تلے ہوے ہیں۔ لڑائی سے پہلے ترکی کے سوا کوئی اسلامی ملک نام کے لیے بھی آزاد نہ تھا۔ اب حالت یہ ہے کہ تازہ دم ترکی، خود مختار افغانستان اور نوزائیدہ ایران کے علاوہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مصر بہت جلد منزل مقصود پر پہنچنے والا ہے، ہندوستان اپنی قوت کا اظہار کر رہا ہے اور ریف اپنی آزادی کے لیے

بر سر پیکار ہے۔ غیر متعصب آنکھوں کو تمام اسلامی ممالک میں نئی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں جن سے لاٹ پادری صاحب اپنے منہ کی کھا رہے ہیں۔ اسلام کی روشنی خدائی نور ہے جو گل نہیں ہو سکتی خواہ عیسائی پادری کچھ ہی کہیں اور کچھ ہی چاہیں۔ لاٹ پادری کا خیال خواہش کا نتیجہ ہے۔ اور یہ خیال مسلمانوں کو بیش از بیش عیسائی طوقِ غلامی نکال پھینکنے پر اُبھارے گا۔"

فصل اول کا عنوان "مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ" ہے جس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ کس طرح عالم اسلام جمود کی حالت میں پست و ذلیل تھا اور کس طرح اُس میں آثار ترقی نمودار ہونے لگے۔ مترجم نے درست کہا ہے۔

"مصنف نے یہ دکھایا ہے جسکے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہے کہ اس (اسلامی نشاۃ ثانیہ) کی ابتدا محمد بن عبدالوہاب نجدی کے مساعی سے ہوئی۔ اس وہابی تحریک کا مقصد اسلام کو بدعات ما بعد سے پاک و صاف کرنا اور اسلامی سلطنت کو بیدار کرنا تھا۔ یہ تحریک اگرچہ سیاسی طور پر ناکامیاب رہی اور مذہبی تجدید میں تنگ خیالی کی ملزم ٹھہرائی گئی لیکن اس نے اسلامی اقوام کو بیدار ضرور کر دیا اور مسلمانوں میں بطور خود اصلاحی تحریکات شروع ہو گئیں جسے مغربی خیالات کی رو سے مزید تقویت پہونچی۔"

مصلحین کے گروہ ہر جگہ پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں سر سید نے آزادی کی تحریک کا آغاز کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں نئی تعلیم کی ترویج سے ایک نئی روح پھونکی۔ غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت مائل بہ پستی و نکبت تھی، لیکن سر سید نے اُنکو ایسا اُبھارا کہ آج ہندوستان میں جو کچھ ترقی کے آثار مسلمانوں میں نظر آتے ہیں اُنکی ہی مساعیِ جمیلہ کے نتائج ہیں۔ ترکی میں مدحت پاشا پیدا ہوئے، مصر میں شیخ محمد بن عبدہٗ۔ اس فصل کے آخر میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کا مصنف نے ذکر کیا ہے۔ ایک وہ ہیں "جو اسلام کو زندہ اخلاقی قوت جانتے اور اسی سے اپنی غذائے روحانی اخذ کرتے ہیں" اور وہ جماعتیں بھی ہیں جو مغربیت کی ایسی شکار ہو گئی ہیں کہ انکو اپنے روحانی اور تمدنی ماضی سے کم دلچسپی ہے کوئی ربط نہیں۔ تیسرا وہ گروہ ہے جو مذہباً ملحد ہے اور اشتراکیت و بالشویت پسند ہے۔

فصل دوم کا عنوان "اتحاد بین اسلامی" ہے اور یہ بہت دلچسپ ہے۔ اس میں دکھایا ہے کہ یورپ کے اقتدار اور تسلط کے بڑھتے چلے جانے سے جو منافرت مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوئی اُسنے

انکی آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے دیکھا کہ یورپ سارے اسلامی ممالک میں اپنے پانوں پھیلائے چلا جارہا ہے اور روز بروز اسلامی آزاد ملکوں کا مرتبہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس تحریک کو سلطان عبدالحمید خان ثانی نے بہت تقویت دی اور سچ یہ ہے کہ آج اسلامی دنیا انکی بہت زیادہ ممنون ہو۔ اس تحریک میں سلطان کو جمال الدین افغانی کی شخصیت سے بڑی مدد ملی۔ اسی اثنا میں افریقہ میں سنوسی جماعت پیدا ہوئی اور روز بروز اسکا اقتدار چپکے چپکے بڑھنے لگا۔ اسکے ضمن میں مصنف نے دکھایا ہے کہ سنوسی اپنا کام نہایت خاموشی سے کرتے ہیں اور اس کا اثر یہ ہے کہ جو افریقی طبقے پہلے اسلام کے نام سے واقف بھی نہ تھے آج کل کے کل مسلمان ہو گئے ہیں اور اسلام نے نصرانیت کو بری طرح پچھاڑ دیا ہے۔ الجزائر اور کوہ قاف میں بھی حریت پسند رہنماؤں کی مدد سے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی۔ مہدویت کی تحریک نے کئی مقام پر فرانس اور برطانیہ کو بہت پریشان کیا۔ اور مسلمانوں میں اس سے بڑا ہیجان پیدا ہوا۔ چین میں بھی وہی اشتعال مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ غرضکہ ہر ملک میں مسلمانوں میں ترقی کی روح نمودار ہونی شروع ہوگئی۔

اب مصنف نے واقعات سے تدریجی طور پر اس بےچینی کے اسباب مستنبط کیے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان نے ایشیا کے اس خوف کو دور کر دیا کہ یورپ مفتوح نہیں ہو سکتا۔ روس کے اپنے منہ کی کھانے کی گھر گھر خوشی تھی۔ ہندوستان میں چوپالوں میں رات کو یہی ذکر ہوتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۵ء سے ہندوستان میں جو جوش پھیلا اسکا ذکر مصنف نے بعد کی فصل میں کیا ہے لیکن مسلمانوں کی بےچینی کا بیج اس طرح بویا گیا کہ طرابلس پر اطالیہ نے بلا وجہ حملہ کیا اور یورپ نے اخلاقی طور پر اس حملہ کی ستایش کی۔ برطانیہ نے مصر کو جو ترکی علاقہ تھا غیر جانبدار قرار دے کے ترکوں کا راستہ بند کر دیا۔ بعد میں جب اطالیہ نے طرابلس پر اپنے قبضہ کا اعلان کیا تو برطانیہ نے سب سے پہلے اسکو تسلیم کیا۔ اسکے بعد فرانس نے اقادیر پر جھگڑا کیا اور مراکش میں خاص حقوق حاصل کیے۔ پھر جنگ بلقان نے اسلامی دنیا میں ایک کھلبلی ڈال دی۔ یورپ کے رویہ نے پہلے سے زیادہ مسلمانوں میں ابال پیدا کر دیا۔ اسکے بعد جنگ عظیم شروع ہوئی۔ مصر پر برطانوی صیانت کا اعلان ہوا۔ برطانیہ نے عربوں کو خودمختاری کے سبز باغ دکھائے۔ جہاد کا سلطان نے اعلان کیا۔ لیکن اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اسکے متعلق مصنف نے نہایت معقول بحث کی ہے کہ اس کا کیوں اثر نہ ہوا۔ کاش کمالی اس کا خیال کرتے جنھوں

نے خفگی سے خلافت کا چولہ محض اس وجہ سے اُتار پھینکا کہ خلافت کی وجہ سے ترک مصائب آلام کا نشانہ بنے رہے اور فی نفسہ اس کا ترکوں کو کچھ فائدہ نہ پہونچا۔ چنانچہ جہاد کا اعلان ہونے پر بھی مسلمان بے حس و حرکت رہے۔ مصنف لکھتا ہے:

"ان حالات میں بہ نظر اول یہ عجیب معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۴ء کے اختتام پر جب ترک میدان میں آئے اور سلطان خلیفہ نے جہاد کے لیے باضابطہ دعوت دی تو اسلامی دنیا میں کوئی عام تلاطم نظر آیا۔ بلا شبہہ یہ دعوت اس قدر ناکامیاب نہ تھی جس قدر کہ اتحادیوں کے خبر رسانوں نے یورپ کو اُس وقت اسکی ناکامیابی کا یقین دلایا۔ واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہر اسلامی ملک میں جو اتحادیوں کے تسلط میں تھے سخت مشکلات پیدا ہوئیں۔ .... عام بغاوت یقیناً ہو جاتی اگر اسلام کے اصحاب حل و عقد ہر جگہ اُس اہتمام بالشان لفظ کو اپنی زبان سے نکال دیتے جس سے ہزارہا تقدیریں وابستہ تھیں۔ لیکن وہ لفظ مُنہ سے نہ نکلا۔ بجائے اسکے ترکی کے باہر اکثر مسلمانوں نے عام طور سے ترکوں کے فعل پر اظہار ناراضی اور حتی الوسع متعصب عوام کے جذبات کو روکنے کی کوشش کی۔ ان سربرآوردہ مسلمانوں کا طرز عمل انکی وسعت نگاہ کی وقعت ظاہر کرتا ہے۔ وہ جان گئے کہ مغرب سے فیصلہ کن جنگ کے لیے نہ تو یہ موزوں وقت تھا اور نہ مناسب موقع۔ وہ اس وقت اسکے لیے مادی طور پر طیار نہ تھے اور انھوں نے [illegible] غیر مسلم اتحادیوں سے کوئی سمجھوتہ کیا تھا۔ سب پر طرہ یہ تھا کہ اخلاقی اقتضا بھی مفقود تھا۔ [illegible] تھا کہ خلیفہ کے فرمان پر "مصنوعہ جرمنی" ثبت تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ [illegible] "نوجوان ترک" پارٹی [illegible] لامذہبوں کی جماعت تھی جن پر [illegible] برائے نام بھی مسلمان نہ تھے بلکہ یہودی لامذہب تھے۔ اور اندیش مسلمانوں کو ذرا بھی پروا نہ ہوئی [illegible] کا آلۂ کار بننے کے لیے اپنے آپ کو گرفتار ہونا کریں۔ اور نہ دنیا پر پروشیا کے اقتدار حاصل کرنے کی تدابیر کی حمایت کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ یہ انکے لیے بعض آقاؤں کا تبادلہ ہوتا۔ یہ بدرجہا بہتر تھا کہ مغرب کو اُس کی مایوسانہ لڑائیاں لڑنے دیا جائے تاکہ وہ [illegible] اپنے آمیز دسکے تعصبات کو ظاہر کرے اس اثنا میں اسلام وقت گذاری کرکے مزید قوت حاصل کرے اور منتظر فرصت رہے۔"

آخر مصنف نے نتیجہ نکالا ہے کہ

"مذہبی جنون بلاشبہ گذشتہ قرن کے سیاسی واقعات سے بہت متنقل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ تیغ مغرب سے مذہبی تمدنی و سیاسی نفرت نے وہ دماغی حالت پیدا کردی ہے جو بالیقین امن دنیا کے لیے فال بد ہے۔ ہم کو موجودہ حالت کے امکانی خطرات کو خفیف سمجھ کر خود فریبی نہ کرنا چاہیے۔ محض اس وجہ سے کہ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے اغوا سے نوجوان ترکوں نے جس نمائشی "جہاد" کا اعلان کیا تھا وہ کامیاب نہ ہوا۔ یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حقیقی جہاد بھی ناممکن ہے چنانچہ ایک جرمن فوجی افسر نے جو جنگ گذشتہ میں ترکی ملازمت میں تھا نہایت آزادی سے کہا ہے "جہاد محض تماشہ تھا کیونکہ یہ جہاد ہی نہ تھا" میں بیان کر چکا ہوں کہ کس طرح اکثر مسلمان چال کو سمجھ گئے اور انھوں نے جنبش تک نہ کی"۔

آج بھی ترکوں کی مذہبی حالت الآن کما کان ہے۔ جو لا مذہبی جہاد کے بے اثر رہنے کی مددگار ہوئی وہ آج بھی موجود ہے۔ ترکوں نے شیخ الاسلام کا عہدہ توڑ دیا۔ خلیفہ کو پہلے تو ایک پوپ کی طرح قسطنطنیہ میں قائم کیا پھر اُسے نکال باہر کیا۔ ترکی دستور میں سے یہ قرارداد نکال دی گئی کہ سلطنت کا مذہب اسلام ہے۔ عورتوں نے اپنے خیالات ظاہر کیے کہ اسلامی قیود اور رسائل نے ہماری ترقی کو مسدود رکھا۔ اس طرح وہ یورپ کی حکمراں جنس لطیف کے نقش قدم پر چلنے لگیں۔ آج تصویر میں ہم مصطفےٰ کمال کی بیوی کو بے نقاب اور فرانسیسی و انگریزی عورتوں کی طرح برہنہ سینہ و بازو دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مسلمانوں میں ترکوں کے لیے وہ جذبۂ احترام و محبت نہ رہا جو سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے وقت سے پیدا ہو کے ان میں ترکوں کے حق میں پرجوش ہمدردی پیدا کردیا کردیا کرتا تھا۔ اطالیہ نے حال میں ترکوں سے لڑنے کی جو بحری نقل و حرکت کی تو مسلمانوں میں وہ ہیجان بالکل پیدا نہیں ہوا جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر نمودار ہوا کرتا تھا۔ اسوقت گویا یہ ایک معمولی بات تھی۔ اب ترکوں کو اگر نقصان پہونچتا تو مسلمانوں کو رنج تو ہوتا لیکن صرف اتنا جو وہ ایران، مراکو اور سرحد ہند کے متعلق محسوس کیا کرتے ہیں۔

خیر جو وعدے دول نے اس جنگ عظیم میں کیے تھے صلح ہونے پر انکی ایفا کے بجائے یہ ہوا کہ عرب پا بزنجیر ہو گئے۔ مصر کی حالت میں کوئی بہتر فرق نہ تھا۔ قسطنطنیہ پر قبضہ ہو گیا اور ایک طرح ترکی سلطنت ناپید کردی گئی۔ مسلمان چراغ پا ہوے اور جن مشرکوں سے وہ گزوں کے فاصلہ پر رہتے تھے اُن سے

وہ حیرت انگیز طور پر متحد ہو گئے۔ اور سب مل کے یورپی طاقتوں سے زور آزمائی کرنے لگے۔ مغربی تہذیب نے ہی یہ جذبہ پیدا نہیں کیا بلکہ یورپی صنعت و حرفت کے غلبہ نے بھی اس تنفر کو تیز کیا۔ اس فصل کو مصنف اس طرح ختم کرتا ہے:

> "اب سوال یہ ہے کہ اقتصادی اتحاد بین اسلامی کا خاص نظام عمل کیا ہے؟ یہ نظام عمل آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اسلام کی دولت مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کی بجائے تجارت اور صنعت کا نفع مسلمان اٹھائیں اور مسلمانوں کے سرمایہ سے مغربی سرمایہ کو خارج کیا جائے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اراضی و معدنوں و جنگلات و ریلوں و محصولات کی ان مراعات کو ختم کر کے جن کی بدولت آج بلاد اسلامی کی دولت سواحل غیر کو کھنچی جا رہی ہے۔ اسلام کے قدرتی ذرائع کو یورپ کی گرفت سے رہائی دلائی جائے۔"

تیسری فصل کا عنوان "مغرب کا اثر" ہے۔ اس میں دکھایا ہے کہ یورپ کی تہذیب کا ایشیا پر کیا اثر پڑا۔ ظاہری نقل بھی لوگوں نے کی ہے۔ یورپی لباس میں لوگ خوش ہوتے ہیں۔ طرز بود و باش بھی یورپی ہو گیا ہے۔ اندرونی طور پر بھی ایشیا نے یورپ کی تقلید کی ہے۔ خیالات پر بھی بہت کچھ مغربی اثر ہے۔ پرانی باتیں مفقود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ پرانی رسوم کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ملک میں تار، ریلیں وغیرہ رائج ہو گئی ہیں۔ مصنف نے صاف طور پر مانا ہے کہ ریلوں وغیرہ کے متعلق ہندوستان پر ہمارا کوئی احسان نہیں۔ ہم اپنے منافع کے لیے ان چیزوں کو جاری کرتے ہیں۔

> "مشرقی ملک پر یورپی حکمراں ...... کو متعدد وجوہ سے اس ملک میں مغربی تہذیب کی اشاعت کی حمایت کرنا پڑی۔ محض ذاتی مفاد نے انکو مجبور کیا کہ ملک کو پُرامن اور خوشحال بنائیں تاکہ نفع اٹھائیں۔"

ایشیائی مطلق العنان سلطنت کے بجائے ذمہ دار حکومت کے قائل ہو گئے۔ اب ہر طرف یہی جذبات ہیں اور ہندوستان نے بھی ایشیا کے اور ملکوں کی طرح ذمہ دار حکومت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ایشیا مغرب سے متنفر ہے۔ اور پرانے زمانہ کو آہیں بھر بھر کے یاد کیا کرتا ہے اور اس زمانہ کو زریں عہد شمار کیا جاتا ہے۔ وہ کیا پرلطف زمانہ تھا

کہ اپنی نیند سونا اور اپنی نیند اُٹھنا معمول تھا۔ اب کاروباری زندگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ منٹ منٹ کی گھبراہٹ ہے۔ وہی مغربی تگاپو اور جلد بازی ہے اور قناعت مفقود ہے۔ اطمینان میسر ہے نہ دلجمعی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ مغربی تسلط نے ایشیائی خود مختاری کا جگہ جگہ خاتمہ کر دیا۔ اور جنگ عظیم نے جو اُمیدیں ایشیائیوں کے دلوں میں پیدا کر دی تھیں اور جن کے متعلق کُھلم کُھلا وعدے کیے تھے، وہ محض سراب ثابت ہوئے۔ اس سے عام بےچینی پھیل گئی۔ یہ فصل اس طرح ختم ہوتی ہے:

> "آج تو یہ حالت ہے کہ مشرق جو قدیم اور جدید کے نزاعات میں منقسم ہے وہ اُس یورپ کے مقابل ہے جو نااتفاقیوں سے پاش پاش اور اپنی حماقتوں میں مبتلا ہے۔ غالباً اس سے قبل کبھی بھی دونوں دنیاوں کے باہمی تعلقات میں ایسے بے شمار اور فتنہ انگیز امکانات کا موقع نہ تھا۔ یہاں پر قابل لحاظ یہ امر ہے کہ یہ اجنبی جدید مشرق جو ہمارے مقابل ہے زیادہ تر اُن مغربی اثرات کا نتیجہ ہے جو گذشتہ سو سال سے عدیم المثال طور پر مشرق میں اپنا عمل کر رہے ہیں۔"

چوتھی فصل میں "سیاسی تبدیلی" کا ذکر ہے کہ لوگوں کے عقائد میں تبدیلی ہو رہی ہے مطلق العنانی کے بجائے اب جمہوریت کی طرف میلان عام ہو رہا ہے۔ صاف طور پر کہا جا رہا ہے کہ مطلق العنان حکومت بدتر حکومت ہے۔ ترکی اور ایران کی آنکھیں کُھل گئی ہیں۔ اسلام جب تک جمہوریت پر چلتا رہا معراج ترقی پر رہا۔ خلفائے راشدین کا زمانہ اصلی جمہوریت کا آئینہ تھا۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے:-

> "واہبری کہتا ہے "اسلام اسوقت بھی دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری مذہب ہے یعنی یہ ایسا مذہب ہے جو حریت اور مساوات کا حامی ہے۔ اگر کبھی بھی کوئی دستوری حکومت تھی تو وہ خلفائے راشدین کی تھی"۔ مشرق ادنیٰ کا ایک بڑا انگریز ماہر بیان کرتا ہے "جمہوری سلطنت کی حقیقی اور صحیح تصویر قبائل عرب ہی میں ملیگی اور عرب قبیلہ کا ہر فرد اس جمہوریت کے قیام کے لیے ہر وقت مسلح رہتا ہے جیسا کہ بہت سے شخصی حکومت کے خواب دیکھنے والے بہت کچھ کھو کر واقف ہو گئے ہیں"۔ ....
>
> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عقلمند ترین اصحاب سے مشورہ فرماتے تھے۔ علما بھی زمانہ موجودہ تک باہم مشورہ کرتے رہے ہیں۔ قانون مقدس یعنی اسلامی شریعت اصلاً جمہوری ہے - اور

اصلاً مطلق انسانی شخصیت کے خلاف ہے۔"

اسکے بعد مصنف ہندوستان کی حالت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اس ملک میں ہندوؤں کی ذاتوں کی تمیز دستوری حکومت کے راستہ میں حائل ہے۔ برہمن اپنے آپ کو "منجانب اللہ ملک کا حکمراں سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو حق رائے دہندگی سے بھی باز رکھنا چاہتے ہیں۔" آخر اس نے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان اصلاً و طبعاً جمہوریت کے ناقابل ہے اور بہت سے دوراندیش ہندی محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان سلف گورنمنٹ کے قابل نہیں ہوا ہے۔ اور اگر برطانوی اثر یہاں سے ہٹ جائے تو یہ ہندوستان کے لیے ایک بڑی مصیبت ہوگی۔ انگریزوں کا منشا ہندوستان میں ہندوؤں کو حکومت عطا کرنا نہیں ہے بلکہ سب چھوٹے بڑوں میں مساوات کے جذبات پھیلانا اور سب کو دنیاوی نعمتوں سے بہرہ ور کرنا ہے۔ مساوات کے سبق دے کے سب کو جمہوریت کے لیے طیار کیا جا رہا ہے۔ آخر میں مصنف لکھتا ہے:

"جنگ عظیم نے مشرقی قوم پرستوں کی توقعات کو ایسا توی اور یورپی اقتدار و قوت کو ایسا ضعیف کر دیا ہے کہ مشرق پر یورپ کا تسلط عام طور پر کم ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ برا ہو یا اچھا لیکن بظاہر یہ ناگزیر ہے کہ ایک پشت یا ایک قرن کے بعد مشرق ادنیٰ و وسطیٰ کا بڑا حصہ خود مختار یا بالکل آزاد ہو جائے گا۔"

دوسری فصل کی طرح پانچویں فصل بھی دلچسپ ہے۔ سچ پوچھو تو یہی دونوں فصلیں اس کتاب کی جان ہیں۔ یہ فصل سب فصلوں سے زیادہ طویل ہے۔ مصنف نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ قوم پرستی کے مختلف منازل کو تینوں حصوں میں جداگانہ زیر بحث لایا ہے۔ نسل اور قوم کی تمیز اس نے اس طرح کی ہے:

"قومیت اور نسل میں کیا فرق ہے؟ بدقسمتی سے ان دونوں اصطلاحات کا اگر بطور مرادف کے نہیں تو نہایت لاپروائی سے استعمال کیا گیا ہے ...... امر واقعہ یہ ہے کہ ان اصطلاحات سے بالکل مختلف امور مراد ہیں۔ قومیت ایک ذہنی ادراک یا دماغی کیفیت ہے۔ نسل ایک جسمانی واقعہ ہے جس کی صحیح تحقیق علمی آزمایش سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً کاسۂ سر کی پیمایش۔ بالوں کی ساخت۔ اور آنکھوں اور کھال کا رنگ۔ یہ الفاظ دیگر انسانوں کی جو کیفیت جسمانی

ساخت کے لحاظ سے ہے اُسے نسل کہتے ہیں اور جماعت جو کچھ اپنے آپ کو سیاسی طور پر سمجھتی ہے اُسے قومیت کہتے ہیں۔"

اس تعریف کے بعد اُس نے دکھایا ہے کہ جنگ عظیم نسلوں کی لڑائی تھی۔ قومیت کا خیال سب سے پہلے ترکوں میں پیدا ہوا۔ گو مصنف اس پر حیران ہے۔ کیونکہ اسلام خود چند لحاظ سے قومیت کا مخالف ہے: "کل مومنٍ اخوۃ" کا اسلامی مسئلہ اور امامت یا عام خدائی جمہوریت کا اسلامی سیاسی نصب العین خالص قومی اماد کی شہنشاہی کی استقامت کا قدرتی طور پر سدِ راہ ہوا۔"
ہمارے ہندو برادرانِ وطن ہم پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ مسلمان پُرانے قصوں کو یاد کر کرکے "پدرم سلطان بود" کی رٹ لگائے رہتے ہیں اس سے ہندی قومیت کو صدمہ پہونچتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک ہندوستان سے مطلق ہمدردی نہیں۔ باہر کی مسلمان قوموں کے حسرت و غم سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں وغیرہ۔ لیکن اُنھیں پُرانی تاریخوں کی اہمیت کا اس لیے احساس نہیں ہو سکتا کہ اُنکے اجداد کو بھی تاریخ کی تدوین وغیرہ کا ذرا بھی شوق نہ تھا۔ بااین ہمہ آج ہم لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی اس یادِ گذشتہ کے جذبہ سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اپنے اخباروں میں زمانۂ سلف کے راجپوتوں کی جھوٹی سچی کہانیاں لکھ لکھ کے اپنے ہم قوموں کے جذبات کو برانگیختہ کیا کرتے ہیں۔ تاریخ کے قومی ارتقا میں مدد و معاون ہونے کا تازہ ثبوت خود ترکی ہے جس کے متعلق مصنف لکھتا ہے:۔

"یورپ کی طرح ترکی میں بھی قوم پرستی کی تحریک تاریخی روایات کے احیا اور زبان کی صفائی سے شروع ہوئی۔ نصف صدی قبل ترک اپنی اصل اور تاریخ سے بالکل نابلد تھے۔ اُن کو اپنے اجداد کے جنگی کارنامے اور اپنی سلطنت کے ولولہ انگیز واقعات محض قصص اور خواب و خیال کی طرح یاد تھے اور وہ قومی تاریخ کے پڑھنے سے غافل تھے۔ دولت عثمانیہ کی فتوحات کے واقعات جو دنیا کے تین بڑے اعظموں سے تعلق رکھتے تھے عوام کے لیے ایسے دلچسپ نہ تھے جیسے کہ مذہبی مباحث یا آنحضرت صلعم کی حیات کا تذکرہ اور ابتدائی اسلام کے حالات۔ پیشوایانِ قوم پرستی نے اپنے ہم وطنوں کو اُن کی تاریخی عظمت بتا کر گذشتہ پر افتخار اور آیندہ کے لیے اعتماد سکھایا۔"

مغرب کے تسلط اور تعدی نے اس تحریک کو اُبھارا۔ سلطان عبدالحمید خاں کی تحریک بین اسلامی نے عربوں کے جذبات نفرت کو ٹھنڈا کر کے ترکوں سے متحد کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی ان میں سرسراہٹ نظر آجاتی تھی جو اپنے آپ کو آنحضرت صلعم کا ہمقوم سمجھ کے ترکی حکومت کو طوق غلامی تصور کرتے تھے۔ مختلف اوقات میں اُنھوں نے ہنگامہ آرائیاں کیں مگر سلطان عبدالحمید خاں کے تدبر نے اس آگ پر پانی کا کام کیا۔ لیکن اب

"قوم پرستوں نے علانیہ طور پر کہا کہ ترکی کے طوق غلامی کو اُتار ڈالا جائے۔ اور عرب ممالک کو ایسی جماعت میں منسلک کیا جائے جس کا سرگروہ ایک مذہبی با اختیار غالباً شریف مکہ ہو۔ دراصل اس کا منشا یہ تھا کہ مغربی قوم پرستی کو ایک خدائی جمہوریت کے قدیم نصب العین کے مطابق بنایا جائے جس کی تکمیل کی خلافت اور نجد کی وہابی حکومت کی صورت میں پہلے ہی ہو چکی تھی۔"

ان جذبات کو جنگ عظیم میں اتحادیوں کے ابلہ فریب وعدوں سے تقویت پہونچی۔ عربوں نے بغاوت کر کے ترکوں کی پشت میں جب وہ دشمن سے برسرِ جنگ تھے خنجر بھونک دیا۔ اتحادیوں کو اس سے اس قدر فائدہ پہونچا کہ ترک اور اُنکے اتحادی مغلوب ہو گئے۔ جب صلح ہوئی اور عربوں سے ایفائے وعدہ کا وقت آیا تو اُنھیں معلوم ہوا کہ ایک جال تھا جس میں اُنھیں پھانسا گیا۔ ایک انگریزی قصے کے مطابق اُنھوں نے بلی کے پنجے کا کام دیا جو بندر نے بھڑکتی ہوئی آگ میں سے اخروٹ نکالنے کے لیے بلی سے عاریۃً لیا تھا۔ اب عربوں میں اشتعال پھیل رہا ہے اور وہ اُس وقت کو پچھتا رہے ہیں جب اُنھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو دھوکا دے کے اُنھیں مروا ڈالا۔ شریف مکہ کی ناعاقبت اندیش رہنمائی میں خدا جانے اُنھیں اور کیا کیا روزِ بد دیکھنے پڑیں گے۔ نام نہاد آزادی کے بعد اُس نے دامنِ خلافت ہاتھ میں لیا ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ حاجی اُنکی جان کو روتے ہیں۔ اور جو آرام ترکوں کے زمانے میں حاجیوں کو ملا کرتا تھا اب خواب و خیال ہو گیا ہے۔ یہی نہیں جانیں بھی خطرے میں پڑ گئی ہیں۔ چنانچہ مسلم آوٹ لُک لاہور، ہمدم لکھنؤ کے ایک خاص نامہ نگار کی چٹھی کا ذکر کرتا ہے کہ ۲۲ ہزار حاجیوں کا قافلہ جس میں زیادہ تر جاوا کے مسلمان تھے حج سے پہلے مکہ سے مدینہ روانہ ہوا۔ شاہ حجاز کی ہدایات کے مطابق ہر حاجی کو

۵ روپیہ فی اونٹ دینا پڑا۔ چنانچہ ان غریبوں نے رقم مطلوبہ ادا کی اور وہ حضور رسول مقبولؐ کے روضہ پر حاضری دینے کے لیے روانہ ہوئے۔ شتربانوں کو صرف ۵ روپیہ فی اونٹ دیا گیا اور اُن کے ذہن نشین کیا گیا کہ شریف نے صرف ۵ روپیہ فی اونٹ اپنا حق رکھا ہے۔ سفر کی پانچ منزلیں طے ہوئی تھیں کہ اونٹ والوں کو معلوم ہوا کہ تقدس مآب خلیفۂ خانہ ساز نے ۵ روپیہ کا تو صرف بہانہ ہی کیا تھا، اُس نے فی اونٹ ۵ روپئے سے کم نہیں لیا۔ چھ ہزار بدوؤں کی پنچایت مدینہ سے دو دن کی مسافت پر منعقد ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شریف سے یہ رقم واپس مانگی جائے۔ اور اگر وہ دینے سے انکار کرے تو حاجیوں کو ربغ پر جو مکہ سے پانچویں منزل پر ہے اُنکی قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔ اس نام نہاد "شاہ" نے اُس نگلی ہوئی رقم کو جیسی کہ توقع تھی اُگلنے سے صاف انکار کر دیا۔ ربغ جھلسنے والی تپش، صحرائے بے آب وگیاہ کے لیے مشہور ہے۔ شریف کے انکار سے بہت سے اونٹ والوں نے حاجیوں کو اس جنگل بیابان میں چھوڑ کر اپنے گھر کی راہ لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً دو ہزار حاجی وہاں مرگئے اور اُنکی گلی ہوئی ہڈیاں شریف کی جان کو دعائیں دے رہی ہیں اور حالات موجودہ پر مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔

خیر۔ عربوں کی موجودہ حالت کس نہج پر قائم رہے گی اور اس کا کیا انجام ہوگا خدا کو معلوم ہے۔ مصنف نے عربوں کے ساتھ ساتھ مصری قوم پرستی کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح مصطفےٰ کامل کے زمانہ میں اس تحریک کو ترقی ہوئی اور اُسکے بے وقت انتقال سے احمد فرید بے کے زمانہ میں کس طرح شدت اختیار کی گئی اور پھر برطانیہ نے کیا کیا سختیاں کیں اور باب ذغلول کے زمانہ میں یہ قوم پرستی کس درجہ پر ہے۔ عارضی خلیفہ کے خواب ۱۹۱۲ء کے برطانیہ کے اعلانِ صیانت سے درہم برہم ہوگئے۔ بربرہ میں اتحادِ قومیت نہ تھا لیکن فرانسیسی تسلط نے وہاں بھی اشتراکِ عمل پیدا کر دیا۔ مصنف نے اتحاد بین الاتراک و بین التوران کا ذکر کیا ہے کہ یہ جنگ عظیم میں ظاہر ہوئے۔ بالشوک تحریک سے بین التورانی اتحاد والوں کو بڑی مسرت ہوئی اب ساری اسلامی دنیا میں ایک جوش رونما ہوگیا ہے :۔

"یہ ایک سیل عظیم ہے جو ایشیا و ہندوستان اور افریقہ کی کُل اسلامی دنیا پر موجزن ہو.....

ممکن ہے کہ بین الاسلامی قوم پرستی اس طرح مستقبل میں ایک جزوِ عظیم ہو جائے جس کا مقابلہ نہایت سنجیدگی سے کرنا ہوگا"۔

مصنف نے ترکی اور مصری ہیجان کا مفصل ذکر کیا ہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی تحریک اور فتحیابی کا عمدہ خاکہ کھینچا ہے۔ وہ ان سب کی وجہ صلح کا نمایشی ہونا بتاتا ہے۔ دول کی نا اتفاقی سے اس جوش کو تقویت پہونچی۔

فصل ششم میں مصنف نے "ہندوستان میں حمایتِ قومی کا تذکرہ کیا ہے۔ ہندوستان کی معاشرت اور ہندوؤں کی ذات پات کے قاعدہ کی تفصیل کے بعد اُس نے نتیجہ نکالا ہے کہ

"متعدد انتخابات میں برہمنوں نے نیچ ذات رالے ہندوں کے دل میں ملکی ووٹ کے یہ ڈر پیدا کر دیا ہے کہ جو برہمن کو ووٹ نہ دیں گے وہ ذات باہر کیے جائیں گے اور پھر ایسے ایسے اچھوت ہو جائیں گے جن کو ہندو معاشرت میں کوئی حق حاصل نہ ہوگا"

مصنف نے ہندوستانی بیچینی کے منازل کانگریس کے ابتدائی انعقاد سے لے کے ۱۹۰۵ء کے تقسیم بنگالہ، بم بازی، کا ذکر کرتے ہوئے رولٹ ایکٹ کی بیچینی عدم تعاون کی تحریک تک بیان کیے ہیں۔ وہ آخر میں لکھتا ہے۔

"حقیقت معاملہ یہ ہے کہ آج ہندوستان ارتقائی اور انقلابی تبدیلی کی قوتوں کی رزمگاہ ہو۔ یہ پُر شور و شر زمانہ ہے۔ پُرانا نظام بالبداہتہ گذر رہا ہے اور نیا نظام ہنوز نظر نہیں آتا۔ اس وقت اچھائی اور خرابی دونوں کے بڑے امکانات ہیں اور نتیجہ کے لیے کوئی شخص یقینی طور پر پیشین گوئی نہیں کر سکتا"

فصل ہفتم میں اقتصادی انقلاب پر بحث ہے۔ کسی زمانے میں ہندوستان کی دستکاری مشہور تھی۔ دُور دُور اسکی مصنوعات جاتی تھیں۔ لیکن اُن میں وقت زیادہ لگتا تھا۔ اور اس قدر گراں تھیں کہ ہر کس و ناکس ان سے مستفید نہ ہوتا تھا۔ کپڑوں کے متعلق ذیل کی تحریر کافی ہے۔

"اس پارچہ بافی کی خوبصورتی اور نفاست کا حال حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ململ کا ایک باریک تھان جو ۱۵ گز لمبا اور گز بھر عرض کا تھا اسکا وزن صرف نوسو گرین یعنی تقریباً ایک چھٹانک تھا یہ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی نے اپنی لڑکی

کو اس امر پر سرزنش کی کہ اُس کا لباس کافی ستر پوش نہ تھا باوجودیکہ شہزادی نے کہا کہ میں ململ کی سات تہ پہنے ہوئے ہوں"

مغرب کی سستی چیزوں نے دیسی مصنوعات کو برباد کر دیا۔ لیکن اب سیاسی بے چینی نے اقتصادی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ دیسی مصنوعات رواج پکڑتی جاتی ہیں۔ مغرب کے سے کارخانے جاری ہوگئے ہیں اور اب میلان طبع یہ ہے کہ یورپ کے مقابلہ میں ہر چیز مشرق میں ہی تیار کی جائے۔

فصل ہشتم میں معاشرتی انقلاب اور فصل نہم میں معاشرتی بے چینی اور بوالشوزم کا ذکر ہے۔ اور آخر میں نتیجہ پر مصنف نے کتاب کو ختم کر دیا ہے کہ

"موجودہ شکایت جو عظیم ہونے کے ساتھ ہی مبہم بھی ہے اس فوز امید مشرق کی دروزہ ہی ثابت ہوگی جو نئی دنیا میں عنقریب اپنا مقام اور وقار حاصل کرنے والا ہے"

یہ اس کتاب کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتاب اس قسم کی ہے کہ اسے شروع سے آخر تک غور سے پڑھا جائے۔ اور یہی منشا مترجم صاحب کا ہے کہ ابنائے وطن اس کتاب کے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھیں اور اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں۔ جو برائیاں ہیں انھیں دور کریں اور جو فرائض اُنکے ذمہ ہیں اُنھیں ادا کریں۔

مصنف نے بہت صاف گوئی سے کام لیا ہے اور دقیق مسائل پر بہت کچھ غور و خوض کیا ہے۔ چنانچہ وہ شہنشاہیت کے اصول لارڈ کرومر کے الفاظ میں اس طرح ضبط تحریر میں لاتا ہے:

"شہنشاہی حکمت عملی بلا شبہ عاقلانہ دوراندیشی سے نافذ ہونا چاہیے۔ اقوام محکوم سے ہمارے تعلقات جن اصول حکومت کی بنا پر قائم ہوتے ہیں وہ سیاسی اور اقتصادی طور پر صحیح اور اخلاقی طور پر قابل استدلال ہونا چاہییں۔ فی الحقیقت یہ شہنشاہی محراب کی درمیانی زینت ہے شہنشاہیت کا اصل جواز ان کاموں سے ثابت ہوتا ہے جن میں شہنشاہی قوت صرف کی گئی ہے۔ اگر ہم اپنے اختیارات کا اچھا استعمال کریں تو ہم مستقبل کا مقابلہ بلا اس خوف کے کر سکتے ہیں کہ ہم اس قہر الٰہی میں گرفتار ہوں گے جو سلطنت روما کی بد نظمی پر نازل ہوا تھا۔ اگر معاملات اسکے برخلاف ہیں تو برطانوی سلطنت کا زوال واجب ہے۔ اور بالیقین آخرکار اُس کو زوال ہوگا"

مصنف نے عالمگیر بےچینی کے اسباب یہ بتائے ہیں کہ (۱) حاکم و محکوم میں اجنبیت پائی جاتی ہے۔ حاکم اپنے آپ کو ایک طرف کھینچتا ہے اور محکوم سے ملنا گناہ سمجھتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ محکوم اقوام کے دلوں میں زبردست منافرت پیدا ہو گئی (۲) تسلط کی شدت (۳) شہنشاہیت (۴) وعدہ خلافیاں۔

مشرقیوں کی نظر میں اس جنگ کی تلافی آزادانہ نظام عمل تھا۔ جس کو اتحادی مدبرین نے اپنے پرچموں پر ثبت کیا تھا۔ لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور اتحادیوں کو فتح حاصل ہوئی تو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ عین اُسوقت میں جبکہ اتحادی لیڈر آزادی کے وعدوں سے لبریز تقریریں کر رہے تھے تو اسی کے ساتھ وہ تجزیۂ مشرقِ ادنیٰ کے لیے آپس میں نہایت حریصانہ ملک گیری کی خاطر متعدد خفیہ عہدنامے طے کر رہے تھے .... یہی خفیہ عہدنامے تھے جن کی بنا پر... کل مشرق ادنیٰ و وسطیٰ یورپ کے سیاسی تسلط کے تحت میں آگیا۔

مصنف نے اس منافرت کی خلیج کو پُر کر دینا دونوں براعظموں کے لیے بہتر تصور کیا ہے چنانچہ لکھتا ہے

مشرق اور مغرب دونوں نے ماضی میں ترقی کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور مستقبل کے لیے ان سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں لیکن جو کچھ بھی حقیقتاً قابل قدر خدمت کر سکتے ہیں وہ اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ دونوں فی نفسہٖ اپنی اصلیت پر قائم رہیں۔ اختلاط نسل سے انکی اصلی روح خراب ہوگی جس کا نتیجہ ہولناک دوغلہ پن ہوگا اور جس سے صرف انحطاط و تنزل ہی پیدا ہوگا۔

مصنف نے اسلام میں زبردست جمہوریت ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اس موقع پر اس نے حضرت ابوبکرؓ کا خطبہ نقل کیا ہے۔

اے قوم تم نے مجھ کو جو تم میں سب سے زیادہ ناقابل ہے اپنا خلیفہ منتخب کیا ہے۔ جب تک میں انصاف پر عمل کروں میری مدد کرو۔ اگر اسکے خلاف کروں تو مجھ کو نصیحت کرو اور انجام دہی فرائض کی یاد دلاؤ۔ چونکہ میں کمزور کا حامی ہوں میری اُسوقت تک اطاعت کرو جب تک کہ میں شریعت کا اتباع کروں۔ اور اگر تم یہ دیکھو کہ میں ذرہ بھر بھی شریعت سے انحراف کرتا ہوں تو میری اطاعت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

شخصی حکومت کی بُرائی بھلائی پر مصنف نے اچھی طرح بحث کی ہے جو قابل دید ہے۔ اس نے دکھایا ہے

کہ اچھی شخصی حکومت کے لیے زبردست اور طاقتور آدمی کی ضرورت ہے جس کی قابلیت اور جوش حیرت انگیز نتائج پیدا کرتے ہیں۔

اس کے عزم اور عمل سے وہ قوت محرکہ پیدا ہوتی ہے جو اسکے ماتحتوں کو کافی قابلیت سے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ نالائق اور بے ایمان کی سزا ایسی سختی سے دی جاتی ہے جیسی کہ ایرانی شاہ نے ایک ظالم صوبہ دار کی کھال زندہ کھنچواکر منصب کی کرسی کو منڈھوایا اور جدید گورنر نے اس پر بیٹھ کر معدلت گستری کی۔

وہ کہتا ہے کہ ایسے طاقتور آدمی کا بیٹا اکثر کمزور ہوتا ہے اور اُس میں باپ کی وہ قابلیتیں وراثتاً نہیں پہونچتیں جس کا نتیجہ خراب نکلتا ہے اور رعایا کو مصائب کا سامنا ہوتا ہے۔

مصنف نے ہندو مسلمانوں کے نقاطِ نظر کے فرق کو نہایت خوبی سے اس طرح دکھایا ہے۔

ہر جگہ کے مسلمانوں کے پیش نظر دو چیزیں ہیں - عرب جمہوریت کی سیاسی مثال اور ایسے مذہب کی تعلیم جس میں وسیع الخیالی کے رجحانات بہت زیادہ ہیں - خواہ یہ رجحانات اس مذہب کے متبعین کے باہم ہی کیوں نہ ہوں - ہنود کے پیش نظر نہ ایسی مثال ہے نہ ایسی تعلیم مذہب - انکی سیاسی روایت تو عملاً مشرقی تجرد و تشدد کا سلسلہ ہے جس کے مصائب سے کبھی نجات ہی نہ ملی - مستثنیات محض یہ ہیں کہ اوائل ایام میں چند ابتدائی خود اختیاری حکومت کی جماعتیں تھیں جن کا دائرۂ اثر کبھی وسیع نہ ہوا اور جو بہت جلد فنا ہوگئیں - مذہب براہمہ یعنی ہندو مذہب غالباً سب سے زیادہ تنگ نظر اعتقادات کا مجموعہ ہے جو بنی نوع انسان پر مسلط ہوا کیونکہ یہ جماعت کو ایسے لا انتہا غیر متبدل ذاتوں میں منقسم کرتا ہے جنکے درمیان کوئی باہمی ربط ممکن ہی نہیں - ہر ذات اپنے سے کمتر کو ناپاک و اچھوت اور جانوروں کے برابر سمجھتی ہے - یہ ظاہر ہے کہ ایسے موانع کی موجودگی سے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہنود کے لیے حقیقی سلف گورنمنٹ کا قائم کرنا زیادہ دشوار ہوگا۔

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے متعلق صفحات ۲۵۴ - ۲۵۵ پر مترجم کا حاشیہ بہت زبردست ہے اور معلوم ہوتا ہے بہت ہی غور و خوض سے لکھا گیا ہے - وہ لکھتے ہیں کہ اتحاد کے تین وجوہ ہو سکتے ہیں - اشتراکِ خیال - اشتراکِ اغراض - اور مشترک منافرت - اشتراکِ خیال کے متعلق وہ مایوسی

ظاہر کرتے ہیں کہ جب ایک ہی ملت کے مختلف طبقات میں اشتراکِ خیال نہ ہو تو بدیگراں چہ رسد۔ اشتراک اغراض کے متعلق بھی ان کا جواب نفی میں ہے کہ ہندو محض اپنے آپ کو اس ملک کے باشندے تصور کرتے ہیں اور دوسروں کو دخل بیجا کا مرتکب۔ اسی وجہ سے انھوں نے پہلے تو مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ جب اس اشتراک سے فوری فائدہ نہ پہونچا تو اب انکا غصہ مسلمانوں پر پڑا کہ یا تو وہ ہندو قوم میں جذب ہوکے ایک نئی ذات قائم کریں اور یا وہ ہندوستان سے فنا ہو جائیں چنانچہ شودھی اور سنگھٹن کے سلسلے جاری کیے گئے۔ جس کا خمیازہ دہلی بھگت رہا ہے۔ اندیشہ ہے کہ یہ وبا دوسرے شہروں میں نہ پھیل جائے گو کم و بیش ہر جگہ موجود ہے لیکن اس قدر کشت و خون کی نوبت یک وقت کہیں نہیں آئی۔ خود ہندوؤں میں بھی کشمکش ہے۔ اسوقت بظاہر متفق نظر آتے ہیں کہ کسی طرح شودھی پھیلے۔ لیکن وقت بے وقت مواد پھوٹ نکلتا ہے۔ چنانچہ وائیکوم ستیہ گرہ کی مثال تازہ ہے کہ برہمن وہاں کے اچھوتوں کو اس قدر حقیر تصور کرتے ہیں کہ ایک خاص فاصلہ پر اچھوت کو کھڑا ہو جانا پڑتا ہے۔ تاوقتیکہ برہمن گذر جائے اور خاص خاص راستوں پر ان غریبوں کو نکلنے کا حکم نہیں۔ اسی کے دور کرنے کے لیے وہ زندانوں کو پُر کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام

انگریز حاکم ضلع کو پسند کرتے ہیں اور دائمی و ابدی سکوت میں رہنے کے طالب ہیں۔ انکو انگریزوں پر اس لیے اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ سے غریب پرور ہیں۔ اور وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ اور ایمان داری کے لیے مشہور ہیں۔"

رہی مشترک منافرت۔ یہی اس اتحاد کی محرک ہوئی تھی۔ سلطنت سے دونوں کو نفرت تھی۔ "حصولِ مدعا کی ناکامیابی اور وجوہِ منافرت میں کمی پیدا ہونے سے وہ اتحاد غائب ہو گیا۔"

اس تنقید میں میں اس پر بہت کچھ بحث کرنا چاہتا تھا لیکن اب وقت موزوں نہیں رہا۔ چاروں طرف بےچینی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی بحث سے اجتناب مناسب ہے جس سے خواہ مخواہ دیں و قال مشتعل ہو۔ اسکے علاوہ تنقید ختم کرنے کی جلدی ہے۔ کم فرصتی کی وجہ سے اس میں غیر معمولی دیر ہوئی۔ اکثر ایسا ہوا کہ دو سطر لکھ کے اپنے کسی اور کام میں مصروف ہو جانا پڑا اور پھر پانچ چھ دن بعد قلم تنقید کے لیے ہاتھ میں لینا پڑا۔ پھر آدھا صفحہ لکھا اور مضمون کئی دن کے لیے رکھ دیا گیا۔

اشاعت اسلام کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے غور سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔

اسلامی بیداری کے پہلے جھونکے نے اشاعت دین کی سلگتی ہوئی چنگاریوں کو نئے جوش سے جوش زن کر دیا۔ اور یورپ کے سوا ہر جگہ اسلام نے اپنی دور دراز سرحدوں پر توسیعی ترقی شروع کی (مصنف اس جگہ غلط بیانی کر رہا ہے۔ اسے اس کا علم نہیں۔ خود انگلستان میں اسلام سرعت سے پھیل رہا ہے اور قادیانی جماعتیں مختلف مغربی ملکوں میں اسلام کی اشاعت میں کامیاب جدوجہد کر رہی ہیں۔ محمد ظفر) ایک حد تک ہر مسلمان فطرۃً مبلغ ہے اور طبعاً اپنے مذہب کو غیر مسلم ہمسایوں میں شائع کرتا ہے لہذا یہ کام صرف مذہبی ماہرین دین ہی نے نہیں کیا بلکہ بیشمار سیاح۔ تجار۔ اور غریب تارکان وطن مزدوروں نے بھی سر انجام دیا۔ بلا شبہ بہت سے فدائیان ملت نے اپنی زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی۔ مذہبی جماعتوں پر یہ بالخصوص صادق آتا ہے۔ سنوسیوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ اور اُن قدرتی خانقاہوں یعنی نخلستان صحارا سے ہزارہا مربوط (ڈاہد) جن کی آنکھیں نور اسلام سے منور اور سینے جوش سے معمور تھے اسلام کی عجیب و غریب تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ از منۂ متوسطہ کے نصرانی گداگر راہبوں کی طرح جوش مذہبی سے مشتعل تھے۔ پچھلی صدی میں مغربی اور وسطی افریقہ کے حبشیوں میں اسلامی تبلیغ کی کامیابیاں غیر معمولی تھیں۔ ہر صاف دل یورپی ناظر ایک ہی قصہ بیان کرتا ہے۔ بیس سال ہوئے ایک انگریز نے بہت ٹھیک لکھا کہ اسلام وسط افریقہ میں حیرت انگیز ترقی اور باطل پرستی کا استیصال کر رہا ہے۔ اسکے مقابلہ میں عیسائی تبلیغ ایک خرافات ہے ۔۔۔۔۔۔ اسلام کو اپنی کامیابی پر اس قدر وثوق ہے کہ وہ اپنے سب سے اہم رقیب یعنی نصرانیت سے بالکل بے پرواہ ہے عیسائی تو فتح افریقہ کے خواب ہی دیکھتے رہے مگر مسلمان اُسکی تعبیر پوری کر رہے ہیں اسلام جنوب میں جس قدر بڑھ رہا ہے اس کا ثبوت حال کے ایک واقعہ سے اچھی طرح ہوتا ہے۔ چند سال ہوئے کہ افسران برطانیہ کو دفعۃً معلوم ہوا کہ اسلام نیاسا لینڈ پر تسلط کر رہا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ زنجباری عربوں کی کارگذاری ہے۔ اُنھوں نے اپنی تبلیغ سنہ ۱۹ ء میں شروع کی۔ دس سال بعد جنوبی نیاسا لینڈ کے ہر موضع میں ایک اسلامی معلم اور خس پوش

مسجد موجود تھی - اگرچہ یہ تحریک علانیہ یورپین کے خلاف تھی لیکن برطانوی حکام کو دوسری جگہ کے فسادات کے ڈر سے اسکو دبانے کی جرأت نہ ہوئی - بہت سے یورپی ناظرین کو اندیشہ ہے کہ کوئی دن جاتا ہے کہ اسلام دریائے زنبیسی کے پار جاکر جنوبی افریقہ میں داخل ہو جائے گا -

ایک اور جگہ مصنف کی ذیل کی تحریر شودھی کی صدائے بے ہنگام کا نہایت موزوں جواب ہے -

اسلام کے عظیم اتحادی احساس سے غالباً سب سے بڑا پتہ اس امر کا چلتا ہے کہ اسلام کا اپنے پیروؤں پر ایسا زبردست اثر کیوں ہے - کسی دوسرے مذہب کا اپنے پیروؤں پر ایسا اثر نہیں ہے - اسلام نے نصرانیوں اور ہندوؤں[1] کے وسیع ممالک فتح کیے اور مجوسیت کو روے زمین سے نکال دیا - لیکن ایسی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ جو قوم ایک مرتبہ مسلمان ہوگئی اُس نے کبھی بھی ترک مذہب کیا ہو - یہ ممکن ہے کہ وہ بالکل مٹ گئے ہوں مثلاً اسپین میں مور - لیکن مٹ جانا ارتداد نہیں ہے ....

ترجمے میں بعض جگہ سلاست بالکل جاتی رہی ہے - بعض جگہ ترجمہ کی اُلجھن میں اُردو فقرے اس قدر پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ پڑھنے والا اُکھٹ اُکھٹ گرتا ہے مثلاً

اس وقت سے یورپ کے امکانی تمدن اور بے رحمانہ مایوس کن جہالت میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی -

ہر عمیق تبدیلی میں ناکارہ فصل لازمی ہے -

انسانی تاریخ میں قسمتوں کے سب سے بڑی تبدیلی کی صف آرائی و توسیع پذیر ہوگئی -

قدیم مشرق میں حیات کی بڑی بازی تھی -

اور اسی قبیل کی دیگر اقوام کی آبادی کی وجہ سے اتحادیین التورانی کے مؤیدین کو تورانی زمین پر مختلف ضخامت کی سلافی تہ معلوم ہوتی تھی -

مسلمانوں کی بیداری کی اصلاحانہ شروعات فوراً آبادہ تعمیری راہوں پر دست پذیر ہوئیں

---

[1] اسلام نے صرف مذہب برہمہ کے وطن ہندوستان ہی میں قدم نہ جمایا بلکہ جزیرہ ہائے جاوا و سماترا کی تقریباً کل آبادی کو مسلمان بنالیا جہاں کہ مذہب برہمہ کا پہلے بہت زور تھا -

یہ لوگ نہایت پختہ اختصاص پسند ہیں"۔

"ہم میں سے ہر شخص سے میرا یہ سوال ہے کہ آیا اُسکو اپنی زندگی کے کسی اہم ترین موقعہ پر ایک بڑے خاندان کی پرورش ہی حاجت نہیں آتی ہے اور آیا اس کفالت کی بدولت ترقی کے ان موانع پر جو ابتدائی استعداد و اہلیت اور غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے حاصل تھے اثر نہ پڑا ہو"

اکثر جگہ ترجمہ میں بہت زیادہ انگریزیت ہے۔ چند فقرے نمونہ کے طور پر پیش ناظرین کیے جاتے ہیں:

"نصرانی مغرب سے جو ازمنہ مظلمہ کی تاریک شب میں چھپا ہوا تھا اسلامی مشرق کا کھلا ہوا تقابل تھا"۔

انقلاب کا تموج ہوا میں ظاہر تھا"۔

محرک ان خانہ بدوش اقوام کے مغربی شعبے تھے۔

چند ورس گاہیں جو ہولناک زوال میں باقی تھیں۔

مشرق پر مغرب کا موجودہ اثر بالکل ہی جدید ہے۔

یہ اس طور پر ان قوتوں کے ارتباط کے لیے جو احیاء مشرق کے لیے سرگرم عمل تھیں ہاتھ کا اشارہ تھے

وہ جوان ہوکر شاندار ظالم..... ہو جاتا ہے۔

ہر جگہ پُرخطر شورش کی کاشت کرکے اپنا اتحاد قائم کرنا چاہتی ہے۔

مغربی سرمایہ مشرقی ممالک میں بہنے لگا۔

روز افزوں موت کی نا سلیف گورنمنٹ کی تنہا ہی نہیں بلکہ حکمت عملی پر غصہ بھی ہے۔

مجوزہ اسکیم کی ساخت بہت پیچیدہ ہے۔ اور بعض تفاصیل میں ترقی کی ضرورت ہے۔ بالخصوص بالائی حصہ میں لیکن بہر نوع یہ ایک ترقی کُن تدبیر ہے۔

کہیں کہیں ترجمہ بالکل لغو اور مہمل ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹ سر ویلینٹائن چیرول کے مختصر اشارات بالکل خارج از فہم عبارت میں ترجمہ کیے گئے ہیں۔

مطبع کی مہربانی تو اس کتاب پر یہ ہوئی ہی تھی کہ کہیں سے چھاپہ اُڑا ہوا ہے اور کہیں سیاہی پھیلی ہے۔ کہیں صفحے بے ترتیب غلط چپک کے مضمون کی ترتیب بگاڑ دی لیکن کاتب نے بھی سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ مترجم کے رسم الخط کی اُس نے خوب پابندی کی ہے۔ لکھنے میں جہاں مترجم نے

یاے مجہول کے بجاے یاے معروف لکھی وہاں اُس نے بھی اُسی طرح لکھ دیا - ملاحظہ ہو

کابلی کے فصیل کو ایسا منہدم کیا کہ کسی دوسرے چیز سے ایسا ممکن نہ تھا - مشرق کو مجبور کیا کہ اپنے پرانی ڈگر کو چھوڑ کر خواب و خیال کے بجاے حقیقت اشیا کے اثبات کا محاسبہ ایسا ہی کرے جس طور پر اس واقعاتی دنیا میں موجود ہیں -

بلا خوف انقلاب اور بدنظمی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابلیت کے لیے عارضی طور پر آزادی کے محرومی سے راضی ہیں -

کتابت میں غلطیاں بھی ہیں - ایک اقتباس کافی ہے -

پرچہ جات موت ایشوع اخبارات کے ذریعہ سے -

مترجم کی تاریخ دانی قابل داد ہے - جہاں مصنف کی عبارت میں کوئی تاریخی تلمیح آئی ہے مترجم نے فوراً نیچے حاشیہ دیا ہے - اور اکثر حاشیے بہت مفصل ہیں - جس سے اس ترجمہ کی خوبی بڑھ گئی ہے - آخر میں ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں رنگوں اور نقطوں کے ذریعہ اسلامی ممالک اور مخلوط اسلامی آبادی وغیرہ کے حدود دکھائے گئے ہیں - اس کتاب میں فہرست مضامین نہ ہونے سے بڑا نقص رہ گیا ہے -

کتاب دیباچہ کے علاوہ الناظر کی تقطیع اور اسی قسم کے کاغذ پر ۲۴۶ صفحوں پر چھپی ہے - اور قیمت عہ ہے - مولوی محمد سلیمان صاحب میونسپل کمشنر - قاضی ٹولہ بدایوں سے یا دفتر رسالہ الناظر لکھنؤ سے مل سکتی ہے - ناظرین منگائیں اور پڑھیں -

محمد ظفر

کلام آمیر

:(۱):

بل پڑ گئے کمر میں قربان گدگدی کے　　آتے مزے ہیں کیا کیا خلوت میں دل لگی کے
بیٹھے ہیں سامنے وہ بیخود بنا ہوا ہوں　　صہباے حسن کو میں آنکھوں سے اپنی پی کے
زخموں سے دل ہے رنگیں داغوں سے سینہ روشن　　کیا کیا صلے ملے ہیں یہ ہم کو دوستی کے

رہتا ہے محو ہر دم وہ حسن مہوشاں میں — دشوار اب ہے جینا، الجھن ہیں گر یہ جی کے
عالم سکوت پرور، دل میں خیال اُن کا — آتے مزے ہیں کیا کیا، دریا پہ، چاندنی کے

(۲)

توڑو وجود اپنا، مٹیو نہ اپنی ہستی — چمکو! تڑپ دکھاؤ! میداں میں زندگی کے

(۳)

قبروں پہ بیکسوں کی حسرت برس رہی ہے — سوتے پڑے ہیں غافل، سایہ میں بیکسی کے

(۴)

کشمیر دیکھو جا کر گلشن ہے ایشیا کا — منظر ہیں روح پرور، ساماں ہیں دل لگی کے
اے کاش دیکھیں جا کر ہم جلوۂ بنارس — کیا صبح کا سماں ہے، کیا رنگ ہیں خوشی کے

(۵)

سب رازکن فکاں کے وہ دل سے کہہ رہے ہیں — سرگوشیاں ہیں کیا کیا سجدوں میں بندگی کے

(۶)

برسات کا موسم:-

برسات کا ہے موسم، دریا ہیں گنگناتے — کلیاں چٹک رہی ہیں، عالم ہیں کیا خوشی کے
بادل گھرے ہوئے ہیں رقصاں ہیں بجلیاں بھی — چھڑ جائیں ساز عشرت، ہوں دور میکشی کے
جنگل ہرے بھرے ہیں چشمے اُبل رہے ہیں — سرسبز وادیاں ہیں، منظر ہیں دلکشی کے
ہیں آبشار جاری، نہریں بھی بہہ رہی ہیں — ہیں مست سب پپیہے پی کی شراب پی کے
چرواہا گا رہا ہے بنسی بجا رہا ہے — سبزے پہ لوٹتا ہے عالم میں اک خوشی کے
آباد میکدے ہیں، رندوں میں ہیں تلاطم — ہیں جوش پر اُمنگیں، چرچے ہیں عاشقی کے

ہر شعر اس زمیں کا دل میں اُتر رہا ہے
یہ بول سارے گویا نغمے ہیں عاشقی کے

محمد امیر (امنگ آبادی) بی اے

ضیاء احمد ایم اے

تصوف

تصوف کا مسئلہ ہر زمانہ میں فکر و نظر کا جولاں گاہ رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکا دارومدار بحث و تمحیص سے زیادہ ذوق و وجدان پر ہے۔ ایک ناواقف آدمی کے سامنے شکر کی ماہیت پر جسقدر گفتگو چاہو کرو، وہ اذعان و یقین حاصل نہیں ہو سکتا جو شکر کے چکھ لینے سے ہوتا ہے۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

مضمون ہذا میں ہم جس نقطۂ نظر سے تصوف پر بحث کریں گے اُس میں نہ تحقیق کا ادعا ہے نہ وجدان کا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ تصوف کے عقائد کس ماحول میں پیدا ہوئے اور اُن سے ملتِ اسلامی پر کیا اثر پڑا۔ اسکے لیے یہ مناسب ہے کہ پہلے تعلیم اسلامی کے اولیں اصول پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔

اسلام کے اولیں اصول اسلام جب دنیا میں آیا فضائے عالم کفر و شرک اور انواع معاصی و مناہی سے گونج رہی تھی۔ اسلامی تعلیم نے دفعتاً علم و عمل کی دنیا میں کایا پلٹ کردی اور مشرک اور بد اعمال انسانوں کو موحد اور صالح بنا کر انسانیت اور روحانیت کا اعلیٰ معیار قائم کردیا۔ وہ صاف اور سادہ اصول جو ہادی اسلام نے مخلوق کو پہونچائے یہ تھے:-

(۱) خدا ایک ہے اور اُسکے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ ذات و صفات میں کوئی اُسکا شریک و نظیر نہیں۔ یہ اعتقاد عمارتِ اسلامی کا اولیں سنگِ بنیاد ہے اور یہی تمام انبیاء و رسلؑ کی زندگی کا مقدس مشن رہا ہے۔ سرورِ عالم اور صحابہؓ کی حیاتِ عملی کا ایک ایک لمحہ اس عقیدہ کا آئینہ نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید کا کوئی ورق اگر بلا قصد بھی اُلٹیے گا تو اسی عقیدہ کی صراحت پائیے گا۔

(۲) رسالت۔ پیغمبروں۔ کتابوں۔ اور فرشتوں پر ایمان لانا۔ گویا معرفتِ الٰہی ایک اہم مقصود ہے جسکی یہ ضروری سیڑھیاں ہیں۔

(۳) حشر و بعث کہ تمام اعمال کی سزا اور جزا کا فائدہ بغیر اسکے مترتب ہونا ممکن نہیں۔

اسکے ساتھ ہی عبادات و معاملات میں بھی اسلام نے ایک ایسی راہ عمل پیش کی ہے جس سے بہتر خیال میں نہیں آ سکتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں تصوف کے عقائد و اعمال کی جھلک بھی پائی جاتی ہے یا نہیں دُنیا جانتی ہے کہ اور مذاہب کے برخلاف اسلام Form اور Spirit (صورت و معنی) دونوں کا جامع ہے۔ نہ وہ یہود کے مذہب کی طرح چند رسمی اعمال اور پابندیوں کا دستور العمل ہے اور نہ عیسائیوں کے دین کے مانند کچھ اخلاقی اور روحانی ہدایتوں کا مجموعہ۔ بلکہ وہ ایک مکمل قانون ہے جو دن میں سریر حکومت پر متمکن رہ کر جہاں بانی کے اصول پر کاربند ہونے کی تعلیم دیتا ہے، اور شب کو بوریائے فقر پر بیٹھ کر ریاضت و مجاہدہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ جو ایک طرف جسم کی طہارت کے ضمن میں غسل وضو کے فرائض و واجبات سکھاتا ہے اور دوسری طرف قلب کی پاکیزگی کے سلسلہ میں تسلیم و رضا کے نکات بتاتا ہے۔ غرضکہ مسلمان کی زندگی کا کوئی شعبہ نکاح اور بیع کے احکام سے لیکر سونے اور جاگنے کے آداب تک اس عالمگیر احاطہ سے باہر نہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کی حقیقت ایک ہی ہے مگر اُسکے دو پہلو ہیں۔ شریعت و طریقت۔ ہم سہولت کی غرض سے احکامِ ظاہر کو شریعت، اور تصوف و حقیقت کے اسرار کو طریقت کہیں گے۔ یہ اگرچہ اصطلاح میں خفیف سی ترمیم و اصلاح ہے مگر لا مناقشۃ فی الاصطلاح۔

یوں سمجھیے کہ حضور پُرنور سے جو دین ہم تک پہونچا ہے اُسکی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ تصفیۂ ظاہر و تزکیۂ باطن۔ زید نماز پڑھتا ہے۔ ایک فقیہ کی نظر جن امور پر جائیگی وہ یہ ہیں۔ کیا اُس نے طہارت کی شرائط پوری کری تھیں۔ اور واجبات و سنن اور تعدیل ارکان میں کوئی کمی تو نہیں ہوئی؟ مکروہات و مفسدات صلوٰۃ تو عارض نہیں ہوے؟ مگر ایک صوفی کی نظر یہ تلاش کریگی کہ نماز حضور قلب سے ادا ہوئی یا نہیں، اور استقبالِ بیت کے ساتھ رب البیت کی طرف بھی دل رجوع ہوا یا نہیں؟ اگر یہ تصوف ہے (اور بیشک صحیح اسلامی تصوف یہی ہے) تو کہنا چاہیے کہ شریعت ایک جسم ہے اور طریقت (تصوف) اُسکی روح۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات جن میں صدق و خلوص کی تاکید اور ظاہر الاثم و باطنہ سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اگر طریقت کی جان نہیں تو اور کیا ہیں۔ احادیث رقاق جو زہد و توکل صبر و رضا کے فضائل سے مالا مال ہیں، تصوف کا ماخذ نہیں تو آخر کیا ہیں؟ حدیث جبرئیل جس میں حضرت جبرئیلؑ

نے جناب رسول خدا روحی فداہ سے احسان (تصوف) کی تعریف پوچھی ہے اور جواب میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسکو دیکھ رہے ہو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم یہ سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ دیکھو اور بتاؤ کہ یہ نکتہ اگر حقائق و معارف کا خلاصہ نہیں تو کیا ہے۔
سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی برکات صحبت سے حصہ لینے والے جس انقطاع اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، تاریخ سے پوشیدہ نہیں۔ یہاں تک تو تصوف کی اصل ہمیں خود اسلام اور شارع اسلام کی تعلیمات میں ملتی ہے۔ اس سے زیادہ جو عقائد و اعمال اس میں اضافہ کر لیے گئے اُن کا ذکر آگے آتا ہے۔

اس جگہ ایک شبہہ کا رفع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ شریعت و طریقت کو دو متناقض حقیقتیں شمار کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ

شریعت و طریقت جدا نہیں

اس لیے کہ یہ دونوں اگرچہ دو متمائز نام ہیں مگر اصل میں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ انکو مخالف جاننا ہی گمراہی اور اسلام میں تفرقہ اندازی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر بینوں کیلیے ہے اور طریقت صاحبدلوں کے لیے یعنی اہل باطن سے تکالیفِ شرعیہ ساقط ہو جاتی ہیں، وہ کھلم کھلا الحاد کی تعلیم دیتے ہیں۔ ملاحدۂ باطنیہ نے بھی ایک زمانے میں ظاہر[ع] و باطن کی تقسیم کی آڑ میں پناہ لی تھی اور اپنے تمام مزخرفات کی اصل اپنے نزدیک کتاب و سنت سے نکال لی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے جس پر سوائے امام کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا۔ اُسی وقت بلکہ اُس سے پہلے علمائے حق نے عقائد و کلام میں اسکی صراحت کر دی تھی کہ تمام نصوص قرآن و حدیث اپنے ظاہر پر حمل کی جائیں گی تاوقتیکہ کوئی صارف قطعی نہ ہو۔ شکر اللہ مساعیہم۔ واقعی اگر اس فتنہ کا جلد سدباب نہ کیا جاتا تو شریعت مطہرہ سے امان اُٹھ جاتی اور دین متین میں رخنے پڑ جاتے۔ ایک مسلمان کے نزدیک حج سے مراد طوافِ کعبہ اور ادائے مناسک وغیرہ ہے لیکن ایک باطنی کے نزدیک نیت و خلوص سے امام کی خدمت میں حاضر ہونا حج کا نعم البدل ہو سکتا ہے۔ فشتان بینہما۔ اس ضروری تمہید کے بعد ہم تصوف کے اصل پر

ع۔ بعض علمائے ربانیین نے احکام شریعت کے اسرار و مصالح پر کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً احیاء علوم الدین اور حجۃ اللہ البالغہ مگر اس میں اور باطنیین کی بدعت میں بڑا تفاوت ہے۔

غور کریں گے۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ تصوف کی حقیقت کیا ہے؟

لفظ تصوف کی اصل اسکے متعلق مختلف توجیہیں بیان کیجاتی ہیں:

(۱) تصوف عربی لفظ صفا (پاکیزگی) یا صوت (یکسوئی) سے ماخوذ ہے کیونکہ تصفیۂ قلب اور انقطاع علائق تصوف کے خاص ارکان ہیں۔

(۲) بعض اس لفظ کو صُفہ یا صوفہ سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ اصحاب صُفہ رسول کریمؐ کے چند صحابہ تھے جو ایک چبوترے (صُفہ) پر بیٹھے رہتے تھے اور جو دنیا اور مال دنیا میں سے کسی چیز کے مالک نہ تھے حتیٰ کہ لباس و مسکن بھی نہ رکھتے تھے۔ صوفہ کے متعلق مشہور ہے کہ ایام جاہلیت میں ایک قوم تھی جو تجرد و تجرید کی زندگی بسر کرتی تھی، اور خدمت خلق میں اوقات صرف کرتی تھی۔

(۳) بعض لوگوں کے نزدیک تصوف کا ماخذ لفظ صُوف (پشمینہ) ہے چونکہ حضرات صوفیہ موٹے جھوٹے لباس کے عادی تھے لہذا اس نام سے موسوم ہوے۔

توجیہات بالا میں نمبر ایک کی تائید پورے طور پر لغات عرب سے نہیں ہوتی۔ نمبر ۲ قرین قیاس ہے لیکن تاریخی سلسلہ قائم کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ نمبر ۳ غالباً سب سے زیادہ صحیح ہے اور پشمینہ پوش کا استعمال صوفی حضرات کے لیے اکثر دیکھا اور سنا گیا ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تصوف کی ابتدا کیونکر ہوئی؟

تصوف کی تاریخ واقعہ یہ ہے کہ لفظ تصوف کی طرح خود تصوف کی اصل بھی ایک تاریخی عقدہ ہے جسکے حل کرنے کے لیے مختلف نظریے پیش کیے گئے ہیں۔

(۱) بعض حضرات کا خیال ہے کہ تصوف کے اسرار و غوامض خود حضور سرور عالم سے سینہ بسینہ خلفاء کرام اور اُن سے اولیاے عظامؒ تک پہونچے ہیں۔* انکے نزدیک احکام شریعت کے علاوہ جو قرآن و حدیث میں موجود ہیں ایک علم باطن تھا، جو ہر کس و ناکس کو نہیں بتایا جاتا تھا اور جسکی عام نشر و تبلیغ ممنوع تھی۔ چنانچہ وہ علی الخصوص جناب مرتضویؑ کو اس علم سینہ کا حامل سمجھتے ہیں اور اپنی تائید میں بعض احادیث لاتے ہیں۔

عـــہ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک قول منقول ہے کہ مجھے رسول خداؐ نے بعض ایسے امور کی خبر دی ہے کہ اگر بیان کردوں تو میرا گلا کاٹ ڈالا جائے۔ اس میں در اصل آنے والے فتنوں کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) بعض لوگ اسکو غیر ممالک کا پودہ جانتے ہیں جو بلاد اسلامیہ میں آکر پھلا پھولا۔ اُنکے زعم میں جب اسلامی فاتحین نے دوسرے ملکوں پر حملہ کیا اور اُنکو مسخر کرلیا تو مفتوح اقوام نے پورے طور پر تو اُنکے عقائد اور عبادات کو قبول نہ کیا البتہ کچھ اُنکے عقیدے اختیار کیے اور کچھ اپنے عقیدے بطور ردِ عمل اُن میں جذب کر دیے۔ جس سے تصوف وجود میں آیا۔ اب پھر متعدد نظریات[ؔ] ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ ہندوستان کو ان خیالات کا ماخذ قرار دیتا ہے دوسرا یونان کو۔ تیسرا ایران کو۔ وللناس فیما یعشقون مذاہب۔

(۳) کچھ لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ تصوف کے خیالات کسی نہ کسی صورت میں ہر زمانہ اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں اور علمی اور دماغی ارتقا کے خاص دور میں ہر جماعت کے ہاں فکر و نظر ان عقائد سے معمور نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف بلاد جنکے ما بین کوئی تاریخی رشتہ نہیں رہا ہے تصوف کے میدان میں متحد منازل[للعہ] طے کرتے دیکھے جاتے ہیں۔

اب مذکورہ بالا نظریات پر اگر غائر نظر ڈالی جائیگی تو ہم کو صاف معلوم ہوگا کہ توجیہ نمبر ۲ ابھی تاریخی حیثیت سے محتاج توثیق و تصدیق ہے۔ اور جب تک قطعی شواہد ہمارے سامنے نہ آئیں ہم اسکو ایک نظریہ[صہ] سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔ نمبر ۳۔ اگرچہ علم النفس کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے لیکن اسلامی تعلیمات میں نفس تصوف کا وجود ہوتے ہوے ہمکو اس نظریہ سے بھی استمداد کی حاجت نہیں۔ لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ تصوف جسکی اصل تعلیم نبوت میں نمایاں طور پر ملتی ہے اور جو ہادی اسلام اور صحابہ کی مقدس زندگی کا نصب العین رہا ہے یقیناً اسلام کی تعلیمات سے براہ راست استنباط کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ہم محض اسلامی تصوف سے بحث کر رہے ہیں اور قرآن اور نزول قرآن کے زمانہ کو پیش نظر رکھے ہوے

سہ کہا جاتا ہے کہ نوشیرواں کے زمانے میں چھ حکمائے یونان فارس میں پناہ گزیں ہوے اور اُن سے تصوف کے خیالات عجم میں اور عجم سے عرب میں پھیل گئے۔

للعہ چنانچہ ہندوستان کی ویدانت فلاسفی جسپر ہندو مذاہب کا دارومدار ہے اور یونان کی اسٹوائک Stoic فلاسفی عیسائی مذہب میں کوئیکرس Quakers کے عقائد اہم مثلے چلے اور تصوف کے اصول سے الگ بھگ پائے جاتے ہیں۔

صہ اس نظریہ میں ایک غلطی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ قبل اسکے کہ مسلمان ان غیر ممالک سے مختلط ہوں تصوف کے خیالات اُن میں سرایت کر چکے تھے۔

شارع علیہ السلام کی حیاتِ مقدس سے خاص طور پر استشہاد چاہتے ہیں چند سوال خود بخود ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

کیا اسلام کی سادگی ان پیچیدہ غوامض کی متحمل ہو سکتی ہے؟ کیا نام نہاد تصوف کا ثبوت قرآن و حدیث سے اسی طرح ممکن ہے جس طرح توحید اور نماز وغیرہ کا؟ کیا سرورِ عالم اور آپکے اصحابؓ وحدت وغیرہ کے عقائد کو اسی طرح مانتے تھے جیسے اکثر صوفی اکابر کی تصانیف سے ثابت ہیں وغیرہ وغیرہ۔ درحقیقت یہ بہت نازک مسئلہ ہے لیکن اگر ہم کتاب و سنت کی روشنی میں دیکھیں گے تو نظر آئیگا کہ جس طرح دیگر امور میں مابعد کے زمانوں میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے تصوف بھی اس کلیہ سے نہ بچ سکا۔ اسی سلسلہ میں تصوف کی تاریخی حیثیت اور نیز اُسکی مذہبی منزلت واضح کرنے کے لیے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تصوف اسلام میں سب سے پہلے کس نے اختیار کیا؟ جہاں تک تحقیق ہوا ہے صحابہ کے زمانہ میں تصوف کے مخصوص عقائد کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ تابعین کے آخر زمانہ میں شاذ طور پر کہیں کہیں اُس کی جھلک نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے جس نے صوفی کا لقب اختیار کیا ابو ہاشم شامی تھے جنکی وفات تقریباً ۱۹۵ھ میں ہوئی ہے۔ ابتدائی صوفیہ میں یحییٰ بن معاذ رازی، ابراہیم بن ادہم۔ داؤد طائی، فضیل بن عیاض، رابعۃ العدویہ، سفیان ثوری کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ یہ سب اکابر امت ۲۰۰ھ کے لگ بھگ گذرے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ اُسوقت تک تصوف محض اُسی قدر تھا جسکا جلوہ سیدنا علی مرتضیٰؓ کی ذات میں نظر آتا ہے یا حضرت ابو ذرؓ کی۔

اس سرسری اور اجمالی تبصرہ سے کم از کم اسقدر ذہن نشیں ہو گیا ہوگا کہ تصوف کے خصوصیات کیا ہیں۔ لیکن ہم کسی قدر تفصیل سے اربابِ تصوف کے مخصوص عقائد اور اصول پر بحث کریں گے۔

اہل تصوف کے خاص عقائد

پروفیسر براؤن نے اپنے خاص ادبی انداز میں تصوف کو بجائے ایک definite movement (معین تحریک) کے indefinite immobility (غیر معین سکون) سے تعبیر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک

؎ اس دور کے بعد مشہور صوفیائے کبار کا زمانہ آتا ہے جو اس فن کے امام مانے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت جنید بغدادی، شیخ شبلی۔ بایزید بسطامی۔ وغیرہم۔ جن اکابر سلف کی تصانیف میں اصول تصوف مدون ہوئے ہیں اُنمیں حضرت امام غزالی اور محی الدین ابن عربی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

صوفی دیگر اہلِ مذاہب کے برخلاف اپنے عقائد کی نشر و تبلیغ پسند نہیں کرتا۔ اور جد وجہد کے بدلے خاموشی اور سکون کا حامی ہے۔ ہم یہاں پر تصوف کے مشہور عقائد کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) ذاتِ باری تعالیٰ، وجود بحت۔ خیر محض اور حُسن مطلق ہے۔ اُسکی صفات عالمِ کون کے اندر بشکل آئینوں پر اپنا پر تو ڈال رہی ہیں۔ ما سوا اللہ کا وجود صرف اسی قدر ہے جسقدر آئینہ کے عکس کا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ارباب شرع کا اعتقاد توحید کے بارے میں یہ ہے کہ خدا ایک اور بےمثل ہے۔ وہ مخلوق سے الگ ایک ازلی اور ابدی وجود ہے۔ بخلاف اسکے اہل طریقت کا عقیدہ یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے۔ ماسوا اُس عالم بیرنگی میں محض عارضی تعینات کا حکم رکھتے ہیں۔ حباب، موج، گرداب وغیرہ بظاہر متعدد تشخصات ہیں مگر حقیقت میں ایک دریا ہی ہے جو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ علماے ظاہر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مخلوق عدم سے وجود میں آتی ہے اور اجل موعود کے بعد مٹ جاتی ہے (اگرچہ روح باقی رہتی ہے) دوسری طرف اہل باطن کا اعتقاد ہے کہ مخلوق علیحدہ چیز نہیں بلکہ اُسی وجود مطلق سے نکلی ہے اور اُسی میں مل کر فنا ہو جائیگی۔ یہ مسئلہ تصوف کی اصل الاصول ہے۔

(۲) اہل شریعت نقل کے بعد اشیاء اور حقائق اشیاء کے ادراک کے لیے حواس اور عقل کو کافی سمجھتے ہیں۔ مگر اصحابِ طریقت اُسکے ساتھ ہی ایک حاسۂ باطنی کا وجود بھی مانتے ہیں۔ جس سے مراد علم لدنی یا کشف ہے جو حضرات انبیاءؑ و اولیاءؒ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۳) سبب آفرینش و حقیقت گناہ۔ وجود مطلق نے (جو خیر محض بھی ہے) بقول الاشیاء تعرف باضدادہا اپنے آپ کو عدم وجود کے مظاہر میں ظاہر کیا۔ کُنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان أعرف فخلقت الخلق اور ان اللّٰہ خلق آدم علی صورتہ اس دعوے پر شاہد ہیں۔ اور اسی سلسلہ میں دُنیا میں گناہ اور غم بھی پیدا ہوے۔ جس طرح ظلمت روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے اسی طرح گناہ نیکی کے نہ ہونے کو کہتے ہیں۔ گویا گناہ خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا۔ گناہ سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ اسکے لیے ارباب تصوف یہ نسخہ تجویز کرتے ہیں کہ اگر ہم مظاہر کو نیہ

کو سرتاپا بے اصل سمجھیں اور ہستی کو جو تمام احساسات کی ذمہ دار ہے سرے سے موہوم جانیں تو گناہ اور (غم بھی) بے حقیقت ثابت ہوں گے۔

(۴) محبت۔ ارباب تصوف کے نزدیک محبت تمام زندگی کا حاصل ہے اور اسی لیے بام حقیقت تک پہونچنے کے واسطے محبت مجاز کا زینہ ایک حد تک لازمی قرار دیا گیا ہے کہ المجاز قنطرۃ الحقیقۃ۔

(۵) تصوف بجائے Socialistic (اجتماعی) شان رکھنے کے Individualistic (انفرادی) حیثیت رکھتا ہے اسی لیے وہ تبلیغ و اشاعت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۶) صوفیوں کے یہاں سلوک کے متعدد مقامات مانے گئے ہیں مثلاً فکر، حیرت، بقا، فنا وغیرہ۔ تصوف بقول علامہ شبلی ایک تصحیح خیال کا نام ہے جو رفتہ رفتہ عارف کی عملی زندگی کے ہر شعبہ پر طاری ہو جائے۔ مثلاً اگر توکل کا مقام درپیش ہو تو یہ نظر آنے لگے کہ تمام عالم دست قدرت میں ایک بازیچہ کے مانند ہے جدھر اُسے چاہا پلٹ دیا۔ اسی طرح فنا کے مقام پر پہونچکر وہ اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور ہر چیز میں وہی تجلی نظر آنے لگتی ہے۔ فنا کے تین درجے فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، اور فنا فی اللہ مشہور ہیں۔ یہ آخری درجہ انا الحق کی منزل ہے۔

یہ چند مخصوص اور مشہور عقائد ہیں جو مشاہیر متصوفین کی تصانیف میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم پھر تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ عقائد بعینہ ہادی اسلام علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کرام کے عقائد تھے۔ بخوف طوالت صرف پہلے عقیدے کو لے لیجیے جو وحدت کا معرکہ آرا مسئلہ کہلاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس اعتقاد میں ایک حد تک افراط و مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ نصوص قطعیہ کی صراحت سے یہ امر تو ضرور مترشح ہوتا ہے کہ تمام موجودات میں وجودِ واجب ہی صرف مستقل ہستی رکھتا ہے باقی تمام کائنات اُسکا ظل و پرتو ہے۔ جس طرح ظل کا وجود اصل کے وجود کا تابع ہے اسی طرح جملہ موجودات عالم ذاتِ باری کے محتاج ہیں۔ یہی توحید شہودی کہلاتی ہے۔ اب رہی توحید وجودی (وحدت الوجود) یعنی صرف ایک ہی ہستی ہے اور کوئی نہیں۔ لاموجود الا اللہ یہ دراصل ایک وجدانی کیفیت ہے اور مستقل شرعی اعتقاد کی شان[1] نہیں رکھتی۔

اسباب ونتائج اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو ہم نے قصداً مؤخر کر دیا تھا۔ تاکہ مسئلہ کے

---

[1] البتہ جن ارباب ذوق سے یہ عقیدہ حالت وجد و بیخودی میں ثابت ہوا ہے وہ معذور ہیں۔

تمام پہلو اجمالی طور پر خود بخود ذہن میں آجائیں۔ یعنی تصوف کس طرح اور کن حالات کے اندر پیدا ہوا، اور ان خیالات نے کس ماحول میں نشوونما پائی؟ اوپر دیکھ چکے ہو کہ تصوف کے عقائد ہجرت کے اُۃ ثانیہ کے وسط میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک طرف تو لوگوں نے دیکھا کہ اسلامی تعلیمات میں صوفیانہ اعتقادات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ دوسری طرف انھوں نے محسوس کیا کہ دنیا کا جاہ وجلال ڈھلتی چھاؤں ہے۔ حکومتوں کے انقلابات، زندگی کے مصائب اور گناہوں کا طغیان دیکھ کر خدا سے لو لگائی اور دنیا کی حشمتوں پر لات مار کر گوشۂ عزلت میں بیٹھ گئے۔ گردوپیش کے واقعات نے دنیا کی آلودگیوں سے بیزار کردیا اور طبعی مناسبت نے عرفان کے ذوق سے آشنا بنادیا۔ یہی وجہ ہے کہ باآں ہمہ زہد و توکل صحابہ کے فاتحانہ دور میں اس انقطاع و تجرید کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

آخر میں یہ پہلو یہ دیکھنا ہے کہ تصوف نے مسلمانوں کی قومی زندگی پر کیا اثر ڈالا اور اُس سے کیا نتائج مترتب ہوئے؟

ہر انصاف پسند شخص اسکا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ تصوف کی چاشنی نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو کو ذوق اور جذبات سے متکیف کردیا۔

ہندو فلاسفی یا اسٹوائک فلاسفی میں محبت اور جذبہ کا وہ عنصر نہیں جو اسلامی تصوف میں میں پایا جاتا ہے۔ اسی محبت نے صوفی حضرات کو جزوی نزاعات اور فروعی اختلافات کی سطح سے ہمیشہ بالاتر رکھا۔ تم ارباب تصوف کو علمائے ظاہر کے برخلاف مجادلہ اور مناقشہ کے میدان میں کبھی پیش نہ پاؤگے۔ اسکے علاوہ شخصی حکومتوں کے استبدادی دور میں ان ارباب توکل کا استغنا برتنا اور سلطنت کے جاہ وحشم کو حقیر جاننا خوشامد پسند امراء اور خوشامد گو مصاحبین کے لیے تازیانۂ عبرت کا کام دیتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص زخارفِ دنیا کو ذلیل سمجھتا ہے اور زندگی کے مصائب و شدائد کو علاً او علاً ہیچ جانتا ہے وہ اس پیکرِ خاکی کی بربادی کے خوف سے یا چند سنہرے روپہلے ٹکڑوں کے لالچ میں باطل کی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے بھی حق گوئی سے دریغ نہیں کرسکتا۔ شان وشکوہ کے متوالے استبدادی پتلے حیران تھے کہ نہ معلوم کیوں تمام جہان ان چند خرقہ پوش بوریہ نشینوں کی طرف ڈھلا چلا جارہا ہے جو تخت وافسر تو درکنار، ایک گز زمین اور ایک پارہ پیرہن کے بھی مالک نہیں۔ اسپر بھی ہمارے جلال وعظمت کو خاطر میں نہیں لاتے۔

لیکن جس طرح ہر تحریک کا حشر ہوتا ہے امتداد زمانہ سے یہ مقدس تحریک بھی بے اعتدالیوں کا شکار ہو گئی۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِہِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ۔ رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا کہ تصوف ایک پیشہ بن گیا اور بجائے ذوقی اور وجدانی کیفیت کے ایک رسمی اور مصنوعی دکانداری رہ گئی۔ یوں تو کوئی زمانہ اہلِ دل سے خالی نہیں، لیکن مرورِ ایام سے بالعموم توکل، صبر، زہد کی جگہ گداگری، بے شرمی اور رہبانیت نے لے لی۔ ایک طرف تو قناعت کے معنی جد و جہد سے پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے اور دوسروں کے دست نگر رہنے کے قرار دیے گئے، دوسری طرف ریاضت کا مفہوم تمام مباح اور شروع آسائشوں سے پرہیز کر لینے پایا۔ یارانِ طریقت نے اپنے اباحت و الحاد کی تائید میں یہ کلیہ ذہن نشین کرا دیا کہ شریعت اور ہے، طریقت اور۔ اس پردے میں تمام محرمات دینی جائز ٹھہرائی گئیں اور جملہ تکالیفِ شرعیہ ساقط کر دی گئیں۔ ہوتے ہوتے ہر کس و ناکس کی یہ ہمت پڑی کہ اپنی گرم بازاری کی خواہش میں کمالات و کرامات کا دعویٰ کرے اور شریعت مقدسہ پر طعنہ زن ہو۔

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہل نظر گئی

ضیاء احمد ایم اے (بدایونی)

لـہ اس مضمون سے مقصود تعریض و اعتراض نہیں، بنیہ اس انداز میں لکھا گیا ہے۔ تصوف اور ارباب تصوف کی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف مدعیانِ باطل کوش کی مذمت کی گئی ہے۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ۔ ہاں کوئی صاحب بقولے الدین النصیحۃ اگر کوئی لغزش پائیں تو مطلع فرمائیں۔

محسوسات اقدس حیدرآبادی

شوق اثر گداز دے درد اثر طراز دے
بجلی بنا ہوا رہوں اتنا تو سوز و ساز دے

چشمِ نظارہ باز بھی خوب نکالے حسرتیں
فرصتِ دید کچھ اگر تیری نگاہِ ناز دے

شاہد بزم حسن سے میری یہی ہے عرض شوق
سب سے الگ تھلگ رہوں خاطر بے نیاز دے

راحت و رنج وصل و ہجر اُٹھ سکے ہیں اختیار میں
جسکو وہ چاہے سوز دے جسکو وہ چاہے ساز دے

گردشوں پہ یہ گردشیں دیتا جو ہے تو رات دن
فرصتِ دم زدن ذرا چرخ کرشمہ ساز دے

صرفِ نیاز غم رہوں میری بھی آرزو یہ ہے
دل تو دیا ہے درد مند شوقِ اثر گداز دے

اقدس دلفگار پھر آنہ کرے جگر خراش
ذوقِ خلش کا لطف پھر مرہم چارہ ساز دے

ماتا بدل

بستی کی جتنی بوڑھیاں ہیں اس امر پر متفق ہیں کہ ماتا بدل کا صحیفۂ حیات بالکل سادہ ہے۔ وکلا، مقدمہ باز، حتیٰ کہ افیونیوں کا بھی جن کی عمر کا تعین بالکل غیر متعلق ہے، اُنکی نسبت یہی خیال ہے۔ ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ موجودہ نسل میں ایسا کوئی نہیں ملتا جو ماتا بدل کے ابتدائی چہل سالہ دَورِ زندگی میں انکا ہمعصر رہا ہو۔ ماتا بدل مزدوری کرتے ہیں اور حُقہ پیتے ہیں۔ حیات کا ثبوت انکی مزدوری اور حسِ حیات کا حقہ نوشی ہے۔ یہ اکثر اور بیشتر انھیں دو مشاغل میں مصروف پائے گئے ہیں۔ جب یہ متحرک ہوتے ہیں۔ انکے سر پر ٹوکری ہوتی ہے اور حالت سکون میں حُقے سے ہم آویز ہوتے ہیں۔ مزدوری میں انکا محبوب ترین مشغلہ سفالہ پوش مکانوں کی مرمت ہے لیکن کام کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، کوئی موقعہ یا محل ہو، انکے جامد سکوت میں فرق نہیں آتا۔ انکی شکل و صورت دیکھ کر میرا ذہن لارڈ ولزلی کی کہنہ سالگی کی اُس تصویر کی جانب منتقل ہوتا ہے جو بعض ابتدائی درجوں کی تاریخ ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ وہی آنکھیں، وہی پلکیں، وہی چہرہ کی جھریاں، وہی تیور، وہی بشرہ!

کوئی مکان ایسا نہیں ہے جسکے بنانے، بگاڑنے یا مرمت کرنے میں ماتا بدل کی خدمات سے کسی نہ کسی وقت فائدہ نہ اُٹھایا گیا ہو اور شاید ہی کوئی خاندان ایسا ہو جسکے زندہ یا مردہ افراد سے ماتا بدل واقف نہ ہوں۔ ہر مکان کے جزئی جغرافیہ سے یہ آشنا ہیں۔ ماتا بدل کو یہ بھی معلوم ہے کہ انکی خدمات کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوگی مثلاً ٹوکری، بیلچہ، رسّی، سیڑھی، مٹی، پھاوڑا، گھڑا، وہ مکان کے کس حصہ میں ملیں گے یا اگر یہ چیزیں موجود نہیں ہیں تو کہاں سے عاریتاً حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یوں تو ماتا بدل کی زندگی ایک 'کلاک' سے بھی زیادہ یکساں اور یکسو ہے لیکن خود انکے نزدیک زندگی کا مفہوم صرف "احتیاط" ہے اور شاید یہی ایک چیز ہے جسکی طرف سے انکو کبھی اطمینان نہیں حاصل ہوا۔ بولتے بہت کم ہیں اِلّا ایسی حالت میں جب انکے نزدیک خاموشی منافیِ احتیاط ہو۔ جب کبھی انکو دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے، انکا فرض اکثر اپنے

ساتھیوں کو حقہ یا پانی پلانا ہوتا ہے۔ ایسے اوقات میں کسی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وقت معینہ سے پہلے یہ کبھی ان چیزوں کی طرف مائل نہیں ہوتے اور نہ کسی کی فرمائش پر مخاطب ہوتے ہیں۔ مٹی کچلنے کے یہ ماہر خصوصی ہیں اور جب تک اس مشغلہ سے فرصت نہیں پاتے کسی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ کسی دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کے سخت اصرار پر بھی اپنے مشغلہ سے دستکش ہوجائیں اور مرمت یا تعمیر کے لیے مٹی حوالہ کردیں۔ بعض امراض کے مانند انکے یہاں بھی ہر مشغلہ کا ایک کورس (دور) ہے بغیر اُسکے ختم ہوے انکے ہاتھوں کے فرض کا ناتمام یا نا مکمل رہ جانا ناممکن ہے۔ اس موقع پر سارے مزدور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے لیکن یہ ناممکن ہے کہ کہیں سے کسی قسم کی حیلۃً یا صراحتًا کوئی تحریک پیش کی جا سکے۔ اگر کسی ناواقف نے ایسا کیا تو اس کا جواب ماتا بدل کے ہاں صرف اپنی آنکھوں کو پوری طور پر کھول دینا اور مٹی کو اور زیادہ انہماک اور کسی قدر طیش کے ساتھ پامال کرنا ہوتا ہے۔ ماتا بدل کا بوجھ لیکر سیڑھی پر چڑھنا بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہوتا ہے۔ ہر درجہ پر یہی معلوم ہوگا گویا انکو کسی غنیم کے مقابلہ میں ایک نہایت مستحکم محاذ قائم کرنا منظور ہے اور کسی شاندار پیشقدمی یا اُس سے زیادہ شاندار پسپائی کا ارادہ نہیں ہے۔ دوپہر میں جب کام ختم کرنے کا وقت آتا ہے، کسی ساتھی کی یہ سمجھ کر کام چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ ۱۲ بج چکے ہیں۔ ایسی حالت میں سب کی نظریں ماتا بدل کی سمت اُٹھتی ہیں۔ یہ کمر پر ہاتھ باندھے اور سر نیچے کیے ہوے مٹی کچلتے ہوتے ہیں اور مزدور سمجھ لیتے ہیں کہ ابھی ماتا بدل اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوے ہیں کہ اگر سورج مہاراج کو خدانخواستہ گرنا نصیب ہو تو یہ احتیاط کے ساتھ اپنی ایک پیچ والی پگڑی کے عین وسط پر روک لیں گے اور مہاراج یا اُنکی مٹی کو کسی قسم کا گزند نہ پہونچ سکے گا اور چونکہ زمین خود متحرک ہے اس لیے یہ نہایت انہماک اور احتیاط کے ساتھ اپنے محدود حلقۂ تگ و تاز میں اس بات کے درپے ہیں کہ کسی طور پر انکا کاسۂ سر آفتاب کے ساتھ خطِ عمودی قائم کرسکے۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے کی صرف یہ علامت ہے کہ ماتا بدل سر سے پگڑی کھول دیتے ہیں اور دیوار کے سائے میں جہاں اُپلے کا ایک نہایت مختصر ٹکڑا سلگتا ہوتا ہے اُسی کو بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ گویا کمر کھول دینے کا اذنِ عام ہوتا ہے۔ سارے مزدور انکے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ سب سے کم عمر مزدور کا فرض ہوتا ہے کہ وہ فوراً حقہ چڑھا کر پیش کرے۔

ماتابدل دوہی چار کش لے کر "اسپنسر سگار" کے فلسفہ میں محو ہو جاتے ہیں جسکا ایک ناکمل سا نمونہ اکثر اُس اشتہار میں دیکھا گیا ہے جسمیں ایک نہایت ہی فربہ اندام بزرگ (گو بزرگ کہدینے کے بعد فربہ اندام کہنا بالکل غیر متعلق ہے) سگار کا ایک کونہ لبوں سے دبائے ہوئے نیم باز آنکھوں اور کسی قدر تبسم زیرلب لوگوں کی توجہ اور سگار کے دھوئیں کو جذب کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں اور نیچے لکھا ہوتا ہے "آسودگی کامل"۔

کام ختم کرنے کے بعد شام کو مزدور رخصت ہوتے ہیں۔ اب گویا ماتابدل کی انتہائی مشغولیت وانہماک کا وقت آگیا ہے۔ یہ تمام مزدوروں سے دن کے کام کا جائزہ لیتے ہیں۔ جن جن چیزوں سے کام لیا گیا ہے، مثلاً کدال، پھاوڑا، ٹوکری گھڑا۔ ان سب کو اس طور پر "جاے موقعہ" سے اُٹھاتے ہیں کہ کسی متلاشیِ آثارِ قدیمہ کو بھی انکے حزم و احتیاط پر رشک آسکتا ہے۔ مالکِ مکان نے بھی انکو مکان جانے اور تمام چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھدینے کا حکم دے دیا ہے لیکن انکی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ ہر چیز کو ٹھیک طور پر رکھدینے اور دروازہ کو مقفل کر دینے کے بعد بھی اطمینان کلی نہیں حاصل ہے۔ جاتے وقت کوئی موجود نہ بھی ہو تو یہ خود بخود کہتے جائینگے کہ تمام چیزیں ٹھکانے ٹھکانے رکھ دی گئی ہیں، ٹوکری کونے میں ہے، کدال اُسکے نیچے ہے، رسّی کھونٹی پر ہے وغیرہ وغیرہ۔ ابھی دس بیس قدم بھی آگے نہ بڑھے ہونگے کہ لوٹ آئینگے۔

"کیوں ماتابدل کیسے پلٹ آئے؟"

ماتابدل :- "معلوم ناہیں گھڑوا کہیٹن آہے" (معلوم نہیں گھڑا کہاں ہے)

اندر جاکر سب دیکھ بھال آئے اور پھر "خیریت بول کر" آگے بڑھے۔ تھوڑی دُور جاکر دوبارہ مراجعت کی۔

"کیوں اب کیا رہا"

ماتابدل :- "سرکار دوپہروا کے جون روپیوا دے رہیں اوہاں کے پیسوا سرکار ہیج لیے رہن کہ ناہیں" (دوپہر کو جو روپیہ سرکار نے دیا تھا اُسکے پیسوں کو سنبھال لیا تھا کہ نہیں)

"ہاں ہاں گن لیا تھا، اب تم بیفکر ہو کر مکان جاؤ"۔

ماتا بدل چند ہی قدم بڑھنے کے بعد پھر پلٹے اور سیدسے مکان کی طرف بڑھے
"کیوں کیسے؟"
ماتا بدل:- کچھو ناہیں تنی دیکھے کے رہا کہ تلوا لاگل ہے کہ ناہیں۔" (کچھ نہیں ذرا دیکھنا تھا کہ قفل لگا ہوا ہے کہ نہیں)

اتفاق سے ماتا بدل کو ایک ایسے مکان میں ہاتھ لگانا پڑا جسکی ہمسایہ "برق تھی، صرصر تھی یا تھا زلزلہ" کا مصداق تھی۔ جس گلی سے گذرہوتا لوگ الامان اور الحفیظ پکارنے لگتے تھے۔ اسکی بے پناہ گالی گلوج اور جنگجوئی کی ساری بستی قائل تھی۔ جس دوکان پر یہ سودا خریدنے پہونچ جاتی، تمام بھیڑ چھنٹ جاتی تھی اور دوکان دار سارا کام چھوڑ کر چھتیا٭ کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ حتّٰی کہ بستی کے نہایت شریر اور جھگڑالو لڑکے اور کُتّے وغیرہ اسکو دیکھ کر راستہ سے کترا جاتے تھے۔ بارش اور کیچڑ، سردی اور کہرا، دھوپ اور لُو، غرضکہ موسم کی بے اعتدالیاں اور اکثر اُسکی ذمہ دار ہستی بھی اسکے غیظ وغضب اور سب وشتم سے محفوظ نہ تھی۔ بعض ستم ظریفوں کی زبانی یہ روایت بھی سُنی گئی ہے کہ چھتیا کی شادی ایک ایسے مردِ معقول سے ہوئی تھی جو آج کل ہوتے تو اُن پر یورپ کے مکمل ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان کا دھوکا ہوتا۔ بیوی اور شوہر کے روابطِ ازدواجی کا "مقسوم علیہ اعظم" چھتیا کی جوتی تھی جسے وہ وقت بے وقت، موقعہ بے موقعہ اکثر مسلسلۂ تفریح یا ورزش نہایت آزادی اور تندہی کے ساتھ برسرکار لاتی تھی اور جسکی پذیرائی، یہ مرد معقول مصلحتِ وقت، اقتضائے مسلک یا پھر مشیت الٰہی سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ مکان کے اندر ایک انار کا درخت تھا جسے کسی جن نے اپنا نشیمن بنالیا تھا۔ شوہر اس حقیقت سے باخبر تھے اور یہ سمجھ کر کہ شاید یہ چھتیا کی دراز دستیوں کا سدِ باب کرسکیں، بالکل خاموش رہے۔ لیکن نو وارد کو چھتیا سے عہدہ برآ ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور شوہر کو وہ ہر طرح سے قابلِ رحم تصور کرتے تھے۔ ایک دن شوہر نے بیوی سے اذن سفر طلب کیا اور کہا کہ اب کچھ کھانے کمانے کی فکر کرنی چاہیے، ممکن ہے جتنے فراغت کے دن اب تک بسر ہوئے ہیں آیندہ میسر نہ آئیں۔ بیوی کا اعتراض ہوا "اور میری جوتیوں کا کون حامل ہوگا؟" شوہر نے کہا "میں جلد واپس ہوں گا۔ میری عدم موجودگی میں تم اس انار کے درخت کو زیر بار کرنا" غرضکہ ایک تھوڑ

٭ چھتیا۔ ا ی ث و ج

سی ردّو قدح کے بعد جس میں کچھ الوداعی (۰۰۰۰۰؟) کو بھی دخل تھا شوہر صاحب سفر کو سدھارے۔ کچھ عرصہ بعد یہ کسی شہر میں ایک مہاجن کے ہاں نوکر ہوے اور فراغت سے رہنے لگے۔ اتفاق سے مہاجن کی لڑکی کو آسیب کا دخل ہوا۔ اور تمام جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویذ سے تنگ آکر مہاجن نے اعلان کیا کہ جو شخص لڑکی کو اس آفت سے نجات دلائے گا صلہ میں اسی سے لڑکی کی شادی کر دی جائیگی۔ یہ بیچارے بھی حق نمکخواری ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوے۔ لیکن آدمی تھے دُور اندیش اور مہاجن کچھ انکے "والدین" میں سے تھا نہیں کہ صرف انکا سہرہ دیکھنے کے لیے زندہ ہوتا، انعام کی شرط مسترد کرائی۔ لڑکی کے پاس پہونچکر اول تو انھوں نے جناب جنّات سے بہت کچھ منت سماجت کی کہ لڑکی کی جان چھوڑ دیں لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر یہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور جنّات کے شدید اصرار کے باوجود انھوں نے گریۂ وزاری کا سبب نہ بتایا۔ بالآخر جنّات نے یہ دیکھکر کہ یہ تو سارا عیش ہی منغص کیے دیتا ہے کہا

"بھئی اگر تم کو رونا ہی ہے تو کہیں دوسری جگہ جاکر روؤ۔ یہاں آخر اس کا کیا موقعہ ہے ؟"

شوہر:- میں کیا کروں مجھے تو آپ کی قسمت پر رشک آتا ہے، ایک میں ہوں کہ جس مصیبت کے باعث آوارہ وطن ہوا، ہر قسم کی صعوبتیں اُٹھائیں وہ اب معلوم ہوا کہ میرے خمیر ہی میں ہے"

جنّات:- آخر وہ کیا مصیبت پیش آئی کہ اپنی زندگی سے بیزار نظر آتے ہو

شوہر:- آپ سے کیا پردہ ہے۔ مجھے بھی اپنا سا بنا لیجیے۔ دنیا میں جنّات بنکر رہنا انتہائی خوش نصیبی ہے۔

جنّات:- بھئی سنوں بھی تو، آخر معاملہ کیا ہے ؟

شوہر:- (ہچکیاں لیتے ہوے) ۰۰۰۰ وہی !

جنات:- کون وہی ؟

شوہر:- چہ ۰۰۰۰۰۰ چہ ۰۰۰۰۰۰ ۰

جنات:- (کسی قدر چونکنا ہوکر) ۰۰۰۰۰۰ کیا ؟

شوہر:- چہ ۰۰۰۰۰ چہت ۰۰۰۰۰ چھتیا !

جنات:- (سراسیمہ ہوکر) چھتیا ؟

شوہر:- ہاں وہی !

جنات:- (از خود رفتہ ہوکر) پھر کیا ہوا ؟

شوہر:- یہاں بھی آنے والی ہے!

یہ سننا تھا کہ جنات صاحب کے سارے ہوش و حواس معطل ہوگئے اور آناً فاناً غائب ہوگئے۔ لڑکی اچھی ہوگئی۔ شوہر صاحب انعام اکرام لیکر مکان واپس آئے تو معلوم ہوا کہ چھتیا نے انار پر اپنی روزانہ مشق جاری رکھی تھی۔ اور یہی سبب تھا کہ جنات کو چھتیا کے شوہر ہی کے نقش قدم کو اپنا خضر راہ بنانا پڑا۔

ماتا بدل اُس کوٹھے کی کھپریل درست کر رہے تھے۔ معلوم نہیں زمانہ کے کس نشیب و فراز پر غور کر رہے تھے اور حقہ نوشی کے کن مدارج سے گذر ہو رہا تھا کہ یکایک چھت سے پھسلے اور کوٹھے کی دوسری سمت، چھتیا کے صحن میں، حقہ سمیت جا گرے۔ دھماکے کی آواز سن کر چھتیا دوڑ پڑی اور چور، چور، چلا کر تمام محلہ سر پر اُٹھا لیا۔ پاس پڑوس کے لوگ جمع ہوگئے۔ چھتیا کی زبان سے مغلظات کا ایک آبشار رواں تھا۔ اِدھر ماتا بدل کا قریب قریب وصال ہی ہو چکا تھا۔ چھتیا کو اصرار تھا کہ یہ دم سادھے ہوئے ہیں۔ ماتا بدل بیچارے بیہوش تھے۔ لوگوں نے آکر انکو بچایا اور بہزار دقت لاد پھاند کر گھر پہونچایا۔

ماتا بدل ایک عرصہ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ تندرست ہونے کے بعد ان میں جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ یہ اب اور زیادہ احتیاط برتنے لگے تھے۔ چلنے پھرنے میں قدم پھونک پھونک کر دھرتے تھے۔ اور کھپریل وغیرہ کی مرمت بھی اسی سلسلہ میں بالکل بند کر دی تھی۔ صرف وہی کام کرتے تھے جن میں زمین سے تعلقات منقطع نہ ہونے پائیں۔ جس چیز کو اُٹھاتے تھے اُسکی پوری طور پر دیکھ بھال کر لیتے تھے اور جہاں رکھتے تھے اُس مقام کی بھی کافی جانچ پڑتال کر لیتے تھے۔ حقہ نوشی میں البتہ کسی قدر اور مشق بڑھ گئی تھی لیکن اسی تناسب کے ساتھ یہ سکون اور تحمل میں بھی ترقی کر چکے تھے۔

حسن اتفاق سے برساتی مرمت کے سلسلہ میں جامع المتفرقین نے چھتیا اور ماتا بدل کو ایک دفعہ پھر یکجا کر دیا۔ کچھ کھپروں کی ضرورت تھی اور یہ اس کام کے لیے تعینات کیے گئے۔ ماتا بدل کمہار کے مکان پر پہونچے اور کھپرے ٹوکری میں اور ٹوکری سر پر رکھکر مکان واپس آئے۔ مسافت کسی قدر طویل تھی اس لیے صحن میں داخل ہوتے ہی، ٹوکری زمین پر رکھ دی اور وہیں کے سامنے بیٹھ کر حقہ

پینے لگے۔ ممکن ہے حقہ کی موسیقی انکی ذمہ دار رہی ہو، تھوڑے ہی عرصہ میں ایک کالے سانپ نے جس کا تمام جسم کھپروں میں تھا ایک بالشت اوپر سر نکال کر ماتا بدل کی بین نوازی کی رقص اور وجد کے ساتھ داد دینی شروع کی۔ ماتا بدل پر تو گویا "اسپنسر سگار" کا کیف طاری تھا، انکی نیاز آنکھوں کے سامنے سارا مکان، ٹوکری، اور چھتیا خود رقص اور وجد میں تھی، اس لیے انکو یہ معلوم ہوا کہ ٹوکری میں وہم پرست عورتوں کے "ناموس" ناچ رہے تھے یا خود انکے ناریل کا دھواں پیچ کھا رہا تھا یا انار پر والے بزرگ چھتیا کی نظر بچا کر چہل میں مصروف تھے۔ لیکن یہ سارا طلسم آناً فاناً حقیقت میں تبدیل ہوگیا۔ چھتیا چیخ مار کر ماتا بدل پر جھپٹی، انھوں نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ چھتیا کے شور پکار پر محلہ والے کئی دوڑ پڑے۔ اب ایک ہنگامہ برپا تھا۔ لیکن ماتا بدل کے سکون میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چھتیا نے لپک کر انکے حقہ کو ایسا دو ہتڑ رسید کیا کہ چلم اور ناریل دونوں ٹوکری کے پاس جا گرے۔ "بھابجی" کی یہ حرکت "ناموس" کو کچھ پسند نہ آئی۔ انھوں نے ادھر کا رخ کیا تو سارے مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ چھتیا نے پھر چیخ مار کر جست کی تو ماتا بدل کے اوپر مسلط تھی۔ سانپ اب بالکل انکے پاؤں کے پاس آ چکا تھا۔ ماتا بدل کو کچھ تو خفت اور غصہ اور کچھ چھتیا کا غیر متوقع بوجھ۔ غرضکہ ان سب سے متاثر ہو کر اپنی سخت، کھردری اور مردانہ دار ایڑی کا ایک ایسا بھرپور دھکا دیا کہ "ناموس" کا سر سینے کی بوٹی بن گیا اور جھٹکے میں "بھابجی" مرحوم کے اوپر آ رہی۔ یہ ایک مزید خلفشار کا باعث ہوا۔ کسی کو کیا معلوم کہ شیش ناگ کی مکتی ہو چکی تھی۔ لوگ یہی سمجھے کہ چھتیا کی جان خطرہ میں تھی۔ کسی نے پاؤں پکڑا کسی نے ہات۔ بعضوں نے سر، ہر ایک نے بیک وقت اپنی اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھتیا معلق ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کچھ امن و تسلط ہوا، تو مجمع عام کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ مدعیہ نے کچھ چیخ کر کچھ غصہ کر کے اور کچھ رو کر کہا،

چھتیا:۔ یہ حرام خور پہلی دفعہ گھر میں کودا تھا، ابکی دفعہ اپنے باپ کو اٹھا لایا۔ ناموس نے ابکی بیجو والی آنکھ کو نہیں ڈس لیا۔

ماتا بدل:۔ (کچھ جھینپ کر اور کچھ جھنجلا کر) ارے او گھرماں کو دب رہا کہ دیوکا کوپ۔ ہے سسر کانی البتا کھپرو میں بد کہاں گھسرئی رہا۔ (ارے وہ گھر میں کودا تھا کہ خدا کا غضب۔ یہ البتہ

معلوم نہیں کہاں کھپروں میں گھسا ہوا تھا)
مجمع میں ایک سالخوردہ کانسٹبل بھی تھے جو اول تو ناتا بدل سے کچھ دست غیبؔ کے طالب ہوے، لیکن مایوس ہوکر بالآخر سب کو تھانہ پر پکڑ لائے۔

راج ریاست کی فضا، وہیں کے قوانین، ویسے ہی حاکم، اور اُسی قسم کے ماتحت! "داروغہ جی" لالہ گنپت رائے، "نائب صاحب" لالہ جگل کشور، اور "دیوانجی" لالہ چھیل بہاری، غرضکہ سارا تھانہ "لالہ زار" تھا۔ لالہ گنپت رائے صرف بہرے تھے اور بات چیت کرتے وقت ہمیشہ آلۂ سماعت کانوں سے لگا رکھتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ داروغہ جی ایک کثیف دھوتی کا نصف حصہ باندھے اور نصف اوڑھے ہوے نیب کے سایہ میں ایک کھرّی بانس کی چارپائی پر سورہے تھے، چارپائی کے ایک پایہ سے آلۂ سماعت اور دوسرے سے نایل کا حقہ آویزاں تھا۔ لالہ جگل کشور کوئیں پر کھڑے اشنان کر رہے تھے اور ایک کثیف کہارن کوئیں سے پانی نکال نکال کر انکے اوپر ڈالتی جاتی تھی، بشرہ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ انکو اپنی صفائی سے زیادہ کہارن کی صفائی کی تمنا تھی۔ منشی چھیل بہاری دفتر میں روزنامچہ سر کے نیچے رکھے ہوے خراٹے لے رہے تھے۔ جس کی ممکن ہے یہ وجہ رہی ہو کہ حلبی شیشوں والی عینک ناک سے پھسل کر نیم کشادہ دہن میں آگئی تھی اور ہر سانس کے ساتھ حلق تک پہونچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شور و غل سنکر چونکے اور احاطۂ تھانہ میں ایک مجمع کثیر دیکھ کر جلد عینک درست کی اور کاغذات اُلٹنے پلٹنے لگے لیکن کبھی کبھی عینک کے اوپر سے آنکھ اُٹھا کر یہ سین بھی دیکھ لیتے تھے۔ لالہ گنپت رائے بھی اُٹھائے گئے، تھوڑی دیر میں سب لوگ اکٹھا ہوے اور مدعیہ، ملزم، اور تماشائیوں کے بیانات شروع ہوے۔ سارا قصہ سننے کے بعد افسران تھانہ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ملزم پر کیا دفعہ لگائی جائے۔ شروع سے آخر تک ہر ایک نے تعزیرات ہند کی ورق گردانی کی اور سب نے تنگ آکر کتاب پٹک دی اور کہنے لگے یہ معاملہ زبانی ہی طے ہو جائے تو اچھا ہے۔ کتاب کو چھیڑنا اچھا نہیں ہے ورنہ وکیل مختاروں کی مین میخ سے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔
دیوانجی کی رائے تھی کہ دفعہ ۳۲۳ تعزیرات ہند (مارپیٹ) عاید ہوتی تھی، لالہ جگل کشور کو ہرا

تھا کہ یہ نقضِ امن اور مجمع خلافِ قانون کے تحت میں آتا تھا۔ بہرحال کچھ طے نہیں ہوتا تھا کہ لالہ گنپت رائے نے یک لخت آلۂ ساعت کشا کو ایک بار پھر چارپائی کے پایہ سے آویزاں کیا اور فرمایا "یہ سب کچھ نہیں۔ کپتان صاحب کا کیمپ قریب ہے۔ یہ تُک بندیوں کا موقعہ نہیں ہے۔ آپ لوگوں کی دعا سے میں اس سارے مسئلہ کی تہ تک پہونچ چکا ہوں۔ صرف تھوڑا سا اشتباہ ہے، وہ بھی پرمیشور کی کرپا سے دُور ہوا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ دفعہ ۳۰۲ (قتلِ عمد) ہے یا ۳۰۴ (قتلِ انسان) تعزیرات ہند! اگر کپتان صاحب نئے نئے نہ آئے ہوتے تو قتلِ انسان چل سکتا تھا، لیکن بھائی زمانہ نازک ہے، ہم لوگوں کی پنشن کا زمانہ بھی قریب ہے۔ ایک کمانے اور سب کھانے والے ہیں۔ قتلِ عمد ہی چلانا مناسب ہے۔ ایشور نے ایسا صاف قتل کا مقدمہ بھیجا ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں موجود ہیں۔ قیصرِ ہند کو بھی مدعی بننے کی ضرورت نہیں رہی۔ چلتے چلاتے ایسی کارروائی ہوئی جاتی ہے کہ سارا علاقہ تھرا جائے گا۔ مقدمہ کی صورت یہ ہے کہ اس سے قبل ملزم، مدعیہ کے گھر میں قتل کی نیت سے کودا تھا، لیکن کامیاب نہ ہوا۔ دوسری دفعہ کھیرے لانے کے بہانے سے عمداً (دریا ونجی غور کیجیے گا، عمداً!) ایک سانپ پکڑ لایا۔ اور مدعیہ کو کٹانا چاہتا تھا۔ صورت دیکھیے اچھا خاصہ ٹھہرا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں بھئی منشی چھیل بہاری کیسی رہی؟ بھئی تم کو کتاب قسم!"

بالآخر یہ طے پایا کہ سب کو کپتان صاحب کے ہاں چلنا چاہیے "بھئی اس کارروائی کی بھنک کپتان صاحب کے کان میں بھی ڈال دینی چاہیے۔ افسرِ اعلیٰ ہے اور پھر انگریز ہے انگریز کیا معلوم خوش ہوکر ہم کو آپ کو کہاں سے کہاں پہونچا دے، انسپکٹر صاحب بھی رخصت پر جانے والے ہیں!"۔ لالہ گنپت رائے نے فرمایا۔

ڈورس صاحب "کپتان" تھے اور کپتان ہی نہیں بلکہ اپنے وقت کے کلکٹر، کمشنر اور لاٹ صاحب بھی۔ قانون اور قاعدہ سے انکو اتنا ہی مس تھا جتنا نئی روشنی کی دخترانِ حوا کو اپنے مہذب اور مصلحت اندیش شوہروں سے۔ اکثر تمام دن دھوپ میں، دن کی نیم آستین پہنکر کپتان صاحب خندق کھودا کرتے تھے اور شام کو کُشتی لڑتے تھے۔ رات کو اجلاس شروع ہوتا تھا۔ اپنی اختلافِ آرا کا اظہار یہ محض اُس بلے کوڑے سے کیا کرتے تھے جو ہر وقت انکے پاس ہوتا تھا اور معلوم نہیں

پیروی سنت کے لحاظ سے یا حفاظت خود اختیاری کے سلسلہ میں انکے لواحقین بھی، بلا قید موسم، وردی وار کپڑا استعمال کرتے تھے۔ معلوم نہیں کیا اتفاق ہوا۔ ایک بار محرر پیشی کو ملزم کی حیثیت سے کسی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ اتفاق سے اُس دن ڈورس صاحب کا بھی اجلاس تھا۔ محرر کی طلبی ہوئی تو غیر حاضر پایا گیا۔ جھنجھلا کر کوڑے کی طرف متوجہ ہوئے تو بوڑھے اردلی نے کہا۔

اردلی:- (حقارت آمیز لہجے میں) کوڑا ہی پھٹکارنا آتا ہے یا کچھ کرتے دھرتے بھی ہو؟

ڈورس صاحب:- (تلملا کر) ..... کیا ہوا؟

اردلی:- ہوا کیا، پیشکار کو فوجداری والے پکڑ لے گئے۔ کچھ کرتے دھرتے تو ہو نہیں، سب ناحق بے ناحق پیٹا کرتے ہو۔

ڈورس صاحب:- (غضبناک ہو کر) کہاں گیا فوجداری والا؟

اردلی:- وہ کیا سامنے اجلاس ہو رہا ہے۔

ڈورس صاحب نے فوراً کوڑا سنبھالا، عدالت میں پہونچے تو دیکھا کہ محرر صاحب ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں، بیان ہو رہا ہے۔ وکیل مختار تو دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئے، حاکم صاحب نے بھی دفعتاً آرام کمرہ کا رُخ کیا، پیشکار صاحب کو کہیں جگہ نہ ملی تو میز کے نیچے دبک گئے، ڈورس صاحب نے اپنے محرر کی گردن دبوچی اور ایک کوڑا رسید کیا "بدمعاش یہاں کس کے حکم سے آیا"؟ اور دھکا دیتے اور کوڑے سے ہنکاتے ہوئے اپنے اجلاس میں پکڑ لائے۔ حاکم اجلاس نے فوراً کلکٹر صاحب سے جا کر شکایت کی، کلکٹر صاحب نے ڈورس صاحب کا نام سنا تو دم بخود رہ گئے اور کچھ دیر تامل کرنے کے بعد فرمایا "بس جانے ہی دو، اس پاگل سے دُور ہی دُور رہنا اچھا ہے!"

ڈورس صاحب جب کبھی سوال کرتے تھے تو اُسکے فوراً ہی بعد پوچھتے تھے "سمجھا"۔ مخاطب کی خیریت اسی میں تھی کہ اگر نہ سمجھا ہو تو فوراً بول اُٹھے "نہیں سمجھا"۔ یہ سوال جواب متواتر ہوتا رہے تو کوئی قباحت نہیں لازم آتی تھی لیکن اگر کسی نے ذہن پر زور دے کر، شامتِ اعمال سے اِدھر اُدھر کا جواب دے دیا اور ڈورس صاحب کی تشفی نہ ہوئی تو پھر فوراً کوڑے سے مرائتہ کیا جاتا تھا۔

اتفاق سے جس روز چھتیا اور ماتا بدل کا مقدمہ پیش ہونے والا تھا، ڈورس صاحب نے پیشکار سے دریافت کیا

ڈورس صاحب :- پیشکار ، ایک ہم ایک تم ، کیا ہوا ؟ سمجھا ۔
پیشکار صاحب :- (فوراً) حضور نہیں سمجھا ۔
ڈورس صاحب :- دیکھو ، ایک ہم اور ایک تم ، کیا ہوا ؟ سمجھا ۔
پیشکار صاحب :- (یکلخت) حضور بالکل نہیں سمجھا ، اگر حکم ہو تو داروغہ جی کو بُلا لوں ، وہ خوب سمجھتے ہیں اور اسوقت اتفاق سے حضور کو سلام کرنے آئے ہوئے ہیں ۔
ڈورس صاحب :- اچھا بُلا لو ۔

پیشکار صاحب نے اردلی کی طرف اشارہ کیا ، لالہ گنپت رائے ایک لمبا چغہ پہنے ، پگڑی باندھے ہوئے حاضر ہوئے ۔

ڈورس صاحب :- وَل تھانہ دار ، ایک ہم ایک تم کیا ہوا ؟

تھانہ دار صاحب نے حسب دستور آلۂ سماعت نکال کر کان کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ڈورس صاحب کا کوڑا ہوا میں بلند ہوا ۔ تھانہ دار صاحب نے فوراً راہِ فرار اختیار کی ، ڈورس صاحب نے تعاقب کیا ۔ خاردار جھاڑی کا احاطہ تھا ، لالہ گنپت رائے نے کوشش کی کہ کسی طرح صاف نکل جائیں لیکن کانٹے نے دامن اور پگڑی دونوں کو گرفتار کر لیا ۔ داروغہ جی کانٹوں میں گرے اوپر سے ڈورس صاحب نازل ہوئے ۔ ادھر چپڑاسی ، عمال تھانہ اور دوسرے تماشائیوں میں خلفشار مچا اور جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگ نکلا ۔

شام تک ناتابدل بھی مکان پہونچ گئے ۔

رشید احمد صدیقی (علیگ)

خود فراموشی جنوں بن کے جو برباد رہے
اُسکو احساس کہاں قید کہ آزاد رہے

وہ حجابات اُٹھا جن سے کھلیں رازِ لطیف
دیکھنے والے کو تا حشر تو کچھ یاد رہے

کیا ملا بندِ علائق میں انھیں کر کے اسیر
تیرے دیوانے تو ہر حال میں آزاد رہے

دل کی جب قیدِ عناصر میں ہے شورش اتنی
کیا غضب ڈھائے جو بھولے سے بھی آزاد رہے

مسلکِ دردِ محبت کا یہ پہلا ہے اصول
مرتے دم تک بھی حریفِ لبِ فریاد رہے

دیکھ لینا کہ بدل دیں گے قفس کی دنیا
ہمصفیر اتنے جو دلدادۂ فریاد رہے

نظر آنے ہی کو ہے جلوۂ جاناں شادقؔ
گرم یوں ہی ابھی ہنگامۂ فریاد رہے

کلام شاد

(شایع کردہ انجمن ترقی اُردو پٹنہ - قیمت باختلاف کاغذ ۲/۸ و ۳/۸)

جناب شاؔد نہ صرف اپنے صوبۂ بہار بلکہ کُل ہندوستان کے ادبی مذاق رکھنے والے افراد میں خاص شہرت اور امتیاز رکھتے ہیں اور اپنی کہنہ مشقی اور قدامت کی بنا پر ملک کے بہت سے شعرا سے ممتاز و فائق ہیں - حال ہی میں ہماری مایۂ ناز قومی یونیورسٹی "جامعہ ملیہ" علی گڑھ کے مطبع سے اُنکے کلام کا انتخاب ۱۵۰ صفحات کے ضخیم دیوان کی صورت میں شایع ہوا ہے - ایک نامور اور کہنہ مشق شاعر کے دیوان سے جو اُمیدیں قائم کی جا سکتی تھیں وہ بڑی حد تک اس نے پوری کر دیں حقیقی انتقاد و تبصرہ کے لیے کافی وقت اور تعمق نظر کی ضرورت ہے لیکن سرسری مطالعہ کرنے پر دیوان کا بڑا حصہ دلچسپ، خوش مذاقی اور تصوف کا دلکش مجموعہ اور فنی حیثیت سے بلند نظر آتا ہے بعض غزلیں شروع سے اخیر تک مرصع ہیں - ہاے کیا شعر کہا ہے

تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز اُن کے

اس شعر والی پوری غزل رنگ حقیقت میں ڈوبی ہوئی ہے - مشہور بابی خاتون قرۃ العین طاہرہ کی غزل کے بعد اسی طرح اور قافیہ میں ایسی غزل کہنا شاؔد ہی صاحب کا حصہ ہے - حق یہ ہے کہ پوری غزل لاجواب ہے - نمونۃً چند شعر درج کیے جاتے ہیں

ترا نور جب ہوا عیاں ہوا آشکار جو تھا نہاں چمک اُٹھے دشت و جبال پر متشعشع متنزلا

ہیں نگاہِ شوق میں متحد ترا کوچہ ہو کہ ہو قتل گہ تری جلوہ گاہیں دونوں ہی جو منیٰ ہے وہ تو یہ کربلا

اسی قسم کی بہت سی غزلیں ہیں جن کی تعریف نہ کرنا ادب اُردو اور کمالِ نظم کا خون کرنا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ہم کو نہایت ادب اور کمال تعجب سے چند امور کی طرف توجہ دلانی ہے اور یقیناً ان پر توجہ نہ دلانا فرض انتقاد میں کوتاہی کرنا ہے

ردیف شعر کی جان ہے - اور اگر ردیف شعر میں دست و گریبان اور پوری طرح چسپاں نہ ہو تو مضمون کتنا ہی عالی ہو شعر مہمل اور لغو سمجھا جائے گا۔ ہم کو تعجب ہے کہ ایسے مشاق اور کہنہ مشق

شاعر کے یہاں بعض مقامات پر ردیف کمزور ہے یا چسپاں نہیں ہے۔

چلے جب شاد ہم سوئے عدم دنیا پکار اُٹھی ہمارے پاس سے پھر بھی اگر ہے مرد ہوتا جا

اگر"ہے مرد" کے پہلو ے ذم کو چھوڑ کر دیکھیے تو ایسے موقع پر بجائے"ہوتا جا" کے"ہوتے جاتا" چاہیے تھا

ہے اب یہ چھیڑ کہ بستر اُٹھا گلی سے مری مجھی پہ غیظ و غضب وہ نکال دیتے ہیں

غصہ نکالنا تو مستعمل ہے۔ غیظ و غضب نکالنا نظر سے نہیں گذرا اور اگر ہو بھی تو"نکال دیتے ہیں" اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے اور ردیف چسپاں نہیں ہوتی۔

صدق دل سے شاد کی تصدیق کر ایمان لا فرق کرا ے مدعی جادو سے اور اعجاز سے

ایسے موقع پر"سے" نہیں اچھا معلوم ہوتا۔ قاعدہ سے"جادو میں اور اعجاز میں" ہونا چاہیے

بے وضو ساقی سے پائے گا نہ ے کہدو میکش اپنے منہ کو دھو رہے

رو رہے اور کھو رہے میں دھو رہے فرمایا ہے ردیف" رہے" غلط ہے۔ ایسے موقع پر ہماری زبان میں" دھو رکھے" بولا جاتا ہے

مقدمہ نگار مولوی سید سلیمان نے شاد صاحب کی بلند نظری اور خوش مذاقی کی بہت تعریف کی ہے لیکن اشعار ذیل کے"عامیانہ اور سوقیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک" ہونے کا فیصلہ ہم انھیں پر چھوڑتے ہیں

گرا جو ہاتھ سے شیشہ معاف کر ساقی کسی نے زور سے پنجہ مرا مروڑ دیا

کسے لحاظ ہے تحت الحنک کا قاتل کے رگوں میں ویسے لہو کھولتا ہوا ہوگا

کیا اس معاملہ کے سزاوار ہم ہیں کیا اور بھی کوئی ہے خریدار آپ کا

میں پنجہ مروڑنا، تحت الحنک، اور معاملہ، تو شاید اُستاد آمانت کے یہاں زیادہ اچھا معلوم ہوتا۔

بعض اشعار میں تو حیدرآباد کی پُرانی اُردو کا لطف مل جاتا ہے

غم فراق پہ اے آسماں نہیں قوت وہ جو سہائیں غریبوں کو ہر طرح سہنا

شاد کے آگے بھلا کیا ذکر یار نام ادھر آیا کہ اُسنے رو دیا

"وہ جو سہائیں غریبوں کو ہر طرح سہنا" اور" اُس نے رو دیا" پر بے اختیار سید سجاد حیدر کے غیالستان کے نواب غیاث الدولہ (آف حیدرآباد دکن) یاد آگئے:

"آپ نے ایک پوربی دوست کا نام ہم لوگوں نے "شالی بدھنا" رکھ دیا تھا اور اس "شالی" سے خاص لطف اُٹھایا کرتے تھے۔"

یہی لطف بعض جگہ اس دیوان میں بھی مل جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو

جھلک کچھ کچھ نظر آئے گی گو پردوں پہ پردے ہیں ہوس گر ہے تو آئیں میرے شالی دیکھنے والے

شتر گربہ اور ضمائر کی عدم مطابقت قادر الکلامی کے کس قدر خلاف ہے۔ عجب ہے شاد صاحب فرماتے ہیں

چلے جائیں گے ہم جو محفل سے کوئی اور میری جگہ آ رہے گا

"ہم" اور "میری" کیا ہے؟

حشو وزوائد کا خیال رکھنا اور شعر میں ایک حرف بھی ایسا نہ رکھنا جس کا حذف کر دینا مطلب میں خلل نہ ڈالے ہنر بلکہ شاعر کے لیے ضروری ہے۔ اشعار ذیل میں نشان داد والفاظ بظاہر نظر میں حشو نظر آتے ہیں

بظاہر مٹ چکا ہے عشق کا آزار لیکن پھر طبیعت ہر گھڑی رہ رہ کے کیوں غمگین ہوتی ہے

یوں تو تھے مد نظر لاکھوں حسیں آخر آخر ہم اُنھیں کے ہو رہے

بعض محاورات وہ نظم ہوئے جو لکھنؤ اور شاید دلّی میں بھی مستعمل نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ صوبۂ بہار کے ساتھ مخصوص ہوں:

دل لے گیا کلام فصیحانہ آپ کا

یہاں کلام فصیحانہ کی جگہ پر کلام فصیح ہونا چاہیے تھا۔

پیغام آرہے ہیں تواتر وصال کے ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا

تواتر آنا غلط ہے علی التواتر بولا جاتا ہے۔

نہ آئی مرے بادہ خانہ میں عید محرّم کا بارہ مہینہ رہا

دوسرے مصرع کی زبان کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

مقتل میں حقیقت کیوں کُھلتی اس میرے شہادت ہونے کی
آپ اپنی خطا سے قاتل کی پہچانا گیا شرمانے سے

میں "شہادت ہونا ثبت ہوتا ہے" بھونڈا ہے۔ ایسے موقع پر "شہید ہونا" فصیح ہے
اسی طرح کی بعض اور خامیاں ہیں جو خدا کرے مظلوم کاتب کی ہوں اور ہمارے نامور شاعر کا دامن ان سے پاک ہو۔
آخر میں پھر ایک بار عرض کیا جاتا ہے کہ اس پر بھی دیوان مجموعی حیثیت سے ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے ناظرین ضرور لطف اندوز ہوں۔

'انصاری'

دانی کہ ایں حیات تو داری باصل چیست!

دانی کہ ایں حیات تو داری باصل چیست ترکیب آں ہمہ ز خزان و بہار ہست
یعنی گہے حیاتِ تو خرم چو نو بہار گاہے چو روزگار خزاں تیرہ تار ہست
اندک برنگ لیل و کمی در لباسِ نور جز تیرگی و لے ہمہ بے اعتبار ہست
طورے کہ صبح و شام شود ژالہ رونما ہم صبح و شام عمر کسے اشکبار ہست

کیفِ حیات نیک بما ندبرود زن کار زد و عود نواہائے تلخ و تر
اول ز فتح و سوز و سرورے کند بیاں مسرور می کند ز سرودش دلِ بشر
تغییر زود می دہدش آں نوائے خوش انگشتہاش باز زند پردۂ دگر
در جائے سوز و عیش سراید ز رنج و درد آرد بروں ز چنگ نواہائے جاں شکر

بازت حیات ہیچ فسانہ ست بس شگرف اندوہ و عیش ہر دو بہم ساختہ در آں

پیکار و رزم و صلح و صفا اندرو بسے | لذت بگوش جاں رسد از حرفہائے آں
ویں طرفہ تر کہ گوش چو مسحور آں شود | دل پُر کند ز خوف و ز اندُہ ہماں زماں
آخر ز دستِ آں تو بسر دست می شوی | از چشم خوں فشانی و پیچی بہ طیلساں

دیگر بشنو حیات چو جز بیست خودنما | کاید ز روئے عرش بریں تودہ غبار
مقصودش ایں بود کہ برایں ارضِ بے ثبات | آرد بدست دولت و ہم عیش و اقتدار
اینہا بود چو کرم شب افروز کم فروغ | انگارد او ز جہل ضیا نیست پائدار
زودش چو نو عروس بآغوش در کشد | آخر شود بحسرت و افسوس خود شکار

بازم بشنو حیاتِ تو در اصل خویش چیست | زیبا چو قوس کو نظر آید بر آسماں
خوشتر ز رنگ و پُر شکوہ و پر افسوں و دلکشا | قائم بچرخ و محکم و بر پائے درعیاں
لاکن چو نیک درنگری زود در رسی | کیں ہست بے ثبات چو ادوار آسماں
ہر رنگ و ہر شکوہش و افسون و دلکشی | مخلوط در فضا شود و نیست بے گماں

شمعیست ایں حیات فروزاں بہ تیرہ شب | کم کم بہ تیرگی دہر از نور خود نشاں
گر باد شعلہ اش بفزاید فرو مرد | در دست نور او بفزاید شود زیاں
تا پہ چو تیز تر بشود زود تر خموش | در ساعتے بہ تیرگی اندر فتد جہاں
والہا ز سوز ہجر فشاند چو شمع اشک | چوں جاں ازیں جہاں بکشد رخت خود بآں

سید اظہر علی، اے۔ ایچ، ایم۔ اے، ایل ایل (دہلی)

حقیقی مسرت اور ظاہری نمائش

سلاطین یورپ نے اپنے ماتحتین کو، اُن کی حسن خدمات کا صلہ دینے کا یہ طریقہ نکالا ہے، کہ اُن کو دو گز لمبا نیلے رنگ کا فیتہ دیتے ہیں، جو اُن کے کاندھے پر لگادیا جاتا ہے، وہ لوگ جو اس عزت کے نشان سے مشرف کیے جاتے ہیں "نائیٹ" کہلاتے ہیں، اور پادشاہ ہمیشہ اس طبقہ کا سردار ہوتا ہے۔ بڑی بڑی اہم خدمات کے صلہ دینے کا، یہ بہت ہی کم خرچ بالانشین طریقہ ہے۔ اور پادشاہوں کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ اُن کے ماتحتین ایسے بے حقیقت انعاموں سے خوش ہو جاتے ہیں۔

اگر میدان جنگ میں کسی سپہ سالار کا پانوں ضائع ہو جائے تو پادشاہ اُسکو دو گز فیتہ دیتا ہے اور اُسکے تلف شدہ عضو کی تلافی کردی جاتی ہے۔ اگر کوئی سفیر، ممالک غیر میں، اپنے ملک کی عزت قائم رکھنے میں، اپنی کل موروثی جائداد صرف کر دے، تو پادشاہ اُسکو دو گز فیتہ بخشتا ہے، جو اُسکی جائداد کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ القصہ اگر کسی یوروپین پادشاہ کے پاس دو گز سبز یا نیلے رنگ کا فیتہ بچ رہے، تو پھر اُسکو اس کا خوف نہ رہنا چاہیے کہ اُسکے پاس مدبروں، جرنیلوں، یا سپاہ کی کوئی کمی ہے۔

میں اُن سلطنتوں کی کافی طور سے قدر نہیں کر سکتا، جہاں موروثی جائداد رکھنے والے اشخاص عنایات تہی کے لیے حقیقی مصائب اور تکالیف کا بار اُٹھاتے ہیں! ایک شخص جو پہلے ہی سے دولتمند ہے، اور جو حرص و ہوا کی زندگی میں داخل ہوتا ہے، اپنی اس حیثیت میں وہ متعدد حقیقی تکالیف محسوس کرتا ہے، اور اُسکو اب ایسی خوشی جو پہلے میسر تھی حاصل نہیں ہوتی۔ ایک درباری بننے سے قبل وہ کھا، پی، اور سو، سکتا تھا۔ غالباً زیادہ اچھی طرح۔ بہ نسبت اسکے کہ جب اُس کو یہ خدمت عطا کی گئی۔ وہ خوشامدیوں پر خانگی زندگی میں اسی طرح حکومت کر سکتا تھا جس طرح کہ اپنے پبلک اختیارات کے ماتحت اُسکو اب اقتدارات حاصل ہیں، اور اپنی ہر ایک مرغوب خاطر خواہش میں بغیر لوگوں کی نکتہ چینی اور اُنکی نظر پڑنے کے ہمہ تن

غرق رہتا تھا - تو پھر ایک ایسی دولت میں، جو پہلے سے وافر ہے مزید اضافہ سے کیا حقیقی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ کچھ نہیں!۔

اگر وہ نامور شخص اپنی دولت بڑھانے سے، اپنی خواہشات میں اضافہ کر سکے، تو اس صورت میں اس کا اعلیٰ مرتبہ حقیقی تفریح کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔

کیا وہ اپنی ایکہزار اشرفیوں کو المضاعف کرنے سے، دو بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے یا بجاے ایک کے، دو پُرتکلف ضیافتیں احباب کو دینے کے قابل ہو گیا؟ اگر ایسا ہے تو بلا شبہہ وہ معاف کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اُس نے اپنے آرام و آسایش کے دائرہ کو بڑھانے کی غرض سے کسی قدر تکلیف برداشت کی، لیکن برخلاف اسکے جبکہ وہ مصائب برداشت کر کے اپنی مسرت کی خواہش کو ترقی دینا چاہتا ہے تو وہ اسکو اکثر گھٹتا ہوا پاتا ہے، اور جوں جوں اس کا تمول بڑھتا جاتا ہے، اسکی مسرت اور تفریح کی وسعت گھٹتی جاتی ہے۔

اس لیے میں، نامور اور معزز اشخاص کو حسد کی نظر سے دیکھنے کے بجاے، اُنکو عموماً کسی قدر افسوس سے دیکھتا ہوں - میں تو اُن کو ایک خوش خلق، راہ گم کردہ، لوگوں کا گروہ سمجھتا ہوں جو اپنی انتظام خوشیوں کے لیے جو وہ منا رہے ہیں، ہمارے ممنون و شکر گزار ہیں۔ وہ، خود کو نہیں، بلکہ ہم کو خوش کرنے کے لیے، زیبائش کے تکلیف دہ خرمن کے نیچے، پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں، وہ صرف ہم کو خوش کرنے کے لیے، اپنے ملازموں کی قطار کے ساتھ، بڑی سنجیدگی اور تمکنت سے ہمارے سامنے سے گذرتے ہیں۔ صرف ایک کوٹ، یا صرف ایک وردی پوش ملازم بھی عبث ترین آراستگی کے اغراض کے جواب میں کافی ہو سکتا ہے، اُن لوگوں کے متعلق جن کے پاس بیس کوٹ ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک کوٹ اپنی مسرت کے لیے رکھتے ہیں اور بقیہ انیس صرف ہمارے لیے۔ واقعی کنفیوشس کا مقولہ بالکل صحیح ہے کہ "ہم بجاے اسکے کہ خود کو خوش و خرم خیال کریں، دوسروں کے دلوں میں یہ بات ذہن نشیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم خوش اور بشاش ہیں" لیکن اگرچہ گفتگو کے عنوان بنائے جانے، اور ایک اعلیٰ حیثیت کے مراتب کو قائم رکھنے کی خواہش، ایک حریص کے لیے، بہت ہی تکلیف دہ ہے، تاہم سوسائٹی کے لیے بہت بہتر ہے کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو بہ رضا و رغبت آرام و سلامتی کو خطرہ اور فتنہ سے بدل لیں گے!

ہم کو ان لوگوں کی رعونت اور خود پسندی سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ اور یہ ذرا نا منصفانہ بات ہے کہ ایک شیر خوار بچہ سے، اُس کا جھنجھنا چھیننے کی کوشش کی جائے۔ اگر ایک ڈیوک[1] یا ڈچس[2] ہماری دلچسپی کے لیے، رضامندی سے، اپنے ملازموں سے لباس کے دامن اٹھوائے ہوئے گذریں تو یہ اُن کے حق میں بہت ہی بُرا ہے۔ اگر وہ محض اپنی رفعت و شان دکھانے کے لیے، تئیں غلاموں اور ملوک کے ساتھ جمہور کے سامنے سے گذریں تو یا اور بھی قبیح ہے صرف تماشہ بین ہی وہ لوگ ہیں جو کہ خوشی حاصل کرتے اور مسرت بخشتے ہیں، صرف یہی، وہ سرگرم افراد ہیں جو ظاہری نمائش کو ترقی دیتے ہیں۔

ایک دفعہ، ایک عیار چینی پوجاری، ایک چینی حاکم سے، جسے زیور پہننے کا بہت شوق تھا، مخاطب ہوا۔ اور فراشی سلام کرکے، اُس کا بہت شکریہ ادا کیا، اُس نے کہا "عزیز من، تم کس وجہ سے میرا شکریہ ادا کر رہے ہو؟ میں نے کبھی تمھیں کوئی زیور نہیں دیا"۔ اُس نے جواب دیا "یہ سچ ہے کہ تم نے مجھے کوئی زیور نہیں دیا، لیکن تم نے مجھے ان زیورات کو جی بھر کے دیکھنے کی اجازت دی، اور تم بھی سوا اسکے کہ ان کو دیکھ کر شادان ہو، اور کچھ نہیں کر سکتے، اس لیے ہم میں کوئی فرق نہیں ہے، بجز اسکے کہ تم کو ہر وقت ان پہ نظر رکھنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑتی ہے، اور یہ ایسا شغل ہے کہ مجھے اس کی زیادہ خواہش نہیں۔ خدا حافظ"۔

(ترجمہ از گولڈ اسمتھ)

محمد عزیز الحسن قریشی۔ متعلم فرسٹ ایر نظام کالج

[1] انگلستان کے بڑے درجہ کا امیر۔ [2] ڈیوک کی بیگم۔

جس بات کو مفید سمجھتے ہو خود کرو　　اوروں پہ اس کا بار نہ اصرار سے دھرو
کافی ہے بس یہ غلط کہ غیرت ضرور ہے　　تقویٰ بہت ضرور ہے اللہ سے ڈرو
حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات　　دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو

اکبر۔ الہ آبادی (مکاتیب اکبر حصہ دوم)

افکارِ جگر

بے نقاب آج تو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے
جو جہاں پر ہو وہیں بیخود و حیراں ہو جائے

ایک ذرّہ کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی شدّتِ انوار سے حیراں ہو جائے

واقفِ سرِّ حقیقت اگر انساں ہو جائے
غم سے نزدیک ہو، راحت سے گریزاں ہو جائے

قلبِ عالم جو مرے حال سے جنباں ہو جائے
سعیِ ناکام بھی اک کارِ نمایاں ہو جائے

حسن خود ہو نگراں، عشق جو حیراں ہو جائے
جان خود جسم بنے، جسم اگر جاں ہو جائے

اس کی اک موجِ تبسم جو نمایاں ہو جائے
دل کا ہر ذرہ پے کیف خمستاں ہو جائے

جامعِ حسن کسی رنگ میں انساں ہو جائے
گُل بداماں نہ سہی، خار بداماں ہو جائے

یوں بڑھے پائے طلبِ حسنِ قدم کی جانب
ایک ہی جست میں طے، عالمِ امکاں ہو جائے

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

تم سُنا دو کسی پردہ سے جو اپنی آواز
روح خوابیدہ ابھی جسم میں رقصاں ہو جائے

رفتہ رفتہ نہ رہا لطفِ توازن باقی
ہوش و مستی میں بہم پھر کوئی پیماں ہو جائے

دل نے دیکھا ہے جو آسکو نظر آجائے اگر
یہ توجّہ ہو نگہ میں کہ پریشاں ہو جائے

بھول کر جائے نہ رنگینیِ صورت کی طرف
عظمتِ روح سے واقف اگر انساں ہو جائے

اس سے بڑھ کر کوئی دلسوز بھی دُنیا میں نہیں
نفسِ چالاک اگر تابعِ فرماں ہو جائے

مستیِ عشق کا افسانہ اگر چھیڑ دوں میں
کفر کی شرح میں گم، شیخ کا ایماں ہو جائے

دل ہے گنجینۂ انوار نگاہیں محدود
کاش اس کُل کا ہر اک جزو پریشاں ہو جائے

اللہ اللہ یہ عرفانِ جنوں کی تاثیر
آج جس خار سے کہدوں وہ گلستاں ہو جائے

خام سمجھو طلب و شوق کا اعجاز جگرؔ
ہر نفس عشق میں جب تک نہ رگِ جاں ہو جائے

جگرؔ۔(مرادآبادی)

اظہار رائے

گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل!

اس خیال سے نہیں کہ اصحاب الرسالے کے ممتاز دائرہ میں میرا بھی شمار ہونے لگے، بلکہ اس لحاظ سے کہ میرے عنایت فرما اڈیٹر الناظر کہیں وعدہ وفا نہ ہوسکنے پر آیندہ کسی اشاعت میں ایفائے وعدہ کے متعلق احادیث نبوی و کلام الٰہی سے استدلال نہ شروع کردیں، میں ایک عرصہ کے بعد آج کچھ اظہار خیالات پر مجبور ہوتا ہوں -!

الناظر کے متعلق مجھ سے کبھی میرے عنایت فرمانے رائے طلب کی تھی مگر میں اپنی عدیم الفرصتی اور کثرتِ مشاغل و فرائض کی وجہ سے تعمیل ارشاد سے قاصر رہا اور ہمیشہ یہی عذر کرتا رہا تاہم تقاضائے شدید زبانی و تحریری میرے عنایت فرما کی طرف سے برابر جاری رہا!

میرے خیال میں الناظر کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی فی الحال ضرورت ہے وہ صحیح مذاق علمی ہے! اگر میں یہ کہوں کہ الناظر بصورت موجودہ، ایک نہایت خشک کھدر پوش اور چاشنیٔ ادب سے گریزاں، رسالہ ہے تو مجھے خوف پیدا ہوتا ہے کہ الناظر "خشک و کھدر پوش" کی حمایت میں "فیہ ما فیہ" کے تحت میں یا "نظرے خوش گذرے" کے زیرسایہ ایک معقول بحث نہ شروع کردی جائے! بہرحال جب تقاضائے شدید مجھے لب کشائی پر مجبور کرتا ہے تو میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار - عام اس سے کہ وہ سلسلہ اثر تا یا غلط ہی کیوں نہ سمجھی جائے - اپنا فرض اخلاقی سمجھتا ہوں!

الناظر کی وہ تصویر بھی میرے پیش نظر ہے جو سنہ ۱۹۱۲ء یا سنہ ۱۹۱۳ء تک باقی رہی اور وہ بھی جو جنگ عظیم کے اختتام سے اڈیٹر صاحب کی عارضی دست کشی تک کسی نہ کسی طرح قائم رکھی گئی - مگر ان دونوں حالتوں اور موجودہ صورت میں ایک بیّن اور نمایاں شانِ امتیاز نظر آتی ہے! پہلی صورت میں ادبی چاشنی، مذاق سلیم کے نمونے، کبھی کبھی شگفتہ نگاری کے مرقعے اور مختصر و سبق آموز افسانے، سب ہی کچھ پائے جاتے تھے لیکن اب خدا کے فضل سے اول سے آخر تک

تمام رسالہ راہِ نجات یا فلاح المومنین نظر آتا ہے!

اکثر احباب کی رائے ہے کہ "الناظر" کی کوئی خاص پالیسی، رَوِش یا مقصدِ زندگی طے ہو جانا ضروری ہے! پہلے یہ ایک علمی و ادبی رسالہ تھا: اب اگر مذہبی اور سیاسی ہو گیا ہے تو اس کا صاف صاف اعلان سرورق پر ہونا ضروری ہے!

الناظر کا مذہبی یا سیاسی رسالہ بن جانا کوئی خدانخواستہ عیب نہیں ہے۔ البتہ اس سے خریداران رسالہ کو جنس خرید کردہ کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوگی اور اس کو علمی و ادبی پرچہ سمجھنے کی غلط فہمی کا احتمال بھی جاتا رہے گا!

کاغذ کی عمدگی، روشنائی کی چمک، غرض رسالہ کی ظاہری آب و تاب، تحریکِ سودیشی نے اپنی کھڑاؤں سے، ہمیشہ کے لیے، یا عرصۂ دراز کے لیے کچل ڈالی! اسکے متعلق اگر ایک حرف کہا جائے تو سودیشی کی بحث کی سلسلہ جنبانی ہو گی جو غالباً اس حد پر ختم ہو گی کہ ایسی رائے دینے والا، اخلاقی، مذہبی، قومی، انسانی اور خدا جانے کس کس نقطۂ نظر سے گناہگار و خطاوار قرار پائے!

مضامین کے علاوہ ذاتیات پر حملے، الناظر کا اب مستقل شیوہ نظر آتا ہے! ایک بات کو باربار۔ اور اکثر نہایت کرخت لہجے میں دُہرانا غالباً اظہارِ شانِ استغناء قرار دیا گیا ہے! اڈیٹر صاحب کی سیاسی دلچسپی اور شرکت کا آغاز جس زمانہ سے ہوتا ہے اُسی زمانہ سے الناظر میں اس درشت نگاری کی جھلک نظر آتی ہے۔ آگے چل کر جس راستہ پر اور جس حد تک وہ دلچسپی و نقل و حرکتِ سیاسی بڑھتی جاتی ہے اُسی سمت اور اُسی قدر، حق گوئی، اظہارِ فیصلۂ ناطق، اور گروہِ مخالف کی نکتہ چینی ذاتیات کی حد تک، نہایت سختی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے!

حاشا وکلّا! میں اڈیٹر صاحب کی زاہدانہ زندگی پر نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتا ہوں مجھے صرف الناظر کے معیارِ حیات سے تعلق ہے! بفضلہٖ میں رسالۂ الناظر کو خود اڈیٹر صاحب کی طرح ہنوز ناقابلِ علاج نہیں سمجھتا ہوں!

الناظر کا موجودہ دَور وہ ہے جو سیاسی میدان سے مذہبی دائرہ کی طرف نقل و حرکت سمجھا جا سکتا ہے! الناظر کے ۶۶ صفحات کا اگر اب تجزیہ کیا جائے تو معقول تعداد اوراق

تدرِ عیب جوئی نظر آئے گی !

تنقید و تحقیق نہایت عمدہ اور ضروری شعبے ہیں ۔ مگر تنقید و عیب جوئی کی حدِ فاصل کو مٹا دینا نہایت ناموزوں دریدہ نگاری ہے ! اگر میں الناظر کے گذشتہ دو سال کے تمام نمبر نکالوں تو اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کر سکتا ہوں ! فی الحال "تحریم سود" سے ناظرینِ الناظر کی معقول تعداد کا دم ناک میں آ گیا ہے !

میں سید طفیل احمد صاحب کا رُوشناس بھی نہیں اور اِس خاص مسئلہ میں اُن کا ہمنوا بھی نہیں، مگر ساتھ ہی چلپی صاحب کے خطبۂ ربا سے عاجز آ گیا ہوں ! چلپی صاحب نے سید صاحب کے جوابِ مضمون پر جو اپنے نوٹ گذشتہ رسالہ میں دیے تھے وہ ذاتیات اور عیب جوئی کے علاوہ درشت نگاری کی بیّن مثال تھے !

جولائی کا الناظر بھی اسی راگ کو الاپتا نظر آتا ہے ۔ خدا ہی جانے طفیل احمد صاحب کی عزت و جان اب کب تک معرضِ خطر میں رہتی ہے ! اس مرتبہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بھی چلپی صاحب کی کسوٹی سے نہ بچ سکے !

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں صاحبزادہ صاحب موصوف کی جماعت خدام میں شامل ہونے کا اعزاز کبھی نہیں پا سکا مگر پھر بھی جس معمولی بات پر چلپی صاحب نے پورے تین صفحوں پر احادیث نبوی کے حوالے دے کر اپنی شانِ تقدس کا اظہار فرمایا ہے وہ ایک معقول حد تک غیر ضروری، ناموزوں اور ناپسندیدہ ہے ! الناظر اگر ادبی و علمی رسالہ ہے تو یقیناً خود اڈیٹر صاحب میرے ہم خیال ہونے پر مجبور ہوں گے !

مجھے یہ قوی اندیشہ ہے کہ آیندہ نمبر میں چلپی صاحب کا قلم اس عاجز کے خیالات ۔ بلکہ ممکن ہے کہ ذات ۔ پر بہت کچھ جولانی دکھائے گا اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری زبان بند کرنے کے لیے ایک درجن احادیث و کلام الٰہی کا حوالہ اُس کرخت نکتہ چینی اور دریدہ نگاری میں ہوگا ! میں اِسکے لیے تیار ہوں ۔ اور دو وجوہ سے تیار ہوں !

اوّل یہ کہ میں اس قدر پُر معاصی ذات ہوں جو دُنیا کے کسی بدترین سے بدترین گناہ سے بھی بچ نہ سکی، ۔ میری عیب جوئی تحصیلِ حاصل ہوگی !

دوسرے یہ کہ محض اپنے ہدفِ ملامت بننے کے خوف سے میں اپنے عنایت فرما اڈیٹر الناظر کو مخلصانہ رائے دینے سے باز نہیں رہ سکتا!

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ الناظر کے ظاہری حلیہ کے علاوہ اُسکے موادِ مضامین میں بھی کسی قدر ادبِ لطیف، شگفتہ نگاری، دلچسپ افسانے وغیرہ کی اصلاح و اضافہ کی حاجت ہے!

اور اگر کھدر پوشی، خشک نگاری، عیب جوئی، ذاتیات، اور دریدہ دہنی الناظر کا مستقل مسلک قرار دیدی گئی ہیں تو نہایت ادب کے ساتھ یہ التجا ہے کہ برائے خدا اس رسالہ کا نام تنبیہ الغافلین۔ یا۔ تعزیرات الفاسقین، یا ایسا ہی کوئی اور موزوں نام بمشورہ چلپی صاحب رکھ دیجیے!

میرے ایک بے تکلف دوست۔ جو ظلم دوست بھی ہیں۔ مجھ سے مصر ہیں کہ میں کسی نہ کسی طرح حافظ شیراز کا وہ شعر جس کا پہلا مصرعہ "واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند" ہے کہیں نہ کہیں اس مضمون میں ٹھونس دوں مگر اڈیٹر صاحب یقین مانیے میرے گلے گلے پانی میں تو یہ ہے حاشا و کلا۔ میں اس کو لکھ کر "فیہ ما فیہ" کی بندوق اپنے اوپر نسلاً بعد نسلٍ نہیں دغوانا چاہتا ہوں!

سلطان حیدر

محبی سلطان حیدر صاحب جوش نے ایک خانگی مراسلہ کے جواب میں مضمون برائے اشاعت بھیجکر یقیناً میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ دوسرے احباب کے لطف و کرم پر نظر کرکے چاہیے تھا کہ اسکے ساتھ اُنکی تحریریں بھی شایع کی جاتیں مگر اوراق الناظر بہت محدود ہیں اس لیے میں اُن سے عذر خواہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

سلطان حیدر صاحب کے اخلاص پر اعتماد کلی ہے۔ اس لیے باوجودیکہ اُنکی تحریر ظریفانہ شوخی سے گذر کر درشتی و تلخی کی حد تک پہونچ گئی ہے، میں اُن کی نکتہ چینی سے بدمزہ نہیں ہوا۔ اور امید ہے کہ چلپی صاحب بھی اُن کے تیز و تند جملوں سے بے کیف نہ ہوں گے۔

اس مراسلہ میں جو اعتراضات کیے گئے ہیں اُنکے متعلق سلسلہ وار حسبِ ذیل معروضات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) الناظر "خشک" مضامین کی اشاعت کے لیے ہمیشہ بدنام رہا۔ علمی مضامین عموماً "خشک" ہی ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ میری یہ ہمیشہ کوشش رہی کہ خشک علمی مضامین کے پہلو بہ پہلو شگفتہ مضامین بھی شایع کیے جائیں

لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس لئے کو اتنا کبھی نہیں بڑھایا کہ رسالہ کی علمی حیثیت نظرانداز ہو جائے ورنہ جو مالی نقصانات الناظر کو اٹھانا پڑے اُن کا افسانہ کم سے کم اتنا طولانی نہ ہوتا۔

مگر چلبی صاحب کی تحریریں یقیناً اس نقص سے پاک ہیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ایک شفیق دوست نے جو شگفتہ مضامین لکھنے میں خاص امتیاز رکھتے ہیں تحریر فرمایا تھا کہ

"حضرت چلبی کے حواشی اگر کچھ اور زیادہ، نیز متنوع ہو جائیں جیسے ماڈرن ریویو والے لکھتے ہیں تو یقین ہے اس کی (الناظر کی) قبولیت میں اضافہ ہوگا .... ان کے زور تحریر اور جذبات اسلامی کی وکالت پر مجھ کو رشک آنے لگا ہے"

ایک دوسرے نامور انشا پرداز جن کی شگفتہ تحریریں مولانا شبلی مرحوم کو اس قدر پسند تھیں کہ جب انھوں نے شعرالعجم کی دوسری جلد خاکسار کو بغرض ریویو عنایت فرمائی تو ساتھ ہی یہ فرمائش بھی کی کہ اس پر دیوان صاحب سے لکھوایا جائے۔ اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فراتے ہیں:

.... " البتہ فیہ ما فیہ کسی زبردست نامہ نگار کے قلم سے نکل رہا ہے۔ اور باوجودیکہ وہ نامہ نگار اپنی عربی دانی کا خواہ مخواہ بہت ثبوت دینا چاہتا ہے، نہایت دلکش اور مفید ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں واقعی اضافہ مناسب ہے مگر اس حد تک کہ تعزیرات ہند کے وار سے بچتا رہے۔ اس نامہ نگار کے قلم کی شوخی بعض وقت مجھ کو متوالا کر دیتی ہے۔ اللہ اسکے زور قلم میں ترقی دے۔ اور وہ تھوڑی سی عربی بھول جائے"

(اس پرچہ کو دیکھ کر صاحب مذکور خوش ہوں گے کہ اُنکی یہ دعا قبول ہو گئی)

خود سلطان حیدر صاحب کے وطن میں جو ایک ظرافت و شوخی کے مجسم اوتار تشریف فرما ہیں اور جو مستقلاً الناظر کے لیے 'سنسر' بنا دیے گئے ہیں وہ بھی بار بار اسی قسم کی رائے ظاہر فرما چکے ہیں۔

اسکے بعد جو کمی ہے اُس کی تلافی سلطان حیدر صاحب کے اختیار میں ہے کہ وہ الناظر کے قدیم فسانہ نگار ہیں اور اب تک باوجود زبانی و تحریری تقاضوں اور وعدوں کے "ترک قلم" کی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔

(۳) "کمدر پوشی" کا الزام میں بخوشی تسلیم کرتا ہوں۔ مگر یہ کوئی نیا روگ نہیں ہے۔ الناظر جس دن سے جاری ہوا ہے دیسی کاغذ پر چھپتا ہے اور اگرچہ دوسرے رسائل کی ظاہری آب و تاب سے لوگوں کی گرویدگی مجھ سے پوشیدہ نہیں تاہم میں ملکی و قومی فلاح کے لیے اپنے ذاتی نفع اور احباب کی نفاست پسندی دونوں کو

قربان کرنے کے بعد بھی الناظر کی کھدر پوشی سے شرمندہ نہیں ہوں۔ وہ دن دُور نہیں جب ملک میں اتنی بیداری پیدا ہو جائے گی کہ ہر شخص غیر ملکی مصنوعات کے استعمال کو فیشن کے خلاف جاننے لگے گا۔

(۳) "چاشنیِ ادب" کی مبہم اصطلاح سے شاید الناظر کے حصۂ نظم میں موجودہ کمی کی طرف اشارہ ہے۔ اسکو میں تسلیم کرتا ہوں۔ انشاءاللہ یہ بات جلد رفع ہو جائے گی۔ اور اگر یہ مقصود ہے کہ علمی مضامین کے بجائے ادبی مضامین پر زیادہ توجہ کی جائے تو دوسری بات ہے۔

(۴) الناظر کی پالیسی کے بارہ میں بہت سے شبہات وارد کیے جاتے ہیں۔ اور میں اس موقع سے فائدہ اُٹھاکر اُس کے مقاصد کی صراحت کر دینا چاہتا ہوں۔

الناظر یقیناً علمی و ادبی رسالہ تھا۔ ہے۔ اور انشاءاللہ رہیگا۔ مذہبی تبلیغ اور سیاسی مناظرہ اسکے دائرۂ عمل میں نہ کبھی داخل تھا اور نہ اب ہے، لیکن وہ مذہب سیاست کو شجرِ ممنوعہ بھی نہیں تصور کرتا۔

الناظر اُردو کا مبلغ ہے اور اسکے ساتھ ہی ساتھ قوم کی علمی ترقی، اخلاقی اصلاح، معاشرتی بہبود اور اقتصادی فلاح بھی ابتدا سے اُسکے پیشِ نظر ہے

جوش صاحب سنہ ۱۴ء یا سنہ ۱۵ء تک کے الناظر کی روش کو پسند فرماتے ہیں۔ کیا اُن کو یاد ہے کہ دسمبر سنہ ۱۲ء کے الناظر میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجتماع لکھنؤ کو مخاطب کر کے الناظر نے بزرگان علیگڈھ کی اس کارروائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی کہ اُنھوں نے کانفرنس کے شعبۂ اصلاحِ تمدن کو مکمل بند اور لٹریری سکشن یا انجمن ترقی اُردو کو کیسر معطل کر رکھا ہے۔ اور اس سے بھی پہلے سنہ ۱۹۰۹ء میں الناظر میں یہ تحریک اُٹھائی گئی تھی کہ آل انڈیا لیڈیز کانفرنس منعقد کی جائے۔ جسکے ضمن میں پردہ کی بحث چھڑ گئی تھی۔ یا وہ بے خبر ہیں کہ عورت کی منزلت اور ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشرت اور اُسکی اصلاح پر سنہ ۱۰ء سنہ ۱۱ء و سنہ ۱۲ء میں درجنوں مضامین الناظر میں شایع کیے گیے

پھر سنہ ۱۲ء سے آج تک مسلم یونیورسٹی، انجمن ترقی اُردو، مسلم لیگ و خلافت کمیٹی پر یا بعض دیگر قومی جلسوں کی کارروائی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ مذہبی و سیاسی بحث میں کیوں شمار کیا جائے۔ آپ اِن مضامین کو ایک دفعہ پھر پڑھنے کی تکلیف گوارا کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں مذہب و سیاست کی قطعاً بحث نہیں ہے۔ مسلم یونیورسٹی کن شرائط پر قبول کی جائے۔ انجمن ترقی اُردو کا نظام کار کیا ہو۔ مسلم لیگ کے حسابات کی جانچ کے کیا نتائج نکلے۔ خلافت فنڈ کی بربادی اور خلافت کمیٹی کی ابتری کے کون ذمہ دار ہیں۔ فلاں فلاں

جلسہ میں فلاں فلاں اصحاب نے کیا وغیرہ اختیار کیے وغیرہ میں سے کس مضمون کو آپ مذہبی و سیاسی تصور کرتے ہیں؟

ہاں ۱۹۰۸ء میں ماہ گذشتہ کے عنوان سے مجالس سیاسی کی کارروائیوں پر جو تبصرہ کیا جاتا تھا اُسے آپ ایک حد تک سیاسی تصور کرنے میں حق بجانب ہوں گے مگر یہ سلسلہ بہت تھوڑے دنوں قائم رہا۔ اور اب عرصہ ہوا کہ بند کر دیا گیا ہے۔

سود کا مسئلہ یقیناً ایک مذہبی مسئلہ ہے۔ مگر کیا ساتھ ہی ساتھ یہ قوم کی اخلاقی، معاشرتی و اقتصادی زندگی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا؟ الناظر میں اس بحث میں جو کچھ شائع ہوا ہے اُسے غور سے پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ اُس میں اگر مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے تو علمی، اقتصادی، اخلاقی، اور معاشرتی پہلو بھی نظرانداز نہیں ہوئے ہیں۔

(۵) فیہ ما فیہ میں قرآن و حدیث کی سند دیکر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بے شبہہ مذہبی رنگ کی چیز ہے مگر کیا چلپی صاحب کی تحریر میں صرف یہی ہوتا ہے۔ اور بس۔

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے ایک فارسی قصیدہ میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ذہنیت کا کیا خوب نقشہ اُتارا تھا۔

اے کہ بر مائدۂ یورپ مہماں باشی	حیف باشد اگر از جملۂ ایشاں باشی
حیف اگر از اثرِ فلسفۂ مغربیاں	منکرِ فلسفۂ سنت و قرآں باشی
مسمر از شعبدۂ جلوہ و ہر سر بنی	منکرِ معجزۂ موسیٰ عمراں باشی
گفتۂ سوکن و آئینِ جہانبانی او	بر زباں داری و بیگانہ زِ نعماں باشی
از نپیال صد افسانہ و دستاں گوئی	جاہل از معرکہ ہائے شہ مردانی باشی
قیصراں را ہمہ یک یک بشماری ز آغاز	بے خبر از عمر و حیدر و عثماں باشی
از خداوند جہاں یاد نیاری گاہے	روز و شب خواہ پرستاری سلطاں باشی

اُس وقت اگر یہ حالت نہ تھی تو آج تو یقیناً یہی صورت ہے۔

یہی "چلپی صاحب" ایک زمانہ میں "ایک طالب علم" کے نام سے مولانا شبلی کی کتاب الکلام پر تنقید لکھ رہے تھے، اور وجود باری تعالیٰ و نبوت جیسے اسلامی مسائل پر مولانا کے عقلی دلائل کو لچکے، تلی، بینی

بوشنر اور برنارڈ شو وغیرہ یورپین فلاسفہ کی تحریروں سے قطع کر رہے تھے تو تمام تعلیم یافتہ جماعت میں ایک قلقلہ مچ گیا تھا اور ہر شخص اُن کے علمی مضامین کی داد دیتا تھا۔ اور اُس کے بعد بھی جب تک صاحب موصوف فلاسفۂ یورپ کے ترجمان رہے اور اُنھیں کے اسناد سے اپنے مضامین کو مزین کرتے رہے تعلیم یافتہ جماعت میں سے کسی کو حرف گیری کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر جب اس خدا کے بندہ کو راہ ہدایت نصیب ہوئی اور بیکن و ڈیکارٹ، کانٹ و اسپنسر کے خیالی و قیاسی علوم کی ترجمانی سے گذر کر انھوں نے خدا و رسول کے اقوال سے اپنی تحریروں میں استنباط شروع کیا تو ایک نہیں متعدد تعلیم یافتہ اصحاب کی ناک بھوں چڑھ گئی۔ چنانچہ کئی مہینے ہوئے جب ایک دوست نے ہمارے لائق انشاپرداز کے "انداز قد" کو جلوۂ نو میں دیکھ کر پہچان لیا اور از راہ ترحم اُن کی انشاپردازی پر فاتحہ خوانی کردی۔

یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔ اب سے چند سال پہلے اگر خود چلبی صاحب ایسی باتیں لکھتے تو مجھے کچھ تعجب نہ ہوتا۔ کیونکہ تعلیم یافتہ احباب کے نزدیک اسپنسر و ڈارون، بیکن و ڈیکارٹ، جانسن و ملٹن، شیکسپیر و مکالے کے اقوال تو علمی و ادبی ہو سکتے ہیں مگر خدا کے کلام اور رسول خدا کی حدیثوں کو علم و ادب سے کیا لگاؤ۔ انکے لیے بزم علمی کے دروازے بند ہیں۔ مسجد اور محفلِ میلاد سے آگے قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

اگر سلطان حیدر صاحب یہ شکایت کرتے کہ رسالہ پر قومیت و اسلامیت کا اثر حاوی ہے، وطنیت اور ہندوستانیت کا عنصر نمایاں کیا جائے تو میں اس کو بخوشی مان لیتا۔ ایک دوسرے اہل قلم نے ان الفاظ میں نہیں مگر اسی مفہوم کو اپنے رنگ میں لکھ کر مجھے ممنون منت بنایا۔ اگرچہ مختلف اسباب ایسے ہیں جن کی بنا پر مجھے اس راہ میں بہت دشواریاں نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی میں اُسے بہتر جانتا ہوں اور حتی المقدور اس کی کوشش کی جائے گی کہ اُن ہندو احباب کی قلمی اعانت حاصل کی جائے جو اُردو سے خاص دلبستگی رکھتے ہیں۔ اور الناظر کے مستقل معاونین سے بھی یہ التماس ہے کہ جہاں تک اُن کے امکان میں ہے ایسے مضامین لکھیں جو دونوں قوموں کے لیے یکساں مفید ہوں یا کم سے کم ہندوؤں کے لیے بالکل بیکار نہ معلوم ہوں۔

(۶) ذاتیات پر حملہ کرنا اگرچہ الناظر کا شیوہ نہیں لیکن چونکہ بیانِ واقعات میں اکثر اصحاب کے نام بھی آ جاتے ہیں اس لیے وہ احباب جنھوں نے اس خیال کو ایک ہوا بنا رکھا ہے فوراً چراغ پا ہوتے ہیں مگر تنقید کرنے والے کو اسکے بغیر چارہ نہیں۔ اور اگر ہمارے دوست کو اس میں عذر ہو تو لائق سے لائق انشاپرداز

اخبار نویسوں، مدبروں، شاعروں اور فلسفیوں کے مطبوعہ اوراق میں سے ایک دو نہیں سیکڑوں مثالیں اس بیان کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سلطان حیدر صاحب اپنی اسی معصوم تحریر کو کسی غیر جانبدار شخص سے پڑھوا کر سُن لیں تو اُنکو اندازہ ہو جائے گا کہ ایک خانگی تحریر پر اظہار رائے جیسے کار خیر میں بھی محض اس سبب سے کافی درشتی و تلخی آگئی ہے کہ اُنھوں نے اپنے خیالات کو آزادی سے برہنہ کر دیا۔ خدا کرے وہ کچھ دنوں کے لیے کسی اخبار (خواہ وہ تحصیل گزٹ ہی کیوں نہ ہو) کے ایڈیٹر بنا دیے جائیں۔ پھر دنیا دیکھے گی کہ اُن کا شوخ نگار قلم معزز حکام اور حکام پرستوں کی کیسی کیسی قصیدہ خوانیاں کرتا، اور شوریدہ سر سوراجیوں اور تارکینِ موالات کو نام بنام کیسی کیسی اَوکھیاں سُناتا ہے۔

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام　　قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

بر این ہم چونکہ ایڈیٹر الناظر سے ایک دفعہ ایسی لغزش ہو چکی ہے جسکے لیے اُس کو نادم ہونا پڑا اور ملامتِ ضمیر سے بچنے کے لیے علی الاعلان عذر خواہی کرنا پڑی، وہ خود اب اس بارہ میں بہت احتیاط برتتا ہے۔ اور کم سے کم سلطان حیدر صاحب تو اطمینان رکھیں کہ "فیہ ما فیہ" کی سند وق اور "نظرے خوش گذرے" کی مشین گن سے وہ تا مرتبہ اس وقت ملکہ ابدالآباد تک کے لیے محفوظ ہیں۔ بشرطیکہ وہ الناظر کے لیے صرف مختصر افسانے تحریر فرمایا کریں اور کتابیں لکھ لکھ کر ریویو کے لیے نہ ارسال فرمائیں۔　　ایڈیٹر

شکریہ

الناظر کی توسیع اشاعت کے بارہ میں جو تحریک کی گئی تھی اُسکے نتائج کی تفصیل گزشتہ مہینہ میں درج کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد جن احباب نے توجہ فرمائی ہے اُن کی کیفیت حسب ذیل ہے:-

۱- مولوی سید محفوظ علی بی اے	نے	۲	خریدار دیئے
۲- مولوی عبد اللہ خاں تپش خورجوی	نے	۱	"
۳- قاضی انتظار علی خاں عباسی بی اے	"	۲	"
۴- مسٹر عبد الشکور بریلوی ایم اے	"	۲	"
۵- مولوی مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی	"	۱	"
۶- منشی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی	"	۳	" (سابقہ ۴ خریداروں کے علاوہ)

اور اصحاب ذیل نے آئندہ توجہ فرمانے کا وعدہ کیا ہے:- پروفیسر رشید احمد صدیقی - خواجہ نجم الغنی قریشی حافظ سید ظہیر الحسن ایم اے -

ظفر الملک

انعامی مضمون

الناظر کے دائرۂ خدمت کو وسیع اور مفید تر بنانے کے متعلق تقریباً ایک سال سے بعض احباب و مخلصین سے مشورہ کیا جا رہا تھا۔ اور منجملہ دوسری باتوں کے ایک یہ امر زیر غور و بحث تھا کہ اہل قلم کی کثیر جماعت کو شریک کار بنانے کے لیے انعامی مضامین کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ مالی مشکلات کی بنا پر اب تک کسی اعلان کی جرأت نہ ہو سکی تھی کہ بعض مخلصین کی محبت و فیاضی نے بالآخر ایک راہ نکال دی۔ اور آج میں نہ صرف الناظر کے جملہ قلمی معاونین اور اہل قلم ناظرین کو بلکہ ہندوستان بھر کے اُن تمام اصحاب کو جو اس امتحان مقابلہ میں شرکت فرمانا گوارا کریں، دعوت دیتا ہوں کہ مندرجۂ ذیل عنوان پر طبع آزمائی فرمائیں:۔

عنوان

"آزاد۔ حالی۔ نذیر احمد اور شبلی میں سب سے بڑا انشا پرداز کون تھا اور سب سے زیادہ اُردو کی خدمت کس نے انجام دی۔"

شرائط مقابلہ

(۱) مضمون فلسکیپ کاغذ کے کم سے کم ۳۰ صفحوں پر صرف ایک جانب لکھا جائے۔

(۲) ۳۱ دسمبر ۱۹۴۲ء تک دفتر الناظر میں وصول ہو جائے۔ بیرونی اصحاب بذریعہ رجسٹری ارسال فرمائیں۔

(۳) مندرجۂ ذیل اصحاب تمام مضامین موصولہ کی جانچ کر کے بہترین مضمون کا انتخاب فرمائیں گے:

۱۔ جناب مولوی سید محفوظ علی بی اے۔ رئیس بدایوں

۲۔ جناب مولوی عبدالماجد بی اے۔ دریاباد ضلع بارہ بنکی

۳۔ جناب مولوی سید ہاشمی فریدآبادی۔ رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

۴۔ جناب منشی امیر احمد علوی بی اے۔ سشن جج ریٹائرڈ

۵۔ جناب مرزا محمد عسکری بی اے سکریٹری انجمن اُردو لکھنؤ

(۴) جن صاحب کا مضمون مجلس انتخاب کی رائے میں سب سے بہتر قرار پائے گا اُن کی خدمت میں

مبلغ پچاس روپے کی تھیلی، اور اُس مضمون کے پچاس مطبوعہ نسخے بطور انعام نذر کیے جائیں گے۔

(۵) جملہ مضامین سوا ے اُن کے جو مجلس انتخاب کی رائے میں ناقابلِ اشاعت قرار پائیں ایک مجموعہ کی صورت میں شایع کر دیے جائیں گے۔ جن اصحاب کے مضامین اس مجموعہ میں شامل ہوں گے اُن کو ایک نسخہ ہدیتہً دیا جائے گا۔

(۶) کوئی مضمون کسی صورت میں واپس نہ کیا جائے گا۔

(۷) جس مضمون پر انعام دیا جائے گا اُسکے طبع و اشاعت کے جملہ حقوق بحق الناظر محفوظ ہوں گے۔

(۸) بقیہ مضامین مجموعہ کی اشاعت تک اوراق الناظر کے سوا کہیں شایع نہ ہو سکیں گے۔ بعد اشاعت مجموعہ ہر مضمون نگار کو اپنے مضمون کے طبع و اشاعت کا کامل اختیار رہوگا۔ البتہ کوئی صاحب مجموعۂ مضامین کے طبع و اشاعت کے مجاز نہ ہوں گے۔ یہ حق صرف الناظر کے لیے محفوظ رہے گا۔

اُمید ہے کہ وہ تمام اہل قلم جو اس بات کی اہمیت کا اندازہ رکھتے ہیں، کہ اُردو ادب میں جو ذخیرہ اب تک فراہم ہو چکا ہے اُس کی تنقید اور درجہ بندی کرنا ضروری ہے تا کہ موجودہ اور آیندہ کارکنوں کو دورِ گذشتہ کے ادبی کارناموں کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو، اس عنوان پر طبع آزمائی فرمائیں گے اور اگر قابل انشا پردازوں نے اُمید کے مطابق توجہ فرمائی تو انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ دوسرے انعام کا انتظام کیا جا سکے گا۔

چونکہ یہ انعام صرف الناظر کے ناظرین و معاونین کے لیے نہیں ہے بلکہ جملہ اہل قلم کو خواہ وہ کسی حصۂ ملک کے باشندے ہوں یا کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں اس دعوت عام میں شرکت کرنا منظور ہے اس لیے جملہ معاصرین کرام سے التماس ہے کہ اپنے اپنے اخبارات و رسائل میں اس اعلان کے ضروری حصہ کو شایع فرما دیں تاکہ اُن کے ناظرین و معاونین قلمی بھی اس سے مطلع ہو جائیں۔ بہت سے حضرات کو دعوتی خطوط علیحدہ بھیجے جائیں گے۔ گر جن حضرات کو کسی سبب سے نہ پہونچیں وہ یہ نہ تصور فرمائیں کہ اُن کو دعوت دینا منظور نہیں ہے۔

صلاے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

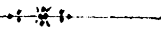
ظفر الملک

نظرے خوش گذرے

الناظر کے ناوقت شایع ہونے سے جس قدر دُکھ ایڈیٹر الناظر کو ہوتا ہے اُس کا اندازہ ناظرین کرام مشکل کرسکتے ہیں۔ تہیہ کیا گیا تھا کہ یہ پرچہ ۲۰ ستمبر سے قبل شایع کیا جائے۔ ستمبر کا اکتوبر کے عشرہ اول میں اور اکتوبر کا اُسی ماہ کی آخری تاریخ کو، تاکہ اُس کے بعد ہر مہینہ کے اندر اندر رسالہ شایع ہو جاسکے۔ اسی نہج پر کام ہو رہا تھا اور ۱۵ ستمبر تک پرچہ تیار ہو جانے کی قوی اُمید تھی کہ دفعتاً ۱۲ ستمبر کو لکھنؤ میں ہندو مسلمانوں کے مابین فساد ہو گیا۔ شہر میں کئی روز بدامنی رہی۔ جس کی وجہ سے بازار بند ہو گئے اور شرفا خانہ نشینی پر مجبور۔ اس غیر معمولی اُفتاد نے سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اور اب مشکل اس کی امید کیجا سکتی ہے کہ ستمبر و اکتوبر دونوں مہینوں کے پرچے اکتوبر ہی میں شایع ہو سکیں۔ خصوصاً اس بنا پر کہ ماہ رواں کے آخر میں تقریباً پندرہ بیس دن کے لیے ذاتی و کاروباری ضرورتوں سے باہر جانا منظور رہے، بہر حال ناظرین کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس سال کے اندر اندر یہ بدنظمی اوقات ختم ہو جائیگی اور اکتوبر کا نہیں تو نومبر کا پرچہ ضرور اُسی ماہ کے اندر شایع ہوگا۔ دلی تمنا تو یہ ہے کہ جس طرح ابتدائی سالوں میں الناظر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو لازماً شایع ہو جایا کرتا تھا وہی انتظام پھر قائم ہو جائے، لیکن،

بہت ارمان ایسے ہیں کہ دل کے دل میں رہتے ہیں

حالتِ موجودہ میں اس کی اُمید کم نظر آتی ہے۔ اس لیے اگر مہینہ کے مہینہ پرچہ شایع ہوتا رہے تو یہی غنیمت معلوم ہوگا۔



جولائی نمبر کے صفحہ ۷ میں جلیبیؔ صاحب نے "پرستان فرنگ" کے زیر عنوان جو کچھ لکھا تھا اُس کے متعلق ایڈیٹر صاحب اودھ اخبار اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"پیرس کے متعلق جس مضمون کا حوالہ گذشتہ اشاعت میں دیا گیا ہے، وہ ہندو بزرگ کا نہیں ہے۔"

ہم اس تصحیح کو نہایت مسرت سے شایع کیے دیتے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب نے یہ بھی شکایت کی ہے کہ الناظر کو اودھ اخبار سے "اس قدر نفرت ہے" کہ

کہ وہ اخبار مذکور کا نام تک اپنے اوراق میں درج کرنا گوارا نہیں کرتا - جہاں تک ایڈیٹر کا تعلق ہے وہ اسکو تسلیم نہیں کرسکتا ، اور شکر گزار ہوگا اگر اُس کی تحریروں میں کوئی ایک ایسا موقع بتا دیا جائے جب وہ اس جُرم کا مرتکب ہوا ہو - اور اپنے قلمی معاونین کی تحریروں کا اس بارہ میں وہ یقیناً ذمہ دار نہیں قرار دیا جاسکتا - البتہ اگر چلپی صاحب کے متعلق یہ سوءظن ہے تو انھوں نے اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرما دیا ہے کہ

> "ایڈیٹر صاحب کی یہ بدگمانی صحیح نہیں - وہ خود اس امر سے یقیناً واقف ہوں گے کہ کسی پرچہ یا شخص کے نام کی عدم تصریح کی وجہ محض "نفرت" ہی نہیں ہوتی بلکہ دوسرے اسباب بھی ہوتے ہیں اور ہم اُنھیں یقین دلانا چاہتے ہیں، کہ اِن سطور کے راقم کو اودھ اخبار سے "نفرت" کی ہرگز کوئی وجہ موجود نہیں "

خدا کرے ایڈیٹر صاحب کو اب اطمینان ہو جائے - اور وہ ایسے پریشان خواب نہ دیکھا کریں -

---

اُسی پرچہ میں صفحہ ۳۵ پر حضرت آثر لکھنوی کی غزل کے مقطع میں ایک غلطی رہ گئی ہے - پہلا مصرعہ " اک گونہ تسکیں ہو جاتی ہے، دل کی آثر بیتابی میں " ہونا چاہیے -

---

سنہ ۱۹۲۶ء میں " انجمن ترقی اُردو کا نظام " کے عنوان سے جو مضامین الناظر میں شایع کیے گئے تھے اگرچہ اُن کا براہ راست تعلق اُسی انجمن سے تھا مگر بہت سی باتیں ایسی تھیں جو انجمن اردو لکھنو کے حق میں بھی مفید ہو سکتی ہیں - اُن مضامین کی اشاعت تو موجب طوالت ہوگی مگر انجمن اردو کے ارکان انتظامی کی اطلاع کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ضروری باتیں اختصار کے ساتھ یہاں عرض کردی جائیں :-

(۱)　انجمن کو ایسی صورت سے چلانا چاہیے کہ اُس کی زندگی اور بقا کسی ایک ہستی پر منحصر نہ ہو جائے بلکہ ابتدا ہی سے ایسا ڈھنگ ڈالا جائے کہ بہت سے افراد تقسیم کار کی بنا پر انجمن کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں -

(۲)　انجمن اُردو کو کسی ایک طبقہ کے لیے محدود نہ کرنا چاہیے - ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی وغیرہ

سب فرقوں کی شرکت سے اُردو زبان کی خدمت زیادہ ہو سکے گی۔

(۳) انجمن اُردو نے اپنے دستور العمل کے رو سے اس قدر ذمہ داریاں اپنے سر لے لی ہیں کہ حالاتِ موجودہ میں اسکی توقع نہیں کہ وہ ان سب کاموں کو انجام دے سکے۔ دستور العمل میں تبدیلی کا فی الحال کوئی سوال نہ ہونا چاہیے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جتنا کام آیندہ سال دو سال میں کیا جا سکے اُسکے لیے ایک نظام عمل مرتب کر کے بقیہ امور کو سردست نظر انداز کر دیا جائے۔

(۴) انجمن اُردو کی طرف سے کم سے کم اِن صوبہ جات کے جملہ ایسے اصحاب کو دعوتِ شرکت دینا چاہیے جن کو اُردو علم ادب سے خاص دلچسپی ہے اور جو دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے۔ قلمے کسی نوع سے انجمن کی مدد کر سکتے ہیں۔

(۵) جملہ ضروری کاموں کے انصرام کے لیے ایسے اصحاب کی ایک مجلس عاملہ بنا لی جائے جو جلد جلد یکجا ہو کر سرانجام کار میں معین ہو سکیں۔

(۶) علاوہ چندۂ رکنیت کے ایک "مستقل سرمایہ" فراہم کرنے کی کارروائی جلد سے جلد شروع کر دینا چاہیے جس کی مقدار کم سے کم دس ہزار ہو۔

آخر میں مضامین کے خاتمہ پر جو سطور سپرد قلم ہوئی تھیں اُن کو بجنسہ نقل کیے دیتا ہوں:۔

"اُن اسباب کی بنا پر ہماری دلی آرزو اور تمنا یہ ہے کہ جدید اجتماعی تحریکات کے منتظمین اس بات میں بدل ساعی ہوں کہ چند دولتمندوں کی نگاہِ التفات پر نہیں بلکہ کثیر التعداد متوسطین کی امداد پر ان تحریکوں کا انحصار رہے۔ موجودہ زمانہ میں اور خصوصاً کسی کام کی ابتدا میں یہ کچھ آسان نہیں۔ لیکن صبر و استقلال، ہمدردی اور حوصلہ مندی کے ساتھ کام کیا جائے تو تھوڑے ہی دنوں میں خود نتائج اس بات کا ثبوت دیدیں گے کہ سب سے بہتر اور قابل اعتماد طریقہ یہی ہے۔"



منشی طفیل احمد صاحب تبلیغ سود کے سلسلہ میں غالباً ہر ہفتہ ایک گشتی مراسلہ ارسال فرماتے رہتے ہیں۔ پہلے بھی تحریر کیا جا چکا ہے اور اب پھر بصراحت عرض کیا جاتا ہے کہ ان مراسلات کی اشاعت کے لیے علمی و ادبی رسائل کے پاس گنجائش نہیں۔ منشی صاحب خواہ مخواہ اپنے ٹکٹ اور کاغذ کیوں ضائع فرماتے ہیں۔ اسراف مذہباً اگر ممنوع ہے تو اقتصادی حیثیت سے بھی لائق تحسین نہیں۔ کاش یہ دام غریب قوم ہی کے کام آئیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۵۹ جلد ۲۷ — ستمبر ۲۴ء۱۹ء

فیہ مافیہ

(از چلپی)

عبرت!

کتب حدیث میں باب الفتن کے زیر عنوان جو ارشادات نبوی محفوظ ہیں زمانہ اُن کی تصدیق ہر ہر قدم پہ کرتا جاتا ہے۔ اسلام کا نام لے کر اسلام کو جس طرح مٹایا جا رہا ہے، دوستی کے پردہ میں جس طرح دشمنی کی جا رہی ہے، اصلاح کی آڑ میں ہدم و تخریب کے جو تیشے چلائے جا رہے ہیں، ان کا اندازہ ہر صاحب ایمان کو ہے۔ اہل فرنگ کو اسلام کا دوست و محافظ بتایا جاتا ہے، قرآن کی تفسیر ڈارون و ہیکل کے اقوال کی تحتی میں کی جاتی ہے، سود خواری کے جواز و ترویج میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے یہ سب اسی دورِ فتن کے مظاہر و آثار ہیں۔ لیکن حال میں پنجاب کے ایک "مشرقی" بزرگ نے جو فتنہ قیامت برپا کر دینی چاہی ہے، اُسکے سامنے یہ تمام فتنے گرد ہوگئے ہیں۔ ان "مشرقی" محقق نے اپنے اجتہاد کا ہدف کسی جزئی مسئلہ کو نہیں، بلکہ اسلام کو اُسکی مجموعی و کلی صورت میں بنایا ہے۔

اُنکا دعویٰ یہ نہیں، کہ کسی خاص مسئلہ میں اُنھیں دنیائے اسلام سے اختلاف ہے، بلکہ وہ یہ ارشاد فرماتے ہیں، کہ دُنیا اسلام کے مفہوم ہی سے آشنا نہیں! گویا اسلام وہ نہیں، جسے ائمہ و محدثین، تابعین و صحابۂ کرام، سمجھتے تھے، شاید وہ بھی نہیں، جسے حضور سرور عالمؐ سمجھے تھے۔ بلکہ صحیح اسلام (نعوذ باللہ) وہ ہے، جس کی تلقین و تشریح، ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد، دنیا میں پہلی بار، انڈین ایجوکیشنل سروس کے اس رُکن رکین نے کی ہے!

اس کتاب (تذکرہ) پر سردست تبصرہ مقصود نہیں، اس کے لیے دوسرے مواقع انشاء اللہ عنقریب نکلیں گے۔ خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے، صاحبِ معارف (اعظم گڈھ) کو، جنھوں نے اپنے رسالہ کے اگست نمبر میں اس ناپاک کتاب کا مختصر تعارف اپنے ناظرین سے کرادیا، اور چودھری محمد حسین، ایم، اے کو جنھوں نے زمیندار (لاہور) میں تفصیل کے ساتھ کتاب مذکور کے مغالطات اور گمراہیوں کی پردہ دری نہایت معقولیت و متانت کے ساتھ کی ہے۔ افسوس کہ جمعیۃ العلماء نے اسکے متعلق صرف ایک تجویز ملامت کا پاس کر دینا کافی سمجھا، توقع تھی، کہ علماء اسکی مفصل تردید لکھ کر شایع کریں گے، اور قوم کو ایک فتنۂ عظیم سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

مشیت الٰہی یوں واقع ہوئی ہے، کہ کوئی فرعون "بے سامان" نہیں رہنے پاتا۔ ہر تماشہ کے گرد تماشائیوں کا ہجوم ضرور ہو جاتا ہے، ہر بُت کے پجاری ضرور پیدا ہو جاتے ہیں، ہر سامری کی معتقد ایک جماعت ضرور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ فتنۂ جدید بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، اور اسکے پرستار، قلم آزمائی و مضمون نگاری کے فن سے ناآشنا نہیں۔ البتہ یہ دیکھکر عبرت ہوتی ہے، کہ اسکے پرستاروں کے حلقہ میں جامعۂ اسلامیۂ ملیہ کا رسالہ جامعہ بھی شامل ہے! کیا یہ وہی جامعہ ہے، جسکی بنیاد شیدائے اسلام محمد علی کے ہاتھوں پڑی تھی؟ کیا یہ وہی جامعہ ہے، جسکی تقریب افتتاح مقدس و برگزیدہ محمود الحسن کے دستِ حق پرست سے انجام پائی تھی؟ کیا یہ وہی جامعہ ہے، جسکے وجود سے مستقبل اسلام کی بہترین توقعات قائم تھیں؟

"غیروں" کے سخت سے سخت وار برداشت کیئے جاسکتے ہیں، لیکن کسی "اپنے" کی معمولی

چھُبکی بھی تیر و نشتر سے بڑھ کر جاں گداز ہوتی ہے۔ کاش جامعہ کو اسکا اندازہ ہو سکتا، کہ اُس کی غیر ذمہ دارانہ جنبشِ قلم نے کتنے دلوں کو جنبش دیدی ہے!

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے، ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

دانائی کی بات

قادیان کی جماعتِ احمدی سے ہمارے اختلافات ظاہر ہیں، لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں، کہ دانائی کی کسی بات کو محض اس بنا پر رد کر دیا جائے، کہ وہ ایسے شخص کی زبان سے نکلی ہے، جو ہم سے مختلف عقائد رکھتا ہے۔ کچھ روز ہوے، اس جماعت کے امام، مرزا بشیر الدین محمود صاحب سفرِ یورپ پر روانہ ہوے ہیں۔ روانگی کے وقت اُنھوں نے جو تحریر شایع فرمائی، اُس میں اشاعتِ اسلام کے متعلق خطرات کا ذکر اس طرح نکتہ سنجی سے کیا ہے کہ دل سے بے اختیار صدائے آفریں نکلتی ہے۔ ایک اقتباس درج ذیل ہے:-

"یورپ ضرور اسلام لائے گا، مگر ساتھ ہی اسلام کو بگاڑ بھی دیگا۔ اور اُسکی شکل کو بالکل مسخ کر دیگا۔ بالکل ممکن ہے کہ یورپ میں چاروں طرف سے اللہ اکبر کی آوازیں آنے لگیں، اور سب جگہ گرجوں کے بجاے مسجدیں بن جائیں، لیکن یہ فرق ظاہر کا ہوگا۔ لوگ تثلیث کی جگہ توحید کا دعوےٰ کریں گے ... گرجوں کی جگہ مسجدیں بنائیں گے، مگر اُنکا وہی ناچ گھر، وہی عورت و مرد کا تعلق، وہی شراب وہی سامانِ عیش نظر آئیں گے۔ یورپ بھی رہے گا، گو وہ بجاے عیسائی کے مسلمان کہلانے لگا"

جو لوگ اس حقیقت کا احساس رکھتے ہیں، کہ اسلام اپنے وطن سے نکل کر کس قدر مسخ ہوگیا ہے، اور جو یہ سمجھتے ہیں، کہ ٹرکی و مصر، حبش و سوڈان، ایران و افغانستان، عرب و ہندوستان، کا موجودہ اسلام، صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لائے ہوے، اور صحابۂ کرام کے اسلام سے بمراحل دور ہے، وہ اندازہ کر سکتے ہیں، کہ فرنگیوں کا اسلام بھی کس قدر فرنگیت آمیز

ہوگا۔ اس خطرہ سے محفوظ رہنے کی تدابیر پہ ہر ہمدرد اسلام کو بجائے خود غور کرنا چاہیئے۔

فرنگستان تو پھر "مغرب" ہے، جو ہم سے "بُعد المشرقین" رکھتا ہے، مشرق ہی میں اسلام جہاں جہاں پھیلا، آج کہیں بھی اپنی اصلی، خالص، وبے آمیز صورت میں موجود نہیں۔ خود ہندوستان کا کیا حال ہے؟ ایک گروہ علم کلام کے مباحث کو اسلام کی روح سمجھ رہا ہے، ایک فرقہ بدعات و ممنوعات میں سرگرم ہے، ایک طائفہ نے ہر قسم کی قیود شرعی سے آزادی کا نام حقیقت اسلام رکھ لیا ہے، ایک جماعت تقلید فرنگ کو عین اسلام قرار دے رہی ہے، غرض ہر طرف خود ساختہ اصنام کا دَور دورہ ہے، اور اسلام کے نام کو خواہشاتِ نفس کے لیے ایک حیلہ بنا لیا گیا ہے۔ غیروں کو اپنا بنانے سے کہیں زائد ضروری یہ ہے، کہ خود اپنوں کو اپنا بنایا جائے، اور یا ایہا الذین آمنوا آمنوا کی عملی تفسیر ہر سمت نظر آنے لگے۔

جامہ ترکان جہاں ہندوے تو!

ترکوں کے عاشق زار اور اردو کے مشہور ادیب حضرت "یلدرم"، یورپ و ٹرکی کے سفر کے بعد ابھی ہندوستان پہونچے ہیں۔ انکے مشاہداتِ سفر کے اقتباسات ذیل قابل مطالعہ ہیں:-

> میرے سفر اول اور اس سفر کے درمیانی زمانہ میں یہاں کی زندگی میں کس قدر عظیم فرق ہو گیا ہے ..... سب سے بڑا وہ تغیر آنکھ کو فوراً محسوس ہوتا ہے یہ ہے کہ کلیاں پھول ہو گئی ہیں، غنچے جو گھنڈیوں میں بند تھے چٹک کر باہر نکل آئے ہیں۔ یعنی ترکی خاتون نے نقاب چہرہ سے ہٹا دیا ہے ..... پاؤں سے لیکر گردن تک لباس، بالکل یورپین لباس ہے۔ پیرس کے تازہ ترین قطع و فیشن کو دیکھنا ہو تو ترکی خاتون کو دیکھیے"

یہ اُس قوم کی اسلامیت ہے، جسکو مسلمانان ہند اپنی سادہ مزاجی سے کل تک محافظ اسلام، و وارث خلافت نبوی علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام سمجھ رہے تھے! آگے اور ملاحظہ ہو:-

> "ترک اسوقت نہ صرف اس نشہ (قومیت) میں مست ہیں، بلکہ روز بروز اس مئے دو آتشہ کے اثر سے مدہوش تر ہو رہے ہیں۔ ترکیت کی پرستش کی جا رہی ہے۔ اور اس

پرستش میں وہ مدنیتِ حجازی پر بعض اوقات سخت حملہ کر جاتے ہیں، جو میری طرح باہر کے مسلمانوں کو بہت گراں گزرتے ہیں۔ وہ اس وقت عرب کا نام نہیں سُن سکتے ......
ہر ملک و قوم کی طرح ترکوں میں بھی ایک انتہا پسند گروہ ہے۔ یہ لوگ 'عرب' اہل عرب، و مدنیتِ عرب سے ایسی بیزاری ظاہر کرتے ہیں، کہ خیال ہونے لگتا ہے کہ دین عرب سے بھی بیزار ہیں۔ اس وقت اس گروہ کے حسیات کے ترجمان واصف بک ہیں' جو وزیر تعلیم ہیں۔ ... دو دن ہوے کہ خود مصطفٰے کمال پاشانے اپنی تقریر میں کہا، کہ ... گئے وہ دن جبکہ سلطان، خاقان، خلیفہ، غیر ترکی عناصر کی مدد سے ترکی قوم کو دبا کر حکومت کرتے تھے۔ غیر ترکی عناصر سے اشارہ زیادہ تر عربوں کی طرف ہے۔ نفرت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ ترک اس وقت اسکے بھی خلاف ہیں کہ کوئی حج کو جائے"۔

پرستش خواہ "ترکیت" کی ہو یا "فرنگیت" کی، یا "ہندیت" کی، سب اسلام سے یکساں خارج ہیں۔ قومیت و وطنیت' یعنی قوم پرستی و وطن پرستی' خاص تحفۂ مغرب ہے، اور بدقسمتی سے یہ بلا تمام عالم پر مسلّط ہوتی جاتی ہے۔ ترک کل تک اسلام کی حلقہ بگوشی پر نازاں تھے، اور اس لیے اُنھیں قدرۃً سرافرازی حاصل تھی' آج اُنھیں بُتِ مغرب کی پرستاری پر فخر ہے، کیا اب بھی اُنکی سیادت قائم رہ سکتی ہے؟ کل تک' ترک بہ اصطلاحِ شعرا "ترک" تھے، کیا اب "ہندو" کی اصطلاح اُنکے لیے موزوں نہ ہوگی؟

آخر کار

مشہور و معروف آریہ لیڈر سوامی شردھانندجی نے بالآخر ایک بار پھر معاملات ملکی و سیاسی سے اپنی کنارہ کشی، اور بقیہ زندگی کو مذہبی و علمی خدمات کے لیے وقف کردینے کا اعلان فرمایا ہے۔ انکی زبان مبارک سے' اپنی نوعیت کا یہ پہلا اعلان نہیں، اس لیے قدرۃً بعض طبائع کو اسکے باور کرنے میں تامل ہو رہا ہے، لیکن بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جنکا عمل اُستاد داغ کے فلسفہ پر ہے:

پھر سہو ہوگئیں تری وعدہ خلافیاں ۔۔۔ پھر اعتبار ہے مجھے عہد جدید کا!

اُنکا خیال ہے کہ قدرت کو اس' تارکِ دنیا' زاہد اور مرتاض سنیاسی سے جو کام لینا تھا' وہ پورا ہوچکا۔ شدھی کی تحریک نے ملک کے امن و امان میں ایک سرے سے دوسرے تک آگ لگا دی۔

گاندھی جی کی ساعیِ اتحاد پر یکلخت پانی پھیر دیا، ہندو مسلم فسادات کی قربان گاہ پر ہزاروں بیگناہوں کی جانیں نذر ہو گئیں، سوامی جی کا مشن اُسکے بعد بھی کسی پہلو سے ناکام یا ناتمام کہا جا سکتا ہے؟ اب وہ ہر طرح آسودہ و مطمئن ہو کر اپنے کنج عافیت سے اپنی کوششوں کے نتائج مدتوں تک دیکھ سکتے ہیں! خدا معلوم، سوامی جی کو کبھی مرزا غالب کے کلام سے بھی دلچسپی رہی ہے، جی میں آتا ہے، اُن سے اس شعر کے معنی دریافت کرتے ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ... ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

سیدنا عمر فاروقؓ پر افتراء عظیم

سود کی بحث میں جناب طفیل احمد صاحب نے ایک عجیب دلچسپ طریقہ یہ رکھا ہے، کہ جب اُنکے کسی دعوے پر گرفت ہوتی ہے، جھٹ اُسکو چھوڑ کر دوسرے مسائل پر اظہارِ خیال شروع فرما دیتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس طرح بحث کا سلسلہ عمر بھر جاری رہ سکتا ہے۔ البتہ ایک دعوے ایسا ہے، جس سے وہ اب تک دست بردار نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اُس کا اپنے ایک جدید مضمون میں پھر اعادہ کیا ہے، حالانکہ اُس کا بے بنیاد ہونا اُن پر بخوبی واضح کیا جا چکا تھا۔ اپنے رسالہ مسئلۂ سود کی بالکل ابتدا ہی میں اُنھوں نے مسئلۂ سود کو "غیر منفصل" اپنے زمانہ سے نہیں بلکہ "عہد صحابہ" سے قرار دیا ہے، اور سند میں حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک قول مبارک کو پیش کیا ہے۔ اپنے جدید مضمون میں پھر اسی بے بنیاد دعوے کو دوہرایا ہے، اور حضرت رضی اللہ عنہ کا نام اس حیثیت سے لیا ہے، کہ گویا اُنکو بھی حرمتِ سود میں تردد و تامل تھا۔

حضرت رضی اللہ عنہ کے اصل الفاظ، حسب ذیل ہیں:۔

عن عمر بن الخطاب قال انّ آخر ما نزلت آیۃ الربوٰا وان رسول اللہ صلعم قبض ولم یفسرہا لنا فدعوا الربوٰا والریبۃ (ابن ماجہ۔ باب التغلیظ فی الربوٰ) (مشکوٰۃ۔ باب الربوا۔ فصل ثالث)	آیۂ ربوا سب سے آخر میں اُتری۔ حضور رسول اللہ صلعم دنیا سے تشریف لے گئے اور اسکی کچھ تفسیر ہمارے لیے نہ بیان فرما گئے؛ پس چھوڑ دو ربوا کو اور ہر اُس شے کو جو اس سے ملتی جلتی ہو

یہ تصریح خود سیدنا عمرؓ کی زبان مبارک سے تھی، اب شارحین کا ایک آدھ قول ملاحظہ ہو۔

ان آخر ما نزلت آیۃ الربوٰا الخ وہی الذین	آخری آیۂ ربوا سے مراد آیہ کریمہ الذین یأکلون الربوٰا لایقومون

یاکلون الربٰوا لا یقومون الآیۃ فھی غیر منسوخۃ ولا مشتبھۃ فکذا لم یفسرھا النبی صلعم، فدعوا الربوا والریبۃ ای فاترکوا الحیلۃ فی حلھا

الخ ہے۔ یہ آیت غیر منسوخ و غیر مشتبہ ہے (یعنی حکم حرمت ربوا بالکل قطعی و غیر منسوخ ہے) اور اسی لیے رسول خدا صلعم نے اسکی تفسیریں بیان فرمائی بس چھوڑ دو ربٰوا کو اور جواز ربٰوا کے لیے حیلہ ڈھونڈنے کو۔

یہ قول طیبی کا تھا، اسی کو صاحب مجمع البحار (جلد اول ص نولکشوری) نے اختیار کیا ہے۔ صاحب لمعات (شرح مشکوۃ) نے اسے بھی نقل کیا ہے، اور اپنی طرف سے یہ اضافہ کیا ہے،

آخر ما نزلت آیۃ الربوا یعنی ہی ثابتۃ غیر منسوخۃ لکن رسول اللہ صلعم قبض ولم یفسرھا بحیث یحیط بجمیع جزئیاتہ وموادھا فینبغی لکم ان تدعوا الربوا الصریح وما یشتبہ الامر فیہ

آیۂ ربوا کے آخر میں نازل ہونے سے مراد ہی یہ ہے کہ یہ آیت قطعی و غیر منسوخ ہے۔ لیکن رسول خدا صلعم دنیا سے تشریف لیگئے اور اسکی تفسیر نہیں فرما گئے جو اسکی جمیع جزئیات و فروع پر حاوی ہو۔ اسلیے یہ چاہیے کہ سود کو بھی چھوڑ دو اور مشتبہات سود کو بھی

گویا جواز سود تو الگ رہا، سیدنا فاروق نے جیسی کہ اُن جیسے مومن کامل سے توقع تھی، حرمت سود و مشتبہات سود کو اور زیادہ قوی و مستحکم کر دیا ہے۔ کیا اُنکے اس قول مبارک کے اصل الفاظ کے مطالعہ کے بعد، کوئی شخص جسے اپنی دیانت ذرا بھی عزیز ہے، اسے جواز سود کی تائید میں پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ جناب طفیل احمد صاحب قرآن پاک کی ایک آیت سے تجارت میں بددیانتی کو تو مسلمانوں کے لیے جائز کر چکے ہیں، کیا مضمون نگاری و تالیف میں بھی بددیانتی کے لیے انھیں سند جواز کسی آیۂ پاک سے ہاتھ آگئی ہے؟

ایک احمدی کی سنگساری

پچھلے دنوں کابل سے ایک احمدی کی سنگساری کی جو خبر موصول ہوئی، اُس پر اُردو پریس میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اور اب تک صدہا مضامین اس تعزیر کی تائید مخالفت میں شایع ہو چکے ہیں۔ احمدی پریس قدرۃً پُرزور مخالفت و احتجاج کر رہا ہے، اور عام اسلامی پریس (باستثناء شاذ) تائید و مسرت کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ یہ سزا اگر کسی ملکی یا سیاسی جُرم کی بنا پر دی گئی ہے، اور کابل کے قانون میں اُس جرم کے لیے اسی سزا کا رواج ہے، تو کسی بیرونی شخص کو یقیناً مداخلت کا حق حاصل نہیں، لیکن اگر یہ سزا محض "ارتداد" کی بنا پر دی گئی ہے، جیسا کہ عموماً اخبارات کا بیان ہے، تو علماے کابل سے غالباً مفہوم شریعت کے

سمجھنے میں غلطی ہوئی۔

مسئلہ میں دو تنقیحات قائم ہوتی ہیں:-

(۱) آیا اسلام نے ارتداد کی سزا سنگساری رکھی ہے ؟

(۲) آیا شخص مقتول مرتد تھا ؟

سوالِ اول کے جواب میں معلوم نہیں، علماء قرآن پاک کی کس آیت، یا کس حدیث صحیح سے استناد کر سکتے ہیں۔ حضرت صدیقؓ کا مرتدین سے قتال کرنا، اس باب میں کافی حجت نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ایسی سند کے پیش کرنے کی ہے، جس میں محض تبدیلِ عقیدہ پر، اختلالِ سیاسی و بدنظمیِ ملت سے قطع نظر کرکے، اسلام نے سزائے موت واجب کی ہو، اور پھر سزائے موت بھی سنگساری ہی کی شکل میں ہو۔

سوال دوم کا جواب کسی طویل بحث کا محتاج نہیں، کوئی شخص جب تک ایک خدا کا قائل ہے، محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت کا اقرار کرتا ہے، قرآن کو حرفاً حرفاً کلام الٰہی تسلیم کرتا ہے، کعبۃ اللہ کو اپنا قبلہ مانتا ہے، کیونکر دائرہ اسلام سے خارج کیا جا سکتا ہے، اور خارج بھی ایسا، کہ اُس پر پوری طرح "مرتد" ہونے کا اطلاق ہو سکے۔ فرقۂ احمدی اسلامی عقائد کی رُو سے، بے شبہ ایک غلط رو، اور گمراہ فرقہ ہے، لیکن "ارتداد" جس آخری و قطعی اور انتہائی گمراہی کا نام ہے، اُس کا اطلاق کسی کلمہ گو پر کرنا بڑی جسارت ہے۔

الناظر پر تنقید

الناظر کے اگست نمبر میں "اظہار رائے" کے زیرِ عنوان جو مکتوب سلطان حیدر صاحب جوش کا شائع ہوا ہے، یقین ہے، کہ اکثر ناظرین نے اُسے ایک خاص قسم کی دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہو۔ اسکے کاتب صاحب اپنے ان خیالات میں منفرد نہیں۔ تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ، روشن خیال و "علم دوست" حضرات کی ایک اچھی خاصی جماعت اُنکی ہم خیال موجود ہے، اُن سب کے خیالات و جذبات کی ترجمانی مضمون مذکور سے ہو گئی۔ راقم سطور نے مارچ ۱۹۲۳ء کے پرچہ میں فیہ ما فیہ کا یہ سلسلہ شروع کرتے ہوئے پروردگار کے حضور میں بصد منت و الحاح یہ عرض کی تھی، کہ اسے خلوص و توفیق حق نصیب کر، اور اسکی حقیر و بے بساط کوششوں کو مقبول کر،

توقع نہ تھی کہ ایک سیہ کار بندہ کی دعا شرفِ قبولیت حاصل کرلیگی! لیکن الحمد للہ کہ آثار قبولیت روز بروز روشن تر و نمایاں تر ہوتے جاتے ہیں چلپی کی گزارشات پر برہمی و ناگواری، ایک خاص طبقہ میں بہت عرصہ سے پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی، خانگی صحبتوں میں اکثر یہ تذکرے ہوتے رہے، کبھی کبھی ایک آدھ اخبار نے بھی کچھ لکھا، تا آنکہ یہ شرف مخصوص، سلطان حیدر صاحب کے حصہ میں آیا، کہ اُنھوں نے ایک عرصہ کے حیص بیص، تامل و تردد کے بعد، اپنی ہمت مجتمع کرکے بالآخر الناظر میں اس طبقہ کی نیابت کا فرض ٹھیک اُنھیں خصوصیات کے ساتھ ادا فرمایا، جو اس طائفۂ عالیہ کے علامات امتیازی ہیں!

"قومی اندیشہ"

صاحبِ تنقید کو یہ تامل و تردد خدانخواستہ کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ اپنی رائے کی صحت میں تزلزل تھا، بلکہ اس کا محرک صرف وہ "خوف" تھا، جو "فیہ ما فیہ کی بندوق" سے صاحبِ تنقید کو "اپنی ذات" اور "اپنی نسل" کے لیے تھا۔ فرماتے ہیں،

"حاشا وکلا، میں اسکو لکھ کر فیہ ما فیہ کی بندوق اپنے اوپر نسلاً بعد نسلٍ نہیں دغوانا چاہتا"

اُن کے دل پر سب سے زیادہ ہیبت "اس قومی اندیشہ" کی مسلط تھی کہ

"آیندہ نمبر میں چلپی صاحب کا قلم اس عاجز کے خیالات بلکہ ممکن ہے کہ ذات پر بہت کچھ جولانی دکھائیگا"

یہاں تک مضائقہ نہ تھا، مگر ناقابلِ برداشت یہ اندیشہ تھا، کہ اس جولانیِ قلم میں

"ایک درجن احادیث و کلام الٰہی کا حوالہ" بھی ہوگا!

"روشن خیال" "شگفتہ نگار" بلند ہمت و شیر دل، "تنقید نگار" "ادبی چاشنی" مذاق سلیم کے نمونے، شگفتہ نگاری کے مرقعے، مختصر و سبق آموز فسانے "سب کچھ برداشت کرسکتا ہے، لیکن اس کا تحمل تو بہرحال نہیں کرسکتا، کہ اسے "احادیث و آیات" کا حوالہ دیا جائے! اور وہ بھی ایک دو نہیں، اکٹھی ایک درجن!! الناظر کی یہ معصیت تو وہ کسی حال میں بھی نہیں معاف کرسکتا، کہ ایک

"معمولی بات پر چلپی صاحب نے پورے تین صفحوں پر احادیث نبوی کے حوالے" دیدیے!

اللہ اکبر! اس ستم کی کوئی حد ہے، کہ پورے تین تین صفحے احادیث نبوی کی نذر کردیے جائیں! اس انتہائی بدمذاقی و تاریک خیالی کے مظاہرہ کے بعد بھی، کوئی شخص الناظر پر "علمی" رسالہ کا اطلاق کرسکتا ہے!! رسالہ "علمی و ادبی" صرف اُسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک اُسکے اوراق

کو مغربی مصنفین کے اسمائے گرامی سے زینت دی جاتی رہے، ہر صفحہ میں بے سوچے سمجھے "ارتقاء" "سائنس" "ترقی" "ادب لطیف" وغیرہ الفاظ متبرکہ کی تکرار ہوتی رہے، یا پھر کذب و دروغ کے انبار "مختصر افسانہ" کے زیر عنوان شایع ہوتے رہیں۔ یہ بھی نہ سہی، تو کم از کم اتنا تو ہو کہ ریلوے اسٹیشنوں پر وہیلر کمپنی کے ہاں سے جنگ کے متعلق کوئی ارزاں کتاب خرید کر لی جائے، اور اُسکے خلاصہ سے ناظرین کو اپنے ماہر فن حربیات ہونے کا یقین دلا دیا جائے! النّاظر اگر اس طریق کو آج پھر اختیار کر لے، تو چشم زدن میں با وجود "دریدہ نگاری" کے وہ پھر ایک "علمی و ادبی" رسالہ بن سکتا ہے، اور سلطان حیدر صاحب جیسے "شگفتہ نگار" اسکے ذریعہ سے "ابن سلم" کی طرح "ادب لطیف" کے حیرت انگیز نمونوں سے دنیا کو ایک بار پھر محو حیرت بنا سکتے ہیں۔ باقی "آیاتِ قرآنی و احادیث نبوی" سو ظاہر ہے کہ دُنیا کی کسی لغت اور کسی محاورہ کے اعتبار سے بھی ان پر "علم" و "ادب" کا اطلاق نہیں ہو سکتا!

حد ہو گئی

سلطان حیدر صاحب کا حسن معدلت گستری، طفیل احمد صاحب کو اسکی پوری اجازت دیتا ہے، کہ وہ جب تک اور جس عنوان سے چاہیں، تبلیغ جواز سود کرتے رہیں، لیکن اگر کوئی بدبخت اُسکے جوابات کا اقدام کر گزرتا ہے، تو وہ یقیناً گردن زدنی ہے، اس لیے کہ اس تذکرہ سے ان "شگفتہ نگار" افسانہ نویس صاحب کا "دم ناک میں آ جاتا ہے"!! انکو بڑی ہی فکر النّاظر کی "بندوق" سے طفیل احمد صاحب کی "جان و عزت" کی ہے، وہ کس قدر شفقتِ برادرانہ کے لہجہ میں آہِ سرد کے ساتھ فرماتے ہیں، کہ

"خدا ہی جانے طفیل احمد صاحب کی عزت و جان کب تک معرض خطر میں رہتی ہے"!

چلیی، اور النّاظر کے ناقابل عفو معاصی کو کہاں تک گنایا جائے۔ حد یہ ہو گئی، کہ اور تو اور، تنقید و بحث سے ماورا، جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب تک

"چلپی صاحب کی کسوٹی سے نہ بچ سکے"!

معاذ اللہ! اس قدر دریدہ نگاری! اتنی شدید گستاخی کے بعد بھی اگر سلطان حیدر صاحب النّاظر اور اُسکے شذرات نگار کو "ناقابل علاج" نہیں خیال فرماتے، تو یہ محض اُنکا غایتِ کرم اور لطفِ عمیم ہے۔

"موزوں نام"

آپ کی نظر میں آج بدترین تالیفات "راہِ نجات" اور "فلاح المومنین" ہیں۔ آج یقیناً آپ کو

اس رسالے کے آزادانہ اظہار کا حق حاصل ہے، لیکن اس کا اصلی فیصلہ "کل" اُسوقت ہوگا، جب راہ نجات اور ابن مُسلم دونوں کے مصنفوں کو اپنے اپنے اعمال کے ہمراہ ایک بڑے ہی ذی اقتدار عالم کے حضور میں حاضر ہونا پڑیگا! اُس وقت شاید "شگفتہ نگاری" اور ادبی "چاشنی" اسقدر محبوب نہ رہ جائے، اور "خشک نگاری" اور "کھدر پوشی" شاید اس قدر قابلِ مضحکہ نہ ثابت ہو. جتنی آج رسائل کے صفحات یا عدالت کی کرسی پر ظاہر ہو رہی ہے! الناظر کے لیے موزوں نام آپ "تنبیہ الغافلین" یا "تعزیرات الفاسقین" تجویز فرماتے ہیں، تعجب ہے کہ آپ کا ذہن انھیں کے ہم قافیہ ایک اور نام کی جانب نہ منتقل ہوا. جو آپ کے آبائے طریقت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل ایک اور کتاب کے متعلق تجویز کر چکے تھے، یعنی "اساطیر الاولین" - بہرحال ان ناموں میں سے آپ "ادب لطیف" کا لحاظ فرماکر جو بھی انتخاب فرمادیں، یقیناً ایڈیٹر صاحب الناظر کے لیے قابل قبول ہو جائے گا، بشرطیکہ تھوڑی سی جرأت کو کام میں لاکر جناب والا بھی اپنے اسم گرامی میں کسی ایسی تبدیلی کا اعلان فرمادیں، جسکے بعد کسی کو جناب کے متعلق مومن ہونے کا حسن ظن باقی نہ رہ جائے۔

موت کے بعد "صاحب" کے ساتھ آخری آرامگاہ میں استراحت فرمانے کو تو آپ اپنے اسی مضمون میں ایک "معمولی بات" قرار دے چکے ہیں، بہتر ہوگا، کہ اپنے حکیمانہ عقائد کے اعلان اور اسم گرامی کی تصحیح سے ہم تاریک خیالوں کو جرأت وہمت کا عملی درس عطا فرمائیں۔

قُل مُوتُوا بِغَيْظِكُم

آپ کے جذبات وحسیات اپنی نوعیت میں کچھ انوکھے اور نادر نہیں، آپ سے صدیوں پیشتر، آپ ہی حضرات کی طرح، ایک روشن خیال وعقل دوست' جماعت اور بھی تھی، جو آیات قرآنی کو سُن سُن کر انتہائی غیظ وغضب سے لبریز ہو جاتی تھی، اور اُنکے ساتھ طرح طرح کی تحقیر کرتی تھی، أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ ؟ (واقعہ - ع ۳) - آپ "شگفتہ نگار" حضرات کی طرح اُس جماعت میں بھی "شگفتہ گفتار" شعرا وفصحا کثرت سے شامل تھے، قرآن ساری دنیا کے لیے نسخۂ تسلی بن کر آیا تھا لیکن اس جماعت کے درد کفر ومرض طغیان وانکار ہی میں اضافہ کرتا رہا - آپ سے پیشتر آپ کے

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا - (مائدہ - ۹)

پیشتر وحضرات اس پیام حق کے اول سُنانے والے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سر ہوگئے، اور جھنجلاتے رہے، کہ کیسی آیات نازل ہوتی رہتی ہیں، جو ہمارے محبوب مشاغل اور دلفریب معاشرت میں خلل انداز ہوگئی ہیں، اور فرمایش کرتے رہے کہ ان

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَا اَوْ بَدِّلْهُ (یونس - ع ۲) | خشک وبے مزہ آیات کے بجاے کچھ اور دلچسپ مضامین سناؤ۔

لیکن جواب ہمیشہ یہی ملا، کہ یہ کلام حق ہے، یہ تمہارے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (صف - ع ۱) | یہ نورِ خدا ہے، تم اسے پھونک مار کر نہیں بجھا سکتے۔ یہ نور پھیل کر رہیگا، خواہ تم منکرین کتنا ہی انگاروں پر لوٹو۔

تیوروں پر بل ڈالنا، مضحکہ کرنا، غصہ میں آکر سخت الفاظ استعمال کرنا،

قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (آل عمران) | سب لاحاصل ہے۔ آیاتِ کلامِ الٰہی قائم وباقی ہیں، اور قائم وباقی رہیں گی۔ اس کلام حق، اور اسکی اشاعت کو روکنا جس طرح عرب کے کسی شاعر، کسی سحر بیان کے بس میں نہ تھا، اسی طرح آج بھی ہندوستان کے کسی افسانہ نویس، کسی "شگفتہ نگار" کی قدرت وبساط میں نہیں۔

تقیہ چھوڑ دیجئے

نفاق وانکار، الحاد ومادہ پرستی، بدعقیدگی واسلام بیزاری کی حقیقت اس لیے نہیں بدل سکتی، کہ اُسے بکمال عیاری "علم وادب" کا لباس پہنا کر پیش کیا جائے، یا اُسے "مخلصانہ مشورہ" کے عنوان سے موسوم کیا جائے۔ بہ قول مولانا سید سلیمان ندوی کے، اگر ایمانیات آپ کے نزدیک اسی درجہ کی فضول وکم رتبہ چیزیں ہیں، تو آخر خدا ومذہب کا پردہ ہی کیوں رکھا جاتا ہے؟

"صاف صاف اور کھلم کھلا مسٹر ظریف کی طرح الحاد، بیدینی اور مذاہب کی تنگ نظری کا وعظ کیوں نہ کہا جائے، آج ہارون ومہدی یا ملک شاہ وسنجر کی تلوار نہیں جسکا خوف کیا جائے۔ آزادی کا دور ہے، محتسب کا ڈر نہیں پھر تستر وتقیہ وتبدیل ہیئت کی کیا ضرورت داعی ہے۔ جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج"

قرآن وحدیث کے تذکرہ سے اگر نفرت ہے، تو بہتر یہ تھا، کہ صاف صاف ان خیالات کا مستقل عنوان کے ذریعے اظہار کیا ہوتا۔ الناظر باوجود اپنی کمزور پوشی کے ان "افکار عالیہ" کے لیے گنجایش نکال ہی لیتا۔

ابن رشد

دار المصنفین کے سلسلہ میں ابن رشد کے سوانح زندگی اور اسکے فلسفہ کی تاریخ (مولفہ مولوی محمد یونس مرحوم فرنگی محلی) جو حال میں شایع ہوئی ہے اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس سلسلہ کی کتابوں سے جس کے بانی مولانا شبلی مرحوم تھے اردو لٹریچر میں جو بیش قیمت اضافہ ہوا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ قدیم مسلمانوں میں بیاگرفی کا رواج نہ ہونے کے سبب سے کسی ماہر علم یا فن کے حالات زندگی کا پتہ لگانا ایک اہم کام ہے۔ یہ نوجوان مصنف پہلا شخص ہے جس نے ابن رشد کے فلسفہ سے قوم کو روشناس کیا۔ جس کاوش سے اُنھوں نے اس کے حالات کو فراہم کیا ہے اور جس قابلیت سے اسکے فلسفہ کا موازنہ کیا ہے اس سے اُن کے طالب علمانہ ذوق تحقیق، دقت نظر اور وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف کے لیے ایک مشکل یہی تھی کہ عربی لٹریچر میں ایسی تصنیف کے لیے بہت کم مواد مل سکتا تھا۔ اُنکو زیادہ تر یورپین مورخین کی کتابوں سے مدد لینی پڑی ملکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کتاب کا بڑا حصہ انھیں مورخین کی کتابوں کا ترجمہ ہے۔ مگر یہ ترجمے اُنھوں نے بڑی فیاضی کے ساتھ کیے ہیں۔ مثلاً حصۂ سوم میں گیبرو اور لکی وغیرہ کے صفحوں کے صفحوں کا ترجمہ درج کردیا ہے۔ ان اقتباسات کو ابن رشد کے حالات سے چنداں تعلق نہیں ہے اگر جاہلیت یورپ کی حالت دکھانی منظور تھی تو اسپین کی علمی حالت کے ذیل میں انکو درج کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ ناظرین کو دونوں کا مقابلہ کرنے میں سہولت ہو۔ اس حصہ میں غیر متعلق واقعات بکثرت پائے جاتے ہیں جن میں اختصار کی بہت گنجایش تھی۔ گو ابن رشد کا فلسفہ تقویم پارینہ ہو چکا لیکن جب اس نظر سے دیکھا جائے کہ باوصف فقیہ اور محدث ہونے کے اُس نے اسلام کے بعض مسلمہ عقائد سے اختلاف کیا اور یورپ نے اُسکی تصانیف کی کچھ عرصہ تک بہت قدر کی تو علمی حیثیت سے اُس کی تصانیف سے بے اعتنائی نہیں کی جا سکتی۔ بعض لوگوں کا شاید یہ خیال ہو کہ اس زمانہ میں اُس کے فلسفہ کی اشاعت اور تنقید سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ لیکن جو مسائل فلسفہ کے زمرہ میں ہیں اُنکا تعلق کسی خاص زمانہ سے نہیں ہے۔ واقعات عالم اور انسان کے خیالات کی تاریخ میں

ماضی و حال و مستقبل ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ زمانۂ ماضی کے خیالات اور اعمال کا نتیجہ ہماری حالتِ موجودہ ہے اور اس وقت جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ مستقبل کا سرمایۂ وجود ہے۔ صدیاں گذر گئیں اور ہر جویان رازِ ہستی اس بزمِ فانی سے بزبانِ حال یہ کہتا ہوا اُٹھا۔

با ہیچکس نشانے زاں دلستاں نہ دیدم
یا من خبر ندارم یا او نشاں ندارد

مگر انسان کی خلقت میں جو مادہ تجسس کا ہے وہ اُسکو مایوس نہیں ہونے دیتا۔ تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اور آج بھی ان مباحث میں اُسکو وہی دلچسپی ہے جو ارسطو اور افلاطون کے زمانے میں تھی۔ اس لحاظ سے متقدمین کے خیالات اور اُنکے نتائج تحقیقات سے آگاہی حاصل کرنا محض قدامت پرستی نہیں ہے بلکہ آیندہ ترقی کے لیے ضروری ہے۔

مصنف نے ابن رشد کے فلسفہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ خود کسی فلسفہ کا موجد نہ تھا ارسطو کا مقلد محض تھا۔ ہم بطور مثال کے اُس کی بعض رائیں یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو اسکے عقائد کی بابت فیصلہ کرنے میں سہولت ہو۔ آفرینش عالم کے مسئلہ میں اُسکی رائے یہ تھی کہ عالم قدیم اور ازلی ہے، مادہ غیر مخلوق اور ناقابل فنا ہے۔

"حرکت کے پہلے سکون یا سکون کے پہلے حرکت نہیں ہوتی۔ بلکہ حرکت خود ازلی ہے۔ زمانہ کا وجود بھی حرکت سے ہے اگر حرکت کا وجود نہ ہوتا تو عالم میں جو سلسلہ پیدایش کا جاری ہے اُس کا وجود بھی نہ ہوتا۔ خدا یا علت العلل اس بارے میں مختار بالارادہ نہیں ہے۔ عالم کی پیدایش اُس سے فیضان وجود کے طور پر ہوئی ہے۔ چونکہ وہ خیر محض تھا اسلیے وہ مجبور تھا کہ عالم کو وجود میں لائے۔ وہ علم رکھتا ہے لیکن محض کلیات کا۔ جزئیات کے علم سے وہ بے بہرہ ہے"

جب مادہ اپنے وجود میں علت کا محتاج نہیں اور حرکت اس کا خاصہ ہے تو پھر خدا یا علت العلل کی ضرورت کیا باقی رہی۔ اور خدا بھی اس حیثیت کا کہ اُس کا کوئی فعل ارادی نہیں۔ کُل متبعین ارسطو کا یہی مذہب تھا۔ اور اسکی جھلک زمانۂ حال میں کینٹ اور ہیگل کے فلسفہ میں پائی جاتی ہے۔ ابن رشد کے بعد اٹھارویں صدی میں فرانس میں اور جرمنی میں اُنیسویں صدی کے وسط تک ڈیزم کے یہ عام عقائد تھے۔ انگلستان میں

ہابس، ہیوم اور مل وغیرہ نے اس درجہ سے تجاوز کیا اور بجائے مادہ کو خالق تسلیم کرنے کے وہ ایک اور جداگانہ ہستی کے قائل تھے۔ اس زمانہ میں یورپ میں بجز طبیعین کے فلاسفہ میں کسی فرقہ کا یہ خیال نہیں ہے بلکہ عام طور پر روحانیت کی جانب میلان پایا جاتا ہے۔ طبیعات اور علم طبقات الارض کے ذریعہ سے ماہیت مادہ اور کرۂ ارض کے متعلق جو انکشافات ہوئے ہیں وہ مذہب کے خلاف نہیں ہیں بلکہ جدید تحقیقات کی رو سے ایک صانع حقیقی کے وجود کا یقین اور مستحکم ہوتا ہے۔ گو مادئین اب بھی اُسکے منکر ہیں۔

کلام ربانی میں خلقتِ انسانی کی تفصیل ایک موقع پر یوں فرمائی گئی ہے۔ "وَبَدَأَ خَلْقَ الإِنسَانِ مِن طِينٍ .... ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ"۔ (اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اُسکو درست کیا۔ اور اُس میں اپنی روح پھونکی)

دوسرے مقام پر اس سے بھی زیادہ صاف یعنے "نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي" فرمایا۔ جو ہستی حامل نور الٰہی ہے جس کا میلان فطرتاً ہمیشہ اعلیٰ کی طرف ہوتا ہے، جو کہیں انبیا اور اولیا کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور کہیں شیطان کا جامہ پہن لیتی ہے خود انسان کے ہاتھوں اتنے پست درجہ میں پہونچ جاتی ہے کہ حشرات الارض اور انسان میں خلقت کے اعتبار سے کوئی فرق امتیازی باقی نہیں رہتا۔

تخلیق عالم کے مسئلہ میں ابن رشد کی جو رائے ہم اوپر لکھ چکے ہیں اُس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ وجود باری کا منکر ہوگا۔ لیکن بجائے اسکے اُس نے وحدت عقل کا مسئلہ ایجاد کیا۔ اس کے نزدیک تمام انسانوں میں ایک ہی عقل پائی جاتی ہے۔ انسانیت کسی میں کم اور کسی میں زیادہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تمام کائنات ایک عقل کل کی مظہر بلکہ اس کا جزو ہے۔ ہم اسکے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے عالم مادہ سے وجود میں آیا لیکن مادہ میں عقل و شعور نہیں۔ اسی بنا پر ایک عقل کل کو ماننا پڑا۔ اگر وہ اسی رائے پر قناعت کرتا تو کم سے کم مادئین کے اعتراض سے محفوظ رہتا لیکن وہ آگے چل کر عقل کی پانچ قسمیں قرار دیتا ہے اور اپنے اجتہاد سے اس مسئلہ کو ہی قدر پیچیدہ بنا دیتا ہے کہ خود اُس میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ فلسفہ صرف اصطلاحات کا نام نہیں ہے، ورنہ وہ قیاسات انسانی کا مجموعہ ہے جن میں کچھ غلط اور کچھ صحیح ہیں۔ حقائق اشیا جو اُس نے

کسی حد تک دسترس حاصل کیا ہے لیکن روحانیات میں وہ انسان کی رہبری سے بالکل قاصر ہے۔ قدم قدم پر اُسکو لغزش ہوتی ہے اور اُس کا بھرم کھل جاتا ہے۔

ابن رشد بحیثیت متکلم یہ اصول قائم کرتا ہے:

"صرف قرآن مجید کو پیش نظر رکھو تو تمام مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ اس سے ایک عامی بھی اسی طرح مطلب سمجھ لیتا ہے جس طرح ایک فلسفی۔ اس کے دلائل جس طرح خطابی ہیں اُسی طرح وہ قیاسی اور بُرہانی بھی ہیں یعنی منطق کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔"

لیکن ایک فلسفی کی حیثیت سے وہ خود اپنے اصول موضوعہ پر عمل نہیں کرتا۔ بجائے اسکے کہ وہ انھیں دلائل کی بنا پر خدائے عزوجل کے وجود کا اقرار کرتا وہ اپنے مفروضہ خدا میں بجز عقل کے اور کوئی صفت نہیں پاتا۔ اور اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاف طور پر صفاتِ باری کا منکر تھا۔ کاش وہ یہ کہتا کہ انسان کی فطرت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ از خود اُسکو معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ یہ خیال ہر ایک کے دل میں خود بخود پیدا ہوتا ہے اور اسکی تردید فطرت کے خلاف ہے۔ یہی مطلب ہے "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلٰى" کا۔ اُنیسویں صدی کا مشہور جرمن فلسفی کانٹ اس تہ کو پہونچ گیا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ خود نفس انسانی ہستیِ مطلق کا شاہد ہے۔

ہرگز نہ شناسند ہمہ راز ست وگر نہ

انہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست

اسکے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن رشد کی نسبت علمائے دین کی بدگمانی اور بالآخر اُسپر بیدینی کا جو الزام عائد کیا گیا وہ کہاں تک واجبی تھا۔ مصنف نے منجملہ اور اسباب کے اسکے دو خاص وجوہ قرار دیے ہیں:-

(۱) تقربِ شاہی کی وجہ سے اسکے خلاف حاسدانہ سازشیں۔

(۲) فلسفہ میں اس کا انہماک۔

ایک یوروپین مصنف کا قول ہے کہ فلسفہ کی تحصیل کسی حد تک ایک دلچسپ اور مفید مشغلہ ہے لیکن اس میں زیادہ انہماک انسان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ ابن رشد اس کا پورا مصداق تھا۔

مسلمانوں کو فلسفہ کے ساتھ جو بیگانہ وشی اور تعصب تھا اس سے قطع نظر خود ابن رشد کے عقائد ایسے تھے کہ اسکے خلاف الحاد کا فتوے حاصل کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خدا کو خالق اور مختار بالارادہ تسلیم نہیں کرتا، صفات باری اور حشر اجساد کا منکر ہے۔ تو ہم کو علماے دین کی رائے سے اختلاف کی جرأت نہیں ہوتی۔

ابن رشد نے مذہب اور عقل میں تطبیق کا دعوئی کیا تھا لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہ خیال اس کا نیا نہیں تھا۔ اسکے پیشتر اور اسکے بعد اکثر حکما اور بعض مصلح قوم نے مذہب کو عقل کے معیار پر لانا چاہا۔ ہمارے زمانہ میں سر سید احمد خاں مرحوم تمام عمر اسی کوشش میں مصروف رہے لیکن نتیجہ کیا ہوا۔ قرآن اور حدیث کی بیجا تردید اور غلط تاویلات سے انھوں نے مذہب کو ضعیف کر دیا نہ وہ کوئی جدید حکیمانہ مذہب قائم کر سکے نہ اصل مذہب کی گتھیاں سلجھا سکے۔ فی نفسہ یہ ایک مغالطہ ہے کہ عقل الٰہی اور عقل انسانی دونوں ایک سطح پر چل سکتے ہیں۔ اگر فلسفہ اور مذہب پورے طور پر منطبق ہو جائے تو دنیا میں کسی الہامی مذہب کا وجود باقی نہ رہے۔ ارسطو کی اصطلاح میں عقل انفعالی (عقل انسانی) عقل فعال کا جزو ہے۔ اور جزو اپنے کل پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ محال عقلی ہے کہ فلسفہ جس کا موجد انسان ہے، علم الٰہی کا مقابلہ کر سکے .... اس بارے میں قابل مصنف کی رائے یہ ہے کہ "مذہب اور فلسفہ میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ایک دوسرے کی سرحد میں قدم رکھے ہم کو ایسا کوئی قانون نظر نہیں آتا جسکے روسے عقل اور مذہب کا بٹوارہ مکمل ہو سکے اور دونوں کی حد بندی کر دی جائے۔ یہ امر انسان کی عقل سلیم اور وجدان صحیح پر منحصر ہے کہ وہ جن چیزوں کا ادراک نہ کر سکے اُن میں خواہ مخواہ عقل کو دخل نہ دیا جائے اور اس کی عاجزی کا اعتراف کیا جائے۔

ہم کو اس بات پر تعجب نہیں ہوا کہ ابن رشد تصوف کا مخالف اور اس سے بیگانہ محض تھا۔ وہ مشائین کے رنگ میں اتنا شرابور تھا کہ اسکو روحانیات سے مناسبت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ موت کے بعد روح انسانی کے عقل فعال میں مجذوب ہو جانے کا قائل تھا لیکن اُس کی رائے میں یہ اتصال محض علم کی رو سے حاصل ہو سکتا ہے جو عقل کی استعداد اور صلاحیت پر منحصر ہے

ہے ع ابن سعادت بزور بازو نیست - اس رائے میں کئی غلطیاں ہیں - اگر علم اور عقل کے ذریعہ سے معرفت الٰہی حاصل ہو سکتی تو ہر فلسفی بایزید اور منصور بنجاتا - عقل میں ذوق و شوق کی صلاحیت کہاں - محل ذوق قلب ہے نہ کہ قوتِ مدرکہ - بغیر ذوق کے دل میں کشش الٰہی پیدا نہیں ہوتی - خدا اپنی معرفت عطا فرمائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک خود بیں زاہد جو حور کے واسطے عبادت کرتا ہے اور ایک ہیئت داں فلسفی جو بزعم خود آسمان میں چلتی لگاتا ہے دونوں شاہراہِ حقیقت سے یکساں فاصلہ پر ہیں - منزل مقصود کا راستہ عالم روحانی کے سنسان اور نا متناہی فضا میں ڈھونڈھنے سے ملتا ہے جہاں عقل حیران اور ششدر رہ جاتی ہے اور علم موجب حجاب ہوتا ہے - جس مقدس طبقہ نے ہم کو رموز و اسرار روحانی سے آگاہ کیا وہی اسلام کے اصلی فلسفی تھے یعنی صوفیہ کرام - ان کا علم ظنی اور قیاسی نہیں بلکہ عملی ہے - انھیں کی بدولت طالبانِ حق فنا اور بقا کے مدارج تک پہونچے - اور انھوں نے اپنی زندگی میں یہ ثابت کردیا کہ جزو کا کل میں فنا ہو جانا یہی اصل مقصد حیات ہے -

گر دو چشمِ حق شناس آمد ترا
دوست پُر بیں عرصۂ ہر دو سرا

ا - ح

بندۂ عشق بتِ دشمنِ ایماں ہوگا — پہلے کافر تھا مرا دل وہ مسلماں ہوگا
ہم جو کہتے ہیں کہ محفل سے اٹھے جاتے ہیں — ہنس کے کہتے ہیں بڑا آپ کا احساں ہوگا
پیشتر ہی سے تجھے مد نظر تھا شاید — تیرے رہنے کا ٹھکانا دل انساں ہوگا
میں تو یہ سمجھوں گا قیامت کا ہے آنا برحق — زیب آغوش جو وہ فتنۂ دوراں ہوگا
ڈھونڈھ لے ڈھونڈھ لے میرے دل صد پارہ میں — انھیں ٹکڑوں میں ترے تیر کا پیکاں ہوگا
جب بنا قالب خاکی کی پڑی آئی صدا — ہوگا دعوائے خدائی جسے انساں ہوگا
سنگِ اسود کو تو کچھ اور بتاتا ہے شیخ — میں سمجھتا تھا کہ سنگِ درِ جاناں ہوگا
ہے تو قہر خدا ہوگا زیادہ جس پہ — آتشِ دوزخ میں عذابِ شبِ ہجراں ہوگا
بندۂ عشق بتاں روزِ ازل سے ہے جگر — نہ ہوا ہے نہ کبھی دل سے مسلماں ہوگا

افادات مہدی پر ایک نظر

لا تقنطوا الدرر ان ینثر عقد ؛ لیعود احسن فی انتظام واجلا

سب سے پہلے میں بیگم صاحبہ کا تہ دل سے تشکر و ممنون ہوں، کہ انھوں نے باوجود حوادث اور وقتی کاوشوں کے مہدی مرحوم کے منتشر مضامین کی تصفیہ و تنظیم فرمائی، اور لوگوں کو شکریہ کا موقع عطا فرمایا۔ ظاہر ہے کہ ایک خانماں برباد و مضطرب الاحوال خاتون کو جس قدر موانع پیش آتے رہتے ہیں، بلحاظ انکے، ایسے کار خطیر کا انصرام صرف اُن ہی کا حصہ ہے۔

جو کچھ میں لکھوں، یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سوگوار بیگم نے "انکی یاد" کے عنوان سے جو ماتم گساری کی ہے، اُس کا ایک ایک حرف باہمی خلوص اور سچی محبت کی بہترین یادگار ہے، اور زناشوئی کے لطیف جذبات کی زندہ تصویر۔ دوبالا مسرت اُس وقت ہو گی جب دلکش مکاتیب کا مجموعہ خوشنما کتاب کی صورت میں اہل علم کے پیش نظر ہوگا۔ جن اصحاب نے مرحوم کے خطوط دیکھے ہیں یا جنھیں خط و کتابت کا فخر حاصل رہا ہے اُنکو معلوم ہے کہ مہدی مرحوم شرک و تقلید سے پاک تھے، اور اُردو لٹریچر میں طرز خاص کے موجد، "مولانا سید مقبول احمد صاحب صمدنی جو جنٹ نفیب "ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی" کے مخلص و دیرینہ دوستوں میں ہیں اور دنیائے ادب میں کافی شہرت رکھتے ہیں، مجھ کو ممدوح کی خدمت میں اکثر و بیشتر حاضری کا اتفاق ہوتا ہے، مرحوم کے کُل وہ خطوط جو ممدوح کے نام موصول ہوئے میری نظر سے گذرے ہیں۔ میں بلا اندیشۂ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ خط سلک مضامین کے گوہر ہائے آبدار ہیں، اور ودایت و تحقیق کے روح رواں۔

"حضرت مہدی مرحوم کی تحریر کی نسبت کچھ لکھنا درحقیقت تحصیل حاصل ہے، مرحوم کے تبحر علمی اور انکی تحریر کی قوت کا (جن کا اہل علم نے ہمیشہ استقبال کیا ہے) کچھ وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں سچ ہے کہ اُنکے پاکیزہ جذبات اور انکی بلاغت و فصاحت کا ضبط تحریر میں لانا دشوار و پُرخطر ہے۔"

مرحوم کی عمر کا کوئی اندازہ بیگم صاحبہ نے نہیں فرمایا، اس لیے میں بھی نظر انداز کرتا ہوں لیکن حضرت مہدی کے شوقِ انشاپردازی اور بدو اشتغال کا جہاں تک تجسس کیا گیا اُس سے پتہ

چلتا ہے کہ آپکی مضمون نگاری کا آغاز "تمدن عرب پر ایک کھلی چٹھی" کے عنوان سے ہوا، جو فروری ۱۸۹۹ء میں ریاض الاخبار گورکھپور میں اشاعت پذیر ہوئی، اور آخر میں "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" ۱۹۱۹ء کے معارف اعظم گڑھ میں جلوہ افروز ہوئی۔ یہ مرحوم کے مضامین کا آخری دور ہے!

یہ کتاب نہ تو مبسوطاً یا مختص الفن ہے اور نہ کوئی جامع تصنیف بلکہ اخبارات و مجلات میں چند اشاعت یافتہ مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں مختلف عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی کو مرحوم کی عمر بھر کی کمائی اور سالہا سال کی سرگرم تلاش کا نتیجہ کہنا چاہیے۔

ایسی بے نظیر تالیف چاہتی ہے کہ مستقلاً ایک تفصیلی نظر اس پر ڈالی جائے۔ اسکو میں اپنے سے لائق تر حضرات کے لیے چھوڑتا ہوں۔ اُمید ہے کہ ناظرین عام طور پر دست شوق بڑھائیں گے۔

میرا تو خیال ہے کہ مرحوم کی ندرت تحریر و جدت طبع خود ہی ایک ایسی بڑی ممتاز حیثیت رکھتی ہیں جسکے لیے محض مہدی کا نام کافی ضمانت ہے۔

مجھ کو ہر حیثیت سے "مہدی" مرحوم کے فلسفیانہ خیالات سے اتفاق ہے، لیکن سرو ست فلسفۂ تمدن کے ساتھ ساتھ جہاں روحانیات سے بحث کی ہے اور علامہ شبلی کی جانب سے جو حریفانہ جواب دیا گیا ہے، اگرچہ آزاد (جدید) فلسفہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض کروں گا کہ مذہب کے دامن پر یقیناً ایک بدنما دھبہ ہے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"صوفیانہ ریاضت و اعمال جو قطعاً غیر فطری ہیں، بے وقت کی شہنائی سے کم نہیں۔ ہم مردوں میں ہسٹریا یعنی اختناق الرحم کے خواص پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ نہ تشنج اعصابی اور حرکات رقاصی کے لیے بوڑھے شبلی کہیں موزوں ہیں۔ اسلم اور اُن کے یاران طریقت کو یہ ناچ ناچنا (افعال صوفیانہ) مبارک۔ وہ کہیں یہ نہ کہیں گا،

اے کہ آگاہ نۂ حالت درویشاں را   تو چہ دانی کہ چہ سودا و سرست ایشاں را"

اگرچہ اس قسم کے خیالات "دور اولی" یا "ایام جوانی چناں کہ دانی" کے مصداق ہیں، لیکن مہدی جیسے ذمہ دار شخص کے لیے ایک معمولی سا تسامح بھی حسن ظن کی اجازت نہیں دیتا۔ اس بے محل گفتگو سے ناظرین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میرا مقصد مہدی مرحوم کے کسی مضمون پر نقد یا لازم کا ہے "حاشا وکلا" میری ہرگز یہ مراد نہیں۔ میرا منشا صرف اس امر کے انکشاف کا ہے کہ میرے سامنے وہ ایسے گروہ ...

کی حیثیت سے ہیں جو اپنے اپنے اصول سے متجاوز ہوکر دُور جا پڑے ہیں۔ ایک گروہ معاندین اسلام کا ہے اُن سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ دوسری وہ جماعت ہے جو روحانی کو دنیاوی ترقی کا متضاد خیال کرتی ہے۔ میرا حق اعتراض بیشک آخرالذکر پر ہے۔ خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تباہی و بربادی کا سب سے بڑا سبب ایسے پوچ خیالات کی جلوہ گستری ہے۔ ایک طبقہ نے اپنا مقصد یہ سمجھا ہے کہ ہمیں صرف دنیوی ترقی کرنا چاہیے اور روحانیات سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ معراج ترقی کے لیے ایک دوسرے کو مخالف تصور کرتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ انسان اسوقت تک دنیا کے جادۂ ترقی پر گام زن نہیں ہو سکتا، جب تک اصول بالا پر عامل اور کاربند ہوگا۔ صورت ثانیہ میں اگر اسلام کے عروج کا دار و مدار اور ذریعہ فلاح محض ریاضت ہی یا ترقی کا مدار صرف دولت و ثروت تو ہم کو بھی "مہدی" کے مذکورۂ بالا فلسفہ سے کلیتاً اتفاق ہوگا۔

لیکن یہ نہ صرف اُنکی نافہمی ہے بلکہ مذہب پر صریح الزام و بہتان۔ مذہب نے کہیں نہیں بتایا کہ مسلمانوں کا اصلی مقصد اور بہترین مشاغل علاوہ فرض نماز و روزہ کے صرف نوافل پڑھنا اور وظیفوں کا ورد رکھنا، عزلت گزینی کرنا، دنیا و ما فیہا سے بیخبر رہنا ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بُدن　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جو طبقہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی روحانی ارتقا کا ذمہ دار سمجھتا ہے اُس کا یہ خیال ہو کہ دنیوی عروج اور علوے جاہ، اطمینان نفس و نظافت روح کے متضاد و متغائر ہیں اور ایک دوسرے کے لیے سم قاتل!

میں آپ کو قرآن مجید کا حکم بتاؤں۔ اس کا وعدہ ہے کہ مسلمانوں کی روحانی ترقی کی ایک بدیہی علامت یہ ہے کہ وہ انتہائی دنیاوی ترقی کر سکیں اور پورے غالب ہو جائیں۔ ارشاد ہوتا ہے وعداللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا۔ (سورہ نور۔ آیت ۵۵)

(ترجمہ۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک بھی کرتے ہیں اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ انکو ملک کی خلافت (سلطنت) ضرور عطا کرے گا، جیسے اُن لوگوں کو خلافت عطا کی تھی جو اُن سے پہلے گذر چکے ہیں اور جس دین کو اُس نے اُنکے لیے پسند کیا ہے اسکو اُن کے لیے جمع کرے گا اور خوف د

خطرہ جو انکو لاحق ہے اسکے بعد انکو اسکے بدلہ میں امن دے گا۔

کسی نافہم کا اعتراض، اسلامی تصوف پر جان بوجھ کر یا نادانستہ، نکتہ چینی اور محض تعصب ہے۔ خود قائل کی قوت امتیاز اور حسن ادراک کا روشن نمونہ ہوگا، مہدی پر قطعاً اس کا الزام نہیں بلکہ یہی مرحوم کی معقول پسندی کا کافی ثبوت ہے اور صداقت و راستبازی کی بدیہی حجت۔ سچ تو یہ ہے کہ مرحوم کے ابتدائی زمانہ کے خیالات اور آخر عمر کے مضامین سے بے انتہا تفاوت ہے۔ افسوس ہے کہ مہدی مرحوم کی حیات نے وفا نہ کی ورنہ آپ دیکھتے کہ مذہبی حیثیت سے بھی وہ قوم کے پیشوا ہوتے، اور اپنے ہی قلم سے بہت سی غلط فہمیوں کی اصلاح کر جاتے۔

"مہدی مرحوم" سے جس قدر اردو ادب کو امیدیں تھیں، اسکے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں۔ مہدی کی جدت پسند طبیعت نے رنگینی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی کا اثر جب قبول کیا اسوقت نشأۃ ادبیہ کے لحاظ سے "مرحوم" کی عمر بیس برس سے اوپر نہ پہونچی تھی، افسوس کہ اپنی جگہ خالی کر گئے۔" افادات" میں یوں تو مجموعی حیثیت سے لطائف و ظرائف کے ساتھ علمی اور خصوصاً ادب و انشا کے ایسے ایسے نکتے مذکور ہیں جو ہر ادیب کے لیے وجہ تفاخر ہیں اور ظریف کے لیے سرمایۂ دلبستگی و نشاط، مگر خصوصیت کے ساتھ آخر کے مضامین، یعنی، ارتقاء ادب، شبلی سوسائٹی، حیدرآباد کی بزم ادب، حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک، مضامین سابق الوقت، سے بہت نمایاں امتیاز رکھتے ہیں۔ مہدی کی تحریریں جہاں اور ممتاز خصوصیات ہیں، وہاں ایک یہ بھی ہے کہ کسی مشکل سے مشکل اور اہم سے اہم مضمون کو روزمرہ کی گفتگو اور باتوں باتوں میں کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ جس پر ادب ناز کرتا ہے۔

انسانی ہستی کا جزو اعظم محبت و عشق ہے۔ اور انسان کے لیے محبت کا ہونا شاعرانہ نقطۂ خیال سے لازمی ہے، خواہ وہ محبت ملکی ہو یا قومی، حقیقی ہو یا مجازی۔ فطری شاعر، عام ازیں کہ نثر کا شاعر ہو یا نظم کا، وہ ہے جس میں مجازی حسن کے مشاہدہ اور حقیقی معنی کے ادراک کی قوت ہو۔ یہی کافی نہیں، بلکہ نیچر کی طرف سے ایسی قوت عطا کی گئی ہو جس کے ذریعہ سے وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو ایسے رنگ میں بیان کرے کہ سننے والوں کی آنکھوں میں اُس کا سماں بندھ جائے۔ جس سے سامع کے جذبات میں اشتعال، قلوب میں کشش پیدا ہو۔ اور الفاظ کی نشست و برخاست، بیان کی رنگینی سے اُس کے سامنے وہی تصویر آموجود ہو جسکو وہ خود دیکھتا ہے اور خود محسوس کرتا ہے

"مہدی" کے تمکنِ خیال، اُنکی بلند پروازی اور اچھوتے مضامین کی قدر کچھ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جو جوہر شناس اور علم دوست ہیں، اور جنھوں نے مرحوم کے تحقیق کمال اور قوت تحریر کا ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے، اگر میں اُسکے سمجھنے سے قاصر ہوں، تو "مہدی" کی جنبش قلم کی کوئی کوتاہی نہیں۔ نشتے نمونہ "مہدی" کے چند مضامین کے اقتباسات حوالۂ قلم کرتا ہوں۔ انکی پاکیزگی خیال و نفاست طبع کو ملاحظہ کیجیے اور لطفِ انشا کی داد دیجیے۔

"فلسفۂ حسن وعشق یونانیوں کے نقطۂ خیال سے"

"محبت کیا ہے؟ ایک مقناطیسی کشش ہے! عورت بغیر چاہنے والے کے رہ نہیں سکتی۔ اسکی نزاکتِ فطری چاہتی ہے کہ کسی کا سہارا ہو، یعنی دو ایک ہوکر رہیں۔ جہاں یہ خود جان دینے کو تیار رہے، یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس پر بھی مرتا ہو۔ دنیا میں یہ صرف محبت کے لیے آئی، اور گلے کا ہار بننے بنانے کے لیے۔ پھولوں کی سیج پر اسکی بہار دیکھیے کہ تھوڑی دیر کے لیے افکارِ دنیا بھلا کر رہتی ہے۔ عالمِ خیال عورت کی ایک وسیع دنیا ہے جہاں وہ اپنے جذبات کو فضائے بسیط میں چھوڑ دیتی ہے، اور جو باتیں دراصل اُسکو حاصل نہیں ہیں اُن کا بھی لطف اُٹھاکر رہتی ہے۔ اسکی ساری زندگی حسن وعشق کا فسانہ ہے۔ وہ خود کسی پر مرتی ہوگی یا کوئی اُس پر جان دیتا ہوگا! عورت پھنستی ذرا مشکل سے ہے، لیکن جہاں پھنسی اُس سے چھٹکارا پسند نہیں کرتی۔ اُسکی اصلی غایت زندگی دوسرے کی پھانس ہے، لیکن اُسے معلوم نہیں کہ جال ڈالنے سے پہلے وہ خود شکار ہو چکتی ہے۔"

"عورت کتنی ہی پاکیزہ وش ہو، اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اُسکی کافر ادائی کا شیدائی ہو۔ اس کی "فتوحات" اُس کا سرمایۂ نشاط ہیں جن سے اُسکے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتی۔ وہ داد کرکے رہے گی، کیونکہ یہ امر اُسکی فطرت میں داخل ہے! شانہ سے آنچل خود نہ گرائے، لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ یہ اُسکی فطرت کا راز ہے جسے وہ ہی خوب سمجھتی ہے! ڈھلکے ہوئے آنچل میں دراصل اُسے سینے کا اُبھار غائب کرنا منظور نہیں، بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر جاکر دیکھیے! محرم کا جائزہ نظری ایک طرح

کی دادِ حُسن ہے، جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لیکر رہے گی! اسی لیے جوانی کی آرائشوں میں وستانہ کی طرح چھپی ہوئی چیز اُسے دل سے پسند ہے جس میں یہ اُن سرکشوں کو قید رکھتی ہے جنھیں عورت کے "ارمان مجسم" کہیے!

"مئے دو آتشہ" وہ بھی شباب کی، جب کھچ کھچا کر قدرتی کنٹروں میں بھری ہو، تو کون ہے جو ان کیفِ مستی اور بیخودی کے "مجسموں" کی پرستش کا دلدادہ نہ ہوگا! ترکیب عناصر ہی تو ہے، ذرا فطرت کی شوخی دیکھیے گا! "فتنۂ قیامت زا" کے لیے گنجائش نکالی تو کہاں؟ ...."

"سچ کہیے عذرا، واقعی بہت حسین ہے؟ حسین تو ایک معمولی لفظ ہے۔ عورتیں سبھی اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں، لیکن میں اپنے تخیل میں اور دل سے اس قدر مختلف ہوں کہ صرف گوشت پوست سے کام نہیں چلتا۔ عذرا میری عذرا! تو نظم زندگی یعنی پوری شاعری ہے، اُسکی آواز کامل موسیقی، اُس کا تبسم میرا عنصر حیات ہے۔ وہ قطعاً تو بہ شکن ہے، توبہ شکن اور کافر ایمان! ناممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اُس پر قابو حاصل کرنے کو جی نہ چاہے، جہاں آنکھیں ملیں بس یہ معلوم ہوتا ہے تمام جسم میں بجلی دوڑ گئی، مدت ہوئی جب میں پہلی نظر میں شہید ہوا، دل سے آواز آئی "خدایا خیر"! جس کا نتیجہ آج تک بھگت رہا ہوں۔ مجھ پر اتنا سخت وار کبھی نہیں ہوا، کچھ تو ہے جس کی وجہ سے مٹا ہوا ہوں، میری آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن خود مجھے معلوم نہیں کس ادائے خاص کا دلدادہ ہوں پچھلی دفعہ بہت اُتری ہوئی حالت میں دیکھا پھر بھی ایک بات تھی۔ آج تک عالم تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے!

"کیا عذرا آپ کے دل کا راز جانتی ہے؟" ہاں ہاں خوب جانتی ہے کہ میں اُس پر مٹا ہوا ہوں لیکن تم کو ہندوستانی سوسائٹی کی حالت معلوم ہے۔ ہمارے ہاں جائز عشق کا پتہ نہیں، نہ جذبات قوت سے فعل میں آسکتے ہیں۔ یہ بات مہذب اقوام ہی میں ہے کہ عقد سے پہلے بیگانگی نہیں رہتی۔ اسکا افسوس ہے کہ میں نے عذرا کے لیے ایک نئی خلش پیدا کر دی اور ایک ایسی فضائے بسیط پیش نظر کر دی جس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ برسوں کے فتنۂ خوابیدہ کو چھینٹے دے دے کر جگانا صریحی ظلم تھا، حصولِ آرزو جسے شعرا اپنی اصطلاح میں "وصل" سمجھتے ہیں ایک طرح کی خود غرضی ہے۔ انتظار و ناکامی میں ایک لذت خاص ہے۔ اور چونکہ مجھ کو عذرا

کے ساتھ خالص روحانی تعلق ہے اس لیے گو وہ مجھے گلے کا ہار نہ بنا سکے تاہم میں اُسکی پرستش سے جیتے جی کبھی دست بردار نہ ہوسکوں گا۔ وقت گذر جائے گا قصے رہ جائیں گے" "خیر سے سن کیا ہوگا؟" "یہ نہ پوچھو - میں وہ پھل چاہتا ہوں جو ڈال میں ٹپکا اور ٹپکا پکایا ہو، ادھ کچرے یعنی ثمر خام کی ضرورت نہیں، نہ پال ڈالنے کی فرصت"

اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ کے ذیل میں سرسید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی کے تذکرے اور اُنکی تحریرات کی خصوصیات دیکھنے کے قابل ہیں اور افادہ و استفادہ کے لائق۔

تِلْكَ آثَارُنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا   فَانْظُرُوا بَعْدَنَا إِلَى الْآثَارِ

سید حبیب احمد

نہ ہو ذوقِ دید حاصل رہے اضطرار اپنا   دمِ حشر ذرّہ ذرّہ ہو نگاہ دار اپنا
نہ ہے قافلہ نہ منزل نہ کہیں دیار اپنا   سرِ رہگذر ہمیں ہیں کہ یہ ہے غبار اپنا
ادھر اپنی یہ تمنا کہ ہجومِ حشر کم ہو   اُدھر اُنکا یہ تقاضا کہو حالِ زار اپنا
یہ اُٹھائے کس نے فتنے یہ مٹا نشانِ تربت   یہ لگائی کس نے ٹھوکر وہ اُڑا غبار اپنا
کوئی اُسکو لاکھ چاہے وہ کسی سے کیا نباہے   جسے شوخیوں کے ہاتھوں نہ ہو اعتبار اپنا
ابھی زخمِ خونفشاں میں وہی دجلہ باریاں ہیں   ابھی ترجمانِ غم ہے دلِ داغدار اپنا
یہ اُمنگ کا زمانہ یہ شباب کی ترنگیں   کہ ہمیں ہے جان جوکھوں دلِ بیقرار اپنا
پسِ پردہ کہہ اُٹھے وہ کہ خدا ہی شرم رکھے   کسی راز کا مرقع نہ ہو حالِ زار اپنا
انھیں اچھی صورتوں میں کوئی شکل تھی قیامت   انھیں اُجڑی بستیوں میں کہیں تھا دیار اپنا
اُڑے پھول کچھ ہوا میں نہ ہوئی مراد حاصل   رہی شمع گردشوں میں نہ ملا مزار اپنا

ابھی تو یہ دوستی ہے وہ قسم دلائے نازش
پئیں کھل کے زاہدوں میں نہ رہے شمار اپنا

محمد مبین - نازش بدایونی

یورپ میں فن تاریخ کی تاریخ

تاریخ کیا ہے؟ گذشتہ واقعات کو صحت کے ساتھ بیان کرنے کا نام تاریخ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان واقعات میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جو مورخ کے زمانہ سے صدیوں قبل گذر چکے ہوتے ہیں، اس لیے اسکو مختلف مصنفین اور اشیا کی شہادت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس شہادت کی بنا پر جس قدر صحت اس خطا و نسیان کے پُتلہ انسان سے ممکن ہے وہ اس کو کام میں لاکر واقعات قلمبند کرتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شہادت کی صحت اور عدم صحت کا اندازہ کرنا اور شاہد کی ثقاہت اور غیر ثقاہت کا معلوم کرنا آسان کام نہیں۔ اور اسکے ساتھ ہی واقعات اور حادثات کو مورخ کے ذاتی خیالات اور معتقدات کی رنگ آمیزی سے پاک و صاف رکھنا بھی معمولی بات نہیں یہی وجہ ہے کہ بعض فلسفی تاریخ کے فن کو قابل اعتبار و لائق وثوق نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک تاریخ کذب و افترا کا ایک بھرا پیدا کنار ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صرف چند مورخین کی وجہ سے تاریخ کے اہم فن کو برباد کر دینا اور اسکو عبث سمجھنا بھی غلطی ہے۔ حقیقی مورخین کبھی اس کو گوارا نہیں کرتے کہ وہ واقعات کے بیان کرنے میں محض "زینت داستان" کے لیے اپنی طرف سے کچھ بڑھا یا گھٹا دیں۔ وہ شہادت کو جانچنے میں بہت احتیاط کرتے ہیں اور شاہد کے بیانات کو پرکھنے میں نہایت سختی برتتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ عام فطرت بشری کی وجہ سے اور نادانستہ طور پر اُن سے غلطیاں ہوں لیکن یہ غلطیاں دوسرے مصنفین دور کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح تاریخ ہر قدم پر پاکیزہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ گذشتہ واقعات کے بیان کرنے کا نام تاریخ ہے۔ لیکن ہماری اس تعریف میں وہ تمام منظوم افسانے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قرون متوسطہ میں اس قدر عام تھے۔ انکو کہاں تک تاریخ میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے افسانوں کو ہم تاریخ میں شامل نہیں کرسکتے کیونکہ ان میں "ضرورت شعری" کی وجہ سے بعض ایسی باتیں بھی داخل کرلی جاتی ہیں جن کو تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ان میں کوئی سچا اور واقعی واقعہ بیان کیا بھی جاتا ہے تو اُسکو اتنا بڑھا چڑھا کر

کہ اصلیت اُسکے حشو و زوائد میں گُم ہو جاتی ہے - اس قسم کے افسانوں کی اصلی غرض و غایت یہ ہوتی تھی کہ عوام الناس کو اُن کے بزرگوں کے کارنامے سنا کر اُبھارا جائے اور اس طرح اُنکی قوت حیات اور حمیت کو برقرار رکھا جائے - کیونکہ یہی قوت حیات اور حمیت اُن کی بقا میں مد ہوتی تھی - یہ غرض و غایت اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ شاعر اس میں رنگ آمیزی نہ کرے اور یہی رنگ آمیزی تاریخ کے لیے مہلک ہے - مختصر یہ کہ منظوم افسانوں کو کسی صورت سے بھی تاریخ کی صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی - لیکن ان منظوم افسانوں کے علاوہ منثور افسانے بھی ہوتے ہیں یعنی ناول، انکو بھی تاریخ نہیں کہا جا سکتا - کیونکہ اول تو ان میں بعض موہوم اور خیالی واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور اگر سچے واقعات ہوں بھی تب بھی منظوم افسانوں کی طرح ان میں بھی واقعات کی قطع و برید ہوتی ہے - اگر ان دونوں مستثنیات سے قطع نظر کر لی جائے تو ہماری تعریف زیادہ صحیح ہو جاتی ہے -

عملی طور پر تاریخ اور تخیل میں کوئی حد فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی - لیکن نظری حیثیت سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے - تاریخ کا دارو مدار تمام تر بیان کردہ واقعات کے متعلق ہمعصر شہادت پر ہوتا ہے - خواہ اس واقعہ کو ظہور پذیر ہوے کتنے ہی دن گذرے ہوں - تحریری دفاتر بارینہ تاریخ کے لیے لازمی نہیں کیونکہ اکثر اوقات روایت سے وہی کام نکل سکتا ہے اور اُس سے بھی نہایت قابل اعتبار شہادت مل سکتی ہے - لیکن بایں ہمہ روایت پر بھروسا کرنا نہایت خطرناک ہوتا ہے - کیونکہ انھیں روایات کے زیر اثر اور انسان کے خلاق تخیل کی رو سے تمام خرافات الاصنام پیدا ہوتے ہیں، اور وہم و حقیقت کے اس مقام اجتماع پر اصلیت اور غیر اصلیت میں امتیاز کرنا اکثر حالتوں میں ناممکن ہو جاتا ہے - اس کے علاوہ روایت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض اہم باتیں اور حوادث نظر انداز کر دیے گئے ہوں یا یہ کہ روایات میں واقعات کے بجاے اُسکے موہومہ اور مزعومہ نتائج بیان کر دیے گئے ہوں - اور اس لیے ممکن ہے کہ وہ روایت اصلیت سے بہت دُور جا پڑی ہو - پھر اسکے ساتھ ہی بعض روایات سینہ بسینہ متوارث چلی آتی ہیں اور انھیں پر تاریخ کو مبنی کیا جاتا ہے - لیکن اس قسم کی روایات کو تسلیم کرنے میں حقیقی تاریخ کے لیے اور بھی زیادہ خطرات ہیں - وجہ یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کو دو اشخاص مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور دونوں میں زمین و آسمان کا

فرق ہو سکتا ہے۔ انکی حالت اُن چار اندھوں کی سی ہو سکتی ہے جو ہاتھی کو دیکھنے گئے تھے، اور ہر ایک نے اپنے تجربہ کے مطابق ہاتھی کی شکل وصورت بیان کی تھی۔ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق معصر روایات اس قدر متفاوت ہو سکتی ہیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ گذشتہ واقعات کے متعلق ان روایات پر کہاں تک بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی ضمن میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ کے لیے یہی حقیقی واقعات کافی نہیں ہوتے۔ چین، مصر اور اشور کے متعلق بہت سے واقعات اور سنین بیان کیے جاتے ہیں جو غالبًا درست ہیں۔ مگر ان واقعات وسنین سے ہم ان ممالک کی تاریخ بیان نہیں کر سکتے۔ یہ بات کہ فلاں بادشاہ فلاں سنہ میں تخت نشیں ہوا، اپنی ہمسایہ سلطنتوں سے برسر پیکار رہا، اُن پر فتح حاصل کی اور فلاں سنہ میں مرگیا۔ سنین کے لحاظ سے اہم ہو تو ہو لیکن اسکو تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔ تاریخ کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ معاشری واقعات و ارتقا کو بیان کرے بلکہ اس کا ایک اہم وظیفہ یہ بھی ہے کہ ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرے اور سوسائٹی کے ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے اور اُس کی نشاۃ وحرکت کو خاص طور پر واضح کرے۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ واقعات، سنین اور بادشاہوں کے ناموں اور اُن کے شجرہ ہاے نسب کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ اس میں ان واقعات کی توجیہ، اُنکے نتائج کی توضیح، اور اُنکے اثرات کی توصیف ہوتی ہے۔ اس کارگاہ حیات میں ہر ایک واقعہ علت ومعلول کی سلک میں منسلک ہے اور اسی سلک کو معلوم کرنا تاریخ کا اہم وظیفہ ہے۔ اسکے بغیر تاریخ میں چمک پیدا نہیں ہوتی۔

اس تمام بحث سے ظاہر ہے کہ بلحاظ مکان وزمان تاریخ کی حدود بہت تنگ ہیں۔ اس کی وسعت انسان کے طول حیات اور زمین کے اُس حصہ کی نسبت سی ہوتی ہے جس پر انسان آباد ہے۔ ابتدائی اور وحشی انسان نے اپنی کوئی تاریخ نہیں چھوڑی کیونکہ اُس کی تمام تر طاقت وقت جہد للبقا میں صرف ہوتی تھی۔ اور اس لیے نہ اس کے پاس اتنا وقت تھا اور نہ طاقت کہ وہ اپنے آپ کو ایک مدنی انسان فرض کرے اور اپنے تجربات کو آیندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جائے۔ اسکے بعد جب یہ وحشی انسان کسی قدر مہذب ہوگیا تب بھی وہ تاریخ لکھنے کے قابل نہ ہوا اور نہ وہ اس کا مواد حاصل کر سکا۔ ہندوستان، مصر اور چین جیسے ممالک میں جہاں علی الترتیب ذاتوں کا

امتیاز، قدامت پسند دولت تخت ریاست ۔لہٰذا اور جابرانہ روایت کا دور دورہ رہا ہو معاشرتی ارتقا اس قدر سست ہوتا ہے کہ ان میں حرکت کے آثار بہت مشکل سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ وہ متحرک معلوم ہی نہیں ہوتے ۔ پوتا ایسے حالات میں زندگی بسر کرتا ہے جو دادا کے وقت کے حالات سے بہت کم مختلف ہوتے ہیں ۔ ایسی صورتوں میں تاریخ کا مواد آئے تو کہاں سے ۔ جمود اور سکون ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی طرف توجہ شاذ ہی منعطف ہو سکتی ہے ۔ ربع مسکون کے اکثر حصے نے اپنی تمام زندگی ایسے حالات میں گذاردی ہے جو گذشتہ حالات سے بہت کم یا بالکل مختلف نہ تھے ۔ چنانچہ مشرق کی داستانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فنون حرب و امن تو بہت ترقی کر گئے تھے لیکن اس ترقی سے تاریخ یا اس کے مواد کے جمع کرنے میں کوئی مدد نہ ملی ۔

اگر ہمارے یہ خیالات درست ہیں تو صرف ۴۰۰۰ برس قبل کی اصل اور صحیح معنوں میں تاریخ لکھی جاسکتی ہے ۔ شروعات اسکی عہد عتیق کی تاریخی کتابوں سے ہوتی ہے ۔ اسکے بعد یہودی تحریرات کا ذخیرہ تو ختم ہو گیا لیکن یونانیوں نے تاریخ کی تدوین میں مدد دی اور ان کے فوراً بعد رومن لوگوں کی جد و جہد شروع ہو جاتی ہے ۔ اور اس طرح اُس وقت سے لیکر اس وقت تک تاریخ کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا ۔ تاریخ کا مسکن بحر روم کے وہ سواحل رہے جو اگر نسل انسانی کی جائے پیدائش نہیں تو اوائل شباب اور ایام کہولت کی درس گاہ ضرور تھے ۔ اسکے بعد تہذیب بحیرۂ روم سے پھیل کر دور و دراز کے اُن جزائر اور براعظموں تک پہونچ گئی جو قدماء کو معلوم نہ تھے ۔ اور تہذیب کے طابق النعل بالنعل تاریخ بھی پھیلتی گئی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک وقت وہ آنے والا ہے جب تاریخ تمام کرۂ ارض پر حاوی ہو جائے گی ۔ مگر ہنوز دلی دور است ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ کا جو مواد مغرب اقصیٰ، جنوب اقصیٰ، اور مشرق اقصیٰ میں جمع ہو رہا ہے اسکی تمام وجہ وہ وراثت ہے جو ہم کو اسلاف سے ملی ہے اور وہ تہذیب ہے جو یادگار زمانہ مراکز روم، ایتھنز اور یروشلیم میں ضیا افگن ہوئی ۔

شروع شروع کی تاریخوں میں واقعات کی تحقیق و تفحص میں کوئی کد و اہتمام نہیں کیا گیا کیونکہ اُس وقت مورخ اور اُسکی تاریخ کا پڑھنے والا دونوں کے دونوں تربیت کے لحاظ سے اُس درجہ پر نہ پہونچے تھے جب صحت کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ شروع کی تاریخوں کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ

دلچسپ ہوں اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہوں - افزائش معلومات اور ازدیاد علم سے اُنکو سروکار نہ تھا - قاعدہ ہے کہ ایک دردانگیز یا مضحکہ خیز قصہ صحت واقعات کی وجہ سے پسند نہیں کیا جاتا - زمانۂ اولیں کے مصنفین کا تمام زور جدت تشابیہ پر ختم ہوتا تھا یا ان مکالمات کی رنگینیِ بیان پر جن میں خیر و شر کو بہت بڑا کرکے دکھایا جاتا تھا - یہ لوگ حقیقت و وہم کو ایسی نفاست اور عمدگی سے مخلوط کر دیتے تھے جیسے کہ ایک ڈراما نویس - بلکہ بعض اوقات تو یہ بھی ڈراما نویسوں کی طرح اپنا ایک ایسا ہیرو بنا لیتے تھے جس نے حیات قومی کے تحفظ میں اپنی جان نثار کردی - یا ان میں بھی ایسی جنگوں کا پُر زور الفاظ میں بیان ہوتا تھا جن میں ایک بیرونی رُوسیہ دشمن مار بھگا یا گیا ہو - ان دونوں حالتوں میں تخیل اور حسیات سے بہت کچھ مدد لی جاتی تھی - اور یہی وہ بات ہے جو آج کل کے فن تنقید کے خلاف ہے - لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کی تاریخوں میں جذبات کی مصوری نہایت خوبی سے کی جا سکتی ہے لیکن اسکو تاریخ سے کیا تعلق ہے - اس قسم کی تمام تاریخیں گویا نثر کی شاعری ہیں - ان میں تخیل کا عنصر غالب ہوتا ہے - ہیروڈوٹس اور فرائسرٹ کی تاریخیں اسی قبیل کی ہیں - لیکن اور اطراف میں علم کی ترقی اور رجز اور شہسواری کے کارناموں کی جگہ سیاسی خیالات کے تسلط کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قدیم طرز کو ہاتھ سے دیے بغیر تاریخ لکھنے کا ایک نہایت متین اور محققانہ طریقہ رائج ہو گیا - چنانچہ تھیوسی ڈائیڈیس اور ٹےسی ٹس کی تاریخات اسی رنگ میں ہیں -

تاریخ دو قسم کی ہوتی ہے - قدیم جس میں الفاظ کی گنگنا رہی ہوتی ہے اور جدید یا معاشرتی - قسم قدیم یونانیوں کی ایجاد تھی اور تقریباً زمانۂ حال تک مروج رہی - طرز تحریر کی تکمیل، پُر شکوہ اور دقیق الفاظ، اخلاقی تفکرات کا عمق اور سیاسی تاملات کی زود فہمی اسکی غایت ہوتی تھی تحقیق و تفحص کی طرف سے یہ ہمیشہ لاپروا ہوتی تھی - اس کے خیال میں یہ بات نہ آتی تھی کہ سوسائٹی ایک کل ہے من قبیل آلی - اسکے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ان واقعات کے پس پردہ جنکو وہ بیان کر رہے ہیں بعض عمیق اور متنوع قوتیں اپنا کام کر رہی ہیں - اسکے برخلاف جدید تاریخ میں طرز تحریر ایک ثانوی چیز ہے - نہ یہ اخلاقی تفکرات میں پھنستی ہے - اس میں تحقیق کا خاص خیال رکھا جاتا ہے - اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُسکو یہ معلوم ہے کہ سوسائٹی قوتوں کا ایک مجموعہ ہے جو مخصوص قوانین کے زیر اثر کام کرتی ہیں اور زندگی کی دوسری شکلوں کی طرح اس میں بھی ارتقا اور نشاۃ ہوتا رہتا ہے -

یونانی قسم قدیم کے موجد تھے - اور اس پر ان ہی کا بلا شرکت غیر قبضہ رہا - تناسب اور خوبی کے اسباب یہ انکی غیر معمولی دقتِ نظر، جو انکی ہر جگہ اور ہر صیغۂ علم ادب و دیگر فنون میں مددگار ہوئی، یہاں بھی انکی راہبر تھی - ڈراما کے تجربی مضامین نے ایس کی لس، سوفوکلیس اور ارسٹوفینیس پیدا کیے - اسی طرح تاریخ میں بھی متعدد وے چند متقدمین نے ہیرو ڈوٹس کو تاریخ لکھنا سکھایا - عجیب بات یہ ہے کہ تاریخ کو ایسے شخص نے سنبھالا جس کے برابر آج تک کوئی شخص نہ نکلا - تھیوسی ڈائیڈیس کی پے لپ نی شئین جنگوں کی تاریخ اس وقت تک تمام تاریخوں کا نمونہ ہے - مگر اس وقت تک کوئی مورخ اس سے بڑھ نہ سکا - علم اور فن میں فرق صرف اسی قدر ہے کہ ایک علمی تصنیف کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو بعد میں ہو سکتا ہے کہ کوئی تصنیف اس سے بڑھ جائے - مگر فن میں تکمیل کے بعد کوئی شخص اس پر اضافہ نہیں کر سکتا - تھیوسی ڈائیڈیس کی تصنیف اسی قسم کی ہے - یونانیوں کے قائم کردہ اصول میں گذشتہ صدی کے اختتام اور موجودہ کے شروع تک کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ ہوا - چنانچہ تھیوسی ڈائیڈیس سے لے کر گبن تک تمام تاریخیں اسی یونانی ڈھنگ پر لکھی گئی ہیں -

تاریخ کی تاریخ ابھی لکھی جانے والی ہے - اگر اس قسم کا کام ہو گیا تو اس کا سب سے زیادہ قابلِ ستایش کام بعض مصنفین کی تنقید ہی نہ ہوگا بلکہ انکے قرون اور انکے اجتماعی ماحول کا مقابلہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا - اسی سے ہم کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان چیزوں نے انکی تاریخی تحریرات کی ماہیت پر کیا اثر کیا - مثلاً یہ بات قابلِ غور ہے کہ تاریخ شعر و سخن اور علم و فلسفہ سے بھی زیادہ عوام کی آزاد خیالی اور حریت پر مبنی ہے - یہ تمام علوم ایک مستبد حکومت کے ماتحت پھلے اور پھولے ہیں مگر تاریخ کے لیے یہ ایک سم قاتل ہے - اسکے علاوہ بعض قرون مورخین کے لیے اچھے ہوتے ہیں جس طرح بعض لڑائیاں سپاہیوں کے لیے اچھی ہوتی ہیں - یونانی تاریخ کو ہم خواہ کتنا ہی اعلیٰ مرتبہ کیوں نہ دیں مگر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ انکو غیر معمولی سہولتیں میسر تھیں - چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح کے یونان کی سیاسی حالت مورخین کے لیے بہت برانگیختہ کرنے والی تھی - چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا غیر معمولی مجموعہ، انکی سیاسی زندگی، انکی لڑائیاں اور ان کا اتحاد و انقلاب اس قدر دلچسپ کوائف تھے کہ بعد میں کسی کو خواب میں بھی نظر نہ آئے - اسی طرح

یونانی مورخین کے لیے یونانی سنگتراشوں کی طرح حالات موافق تھے۔

اگر کوئی قوم یونانیوں کا مقابلہ کرسکتی ہے تو وہ رومن قوم تھی۔ اگرچہ یہ قوم ہر جگہ یونانیوں کی نقل کرتی تھی اور بہت بھدے طریقہ سے نقل کرتی تھی۔ مگر تاریخ میں اگر یہ لوگ یونانیوں پر سبقت نہیں لے گئے تو اُنکے ہمرتبہ تو ضرور ہوگئے۔ مگر اسکی وجہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ اُنکی قومی زندگی اکثر صورتوں میں یونانیوں کی زندگی سے بھی زیادہ اعلیٰ رتبہ رکھتی تھی۔ قرون متوسطہ کے مطالعہ سے مورخ تاریخ پر اجتماعی ماحول کے اثر کو بخوبی واضح کرسکتا ہے۔ اُس زمانہ کی تمام تاریخی درسگاہوں کے متعلق کافی وجوہ مل سکتے ہیں کہ انھوں نے یہ خاص صورت کیوں اختیار کی۔ فرائسرٹ کی تاریخی تصانیف سے صاف ظاہر ہے کہ ایک بردست تاریخی تصنیف کے لیے موقعہ اور دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرائسرٹ کی تصانیف محض اتفاقیہ نہیں۔ جنگ صد سالہ کی انگلستان اور فرانس کے درمیان پہلی لڑائیاں، ڈٹیس بارسل کی سرکردگی میں جمہور پیرس کا عظیم الشان مگر لاحاصل خروج، اور فرانس کے پہلے جنرل کا عمل دخل ایسی باتیں تھیں جنھوں نے فرائسرٹ کے دماغ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اگرچہ ان تمام حالات کے باوجود فرائسرٹ میں بہت سی کمزوریاں باقی رہ گئیں۔ اسی طرح پندرہویں صدی میں نظام الاقطاع اور شہنشاہیت کے درمیان تنازع کے لیے کامنیس سب سے زیادہ اہل تھا۔

سولھویں صدی کے پرآشوب زمانہ میں مورخین کی بہت کثرت ہے۔ اس کے بعد عجیب بات یہ ہے کہ ڈیڑھ سو برس تک بر اعظم یورپ پر تاریخ کا نام لیوا تک باقی نہ رہا۔ سی سالہ اور ہفت سالہ جنگوں کے مابین کوئی یادگار مورخ پیدا نہ ہوا۔ اگرچہ میزارے کا نام اب تک باقی ہے۔ مگر اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا طرز تحریر عجیب و غریب ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ یہ زمانہ لوئی چہاردہم کا ہے جب علم ادب اور فلسفہ زوروں پر تھا اور فرانسیسی سائنس کی بنیاد پڑی تھی۔ مگر کیتھولک اور شہنشاہی ردعمل موافق نہ آیا۔ اس زمانے میں فرانس میں بھی تاریخ لکھی جارہی تھی مگر یہ اس قابل نہ تھی کہ سو برس تک کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی دیکھے۔ اسکے برخلاف باغی اور انقلاب پسند انگلستان نے کلیرنڈن اور برنٹ پیدا کیے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی پر نظر ڈالنے سے ہمارے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

تاریخ کی قسم قدیم گویا نقاشی کی ایک صنف تھی اور نقاشی میں سوائے مطابقت اصل کے تمام خوبیاں ہوتی ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ قدماء مصنفین رنگوں کی چمک اور تصاویر کی اثر آفرینی کے

مقابلہ میں حقیقت کی بہت کم پرواہ کرتے تھے - قدما، مورخین قدما، نقاشین کی طرح تھے - دونوں اس کی پرواہ نہ کرتے تھے کہ جو کچھ وہ تیار کر رہے ہیں وہ اصل کے کہاں تک مطابق ہے - ان کی تمام احتیاط اس میں صرف ہوتی تھی کہ ان کی تصاویر دلکش ہوں، خوبصورت ہوں، ان کے تمام رنگ عجیب و غریب ہوں، ان کا خاکہ نایاب ہو خواہ وہ اس کوشش میں اصلیت سے کتنی ہی دور نہ جا پڑیں - اس پر غضب یہ کہ وہ لوگ تحقیق و تفحص سے متنفر تھے - اور یہ تمام باتیں مل کر آج کل کے لوگوں کے لیے بہت نفرت انگیز ہو جاتی ہیں - آج کل تو تاریخی شہادت کی جانچ میں اس قدر سختی اور احتیاط کی جاتی ہو جتنی ایک کمرۂ عدالت میں - اس میں شک نہیں کہ یونانیوں میں یہ تمام عیوب تھے مگر انکے ساتھ ہی ان میں ہنر بھی تھے - وہ تحقیق و تفحص سے گریزاں سہی مگر وہ کشادہ دل تھے، ہمدرد تھے اور نرم دل تھے - انکی تمام تصانیف عوام کے لیے ہوتی تھیں نہ کہ ماہرین کے لیے ان کا طریقہ اگرچہ بہت بے پروایانہ تھا مگر ان کو اپنی لیاقت کے نمود کی ضرورت نہ تھی -

کومٹ نے سچ کہا ہے کہ اہم تاریخی واقعات کسی تحقیق و تفحص کے رہین منت نہیں ہوتے - تاریخ میں کتابی پہلو (جس میں ہر واقعہ کی صفحہ و نشان کے حوالہ سے تصدیق کی ضرورت پڑتی ہے) کے علاوہ اخلاقی اور نفسیاتی پہلو بھی ہوتا ہے - صفحہ و باب کا حوالہ اگرچہ اہم ہے مگر بعض اوقات یہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہو جاتا ہے - اسناد کا پشتارہ ایک غبی آدمی کے کیرکٹر کے جانچنے میں مدد نہیں دے سکتا - وہ اسکو اس قابل نہیں بناتا کہ ایک تاریخی واقعہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرے قس علیٰ ہذا - ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ قدما کی کمزوری کا علاج متاخرین نے کیا اور متاخرین کی کمزوریاں متقدمین کی قوت تھی - متقدمین کی غرض و غایت صرف کیرکٹر کا بیان کرنا تھی - اور اس میں وہ کامیاب ہو گئے - جہاں ان میں بہت سے خفیف اسقام ہیں وہاں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ قیافہ سے کیرکٹر کے میزات خصوصی تک پہونچ جاتے ہیں اور اس قدر کامیاب ہوتے ہیں کہ آج کل کی تحقیقات بھی اسکو بدل نہیں سکتی - مثلاً بیکن نے ہنری ہفتم کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اس وقت تک جوں کی توں باقی ہے - حالانکہ یہ کتاب اس نے صرف چار ماہ میں لکھی اور اسکے پاس وہ ذرائع علم نہ تھے جو اسوقت موجود ہیں - آج کل باوصف اسکے کہ بہت سی معلومات فراہم ہو گئی ہیں جنکے مقابلہ میں اس وقت کی معلومات کچھ حقیقت نہیں رکھتیں پھر بھی بیکن کی تصویر میں کچھ تغیر و تبدل نہ ہو سکا -

متقدمین مورخین نے بعض موہوم اور من گھڑت تقاریر بھی اپنی تاریخوں میں شامل کرلی ہیں۔ مگر اس کی بھی کوئی وجہ تھی۔ اگرچہ زمانہ حال کے ناقدین اس کو بہت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میکالے کا خیال ہے کہ یہ رویہ بیہودہ تھا اور یہ کہ اگر کوئی انگریز مصنف آج ایسا کرے تو خاصہ مضحکہ بن جائے۔ مگر میکاولی اور گروشی (ر) اور بیکن جیسے دماغ اس پر کاربند ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اس میں صرف طریق اظہار کا فرق ہے۔ آج کل کے مصنف اسکو مسلسل دلائل قاطعہ، اسناد، حوالجات اور ذیلی حواشی کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو اس میں شبہ نہیں کہ بہت اچھا طریقہ ہے مگر ذرا سکون اور اطمینان کے ساتھ متقدمین کے طریقہ کے متعلق بھی غور کرنا چاہیے۔ بیکن نے ہنری ہفتم کی تاریخ میں جو تقاریر شامل کی ہیں اُن کے متعلق اسپیڈنگ کہتا ہے:-

"میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جدید طریقہ پر لکھی ہوئی تاریخ کی نسبت قدیم طریقہ پر لکھی ہوئی تاریخ سے ناظرین کو غلط فہمی کا کم اندیشہ ہے اگرچہ مقدم الذکر طریقہ زیادہ محتاط طریقہ ہے۔ زمانۂ ماضی کی تاریخیں اس قدر نامکمل ہیں کہ ایک ذہین سے ذہین مورخ بھی انکی بناپر اُس زمانہ کی ایسی مسلسل تاریخ بیان نہیں کرسکتا جس میں تخیلات، استدلالات اور غیر مستند روایات کو دخل نہ ہو۔ بعض اوقات وہ خود اپنے قیاسات اور تخیلات سے مدد لیتا ہے اور کبھی دوسروں کے قیاسات و تخیلات سے۔ لیکن ان کا ہونا لازمی ہے۔ قدیم طریقہ میں یہ خوبی تو ہے کہ تحریفات بالکل واضح ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے جدید طریقہ میں ارادی اور صاف تحریف کو برا لکھکر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ جو کچھ پیش نظر ہے وہ خالص واقعات ہیں۔ حالانکہ اصل میں ایسے حالات مصنف خود اپنے یا دوسروں کے قیاسات سے بیان کرتا ہے گویا وہ خود ایک تقریر کر رہا ہے۔" (بیکن جلد ششم صفحہ ۷۲)

اس قسم کی موہوم اور من گھڑت تقاریر کو اپنی تاریخوں میں شامل کرنے سے متقدمین اور اُن کے متاخرین نقالوں کی اصلی توجیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اُنکے تعلیمات کو بیان کرنے کا طریقہ تھا۔ انھوں نے عینی اور تمثیلی طریق کو اختیار کیا ہم آج کل مجرد اور غیر مشخص شکل میں ان ہی کو پیش کرتے ہیں اور بقول اسپیڈنگ ان کا طریقہ اتنا ہی درست ہے جتنا کہ ہمارا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قدیم قسم کس طرح جدید میں تبدیل ہوگئی۔

سترہویں صدی پوری اور اٹھارویں کے نصف اول کی تاریخ کی کمزوری اور بےچیزی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم اُس کا مقابلہ معصر ادب سے کرتے ہیں۔ فرانس میں لوئی چہاردہم اور انگلستان میں آین کے عہد حکومت میں کوئی مورخ پیدا نہ ہوا۔ بوسے کی تاریخ عالم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کیونکہ یہ تاریخ ہونے کے بجاے ایک لمبا چوڑا وعظ ہے۔ حالت یہاں تک گر گئی تھی کہ اُس زمانہ کے لوگ تاریخ کو حقیر سمجھنے لگے تھے۔ کیونکہ فرو تر لوگوں نے فروتر نقطہ نظر (یا کسی اور نقطہ نظر) سے تاریخیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ ڈاکٹر جانسن نے تو کھلم کھلا اس کا مذاق اُڑایا ہے۔ پھر بھی اس زمانہ میں بہت سے ماہرین علوم قدیمہ تھے۔ میڈاکس اور آلمر انگلستان میں، تو اکری اور مابلان فرانس میں، اور لائبنٹز جرمنی میں۔ مگر تاریخ بالکل بے دست و پا تھی۔ ہمارے نقطہ نظر سے بھی یہ جاہلانہ اور کورانہ تھی۔ اول تو یہ واضح ترین واقعات کو بھی دیکھ نہ سکتی تھی اور جو کچھ دیکھتی بھی تھی اُسکو توڑ مروڑ کر بالکل مسخ کر دیتی تھی۔ یہ حالت صرف معمولی اور فروتر درجہ کے مورخین ہی کی نہ تھی بلکہ حیرت تو یہ تھی کہ ہیوم اور رابرٹسن، گبن اور والٹیر جیسے عالی دماغ مورخ زمانہ ماضی کو اس قدر غلط سمجھتے ہیں کہ یہ غلط فہمی بذات خود ایک دلچسپ تاریخی واقعہ بن گئی ہے۔ اس سے مصنفین پر کوئی دھبہ نہیں آتا بلکہ بذاتہ قابل غور ہے۔

جب زمانہ حال کے ناقدین اٹھارویں صدی کے مورخین کو قرون متوسطہ اور ازمنہ گذشتہ کی غلط فہمی پر لعنت ملامت کرتے ہیں تو وہ ان لوگوں کی تاریخی حالت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں تاریخ لکھنا اس سے پہلے تاریخ لکھنے سے بالکل مختلف ہو چکا تھا۔ یہ اختلاف مختلف حیثیتوں سے تھا۔ سب سے پہلے تاریخی نگاہ وا پسیں کی تطویل نے تاریخی تحقیقات کی حدود کو بہت وسیع کر دیا تھا۔ اٹھارویں صدی کے ایک مصنف کو زمانہ گذشتہ کے اتنے ہی حصہ پر غور کرنا پڑتا تھا جتنا کہ ہمکو۔ ان کا یہی کام کچھ کم قابل تعریف نہیں کہ انھوں نے اس وسیع جنگل کو چھاننے کی ہمت کی اگرچہ ان کے پاس اسکے لیے کافی زاد راہ نہ ہوتا۔ بعض اوقات یہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ متقدمین اور اٹھارویں صدی تک متاخرین ہمیشہ معصر تاریخ لکھتے تھے یا تاہم سے زائد ماضی قریب کی۔ ہیرو ڈوٹس وغیرہ کی تاریخیں اس کی شاہد ہیں۔ معصر تاریخ میں مورخ کی اعلیٰ ترین خصوصیات آسکتی ہیں۔ مگر اس میں ایک بات پیدا نہیں ہو سکتی ہے اور ان کو

سکی ضرورت ہوتی ہے یعنی یہ کہ وہ زمانہ گذشتہ کو بنظر امعان نہیں دیکھ سکتے جو اُنسے تہذیب و تربیت، سیاسیات اور مذہب میں مختلف تھا۔ پھر بھی اٹھارویں صدی کے لوگوں نے اس خطرناک کام کو بڑی ہمت اور جوانمردی سے شروع کیا۔ اور اگر اس میں اُنکو ناکامی ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ اس میں کامیاب ہونا معجزہ ہوتا۔

آج کل ارتقا کے خیالات ہمارے دماغوں میں اس مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہوگئے ہیں کہ ہم سوسائٹی کو اسی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ مگر یہ خیالات اٹھارویں صدی میں ناپید تھے۔ انکی شروعات انیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ لہذا ظاہر ہو کہ اٹھارویں صدی کے لوگوں کو اپنے زمانہ کے لوگوں اور سوسائٹی اور زمانہ گذشتہ کے لوگوں اور سوسائٹی میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ اور اگر ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ اُن سے مختلف تھے تو یہ اُنکو وحشی، کندۂ ناتراش اور اس لیے ناقابل اعتنا سمجھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قرون ماضیہ کے لوگوں کا ذکر نہایت ہی حقارت سے کرتے ہیں جو ہمارے لیے بہت دلچسپ ہے۔ اس بات پر ہر شخص کا اتفاق تھا۔ ڈاکٹر جانسن کا قول تھا

"ڈیاس سے تھے نیس کے زمانہ کے باشندگان اتینھز وحشی اور جانور تھے"

بعینہ یہی خیال والٹیر کا تھا۔ اس قسم کے خیالات ہوتے ہوے زمانۂ گذشتہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا ناممکن تھا۔ اور حق تو یہ ہے کہ اُنھوں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی۔ اُنھوں نے بالاکثر اپنے زمانہ کو سب سے زیادہ قابل تحسین اور لائق احترام تسلیم کر لیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن ہی کا زمانہ محاسن اخلاق کا سرمایہ دار تھا۔ زمانۂ ماضی کو وہ جرم، جہالت، حماقت، اور مذہبی جوش کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ رابرٹسن نے جنگہاے صلیبی کا ذکر اسی طرح کیا ہے۔ اُن کی کبھی یہ خواہش ہی نہ ہوئی کہ اصلیت کو معلوم کریں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تاریخ (جن معنوں میں ہم اُسکو استعمال کر رہے ہیں) وہ لکھ ہی نہ سکتے تھے۔ اس پر اضافہ یہ ہوا کہ اخلاقی تعصبات نے قرون ماضیہ کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ لوگ اسی کو ترجیح دیتے رہے اور اُمید کرتے رہے کہ وہ دس سے کچھ بہتر بن جائیں گے۔ اُنھوں نے قرون ماضیہ کو ہمیشہ حال کے رنگ میں دکھایا۔ اس باب میں فرانسیسی مصنفین نے انگریزی مصنفین کو بھی مات کر دیا ہے۔ اُنکے لیے لوئی چہاردہم بادشاہ کا نمونہ تھا۔ اور اس لیے ہر ایک بادشاہ کم و بیش اُسکے مشابہ ہونے لگا۔

اور ڈوپلے نے تو کمال ہی کر دیا۔ کلاڈس کی رسم اصطباغ کا ذکر کرتے ہوئے وہ وحشی افرنجیوں کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے :-

یہ لوگ بلند بالا تھے۔ ان کا طریق نشست و برخاست مرعوب کن تھا۔ ان کا لباس مطلا و مذہب اور عطریات میں بسا ہوا تھا، اور قدیم فرانسیسیوں کی رسم کے مطابق انکے سروں پر گھونگھر والے اور لمبے بالوں کی ایک ٹوپی تھی جس میں سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔"

ایک بڑے شخص اور ایک بڑے زمانہ کو (جو موجودہ زمانہ سے مختلف تھا) انھوں نے سمجھنے میں اور بھی فاش غلطیاں کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اور مذہبی واقعات کی ترجمانی میں دیدہ و دانستہ غلطی کی گئی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس بات کا کہ ان میں کافی تربیت نہ تھی۔

صرف یہی تعصبات ان مورخین کے سدراہ نہ تھے۔ انکے پاس معلومات کا ذخیرہ بھی بہت کم تھا۔ سوسائٹی کے متعلق اُن خیالات کا تو ذکر ہی کیا جو آج کل ہمارے ذہن میں ہیں۔ ان کے پاس ماضی کے مشاہدہ کے لیے وہ ذرائع و وسائل بھی نہ تھے جو بعد میں منکشف ہوئے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ معاشیات نے تاریخ کے بعض مبہم مسائل پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں کے پاس یہ علم بھی نہ تھا اور اس میں یقیناً وہ بالکل بے قصور ہیں۔ آن ٹسک جیسا طباع اور عالی دماغ شخص روم کے زوال کی ایک وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ سلطنت کی تقسیم کے وقت تمام سونا اور چاندی قسطنطنیہ چلا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ "دولت اقوام" کے متعلق صحیح خیالات کی اہمیت کیا ہے۔ لیکن اُس وقت یہ قیمتی دھاتیں دولت کا ذریعۂ وحید یا بڑا ذریعہ سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ اس نے اسی خیال کو اپنی تاریخ میں جگہ دیدی۔ گبن نے زوال روم کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ سپاہی زرہ بکتر استعمال کرنے سے کتراتے تھے۔ وہ لکھتا ہے :-

"سپاہی اپنے زرہ و بکتر کے وزنی ہونے کی شکایت کرتے تھے اور اسی وجہ سے اُن کو استعمال بھی بہت کم کرتے تھے۔ اسی طرح سے انھوں نے بارہا خود و دل اور جوشنوں کو استعمال نہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اسلاف کے وزنی اسلحہ اُنکے

کمزور ہاتھوں سے چھوٹ گئے"۔ اُن کی اس بزدلانہ سستی کو سلطنت کے زوال کی ایک وجہ قرار دیا جاسکتا ہے" (باب ۲۷)

مآن ٹسک اور گبن کی عظمت میں کون شبہہ کر سکتا ہے۔ مگر یہ لوگ بھی اسی قسم کی بیہودگیوں میں پڑ گئے تھے۔ وجہ یہ بھی کہ ان کے وقت تک "دولتِ اقوام" اور فوجی طاقت کے اصلی ذرائع معلوم نہ ہوے تھے۔ اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں۔ ان لوگوں کی توجیہات ایسی ہوتی تھیں جیسے ہم زلزلہ کی توجیہہ سطح زمین کو کھرچنے سے کریں۔ اُن لوگوں کو اُن طاقتوں کا خیال بھی نہ آسکتا تھا جو واقعات کے پس پردہ عمل کر رہی تھیں۔

لیکن خیالات اور علم میں بہت بڑا انقلاب ہونے والا تھا۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں رومنٹیک تحریک نے تاریخ، فلسفہ، سیاسیات اور مذہب سب کی قلب ماہیت کر دی۔ فرانس میں روسو کی بغاوت شدید نے انگلستان اور جرمنی کے ادبیات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اسکی بدولت ایسے ایسے خیالات رونما ہوے جو مروجہ خیالات سے بالکل مختلف تھے۔ آدمیوں کے مذاق و مزاج دونوں نہایت سرعت کے ساتھ بدل گئے۔ اٹھارویں صدی کا فلسفہ جو اس وقت تک بہت بلند پایہ اور محفوظ سمجھا جاتا تھا مسترد کر دیا گیا۔ لاک، ہیوم، وَوِدو اور والیٹر الگ کر دیے گئے اور ان کی جگہ دوسرے کھڑے ہوگئے۔ یہ تمام تحریک اُس وقت رجعی اور پایان کار لاحاصل اگرچہ کامیاب معلوم ہوتی تھی۔ مگر اسکے ظہور کی وجوہ تھیں اور فوائد بھی تھے۔ ان ہی فوائد میں وہ خدمت تھی جو اُس نے تاریخ کی کی۔ چونکہ اس تحریک کا اصول یہ تھا کہ جن اشیا کی ان کے اسلاف نے قدر کی تھی اُن کو اُنھوں نے دوبارہ زندہ کیا۔ اس طرح زمانۂ ماضی بھی قابل احترام ہوگیا۔ اور بالخصوص قرون متوسطہ جن کو بے فائدہ اس قدر بُرا کہا جاتا تھا۔ جس جگہ لوگوں کو سوائے وحشت، توہم اور جہالت کے کچھ اور نظر نہ آتا تھا اُنھوں نے اور اُنکی اولاد نے اُسی جگہ حسن، اتقا اور خوبی کو موجود پایا۔ اسکے بعد سر والٹر اسکاٹ نے تو اس رَو کو سمندر کی تیزی دیدی۔ قرونِ متوسطہ کا ہمدردانہ اور شوقیہ مطالعہ شروع ہوگیا۔ جب لوگوں نے گیارھویں صدی کے پوپوں اور شاہنشاہوں، اُنکی رہبانیت اور اُنکے نظام الاقطاع اور مدرسیت کا مطالعہ کیا اور اُنکو اچھی طرح سمجھ گئے تو اُن کی ہمتیں اور بڑھ گئیں اور تاریخی میدان میں وہ اور ثابت قدم ہوگئے۔ غرض رفتہ رفتہ

انسان کی تمام گذشتہ زندگی قابل مطالعہ سمجھی جانے لگی۔

اس کے روش بدوش علم میں بھی تغیر پیدا ہوا۔ مدت سے موجودہ دنیا کی روزافزوں دولت اور بیش از بیش صنعت و حرفت کے مسائل لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ چلے تھے۔ آدم اسمتھ نے متقدمین کے کام سے مدد لیکر ان میں اضافے کیے۔ اور معاشیات کو ایک نئی اور مثبت بنیاد پر کھڑا کر دیا۔ گر اس کی یہ تحریک صرف اسی علم تک محدود نہ رہی۔ اصل میں اُس وقت معاشیات کی تاریخی خدمت کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا گیا۔ زمانہ حال کی دولت کے ذرائع کی تحقیقات سے زمانۂ گذشتہ کی حکومتوں کے ترقی اور اُن کے زوال کی توجیہ کی گئی۔ اور اس طرح عجیب و غریب نتائج حاصل ہوئے جو غیر مترقبہ ہونے کی وجہ سے نہایت محیر العقول تھے۔ اس وقت تک دولت کو ابتذال کا باعث سمجھا جاتا تھا، اور عیش تو ہمیشہ کا بدنام ہے ہی۔ فقر اتقا کا موجب تھا۔ زمانۂ اولین کے لوگ اس وجہ سے متقی تھے کہ وہ غریب تھے۔ بت پرست فلسفیوں اور عیسائی راہبوں نے دولت کو بُرا کہا، معاشیات نے اس شبہہ کو دُور کیا۔ اُس نے دکھایا کہ حکومت کی دولت کا ایک خاص فرقہ کی امارت سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی زمانہ میں کسی قوم کو بھی دولت کی بہتات سے گزند نہیں پہونچا۔ معدودے چند لوگوں کی امارت عوام کے فقر کی مرادف ہے۔ مختصر یہ کہ تمام خرابی تقسیم دولت کے غیر مساوی ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں معاشیات کی یہ موٹی باتیں مستبعد اور معمّا نظر آتی تھیں اور جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اُس زمانہ کے مورخ انکی اہمیت سے ناواقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی حکومت کے زوال کے اسباب کی تلاش کرتے ہیں، تو وہ یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُس نے اپنا تمام سونا اور چاندی گم کر دیا، یا یہ کہ عیاشی کا کا دور دورہ ہو گیا تھا، یا یہ کہ فوج کی جرأت و ہمت زوال پذیر ہو گئی تھی۔ اُن کو اس بات کا خیال بھی نہ آتا تھا کہ اسکی بڑی اور بعض اوقات اکلی کھلی وجہ عوام کی غربت ہے۔ آدم سمتھ کی یہ تصنیف تمام گذشتہ واقعات پر ریویو ہے۔ جس میں معاشیات سے مدد لی گئی ہے۔ اس نے روم کے زوال کو اٹلی میں زراعت کے زوال کا معلول قرار دیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

"لوگوں میں اناج کے مفت یا تھوڑی قیمت پر تقسیم کرنے سے اٹلی کے اُس حصہ کی کاشتکاری کو ضرور نقصان پہونچا ہوگا جو روم کے قریب قریب واقع ہے۔ یہ اناج مفتوحہ علاقوں سے آتا تھا۔

ان علاقوں میں سے اکثر محصول کی بجائے اپنی تمام پیداوار کا دسواں حصہ مقررہ قیمت پر سالانہ دیا کرتے تھے - اناج کی قیمت کم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ روم کی منڈی میں اُس اناج کی قیمت کم ہو گئی ہوگی جو سسلی یا روم کے قدیم علاقہ سے آتا تھا اور اس طرح وہاں کی کاشتکاری کو بھی ضرور ضرر پہونچا ہوگا"

یہ اصلی علت تھی - اور جب بعد میں لوگوں نے اس پر غور کیا تو عجیب عجیب باتیں معلوم ہوئیں -

اخلاقی اور عقلی طاقتوں کو، جو تاریخ کے متعلق نئے نئے خیالات پیدا کر رہی تھیں، انقلاب فرنساوی سے اور بھی مدد ملی - اس طوفان نے سوسائٹی کی تمام پس پردہ طاقتوں کو ظاہر کر دیا جو اَب تک خوابیدہ تھیں اور جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں - لوگوں نے اس قعر کے عمق کو دیکھا جو وہ بحالت جہالت طے کر چکے تھے اور انسانی سوسائٹی، اور تاریخ کے متعلق ان کے خیالات میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی؛ تاریخ کو ایک نئی روشنی میں دیکھا جانے لگا - ۱۸۱۵ء کی صلح کے بعد تاریخی مطالعہ نہایت شدت اور وسعت کے ساتھ شروع ہوا؛ اُن لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ تمام تاریخیں نظر بازدید کی محتاج ہیں، وہ سب کی سب نئے نقطہ ہاے نظر، زیادہ علم، عمیق تر نظر اور ہمدردانہ طریق سے ازسر نو لکھی جانی چاہیئے - اس تحریک میں فرانسیسیوں نے مسابقت کی - اور اپنی مخصوص پُرشکوہ طرز تحریر کو اپنا مددگار بنایا - لیکن چونکہ انقلاب کو اُنھوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور اسکے نفع و نقصان سے وہی زیادہ متاثر ہوے تھے اس لیئے اُن ہی کی آنکھیں سب سے زیادہ کھلیں - بازیافت کے زمانے میں ماہرین کے ایک گروہ نے تاریخ کو اتنا قابل احترام بنا دیا کہ آج تک اسکو کبھی نصیب نہ ہوا تھا - اگرچہ اس وقت اُنکی ان تمام خدمات کو حوالۂ نسیاں کر دیا گیا ہے کیونکہ بعد کے محققین ان پر بھی سبقت لے گئے - مگر اُنکی عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے ایسے اسباب پیدا کیئے کہ بعد کے لوگ اُن سے بڑھ جائیں - جرمن بھی فرانسیسیوں سے کسی طرح کم نہ رہے - اُنھوں نے قرون متوسطہ، یونانی، رومی، اور قرون ماضیہ کو نہایت دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس تاریخ نے قسم جدید میں قدم رکھا -

اسکے بعد تمام تاریخی میدان اچھی طرح چھان ڈالا گیا - اور چونکہ یہ کام ایسے اشخاص نے کیا جو متقدمین سے دقت نظر اور وسعت معلومات میں کہیں بڑھکر تھا اور اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے انھا دیں

صدی سے قبل کی تمام تاریخیں ہیچ ہوگئیں - البتہ گبن ایک ایسا خوش نصیب شخص ہے جو ابھی تک پوجا جا رہا ہے۔ قرون ماضیہ کی تاریخ جرمنوں کے غیر معمولی شوق اور فطنت کی بدولت بہت زیادہ دلچسپ اور نفع بخش ہوگئی ہے۔ بہت سے سالوں کی محنت کے بعد روم اور یونان کی تاریخوں میں سے تمام وہمی اور من گھڑت عنصر خارج کردیا گیا۔ اور اسکے بعد یہ بخوبی ذہن نشین ہوگیا کہ یونانی اور رومن زندہ لوگ تھے بت نہ تھے۔ اور پھر ان کی سیاسیات، ادارات اور مذاہب پر مزید غور کیا گیا اور ان کو جیسے کہ وہ اصل میں تھے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ ایتھنز کی جمہوریت، اسپارٹا کی دولت اعیان، روم کے امرا، اور عوام اور ان چھوٹے چھوٹے تنازعات کی ماہیت پر غور کیا گیا جن کی وجہ سے جمہوریت سلطنت سے مبدل ہوگئی۔ قدیم سلطنتوں کے مذہب، حکومت، اور محصول وغیرہ کی تحقیقات کے لیے نئے نئے طریقے اختیار کیے گئے جو زمانۂ گذشتہ میں ممکن نہ تھے۔

(ماخوذ)

معتضد ولی الرحمن ایم اے
پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ - حیدرآباد دکن

کلام عزیز

رخصت اے صبر آس ٹوٹ گئی　　کھل گیا راز بات پھوٹ گئی
غلط انداز اک ادا اسکی　　دل کی بستی تمام لوٹ گئی
نہ ملا سنگِ آستاں تیرا　　ہائے تقدیر میری پھوٹ گئی
اب تحیر ہے رات دن مجھ کو　　عادتِ آہ و نالہ چھوٹ گئی
لاکھ پردوں میں تم چھپے پھر بھی　　حسن پنہاں کی بات پھوٹ گئی

نخل امید کیا پھلے گا عزیز
ایک ایک شاخ اسکی ٹوٹ گئی

کلام میر

اُردو زبان جب تک زندہ ہے لکھنؤ کی بندۂ احسان رہے گی کہ اُس نے الوان نعمت کے خوان بچھا کر دہلی کے سخنوروں کو رجھایا اور اپنے خون جگر کے قطروں سے ادب کی اُس وقت تواضع کی جبکہ بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم رہ گئی تھی اور تنگدستی کے باعث اُردو کے وطن میں قدر سخن کا کال تھا۔

"غم الفت" کا قحط تو مرزا غالب کے عہد میں پڑا ہوگا

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد　　ہم نے مانا یہ کہ دلی میں رہیں کھائینگے کیا؟

لیکن داد و دہش، ہمت افزائی، اور سامان کمال کا قحط بیسیوں برس پہلے سے تھا جس نے شاہجہان آباد کے قریب کل سربرآوردہ ہنرمندوں کو لکھنؤ کا زیر بار منت ہونے پر مجبور کیا اودھ کی سرزمین قابلیت کا جوہر رکھتی تھی۔ میر و سودا، انشا و مصحفی، جرأت و میر حسن کی تربیت نے اُسکو آسمان بنا دیا اور لکھنؤ کی زبان اُنکے دامنوں میں پرورش پاکر ایک ہی نسل کے بعد دہلی کی حکومت سے آزادی کا اعلان کرنے کے قابل ہو گئی۔

نظم اُردو کو لکھنؤ کی مسافر نوازی کا اعتراف کرنا لازم ہے۔ لیکن یہ بیوفائی بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جن شعرا نے آصف الدولہ کی چھاؤنی کو زبان و محاورات کی درگاہ بنایا اُنکی قبروں کا بھی آج وہاں نشان نہیں ملتا۔ نہ انشا اور جرأت کے مرقدوں کا صحیح پتہ ہے اور نہ باور کرنے کی کوئی دلیل کہ آغا میر کی ڈیوڑھی کے اسٹیشن کے پاس گنج قبور میں جو ایک بے نام و نشان تربت ہے وہ کسی فقیر کی ہے یا شہنشاہِ سخن میر کی!!

انشا و جرأت نے تو زندگی میں خوب داد عیش دی تھی لیکن میر کو اُنکی حیات میں بھی وہ قدر و منزلت نصیب نہیں ہوئی جو اُن کے شایانِ مرتبت تھی۔ اس کی وجہ ممکن ہے کہ اُنکی نازک دماغی اور شان استغنا بھی ہو۔

"تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی　　تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے"

لیکن اس کا اصل راز اُن کے طرز کا لکھنؤ میں مقبول عام نہ ہونا تھا۔

یہاں کے ممتاز شعرا ہمیشہ میر کی عظمت کا ترانہ گاتے رہے یہاں تک کہ کسی اُستاد کے کمال پر دہلی و لکھنؤ کو ایسا کامل اتفاق نہیں ہے جیسا کہ میر صاحب پر

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ		آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

لیکن تعریف اور محبت کی سچائی کا شاہدِ عادل ممدوح کی پیروی کا شوق ہے، اور یہ گواہ لکھنؤ کی بازار میں ہمیشہ کمیاب رہا۔

میر کی سیدھی سادی عبارت یہاں عامیانہ زبان سمجھی گئی اور اُن کے دلکش طرز بیان و لطیف انداز بندش سے مستفید ہونے کی کسی نے (الا ماشاءاللہ) کوشش نہیں کی۔ خواجہ آتش کے نامور شاگرد سید محمد خاں رند نے بڑا بول بولا کہ

"تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے		عاشق ہیں ہم تو رند اسی بول چال کے"

لیکن یہ صرف ایک شاعرانہ خیال یا زبانی جمع خرچ تھا ورنہ اُن کا بہترین کلام سودا اور مصحفی کے طرز پر ہے اور جب میر کے کوچہ میں جانا چاہتے ہیں تو جرأت بن کر ایسی ٹھوکر کھاتے ہیں کہ چوک میں بھی نہیں بلکہ ۔۔۔ میں جاکر گرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

ہو نہ انگشت نما مثل ہلال		جان تو چندنی میں جایا نہ کرو

خوش نہیں آتا اگر میرا کلام		تو غزل بھی مری گایا نہ کرو

اگر اس کلام پر میر کی مشابہت کا گمان ممکن ہے تو رند پر صد رحمت !

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو !!

میر کی شاعری کا اصلی جوہر زبان کی سادگی کے ساتھ انوکھے طرز پر درد و حسرت کی تصویری تھا۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے		درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اُن کی زندگی حسرت و حرماں کی تصویر تھی۔ جو خیالات دل میں پیدا ہوتے وہ اُنکو بے ساختہ نظم کرتے تھے اور اظہار جذبات میں صادق البیان تھے۔ اسی حقیقت نگاری نے اُنکے سوز و گداز میں تاثیر پیدا کی اور وہ جادو جگایا کہ آج سو برس کے بعد بھی اُن کے نشتر کلیجوں کے پار ہوتے ہیں ۔۔۔۔

اور اُن کے بیسیوں مصرعے ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہیں۔

لکھنؤ تصنع اور تکلف کے امراض میں گرفتار تھا۔ وہاں ایہام اور شوکتِ الفاظ کی تلاش تھی میر کی تقلید کون کرتا؟ نظم کو ترقی دی تو "امانت" کا سا شاعر بے ہمتا پیدا کیا اور نثر کی طرف متوجہ ہوئے تو "سُرور" کو حیاتِ جاوید عطا کی!

ناسخ نے زبان میں مفید اصلاحیں کیں۔ آتش نے غزل کا پایہ بلند کیا۔ وزیر، صبا، خلیل، رند، اور نسیم نے اپنی نازک خیالیوں اور موشگافیوں سے اصنافِ سخن کے خوشبودار گلدستے تیار کیے لیکن ان میں سے کوئی میر کی "سہل ممتنع" کا مقلد نہ تھا۔ غرض یہ دعویٰ یقیناً صحیح ہے کہ لکھنؤ میں میر کی وہ قدر نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اور جو دو ایک پیروانِ میر پیدا بھی ہوئے وہ مقصود تک پہونچنے سے پہلے ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑے۔

حیرت ہے کہ شرفائے دہلی و لکھنؤ جو زبان بولتے تھے وہ قریب قریب یکساں تھی صرف لہجہ کا اختلاف تھا لیکن جب قلم ہاتھ میں لیتے تھے تو ایک "چار درویش" لکھتا تھا اور دوسرا "فسانۂ عجائب"! ایک کہتا تھا کہ ہجر و فراق کی مصیبت میں

"کسی نے کہا گر کہ کچھ کھائیے کہا خیر بہتر ہے منگوائیے"

فطرت کے اصول کے مطابق اور حسبِ حال ہے۔ دوسرا سمجھتا تھا کہ دردِ جدائی میں بھوک پیاس کا علاج آنسو پینے اور قسمیں کھانے سے ہو سکتا ہے!!

"گر تی تھی جو بھوک پیاس بس میں آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں"

فسانۂ عجائب اور گلزارِ نسیم دونوں سحر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ایک نے نثر میں طلسم بنایا اور دوسرے نے نظم میں جادو کیا۔ اس مضمون کا موضوع میر کی حقیقت نگاری کی تعریف ہے نہ کہ لکھنؤ کے کمالات کا انکار!!

فسانۂ عجائب اور گلزارِ نسیم پر جس قدر اہلِ لکھنؤ ناز کرتے بجا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ اربابِ کمال کے حاشیہ نشیں سحر سامری کو معجزۂ موسیٰ سمجھنے لگے اور گورکھ دھندۂ الفاظ کی پرستش میں ایسے محو ہوئے کہ چند روز کے بعد خدائے معنی بھی فراموش ہو گیا۔!!!

اردو، فارسی اور برج بھاشا کے ملنے سے بنی تھی۔ اس لیے ان دونوں زبانوں کے الفاظ

تو لازمی طور پر اس میں ہونا چاہیے تھے۔ فارسی نے عرب کے دامن میں اور بھاشا نے سنسکرت کے سایہ میں نشو ونما پایا تھا۔ عربی و سنسکرت کے بعض الفاظ فارسی و بھاشا میں اس طرح پیوست تھے کہ اُن کا جدا کرنا دشوار تھا۔ لہذا جب اُردو زبان وجود میں آئی تو عربی و سنسکرت کا ایک ذخیرہ بھی اُسکو ترکہ میں ملا اور نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کیا گیا۔

اگلے شعرا نے اُن الفاظ کو جس طرح بے تکلف بولتے تھے اپنے نظم میں استعمال کیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ اُردو کا جزو بن گئے۔ میر تقی کی زبان بھی عربی و سنسکرت کی آمیزش سے پاک نہیں ہے لیکن غضب یہ ہوا کہ پچھلے تیس سال میں اہل لکھنؤ اور اُن کے مقلدین نے عربی کے اسقدر ثقیل لغت اپنے افسانوں اور رسالوں میں استعمال کیے اور اُس کے جواب میں اہل پنجاب نے اس قدر دشوار الفاظ سنسکرت کے اپنے اخباروں اور کتابوں میں شامل کیے کہ متوسط طبقہ کے لیے اُردو زبان، لاطینی یا یونانی بن گئی۔

تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بولتے تو قریب قریب ایک ہی زبان تھے لیکن جب لکھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ایک عباس صفوی کا مصاحب ہے یا ولید بن عبد الملک کا درباری، اور دوسرا بکرماجیت کا پجاری ہے یا چندر گپت کا منتری!! علمی مضامین کے لیے اگر عربی یا سنسکرت کی اصطلاحیں لی جاتیں تو بجا و درست! کلام میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے خوبصورت الفاظ استعمال کیے جاتے تو جائز و روا!! فارسی اشعار یا بھاشا کے دوہوں سے نثر کو زینت دی جاتی تو سونے پر سہاگا!! آیات قرآنی یا اقوال حکماے ہند سے بیان کی تائید کی جاتی تو چاندی کی انگوٹھی پر پکھراج کا نگینہ!!! لیکن خیالی مباحث، عشقیہ فسانوں، یا سیاسی تحریروں میں بے ضرورت عربی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ لانا یا فارسی کی پیچدار اضافت در اضافت ترکیبیں صرف کرنا صرف حرکتِ عبث ہی نہیں بلکہ ادب کے چہرہ پر نہایت بدنما داغ تھا۔

جو خال اپنی حد سے بڑھا وہ مسّا ہوا

انجام یہ کہ ہمارے وقت میں مضمون نگاری کا مقصود صرف خوبصورت الفاظ کا جمع کرنا ہو گیا۔ فقرہ چست اور ترکیب نرالی ہونی چاہیے۔ الفاظ کے معنی ہوں یا نہ ہوں، اور جملہ ازروے قواعد درست ہو یا نہ ہو۔

اکبر آباد سے ایک رسالہ شایع ہوتا ہے، جس کے قابل اڈیٹر کی شہرت نے اس پرچہ کو کافی مقبولیت عطا کردی ہے۔ اس کے سرورق پر "مجلہ علمیہ وادبیہ" لکھا جاتا ہے۔ "مجلہ" شاید عربی زبان کا لفظ ہو مگر اس قدر غیر مانوس ہے کہ اس کے معنی رسالہ کے "رئیس التحریر" اور "معاون مدیر" کے طبقۂ احباب کے باہر کم لوگ جانتے ہوں گے۔ اس "مجلہ" کے اکتوبر ۲۲ء کے نمبر میں صفحہ ۱۱ پر ایک عجیب و غریب مضمون شروع ہوتا ہے جس کی سرخی ہے "میں ہوں اپنے شکست کی آواز" عنوان خوبصورت الفاظ کا مجموعہ ہے لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ معمّا سارا مضمون پڑھنے کے بعد بھی حل نہیں ہو سکتا!! مضمون یوں شروع ہوتا ہے :-

"نازلہ پیاری۔ تمھاری تحریر جو ایک ہی وقت میں نامۂ مودّت بھی تھی اور مکتوب متالم بھی۔ ملی۔ کاش میں تمھیں بتا سکتی کہ تمھارے اس خط نے میرے خوابیدہ جذبات کے ساتھ کیا کیا۔ ہر چند اس کا اعتراف میں خود اپنی ذات سے بھی کرنا نہ چاہتی تھی لیکن اب میرے قابو میں نہیں کہ میں اس حقیقت کو مزید عرصہ تک راز بنائے رکھوں۔ کچھ تو اس لیے کہ میں اس دردِ دیرینہ کو اب چھپا نہیں سکتی اور کچھ اس لیے کہ میرا یہ اقبالِ جرم تمھارے کرب روحی کا بھی مرہم ثابت ہوگا۔ میں اپنی حیات معاشقہ کا افسانہ آج پہلی بار دوہراتی ہوں۔ اگرچہ مشاغلِ زندگی سے فرصت اس لیے نکالنا کہ ایک مردہ و مدفونِ محبت کا ماتم کیا جائے دشوار ہے۔"

سبحان اللہ! سبحان اللہ!! کیسے پیارے الفاظ ہیں!!! مسرت کی بات ہے کہ ہندوستان کی عورتیں اب ایسی دلفریب زبان میں خط کتابت کرتی ہیں جو لکھنؤ کے دشوار پسندوں کے لیے بھی عبرانی ہے!!! اور صراح و غیاث کی امداد کے بغیر اُن عربی و فارسی الفاظ کے معانی معلوم نہیں ہو سکتے جو ان تعلیم یافتہ مستورات کے روزمرہ میں داخل ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

(۱) "لبوں میں التہاب عقیق کو گویا دیکھا اور آنکھوں میں شباب کو متموج۔"

(۲) "اپنے اندر ایک شعلہ کا التہاب لرزاں محسوس کیا جس کا مقتضا یکسر اغراق و محویت تھا۔"

(۳) "ایک لمس سے اُس کی آنکھیں مشعلِ نیم شبی کی طرح روشن ہوگئیں۔"

(۴) "آنِ واحد میں میرے اندر کی دویت نے اُسے ایک دوتا بنا لیا۔"

"دویت" معلوم نہیں دیو سے بنا ہے یا دیوی سے - ظاہرا جرمنی یا روسی زبان کا لفظ ہے !!

بدقسمتی سے اہل ہند کو انگریزی کی تعلیم اس قدر مہلت نہیں دیتی کہ یورپ کے کُل ملکوں کی زبانیں سیکھی جائیں اس لیے یہ رسالہ طاق پر رکھیے اور جدید ترین نمونہ گلابی اُردو کا ملاحظہ فرمائیے -

اگست ۱۹۱۴ء سے ایک رسالہ "دارالنشور" علیگڈھ سے جاری ہوا ہے - اور اُسکے سرورق پر بھی "مجلۂ ادبیہ" کا دعدگر چاہے - اسکے پہلے نمبر میں صفحۂ ۱۴۱ پر یہ مضمون ہے :-

"بیداری حُسن"

"جھُٹ پُٹے کے وقت ایک دوشیزۂ کشیدہ قامت اپنے حُسن نوبہار کی تمام قمرزائیوں اور تبسم جلوہ زاوکی ہمہ ہلال آفرنیوں کو لیے ہوے ایک سفید ساری میں لپٹی ہوئی مکان کی چھت پر شانہ بزلف تھی - راتیں پیدا ہو ہو کر مٹ رہی تھیں جنہیں طلوع ہو ہوکر مُعیب ہی تھیں یہ رنماشی کا چاند اس بدرنسوانی کو دیکھ کر خجالت کی ہنسی ہنسا - چاندنی کبھی اتنی پُررونق نظر نہ آئی تھی ،

چندرکنول کے عنفوان جگرریز و تابش یاسمن افشاں پر جب چاندنی کے پھول اس طرح نچھاور ہو رہے تھے ...."

"قمرزائیاں" اور "ہمہ ہلال آفرینیاں" ممکن ہے کہ کوئی پہیلی ہو، چاند کی "خجالت سے چاندنی کا "پُررونق" نظر آنا شاید کوئی چیستاں ہو، لیکن یہ "جگرریز" اور "تابش یاسمن افشاں" تو یاجوج ماجوج کی زبان معلوم ہوتی ہے !! انا للہ وانا الیہ راجعون -

یہ مسلمانوں کے کارنامے تھے - اب ہندووں کا جواب سُنیے - اینجاست کہ آفتاب تیز است -

(۱)

"دویش اگنی جلد بجھاؤ - دویش کی آگ زبردست آگ ہے - اس دویش اگنی نے کئی قوموں کا ستیاناش کر دیا ...."

(۲)

"گورو ہمان نوشش اور اگ کا ایک حیرت بخش نظارہ - شری گورو نانک دیو جی پردہ اٹھا

کو پہونچ چکے ہیں۔ انکے لیے شردھا کا بھاؤ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل چکا ہے۔ صوبہ بھر کے نامی گرامی فقیران کی مہما کا گیت گاتے ہیں۔ کثرت سے دولتمند لوگ اُن کا ستان کرتے ہیں۔ سیکڑوں لوگ ان کے شری چرنوں میں اپنی بھگتی اور پوجا کے پھول چڑھاتے ہیں۔

"..............

صور پھونک گیا اور قیامت آگئی!!!

آنکھیں کہیں کہ دل ہی نے ہمکو کیا خراب — دل یہ کہے کہ آنکھوں نے ہمکو ڈبا دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں آ درد عشق میں — دونوں کی ضد نے خاک میں ہمکو ملا دیا

ایک مقدس دانشمند کا قول ہے کہ رسم بد کا موجد اپنے مقلدین کی سیہ کاری کا جواب دہ ہے۔ کیا اُردو کی موجودہ تباہی کا وبال لکھنؤ پر نہ پڑے گا جس نے پہلی مرتبہ زبان اُردو کو عبارت کی سادگی ترک کرنے اور شوکتِ الفاظ کی طرف اس حد تک متوجہ ہونے کا سبق پڑھایا کہ مضمون کا چیستاں بنانا جائز، مگر عامیانہ زبان کا استعمال گناہ !! اگر بچپن میں سادگی اور سچائی کی تعلیم دی ہوتی تو آج عنفوان شباب پر یہ "قمرزائیاں" کیونکر ظہور میں آتیں؟

ہزار احسان انجمن "ترقی اُردو" کا کہ اُس نے "مجلۂ ادبیہ" اور "دویش اگنی" کے دور میں میرتقی کا منتخب کلام شایع کرنے کی ہمت کی اور بگڑے ہوے مذاق کو "معلم اول" کی بیاض دکھا کر سُدھارنا اور سیدھے رستہ پر لگانا چاہا۔ ہماری نئی تعلیم یافتہ جماعت غالب اور اقبال کی قدرشناس ہے لیکن کلیات میر سے قطعًا ناآشنا ہے۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ میر کے اشعار میں متروک الفاظ اور قدیم محاورے شامل ہیں۔ اُسکی فارسی آمیز ترکیبیں بھونڈی ہیں۔ اور اُس کی صرف ونحو اس قدر تبدیل ہوگئی ہے کہ اب میر کے کلام سے کوئی لطف نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ واقعی میر نے "مجلہ" اور "جگریزہ" کے سے خوبصورت الفاظ" ہمہ ہلال آفرینیوں" کی سی دلکش ترکیب استعمال نہیں کی اور اُردو کی جدید نثر کو میر کے کلام سے وہی نسبت ہے جو شاہ قاجار کے سفرنامہ سے گلستاں کو، یا (بے تشبیہ) کشف الخباءعن فنون اوربا سے قرآن کو! لیکن کسی شایستہ قوم نے اپنی زبان کے ابتدائی خزانوں کو اس عذر سے برباد نہیں کیا کہ قدیم زبان سمجھنا دشوار ہے۔

ایران اس وقت تک رودکی کی پرستش کرتا ہے۔ عرب ایام جاہلیت کے "سبعہ معلقہ" درس میں شامل کرتا ہے۔ انگلستان چاسر اور اسپنسر کے کلام سے آشنائی پیدا کیے بغیر تعلیم کو ناقص قرار دیتا ہے۔ ہندوستان کالی داس کا شیدائی ہے اور یونان ہومر کا فدائی۔ کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ میر کا کلیات اس بنیاد پر فراموش کیا جائے کہ وہ کبھی کبھی "ٹک" اور "کسو" کا استعمال کرتا ہے، یا اُسکے بعض محاوروں سے کان نا آشنا ہو گیا ہے۔ لطافت سخن ہو تو اُسکی پرانی بول چال پر آج کل کی ہزاروں "قمرزائیاں" قربان کرنے کے قابل ہیں۔

بیشک میر کے کلیات اور نیز تمام ہندی شعرا کے دواوین میں رطب و یابس شامل ہے، اور اس لیے مناسب ہے کہ اُنکے کلیات کا انتخاب مرتب کیا جائے جو ایسا جامع ہو کہ اصل کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے۔

شکر ہے کہ میر مغفور کے مردہ دیوان پر "انجمن ترقی اُردو" نے آب حیات کے قطرے ٹپکائے اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے کے "انتخاب کلام میر" کو شایع کیا۔

خدا کرے کہ سودا، انشا، درد، مصحفی، اور جرأت کا انتخاب بھی شایع کرنے کی اُنکو توفیق ہو۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

ایک زمانہ میں مشہور تھا کہ میر صاحب کے کلام میں بہتر نشتر، اور مرزا رفیع سودا کے کلیات میں بہتر خنجر ہیں۔ شروع شروع میں تو "بہتر" کا لفظ غالباً "بہت" کی جگہ بولا گیا تھا اور "نشتر" و "خنجر" کے پردہ میں میر و مرزا کے کلام کا ایک نازک امتیاز بیان کرنا مقصود تھا، مگر چند روز کے بعد میر کے بہترین اشعار بہتر ہی تک محدود سمجھے جانے لگے اور بعض بذلہ سنجوں نے میر کے بہتر نشتر اور سودا کے بہتر خنجر مرتب بھی کیے۔ مرزا کی بابت بحث کرنے کا تو یہاں موقع نہیں لیکن میر کے نشتروں کو بہتر تک محدود کرنا صریح ظلم تھا جس کی تردید "انتخاب کلام میر" سے بخوبی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں۔ اور ہر ایک شعر کسی خاص وصف سے ممتاز ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے میر کی مثنویوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ حالانکہ یقیناً میر اُردو زبان میں طویل مثنویوں کا موجد تھا۔ اور اُنکے بعض اشعار جو اس وقت تک زبان زد خاص و عام ہیں اپنے انتخاب میں شامل نہیں کیے ورنہ نشتروں کی تعداد میں اور بھی اضافہ

ہو جاتا۔

درد و حسرت کا بیان میر صاحب کی زبان سے نشتر کی خاصیت رکھتا ہے۔ اگر اس انتخاب سے صرف اسی مضمون کے اشعار چھانٹے جائیں تو کتنے ہی بہتر نکلیں گے۔ سادگی عبارت، درد، اور تاثیر میر کے کلام کے تین آبدار جوہر ہیں۔ ان موتیوں سے بہتر دانہ کا ایک ہار گوندھکر بطور مشتے نمونہ از خروارے اس مضمون کا جزو کیا جاتا ہے* جس سے ثابت ہوگا کہ میر کا کلام اس وقت بھی عام فہم ہے اور "کلیاتِ میر" نہیں تو "انتخاب کلام میر" سے زمانۂ حال کے ادیبوں کو سبق لینا چاہیے۔

انتخاب کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب نے ایک بسیط مقدمہ بھی شامل کیا ہے اور میر کی زندگی کے بعض حالات بغیر تعین سنہ ولادت و وفات کے لکھ کر اُنکے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ انشا پردازی اور دیباچہ نگاری میں مولوی صاحب شہرتِ عام حاصل کر چکے ہیں۔ اُنکے مقدمہ کا کیا کہنا۔ بقول غالب مرحوم، دیوان معشوق ہے تو مقدمہ اُس کا گہنا!! لیکن تعجب ہے کہ اُنھوں نے مقبولیت میں میر صاحب کو سعدی سے مشابہت دی۔ لکھتے ہیں:۔

"میر تقی سرتاج شعرائے اُردو ہیں۔ اُن کا کلام اُسی ذوق و شوق سے پڑھا جائیگا جیسے سعدی کا کلام فارسی زبان میں"

زمانۂ ماضی میں سخن فہموں نے میر کا کلام ذوق سے پڑھا مسلّم، زمانۂ مستقبل میں ان کا کلام پڑھا جائے گا، خدا ہمچنیں کند۔ لیکن زمانۂ حال میں تو اہل ہند کو کلام میر سے بہت ہی کم دلچسپی ہے اور اسی محسن کشی نے ادب اُردو کی وہ شرمناک حالت بنا دی ہے جس کا تفصیل سے اوپر اظہار کیا گیا۔

علاوہ اسکے ایران نے تین چار سو برس کی عرق ریزی اور جاں کاہی کے بعد فردوسی و سعدی پیدا کیے تھے۔ نظم اُردو جامۂ حیات پہنتے ہی میر تقی کو سعدی کا سا جامع کمالات کیونکر جنا سکتی تھی اور اُس کے کلام کے لیے سعدی کی طرح حیاتِ جاوید کی کیونکر توقع ہوسکتی تھی؟ فردوسی تو غالباً اُردو زبان کو نصیب ہی نہ ہوگا کیونکہ رزم کا چراغ ہندوستانیوں کے لیے مدت سے ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ البتہ سعدی ممکن ہے کہ دو سو برس کے بعد پیدا ہو بشرطیکہ "انتخاب عتیق"

* سہارا ہم ... میر حسن ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس دفعہ گنجایش نہیں۔ ایڈیٹر

اور "شش اور اگ" کے مہلک امراض سے یہ زبان جانبر ہو اور قران النحسین کے برج سے زندہ و سلامت نکلے۔

میر تقی کو سعدی کے مقابل لانا ویسا ہی ستم ہے جیسا رند یا شاد کا میر کو منہ چڑھانا! اگر میر کو رودکی سے شباہت دی جاتی تو بیشک درست تھا۔ جس طرح میر کی عظمت کا یوں اعتراف کیا جاتا ہے۔

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا ۔ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

اسی طرح رودکی کے سامنے یوں سر تسلیم خم ہوتا ہے کہ

غزلہا ے من رودکی وار نیست ۔ غزل رودکی وار نیکو بود

صاحب مقدمہ سے ایک اور شکایت ہے۔ صفحہ ۲۶ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"اُن بے تہوں کو جنھیں اتفاق سے ہلدی کی گرہ ہاتھ لگ جاتی ہے اور پنساری بن بیٹھتے ہیں، میر کی زندگی کا مطالعہ غور سے کرنا چاہیے"۔

"بے تہوں" پر نوٹ ہے:۔

"بے تہ - یہ خاص میر صاحب کا لفظ ہے۔ اُنھوں نے اسے کم مایہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے آج کل سطحی کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے اور بے تہ کے مقابلہ میں بہت بھونڈا اور ثقیل ہے۔ یہ لفظ استعمال کرنے اور رواج دینے کے قابل ہے"۔

"ہلدی کی گرہ" اور "پنساری کی دوکان" مقدمہ کی شان متانت سے بہت گری ہوئی ہے۔ اگر محض لفظ "بے تہ" کو رواج دینے کے لیے ان مسالوں کی ضرورت تھی تو نہایت مفید خدمت ملک اور زبان کی ہوتی اگر میر کے تمام مصطلحات کی ایک فرہنگ مرتب کر کے مقدمہ کے ساتھ شامل کر دی جاتی جس سے قدیم اور جدید زبان کا فرق معلوم ہوتا۔ کلام میر سے لطف اُٹھانے میں آسانی ہوتی اور اُردو کے جدید نثار جو خوبصورت الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہا کرتے ہیں اُس فہرست سے زیادہ خیر مانوس الفاظ منتخب کر کے اپنے "مجلہ" کو زینت دیا کرتے۔

آئین ما ست سینہ چو آئینہ داشتن ۔ کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن

مختصر تاریخ جاوہ و ملحقات

سنسکرت میں جاوہ کا نام جاوہ دویپا (Jawa Dwipa) ہے۔ بعض کہانیوں میں اس کا نام دولت سے بھری زمین بھی پایا گیا ہے۔ عرب تاجروں نے ان جزائر کا نام "ذہابیج" (Zahabedj) رکھا۔ یعنی سونے کی زمین۔

پرانے گیتوں سے پتہ لگتا ہے کہ یہ سرزمین ایک زمانہ میں دولت سے بھری ہوئی تھی۔ اور یہاں ہر طرح کی کانیں موجود تھیں۔ چنانچہ پرتگیزوں نے بھی ان کا نام سونے کے جزائر رکھا۔

طالمی (PTolemy) مشہور یونانی مورخ نے ان جزائر کو بہترین جزائر لکھا ہے۔ اور یہاں کے باشندوں کو متمدن ترین اقوام عالم بیان کیا ہے۔

ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ علاقہ تمدن میں اعلیٰ ترقی کر چکا ہے۔ لیکن یہ تہذیب کہاں سے آئی تھی؟ اس کا پتہ لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہاں کے باشندوں کی قومی روایات جن سے تاریخ میں بہت کچھ امداد لی جا سکتی ہے بہت ہی خراب حالت میں ہیں۔

چونکہ باعتبار تقسیم جنسیت یہ جزائر منگول اور ایرین کی مخلوط النسل جنس سے آباد ہیں اور منگولین اقوام کی مرکزی سلطنت چین ہی رہی ہے۔ اس لیے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہ جزائر بھی چین کے ماتحت ہوں۔ یہ کہ یہ جزائر ایک وقت مہذب ترین ممالک میں شمار کیے جاتے تھے۔ جاوہ اور ساترہ (جسے جاوہ کیل یعنی جاوہ خورد بھی کہا جاتا ہے) میں اسکے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ ریفیل (Raffles) لکھتا ہے کہ ان لوگوں نے قدیم زمانہ میں مصر سے تمدن حاصل کیا۔ فیبل (Fable) کا خیال بھی قریب قریب یہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بحر احمر کے راستہ سے یہاں تہذیب آئی۔ کچھ تعجب نہیں کہ قدیم مصریوں نے بحر احمر کے راستہ سے ان جزائر میں آمد و رفت شروع کی ہو۔ اور وہی ان لوگوں کے تمدن کے ذمہ دار ہوں۔

قدیم دیسی تحریروں سے پتہ لگتا ہے کہ ؁ء میں ایک شخص اجی ساکا (Aji Saka)

نامی جسکو استینا (Astina) کے زیر دست شہزادہ کا وزیر بیان کیا جاتا ہے اس ملک میں آیا اور اسی کے باعث ان جزائر میں تہذیب پھیلی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ شخص وزیر نہیں بلکہ شہزادہ تھا۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ ولی تھا اور پانی اور پہاڑوں کے اوپر سے اُڑ کر آیا تھا لیکن سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اس شخص کے ذریعہ سے جاوی طرز تحریر کی بنیاد پڑی، سلطنت کی باقاعدہ ابتدا ہوئی اور بدھ مذہب جاری ہوا۔ اسکے زمانہ کے قوانین عام طور پر ۱۴۰۰ء تک اور ماجاپاہٹ (Majapahat) میں ۱۴۷۸ء تک استعمال ہوتے رہے۔ اجی ساکا کے وجود سے قبل ان لوگوں میں کوئی خاص مذہب نہ تھا۔ صرف قدیم دستور کے مطابق بعض قبائل نے اپنے لیے کوئی خاص چیز عبادت کے لیے مقرر کر رکھی تھی۔ مثلاً چاند سورج آگ پانی درخت وغیرہ۔ اسی طرح اُس زمانہ میں کوئی سلطنت بھی نہ تھی صرف فطرتی قاعدہ کے مطابق سب سے بڑی عمر والے کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاتا تھا۔

چونکہ یہ جزائر ہندوستان ہی کا ایک جزو ہیں اس لیے اگر مصری تہذیب بھی اس طرف آئی۔ تو ہندوستان ہی کے راستہ سے آئی ہوگی۔ اگرچہ اس دعوے کا کوئی ثبوت دینا مشکل ہے کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ مصریوں نے سواحل ہند کے چھوئے بغیر اپنے آپ کو ان جزائر میں پہونچایا ہو۔ مگر یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ سب سے اول ان جزائر میں مصری تمدن پہونچا۔ لیکن اس تمدن کے ساتھ کوئی مذہب نہ آیا۔ مصری تمدن کے لیے کوئی صحیح زمانہ مقرر کرنا مشکل ہے۔ ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مصری تمدن کے عروج کے زمانہ کا یہ واقعہ ہوگا۔ جب مصری تمدن کو ضعف پہونچا تو قدرتاً ان جزائر میں اس کا اثر کم ہوا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب اجی ساکا کا ان جزائر میں پہونچنا بیان کیا جاتا ہے۔ اس شخص کے آنے کے متعلق ذرا غور سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ان جزائر کے باشندے سب منگولین ہیں۔ یا یوں کہو کہ اُسی نسل سے ہیں جس نسل سے چینی اور جاپانی ہیں۔ اس لیے قدرتاً یہ لوگ شاہ چین کو اپنا رئیس سمجھتے ہونگے۔ انکے ہاں مشہور ہے کہ اجی ساکا استینا سے آیا۔ استینا کے نام کا کوئی شہر یا ملک موجود نہیں۔ لیکن ملایو زبان میں ایوان شاہی کو "استانہ" کہا جاتا ہے۔ اس لیے بالکل ممکن ہے کہ یہ شخص چین کے دربار سے اس علاقہ میں گورنر ہو کر آیا ہو۔ اور چونکہ شہنشاہ کی طرف سے آیا تھا، مشہور ہوا کہ استانہ سے آیا ہے۔ اس قسم کے قائم مقام چین کی طرف سے تبت

برما وغیرہ میں بھی بھیجے جاتے تھے۔ اجی ساکا اگرچہ چینی نام نہیں ہوسکتا لیکن یہ نام جاپانی ضرور معلوم ہوتا ہے۔ اور چونکہ اُس زمانہ میں چین اور جاپان ایک ہی تھے کچھ تعجب نہیں کہ یہ شخص در اصل جاپانی نسل سے ہو۔ یا یہ کہ چینی نام توڑ مروڑ کر ایسا ہوگیا ہو۔ بہرحال اجی ساکا کے آنے سے ۷۵ء میں یہاں سلطنت اور مذہب کی بنیاد پڑی۔ اور یہی شخص جاوی رسم الخط کا بانی ہوا چونکہ یہ شخص امور سلطنت سے واقف بلکہ اُس میں کامل تھا اس لیے یہ بھی ایک دلیل ہے کہ یہ شخص چین کے دربار سے یہاں آیا ہو۔ چنانچہ اسکے بنائے ہوئے قواعد اور قانون ہزار بارہ سو سال تک بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسلام کے ان جزائر میں داخل ہونے تک مستعمل رہے۔ مذہب جو یہ شخص اپنے ہمراہ لایا بُدھ مت تھا۔ اور یہ پہلا مذہب ہے جو اُن جزائر میں پھیلا۔ جس کی تقویت کا ایک بدھ راہب فاہیان (Fahian) سے ہوئی۔ جو سنہ ۴۱۲ء میں چین سے جاوہ آیا اور بدھ مذہب کی اشاعت کا عام طور پر سبب بنا۔ اجی ساکا کے بعد پھر یہاں کی تاریخ پردۂ کتمان میں ہوجاتی ہے۔ اور کئی سو سال تک کچھ پتا نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ ہندو مذہب کی ابتدا ان جزائر میں ہوئی۔ ڈاکٹر براندس (Dr. Brandes) کا خیال ہے کہ سنہ ۵۰ء میں ہندو مذہب کی ابتدا ان جزائر میں ہوئی۔ لیکن مشہور ڈچ مورخ فان درلیتس (F. M. von der Lith) لکھتا ہے کہ ان جزائر میں ہندو مذہب اس سے قبل آچکا تھا۔ بہرحال ماننا پڑے گا کہ آٹھویں صدی میں رفتہ رفتہ ہندو مذہب نے اپنا اثر جما لیا تھا۔ لیکن ہندو مذہب بُدھ مت کو مٹا نہ سکا۔ بلکہ ان دونوں کے ملاپ سے ایک مخلوط مذہب کی بنا پڑ گئی۔ چنانچہ یہاں کے مندروں اور آثار قدیمہ میں ہر جگہ بدھ کی تصاویر کے ساتھ ساتھ کرشنا، سیوا اور گنپتی وغیرہ کی مورتیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ صرف جزیرہ بالی ہندو مذہب و تہذیب کا مرکز رہا اور وہاں سے بُدھ مت کا اثر تقریباً جاتا رہا۔ باقی ہر جگہ مخلوط مذہب رہا۔

جاوہ میں ہندوؤں کی تین مشہور سلطنتیں گذری ہیں (۱) پاجاجاران (Pajajaran) مشرقی جاوہ میں ایک قوی سلطنت تھی۔ جس کا دارالخلافہ پاگور (پیوٹن زرگ) کے قریب کسی جگہ تھا۔ یہ سلطنت ۱۱۱۵ء سے ۱۵۲۶ء تک رہی۔ اس سلطنت میں ایک لاکھ جرار فوج ہر وقت تیار رہتی تھی لیکن آخر میں اسلام کے زور پکڑنے کے سبب سے یہ نیست و نابود ہوگئی۔ (۲) ماجاپاہت (Majapahat) کا دارالخلافہ سورابایا کے قریب کسی جگہ بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سلطنت

کی ابتدا میں سخت اختلاف ہے۔ لیکن یہ سلطنت ۱۴۷۸ء اور ۱۵۲۷ء کے درمیان میں کسی وقت پیدا ہوئی۔ اور اس کا خاتمہ ۱۵۱۸ء سے ۱۵۲۵ء تک ہوا۔ (۳) ڈیماک (Demak) کی سلطنت کا دارالخلافہ کارنگ کے قریب بیان کیا جاتا ہے۔ اس سلطنت کی ابتدا کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ لیکن ۱۴۷۸ء میں یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔ جو اس زمانہ میں سواحل پر قابض ہوچکے تھے۔ اور بعد میں یہ سب لوگ مسلمان ہوگئے۔ ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو ان سلطنتوں کی ماتحت تھیں اور اُنکے ساتھ ہی ختم ہوگئیں۔

اسلام کی ابتدا تیرہویں صدی کے اندر ان جزائر میں ہوئی اور تقریباً سو سال کے زمانہ میں کئی اسلامی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ صرف جاوہ میں سات مشہور اسلامی سلطنتیں تھیں (۱) ڈیماک (Demak) (۲) پاجانگ (Padjang) (ماتارام-مگجا) (۳) گریسی (grisse) (۴) قدیری (Kediri) (۵) چریبون (cheribon) (۶) جکارتا (Jakarta) (۷) بنٹام (Bantam)۔ پاجانگ (ماتارام-مگجا) کا بادشاہ سوسوہونان (Soo-Soo-hoenan) یعنی شہنشاہ کہلاتا تھا۔

۱۵۱۱ء سے پرتگیزوں نے اس طرف اپنا رسوخ جمانا شروع کیا لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ پھر ۱۵۲۰ء یا ۱۵۲۱ء میں اُن کا دوسرا مشن اس طرف آیا۔ جسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ان جزائر میں اپنے تجارتی تعلقات قائم کیے وہ بھی اس طرح پر کہ چونکہ مسلمانوں کا زور تھا۔ ایک نامسلمان راجہ نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ پرتگیزوں کے ساتھ دوستی کے تعلقات قائم کرے اور اس طرح پر مسلمانوں کی تعدی سے امن میں رہے۔ چنانچہ پرتگیز تاجروں نے اس کی خواہش کے مطابق اسکے لیے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا۔ جسکے معاوضہ میں راجہ نے اُن کے لیے سالانہ ایک ہزار بوری سیاہ مرچوں کی مقرر کی۔

لیکن اُس زمانہ میں مسلمانوں کی سطوت روز دوں پر تھی۔ اور اگرچہ ہر طرح کی تدابیر ان کے مقابلہ میں کی گئیں۔ کسی کی کچھ پیش نہ گئی۔ اسی زمانہ کے قریب ڈچ لوگوں نے ان جزائر کا پتہ لگایا۔ اور پرتگیزوں اور ڈچوں کے آپس میں لڑائیاں بھی ہوتی رہیں۔ جن میں کبھی ایک اور کبھی دوسرا کامیاب ہوتا رہا جس کی تفصیل بہت طولانی ہوگی۔

آخر زمانہ نے پلٹا کھایا۔ مسلمانوں کو زوال شروع ہوا۔ اور ڈچوں کی حکومت کی ۱۶۱۰ء میں باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ ڈچوں نے ۱۶۱۹ء میں بٹاویہ شہر کی بنیاد ڈالی۔ روز بروز ان کی سلطنت کو استحکام ہوتا گیا۔ لیکن اطمینان کامل نہ رہا۔ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۶ء تک جاوہ انگریزوں کے قبضہ میں رہا لیکن آخر میں انکو بھی یہاں سے جانا پڑا۔ اس پانچ سال کے عرصہ کو چھوڑ کر باقی ۱۶۱۰ء سے آج تک دراصل ڈچ ہی اس سرزمین کے مالک ہیں۔ اب انکی یہ نوآبادی بہت وسیع ہوگئی ہے اور دور دور کے جزائر تک ان کے قبضہ میں آگئے ہیں۔ صرف تیمور (Timor) کے دور دراز جزیرہ کے نصف حصہ پر ابھی تک پرتگیز قابض ہیں۔

جاوہ اور اسکے لمحقات میں اسوقت کوئی مستقل اسلامی سلطنت موجود نہیں اور جو ہیں وہ سب ڈچوں کے ماتحت ہیں۔

۱۹۰۵ء سے ڈچوں نے زمانہ کے اقتضا کو دیکھ کر اپنے طرز حکومت میں تبدیلی شروع کی ہے جسے ایک طرح پر جاوہ میں سلف گورنمنٹ کی ابتدا سمجھنی چاہیے۔ اس وقت تک ۱۶ مختلف مقامات میں لوکل کونسلیں قائم ہیں۔ اور سرکاری آمدنی کا ایک حصہ انکے ہاتھوں میں دیا جاتا ہے۔

جاوہ اور اُسکے لمحقات میں اسلام

اسلام کیونکر ان ممالک میں آیا اور اسکی ابتدا کس سنہ میں ہوئی؟ ان دونوں باتوں میں بیحد اختلاف پایا جاتا ہے۔ عوام میں جیسا کہ ہر جگہ دستور ہے یہاں بھی اسلام کی اشاعت کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہیں (۱) کسی ہندو راجہ نے کسی مسلمان کو نماز پڑھتے دیکھا اور ایمان لایا (۲) کسی راجہ کو اُسکے نجومی نے اطلاع دی کہ اگر وہ مسلمان نہ ہوگا تو اُس کا ملک برباد ہو جائے گا۔ (۳) کسی مسلمان درویش کے سبب سے اسلام پھیلا (۴) ایک مقدس مسلمان عورت ان ممالک میں اسلام پھیلانے کا سبب ہوئی (۵) کسی راجہ کو خواب میں ہدایت ہوئی کہ وہ اسلام قبول کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ عربوں کا دعوےٰ ہے کہ اسلام ان جزائر میں اُنکے ذریعہ سے آیا۔ بعض مورخوں کا دعوےٰ ہے کہ ان جزائر میں اسلام ایرانی مسلمانوں کے ذریعہ سے پھیلا۔ نئی تحقیقات والے بعض نئے مورخ بڑے زور سے کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس طرف اسلام پھیلایا۔ ایک مغربی صاحب

* چونکہ اس زمانہ میں ہالینڈ فرانس کے زیر اثر تھا اور فرانس، سپینیوں اور انگریزوں میں لڑائی ہوئی اس سبب

سے مجھ سے کہا کہ مغربیوں کے واسطے سے اسلام اس طرف آیا - یہ آخری دعویٰ صرف دعویٰ ہی دعویٰ نظر آتا ہے اور کوئی قابل التفات دلیل اس بارے میں پیش نہیں کیجاتی - تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام کی ابتدا ان جزائر میں جن لوگوں سے ہوئی وہ خلیج فارس سے آئے ہوئے تاجر تھے اور یہی مغالطہ ہے جو بعض مورخوں کو ان لوگوں کے ایرانی ہونے کے متعلق ہوا - دراصل سب سے اول عرب تاجر جو بصرہ اور بغداد کے اطراف کے رہنے والے تھے - اس طرف آئے اور پہلے ملاکا اور پھر سماترہ میں تجارت کرتے رہے - اور یہی لوگ اسلام کی اشاعت کے بانی قرار دیے جاسکتے ہیں - چونکہ یہ لوگ خلیج فارس سے آئے تھے اور ان کے اور ایرانیوں کے لباس بھی یکساں ہوتے ہیں - بعض مورخوں نے ان کو ایرانی الاصل سمجھا - نیز چونکہ ان کا راستہ بحر ہند ہی سے تھا اور کچھ تعجب نہیں کہ ہندوستان کے بعض شہروں خاص کر سورت سے ہو کر یہ لوگ اس طرف آتے رہے ہوں بعض مورخوں کا خیال ہے کہ ہندوستان ہی سے یہاں اسلام آیا - ان لوگوں کے پاس اپنے دعوے کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ "ایک زمانہ میں سورت کے بعض حکمرانوں کے تعلقات جادہ کے بعض سلاطین کے ساتھ پائے جاتے ہیں - اور دیکھنے میں آتا ہے کہ اس طرف پرانے سلاطین کی قبروں کے پتھر اور کتبہ بالکل اسی قسم کے ہیں جیسے کہ ہندوستان کے مقابر میں ہیں" - لیکن نظر تعمق سے دیکھا جائے تو یہ کوئی زبردست دلیل نہیں - کیونکہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام کی ابتدا یہاں ہندوستان کے مسلمانوں سے ہوئی - کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ جب ان جزائر میں اسلامی ریاستیں قائم ہوگئیں تو ان لوگوں نے ہندی رئیسوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کیے یا کہ رشتہ داریاں بھی کیں - اور یہ صرف یہ کہ قدرتاً انسان اپنے ہمسایہ سے ایسے تعلقات قائم کرتا ہے یا یہ کہ ان جزائر کے تعلقات اسلام سے پہلے سے بہت قبل ہندوستان سے تھے - اور اس ذریعہ سے یہاں کے مسلمان رئیسوں نے وہاں کے مسلمانوں سے برادری قائم کی - اور پھر روز بروز ہندی مسلمانوں کی آمد و رفت ان ممالک میں زیادہ ہوتی گئی - جہاں تک میں نے تحقیقات کی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی ابتدا خلیج فارس کے عرب تاجروں سے ہوئی چنانچہ بعض تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان ابتدائی مسلمانوں کا پرتگیزوں کے ساتھ تجارتی مقابلہ ہوتا رہا اور اپنے اپنے جہازوں کی حفاظت کے لیے دونوں فریق اسلحہ سے کام لیتے رہے - یہ لڑاکا تاجر بھی عرب ہی ہوسکتے ہیں - لیکن اسلام کی ابتدا کی ٹھیک تاریخ معین کرنا مشکل ہے - ہاں تیرہویں صدی عیسوی

میں اسلام ان ممالک میں آچکا تھا۔ مشہور سیاح مارکو پولو (Marco Polo) تیرہویں صدی کے آخر میں جاوہ کے شمالی حصہ میں اسلام کا زور بیان کرتا ہے۔ ابن بطوطہ ۱۳۴۵ء میں بہت زیادہ پھیلا ہوا اسلام ان ممالک میں بتلاتا ہے۔

باگو، (بیوٹن زرگ) کے قریب ایک جگہ "باتو تولیس" نامی ہے۔ جس کے معنی ہیں سنگ تحریر۔ مشہور ہے کہ اس پتھر کے ذریعہ سے شہزادہ پربو راجہ پورانا (راتو دواتا) نے پیشین گوئی کی تھی کہ ان ممالک میں اسلام زور پکڑ جائے گا۔ لیکن تاریخ کا پتہ اس سے بھی نہیں چلتا۔

اسلام کی ابتدا مقامات Acheh اور Pasai میں ہوئی۔ پھر جاوہ کے شمالی اور اسکے بعد غربی سواحل میں پھیلا۔ کہتے ہیں کہ جاوہ میں سب سے اول ایک شخص حاجی پروانامی (سنہ اور تاریخ کا پتہ نہیں ملتا) آیا اور اسی نے ریاست پاجاجاراں میں اسلام کی اشاعت شروع کی لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ گرے سک جو جاوہ کے مشرق میں واقع ہے عرب تاجروں کا تجارتی مرکز تھا۔ اور اسی کو جاوہ میں اشاعت اسلام کا مرکز بھی سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ مولانا ملک ابراہیم بھی جن کا نام کثرت سے تاریخ میں آتا ہے اور جن کے بشمار معتقدین بیان کیے جاتے ہیں گرے سک کے قریب ہی مقام گیری میں تھے۔ انھیں کے زمانہ میں اسلام نے زور پکڑنا شروع کیا۔ ان کا جانشیں اگرچہ "رادن پاکو" ہوا لیکن رادن رحمت جس نے "توجایا" (جو پاہت کے پادشاہ کی لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی، اشاعت اسلام میں رادن پاکو کا دست راست ثابت ہوا اور سورابایا کے قریب نگام پل میں اُس نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ ان دونوں ہی کی کوششوں سے تمام ریاستوں میں اسلام پھیلا۔ یہاں تک کہ جنوبی سواحل کی تمام ریاستیں حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئیں۔ اور آہستہ آہستہ آزاد ہوکر اصلی باشندوں اور اُن کے راجاؤں کے ساتھ معرکہ آرا ہوتی رہیں اور کبھی آپس میں بھی ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے لیے لڑتی رہیں۔ اور اس طرح اسلام جاوہ کے مشرقی اور وسطی حصہ میں ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ماتارام (دجگجا) سے ہوتا ہوا آبنائے مادورا کو عبور کرکے مادورا میں پہونچا۔ ۱۴۸۲ء اور ۱۴۹۰ء کے درمیان نورالدین ابراہیم بن مولانا اسرائیل المعروف سوتار، گونونگ جاتی نے مغربی جاوا میں اسلام پھیلایا۔ اور اس عرب شیخ نے مقام چربون میں اس مقدس کام کو انجام دیا۔ جہاں بعد میں جاوہ کی سب سے پہلی مسجد تعمیر کی گئی، ان حالات کو دیکھ کر ان مورخوں پر افسوس آتا ہے

جو تعصب سے اندھے ہو کر اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں :-

"ان جزائر میں بھی اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا"۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کوئی اسلامی سلطنت اس طرف حملہ آور ہی نہیں ہوئی اور سب مورخ متفق ہیں کہ صرف مسلمان تاجروں کے ذریعہ سے اسلام اس طرف پھیلا تو پھر وہ کونسی تلوار تھی جس کا ذکر کیا جاتا ہے؟ اگر اس مورخ کا اشارہ اُن لڑائیوں کی طرف ہے جو مسلمان سلاطین کی غیر مسلمان راجاؤں سے ہوتی رہیں تو اسکی عقل و دور اندیشی پر رونا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان سلطنتیں کس طرح قائم ہوئیں۔ کیا تلوار کے زور سے؟ یا صرف اسلام کی تعلیم سے؟ اور جب سلطنتیں قائم ہوئیں تو جنگ ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن یہ لڑائیاں اسلام کی اشاعت کے لیے نہیں بلکہ ملک گیری کے لیے ہر جگہ ہوئی ہیں۔ کیا مسلمان مسلمان آپس میں نہیں لڑتے رہے؟ کیا عیسائی عیسائی انہیں جزائر میں (ڈچ - پرتگیز) باہمی جنگ نہیں کرتے رہے؟ تنگر کے علاقہ میں انیسویں صدی کے آخری نصف میں اسلام پھیلا - جبکہ یہ عیسائی ڈچوں کے قبضہ میں عرصہ سے آچکا تھا - یہاں کس تلوار نے اسلام پھیلایا؟

جب اسلام نے اس علاقہ میں اپنے پاؤں جمائے تو اسلام کو نصرانیت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پرتگیز - انگریز اور ڈچ لوگوں کے سخت مقابلہ کے باوجود اسلام برابر پھیلتا رہا - اور نصرانیوں کو اپنا مذہب پھیلانے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اور تقریباً تمام باشندے مذہب اسلام میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ آج کل جاوہ یا سماترہ میں بمشکل ایک لاکھ میں سے ایک شخص اصلی باشندوں میں سے ایسا ہو گا جو اسلام کا حلقہ بگوش نہ ہو - یہ جزائر ڈچ گورنمنٹ نے نئے فتح کیے انکے اصلی باشندوں (لا مذہبوں) کو ہر طرح سے نصرانیت میں داخل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو ظاہر طور پر اشاعت اسلام کی اجازت نہیں - اور نصرانی پادری کو معقول مالی امداد دے کر عیسائیت پھیلانے کے لیے روانہ کیا جاتا ہے -

آچے (Acheh) کا علاقہ سارے کا سارا سلطان علی مغایت کے عہد میں (۱۵۱۶ء تا ۱۵۲۲ء) اسلام کا حلقہ بگوش ہوا - نورالدین نے جب جریدوں میں اپنا پولٹیکل اور مذہبی اثر جمایا تو بنتام کے علاقہ میں بڑھنا شروع کیا تاکہ مغربی ساحل اگر با قاعدہ اسکے زیر حکومت نہ آجائے

تو کم از کم زیر اثر تو ہو جائے ۔ جس کا فائدہ یہ ہو کہ آبنائے سندھا کے ساتھ مسلمانوں کی تجارت آزادی سے ہو سکے ۔ کیونکہ پرتگیزوں کے سبب سے ان دنوں آبنائے ملاکا سے گذرنا خطرہ سے خالی نہ تھا ۔ ڈیماک کے رئیس نے جب اسلام اور نصرانیت کا تجارتی مقابلہ دیکھا تو آخر الذکر کا ساتھ دیگر مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے ان سے مدد چاہی ۔ اور اس طرح دونوں نے مل کر چریبون اور ڈیمارک کی اسلامی ریاستوں کو نابود کرنا چاہا ۔ مگر نورالدین کے ایک بیٹے مولانا حسن الدین نے ان لوگوں کو سخت شکست دی ۔ اور علاقہ ڈیماک کے باشندے بھی مذہب اسلام میں داخل ہو گئے ۔ اسی طرح نورالدین کے دوسرے بیٹے نے انھیں دنوں میں سنداکلا یا میں اسلام پھیلایا ۔ حسن الدین نے درمیانی ریاستوں کو زیر اثر کر کے تقریباً ۱۵۲۲ء میں پاجاجاراں کی افواج کا مقابلہ کیا جو شہزادۂ سیلی وانگی کے زیر کمان تھیں ۔ اور انکو شکست دے کر بزور شمشیر انکی سلطنت پر قبضہ کر لیا ۔ ڈیماک کی ریاست چونکہ اسلام قبول کر چکی تھی ۔ اس لیے ان لڑائیوں میں چریبون والوں کی مدد کرتی رہی ۔

اس عظیم الشان اسلامی سلطنت (چریبون) نے اگرچہ ڈیماک اور پاجاجاراں جیسی ریاستوں پر قبضہ کر لیا لیکن آہستہ آہستہ اپنی قوت کھوتی گئی ۔ اور ۱۶۲۵ء میں ماتارام (جگجا) کے زیر اثر اور ۱۶۳۲ء میں بالکل ماتارام میں مدغم ہو گئی ۔ جس کا اصلی سبب پانام باہاں کے مرنے کے بعد اس سلطنت کے دو حصے ہونے ہیں جو اسکے دو بیٹوں میں تقسیم ہوئے ۔ جو بعد میں سلطان سیپوہ اور سلطان انوم کے نام سے مشہور ہوئے ۔ ان دونوں کو باپ نے اس شرط پر سلطنت دی تھی کہ وہ تیسرے بیٹے کے لیے گوڈونگ (پنام باہاں) کی ریاست فتح کر دیں گے ۔ اس مشہور جنگ میں وہ دونوں پکڑے گئے ۔ اور کارٹا میں سیاسی قیدی بنا کر رکھے گئے ۔ اور بعد میں سلطان ڈیماک معروف بہ ابوالفتح کی وساطت سے آزاد ہو کر اپنی مملکت میں واپس آئے ۔

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۱۹ء میں شہر بٹاویہ کی بنیاد ڈالی ۔ اور چریبون کے شہزادوں کے قید ہو جانے کے دنوں میں چریبون پر قبضہ کر لیا تھا ۔ اس لیے ان دونوں نے واپس آتے ہی ایک طرف ماتارام کی اسلامی سلطنت سے عداوت کو بڑھانا شروع کیا ۔ دوسری طرف ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے برخلاف کارروائی شروع کی ۔ کمپنی والے چاہتے تھے کہ اس سلطنت کو تینوں

حصہ داران سلطنت میں اس طرح پر تقسیم کر دیں جس میں سراسر اپنا ہی فائدہ ہو۔[1] چنانچہ اس ڈچ کمپنی نے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی سے مل کر نبتام وغیرہ کے سلسلۂ تجارت بحری کو اپنے جہازوں کے ذریعہ سے بند کر دیا۔ جس سے یہ سب راجگان مجبور ہوئے کہ نصرانیوں کے ساتھ سلسلۂ دوستی قائم کریں۔ اور سنہ ۱۶۵۹ء میں اس کی ابتدا ایک عہد نامہ کے ذریعہ سے ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ نصرانیوں کے پاؤں جمتے گئے۔

مسلمانوں کی ایک قوی سلطنت ماتارام (جگجا) کی تھی۔ جس کی طاقت سنہ ۱۶۱۳ء سے سنہ ۱۶۴۶ء تک تمام جاوہ اور مدورا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کے بادشاہ کو جس کا نام سلطان اگنیگ تھا۔ سنہ ۱۶۴۳ء میں مکہ سے سلطان کا خطاب ملا تھا۔ اب اس تمام علاقہ میں یہی ایک اسلامی سلطنت قوی رہ گئی تو نصرانیوں نے "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کر کے وسط جاوہ کے سلاطین کو مغربی جاوہ والوں کے خلاف بھڑکا دیا۔ یہاں تک کہ دونوں کی طاقتیں اس خانہ جنگی میں برباد ہو گئیں۔ اور "دو مرغ جنگ کنند فائدہ تیر گر" والی مثل ان پر صادق آ گئی۔ ڈچوں نے ان لوگوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تمام ریاستوں پر اپنا اثر جما لیا۔ اور اب ان تمام جزائر میں سوائے چند محبوس اور بے اختیار سلاطین کے کوئی خود مختار علاقہ باقی نہیں رہا۔

ڈچ گورنمنٹ نے اسلامی سپہگری سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ اور اب تک اٹھا رہے ہیں۔ سنہ ۱۶۲۸ء میں جب ماتارام کے سلطان نے بٹاویہ کی ڈچ آبادی پر حملہ کیا تو ڈچوں نے مسلمانوں ہی کی فوج سے ان کو شکست دی۔ جن کو آخر خانہ جنگی اور تجارتی مقاطعہ کے سبب سے نبتام اور چریبون والوں کی طرح نصرانیوں کے ساتھ دوستی ہی کرنی پڑی۔ آج کل بھی ڈچ گورنمنٹ کی جاوہ کی فوج کا معتد بہ حصہ مسلمان ہے۔ اور اسلامی فوج کے ذریعہ سے ڈچوں نے دور دراز کے وحشی جزائر پر اپنا قبضہ کر لیا۔ اور ہر جگہ اپنی سلطنت قائم کی۔

آج کل یہاں کے مسلمانوں میں سب سے بڑی عزت حاجی بننے کی ہے۔ اور جو لوگ حج کر آتے ہیں وہ سر پر عمامہ باندھ لیتے ہیں۔ اسی طرح جو عورت حج کر آتی ہے وہ سر پر کپڑا باندھ لیتی ہے۔ [illegible]

---

[1] Monumental Java. By J. I. Scheltemma, M.A. (مانومنٹل جاوا مولفہ شالٹما ص۲۷)

بالکل ننگی پھرتی ہیں۔ گویا حج کے بعد یہ لوگ نصف عربوں کی سی شکل بنا لیتے ہیں۔

آج کل توہمات کا ان لوگوں میں بہت زور ہے۔ اخلاقی حالت بہت ہی خراب ہے۔ یہ لوگ آرام طلب بہت زیادہ ہیں لیکن زمین زرخیز ہے۔ اس لیے آسودہ حال ہیں۔ دین اسلام کی حقیقت سے بالکل واقفیت نہیں۔ مذہباً سب شافعی ہیں۔

عبدالسلام رفیقی

جذبات فانی

کیوں نہ نیرنگِ جنوں پر کوئی قرباں ہو جائے
گھر وہ صحرا کہ بہار آئے تو زنداں ہو جائے

برق دم لینے کو ٹھہرے تو رگِ جاں ہو جائے
فتنۂ عشق مجسم ہو تو انساں ہو جائے

جوہرِ آئینۂ دل ہے وہ تصویر ہے تو
دل وہ آئینہ کہ تو دیکھ کے حیراں ہو جائے

غم وہ راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں
دم وہ مشکل ہے کہ موت آئے تو آساں ہو جائے

عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا
عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے

ذرہ وہ رازِ بیاباں ہے جو افشا نہ ہوا
دشت وحشت ہے وہ ذرہ جو بیاباں ہو جائے

غمِ محسوس وہ باطل جسے کہتے ہیں مجاز
دل کی ہستی وہ حقیقت ہے جو عریاں ہو جائے

خلد میخانے کو کہتے ہیں بقولِ واعظ
کعبہ بتخانے کو کہتے ہیں جو ویراں ہو جائے

سجدہ کہتے ہیں درِ یار پہ مر جانے کو
قبلہ وہ سر ہے جو خاکِ درِ جاناں ہو جائے

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن فانی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

فانی

زاریِ عفت

فطرت ہیں آسماں کی بلندی و سرکشی — خاکِ حزیں کو ضعف ہے اور عجز و نارسی
لیکن اس اختلاف کی اساس ہے شانِ جبر — تنظیمِ کائنات ہے وہ بندشِ قوی
بجلی گرائے چرخ زمیں پر ہزار بار — طاقت نہیں غریب کو جنبش کرے کبھی
وہ شوخیاں کرے یہ تحمل کیا کرے — حاصل ہے اس نظام کا دُنیا کی زندگی

اے خوگرِ شدائدِ دوراں خفا نہ ہو
سرگرمِ شکوۂ ستمِ ناروا نہ ہو

اے خاکِ پاک حُسنِ نباتی کی ماں ہے تُو — آغوشِ مہرِ پرورشِ بحر و کال ہے تُو
تو ہی محلِ عقل ہے اور تو ہی ظرفِ روح — نوعِ بشر کا محملِ لیلائے جاں ہے تو
جذب و کشش ہے تیری ہے مائل ترا جہاں — معشوقۂ جمیلۂ دورِ زماں ہے تو
صبار و بُردبار و متین و حلیم و نرم — تانیث کی صفات کی روحِ رواں ہے تو

وہ جسمِ نازنیں کہ جو اُمّ البنات ہے
تو خود اگر نہیں تو تری ذریات ہے

عورت میں ہے زمیں کے خصائص کا التزام — سعیِ بقائے جنس ہے کام اُس کا لاکلام
تولید و تربیت میں ہے مشغول رات دن — اُس لئے بغیرِ امرِ معیشت ہیں ناتمام
دُنیا کے کاروبار میں اور دیں کی راہ میں — ہے اُس کی ذات لازمۂ حُسنِ انتظام
نے نور کا وجود نہ ظلمت کی ہو نمود — باہم جو مختلط نہ ہوں ہر روز صبح و شام

اس جنس کا عدم بھی عدم ہے وجود کا
لازم ہے اہتمام ولود و ودود کا

اے توشہ دارِ خلوتِ آدم نگارِ خلد — ہے اس عذابِ نار میں تو یادگارِ خُلد
رفتارِ اہتمام مشاغل نہیں تری — جاری ہے صحنِ خانہ میں اک آبشارِ خلد

تزئینِ خانہ دخترِ حوّا اگر کرے — آئے نظر ہجومِ خزاں میں بہارِ خلد
تسکینِ مضطرب تری الفت سے کیوں نہ ہو — بخشا تجھے خدا نے سکون و قرارِ خلد

رحمت مودّت اب جو کہیں اس جہاں میں ہے
وہ حلیۂ جناں ترے گنجِ گراں میں ہے

چادر سکونِ شب کی تھی رخ پر پڑی ہوئی — کھینچی سحر نے آکے تو تو اٹھ کھڑی ہوئی
اقلیم خانماں کی فداکار و جاں نثار — ہر دم ہے اپنے عزم مہم پہ اڑی ہوئی
اللہ ری ناخوشی میں تری خوش کلامیاں — بلبل چہک رہی ہے صبا سے لڑی ہوئی
وہ آبلہ ہے تو کفِ آہستہ گیر کا — شق ہو گیا ذرا جو ہتیلی کڑی ہوئی

خلقت تری حیا سے صدا باغ باغ ہے
چھوٹے اگر نسیم تو تو داغ داغ ہے

بچوں کی پرورش میں گذاری تمام عمر — شوہر کے قہر و مہر پہ واری تمام عمر
تھک تھک کے گر پڑی نہ رہا تن بدن کا ہوش — خدمتگذاریوں سے نہ ہاری تمام عمر
کنجِ قفس ہمیشہ رہا تجھ سے باغ باغ — نکلی نہ گھر سے فصلِ بہاری تمام عمر
تاثیر سے تری ہوے آوارہ پارسا — بگڑے ہوؤں کی تو نے سنواری تمام عمر

ہنس کر روا روی میں جب اک بات کر گئی
سینہ میں شورِ قلزمِ جذبات بھر گئی

ناخوش ہوا کوئی تو زباں بند ہو گئی — دیکھا جب التفات رضامند ہو گئی
تلخی کی بول چال میں پیدا کیا یہ ذوق — لب پر جو آئی بات وہ گلقند ہو گئی
بارانِ شیر کیوں نہ کرے چرخ سے نزول — تو کمسنی میں مادرِ فرزند ہو گئی
جس در پہ آکے بیٹھ گئی مر مٹی وہیں — ایسی مٹی کہ خاک کا پیوند ہو گئی

سرنامہ مروت و مہر و وفا ہے تو
مظلوم کی شریک و رفیقِ بلا ہے تو

زانو ہے اور مریض کا سر ہے تمام رات — بیداریوں میں تیری بسر ہے تمام رات

دن بھر ہوا نہ طفلِ حزیں گود سے جدا | ناطاقتی سے دردِ کمر ہے تمام رات
معلوم ہے مجھے وہ مصیبت کہ جس میں روز | بیکس تری غذا پہ نظر ہے تمام رات
فاقہ میں چشمِ سدرمق ہے تمام دن | سردی میں انتظارِ سحر ہے تمام رات

رکھتی ہے لاج کھیل کے تو اپنی جان پر
مرنے میں تجھ کو باک نہیں آن بان پر

اے وہ کہ تیرے حق کی حمایت خدا نے کی | مظلومیوں میں دادرسی انبیا نے کی
اے ہمنشین بوے خوش و لذتِ نماز | توقیر تیری بادشہِ دوسرا نے کی
دن رات جبکہ عالمِ بالا کا شوق تھا | اُس وقت تیری یاد رسولِ خدا نے کی
تیری کبھی کچھ مزاج شگفتہ میں آگئی | تسلیم شرطِ عفو جو خُذ ما صفا نے کی

شاہ و گدا اسکے ساتھ ترا ایک ڈھنگ ہے
بیساختہ ہے بات تری بے درنگ ہے

کرتے ہیں ذکر تیرا مذمت کے ساتھ اگر | وہ شکوۂ تغیرِ عادت ہے سر بسر
جس خاصہ پہ ناز ہو مخصوصِ وصف کو | اُس خاصہ بغیر ہے تخصیص بے اثر
تیرہ ہو آبگینہ تو پتھر کہو اُسے | خالص اگر نہیں ہیں تو مٹی ہیں سیم و زر
اک شرف ہے شرافتِ انساں کا لازمہ | جب وہ نہیں تو حضرتِ انساں ہیں گاؤ خر

باقی ہے بُو تو مشک ہے بعد اُسکے خاک ہے
پانی نہیں کوئیں میں تو تیرہ مغاک ہے

مرنے کے بعد دفن کا ساماں ہے ضرور | میت کو لیکے بیٹھے وہ نادان ہے ضرور
بیگانۂ و یگانہ غرض وہ کوئی بھی ہو | بے روح کا جسد تنِ بیجان ہے ضرور
شرطِ صفت ہے ہستیِ موصوف کا وجود | انساں میں عقل اگر نہ ہو حیوان ہے ضرور
اوصاف سے جب اپنے کیا اُسنے انحراف | خاتون کے لباس میں شیطان ہے ضرور

اُس کا علاج دیں نے سکھایا ہے واہجرو
تدبیر اس کی شرع میں آئی ہے واضربو

آغاز حشر و نشر ہے مغرب کی روشنی — گُل کرتے ہیں چراغ تجلّائے طور کا
فتویٰ ہے اب یہ مسئلۂ ازدواج پر
ایمان لاؤ بھائیو انگلش رواج پر
وقت طلوع شمس ہے ظلمت کا انہزام — روشن روانِ روز ہوے فائز المرام
ور ناک کے طوفاں کا شور ہے — موجوں میں غرق ہو گئے ایران و روم و شام
پھر جب ہوا غروب سے آغاز تیرگی — روے زمیں پہ چھا گئی بدبختیِ ظلام
اب ہم ہیں اور یہ وسطِ اقلیلِ پُرخطر — ہر اک قدم پہ دیکھیے فتنوں کا اژدحام
آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سر گذشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

تپش خورجوی

نواے جلیل

لے لے تیغ نازِ حسنِ یار جب قاتل ہوا — دل نکل کر پہلوِ عاشق سے خود بسمل ہوا
یادِ لیلےٰ سے تصور میں یہ تصویریں کھنچیں — سینہ صحرا ہو گیا، دل قیس کا محمل ہوا
گر پڑا حسرتِ ناکاں سے دل ابرو نے ٹکڑے کر دیے — ناوک افگن ہو کے خنجر آزما قاتل ہوا
کچھ ہے پاسِ بیکسیِ عشق کچھ اُن کا خیال — جان دینا بھی محبت میں بہت مشکل ہوا
گر نہ ساحل تک پہونچتے ڈوبتے ہی کاش ہم — بحرِ الفت میں اُترنا سعیِ لاحاصل ہوا
ہم کو رکھا سرخرو دونوں جہاں میں عشق نے — "کائناتِ ہر دو عالم اک ہمارا دل ہوا"
بحرِ خارِ محبت اور یہ جسمِ ناتواں — جتنا پہونچا پاس میں دور اتنا ہی ساحل ہوا
بحرِ ہستی کے تلاطم میں مری منزل نہ پوچھ — کشتیِ ہستی جہاں ڈوبی وہیں ساحل ہوا
یوں ہوئی جذبِ محبت کی نمائش اے جلیل
خونِ دل کا عکس حسنِ یار میں شامل ہوا

جلیل قدوائی

نظرے خوش گذرے

میں باہر نہیں جا سکا، اور جاتا تو بارش و سیلاب نے جو ریلوں کے انتظام میں ابتری پیدا کی ہے اُسکی وجہ سے غالباً وقت پر واپسی نہ ہوتی اور یہ پرچہ بہت تاخیر سے شایع ہوتا - الناظر کے کاتب صاحب کے عین وقت پر دفعتہً بیمار ہو جانے کے باعث پھر بھی ایک ہفتہ کی تاخیر ہوئی، اور مزید تاخیر سے بچنے کے لیے کتابوں پر تبصرہ اور روداد سفر حجاز دونوں سے قطع نظر کرنا پڑا - جن اصحاب کو خطوط میں توقع دلائی گئی تھی کہ اُنکی کتابوں پر اس نمبر میں تبصرہ شایع ہوگا وہ معاف فرمائیں - تبصرہ لکھا ہوا موجود ہے - انشاء اللہ آیندہ پرچہ میں درج ہوگا - الناظر کی اشاعت بڑھانے والوں کا شکریہ بھی سردست ملتوی -

---

جوش صاحب کو جس بات کا کھٹکا تھا، وہی پیش آئی - چلپی صاحب کی بندوق بالآخر دغ گئی - اب دیکھیے جان و عزت، دونوں میں سے کون سلامت رہے - مجھے تو دونوں کی خیر نہیں نظر آتی - اسلیے کہ بندوق اگرچہ توڑے دار ہے، مگر اسکی مار شاہی زمانہ کے شیر بچہ سے کم نہیں - شیر بچہ میں دو ساہی پیسے بھرے ہوتے تھے تو چلپی صاحب کی بندوق میں طنزیات، اعتبہ آلی آبادیات کا ایسا آتشیں مرکب بھرا ہوا ہے کہ اسکے زہریلی گیس سے دُور دُور تک لوگوں کو پناہ نہ ملیگی - الحفیظ والاماں - میں اپنے مخلص دیرینہ سلطان حیدر صاحب کے ساتھ اس حادثہ فاجعہ میں دلی ہمدردی رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ صبر و تحمل کی ناقابل نفوذ زرہ اُنکی جان و عزت کو صدمہ سے بچالے ورنہ مجھے رسم تعزیت ادا کرنے کے لیے زحمت سفر گوارا کرنا ہوگی -

چلپی صاحب سے بھی ایک عرض بے موقع نہ ہوگی - اسلام نے انتقام کی رخصت دی ہے مگر عفو کا درجہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ انتقام میں کوئی خوبی نہ رہی - مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کا بھی یہی مقصود و مفہوم ہے - حکیم شیراز نے کیا خوب کہا ہے

درعفو لذتیست کہ در انتقام نیست

۹ اگست ۱۹۲۴ء

فصلی بخار و طحال کی دوا

فصلی بخار و طحال کے لیے یہ ایک ہی دوا ہے۔ آج کل سیکڑوں اشتہار فصلی بخار و طحال کی دوا کے آپ دیکھتے ہوں گے مگر ان میں عموماً کونین رہتی ہے۔ اس لیے یہ دوائیں بخار کو کچھ وقت تک تو روک دیتی ہیں مگر جڑ سے آرام نہیں کر سکتی ہیں۔ ایسے بخار کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی فصلی بخار و طحال کی دوا چند روز میں ایک دم آرام کرنے کا دعوےٰ رکھتی ہے اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھکر قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔ اس میں تین خاص صفتیں ہیں (۱) ملیریا کے [illegible] کو مار دیتی ہے اسلیے چار پانچ ہی خوراک کے استعمال سے بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے (۲) یہ خون کو بڑھا کرتی ہے اور اسکی خرابیوں کو مٹاتی ہے (۳) یہ طحال کو گلاتی ہے۔ قیمت فی شیشی کلاں ۱۲ر شیشی خورد ۱۰ر محصول ڈاک شیشی کلاں ۸ر اور خورد ۶ر

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں

لیرہ و بخار پرانا ہو جانے پر بار ی سے نہ آکر دن رات تھوڑا بہت چڑھتا ہے۔ جسم کا خون پانی سا ہو جاتا ہے اور آدمی کا رنگ پھیکا میلا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی محنت سے کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ سانس پھولتی ہے۔ کھانے کی خواہش اور قوت بہت ہی گھٹ جاتی ہے۔ تلی کے بڑھنے سے پیٹ نکل آتا ہے۔ کبھی منہ اور ہاتھ پیروں پر ورم آجاتا ہے اور زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ گولیاں فائدہ کرتی ہیں اور چار ہی پانچ خوراک میں بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱۰ر محصول ڈاک ایک سے دو ڈبیہ تک ۶ر

کونین کی گولیاں

یہ چار گرین کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹکیاں بنتی ہیں اور سنہری پیٹنٹ ڈبیہ میں ہوتی ہیں۔ کونین کا استعمال کرنا ہو تو یہ گولیاں پاس رکھیے۔ اس میں نہ وزن کی ضرورت ہے نہ کھانے میں تلخی ہے قیمت پچیس گولیوں کی ڈبیہ ۱۲ر محصول ڈاک ۶ر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تارا چند دت اسٹریٹ۔ کلکتہ

ایجنٹ :۔ گنگا رام مینتی۔ چوک لکھنو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۶۰و۱۶۱ جلد ۲۷ — اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۲۴ء

فیہ ما فیہ

(اثر خامہ: چلپی)

دو بھائی قرآن میں

دُنیا کی سب سے زیادہ معتبر و مستند کتاب میں یوں مذکور ہے، کہ ایک مرتبہ ایک برگزیدہ قوم اپنی شامتِ اعمال کی پاداش میں ایک زبردست و طاقتور حکومت کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہوگئی تھی، اُسکے حقوق بیدردی کے ساتھ پامال کیے جانے لگے، اُس پر سختیاں ہر طرح کی ہونے لگیں، یہاں تک کہ اُسکی اولادِ ذکور پیدا ہوتے ہی ذبح کر دی جانے لگی۔ ظالم گورنمنٹ کو اپنی قوت و طاقت پر غرّہ تھا، ارکانِ حکومت کو اپنی حکمت و تدبیر پر ناز تھا، اور فرماں روائے وقت حدودِ بشریت و عبدیت سے متجاوز ہو کر اپنے تئیں عملاً، کارسازِ حقیقی، رب الارباب و احکم الحاکمین کے مرتبہ پر رکھنے لگا تھا۔ عین اُس وقت غیرتِ الٰہی حرکت میں آئی، اور محکمۂ قضا و قدر سے اُس مظلوم و بے بس قوم کو ظالم و پُر قوت حکومت سے نجات دلانے کا فرمان صادر ہو گیا۔

عالم ناسوت، عالم اسباب ہے، یہاں ہر مقصد کی تکمیل بندوں کے ذرایع سے کی جاتی ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے بھی ایک نہایت ہی مقبول و برگزیدہ بندہ کا انتخاب ہوا، جو اُسی محکوم و مظلوم طبقہ کا تھا

کا ایک بے بس و بےکس فرد تھا۔ اس مقدس بندہ نے عرض کی کہ "تنہا میرا دوش ناتواں اس بار عظیم کا تحمل نہ کرسکے گا، میرا بھائی مجھ سے زیادہ زبان کی قوت رکھتا ہے، اسے بھی میرا شریک کار و رفیق بنایا جائے۔" یہ عرض فوراً مستجاب ہوئی، اور نیابت الٰہی کے منصب مقدس پر "دونوں بھائی" ایک ساتھ مامور ہوئے۔ ظالم و جابر حکومت کا جبر و تشدد (Repression) اور افراط و طغیان (Violence) سب میں مشہور تھا، ان دونوں بھائیوں کو اپنے متعلق بھی یہی خیال ہوا، کہ حکومت ہمارے ساتھ بھی اپنے تشدد و طغیان کے ان ہی طریقوں سے پیش آئے گی۔ قَالَا رَبَّنَا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا اَوْ اَنْ یَّطْغٰی (طٰہٰ ع ۲) سکینت الٰہی نے ڈھارس دی، اور عرش کی کبریائیوں سے القاء ہوا کہ "ہماری نصرت و تائید تمہاری رفیق ہوگی، پریشان خاطر نہ ہو۔" ساتھ ہی اس کی خاص تاکید ہوئی، کہ کہیں تم بھی تشدد (Violence) کے مقابلہ میں تشدد نہ اختیار کر بیٹھنا،

فقولا لہٗ قولا لینا (طٰہٰ ع ۲)	بلکہ عمل میں تشدد تو الگ رہا، اپنی گفتگو و تقریر تک میں عدم تشدد (Non Violence) پر عامل رہنا کہ یہی اقوام محکوم و مغلوب کے اسلحہ خانہ میں سب سے زیادہ قوی و کارگر حربہ ہے۔

یہ برادران محترم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) جس خدمت مقدس پر متعین ہوئے تھے، وہ یہ تھی، کہ مظلوم و محکوم

فَاْتِیٰہُ فقولا انا رسولا ربک فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ولا تعذبہم (طٰہٰ - ع ۲)	قوم بنی اسرائیل کو ظالم حکومت کے شدائد سے نجات دلائیں، اور استبداد کی غلامی سے آزاد کرائیں۔

یہ دونوں برادران گرامی قدر (علیہما السلام) جس سفارت الٰہی پر مامور تھے، وہ یہی تھی کہ قوم اسرائیل

فقولا انا رسولا رب العالمین ان ارسل معنا بنی اسرائیل (شعرا - ع ۳)	کو ظالم حکومت کی غلامی سے رہائی دلاکر خدائے عالم و عالمیان کی طاعت و بندگی کی جانب لائیں۔

فرماں روائے وقت کو یہ صدائے حریت و مطالبۂ حقوق اس قدر نامانوس اور انوکھا معلوم ہوا،

قال لمن حولہٗ الا تستمعون (شعرا - ع ۲) قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون (شعرا - ع ۲)	کہ اس نے اپنی پارلیمنٹ کے سامنے، اپنی کیبنٹ کے روبرو، بڑے ہی حیرت و استعجاب کے ساتھ اس مطالبۂ آزادی کو نقل کیا، اور کہا کہ ایسا عجیب مطالبہ پیش کرنا تو کسی غیر ذمہ دار سڑی سودائی، خبطی دیوانہ ہی کا کام ہو سکتا ہے!

اس گورنمنٹ کو اپنے وسائل مادی و مالی، اپنی قوت حربی و عسکری، اپنی اعلیٰ تہذیب و شائستگی

اپنی تنظیم و تدبیر پر ایک غیر متزلزل اعتماد تھا۔ اور
اِنّا فوقہم قاہرون (اعراف۔ ۱۵) | اپنے تفوق و ترفع پر ایک غیر مشتبہ اطمینان۔ اور اس عاقل و دانا، ہوشیار و فرزانہ، حکومت کے تصور میں اس کا تو امکان بھی نہیں آسکتا تھا کہ ایسی مقتدر و منتظم، با اقبال و صاحب جبروت حکومت کو کسی حالت میں بھی،

قالوا انؤمن لبشرین مثلنا و قومہما لنا عابدون (مومنون۔ ع ۳) | مفتوح و محکوم رعایا کے دو بیکس و بے بس افراد کے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

پس رعب شہنشاہی کے جملہ آداب و لوازم کو ملحوظ رکھ کر، اپنے اختیارات و اقتدارات، تعزیرات و ضوابط کا پورا مظاہرہ کرکے اور ٹھیک اس ڈھٹائی کے ساتھ، جو ہر سرکش و خدافراموش حکومت کا خاصہ ہوتی ہے، شیطان کی آواز، فرعون کے دہن و زبان سے یوں برآمد ہوئی کہ

قال لئن اتخذت الٰہاً غیری لاجعلنک من المسجونین (شعراء۔ ع ۲) | خبردار، اگر ہماری گورنمنٹ کے سوا، کسی دوسری حکومت سے لَو لگائی، تو اتنا سمجھے رہنا کہ ہمارے جیل خانوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔!

"دیوانہ" حق فرزانۂ دنیا کی دھمکیوں سے غیر متاثر رہا۔ وہ دلائل محکم و شواہد پیہم کے ساتھ اپنی قوم کی آزادی کے مطالبہ پر قائم رہا، اور یہی کہتا رہا کہ

و جاءہم رسول کریم ان ادّوا الیّ عباد اللّٰہ (دخان۔ ع ۱) | بندگان خدا کو اپنا بندہ بنانے کی بجائے خدا کا بندہ بننے دو۔

جب آزادی کا مطالبہ کسی طرح نہ دبا، بلکہ (باصطلاح حکومتِ حال) "شورش" و "بےچینی" روز بروز بڑھنے لگی، تو فرعون اور فرعونیوں کے کیمپ میں ایک کھلبلی مچ گئی، اور اُس وقت کے بڑے بڑے خان بہادر و رائے بہادر، نواب بہادر و راجہ بہادر، رؤسا ذوالاقتدار و امرائے عظام، خطاب یافتہ و جاگیردار، تعلقدار و زمیندار، سب چلا اُٹھے کیا اب "سرکار کی جے" نہ پکاری جائے گی؟ کیا ہماری سرکار ابد قرار کا تسلط اُٹھ گیا، اور اب ملک مفسدوں اور شوریدہ سروں کے اوپر چھوڑ دیا گیا ہے، کہ وہ سرکاری اقبال کو جس طرح چاہیں، پامال کریں؟ کیا امن و آئین (Law and Order) کی حکومت اب ہمارے سروں سے اُٹھ گئی ہے؟

وَقال الملأ من قوم فرعون اتذر موسیٰ و قومہ لیفسدوا فی الارض و یذرک و اٰلہتک (اعراف۔ ۱۵)

سختیاں بڑھائی گئیں، تشداد میں اضافہ ہوا، نئے نئے قیود عائد کیے گئے، مظلوم رعایا زیادہ تاب نہ لا سکی، خود اپنے نجات دہندہ سے شکوہ و گلہ مندی کے لہجہ میں بولی کہ ہمیں تو تمھاری اس تحریک

قالوا اوذینا من قبل ان تاتینا و من بعد ما جئتنا (اعراف - ۱۵) | آزادی سے کچھ نفع نہیں پہونچا، ہماری تکالیف تو تمھاری آمد سے قبل بھی ایسی ہی تھیں، اور اب بھی ویسی ہی ہیں!

داعی حق (علیہ السلام) نے سمجھایا، کہ آزادی کی جنگ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے، مادی ذرائع و تدابیر

قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللّٰہ واصبروا، ان الارض للّٰہ یورثھا من یشاء من عبادہ، والعاقبۃ للمتقین (اعراف - ۱۵) | کے بجائے اپنا اعتماد خدا پر رکھو، اُسی سے مدد چاہو اور صبر و استقلال سے کام لیتے رہو، حکومتوں کا اُلٹ پھیر اُسی کے ہاتھ میں ہے، جسکو چاہے حکومت دے۔

ہاں یہ خیال رہے کہ آخری کامیابی اُسی کی ہوتا ہے جو شیطانی ترغیبوں سے بچتا ہے، اور رضائے حق میں کوشاں رہے۔

خدائی کی مدعی حکومت، خدائی قانون کی گرفت سے باہر نہ تھی، بایں ہمہ فکر و تدبیر، خوش نظمی و اقبالمندی، آخر اس سرکار عظمت مدار کو کبھی کبھی مصائب و آفات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہی تھا۔

ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم یذکرون (اعراف - ۱۶) | کاش ان واقعات و حوادث سے عبرت و نصیحت حاصل کی جاتی! لیکن یہ ایک فاتح و متمدن قوم کی ذہنیت سے

کیونکر ممکن تھا! بجائے عبرت پذیری کے ہوتا یہ تھا، کہ جب کبھی کوئی صورت فلاح و بہبود کی پیدا ہوتی

فاذا جاءتھم الحسنۃ قالوا لنا ھذہ وان تصبھم سیئۃ یطیروا بموسیٰ ومن معہ (اعراف - ۱۶) | تو اُسے بلا تامل اپنی خوش انتظامی و اقبالمندی کا نتیجہ قرار دے لیا جاتا، اور اگر کوئی واقعہ اسکے برعکس پیش آتا، تو اُسے جھٹ اُسی

پیامبر حق اور اُسکی جماعت کی نحوست اور شامت عمل کی جانب منسوب کر دیا جاتا!

اس سے بھی بڑھ کر فرعونیت یہ تھی، کہ جب حکومت کو کوئی خطرہ عظیم درپیش ہوتا، تو فوراً اس آزادی طلب و آزادی خواہ جماعت سے اپنے تعلقات ہموار کیے جاتے، اُسکو پوری آزادی عطا کرنے کا وعدہ

لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل، فلما کشفنا عنھم الرجز الیٰ اجل ھم بالغوہ اذا ھم ینکثون (اعراف - ۱۱۶) | کر لیا جاتا، اور اُسکے سردار کے آگے سر اطاعت خم کرنے کا اطمینان دلا دیا جاتا، لیکن جوں ہی وہ خطرہ ٹل جاتا، معاً وعدے اور معاہدے، مواعید و مواثیق، پس پشت ڈالدیے

جاتے اور غلاموں کا طبقہ بدستور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا رہتا۔

ادھر یہ سب کچھ تھا، اُدھر آزادی کے سچے اور پکے علمبردار کے سامنے یہ درس موعظت بھی جاری تھا کہ ہمارے ہی ہاں کے تربیت یافتہ اور ہمارے نمک خوار ہو کر ہمارے مقابلہ میں آتے ہو، اور ہماری مہذب و شائستہ حکومت کی برکاتِ امن و نظم کو یکسر نظر انداز کیے دیتے ہو! کلیمؑ کی زبان گویا ہوئی، کہ جی

وتلك نعمة تمنها علىّ ان عبدت بنى اسرائيل (شعراء-ع ۲)

اور کیا! اور سب سے بڑھ کر آپ کا یہ احسان عظیم ہے، کہ ساری قوم بنی اسرائیل کو آپ نے اپنی غلامی سے مشرف و مفتخر کر رکھا ہے!

آزادی کا جذبہ ایک بار بیدار ہو کر، جس طرح کہیں بھی مردہ نہیں ہوا ہے، یہاں بھی استبداد کی قوتوں سے مسخر و مغلوب نہ ہو سکا، مظلوموں کی آہوں نے، بیکسوں کی فریادوں نے، یتیموں کی ٹھنڈی سانسوں نے بارہا عرش الٰہی تک کو ہلا دیا ہے، فرعون اور اُسکی گورنمنٹ بیچاری کی کیا بساط تھی، جو انکا مقابلہ کر سکتی، ایوانِ حکومت میں لرزہ پڑ گیا، قصر استبداد کی بنیادیں ہلنے لگیں، گھبرا کر خود سر فرماں روا نے اپنی "کیبنیٹ" کا ایک خفیہ اجلاس کیا، اور اہتمام رکھا، کہ کارروائی بالکل "کانفیڈنشل" رہے، باہر تک کوئی "رپورٹ" نہ پہونچنے پائے۔ بالآخر عقلاے سلطنت کی "ایکزیکٹو کونسل" بحث و مباحثہ

فتنازعوا امرهم بينهم واسروا النجوى (طٰہٰ-ع ۳)

اصلاح و شوریٰ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی، کہ "دونوں بھائیوں" نے سازش کر کے قوم پر افسوں پھونک دیا ہے، بغاوت پر کمر باندھ لی ہے، اور حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کا ارادہ کر لیا ہے، پس اس فتنۂ عظیم کے استیصال کا انتظام پوری قوت کے ساتھ کرنا ضروری ہے، اور اس

قالوا ان هٰذان لسٰحران يريدان ان يخرجٰكم من ارضكم ويذهبا بطريقتكم المثلىٰ فاجمعوا كيدكم ثم ائتوا صفا (طٰہٰ-۳)

کے لیے زورِ بازو و زورِ دماغ، قوتِ شمشیر، قوتِ تدبیر "آرگنائیزیشن" اور "پروپیگنڈا" کے تمام ذرائع و وسائل کو بروے کار لانا چاہیے!

یہ رائے قائم ہوتے ہی، اسپر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی امن سبھاؤں کی طرح، اُسوقت بھی جذبۂ آزادی کو دبانے کے لیے ملک بھر میں مجلسیں اور انجمنیں قائم ہونے لگیں، رائے عامہ کو اپنے موافق و ہموار بنانے کے لیے جس طرح آج ہر ہر صوبہ میں "پبلسٹی بیورو" قائم ہیں، اُسوقت بھی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جانے لگی۔ اور خلق خدا کو گمراہ کرنے کا کام آج جس طرح نیم سرکاری اخبارات سے لیا جاتا ہے، اُسوقت بھی کوئی کوشش اُٹھا نہ رہی۔ غرض خلقت پر سرکار کی ہیبت و عظمت اقبال و جبروت کا سکہ بٹھانے کے لیے "کید" "سحر" "استرہاب" کی قوتوں کا

وابعث فى المدائن حٰشرين ياتوك بكل سحّار عليم (شعراء-۳)

وارسل فى المدائن حٰشرين ياتوك بكل ساحر عليم (اعراف-۱۴)

سحروا اعین الناس واسترہبوہم وجاؤ بسحر عظیم (اعراف-۱۴) | عمل پورے زور وشور کے ساتھ جاری رہا، اور ٹھیک آجکل کے مدبرین مملکت و دانایان سیاست کی طرح فرعون کی... گورنمنٹ برابر اسی کا اعلان کرتی رہی کہ یہ تو معدودے چند شورش پسند

فارسل فرعون فی المدائن حشرین ان ہؤلآء لشرذمۃ قلیلون - وانہم لنا لغائظون وانا لجمیع حٰذرون (شعرا-۴) | اور شورش پسندوں نے ملک میں فتنہ و فساد برپا کر رکھا ہے، اور اس لیے ہم کو مجبوراً انھیں کے خلاف ذرا سخت کارروائی کرنا پڑتی ہے، ورنہ سارا ملک تو ہماری وفاداری پر ثابت و استوار ہے، اور ہماری حکومت بھی عام رعایا پر دل سے مہربان ہے!

آج کل کے وفاداران سرکار و ہوا خواہان دربار کی طرح، اس وقت کے نیاز کیشان حکومت بھی شاید اغراض ذاتی کی آلائش سے بالاتر نہ تھے "دونوں بھائیوں" کی مخالفت میں کام تو بڑی ہی ہوشیاری وسرگرمی سے کیا، لیکن ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی پیش کر دیا، کہ اگر اقبال خداوندی سے ہم نے حریف کو نیچا

قالوا ان لنا لاجرا ان کنا نحن الغالبین (اعراف-۱۴) | دکھا دیا تو پھر ہم کو خاطر خواہ انعام بھی، جاگیر یا سند، خطاب یا جائداد کی شکل میں ضرور عطا ہو! حکومت کے خزانۂ عامرہ میں جو غریبوں سے

حاصل کی ہوئی دولت سے لبریز تھا، اسکی کیا کمی تھی، بہ غایت لطف وکرم ارشاد ہوا، کہ تنہا خطاب و جائداد

قال نعم، وانکم لمن المقربین (اعراف-۱۴۰) | پر کیا موقوف ہے، دولت تقرب خاص سے بھی سرفراز ہوگے، رازداری و اعتماد کے مناصب تمھارے لیے ہیں، وزارت تمھارے لیے ہے، گورنری تمھارے لیے ہے، ہم خود تمھارے لیے ہیں۔

غرض یہ سارے جتن ہوئے، کروفن، تدبیر واحتیال، حیلہ وسازش، طاقت وجبروت، عظمت و شوکت، ہر شے کے شاندار مظاہرے ہوئے، اور وہ سب کچھ کیا گیا، جو ایک متمدن وبااقبال سرکار کے بس میں ہے، اور جن کی ساری تفصیل، قرآن پاک کے تین مختصر فقروں (فاجمعوا کیدکم - واسترہبوہم - وجاؤ بسحر عظیم) کے اندر جھلک رہی ہے - لیکن آخری نتیجہ جو برآمد ہوا، وہ اوراق لیل ونہار پر ثبت ہے، صحیفۂ کائنات کی ایک ایک سطر اس کی شہادت دے رہی ہے - سروری وسرداری کو اپنا حق فطری سمجھنے والا سر ذلت ورسوائی کے گہرے سمندر میں غرق ہوا، دوسروں کے لیے غلامی اور اپنے لیے خواجگی کو مخصوص سمجھنے والے جسم نے اپنے تئیں پانی کی چند لہروں کے سامنے بے بس پایا، اور انا ربکم الاعلیٰ اور انا فوقہم قاہرون پر کھلنے والی زبان، جب بند ہونے لگی، تو اپنے تئیں اس اعتراف پر مجبور پایا، کہ

آمنت انہ لا الٰہ الا الذی آمنت بہ | کہ بنی اسرائیل بے بس ومغلوب تھے، لیکن ان کا معبود بے بس و

بنو اسرائیل و انا من المسلمین (یونس - ع ۹) | مغلوب نہ تھا۔ قوت و اقتدار، حکومت و اختیار، سارے کا سارا، صرف اُسی کا تھا، اُسی کا ہے، اور اُسی کا رہے گا۔

اور وہ سلطنت، جسے اپنے اقبال و خوش بختی پر ناز تھا، جسے اپنے ذرایع و وسائل پر غرہ تھا، جسے اپنی ثروت و سرمایہ پر اعتماد تھا، جسے اپنی تنظیم و شائستگی پر گھمنڈ تھا، چشم زدن میں (زاروں کی سلطنت کی طرح) ایسی معدوم ہوئی، کہ آج بجز کتاب عبرت کے، کہیں اُس کا نام و نشان تک نہیں ملتا! فرعون مٹ گیا، اسکا جاہ و حشم رخصت ہوگیا، اُسکی وزارتیں غائب ہوگئیں، اُسکی کونسلیں افسانہ بن گئیں، اُسکے وفاکیشوں کی ہڈیاں تک ہوا میں مل گئیں، اُسکے وابستگانِ دامن اور حاشیہ نشینان و مقربین دربار کا تذکرہ، تذکرۂ عبرت رہ گیا۔ لیکن وہ دونوں برادران محترم (علیہما السلام)؟ وہ دونوں "دیوانہ"؟ وہ دونوں "ساحر"؟ وہ ایک بےبس رعایا کے دو بےبس افراد؟ وہ آج بھی زندہ ہیں، کل بھی زندہ رہیں گے، اور اُس وقت تک زندہ رہیں گے، جب تک اُن کا زندہ و قائم، حی و قیوم، ازلی و ابدی، پروردگار اُنھیں زندہ رکھے!

دو بھائی ہندوستان میں

آج ہندوستان میں بھی دو بھائی موجود ہیں، خدائے واحد کے پرستار، رسولِ اسلام کے عاشق زار، کفر و غلبۂ کفر سے بیزار، اُسوۂ موسوی کی زندہ یادگار۔ یہ دونوں بھائی بھی ایک پسماندہ، مغلوب و محکوم قوم کے افراد ہیں۔ ان دونوں بھائیوں میں بھی باہم بےحد محبت و اعتماد ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی ہر امانت الٰہی کی ادائی میں ایک دوسرے کے رفیق و شریک رہتے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کا نشو و نما بھی ایک زبردست و متمدن حکومت کے سایۂ عاطفت میں ہوا۔ یہ دونوں بھائی بھی ایک زمانہ تک حکمراں جماعت سے بڑے گہرے تعلقات رکھ چکے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک با اقبال و پُر شکوہ حکومت کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا ہے کہ انکے ہمقوموں کو اپنی غلامی سے آزاد کرکے خدا کی غلامی میں آنے دے۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی اپنے تئیں تشدد سے محترز رہنے، اور قول و فعل میں عدم تشدد پر قائم رہنے کا پابند کرلیا ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی حکومت قاہرہ کی طرف سے، سخت سے سخت شدائد و تعزیرات کا تحمل کر چکے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں پر بھی حکومت کی طرف سے یہی الزام ہے، کہ اپنی ایک قلیل جماعت کو ہمراہ لے کر ملک میں شورش پھیلا رہے ہیں، اور امن عامہ میں خلل ڈال رہے ہیں۔ ان دونوں بھائیوں کی تحریک کے جواب میں بھی، حکومت، اخبارات نکلوا چکی ہے، انجمنیں اور سبھائیں قائم کرچکی ہے اور بکثرت مضامین و رسائل شایع کرا چکی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی بھی مخالفت کے صلہ میں سرکار دولتمدار، اپنے تقرب سے مشرف کرتی ہے، خطابات عطا فرماتی ہے، اور مناصب اعلیٰ عنایت کرتی ہے۔

یہ دونوں بھائی بھی بجز صبر و توکل، استقامت و تحمل، اور توقع الطاف و عنایات حق کے، ہر قسم کے ساز و سامان ظاہری سے معریٰ و محروم ہیں۔ اور جس حکومت سے مقابلہ کے لیے اُٹھے ہیں، اُسے اپنے ذرائع و وسائل پر اعتماد، اپنے فوج و خزانہ پر ناز، اور اپنی تنظیم و تہذیب پر دعویٰ ہے۔

کیا اتنے اتفاقاتِ حسنہ کا اجتماع، خدائے لطیف و خبیر، حکیم و علیم، کے نظام کار و طریق عمل میں، محض بے معنی ہے؟ اللہ العالمین، ہم سب کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اُٹھائے، اور اشخاص و اقوام، حوادث و واقعات کو اُنکی اصلی شکل میں جلوہ گر کرے! اللّٰھم اَرِنا الاشیاءَ کماہیَ۔

یہ کیا کہا کہ داغ کو پہچانتے نہیں!

ہماری قوم کے اُس "تعلیم یافتہ" طبقہ نے، جس کا دائرۂ نظر کلکٹر صاحب کی گفتگو اور بعض اینگلو انڈین اخبارات کے مطالعہ تک محدود ہے، تو اپنی جگہ پر یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے، کہ "کھدر پوشی" "عدم تشدد" اور "چرخہ" کا تذکرہ "علم و ادب" کے منافی، اور ایک "علمی" رسالہ کے مرتبہ سے فروتر ہے، لیکن اُسے یہ سُن کر شاید مایوسی و تاسف ہو، کہ یورپ کا سنجیدہ و علمی طبقہ روز بروز انھیں تذکروں سے زیادہ مانوس، اور ان کا قدرشناس ہوتا جاتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے بڑے سے بڑے اخبارات میں گاندھی جی کے اصول پر صدہا مضامین نکل چکے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ رسائل (مثلاً ہیبرٹ جرنل، کرنٹ تھاٹ، ریویو یوریا، وغیرہ) سابرمتی کے خانقاہ نشیں درویش کی تعلیمات پر بارہا مفصل نقد و تبصرہ کر چکے ہیں۔ اور اب مستند و گراں پایہ مصنفین و ارباب فکر نے اسی موضوع پر مستقل تصانیف کا بھی سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ برطانیہ کے مشہور ماہر تعلیمات مسٹر فشر، فاضل جلیل برنارڈ شا، اور نامور ادیب پروفیسر گلبرٹ مرے، امریکہ کے مسٹر اپٹن سنکلیر، اور ریونڈ ہومز، فرانس کا ممتاز فلسفی و انشاپرداز رومین رولاں، اور جرمنی و روس کے متعدد فضلا و اہل کمال نے اتنا ہی نہیں، کہ گاندھی و تعلیمات گاندھی پر مداحانہ مضامین شائع کیے ہیں، بلکہ بعض نے معتقدانہ حیثیت سے مستقل تصانیف بھی تیار کی ہیں۔ حال میں خبر آئی ہے کہ برطانیہ کے مشہور علمی مرکز (برمنگھم) ڈلینڈ انسٹیٹوٹ نے اپنی موسم سرما کی تعلیمی ششماہی میں لکچروں کا جو سلسلہ منظور کیا ہے، وہ کل کا کل، گاندھی اور گاندھیت ہی سے متعلق ہے۔ پہلے لکچر کا عنوان "مہاتما گاندھی اور عدم تشدد" ہے، اور اسی سے ملتے جلتے ہوئے پانچ لکچر اور ہوں گے، جن میں مہاتما جی کے فلسفہ و اصول پر مفصل بحث ہوگی، اور اس بحث و مذاکرہ میں برطانیہ کے بڑے سے بڑے جلیل القدر علما (مثلاً پروفیسر سوہٹا) شرکت کرینگے۔

کیا اب بھی گاندھی اور عدم تشدد، چرخہ اور کھدر کا ذکر "علم و ادب" کے منافی سمجھا جائے گا؟ کیا اب بھی یہ تذکرے، "ایک علمی" رسالہ کے مرتبہ سے فروتر سمجھے جاتے رہیں گے؟

کانفرنس

علیگڈھ کانفرنس، جس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے صحیح طور پر تبدیل کر کے اب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا ہے، ہماری قومی زندگی کی ایک قدیم و دلچسپ یادگار ہے۔ مسلمان جب تک سیاسیات کے شجرِ ممنوعہ سے الگ تھے، اُس وقت تک اُنکی توجہ کا اصلی مرکز اسی انجمن کے سالانہ اجلاس رہتے تھے۔ پچھلے اجلاس کی ضخیم ومبسوط رپورٹ ستمبر ۱۹۲۲ء میں شایع ہوئی ہے، اور مختلف حیثیات سے قابلِ ذکر ہے۔ رپورٹ چار جداگانہ حصوں میں تقسیم ہے۔ حصہ اول میں اجلاس کی پوری کاروائی درج ہے، بہ اضافۂ ضمیمہ جات۔ حصۂ دوم، اُن اُردو لکچروں کا مجموعہ ہے، جو مختلف ماہرینِ فن نے مختلف عنوانات پر کانفرنس میں دیے تھے۔ یہ دونوں حصے ایک جلد میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ حصہ سوم، انگریزی میں ہے، اور اُن انگریزی لکچروں کا مجموعہ ہے، جو کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔ حصۂ چہارم، صاحبزادہ صاحب کے خطبۂ صدارت کے لیے مخصوص ہے، جس پر کسی پچھلے الناظر کے انھیں اوراق میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ بحیثیت مجموعی، اس سال کی رپورٹ ایک دلچسپ، پُرمغز، و مستقل مفید تالیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ کاغذ، طباعت، کتابت، ہر اعتبار سے قابلِ داد۔ ہر حصہ علٰحدہ علٰحدہ بھی مل سکتا ہے۔ چاروں حصوں کی یکجائی قیمت ۸ؔ ہے۔ ملنے کا پتہ، دفتر کانفرنس، علیگڈھ۔

حصۂ دوم، جس کی ضخامت تقریباً تین سو صفحہ ہے، علم وسنجیدگی کا ایک قابلِ قدر مرقع ہے۔ اس میں وہ ۲۳ لکچر یکجا ملیں گے جو مختلف ماہرینِ فن نے کانفرنس کے سامنے پڑھے تھے۔ ابتداء میں کانفرنس کی تعلیمی نمائش کے شعبۂ علمی پر ایک ندوی عالم کا مضمون قابلِ مطالعہ ہے۔ لکچروں کی نوعیت کا اندازہ عنوانات ذیل سے ہوگا :-

(۱) تعلیمی اعتبار سے ابتدائی ریاضیات کی قدر وقیمت۔

(۲) زبانِ اُردو

(۳) جغرافیہ کا تصور، اور اُس کی تعلیم میں مشاہدات کی ضرورت۔

(۴) کم لاگت کے اسکول،

(۵) ارض القرآن

(۶) علم کیمیا

اس طرح کے کل ۲۳ مقالات، مختلف علوم وفنون سے متعلق ہیں، اور ہر مقالہ بجائے خود ایک مستقل

رسالہ یا تالیف کی اہمیت رکھتا ہے۔ رشید احمد صاحب صدیقی کا لکچر اُردو زبان پر ایک مستقل ادبی کارنامہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ قابلِ داد ہے۔ پروفیسر فیروز الدین مُراد، پروفیسر عبد المجید قریشی، پروفیسر ابن حسن، قاضی جلال الدین صاحب اور خواجہ غلام الحسنین کے مقالات، علی الترتیب، طبعیات، ریاضیات، تاریخ، جغرافیۂ قرآنی، اور علوم قرآنی پر پُر مغز ہونے کے ساتھ ہی دلچسپ و شگفتہ بھی ہیں۔ نقص و مسامحت سے کوئی انسانی کوشش خالی نہیں ہو سکتی، تاہم اس میں ذرا شبہ نہیں، کہ ہر لکچرر نے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھا، اور کانفرنس کی تعلیمی حیثیت کو کامیاب بنانے میں اپنی سنجیدہ سعی و محنت سے پوری شرکت کی۔ اس خوش آیند نتیجہ پر جملہ کارکنان کانفرنس، خصوصاً محترم صدر، و محترم سکرٹری، قابل مبارکباد ہیں۔

حصۂ سوم، جو انگریزی زبان میں ہے، تقریباً ڈھائی سو صفحہ کی ضخامت رکھتا ہے۔ شروع میں وہ ایڈریس، درج ہے، جو گورنر بہادر کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، اور پھر وہ جواب بھی جو صاحب موصوف کی زبان فیض ترجمان سے صادر ہوا۔ یہ جواب ایک معمولی درجہ کی چیز ہے، ہر گورنر سے کم و بیش اسی جواب کی توقع ہو سکتی تھی، اسکے طول و عرض میں اُس علم و فضل، کمال و تبحر کی قطعاً کوئی جھلک موجود نہیں، جس کا ذکر نواب صاحب بھیکم پور کے قصائد نظم و نثر میں موجود ہے۔ صوبہ جات متحدہ و پنجاب کے ڈائرکٹران تعلیم کے دو ایڈریس ہیں، اور پھر وہ ۱۲ لکچر جو مختلف ماہرین فن نے تعلیمی مسائل پر پڑھے تھے ان ماہرین فن میں مسلمانوں کی تعداد صرف چار ہے، سات انگریز ہیں، باقی دس ہندو اور ملکی عیسائی ہیں۔ اور ان چار ماہرفن مسلمانوں میں، مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے ایک فرد بھی نہیں! کیا اسے محض اتفاق پر محمول کیا جائے، یا یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کے مُسلم اساتذہ میں سے ایک بزرگ بھی، با وجود اپنی اعلیٰ مغربی ڈگریوں کے، کسی علم و فن سے متعلق انگریزی زبان میں اظہار خیال پر قادر نہیں؟ فی الجملہ اس حصہ کے مضامین کا مطالعہ بھی لطف و نفع سے خالی نہ ہوگا۔

حصۂ چہارم، نام ہے محض صدر صاحب کے خطبۂ افتتاحیہ کا۔ اس اہم و قابل وقعت خطبہ پر ایک اُنھیں اوراق میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ اس لیے کسی جدید رائے زنی کی ضرورت نہیں۔ بحیثیت مجموعی رپورٹ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اِکی مرتبہ کا اجلاس اپنے مقاصد کے لحاظ سے ہر طرح کامیاب رہا۔ کانفرنس کی بنیاد جن اصول پر ہے، اُن سے راقم سطور کو ایک بڑی حد تک اختلاف ہے۔ اُس اختلاف

کا اظہار بارہا ان صفحات میں ہو چکا ہے، اور آیندہ بھی انشاءاللہ حسب موقع ہوتا رہے گا، لیکن اس اصولی اختلاف کی توضیح کے بعد، کانفرنس اگر اپنے محدود مقاصد کی حدود میں رہ کر مفید خدمات انجام دیتی ہے، تو اُس کا اعتراف ہر مسلم پر لازم ہو جاتا ہے۔ پچھلے سال کی درخشاں کامیابی یقیناً آفتابِ علیگڈھ کی ضو فشانی کا نتیجہ ہے، خدا اس روشنی کو روز بروز زیادہ صاف و منور کرتا جائے اور بجائے برقی جگمگاہٹ کے اس میں نورانیت اور صفائی پیدا کرتا رہے۔ صدرِ جلسہ کا انتخاب صحیح، اس قسم کی مجالس میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، کاش صدر ہمیشہ ایسا نصیب ہوتا رہے، جو بجائے صوبہ کے حاکم کے، احکم الحاکمین کے دربار میں رسوخ و تقرب کا حریص ہو، اور جس کی جیبیں..... اگرچہ خالی ہوں، لیکن دل محبت اسلام سے، اور دماغ خودداری و متانت سے خالی نہ ہو-!

"ہم تشنہ کامانِ زیارتِ جمالِ دوست!"

لیکن جلسۂ کانفرنس پر تبصرہ یقیناً نامکمل رہ جائے گا، اگر ناظرین کی سرسری نظر اسکے سب سے زیادہ دلکش و ہوش ربا منظر کی جانب متوجہ نہ کی گئی- یہ وہ ساعتِ ہمایوں تھی، جب تاجدارِ حسن، پیکرِ جمال، تمثالِ دلبری، سر ولیم میرس نے اپنی "زیارتِ جمال باکمال سے "تشنہ کامانِ جمالِ دوست" کو مشرف و سرافراز فرمایا! اور سرآمدِ عاشقانِ زمن، رشکِ قیس و فرہاد، نواب مزمل اللہ خاں بہادر بالقابہ العظیمہ نے بہ صد ذوق و شوق، و صد ہزار تمنا و آرزو، بڑھ کر قدم مبارک سے جبینِ عقیدت کو سربلند، اور ناصیۂ نیاز کو مفتخر کیا! اس منظر کا پورا لطف اُٹھانا ہے، تو ناظرین کو رپورٹ کے حصہ اول کے ص ۳۵-۳۶ ملاحظہ کرنا چاہیے- مختصر یہ ہے، کہ اس خدائے مجازی کو پہلے اپنے کاشانۂ وفا و نیاز پر لنچ کے لیے مدعو کیا گیا (ص ۳۵)، پھر کالج کی زمین پر "شاندار" ایٹ ہوم دیا گیا (ص ۳۶)، لیکن والہانہ جذباتِ عقیدت کی اس سے بھی تسکین نہ ہوئی، اور گورنر بہادر نے جب کانفرنس ہال میں قدم رنجہ فرمایا، تو کانفرنس کی جانب سے "پُرزور خیر مقدم" کی سعادت بھی اسی خوش نصیب عاشقِ دیرینہ کے حصہ میں آئی! پھر "نثر عاری" کی سادہ زبان، جب والہانہ جوش و خروش، اور سرفروشانہ حسرت و ارمان، کی ترجمانی میں قاصر رہی، تو نظم کے خوان میں قلبِ عقیدت آگیں کی قاشیں لگا کر نذرِ خدمت کیں! خدا کرے یہ نذر دربارِ گورنری میں مقبول ہوگئی ہو!

"خیر مقدم" کانفرنس کی طرف سے تھا، لیکن ساری "تقریر دلپذیر" میں اگر ایک فقرہ نہیں، ایک لفظ بھی مقاصدِ کانفرنس، مقاصدِ کالج، مقاصدِ یونیورسٹی، مقاصدِ تعلیم سے متعلق آجاتا، تو وارفتگیِ عشق کا جذبۂ صادق ناقص رہ جاتا، اس لیے الحمدللہ یہ داستانِ عشق اس قسم کے حشو و زوائد سے یکسر پاک و صاف ہے!

یوسفؑ جب جلوہ افروز ہوئے، تو دو سو زنان مصر میں سے ایک بھی اپنے حواس درست رکھنے پر قادر نہ ہو سکی، اور سب نے بجائے پھلوں کے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا، کوہ طور پر جب تجلی الٰہی ہوئی تو حضرت کلیم با این ظرف نبوت، و شرف رسالت، "تاب نظارہ نہ لا سکے"، اور بیہوش ہو گئے۔ پھر آپ ہی انصاف فرمائیں کہ جب کانفرنس کے ظلمتکدہ کو کوئی رشکِ یوسف اپنے جمال جہاں آرا سے مطلع انوار بنا دے، تو ایک عاشقِ صادق سے یہ توقع رکھنی، کہ وہ اُسوقت موقع و محل کا لحاظ رکھے گا، کانفرنس کے مقاصد کو شمار کرائے گا، کلام کے ربط و نظم کی پابندیوں میں اُلجھا رہے گا، اقلیم عشق و الفت میں محال عقلی کی توقع رکھنا ہے یا نہیں! بہرحال پوری سرگذشت کے اعادہ کے لیے تو جامی و خسرو کے قلم کی ضرورت ہوگی، ہم بدمذاق اغیار کے کانوں تک جن چند الفاظ اور فقروں کی بھنک پہونچی، وہ حاضر ہیں:-

"حضور کے محامد و مدارج علیا کا مفصل بیان"۔ "حضور انور کی ذاتی علمی قابلیت اور علم پروری" "حضور کا کلاسیکل زبانوں کا وسیع علم اور گریک نظم کا مشہور ترجمہ" "حضور کی اپنے تمام دائرۂ عمل میں عالیشان کامیابی"۔ "اصلاحی اسکیم میں حضور کے دل و دماغ کا کتنا حصہ" "دہلی میں حضور سے ملا تھا اور گھبرا کر پوچھا تھا کہ طبیعت عالی کچھ ناساز تو نہیں" "حضور انور علیگڈھ کو یہ عزت عطا فرمائیں کہ یہاں ایک چھوٹا سا گورنمنٹ ہاؤس بن جائے" "ہم تشنہ کامانِ زیارت جمال دوست" "حضور کی زیارت جمال باکمال سے مستفید ہوں" "قانع بہ تجلی نہ شود طالب دیدار"

کے، سی، آئی، ای بود اور اخطاب　　　　بلکہ بالاتر ازاں آید ہمی
از ہجوم شوقِ دیدارِ تو قوم　　　　کاروان در کاروان آید ہمی
حکمرانِ ملک بسیار اند لیک　　　　"میر" بر دل حکمراں آید ہمی
از وفورِ جوشش مداحیِ تو　　　　ہر بنِ مویم زباں آید ہمی

تیسرے شعر میں "میر" شاید "میرس" کا مخفف بنایا گیا ہے، اگر ایسا ہے، تو اس لطیف اجتہادِ شعری کی داد نہ دینا ظلم ہے!

کانفرنس کے سکرٹری صاحب کی خدمت میں، بادب التماس ہے کہ اگر آیندہ بھی اسی قسم کے لطائف کانفرنس میں پیش آتے رہیں، تو ان لطائف و نکاہات کے لیے ازراہِ کرم، کانفرنس کی سنجیدہ کارروائیوں سے الگ، رپورٹ کا ایک حصہ مخصوص کر دیں، اور اُس حصہ کی اشاعت صرف گورنمنٹ ہاؤس اور اسکے ملحقات تک محدود رکھی جائے۔ ورنہ عام پبلک کے سامنے جب اس مجموعہ کے اندر یہ زعفران زار بھی پیش

ہوگا، تو ہر دیانتدار تبصرہ نگار اس پر مجبور ہے، کہ طاؤس کے "نقش ونگار" کے ساتھ اسکے "پائے زشت" پر بھی نظر رکھے، اور اگر اسکی یہ عبارت کسی حلقہ میں سوء ادب سمجھی جائے، تو اسکو معذور رکھا جائے

ایک شریف انگریز

حکمراں قوم کا ہر ہر فرد، اپنی عظمت و فضلیت کا احساس رکھتا ہے، اور اپنے مقابلہ میں محکوم و مفتوح رعایا کے بڑے سے بڑے فرد کو حقیر و بے حقیقت سمجھتا ہے۔ یہ جذبہ شاید ایک بڑی حد تک فطری ہے، تاہم ہر کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں۔ اس استثنا، کی اعلیٰ مثال مسٹر چارلس اینڈریوز ہیں۔ وہ نسلاً خالص انگریز ہیں، برطانیہ کے ایک معزز خاندان کے رکن ہیں، مسیحی مذہب کے زبردست عالم ہیں، ہندوستان میں کیمبرج مشن کی جانب سے مشنری ہوکر آئے، اور مدتوں اپنے فرائض کی انجام دہی میں سرگرم رہے۔

سچے مسیحیوں کی ایک شناخت کلام مجید میں یہ ارشاد ہوئی ہے، کہ وَجَعَلْنَا فِی قُلُوبِ الَّذِینَ اتَّبَعُوہُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً (حدید-۴) اُن کے قلوب میں نرمی اور محبت ہوا کرتی ہے۔ بحمد اللہ یہ صفت مسٹر اینڈریوز میں بوجہ اتم موجود ہے، وہ ہندوستانیوں کو اپنا مساوی سمجھتے ہیں، ادنیٰ سے ادنیٰ مہتر اور چمار سے بھائی کی طرح ملتے ہیں، اُنکے قلب میں ہر مخلوق کی طرف محض محبت ہی کی گنجائش ہے۔ وہ اپنی معاشرت میں بھی ہندوستانی ہوگئے۔ اُنکی غذا، لباس، طرز ماندوبود، ہر شے ٹھیٹھ ہندوستانی ہے۔ آج سے پندرہ بیس سال قبل، جب اُن کا مستقل قیام دہلی میں بحیثیت سینٹ اسٹیفن کالج کے پرنسپل کے رہتا تھا۔ بعض مسلمان مشاہیر شہر سے اُنکے مخلصانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ اُن میں سے ایک اُردو کے ایک پختہ نویس مصنف شمس العلما مولوی ذکاء اللہ تھے، جو تاریخ، ریاضی، سائنس، وغیرہ میں بیسیوں تراجم و تالیفات اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ اُن کا انتقال غالباً ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ مسٹر اینڈریوز نے اُسی وقت انگریزی میں اُنکی سوانحعمری مرتب کرنا شروع کردی۔ درمیان میں ایسے موانع پیش آئے، کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اب بارہ تیرہ برس کے بعد موصوف نے اس کام کے لیے پھر وقت نکالا ہے، اور کتاب مکمل کرکے کیمبرج میں طبع ہونے کو دے دی ہے۔ اسکے تیار ہونے میں تو ابھی کچھ وقت لگے گا، اُسوقت تک اُسکی اشاعت بہ احتیاط، ہندوستان کے نامور انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں ہوتی رہے گی۔ چنانچہ پہلی قسط رسالہ مذکور کے نومبر نمبر میں نکل بھی چکی ہے۔ یہ قسط صرف دو دیباچوں پر مشتمل ہے۔ ایک مفصل دیباچہ خود اینڈریوز صاحب کا ہے۔ دوسرا دیباچہ شمس العلما مولانا نذیر احمد مرحوم (مترجم قرآن) کے قلم سے ہے، جسے اپنی وفات سے اُنھوں نے چند ہفتہ قبل

۱۹۱۲ء میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے، کہ کتاب مذکور میں مولوی ذکاء اللہ کے علاوہ، مولوی نذیر احمد کی بھی روئداد زندگی ہوگی۔ انگریز اہل قلم کی طرف سے ہندوستانی معاصرین کی خدمت گزاری کی یہ مثال الشاذ کالمعدوم کے حکم میں داخل ہے۔ اہل ہند، خصوصاً مسلمانوں کو اس خدمت کی عملی داد دینی چاہیے۔

زرداروں کی ناداری

لی فیلڈ سے چلا ہوا سرکاری تار، مورخہ ۵۔ نومبر جو ہندوستان کے انگریزی اخبارات میں ۷۔ نومبر کو شایع ہوا ہے، مظہر ہے، کہ ۲۷ راکتوبر ۱۹۲۴ء کو انگلستان میں باضابطہ "بے روزگاروں" کی تعداد کچھ اوپر ۱۲ لاکھ تھی، اور ۳۱ دسمبر ۱۹۲۳ء کو یہ تعداد کچھ کم ۱۳ لاکھ تھی!

جناب طفیل احمد صاحب علانیہ یہ دعویٰ فرما چکے ہیں، کہ سود خوار فرنگستان کا ہر ہر فرد دولتمند و با ثروت ہے۔ کیا وہ براہ کرم اس سرکاری بیان کی تردید شایع فرمائیں گے؟ یا ممکن ہے، کہ یہ اطلاع "ضلع مظفر نگر کی رپورٹ بندوبست" کے مساوی مرتبۂ استناد نہ رکھتی ہو!

بدایون "شریف"!

جس طرح ہمارے صوبہ کے بعض امراء و روساء کا عشق، بعض فرماں روایان صوبہ کے ساتھ مشہور ہے، ٹھیک اسی طرح کی شیفتگی بدایوں کے بعض پیرزادوں کو ذاتِ "شریعت" کے ساتھ ہے، اور ہر گذرنے والے لمحہ کے ساتھ اس شغف و شیفتگی کو بھی ترقی ہوتی جارہی ہے۔

حال میں اس جذبۂ عشق و نیازنے غیظ و غضب کی شکل اختیار کرلی ہے، اور اس غیظ و غضب کے ہدف سلطان نجد، امیر عبد العزیز بن سعود، اور انکی سپاہ ہے، جس نے چشم زدن میں بلدامین کی ارضِ مطہر کو شریف حسین اور انکی ذریات کے وجود سے پاک کردیا۔ اہل نجد، اس طائفۂ بدایونی کے نزدیک، محض فاسق و مبتدع ہی نہیں، بلکہ قطعاً "کافر" و "خارج از اسلام" ہیں۔ یہ فیصلہ تھا۔ جرم یہ عائد کیا گیا ہے، کہ یہ لوگ

"حضرات انبیاے کرام و اولیاے عظام کی تعظیم و تکریم کو بدعت و کفر و شرک"

قرار دیتے ہیں۔ اس دعوے کی سند میں بجاے کسی وہابی یا نجدی کے قول کے چار گواہ باہر کے پیش کیے گئے ہیں، جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:—

(۱)　تاریخ شامی،

(۲)　سید محمد امین کا حاشیۂ دُرِّمختار،

(۳) ہدایۂ کمیہ۔
(۴) ہمدم کا ایک مضمون۔

ان چار میں سے عبارتیں صرف تین آخر الذکر سے نقل کی گئی ہیں۔ حاشیۂ درمختار کی عبارت میں عقیدۂ مذکورۂ بالا کا اشارۃً بھی ذکر نہیں، اسی طرح ہدایۂ کمیہ کی عبارت منقولہ بھی عقیدۂ مذکورہ کی بابت ایک حرف بھی شہادت میں نہیں پیش کرتی۔ لے دے کے ہمدم کا مضمون رہ جاتا ہے، اُسکی شہادت ملاحظہ ہو:۔

"بت پرستی و شرک کی بیخکنی کے لیے شمشیر بکف نکل آتے ہیں ...... وہ تمام سست اعتقاد نام کے مسلمانوں کو بت پرست، بدعتی و مشرک خیال کرتے ہیں ...... مساجد کو صاف و سادہ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ قبرپرستی، پیرپوجا، اور تعزیہ پرستی کے جانی دشمن ہیں"

یہ ہیں، وہ زبردست شواہد اور مستحکم دلائل، جن کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے، کہ اہل نجد تعظیم و تکریم انبیاء علیہم السلام کے منکر ہیں، اور اس لیے "کافر" و "خارج از اسلام" ہیں!!

"بدایوں کے اس طائفۂ عالیہ کو "ذات شریف" کے ساتھ جو والہانہ شغف و شیفتگی ہے، اُسکے لحاظ سے حیرت ہے، کہ معزول حسین نے بصرہ کو اپنا مستقر قرار دیکر بدایوں کے حقوق کیوں نظرانداز کردیے! امیر فیصل سے رشتۂ فرزندی مسلّم، تاہم خاک پاک بدایوں کو شرف میزبانی سے محروم رکھنا، بڑی بیدردی ہے۔ شریف صاحب اگر اب بھی اس استدعا کو شرف قبولیت بخشنا گوارا فرمالیں، تو پھر کسی بڑے سے بڑے کٹر "وہابی" کو "بدایونِ شریف" (خواہ بہ اعلانِ اضافت، خواہ بہ فکِ اضافت) کہنے میں یقیناً تامل نہیں ہو سکتا۔

"وہابیت" یا "شریفیت"؟

وہابی، در اصل حنبلی مذہب کے اشخاص ہیں، اس لیے "وہابیت" کا تقابل اگر ہو سکتا تھا، تو "حنفیت" سے۔ لیکن عوام میں "وہابیت"، "صوفیت" کی حریف سمجھی گئی، اور بعض نے ترقی کرکے اسے تقلید ائمہ کا مقابل قرار دیا۔ بدایوں کے نوجوان پیرزادہ نے اخبارات میں جو تار شایع کرایا ہے اُس میں ترقی کا ایک قدم اور آگے بڑھاکر "وہابیت" کو "سُنّیت" کے مقابلہ میں پیش کیا ہے! کیا یہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا، کہ اس وقت نجد و حجاز کی آویزش درحقیقت، "وہابیت" و "شریفیت" کی ٹکر ہے؟ وہابیوں پر بڑے سے بڑا الزام یہ عائد ہو سکتا ہے، کہ مزارات و مقابر سے متعلق وہ عامۂ مسلمین کے جذبات کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن زندہ کلمہ گویان اسلام کی جانوں اور جائدادوں کے ساتھ بےپروائی کس نے برتی؟

دشمنانِ اسلام کے ساتھ اتحاد کس نے قائم کیا؟ ہزارہا زائرین و حجاج کا خون کس کی گردن پر ہے؟
فتنے سب پیچ سہی قیامت کے　　لیکن آگے تمہاری قامت کے؟

حضرت غوث جیلانیؒ کا مسلک

بدایونی پیرزادے "اپنی قادریت" کو شاید اپنے اسلام سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں، بہتر ہوتا کہ آج وہ مضبوطی کے ساتھ، حضرت غوث جیلانیؒ ہی کے مسلک پر قائم رہتے۔ حضرت موصوف بھی حنبلی تھے، یعنی اُسی حنبلیت کے پیرو تھے، جس کی تعلیم دینے کے صلہ میں آج شیخ عبدالوہاب کو "حنفی قادری" خانقاہوں سے لعنت کا خطاب حاصل ہو رہا ہے! حضرت شیخؒ کی تصانیف آج ناپید نہیں، غنیۃ الطالبین و فتوح الغیب کے مطبوعہ نسخے موجود ہیں، مواعظ و مکتوبات کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ.... محفوظ ہے، کیا اس سارے دفتر میں بجز تاکیدِ توحید و اتباعِ سنتِ رسول اللہؐ کے ایک لفظ بھی موجودہ مراسمِ تصوف سے متعلق مذکور ہے؟ کیا حضرت شیخؒ نے کہیں بھی موجودہ قادریت کی تعلیم دی ہے؟ حضرت شیخؒ نے اپنی وفات کے وقت اپنے صاحبزادہ شیخ عبدالوہابؒ کو جو بیش بہا آخری وصایا فرمائی تھیں، اُسکے بعض فقرے یہ ہیں:۔

علیک بتقوی اللہ وطاعتہ۔	خدا ہی سے پرہیزگاری، اور اُسی کی طاعت اپنے اوپر لازم رکھنا۔
وکِل الحوائج الی اللہ واطلبھا جمیعاً منہ	اپنی حاجتوں کو خدا ہی کے سپرد کردے، اور سب کچھ اُسی سے طلب کر۔
لا تثق باحد سوی اللہ۔	بجز خدا کے کسی پر اعتماد نہ کرنا۔
لا تخف احد سوی اللہ ولا ترج احداً سوی اللہ	بجز خدا کے نہ کسی سے خوف کرنا، نہ کسی سے اُمید قائم کرنا۔

وہابی، اگر اسکے خلاف کوئی مسلک رکھتے ہیں، تو یقیناً گمراہ ہیں، لیکن اگر اُن کا عقیدہ بعینہٖ یہی ہے، تو خدا کے لیے اُنکو بھی اپنا بھائی سمجھیے، اور یہ دعا کیجیے، کہ اس پر عمل کی توفیق خدائے تعالیٰ و تقدس، اُنکو، آپ کو، ہم کو، اور سب کو، عطا کرے۔ مسلم کے لیے بنیادی عقاید صرف دو ہیں، اللہ کو ایک سمجھنا (لا الٰہ الا اللہ)، اور محمدؐ بن عبداللہ کو اُس کا سچا رسول ماننا (محمد رسول اللہ)۔ باقی تمام جزئیات و تفصیلات میں جب حضرات صحابہؓ تک میں پورا اتفاق نہ ہو سکا، تو آج اسکی کوشش نہ صرف لاحاصل بلکہ اسلام کے حق میں مضر ہے، کہ ہر جزئیہ فقہی میں، نجد و حجاز، مصر و افغانستان، بریلی و دیوبند، دہلی و لکھنؤ کا نقطۂ نظر بالکل متحد ہو جائے۔

"صلح ہے اک مہلت سامانِ جنگ"

مولانا حالی مغفور کے اس الہامی مصرعہ کی عملی شرح کی خبر امریکہ سے

یہ موصول ہوئی ہے، کہ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد سے، اسوقت تک، چھ سال کی مدت میں، صلح جو امن پسند، آشتی دوست و مصالحت نواز، سرکار امریکہ، صرف بحری جنگ کے ساز و سامان پر پچاس کرور ڈالر، یعنی ایک ارب سے زائد روپیہ صرف فرما چکی ہے! واضح رہے کہ، یہ محکمۂ جنگ کے صرف ایک شعبہ کا خرچ ہے، اس سے کل مصارفِ محکمۂ جنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ امریکہ کا شمار اس وقت تک، متمدن دنیا کی جنگجو اقوام میں نہیں، صلح پسند ممالک میں کیا جاتا ہے۔ اسی پر اُن سرکاروں کے مصارفِ جنگ کو قیاس کرنا چاہیے، جن کی جوع الارض (امپریلزم) مشہور ہے۔

کیا تہذیب جدید کی یہی وہ برکات ہیں، جنکی دعوت بدنصیب مشرق کے سامنے پیش کی جا رہی ہے؟ کیا نظام سرمایہ داری کے یہی وہ مناقب ہیں، جنکی منادی ہر ہفتہ 'ولایت منزل' علیگڈھ سے ہوتی رہتی ہے؟ کیا اقبالمند و باثروت، شایستہ و سودخوار مغرب کے یہی وہ کمالاتِ عالیہ ہیں، جن پر مفلس و تنگدست، صابر و شاکر، مشرق کو رشک کرنا چاہیے؟

خلافت کمیٹی کے مصارف

مولانا شوکت علی نے ۲۰ء سے لیکر ۲۳ء تک کے خلافت کمیٹی کا جو حساب، روزنامۂ خلافت میں شایع کیا ہے، اُس سے معلوم ہوا، کہ اس مدت میں خلافت کمیٹی کو کل رقم تقریباً ۵۷ لاکھ وصول ہوئی۔ اس میں سے تقریباً ۲۵ لاکھ ترکوں کے کام آئی۔ ۱۶ لاکھ روپیہ سیٹھ چھوٹانی نے اپنے کارخانہ میں لگا دیا تھا، اب وہ کارخانہ ٹرکی کو منتقل ہو رہا ہے۔ اس طرح گویا ۵۷ لاکھ میں سے ۴۱ لاکھ کا حساب براہ راست ترکوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ بقیہ ۱۶ لاکھ خلافت ہی کے سلسلہ میں دوسرے ضروری شعبوں میں صرف ہوا، مثلاً دو مرتبہ وفد خلافت کی انگلستان اور دوسرے ممالکِ یورپ کو روانگی، جامعہ ملیہ علیگڈھ اور دوسری قومی درسگاہوں کی اعانت، اسیرانِ خلافت کی امداد، متعدد انگریزی و اُردو جرائد کی امداد، تحریکِ ترک موالات کی نشر و تنظیم، خلافت پریس و اخبار خلافت (انگریزی، اُردو و گجراتی) کا قیام، ہزارہا تبلیغی رسائل و تالیفات کی اشاعت، وقس علی ہذا۔

یہ کہنا کہ اس حساب کا ہر جزئیہ، ہر طرح پاک اور تسلی بخش ہے، بے مزہ مبالغہ ہوگا۔ بعض مصارف یقیناً بیجا ہوے، بعض اشخاص نے غفلت برتی، بعض کا جُرم غفلت سے زیادہ سنگین ہے۔ سیٹھ چھوٹانی کے کارخانہ میں اتنی بڑی رقم کا پھنسا رہ جانا، خصوصیت کے ساتھ تاسف انگیز و تکلیف دہ واقعہ ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا، کہ جو عظیم الشان خدمتِ اسلام اس زمانہ میں خلافت کمیٹی نے انجام دی، اسکی توقع مسلمانان ہند جیسی پریشان حال، غیر ذمہ دار، و غیر منتظم جماعت سے ہرگز نہیں

ہو سکتی تھی، حسابات میں غلطیوں اور تصرف و تغلب بیجا کی مثالیں، بڑی بڑی منتظم و باقاعدہ حکومتوں کے مختلف محکموں میں برابر ملتی رہتی ہیں، مسلمانان ہند سے بھی اگر کچھ ایسے ہی قصور سرزد ہوئے، تو اسپر حیرت نہ کرنا چاہیے، حیرت اس پر ہونا چاہیے کہ اتنی قلیل لغزشیں کیوں عمل میں آئیں!

ان الحسنات یذہبن السیئات (بھلائیاں، برائیوں کو دور کر دیتی ہیں) خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے، ہم کمزور و ناتواں، عاجز و درماندہ بندگان خدا، کو بھی حتی الامکان اسی پر عمل چاہیے اور دوسروں پر اعتراض و نکتہ چینی سے قبل بشری کمزوریوں کو بھی یاد کر لینا چاہیے۔ خلافت کمیٹی نے ہماری بیداری میں، وہ عظیم الشان حصہ لیا ہے، اور اسکے بعض جلیل القدر رہنماؤں نے وہ عظیم النظیر ایثار دکھایا ہے کہ اسکے بعض دوسرے کارکنوں کی لغزشوں اور خطاؤں کو بہ نظر عفو دیکھنا چاہیے، اُن کا قصور معاف کرنا چاہیے، اور خدا سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ بھی معاف کرے۔ ساتھ ہی اس درمیان میں کارکنان خلافت کو جو تجربات حاصل ہوئے ہیں، یقین ہے، کہ آیندہ وہ اُن سے پورا فائدہ اُٹھائیں گے مسلمانوں کا مال خرچ کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتیں گے، اور صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ کا اسوۂ عمل ہر وقت پیش نظر رکھیں گے۔ قوم کو بھی لازم ہے، کہ وہ چند بے احتیاط اشخاص کے جرائم کی سزا اپنے اُن رہنماؤں کو نہ دے، جو پوری دیانت و امانت، صداقت و خلوص، ایثار و سرفروشی کے ساتھ خدمت اسلام و مسلمین میں مصروف ہیں۔ سرور کونینؐ کے عہد مبارک تک میں، ہر شخص تو صدیقؓ و فاروقؓ نہیں بن گیا تھا، آخر منافقین بھی تھے، اور بہت تھے، اور آخر تک قائم رہے۔ باانہمہ منافقین کے خوف سے اسلام کی اجتماعی زندگی مُردہ نہ ہوئی، بیت المال برابر معمور ہوتا رہا، امین ہاتھوں سے تقسیم بھی برابر جاری رہی۔ ایسے امین ہاتھ آج کمیاب ضرور ہیں، لیکن نایاب نہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے جدید وائس چانسلر

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے جدید افسر اعلیٰ سے جو توقعات ان صفحات میں آج سے دو ماہ پیشتر قائم کی گئی تھیں، بحمد اللہ وہ تیزی کے ساتھ پوری ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ بدنظمی و طوائف الملوکی دور ہو کر، کالج میں ایک نظم و تنظیم کی صورت پیدا ہوتی جاتی ہے، اساتذہ کو اپنی ذمہ داری کے احساس پر مجبور ہونا پڑا ہے، ضیافتوں میں سادگی کی تعلیم لفظاً و عملاً دونوں طرح شروع ہو گئی ہے اور فضا میں یک گونہ اسلامیت آچلی ہے۔ وائس چانسلر صاحب کی متعدد تقریریں، جو طلبہ کے سامنے ہوئیں، وہ سب تعلیمی حیثیت سے پُر مغز، اور اسلامی حیثیت سے بھی فی الجملہ غنیمت ہیں۔ یونیورسٹی کی ایک بڑی ذمہ دار

ومقتدر ہستی، جو روایات عہد غلامی کی سب سے بڑی حامل ہے، سُنا ہے کہ اپنا تعلق اب کالج و یونیورسٹی سے قطع کرنے والی ہے۔ اگر وائس چانسلر صاحب کو بعض اچھے مشیر و رفیق کار میسر آجائیں، تو اصلاح و ترقی کی بہت زیادہ توقعات قائم ہو سکتی ہیں۔ ایک خاص اصلاح یہ بھی ہوگئی ہے، کہ یونیورسٹی کا ہفتہ وار آرگن، "مسلم یونیورسٹی گزٹ" اب امن سبھا کی بجائے کالج و یونیورسٹی کا پرچہ معلوم ہونے لگا ہے، اور مسائل تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے قابل مطالعہ ہوگیا ہے۔ اگر "خبروں" کے حصہ میں بھی بجائے متفرق خبروں کے، بیرون علیگڈھ کی محض تعلیمی خبروں کا التزام رکھا جائے، تو اسکی حیثیت افادی میں بدرجہا اضافہ ہو سکتا ہے۔

سرسید کے بعض عقائد بہت ہی افسوسناک تھے، کلام مجید کی بعض آیات کی ایسی تاویلات انھوں نے فرمائیں کہ گویا اُن آیات کو مسخ کر دیا۔ انگریزی حکومت، انگریزی علوم، انگریزی تہذیب، غرض انگریزیت کا رعب اُن پر اس درجہ طاری تھا، کہ اُنھوں نے دنیا کی ہر شے کو اسی پیمانہ سے ناپا، اور جو شے اُنکے اس معیار پر پوری نہ اُتری، اُسے اُنھوں نے ناقابل التفات سمجھا، خواہ وہ فقہ ہو یا تصوف، یا حدیث، یا قرآن۔ باایں ہمہ اُنکی نیت بالکل خالص تھی۔ اُنکی تحقیق و جستجو میں ذاتی اغراض کو مطلق دخل نہ تھا۔ اُنکی نیت صرف خدمت اسلام کی تھی۔ غلطی سے وہ اسلام کی فلاح اسی میں سمجھے، کہ جس حد تک ممکن ہو انگریزیت کو اپنے میں جذب کر لیا جائے۔ یہ رائے کی غلطی تھی، نیت کا فساد نہ تھا۔ منافقت اُنکے قریب بھی نہیں گذری تھی۔ وہ تفسیر اس لیے نہیں لکھتے تھے، کہ دنیا اُنکی مفسرانہ عظمت کی داد دے، یا یہ کہ اپنی ہر دلعزیزی قائم رکھنے کو وہ اپنے ضمیر کے خلاف، مسائل کی تاویل کریں، بلکہ وہ وہی لکھتے تھے، جو کچھ اُن کا ضمیر اُنھیں سوجھاتا تھا۔ جسے وہ امر حق سمجھتے تھے، اور جس کے لیے وہ محض رضائے حق کے طلبگار رہتے، وہ انگریزوں کے دل سے خیر طلب تھے، اور اس لیے تھے کہ وہ فلاح مسلمین کے لیے اسے ضروری سمجھتے تھے، یہ نہ تھا کہ گھر پر بیٹھ کر خود بھی انگریزوں کو بُرا بھلا کہیں، اور جب سامنا ہو جائے تو خوشامد و تملق کو انتہا پر پہونچا دیں، تاکہ کسی خطاب یا صلہ سے سرفرازی حاصل ہو۔ علام الغیوب، جو قال سے زیادہ حال پر، زبان سے زیادہ قلب پر، عمل سے زیادہ مقصد عمل پر نظر رکھتا ہے، یقین ہے کہ اُنکی لغزشوں سے ضرور درگذر کرے گا، اور اُنھیں خدمات اسلام پر پورا اجر عنایت کرے گا۔

سید کے انتقال کے بعد یہ خصوصیت بھی علیگڈھ سے رفتہ رفتہ رخصت ہونے لگی، وقار الملک کی اسلامیت نے اپنا رنگ جمانا چاہا، لیکن اپنے تئیں مخالف قوتوں کے سامنے بے بس پایا، تاآنکہ علیگڈھ کالج، اور اُسکے ملحقات و متعلقات، سازش و دکاکت کے مرادف قرار پاگئے۔ اب نہ اسلامیت کا اثر باقی تھا، نہ مشرقیت کی پرسش تھی، نہ علم اور کیرکٹر کی قدر تھی، نہ ایثار و خلوص کو کوئی پوچھتا تھا۔ ہرطرف ذاتی اغراض کی کشاکش تھی، ہرسمت نمود و نمائش کی گرم بازاری تھی، ہرجانب پارٹی سازی اور گروہ بندی تھی، اور ہرفریق کی ساری کوشش اسکے لیے وقف تھی، کہ فریق مقابل کو زیر کرکے حکام والامقام کی بارگاہ میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرے۔ ایک بزرگ جو تعلیمات کے ماہرفن سمجھے جاتے تھے، اُن کا وقت کالج سے کہیں زیادہ حکام کی نبض شناسی میں صرف ہوتا تھا۔ ایک بزرگ جن کے ہاتھ میں نظم و نسق کی باگ تھی، اُنھیں دختِ رز کی نیازمندیوں سے مہلت نہ تھی۔ ایک اور بزرگ قوم، کالج سے صدہا میل کے فاصلہ پر سکونت رکھتے تھے، اور شاید بُعدِ مادّی ہی کی مناسبت سے کالج کے ساتھ بُعدِ روحانی بھی رکھتے تھے۔ یہ صورت حال ہر مسلمان کے لیے کس درجہ لایق شرم و باعث اذیت تھی! اب الحمدللہ کہ زمانہ نے پھر کروٹ لی ہے، اور ایک ایسے شخص کو یونیورسٹی کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا ہے، جو اکثر حیثیات سے صحیح معنی میں سرسید کا جانشین ہے۔ یہاں تک کہ سرسید کی خوبیوں کے ساتھ سرسید ہی کی کمزوریوں کا بھی وارث ہے۔ صاحبزادہ صاحب کے خلوص نیت میں ذرا شبہہ نہیں، فلاح اسلام کے دو دل سے متمنی ہیں، لیکن بدقسمتی سے انگریزیت کے سحر سے وہ بھی سید صاحب ہی کی طرح مسحور ہیں۔ خدائے تعالےٰ اُنکے جوہر ایمان میں زیادہ آب و تاب پیدا کرے، اور اُنکے عہد کو بابرکت ثابت کرے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

بالآخر وہی پیش آیا، جس کا کھٹکا ایک عرصہ سے تھا۔ یعنی جس لایق عزت شخصیت نے ترک موالات کا سیاسی پروگرام ملک کے سامنے پیش کیا تھا، اُسی نے اسکے خاتمہ کا بھی اعلان کردیا۔ اس سے بڑھ کر قومی مصیبت اس وقت خیال میں نہیں آتی، اور مسلمان کا کام یہ ہے، کہ ہر مصیبت کے وقت اسے یاد کرلیا کرے، کہ "وہ اللہ ہی کے واسطے ہے، اور اُسے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ واذا اصابتہم مصیبۃٌ قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

گاندھی جی نے مجاہدات و ریاضات سے جس قدر تزکیۂ نفس حاصل کرلیا تھا، اور اپنی عقل و فراست کو جس قدر منور کرلیا تھا اسکی نظیر دور حاضرہ کے ہندوستان میں نہیں اسوقت ساری دنیا میں مشکل ہی سے ملے گی، تاہم بشریت کی کمزوریوں سے پاک ہوجانا کسی بشر کے بس کی بات نہیں۔ صرف انبیاء علیہم السلام

ایک ایسی نعمت "وحیِ الٰہی" سے مشرف و ممتاز رہتے ہیں، جو اُنکی بشری کمزوریوں سے اُنھیں محفوظ رکھتی ہے۔ باقی الہام و مکاشفہ، کوئی ایسی شے نہیں، جسے ہادیِ قطعی کہا جا سکے، اور اسی لیے کوئی غیر نبی خواہ بجائے خود کتنا ہی صاحب کمال ہو، رائے و فہم کی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا، چہ جائیکہ گاندھی جی جو بیچارے پوری طرح نور ایمان سے بھی مشرف نہیں۔ ایسی حالت میں ان سے اتنی بڑی غلطی کا صدور گو کتنا ہی رنج دِہ واقعہ ہو، ناممکن یا مستبعد نہ تھا۔

بہرحال جو کچھ مشیت الٰہی میں تھا، پورا ہو کر رہا۔ اب اُسکے حسن و قبح پر زیادہ بحث و گفتگو بھی عبث ہے۔ کہنے کی بات صرف اتنی ہے، کہ جو لوگ ترک موالات کو ایک سیاسی و قومی پروگرام کی حیثیت سے اختیار کیے ہوئے تھے، وہ بے شبہ بڑی آسانی سے کھُلم کھُلا اسکے ترک پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن جو خدا کے بندے اسکو خدا کا کام سمجھ چکے ہیں، اور جن پر اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل و کرم سے اس تحریک کی معنویت کو روشن کر دیا ہے، وہ انشاءاللہ اس اعلان کے بعد بھی مایوس و شکستہ خاطر نہ ہوں گے، بلکہ جہاں تک اُنکی ذات کا تعلق ہے، اس حادثۂ کبریٰ میں بحسب فرمان خداوندی "استعانت بالصبر والصلوٰۃ" میں مصروف رہیں گے، اور زبان و دل دونوں پر ان دعاؤں کو جاری رکھیں گے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا - رَبَّنَا ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا

اہل ایمان پر روشن ہے، کہ نور ہدایت سے مشرف ہو کر پھر ظلمت فسق کی جانب واپس جانا، آئین الٰہی میں کس قدر شدید و سنگین جرم ہے۔ وہ کتاب مبین میں حضرت شعیبؑ اور اُنکے رفقا کا قول پڑھ چکے ہیں:-

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰہُ مِنْھَا، وَمَا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْھَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّنَا، وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا، عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا، رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ (اعراف - ۱۱)

اُنھیں اس قانون الٰہی کی اطلاع مل چکی ہے، اور وہ اپنے اس ایمان پر راسخ ہیں، کہ جو لوگ راہ حق دیکھ چکنے کے بعد باطل پرستیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں

سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ (اعراف - ۱۹)	اُن پر غضب الٰہی نازل ہوتا ہے، اور عذاب آخرت سے قطع نظر کرکے اسی دنیا میں اُنھیں ذلت و خواری نصیب ہوتی ہے۔

انسانوں کے کام، خواہ وہ کتنے ہی بہتر و پاکیزہ انسان ہوں، دُنیوی مصلحتوں کے پابند ہوتے ہیں۔ خدا کا کام ان قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ جن کو دنیوی کامیابیاں عزیز ہیں، اُنھیں مصلحت شناسی مبارک، جنھیں رضائے حق مطلوب ہے، اُنھیں دنیا میں ناکامیاں مبارک۔ خدا روشن کرے اکبر کی تربت کو، کیا خوب

کہ گیا ہے :-

دینِ خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے — دنیا اُٹھی ہے اپنی تعلّی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ — اللہ ہی ہے اُنکی تسلّی کے واسطے

رباعیات

(از جناب مولوی حافظ ساجد علی عباسی وکیل اورنگ آباد دکن)

آوازِ اذاں میں پائی سُن گُن تیری — ناقوسِ برہمن میں بھی ہے دُھن تیری
اک آن میں ہو گیا دو عالم کا ظہور — واللہ قیامت کی ہے اک کُن تیری

کچھ کام نہیں ہے این و آں سے مجھکو — کیا واسطہ ہے نام و نشاں سے مجھکو
توحید و رسالت سے ہے سینہ معمور — دولت یہ ملی دونوں جہاں سے مجھکو

یارب دمِ آخر رہے رحمت کی نگاہ — شیطانِ لعیں نہ کرنے پائے گمراہ
ہر تارِ نفس ہو نغمہ سنجِ توحید — ہر ہر بُنِ مُو سے نکلے اللہ اللہ

یارب تری رحمت کے یہ برسیں بادل — سرسبز چمن ہوں لہلہائیں جنگل
سیراب ہوں کھیتیاں شگفتہ دل ہوں — ہم دھوم سے جنگل میں منائیں منگل

گذری غفلت میں زندگانی اپنی — اک چھاؤں تھی - پیری و جوانی اپنی
کیوں آئے تھے - کیا لیا - چلے خالی ہاتھ — افسوس کہ کچھ قدر نہ جانی اپنی

تاریخ مغرب ابن العذاری

(مترجمۂ جمیل الرحمن صاحب ایم اے۔ پروفیسر جامعۂ عثمانیہ)

شمالی افریقہ کا سرسبز و شاداب ساحل جو سرحد مصر سے جبل الطارق تک بحیرۂ روم کے کنارے تقریباً دو ہزار میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے انقلابات عالم کا ایک عجیب و غریب مرقع ہے۔

ازمنۂ مظلمہ سے اس وقت تک بیسیوں قومیں اس ملک میں آباد ہوئیں اور تباہ ہوگئیں۔ سیکڑوں سلطنتیں اس سرزمین پر قائم ہوئیں اور فنا ہوگئیں۔ ہزاروں فاتح جنرل اس خطہ سے پیدا ہوے اور پیوند خاک ہوگئے۔ اور بے شمار دانشمند، عالم، اور فلاسفر اس مرزبوم میں نشو نما پاکر عالم کے راہبر بنے اور گمنام ہوگئے۔

ایک سمت بحیرۂ روم کا ناپیدا کنار پانی اور دوسری جانب صحرائے اعظم کا ہولناک ریگستان اسکے دامنوں کے قدرتی محافظ تھے اور دشوارگذار کوہستانی علاقہ ملک کے اندرونی حصہ میں مدافعت کے لیے دائمی ملجا اور مامن تھا۔

شہروں کے آباد کرنے والے فنا ہوگئے، قومیں مٹ گئیں، سلطنتیں تباہ ہوگئیں، ملکوں کے نام تک بدل گئے، مگر یہ عظیم الشان ساحل اپنی بھولی بسری شوکت پر فاتحہ خوانی کرنے کے لیے آج بھی اُسی صورت و حالت سے قائم ہے۔ جیسا کہ کئی ہزار برس پہلے تھا۔ دریاؤں کی روانی اور طغیانی میں سرمو فرق نہیں ہوا۔ پہاڑوں نے ایک قدم بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ ریگستان کے ہولناک مناظر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ زرخیز زمین اب بھی آفتاب کی تیز شعاعوں کو اپنے آغوش میں جگہ دیکر سبزہ اُگاتی ہے اور آب و ہوائی جاں بخش تاثیر آج بھی خرما او رزیتون پیدا کرنے کو تیار ہے۔ جن کی افراط پر کبھی اس دیس کو ناز تھا۔ لیکن سمندر میں جنگی جہازات کے بیڑے نظر نہیں آتے۔ دریاؤں اور نہروں میں تجارتی کشتیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ پہاڑوں پر محفوظ اور مستحکم قلعے اور خوبصورت

اور شاندار محل عنقا ہوگئے۔ خُرما اور زیتون میں لذت باقی نہیں رہی اور دنیا کی بازار سے یہاں کی پیداوار کی مانگ اُٹھ گئی۔ اس وجہ سے کہ زراعت کے ترقی دینے والے، اسباب معیشت کی فراہمی میں کوشش کرنے والے۔ اشجار و اثمار کی افزائش و زیبائش کے باعث جنھوں نے اس سرزمین کو اپنے دماغ اور بازوؤں کے خون سے سینچا تھا، اور اقصائے عالم میں ناموری کا غلغلہ ڈال کر اپنی شوکت و عظمت کے پرتو سے اس دامن بحر کو تمام تہذیب یافتہ ممالک کا درسگاہ بنایا تھا دنیا میں باقی نہیں رہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔!!

سب سے پہلے جس اقبالمند قوم نے اس ساحل کی عظمت کا دنیا میں ڈنکا بجایا وہ تاجر کی ایک مختصر جماعت تھی جو عالم کی تاریخ میں "فنوشنس" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سوداگروں کا گروہ مشرق سے تلاش معاش میں آیا اور سمندر کے کنارے ایک ہموار تختۂ زمین پر چند جھونپڑے بنا کر آباد ہوگیا۔ گرد و نواح کے وحشیوں کو رام کیا اور چند ہی روز میں ان جھونپڑوں کی جگہ ایک گاؤں نظر آنے لگا۔ یہی گاؤں اُس عظیم الشان سلطنت کا خوبصورت اور قلعبند دارالحکومت بنا جس نے ایک دن رومۃ الکبریٰ کے دھوئیں اُڑا دیے اور جو "کارتیج" کے حسرت خیز نام سے آج تک تاریخ کے صفحوں پر یادگار ہے۔ اس سلطنت کا بنیادی پتھر رکھنے والے سوداگر تھے اور تجارت ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اپنے روزگار کے لیے انکو کشتیوں اور جہازوں کی ضرورت تھی۔ اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ فن جہازرانی میں اُنھوں نے اس قدر ترقی کی کہ مورخوں کا ایک گروہ اُنکو اس فن کا موجد خیال کرتا ہے۔ اپنے کاروبار کے لیے انکو حساب دانی کی احتیاج تھی اور ضروریات زندگی کی خود زندگی کفیل ہے۔ علم ریاضی میں انھوں نے وہ درجۂ کمال حاصل کیا کہ محققین کی ایک جماعت ہندسوں کی موجودہ شکل کو انہیں جاہلوں کی ایجاد بتاتی ہے۔

جہازوں کی افراط سمندر پر قبضہ پانے کی طلسمی کنجی تھی اور تجارت کا فروغ، دولت و سامان معیشت کی فراہمی کے لیے ایک درشنی ہنڈی!!

دولت اور فراغت نے بیوپاریوں کی منڈلی میں شجاعت و حوصلہ مندی کی آتش جہانسوز مشتعل کی اور غیرت قومی یا حب جاہ نے اس آگ پر تیل چھڑکا۔ آلات جنگ فراہم کیے گئے۔ مستحکم قلعے تعمیر ہوئے۔ رضاکاروں کی فوجیں مرتب ہوئیں۔ یونان، مصر، اور افریقہ کے دلیر نوجوان

ملازمت کے لیے آئے۔ سسلی، سارڈنا، وغیرہ بحیرۂ روم کے جزائر حلقہ بگوش ہوے اور مدبران ملک نے حکومت عالم کا سبز باغ دکھا کر ساحل کے ہر ایک باشندہ کو رستم و افراسیاب بنا دیا!! رومۃ الکبریٰ کا آفتاب اقبال اُس وقت تک نقطۂ نصف النہار پر نہیں پہونچا تھا لیکن چڑھتی ہوئی دھوپ میں کافی حرارت تھی۔ اُس کی تہذیب و جہانداری مشعل ہدایت تھی۔ اور اُس کا قانون معاشرت دنیا کا راہبر اور ہادی۔ اُسکے فوجی نظام کا ہمسایہ سلطنتوں میں جواب نہ تھا اور اُسکے جنرلوں کی دانشمندی و وفاداری، سپاہیوں کی شجاعت و مردانگی، اور آلات جنگ کی فراوانی اُس وقت بھی تمام قرب و جوار کے حاکموں کے دل تھرا دیا کرتی تھی۔ ایران اور ہندوستان کی گذشتہ عظمت پر ایشیا والے بہت نازاں ہیں لیکن رومیوں کے ستارۂ اقبال نے ان سب کو کرمکِ شب تاب بنا دیا تھا۔

بلبل کہ ہمین قافیۂ گل شود بس است! ان ممالک کے لیے اتنی ہی تعریف بس ہے کہ یہاں کے باشندے بھی اُس وقت متمدن سمجھے جاتے تھے جبکہ روما اور اُس کے مقبوضات کے سوا بقیہ تمام دنیا غفلت اور جہالت کے تاریک بادلوں سے گھری ہوئی تھی، اور سارا کرۂ خاک نیم وحشیوں، وحشیوں، یا درندوں سے آباد سمجھا جاتا تھا!!!

روما کے معراج کمال کے وقت اندلس، یونان، اور ایشیاے کوچک اُس کے باجگزار صوبے بنے۔ دجلہ اور فرات اُسکی مشرقی سرحد قرار پائے، اور انگلستان کا ٹھنڈا جزیرہ جو آج برطانیہ عظمیٰ کے پُر شوکت لقب سے دعویدار ہے کہ اُس کی حکومت کے پرچم پر آفتاب غروب نہیں ہوتا، اس مظفر و منصور سلطنت کی ایک فوجی چھاؤنی بنایا گیا۔ لیکن یہ نقطۂ کمال ہنوز دور تھا اور اس منزل عروج تک رسائی نہیں ہوئی تھی کہ صقلیہ (سسلی) کے میدان کارزار میں روم و کارتیج کا مقابلہ ہوا۔

رومیوں کے تدبر، جفاکشی اور دور اندیشی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اُن کو کارتیج سے نبرد آزمائی کی ضرورت ہوئی تو اُنھوں نے ایک سو تیس جہازات کا بیڑہ ساٹھ دن کی قلیل مدت میں تیار کیا اور دشمن سے اُسی کے عنصر یعنی عالم آب میں کلّہ بہ کلّہ مقابل ہوے۔ روما اور کارتیج کی لڑائی اُنیسویں صدی عیسوی میں سلطنت ہند کی کابل پر چڑھائی تھی۔

اگر پوری قوت صرف کی جاتی اور مصالح ملکی مجبور نہ کرتے تو کارتھج کا اُسی وقت نام و نشان مٹ جاتا۔ مگر زندگی کی سب سے بڑی محافظ موت ہے۔ وقت برابر نہیں ہوا تھا اور ابھی بہت سے عجائب قدرت ظہور میں آنا باقی تھے۔ ۲۴ سال کی جنگ کے بعد صلح کا پیام قبول کیا گیا اور چشم نمائی کافی سمجھی گئی۔

اس طویل جنگ نے جو روم کی تاریخ میں "پہلی پیونک وار" کے نام سے یاد کی جاتی ہے شمالی آفریقہ کے تمام متمدن ساحل پر انتقام کا جوش پیدا کر دیا۔ جنگجو بہادروں، جفاکش سپاہیوں، اور جہاں دیدہ جنرلوں کی ایک قوم اس ساحل پر پیدا ہوگئی جس کے بچے بچے کو رومیوں سے اپنی پہلی شکست کا عوض لینے اور اُنکے دارالحکومت کو تباہ کرنے کی آرزو تھی۔ خوبیٔ قسمت سے زمام اختیار اس حوصلہ مند سپہ سالار کے ہاتھ میں گئی جو "ہنبال" کے پُرعظمت نام سے آج تک جوان مَردوں کی دنیا میں زندہ ہے اور جس کے زریں کارنامے تاریخ کے صفحوں سے اُس وقت تک محو نہیں ہو سکتے جب تک کہ روما کا نام بھی دنیا سے نہ مٹ جائے۔

افسوس کہ شب فرصت مختصر ہے اور افسانہ زلفِ مسلسل سے زیادہ دراز ورنہ اس شجاع دوران کے سیلاب فتوحات کی سیر میں محمود و نادر کی پرستش کرنے والوں، بایزید و تیمور کی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کرنے والوں، اور ارجن و رستم کا کلمہ پڑھنے والوں کو قلم اور روشنائی کی طلسمی لالٹین سے دکھاتا جس سے ظاہر ہو جاتا کہ کوہکنی کی بازار میں فرہاد کی قیمت بہت گراں ہے اور خسرو کا مرقع اپنے ہی گھر میں کھوٹے داموں بکتا ہے!!

هزار نکتهٔ باریک تر زمو اینجاست
نه هر که سر بتراشد قلندری داند

ہنبال کی تصویر جو اس وقت صفحۂ تاریخ پر موجود ہے وہ دشمن کی کھینچی ہوئی ہے۔ شیر کو انسان نے زنجیروں سے جکڑ رکھا ہے!! مگر یہ معقید شاہ سباع دشمن کے قلم سے بھی خط و خال میں نپولین اور سکندر کا مدمقابل ہے۔ اتنا تو عدو کو بھی تسلیم ہے کہ ہنبال "الپس" کے دشوار گذار کوہستان کو روندتا اور رومیوں کے زرخیز علاقوں کو پامال کرتا ہوا روما کے دروازہ پر پہونچ گیا تھا اور دنیا کی شائستہ ترین سلطنت کی کُل قوت اُس کے ہیبت و جبروت سے جاں طلب تھی۔

کارکنان قضا و قدر نے روم کی آخری تباہی اُسکے ہاتھوں مقدر نہیں کی تھی جس طرح کہ یورپ کی شاہنشاہی نپولین کے نصیب میں اور سارے عالم کی حکومت سکندر کی تقدیر میں نہ تھی سعی انسان کے اختیار میں ہے اور اتمام خدا کے ہاتھ! اتفاقات زمانہ نے مجبوریاں پیدا کیں اور اس سرکیف دلیر کو اپنی مہم نامکمل چھوڑکر وطن واپس آنا پڑا - یہ افریقیہ کی بدقسمتی تھی کہ ہنبال کے بعد کسی دوسرے جنرل کو اوس کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نہ ہوئی اور ہنبال کی فتوحات کے بعد (جو روما کی.... تاریخ میں دوسری پیونک وار کے نام سے مشہور ہیں) لڑائیوں کا انجام تاجروں کی شکست پر ہونے لگا - اور بالآخر تقریباً ایک صدی کے مقابلہ، مجادلہ اور مقاتلہ کے بعد روم کارتھج پر غالب آگیا شاذاً کارتھج تباہ ہوا اور رومۃ الکبرٰے کا ایک صوبہ بنا یا گیا -

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوقِ زریں ہمہ درگردن خری بینم

اب اس بیوفا ساحل پر رومیوں کا شادیانہ ظفر بجنے لگا - رومن قانون جاری ہوا - رومی گورنر مقرر ہوے اور ساحل کے بربری اپنے پُرانے محسنوں کو فراموش کرکے روما کا "شہری" کہلانا طرۂ افتخار و امتیاز سمجھنے لگے -

حضرت مسیحؑ کی پیدایش سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے رومیوں نے کارتھج پر قبضہ کیا تھا اور کم و بیش چھ سو برس تک اُنکی حکومت اس ملک پر قائم رہی - اس طویل مدت میں ساحل کی تاریخ روما کی داستان غم و شادی کا ایک جزو ہے - روما کا تمدن ساحل میں سرایت کرگیا - تھیٹر اور سرکس بنائے گئے - کشادہ سڑکیں وجود میں آئیں - دنگل اور اکھاڑے جگہ جگہ نظر آنے لگے - ستونوں اور محرابوں کی تعمیر میں صنعتیں صرف کی گئیں - آب رسانی کے حوض اور پانی کے وہ بے نظیر خزانے تیار ہوے جن کے کھنڈر آج تک ٹیونس کی ریاست میں سیاحوں کو خون کے آنسو رلاتے ہیں -

اسی تمدن کے عہد میں گورنر افریقیہ کے لڑکے جان اور روما کی شہزادی ہنوریا نے ایڈیٹر مرقع عالم مرحوم کے قول کے مطابق عشق و محبت کی چوسر کھیلی تھی اور اُنکی داستان کے بعض ہنگامے اسی دلفریب ساحل پر واقع ہوے تھے - قصہ میں تاریخی عنصر بہت تھوڑا بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے

تاہم افریقیہ اور روم کی قدیم معاشرت کا ایک بگڑا ہوا فوٹو اور ساحل مغرب کی شوکت کا مٹا ہوا خاکہ ضرور ہے۔

اس تاریخی بیان میں ایک ناول کا حوالہ دینا خامۂ شکستہ پر سخت جبر ہے مگر بدقسمتی سے اُردو زبان میں شاید کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ہے[1] جس میں قدیم ساحل مغرب کا اُتنا بھی تذکرہ ہو جتنا اس افسانہ میں تحریر ہے۔ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی بیجا تعریف سے اس قدر مہلت نہ تھی کہ دنیا کی دوسری شائستہ قوموں کی تاریخ پر متوجہ ہوتے۔ اور ہنود جو اُردو کے ابتدائی عہد میں اس لشکری زبان کی خدمت اپنا فرض سمجھتے تھے کچھ عرصہ کے بعد ہندی کو خویش اور اُردو کو بیگانہ تصور کرنے لگے۔ انجام کار یہ ہوا کہ سوائے تاریخ اسلام کے چند کرم خوردہ صفحوں کے اُردو کے دامن میں کوئی قیمتی خزانہ نہیں آیا۔ اور تاریخ اسلام کی بھی یہ کیفیت رہی کہ مسلمانوں کا عروج تو بڑے زور شور سے دکھایا گیا لیکن اُنکی اندرونی خرابیوں اور اُنکے زوال و تباہی کے حقیقی اسباب پر ہمیشہ پردہ ڈالا گیا تاکہ ناظرین کی دل آزاری نہ ہو!

خلافت راشدہ اور بنی اُمیہ کے فتوحات یا عباسیوں کے علمی کارنامے تو بڑی آب و تاب سے شاعروں اور مقرروں نے موقع بے موقع بیان کیے لیکن عباسیوں یا خوارزمیوں کی تباہی کے آخری شرمناک اسباب کسی نے علی رؤس الاشہاد ظاہر نہ کیے اور نہ غرناطہ کے قابل نفرت آخری حاکم کی بزدلی اور کمینہ پن سے اہل ملک کو آگاہ کرنے کی ہمت کی۔

ایک معترض کہتا ہے کہ ہندوستان کے خوشامد پرست مسلمان اپنے اسلاف کی بد افعالی پر بے لوث تنقید برداشت نہیں کر سکتے اور سوائے اپنے بزرگوں کی مدح و ستایش کے کسی غیر مذہب والے کی تعریف سُن کر اپنے کانوں کو گنہگار نہیں بنا سکتے!!

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل اک روز جھونکا کھائیگی

[1] ایسا تو نہیں ہے۔ کم سے کم الناظر بک ایجنسی کے ذخیرہ میں دو کتابیں موجود ہیں: ۱ اقصائے مغرب (مولوی حامد علی صدیقی) ۲۔ تاریخ مراکش و مغرب الاقصیٰ ۲ جلد۔ اسکے علاوہ تاریخ ملل قدیمہ (شائع کردہ انجمن ترقی اُردو) میں بھی اہل فینیقیہ کے حالات میں......... ایک پورا باب موجود ہے۔　ایڈیٹر

اُردو کا علمی افلاس دُور نہیں ہو سکتا جب تک کہ تمام قدیم شایستہ اور متمدن قوموں کی تاریخ اُس میں مہیا نہ کی جائے اور مسلمان اپنی مذموم اسلاف پرستی ترک کر کے جادۂ اعتدال پر نہیں آ سکتے جب تک کہ وہ امم سابقہ کے کارناموں سے اپنے ہوش و حواس نہ درست کریں۔ اونٹ جب پہاڑ کے نیچے آئے تو جانے کہ اُس کا قد و قامت کس قدر عظمت کا مستحق ہے۔" قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلہم"۔ احباب معاف کریں۔ دل بھرا ہوا تھا اس لیے یہ جملۂ معترضہ اپنی حد سے بڑھ گیا۔ باز آمدم بر سر مطلب۔

دنیا میں ہر عروج کے بعد زوال اور ہر ترقی کے لیے ایک حدِ کمال ہے۔ آفتاب نقطۂ نصف النہار سے گذرتا ہے تو اُس کی تیزی گھٹنے لگتی ہے اور چودھویں رات کے بعد چاند کی روشنی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ رومۃ الکبریٰ کو بھی معراج کمال کے بعد پستی کے منازل کی طرف جھکنا پڑا۔ خانہ جنگی نے سلطنت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ فوجی طاقت کمزور ہوئی۔ رعایا میں بغاوت و سازش کا حوصلہ پیدا ہوا۔ دور اُفتادہ صوبے یکے بعد دیگرے سُوارا ج کے طلبگار ہوے اور مغرب کے بدقسمت ساحل پر وحشیوں کی ایک قوم نے جو "ونڈال" کے مہیب نام سے تاریخ کے خونیں صفحوں پر مشہور ہے اپنا سکہ چلایا۔

اس عہد تباہی کے واقعات بہت کم محفوظ ہیں مگر انکے اقبالمند جانشینوں نے سونے چاندی اور جواہرات کے جو انبار اس ملک سے پائے وہ شاہد ہیں کہ ونڈال کے وحشی درندے بھی اس زرا ندود سرزمین کا لہو چوسنے میں پوری طور پر کامیاب نہیں ہوے اور پچھلے پندرہ سو برس کے تمدن و فلاح میں جو حشمت و فراغت اس ساحل کو نصیب ہو چکی تھی وہ اس ظلم و جہالت کی دو صدیوں میں بالکل مفقود نہ ہو سکی اور آنے والی نسلوں کا اشتیاقِ غارت پورا کرنے کے لیے بہت سامال غنیمت باقی رہ گیا۔

ہندوؤں کے مقدس رشیوں کا قول ہے کہ جب مظالم اور بدکاریوں کا طوفان حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس سیلاب کو روکنے کے لیے ایک اَوتار جنم لیتا ہے، جو ملک میں دوبارہ انصاف اور حق پرستی کی عدالت قائم کرتا ہے۔ مغرب کی زمین جب وحشیوں کے جور و ستم سے تلملانے لگی تو کرّوبیانِ قدسی کو اُسکے حال زار پر رحم آیا۔ پُروائی ہوا کے جھونکے چلے، عباؤں اور

غاموں کی گھٹا گھنگھور چھائی - تکبیروں اور رجزوں کا بادل گرجا - نیزوں کی بجلی چمکی - عربی گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے افریقہ کی وادیاں گونجنے لگیں اور ایک ایسی سرفروش قوم میدان میں آئی جس نے آلاتِ جنگ اور قدیم فنونِ حرب بیکار کردیے - جو نہ امان کی طالب ہوتی تھی نہ میدان سے منہ موڑتی تھی اور جسکے عقیدہ کے مطابق تلواروں کے سایہ میں جان دینا اور جنۃ الفردوس میں حیاتِ ابدی حاصل کرنا مرادف تھا !!

عربوں کی ابتدائی فتوحات کا سیلاب واقعی قدرتِ خداوندی کا ایک کرشمہ تھا مگر یہ حیرت انگیز داستان متعدد بار اس قدر تفصیل سے بیان ہوچکی ہے کہ اب اس کہانی کا دُہرانا بے مزہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ایران، شام، فلسطین و مصر پر غلبہ پانے کے بعد ساحلِ مغرب کی مشرقی چوکیوں یعنی برقہ اور طرابلس پر اُنھوں نے حملہ کیا اور بغیر کسی سخت مزاحمت کے کامیاب ہوگئے - حوصلہ بڑھا تو مصر کا عربی گورنر عبداللہ بن سرح ۲۰ ہزار بہادروں کی جمعیت سے جرجیر حاکم افریقہ کے مقابل آیا جس نے ان پردیسیوں کے کچلنے کے لیے ایک لاکھ بیس ہزار فوج میدان میں استادہ کردی - اس جنگ کے انجام میں کوئی ذی فہم شک کرہی نہ سکتا تھا مگر حضرت عبداللہ بن زبیر کی دانشمندی اور دلیری نے پانسہ لپٹ دیا - جرجیر اپنی غلطی سے قتل ہوا اور فتح کا سہرا کشتۂ حرص عبدالملک کے سر رہا - ابن العذاری المراکشی لکھتا ہے کہ "مالِ غنیمت کا اکثر حصہ سونا اور چاندی تھا .... چنانچہ ابن ابی سرح کے سامنے سونے اور چاندی کے مٹکے لاکر رکھنے شروع کیے گئے - اُنھوں نے افریقہ کے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ تمام مال تم کو کہاں سے دستیاب ہوا؟ (یہ سُن کر) اُن میں سے ایک شخص زمین پر کوئی چیز تلاش کرنے لگا - اتنے میں وہ لوگ زیتون کی کچھ گٹھلیاں اُٹھالائے اور اُس شخص نے جواب دیا کہ یہی چیز ہے جس سے ہم کو یہ تمام مال و متاع حاصل ہوا ہے - کیونکہ اہالی بحر کے ہاں زیتون نہیں ہوتا - وہ یہ چیز ہمیں سے خریدتے تھے - بہرحال یہ مالِ غنیمت اس قدر تھا کہ ہر ایک سوار کو دُس ہیں سے تین ہزار دینار سرخ اور پیادے کو ایک ہزار دینار حصہ ملا"

اس فتحِ عظیم نے مغرب کے ساحل پر عربوں کی سلطنت کا بنیادی پتھر رکھا - مناسب موقعوں پر فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں اور ۵۰ ہجری میں قیروان کا مشہور شہر آباد کرکے (جو آج تک

ریاست ٹونس میں مغرب کا مکہ کہلاتا ہے اور جہان کسی غیر مذہب والے کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے) مسلمانوں نے اس ملک میں گھر بنانے کا تہیہ کر لیا۔

حسرت نصیب کارتیج جسکی عظمت و صولت کی دُھندلی تصویر گذشتہ اوراق میں دکھائی گئی ہے ابھی تک عربوں کی زد سے محفوظ تھا۔ مگر ۷۸ھ میں عبد الملک اموی کے گورنر حسان بن نعمان نے شوکت افریقیہ کے اُس مجاور کی طرف رُخ کیا اور ایکی کارتیج ایسا تباہ ہوا کہ پھر کبھی سنبھل سکا۔

اس دردناک داستان پر مسلمان مورخین نے عام طور سے پردہ ڈالا ہے، لیکن العذاری نے خون ناحق چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کارتیج کی تربت پر یوں موتی چڑھاتا ہے:-

"افریقیہ کے شہر قرطاجنہ کا حال۔ اسی شہر کو موجودہ زمانہ کے اہل ٹونس معلقہ کہتے ہیں۔ قرطاجنہ ایک زبردست شہر تھا جس کی فصیل سے سمندر کی لہریں ٹکرایا کرتی تھیں۔ یہ ٹونس سے بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور اُن دونوں شہروں کے درمیان معمور آبادیاں اور قریے ہیں۔ اس وقت تک سمندر تونس کی طرف نہیں آیا تھا مگر آخر میں اس طرف آ گیا۔ اس شہر میں عظیم الشان کھنڈر، زبردست عمارتیں اور عالیشان بنیادیں پائی جاتی ہیں جس سے اسکی گذشتہ مٹی ہوئی قوموں کی عظمت و شان کا پتہ چلتا ہے۔ اہل تونس اب بھی اسکے کھنڈروں میں عجیب و غریب چیزیں پاتے ہیں جو مرورِ زمانہ کے باوجود غور و فکر کرنے والوں کے لیے باعث تعجب و عبرت ہیں۔

جب حسان نے وہاں پہونچکر شرفا کو تہ تیغ کیا تو باقیماندہ لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اس شہر سے بھاگ جائیں۔ بیشمار کشتیاں اور جہاز موجود ہی تھے ان میں سے بعض صقلیہ اور بعض اندلس کی طرف چلے گئے ...... حسان پھر وہاں واپس آیا اور ناکہ بندی کرکے اُسکا سخت محاصرہ کیا۔ اُسکو پھر فتح نصیب ہوئی اور وہ بزور شمشیر شہر میں داخل ہوا۔ اس مرتبہ اُس نے قتل و غارت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ بیشمار قیدی اُسکے ہاتھ آئے۔ اسکے بعد اُس نے اردگرد کے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب وہ سب اُسکے سطوت اور رعب سے خوف زدہ ہوکر جمع ہو گئے اور اُن میں سے کوئی ایسا باقی نہ رہا جو حاضر نہ ہوا ہو تو اُس نے اُنکو قرطاجنہ کے برباد و منہدم کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حسان نے اُسکو ایسا برباد کر دیا کہ وہ گذشتہ زمانہ کی ایک قصہ کہانی ہو گیا۔"

اللہ اللہ! وہ بھی کیا حسرت خیز منظر تھا کہ کارتیج کے مظلوم باشندے غلامی کی زنجیریں

ٹپکائے اور اُن کے جانشین عبیدیوں نے اسکو دوبارہ بساط عالم میں اپنی قدیم جگہ لینے کے قابل بنایا۔ عبیدئین کی عظمت پر بھی عرب کے بعض عابد ومتقی مورخ خاک ڈالنے کی کوشش کرتے اور اُنکے بادشاہوں کا نام بغیر دشنام کے لکھنا گناہ سمجھتے ہیں کیونکہ انکے بعض عقائد مشرقی خلافتوں سے مختلف تھے اور ان کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انکی سلطنت جو دولت بنی فاطمہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے ایک مدت تک خلافت بنی عباس کی زبردست حریف رہی اور اُس نے شام وحجاز کو اپنا ماتحت صوبہ بنا کر ایک سال حرمین شریفین میں بھی اپنی شوکت کا خطبہ پڑھوایا۔

شاہزادۂ معزالدین جس کو ہندوستان کے سرمایۂ ناز افسانہ نگار میر تقی نے اپنی بوستان خیال میں حیات جاوید عطا کی ہے اسی سلطنت کے ایک تاجدار ابوتمیم معزلدین اللہ کا بگڑا ہوا نام ہے اور ابوالحسن جوہر جس نے مصر فتح کرکے عباسیوں کی خلافت افریقہ کے بر اعظم سے مٹادی اسی دولت کا ایک جنرل ہے!!

قدیم اسلامی سلطنتوں کے نظام میں چند اندرونی خرابیاں تھیں جو انکی کامیابیوں کو دیرپا نہیں ہونے دیتی تھیں اور انکو "دولت مستعجل" کا طعنہ دلایا کرتی تھیں لیکن اُن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ دولت بنی فاطمہ کے زوال کے بعد صنہاجیہ، مرابطین، ملثمین اور موحدین نے بڑی بڑی زبردست سلطنتیں اس سرزمین پر قائم کیں جن میں سے علامہ شبلی مرحوم نے بھی اپنے سلسلۂ "ڈائل ہیروز آف اسلام" کے لیے دو ایک نامور تاجداروں کو منتخب کیا تھا۔ مگر ملک کی بدقسمتی سے اُنکی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور اُنکے قابل جانشین کو سیاسیات نے اُستاد کی یہ دیرینہ آرزو پوری کرنے کی فرصت نہ دی۔ ملثمین کی حکومت مغرب کی ایجادات واختراعات پسند آب وہوا کا ایک شعبدہ تھی جس نے دنیا کی تاریخ میں اپنا نام یوں زندہ رکھا کہ اُس عہد کی عورتیں مردانے لباس میں باہر نکلتی تھیں اور مرد نقاب پوش رہتے تھے!!

مرابطین اور موحدین کی بیش بہا خدمات مذہب اسلام کو کبھی فراموش نہیں ہوسکتیں۔ مسیحیوں کی روزافزوں سطوت سے مقابلہ کرتے میں اُن کی عظیم قربانیاں مسلمان کبھی بھول نہیں سکتے۔ اور جب تک اسپین کی تاریخ یورپ کی لکھی ہوئی بھی دنیا سے مٹ نہ جائے اُنکی حسرت والم انجام "جنگ عقاب" پر جس میں چھ لاکھ بہادر ایک میدان میں کٹ کر فدائے مذہب ہوگئے مغرب ہمیشہ آنسو بہاتا رہے گا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

موحدین کا خاتمہ ترکوں کے بحری عروج کا پیش خیمہ تھا اور اُس عہد کے بربری قزاقوں کا دبدبہ مسیحی دلاوروں کو ابھی تک یاد ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو ترکوں کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں اور کسی مسیحی کا بحیرۂ روم سے زندہ و سلامت واپس آنا ساوتری کے طفیل میں جم دُوت کے پنجے سے رہائی پانا تھا!!!

یہ دن بھی گذر گئے۔ شیر بیمار ہوا اور مر گیا۔ فرانس، اٹلی اور اسپین نے شمالی افریقہ کی ہڈیوں پر دندان آز کو تیز کیا اور کل شام تک اس بلکیں اور بے یار ساحل پر انھیں ملکوں کے خمار آلود سپاہی پولو کھیل رہے تھے مگر یہ زمین عجائبات قدرت کا تماشہ گاہ ہے۔ معلوم نہیں کہ آج رات کو رومیو جولیٹ کا ناٹک ہوگا یا راجہ اندر کا اجلاس!!

تلک الایام نداولہا بین الناس

المختصر یہ بربری ساحل انقلابات عالم کا عجیب و غریب مرقع ہے اور اسکی مکمل تاریخ کسی وقت اُردو زبان میں اگر مرتب ہو جائے تو وہ دلچسپیوں کا انمول خزانہ ہوگی۔

ضرورت ہے کہ انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں سے کارتھیج کی قدیم تاریخ کو اُردو کا جامہ پہنایا جائے۔ عربی سے تاریخ مغرب کے قدیم دفینے تلاش کرکے ہندوستان میں لائے جائیں اور اُسکے بعد کوئی سحر نگار مورخ اس انبار سے جواہرات ڈھونڈھ کر مغرب کی ایک مکمل تاریخ اپنی ملکی زبان میں تیار کرے۔

بے مایہ زبان اُردو کو محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ اسلامی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے اس قومی فرض کا ایک مختصر حصہ ادا کرنے کی سعی کی ہے اور ابن العذاری المراکشی کی ایک نایاب تالیف البیان المغرب فی اخبار المغرب کی پہلی جلد کا ترجمہ شایع کیا ہے۔

افسوس ہے کہ فاضل مترجم نے اپنی کتاب کے ساتھ کوئی مقدمہ شایع نہیں کیا جس سے مغرب کی قدیم عظمت و شوکت معلوم ہو سکتی اور اُن کی بیش قیمت تالیف سے روشناس کرنے کے لیے

اس طویل تمہید کی ضرورت نہ ہوتی۔ کم سے کم مورخ العذاری کی مختصر سوانحعمری تو کتاب کے شروع میں ضرور دینا چاہیے تھی تاکہ یہ معلوم ہو سکتا کہ مولف کا نشو ونما کس عہد میں ہوا تھا اور جو واقعات اُس نے اپنی تاریخ میں درج کیے ہیں اُن سے واقفیت حاصل کرنے کی اُس کے پاس سوائے قدیم کتابوں کے اور کیا کیا ذرائع موجود تھے۔

جفاکش مترجم نے ملک مغرب کا ایک نقشہ کتاب کے ساتھ ضم کیا ہے جس سے تاریخ مغرب کے سمجھنے اور موجودہ شہروں کے قدیم عربی نام دریافت کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نقشہ میں رنگ نہیں بھرا گیا اور نقاط کے ذریعہ سے یہ دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ بنی اغلب کا رقبۂ حکومت کس قدر تھا؟ عبیدئین نے کتنا اضافہ کیا اور موحدین کا دائرۂ سلطنت کہاں تک وسیع ہو گیا۔ مترجم کی دیانت اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ متن کے ابتدائی اوراق جن میں غالباً افریقہ کے حالات اور عربوں کے ابتدائی فتوحات کا تذکرہ تھا گم ہو گئے تھے یا دیمک کی نذر ہوئے تھے تو ترجمہ میں بھی نقاط کے ذریعہ سے دکھا دیا گیا کہ اصل کتاب میں اس جگہ نقص واقع ہو گیا ہے۔ اگرچہ زیادہ بہتر تھا کہ اُس زمانہ کے واقعات دیگر عربی تواریخ سے اخذ کر کے بطور نوٹ کے لکھ دیے جاتے تاکہ کتاب بحیثیت مجموعی مکمل رہتی اور ساحل مغرب کے آیندہ خوش نصیب مورخ کو اُس عہد کے لیے جو اس تالیف میں مذکور ہے کسی دوسری کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہ پڑتی۔

کتاب کے خاتمہ پر تعلیقات کے عنوان سے بہت سے انمول جواہر ریزے مترجم نے اپنی کد و کاوش سے فراہم کیے ہیں۔ اور درحقیقت یہی معلومات قابل ترجمہ نگاری و وسعت نظر کا ثبوت ہے لیکن زیادہ مناسب تھا کہ یہ لعل و زمرد کے ٹکڑے موقع موقع پر کتاب کے دامن میں فٹ نوٹ کی طرح جڑے جاتے اور کتاب کے آخر میں ایک جگہ انبار نہ کر دیے جاتے جہاں ان کی قیمت کا اندازہ کرنے کی کم لوگ کوشش کریں گے۔ انھیں تعلیقات کا ایک جزو بربری قبائل کا شجرۂ نسب ہے۔ جس کے یکجا کرنے میں مترجم کو بہت تکلیف برداشت کرنا پڑی ہو گی مگر اس شجرہ کی صحت اب بھی مشتبہ ہے۔ اور ترجمہ کی عظمت میں کچھ فرق نہ آتا اگر یہ بیکار زحمت نہ اُٹھائی جاتی۔

خدا کرے کہ اس ترجمہ کے دوسرے اڈیشن کی نوبت جلد آئے۔ اور مترجم صاحب

ان نقائص کو دور کر سکیں۔

ترجمہ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں ہے۔ اور نکتہ چیں نگاہ ۵۰۰ صفحوں کی ضخیم کتاب میں صرف دو جگہ پنجابی اُردو کا نمونہ تلاش کر سکی:

صفحہ ۳۰ پر یہ عبارت درج ہے "جن سے ہم نے بہت سے عہد نامے اور وعدے کیے ہوئے ہیں" اور صفحہ ۳۳۰ پر ایک جگہ لکھا ہے "معلوم ہوا کہ اُنکے غلاموں نے سواری اور ہتھیاروں وغیرہ کا انتظام کیا ہوا ہے"

یہ خفیف لغزش یقیناً کاتب کی غلطی ہے جو تصحیح کی نظر سے بچ گئی ورنہ ساری کتاب فصیح اور بامحاورہ اُردو میں ہے۔ اور عربی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں میں زبان کے متعلق ہونے کا جو نقص ہوتا ہے اور جو ہمارے بعض عالم لیڈروں کی تحریرات میں بھی پایا جاتا ہے اس بیش بہا تالیف میں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ نثر سے زیادہ نظم کا ترجمہ دشوار ہے مگر اس دشوار گذار منزل میں بھی پروفیسر صاحب کا قدم نہیں پھسلا۔ اشعار کا ترجمہ صحیح ہوا اور زبان بھی صاف رہی۔ مثال کے لیے دو نمونے ملاحظہ ہوں:—

(۱) اصبر لدہر نال منک فہکذا مضت الدہور
فرحٌ و حزنٌ مرۃً لا حزن دائم ولا السرور

(ترجمہ۔ زمانہ کی کج ادائی پر صبر کر۔ کیونکہ زمانے اسی طرح گذرتے رہتے ہیں۔ خوشی اور غم آتے جاتے رہتے ہیں۔ نہ غم ہمیشہ رہتا ہے اور نہ خوشی)

(۲) اسلامی سلطنتوں کے آخری فرماں روا عام طور پر اپنی جان بچا کر بھاگنا میدان جنگ میں کٹ کر مر جانے سے بہتر سمجھا کیے ہیں۔ کیونکہ اپنے ملک و قوم کی حفاظت کے لیے اگر وہ جان دیدیتے تو اُن میں اور چیتوڑ گڈھ کے راجاؤں میں کیا فرق باقی رہ جاتا!! اسی صلح و عافیت کی انجیل پر عمل کرنے کے لیے بنی اغلب کا آخری تاجدار زیادۃ اللہ بھی افریقیہ سے فرار ہوا اور بیت المقدس میں جاکر مرا۔ جب وہ اپنے اہل و عیال، مال و متاع اور ایک ہزار صقلیوں کے ساتھ قیروان سے بھاگا ہے تو ایک لونڈی کو پیچھے چھوڑنا چاہتا تھا۔ جس نے رخصت کے وقت یہ دو شعر گائے تاکہ وہ اسکو بھی ساتھ لے جائے:

لم انس یوم الوداع موقفها وجفنها فی دموعها غرق
وقولها والرکاب واقفتہ تترکنی سیدی وتنطلق

(ترجمہ) "میں نہیں بھولا رخصت کے دن اُس کے ٹھہرنے کے مقام کو ایسی حالت میں کہ اُن کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ اور اُس کا یہ کہنا اُس وقت جبکہ سواری تیار کھڑی تھی کہ ہمارے سردار ہم کو چھوڑ کر جا رہا ہے!"

یہ اشعار سن کر عبیداللہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اُس نے مال کا ایک بوجھ گرا دیا اور لونڈی کو ساتھ لے گیا۔ (صفحہ ۲۰۲ و صفحہ ۲۳۰)

———— ⁘ ————

نثر میں بھی ایک مقام پر رعایت لفظی نے عربی عبارت کا اُردو میں ترجمہ کرنا دشوار کر دیا تھا مگر مترجم نے نہایت خوش اسلوبی سے اُس مہم کو آسان کیا۔ ملاحظہ ہو:

"ابن خنیش معروف بہ یونانی نے مجھ سے کہنا شروع کیا کہ" کہا جاتا ہے کہ نمکین چیز (ملوحہ) مزہ دار ہوتی ہے (تحلو)" میں نے کہا ہاں۔ پھر کہا کہ" اور کہتے ہیں مٹھاس (حلاوۃ) میٹھی ہوتی ہے (تحلو)" میں نے کہا ہاں۔ اس پر اُس نے کہا" پھر مٹھاس ہی نمکینی ہے اور نمکینی مٹھاس ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ مٹھاس اپنی لطافت کی وجہ سے مزہ دار ہوتی ہے اور نمکینی اپنی ثقالت کی وجہ سے۔ اسکے بعد اُس نے اسی قسم کی گفتگو جاری رکھی۔ آخر میں نے تنگ آ کر کہا کہ کہتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ ہاں۔ میں نے کہا یہ بھی کہتے ہیں کہ کُتا زندہ ہے۔ اُس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر تم کتے ہو اور کُتا تمھارے برابر ہے۔ یہ سُنکر زیادۃ اللہ خوب قہقہے مار کر ہنسا۔ میں سمجھ گیا کہ بجائے کام کی باتوں کے ان ہی ہزلیات کی طرف زیادہ مائل ہے"۔ (صفحہ ۱۹۲)

ترجمہ کی خوبیاں ظاہر کرنے کے لیے اتنے ہی نمونے کافی ہیں۔ اب متن کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ فن تاریخ نویسی بیسویں صدی میں بہت ترقی کر گیا ہے اور زمانۂ حال کے بعض یورپین مورخ صداقت و راستبازی کو اتنا ضروری خیال نہیں کرتے جتنا کہ اپنی تالیفات کو دلچسپ بنانا لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ ہر ایک ملک کے واقعات جداگانہ طور پر مسلسل بیان کرتے ہیں اور اُن سوانح کے اسباب و نتائج بھی ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ عرب کے قدیم مورخ اس طرز تحریر سے ناآشنا

تھے اور اپنے علمی تصنیفات کو قصہ کہانی کی طرح عوام پسند بنانا نہیں جانتے تھے۔ وہ واقعات کو بترتیب سنین لکھتے تھے اور جس سال میں جو سانحہ پیش آتا تھا اُسکو تسلسل کا لحاظ کیے بغیر اُس سنہ کے عنوان میں درج کردیتے تھے۔ العذاری المراکشی جس کی تاریخ مغرب کی پہلی جلد کا ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اسی سنت قدیم کا عامل تھا۔ وہ بھی سال بہ سال واقعات تحریر کرتا ہے لیکن غنیمت ہے کہ خاص خاص حکومتوں اور مہتم بالشان سوانح کو بطور خلاصہ ایک جگہ بھی جمع کردیتا ہے۔ اس جلد میں عربوں کے ابتدائی فتوحات سے ۲۶۰ھ ہجری یعنی آغاز سلطنت موحدین تک کے حالات ہیں۔ بنی اغلب اور بنی فاطمہ کا دورِ حکومت کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بنی ادریس، صنہاجیہ اور بنی رستم کا بھی حال ہے لیکن مرابطین اور ملثمین اس سے زیادہ توجہ کے مستحق تھے جتنی کہ العذاری نے اُنکے حال پر کی ہے۔

کتاب بحیثیت موجودہ ناول کی طرح پڑھنے کے قابل نہیں ہے لیکن معمولی تاریخی واقعات کے علاوہ ہجرت کی ابتدائی چھ صدیوں میں اہل مغرب کی معاشرت، اُنکی اخلاقی حالت، اُنکی خانہ جنگیاں، اُنکے سنگین جرائم، اُن کا علم وفضل، اُنکے ایجادات واختراعات اور اُنکے جاہ وجلال کی چلتی پھرتی تصویریں اس قدر افراط سے اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں کہ مغرب کا آیندہ مورخ اس کتاب سے حکایات اخذ کرکے ساحل بربر کے ازمنۂ متوسطہ کی نہایت دلچسپ تاریخ مرتب کرسکتا ہے جو بالکل زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق ہو۔ اگر ان سب حکایتوں کا اقتباس کیا جائے تو یہ مضمون ایک مستقل رسالہ بن جائے گا۔ لہذا دو ہی چار نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) ایک ملکہ کا جنازہ

"اُسی سال نصیر الدولہ کی بیوی نے انتقال کیا۔ اُسکو ایسا کفن دیا گیا کہ کسی بادشاہ کو اُس جیسا کفن نصیب نہیں ہوا۔ ایک سوداگر نے جو اُس وقت وہاں موجود تھا بیان کیا ہے کہ اُسکی قیمت ایک لاکھ دینار تھی۔ جنازہ کو عود ہندی کے تابوت میں جو جواہرات سے مرصع تھا بند کیا گیا یہ جنازہ اس شان وشوکت سے اُٹھایا گیا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ .... اس تابوت کی صرف کیلوں کی قیمت دو ہزار دینار تھی۔" (صفحہ ۳۰۹، ۳۸۰)

(۲) ایک شہزادی کی شادی

"اسی سال ماہ رجب میں شرف الدولہ کی بہن شہزادی اُم العلو بنت نصیر الدولہ کی شادی ہوئی۔ غرۂ شعبان کو بُدھ کے دن ام العلو کے محل کو سجایا گیا اور عوام و خواص اُسکے دیکھنے کو آئے۔ یہاں اُنھوں نے ایسے طرح طرح کے جواہرات، ململے، بیش بہا سامان اور سونے چاندی کے برتن دیکھے کہ نہ پہلے کبھی اُس جیسے بنائے گئے تھے اور نہ کسی بادشاہ کے پاس سُنے گئے۔ ابو اسحاق کہتے ہیں کہ یہ حال اور عظمت و شان دیکھ کر عوام الناس کی آنکھیں چوندھیا گئیں اور وہ مبہوت ہو کر رہ گئے... ...... اُس کا مہر دس بوجھوں میں دس خچروں پر بار تھا اور ہر ایک بوجھ پر ایک خوبصورت لونڈی تعینات تھی .... ایک تجربہ کار سوداگر کا قول ہے کہ میں نے اُس تمام سامان کی قیمت آنکی تو وہ اندازاً دس لاکھ دینار ہوتی تھی۔ اس سے قبل افریقیہ میں کسی عورت کو اتنا جہیز نہیں دیا گیا"۔ (صفحہ ۳۸۴)

(۳) ہمت و استقلال

"۴۳۶ھ میں جرجانی نے مصر میں وفات پائی۔ الحاکم بامر اللہ عبیدی نے کسی قصور پر اُسکے دونوں ہاتھ کٹوا دیے تھے مگر اُسے مصیبت سے ذرا بھی دُکھ درد نہ ہوا۔ بلکہ کہتے ہیں کہ اُس نے زخم کو باندھا اور اُسی وقت دیوان میں اجلاس کرنے کے لیے آ بیٹھا اور کام کرنا شروع کر دیا۔ جب لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا تو کہا کہ امیر المومنین نے مجھ کو میرے قصور کی سزا دی ہے معزول نہیں کیا ہے۔ جب حاکم کو یہ معلوم ہوا تو اُسے پھر اُسکے کام پر مقرر کر دیا"۔ (صفحہ ۳۸۸)

[نوٹ۔ شاید "اختیارات سرسری" عطا فرما دیے ہوں گے تاکہ شہادت لکھنے کی ضرورت نہ ہو، اور جیل خانہ کی آبادی میں اضافہ ہو جائے !!۔]

(۴) علم و قابلیت

"یہ امیر افریقیہ (ابو عباس محمد بن الاغلب) بہت کم لکھا پڑھا آدمی تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ اُس کا کاتب رجاء ایک دن اُسکے پاس تھا کہ اُس نے "محمضبی" "ضاد" سے لکھا۔ جب مجلس برخاست ہو گئی تو کاتب نے کہا کہ خدا امیر کا بھلا کرے، "ضبی" "ظ" سے ہے نہ کہ "ض" سے۔ امیر نے جواب دیا کہ ہم کو معلوم ہے کہ اس میں اختلاف ہے۔ ابو حنیفہ اسکو "ظ" سے لکھتے ہیں اور امام مالک "ض" سے۔ یہ سُن کر تمام حاضرین تعجب میں رہ گئے"۔ (صفحہ ۴۴، ۴۵)

(۵) ایک جدید مذہب

"متیسرین سے مراد میاسرہ یعنی میسرہ کے پیروؤں سے ہے۔ اس مذہب یا گمراہی کی تفصیل یہ ہے کہ وہ صالح بن طریف کی نبوت کے قائل تھے۔۔۔۔۔۔ اُس نے ماہ رجب کے روزے اور رمضان میں کھانا پینا فرض کیا تھا۔ پانچ وقت کی نماز دن میں اور پانچ وقت کی نماز رات کو فرض کی۔ عیدالضحیٰ گیارہ محرم کو مقرر کی۔۔۔۔۔۔ اُنکی بعض نمازیں بغیر سجدہ کی ہوتی تھیں اور بعض مسلمانوں کی نماز کی طرح۔ مگر وہ یکے بعد دیگرے تین سجدے کیا کرتے تھے اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں کو زمین سے نصف بالشت بلند رکھتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان میں سے ہر شخص جتنی عورتیں چاہے کرسکتا تھا اور جس طرح چاہے اُنکو طلاق دے کر پھر اُنکی طرف رجوع کرسکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ زانی کو سنگسار اور جھوٹے کو جلا وطن کیا جاتا تھا۔۔۔۔ تمام حیوانات اُنکے ہاں حرام تھے۔ مچھلی کا گلا کاٹے بغیر نہ کھاتے تھے۔ مرغ اور انڈا قطعًا حرام تھے۔ مرغی مکروہ تھی سوائے اسکے کہ کسی کو اُس کی بہت ہی خواہش ہو۔ اوقات کا معلوم کرنا اُن کے ہاں مرغ کی اذان پر منحصر تھا اور اسی وجہ سے اُنھوں نے اُسے حرام قرار دیا تھا، اور اُس کا تھوک اُنکے یہاں متبرک تھا۔ یہ لوگ علم نجوم کے بڑے عالم تھے۔۔۔۔۔۔۔ صالح کے قرآن میں اسّی سورتیں تھیں جن میں سے اکثر نبیوں کے نام سے منسوب تھیں۔ ان ہی میں سورۂ فرعون، سورۂ دیک، سورۂ جراد۔ سورۂ جمل، سورۂ ہاروت سورۂ ماروت وغیرہ تھیں۔۔۔۔۔۔۔ ۵۴۲ھ تک اکثر قبائل اس مذہب کے پیرو رہے۔" (صفحہ ۳۱۵ - ۳۱۶)

(۶) ایک ظالم کے دردناک ستم

"کہتے ہیں کہ اُس کی (ابراہیم بن احمد اغلبی کی) ایک لونڈی سے اُس کا ایک چھوٹا سا رومال جس سے وہ منہ پونچھا کرتا تھا گم ہوگیا اور ایک نوکر کے پاس سے ملا۔ اس جرم میں اُس نے تین سو خادموں کو قتل کراڈالا۔ اپنے بیٹے ابواغلب کو قتل کرانے کا سبب محض ایک شبہہ تھا۔ اسی طرح اُس نے اپنے آٹھ بھائیوں کو اپنے سامنے ہی قتل کرایا۔ جب کبھی اُسکے کوئی بیٹی پیدا ہوتی تھی تو ابراہیم کی ماں اس خوف سے کہ کہیں وہ اسے قتل نہ کرادے ہمیشہ اس ولادت کو پوشیدہ رکھتی تھی۔ اس طرح ہوتے ہوتے اُسکے پاس سولہ نہایت خوبصورت لڑکیاں جمع ہوگئیں۔

ایک دن جب اپنے بیٹے کو ذرا خوش خوش دیکھا تو کہا کہ میں نے تمھارے لیے چند خوبصورت لونڈیاں پرورش کی ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ تم اُنکو دیکھ لو۔ ابراہیم نے بھی خواہش ظاہر کی۔ اس پر اُن سب کو بُلایا گیا۔ اور اب اُس کی ماں نے بتانا شروع کیا کہ یہ تمھاری بیٹی فلانی کے بطن سے ہے اور یہ فلاں سے وغیرہ وغیرہ۔ یہ دیکھ بھال کر وہ اپنی ماں کے پاس سے اُٹھکر باہر آیا اور ایک اپنے حبشی غلام کو حکم دیا کہ جا کر لڑکیوں کے سر لے آئے۔ خادم یہ سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ ابراہیم نے کہا کہ جا، ورنہ میں اُن سے پہلے تجھ ہی سے شروع کروں گا۔ مجبوراً اُسکو جانا پڑا۔ جب وہ اُس کی ماں کے پاس گیا تو اُسے بھی سخت صدمہ ہوا اور اُس نے کہا کہ جا کر پھر اُس سے کہہ۔ مگر اُس نے جواب دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان سب کو قتل کر ڈالا اور بالوں کو پکڑ کر ان سب کے سر ابراہیم کے سامنے ڈالے۔" (صفحہ ۱۸۱-۱۸۲)

سلسلۂ سخن دراز ہوگیا۔ اور اہل مجلس زانو بدلنے لگے۔ اب العذاری کی مورخانہ وقعت پر تبصرہ کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ احباب کو جماہیاں آنے لگیں! "الناظر" کی جبین پر مضمون کی طوالت سے شکن پڑ چکی ہے۔ اب العذاری کا عرب کے دوسرے مورخوں سے موازنہ کیا جائے تو خطرہ ہے کہ "باقی آئندہ" کا نوٹ نوازش عتاب نازل ہو اور اشہب قلم صفحہ قرطاس پر جو دَوڑ کر چکا اُس کا بھی لطف جاتا رہے!! لہذا شمع محفل خاموش اور مجلس برخاست!!

مگر صبح کچھ دور نہیں!! دنسیم کے جھونکے شروع ہوگئے۔ افق مشرق پر سفید دھاری نمایاں ہے۔ اُدھر جلد دوم مطبع سے طلوع ہوئی اور یہاں بزم سخن پھر قائم ہوگئی!! یار زندہ وصحبت باقی!!!

امیر احمد علوی بی اے ۔ نیچ چھاؤنی ۔ سنٹرل انڈیا

اگست نمبر میں انعامی مضامین کی جانچ کرنے والے اصحاب کے اسمائے گرامی درج کرتے وقت عزیز محترم جناب منشی امیر احمد علوی کا پتہ غلط ہوگیا تھا۔ صاحب موصوف "نیماڑ" میں نہیں بلکہ "نیچ" میں تشریف رکھتے ہیں۔ اور سشن جج نہیں بلکہ "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور جج" ہیں۔ ایڈیٹر

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر مسعود اجودھی رحمۃ اللہ علیہ

آفتاب انوار ولایت، پیشوائے عالم ہدایت، بدر الطریقت شمس الحقیقت، عمدۃ الابرار قدوۃ الاخیار، سلطان السالکین، شمس العارفین، برہان العاشقین فرید الحق والشرع والدین قدس سرہ العزیز اپنے زمانے کے سرحلقۂ واصلان حق تھے۔ صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ

"وی را دریں طریق بغایت شانے بزرگ است۔ و جمیع مشائخ بر کمال عشق و عرفان احوال وے متفق اند۔ و ریاضت و مجاہدات و ترک و تجرید و فقر و شوق کہ وی را دست دادہ بود ہیچ یکے ازیں طائفہ را مجموع کمالات صوری و معنوی در یک شخص واحد میسر شد۔ در کشف و کرامات و وجد و حال و ہمت و شجاعت بے نظیر وقت بود۔"

آپ کے والد ماجد کا نام قاضی جمال الدین بن سلیمان تھا جو کھتوال (واقع ملتان) کے قاضی تھے۔ اور والدۂ ماجدہ ملا وجیہ الدین خجندی کی دختر نیک اختر تھیں۔ آپ کے والد ماجد قاضی شعیب کی اولاد میں سے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہونچتا ہے۔ سید محمد کرمانی کتاب سیر الاولیا میں فرماتے ہیں کہ فرخ شاہ عادل والی کابل آپ کے اجداد میں سے تھے۔ کابل کی سلطنت حوادث روزگار سے غزنی کی سلطنت میں ضم ہوگئی لیکن فرخ شاہ کی اولاد چنگیز خاں کے خروج تک کابل ہی میں رہی۔ فتنۂ تاتار کے بعد آپ کے جد قاضی شعیب تمام عیال و اطفال کو لے کر لاہور آگئے۔ گو وہاں چند روز قیام کرکے قصور کا ارادہ فرمایا۔ قاضی قصور نے آپ کی بڑی خاطر تواضع کی اور بادشاہ وقت کو آپ کے حالات سے مطلع کیا۔ بادشاہ نے قصبۂ کھتوال کی قضاۃ جو ملتان کے قریب واقع ہے آپ کو عطا کی۔ چنانچہ آپ نے وہیں اقامت و سکونت اختیار فرمائی۔

آپ کی والدۂ ماجدہ اپنے زمانہ کی بڑی بزرگ بی بی تھیں۔ حضرت سلطان جیؒ کے ملفوظات میں اکثر آپ کی کرامات کا ذکر ہے۔ آپ کا نام قرسم خاتون تھا۔

سفینۃ الاولیا میں ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت قصبۂ کھوتوال میں جو ملتان کے مضافات

میں ست ہے اور آج کل مشائخ کی چاؤلی کے نام سے مشہور ہے، ۵۶۹ھ پانسو اُنہتر ہجری میں واقع ہوئی۔ یہ موضع پاک پٹن (اجودھن) اور مہاران ضلع ملتان کے درمیان واقع ہے۔ اپنے شیخ کے وصال کے بعد اکتیس (سی ویک) سال قید حیات میں رہے۔ اور پچانوے سال کی عمر میں سہ شنبہ[1] کے دن پانچویں محرم ۶۶۴ھ چھ سو چونسٹھ ہجری کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ مرأۃ الاسرار میں تاریخ وفات چھ سو اڑسٹھ (۶۶۸) درج ہے یعنی سفینۃ الاولیا سے چار سال کا تفاوت آتا ہے۔ لیکن عمر دونوں نسخوں میں پچانوے (نود و پنج) سال لکھی ہے۔ آپ کو قصبۂ اجودھن میں جو اب پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے دفن کیا گیا۔ مزار مبارک آج تک منبع فیوض و برکات ہے۔ یزار و یتبرک۔

صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ بچپن ہی سے عشق الٰہی آپ کے دل میں موجزن تھا۔ اور عنفوان شباب ہی میں تمام دنیاوی مرادوں سے دست کش ہو کر گھر سے علم ظاہری و باطنی کی طلب میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

سیر العارفین میں حضرت سلطان المشائخؒ سے منقول ہے کہ تلاش علم میں آپ گھر سے نکل کر ملتان پہونچے۔ وہاں مولانا منہاج الدین ترمذی کی مسجد میں اُترے۔ علم فقہ میں ایک کتاب ہے نافع نام، اُسی کا مطالعہ فرما رہے تھے کہ حضرت قطب الاسلام و المسلمین خواجہ بختیار کاکیؒ اس مسجد میں تشریف لائے۔ انھیں دیکھا کہ ایک پاک صورت نیک سیرت ایک کتاب ہاتھ میں لیے پڑھ رہا ہے۔ آپ نے پوچھا مسعود کونسی کتاب پڑھ رہے ہو؟ اُنھوں نے کہا نافع۔ آپ نے فرمایا تم سمجھتے ہو کہ اس سے تمھیں نفع پہونچے گا؟ حضرت گنج شکرؒ نے التماس کیا کہ میرا نفع حضرت کی نظر کیمیا اثر میں ہے۔ یہ کہہ کر قدمبوس ہوئے۔ خواجہ قطب الاسلام نے بہت نوازش فرمائی۔ اور جب ملتان سے دلی جانے لگے تو حضرت گنج شکر تین منزل تک ہمراہ آئے۔ بعدہٗ حضرت قطب الاسلام نے یہ کہکر رخصت کر دیا کہ ابھی چند ایام علم ظاہری کی تحصیل میں مشغول رہو۔ اسکے بعد دلی آکر ہمارے پاس ٹھہرنا۔ حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت گنج شکرؒ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

---

[1] مرأۃ الاسرار میں روز وفات شنبہ درج ہے اور سفینۃ الاولیا میں سہ شنبہ۔ لیکن دونوں میں پانچویں محرم کی تاریخ وفات بیان کی گئی ہے۔

خواجہ قطب الاسلام سے رخصت ہوکر آپ قندھار کی طرف متوجہ ہوئے اور پانچ سال کامل وہاں تحصیل علم میں مشغول رہے۔ اسکے بعد بغداد کی طرف ارادہ فرمایا۔ یہاں تمام مشائخ وقت سے ملاقات فرمائی خصوصاً شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرہٗ العزیز کی ملازمت بھی حاصل کی چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ "شیخ شہاب الدین سہروردی را دعاگو دیدہ است وسعادت قدمبوسی حاصل کردہ"۔ حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ بغداد میں شیخ اجل شیرازیؒ سے بھی ملا تھا۔ بہت بزرگ و باعصمت پیر تھے۔ جب ہاتھ چومنے کے لیے بڑھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا "بیا اے لنگر عالم نیک آمدی"۔ چند روز اُن کی خدمت میں بھی رہا۔ کسی کو نہیں دیکھا کہ انکی خانقاہ سے محروم گیا ہو۔ مجھے بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے رزق میں برکت عطا فرمائے۔ بغداد سے نکل کر جب میدانوں میں پہونچا تو ایک درویش کو دیکھا زار و نزار۔ جسم پر صرف استخوان و پوست باقی رہ گیا ہے۔ میرے دل میں یہ خطرہ گذرا کہ اس جنگل میں یہ صاحب کب سے ہیں اور کیا کھاتے پیتے ہیں؟ اس خطرہ پر مطلع ہوکر اُنھوں نے فرمایا کہ اے فرزند چالیس سال سے اس غار میں مقیم ہوں اور سوائے خس و خاشاک اور میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ چند روز اُن کی خدمت میں رہا۔ پھر وہاں سے بخارا کی طرف روانہ ہوا جہاں شیخ سیف الدین باخرزی رحمۃ اللہ علیہ سے قدمبوسی حاصل کی۔ بڑے باعصمت بزرگ تھے۔ اُن کی خدمت میں رہا ہوں۔ جب میری طرف نظر فرماتے یہ کہتے کہ یہ لڑکا مشائخ روزگار میں سے ہوگا۔ اور تمام عالم اس کے مُریدوں اور فرزندوں سے بھر جائے گا۔ ایک سیاہ گلیم آپ کے دوش مبارک پر تھی اُتار کر مجھے دی اور فرمایا پہن لو۔ میں نے پہن لی۔ چند روز کے بعد یہاں سے بھی رخصت ہوا۔ ایک مسجد میں پہونچا۔ وہاں سے نزدیک ایک صومعہ تھا وہاں ایک باہیبت درویش کو دیکھا کہ عالم تفکر میں کھڑا ہوا ہے اور آنکھیں آسمان کی طرف ہیں۔ چار روز بعد عالم صحو میں آئے اُس وقت میں نے سلام کیا۔ جواب سلام عطا فرمایا اور کہا کہ میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی، بیٹھو۔ اُنھوں نے اپنا حال بیان فرمایا کہ میں حضرت شمس العارفینؒ کے پوتوں میں سے ہوں اور تیس سال سے یہاں معتکف ہوں۔ سوائے ہیبت و حیرت کے اور کچھ نصیب نہیں ہوا۔ پھر فرمایا کہ "ایں راہ راہیست ہر کہ دریں راہ بہ راستی قدم نہ زند بدوست نہ رسد"۔ بعد ازاں اپنے احوال و مقامات بیان فرمائے اور کہا خویشتن سے بیگانہ ہو جاؤ تاکہ

اُس کے یگانہ ہو۔ رات بھر خدمت میں رہا صبح کو رخصت ہوا۔

آپ فرماتے ہیں کہ بدخشاں میں بھی بہت سے بزرگوں سے نیاز حاصل ہوا جو ایسے تھے کہ اُنکی تعریف نہیں بیان کر سکتا۔

اس تمام دورہ و سفر کے بعد آپ ملتان کی جانب واپس ہوئے۔ اور شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات فرمائی۔ وہاں سے مراجعت کرکے دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الاسلام بختیار اوشی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں رہنے لگے۔ خود فرماتے ہیں کہ

"نعمتے کہ درد دے دیدم آں نعمت در حد وصف در بیان نیاید پس خود را در پائے ایشاں ستیم و بشرف بیعت مشرف شدم۔ سوم روز سر نعمت بمن رواں کرد و ایں سخن ہم فرمود کہ مولانا فرید کار خود تمام کردہ بودی انگاہ بمن آمدی"

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت گنج شکرؒ نے جب یہ بیان ختم کیا تو نعرہ مارا اور تین شبانہ روز عالم استغراق میں بےخود رہے۔ اسکے بعد جب ہوش میں آئے تو فرمایا مردان خدا نے یہ کیا ہے جب کسی مقام پر پہونچے ہیں۔ اُس راہ میں جب تک کوئی صدق دل سے سفر نہ کرے گا ہرگز ہرگز کسی مقام پر نہ پہونچے گا۔ پھر یہ ابیات زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے جامی

تو راہ نہ رفتی و ترا نہ نمودند ورنہ کہ زد ایں در کہ بروں نکشودند

جاں در رہِ دوست باز اگر میخواہی تو نیز چناں شوی کہ ایشاں بودند

فوائد السالکین میں حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ جب میں خواجہ قطب الاسلام کے شرف ارادت سے بہرہ مند ہوا تو چار کلاہ ترکی میرے سر پر رکھی اور بہت شفقت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ شیخ میں اتنی ذاتی قوت اور تصحیح خاطر ہونی چاہیے کہ اگر کوئی اُس کے پاس مُرید ہونے کو آئے تو باطنی نظر کی قوت سے اُس کے سینہ کے زنگار کو جو آلودگی دنیا کی وجہ سے جم گیا ہے صاف کردے تاکہ کوئی کدورت اور آلائش باقی نہ رہے۔ اسکے بعد ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہونچا دے۔

شرف بیعت کے بعد حضرت گنج شکرؒ غزنی دروازہ کے متصل جو برج ہے اُسکے نیچے ایک حجرہ بنا کر مشغول بحق ہوئے۔ وہاں سے ہر دو ہفتے کے بعد خواجہ قطب الاسلامؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ خواجہ صاحب نے آپ سے ملنے کے روزے رکھوائے اور فرمایا کہ تین روز کے بعد جو

غیب سے بہم پہونچ جائے اُس سے افطار کرو۔ تیسرے روز ایک شخص کے یہاں سے کھانا آیا جو شرابی تھا۔ آپ کے معدہ نے قبول نہیں کیا۔ خواجہ صاحب کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ دو تین روزہ اور طے کرو۔ چھٹے روز اس قدر ضعف ہوا اور ایک گھڑی رات گذرنے کے بعد بھوک کی اس قدر حرارت معلوم ہوئی کہ چند سنگریزے زمین پر پڑے ہوئے تھے حالتِ اضطرار میں اُن پر ہاتھ ڈالا۔ جس وقت وہ دہن مبارک میں پہونچے شکر ہوگئے۔ آپ نے فوراً تھوک دیا کہ کہیں مکر نہ ہو۔ کئی بار ایسی نوبت آئی اور سنگریزے شکر ہوگئے۔ یکایک حضرت خواجہ قطب الاسلام کا یہ ارشاد یاد پڑا کہ جو کچھ غیب سے ملے افطار کرلو۔ اس خیال کے آتے ہی آپ نے مواہب الٰہی خیال کرکے چند سنگریزے منہ میں ڈال لیے جو شکر ہوگئے۔ خواجہ سنائی نے اسی مضمون کو نظم فرمایا ہے

سنگ در دست تو گہر گردد زہر در کام تو شکر گردد

صبح ہوتے ہی خواجہ قطب الاسلام سے اس واقعہ کو عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا کیا کہ اُس سے افطار کیا۔ غیب سے جو شے پہونچی وہ اچھی ہی ہے۔ انشاءاللہ شکر کے مانند تم شیریں رہوگے۔ اسکے بعد جو آپ کو دیکھتا تھا گنج شکر کے نام سے خطاب کرتا تھا۔ لیکن سفینۃ الاولیا میں گنج شکر کی وجہ تسمیہ دوسری ہی لکھی ہے۔ صاحب سفینۃ الاولیا لکھتے ہیں کہ سات روز گذر گئے کہ آپنے افطار نہیں کیا تھا۔ ضعف غالب تھا۔ اسی حالت میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں روانہ ہوئے اثنائے راہ میں ضعف سے پَیر لڑکھڑایا اور آپ زمین پر گرپڑے۔ دہن مبارک میں کچھ مٹی چلی گئی جو تمام شکر ہوگئی۔ وہاں سے اُٹھ کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں پہونچے۔ حضرت شیخ نے فرمایا

"فریدگلے کہ بدہنت رسیدہ شکر شدہ حق تعالیٰ وجود ترا گنج شکر گردانیدہ است ہموارہ شیریں خواہی بود"

پیر کی خدمت سے جب باہر آئے دیکھا کہ جو شخص دیکھتا ہے گنج شکر کے لقب سے آپ کو یاد کرتا ہے۔ صاحب سیر العارفین لکھتے ہیں کہ "روزے وے بخدمت خواجہ می آمد از ضعف ریاضت پایش بلغزید بر زمین اُفتاد پارہ گِل بدہن رسید شکر شد از اں وقت گنج شکر گویند"۔ مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار میں ایک دوسری حکایت لکھتے ہیں کہ ایک سوداگر جو چند گاؤ شکر بار کرکے کہیں جا رہا تھا۔ حضرت شیخ

فرید الدین گنج شکر نے اُس سے تھوڑی شکر مانگی اُس نے جواب دیا کہ یہ نمک ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ نمک ہی ہوگا۔ چنانچہ سوداگر نے جب بوجھ کھولے تو تمام نمک نظر آیا۔ شرمندہ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نہایت عاجزی کی۔ آپ نے فرمایا اچھا شکر ہو گی۔ اسکے بعد جو دیکھا تو تمام شکر تھی۔ ایک عزیز نے اس مضمون میں چند شعر خوب کہے ہیں۔

کاں نمک جہاں شکر شیخ بحر و بر کز شکر نمک کند وز نمک شکر

اس کے بعد حضرت خواجہ قطب الاسلام قدس سرہ العزیز نے چلہ معکوس کے لیے آپ کو حکم فرمایا کہ ایسے مقام پر جاؤ جہاں مسجد ہو اور اُس مسجد میں ایک کنواں ہو اور اُس کنوئیں کے منہ پر ایک درخت ہو اور اُس مسجد میں ایک ایسا موذن ہو جو متدین لایق اور درویشوں کی صحبت کے قابل ہو۔ وہاں چالیس شب اپنے پاؤں کو سینے سے باندھ کر سرنگوں کوئیں میں لٹکو اور یاد الٰہی میں مصروف رہو۔ حضرت گنج شکر نے کوشش فرمائی تو ایسا مقام خطۂ اُچہ میں ملا جہاں اسی طرح کی ایک مسجد۔ کنواں اور درخت تھا۔ اور خواجہ رشید الدین میناٸی موذن تھے۔ آپ نے اس ارادہ کا اُن سے ذکر کیا اور اخفاے راز کی تاکید کی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر آپ وہاں جاتے اور رات بھر اسی حالت میں لٹکے رہتے۔ صبح کو خواجہ رشید الدین آتے اور آپ کو کنوئیں سے باہر نکالتے۔ آپ نماز فجر ادا کرکے اُسی مسجد میں مراقب رہتے۔ اسی طرح چالیس راتیں گذر گئیں اور چلہ ختم ہوا۔

خواجہ نظامی:

دارد دو سر ایں رشتہ یکے عجز دگر ناز زیں سو ہمہ عجز آمد وزاں سو ہمہ ناز

امیر حسن دہلوی:

ہر دل کہ در و مہر تو آویختہ شد آویختہ شد عاقبت از کنگرۂ عشق

اس طرح نماز معکوس حضرت سرور کائنات علیہ الف الف تحیۃ والصلوٰۃ سے بھی مروی ہے۔ حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پڑھی ہے۔ سلسلۂ چشتیہ میں خواجہ ابو محمد چشتی نے نماز معکوس بہت ادا فرمائی ہے۔

حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواجہ بزرگ معین الحق والدین قدس سرہ العزیز دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الاسلام قدس سرہ العزیز کے مکان پر ٹھہرے۔

حضرت گنج شکرؒ اس وقت وہیں قیام فرما تھے - خواجہ بزرگ نے اُنھیں دیکھ کر فرمایا
"بابا بختیار ایں جوان را چند در مجاہدہ خواہی سوخت، چیزے بخشش کن" خواجہ
قطب الاسلام نے عرض کی کہ "مرا چہ مجال کہ در نظر آں حضرت عطائے توانم کرد" آپ نے
فرمایا تمھیں سے اس کا تعلق ہے۔ اسکے بعد خواجہ بزرگؒ قبلہ رو حجرہ میں کھڑے ہوگئے۔ خواجہ
قطب الاسلام نے بھی موافقت فرمائی اور حضرت گنج شکرؒ کو بُلایا - خواجہ بزرگؒ نے انھیں اپنے
اور خواجہ قطب الاسلام کے درمیان کھڑا کیا - پھر دونوں بزرگوار حضرت گنج شکرؒ کے حق میں بہت
دیر تک دعائیں مانگتے رہے اور اتنی نوازش فرمائی کہ بیان سے باہر ہے۔ اور یہ ارشاد فرمایا کہ
"فرید شمعے ست کہ خانوادہ درویشاں روشن خواہد کرد" میر سید محمد کرمانی نے سیرالاولیا میں خوب کہا ہے

بخششِ کونین از چنین شد در بابِ تو　　بادشاہی یافتی زیں بادشاہانِ جہاں
مملکت دنیا و دیں گشتہ مسلّم مر ترا　　عالم کُن گشت اقطاع تو اے شاہ جہاں

سفینۃ الاولیا میں ہے کہ "ایشاں بخدمت حضرت خواجہ معین الدین چشتی نیز رسیدہ بودند و حضرت
خواجہ معین الدین در باب ایشاں می فرمودند کہ بختیار عظیم شاہبازے را بقید آوردہ است کہ جز بہ
سدرۃ المنتہیٰ آشیاں نگیرد و ایں شمعیست کہ خانہ درویشاں روشن و منور سازد" آپ اپنے زمانہ کے
قطب وقت و غوث زماں ہوے اور اتنے خوارق عالیہ آپ سے ظاہر ہوے ہیں کہ اس سلسلہ میں
بہ مشکل کسی سے ظہور میں آئے ہوں گے -

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ خواجہ قطب الاسلام کے وصال کا وقت جب قریب پہونچا
اُس وقت حضرت گنج شکرؒ قصبۂ ہانسی میں تھے - قاضی حمیدالدینؒ ناگوری اور بدرالدینؒ غزنوی کے
دلوں میں گذرا کہ خرقہ و سجادہ ہمیں عطا ہوگا - لیکن خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میں اپنا خرقہ و
عصا اور چوبی نعلین فریدالدین مسعود کو دُوں گا، وہی میرے خلیفہ اور جانشین ہوں گے۔ یہ امانت
قاضی حمیدالدینؒ کے حوالہ کرکے جاں بحق تسلیم ہوے - ہانسی میں یہ امر حضرت گنج شکرؒ کو معلوم ہوا
آپ دہلی کی طرف روانہ ہوے اور خواجہ قطب الاسلامؒ کی وفات کے چوتھے روز آپ کے مزارِ
پاک پر پہونچ کر شرف زیارت سے مشرف ہوے - قاضی صاحب نے وہ تمام نعمتیں آپ کے سپرد
کیں۔ حضرت گنج شکرؒ نے بتعظیم خرقہ پہنا اور جس گھر میں خواجہ قطب الاسلام رہتے تھے اُسی میں

قیام فرمایا۔

خواجہ قطب الاسلام اژدہام خلائق کے خیال سے ایک دربان رکھا کرتے تھے۔ حضرت گنج شکرؒ نے اپنے پیر کی سنت سمجھ کر اس دربان کو برقرار رکھا۔ اتفاقاً ایک دن ایک مجذوب سرہنگا نام جو ہانسی میں حضرت گنج شکر کی خدمت میں بہت آیا جایا کرتا تھا اور بہت خلوص و محبت رکھتا تھا آیا۔ دربان نے روکا اور اندر نہیں جانے دیا۔ دستور کے موافق حضرت گنج شکر جب جمعہ کے روز باہر تشریف لائے تو سرہنگا مجذوب روتا ہوا پیروں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ ہانسی میں روز آپ کو دیکھتا تھا۔ یہاں تین روز سے آیا ہوا ہوں اور بار نہیں ملتا۔ حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا کہیں نہیں رہوں گا۔ حاضرین نے کہا بھی کہ خواجہ قطب الاسلام نے یہ مقام آپ کو عطا کیا ہے مناسب نہیں کہ کہیں اور تشریف لے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو نعمت خواجہ صاحب نے مجھے مرحمت فرمائی ہے وہ کیا شہر کیا بیابان سب جگہ میرے پاس ہے۔ اسکے بعد دہلی سے روانہ ہو کر ہانسی میں تشریف لائے۔ یہیں شیخ جمال الدین ہانسوی کو شرف ارادت حاصل ہوا۔ یہ آپ کے محبوب ترین مُرید تھے۔ ہانسی میں بھی جب بہت بھیڑ بھاڑ ہوئی تو وہاں سے بھی روانہ ہوئے اور قصبۂ کھتو میں جو آپ کے آباؤ اجداد کا وطن تھا قیام اختیار کیا۔ یہ مقام ملتان سے قریب تھا اور دہلی اور ہانسی کی طرح یہاں بھی ہجوم ہونے لگا تو آپ نے لاہور جانے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں لاہور چنگیزی مغلوں کی تاخت و تاراج کی وجہ سے بہت خراب اور ویران ہو گیا تھا مگر آخرکار آپ نے اجودھن میں جو اَب پاک پٹن کہلاتا ہے قیام فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال اور بعض کہتے ہیں کہ چوبیس سال آپ اجودھن میں رہے۔ یہ آپ کی عمر کا آخری زمانہ تھا۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ آں مقام بہ وجود مبارک وے قبلۂ ہندوستان و خراسان گشت و تا روز قیامت خواہد ست

برزمینے کہ نشان کفِ پائے تو رسد سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود،،

حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ اجودھن میں آپ نے کئی شادیاں کیں۔ اور بچے ہوئے۔ جامع مسجد کے پاس آپ کا مکان تھا وہیں سب اہل و عیال رہا کرتے تھے۔ اور خود کبھی مسجد میں مشغول رہا کرتے تھے اور کبھی جنگل میں درختوں کے تلے بسر کرتے تھے۔ اور قناعت

پر نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک نوکر ایک دانگ کا نمک قرض لایا جب
جب افطار کے وقت آپ کے سامنے کھانا آیا تو آپ نے فرمایا اس میں اسراف کی بو آتی ہے۔
اس کھانے کو میں نہیں کھاؤں گا۔ ایک مرتبہ آپ کے ایک صاحبزادے گرسنگی سے ہلاک
ہوگئے۔ آپ کی بیوی صاحبہ نے عرض کی تو آپ نے فرمایا کہ مسعود بندہ کیا کرسکتا ہے اگر خدا کی
یہی مرضی ہے اور وہ مرگیا ہے تو ایک پیر میں رسی باندھ کر باہر پھینک دو۔ سبحان اللہ۔ یہ کسقدر
استغراق، فنا، قناعت، استقامت اور بلندیٔ ہمت تھی۔ یہ زمانہ جب گذر گیا اور فراغت
کا زمانہ آیا اور آپ کی عظمت و شہرت کی شہرت تمام عالم میں ہوئی اور ہر طرف سے فتوحات
آنے لگیں اُس وقت بھی یہی حال تھا۔ یہ تمام فتوحات مجاورین و مسافروں کے کام آتی تھیں۔
حضرت سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ صبح سے ایک گھڑی رات تک جو کوئی آتا طرح طرح
کے کھانے آپ کے باورچی خانہ سے کھاتا۔ اور ہر چاندرات کو آپ کے پاس مٹھائیاں آتیں
اور اُنکے انبار لگائے جاتے اور نقد بھی موجود رہتا۔ جو کوئی ماہِ نو کی مبارکباد کو آپ کے پاس
حاضر ہوتا اُس میں سے ضرور کچھ نہ کچھ اُسے عطا ہوتا۔ کسی کو شیرینی اور کسی کو نقد روپیہ۔ کسی کو
دونوں۔ جس کا جو حال ہوتا اُسی کے مناسب اُسے عطا ہوتا۔

حضرت سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ آپ اکثر صائم رہتے اور شربت سے افطار فرمایا
کرتے۔ ایک پیالہ میں چند مویز بھگو دیے جاتے اُسی کا شربت بن جاتا۔ نصف یا ثلث حاضرین
پر تقسیم ہوتا باقی خود نوش فرماتے بلکہ اُس میں سے بھی بچا کر کسی کو مرحمت فرماتے۔ بعد ازاں
نماز کے پہلے دو گھی چپڑی روٹیاں لائی جاتیں۔ ایک حاضرین کو تقسیم فرماتے اور ایک خود
تناول فرماتے بلکہ اُس میں سے بھی کسی کو دیدیتے۔ اسکے بعد سُرخ دسترخوان بچھایا جاتا اور طرح
طرح کے کھانے چُنے جاتے اور لوگ کھاتے۔ خود بہت کم شاذ ہی کبھی ارادہ فرماتے بلکہ اُسی
ایک روٹی میں سے کچھ بچا کر دوسرے روز کے افطار کے لیے رکھ دیتے۔ سلطان المشائخؒ فرماتے
ہیں کہ آپ اکثر زنبیل کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ افطار کے وقت اسی نانِ زنبیل کے دو ایک
ٹکڑے سامنے لائے جاتے۔ کبھی مکان میں دونوں دفعہ زنبیل کی روٹی تقسیم ہوتی لیکن احباب
کو اکثر دن کے وقت نانِ زنبیل اور رات کے وقت دسترخوان پر کھانا ملتا تھا۔ مصرعہ

ہر تنک حوصلہ شایستہ ہوائی نسبت

صاحب مرأۃ الاسرار سیرالاولیا کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جب سلطان ناصرالدین بن سلطان شمس الدین التمش نے اچھ اور ملتان کی طرف لشکرکشی کی تو حضرت گنج شکرؒ کی ملاقات کو بھی اجودھن آیا۔ ملازمت کے بعد کچھ زرِنقد اور چار گانوں کا فرمان الغ خاں کے ہاتھ خدمت مبارک میں پیش کیا۔ زرِنقد تو آپ نے لیکر اُسی وقت درویشوں کو تقسیم کر دیا اور فرمان واپس کر دیا کہ یہ گانوں کسی مستحق کو دیے جائیں مجھے ضرورت نہیں۔ الغ خاں کے دل میں یہ خیال آیا کہ سلطان کے کوئی لڑکا نہیں ہے کیا اچھا ہو اگر حضرت کی توجہ سے دہلی کی سلطنت اُسکے بعد مجھے مل جائے۔ اس خیال پر مطلع ہو کر آپ نے دو بیت زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے:

فریدون فرخ فرشتہ نبود ز عود و ز عنبر سرشتہ نبود
ز داد و دہش یافتہ نیکوئی تو داد و دہش کن فریدون توئی

سلطان ناصرالدین کی وفات کے بعد ہی الغ خاں بادشاہ ہوا اور سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے مشہور ہوا۔

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ کی محاسن مبارک سے ایک بال اُڑ کر نیچے گرا۔ فدوی نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو میں یہ لے لوں اور تعویذ بنا کر رکھوں۔ فرمایا اچھا۔ جب میں دہلی گیا تو یہ تعویذ اپنے ساتھ لیے آیا۔ جس کسی کو کوئی حاجت ہوتی اور مجھ سے تعویذ مانگتا تو میں یہ دے دیتا اور یہ شرط کر لیتا کہ جب کام نکل جائے تو مجھے واپس کر دینا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ کام نکلنے والا نہ ہوتا تو ہر چند تلاش کرتا تعویذ نہ ملتا۔ سبحان اللہ جب ایک موئے مبارک میں یہ عظمت و کرامت تھی تو دیگر خوارقِ عادات کا کیا ذکر۔

آپ کے چند اقوال سیرالاولیا، راحت القلوب، اسرارالاولیا، مرأۃ الاسرار و اخبارالاخیار سے انتخاب کرکے ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:-

آپ فرماتے ہیں کہ خدا سے بزرگ و برتر کے ساتھ معاملہ رکھو۔ سب لیتے ہیں اور وہ دیتا ہے اور جو وہ دیتا ہے اُسے کوئی نہیں لے سکتا۔ اپنے سے بھاگنا (یعنی اپنے نفس کے کرے بچنا) خدا سے ملنا ہے۔ ہر شخص کا کھانا مت کھاؤ۔ لیکن ہر شخص کو کھانا کھلاؤ۔ مستحقین کو کبھی فراموش مت کرو۔

قیاس پر باتیں نہ کیا کرو اور دل کو شیطان کا کھلونا نہ بناؤ۔ جس قدر تم اپنے ظاہر سے واقفیت رکھتے ہو اُس سے زیادہ باطن سے واقفیت رکھو۔ ظاہری آرائش کے پیچھے مت پڑو۔ پرانے گھرانوں کی عزت کرو۔ جنگ کی جگہ صلح سے کام لیا کرو۔ اور کسی دشمن سے گو وہ تم سے خوش نظر آئے بے خوف مت رہو۔ جو تم سے ڈرے اُس سے تم بھی ڈرو۔ اور اپنے زورِ بازو پر بھروسہ مت کرو۔ شہوت نفسانی کے وقت تمام اوقات سے زیادہ خویشتن داری سے کام لینا چاہیے جب اہلِ دولت کے پاس بیٹھو تو اپنے دین کو مت بھول جاؤ۔ عزت وحشمت عدالت وانصاف میں سمجھو۔ تونگری کے وقت ہمت بلند رکھو۔ دیتے وقت اپنی ذات کو درمیان سے اُٹھا لو۔ اسپر نظر نہ پڑے۔ دشمن کو نیک مشورہ سے شکست دو اور دوست کو تواضع سے غلام بناؤ۔ اپنے عیبوں پر نظر رکھو۔ دشمنوں کی سخت کلامی سے برانگیختہ مت ہو۔ اگر آسودگی چاہتے ہو تو حسد سے بچتے رہو۔ اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہو کہ موت کے بعد زندگی نصیب ہو۔ زندہ دل وہی ہے جس میں محبت اور اشتیاق ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ درویشی پردہ پوشی کا نام ہے۔ درویش کو لازم ہے کہ ان چار چیزوں سے دُور رہے۔ یعنی لوگوں کے عیب نہ دیکھے۔ نہ سُننے کے لائق باتیں نہ سُنے۔ نہ کہنے کی باتیں زبان سے نہ کہے اور جہاں جانا مناسب نہ ہو وہاں نہ جائے۔ نیز درویشی قناعت کا نام ہے۔ جو کچھ تجھے ملے اس پر قناعت کر اور یہ نہ کہہ کہ ایسا ملنا چاہیے تھا۔ اسراف اُسے کہتے ہیں کہ جو کچھ بے نیت دے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر نہ دے۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو کوئی میرے پاس آئے اور کوئی چیز نہ لائے تو مجھ پر واجب ہے کہ اُسے کچھ دوں۔ درویشی کا کوئی مقام خوف وامید سے خالی نہیں۔ ہر مقام کی مصیبت اُس کی آزمایش کے واسطے ہوتی ہے۔ اگر ذرا بھی چون وچرا کی تو پھر کبھی وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ درویش مصیبتوں میں صابر اور خوش رہتا ہے اور اٹھارہ ہزار عالم کی پروا نہیں کرتا۔ دُنیا بندہ اور مولا کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے (یعنی دنیا سے مراد یہ ہے کہ خدا سے غفلت میں کرے اسلئے سب سے بڑا حجاب ہے) حب الدنیا راس کل خطیئۃ۔ قال اہل المعرفۃ من ترک الدنیا ملک ومن اخذہا ہلک۔ دل مردہ بھی ہوتا ہے اور زندہ بھی۔ پس مردہ دل کو ذکر الٰہی سے زندہ کرو۔

جب دل دنیاوی لذتوں، شہوتوں، ماکولات اور مشروبات میں مشغول ہو جاتا ہے تو غفلت طاری ہو جاتی ہے اور خواہشات نفسانی غالب آجاتی ہیں اور دل میں ہر طرف سے خطرات آنا شروع ہوتے ہیں جو اُسے سیاہ کر دیتے ہیں اور جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو گویا مردہ ہو جاتا ہے اسے اندیشہ الٰہی اور ذکر الٰہی سے زندہ کرو۔

آپ فرماتے ہیں کہ جو درویش دنیا کے کاموں میں مصروف ہوا اور مال و مرتبہ و ترقی جاہ کا طلبگار ہوا وہ درویش نہیں بلکہ مرتد طریقت ہے۔ اس راہ میں بڑا اصول حضوریٔ دل ہے جو بغیر لقمۂ حلال کھائے اور دنیا سے پرہیز کیے حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک دوست کی شناخت حاصل نہ ہو ہزار سال بھی عبادت کرے تو بھی ذوق حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہی نہیں کہ طاعت کس کے لیے کر رہا ہے۔ اہل سلوک نے فرمایا ہے کہ جو پیر اہل سنت و جماعت کے طریق پر کاربند نہیں اور اُس کے اقوال و افعال، حرکات و سکنات حدیث و قرآن مجید کے مطابق نہیں وہ اس راہ میں راہزن ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں مومن کے دل کی بڑی قدر و منزلت ہے لیکن لوگ دل کی اصلاح سے غافل ہیں اسی واسطے گمراہی میں پڑتے ہیں۔ سلوک کا اصل اصول ہی دل ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ فقیر کے لیے دولتمند کی صحبت سے بڑھ کر کوئی چیز مضر نہیں۔ جب فقیر گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے تو اُس کے دینی و دنیوی کام اپنے آپ بنتے چلے جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا شیخ کامل نہ ہو تو اہل سلوک کی کتاب کو پیش نظر رکھے اور اُس کی متابعت کرے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو کوئی زحمت یا تکلیف ہو سمجھو کہ اُسے گناہ سے پاک کر رہے ہیں۔ بندہ کو سمجھنا چاہیے کہ رب درد و محبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اپنے نفس کا طبیب خود بننا چاہیے۔

اے بسا درد کاں ترا دارد وست ۔ اے بسا شیر کاں ترا آہو ست

آپ نے فرمایا کہ آدمی کو درویشوں کے حق میں ہمیشہ نیک گمان رکھنا چاہیے تاکہ اُنکی حمایت نصیب ہو۔ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے کام میں ہوتا ہے اللہ جل شانہٗ اُس کے کام میں ہوتا ہے۔ جو شخص دوست کی رضا کا طلبگار رہتا ہے تو دوست بھی اُسکی رضا کا جویندہ ہوتا ہے۔ طالب کو

ہر حالت میں مطلوب کے عشق و محبت اور اُسکی یاد میں رہنا چاہیے تاکہ متقدمین کے مانند ہو جائے۔ طریقت کی راہ رضا و تسلیم ہے۔ اگر کوئی گردن پر تلوار مارے تو اُسی پر راضی رہے۔ جسکی یہ حالت ہو وہ درویش ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اگر عابد سے کوئی ورد یا طاعت فوت ہو جائے تو اُسی کو اُسکی موت کہا جاتا ہے۔ صاحب وِرد کو چاہیے کہ جو وظیفہ ہے اگر دن کو پورا نہ کرسکے تو رات کو پورا کرے۔ بہر حال ترک نہ کرے۔

آپ نے فرمایا کہ اپنے تئیں کسی کے پلہ باندھ لینا اچھا ہے اور یہ شعر پڑھا جو حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کی زبان مبارک سے سنا تھا ؎

گر نیک تو ام مرا از ایشاں گیرند		ور بد باشم مرا بدیشاں بخشند

آپ نے فرمایا کہ جب لوگ کھانا کھائیں تو چاہیے کہ طاعت بھی کر دکھائیں کیونکہ طاعت کے لیے کھانا بھی طاعت ہے۔ ہوائے نفس کے لیے کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ سعدی

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است		تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

آپ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو علم کا درجہ معلوم ہو جائے تو تمام کام چھوڑ کر علم ہی تحصیل کیا کریں۔ علم ایک ایسا بادل ہے جس میں رحمت ہی رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ افسوس علمائے ظاہر علم سے غافل ہیں کیونکہ اُنھوں نے دنیا کو اپنا بُت بنا رکھا ہے اور شریعت کو کھیل سمجھ رکھا ہے۔ قیامت کے دن ان علما کے لیے جو دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ انہماک رکھتے ہیں اور علم سے جو مقصود ہے اُس پر عمل نہیں کرتے حکم ہوگا کہ انھیں آگ کے طوق پہنا کر دوزخ میں لیجائیں۔ پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ کی ذات سب سے بزرگ تر ہے۔ پھر لوگ کیوں ایسی نعمت سے محروم رہتے ہیں اور اپنی ساری عمر اُسکے ذکر و فکر میں صرف نہیں کرتے۔ کوئی ذکر کلام الٰہی سے بڑھ کر نہیں۔ اُسی کو پڑھنا چاہیے۔ اس کا پھل تمام طاعتوں سے بڑھ کر ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ انوار و اسرار کے لیے وسیع حوصلہ چاہیے۔ اسرار و انوار الٰہی جو عاشق پر متجلی ہوتے ہیں اگر اُنکے نور کا ذرہ بھر باہر نظر آ جائے تو تمام جہان منور ہو جائے۔ اس راہ میں صدق کی ضرورت ہے تاکہ دوست کے تمام اسرار سے واقفیت حاصل ہو جائے۔ راہ خدا

میں ایسے مرد بھی ہیں کہ ایک ساعت میں دوست کے اسرار کے لاکھ دریا پی جاتے ہیں۔ اور ذرہ بھر اثر ظاہر نہیں ہوتا۔

آپ فرماتے ہیں کہ فقرا اہل عشق ہیں اور علما اہل عقل۔ لیکن واقف کار وہی لوگ ہیں جنہیں یہ دونوں چیزیں پائی جائیں ؎

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

سر بیت عاشقاں را در طاقت نہانی پوشیدہ درازخود تا تیغ خجل نہ مانی

جہاں محبت آتی ہے وہاں دوئی اُٹھ جاتی ہے۔ محبت کے معاملہ میں یگانہ ہونا چاہیے تاکہ خانۂ وصال محبت کے معاملہ میں بار حاصل ہو سکے ؎

تا نفس من زعشق دوست زدم خاست از ما بسے دوئی خیزدوست

عشق کی آگ ایسی ہوتی ہے کہ درویش کے دل کے سوا کہیں اور قرار نہیں پکڑ سکتی۔ درویشوں کو عشق کی خاک اور انوار تجلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ عشق کی یہ بے بہا نعمت کسی فرشتہ کو بھی نہیں ملی صرف آدمی کو ملی ہے جیسا کہ خود فرمایا ہے ولقد کرمنا بنی آدم۔ جس وقت عشق پیدا کیا گیا تو اُسے حکم ہوا کہ جا اور اندوہناک آدمیوں کے دل میں قرار پکڑ۔ وہی مقام تیرے رہنے کے قابل ہے

گفتم صنما گر تو جا نان منی اکنوں کہ نگاہ می کنم جان منی

مرتد گردم اگر زمن برگذری اے جان جہاں تو کفر و ایمان منی

اے درویش تجھے قدر ہی نہیں معلوم کہ تیرے دل کے اندر ایسی خوبصورت نعمت مقام کیے ہوئے ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ متعبد اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کا ظاہر و باطن حق سے آراستہ ہو اور کسی قسم کی ریا، حسد، بغض اور کھوٹ ظاہر و باطن میں نہ ہو۔ جو طاعت کریں خالصۃً لوجہ اللہ کریں۔ پھر فرمایا کہ درویشوں نے دنیا ہی میں بحالت زندگی اپنے تئیں مردہ بنالیا ہے اور تمام خواہشات نفسانی سے اپنے تئیں باز رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مومنوں کے دل پاکیزہ زمین کے مانند ہیں۔ اگر محبت کا بیج اس میں بویا جائے تو رنگ برنگ کی نعمتیں پیدا ہوں گی۔ پھر فرمایا کہ جب تک تو سانپ کی طرح کینچلی نہ اُتارے گا کبھی محبت حق کے دعوے میں صادق نہیں ہو سکتا۔

کامل حال درویش ہے جو کسی اور کی حاجت نہیں رکھتا اور اسرار کی نعمت سے آنے والوں کو اُن کا حصہ دیتا اور اُن کا مدعا پورا کر کے رخصت کرتا ہے۔ مرد خدا وہی تھے جو ذرہ برابر راہِ خدا سے باہر نہ ہوئے اور رزق کی خاطر کبھی مشوش نہیں ہوئے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ توبہ کی چھ قسمیں ہیں۔ دل وزبان سے توبہ کرنا۔ آنکھ۔ کان۔ ہاتھ۔ پاؤں اور نفس کی توبہ۔ اس کی تشریح یوں بیان فرمائی کہ جب تک دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار نہ ہو توبہ درست نہیں ہو سکتی۔ ایسی چیزوں کے دیکھنے سننے سے توبہ کرے جو دیکھنے اور سننے کے قابل نہیں ہیں ایسی چیزوں کے چھونے اور مدد کرنے سے۔ ہاتھ سے مدد اور پاؤں سے تعلق کی توبہ کرے جو اس قابل نہیں کہ انکی مدد یا اُن کا قصد ہاتھ پاؤں سے کیا جائے۔ اور نفس کو تمام خواہشات ماکولات وشہوات سے باز رکھا جائے۔ اور ان سب سے توبہ کی جائے اور نفس کی خواہش کے مطابق کام نہ کیا جائے۔

توبہ کی بجا لت زمانہ اور تین قسمیں بیان فرمائیں۔ حال، ماضی واستقبال۔ حال.... یعنی کیے ہوئے گناہ سے ندامت حاصل ہو۔ ماضی یہ کہ تلافیِ گناہاں کرے مثلاً دشمن کو راضی کرنا کسی سے اگر کوئی شے لی ہے تو اُسے واپس کرنا یا اُس کا معاوضہ کرتا۔ اور استقبال یہ کہ آیندہ گناہ سے بچنے کا مصمم ارادہ کرنا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اے درویش جس نے سعادت حاصل کی ہے بزرگوں کی خدمت سے حاصل کی ہے۔ جو کچھ انسان کرے اُسے یہی سمجھنا چاہیے کہ سب خدا کی مرضی سے ظہور میں آ رہا ہے اور خود وہ درمیان میں نہیں ہے۔

تلاوت قرآن کی آپ بہت تاکید فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے کلام کرنا چاہے وہ کلام الٰہی پڑھا کرے۔ نیکبخت بندہ وہ ہے جو اپنے دوست اور مولا سے ہمکلام ہو۔ اس ہمکلامی کی سعادت تلاوت قرآن مجید سے حاصل ہوتی ہے۔ عاشق ومعشوق میں الفت باہم گفتگو سے بڑھتی ہے۔ پس راہ سلوک میں تلاوت قرآن سے بڑھ کر کوئی شے نہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں خلوت میں یاد الٰہی میں مشغول تھا۔ جب سورۂ اخلاص پر پہونچا تو مجھ پر عالم تجلی سے اسرار وانوار نازل ہونا شروع ہوئے۔ ان انوار نے عشق ومحبت کے صحرا میں

مجھے جا پھینکا۔ جب وہاں سے نکلا تو اللہ جل شانہٗ کے عشق و محبت کے دریا میں غرق ہوا سات دن رات میری یہی حالت رہی پھر عالم صحو میں آیا۔

آپ فرماتے ہیں اے درویش خرقہ پہن لینا تو آسان ہے مگر اُس کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے اگر صرف خرقہ پہن لینے سے نجات ہوتی تو تمام لوگ خرقہ پہن لیتے اور نجات حاصل کر لیتے۔

درکوہ و دشت ہر سبعی صوفیے بُدے   گر ہیچ سود مند بُدے صوف بیصفا

خرقہ خرقہ پوش کی وجہ سے قابل اعتبار ہوتا ہے۔ اس کا بطور خود کوئی اعتبار نہیں جب درویش صوف پہن لے تو اُس پر واجب ہے کہ گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرے اور دولتمندوں سے ملنا جلنا چھوڑ دے۔

پھر فرمایا کلام مجید میں ہے الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم یعنی اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ میرے خوف سے تمھارے دل نرم ہوں، یا کوئی تم میں سے ایسا ہے جو ہم سے صلح کرے یعنی توبہ کرے اور ہم اُسکی توبہ قبول کریں۔ پھر فرمایا کہ خائف اُس شخص کو کہتے ہیں جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں۔ اول روزہ کی خاطر کم کھانا۔ دوم نماز کی خاطر کم بولنا۔ سوم تو کر کی خاطر کم سونا۔ اور جس طرح یہ باتیں درویش کے لیے ضروری ہیں اسی طرح خوف۔ اُمید۔ اور محبت بھی ضروری ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ عقلمند وہ شخص ہے جو سب کاموں میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرے اور کسی سے کسی طرح کی اُمید نہ رکھے۔ پھر فرمایا اہل توکل پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اگر اُس وقت انھیں آگ میں پھینک دیا جائے یا زخمی کیا جائے تو اُنھیں مطلق خبر نہ ہوگی۔ نیز فرمایا کہ جو شخص عالم توکل میں حق تعالیٰ کے کرم پر بھروسہ کرتا ہے اُسے عالم غیب سے روزی پہونچتی ہے اور جو کچھ وہ طلب کرتا ہے اُسے مل جاتا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اے درویش لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو دنیا سے محبت کرتے ہیں اور ہر وقت اُسی کی یاد و طلب میں رہتے ہیں۔ ایسے بہت ہیں۔ بعض اسے دشمن سمجھتے ہیں اور محبت نہیں کرتے۔ بعض نہ اسے دوست سمجھتے ہیں نہ دشمن۔ یہ تیسری قسم کے لوگ پہلی دو قسموں سے اچھے ہیں۔ پھر فرمایا کہ جو شخص میں قدر اللہ تعالیٰ سے غافل ہے اُسی قدر دنیا میں مبتلا ہے

پھر فرمایا کہ میں نے خواجہ بختیار اوشی سے سُنا ہے کہ دنیا میں تین کام سب کاموں سے افضل ہیں۔ اول دُنیا کو پہچاننا اور اُس سے بچنا۔ دوسرے حق تعالیٰ کی طاعت کرنا اور ادب ملحوظ رکھنا۔ تیسرے آخرت کی آرزو رکھنا اور اُس کی طلب میں کوشش کرنا۔ اس راہ میں مرد وہی ہے جو ان تین باتوں پر عمل کرے یعنی (۱) دنیا سے بچا رہے (۲) مرنے سے پہلے گور کے لیے تیاری کرے (۳) حق تعالیٰ کو دیکھنے سے پہلے اُسے خوش کرے۔ پھر فرمایا جو شخص جس قدر زیادہ موت سے غافل ہوگا اُسی قدر دنیا کا ذکر اُس کے دل میں محکم ہوگا۔ سلوک کے بارے میں لکھا ہے اکثروا ذکر ہادم النفس وہادم اللذات۔ جو شخص ہمیشہ موت کو یاد رکھتا ہے اللہ جل شانہٗ اُس سے خوش ہوتا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کا اپنے پیر کے حق میں نیک عقیدہ نہیں وہ مُرید نہیں۔ پیر میں اتنی قوت ہونی چاہیے کہ جب کوئی مرید ہونے کی نیت سے آئے تو اُسکے حُسن عقیدت کو دیکھے۔ اگر اُسکو فرمانِ حق میں راسخ نہ پائے تو کہدے واپس جاؤ ابھی تمہارا وقت نہیں آیا۔

آپ نے فرمایا کہ مذہب۔ تصوف و سلوک کے مطابق وہ شخص صوفی و سالک نہیں ہے جو یادِ حق میں نہیں۔ کیونکہ جس دم وہ یادِ الٰہی سے غافل ہوتا ہے اُسے نہیں معلوم اُس وقت کن کن نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے یادِ الٰہی سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اہلِ تصوف صرف اُسی دل کو زندہ سمجھتے ہیں جو یادِ حق میں مستغرق ہو اور ایک دم بھی یادِ الٰہی سے غافل نہ ہو۔ جو یادِ الٰہی سے غافل ہیں وہ مردہ ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ ہمارے خواجگاں نے سلوک کے پندرہ مراتب مقرر کیے ہیں جن میں سے پانچواں مرتبہ کشف و کرامت کا ہے۔ اگر سالک اس مرتبہ میں کشف و کرامت ظاہر کر دے تو اچھا نہیں۔ پورے پندرہ مراتب طے کر کے کشف کا اظہار کرنا چاہیے۔

آپ کا ارشاد ہے" مرید کو چاہیے کہ پیر کا فرمان دل و جان سے بجا لائے۔ فرمایا کہ جب انسان پر رنج و مصیبت نازل ہو تو اُسکے سبب پر غور کرنا چاہیے اور تنبیہ حاصل کرنا چاہیے۔ جو شخص ہر وقت طاعت میں رہتا ہے اُسے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچتی۔ اے درویش جو لوگ مصیبت میں صبر کرتے ہیں اللہ جل شانہٗ اُن کے گناہوں کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ یہ سعادت ہے

جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ اے درویش۔ اس راہ میں عاشقوں نے درد و بلا کو اپنی خوراک بنایا ہے۔ جس دن اُن پر بلا نازل نہیں ہوتی وہ ماتم کرتے ہیں کہ آج ہمیں دوست نے یاد نہیں فرمایا اور جب کسی درد و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں تو یاد آوری کے شکرانے بجا لاتے ہیں۔ اے درویش راہِ محبت میں صادق وہی شخص ہے جو بڑی خواہش سے درد و بلا کی تمنا کرے۔ پھر فرمایا کہ اے درویش ہم مسافر ہیں، بلا کے سر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ بلا دنیا ہے۔ ہماری عمر کی بساط یکایک لپیٹ دی جائے گی اور قبر ہمارا مقام و منزل ہو گی۔

جہاں چیست بگذر ز نیرنگ او ۔۔۔ رہائی بجنگ آر از چنگ او
مقیمے نہ بینی دریں باغ کس ۔۔۔ تماشا کند ہر یکے ہر نفس
دریں چار سو ہیچ بیگانہ نیست ۔۔۔ کہ کیسہ بر مرد خودکامہ نیست
در و ہر دمے نوبرے می رسد ۔۔۔ یکے می رود دیگرے می رسد
جہاں گرچہ آرامگاہے خوش است ۔۔۔ شتابندہ را نعل در آتش است
دو در دارد ایں باغ آراستہ ۔۔۔ در و بند ایں ہر دو برخاستہ
در آ از درے باغ بنگر تمام ۔۔۔ ز دیگر درے باغ بیروں خرام
اگر زیرکی با گلے خو مگیر ۔۔۔ کہ باشد بجا ماندنش ناگزیر
دریں دم کہ داری بشادی بسیچ ۔۔۔ کہ آیندہ در زیر پیچ است و ہیچ
یکے را در آرد بہ ہنگامہ تیز ۔۔۔ دگر را ز ہنگامہ گوید کہ خیز
نظامی سبکباش یاراں شدند ۔۔۔ تو ماندی بہ غم غمگساراں شدند

آپ کا ارشاد ہے کہ فقیر جب جامہ پہنے تو یہ سمجھے کہ جامہ نہیں بلکہ کفن پہنا ہے۔

صاحب سیرالاولیا لکھتے ہیں کہ آپ کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں لیکن پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بہت ہیں۔ آپ کے سب سے بڑے صاحبزادہ کا نام شیخ نصیرالدین قدس سرہٗ ہے۔ صاحب مرأۃ الاسرار سیرالاولیا سے نقل کرتے ہیں کہ "بہ اوصاف سینہ و اخلاقِ مرضیہ موصوف بود۔ روزگار بعبادت باری تعالیٰ و بہ کسب زراعت جہت لقمۂ حلال گذرانید و عمر عزیز در رضائے حق تعالیٰ بسر بردہ رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ کے دوسرے صاحبزادہ کا نام شیخ

شہاب الدین قدس سرہٗ ہے ۔ آپ وفورِ علم وفضائل سے آراستہ تھے اور اکثر اوقات اپنے والد صاحب کی خدمت مبارک میں رہا کرتے تھے ۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ مجھ میں اور شیخ شہاب الدین میں باہم محبت تھی ۔ ایک مرتبہ بلا قصد مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوگئی تھی اُنھوں نے درمیان میں پڑ کر معافی دلوائی ۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۔ آپ کے تیسرے صاحبزادہ کا نام بدرالدین سلیمان بن گنج شکر تھا قدس سرہ العزیز ۔ یہ بھی علم وتقویٰ میں مشہور اور اوصاف مشائخ کبار سے موصوف تھے حضرت گنج شکرؒ کے وصال کے بعد انھیں کو تمام بھائیوں اور اہل ارادت کے اتفاق رائے سے سجادہ پر بٹھایا تھا ۔ صاحب مرأۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ "آں مقام را بنور حضور بر جادۂ طریقت منور گردانید وے از گنج شکرؒ مرید خلفاے چشت گردانیدہ بودند" چوتھے صاحبزادہ کا نام نظام الدین تھا ۔ حضرت گنج شکرؒ کو تمام لڑکوں سے زیادہ انھیں سے محبت تھی ۔ آپ نے فوج کی نوکری کی اور والد ماجدؒ کی وفات کے بعد حملۂ کفار میں لڑ کر شہید ہوئے ۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کی نعش مبارک نہیں ملی ۔ اور بعض کہتے ہیں علاء الدین خلجی کے زمانہ میں قلعہ سیہور کی تسخیر میں آپ شہید ہوئے اور وہیں آپ کا مزار ہے ۔ یزار ویتبرک ۔ پانچویں صاحبزادہ شیخ یعقوب بن گنج شکرؒ تھے قدس سرہ العزیز ۔ آپ سب سے چھوٹے تھے اور بذل وایثار میں شہرت تام رکھتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کا طریقہ ملامتیہ تھا اور کراماتِ ظاہر ظاہر تھیں ۔ آپ اکثر سفر میں رہتے ۔ اثنائے سفر میں قصبۂ اترودھہ میں کہتے ہیں کہ آپ مردان غیب کے ساتھ شامل ہوگئے ۔

صاحب مرأۃ الاسرار سیر الاولیا سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت گنج شکرؒ کی بڑی صاحبزادی کا نام بی بی مستورہ تھا ۔ دوسری کا نام بی بی شریفہ تھا ۔ بی بی شریفہ نہایت عابدہ زاہدہ تھیں اور ... عنفوان شباب ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں ۔ پھر عمر بھر شادی نہیں کی اور عبادت الٰہی میں بسر کی ۔ حضرت گنج شکر نے بارہا فرمایا ہے کہ اگر عورت کو خلافت وسجادۂ مشائخ دینا روا ہوتا تو میں شریفہ کو دیتا ۔ تیسری صاحبزادی کا نام فاطمہ تھا ۔ ان کا نکاح شیخ بدرالدین اسحاق سے ہوا تھا ۔ جنسے دو لڑکے خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ پیدا ہوئے اور حضرت سلطان المشائخ کے زیر تربیت رہ کر مقا[redacted] عالی پر پہونچے ۔

حضرت گنج شکرؒ کے پوتے شیخ علاء الدین بن شیخ بدرالدین سلیمان بن گنج شکر قدس سرہٗ تمام پوتوں اور نواسوں سے زیادہ ممتاز تھے۔ ایک بار کھیلتے کھیلتے آئے اور اپنے دادا کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ شیخ عیسیٰ ایک درویش نے ہٹانا چاہا مگر حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا "بگذار تا نشستہ باشد"۔ ان انفاس متبرکہ کی برکت سے تقریباً دو قرن شیخ علاء الدین اپنے دادا کے سجادہ پر متمکن رہے۔ اور چونسٹھ سال حق سجادگی ادا کیا۔ سلطان فیروزشاہ بادشاہ دہلی آپ کے مریدوں میں تھا۔ شیخ رکن الدین جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے تھے جب دہلی سے ملتان کی طرف معاودت فرماتے تو شیخ علاء الدین سے ضرور ملتے اور فرماتے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو ایسی استقامت بخشی ہے کہ کوئی شخص اس جگہ سے آپ کو جنبش نہیں دے سکتا۔ جب آپ کا وصال ہوا تو حضرت گنج شکرؒ کے جوار میں آپ کو دفن کیا گیا۔ اور سلطان محمد تغلق نے جو آپ کا مرید اور معتقد تھا ایک بڑا گنبد مزار پر تعمیر کیا۔ یتبرک و یزار۔

"عبداللہ"

ارے وصل کا آسرا دینے والے
کہاں تک کوئی موت کو روز ٹالے

جو آنکھیں لڑائیں تو آنکھیں نکالے
ستم ہے پڑے ہیں ستمگر کے پالے

جنھیں سُن کے تم آ گئے دل سنبھالے
وہ آہیں ہیں آہیں وہ نالے ہیں نالے

عدم جا رہا ہے کوئی در سے اُٹھ کر
ذرا اپنے روٹھے ہوئے کو منا لے

ہوائے اجل نے سُلایا ہے جنکو
جگانے سے جاگے نہ وہ سونیوالے

ہوئے سارے جنگل کے سیراب کانٹے
جو دو ایک ٹوٹے ہیں تلوے کے چھالے

ہماری لحد کو کبھی ٹھکرا دے آ کر
ارے مُنہ اُدھر پھیر کر جانے والے

گلستان محبت کا عبرت کدہ ہے
کہ شبنم ہے گریاں ہیں بلبل کے نالے

سنبھلتا نہیں تم سے سینہ پہ آنچل
سنبھلتا نہیں دل ہمارے سنبھالے

جگر خاک میں دل ملا کر ہمارا
وہ گھر جا رہے ہیں کلیجا سنبھالے

جگر بسوانی

انتخاب از سیر المصنفین

مکرمی مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے (علیگ) وکیل غازی آباد نے سیر المصنفین کے نام سے ایک تذکرہ مصنفین اُردو کا لکھا ہے۔ جس کا حجم وہ ۶۰۰ صفحے بتاتے ہیں۔ آزاد نے تذکرۂ آبِ حیات میں شعرا کے پانچ دَور قائم کیے تھے۔ تنہا صاحب نے اپنے تذکرہ کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ جلد اول جو زیر طبع ہے اُس میں ابتدائی دو دَوروں کے اور جلد دوم میں جو بعد کو چھپے گی تیسرے دَور کے مصنفین کے حالات ہیں۔ چوتھا دَور ابھی لکھنا باقی ہے جس میں اُردو کے موجودہ مصنفین کے حالات آئیں گے۔

اس کتاب پر تبصرہ کا ابھی وقت نہیں ہے مگر بے شبہ یہ ایک نہایت ضروری کام ہے۔ جس کے لیے تنہا صاحب دُنیائے اُردو کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ تنہا صاحب نے ازراہِ کرم اپنے مسودہ کے بعض اجزا ارسال فرمائے ہیں جو شکریہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ کتاب کے متعلق امید دلائی گئی ہے کہ نومبر میں تیار ہو جائے گی۔

ایڈیٹر

اُردو کی پیدائش

جب دو صاحبِ زبان قومیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور آپس میں رشتۂ اتحاد و ارتباط قائم ہوتا ہے تو قانونِ فطرت کے مطابق اخلاق، مذہب، زبان، طرز بود و باش، ادب و آداب، لباس اور دیگر شعائر پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ اثر کچھ دنوں میں ایک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور سب کو نظر آنے لگتا ہے۔ اس قاعدۂ کلیہ میں کوئی استثنا نہیں۔ جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ اس امر کی بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں دیگر امور متذکرۂ بالا کی نسبت دونوں قوموں کی زبان پر خصوصاً زیادہ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ اظہارِ مطالب کے لیے ہر شخص وہ لفظ استعمال کرنے کی قدرۃً کوشش کرتا ہے جسکو

دوسری قوم کا فرد آسانی سمجھ لے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ مؤخر الذکر قوم کی زبان کا لفظ بولا جائے۔ اس طریقہ سے دونوں قوموں کے افراد روزمرہ کے کاروبار چلانے کے لیے کچھ الفاظ ایک دوسرے کی زبان کے سیکھ لیتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں۔

انگریزی زبان جو آجکل مخزن علوم و فنون بنی ہوئی ہے، اُس میں اُردو سے لیکر لاطینی و یونانی زبان تک کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ایرین زبان ہونے کے اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزوں کو دنیا کی تمام قوموں سے خوب ملنے جُلنے کا واسطہ رہا ہے۔ اس لیے ان قومون کی زبانوں کے بہت سے الفاظ بھی بجنسہ اُن کی زبان میں داخل ہوگئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ پس ہماری زبان کی ابتدا اُسی وقت سے ہوگئی تھی، جب سے مسلمان اِس ملک میں داخل ہونے شروع ہوگئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ زبان جو اُس وقت ہندو مسلمان بغرض ادائے مطالب بولتے تھے اُردو نہیں کہی جا سکتی، تاہم اختلاطِ الفاظ کی بنیاد پڑ چکی تھی اور یہی اختلاطِ الفاظ آگے چل کر ہماری زبان کی پیدائش کا باعث ہوا۔

ابوریحان بیرونی نے، جو علامہ البیرونی کے نام سے موسوم ہے اور جس کا شمار دربار غزنوی کے افاضل و اکابرین ہے، ہندوؤں کی قدیم علمی درسگاہوں میں طالب علمی کر کے سنسکرت حاصل کی اور ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کیے اور برسوں اُن شہروں میں رہ کر جہاں اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا یہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں۔ اُسی عہد سے وابستہ فارسی کا شاعر مسعود سعد سلمان ہے جس کی نسبت تذکرہ مجمع الفصحا میں لکھا ہے "وے راسہ دیوان بودند، تازی، ہندی، پارسی"۔ اور مولانا شبلی لکھتے ہیں "تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اُس نے ایک دیوان لکھا تھا"۔ یہ غزنویوں کے عہد اوّلیں کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ خاندانی لحاظ سے وہ عجمی تھا تاہم اُس نے اپنے وطنِ ولادت کی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کر ڈالا۔

۱۱۹۳ء میں جبکہ شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی تو چاند کوی ایک نامی شاعر نے پرتھی راج راسو لکھا۔ اس کتاب کے ہر صفحہ میں فارسی، عربی کے کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔

اگر محمود غزنوی کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی عربی، فارسی کے الفاظ پائے جائیں۔

کشمیر کے حکمران سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانوں میں بھی پورا دخل رکھتا تھا، فارسی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ اور سب سے پہلے اسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگنی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ اسی عہد کے قریب قریب امیر خسرو نے جو ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے خالق باری تصنیف کی۔ یہ کتاب بازار میں عام طور پر فروخت ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب تصنیف یہ ہے کہ جو طلباء فارسی سیکھنے کا شوق رکھتے ہوں اسکو پڑھیں، کیونکہ اس میں اکثر فارسی، عربی الفاظ کا ترجمہ یہاں کی اُسوقت کی عام اور مروجہ زبان میں کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر کافی ہے۔

بیا برادر آؤ رے بھائی		بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

اُس وقت سے لیکر اُنیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک یہ کتاب مبتدی طلاب کا وظیفۂ زبان ہی ہے۔ البتہ بیسویں صدی کے آغاز سے اسکی کساد بازاری ہوگئی ہے۔ اور وجہ صرف یہ ہے کہ اب فارسی زبان حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

امیر خسرو آنکھوں کا ایک مجرب نسخہ دوہروں کی بحر میں اس طرح لکھتے ہیں کہ

لود، پھٹکری، مردہ سنگ		ہلدی، زیرہ ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر، مرچیں چار		اُرد برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے		تُرت پیڑ نینوں کی ہرے

ظاہر ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کی زبان بھی آپس کے تعلقات کی بنا پر ضرور برج بھاشا ہوگی۔ جسکو وہ آدھی اپنی اور آدھی اُنکی ملاکر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہونگے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں ملتی۔ البتہ امیر خسرو کی ایک غزل جس کا مطلع ہے

زحال مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں		کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اور پہیلیاں، مکرنیاں اور گیت پتہ دیتے ہیں کہ ۷۰۰ ہجری میں یہاں کے مسلمان خلجی بھاشا بولتے ہوں گے۔ بلکہ اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان بھی اُس وقت ہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ بیشک ہندوؤں کی نسبت اُنکی زبان پر

فارسی، عربی الفاظ زیادہ آ جاتے ہوں گے لیکن جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اُتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔

پندرہ صدی عیسوی میں جبکہ سکندر لودی سریر آرائے سلطنت تھا، اوّل کا یتھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے، اور عربی فارسی کے الفاظ اُنکی زبانوں پر بکثرت آنے لگے۔ اور اسی سکندر لودی کے زمانہ میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں اَن پڑھ تھے، گرو رامانند کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ کبیر پنتھیوں کا مت نکالا۔ اُنکے دوہروں میں فارسی عربی کے الفاظ بکثرت موجود ہیں، مثلاً

دین گوایو دُنی سے دُنی نہ آیو ہاتھ پیر کہاڑی ماریو گافل اپنے ہاتھ
کبیر ہیرے پر سانسے ہے کیوں سوے سُکھ چین کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

گرو نانک کی تصنیفات میں بھی جو ۱۵۳۹ء کے بعد فوت ہوئے عربی فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں:-

سانس ماس سب جیو تمہارا تو ہے کہرا پیارا نانک شاعر ایو کہت ہے سچے پروردگارا

جو چیزیں وظیفۂ عبادت کے طور پر ہیں اُن میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے ہیں۔ جپ جی کے دو فقرے ملاحظہ ہوں :-

وارع جاؤں اَن ایک بار تو سدا سلامت جی نرنکار

سولھویں صدی عیسوی میں کہ شیر شاہی عہد تھا ملک محمد جائسی نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اور یہ التزام کیا کہ فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں آنے دیا اور بحر بھی ہندی رکھی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔

بعد ازاں اکبر کے عہد سے جبکہ مسلمان ہندوؤں سے شیر و شکر ہو گئے یہ نوبت پہونچی کہ ہندو شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہن کر اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے جس طرح کہ آجکل انگریزی بولنے اور انگریزی لباس پہننے پر فخر کیا جاتا ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن نے جو ضلع باندہ کے رہنے والے تھے اور پنڈت، اور شاعر، اور فقیر تھے، رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ یہ لاثانی کتاب مقبول خاص و عام ہوئی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں فارسی عربی کے الفاظ موجود ہیں جنکا ہے سیوک سکل سیلے سوامی بڑکو پاسے گھر تر دترو ین وباگ وبر ڈیرا دیو لگاسے

گھر بواس بکن ہٹ بولے　　　کتنی بھنگ کلہ بھی کھولے
رام ایک گریب نواجے　　　لوک بید برد براجے
گنی گریب رام تر ناگر　　　پنڈت موٹے ملین او جاگر
مایا کو ملے کر کر بیٹے ہاتھ　　　تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات

اسی زمانہ میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ انکی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا جو فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔ پس اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ بزرگان مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا کچھ اس سے زیادہ نہ بولتے ہونگے۔ سورداس جی کہتے ہیں :-

مایا دعام دان وتنا باندھوں ہوں اس ساج　　　سنت سبھی جانت ہوں تو نہ آیو باج
کھیت بہت کا ہے تم تانے سبن سنی آواج　　　دیو نہ جات پار اُتر آئے چاہت چڑھیں جہاج
لیجیے پار اُتار سور کوں مہاراج برج راج　　　نیں کرت کہت پرہوتم سوں سد گریب نواج

رفتہ رفتہ شاہجہان کے زمانہ میں شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار السلطنت ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ، اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا۔ اور یہ زبان خاص و عام میں شاہجہاں کے اُردو کی طرف منسوب و مشہور ہو گئی۔

سنا جاتا ہے کہ ہماری زبان کو ریختہ بھی کہتے تھے۔ یہ لفظ ہمارے کانوں کو غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتا ہے، تاہم متقدمین اور متاخرین شعرائے اُردو کے بجائے لفظ ریختہ اشعار میں لکھا ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں :-

خوگر نہیں کچھ یوں ہی، ہم ریختہ گوئی کے　　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اُن کے ہم عصر قائم بھی کہتے ہیں :-

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　　اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

متاخرین میں مرزا غالب کا ارشاد ہے :-

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا
یا
یہ جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھکے اُسے سُنا کہ یوں

نواب مرزا داغ اور اُنکے ہم عصروں کے یہاں ریختہ متروک ہو گیا اور ہماری زبان کا نام صرف اُردو رہ گیا۔ چنانچہ داغ نے ایک جگہ فخریہ کہا ہے :۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ایک اور شعر ہے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

نسیم دہلوی شاگرد حکیم مومن خاں یوں نغمہ سرا ہیں :۔

نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا جانے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

اُردو کو ریختہ پہلے اس وجہ سے کہتے تھے کہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے۔ جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونہ، سفیدی وغیرہ ریختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی، پریشان چیز چونکہ اسمیں الفاظ پریشان جمع ہیں اسلیے اسی ریختہ کہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ اسمیں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور اب انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہوگا کہ عربی، فارسی کی طرح انگریزی زبان بھی قابض ہو جائے گی۔ اور شاید وہ وقت بسرعت تمام قریب آ رہا ہے۔

اُردو کی ابتدائی تصنیفات نظم سے شروع ہوئیں۔ اگرچہ فطرت بھی اسی کی مقتضی رہی ہے کہ ادب اور علم کی ابتدا ہمیشہ نظم سے ہوتی آئی ہے۔ کیونکہ ایک وحشی قوم جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی ہمیشہ اپنے بزرگوں کی روایات، رسم و رواج اور اُنکی شجاعت و بسالت کو جسکو اُس قوم کی تاریخ سمجھنا چاہیے اپنی قوم کے بھاٹ اور کبیشر کے ذریعہ سے گیتوں اور راگ راگنیوں میں محفوظ رکھتی آئی ہے۔ چنانچہ یہی بھاٹ اور کبیشر تھے جنھوں نے نہ صرف یورپ بلکہ چین، تبت اور تاتار اور اسی طرح ہندوستان، بلوچستان، مغربی ایشیا، جزائر بحر اسود، مصر، مغربی افریقہ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، اور جزائر بحر الکاہل کے مطبوع و مقبول افسانہ ہائے قدیم کو محفوظ رکھا۔ پس علم کی سب سے پہلی بنیاد ہمیشہ شاعری اور اکثر اوقات قافیہ بندی سے پڑتی ہے۔ ایک وحشی کے کانوں کے لیے یہ الفاظ کی زیر و بم عجب ترنم پیدا کرتی اور خوش آیند معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ حالات ہماری زبان

پر منطبق نہیں ہوتے کیونکہ اسکے بولنے والے اَن پڑھ اور وحشی نہ تھے بلکہ ایک طرف سنسکرت اور بھاشا کے خزائن کی کنجی ہاتھ میں لیے ہوے تھے اور دوسری طرف عربی، فارسی کے گنجینوں کو سینوں میں نہاں رکھتے تھے۔ تاہم نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ اُردو کی تصنیفات کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ ہمارے نزدیک اسکی وجہ یہ ہے کہ مطالب ضروری کی سب کارروائی فارسی میں ہوتی تھی۔ اُردو نثر کی طرف کسی کو اصلا توجہ نہ تھی اور اُردو کے اُس وقت کے اہل زبان جو ذی استعداد ہوتے تھے وہ اُردو کی شاعری کو بھی فخر نہ سمجھتے تھے۔ کچھ کہنا ہوتا تھا تو فارسی میں کہتے تھے۔ البتہ عوام الناس موزوں طبع دل کی ہوس پوری کرنے کو جو منہ میں آتا تھا کہے جاتے تھے اور اس طرح ابتدا شعر و شاعری سے ہوگئی۔

نواز نام ایک مصنف نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں کیا اور اُردو کو محروم رکھا۔ لہذا یہ بات قابل افسوس ہے کہ سنسکرت اور بھاشا سے باوجود ندرت کوئی فائدہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی مشترکہ زبان کو نہیں پہونچایا اور وہ اسلوب بیان اور وہ صحیفۂ فطرت کے مناظر جن سے سنسکرت اور بھاشا کی نظمیں مالا مال ہیں اُن سے اُردو مفلس نظر آتی ہے۔ البتہ فارس کی انشا پردازی کے گلزار جا بجا کھلے ہوے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نظم اُردو کے آغاز میں سنسکرت کی تقلید شروع کی گئی۔ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں۔ اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اسکی شاخ میں ذومعنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اُردو میں پہلے پہل شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی اور دور اول کے شعرا میں وہی قانون جاری رہا۔ اُس عہد کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

لام نستعلیق کا ہے اُس بُتِ خوشخط کی زلف　　ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے
کیوں نہ ہو ہم سے وہ سجن باغی　　قد ہو جس کا نہال کی مانند
تو جو دریا کے پار جاتا ہے　　دل مرا وار وار جاتا ہے
تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا　　یہ تو قدیم ہی سے سر پر ہمارے کر ہے
نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے　　کہ آخر بد نما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا

لیکن جس چیز کی اُردو میں نقل کرنی چاہیے تھی اُس سے قاطبۃً اعراض کیا گیا۔ وَلی نے عالمگیر کے

عہد میں نظم اُردو کی ابتدائی اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں جبکہ عیش و عشرت کی بہار تھی اور اُردو شاعری کا ستارہ چمک رہا تھا فارسی کا تتبع اختیار کیا اور غزل میں رنگ اُڑانا شروع کیا۔ شاعروں نے بھی اُسکی دیکھا دیکھی فارسی کے خاکے اُردو میں اُتار کر غزلخوانیاں شروع کویں اور قصیدے کہنے لگے۔ چنانچہ ہمارے یہاں نئے نئے اسلوب بیان، عمدہ عمدہ تراکیب الفاظ تشبیہ و استعارات بکثرت موجود ہیں لیکن مصلحات علمی سے ہماری زبان نا آشنا رہی کیونکہ اُس عہد میں علوم و فنون، تاریخ و فلسفہ و ریاضی وغیرہ کا چرچا نہ تھا۔ الغرض یہی سلسلہ اب تک جاری رہا۔ اور کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس پگڈنڈی کو چھوڑ کر ایک دوسری شاہراہ اختیار کریں اور آنکھ بند کیے اگلی بھیڑوں کے پیچھے چلتے رہے۔ آخر کار انگریزی علم ادب نے ہماری آنکھیں کھولیں اور آزاد و حالی نے ایک علحدہ روش اختیار کی جس پہ آجکل ہمارے نوجوان شعرا جادہ پیمائی کر رہے ہیں اور مترجمین مصطلحات علمی بہم پہونچا رہے ہیں۔

اُردو زبان کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے سنسکرت آئی اُس سے مل گئی، عربی فارسی آئی اُسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اُسکے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسکی اس ملنساری اور آسانی کی وجہ سے یہ ملکی زبان ہو گئی ہے۔ کشمیر سے راس کماری تک اور بنگال سے سندھ تک اُردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں جب سے کہ ولی نے اپنی پہلی غزل اُردو میں تصنیف کی جس کو سوا دو سو برس کا زمانہ گذرا آج تک جو کچھ ہوا وہ کسی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا تاہم اُردو کی ترقی نمایاں اور روز افزوں ہے۔ بلا شبہہ یہ رفتار دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں نسبتہً بہت کم ہے لیکن یہ اسکے ابتدائی مدارج ہیں اور دوسری زبانیں اپنی ترقی مکمل کر چکی ہیں۔ انگریزی زبان نے اپنا موجودہ علم ادب چوتھی صدی سے بیسویں صدی تک یعنی ایکہزار چھ سو برس میں پیدا کیا ہے جبکہ کل قوم اور حکومت انگلشیہ برابر اسکی ترقی کے لیے کوشاں رہی ہیں تو کیا تعجب خیز امر نہیں ہے کہ اُردو نے بغیر کسی امداد اور وسیلہ کے اس قدر جلد ایک معتدبہ علم ادب بہم پہونچا لیا۔

افسوس ہے کہ نظم اُردو کے ساتھ ساتھ نثر[1] اُردو کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ ایک عرصہ کے بعد

---

[1] مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی اپنے ایک خط مورخہ ۱۰۔ ستمبر ۱۹۱۲ء میں تحریر فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ گذشتہ)

محمد شاہ کے عہد میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے ۱۱۴۵ھ ہجری میں دہ مجلس لکھی۔ اسکے دیباچہ میں وہ سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے :-

"پھر دل میں گذرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احدی، یہ شکل صورت پذیر نہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے۔ لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمۂ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایتِ الٰہی دل افگار پر اہتزاز میں آ۔ یہ بات آئینۂ خاطر میں مُنہ دکھلائی۔"

میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع السودا نے نثر میں لکھا ہے (جن کا زمانہ ۱۱۲۵ھ ہجری سے ۱۱۹۵ھ ہجری تک ہے) اُس کا انداز بالکل یہی ہے جو سودا کی کلیات کے دیباچہ کا ہے۔

نثر مرزا رفیع

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایتِ حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیلِ ریختہ دُر ریختہ خامہ دو زبان اپنے سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کروں۔ تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ موردِ تحسین و آفریں رہوں

قیمتِ قدر شناسا ہی سے پہونچے ہے بہم ورنہ دنیا میں خذف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے۔ جس وقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش دادرس کے۔ غرض جس اہل سخن کا دُر منصفی زینتِ لب ہے سررشتہ حسن معانی کا اس کلام کے، اُس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی، مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغِ ہوش دیا ہے۔ چاہیے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ ہرگز نہ زہر آلودے بے اجل کلھے کو مرے۔"

(حاشیہ صفحہ ۵۰) کہ ایک صاحب تاریخ اُردو لکھ رہے ہیں اُن کو عہد شاہجہانی تک کی نثریں دستیاب ہو گئی ہیں۔ اس لحاظ سے نثر اُردو کی ابتدا نظم اُردو کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ وہ نثریں جیسا کہ متن میں حوالہ دیا گیا ہے کچھ ان سے بہتر نہ ہونگی۔ تمنا.

اس تصنیف سے تخمیناً تیس برس کے بعد جب میر انشا اللہ خاں اور مرزا مظہر جانجاناں نظہر کی دلی میں ملاقات ہوئی ہے، اُس گفتگو کے چند فقرے بھی قابل غور ہیں۔ سید انشا مرزا جان جاناں سے فرماتے ہیں :۔

"ابتداے سن صبا سے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالایطاق تقبیل عتبۂ عالیہ کا بحدّے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں :۔

"آپنے تئیں کوں بھی بدو طفلی سے تمھیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست و مجالست رہا کی ہے"

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بزم شعرا کے تین دور ختم ہو چکے ہیں۔ اگرچہ میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا چراغ سحری ہیں لیکن اُنکی گرم نفسی اور آتش بیانی ہر صحبت اور جلسہ کو گرما رہی ہے اور چوتھے دَور کے شعرا، کے قہقہوں کی آواز دور سے پیہم سنائی دے رہی ہے کہ اب آئے اور اب آئے۔

با اینہمہ اُردو میں اُس وقت نثر کی کوئی قابل الذکر کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جس سے زبان کی تبدیلیوں کا سلسلہ معلوم ہوتا۔ کیونکہ نثر اُردو کی انشا پردازی اور وسعت فقط شعراء کی زبان پر تھی اور عرصہ تک یہی حال رہا۔ آخر تیرہویں صدی ہجری کے شروع میں کئی قدرتی سامان جمع ہوگئے اور سب سے مقدم سبب اسکی عام فہمی تھی۔ چونکہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لیے نثر لکھنے والوں کو بھی اسی میں واہ واہ لینے کا شوق ہوا۔

اُردو کا عنفوانِ شباب

تیسرا دَور

(۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)

دوسرا دَور ہنگامۂ مشرق یعنی غدر تک منتہی ہو جاتا ہے اور اسکے بعد تیسرے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دَور دوسرے دَور سے اس قدر چسپاں ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا آسان نہیں ہے۔ بے شک ہر دَور کی خصوصیات نمایاں ہیں لیکن یقینی طور پر یہ نہیں

کہا جا سکتا کہ فلاں سنہ سے فلاں سنہ تک دور اوّل رہا اور اسکے بعد دوسرا دور شروع ہوا یا یہ کہ تیسرا دَور ٹھیک غدر کے بعد شروع ہو گیا - دراصل مصنفین کی طرز تصنیفات کے لحاظ سے ہم نے یہ تین دَور قائم کیے ہیں - خواہ اُنھوں نے اپنی کتابیں کسی دَور میں کیوں نہ تصنیف کی ہوں مثلاً سرسید تیسرے دور میں شمار کیے گئے ہیں حالانکہ اُنکی بعض تصنیفات مثل آثار الصنادید وغیرہ غدر سے پیشتر کی ہیں - اسی طرح اگرچہ منشی امیر احمد مینائی نے غدر کے بعد شہرت حاصل کی اور اُنکی جس کتاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ غدر کے بہت بعد کی تصنیف ہے لیکن اُنکو دوسرے دَور کے مصنفین میں جگہ دی گئی ہے کیونکہ انتخاب یادگار کی زبان بالکل فسانہ عجائب جیسی ہے - پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے قائم کردہ دَور فی الواقع ایک سنہ سے شروع ہو کر دوسرے سنہ پر ختم ہو جاتے ہیں اور اُن میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا - ہاں مطالب کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے اور آسانی کی غرض سے یہ دور قائم کر دیے گئے ہیں - ممکن ہے دو چار سال کا ادھر اُدھر پھیر ہو لیکن یہ بے ریب و شک کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان کی تصنیفات ضرور تین زمانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں اور تین سے زیادہ یا تین سے کم دَور قائم نہیں کیے جا سکتے - چوتھا دَور دورِ حاضرہ ہے اور اس عہد کے مصنفین کے حالات کسی آیندہ زمانہ میں شرح و بسط کے ساتھ لکھنا بہتر ہوگا - اس وقت اُنکے حالات پر خامہ فرسائی قبل از وقت ہے - پس ہم نے تیسرے دور کو ہنگامۂ مشرق یعنی غدر کے اختتام سے شروع کیا اور ہنگامۂ مغرب یعنی جنگ یورپ کے آغاز پر ختم کیا ہے -

تیسرا دور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے نہایت اہم ہے - اگر ہم پہلے دو دور کا حال نظر انداز کر جائیں یا ۱۷۹۸ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تصنیفات صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائیں تو ہماری زبان کے ادبی سرمایہ میں خشخاش کے دانہ کی برابر بھی کمی محسوس نہیں ہو سکتی - بلاشبہ مرزا غالب کے خطوط اگر دوسرے دَور کی تصنیفات میں شمار کیے جائیں جیسا کہ ہم نے کیا ہے تو ضرور اُنکی گمشدگی ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا - لیکن مرزا کے خطوط غدر کے بہت بعد شایع ہوے ہیں اس لیے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان کے لیے سرمایۂ ناز و افتخار ۱۸۵۸ء سے ۱۹۱۴ء تک کی تصنیفات ہیں - البتہ یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ پہلے دو دَور کی تصنیفات اُردو زبان کی عمارت کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر بنیاد کوئی عمارت قائم نہیں ہو سکتی -

تیسرا دَور نہ صرف اپنے ماسبق دو دَوروں سے گوے سبقت لے گیا ہے بلکہ اب اُمید نہیں کہ ایسا شاندار، عظیم الشان اور مختلف النوع دَور ہماری آنکھوں کے سامنے قائم ہو۔ یہ ممکن ہے کہ تصنیفات کی تعداد روز افزوں ہو اور مصنف بھی کثرت سے پیدا ہوں لیکن یہ بزرگ صورتیں جن کو زمانہ مٹا چکا ہے اب دوبارہ نظر نہیں آئیں گی اور وہ جدت اور خوبیِ زبان اور وہ تلاش و تحقیق و تدقیق جو اِن صاحبان کی تصنیفات میں پائی جاتی ہیں نہیں دکھائی دیں گی۔

یا رب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

چوتھا دَور جس کا آغاز ہم ۱۹۱۴ء سے بتاتے ہیں دراصل ترجمہ کا دَور ہے۔ اگرچہ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے آغاز سے یا اس سے قبل شروع ہو گیا ہے لیکن آجکل زیادہ زوروں پر ہے۔ اور اسی بنا پر دَورِ حاضرہ کو ہم ۱۹۱۴ء ہی سے شروع کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا حالی اور مولانا شبلی جو تیسرے دَور کے مصنفین میں اعلیٰ پایہ کے ہیں اسی سنہ میں ہم لوگوں کو داغ مفارقت دیگئے ہیں اور اِنکی ذات بابرکات کے ساتھ تیسرا دَور ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مولوی عبدالحلیم شرر جنکا شمار تیسرے دَور کے مصنفین میں ہے خدا کے فضل سے ۱۹۱۴ء سے اب تک یعنی ۱۹۲۴ء تک اپنی تصنیفات سے برابر ہم لوگوں کو محظوظ فرماتے رہے ہیں اور اُردو زبان کے ناولوں میں اضافہ کرتے رہے ہیں اور خدا کرے کہ وہ بہت دنوں تک زندہ و سلامت رہیں اور اُن کا یہ مشغلہ برابر جاری رہے لیکن اس سے تیسرے دَور کی مدت کے تعین میں کوئی دقت نہیں ہوتی کیونکہ آپ کی جملہ تصنیفات جو ۱۹۱۴ء سے قبل کی ہیں اُن میں اور مابعد کی تصنیفات میں کوئی مابہ الامتیاز فرق نہیں۔ سب ایک ہی زنجیر کی کڑی معلوم ہوتی ہیں۔

تیسرے دَور سے اُردو کا عنفوان شباب شروع ہوتا ہے اور عالم طفولیت ختم ہو جاتا ہے اب اُردو زبان جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جس طرح ایک نوجوان اظہار مطالب کسی بچہ کی نسبت بہتر طور پر کر سکتا ہے یہی حال ہماری زبان کا ہو گیا ہے، اگرچہ اسکو علمی اور سائنٹفک مضامین کے اظہار پر پوری قدرت حاصل نہیں ہوئی لیکن وہ طرز احسن اُنکو ادا کرنے کی سعی بلیغ کر رہی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوتی جا رہی ہے حکیم ہربرٹ اسپنسر کی فلسفیانہ کتب کا ترجمہ اُردو میں مشکل اور سخت مشکل ہے۔ چنانچہ جب مولانا شبلی مرحوم نے ڈاکٹر

(اب سر) محمد اقبال سے دریافت کیا کہ حکیم موصوف کی فلسفیانہ کتب کا ترجمہ اُردو میں ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ تو اُنھوں نے نفی میں جواب دیا لیکن ڈاکٹر موصوف نے حب حکیم ہربرٹ اسپنسر کی کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ جو مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے کیا ہے دیکھا تو اُنھوں نے اپنی پہلی رائے بدل دی اور کہا کہ بلاشبہہ حکیم ممدوح کی کتابوں کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مترجم دونوں زبانوں پر کامل قدرت رکھتا ہو۔

فی الحقیقت ہر زبان کی ترقی اور وسعت ترجموں پر منحصر ہے۔ جس قدر علوم و فنون کی کتب کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا جائے گا زبان وسیع ہوتی جائے گی اور اہل زبان علوم جدیدہ سے ماہر و واقف ہوتے جائیں گے۔ عربی زبان میں جب تک لاطینی اور یونانی و عبرانی کتب سے ترجمے نہیں کیے گئے کچھ اضافہ نہیں ہوا اور نہ عربوں کی سلطنت میں شائستگی اور تمدن کا دَور ہوا فتوحات کے بعد تہذیب کا دَور شروع ہوتا ہے اور عربوں کا یہ دَور دورِ عباسیہ ہے جبکہ ہزاروں کتابیں دیگر ممالک سے اونٹوں پر لد کر آتی تھیں اور ترجمہ ہوتی تھیں بقول مولانا حالی

یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم　　　کہ ہو جیسے مجروح پائے جو مرہم
کسی طرح پیاس اُنکی ہوتی نہ تھی کم　　　بُجھاتا تھا پیاس اُنکی باراں نہ شبنم

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن　　　پہ تھا اُنکی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جنکے اب تک مزین　　　کتب خانۂ پیرس و روم و لندن

پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

اس دَور میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی، تاریخی و تمدنی، غرضکہ ہر قسم اور ہر نوع کی کتابیں لکھی گئیں۔ اس عہد کے لکھنے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہے۔ اگر یہ وہ مصنفین جن کو ہم نے لیا ہے ایک عشرہ سے زائد نہیں ہیں لیکن دوسرے درجے کے مصنفین کی تعداد کسی طرح ایک ربع صدی سے کم نہیں۔ اگر ہزارہا نہیں تو سیکڑوں کتابیں بلا شبہہ اس

دور میں لکھی گئی ہیں جو اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ درجہ تک کی ہیں۔

رفتار زمانہ سے ضرور اُمید ہے کہ اُردو زبان ترقی کرتی جائیگی۔ اگرچہ بعض تنگ خیال اصحاب اُردو کے مخالف نظر آتے ہیں لیکن اُنکی مخالفت بے سود ثابت ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ شروع سے آج تک ہمیشہ اسکی عام فہمی اسکے رواج کی سفارش کرتی رہی ہے بشرطیکہ اسکے نادان دوست اس کا معیار بلند کرنے کے خیال سے اسکو اس صفت سے معرّیٰ نہ کردیں جیسا کہ دور حاضرہ کی بعض تصنیفات کو دیکھ کر اسکے محبان صادق کو یہ خیال پیدا ہو چلا ہے۔

اس عہد کے سرتاج یا امام سرسید احمد خاں ہیں جن کی تحریرات نے اُردو کے قالبِ بے جان میں جان ڈال دی۔ اُنکی کتاب آثار الصنادید کسی یورپی تصنیف سے کم پایہ نہیں۔ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس وقت غالباً فوٹو کا رواج نہ تھا یا وہ اس قدر گراں تھا کہ سرسیّد اُسکے صرف کے متحمل نہ ہوسکتے تھے ورنہ وہ عمارات کے فوٹو لیتے اور اپنی کتاب میں چھاپتے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر عمارات کے کتبوں اور اُنکی پیمایش کو صحیح صحیح تحریر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب غدر سے پہلے شایع کی گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کا دماغ فطرتاً صحیح اور عمدہ باتوں کے قبول کرنے کیلئے موزوں ہوا تھا۔ سفر انگلستان نے صرف جِلا کردی۔ اسی کتاب کی بدولت سرسید کو انگلستان پہونچ کر وہ اعزاز اور خطاب حاصل ہوے جن کا اُنکو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اور اہل یورپ نے اس کتاب کی کماحقہٗ قدر کی اور داد دی۔ اخبار نویسی، مضمون نگاری، اور مدلل بحث و تقریر کرنا دراصل سرسید نے ہم سب لوگوں کو بتایا ورنہ اُردو زبان ان ضروری اور اہم اصناف سے محروم رہتی۔

آزاد نے اُردو نثر کو نظم کا ہم پایہ بنایا۔ جو کچھ لکھا تلاش و تحقیق سے لکھا۔ تشبیہ و استعارات کو موزوں طریقہ سے برتا، انگریزی خیالات کو اُردو کا دلفریب جامہ پہنایا۔ کتابیں ہیں کہ ہنستی بولتی تصویریں ہیں۔ جو خیالات ہیں بلند و ارفع اور جو بات ہے دلفریب و دلچسپ۔

مولوی نذیر احمد نے محاورات اور روزمرہ کو اس نہج پر استعمال کیا کہ اُن کا انداز تحریر خاص ہوگیا۔ اگرچہ بعض مقامات پر موٹے موٹے عربی الفاظ بھی آجاتے ہیں لیکن اُنکی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اس طرح لکھتے ہیں کہ مطالبِ کتاب، پڑھنے والے کے ذہن نشیں ہوجاتے ہیں، بلکہ

کالنقش فی الحجر بنجاتے ہیں۔

مولوی چراغ علی مذہبی مضامین وکتب کے مصنف ہیں۔ آپ کی تصنیفات مدلل اور جامع و مانع ہوتی ہیں۔ متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جس عنوان پر لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں اور تحقیق وجستجو کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔

مولوی ذکاء اللہ طرز تحریر کے لحاظ سے کوئی خوبی نہیں رکھتے۔ البتہ اُنکی کتابوں میں معلومات کا ذخیرہ دفن ہے۔ اور مختلف مضامین پر اُنکی تصنیفات نے اُنکو اُردو کا سچا بہی خواہ اور محسن قرار دیا ہے۔

مولانا حالی فن تنقید کے بادشاہ ہیں اور سوانحمری لکھنے میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ طرز عبارت سادہ اور موثر ہے۔ مبالغہ سے پاک ہے اور واقعیت سے وہ کبھی تجاوز نہیں کرتے۔ تعریف ہر تو حدود کے اندر، اور اعتراض ہے تو صحیح۔ نہ اُستادی کا خیال ہے نہ دوستی کا، نہ بزرگی کا خیال ہے نہ پبلک کے مذاق کا۔ بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف صاف بے کم وکاست کہتے ہیں اور کبھی بیجا طور پر نکتہ چینی نہیں کرتے۔ اور واقعی نقائص کے دکھلانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔

علامہ شبلی ایک مورخ اور بے مثل مورخ ہیں۔ اگرچہ اُنکی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے، لیکن تاریخی رنگ نمایاں اور ممتاز ہے۔ عبارت صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ الفاظ موثر اور دلکش ہوتے ہیں۔ اپنے ممدوح کی تعریف خوب کرتے ہیں اور اگرچہ آپ کا ممدوح اکثر صفات سے متصف ہوتا ہے تاہم وہ انسان ہے اور اُسکے نقائص کا اظہار بھی تاریک پہلو پر روشنی ڈالتا تو اُسکی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی۔

ڈاکٹر سید علی بلگرامی ترجمہ کے اُستاد ہیں، اُن کا انتخاب بھی لاجواب ہے۔ تمدن عرب اور تمدن ہند دونوں کتابیں مشہور ومقبول ہو چکی ہیں اور کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں۔ عبارت رنگ آمیزی سے پاک ہے اور اس قدر مرغوب ودلنشیں ہے کہ اُن کی کتابوں پر ترجمہ کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔

سرشار کا قلم ظرافت کے موتی ٹپکاتا ہوا چلتا ہے۔ اگرچہ فسانۂ آزاد پڑھنے کے بعد اُنکی ہر کتاب میں وہی طرز خاص پایا جاتا ہے تاہم جو کچھ لکھا ہے وہ اُنہیں کا حصہ تھا۔ قلم برداشتہ لکھنا

ہنسی کھیل نہیں - اور اُنکی بہترین تصنیف یعنی فسانہ آزاد اسی تیز قلمی کا نتیجہ ہے - خاص بات یہ ہے کہ طرز تحریر سے اُنکو کوئی شخص ہندو نہیں کہہ سکتا بلکہ لطف یہ ہے کہ اُنکے الفاظ اور اُنکی معلومات اُنکو مسلمان کہنے پر مجبور کرتی ہیں -

شرر کا طرز تحریر متانت آمیز ہے - اُنکے ناول دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں - عبارت کا انداز علمی کتابوں کے لیے بھی موزوں ہے مگر تاریخی ناول فرضی افسانے ہیں اور دو چار باتوں کے سوا، قصہ کی تمام جزئیات تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں -

ہر حال یہ مصنف اس درجہ اور اس پایہ کے ہیں کہ ہر زبان کے لیے مایۂ صد افتخار ہو سکتے ہیں - انکی تصنیفات دوسری زبانوں کی تصنیفات کے مقابل پیش کی جا سکتی ہیں - انکے کلام سے دوسری زبانوں کو مالا مال کیا جا سکتا ہے -

افسوس کہ اب اِن کا کوئی جانشیں نظر نہیں آتا - اگرچہ دُنیا رو بہ ترقی ہے اور ہم ہرگز مایوس نہیں کہ آیندہ زمانہ میں ایسے قابل اور لایق مصنف پیدا نہ ہونگے - نہیں ضرور پیدا ہونگے اور خدا کرے کہ وہ اِن سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوں - لیکن فی الحال اُمید نہیں کہ ہماری زندگی میں کوئی ایسا عالی دماغ مصنف پیدا ہو جو اِن بزرگوں کی ہمسری کر سکے - چوتھا دور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے - ترجمہ کو چھوڑ کر تالیفات و تصنیفات اگرچہ تعداد میں سیکڑوں ہوں لیکن مشکل سے دو چار کتابیں ایسی نکلیں گی جو اُردو لٹریچر میں داخل ہونے کی عزت حاصل کر سکیں

--- :: ش :: ---

اگرچہ اس دور میں صرف چیدہ چیدہ مصنفین کا ذکر خیر کیا گیا ہے لیکن اس زمانہ کی حسب ذیل کتب بھی قابل ذکر ہیں - افسوس کہ ہندوستان بظاہران کتابوں کے وجود سے محروم ہے اور انڈیا آفس لائبریری لندن انکے موجود ہونے پر جس قدر فخر کرے وہ کم ہے - ممکن ہے بعض اصحاب کے کتب خانوں کو یہ کتابیں زینت دے رہی ہوں اس لیے بادب التماس ہے کہ ناظرین احقر کو اِن کتابوں کے بعض بعض مقامات کی نقل اور مصنفین کے حالات جس قدر مل سکیں بھیجدیں تا آیندہ ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کر دیا جائے -

فن زراعت:

۱ - علم الفلاحت از رابرٹ اسکاٹ براؤن صفحات ۲۵۲ علی گڑھ ۱۸۶۵ء
۲ - علم الفلاحت، میجر کاربرٹ الہ آباد ۱۸۶۹ء - ۳ - تجربۂ ملخ از غلام نبی میرٹھ ۱۸۶۵ء

کتب حکمت

۱ - علم تعمیر کالی پرشاد اور سید علی ۱۸۶۳ء پٹنہ

جغرافیہ

۱ - ترجمہ مراصد الاطلاع (عربی) در اُردو - عبد المومن ۱۸۶۲ء پورٹ بلیر ۳ جلد
۲ - مختصر بیان جغرافیۂ ہند - پنڈت چنتامنی، کانپور ۱۸۶۷ء

طبعیات

۱ - دائرۂ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کرم بخش، لکھنؤ ۱۸۶۶ء

معاشیات

۱ - اصول سیاست مدن، دھرم سبھا، علی گڑھ ۱۸۶۹ء
۲ - علم انتظام مدن ترجمۂ انگریزی ناسو ولیم سینیر، علی گڑھ ۱۸۶۴ء

علم المعاشرت

۱ - دستور عمل امورات شادی وغمی از چراغ شاہ ملتانی ۱۸۶۸ء

منطق

۱ - میزان العلوم از سید عبد العلی پٹنہ ۱۸۶۹ء　　۲ - خلاصۃ المنطق، دیوی پرشاد بدایوں ۱۸۶۹ء

از حالات آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بقابہ

لطیفہ - ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں - آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجیے - میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں - جو کام آپ میرے لایق سمجھیں اُسکے واسطے سفارش کر دیں۔" سرسید نے اُنکو لکھ بھیجا کہ "میری عادت کسی کی سفارش کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر

چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہیگی"۔ غالباً یہی لطیفہ سُن کر مولانا حالی نے حسب ذیل قطعہ لکھا ہے :-

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے — برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا — لیکن نہ اُسکے ہاتھ کہیں نوکری لگی
اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی — تدبیر یہ بھی اُسکی نہ تقدیر سے چلی
روزی کی خاطر اُس نے کیے سیکڑوں جتن — پر، کی کہیں نصیب نے اُسکے نہ یاوری
راہ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت — اک خضر پے مجسمہ نے کی آکے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اُسکے کہ آجکل — سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی
جا اور لفظ لفظ پہ اُسکے چھیڑ کر — تردید اسکی چھاپ دے جو ہو بُری بھلی
پھر دیکھنا کہ اس وجیٹ گردو پیش سے — لگتی ہے کیسی آکے زر و سیم کی جھڑی

دنیا طلب کو چاہیے ابلہ فریب ہو
دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے ابلہی

از حالات شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں

تصانیف پر عام رائے | اگرچہ آپ کے مزاج میں مزاح تھا اور ظرافت بدرجۂ غایت تھی لیکن آپکی تصانیف میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ خشک اور فلسفیانہ خیالات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے انگریزی کتابوں سے خیالات کو مستعار لیکر اپنی زبان کے لباس میں جلوہ گر کیا ہے۔ مگر طرز ادا ضرور قابل تعریف ہے۔ بیشک آپ کی کتابیں سوکھی، پھیکی ہیں مگر اس قدر بدمزہ نہیں کہ اُن کا پڑھنا ناگوار ہو۔ معلومات کے ذخائر جا بجا پائے جاتے ہیں اور متین و سنجیدہ مطالعہ کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ آجکل کے تعلیم یافتہ انگریزی خیالات کو اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں تو عجیب و غریب ترکیبیں استعمال کرتے ہیں، جس سے اُن خیالات کی ندرت اور اجنبیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ کے طرز بیان میں یہ خوبی ہے کہ وہ ٹھیٹھ اُردو میں اپنے ذاتی خیالات معلوم ہوتے ہیں، ترجمہ یا ماخوذ نہیں معلوم ہوتے۔ بلاشبہ سرسید اس بارے میں مولوی صاحب سے

بہت آگے ہیں۔ اُنھوں نے جہاں انگریزی خیالات کو اپنی زبان کا جامہ پہنایا ہے، اُنکو ایسا آراستہ اور پیراستہ کر دکھایا ہے کہ خود اصلی خیالات میں اضافہ معلوم ہوتا ہے اور طرز بیان نہایت دلکش اور موثر ہو جاتا ہے۔ لیکن سر سید سے مولوی ذکاء اللہ کا موازنہ کرنا فضول ہے کیونکہ سید صاحب تیسرے دور کے امام ہیں اور کوئی مصنف اُنکے اندازِ تحریر کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ کوئی اُنکے لگ بھگ ہے

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کہا جا سکتا ہے کہ آزاد نے نیرنگ خیال میں انگریزی خیالات کو نہایت عمدگی سے اپنی زبان میں بیان کیا ہے۔ یہ سچ ہے۔ لیکن مولوی ذکاء اللہ کم سے کم الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہیں اور آزاد کو ایک سطر کے مضمون کے لیے ایک صفحہ چاہیے۔ آزاد کی کتابیں ناول اور قصہ کا مزہ دیتی ہیں اور مولوی ذکاء اللہ کے یہاں ثقیل اور مقوی غذائیں ہیں، اگرچہ بعض انگریزی کھانوں کی طرح ہمیں پھیکی اور اُبلی ہوئی معلوم ہوتی ہوں۔ لہذا دونوں کا اندازِ تحریر جداگانہ ہے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں بکار اور ناگزیر ہیں۔

مولوی صاحب کی کتاب تاریخ ہندوستان کے اٹھارہ حصے تیرہ جلدوں میں مجلد ہیں۔ اور انکے سات ہزار ایک سو اُنہتر صفحات ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:۔

	صفحات
ہندوؤں کے عہد سلطنت کی تاریخ	۱۱۰
مسلمانوں کے عہد سلطنت کی تاریخ جلد اول لغایت دہم	۵۱۰۱
انگریزوں کے عہد سلطنت کی تاریخ جلد اول لغایت چہارم	۱۹۵۸
میزان کُل	۷۱۶۹

مولوی صاحب نے سوانح عمری ملکۂ معظمہ وکٹوریا بھی لکھی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ اُس سے انگریزی پارلیمنٹ اور اُسکے وزراء کا حال بخوبی معلوم ہو جاتا ہے۔

آپ نے تاریخ ہندوستان میں اُن یوروپین مورخین کی پیروی نہیں کی جو اپنی ناواقفیت تعصب اور تنگ خیالی کی بنا پر واقعات کو خواہ مخواہ رنگ دیتے ہیں۔ آپ نے جس زمانہ کا حال لکھا ہے (کم از کم مسلمانوں کے عہد سلطنت کی بابت) اُسی زمانہ کے مورخین کی تاریخوں سے واقعات اخذ کیے ہیں اور اس طرح سے اُن تمام غلط خیالات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو بوجہ لاعلمی یا کسی مقصدِ ذاتی

کی بنا پر جھوٹے حالات سچے واقعات کی صورت میں مشتہر کیے گئے ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ نویسی میں ایک نقص ہے۔ وہ یہ کہ آپ جا و بیجا انگریزوں کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ مورخ کا یہ کام ہے کہ واقعات کو اُنکے اصلی رنگ میں ظاہر کرے نہ یہ کہ اُن پر ملمع سازی کرے۔ جہاں تعریف کی ضرورت ہو بلا شبہ بلا لحاظ لوم لائم مدح سرائی کرے لیکن جہاں مذمت کی ضرورت ہو، ضرور بُرے کاموں کی خواہ کسی سے صادر ہوے ہوں بُرائی کرے۔ اور اگر دونوں باتیں نہ کرے تو اپنی رائے سے اجتناب کرے اور واقعات کی جانچ پڑتال کے بعد صحیح صحیح حالات لکھدے۔

لیکن یہ ناانصافی ہوگی اگر ہم مولوی ذکاء اللہ کی محنت او تلاش کی داد نہ دیں۔ وہ جلد ہفتم ظفرنامہ شاہجہاں کو اس طرح شروع کرتے ہیں :۔

"میرا قاعدہ ہے کہ میں سلاطین ہند کی تاریخ نویسی کے لیے وہ تواریخ لیتا ہوں جنکے مؤلف عہد بعہد ہوں اور وہ سب سے زیادہ معتبر و مستند سمجھی جاتی ہوں۔ اُن سے تاریخی حالات اخذ کر کے لکھتا ہوں اور پھر انگریزی تاریخوں سے جن کا ایک انبار میرے پاس موجود ہے، بعض مضامین التقاط کر کے لکھتا ہوں۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں اہل یورپ (فرانسیس، پرتگیز، انگریز، ڈچ) بہت ہندوستان میں آگئے تھے۔ ان میں سے بعض فرنگیوں نے اس زمانہ کی تاریخیں اپنی زبانوں میں تصنیف کیں، یا اُنکی تاریخوں سے بعض معاصرین نے جو ہندوستان میں نہیں آئے، مضامین استنباط کر کے اور بعض سُنی سُنائی باتوں کو تحقیق کر کے تاریخیں تالیف کیں۔ یورپ میں گویہ قدیم تاریخیں اپنے زمانہ میں شائقین تاریخ کے لیے ایک پُرلطف غذائے علمی تیار ہوئی، اُس زمانہ کے مورخوں نے اسکے بڑے مزے لیے مگر اب وہ غذا ایسی باسی اور اُسی ہوگئی ہے کہ کوئی مورخ جسکا مذاق تاریخ صحیح ہو اُسکو زبان پر نہیں رکھتا۔ گو وہ اس زمانہ میں اپنے پایۂ وقعت سے ساقط ہوگئی ہوں مگر اُنکے سبب سے جو اہل یورپ کے دل و دماغ میں غلط خیالات جم کر نقش کالحجر[1] ہوگئے ہیں وہ کسی طرح مٹانے سے نہیں مٹ سکتے۔ اگر کوئی فرنگی مورخ یا کوئی ہندوستانی مورخ خواہ کیسا ہی اپنے ملک کی تعریف میں

[1] مولوی صاحب کی اصل کتاب میں یہ فقرہ اسی طرح درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے غلط العام فصیح پر عمل کیا۔ "پنھا"

عالم فاضل ہو وہ اُس پر کز لکِ حک لگائے تو اہل فرنگ کے نزدیک جاہل بے فرنگ سمجھا جائے گا۔
میں نے ان تاریخوں کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے اور انکی غلطیوں کو بیان کیا ہے"۔

مولوی ذکاء اللہ، آزاد اور شبلی کا موازنہ

پس مولوی صاحب نے تاریخی واقعات لکھنے میں بہت تجسس اور مطالعہ سے کام لیا ہے لیکن یورپین مصنفین کی غلطیاں فاش کرنے میں انکو ہمیشہ یہ خوف رہا ہے کہ اہل فرنگ کے نزدیک ہم جاہل بے فرنگ نہ ہو جائیں لہذا وہ اُنکی غلطیاں ظاہر کرتے ہیں مگر دبی زبان سے۔ برخلاف اسکے مولوی شبلی نعمانی کا ڈھنگ بالکل جداگانہ ہے۔ اُنھوں نے اورنگ زیب عالمگیر پر جو تاریخی مضامین لکھے اُن میں تمام حالات پوست کندہ بیان کیے اور اہل یورپ کی غلط فہمی، تعصب، تنگ خیالی اور ناواقفیت کو علی الاعلان ظاہر کیا۔ تاریخ کے دو بڑے اصول روایت و درایت لازم و ملزوم ہیں۔ روایت کے متعلق جس قدر اہتمام مسلمانوں نے کیا ہے اور جو قواعد اسکے مرتب کیے ہیں' اس قدر ترقی علوم و فنون کے بعد بھی اُن میں اضافہ تو کیا، اُنکی تقلید بھی دوسری اقوام سے کماحقہ نہیں ہو سکی۔ درایت کے متعلق، البتہ، یوروپین اصحاب نے تخیل کے جولاں گاہ سے خوب مدد لی ہے اور تاریخ ہندوستان کے واقعات کو کچھ اس ملک کے رسم و رواج کی لاعلمی سے اور کچھ یہاں کے بھنگڑخانوں کے ثقہ راویوں کے سُنے سُنائے حالات سے غلط نتائج کا آماجگاہ بنایا ہے۔ اور اپنے ملکوں کے حالات سے اُن کا موازنہ کر کے خوب خوب نکتہ چینی کی ہے۔

آزاد نے دربار اکبری دوسرے طرز پر لکھی ہے۔ اُس نے اکبر کی خوبیاں ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بدقسمتی سے یوروپین اصحاب کا بھی یہی شیوہ رہا ہے کہ اکبر کی خوبیاں اور عالمگیر کی بُرائیاں ظاہر کریں اور اُنکی تاریخ نویسی کا یہی اصل اصول ہے تاکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں نااتفاقی کا بیج ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم اکبر کی پالیسی اور اُسکی لامذہبی کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو سلطنت مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ اکبر کی پالیسی تھی۔ اکبر نے راجپوتوں سے رشتے ناتے کر کے اُنکو اندرونی اور باہر سلطنت میں دخیل کر لیا۔ حالانکہ محکوم قوم کا تالیفِ قلوب کرنا کتنا ہی عمدہ اور قابل ستائش کیوں نہ ہو لیکن حاکم کو اپنی گردن اُسکے ہاتھ میں دیدینا موت اور زوال کی

نشانی ہے۔ اورنگ زیب نے سلطنت کو ان مہلک نتائج سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں کیں اور اُس کا یہ فعل غیر اقوام کی نظروں میں کانٹا سا کھٹکتا ہے۔ حالانکہ انگریزوں نے ہم بیچارے ہندوستانیوں کو باوجود دعوی تہذیب و ترقی آج بیسویں صدی میں بھی اُن حقوق کا عشر عشیر نہیں دیا جو عالمگیر کے زمانہ میں اہل ہنود کو حاصل تھے۔

لہذا آزاد کی جہاں یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ اُس نے اکبر کے زمانہ کی تاریخ کو صرف شاہی کارناموں تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ اُس زمانہ کے رسم ورواج، طرز ماند و بود، ملک کی عام حالت، رعایا کی مرفہ الحالی اور دیگر خیالات کا نقشہ کھینچکر پڑھنے والوں کو یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اُس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے تمام حالات مشاہدہ کر رہے ہیں، وہاں یہ بھی نقص ہے کہ اُس نے اکبر کے ہر فعل کو اچھا ہی اچھا کہا ہے۔ اپنی طرف سے وہ وہ توجیہات پیدا کی ہیں کہ باید و شاید۔ یہ کہنا آسان ہے کہ بادشاہ کو امور ملکی میں مذہب کو دخل نہ دینا چاہیے اور ہم کو اسکے ماننے میں تامل نہیں۔ لیکن کیا بادشاہ کو ایک بانیٔ مذہب بھی ہونا چاہیے؟ اور باوجود ادعاءِ اسلام اُسکے لیے توہین مذہب جائز ہے؟ آزاد نے ان امور کو بھی سراہا ہے۔

مولوی ذکاءاللہ زبان اور الفاظ کی برجستگی کے لحاظ سے آزاد کا مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن تاریخ نویسی کے اعتبار سے جسقدر غور اور تامل کے بعد صحیح نتائج پر پہونچنے کی، مولوی صاحب نے کوشش کی ہے۔ آزاد نے زیادہ تر دلچسپ بنانے میں وقت صرف کیا ہے۔

مولانا شبلی اس دور کے مصنفین میں زیادہ تر مورخ ہی کے نام سے مشہور ہیں اور اس میں شبہہ نہیں کہ اُنھوں نے اُن اسلامی معلومات کو جو عربی کی ناواقفیت کی بدولت ہماری دسترس سے باہر تھیں اپنی زبان میں نہایت عمدگی کے ساتھ جلوہ آرا کیا ہے۔ خلفائے راشدین، ائمہ معصومین اور اولیائے کرام سے جن کے حالاتِ زندگی نہ جاننا ہم مسلمانوں کے لیے باعث ننگ و شرم تھا، بڑی تحقیق و تدقیق اور محنت و تلاش کے بعد ہم کو واقف بنا دیا ہے۔ اور اُنکا مایۂ عمر اُنکی آخری کتاب سیرۃ النبیؐ ہے۔ یہ فرض جو اُنھوں نے نہایت خوش سلیقگی سے ادا کیا ہے اور اُردو بولنے والے مسلمانوں پر جو اب تک ایک بارگراں چلا آتا تھا اُنھوں نے اپنی قادر الکلامی اور علمیت سے کام لیکر ہم سب مسلمانوں کو اُس سے سبکدوش کر دیا ہے۔

لیکن جس ملک میں ہم رہتے ہیں اور جسکے کارناموں کو جاننا بھی ہمارا فرض ہے اُسکی طرف مولوی ذکاء اللہ صاحب ہی نے توجہ فرمائی۔ اُردو زبان کے لحاظ سے مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان اُن اقوام کے لیے جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہیں دلچسپ اور ضروری ہے اور مولوی شبلی کی تصانیف محض مسلمانوں کے لیے مفید اور دلکش ہو سکتی ہیں۔ اُردو زبان میں جو کمی مکمل تاریخ ہندوستان کے نہ ہونے سے تھی، وہ ہرگز المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان اور دیگر کتب کے نہ ہونے سے نہ تھی۔ پس اس بارے میں مولوی ذکاء اللہ کی قلم فرسائی زیادہ قابلِ شکریہ اور لایق تحسین ہے۔

فن تاریخ میں جو استدلال کا طریقہ مولانا شبلی کا ہے وہ ہرگز مولوی ذکاء اللہ کا نہیں ہے۔ مولانا شبلی، آزاد کی طرح الفاظ کی بھول بھلیاں میں نہیں پڑتے۔ اُنکے الفاظ بجائے خود مؤثر اور زوردار ہوتے ہیں، وہ اُنکو تشبیہات و استعارات سے دلچسپ نہیں بناتے۔ مولوی ذکاء اللہ الفاظ کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ جو اُس وقت قلم سے نکل گیا، وہی غالباً کتاب کے طبع ہونے تک قائم رہا۔ دلائل پیش کرتے ہیں لیکن نہ اس طرح کہ پڑھنے والے کے دلنشیں ہو جائیں البتہ خفیف اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ آزاد اپنی عبارت کی عمدگی سے پڑھنے والے کے دماغ کو معطل کر دیتا ہے اور ایک ناول اور قصہ کی طرح اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے۔ تاوقتیکہ پڑھنے والا واقف حالات و واقعات نہ ہو، بہت کم آزاد سے اختلاف کرتا ہے۔

از حالات شمس العلما مولوی محمد شبلی نعمانی

تصنیفات و تالیفات پر عام رائے ایک نہایت تجربہ کار اور وسیع المعلومات جرمن مستشرق نے مولانا کی تصانیف کے متعلق رائے دی ہے۔ لہذا ہم اُسکو یہاں نقل کرتے ہیں:۔

"علما اور مصنفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے۔ اوّل مادہ تحقیق و تدقیق دوم جانچ پڑتال۔ سوم جدت۔ چہارم استحکام رائے اور قوت استدلال۔ علما اور مصنفین ہند کا متخیلہ تو بیشک زیادہ زوردار ہے۔ لیکن اُن میں مبالغہ کی عادت ہے۔ انکی تاریخی حکایات اور جنگی افسانے مبالغہ اور متضاد خیالوں سے پُر ہیں۔ برخلاف اسکے اہل مغرب کے دماغ،

منطقی استدلال اور موزوں اور درست الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔گویہ ایک گونہ اسلامی رنگ لیے ہوتی ہیں"۔

ہمارے نزدیک جرمن مستشرق کی رائے جہاں تک اُس کا تعلق مولانا شبلی کی ذات تک ہے درست ہے۔لیکن اُسکی رائے کے بقیہ حصہ سے ہمیں اتفاق نہیں۔اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس دَور کے مصنفین میں ایک یا دو کے سوا باقی تمام مصنفین اُن صفات سے جن کا ذکر جرمن مستشرق کرتا ہے متصف ہیں۔ممکن ہے اور لوگ جن کو ہم نے اس دور کے مصنفین میں شامل نہیں کیا یا جنکا شمار ٹھیٹھ علمائے اسلام کے زمرہ میں ہے ان صفات سے عاری ہوں۔لیکن تیسرے دَور کے مصنفین ہرگز اس الزام کے مورد نہیں ہوسکتے۔آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت اور جدت وغیرہ سے پُر ہیں۔مولوی چراغ علی، سرسید اور مولانا حالی کی تصنیفات ان تمام خوبیوں سے بھری ہوئی ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ و محققانہ و فلسفیانہ استدلال و انداز کے کسی مستند یورپی تصنیف سے کم نہیں۔آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت فلسفیانہ تحقیق و تدقیق، مضبوطیِ رائے اور منطقی استدلال ہے۔ان میں ایک قسم کی جدت بھی ہے اور طرزِ ادا میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔جو خصوصیتیں اوائل اسلام کے ائمہ و مجتہدین میں پائی جاتی تھیں اُن کی جھلک یہاں بھی نمودار ہے۔عالمانہ عبور، غور و خوض کی قوت، تحقیق و تجسس، درایت، علمی جانچ پڑتال کی عادت، اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہونچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان سے نکال کر سلجھانا اور پھر تقسیم و تحلیل کرنا، بعد ازاں اُسے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے۔یہ وہ باتیں ہیں جو علامۂ شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔اسی کے ساتھ علامۂ مرحوم میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی۔معاملہ فہمی اور دوراندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے

آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔غیر اقوام پر انکے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف

ہو جاتی ہیں - یہ کتابیں سہل پسندی، عام فہمی اور دلاویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں - آپ کا مذاقِ علمی مختلف پہلو رکھتا ہے - ایک طرف تو آپ سخت فلسفیانہ اور محققانہ پہلو لیے ہوئے ہیں اور واقعاتِ تاریخی میں کسی قسم کی رنگ آمیزی آپ کو پسند نہیں - دوسری طرف آپ سجید نیچر پرست واقع ہوے ہیں - آپ کی فارسی غزلیات سے جذباتِ لطیفہ، درد و عشق اور حُسن و جمال کا پتہ ملتا ہے۔ آپ پہلے شخص ہیں جس نے اپنی تصنیفات سے اس خیال کو دُور کر دیا کہ شاعر او نثار صرف دہلی اور لکھنؤ ہی کی سرزمین سے پیدا ہو سکتے ہیں - مولانا حالی پانی پت کے رہنے والے ہیں لیکن دہلی میں نشو و نما پائی ہے اس لیے آپ کے نام کے ساتھ بھی دہلی کا لفظ جزوِ لاینفک ہے۔ شیخ مصحفی امروہہ کے رہنے والے ہیں لیکن دہلی کے فیض یافتہ ہیں اور خود اس بات پر نازاں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:-

دہلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

مولوی سید علی بلگرامی نواح لکھنؤ سے ہیں اور کھینچ تان کر وہ بھی لکھنوی ہو سکتے ہیں۔ لیکن مولانا شبلی کسی طرح دہلوی یا لکھنوی نہیں ہو سکتے - بااین ہمہ آپ کی زبان مستند ہے اور آپ اُردو زبان میں پایۂ اُستادی رکھتے ہیں -

---

دل

ایامِ گل برفت و شد عہدِ شباب ہم دستان نائے و نوش سر آمد بروزگار
سرمایۂ نشاط جو ایم رفت و ماند سرگشتۂ خمارِ تمنا دلِ فگار
نے نے، دلم کجاست؟ غلط گفتہ ام کہ ہست زیرا کہ ہستیش بہ برم نیست آشکار
می ماند اگر بسینہ ام آں مونسِ قریں نے روزگار عیش ہمی رفت و نے بہار
دستانِ نائے و نوش کشیدے درازو دیر ہرگز نمی گرفت بایں زود اختصار
تا مونس قدیم دلم از کنار رفت
درد اکہ ساز عیش بروں ز اختیار رفت

سید اظہر علی آزاد
ایم اے ، ایم او - ایل از دہلی

راماین کی تعلیم

الہ آباد یونیورسٹی کے بعض اسکولوں کے درجۂ ہشتم میں رامائن کا انتخاب بہ زبانِ انگریزی پڑھایا جاتا ہے۔ یہ ایک انگریز کی تالیف ہے مگر زمانۂ حال کے مذاق میں نہیں ہے۔ رامائن کے مافوق العادت واقعات اس میں بجنسہ درج ہیں۔ مثلاً راون کی سواری پر سری رام چندر جی نے ہوا میں اجودھیا تک سفر کیا۔ یہاں پر اگر لکھ دیا جاتا کہ غالباً ہوائی جہاز اُس وقت بھی ایجاد ہو چکا تھا تو مضمون بہت صاف ہو جاتا۔ اسی طرح ایک تیر کا گر کر سیکڑوں تیروں کا پیدا ہو جانا مہابھارت میں مذکور ہے۔ اسے یوں سمجھیں کہ بم کے گولے کے پھٹنے سے سیکڑوں مہلک آلات دشمنوں کی فوج میں پھیل جاتے تھے تو زمانۂ حال کے مطابق بات قابل فہم ہو جاتی ہے۔ اُس زمانہ میں بھی زمانۂ حال کی طرح سائنس کی شعبدہ بازیوں کا وجود ماننا طالب علموں کو سمجھانے کا اچھا ذریعہ ہے۔

رامائن میں باپ کی اطاعت بھائی کی ہمدردی اور بی بی کی وفاداری کی بہترین صورت دکھائی گئی ہے۔ جہاں تک باپ کی اطاعت سے اسے تعلق ہے ہندوؤں کے تمدن کے لیے یہ نہایت ضروری شے ہے۔ منوجی کے قانون نے یہ تعلیم دی کہ بیٹے سن شعور کو پہونچیں تو بجبر وہ اپنے باپ کی جائداد چھین سکتے ہیں۔ یعنی بجبر اپنا حصہ بذریعہ تقسیم جدا کرا سکتے ہیں۔ یہ انوکھا قانون ہندوستان کے سوا اور کہیں کرۂ ارض پر نہ جاری تھا اور نہ اب جاری ہے۔ رامائن کی تعلیم اگر مذہبی رنگ میں دلوں پر اپنا اثر نہ ڈالتی تو ہندوستان میں خانہ جنگیوں کی انتہا نہ رہتی۔ منوجی کا قانون جہاں جاری ہو وہاں رامائن بھی ساتھ ساتھ نہ پڑھی جائے تو طبیعتیں اعتدال پر نہیں رہ سکتیں۔

خاندان مغلیہ میں عورتیں داخل حرم ہوئیں تو بادشاہ اپنے شاہزادوں سے برابر نالاں رہے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر ان سب کے مقابلہ میں تقسیم سلطنت کے لیے لڑکوں نے علم بغاوت برابر بلند کیے یا بلند کرنے کی صورت پیدا کرتے رہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان لڑکوں میں ایرانی اور ہندوستانی دونوں خونوں کا میل تھا۔ اس لیے نہ مسلمانوں کے قانون کا خیال رہا اور نہ ہندوؤں کی مذہبی تعلیم کا پورا اثر رہا۔ ماں کی طرف سے صرف شاستر کی یہ تعلیم ذہن میں تھی کہ لڑکا بالغ ہو تو باپ کے

جائداد تقسیم کرائے - اور باپ کے خون کا یہ اثر تھا کہ سری رام چندر کی سنت کو وہ واجب التعمیل نہ سمجھے - مسلمانوں کی تاریخ میں بیٹے کا باپ سے مخالف ہونا اگر کہیں ہے تو شاذ و نادر ہے - اور یہ سلسلۂ بغاوت جو باپ بیٹوں میں ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان میں برابر قائم رہا آپ اپنی نظیر ہے - خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، خلاصہ یہ ہے کہ منوجی کی شاستر جہاں سنائی جائے وہاں راما ئن بھی ضرور سنائی جائے لیکن سوال یہ ہے کہ جب راما ئن بطور ناٹک مذہبی میلوں میں برابر سنائی جاتی ہے تو کیا یہ ضرورت باقی ہے کہ وہ مدرسوں کے نصاب تعلیم میں بھی داخل کی جائے؟ ایک طرف لڑکوں کو سائنس، طبیعات، اور ریاضیات کی تعلیم دی جائے اور دوسری طرف راما ئن کی مافوق العادت واقعات پڑھائے جائیں گے تو ان متضاد اور متناقض باتوں کے پڑھنے سے یا تو لڑکوں کے خیالات میں یکسوئی نہ ہوگی یا مذہب سے انھیں بے اعتنائی ہوگی - یہ دونوں صورتیں غیر مستحسن ہیں

اگر ہندوؤں کے نصاب تعلیم میں راما ئن کا انتخاب جس طور سے کہ شایع ہوا ہے داخل ہو تو کسی غیر مذہب والے کو عذر کا موقع نہیں ہے، محض ہندوؤں کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ زمانۂ موجودہ کا مذاق اپنے بچوں میں پیدا کرانا چاہتے ہیں یا اپنے بچوں کو اُس زمانہ کا سا بنانا چاہتے ہیں جب اسکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا - بہرحال عیسائیوں، پارسیوں اور مسلمانوں کو تو یہ کہنے کا حق ضرور ہے کہ اسکولوں میں اگر تعلیم اخلاق مذہبی کی کوئی کتاب داخل ہو تو اس میں صرف وہی باتیں درج ہوں جو ہندوستان کے تمام مذاہب میں جزو مشترک ہوں -

یہاں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے، اکبر کی پالیسی کا جہاں یہ مقتضا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی مناکحت جاری ہو وہاں مسلمانوں کو ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے پڑھنے کی رغبت بھی دلائی گئی تھی - جس طرح زمانۂ حال میں مناکحت کی آزادی کے خلاف قوم نے صدائے مخالفت بلند کی، اور آزادیِ مناکحت کا بل پاس نہ ہونے دیا اسی طرح شاہجہاں نے کثرتِ رائے پر نظر کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مناکحت کو روکا، لیکن مسلمانوں کو ہنود کے مذہبی مدرسوں میں تعلیم پانے سے اس نے باز نہیں رکھا - دارا شکوہ کا قیام گاہ جو اب پرانی عدالت کے نام سے بنارس میں مشہور ہے، شہادت اس امر کی ہے کہ دارا شکوہ نے اس میں مقیم ہو کر بنارس کے پنڈتوں سے ہنود کی مذہبی کتابیں پڑھی تھیں - عالمگیر نے جب مدرسوں کا انتظام کیا

تو مسلمانوں کو ہندوؤں کی مذہبی تعلیم گاہوں میں جانے سے روکا۔ اس پر لوگ عالمگیر کو متعصب کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ تعصب نہ تھا، زمانۂ موجودہ کے موافق نصاب تعلیم درست کرنے کا نتیجہ تھا۔ اور اُس وقت کے ہندوؤں کو جو دنیا کے لیے تعلیم دلوانا چاہتے تھے یہ بالکل ناپسند نہ تھا۔ آج ہندوؤں کی یونیورسٹی بنارس میں قائم ہے اور ہندو اُس کے مہتمم ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وید مقدس، اُپنیشد، رامائن، اور مہابھارتھ یا دیگر علوم و فنون ہنود کی کتابیں وہاں کے انگلش ڈپارٹمنٹ کے کورس میں داخل نہیں ہیں۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ لڑکوں کو زمانہ کے موافق بنانے کے لیے زمانہ کے موافق تعلیم دینا وہ مقدم سمجھتے ہیں۔ یہی کام عالمگیر نے کیا تو کیا بیجا کیا؟

ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی۔ گورکھپور

تدلیس مُدلّل

سود را جائز بہ تدلیسِ مُدلّل کردۂ
مردِ کامل بودۂ فکرِ مُکمّل کردۂ

مرحبا اے شور طوفاں خیزیٔ افلاسِ قوم
دین و ایماں غرق امواجِ تموّل کردۂ

بخشش سیلاب سحر است آب و تابِ حُسنِ تو
دلبرا چاہ و ذقن را چاہِ بابل کردۂ

نطق گوہر بار شد یا از طلسم و شعبدہ
ابر نیساں را طراز فرشِ محفل کردۂ

خوش سرائیدی تو قرآں را بلحنِ زر پرست
سامری را پیش گوسالہ مُہمل کردۂ

مست می رقصند و می میرند رنداں ساقیا
تشنگاں را عرضہ صہبائے مہمل کردۂ

فتنۂ کیلِ وِ میزاں نعمتِ قوم شعیب
تہر فی اَمْوَالِنَا بر خلق نازل کردۂ

کردۂ تقلید مغرب رفتۂ راہِ ہنود
لقمۂ پس خوردۂ یاراں تناوُل کردہ

شکر نعمت میکند طبل شکم از پُر خوری
ارزشِ حلوائے بہ بیماریٔ تعلّل کردۂ

اجرتِ تسوید باطل حق تست اے خوشنویس
برملا بر رغم حق تائید باطل کردۂ

متہم فاروق را کردی بایمائے ربوا
یوسفے را از دہانِ گرگ بسمل کردۂ

لبیب مہدی

دائرہ

(از مسٹر ایمرسن)

آنکھ پہلا دائرہ ہے، اس سے جو اُفق بنتا ہے وہ دوسرا دائرہ ہے، اور عالم فطرت میں اس ابتدائی شکل کی تکرار بلا اختتام کے جاری رہتی ہے۔ دنیا کے نقوش میں یہ سب سے قابلِ وقعت علامت ہے۔ سینٹ آگسٹائین نے اللہ عزوجل کی قدرت کو ایک دائرہ سے تشبیہ دی ہے جس کا مرکز ہر جگہ ہے اور جس کا محیط نامتناہی ہے۔ یہ جو اشکال میں سب سے اول ہے اس شکل کے وسیع ادراک کے متعلق ہم زندگی بھر پڑھتے چلے آئے ہیں۔ ہر انسانی فعل کو دائرہ فرض کرکے ہم ایک نتیجہ نکال چکے ہیں۔ اب دوسری تشبیہ قائم کرکے ہم یہ دریافت کریں گے کہ انسان کے ہر فعل میں یہ قابلیت موجود ہے کہ وہ اُسکے پہلے کام سے بڑھ جائے۔ ہماری زندگی صداقت کے لیے ایک قسم کی نو آموزی ہے وہ یہ کہ ہر دائرہ کے باہر ایک اور دائرہ بنایا جا سکتا ہے اور یہ کہ فطرت میں کوئی آخری سرا نہیں ہے بلکہ ہر آخر ایک آغاز ہے یعنی ہر دوپہر کے بعد ہمیشہ دوسری صبح طلوع ہوتی ہے اور ہر سمندر کی تہ میں ایک اور عمیق سمندر نکلتا ہے۔

یہ حقیقت ہر شعبہ میں انسانی قوت کے کام کرنے کی بہت اچھی مثال ہو سکتی ہے کیونکہ حقیقت ایک حد تک ذات نامحدود کے اس وجود کا تصور پیش کرتی ہے جو کامل و بسیط ہے اور جس تک انسان کی دسترس ممکن نہیں اور جو ہر کوشش و کامیابی کی تحریک دلانے والی اور پھر ناکارہ ثابت کردینے والی بھی ہے۔

عالم فطرت میں کسی قسم کا ثبات نہیں ہے۔ عالم کائنات بالکل رفتنی و گذشتنی ہے۔ استقلال کی وقعت محض خیالی وقعت ہے۔ اللہ عزوجل کے نزدیک ہمارے کرہ کی حقیقت بہتر یا قانون کی سی ہے، واقعات کے مجموعہ کی سی نہیں ہے۔ ہماری تربیت کی بنا خیالات کے غلبہ پر منحصر ہے جو شہروں اور تعلیم گاہوں کو اپنے پیچھے کھینچے لیے چلا جا رہا ہے۔ کسی خیال پر غور کرتے وقت اگر ہم دوسرے خیال پر غور کرنے لگیں تو پہلے خیالات غائب ہو جائیں گے۔ چنانچہ یونانیوں کا فن سنگ تراشی قطعی

معدوم ہو چکا ہے۔ اُسکی اب ایسی حالت ہوگئی ہے کہ گویا وہ برف کی مورتیں تھیں، جنکی کہیں کہیں ایسی نشانیاں پائی جاتی ہیں جیسے کہ ہم جون یا جولائی کے مہینے میں، پہاڑوں اور گھاٹیوں میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اِدھراُدھر پڑا ہوا دیکھا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ جس فراست نے جو باتیں اُنھیں سوجھائی تھیں اب اُسی فراست نے دوسری باتیں ہمیں اور سوجھا دی ہیں۔ یونانیوں کا علم و حکمت یہ سچ ہے کہ کچھ دنوں قائم رہا مگر اب اُس پر بھی وہی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ اور ایسی خستہ حالت میں ہے جیسی نئے خیالات نے پرانی چیزوں کی ابتر حالت کر دی ہے۔ چنانچہ نئے برِاعظم پرانی دُنیا کے کھنڈرات سے بنائے جا رہے ہیں، نئی نسلوں کا طرزِ عمل پرانی نسلوں سے جدا گانہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ نئے فنون پرانے فنوں کو معدوم کر دیا کرتے ہیں۔ پرانے اعلیٰ درجہ کے پُلوں کو دیکھو، وہ پانی میں زور پیدا کرنے کی نئی ایجادات سے بیکار کر دیے گئے ہیں مستحکم قلعوں کی، بارود کی ایجاد سے کوئی حقیقت نہیں رہی۔ بادبانی کشتیوں کی بھاپ سے چلنے والی کشتیوں کے آگے، اور بھاپ سے چلنے والی کشتیوں کی بجلی کی ایجاد کے آگے کوئی وقعت نہیں رہی۔

تم اس سنگ مرمر سے بنے ہوے مضبوط مینار کی تعریف کرتے ہو جو مدتوں سے سردی اور گرمی کے موسموں کی سختیاں برداشت کرتا چلا آ رہا ہے۔ تاہم اس بلند مینار کو کسی کے کانپتے ہوے ہاتھوں نے بنایا تھا اور حق تو یہ ہے کہ صانع، مصنوع سے ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ جو شخص جو چیز بناتا ہے وہ اُسکو بہت جلد بگاڑ بھی سکتا ہے۔ وہ نظر نہ آنے والا خیال جو مینار کے بنانے کے لیے پیدا ہوا تھا حقیقت میں وہ ہاتھ سے زیادہ بہتر اور قابلِ وقعت تھا۔ اور اس طرح ہمیشہ ایک بھدے نتیجے کے پیچھے ایک نازک سبب ہوا کرتا ہے جسکو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ خود ایک اور نتیجہ کا زیادہ نازک سبب نظر آئے گا۔ جب تک کسی چیز کا راز نہ معلوم ہو اُس وقت تک وہ پائدار ہی معلوم ہوتی ہے عورتوں کو ایک زرخیز جائداد مستقل اور پائدار معلوم ہوا کرتی ہے، وہی جائداد ایک تاجر کو ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا وہ اینٹ اور چونے سے بنائی گئی ہے اور آسانی سے فنا ہو سکتی ہے۔ شہر کے رہنے والے کو ایک باغ کی اچھی پیداوار اُسکی اچھی زمینیں غرض یہ سب چیزیں ایسی زرخیز اور مستقل معلوم ہوا کرتی ہیں جیسی سونے کی کان یا دریا۔ مگر یہی چیزیں ایک کسان کو صرف پیداوار کے ذرائع معلوم ہوا کرتی ہیں۔ عالم کائنات ہمکو نمایاں طور پر مستقل اور باثبات معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ہر چیز کی مانند ایسا معلوم ہونیکا ایک سبب بھی ہوتا ہے اور جب ایکمرتبہ یہ بات میری سمجھ میں

آ جائے تو پھر مجھے کیا یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کھیت ہمیشہ ایسے ہی سرسبز و شاداب رہیں گے؟ کیا پتوں کی یہ ہتات اسی طریقے سے قائم رہے گی؟ حق تو یہ ہے کہ استقلال اور ثبات کی خیالی وقعت ہے ہر چیز اپنی اوسط پر قائم ہے۔ روحانی قوت کے سامنے چاندی کی گنید سے زیادہ وقعت نہیں ہے۔

کسی واقعہ کو ہر ختم کرنے والا واقعہ ایک نئے سلسلۂ واقعات کا آغاز ہوتا ہے۔ ہر عام قانون کسی زیادہ جامع اور بڑے قانون کی جو آیندہ جلد ظاہر ہو جائے گا محض ایک کڑی ہوتا ہے۔ ہمارے لیے کوئی بیرونی احاطہ کرنے والی دیوار نہیں ہے۔ انسان جب اپنا قصہ ختم کرتا ہے تو وہ کیسا اچھا، کیسا محیط ہوتا ہے اور وہ تمام واقعات کی صورت کیسے بدل دیتا ہے۔ پھر بھی وہ سارے منظر پر مختتم ہوتا ہے۔ لیکن کچھ دیر نہیں گذرتی کہ دوسری طرف ایک اور آدمی نمودار ہوتا ہے اور اس دائرہ کے اطراف ایک اور دائرہ بناتا ہے جسکو ہم ابھی دائرۂ نظر کی انتہا قرار دے چکے تھے۔ تب ہمارا پہلا قصہ گو محض متقدم رہ جاتا ہے اور انسان کا جامع و معنی خیز لفظ اسکے لیے صادق نہیں رہتا اور اب اسکی تلافی کی شکل صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے حریف کے گرد ایک اور بڑا دائرہ بنا دے۔ اور حقیقت میں لوگ اسی طرح کرتے بھی رہتے ہیں۔ جو نتیجہ آج برآمد ہوا ہے اور دل و دماغ کو پریشان کر رہا ہے وہ کل ایک لفظ واحد میں کھنچ آئے گا اور وہ اصول جس سے آج معلوم ہوتا ہے کہ رموز فطرت حل ہو گئے کل وہ محض تعمیم کی ایک قابل تعریف مثال رہ جائے گا۔ آنے والے خیال میں ایک قوت ہوتی ہے جو صرف تمھارے ہی مذہب کو نہیں بلکہ تمام مذاہب حتیٰ کہ تمام قوموں کے علوم و فنون کو اُلٹ سکتی ہے اور پھر وہی قوت تمھیں ایسی جگہ کی سیر کرا سکتی ہے جسکو بڑے سے بڑے شاعر نے کبھی نہ خواب میں دیکھا ہوگا اور نہ اُسکو قلمبند کیا ہوگا۔ ہر شخص دنیا میں خود کارگر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس بات کا ایک اشارہ ہوتا ہے کہ اُسکو کس قسم کا آدمی ہونا چاہیے۔ اسی طرح موجودہ نسل سے آنے والی نسل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

گفتگو حلقوں کے ایک کھیل کے مثل ہوتی ہے۔ خموشی کی مشترکہ زمین کی جو چاروں طرف حدود ہیں اُن کا اظہار گفتگو ہی میں ہوتا ہے۔ انسانوں کی جماعتیں جس جوش و خروش سے گفتگو میں حصہ لیتی ہیں اور جس خوشی و خرمی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں، ان جماعتوں کی جانچ انکی گفتگو یا انکے خیالات سے نہیں ہو سکتی اس وجہ سے کہ کل وہ گفتگو کے اُس بلند مقام سے

پیچھے ہٹ جائیں گی۔ پھر اسکے بعد تم انھیں دیکھوگے کہ وہ اپنی پُرانی روش پر آجائیں گی۔ تاہم جو خیال ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے اس سے ہمیں ضرور محفوظ ہولینا چاہیئے۔ جب کوئی نیا مقرر کسی خیال میں کوئی نئی بات پیدا کرتا ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس سے پہلے والے مقرر کی گفتگو کی اُلجھنوں سے آزاد ہوگئے۔ یہ مقرر کوئی نئی بات اس لیے پیدا کرتا ہے کہ اپنے خیال کی بلندی میں از سر نو ہمیں اُلجھا دے۔ پھر اس خیال کی بنا پر ہم اس دوسرے نجات دہندہ کے ممنون ہوتے ہیں۔ پھر اسکے بعد ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم حق پر آگئے ہیں اور انسانوں میں ہمارا شمار ہونے لگا ہے۔ ہر صداقت کے اظہار میں، ہر زمانہ میں جیسی جیسی گہری سچائیاں اور عمل کرنے والی صداقتیں پائی جاتی ہیں ان کا کیا کہنا ہے۔ عام طور پر سوسائٹی حالت جمود و غفلت میں رہتی ہے۔ ہم خالی الذہن ہوکر اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ شاید ہم میں اچھے خیالات پیدا ہوجائیں۔ مگر حق تو یہ ہے کہ ہم قابل قدر خیالات سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ اگرچہ ہم انکو ایسا نہیں سمجھتے بلکہ انکو مذاق یا دل لگی کی باتیں سمجھا کرتے ہیں۔ اس حالت جمود میں ایک باخدا شخص پیدا ہوتا ہے اور ان بیخبر آدمیوں کو بیدار کر دیتا ہے اور اپنی نگاہ سے اس پردہ کو جلا کر خاک کر دیتا ہے جو تمام چیزوں پر پڑا ہوا تھا اور پھر تمام نمایشی چیزوں مثلاً پیالے، تشتری، کرسی، گھڑی وغیرہ کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔ وہ باتیں جو کل ہمیں بڑی باوقعت معلوم ہو رہی تھیں مثلاً جائداد، آب وہوا، اولاد، ذاتی حُسن و جمال غرض اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں۔ ان تمام چیزوں کی عجیب و غریب طریقہ سے ہیئت بدل جاتی ہے۔ جن چیزوں کو ہم پائدار سمجھے ہوئے تھے وہ متزلزل اور منتشر ہوجاتی ہیں اور علوم و فنون، شہر، آب وہوا، مذاہب وغیرہ اپنی بنیاد چھوڑ دیتے ہیں اور تمہاری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ پھر ان تمام چیزوں کے متعلق لوگ بہت احتیاط سے کام لیا کرتے ہیں۔ بحث و مباحثہ کرنا یقینی اچھا ہے مگر اس سے زیادہ خاموشی بہتر ثابت ہوتی ہے اس وجہ سے کہ بعض وقت وہ اُسے محجوب کر دیا کرتی ہے۔ گفتگو کی درازی گفتگو کرنے اور سننے والے کے درمیان خیالات کا فرق ظاہر کرتی ہے۔ اگر سننے والا کسی بات کو پہلے سے سمجھے ہوئے ہوتا تو اسکے لیے الفاظ کی ضرورت نہ ہوتی اور اگر وہ ہر اعتبار سے ہمخیال ہوتے تو پھر الفاظ کو تکلیف دینے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

محمد نجم الغنی قریشی دار الترجمہ۔ حیدر آباد دکن

بیرن کا کمرہ

میڈم ہلینا پٹروونا بلاوٹسکائی بہت سے فنون میں طاق اور ہمہ صفت موصوف تھی اور ایسی عجیب و غریب شخصیت تھی کہ میری زندگی میں کبھی نظر سے نہیں گذری۔ اُسکے مُرید فطرۃً و طبعاً اُسے علوم باطنی کی زبردست اُستاد تصور کرتے ہیں جس کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے لیکن ہم لوگوں کے نزدیک جنھیں اس سے مادی وجسمانی حالت میں واقف ہونے کا فخر حاصل ہے اسکی حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہے اور ہمارے دلوں میں اسکی تصویریں مختلف اور بہت سے امور سرانجام دیتی ہوئی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان شاذ و نادر موقعوں پر جب اُسے اپنی قدرت کا کمال دکھانا منظور ہوتا تھا وہ پیانو ساحرانہ دلکش پیرایہ سے بجاتی تھی۔ اگرچہ اُسے تکلفات سے نفرت تھی اور اکثر انھیں توڑنے کے لیے غیرضروری طور پر بیجا حرکتیں کر بیٹھتی تھی (یا ہمیں اُن دنوں ایسا ہی معلوم ہوتا تھا) لیکن جب وہ کوئی کام کرنا چاہتی وہ بس مطلق العنانی سے اُسے کرکے رہتی۔ اُسکی نظیر میری نظر سے نہیں گذری۔ ہر قسم کے مضمون پر وہ ندرت آمیز فصاحت و بلاغت کا ثبوت دیتی تھی لیکن سب سے زیادہ جس چیز پر اُسے قدرت حاصل تھی وہ علوم باطنی کی دُنیا تھی۔ اُس کا طرز بیان ظریفانہ اور حیرت انگیز تھا لیکن جب وہ کسی روح کی کہانی بیان کرتی غضب کر جاتی تھی۔

جب میں ۱۸۷۹ء میں مصر سے ہندوستان آتے ہوئے جہاز نیوریو میں اس کا ہمسفر تھا میں اُن شاموں کو بالکل فراموش نہیں کرسکتا جب ہم اُس سے کہانیاں سُنا کرتے تھے۔ ہمارے ہمسفروں کی مختلف الاقسام والالوان جماعت میں مذہبی عنصر زیادہ تھا اور ان حاملان دین میں سے بعض جاہل مطلق اور تُندخو و آشفتہ مزاج تھے جنکی اس زمانہ کے مقابلہ میں اُن دنوں بہت کثرت تھی۔ تو تو میں میں اکثر ہوجاتی تھی اور ہمیں بڑا لطف دیتی تھی۔ کیونکہ میڈم بلاوٹسکائی ان خودساختہ مقلدین ملت کی نسبت عیسائی مقدس کتابوں اور عقائد کو کہیں زیادہ جانتی تھی۔ لیکن جب وہ کھانا کھانے کے بعد شام کو بھوتوں کی کہانیاں سُنانے لگتی اُسوقت مُنکر سے مُنکر پادری بھی اُسکی سحر بیانی کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے سامعین کو مبہوت رکھتی تھی، کسی ساز کی طرح یہ لوگ اُسکی

مٹھی میں ہوتے تھے اور وہ جب چاہتی اُنکے رونگٹے کھڑے کر دیتی - میں نے بارہا دیکھا کہ جب اُسکی کوئی کہانی ختم ہوتی لوگ اِدھر اُدھر چلنے پھرنے کے وقت کئی کئی اکٹھے ہو کے نکلنے کی احتیاط برتتے اور ایک لمحہ کے لیے بھی تنہا رہنے سے احتراز کرتے تھے!

ان حالات میں ہم نے اُس سے "گونجوں کا غار" "مسحور زندگی" اور کئی کہانیاں سنیں جنکو جس کا جی چاہے اُسکی کتاب "رات کی وحشت انگیز کہانیاں" میں پڑھ سکتے ہیں - مجھے ایک دلکش کہانی یاد ہے جو اس مجموعہ میں شائع نہیں ہوئی - اگر میں اُس طرز کی جس میں اُس نے اسے ہمیں سُنایا کچھ بھی نقل کر سکوں تو میرے ناظرین کو شاید اُس کیفیت کا احساس ہو سکے جو ہماری کہانی سنتے وقت تھی - لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میری قدرت سے باہر ہے - میں نے اسے ایک مرتبہ اپنی ایک دوست کو جو ایک مشہور ناول نویسہ ہے حتی الامکان عمدہ پیرایہ میں سُنایا - اسنے اس میں خوب نمک مرچ لگایا اور اُسے زیادہ موثر اور دلکش بنانے کے لیے بعض تفصیلات میں تغیر و تبدل بھی کیا اور بہت کچھ دلفریبی اور معنی آفرینی بھی دکھائی لیکن اس بہترین نگارش میں بھی وہ ساحرانہ دلآویزی نہیں آئی جو میڈم بلاوٹسکائی کی جادو بیانی سے اُسکو نصیب ہوئی تھی - اس فسانہ نگار کے برابر بھی مجھ میں بیان کرنے کی طاقت نہیں - لیکن جو کچھ بھی ہو میں ہمت کروں گا اور جس طرح میڈم مذکور نے اُسکو بیان کیا اسکی اصلی کیفیت کو جہاں تک مجھے یاد ہے حتی الامکان ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کروں گا -

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

دو نوجوان (جنھیں ہم چارلس اور ہنری کے نام سے یاد کریں گے) فرانس کی نظر فریب سرزمین کے ایک نہایت ہی دلکش و خوشنما علاقہ میں سیر کرتے پھر رہے تھے - ایک روز شام کے قریب ہونے پر وہ ایک خوبصورت چھوٹے سے قصبہ کے سامنے جا نکلے جو ایک الگ تھلگ وادی میں بسا ہوا تھا - اسکی سرائیں، دوکانیں اور چھوٹے مکانات ایک چھوٹے سے چشمہ کے اِدگرد جھرمٹ لگائے ہوئے تھے اور اسکے مقتدر باشندوں کے بڑے مکانات اسکی احاطہ کرنے والی پہاڑیوں کے معمولی نشیبوں میں واقع تھے - دونوں دوست اس مقام کی نمایاں سرائے میں رات گزارنا چاہتے تھے - اور ان میں سے ایک موسیو چارلس کا قصبہ کے بیرونی حصہ میں ایک واقف رہتا

جس سے وہ ملنا بھی چاہتا تھا۔

گاؤں کی طرف سڑک کا ڈھلاؤ شروع ہوتے ہی ایک پُرانا مکان جو خاص طور سے خوشنما نظر آتا تھا دکھائی دینے لگا۔ یہ عشق پیچہ اور اسی قسم کی بیلوں سے قریب قریب ڈھکا ہوا تھا اور سڑک سے کچھ فاصلہ پر پیچھے کی طرف واقع تھا۔ مکان اور اُسکے وسیع میدان سے ہر جگہ غفلت ٹپک رہی تھی جس سے صاف صاف معلوم ہوتا تھا کہ مکان غیر آباد ہے اور یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی تھی کہ مدتوں سے خالی پڑا ہے۔ دونوں دوست اُسکی بیرونی صورت اور اُسکی جائے وقوع کی رعنائی سے بہت متاثر ہوئے اور ہنری جو پُرانی وضع قطع کے سامان کے جمع کرنے کا بڑا ہی شائق تھا فوراً اُن گوہرہائے مقصود کے متعلق جو وہاں پوشیدہ ہوں گے خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ چونکہ جگہ بظاہر غیر آباد تھی یہ فطرتی امر تھا کہ اُنھیں یہ خیال آئے کہ شاید وہ اسکے محافظ کو اُنھیں اسپر ایک نظر ڈالنے کے لیے آمادہ کرسکیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے قدموں کا رُخ ایک کُٹیا کی طرف کردیا۔ جس سے بھی اگرچہ عام غفلت کا اظہار ہوتا تھا اور اردگرد تروتازہ اور عمدہ نباتات کثرت سے اُگی ہوئی تھی تاہم آباد معلوم ہوتی تھی۔

اُنکی دستک کے جواب میں ایک بہت بڈھا آدمی دروازہ پر آیا۔ اُنھوں نے اس مکان کے دیکھنے کی اجازت مانگی، لیکن بڈھے نے خوش اخلاقی سے افسوس ظاہر کرتے ہوئے اُنھیں جواب دیا کہ اسکی اجازت نہیں ہے۔ وہ اس بڈھے محافظ سے باتیں کرنے لگے جسکی صورت سے اُس آدمی کی سی کیفیت ظاہر ہوتی تھی جو تنہا رہتا ہو اور کسی اپنے آدمزاد بھائی سے باتیں کرنے کا موقع ملنے سے خوش ہو۔ ہنری فوراً ساز و سامان کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ یہ پُرانا اور بہت پُرانا ہے اور ہر چیز بے چھوئی اُسی طرح رکھی ہے۔ جب بہت سال ہوئے یہ مکان آباد تھا اُسکے دل میں اسکے دیکھنے کی ناقابلِ ضبط آرزو پیدا ہوئی۔ اور اُس نے بڈھے سے حتی الامکان ملائمت سے کنایتہً کہا کہ اس عزت افزائی کے لیے میں ایک معقول نذر دینے کو طیار ہوں۔ لیکن بڈھے نے صرف یہ جواب دیا کہ نہیں موسیو! مجھے افسوس ہے کہ یہ ناممکن ہے میں آپ کی فیاضی سے فائدہ اُٹھانے پر خوب خوش ہوتا۔ کیونکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں غریب آدمی ہوں اور زمانہ میرے اوپر تنگ ہے۔ لیکن یہ تو بالکل ناممکن ہے۔

ہنری - "لیکن آخر یہ نا ممکن کیوں ہے؟ یہ جگہ برسوں سے غیر آباد معلوم ہوتی ہے - سڑک سنسان میں واقع ہے، کوئی یہاں سے گزر نہیں رہا - کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی - آپ ہمیں کمروں کی سیر کرنے کی اجازت دے کے ہمیں ممنون کیوں نہیں کرتے اور ساتھ ہی ساتھ خود بھی فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے؟"

بڈھا - "افسوس! موسیو - مجھ میں اتنی ہمت نہیں - مالک یا کارندہ کا اس میں کوئی سوال نہیں ہے جیسا کہ آپ کا خیال ہے کہ اُنھیں اسکی ہرگز خبر نہ ہوگی - بلکہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے بات ہے - اس سے کہیں بدتر بات - واقعی میں اسکی جرأت نہیں کر سکتا۔"

اس موقعہ پر اسرار کی بُو پاکے دونوں دوستوں نے بڈھے سے اصرار کرنا شروع کیا کہ وہ اسکی اصلی وجہ بتائے اور بالآخر بڑی مشکل اور منت سماجت سے اُس سے اتنا قبولوا سکے کہ "مکان بہت بدنام ہے اور اس میں ہولناک واقعے ہو چکے ہیں اور کم از کم بیس سال سے کوئی شخص اس میں داخل نہیں ہوا بجز لمبے لمبے وقفوں کے جب کارندہ آکے اس کا ایک طرح کا معائنہ کر جاتا ہے۔"

اگر ہنری پُرانے ساز و سامان کا دیوانہ تھا تو اُسے روحانی معاملات سے بھی خاص طور پر دلچسپی تھی - فوراً اُسے اس میں کسی دلچسپ کہانی کا امکان نظر آیا - چنانچہ اُس نے دریافت کیا "آپ کہتے ہیں کہ مکان کا نام نکلا ہوا ہے، تو کیا اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا آسیب ہے؟"

بڈھا - "افسوس! ہاں موسیو - لیکن یہ محض افواہ ہی افواہ نہیں ہے - اس میں تشنباک صداقت ہے۔"

اس میں شک نہیں اسکے بعد ہمارے دوستوں کو اُس وقت تک کل نہیں پڑی جب تک اُنھوں نے سارا قصہ نہ سُن لیا اگرچہ بڑی مشکلوں سے بڈھے کو اسپر آمادہ کر سکے جو اس کا ذکر کرنے سے بہت ہی گریز کر رہا تھا اور کہانی بیان کرتے ہوے کچھ کا کچھ کہ جاتا تھا - یہ ایک سیدھی سی بات تھی - آخری مالک کی زندگی نابکاری اور معصیت میں گزری تھی - جسے رندانہ عیش و عشرت اور بدمستی کی زندگی بسر کرنے، بیرحمی، خود غرضی اور شہوت پرستی کا شیطان مجسم ہونے کی شہرت حاصل تھی - بڈھے کو تفصیلات معلوم نہ تھیں - لیکن کسی نہ کسی طرح بیرن کے گناہ اُسکے آگے آئے اور اُسکے حالات نے اُس کا ایسا ناک میں دَم کیا کہ اُسے خودکشی کرنے سے نجات ملی (یا اُسکے خیال میں

اُسے چھٹکارا ہو گیا) وہ ایک روز شام کے وقت بالکل خلاف توقع پیرس سے وہاں آیا اور صبح کو اپنی بڑی کرسی میں بیٹھا ہوا اور گلا کٹا ہوا ملا۔

بڈھے نے بتایا کہ اسکے بعد کسی قسم کا بُرا اثر اس میں ظاہر ہوا اور طرح طرح کی مہیب کہانیاں پھیلنے لگیں۔ اُسے انکی اصلیت کا کچھ پتہ نہیں۔ انکو بہت برس گزرے اور وہ اصل میں اسکی سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔ اسکے خیال میں کچھ مقدمہ بازی ہوئی اور خاندان کی ساری دولت کسی طرح ہضم ہوگئی اور مکان اس خاندان کی ایک بعید شاخ میں جا پہونچا۔ بیرن کے مرنے کے بہت برس بعد مقدمہ بازی ختم ہوئی اور نئے مالک کا قبضہ ہو گیا۔ اُس وقت تک کسی نے بھی مکان کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ نئے مالک کے معائنہ کے لیے اسے چھوڑ دیا گیا۔ مالیوں کی ایک جماعت یہاں بھیجی گئی جنھوں نے زمینیں درست اور ہموار کردیں۔ نیا آقا اپنی بیوی اور چند ملازموں کے ہمراہ آیا۔ لیکن مکان میں ایک ہی رات رہ کے وہ یہ کہتے ہوے پیرس چلے گئے کہ دنیا کی کوئی چیز اُنھیں اس مکان میں پھر آنے کی ترغیب نہیں دے سکتی۔

ہنری نے اشتیاق سے پوچھا "اُنھیں کیا پیش آیا، اُنھوں نے کیا دیکھا؟"

بڈھا "جناب اسکی مجھے خبر نہیں۔ بہت سی کہانیاں ہیں لیکن میں نہیں کہ سکتا کہ کونسی درست ہے۔ اسکے بعد مالکوں نے اُسے کرایہ پر دینے کی کوشش کی۔ دو مرتبہ کرایہ دار آئے لیکن کوئی ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔ دوسرے کے ساتھ تو بڑا ہی ماجرا پیش آیا۔ اُس خاندان کی ایک عورت اسقدر ڈری کہ اُسپر دوروں کا ایک سلسلہ پڑ گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں وہ پاگل ہو کے مر گئی۔ اسکے بعد اس جگہ کو کرایہ پر دینے کی پھر کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن چار موقعوں پر اجنبی، مالک کی چٹھی کے ساتھ یہاں آئے جس میں اُنھیں مکان میں سو رہنے کی اجازت دی گئی تھی اور ہر صورت میں ہیبتناک بُرا نتیجہ دیکھا گیا۔ ان میں سے ایک نے موسیو بیرن کی طرح اپنا گلا کاٹ لیا۔ دوسرا شخص تشنج کی حالت میں مردہ ملا۔ اور باقی دو خوف و دہشت سے پاگل ہوگئے۔ اس طرح اس جگہ کی شہرت بُری ہوتی چلی گئی ہے"

ہنری "۔ میرے اچھے دوست! تم ذرا ادھر دیکھو اور جو میں کہوں اُسے غور سے سُنو۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ مجھے پُرانے سامان کا شوق ہے اور میں تمھیں اس کوٹھی کی سیر کرلینے کی

اجازت دینے پر ایک پنولین (ایک طلائی سکہ جو ۱۵ شلنگ ۱۰ ½ پنس کے برابر ہوتا ہے - محمد ظفر) دینے کو طیار رہوں - لیکن آسیب والے گھروں کا مجھے اُس سے سینکڑوں گنا زیادہ شوق ہے - اور تم نے جو کچھ بیان کیا اُس سے میرا مصمم ارادہ ہو گیا ہے کہ میں ایک رات یہاں گزاروں - اگر تم مجھے اسکی اجازت دو تو میں تم کو سو فرنیک (ایک نقرئی سکہ جو ۹ ½ پنس کے برابر ہوتا ہے - محمد ظفر) دوں گا"

بڈھا - "حضرت بات یہ ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ہے ہی ناممکن - آپ بیشک ضرور مرجائیں گے - اور میں آپ کا قاتل ہوں گا - کاش میں آپ کے کام آسکتا لیکن اسکے متعلق مجھ سے پوچھنا فضول ہے"

لیکن اس رد و قدح نے ہنری کا اصرار بڑھا دیا اور ارادہ پختہ کر دیا - اور وہ برابر اپنی پیش کردہ رقم بڑھانے اور بڈھے کو یقین دلانے لگا کہ کچھ بھی پیش آئے وہ بالکل بخیلا ہوگا - اور اگر وہ پسند کرے تو وہ اپنی کُٹیا کا دروازہ بند کر کے اندر بیٹھ رہے اور اس معاملہ میں اس سے زیادہ حصہ نہ لے کہ دروازہ کُھلا چھوڑ دے - محافظ عجب تذبذب کی بےچینی میں تھا - جو زبردست رشوت اُسے پیش کی گئی تھی وہ اسکے لیے نعمت عظمیٰ تھی اور اس سے بھی زیادہ اُس کا مشفقانہ فرانسیسی اخلاق اُسے اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ اس منت سماجت کرنیوالے اجنبی کا دل توڑے جس نے بظاہر اس تجربہ کو کرنے کی ٹھان لی تھی - بایںہمہ اس کا ضعیف الاعتقادانہ خوف اسکے لالچ سے بہت زیادہ تھا اور گھنٹہ بھر کے قریب حیص بیص کرنے کے بعد اُنھوں نے اُسے منا لیا اور اُس نے آبدیدہ ہو کے اُنھیں بیدلی سے اجازت دیدی -

وہ اب دن کی روشنی میں اُنھیں مکان کے اندر لیجانے اور بیرن کا آسیب زدہ کمرہ دکھانے پر رضامند ہو گیا تاکہ جب وہ رات کو آئیں کیونکہ اُنھیں رات کو آنا ضرور تھا (اور وہ مایوسی سے اپنے ہاتھ ملنے لگا) اُسکے دروازہ پر آواز دینے سے وہ باہر نکل کے تالی اُنکے حوالہ کر دیگا لیکن وہ اُس سے ہرگز اسکی توقع نہ کریں کہ وہ اپنی دہلیز سے باہر آئے یا اس آسیب زدہ عمارت کے قریب جائے - اس حالت میں بھی وہ بار بار کہتا تھا کہ میں ہر طرح کی ذمہ داری سے بری ہوں - آپ کی موت یقینی ہے اور میں صرف آپ کی روحوں کے لیے جناب باری میں دعا کر سکتا ہوں -

وہ اُس سے کھلکھلا کے بولے اور اُسکے کندھے کو ٹھونکا اور یقین دلایا کہ اگلے روز صبح کو ہم تمھارے ساتھ شراب کی بوتل پییں گے اور تمھارے اس دھڑکے اور وہم پر خوب ہنسیں گے لیکن ان تمام باتوں کے کہنے سے بھی وہ اسکے دل کو انکی فوری ہلاکت کے اندوہگیں تیقن سے ذرا بھی متزلزل نہ کر سکے۔ اُس نے مکان کے اوپر کی منزل دکھائی جسکے حیرت انگیز قدیم ساز و سامان کے شاندار نمونوں سے ہنری مارے خوشی کے بیتاب ہوا جاتا تھا۔ اُس نے گول کمرہ میں بیرن کی تصویر اُنھیں دکھائی۔ اُس نے نیچے کی منزل میں ایک لمبا کمرہ دکھایا جو بیرن کا خاص مطالعہ کا کمرہ تھا۔ اور وہ کرسی بھی دکھائی جس میں بیٹھ کر اُس نے خودکشی کی تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے موعودہ رقم زبردستی اُسکے حوالہ کی جو اُس نے اپنی سخت ضروریات کے باوجود کھلی بیدلی سے یہ کہتے ہوے لی کہ حضرات۔ میرے لیے یہ بڑی نعمت ہے، پھر بھی میرا دل کہتا ہے کہ نہ لوں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کی جانوں کی قیمت ہے۔ اور کسے معلوم ہے کہ یہ آپ کی غیر فانی روحوں کی بھی قیمت ہو۔ موسیو بیرن بُرے قماش کا آدمی تھا۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ اسکی بھینٹ چڑھنے والوں کو کیا پیش آئے گا؟

چنانچہ وہ اُس سے رخصت ہوے۔ اپنی طبیعت پر جبر کرنے کے باوجود اُنکے دلوں پر اسکی غیر متزلزل افسردگی اور مایوسانہ انداز کا خاص اثر تھا۔ گو وہ اُس سامنے آنے والے جان جوکھوں کے کام کے متعلق گفتگو کرتے ہوے آپس میں اس بات پر ہنستے تھے۔ اُنھوں نے اُس چھوٹے سے خوشنما قصبہ کا راستہ لیا اور اُس بارونق چھوٹی سرائے میں جو ناشتہ اُنھیں میسر آسکا بیٹھ کے وہ اُس سے تازہ دم ہوے۔ اُنھوں نے رات کے ساڑھے دس بجے اس آسیب زدہ مکان پر پہونچ جانے کا وقت مقرر کیا اور اس وقت مشکل سے چھ بجے تھے۔

ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ چارلس کے اس نواح میں چند دوست تھے جنسے وہ ملنا چاہتا تھا۔ اُس نے پہاڑی سے شہر کے اندر اُترتے ہوے ہنری کو اُنکے گھر اشارہ سے بتا دیے تھے ہنری اُن دوستوں سے واقف نہ تھا۔ اور چونکہ اُسے چند ضروری خطوط لکھنے تھے اس لیے اُس نے ملاقات کے لیے چارلس کے ہمراہ جانے سے معذوری ظاہر کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چارلس اپنے دوستوں کی طرف سے دونوں سیر کرنے والوں کے لیے نہایت پُرشوق دعوت کا پیام لیے ہوے پھر آموجود ہوا۔

لیکن ہنری نے اپنے خطوط ختم نہیں کیے تھے اس لیے اُس نے چارلس سے اکیلے ہی جانے اور اسکی طرف سے معذرت کر دینے کی خواہش کی اور خود اُسکے دوست کے مکان پر ساڑھے دس بجے پہونچ جانے کا وعدہ کیا۔ کیونکہ وہ مکان اس آسیب زدہ کوٹھی کی سمت میں واقع تھا اور سرائے سے جاتے ہوے راستہ سے یوں ہی ساہٹ کے تھا۔ یہ طے ہو کے چارلس پھر اپنے دوست کے گھر گیا۔ اس عرصہ میں ہنری نے اپنے لیے سرائے میں تھوڑا سا کھانا منگایا اور پھر لکھنے بیٹھ گیا۔

وقت پر وہ کھانے سے فارغ ہوگیا اور خط بھی پورے کر لیے۔ اُنکو روانہ کرنے کے بعد وہ ساڑھے دس بجے سے چند لمحے پہلے اُس گھر کی طرف روانہ ہوا جو چارلس نے اشارہ سے اُسے دکھایا تھا۔ لکھنے وقت اُسکے خیالات اُسکے کام پر مجتمع تھے اور اب اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ مہم جس پر وہ قدم اُٹھانے والا تھا اُسکے مطلع خیال پر عظیم الشان نظر آنے لگی اور وہ اپنے دل میں اس کا قائل ہوے بغیر نہ رہا کہ کچھ بھی ہو جیسی دلکشی اس گرمی کے تیسرے پہر کی پُرلطف آب وتاب میں نظر آرہی تھی اب رات پڑنے پر صریحًا کم خوشگوار و حوصلہ افزا دکھائی دیتی تھی۔

وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اُسکے دل میں اس سے بالکل بچ نکلنے اور اس صاف ستھری چھوٹی سی سرائے میں آرام سے بستر پر جا لیٹنے کی خواہش کچھ کچھ قائم ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن اُس نے یہ بزدلانہ خیالات اپنے دل سے ہٹائے اور خود بخود سوال کرنا شروع کیا کہ وہ کس طرح ایسے اعلیٰ درجے کے موقعہ کو ہاتھ سے دے سکتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ کس طرح ایسی خودغرضی برت سکتا ہے کہ وہ چارلس کی دلشکنی کا خیال کرے جو اپنے چُپ چاپ طریقہ میں اس مہم کا بالکل اُتنا ہی مشتاق تھا جتنا وہ خود شروع میں تھا۔ اُس نے بڑی بےچینی سے اپنے دل میں تسلیم کیا کہ وہ صاف طور سے ہول رہا تھا۔ اور اگر وہ اکیلا ہوتا تو اس ارادہ کو ضرور ترک کر دیتا۔ لیکن اُس نے سوچا کہ اپنے زیادہ بلغمی دوست کی موجودگی کے حوصلہ اور سہارے سے وہ اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکے گا۔ لیکن اُسکے خیالات باربار اُن چار بیش روؤں کے بھیانک انجام کی طرف ناگواری سے لوٹ لوٹ آتے تھے اور وہ متعجب تھا کہ اُن میں سے کسی کو بھی اتنی گھبراہٹ محسوس نہ ہوئی ہوگی جتنی اُسے ہو رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ مقررہ مقام پر پہونچ گیا۔ اور اُس جگہ اُن سیڑھیوں کے اوپر جو سامنے کے دروازہ تک جاتی تھیں ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی کے سایہ میں اُسے چارلس پہلے ہی سے اُسکا انتظار کرتا ہوا نظر آیا اور بظاہر ایک ایک لحظہ کا پابند اور اتنا شائق نظر آتا تھا کہ ذرا سا بھی وقت ضائع کرنا اسے منظور نہیں ہے۔ کیونکہ پکارے جانے کی بجائے وہ پہلے ہی دوستوں سے رخصت ہو لیا تھا اور اُس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا۔ ہنری نے پُرشوق الفاظ میں اُس صاحب سلامت کی لیکن اُسے معلوم ہوا گویا چارلس نے جیسے ہی وہ سیڑھیوں سے اُترا کچھ سُنا ہی نہیں۔ رات کچھ ایسی تاریک نہ تھی لیکن اسپر بھی اُسے اپنے دوست کا چہرہ صاف نظر نہ آسکا۔ حالانکہ اسکی طرف جھانک کے دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ اگرچہ اُسے اتنا کم نظر آیا اُسے ایسا معلوم ہوا کہ چارلس مشکل سے اپنی اصلی حالت پر تھا۔ وہ بالکل محو اور کسی خیال میں غرق اور اپنے دوست کے سوالوں کے مختصر جواب دینے میں وہ تقریباً ترش اور آزردہ معلوم ہوتا تھا۔ اُسے ہنسی خوشی کی باتوں میں لگانے کی چند فضول کوششوں کے بعد ہنری نے ہوشیاری سے اُسے اُسکی حالت پر چھوڑ دیا۔ البتہ کبھی غیر متعلق مضمونوں پر اُٹکل پچو اظہار خیال کر دیتا تھا جسکے جواب کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید اسکے دوست کے مکان پر کسی ناخوشگوار بے موقع بات نے چارلس کو برہم کر دیا ہے۔ یا شاید اُسے کوئی بُری خبر ملی ہے۔ لیکن اُس نے اس خیال سے بھی کیفیت دریافت نہیں کی کہ اس کا دوست اپنے اطمینان کے وقت خود بخود اپنا راز اُسے بتا دیگا۔ اس اثنا میں اسکے جذبات بھی کچھ خوشگوار نہ تھے۔ اسکے دل میں ہول بڑھتی جارہی تھی اور اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی چیز اسکی طاقت، اسکی ہمت، بلکہ اسکی جان ہی متواتر آہستہ آہستہ لیکن بے رحمی سے چوسے چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے کبھی اُسپر اتنا حیرت انگیز اور نا ملائم اثر نہ پڑا تھا۔

اس صورت میں اس پُر آسیب مکان تک انکا راستہ کسی قدر خاموشی سے کٹا۔ جب اُنھوں نے بڈھے محافظ کی کُٹی کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ ازسرنو معترض ہوتا ہوا اور حسرت وانذوہ ظاہر کرتا ہوا اُن سے ملاقی ہوا۔ اُس نے ان سے کہا کہ جتنا زیادہ میں آپ کے اس منصوبہ پر غور کرتا ہوں اُتنا ہی مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی طرح بھی آپ کی اس کارروائی میں حصہ نہیں لینا چاہتا۔ اُس نے یہاں تک کہا کہ انکی رقم انھیں پھیر کے واپس دینے لگا کہ میں اپنے ضمیر کو اس کے

قبول کرنے پر رضامند نہیں کر سکتا۔ لیکن ہنری نے پُر لطف اور ملائم الفاظ میں اُسے اسکے لیے رہنے پر اصرار کیا اور کہا کہ سب خیریت رہے گی اور جب ہم صبح کو صحیح و سالم ملیں گے میں اس رقم میں جو پہلے ہی معقول تھی کچھ اور اضافہ کر دوں گا۔

بُڈھے محافظ نے اس بات کو شائستگی سے رد کر دیا اور اُنھیں یقین دلایا کہ مجھے پہلے ہی بہت کچھ مل چکا ہے اور اگر تم اتنے خوش قسمت ثابت ہو کہ اپنی جانیں اور عقل و حواس سلامتی سے لے کے نکل آئے تو تمھیں صبح کو صحیح سالم اور خوش و خرم دیکھنے ہی میں مجھے بہت بڑی خوشی ہوگی۔ ہنری بڈھے کے اس تعلق خاطر سے واقعی متأثر ہوا اور رات کا رخصتی سلام کہتے ہوئے اُس نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا۔ چارلس اس تمام عرصہ میں پیچھے کی طرف رہا اور اُس نے مطلق بات نہیں کی یا کم از کم ایسی بات کوئی نہیں کہی جو قطعی ضروری نہ تھی۔ ظاہر تھا کہ اسکی افسردگی کا اثر اُس سے بالکل دُور نہیں ہوا تھا اور ہنری سخت حیران تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا تھا جسنے چند ہی مختصر گھنٹوں میں اُسکے دوست کی قلب ماہیت کر دی۔

اُنھوں نے دروازہ کا قفل کھولا اور اُس بڑے ویران گھر میں داخل ہوئے۔ اپنے ساتھ چور لالٹین لے لینے کی وجہ سے اُنھیں بیرن کے مطالعہ کے کمرہ کی طرف جانے میں کچھ دقت معلوم ہوئی۔ یہ عجیب و غریب کمرہ تھا اور مکان کے ایک سرے پر باغ کے اندر کی طرف بعض اِتنا گھر کی طرح بنا ہوا تھا جس سے یہ خیال پڑتا تھا کہ یہ کبھی بعد میں بنایا گیا ہے اور اصل نقشہ میں شامل نہ تھا۔ یہ ایک لمبا اور تنگ کمرہ تھا جس میں بہت سی فرانسیسی نمونہ کی کھڑکیاں برابر طول میں ہر جانب فرش کی طرف کھلنے والی بنی ہوئی تھیں لیکن کمرہ کا ہر ایک سرا ایک لمبے چوڑے آویزاں آئینہ سے قریب قریب ڈھکا ہوا تھا۔ اس سے ایک قابل دید منظر پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ جب کوئی کمرہ کے طول میں نظر ڈالتا تو دونوں طرف یہ غیر محدود طور پر پھیلا ہوا معلوم دیتا اور ہر ایک چیز بار بار نظر آنے سے بظاہر نا قابل اختتام سماں پیدا ہو رہا تھا۔ طرح طرح کا سامان اس کمرہ میں کثرت سے تھا۔ اور چاروں کونوں میں زرہ بکتر اس خوبی سے آویزاں کی گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسکے اندر کوئی جسم ہے۔ کمرہ کے وسط میں ایک بڑی لمبی چوڑی اور خوشنما میز تھی۔ جسکے سامنے بیرن کی کرسی تھی —— وہ کرسی جس میں اُس نے خودکشی کی تھی۔

ہمارے دوستوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ بڈھا ایک چراغ بالکل طیار انکے لیے رکھ جائے۔ اُسے اُنھوں نے آتے ہی روشن کر لیا۔ اتنے بڑے کمرہ کو بارونق بنانے کے لیے بیس چراغوں کی ضرورت تھی۔ دُور دُور کے گوشے اب بھی اتنے تاریک تھے کہ دہشت ہوتی تھی۔ کمرہ کے ہر سرے کے آئینوں میں روشنی کے غیر محدود انعکاس سے ایک عجیب ڈراؤنی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اس مقام میں گھٹی ہوئی مرطوب بدبو آ رہی تھی جیسی کہ اکثر مدت تک بند رہنے والے کمروں میں سے آیا کرتی ہے۔ ہنری کو صاف طور سے اپنے دل میں بےچینی کا احساس اور سرائے کی آرام دہ، سادہ، اُنیسویں صدی کی خوابگاہ کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔

اسکے علاوہ وہ لحظہ بلحظہ کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے بالکل وہی محسوس ہو رہا تھا جو ایک مکھی مکڑی کے چنگل میں پھنس کے خیال کرتی ہو گی جب وہ اُس کا سارا خون چوس کے اُسے خالی چھلکا کر کے چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن اس بات کے تسلیم کر لینے سے مطلب حل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اُس نے ہنسی خوشی کی گفتگو میں اپنے خوف و ہراس کو چھپانے کی کوشش کی اور چارلس کو اُسکے سکوت اور ظاہری پست ہمتی پر ملامت کرنے لگا۔ اُسے نہایت مختصر جواب ملے اور یہ ظاہر تھا کہ چارلس اب تک اپنی اُسی حیرت انگیز حالت میں تھا اور در اصل یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر فرق ہے تو یہ کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ اس میں غرق ہو گیا تھا۔ اسوقت ہنری اسے چراغ کی تیز روشنی میں صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ اسکے دل پر اسکے دوست کی عجیب و غریب ہیئت و انداز سے اور بھی زیادہ اثر ہوا۔ چارلس بھی اپنی اس حالت سے کچھ آگاہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ روشنی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس نے ایک چوکی پر اپنے آپ کو ٹپک دیا اور دیر تک بےحس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس اثنا میں وہ اپنے دوست کی پُر لطف و پُر مذاق گفتگو کے چند حرفی روکھے جواب دیتا تھا

کچھ دیر بعد یہ عجیب و غریب خاموشی و سُستی ایسی ہی عجیب بےچینی و بیقراری میں تبدیل ہو گئی۔ کیونکہ وہ اچانک چوکی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس لمبے کمرہ میں ایک طرف سے دوسری طرف اس طرح گھومنے لگا جیسے ایک وحشی جانور اپنے پنجرہ میں چکر لگاتا ہے۔ ہنری کو اگر اُس کا تخیل کسی قسم کا دھوکا نہیں دے رہا تھا وحشی جانور کا خیال محض تشبیہ سے زیادہ ہی تھا۔

یہی نہیں کہ وہ اِدھر اُدھر بے چینی سے چکر لگا رہا تھا بلکہ ایک عجیب قسم کی دبی ہوئی تندی بھی تھی جو اُسکے دوست کی بالعموم ہموار اور پُرسکون طبیعت پر کسی طرح چھا گئی تھی۔ ہنری کی سمجھ میں خود اپنی محسوسات نہ آتی تھیں اور اُنھیں لغو کہہ کے اپنے دل و دماغ سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن اِس اِدھر سے اُدھر لگاتار ٹہلنے کی دوڑ نے اُسے آخر اس قدر متوحش اور پریشان کر دیا کہ وہ مجبور ہو کے اپنے دوست سے رُک جانے کے لیے منت کرنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ موخرالذکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کم ازکم اس وقت تک کہ اُس نے اپنے الفاظ ایک دفعہ سے زیادہ نہ دوہرائے۔ اس وقت وہ ایک عجیب نیم بیصبری کی آواز کے ساتھ پھر چوکی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ چُپ چاپ سست بیٹھنے کی کوئی علامت نہ تھی۔ کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ اس پر اس وقت تک بےچینی چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ اس حالت میں چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہ سکتا تھا۔

ان تمام باتوں نے اب ہنری کو حقیقۃً مضطرب کرنا شروع کر دیا۔ اُسے معلوم ہونے لگا کہ معمولی فکر و استغراق اس تبدیلِ حالت کی پوری وجہ نہیں ہوسکتا۔ اُسے اندیشہ ہوا کہ اُسکا دوست کسی عارضہ میں مبتلا ہوگیا ہے۔ اس وقت وہ دل سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میں اس دہشتناک معاملہ پر اس قدر شوق کا اظہار نہ کرتا کیونکہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے اپنے دوست کی امداد و موجودگی کے سہارے پر اُس نے اسکو بخوبی انجام تک پہونچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اور اب یہ مدد کچھ عجب طریقہ سے مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ بہرحال آدھی رات کے وقت جبکہ بیرن کا آنا ظاہر کیا جاتا تھا اب تیزی سے قریب آتا جا رہا تھا اس نے ٹھان لی کہ اس جادو بھری گھڑی کے گذرنے کے بعد جس قدر جلد مناسب و ممکن ہوا وہ اپنے دوست کو باحتیاط تمام سرائے کو نکال لے جائے گا اور وہاں اُسے بستر پر لٹا دے گا اور اگر صبح تک اُسکو افاقہ نہ ہوا تو وہ گاؤں کے طبیب سے مشورہ کرے گا۔

اس اثنا میں چارلس کی بیخودی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ وہ پھر کھڑا ہوگیا اور اُس پر وہی عجیب و بی دبی حملہ آور رفتار آ گئے اور پیچھے کی طرف شروع کردی۔ اور اب اُس نے اپنے دوست کے فقروں سے کان بالکل بہرے کرلیے اور اپنا سارا زور اس پُراسرار اور لگاتار چہل قدمی میں لگا دیا۔ ہنری نے جب اسے غور سے دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُسکا چہرہ بھی

بول رہا ہے۔ اسے اس موقعہ پر ایک روحوں کی بیٹھک کا واقعہ یاد آگیا جس میں اُس نے معمول کے اثر پذیر ہوتے ہی اُسکے چہرہ کو وقتاً فوقتاً بدلتے دیکھا تھا۔ خود اسکی وحشت اور گھبراہٹ نا قابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اور اگرچہ اسکے دوست کے حیرت انگیز ترشرو انداز کی وجہ سے کسی سمجھانے بجھانے یا دخل دینے کی مطلق گنجائش نہ رہی تھی لیکن اس نے سوچا کہ اسے ایک مرتبہ اور ٹوک کے اس خطرہ کی کیفیت کو دُور کرنا چاہیے۔ لیکن جیسے ہی اُس نے جی کڑا کرکے بولنا چاہا، چارلس اچانک بیٹھ گیا، اُس چوکی پر نہیں جس پر اُس نے شروع میں بیٹھنا پسند کیا تھا بلکہ میز کے سامنے کی بیرن والی کُرسی پر۔ وہاں وہ نہایت سُست اور بالکل ساکت و صامت بیٹھ گیا، اور اپنی آنکھوں پر روشنی کی طرف سے سایہ کر لیا۔

ہنری نے چلاّ کے کہا "اُٹھو بھئی اُٹھو! کیا بھول گئے، یہ وہی کُرسی ہے جس میں کہا جاتا ہے بیرن بیٹھا کرتا ہے۔ اور (اپنی گھڑی دیکھ کے) اب اُسکے وقت مقررہ میں چند ہی لمحے رہ گئے ہیں!"

لیکن چارلس نے ذرا توجہ نہ کی اور بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اضطراب سے بے اختیار ہو کے ہنری اُسکی طرف لپکا اور اُسے کندھے سے ہلا ہلا کے چیخ چیخ کے کہنے لگا "خبردار ہو، ہوشیار ہو! آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے؟"

اسکے بولتے بولتے باہر کے کنگرہ کے بڑے گھنٹہ نے رات کے بارہ بجانا شروع کر دیے۔ ایک اچانک آواز نے، ایک قسم کی دبی دبی ٹوٹنے کی آواز نے، جو کچھ اسکی سمجھ میں نہیں آئی اسکی توجہ کو کمرہ کے ایک سرے کی طرف ہٹا لیا اور جیسے ہی اُسکی نظر بڑے آئینہ پر پڑی اس نے اُس میں اپنا اور چارلس کا باہمی عکس اپنے قریب کی میز کے بڑے لمپ کی روشنی میں نہایت منور و روشن دیکھا۔ اس نے اپنی بوکھلائی صورت دیکھی اور چارلس کو اپنا چہرہ اپنے ہاتھ سے سایہ کیے دیکھا۔ لیکن آئینہ میں نظر ڈالتے ڈالتے دوسری صورت نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور خوف اور گھبراہٹ کے تصادم میں اُس نے معلوم کیا کہ جس چہرہ کا اس میں عکس پڑ رہا تھا وہ مطلق اسکے دوست کا نہ تھا۔ یہ بیرن کا چہرہ تھا، بالکل وہی جو اُنھوں نے اسکی تصویر میں دیکھا تھا۔ اور وہ ایک دفعہ پھر اپنے گلے پر اُسترا پھیرنے کی حالت میں نظر آ رہا تھا۔!

دہشت سے چیخ کے ہنری نے اپنی نظریں آئینہ سے ہٹائیں اور اپنے ہاتھ کے نیچے کی صورت کو دیکھنے لگا جو بلا شبہ اسکے دوست کی نہ تھی بلکہ بیرن کی شکل تھی، جو اُسکی طرف زہرخند بہ باطنی کی ابلیسانہ کچلچی سے دیکھ رہا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اس نے خون کی ایک دھار اپنے ہاتھ پر پڑتے محسوس کی۔ ہنری کو معلوم ہوا کہ اُسکے دماغ کے اندر کوئی چیز جگہ سے ہل گئی اور وہ بیہوش ہوکے زمین پر گر پڑا۔

آخر اُسکے کندھے پر ایک ہاتھ، تھرتھراتے ہوے ہاتھ کے پڑنے سے اور یہ سوال کرتی ہوئی ایک متفکر آواز سے آنکھ کھلی: "آپ کا دوست کہاں ہے؟"

چند لحظے وہ اس قدر مبہوت رہا کہ اُس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ لیکن کچھ دیر بعد اس نے پراگندہ ہوش و حواس قائم کیے اور اپنی حالت کا اندازہ لگایا۔ اُس نے اپنے آپ کو بیچ کی میز کے پاس بیرن کے کمرہ کے فرش پر پڑا پایا اور بڈھا محافظ بوکھلائے اور گھبرائے ہوے چہرہ کے ساتھ اُسپر جھکا ہوا تھا۔ اُس نے پھر پوچھا "حضرت! آپ کا دوست کہاں ہے؟ دوسرے صاحب کہاں ہیں؟"

گذشتہ شب کے مہیب واقعات ایک رَو کے ساتھ اُسکے دماغ میں عود کر آئے اور وہ بیٹھ کے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ واقعی چارلس وہاں نظر نہ آتا تھا۔ نہ وہاں اُس بھیانک صورت کا کچھ پتہ نشان تھا جس نے بیرن کی خودکشی کا سماں دوبارہ دکھایا تھا۔ وہ بڈھے کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اُس نے سنبھل کے اپنی داستان سنائی۔ بڈھے محافظ نے فریاد و واویلا شروع کی اور بدحواس ہوکے ہاتھ ملنے لگا اور بار بار کہنے لگا کہ مجھے شروع ہی سے معلوم تھا کہ اس مجنونانہ فعل کا نتیجہ بُرا نکلے گا۔ اور اپنے آپ کو نہایت سخت سُست کہنے لگا کہ میں کیوں اس معاملہ میں شریک کار ہوا۔ خواہ نہایت بعید اور بلا واسطہ طریقہ سے ہی کیوں نہ ہوا ہوں۔ وہ چلایا کہ یہ ہے عجیب اور اندیشہ ناک بات کہ آپ کا دوست اس طرح غائب ہو گیا"۔

ہنری "بیشک ہمیں اُسکو اس مکان میں ڈھونڈھنا چاہیئے۔ وہ خوفزدہ ہو گیا ہوگا۔ وہ بھاگ کے کہیں چھُپ گیا ہوگا۔ وہ میری طرح کسی اور کمرہ میں بیہوش ہو گیا ہوگا۔ آؤ تو ہم اُسکی

تلاش کریں۔"

بڑھے نے پوچھا "لیکن تم بھی تو صاحب زخمی ہو رہے ہو۔ کیا نہیں ہو؟"

ہنری: "نہیں تو۔ مجھے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ مجھے نہایت کمزوری اور کپکپی معلوم ہو رہی ہے۔"

بڈھا: "لیکن اپنے ہاتھ کو تو دیکھو۔ یہ خون میں سنا ہوا ہے۔!"

ہنری نے نہایت پریشان ہو کے دیکھا کہ واقعی یہی بات ہے۔ بیرن یا چارلس (مطلق سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا اصلیت تھی) کا خون خودکشی کے اعادہ کے وقت اسکے ہاتھ پر بہ کے گرا تھا۔ اور وہ خون اس ہیبتناک منظر کی حقیقت سے کہ یہ المنظر شہادت کے طور پر قائم تھا۔

اُس نے بڈھے سے چلا کے کہا "پانی لاؤ۔ فوراً پانی لاؤ۔ ورنہ میں اپنا ہاتھ کاٹ پھینکوں گا۔"

بڈھا پاس کے کنوئیں سے پانی کا پیالہ بھر کے لایا اور اُس نے فوراً ان منحوس دھبوں کو دُور کیا۔ گو وہ پانی میں معمولی طور پر جاتے رہے، گو دیکھنے میں وہ غائب ہو گئے، اُسے یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ ابھی اُسی طرح موجود ہیں۔ گویا اُس کا ہاتھ پھر پاک ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ چونکہ بہت کمزور تھا وہ آہستہ آہستہ اُس قدیم مکان کے ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں گھستے چلے گئے کہ چارلس کا کچھ بھی پتہ نشان چلے لیکن بیکار۔ اُنھیں اپنے وہی نقش قدم خاک میں معلوم ہوئے جو ایک روز پہلے اسکے مکان دیکھنے کے وقت بنگئے تھے۔ اُنھیں اور کوئی نشان نہیں نظر آیا۔ اور اُس مفقود الخبر شخص کا کسی قسم کا کوئی کھوج نہ ملا۔ بڈھے نے خائفانہ چلا کے کہا "بس اُسے وہ بھتنا اُٹھالے گیا ہے!"

اُنھوں نے باغوں کے قریب ترین حصہ میں ڈھونڈھا لیکن ہنری کی طاقت نے جواب دیدیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا کیونکہ اُس نے پہلے شہر میں واپس جانے اور کچھ تحقیقات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن بڈھے سے رخصت ہونے سے پہلے وہ اُس کی طرف مخاطب ہو کے مؤثر پیرایہ میں کہنے لگا "تم رنج نہ کرنا۔ تم نے حق کے سوا کچھ نہیں کیا۔ تم نے اول سے آخر تک ہمیں اس مجنونانہ حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن ہمارے کانوں پہ جوں نہ رینگی۔ اگر

اس سے ہمیں کچھ نقصان پہونچا تو تمہارا اس میں کیا قصور - خدا جانے میرا دوست کہاں ہے - پچھلی رات کے واقعات میری عقل سے بالکل باہر ہیں لیکن جیسا کہ تمہارا خیال ہے میں مطلق یہ باور نہیں کرتا کہ میرے دوست کو وہ بھتنا اٹھائے گیا ہے - اگر اس نے وہی دیکھا جو میں نے دیکھا ——— لیکن وہ یہ کیسے دیکھ سکتا تھا جب خود اس نے یہ باتیں کیں ؟ میری سمجھ میں آتا ہی نہیں - لیکن وہ ڈر گیا ہو وہ بھاگ گیا ہو - شاید میں اسے ڈھونڈھ نکالوں - اُمید تو مجھے یہی ہے لیکن کچھ بھی ہو تم اسکی تسلی رکھو - تم نے کم ازکم کوئی بھی ایسی بات نہیں کی جس پر تم اپنے آپ کو برا بھلا کہو - میں خود بھی پچھلی رات کے واقعہ کی ذرا سی بھی بھنک کبھی کسی کو نہ دوں گا تا وقتیکہ میں اپنے دوست کے ہی فائدہ کی خاطر مجبور ہو جاؤں - میں اب گانوں میں جاؤں گا - یہاں سے جانے سے پہلے اگر مجھے کوئی خبر ملی تو میں تم سے ضرور مل کے جاؤں گا -

یہ کہہ کے اس نے بڑھیے سے ہاتھ ملائے اور اسے کسی قدر سکون میں چھوڑ کے رخصت ہوا جب وہ قصبہ کی طرف جا رہا تھا اُسکے دل میں وحشت بھرے خیالات آرہے تھے - اس وقت مسلسل خیال آرائی یا استدلال کی اس میں اہلیت نہ تھی اور حقیقت میں یہ بات ایک پریشان کن خواب تھی جس نے عقل کو بیکار کر دیا تھا - اُسے یہ بھی تو خیال نہ آتا تھا کہ اُسے اب کیا کرنا چاہیئے آیا اپنے دوست کے غائب ہو جانے کے متعلق حکام کو مطلع کرے یا کیا - کسی مفید نتیجہ پر پہونچنے سے پہلے ہی سرائے آگئی اور وہ چپ چاپ کسی کی توجہ اپنی طرف کیے بغیر اپنے کمرہ میں چلا گیا - وہ چارلس کے کمرہ میں گیا لیکن وہاں بھی اس کا کچھ پتہ نہ تھا - اور نہ بستر پر سونے کے آثار تھے - ہنری اپنے کمرہ میں واپس آگیا اور ایک پلنگ پر گر پڑا کیونکہ اُسے یہ محسوس ہوا کہ سب سے زیادہ اُسے آرام و سکون کی ضرورت ہے ——— اس حیرت انگیز اور ہیبت ناک حادثہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت مہیا کرنے سے پہلے اُسے سو لینا چاہیے - اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کرنا ضرور چاہئے اور وہ بھی فوراً - پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا اور نہ اُسے یہ خبر تھی کہ آخر کیا کرنا چاہیئے ؟ وہ جانتا تھا کہ اُسے نیند کی ضرورت ہے - اس پر بھی اس کا فکر اسے سونے نہیں دیتا تھا - اس حالت میں وہ کچھ دیر تذبذب آمیز حیرت میں پڑا رہا کہ دیکھیے آخر ان سب باتوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے -

اس کا تھکا ماندہ جسم غنودگی کی طرف قریب قریب مائل ہوتا جا رہا تھا کہ اچانک دروازہ

چوپٹ کھل پڑا اور اُسکے سامنے چارلس اپنے معمولی لباس میں کھڑا اُسکی طرف ٹھیک اس طرح دیکھ رہا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں -!

ہنری وحشت و بوکھلاہٹ میں کچھ بے مطلب اور بے جوڑ الفاظ چیخ چیخ کے کہتا ہوا فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے حیرت زدہ چارلس کی طرف لپک کے اس کا بازو یہ دیکھنے کے لیے پکڑ لیا کہ کیا واقعی وہ چارلس ہی ہے یا یہ اسکے نیم مجنون دماغ کا ایک وہمی کرشمہ ہے؟

چارلس "ارے میاں، خدا کے لیے بتاؤ تمھیں یہ ہو کیا گیا ہے؟ کیا بات ہے کیا بات ہے؟"

ہنری "الٰہی تیرا شکر! سچ مچ تم ہی ہو اور تم پھر بھلے چنگے نظر آئے لیکن میں تم سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ جب تم اس پر اسرار طریقہ سے گم ہو گئے تو تم پچھلی رات کہاں گئے اور تمھارے ساتھ کیا پیش آیا؟"

چارلس "گم ہو گیا! اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟ میں تم سے چھ بجے جیسا کہ تمھیں معلوم ہے رخصت ہوا اور تمھیں میرے دوست کے مکان پر ساڑھے دس بجے آنا تھا لیکن تم بالکل نہیں آئے اور میں واقعی تمھارے لیے نہایت متفکر تھا۔"

ہنری "بالکل نہیں آئے! کیا معنی؟ میں قطعی آیا - میں تم سے ملا ——————"

چارلس (بات کاٹ کے) "کیا! تم مجھ سے ملے؟ لیکن جب میں اس سرائے سے چھ بجے چلا گیا - اسکے بعد تم مجھے نظر آئے ہی نہیں - اس میں کچھ اسرار ہے اور تمھاری صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیبت ناک ہے - اب بیٹھ کے مجھے سارا ماجرا سناؤ۔"

ہنری "سناتا ہوں - لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے رات کہاں گزاری؟"

چارلس "بلا شبہ اپنے دوست کے مکان پر - اپنے ارادہ کے مطابق اپنے دوست کے ساتھ کھانا کھایا - لیکن سوءِ اتفاق سے کھانے کے بعد مجھ پر خفیف سی غشی طاری ہو گئی - کوئی بڑی بات نہ تھی، قطعی نہیں، لیکن رہی کچھ دیر، جسکے بعد مجھے کمزوری معلوم ہوئی اور میری طبیعت گھبری جاتی تھی - میرے دوستوں نے اصرار کیا کہ ان حالات میں مجھے اپنی اس کارروائی کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیے بلکہ سرائے میں بھی واپس نہ جانا چاہیے تا وقتیکہ میں رات بھر آرام نہ لے لوں - اُنھوں نے محبت آمیز طریقہ سے بہت تعلقِ خاطر اور بڑی شدّ و مد کا اظہار کر کے مجھے گھیر لیا - سب نے

اپنے ایک فالتو کمرہ میں بستر پر لٹا دیا اور مجھے مقویات دیں اور میری تشفی کی کہ جب تم آؤ گے وہ تمھیں سارا ماجرا کہہ سنائیں گے اور اگر میں اُسوقت تک جاگتا ہوا تو وہ تمھیں میرے بستر کے پاس لے آئیں گے۔ لیکن تمھارے آنے کے وقت سے کہیں پہلے میں اُنکی دوا کے اثر سے سو گیا۔ میں صبح تک سوتا رہا اور جب جاگا تو میری طبیعت بالکل تر و تازہ، بحال اور درست تھی۔ جب یہ سُنا کہ تم آئے ہی نہیں تو مجھے فکر ہوا کہ کیا وجہ ہوئی۔ اس لیے میں جس قدر جلد ہو سکا یہاں سرائے میں آیا ہوں اور اب تمھارے سامنے ہوں! میں تمھاری داستان سُننے کے لیے بیتاب ہوں"۔

ہنری نے جہاں تک ہو سکا اچھی طرح اس واقعہ کو بیان کیا اور چارلس اس اثنا میں حیرت و استعجاب کی آوازیں نکالتا رہا۔ اسکے بعد اُنھوں نے قیاس دوڑا کے کوئی نتیجہ قائم کرنا چاہا کہ اصل میں ہوا کیا۔ اتنا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُس خوفناک بیرن نے کسی طرح اُنکا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ سہ پہر کو اُنکے اُس کا مکان معائنہ کرتے وقت شاید وہ بے نظر آئے اُن کے ساتھ ساتھ رہا اور اُس نے ہنری کو خود اسکے دوست کی جگہ لے کے جس کی رفاقت اور امداد کے بھروسہ پر اسے اپنی تدبیر کو عمل میں لانے کی اُمید تھی وہ جگہ دینے کی ٹھان لی جو بہت خوبی سے اسکی ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔ شاید بیرن نے ہی چارلس کی طبیعت ناساز کر دی ہو۔ بہر حال اُس نے اُس کا روپ بھر کے اس سے فائدہ اُٹھانے کا بلا شبہ تہیہ کر لیا۔ اور یہ بھی اُتنی ہی یقینی بات ہے کہ اُس نے اتنی دیر اپنی مادّی صورت ہنری کی قوت سلب کرتے رہنے سے قائم رکھی۔

اس واقعہ کا نرالا وحشت آمیز و ہیبت ناک پہلو یہی تھا کہ ہنری کے غیر معمولی طور پر ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اور وہ اپنے دوست کی موجودگی اور مدد کے بغیر ہرگز اس تجسس میں نہ پڑتا اور عین اس نازک موقعہ پر جب سب سے قطع نظر اس مدد کی ضرورت تھی وہ دوست خود بھتنا ہی ثابت ہوا! وہ گھنٹوں تک اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے لیکن وہ اس سے زیادہ اور کوئی نتیجہ نہ نکال سکے۔ ایک بات پر البتہ دونوں بالکل ہم آہنگ تھے کہ اب بیرن کے کمرہ کا راز اس سے زیادہ معلوم کرنے اور ٹٹولنے کی اُنھیں مطلق خواہش نہ تھی۔

باایں ہمہ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُن کا فرض ہے کہ اپنے نیکدل بڈھے دوست محافظ سے ملنے کے لیے اُسکی کُٹیا پر ایک دفعہ اور ہو آئیں اور اس عجیب و غریب سانحہ کے نتائج کے متعلق اُسکے

دل کو کیسو کر آئیں لیکن اُنھوں نے اتنی احتیاط برتی کہ وہ وہاں سے ٹھیک دوپہر میں گئے اوراب اُنھیں اُس مہلک مکان میں دوبارہ جانے پر دُنیا کی کوئی چیز آمادہ نہ کرسکتی تھی۔ بڈھا محافظ نہایت مایوسی میں ڈوبا پڑا تھا۔ لیکن جب اُس نے دونوں کو صحیح و سالم دیکھا تو وہ خدا کا بڑی گرمجوشی سے شکرادا کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ میرے دل پر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔ کیونکہ میں صبح سے یہ خیال کررہا تھا کہ میں پچھلی رات کے واقعات میں حصہ لینے کی وجہ سے کبھی اپنے آپ کو بری الذمہ نہیں سمجھوں گا۔

اُنھوں نے اُسے اپنی داستان سُنائی کیونکہ اُنھوں نے خیال کیا کہ یہ سب کچھ اسکی بدولت ہے۔ اُنھوں نے خاصکر اُس سے یہ پوچھا کہ تم نے پچھلی رات کو موسیو چارلس کو دیکھا تھا؟ اور کیا تم نے اُس میں کسی قسم کا فرق پایا؟ لیکن بڈھے نے کہا۔ نہیں۔ میں نے خصوصیت سے دوسرے صاحب کو نہیں دیکھا۔ اب میں جو سوچتا ہوں تو واقعی یہی بات ہے کہ موسیو چارلس روشنی کی طرف سے جو دروازہ میں سے نکل رہی تھی پیچھے کو ہٹ کے کھڑے تھے لیکن انکی طرف میں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ کیونکہ خود میرے دل کی کچھ عجیب مضطرب حالت تھی۔ یہ کہکے وہ پھر خوشی کے مارے اطمینان اور تسلی کے الفاظ کہنے لگا کہ آخر کار میری جان پر کوئی خون نہ رہا کیوں تم دونوں صحیح و سالم ہو۔

اُنھوں نے اُسے کچھ اور انعام دیا اور جب اُس نے انکار کیا تو اُسے اطمینان دلایا کہ جو تجربہ ہمیں ہوا ہے ہمارے لیے اسی قیمت کا ہے۔ لیکن گو اس عجیب کارروائی کی وجہ سے اُسے بہت سا مال ہاتھ آگیا تھا، اُس نے نہایت متانت اور سچے دل سے قسم کھائی کہ خواہ کچھ بھی ہو اب میں کبھی راتھس چائلڈ کی تمام دولت کے معاوضہ میں بھی بیرن کے کمرہ میں کسی کے ایک رات بسر کرنے پر رضامند نہ ہوں گا۔

محمد ظفر

فلسفۂ فطرت

دنیا میں جہاں تک انسانوں کی پہونچ ہے، اُن حصوں کا ایک سطحی علم ہمیں بتاتا ہے کہ سب کی تقسیم ہوا، سمندر، اور ٹھوس زمین میں کی جا سکتی ہے۔ علم حکمت کے شیر خواری والے زمانہ میں پرانے لوگ سمجھتے تھے کہ عنصر چار ہیں۔ آگ، ہوا، مٹی اور پانی۔ مگر زمانہ موجودہ کی بے مثال ترقیاں پکارے گلے چلا رہی ہیں

ہو چکا ہے آج تک سر سٹھ عناصر کا ظہور آپ آب و باد و خاک و نار رہنے دیجیے

فلسفۂ فطرت کی تلاش (جس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ تمام موجودات کی عالمانہ دیکھ بھال کی جائے) ہر پہلو سے ہر واقعہ سے شروع کی جا سکتی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں وہ تمام نئی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں جو اس صیغۂ معلومات میں انسانی دماغ کی سرگرم کوششوں کا ماحصل ہیں۔ مگر جب ہم خوشیوں بھری فہرست میں اپنا "نقطۂ آغاز" منتخب کرتے ہیں تو سب سے اچھا یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی بہترین، حقیقی، اور منطقی سلسلہ کے دوش بدوش چلیں۔

وہ تمام ترقیاں جو ہمارے وقت میں فلسفی حضرات نے کی ہیں۔ جنھیں ہم سمجھتے ہیں، جنکی تعریفیں کرتے ہیں۔ سب کی سب محض علم حکمت کے زبردست بنیادی اصول کے صاف ستھرے حس و ادراک کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ تمام چیزوں کی ایسی عام فہم تفصیل نہ تو صرف عقلی نقلی دلیلوں سے ممکن ہے نہ انسان کی بے بس ذہانت سے ہو سکتی ہے۔ بلکہ محض سچے سچے نظری واقعات کی دیکھ بھال، اُنکی پوری تشریح کر سکتی ہے۔ ہمارے لیے یہی واقعات شروع شروع میں "عنوان اور سرخی" کا کام دیتے ہیں اور علم و حکمت کے دور دراز ممالک میں محض ان کا حوالہ دے دینا کافی ہوتا ہے۔

کبھی تو انکی مشابہت اور کبھی انکے اختلاف کا حوالہ ایسی پیچیدہ باتوں پر کافی روشنی ڈالدیتا ہے جو بغیر اس ترکیب کے نامکمل، بے ترتیب، اور سمجھ سے باہر رہ جاتیں۔ نقاش فطرت نے تمام مادّی موجودات کو ہمارے لیے عجیب سلیقہ سے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جن میں

اکثر مخصوص خط و خال بھی موجود ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ "اصل مادہ" ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اسکے کافی سے زیادہ نمایاں ثبوت زمین والے مٹیلے غلاف کے وہ رنگین دھبے ہیں جنھیں ہم پہاڑ، وادی، یا ساحل کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور جن کی اصلی حالت و صورت میں صدیوں تک ذرا بھی تبدیلی نہیں آتی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ "بادِ بسیط" ہی اکیلی وہ چیز ہے جو خود بھی جلد جلد بدلتی رہتی ہے اور بظاہر یا دریں وہ تمام تبدیلیوں کا سبب ہوتی رہتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہی چیز دو مرتبہ ایک ہی شکل میں ہمارے سامنے آ جائے۔ کیونکہ بادِ بسیط کی سیماب مزاج ہوائیں ہر وقت کچھ سے کچھ ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس میں ہر ممکن رنگ روپ کے بادل ہر وقت تیرتے رہتے ہیں۔

حقیقۃً یہی بادِ بسیط تمام ارضی نقل و حرکت کی اصل اور وجہ ہے۔ سمندر والے طوفان صرف ہوا والے طوفان سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ دریا کی رفتار بھی انھیں تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو فضائی ہواؤں میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ انھیں تبدیلیوں سے جو جو فائدے حاصل ہوتے رہتے ہیں اُن کا احاطہ و شمار لفظوں میں ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی ہمارا فضا ان تمام ان گنتی رنگ روپ والے مخلوق کی "جائے پیدائش" ہے جو دنیائے حیوانات و نباتات میں موجود ہیں۔ انھیں فضائی ہواؤں سے ایسے سامان مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے شاداب پودے اپنے مختلف ڈھانچے اختیار کر لیتے ہیں اور یہی وہ چیز ہیں جنکی مدد سے ہر قسم کے حیوان پردہ در پردہ میں اپنی غذائیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہوائیں روزی رساں ہیں۔ زندگی کی آس اور حیات کا سہارا ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر حیوان کے وجود میں ہر گھڑی لگاتار تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو آخر میں موت کی زنجیر بن کر اُنکے جسموں کو کچھ سے کچھ کر دیا کرتی ہیں۔ یہی ہوائیں اُن سڑے گلے ہوئے جسموں کے جوہر کھینچ لیتی ہیں اور اُنکو "داشتہ آید بکار" سمجھ کر محفوظ رکھتی ہیں۔ ہمارے زمانہ کی بہترین پرتال یہ ہے کہ یہی جوہر (جو برباد جسموں سے مل جاتے ہیں) انھیں کا استعمال ہرے بھرے پودوں کو نشو و نما دیتا ہے اور اُنکی بقاء و حیات کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

اب یہ بات طے سمجھیے کہ "اصل جوہر" کبھی برباد نہیں ہوتا۔ دنیا ایک چرخی ہے اور "جوہر" اس چرخی میں اس انداز سے چکر لگایا کرتے ہیں کہ کبھی دھانی پودوں میں رنگ و بو ہو کر رہتے ہیں کبھی چالاک حیوان میں ہوش و تمیز بن کر بسر کرتے ہیں یہی جوہر فضائی ہواؤں سے آتے ہیں اور پھر انھیں میں واپس ہو جاتے ہیں۔

اکیلی یہی باتیں نہیں، کہ ان ہواؤں کا سہانا رنگ آسمانی ہے۔ جسے کم نگاہ حضرات آسمان کہتے ہیں؛ یا ان میں رات بھر نورانی قمقمے جگمگاتے رہتے ہیں، یا ان پر چلتی پھرتی ہوئی بدلیاں چھائی رہتی ہیں جو فضائی نظارہ کو اتنا خوبصورت بنا دیتی ہیں کہ ان کا ہر رنگ نگاہوں میں کھب جاتا ہے ہر انداز، دل میں اتر آتا ہے یا اُن میں ایسے زبردست نسبتی رشتے موجود ہیں جن کا خاص تعلق موت و حیات کے واقعات سے ہے جو فہیم و عقیل طالب علم کی توجہ کو مبذول کر لیں بلکہ اُنکا تعلق ہمارے روزمرہ کے معمولی واقعات سے اتنا زیادہ ہے کہ ہم کو خواہ مخواہ ان کا بیان ذرا اور تفصیل کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔

"علم الحیات" جاننے والوں نے پتہ لگا لیا ہے کہ فضائی ہوائیں ہماری زمین کو ہر طرف سے پچاس میل کی دبازت سے گھیرے ہوئے ہیں گو زمین کے زبردست تودہ کے مقابلہ میں انکی جسامت ایسی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے کہ ہر پہلو سے زمین کا عین وسط قریب قریب چار ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان ہواؤں کی دبازت اس زبردست فاصلہ کے اعتبار سے صرف اٹھارویں حصہ کے برابر ہے۔

اگر ہم اٹھارہ انچ کے گولہ پر فضائی ہواؤں کی جسامت دکھانا چاہیں تو انکی گہرائی ایک بٹے دس ($\frac{1}{10}$) انچ سے بھی کم رہ جائے گی۔ دیکھ بھال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فضائی ہوائیں کم تعداد میں قطعی بے رنگ، بالکل اجلی نرمل صاف و شفاف ہوتی ہیں۔ اور پانی یا ٹھوس چیز کے مقابلہ میں بہت ہلکی ٹھہرتی ہیں۔

کیمیا والوں نے ثابت کر دیا ہے کہ "ہوا" کوئی خاص عنصر نہیں ہے (جیسا پرانے زمانہ والے حضرات خیال کرتے تھے) بلکہ اس میں بہت سے اور مادے بھی شامل ہیں، اس وقت ہمارے لیے صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ ان میں دو خاص طرح کے جوہر موجود ہیں۔

۱۔ آکسیجن : وہ خاص جزو جو زندگی و روشنی کے لیے لازمی ہے۔

۲۔ نائٹروجن : شورہ والا مخصوص جزو۔

انکے علاوہ دوسرے نسبتی اجزاء بھی کم کم تعداد میں موجود ہیں۔

(الف): وہ جزو جسکی مدد سے دہکتے ہوئے کوئلوں سے تیزابی نمک نکالا جاتا ہے

(ب): پانس سے حاصل کی ہوئی "بھاپ"

فلسفۂ فطرت والوں کے نزدیک "بادبسیط" ہر قسم کی ہواؤں کا گلدستہ (مجموعہ) ہے اور اس میں اُن سب کے خاص خاص اجزاء تمام و کمال انداز سے مخلوط و محفوظ رہتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر انفرادی ہوا میں کوئی نہ کوئی نمایاں خاصیت امانت کی ہوئی ہے مثلاً بعض پیلی ہوتی ہے بعض آسمانی۔ کسی کا رنگ بیر بہوٹی کی طرح لال ہوتا ہے کوئی ہلکے سرخ رنگ کی ہوتی ہے۔

ہمارے نزدیک بادبسیط کی سب سے پہلی خصوصیت یہی ہے کہ اسکی حبامت معینہ حد سے کم کی جا سکتی ہے۔ اس میں بلا کی لچک ہے، غضب کا لنگر ہے۔ ان دونوں صفتوں کی ایک سہل سی مثال ملاحظہ فرمایئے۔

اگر ہم شیشے کی ایک لمبی نلکی لے لیں۔ جسکے اوپری سرے پر ایک گول گنبد بنا ہوا ہو اسکو پانی سے لبالب بھرلیں۔ پھر اُسکے نچلے سرے کو پانی بھرے برتن میں ڈبو دیں۔ اب اگر ہم اس گول گنبد پر اولہ کی تہیں جمائیں، جوہر شراب ڈالیں یا اور کسی تدبیر سے اُس میں سردی پہونچادیں تو صاف پتہ چلتا جائے گا کہ اندروالی ہوائیں دب دب کر پہلے سے کم فاصلہ میں گھرجائیں گی اور اگر ہم اسی گنبد کو ہتھیلی سے مل کر گرم کر دیں، تو وہی دبی دبائی ہوئی ہوائیں لچک لچک کر اپنی اصلی حالت پر آجائیں گی۔

یہی پھیلنے اور دب جانے والی خاصیتیں ایسی ہیں جو "بادبسیط" کو ٹھوس اور بہنے والی چیزوں سے الگ تھلگ کر دیتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دوسری اور تیسری قسم میں بھی یہی صفتیں موجود ہیں مگر بہت تھوڑی سی ہیں۔

ہم نے مان لیا ہے کہ تمام مادی چیزیں فطری طور پر ایسی بنی ہوئی ہیں کہ اُنکے اجزا آپس

ہیں ملے جلے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ کھینچنے اور جدا کرنے والی قوتوں کی مدد سے اپنی اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ "بادبسیط" میں جسے ہم فضائی ہوائیں کہتے ہیں جدا کرنے والی قوت کھینچنے والی پر چھائی ہوئی ہے۔ حالانکہ ٹھوس چیزوں میں اس کا الٹا ہے، یعنی کھینچنے والی زیادہ طاقتور ہے۔ اور بہنے والی چیزوں میں دونوں قوتیں ایسی برابر برابر کی چلی ہوئی ہیں کہ انکے وزن و اختیار، جسامت و مقدار میں بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔

جہاں تک نسبتی وزن کا تعلق ہے فضائی ہوائیں دوسری مادی اشیاء سے کہیں زیادہ بلند مرتبت، رفیع الدرجات ہیں۔ کیونکہ ان میں فطرت کا وہ بہترین جوہر موجود ہے جسے ہم ہائڈروجن کہتے ہیں (وہ ہولے لطیف جو پانی کا ایک جزو ہے) پھر اسکے علاوہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے صرف یہی "بادبسیط" تمامی موجودات میں سب سے زیادہ لچیلی چیز ہے۔ مثلاً فضائی ہوائیں چاہے کسی مقدار میں ہوں، کیسے ہی محفوظ وصاف برتن میں بھری گئی ہوں، کتنے ہی زمانہ تک قید و بند میں رہی ہوں۔ جب باہر نکلیں گی تو انکی اصلی حالت اور سابقہ شکل میں ذرا بھی کمی نہ آئے گی۔

یہی لچک بادبسیط کی پھیل جانے والی صفت کو بھی مدد پہونچاتی رہتی ہے۔ فرض کیجیے کہ فضائی ہوائیں کسی بے پایاں خلا میں قید کردی جائیں، یا کسی ایسی حالت میں "نظربند" رکھی جائیں جہاں کسی قسم کی کوئی خارجی قوت نہ پہونچ سکے تو صاف ظاہر ہے کہ اُن کا پھیلاؤ بھی بے پایاں ہوگا۔ اجزائے اصلیہ کی جدا کرنے والی قوت کھینچنے والی پر چھا جائے گی۔ اور ستم یہ کہ وہاں کوئی ایسی چیز موجود نہ ہوگی جو انکی برہمی و انتشار کو روک سکے۔

مگر جب بادبسیط کسی ٹھوس چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے تو اُسکی صورت جداگانہ ہوا کرتی ہے۔ پھیلاؤ ضرور ہوتا ہے مگر اپنی حد و انتہا سے بڑھنے نہیں پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ زمین اور سیارے لچیلی فضا میں ہمیشہ ہمیشہ گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح ہماری زمین کا گولا ہر معلق چیز کو (چاہے وہ بم گولے یا توپ گولے ہوں خواہ وہ کتنی تیزی اور چستی سے رہا کیے گئے ہوں) اپنی طرف گرا لیتا ہے، اسی طرح کھینچنے والی قوت ہوا کے پھیلاؤ کو محدود کرلیتی ہے۔ اور

"فضاء" کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھتی ہے، باد بسیط منتشر نہیں ہونے پاتی بلکہ ہر پہلو سے نظربندیوں میں جکڑی ہوئی رہتی ہے۔

اسکے علاوہ جو قوتیں ہماری زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہیں وہ بھی فضائی ہواؤں کو متصل کر سکتی ہیں۔ کیونکہ سردی سے انکے اجزا میں انقباض اور سمٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ مشاہدات نے بتایا ہے کہ ہم فضائے فلکی میں جتنے بلند ہوتے جائیں سردی اسیقدر بڑھتی جاتی ہے اور ہر قسم کی ہوائیں برودت کی وجہ سے زیادہ گاڑھی اور کثیف دکھائی دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمین کی کشش اور بالائی سردی یہی دو زنجیریں ایسی ہیں جو "باد بسیط" کو بیحد و بے انتہا پھیلنے نہیں دیتیں اور اسی وجہ سے فضائی ہواؤں کی گہرائی پچاس میل سے زیادہ نہیں ہونے پاتی۔

اس اصول کی بنا پر کہ باد بسیط ایک ناپ جانے والی مادی چیز ہے ہم یہ غیب کی بات بتا سکتے ہیں کہ مختلف بلندیوں پر فضائی ہواؤں کی کثافت جدا جدا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انکے وہ حصے جو زمین سے زیادہ قریب ہیں، اُن بیچاروں کو اپنے اوپر والے لنگر کا پورا پورا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے۔ مگر یہی بوجھ ہلکا اور زیادہ ہلکا..... ہوتا جاتا ہے جیسے جیسے ہم فضائی قطعات میں اونچے اور زیادہ اونچے ہوتے جاتے ہیں، چونکہ ان بلند مقامات میں دباؤ ڈالنے والی ہوائیں کم مقدار میں ہوتی ہیں۔ لہذا لازمی طور سے لنگر بھی ہلکا ہونا چاہیے۔

یہ تمام باتیں ہمارے لگاتار مشاہدات کا نتیجہ ہیں۔ وہ نچلے حصے جو سطح زمین پر پڑے ہوئے ہیں انکی کثافت سب سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ مگر ہم جتنے ہی اونچے ہوتے جائیں اُن کا گاڑھاپن اُتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اگر ہم چار اونی پوستینیں تلے اوپر جما کر رکھدیں تو صاف دکھائی دیگا کہ سب سے نچلی پوستین اوپر والی تینوں پوستینوں کے بوجھ سے دب جائیگی اور سب سے اوپر والی پوستین پر اس لنگر کا بال بھر بھی اثر نہ پڑیگا۔ بالکل یہی حالت اُن اجزا کی بھی ہے جن سے فضائی ہواؤں کی خلقت ہوتی ہے۔ اسی لیے سطح زمین پر باد بسیط زیادہ کثیف ہے اور پہاڑ کی چوٹیوں پر بہت کم کثیف ہے۔ اگر ہم ذرا بھی عقل سلیم سے کام لیں تو یہ بات خود بخود سورج سے زیادہ اُجلی ہو جائیگی کہ فضائی ہواؤں کے لنگر اور لچک میں ایک عجیب رشتۂ سربستہ موجود ہے۔ ذرا سوچیے تو اگر ہمارے اردگرد ہواؤں کی لچک کم ہوتی تو اوپر والے اجسام کا لنگر انکو منتشر و برباد کر دیتا اور اگر زیادہ ہوتی تو ان پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہ پڑتا اور باد بسیط پھیل کر خدا جانے کیا سے کیا ہو جاتی۔ لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی ہوا کی لچک نہ تو کم ہے نہ زیادہ، بلکہ ٹھیک اُسی لنگر کے برابر ہے جو اُسکے اوپر چھایا ہوا ہے۔

طالب

مسلمانانِ اندلس (اسپین) کی پہیلیاں

بچوں کو اپنے دماغ پر زور ڈالنے اور بڑوں کی ذہانت آزمانے کے لیے پہیلیوں سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہے - ہر ایک مہذب و متمدن ملک میں ان کا رواج ہے - بوڑھے کہتے ہیں بچے بوجھتے ہیں، جوان غور و خوض کرتے ہیں - شعرا انھیں کے ذریعہ سے چھوٹی چھوٹی بچیوں کے دربار میں پہونچتے ہیں - فلسفی انگوشت بسر دُھنتے ہیں - ہر چیز اور ہر بات کے لیے ایک موقعہ و محل ہوتا ہے، مگر پہیلیاں گویا مارشل لا ہیں کہ وقت اور غیر وقت کی پابند نہیں - مثلاً کہانیوں کو لیجیے کہ ان سے زیادہ دلچسپی کا باعث اور نہیں ہو سکتا - ذرا دن کے وقت یہ کہہ تو دیکھیے کہ "ہم کہانی کہتے ہیں" چھوٹی سی بچی آکر آپ کو دھمکا دیگی کہ "خبردار! مسافر راستہ بھول جائیں گے" مگر پہیلیاں ہیں کہ کسی وقت کی پابند نہیں -

ہمارے ہندوستان میں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کو پہیلیوں میں بجا شہرت حاصل ہے - اندلس میں یہی رتبہ ابو جعفر احمد بن ابراہیم کو حاصل تھا - انکی پہیلیاں بہت مشہور اور زبان زد تھیں - یہ غرناطہ کے رہنے والے بہت بڑے شاعر تھے - ۶۷۳ھ ہجری میں پیدا ہوے اور ۷۴۹ھ ہجری میں انتقال کیا - ان کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ وزیر لسان الدین جیسے ادیب کے اساتذہ میں سے ہیں - وزیر موصوف (رحمہ اللہ) نے انکی نظم و نثر کو جمع کرکے اُس کا نام "نافۃ من جم و نقطۃ من یم" رکھا تھا - افسوس کہ یہ کتاب اب ناپید ہے، مگر بعض نظمیں اب بھی جواہرات کی طرح اکثر کتبِ ادب میں چمک رہی ہیں -

میں ذیل میں ممدوح کی چند پہیلیاں لکھتا ہوں - امید ہے کہ باوجود ایک غیر زبان ہونے کے لطف سے خالی نہ پائی جائیں گی:

کانون (انگیٹھی)

وما اسم لسمیین ولم یجمعھما جنس

ایسے دو ہمناموں کا کیا نام ہے جو نام میں ایک اور جنس میں مختلف ہیں

فہذا اکلما یاتی فبا الآخر لی انس

یہ (ایک) جب کبھی آتا ہے تو دوسرے سے مجھے اُنس ہوتا ہے۔

وہذا مالہ تشخص وہذا مالہ حس

اس کا (ایک کا) تو کوئی تشخص نہیں ہے۔ اور اس میں (دوسرے میں) کوئی حس نہیں ہے

وہذا مالہ سوم وذا قیمتہ فلس

اس کا (ایک کا) تو کوئی مول بھاؤ نہیں ہے۔ اور اس کی (دوسرے کی) قیمت ایک پیسہ۔

وہذا اصلہ الارض وہذا اصلہ الشمس

اس کی (ایک کی) اصل زمین ہے۔ اور اس کی (دوسرے کی) اصل آفتاب ہے۔

وہذا واحد من سبعۃ تحیا بہا النفس

یہ ایک ایسے سات میں سے ہے جن سے زندگی ہے۔

فمن محمولہ الجن ومن موضوعہ الانس

اس کا (ایک کا) محمول جن ہے۔ اور اس کا (دوسرے کا) موضوع انسان ہے

فقد بان الذی الغزت ما فی امرہ لبس

جو پہیلی میں نے بوجھائی وہ ایسی واضح ہوگئی ہے کہ شک کی مجال نہیں۔

مائدہ (دسترخوان)

حاجیت کل فطن نطار ما اسم لانثٰی من بنی النجار

ہر ایک سمجھدار سے پہیلی بوجھواتا ہوں۔ بنی نجار کی عورت کا کیا نام ہے

وفی کتاب اللہ جاء ذکرہا نقلہا یغفل عنہا القاری

قرآن میں بھی اُس کا ذکر ہے۔ اور پڑھنے والا اُس سے بہت کم غافل ہوگا۔

فی خبر المہدی فاطلبہا تجد ان کنت من مطالعی الاخبار

اگر تم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہو تو مہدی کے اخبار میں اسے تلاش کرو۔

ماہیَ الا العید عید رحمۃ ونعمۃ ساطعۃ الانوار

وہ عید ہے اور رحمتِ عید۔ اور نعمتِ روشن۔

یشر کہا فی الاسم وصف حسن من وصف قضب الروضۃ المعطار

خوشبو والے باغ کی شاخوں کے اوصاف میں سے ایک اچھا وصف اُسکے نام میں شریک ہے۔

فہا کہہ کالشمس فی وقت الضحےٰ قد شق عنہا حجب الاستار

لو۔ یہ واضح پہیلی ایسی روشن ہے جیسے چاشت کے وقت آفتاب۔

مسک (مشک) نمبرا

ما طاہر طیب و لاکن ما اصلہ ذوی الطہارہ

وہ کون سی پاک چیز ہے جس کی اصل پاک نہیں ہے۔

من الظباء الحسان لاکن اذا تاملتہ فقارہ

وہ خوبصورت ہرنوں سے (ماخوذ) ہے اور غور سے دیکھو تو چوہیا ہے۔ (الفارۃ۔ نافۂ مشک)

نص حدیث الرسول فیہ شہادۃ تقتضی بشارہ

آنحضرت علیہ الصلوۃ والسلام کی حدیث اس کی ایسی شہادت ہے جو مستحق بشارت ہے

تصحیفہ بعد حذف حرف منزل الاہل العمارہ

اس میں ایک حرف حذف کرکے غلط پڑھو تو وہ ایک آباد قبیلہ کی منزل ہے

نمبر۲

کتبتم کثیراً و لم تکتبوا کہذا الذی سبلہٗ واضحہ

تم نے بہت لکھا لیکن ایسا نہیں جیسے کہ اس کی (یعنی ہمارے لکھے ہوے کی) راہیں واضح ہیں۔

فما اسم جری ذکرہ فی الکتاب فان شئتہ فاقرأ الفاتحہ

اس کا کیا نام ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ اگر تم چاہو تو فاتحہ پڑھ کر دیکھ لو۔

ففیہا مصحف مقلوبہ یعبر عن حالہ صالحہ

اس میں (یعنی فاتحہ میں) اس کا اُلٹا ہوا نام غلط ہے۔ جو اس کی اچھی حالت ظاہر کرتا ہے۔

ولیست بغادیۃ فاعلموا ولکنہا ابداً رائحہ

یہ سمجھ لو کہ وہ صبح ہی نہیں بلکہ ہمیشہ مہکتی ہی رہتی ہے۔

فلک (آسمان)

ما اسم شئ مرتقی فی مغرب و مشرق

جو مشرق و مغرب میں بلند ہے اُس کا کیا نام ہے

اذا حذفت فاءہ کان لک الذی بقی

اسکی فاء کو اگر حذف کردو تو جو باقی رہتا ہے وہ سب تمہارا ہو جائے۔"لک" کے معنی عربی میں تیرا ہے

نوم (نیند)

ما اسم مسماہ بہ یسقط حکم التکلیف

اُس کا کیا نام ہے جس سے موسوم ہونے سے حکم تکلیف دُور ہو جاتا ہے۔

وان دخلت البیت بالتصحیف حق التعنیف

اور اگر اسکے لفظ کو غلط کرکے گھر میں داخل ہو تو مستحق سرزنش قرار پاؤ۔

وان امروت شبھہ فقلبہ بالتصحیف

اور اگر تم اسکے ہمشکل (مشابہ) چاہو تو اُسے غلط کرکے اُلٹ دو۔

بینہ فھو فی کتاب اللہ بادی التعریف

بتاؤ۔ قرآن میں اس کی تعریف واضح ہے۔

نمل (چیونٹی)

ما حیوان اسمہ قد جاء فی الذکر الحکیم

وہ کونسا جانور ہے جس کا نام کلام پاک میں آیا ہے۔

وھو اذا قلبتہ لمن بہ انت علیم

اور جب تم اُسے اُلٹ دو تو لمن ہوگا جسے تم خوب جانتے ہو۔

ان تصحف اسمہ نبعض اوصاف اللئیم

اور اگر اس کا نام غلط کردو تو کمینہ کے بعض اوصاف ہو جائیں۔

قلم

موم بہ عرف الامام کما باھت بصحبتہ الکرام

اور ایسا مقتدی جس سے امام پہچانا جاتا ہے۔ اور وہ ایسے ہی مفاخرت کرتا ہے جیسے شرفا اپنے حجاب پر فخر کرتے ہیں

لہ اذیر توی ٹیشان صاد ۔ ویکن حین یعیر وہ الاوام

پیاس کے وقت جب وہ سیراب ہوجاتا ہے تو اس میں ایسی تیزی ہوتی ہے جیسی پیاس (کے وقت پیاسے کو)

ویذری حین یستسقی دموعًا ۔ یرقن کما یرق الابتسام

جب وہ پیتا ہے تو (اسکے بعد) ایسے (خوش آیند) آنسو بہاتا ہے جیسے مسکراہٹ میں دانت خوش آیند معلوم ہوتے ہیں۔

لبن (دودھ)

افدیک ما اسم اذا ما ۔ صحفتہ فہو سبع

میں تجھ پر قربان - وہ کون سا نام ہے جسے غلط پڑھو تو وہ درندہ ہو جائے۔

وان تصحف بعکس ۔ ففیہ للقبط شرع

اور اگر اسے بالعکس غلط پڑھا جائے تو اس میں قبط کا شرع ہو۔

والاسم یعرب عما ۔ لدیہ ری و مشبع

اور اس کا اصلی نام ایسی بات ظاہر کرتا ہے جس سے سیرابی و شکم سیری ہے۔

فی النحل یلفی ولاکن ۔ لا یتقی فیہ لسع

شہد کی مکھیوں میں وہ پایا جاتا ہے - لیکن اس میں ڈنک کا ڈر نہیں ہے۔

فلیس للنحل اصلًا ۔ ولا لہا فیہ فرع

تو شہد کی مکھیوں کے لیے اس میں نہ کوئی اصل ہے نہ فرع۔

فہا کہ قد تبدی ۔ لحجبہ عنہ رفع

لو یہ (پہیلی) پردہ ہائے حجاب سے نکل کر بالکل ظاہر ہے۔

حوت (مچھلی)

ما حیوان فی اسمہ ۔ ان اعتبرتہ فنون

وہ کونسا جانور ہے جس کے نام میں اگر ان میں غور کرو تو نون ہو۔

احرفہ ثلاثۃ ۔ والکل منہا ہو نون

اس کے تین حرف ہیں - اور ان میں سے ہر ایک نون ہی ہے۔

ان انت صحفت اسمہ　　فما جنا ہ المذنبون

اگر تم اُسے غلط پڑھو تو وہ ہو جائے جس کا ارتکاب گنہگار کیا کرتے ہیں۔

او ابیض او اسود　　او صفتہ النفس الخؤن

وہ سفید ہوتی ہے یا سیاہ یا اُس کے اوصاف خائن نفس کے سے ہیں۔

قلب اسمہ مصحفا　　علیہ دارت السنون

غلط کرکے اُسکے نام کو پلٹ دو (تو ایسی حالت میں) اُس پر برسیں گذر گئیں۔

کانت بہ فی ما مضٰی　　عبرۃ قوم یعقلون

گذرے ہوئے زمانہ میں اس میں سمجھدار قوموں کے لیے عبرت تھی۔

اودع فیہ زمنا　　سر من السر المصون

ایک زمانہ میں اس میں ایک نہایت محفوظ بھید ودیعت کیا گیا تھا۔

فھا کہ کالنار فی الزند کہ فیھا کمون

لو۔ جیسے چقماق میں آگ مستور رہتی ہے اُسی طرح یہ پہیلی بھی ان الفاظ میں مستور ہے۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یکایک خیال آیا کہ وہ بھی عجیب وقت اور سماں ہوگا کہ عرب کے جواہر پارے اپنے کاشانوں میں، اور بربری کاشتکاروں کے لخت جگر اپنی جھونپڑیوں میں بیٹھے ہوئے یہ پہیلیاں کہتے سنتے ہوں گے۔ اسکے ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ ظالموں نے کہنے والوں کا نشان چھوڑا نہ سننے والوں کی قبریں باقی رکھیں۔ اسکے ساتھ ہی دل بھر آیا۔ کتاب بند کردی۔ پھر جو کھولتا ہوں تو ابن جیابؒ کی ایک نظم پر نظر پڑی۔ اُس کا پہلا شعر لکھتا ہوں:—

قضی الامر فیا نفس اصبری　　صبر تسلیم لحکم المقتدر

(خدا کا حکم پورا ہو چکا تو اے نفس تقدیر کے حکم پر صبر و تسلیم اختیار کر)۔

گو معقول مزاج حضرات مجھ نامعقول پر ہنسیں، مگر میں اس کو ابن جیابؒ کی کرامات سمجھتا ہوں۔

محمد خلیل الرحمن

نقد و تبصرہ

"ناظر"

ادب

(۱) زبان اُردو پر سرسری نظر - از رشید احمد صدیقی صاحب ایم اے - لکچرر اُردو مسلم یونیورسٹی - ضخامت ۵۲ صفحے - تقطیع ۲۰ × ۲۶ - قیمت درج نہیں - غالباً منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ سے مل سکے - (کتاب بغرض فروخت نہیں شایع ہوئی بلکہ محض خراج تحسین وصول کرنے کے لیے - (ایڈیٹر)

پچھلے سال کانفرنس نے ایک مفید جدت یہ کی، کہ مختلف ماہرین فن کے لکچروں کا مختلف عنوانات پر اپنے زیر اہتمام انتظام کیا - ایک عنوان "اُردو زبان" تھا، اُس کے لیے قرعۂ انتخاب خوش قسمتی سے علیگڈھ میگزین کے ہیرو، رشید صاحب پر پڑا، جو یونیورسٹی میں زبان اُردو کے اُستاد بھی ہیں - یہی لکچر نظرثانی کے بعد اب کتابی صورت میں شایع ہوگیا ہے، اور اسوقت زیر تبصرہ ہے -

موضوع بیحد وسیع تھا، اس پر لکچر دینا آسان نہ تھا - اُردو زبان کی تاریخ، اس کی موجودہ ضروریات، رسم الخط، مصطلحات علمی، ادبیات حاضرہ پر تبصرہ، وغیرہ بیسیوں عنوانات پیدا ہونے لازمی تھے، جن میں سے ہر عنوان بجاے خود ایک مبسوط بحث کا محتاج تھا - نہایت مسرت ہے، کہ نوجوان مصنف اس دشواری پر پوری طرح غالب آگیا - اُس نے اپنے خداداد ذوق سلیم سے کام لیکر، ہر ضروری بحث کو لیا، ہر بحث پر سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا، اور کتاب کے وصف جامعیت کو کہیں سے بھی ہلکا نہیں ہونے دیا -

بعض مسائل متعلقہ پر اس قدر صحیح، اور اتنے جنچے تُلے الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے، کہ اس میں کسی ترمیم یا اضافہ کی گنجایش نہیں رہ جاتی - ہوا خواہان اُردو کے لیے یہ ایک ہمت شکن حقیقت ہے، کہ اُردو کے خدمتگزار بہت ہی قلیل تعداد میں ہیں - فاضل لکچرر اس گتھی کو یوں سلجھاتے ہیں:-

"میں یہ نہیں عرض سکتا، کہ ہمارے یہاں ماہران اُردو کی کمی ہے، یا خود اُردو میں استعدادِ ترقی

نہیں ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اُردو کی پُرسش نہیں ہے ..... اُردو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ اُردو لکھنے پڑھنے اور سیکھنے میں لوگ تامل کرتے ہیں، اس لیے کہ آزوقۂ حیات میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا ...... حصول معاش میں اس سے کوئی معتدبہ نفع نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ لوگ خلوص، شوق، یا ضرورت کی بناپر اسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ جب تک اُردو کی قدر و قیمت روپیوں میں تحویل نہ کی جاسکے، لوگوں کی توجہ اس طرف بمشکل منعطف کرائی جا سکتی ہے۔ ہم تمام عمر انگریزی زبان سیکھنے میں صرف کر دیتے ہیں ... لیکن یہ وقت ہمت شکن نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ حصول معاش یا ملازمت میں یہ بوجہ معلومہ معین ہوتی ہے۔ اُردو داں دونوں حالتوں میں محروم رہتا ہے، یہاں نہ ڈگری کی پُرسش ہے، اور نہ ذاتی قابلیت کی کوئی قیمت۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ اُردو سیکھنے کی دردسری سے فائدہ؟ ..... اُردو میں تبحر حاصل کرکے کسی کو نفع کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ کتنے اسکول یا کالج ہیں جہاں ان کے لیے جگہ نکل سکتی ہے؟ کتنے دفاتر یا محکمہ جات ہیں جو ان کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہیں؟ ... آپ گھر بیٹھ کر تصنیف و تالیف کی ابتدا کیونکر کر سکتے ہیں، جب اُنکے پڑھنے والے ہی معدوم ہیں۔" (صلـ۲۲ ـ ۲۳)

ریویو نگار کو مرحوم لسان العصر الہ آبادی، کا یہ ارشاد کبھی نہیں بھولتا کہ " لوگ کہتے ہیں کہ ابوالفضل و فیضی اب نہیں پیدا ہوتے، میں کہتا ہوں کہ کیوں پیدا ہوں، پہلے کوئی اکبر تو پیدا ہولے۔"

مصنف کا یہ خیال بالکل درست ہے، کہ ملک میں جگت بھاشا (لنگوا فرینکا) بننے کی صلاحیت اگر کسی زبان میں ہے، تو وہ اُردو ہی زبان ہے اُردو رسم الخط کے ساتھ ہے، اور اپنے اس دعوے کو اُنھوں نے جس دلنشیں پیرایہ میں ثابت کیا ہے، وہ اصل کتاب میں قابل دید ہے۔ اور ہر حیثیت سے قوی و محکم ہے (صـ۲۴ ـ ۳۴) البتہ اس سلسلہ میں اُنھوں نے مہاتما گاندھی کے پیش کردہ خاکہ زبان "ہندوستانی" سے جو اختلاف کیا ہے، اسکی چنداں حاجت نہ تھی۔ گاندھی جی جس شے کو ہندوستانی سے موسوم کر رہے ہیں، وہ در اصل اُردو ہی ہے۔ نام کے بدل دینے سے کسی شے کی ماہیت و حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اگر ہندو برادران وطن بجائے اُردو کے "ہندوستانی" کہنے سے خوش ہوتے ہیں، تو ہمیں بھی اسکے قبول کر لینے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ اور قدیم انگریز تو اُردو کو ہندوستانی کہتے ہی تھے۔

رسم الخط کا سوال البتہ کسی قدر دشوار ہے۔ اُردو اور ہندوستانی تو مرادِف الفاظ ہیں، البتہ اُردو (فارسی) رسم الخط، بیشک ہندی رسم الخط سے مختلف ہے، اور ایک فریق بعض سطحی دلائل کی بنا پر ہندی رسم الخط کو رواجِ عام کے لیے پیش کر رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ رشید صاحب نے تفصیل سے دکھایا ہے، اس دعوے کی بنیاد کسی قوی دلیل پر نہیں، بلکہ حقِ ترجیح اگر پہونچتا ہے تو اُردو کے مروجہ رسم الخط ہی کو پہونچتا ہے" (صفحہ ۳۱-۳۲)

آغازِ کتاب میں مصنف نے حالی، اکبر، اقبال پر جو تبصرہ کیا ہے اور اُردو کی تاریخ ارتقائی میں انکے جن مدارج کی تعیین کی ہے وہ نہایت نکتہ سنجانہ ہے، اور خود ریویو نگار کے خیال کا بالکل توارد ہے، ماضی، حال و مستقبل کے ادوار ثلٰثہ سے ہر قوم کو گذرنا ناگزیر ہے، اور یہ تینوں بزرگ، علی الترتیب اپنے اپنے دور کے پیمبر ہوئے ہیں۔ ایک نے اجداد و اسلاف کی عظمتوں پر نوحہ خوانی کی، دوسرے نے ابنائے عصر کی جدت طرازیوں پہ خوب خوب چٹکیاں لیں، تیسرے کا کام اقدام عمل پر قوم کو آمادہ کرنا ہے۔

آخر حصۂ تصنیف میں مصنف نے اُردو زبان کی ترقی و تحفظ کے لیے سات تجویزیں پیش کی ہیں۔ (۱) ایک جامع کتبخانۂ اُردو۔ (۲) علیگڈھ میں انجمن اُردوے معلّی کا قیام۔ (۳) معلمین اُردو کی کانفرنس کا سالانہ انعقاد۔ (۴) مشاہیر اساتذہ و ماہرین اُردو کی ایک مجلس یا اکاڈمی، جو مسائل زبان میں ٹکسال کا کام دے۔ (۵) اُردو مکاتب کا بکثرت اجرا۔ (۶) ایک وسیع دارالترجمہ و دارالتصنیف کا قیام۔ اور (۷) صحیح اصول پر افسانہ نویسی کی ترویج۔ اور ان میں سے ہر عنوان کے متعلق مصنف نے تفصیلی گفتگو بھی کی ہے۔ یہ سب تجاویز بجائے خود معقول ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ بلحاظ اہمیت سب مساوی نہیں، بعض کا تعلق مخصوص علیگڈھ سے ہے، اور سب کا قابل عمل ہونا تو یقیناً خارج از بحث ہے، جیسا کہ اس اثنا میں خود لکچرر صاحب کو بھی تجربہ سے نظر آگیا ہوگا۔

کتاب شروع سے آخر تک جس ادیبانہ و انشا پردازانہ عبارت میں ہے اُس کا کسی قدر اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا:-

"اُردو زبان اور موجودہ دور کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ کم و بیش عرض کر چکا۔ اب میں اپنے فرض کے اُس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس سے بڑھ کر آسان اور کوئی چیز نہیں، یعنی صلاح و مشورہ! قبل اسکے کہ میں کچھ اور عرض کروں، اس امر کا اظہار ضروری

سمجھتا ہوں کہ اسوقت دہلی اور لکھنؤ دونوں اُردو کی طرف سے انتہائی استغنا برت رہے ہیں حالانکہ ان دونوں مقامات پر یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں، اور ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں، لیکن مجھے افسوس ہے، کہ یہ خانقاہیں صرف اپنے گذشتہ سجادہ نشینوں کی سوگوار ہیں، گلشن و مصر دونوں ویران ہیں، اور متاع یوسفی کے لیے آنکھیں بیقرار ہونے لگی ہیں۔ اب وہ دن دُور نہیں ہے، جب ہماری مایوس نگاہیں صرف حیدرآباد کی فضا کو اپنا نشیمن بنائیں۔ جنوبی ہند کے اُردو پر جو کچھ احسانات رہے ہیں، اُن سے آپ واقف ہیں۔ کیا تعجب ہے، زمانہ کا انقلاب اُنھیں لیل و نہار کو پھر ہمارے سامنے کردے، جن کی کروٹیں کبھی اُردو کی گہوارہ جنبانی کر چکی تھیں۔" (صد ۴۵)

ایک صفحہ کیا معنی ایک سطر بھی کتاب بھر میں غیر دلچسپ نہ ملے گی۔ رشید صاحب سے توقع بھی اسی کی تھی۔ البتہ دلاویزیِ عبارت کے علاوہ، جس اصابتِ رائے، نقدِ صحیح، پختگیِ خیالات، و امعانِ نظر کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے، وہ توقع سے زائد ہے۔

طبعِ آیندہ کے وقت اگر امور ذیل پر لحاظ رکھ لیا جائے، تو یہ آئینہ روشن سے روشن تر ہوجائے:۔

(۱) بعض الفاظ مثلاً صد ۳۵ پر "اسلحات"۔ یا صد ۴۵ پر "محاذ"۔ صد ۱۶۳ پر "خد و خال" کی صحت کے متعلق مزید اطمینان کر لیا جائے۔

(۲) اس قسم کے انگریزی الفاظ کے استعمال پر رشید صاحب کو خود اپنے ہی ذوق سلیم سے ایک بار پھر استفتاء کرنا چاہیے:۔ "ڈی ٹامینس" "کلاسکس" "لائبریری" "ایجنسی" "انسٹی ٹیوشن" وغیرہ۔ یا پھر اس قسم کے فقرے، کہ "تمھاری تحریر کا تم سے بہتر جج نہیں ہو سکتا۔"

(۳) صد ۳۱۲ پر اُن چند اصحاب کے نام لیے گئے ہیں، جو اپنے اپنے رنگ میں اُردو زبان و انشاء کے مالک کہے جاسکتے ہیں۔ یہ کیسا ظلم عظیم ہے، کہ یہ صفحہ محمد حسین آزاد، شبلی و حالی کے ذکر سے خالی ہے، اور نذیر احمد کی قلمرو کو صرف "مضحکات و طنزیات" تک محدود رکھا ہے! اسی صفحہ میں ایک لفظ "شاگوریت" بھی آیا ہے۔ کاش رشید صاحب اس جُرم کے سب سے بڑے مجرم کا نام بھی آزادی کے ساتھ لکھ دیتے۔

مصنف کی یہ پہلی تصنیفی کوشش تھی، جو ہر پہلو سے نہایت کامیاب و قابل قدر ثابت ہوئی ہے۔

انشاء اللہ وہ دن دُور نہیں، جب ہم اس نوجوان اہل قلم کو اُردو مصنفین کی صف اول میں ایک ممتاز مرتبہ پر پائیں گے۔

(۲) **مکمل شرح دیوان غالب**۔ مولفہ مولوی عبدالباری آسی اُلدنی۔ ضخامت ۴۷۲۔ تقطیع ۱۸ + ۲۲ ملنے کا پتہ صدیق بک ڈپو، امین آباد، لکھنؤ۔ قیمت باختلاف کاغذ ے۔ ر و عہ

غالب کے دیوان اُردو کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں، اور یہ غیر ضروری سلسلہ برابر جاری ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ شرح بھی ہے۔ بعض اشعار کے معانی تحریر کرنے میں آسی صاحب نے یقیناً تلاش و محنت سے کام لیا ہے، اور اس لحاظ سے اُنکی کوشش قابلِ داد ہے۔ جابجا مقابلہ و توضیح مطالب کے لیے دوسرے شاعروں کے کلام کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ دلی اور لکھنؤ کی زبان کے فرق کو بھی بعض مقامات پر واضح کیا گیا ہے، البتہ شارح صاحب کا اپنے کلام کو سنداً یا تمثیلاً پیش کرنا مذاق سلیم کو خوشگوار نہیں معلوم ہوتا۔ آیندہ اس سے احتیاط بہتر ہو گی۔

(۳) **حجاب زندگی اور دیگر افسانے**۔ مولفہ سید عابد علی عابد بی اے۔ مقام اشاعت، اُردو ہاؤس، لاہور۔ تقطیع خُرد۔ ضخامت ۱۶۰ صفحے۔ قیمت عہ

یہ سات مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، جو پنجاب کے ایک جدید اہل قلم کا ثمرۂ فکر ہے۔ ان افسانوں کا مقصد "اخلاقی تعلیم نہیں" بلکہ بہ قول مولف، صرف یہ ہے کہ "انسان کی فطرت کے تاریک پہلو کو .... دکھایا جائے"۔ افسانوں کے پلاٹ میں انگریزی قصوں کا تتبع کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں صاف ترجمہ پن نظر آتا ہے۔ صحت زبان و شستگی عبارت کے اندازہ کے لیے ذیل کا نمونہ کافی ہوگا:-

"عشق و محبت کے زیر تحت عنوانات سے" (ص۱۳)

"یہ ایک نفس الامری حقیقت ہے" (ص۱۳)

"ایک معصوم بچہ کا دل ہر ایک طرح کے گرد و غبار سے مخلی ہوتا ہے" (ص۱۵)

"ان افسانوں کے مخرج کو زیادہ واضح ... کروں گا" (ص۱۵)

مذہب

(۱) **بشریٰ**۔ مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ ضخامت ۴۸ صفحہ۔ تقطیع خُرد۔ ملنے کا پتہ:- احمد برادران، تاجران کتب، علیگڈھ۔ قیمت ۲ر

مولانا سید سلیمان ندوی نے کچھ عرصہ ہوا، اپنے رسالۂ معارف میں ایک مضمون اس بحث پر تحریر فرمایا تھا، کہ اسلام کا خدا، غصہ ور وسخت گیر نہیں، جیسا بعض مستشرقین نے اپنی غلطی سے سمجھ رکھا ہے، بلکہ رحمٰن ورحیم، مہربان وشفیق، اور دلدار ومحبوب ہے۔ یہی مضمون، بعد اصلاح واضافہ، ایک رسالہ کی صورت میں شایع ہوا ہے۔ مولانا کا یہ دعویٰ، آیات قرآنی واحادیث نبوی سے مدلل، اور عقیدۂ اسلام کی بالکل صحیح تعبیر ہے۔ طرز بیان صاف، سلیس ودلکش۔ ہر شخص پر جو اسلام کی صحیح تعلیم سے واقف ہونا چاہتا ہے، یا جو اپنے دل میں خدا اور رسولؐ کی محبت کا کوئی جزو بھی رکھتا ہے، اس کا مطالعہ واجب ہے۔

(۲) **خیر الوصیۃ** - مترجمۂ مولوی ابوالخیر محمد خیر اللہ۔ ضخامت ۲۲ صفحہ۔ تقطیع خرد۔ قیمت صرف ار ملنے کا پتہ:- حاجی محمد محی الدین، تاجر کتب، نمبر ۳۹۹ - موچی بازار، لشکر بنگلور۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی، جس پایہ کے محقق شریعت وامام طریقت گزرے ہیں، اس سے ہر شخص واقف ہے۔ یہ رسالہ انھیں کے وصایا کا اردو ترجمہ ہے۔ کل بارہ وصیتیں ہیں، جن میں سے اکثر ایسی ہیں، جنکی اشاعت آج مسلمانوں میں نہایت ضروری ہوگئی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے طریقۂ اتباع رسول، اور پابندی احکام شریعت کی سخت تاکید کی ہے، اور تقاریب شادی وغم کے مواقع پر بدعات ومراسم پرستی سے بچنے کی شدید مخالفت کی ہے۔ سالکان طریقت وطالبان تصوف انکی ہدایات ذیل کو اپنے لیے خصوصیت کے ساتھ سبق آموز پائیں گے:-

"اس زمانہ کے مشائخ جو قسم قسم کی بدعتوں میں مبتلا ہیں، ان کا ہرگز مرید نہ ہونا چاہیے، اور ان سے کبھی بیعت نہ کی جائے۔ انکی کرامات اور عام لوگوں کے رجوع ہونے پر دھوکا نہ کھانا چاہیے، کیونکہ عام لوگوں کا رجحان ایک رسمی بات ہے، اور ایسی رسمی چیزیں فی الحقیقت اعتبار کے لائق نہیں ہیں، ......

بہتر طریقہ یہ ہے کہ طالب، کتب حدیث مثلاً صحیح بخاری، وصحیح مسلم، وسنن ابی داؤد، وترمذی، اور کتب فقہ حنفیہ وشافعیہ کو پڑھتا رہے۔ اور ظاہر سنت پر عمل اختیار کرے۔ اگر حق سبحانہ تعالیٰ اس کے دل میں شوق صادق عطا فرمائے، اور اس روحانی راستہ کی طلب غالب ہو جائے، تو کتاب عوارف المعارف کے آداب نماز وروزہ اور اوراد ووظائف میں مشغول رہے

اور سلسلۂ نقشبندیہ کے رسالوں کا روحانی نسبت کے پیدا کرنے کے لیے مطالعہ رکھے۔"

اس دَورِ فتن میں، جبکہ حقیقی تصوف کے بجائے شعبدہ بازی کا رواج عام ہوگیا ہے، اس رسالہ کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے مفید ہوگا۔ زبان صاف و سادہ ہے۔

(۳) **فتویٰ کفر بے نماز مع رسالۂ بے نمازاں** (منظوم) ضخامت ۴۲ صفحہ۔ تقطیع خُرد قیمت ار ملنے کا پتہ، حاجی محمد محی الدین۔ تاجر کتب ۳۹۹ ۔ موچی بازار۔ لشکر بنگلور۔

تارکین نماز پر زجر و تہدید۔ بے نمازیوں کے کافر ہونے کا فقہاء حنفیہ کی کتابوں سے ثبوت۔ حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔

(۴) **برقِ جہندہ** ۔ حجم ۱۶ صفحہ۔ تقطیع ۲۰ + ۲۶ ۔ قیمت اور پتہ درج نہیں، بلکہ "المشتہر" کا نام "شیخ الدین شاہ صاحب" درج ہے، اپنی فتنہ انگیزیوں کے لحاظ سے یقیناً اس قابل ہے کہ اسکا شمار آثار قیامت میں کیا جائے۔ ٹائٹل پر بجائے مصنف کے اسم گرامی کے، پوری چار سطروں میں اُن "بزرگان کرام" کے اسمائے پاک درج ہیں، جن کی "حسب فرمائش" یہ رسالہ طبع ہوا ہے۔ اُن اشخاص کے نام اس نمونہ کے ہیں:-

"خلیفہ مخدوم صوفیہ صافیہ شاہ صاحب"۔

"شیخ المشائخ سمیع اللہ شاہ صاحب" وغیرہ۔

جس عجیب ترہستی کے یہ لوگ زلہ رُبا ہیں، اُس کا نام ان الفاظ میں درج ہے:-

"جناب سرکار حضرت خواجہ شاہ نعیم قدرتی صاحب صدر نشیں"

یہ تصریح کہیں نہیں ملتی، کہ یہ "جناب سرکار" "صدر نشیں" کس بزم کے ہیں؟ بزم ارتداد کے؟ مجلس تخریب ایمان کے؟ محفل القاء شیطانی کے؟ رسالہ کا خلاصہ یہ ہے، کہ نماز پڑھنی ناجائز ہے! اور "صوفی" کو تارکِ صلوٰۃ ہونا چاہیے! قصبہ فتحپور ضلع بارہ بنکی میں ایک دجال، گھورو شاہ پیدا ہوا ہے، جس کی تبلیغ ترک نماز کی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے قصبہ کے مشہور مقدس بزرگ مولانا عابد حسین مدظلہ کے حسب ہدایت اس شیطانی گروہ سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے، یہ رسالہ اسی گروہ کی حمایت میں شایع ہوا ہے۔ دلائل ایک سے ایک بڑھ کر مہمل و لغو پیش کیے ہیں۔ جا بجا آیات قرآنی نقل کی ہیں، مگر ایک آیت سے بھی اس نتیجہ کی تائید نہیں نکلتی۔ اقوال رسول کریمؐ

بجاے کتب احادیث کے مخزن الافوار نامے کسی کتاب سے نقل کیے ہیں۔ اول تو انھیں حدیث کہنا ہی سرے سے غلط ہے، پھر اگر مان بھی لیا جائے، تو مصنف کا مدعا کسی تاویل کے ساتھ بھی ان سے ثابت نہیں ہوتا۔ مولانا رومؒ کے اشعار بھی بکثرت درج کیے ہیں۔ ان میں بے عقلی اور بد دیانتی دونوں سے کام لیا ہے، بعض اشعار دوسروں کے ہیں، انھیں مولاناؒ کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ جو اشعار واقعۃً مولانا کے ہیں، اُن سے محض نماز ریائی، اور عبادت نمائشی کی منقصت نکلتی ہے (جو ایک کھلی ہوئی معصیت ہے) نہ کہ نفس نماز کی۔ "غروری" "سفلی لوگ" وغیرہ کیسر غلط الفاظ، لکھنے والے کی جہالت ثابت کر رہے ہیں۔ اس سے زائد اس شیطانی گردش قلم، اور جاہلانہ تالیف پر کچھ لکھنا تضیع وقت کرنا ہے۔

متفرق

(۱) خطابت و تقریر۔ مولفہ حکیم خواجہ شمس الدین احمد لکھنوی۔ ضخامت ۸۰ صفحہ تقطیع خرد۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ غالباً، نامی پریس، نخاس، لکھنؤ۔

فن خطابت، دراصل فلسفہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ یونانیوں میں ارسطو نے اس پر مستقل کتاب لکھی۔ مسلمانوں میں ابن رشد، ابن سینا، و فارابی نے اس پر لکھا۔ انگریزی میں بین، وغیرہ کی کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں اُردو اب تک اس حیثیت سے بے مایہ تھی۔ شکر ہے کہ حکیم شمس الدین صاحب لکھنوی کو ادھر توجہ ہوئی، اور انھوں نے پہلے مسلم اکاڈمی کے سامنے اس عنوان پر لکچر دیا، اور پھر اس لکچر کو کتابی صورت میں طبع کر دیا۔

حکیم صاحب کا یہ رسالہ مختصر ہے، لیکن ناقص نہیں۔ تعریف، موضوع و غایت کے بتانے کے بعد انھوں نے دلائل، تحریک جذبات، ترتیب، آداب، وغیرہ ہر ضروری عنوان پر گفتگو کی ہے، اور ماہرانہ انداز سے ہر مسئلہ کی دلنشیں توضیح کی ہے۔ آخر میں "دینی خطبات" اور "قدیم و جدید خطبات" کے زیر عنوان انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اُس پر عمل کرنے سے ہماری بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ خطابت کی مثالیں انھوں نے قرآن، حدیث، اور بعض اقوال مشاہیر سے پیش کی ہیں، اور اپنے ہر بیان کو مدلل کرنے کے ساتھ ہی دلچسپ بھی رکھا ہے۔ اُمید ہے کہ اس رسالہ کو ملک میں مقبولیت حاصل ہوگی، اور حکیم صاحب بھی آیندہ اسی موضوع پر کسی مبسوط تالیف کے لیے وقت نکال سکیں گے۔

یوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

رات گذری ہے مجھے نزع میں روتے روتے
آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے

دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کو

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستمزدہ کو ہمنے تھام تھام لیا

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائیگا

کسو سے دل نہیں ملتا ہے اب
ہوا تھا کس گھڑی اُن سے جدائیں

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

دل گیا رسوا ہوے آخر کو سودا ہو گیا
اس دو روزہ زیست میں ہمپر بھی کیا کیا ہو گیا

کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہے
گُلِ گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

اک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں
آتے ہو اب تو آؤ - پھر ہم میں کیا رہے گا

دل مجھے اُس گلی میں لیجا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

اب تو جاتے ہیں بتکدہ سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا - یاں بہت دن کم رہا

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے	میکدہ اک جہان ہے گویا
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں	اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی
کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے	آج سو سو طرف گمان گیا
میر صاحب زمانہ نازک ہے	دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار
یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے	سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا	جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا	آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
سخت کافر تھا جسنے پہلے میر	مذہبِ عشق اختیار کیا
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن	گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں	کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں
عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں	اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
عشق کا گھر ہے میر سے آباد	ایسے پھر خانماں خراب کہاں
فقیرانہ آئے صدا کر چلے	میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
رہنے سے مرے پاس کے بدنام ہوئے بہت	اب جا کے رہو واں کہیں رسوا نہ جہاں ہو
ہو گا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر	کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو
اگ وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم	اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں
آنے میں اس کے حال ہوا جائے ہے تغیر	کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا
داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق	میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا
برسوں ہوئے گئے اُسے پر بھولتا نہیں	یادش بخیر میر۔ رہے خوش۔ جہاں ہو اب
عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا	جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
دُور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طرز غزالوں کا	وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا
کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا	یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر	کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے — اب آئے تم تو فائدہ ہم ہی نہیں رہے

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجھکو تو ہنسی سے — پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش — ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

مرا سر نزع میں زانو پہ رکھکر یوں لگا کہنے — کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مرجانا

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو — ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

وصیت میر نے مجھکو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

"الف - ع"

میدانِ قیامت میں جو اک حشر بپا ہے — اپنے دلِ غمگیں کی یہ دھیمی سی صدا ہے

محرومیِ پیہم نے بالآخر یہ بتایا — شامل ہے وہ ہر رنگ میں ایسا کہ جدا ہے

ہر جلوۂ صورت میں ہے سامانِ لطافت — شاید پسِ ہر پردہ وہی جلوہ نما ہے

آغازِ حیاتِ ابدی تھا دمِ آخر — غافل تھا جو سمجھا کہ یہ پیغامِ قضا ہے

باطل نہیں اس عالمِ امکاں کے تماشے — باطل انھیں سمجھا تو یہ اپنی ہی خطا ہے

سازِ دلِ مایوس ہو یا بربطِ امید — سینہ میں غرض میرے کوئی بول رہا ہے

نذرِ خلشِ شوق کیے پھر تپشِ دل — اک آبلہ پا دشت نوردی کو چلا ہے

واللہ رے ترے ذوقِ محبت کے کرشمے — ہر دل دلِ پر درد ہے ہر درد دوا ہے

دیکھی گئی کس سے تری اعجاز نگاہی — بیٹھا ہوں جو میں آئینہ بتصویر بنا ہے

وارفتگیِ شوق میں اتنا نہیں معلوم — خود ہم ہیں جدا دل سے کہ دل ہم سے جدا ہے

صحرائے محبت میں جلیل آپ کی ہستی
اک نقشِ تمنا ہے جو زیرِ کفِ پا ہے

جلیل قدوائی (علیگ)

غمزدہ کوئل

کوبکو صحرا بصحرا پھر رہی ہے کیوں اداس
خیر تو ہے کیوں سراسیمہ ہے کیوں ہے بدحواس

غمزدہ کوئل یہ کیسی دکھ بھری آواز ہے
تیرے ہر نالے میں تیری زندگی کا راز ہے

خانماں برباد نکلا عشقِ افسوں گر ترا
محشر انگیزِ تمنا ہے دلِ مضطر ترا

تیرے دردانگیز نالوں میں نہیں کچھ بھی اثر
کیوں تجھے تڑپا رہی ہے شدتِ دردِ جگر

تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کتنا اضطرار
باغ و صحرا میں کہیں بھی تو نہیں تجھ کو قرار

رکھتا ہے بیتاب کیا شوقِ گوناگوں تجھے
مخلصی دیتا نہیں ہے عشق کا افسوں تجھے

اے شکارِ دردوغم کیوں اسقدر رنجور ہے
شاہدِ مقصود کیا تیری نظر سے دور ہے

رنگ ماتم کا ہے تجھ پہ کس قدر چھایا ہوا
نالہ کرتی ہے تو اڑ جاتا ہے ہوش آیا ہوا

آسماں سنتا نہیں ہے کچھ تری فریاد کو
صبر بھی دیتا نہیں تیرے دلِ ناشاد کو

تیری ہستی کا ابھی مجھ پہ نہیں عقدہ کھلا
کس سے پوچھوں میں تری سرگشتگی کا ماجرا

تو ہے میرا گمشدہ دل یہ تو میں کیونکر کہوں
ہاں کسی بیتاب کا تجھکو دلِ مضطر کہوں

قابلِ عبرت ہے تیرا حال دنیا کے لیے
زندگی ہے تلخ تجھ سے ناشکیبا کے لیے

آ ادھر آ پاس او سرمایہ دارِ زندگی
میں بھی تیرا ہمنوا ہوں غمگسارِ زندگی

تجھ سے سننا چاہتا ہوں داستانِ دردوغم
پھر سنانا چاہتا ہوں کچھ بیانِ دردوغم

اقدس حیدرآبادی

سفرِ حجاز کی مختصر رُوداد

(بسلسلۂ الناظر ماہ جولائی ۱۹۲۴ء)

۱۴۔جون روز پنجشنبہ علی الصباح پڑاؤ کا گشت لگایا اور تقریباً قافلہ کی ہر چھوٹی بڑی ٹکڑی پر نظر دوڑائی مگر نظام الدین لاہوری کی تلاش میں کامیابی نہ ہوئی۔ وسط میں ایک شکستہ قلعہ نظر آیا جسکے اطراف میں پڑاؤ کا بازار تھا۔ دوسرے مقامات کی طرح اگرچہ یہاں کوئی مستقل بازار نہیں ہے لیکن چونکہ بندرگاہ ینبوع کی طرف سے جو قافلے مدینۂ منورہ جاتے ہیں اُن کا رہگذر یہی ہے اور اسوقت تو مکۂ معظمہ کا تقریباً پورا قافلہ یہیں یکجا تھا اس لیے بکثرت دوکانیں لگی ہوئی تھیں۔ گوشت اور دیگر ضروری اشیا کی فراوانی کے علاوہ جو تقریباً ہر پڑاؤ پر ملتی تھیں یہاں سبزی، پیاز اور رسالے بھی زیادہ مقدار میں نظر آئے۔

پڑاؤ چونکہ قلعہ کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اس لیے بہت دیر میں گشت تمام ہوا۔ اپنے مقام پر واپس آکر پہلا کام یہ کیا کہ میر صاحب سے ایک گنّی مستعار لیکر بازار سے مجیدیاں بھنائیں اور رحمت شاہ کے مصارف تجہیز و تکفین ادا کیے۔ پھر اُنکے آلودہ بستر اور کپڑوں کو ایک پشاوری مولوی صاحب کی معرفت جو ہمارے ہمراہ تھے ساکین حجاج میں تقسیم کیا۔ عصر کے بعد ایکبار پھر نظام الدین کی تلاش کے لیے نکلا مگر اِس دفعہ بھی ناکامیاب رہا۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ خبر دریافت ہوئی کہ ترارع سے حیدرآبادی قافلہ اور حضرت شمس المشائخ معہ اپنے ہمراہیوں کے اور بعض اور ٹکڑیاں ادھر نہیں آئیں بلکہ اُنھوں نے احمدیوں کو مجیدیاں دینے سے انکار کردیا اور اس بنا پر غائر کا رستہ اختیار کیا جس میں ایک بلند پہاڑی پر سے گذرنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔

۱۵۔جون روز جمعہ آج صبح سے چل چلاؤ کا سامان ہے۔ رحمت شاہ کے انتقال سے میرے شغدف میں جو جگہ خالی ہوگئی تھی میں چاہتا تھا کہ اُس پر پشاوری مولوی صاحب کو بٹھالوں جو بیرحسانی سے برابر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوکر منازل طے کر رہے تھے۔ مگر جمّال باوجودیکہ ۵ر یومیہ کے بجائے اب اُس سے کہا گیا کہ صرف ۵ر بخشش کے ملیں گے کسی طرح راضی نہ ہوا۔ اور میزان برابر کرنے کے لیے

خالی شغدف پر میرے زائد سامان کا بورہ لاد دیا۔ قافلہ ظہر کے قریب روانہ ہوا۔ مگر تھوڑی دُور بھی نہ گیا تھا کہ ٹھہر گیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کا کوئی اور شیخ نمودار ہو گیا ہے اور حملہ کرنے کی دھمکی دیتا ہے اس لیے قافلہ آج قیام کرے گا۔ خدا خدا کر کے ایک ہفتہ کے بعد روانگی ہوئی تھی اور اب جو دوبارہ اقامت کی اطلاع ملی تو بہت ناگوار ہوئی جس معقوم کو ہم سبھوں نے ملکر گھیر لیا اور خدا مجھے معاف فرمائیں کہ میں نے اُس غریب کو بہت ڈانٹا۔

۱۶۔جون روزِ شنبہ | صبح کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد معمول کے مطابق تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے ہم نے رضائیوں کا تنبو تان لیا تھا۔ چاشت کے اخیر وقت میں تپش سے بچنے کے لیے ہمارے جمالوں کے ساتھ کئی اور بدو اور جمال ہمارے تنبو کے نیچے آ کر جمع ہو گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بدو احمدی فرقہ کے ہیں، تو میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں اُن سے شکایت کی کہ تمام اہلِ عرب اپنے مہمانوں کی بڑی خاطر کرتے ہیں اور تم لوگ کیسے ہو کہ حجاج کو جو اسوقت نہ صرف اہلِ عرب کے بلکہ خدا اور اُسکے رسولؐ کے مہمان ہیں پریشان کرتے ہو۔ اُن میں سے ایک نے میری گفتگو سننے کے بعد فوراً ہی کہا "اور شریف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو حجاج سے چودہ گنّی فی اونٹ وصول کرتا ہے اور جمالوں کو صرف پانچ چھ گنّیوں پر ٹرخا دیتا ہے اور باقی خود ہضم کر جاتا ہے"۔ احمدی کی اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ اور یقیناً امیر الحج کے اس مہمان نوازانہ طرزِ عمل کے بعد غریب بدوؤں سے یہ توقع رکھنا عبث ہی ہوگا کہ وہ اپنی روایات مہمان نوازی کو برقرار رکھنے کے لیے اس موقع پر سال بھر کا آزوقہ جمع کرنے کی فکر سے باز رہیں گے۔

بالآخر ظہر کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔ مغرب کے وقت بیر الروحہ پر نماز کے لیے قافلہ رُکا تو چار پانچ گھنٹے وہیں رُکا رہا۔ معلوم ہوا کہ کچھ بدوی قبائل نے یہاں بھی روک لیا ہے۔ قافلہ چل رہا ہو تو شب کے وقت شغدف میں پڑے رہنے کے سوا چارہ نہیں مگر قافلہ رُکا ہوا تھا اسلیے شغدف میں پڑا رہنا کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ میں کچھ دُور تک ٹہلتا ہوا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک مقام پر قہوہ اور چائے کی چند دوکانیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک جمال کو ہمراہ لیکر میں بھی وہاں پہونچا اور اُسکے ساتھ بیٹھکر چائے پی۔ عشاء پڑھکر پھر شغدف میں سوار ہو گیا۔ اور جب قافلہ چلا تو نیند آ گئی۔

۱۷۔جون روزِ یکشنبہ | صبح کو قافلہ پھر ایک مقام پر رُکا جس کا نام غالباً غار بتایا گیا۔ یہاں دو طرفہ

پہاڑیاں تھیں جن پر سے برابر بندوقوں کے چھوٹنے کی آوازیں آتی تھیں - بعد کو پتہ چلا کہ سوا مجیدی کا مطالبہ ہے - مجبوراً یہ رقم بھی ادا کی گئی - تب قافلہ روانہ ہوا اور دوپہر کے قریب ہویقہ میں مقیم ہوا - یہاں کا پانی اس قدر کھاری تھا کہ دال چاول کا گلنا بھی مشکل نظر آیا - ہم لوگ بازار سے ہٹ کر ایک کنوئیں کے قریب ٹھہرے تھے - بقیہ قافلہ بازار کے قرب میں اور ہم سے کسی قدر فاصلہ پر تھا - ایک کنواں اُس مقام پر بھی تھا - یہاں لکڑیاں بہت بکنے آئیں جنکو بڑے شوق سے سب لوگوں نے خریدا - رات بہت ٹھنڈی ہوئی - سردی کی وجہ سے اس قدر چھینکے نکل آئے کہ نصف شب کے بعد سونا دشوار ہوگیا - آخر پریشان ہوکر شغدفوں کے اندر پناہ لی -

۱۸ جون روز دوشنبہ سویرے ہی سے روانگی کا اہتمام ہوا - عجلت میں صرف چاول پکائے اور شکر یا پیاز کے ساتھ کھائے گئے - ایک مجیدی آج اور طلب کی گئی تھی مگر معتومین نے نہیں دلائی بلکہ قافلہ کو جلد سے لیجانا پسند کیا - ظہر پڑھ کر سوار ہوئے - عصر کے بعد ایک جگہ ایک پتھر نظر پڑا جس پر اُس خط میں کچھ عبارت منقوش دیکھی جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ جات سے مشابہ تھی - بے اختیار جی چاہا کہ قافلہ روک کر یہاں قیام کیا جائے اور اس تحریر کو کسی سے پڑھوا کر دیکھا جائے شاید یہ کوئی اہم آثار ثابت ہو - مگر قافلہ کا روکنا بس کی بات نہ تھی - مغرب کے قریب جب ٹھنڈا ہوگیا تو جی چاہا کہ قمری مہینہ کی ابتدا ہے آج کچھ دیر شب ماہ میں اونٹ کی کھلی پیٹھ پر سوار ہونا چاہیے - لہذا نماز مغرب سے فارغ ہوکر جمال کو اپنی جگہ شغدف میں بٹھایا اور اسکے کوتل اونٹ پر تقریباً ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا - مگر اتنی ہی دیر میں ہچکولوں نے خستہ کر دیا - اس منزل میں اگرچہ تاسحر پتھریلی اور ناہموار زمین سے سابقہ رہا مگر مغرب کے بعد ہی پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوگئی تھی اور عشاء کے وقت سے تو ایک نہایت ہی دشوار گذار گھاٹی میں چل رہے تھے - پہاڑی زیادہ بلند نہ تھی مگر راستہ نہایت ناہموار تھا جسکی وجہ سے اکثر اونٹ چلتے چلتے اگلے گھٹنوں کے بل گر پڑتے - الحمد للہ کہ مجھے اس قسم کی کوئی افتاد نہیں پڑی لیکن جب تک پہاڑی کے اوپر نہیں پہونچ گئے، ایک منٹ کے لیے بھی چین سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا - نصف شب کے بعد پہاڑی راستہ تمام ہوا اور مسطح میدان آگیا - جہاں پہونچکر دفعۃً خنکی بڑھ گئی -

نظرے خوش گذرے

الناظر کا پرچہ مشترکہ شایع کرنے میں مجھے تامل تھا مگر بغیر اسکے ممکن نہ ہوا کہ پرچہ کی ماہ بماہ اشاعت کا انتظام ہوسکے۔ لہذا اس دفعہ دو ماہ کا پرچہ شایع کیا جاتا ہے۔ اس پرچہ کا حجم اگرچہ ڈیڑھ سو ۱۵۰ صفحے کے قریب ہے مگر افسوس ہے کہ چلپی صاحب کی جولانی قلم نے روداد سفر حجاز کے اوراق بہت کم کردیے۔ حالانکہ مدینہ منورہ کی منزل کے کافی حالات لکھ گئے تھے جو انشاء اللہ آیندہ پرچہ میں پیش کیے جائیں گے۔ خدا کرے اب ماہ بماہ اشاعت میں کوئی امر مانع نہ ہو کہ ناظرین کرام تقاضا کرنے کی زحمت سے اور ایڈیٹر اظہار ندامت و عذر خواہی سے محفوظ رہے۔ آمین یارب العالمین۔

ہمیں افسوس ہے کہ ستمبر نمبر میں عزیز صاحب کی غزل کے دوسرے شعر میں "غلط انداز اک نظر" کی جگہ "غلط انداز اک ادا" چھپ گیا ہے۔ غلطی اتنی نمایاں ہے کہ کسی صاحب نظر کو یہ بدگمانی نہ ہوگی کہ عزیز صاحب نے اسی طرح نظم کیا ہوگا۔ البتہ ایک کرم فرمانے اس میں شک ظاہر کیا ہے کہ "دل کی بستی تمام لوٹ گئی" میں "لوٹ گئی" کا استعمال جائز، مناسب یا پسندیدہ ہو سکتا ہے۔ خود عزیز صاحب یا اور کوئی صاحب مناسب جانیں تو اس بارے میں اپنے افادات سے مستفید فرمائیں۔

انجمن اُردو نے گذشتہ دو ماہ کے اندر کم سے کم اتنا تو کیا ہے کہ مجلس انتظامیہ کے متعدد جلسے کرکے پیش نظر مقاصد کے لحاظ سے تین شعبوں میں کام تقسیم کردیا ہے۔ اور ان میں جو سب سے اہم شعبۂ تصنیف و تالیف ہے اُسکی باقاعدہ تنظیم بھی ہوگئی ہے۔ شعبہ کے پانچ رکن علاوہ اُن اصحاب کے رکھے گئے ہیں جو بحیثیت اپنے عہدہ کے رکن رہیں گے۔ ڈاکٹر بذل الرحمٰن ایم اے معلم اعلیٰ عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی شعبہ کے ناظم مقرر کیے گئے ہیں اور مولانا عبدالحلیم شرر۔ مولوی عبدالماجد بی اے پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے و ایڈیٹر الناظر اُسکے ارکان بنائے گئے ہیں۔ شعبہ کے اجلاس اول میں ایک نظام عمل مرتب کرلیا گیا ہے اور جن کتابوں کا انتخاب اس وقت کیا گیا ہے امید ہے کہ سال آیندہ کے اندر اندر ان میں سے بعض شایع ہوجائیں گی۔ مفصل نظام عمل انشاء اللہ آیندہ پرچہ میں شایع کیا جائے گا۔

ہر دو کی سے صادق حسین صاحب نے جو مزاحاً اپنے تئیں فلسفہ کا گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں کرمی سلطان حیدر صاحب جوش کی تائید اور چلپی صاحب کی تردید میں ایک مضمون ارسال فرمایا ہے اور بخیال خویش الناظر کی اخلاقی جرأت کا امتحان لینا چاہا ہے۔ اگر مضمون کی اشاعت میں ناظرین الناظر، ایڈیٹر، چلپی یا خود جوش صاحب کا کچھ نفع ہوتا، یا کسی علمی و ادبی، اخلاقی و معاشرتی، اقتصادی و سیاسی، تاریخی و مذہبی مسئلہ پر اس میں کوئی معلومات فراہم کی گئی ہوتی تو یقیناً اس خیال سے اسکی اشاعت نہ روکی جاتی کہ چلپی صاحب کے مضمون کی تردید ہے لیکن مضمون کو شروع سے لیکر آخر تک پڑھنے کے بعد میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور رہوں کہ اسکی اشاعت سے احتراز کروں۔ میں جانتا ہوں کہ فیہ ما فیہ کی بندوق دغ جانے کے بعد اس قسم کی تحریروں کا قلمبند ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں۔ اور اگر سلطان حیدر صاحب پسند کرتے تو وہ اپنے دلچسپ افسانوں کے ذریعہ تنہا الناظر میں نہیں بلکہ دوسرے رسائل میں بھی چلپی صاحب کے نقطۂ نظر سے پوری طرح اختلاف کر سکتے تھے۔ اور اس ضمن میں وہ چاہتے تو انتقام کے کافی سے زائد موا قع حاصل ہو سکتے۔ گو میں اُن سے بھی یہی عرض کروں گا کہ

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

افادات مہدی پر ایک نظر" کے عنوان سے جو مضمون گذشتہ پرچہ میں شایع ہوا تھا اس پر ایک تنقید وصول ہوئی ہے۔ مرحوم مہدی حسن کی زندگی ہی میں الناظر میں اُنکی بعض تحریروں پر تنقیدیں شایع ہو چکی ہیں اور اگر اب بھی کوئی صاحب اُنکے مجموعۂ مضامین پر مفصل تنقید لکھیں تو ضرور شایع کی جائیگی۔ لیکن اخباری مضامین کی طرح اگر رسالہ کے ہر مضمون پر سلسلۂ بحث چھڑ جائے تو اصل مقصد فوت ہو جائیگا اس لیے اس تنقید کی اشاعت سے معذوری ظاہر کر دیگئی ہے۔ البتہ اس تحریر کے بعض ضروری حصوں کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ "مرحوم کی عمر کا کوئی اندازہ بیگم صاحبہ نے نہیں فرمایا" عبد القیوم صاحب ندسی بتاتے ہیں کہ

"افادات کے صفحہ ۲۵ پر 'انکی یاد' کے تحت میں لکھا ہوا ہے کہ عمر کوئی ۴۶ - ۴۷ برس کی ہوگی لیکن ابھی بھی اُنکی صورت یا اُنکے کسی انداز سے معلوم نہیں ہوتی تھی۔"

افادات مہدی کے متعلق خود معترض صاحب کا خیال یہ ہے: "اس میں شک نہیں کہ بعض ادبی لغزشیں نظر انداز کر دی جائیں جنکا حضرت مہدی سے ہونا تعجب انگیز ہے تو اُنکے مضامین اعتقادات عالیہ کے تحت میں آسکتے ہیں اور واقعتہً آپکے مضامین خوب ہیں خصوصاً مہدی مرحوم کی اصابت رائے نکتہ فہمی ذوق ادبی ایسی چیزیں ہیں جنکی داد نہ دینا ظلم ہے مگر یہی حد تک کہ اُنکے مضامین مضامین سمجھے جائیں ورنہ مجموعۂ مضامین پر بحیثیت تصنیف نظر ڈالی جائے تو مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں کوئی اچھی رائے ظاہر نہ کر سکوں گا۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱۲ جلد ۲۷ — دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء

فیہ مافیہ

(اثر خامہ : چلپی)

ایک مسلم کی اسلام نوازی

پنجاب کے سر میاں محمد شفیع کا نام نامی مسلمانان ہند کے لیے نامانوس نہیں، مدتوں آپ اس بدنصیب قوم کی "لیڈری" کے تخت پر رونق افروز رہ چکے ہیں۔ ادھر چند سال سے حکومت ہند کے اعلیٰ ترین مناصب، وزارت تعلیم و وزارت قانون پر فائز تھے۔ اور اب ان مناصب جلیلہ سے سبکدوشی کے بعد غالباً پھر قومی لیڈری کے مشغلۂ قدیم کی جانب توجہ فرمائیں۔ سرکاری گروہ میں آپ کو جو مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی، اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ وایسرائے بہادر سے لیکر چھوٹے چھوٹے "صاحبوں" تک سب کو آپ کی مفارقت پر قلق و تاسف ہوا۔ حکام والا مقام کی طرف سے آپ کی الوداع میں کثرت تقریبات ہوئیں، اور سب نے آپ کو اُنھیں جذبات حزن و ملال کے ساتھ رخصت کیا، جو دنیا میں ہر "یار عزیز" و "حبیب لبیب" سے چھوٹنے کے وقت قدرۃً ہر قلب بشری میں پیدا ہوتے ہیں۔

جنابِ ویسرائے بہادر ـــــــ ہاں وہی وایسرائے جن کا عہدِ حکومت گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی، حسین احمد، موتی لال، داس، جواہر لال، کچلو، حسرت، اور دیگر محبانِ وطن کے اسیرِ زنداں کرانے کے لیے تاریخ ہند میں ہمیشہ یادگار رہیگا ـــــــ نے اپنی الوداعی تقریر میں اپنے اس "یارِ وفادار" کے جہاں اور سب فضائل و مناقب ارشاد فرمائے، وہاں اس کارنامہ کو خاص اہمیت و امتیاز دے کر بیان فرمایا، کہ جس زمانہ میں خلافت کے متعلق مسلمانانِ ہند میں خاص "شورش" برپا تھی، "اُس" نازک زمانہ" میں

"خوش قسمتی سے مجھے سر شفیع کی رفاقت نصیب تھی"

اور اس کا اعتراف کیا کہ اس زمانہ میں سر موصوف کی ذات سے

"مجھے نہایت گراں قدر و بیش بہا امداد ملی"

اس امداد و اعانت کی کیا نوعیت تھی؟ اسکی تفصیل بیان کرنا اگر "حاکم" و "فاتح" قوم کے سب سے زیادہ معتمد فرد کے مصالح کے خلاف تھی، تو "محکوم" و "مفتوح" قوم کے ضعیف و پست افراد کو بھی اسکے معلوم کرنے پر زیادہ اصرار نہیں ۔ خلوت کے بہت سے اسرار اغیار کے سامنے لانے کے قابل نہیں ہوتے۔ لیکن اسے کیا کیجیے، کہ کسی کی نگاہِ شرمگیں، خود ہی زبان بن کر، صحبتِ شب کے سارے راز و نیاز بے پردہ کردیتی ہے!

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں،
تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں!

یہ تو فراست شاعرانہ کا کرشمہ تھا، پھر جب فراست شاعرانہ کے ساتھ فراست ایمانی بھی شامل ہوجائے تو جماعت مومنین کے لیے وایسرائے بہادر کی تصریح و اخفاء، تفصیل و اجمال، تکلم و سکوت، سب یکساں ہے!

بہرحال، اس خدمت جلیلہ کی جزئیات تو اُسوقت معلوم ہو کر رہیں گی، جب ہر شے اپنی اصلی صورت میں بے نقاب ہو کر آئیگی، جب شملہ و لندن کے گورے دیوتا اپنے سے کہیں قادر تر و توانا تر حاکم کے حضور میں اپنے کالے پرستاروں کے ساتھ صف بستہ حاضر ہوں گے، اور جب لارڈ کرزن اور محمود الحسن، لارڈ ریڈنگ اور حسین احمد، لائڈ جارج اور محمد علی کے درمیان انصاف ہو کر رہے گا، سردست اس مسلمان وزیر سلطنت کے ایک روشن تر کارنامہ کی داد دینا مقصود ہے ۔ بیگم شفیع صاحبہ ہر زنِ مسلمہ کی طرح، سارے مسلمانوں کے لیے ایک واجب الاحترام خاتون تھیں، لیکن اب معلوم ہوا، کہ وہ شملہ کی بلندیوں پر انگریزی

صحبتوں میں، سرکاری کوٹھیوں میں "بیگم شفیع" کے بجائے "لیڈی شفیع" ہوتی تھیں، اور گو وحشی و بد تہذیب مسلمانوں کے سامنے پردہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ مہذب و شائستہ، قدسی خصال و ملائک سرشت حکام انگریز کے درمیان ان کا پردہ کی جاہلانہ و وحشیانہ رسم پر مُصر رہنا بالکل بے معنی تھا۔ دہلی و شملہ کے گورے دیوتاؤں سے ملیں، اور ملتی رہیں، اور نہ صرف خود، بلکہ اپنی صاحبزادیوں اور اپنی بہو کو بھی شریکِ بزم فرماتی رہیں، چنانچہ ۱۵۔ نومبر کی شب کو جو عظیم الشان ڈنر ہوا، اور جس میں بجز سر شفیع کے شاید ایک بھی مسلمان شریک نہ تھا، اُس میں لیڈی شفیع مع اپنی بہو اور دونوں صاحبزادیوں کے رونق افروز تھیں۔ ڈنر کے بعد لیڈی صاحبہ کا "جام صحت" خود جناب وائسرائے بہادر نے تجویز فرمایا، اور دوران تقریر میں اُنکے شوہر نامدار کے سارے مناقب و کمالات بیان کرنے کے بعد آخر میں حسب ذیل گہر فشانی کی:۔

"سر محمد شفیع کے ہم پر صرف اسی قدر احسانات نہیں، بلکہ یہ بھی ہے، کہ اُنھوں نے لیڈی شفیع کو ہمارے حلقہ احباب (سوشل سرکل) میں شامل کرایا۔ میرے ورود شملہ کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا، کہ جبھی مجھے لیڈی شفیع سے ملنے کی مسرت حاصل ہوگئی، اور میں یہ بیان کردینا چاہتا ہوں کہ مجھے کس قدر مسرت اس امر سے ہوئی کہ اُنھوں نے ہمارے درمیان آنا پسند فرمایا۔ اور ہماری صحبتوں کو خود اپنی، نیز اپنی صاحبزادیوں کی شرکت سے پُر لطف بنایا"

تقریبًا اسی قسم کے الفاظ سر الگزنڈر مڈی مین (ہوم ممبر) نے بھی کسی دوسرے موقع پر، لیڈی ممدوحہ کی شان میں اپنی زبان مبارک سے صادر فرمائے ہیں!

امت محمدیہ کی اس عزت افزائی پر، ملت اسلامیہ کے اِس مجد و شرف پر، اور مسلمانانِ ہند کے اس اوج تقدیر پر، خود دین اسلام سر شفیع اور لیڈی شفیع دونوں کا تہ دل سے ممنون و سپاس گزار ہے!

تہذیب کی معراج کمال

اہل ہند کے مطالبۂ حقوق کا ایک جواب خدایانِ مجازی کی طرف سے ہمیشہ یہ ملتا رہا ہے، کہ فضائے ہند میں ابھی حریت و حکومت خود اختیاری کی اہلیت ہی نہیں، اور اسکے ثبوت میں دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ کونسل یا میونسپلٹی کے انتخاب کے مواقع پر اُمیدواروں میں باہم سخت کشمکش ہوتی ہے۔ گویا انتخاب ارکان کی کارروائیوں میں، مجلس وعظ و پند کی طرح انتہائی سنجیدگی و سکون برقرار رہنا چاہیے! غریب ہندوستان تو ابھی پارلیمنٹری انتخاب کے فن میں ہنوز بالکل نو آموز ہے، ابتدا میں جتنی بھی ٹھوکریں

کھائے کم ہے۔ اور پھر یہاں کے باشندوں کے درمیان قومی، مذہبی، و لسانی اختلافات، سب پر روشن، پس یہاں اگر اختلافات رونما ہوں بھی، تو حیرت کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔ سوال یہ ہے، کہ جو ملک اس فن میں اُستادی کا مدعی ہو، جو تہذیب و شائستگی کے معراج کمال پر پہونچا ہوا ہے، جو صدہا سال سے انتخابات کا خوگر ہے، اور جو مختلف اقوام و ملل کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک متحد قوم ہے، خود وہاں کے انتخابات میں سکون و سنجیدگی کا پارہ کس درجہ پر قائم رہتا ہے؟

اس کا جواب مانچسٹر گارڈین کی حسب ذیل سرخیاں دینگی، جو پچھلے پارلیمنٹری انتخاب کے واقعات کے متعلق اس نے اپنے صفحات میں قائم کی تھیں:—

"ولیش اُمیدوار کا جسم نوچ ڈالا گیا"

"تقریر سننے کے بعد مجمع نے حملہ کر دیا"

"ایک امیدوار کو ضرب سے بیہوش کر دیا"

"علاقہ نارتھ ڈیون میں بلوہ کے آثار"

"ایک ٹوری اُمیدوار کو پتھر کا ہدف بنایا گیا"

"مقرر پر چاقو پھینک مارا گیا"

"پیشانی چاقو سے زخمی ہوئی"

"شور و ہنگامہ کے باعث تقریر ناتمام چھوڑنا پڑی"

"جلسہ پولیس کی نگرانی میں"

"مقرر کو مکہ بازی کی دھمکی"

یہ صرف ایک اخبار کی سرخیاں ہیں۔ اس طرح کے واقعات، زمانۂ انتخاب میں، انگلستان میں بہ کثرت پیش آتے رہے، اور ہر اخبار دوسری پارٹی کے متعلق سنگین سے سنگین الزامات لگاتا رہا۔ کیا بدتہذیبی و شورش، بیہودگی و تہذیبی اہل فرنگ کے لیے سب کچھ جائز ہے؟ اور اس کا عشر عشیر بھی اگر ہندوستان میں ہو جائے، تو ناجائز۔

آئرش انڈیپنڈنٹ لکھتا ہے، کہ یہ واقعات تو پھر بہت ہلکے ہیں، ایک صدی قبل، انتخاب کے موقع پر، ہر فریق ایک پوری معرکہ آرائی کا سامان کرتا تھا، حریف پر سنگریزوں کی بارش کی جاتی تھی، اور اکثر اوقات

ہاتھ پیر ٹوٹنے تک کی نوبت آجاتی تھی۔ ہمارے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بالقابہ انگلستان میں جاکر ایک جگہ ہندوستان کی تاریک خیالی وجہالت کی انتہائی مثال یہ پیش فرماتے ہیں کہ "وہاں ایک انتخاب کے موقع پر عذاب وثواب، دوزخ وجنت کو معرض بحث میں لایا گیا"! واقعی، عذاب وثواب، دوزخ وجنت کے تذکرہ سے بڑھ کر، جہالت وتاریک خیالی کی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔ باقی درشت کلامی کرنا، ایک دوسرے کی تفضیح کرنا، اتہامات لگانا، فریق مقابل پر حملہ کردینا، اینٹ پتھر برسانا، چھری چاقو کے وار کرنا، ضرب شدید سے بیہوش کردینا، ہاتھ پیر توڑ دینا، یہ سارے واقعات، منتہائے کمال، ومعراج شائستگی کے مظاہر ہیں!

یہ اخلاقی زندگی کا نمونہ تھا۔ اب مالی پہلو ملاحظہ ہو۔ اُمیدواران انتخاب کی کُل تعداد ۱۴۴۶ تھی اور ان سب کو مجموعی مصارف ۹۸۲۳۴۰ پونڈ پڑے۔ گویا اوسطاً ہر امیدوار کو تقریباً سات سو پونڈ (۱۰۵۰۰ روپیہ) خرچ کرنے پڑے! چند امیدواروں کے مصارف متعین طور پر بھی شایع ہوچکے ہیں، شلاً

مسٹر ریمزے میکڈانلڈ	کے مصارف	۱۰۵۲ پونڈ
مسٹر ہالڈین	"	۸۴۴ "
مسٹر اسکوتھ	"	۷۴۳ "
مسٹر لائڈ جارج	"	۵۰۷ "
سرجارج ہملٹن	"	۱۴۹۲ "

مشرقی تہذیب میں کسی شخص کا کسی اعلیٰ منصب وجاہ کے لیے اپنے تئیں پیش کرنا، جس حد تک درست ہوسکتا ہے، سب کو معلوم ہے، چہ جائیکہ اس پر زر کثیر صرف کرنا، اور اپنے کمالات ومناقب کو خود اپنی زبان سے یا اپنے احباب کی طرف سے شایع کرنا۔ لیکن مغرب کے فلسفۂ اخلاق میں خودستائی وخودنمائی عیب نہیں ہنر، نقص نہیں کمال، موجب ننگ وعار نہیں، باعث فخر ومباہات ہے۔ اور کون ہے، جو دانایان مغرب کے کسی قول وفعل پر اعتراض کی جرأت کرسکتا ہے؟

بدایونی پروپگنڈا

سلطان نجد واہل نجد کی مخالفت میں بدایونی پروپگنڈا، اب تک اپنے صدر مقام نیر تاباں شاخوں سے، زور وشور کے ساتھ جاری ہے، لیکن یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ملک اس سے غیر متاثر ہے، اور

ہمدرد، زمیندار، سیاست، مدینہ، تنظیم، وغیرہ اسلامی اخبارات نے جو صحیح روش اس باب میں ابتدا سے اختیار کی تھی، اُس پر برابر قائم ہیں۔ وفد نجد و حجاز بھی الحمد للہ روانہ ہوگیا۔ خداوند کریم اُسکی کوششوں کے نتائج کو اسلام و مسلمین کے حق میں مفید ثابت کرے۔ جو شے اس پروپگنڈا میں سب سے زیادہ تاسف انگیز ہے وہ یہ ہے، کہ اہل نجد کو بدنام کرنے کے لیے اُنکی جانب خواہ مخواہ ایسے عقائد کا انتساب کیا جارہا ہے، جو اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، کہ اہل نجد کے عقائد، بعض مسائل میں عام حنفیہ و صوفیہ کے عقائد سے مختلف ہیں، لیکن اسکے یہ معنی تو نہیں، کہ اُنکے سر وہ گندے عقائد تھوپ دیے جائیں، جن سے وہ بیچارے بار بار، اور پُر زور طور پر تبرّی و تحاشی کر چکے ہیں، مثلاً یہ کہ وہ (نعوذ باللہ) توہین قرآن، توہین رسولؐ کرتے ہیں، یا یہ کہ شفاعت رسولؐ کے منکر ہیں، یا یہ کہ درود خوانی کے مانع ہیں۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

اس قسم کے اتہامات کے جواب میں ہم خود نجدیوں کا بیان پیش کرتے ہیں۔ یہ عبارت شیخ سلیمان بن سحمان نجدی کی کتاب "الہدیۃ السنیۃ التحفۃ الوہابیۃ النجدیہ" کی ہے، جو اہل نجد کی ایک مستند تالیف ہے، اور مطبع منار، مصر سے سلطان عبد العزیز بن سعود کے حکم سے اسی سال شایع ہوئی ہے:-

... واما ما یکذب علینا ستراً للحق وتلبیساً علی الخلق بانا نفسر القرآن برائنا وناخذ من الحدیث ما وافق افہامنا ...... وانا نضع من رتبۃ نبینا محمد صلعم بقولنا ان النبی رمۃ فی قبرہ وعصا احدنا انفع منہ ولیس لہ شفاعۃ وان زیارتہ غیر مندوبۃ ... سبحانک ہذا بہتان عظیم فمن روی عنا شیئاً من ذٰلک او نسبہ الینا فقد کذب علینا وافترٰی ومن شاہد حالنا وحضر مجالسنا وتحقق ما عندنا علم قطعیاً ان جمیع ذٰلک وضعہ وافتراہ اعداء

اور جو امور حق پوشی اور فریب خلق کے لیے ہماری طرف جھوٹ منسوب کیے جاتے ہیں، مثلاً یہ کہ ہم قرآن کی تفسیر بالرّائے کرتے ہیں، اور صرف وہی احادیث قبول کرتے ہیں جو ہمارے فہم کے مطابق ہوں، ... اور یہ کہ ہم اپنے نبی محمد صلعم کی توہین یہ کہکر کرتے ہیں کہ وہ اپنی قبر میں سڑ چکے، اور ہمارا عصا اُن سے زیادہ بکار آمد ہے، اور اُنکی شفاعت باطل اور اُنکے روضہ کی زیارت ناجائز ... حاشا، یہ سب ہمارے اوپر افترائے عظیم ہے۔ جس نے ان امور میں ہم سے کچھ بھی روایت کی، یا ہماری جانب منسوب کیا اُس نے ہم پر افتراء کیا، اور ہم کو جھوٹ لگایا۔ جو شخص ہم سے واقف ہے، اور ہمارے جلسوں میں شریک ہوتا ہے اور ہمارے عقائد کا صحیح علم رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ سب اتہامات ہم پر

الدین واخوان الشیاطین ... نعتقد ان رتبۃ نبینا محمد صلعم اعلیٰ مراتب المخلوقین علی الاطلاق وانّہٗ حیٌّ فی قبرہ حیوۃً برزخیۃً ابلغُ من حیوۃ الشہدآء المنصوص علیہا فی التنزیل اذ ہو افضل انہم بلا ریب وانہٗ یسمع سلام المسلم علیہ وتسن زیارتہ .... ومن اَنفقَ نفیس اوقاتہ بالاشتغال بالصلوۃ علیہ الصلوۃ والسلام الواردۃ عنہ فقد فاز لسعادۃ الدارین وکفیٰ ہمّہ وغمہ کما جاء فی الحدیث عنہ ولا ننکر کرامات الاولیاء ونعترف لہم بالحق وانہم علےٰ ہُدًی من ربہم ..... ونثبت الشفاعۃ لنبینا محمد صلعم یوم القیامۃ حسب ما ورد وکذا نثبت لسائر الانبیاء والملئکۃ والاولیاء والاطفال حسب ما ورد (ص ۴۶-۴۷)

اعدائے دین واخوان الشیاطین نے لگائے ہیں ... ہمارا اعتقاد تو یہ ہیں، کہ ہمارے نبی محمد صلعم کا مرتبہ تمام مخلوقات سے قطعاً برتر ہے، اور آپ اپنی قبر میں برزخی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں، جو شہداء کی زندگی سے حسب تصریح قرآن مجید، کہیں افضل ہے اس لیے کہ آپ خود اُن سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اور آپ سلام کرنے والے کا سلام سنتے ہیں، اور آپ کے روضہ کی زیارت مسنون ہے ..... اور جو شخص اپنے اوقات عزیز کو آپ کے بتائے ہوئے درود کو آپ پر پڑھنے میں صرف کرے، تو وہ شخص دونوں جہان کی مرادیں پائے گا اور اُسکے غم و افکار سب بحکم حدیث دور ہو جائیں گے۔ اور نہ ہم اولیاء اللہ کی کرامات کے منکر ہیں، بلکہ اُن کا حق پہچانتے ہیں اور اُن کو ہدایت الٰہی پر جانتے ہیں۔ اور ہم روز قیامت میں اپنے نبی محمد صلعم کی شفاعت پر یقین رکھتے ہیں، اور نہ صرف اُن کی بلکہ حسب فرمان شریعت تمام انبیاء و ملائکہ و اولیاء اور بچوں کی شفاعت پر بھی۔

کیا ان تصریحات، ان واضح بیانات کے بعد بھی وہابیہ بدستور صدہا ناکردہ گناہوں کے مجرم برقرار رہیں گے؟

سلام جناب سلطان حیدر صاحب تحصیلدار کی خدمت مبارک میں ستمبر نمبر میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا، اُس سے قدرۃً اُنکی برافروختگی کا پارہ حد سے تجاوز کر گیا۔ تحصیلداروں اور مجسٹریٹوں کا غصہ ضرب المثل ہے، خدا کا شکر ہے، کہ غریب الناظر اُن کے قلمرو کے حدود سے باہر ہے۔ بہرحال ایک راوی معتبر کا بیان ہے کہ روزانہ اخبارات سے لیکر ماہوار رسائل تک اور دہلی سے لیکر بھوپال تک "پُرغضب جوابات" کی ڈاک بٹھا دی گئی ہے۔ دُنیا کے لیے یہ تجربہ نیا نہیں، اس سے پیشتر بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ آیات قرآنی

کا وعظ سنانے والوں کو ان قلمی "جوابات" سے کہیں بڑھ کر خطرات درپیش رہے ہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمُنْکَرَ یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ بِالَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْہِمْ اٰیٰتِنَا (حج، ع ۹)

ان منکروں کو جب ہماری واضح آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے چہروں سے برہمی ٹپکنے لگتی ہے - اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ ہماری آیات کے سنانے والوں پر حملہ ہی کر بیٹھیں گے۔

ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد اگر اسی سایکالوجی (ذہنیت) کا ظہور آج اپنی پوری قوت کے ساتھ ہو رہا ہو، تو یہ عین قانون الٰہی کی ایک تازہ تصدیق ہے۔ چڑھے ہوئے تیوروں اور چڑھی ہوئی آستینوں دونوں کے مقابلہ میں کلام الٰہی کی ہدایت ہے کہ صرف "سلام" کہکر سکوت اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ جناب سلطان حیدر صاحب کی خدمت گرامی میں بصد ادب و نیاز "سلام" عرض کیا جاتا ہے، اُمید ہے کہ وہ قبول فرمائیں گے۔

انعامی مضمون

اگست کے الناظر میں ایک اعلان کیا گیا تھا اور اہل قلم حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ مقابلۂ انعامی میں شرکت کریں۔ اعلان کو تقریباً دو درجن اخبارات و رسائل میں بھی شایع کرا دیا تھا۔ اور بہت سے احباب کے نام خطوط بھی چھپوا کر بھیجدیے تھے۔ غرض مشکل سے کوئی اہل قلم باقی رہا ہوگا جس نے اس اعلان کو نہ دیکھا ہو۔ مگر افسوس ہے کہ اہل قلم کی طرف سے جس سرگرمی و مستعدی کی توقع تھی اُس کے آثار کم نظر آتے ہیں۔ چونکہ آخری تاریخ ۳۱ - دسمبر ہے اس لیے ابھی صحیح رائے قائم کرنے کا موقع نہیں۔ انشاءاللہ آیندہ نمبر میں اطلاع دی جائے گی کہ کتنے مضامین آئے اور اُن میں سے کن کن اصحاب کے مضامین 'شرائط مقابلہ' کے مطابق مجلس انتخاب کے حوالہ کیے گئے۔

اڈیٹر

طنجہ و مراکش

غالباً دس برس ہوے کہ معاہدۂ طنجہ کا معاہدہ درپیش تھا۔ متعاقدین اسپین اور فرانس ہونیوالے تھے، کیونکہ ریف پر اسپین قابض تھا، اور تونس وغیرہ پر فرانس؛ اسکے علاوہ مراکش کا گلا فرانس کے ہاتھ میں ہے۔ بعد میں بوجہ طرابلس کے اٹلی بھی اپنے حق کو بغل میں دبائے ہوے پہونچا اور ایک فریق بننا چاہا۔ یہ دیکھکر انگلستان بھی آگے بڑھا۔ مگر اب سے چند روز پیشتر تک ابھی رقابت نے یہ معاہدہ مکمل نہ ہونے دیا، اور اس لیے معرض تعویق میں پڑا رہا کہ اصلی مالکان ملک غافل تھے۔ حضرت امیر عبدالکریم غازی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے متعلق کسی کو شان گمان بھی نہ تھا کہ انکو رب الافواج اس قابل کر دے گا کہ اس معاہدہ کی تکمیل کی اتنی جلد ضرورت پڑ جائیگی۔ چنانچہ جو معاہدہ دس برس میں مکمل نہ ہو سکا تھا وہ پورے دس روز میں تکمیل پذیر ہو گیا اور اُس پر فریقین کے دستخط بھی ہوگئے۔ اس معاہدہ کی شرائط کا علم مجھے نہیں ہے اور خیال یہ ہے کہ شاید ہندوستان میں ذی خبر لوگوں کو بھی اس کی خبر نہ ہو۔

"کن ٹیم پریری ریویو" میں ایک صاحب "آرگاڈن کیننگ" نے ایک مختصر سا مضمون عنوان بالا پر لکھا ہے جو ریف اور مراکش کے معاملات پر بہت کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ میں انتظار میں تھا کہ مجھ سے بہتر کوئی بزرگ اس مضمون پر توجہ فرمائیں گے۔ مگر مایوسی ہوئی۔ لاچار با وجود اعتراف ناقابلیت اس کا ترجمہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے۔ یہ امر شاید باعث دلچسپی ہو کہ مسٹر کیننگ امیر عبدالکریم کی مدد کے لیے ریف گئے ہیں۔

گورنمنٹ اور باشندگان انگلستان نے طنجہ کی اہمیت بلحاظ مصالح جنگی اور مراکش کی اہمیت بنظر امکانات فوائد اقتصادی، اور وہاں کے باشندوں کی قابلیت اور خواہشات کے یا تو بالکل نظرانداز کر دی ہے یا ان امور کا تخمینہ بہت کمی کے ساتھ لگایا ہے۔ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ طنجہ دنیا کے مقبوضات کی کنجیوں میں سے ایک کنجی ہے۔ برطانیہ عظمیٰ اپنی ضروریات زندگی کے لیے بحری تجارت کا محتاج ہے،

اُس لیے جو اولیت نہر سویز کو حاصل ہے وہی اہمیت طنجہ کی بھی ہے - اس سے کیا فائدہ ہے کہ ہم ممالک مشرقیہ کے بیرونی راستہ کی حفاظت میں آتنی احتیاطیں کریں - درانحالیکہ مغربی دروازہ کی یہ حالت ہے کہ جس وقت جس کا جی چاہے اُسکو بند کردے، یاکسی تجارتی جہاز کے لیے یہ راستہ بے حد خطرناک بنا دے - شاید طنجہ کے سوال کو کسی قدر غیر اہم سمجھ کر پس پشت ڈال دینے کے مختلف وجوہ میں سے ایک یہ بھی ہو کہ جبل الطارق (جبرالٹر) ہمارے قبضہ میں ہے - آیند و روند لوگوں کی نگاہ میں جبل طارق ایک مضبوط اور دشمنوں کے لیے مدہش قلعہ ہے، جو بحر روم کا مغربی دروازہ روکے ہوے ہے اور ساحل افریقیہ پر جو کچھ بھی گذرتا ہے اُس میں برطانیہ کے فوائد کا نگہبان ہے - لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ خیال واقعیت اور اصلیت سے بہت دور ہے - جبل طارق کی اس چٹان کو زمانۂ حال کا توپ خانہ اور جنگی طیارے ذراسی دیر میں ناقابل ماندو بود بنا سکتے ہیں - ماسوا اسکے یہ قلعہ آنکھوں میں کھٹکتا ہے اور دو قوموں کی نزاع کا باعث بنا ہوا ہے؛ اگر یہ نہ ہوتا تو یہ دونوں ایک دوسرے سے ملکر یکجہتی کے ساتھ کام کرسکتی تھیں - منجملہ اور باتوں کے بڑی بات یہ ہے کہ جبل طارق میں جنگی طیارے نہیں رہ سکتے - نظر بریں حالات ایک بین الاقوامی علاقہ قائم کرنے اور ریف اور فرانسیسی علاقہ کے معاملات روز بروز برطانیہ کے لیے اہم ہوتے چلے جاتے ہیں - اور اسکی ضرورت ہے کہ یہاں بہت جلد کوئی کارروائی شروع کردینا چاہیے - یہ معاملات ایسے ہیں کہ جس کی طرف ہماری گورنمنٹ اور باشندگان انگلستان کو تن دہی کے ساتھ متوجہ ہونا چاہیے - یہ کہکر کہ حال ہی میں طنجہ کا معاملہ طے ہوچکا ہے، اس طرف سے چشم پوشی کرلینی غیر مناسب ہے -

دیگر علاقہاے مراکش کی طرح اس ملک کے بین الاقوامی علاقہ کے باشندے ایسی نسل کے ہیں جن میں عربوں، سوسیوں اور ریفیوں کا خون ملا ہوا ہے - موخر الاسم لوگ ازروے تعداد زیادہ ہیں - اصل میں یہ لوگ اُس بڑی قوم کے افراد ہیں جو صدیوں سے بربر کہے جاتے ہیں اور جن کی اصلیت اب تک صحیح طور پر کوئی قرار نہیں دے سکا ہے[1] - چونکہ اہالی ریف ساحل کے قریب رہتے ہیں اسلیے ممکن ہے کہ اُن میں یورپ کے خون کا کچھ حصہ ملا ہوا ہو - ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ وینڈال اور وزی گاتھ

[1] اخبار الاندلس اور تاریخ مغرب دیکھنے سے انکی اصلیت پوری طرح معلوم ہوسکتی ہے - افسوس ہے کہ مسٹر گیننگ نے تحقیق سے کام نہیں لیا - (مترجم)

کے حملوں کا بقیہ ہوں ۔ یہ لوگ اُس زمانہ کی زنجیر کی بھی ایک کڑی ہو سکتے ہیں کہ جب اندلس میں تہذیب کا دور تھا ، اشبیلیہ، المریہ، اور غرناطہ شہرت کے بام اعلیٰ پر تھے ؛ یا اُن مسلمانوں کی اولاد ہوں جو اسپین سے جلا وطن کیے گئے تھے اور ۱۴۹۲ء سے لیکر ۱۶۱۰ء تک طیطوان اور طنجہ میں آ آکر بستے رہے تھے، اور جن کے قبضہ میں اب تک اپنے بزرگوں کے اندلسی مکانات کی کنجیاں چلی آتی ہیں ۔ لیکن خواہ وہ عرب ہوں یا ریفی، یہودی ہوں یا برطانی ، فرانسیسی) ہوں یا باشندگان اٹلی و اسپین، وہ یہ جانتے تھے کہ نومبر ۱۹۲۳ء میں ہماری زندگی کی وہ حالت نہیں رہی جو اکتوبر ۱۹۱۹ء میں تھی ۔ تمام شہر میں بیداری تھی ؛ اُسکی ملی جُلی آبادی کو یہ اُمید لگی ہوئی تھی کہ اس بندر کے متعلق ایک معاہدہ ہونے اور ایک قانون بننے والا ہے ؛ اس سے پہلے تو یہ کیفیت تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس خوشنما اور دلکش مقام میں زہریلی ہوا پھیلی ہوئی ہے ۔ ہر شخص کو یہ اُمید تھی کہ طنجہ کا عقدہ حل ہو جائے گا، اور خود اُنکے اور اُس شہر کے فوائد کئی قدم آگے بڑھ جائیں گے ۔ شاید باشندگان طنجہ میں سب سے زیادہ انتظار مورش (مسلمان) شرفاے شہر کو تھا ۔ کیونکہ وہ اس اُمید کو لیے ہوے خوش تھے کہ اس معاہدہ سے انکا مستقبل خوشگوار ہو جائے گا اور اُن کے ساتھ انصاف کا برتاؤ ہوگا[1] ۔

نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی علاقہ سمندر اور اسپین کے زیر اثر علاقہ سے محیط ہے ۔ پھر موخر الذکر علاقہ کو سمندر اور فرانس کے مقبوضات گھیرے ہوے ہیں ۔ اس صورت میں بین الاقوامی علاقہ کی سرسبزی اور خوشحالی کی کیا امید ہو سکتی ہے ؟ یہ (بین الاقوامی) علاقہ مراکش کا جزو لاینفک ہے، نہ صرف خود اپنے فوائد کے لیے بلکہ خود مراکش کے واسطے ۔ اس وقت چونکہ یہ الگ الگ ٹکڑے ہیں اس لیے دونوں کو خوشحالی نصیب نہیں ہو سکتی ۔ طنجہ اپنے قدرتی جاے وقوع کے لحاظ سے بندر ہے اور مراکش کے لیے یہیں سے ریل شروع ہوتی ہے ۔ ایک سابق سلطان کی یہ خواہش تھی کہ طنجہ اور طفالہ کو بذریعہ ریل ایک دوسرے سے ملا دیا جائے اور یہ تمام علاقہ تجارت کے لیے کھول کر اسکی نشو و نما کی جائے ۔ یہ سب کچھ ہو جاتا مگر یورپ کی اقوام کی باہمی رقابت نے

[1] اندلس کے شہروں کے نام ہیں (مترجم) ہ[؟] گمان غالب ہے کہ یہ قول صحیح ہو، کیونکہ طنجہ گو اسپین کے قبضے میں تھا مگر اُن لوگوں سے یہ امید کم تھی کہ وہ مسلمانوں سے اچھا سلوک کریں گے یا انصاف کو مدنظر رکھیں گے بالکل غلط ہے ۔ (مترجم)

رکاوٹیں ڈالیں اور اس تدبیر و انتظام کو قوت سے فعل میں نہ آنے دیا - ہم آگے چل کر اس پر بحث کریں گے کہ اس معاہدہ و قانون نے کیا کیا؛ پہلے ہم ان اقوام کے زیر اثر علاقوں پر نظر ڈالنا اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ اپنے یہاں کے باشندوں کے لیے فائدہ بخش ہیں یا سلطنت برطانیہ کے لیے اندیشہ کا ذریعہ۔

جب سے کہ ملکۂ ازابیلا نے اپنے ملک میں مسلمانوں کے خلاف دینی جنگ کی آگ لگائی، وہ علاقے جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اسپین کے زیر اثر ہیں، متواتر و مسلسل باعث نقصان رہے ہیں؛ نہ صرف مال کے بلکہ جانوں کے بھی - آخر اسپین کو کیا ضرورت داعی ہوئی تھی اور اسکے کون سے حقوق کو صدمہ پہونچتا تھا کہ وہ افریقیہ میں پہونچا اور اسکے علاقوں کو اپنے زیر اثر لے لیا؟ آیا اسکی یہ وجہ تھی کہ افریقیہ کا ساحل اسپین سے ملحق ہے، یا یہ سبب تھا کہ ملک اُن کفار (مسلمانوں) کا وطن اصلی تھا جن کو اسپین نے پندرہویں سولھویں صدی میں اپنے یہاں سے جلا وطن کیا تھا، یا اس کا باعث صرف یہ تھا کہ وہ افریقیہ کے اُن علاقوں میں اپنی تہذیب پھیلانا اور اسکے لیے مشن بھیجنا چاہتا تھا؟ موجب جو کچھ بھی ہوا ہو - موجودہ حالت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یا تو یہ خیال ہی سرے سے غلط تھا یا آنکہ حصول مقصود کے لیے جو کارروائی کی گئی وہ صحیح طور پر نہیں کی گئی؛ یا تو یہ ہوا کہ اپنے مقاصد کو لیکر جس ملک پر حملہ کیا گیا اُس کے باشندوں نے اسکو قبول نہیں کیا، یا اُنھوں نے ضرورت نہیں دیکھی؛ اگر یہ نہیں ہوا تو شاید یہ ہوا کہ خود اسپین کے لوگوں نے یکدلی کے ساتھ اُس مقصود کی حمایت نہیں کی - ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سنہ ۱۹۰۶ء سے اسپین کی یہ خواہش رہی ہے کہ ریف کو مغلوب کرکے وہاں حکومت کرے - اسپین کی آبادی تین کروڑ ہے - وہ پچاس ہزار سے لیکر ڈیڑھ لاکھ تک فوج رکھتا ہے - باوجود اسکے وہ ان اٹھارہ برسوں میں ایسے ملک کو فتح نہیں کرسکا کہ جس میں کُل دس لاکھ آدمی بستے ہیں، جس کا طول دو سو میل ہے اور عرض صرف پچیس میل اور جس کی فوج کم و بیش ہوتے رہنے پر بھی پانچ ہزار سے تیس ہزار تک ہے! نتیجہ یہ ہے کہ اتنے برسوں میں اس چھوٹے سے علاقہ نے سخت نقصان اُٹھایا، اور آج سے پچاس برس پہلے جو حالت تھی اُس میں از روے اخلاق یا مال و منال ذرا سی بھی ترقی نہیں کی! .... زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ چند چھوٹی پٹی کی لیں مکمل ہوگئی ہیں اور طنجہ اور القصر کا درمیانی حصۂ ملک تھوڑا بہت محفوظ ہوگیا؛ لیکن طیطوان

کی یہ حالت ہے کہ شام ہوتے ہی تمام یوروپیوں کو اپنے گھروں میں گھس جانا پڑتا ہے، اور دن کے وقت شہر کے باہر سڑکوں پر پہرہ لگانا اور گرداوری کرانا پڑتی ہے - یہ وہ بڑی سے بڑی کامیابی ہے جو اس قبضہ کے بعد سے اسپین کو حاصل ہوئی ہے، حالانکہ یہ علاقہ ۱۵۸۰ء سے اُسکے قبضہ میں ہے- سچی بات یہ ہے کہ نہ تو اسپین کے باشندے اسکو چاہتے ہیں نہ اہالی ریف، کہ اسپین کی فوج علاقۂ ریف میں رہے؛ اب جو دس لاکھ پسیٹا[1] روزانہ وہاں خرچ کیے جا رہے ہیں، اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ کسی طرح اسپین کا اقتدار وہاں قائم رہے - ہم یورپ کے رہنے والے (مسیحی) اسپین کی گذشتہ عظمت پر جتنا چاہیں عش عش کریں لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان اُسکو یورپ کی نگاہ سے نہ دیکھیں گے کیونکہ وہ (مسلمان) اسکو کبھی نہیں بھول سکتے کہ اندلس میں صدیوں (اُن ہی کے طفیل میں) تہذیب رہی ہے؛ نہ وہ اسکو بھولیں گے کہ جب سے (۱۶۱۰ء) وہ وہاں سے نکالے گئے ہیں، وہ ملک برابر رجعتِ قہقری کر رہا ہے-[2]

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ (امیر) عبدالکریم (ایدہ اللہ بنصرہ العزیز) ریف کے مسلمہ رہنما ہیں؛ وہ نہ بے رحم ظالم ہیں نہ غیر تعلیم یافتہ، بلکہ اسکے بالکل برعکس ہیں[3] - برسوں گذر گئے کہ وہ بہ حیثیت

---

[1] ایک گنی یعنی ۲۱ شلنگ = ۱۲۶ (سو چھبیس) پسیٹا کے- اشلنگ = بارہ آنہ (۹) ہندوستانی کے (مترجم)

[2] مسٹر کیننگ کو مختصراً یہ کہنا چاہیے تھا کہ مسلمان اپنی حکومت اندلس کو کبھی نہ بھولیں گے - چونکہ صابر و متوکل مسلمان اپنی تقدیر اور مشیت ایزدی کے قائل ہیں اس لیے اپنی حکومت اور اپنی تہذیب کو شاید بھول جائیں مگر نہیں بھول سکتے تو اُس ستم ناروا کو جو بادشاہان اسپین نے اُن پر روا رکھا تھا، اور جس کا شمہ میری کتاب "مولدین" سے معلوم ہوتا ہے- استغفر اللہ! میں کیا کہہ رہا ہوں! ممکن ہے کہ اس جور و ظلم کو اہالی افریقیہ نہ بھولے ہوں، میرا تجربہ تو یہ ہے کہ باقی دنیا کے مسلمان تو بھول گئے - اللہ اللہ!! یہ قوم کتنی سادہ، کتنی عفو کرنے والی، کتنی قانع ہے - جہاں اُنھوں نے اہل اسپین کے تعصب و شقاوت کو بھلا دیا وہیں یہ بھی بھلا دیا کہ قرآن مجید نے یہ مشورہ دیا ہے کہ فی القصاص حیاۃٌ (مترجم)

[3] ایک اور مقام پر مسٹر کیننگ لکھتے ہیں کہ "میں اکثر یہ لکھا ہوا دیکھتا ہوں کہ اہالی ریف وحشی ہیں، مگر کیفیت یہ ہے کہ امیر عبدالکریم نے میڈرڈ میں تعلیم پائی ہے، اور وہ مہینوں دیگر ممالک یورپ میں رہے ہیں- ایک انگریز اُنکے پاس گیا تو اُس سے اُنھوں نے دریافت کیا کہ یورپ کی اس جنگ عظیم میں کتنے آدمی مارے گئے- اُسنے لاکھوں کا حساب بتلایا، امیر نے مسکرا کر کہا کہ ہم نے تو اسکے لاکھویں حصہ کا بھی خون اپنے سر نہیں لیا، پھر بھی ہم وحشی ہی کہلاتے ہیں، اور جنھوں نے لاکھوں آدمی مروا ڈالے مہذب و متمدن!!

رکھتے ہیں؛ اسکی وجہ صرف اُنکی ذاتی قابلیت ہے، بلکہ یہ بھی کہ وہ شریفی خاندان کے فرد ہیں۔ اُنھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن میں قبائل کو مجتمع کر دینے اور اُنکی باہمی رنجشوں اور رقابتوں کو مٹا دینے کی قابلیت ہے، حالانکہ یہی کام مشکل ترین ہے۔ اسی قابلیت نے اُنکی قوت کو قائم کیا اور بڑھایا ہے۔ اُنھوں نے یورپ میں تعلیم پائی ہے۔ اور اپنے ملک کی نشو و نما اور ترقی کے متعلق ایک پختہ رائے قرار دے چکے ہیں۔ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتے کہ کسی کے باجگذار ہوکر رہیں، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ مالی ضرورت سے مجبور ہوکر یورپ کے سرمایہ داروں کے پنجہ میں آجائیں کیونکہ اس کا نتیجہ اکثر یہ نکلتا ہے کہ یہی قرضہ حملہ اور فوجی قبضہ کا بہانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اُن کا باڈی گارڈ بہت شاندار ہے۔ اور اُنکی فوج میں سات ہزار سے دس ہزار تک آدمی اُس قبیلہ کے ہیں جو ریف میں نہایت طاقتور اور معزز سمجھا جاتا ہے۔ اُنکی باقی فوج ایسی ہے کہ جو کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ قبائل کا ہر ایک آدمی ایسا نشانہ باز ہے کہ جسکی نسبت بلا مبالغہ افضل التفضیل کی صفت استعمال کی جا سکتی ہے، ہر شخص بہادر ہے، وطن پرستی کے صحیح جذبات سے سرشار ہے، اور ہر فرد کو اپنے دین کے پُرشکوہ ہونے کا احساس ہے۔ جتنے مقامات میں ممکن ہوا اُنھوں نے ٹیلیفون کا جال بچھا رکھا ہے۔ (امیر) عبدالکریم (ایدہ اللہ) کے یہ ارادے ہیں کہ وہ اپنے تمام ذرائع کے ساتھ اپنے ملک کو بیرونی تجارت وغیرہ کے لیے کھولدیں۔ اگر اقتصادی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ رائے نہایت صائب ہے۔ اسی سے اُن کا ملک آزاد رہ سکتا ہے۔ وہ اس سے بہت ڈرتے ہیں کہ کوئی اُنکے ملک میں مُلکی ترکیبوں اور چالوں سے درخور حاصل کرلے؛ اصل یہ ہے کہ اُنکے یہاں وہی لوگ کامیاب ہونگے جو صاف دلی اور انصاف کو لیے ہوے اُن سے ملیں گے۔

اس خوف سے کہ اسپین کی سلطنت، ریف پر شاہی اقتدار و حق نہ جمالے، اہالی ریف جب تک ممکن ہوگا لڑے جائیں گے، کیونکہ اسپین کو تنہا یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسے ملک میں آئے جہاں فوجی قبضہ ہے، نہ اسپین ریف کے کسی چھوٹے سے چھوٹے حصہ پر دعویٰ کرسکتا ہے۔ مسلمانان ریف اسکو کسی وقت نہیں بھولتے کہ جب وہ جزیرہ نماے اسپین پر حکمراں تھے تو اُنھوں نے مساویانہ حکومت کی تھی اور ہر طرح کی مسامحت کو روا رکھا تھا؛ لیکن جب وہ کمزور ہوے اور اُنکی سلطنت گئی تو مسیحیت بدترین تعصب کو کام میں لائی، تعذیب مذہبی سے مسلمانوں ہی کا شکار کیا۔

اور ہر طرح کی دغا بازی سے کام لیا۔ جب وہ موجودہ اسپین کو دیکھتے ہیں تو فوراً یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ایسا ملک جس کے ذرایع اب تک نشو و نما نہیں پا سکے ہیں اور جس کے باشندے نکمے اور ایسی حالت میں ہیں کہ جیسے وحشی، ہم کو کچھ سکھا اور تہذیب کے راستہ پر ڈال سکتا ہے؟ اہالی ریف اپنے دین کو قائم و باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں کہ مبادا وہ روند ڈالا جائے، یا اُس میں خرابی پڑ جائے۔ (امیر) عبدالکریم (ایدہ اللہ بنصرہ) اسپین سے صلح کرنے، اُسکو حقوق فایق دینے، بلکہ شاید ملیلہ اور طیطوان اُسکے لیے چھوڑ دینے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ اسپین کے پچھلے اصحاب حل و عقد نے (امیر غازی) عبدالکریم کو کئی مرتبہ رشوتیں دینے کی کوشش کی، مگر اُنھوں نے منظور نہ کیا؛ وہ صلح کرنا چاہتے ہیں مگر صرف اس شرط پر کہ اُن کا ملک آزاد رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ملک کی آزادی تسلیم کر لی جائے گی تو اہالی اسپین کو ریف میں داخل ہونے کی اجازت دیدی جائیگی اور وہ قیمتی مراعات بھی اُن سے نہ چھینی جائیں گی جس پر وہ بجبر قابض ہیں۔ اسپین کی جغرافی جاے وقوع اُنکے مفید مطلب ہے، اس لیے ملک کے اقتصادی نشو و نما میں وہ تفوق حاصل کر سکیں گے۔ اگر سلطان مراکش کسی بہانہ یا کسی تدبیر سے ریف پر اپنے حقوق شاہانہ جمانا چاہیں تو اہالی ریف اسکو بھی اُسوقت تک منظور نہ کریں گے کہ جب تک وہ (سلطان مراکش) کسی غیر سلطنت کے دباؤ سے بالکل آزاد نہ ہو جائیں۔ مراکش کی تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح جنوبی کوہ اطلس کے قبائل ہمیشہ حکمران سلطان کی تکلیف کا باعث رہے ہیں وہی کیفیت اہالی ریف کی رہی، لیکن اگر اسوقت کوئی ایسا آزاد مسلمان بادشاہ تختِ فیض پر ہوتا جو اُنکی مادی و روحانی ضروریات کا کفیل ہو سکتا تو اہالی ریف اُسکو اپنا سلطان تسلیم کر لینے پر آمادہ تھے۔ اس وقت تو سلطان کی حمایت بیجا برائے گفت ہی ہے۔

فرانس اپنی اس اُمید کے پورے ہونے کا انتظار کر رہا ہے کہ (غازی) عبدالکریم (ایدہ اللہ) اور اسپین کی صلح ہو جائے؛ بلکہ بعض وقت یہ بھی شبہہ کیا جاتا ہے کہ فرانس نے امیر کو مدد دی ہے؛[لہ]

لہ یہ بالکل لغو ہے۔ اول تو یہ اُمید ہی نہیں کہ فرانس امیر غازی کو مدد دے۔ دوسرے کیا فرانس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسپین اور امیر غازی ایدہ اللہ دونوں سے ریف خالی کرا لے۔ تیسرے نہایت معتبر خبر تو یہ ہے کہ امیر غازی ایدہ اللہ نے حال ہی میں سرکاری طور پر تمام دنیا کو مطلع کیا ہے کہ یہ خیال سرتاپا غلط ہے کہ ہمیں کوئی سلطنت مدد دے رہی ہے؛ برعکس اسکے جو قیدی اسپین کے ہم گرفتار کر رہے ہیں اُن میں یورپ کی کئی اقوام کے لوگ شامل ہیں؛ (دیکھیے صفحہ آیندہ)

نہ اس لیے کہ انصاف اسکا متقاضی ہے، بلکہ اس واسطے کہ وہ وہاں کے معاملات کو زمانۂ آیندہ میں اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت تو وہ بےصبری کے ساتھ اُس گھڑی کا انتظار کر رہا ہے کہ جب ریف آزاد ہو جائیگا۔ اُس وقت اگر انگلستان یا کسی پُرزور لیگ آف نیشن نے ریف کی آزادی کی حفاظت وحمایت نہ کی تو وہ کوئی چھیڑ خانی کرکے یہ بہانہ پیدا کرلے گا کہ ریف کے قبائل نے اُسکے محفوظہ ملک پر حملہ کیا ہے، اور اس ترکیب سے وہ اُس آخری حصۂ ملک پر قبضہ کرلے گا۔ جو اُس کا نصب العین، یعنی اَوران سے لیکر طنجہ تک کے قبضہ کا خارراہ ہے۔ جب فرانس یہ کر چکے گا تب کہیں جاکر وہ شمالی افریقیہ کے قبضۂ کامل میں کامیاب سمجھا جائے گا، اور یہی فرانس کی مدت مدید کی آرزو۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ جب تک یہ نہیں ہوتا اُس کا ایک بازو محفوظ نہیں ہوتا۔ نہ بحر روم پر اُسکی قوت کو تمام اقوام پر تفوق حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ صرف یہی صورت ایسی ہے کہ آبناؤں پر اُس کا قبضہ بلا شارکت غیرے ہو سکتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ریف فرانس کی مسلح، قواعد داں اور منظم فوج کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے (امیر) عبد الکریم (ایدہ اللہ) کو بہت محتاط رہنا چاہیے کہ کہیں وہ اسپین کے ادعاے حفاظت وحمایت کو تباہ کرکے بڑے خطرات میں نہ مبتلا ہو جائیں۔

ریف کے اندرونی اور اقتصادی معاملات ایسے ہیں کہ اُنکا نشو ونما کرنا بہت مناسب ہے۔ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ایک جرمن انجینیر نے یہاں کوئیلہ، تانبہ اور سونے کی کانیں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اور سلطنتیں اسپین کو مدد دے رہی ہیں۔ شاید حضرات ناظرین کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں مسلمانوں کے شفیق مسٹر لائڈ جارج نے انگلستان کے لوگوں کو اجازت دیدی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اسپین کی فوج میں بھرتی ہوکر امیر عبد الکریم ایدہ اللہ کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔ ہندوستان اور مصر کے مسلمانوں نے اسکی مخالفت کی۔ جناب لائڈ جارج کو اپنی یہ اجازت منسوخ کرنا پڑی۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اُن قیدیوں میں جو امیر غازی ایدہ اللہ گرفتار کر رہے ہیں علاوہ اور ممالک کے انگلستان کے لوگ بھی شامل ہیں تو اسکی توجیہ یہ ہے کہ انگلستان میں بیکار لوگ زیادہ ہیں اسلیے "شاید" وہ چلے جاتے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو مسلمانوں کو غیر ممالک سے شکایت کرنے کا چنداں حق نہیں ہے اگر ہم کچھ کہہ سکتے ہیں تو اُس سلطنت سے جسکو یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں دنیا بھر سے زیادہ مسلمان بستے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ایجی ٹیشن میں بڑی برکت رکھی ہے مگر شاید امیر غازی ایدہ اللہ اس قابل نہیں کہ انکی مدد کیجائے، یہ شرف صرف ترکوں ہی کو حاصل تھا! (مدیر)

بتلائی ہیں اور اُنکے متعلق اُمید افزا رپورٹ کی ہے۔ حال ہی میں ایک انگریز ماہر تسلین بخش رپورٹ لیکر آیا ہے۔ انکے علاوہ وہاں لیموں و نارنگیوں کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہیں۔ یہ ساحل بحر کے بہت قریب ہیں۔ اور ایک اول درجہ کا بندر وہاں موجود ہی ہے۔ وہاں کے باشندوں کی خصلت و جہالت ایسی وحشیانہ اور بُری نہیں ہے جیسی کہ ظاہر کی گئی ہے۔ ان لوگوں کی جسمانی حالت بہت اچھی ہے۔ مجھے طنجہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اُن میں تعلیم حاصل کرنے کی غیر معمولی قابلیت ہے، خاص کر انجنیری کی۔ اُن میں جو کٹرپن اور مذہبی دیوانگی سی معلوم ہوتی ہے یہ اصل میں احتیاط ہے اس امر کی کہ عیسائی اقوام میں سے کوئی اُن پر یک لخت حملہ نہ کر بیٹھے۔ جیسے ہی اُن کا یہ شبہہ جاتا رہے گا یہ کٹرپن بھی ختم ہو جائے گا، کیونکہ سماحت اُنکے دین کا ایک جزو ہے۔ مراکش کا ماضی کافی عظمت رکھتا تھا، اس لیے اُسکے مستقبل کی نسبت بھی اچھی اُمیدیں ہیں۔ ہر ایک انگریز کو چاہیے کہ وہ ریف کو محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے۔ باوجود اسکے کہ اس ملک کی آبادی چند لاکھ نفوس کی ہے، مگر وہ اپنی مردانگی اور حب وطنی کی وجہ سے برسوں ہو گئے کہ ایسے ملک کی فوجوں سے مقابلہ کر رہا اور ٹکر جھیل رہا ہے کہ جس کی آبادی کروروں ہے۔ کیا انگلستان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اسپین کو زیادہ نقصان پہونچائے بغیر ریف کے سوال کو لیگ آف نیشنس میں پیش کر دے، اور اسکی نگرانی کرے کہ اُسکی آیندہ حفاظت اور آزادی قائم رکھے؟ (امیر) عبد الکریم (ایدہ اللہ) کی روشن خیالی اور اعلیٰ درجے کے اخلاق کی قدر کی جائے اور سلطنہائے یورپ کی رقابتوں سے اُن کو دل تنگ نہ ہونے دیا جائے۔ ہم کو اس شخص کی مدد کرنی چاہیے کیونکہ وہ ملک مغرب میں اسلام کے احیاءِ ثانیہ کا اصل باعث ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح مصطفےٰ کمال (ایدہ اللہ) باوجود ہر قسم کی مشکلات کے مشرق وسطیٰ میں احیاءِ ثانیہ کر رہے ہیں۔ ماسوا اسکے چند لمحوں کے لیے نقشہ پر نگاہ ڈال کر فرانسیسی مراکش اور فرانسیسی شمالی افریقیہ کے باہمی تعلق کو دیکھنا چاہیے۔ آپ یہ پائیں گے کہ اُسکے بازو اُس راستہ کو دھمکا رہے ہیں جو مارسیلیز سے سینے گال کو جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں بمقام الجزائر گورنمنٹ مراکش کی حیثیت پر یورپ کی گیارہ یا کچھ زیادہ سلطنتوں اور سلطان مراکش کے نمایندوں کے آپس میں بحث ہو کر ایک معاہدہ لکھا گیا تھا۔ اُسکی پہلی ہی دفعہ میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ مراکش کی آزادی قائم رکھی جائے گی اور اُس

کی اقتصادی نشو و نما میں ہر طرح کی مدد دی جائیگی۔ مگر اسوقت ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ مراکش کی جو حیثیت قرار پائی تھی۔ اُس میں اور اب میں کتنا فرق ہے[1]۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان میں ایک معاہدہ ہوا تھا کہ یہ دونوں جو حقوق فائق مراکش و مصر میں حاصل کر چکے ہیں اُن میں ایک دوسرے سے تعرض نہ کرے گا۔ اس معاہدہ پر برطانیہ ابتک قائم ہے جس کو اہل مراکش حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ اپنے اس خیال پر مُصر ہیں کہ برطانیہ کو جو وقتیں مصر میں پیش آ رہی ہیں وہ فرانس کی عنایت سے ہیں۔ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ انگلستان نے اُن (مراکشیوں) کے ملک میں کبھی پراپیگنڈا نہیں کیا۔ سنہ ۱۹۰۴ء کے معاہدہ میں صاف طور پر درج ہے کہ فرانس صرف امن و امان سے مراکش میں داخل ہونے کے ذرائع استعمال کر سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں ایک خفیف سے معاملہ پر فرانس نے کاسابلینکا پر گولہ باری کر دی؛ بس اُسی دن سے سلطان کے اختیارات سلب ہوگئے اور فرانس کی گورنمنٹ وہاں قائم ہوگئی۔ مولاے عبدالعزیز اور مولاے حفیظ کو بے عزت کرکے نکال دیا گیا، اور اُن کا چھوٹا بھائی یوسف بنام نہاد سلطان تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اُس روز سے یہ غریب بلا چون و چرا فرانس کے احکام کی تعمیل کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ یوسف کو سلطان کا باشان و شکوہ خطاب حاصل ہے، مگر مراکش کے مسلمانوں کو نہ اُس سے محبت ہے نہ اُنکے دلوں میں اُسکی کوئی قدر و منزلت ہے۔

فرانس کی حکومت صرف دو چیزوں پر قائم ہے: ایک سونا، دوسرے مشین گن۔ سونا وہ اُن اضلاع میں بکھیرتے ہیں جہاں نسبتہً امن ہو چکا ہے، اور جو بربر اپنے سلطان کے حامی رہے تھے؛ مشین گنیں اُس علاقہ میں استعمال کرتے ہیں جس کو اُنھوں نے چند روز پیشتر مغلوب کیا ہے۔ زمانۂ جنگ میں تو کچھ نہ ہو سکا؛ تاہم مارشل لاپوٹی کے استقلال مزاج اور بہترین تدبیر سے وہ علاقہ فرانس

[1] مسٹر کننگ اس کا اقبال کیوں نہیں کر لیتے کہ عیسائی سلطنتوں کی یہ عادت مستمرہ ہے کہ وہ اپنی زبان و قلم پر کبھی قائم نہیں رہتے۔ کیا فرڈنینڈ اور ازابیلا نے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد در اولاد کو ایک معاہدہ کی رو سے اسکا پابند نہیں کیا تھا کہ وہ اسپین میں مسلمانوں کو مساوی حقوق دیں گے، مساجد کی توہین نہ کریں گے، اُنکے دین سے تعرض نہ کرینگے وغیرہ وغیرہ۔ پھر چند روز کے بعد انھیں دونوں ملعونوں اور انکی اولاد در اولاد اور جانشینوں نے کیا کچھ نہیں کیا جسکا مختصر نتیجہ یہ ہے کہ اسلام تو ایک طرف وہاں مسلمانوں کی قبریں بھی نہیں ملتیں۔ اسکا تماشا دیکھنا ہو تو میری کتاب "مولدین" ملاحظہ فرمائیے اور اگر آپ سے رو دیا جائے تو رو دیجئے۔ مترجم

ہی کے ہاتھ میں رہا جو امن کی حالت میں تھا۔ اُنھوں نے جرمن قیدیوں سے وہ سڑکیں بنوائیں جو اس وقت ملک میں اول درجہ کی سمجھی جاتی ہیں۔ جنگ کے بعد جو چار برس گذرے ہیں اُن میں اور فتوحات ہوئیں؛ اب صرف پہاڑی علاقہ اور سوس فتح ہونا باقی ہے۔ ان ہی چار برسوں میں سول گورنمنٹ نے ملک میں اور بھی ترقیات کی ہیں، کاسابلینکا کا بندر تیار کرلیا ہے، بڑی بڑی سرکاری عمارتیں بنادی ہیں، عرب آبادی کے باہر نئی چھاؤنی بنگئی ہے، چھوٹی پٹری کی ریل تیار ہوگئی ہے اور اب اُسکو چوڑی پٹری میں منتقل کیا جارہا ہے۔

اگر کوئی شخص اس ملک میں موٹر پر سفر کرے تو اُسکو دفعۃً تو بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ یہ ملک خوشحال، پُرامن اور قانع ہے۔ لیکن باوجود مارشل لاءوٹی کی محنت، بلند نظری اور ہمدردی کے یہ حالت صرف سطحی ہے۔ ملک کے اوپر قرضہ کا بڑا بار ڈال دیا گیا ہے؛ زراعتی پالیسی سے بہت غفلت کی گئی ہے، حالانکہ ملک مراکش قدرتی طور پر زراعتی ملک ہے۔ نہ ذرایع آبپاشی میں کوئی ترقی کی گئی ہے، نہ بھیڑ بکریوں اور دیگر جانوروں کے پالنے اور بڑھانے پر توجہ کی گئی ہے حالانکہ آسٹریلیا کے ماہرین یہ رپورٹ کرچکے ہیں کہ ملک کے بہت سے حصے مرینو[له] کی نسل کشی کی بہترین قابلیت رکھتے ہیں۔ سرکاری عمارتوں پر بے دردی کے ساتھ روپیہ خرچ کیا گیا ہے، لیکن یہ سب بیکار، کیونکہ جو سرمایہ اُن پر لگایا گیا ہے نہ اُس سے کوئی منافع کی اُمید، نہ ان عمارتوں سے یہ توقع کہ وہ ملک کے ترفہ کو بڑھائیں گی۔ بندر بنانے کے لیے جو مقام اور جگہ انتخاب کی گئی ہے وہ بدترین ہے۔ جو ساحل تجویز کیا گیا ہے وہ خطرناک ہے جو بند دیوار کی صورت میں لگایا گیا ہے اُسکے متعلق ماہرین کی رائے ہے کہ وہ بہت دیر تک اطلانٹک کی امواج کا مقابلہ نہ کرسکے گا۔

جنوبی مراکش میں قائدین کے ہاتھ میں حکومت ہے ان کو فرانس سے بیش قرار معاش ملتی ہے بہت سے قبائل کو ہتھیار رکھنے کی اجازت ہے۔ اب تک فرانس کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اُن سے ہتھیار چھین سکے۔ ان تمام باتوں کے پس پردہ فرانس کی موجودہ طرز حکومت کے خلاف ملک میں

له مرینو اُس بھیڑ کا نام ہے جس کی پشم سے مرینو نامی کپڑا بنتا ہے۔ جب اسپین میں مسلمانوں کی سلطنت تھی تو ان بھیڑوں کی طرف خاص توجہ کی جاتی تھی۔ اور ان کے متعلق الگ قانون وضع کیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو میری اخبار الاندلس۔ (مترجم)

بے چینی اور بے اطمینانی ہے؛ لوگ اُسکے طریق داد رسانی سے خوش نہیں ہیں، حالانکہ وہ حج اور زیارات کے راستہ میں رُکاوٹیں نہیں ڈالتی۔ جو اثرات مراکش میں وہی مادۂ فساد اور وہی آزادی کی خواہش موجود ہے جو ایسے ملکوں کے جوانوں میں ہوتی ہے جو کسی غیر ملکی حکومت کے ماتحت رہ کر فائدہ یا نقصان اُٹھاتے ہیں؛ چند ہی سال کے بعد یہ ہونے والا ہے کہ وہ منظم طور پر حکومت خود اختیاری کا دعوے کریں گے اور اُسکولے کر رہیں گے مراکش کی آبادی اسّی لاکھ نفوس کی ہے۔ اسکے واسطے فرانس نے وہاں اتنی فوج رکھی ہے جتنی انگریزوں نے ہندوستان میں؛ حالانکہ اس ملک کی آبادی تیس کرور سے بھی زیادہ ہے۔ شاید زمانۂ مستقبل میں فرانس کے قبضہ و غلبہ کا نشان مارشل لایوٹی کی معدودے چند عمارتیں رہ جائیں یا بعض اور خوبصورت چیزیں۔

مسلمانان عالم کے جو خیالات انگلستان کے متعلق ہیں وہ ہم اخبارات وغیرہ میں پڑھ چکے تھے۔ جب ہم طنجہ پہونچے تو ہم کو یہ دیکھ کر تعجب اور خوشی ہوئی کہ ہر شخص کے دل میں اُمید اور اُمنگ تھی۔ انگلستان پر وہاں والوں کو بہت کچھ اعتماد تھا اور وہ اسکے خواہشمند تھے کہ اُنکے تعلقات انگلستان سے بڑھ جائیں اور وہ لوگ اُسکے زیر سایہ آ جائیں؛ انگلستان کے انصاف کی بہت کچھ قدر تھی۔ انگلستان نے جو حال ہی میں مصر کی حکومت سے اپنا دخل ہٹا لیا ہے اور وہاں کی مالی حالت بہت اچھی چھوڑی ہے اُسکی سب تعریفیں کرتے تھے۔ لیکن جب اُن سے معاہدہ طنجہ کا ذکر آیا تو وہ بہت خاموش، مایوس اور بزدل معلوم ہوئے؛ اُن کے بشرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان نے ایک مرتبہ پھر اپنے دوستوں کو ملکی پالیسی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

نئے سال کو اپنے ساتھ امید ترقی لانی چاہیے؛ اب کے نیا سال آیا تو اہل طنجہ کے لیے کوئی ایسی خوشخبری نہیں لایا جس پر وہ شکر کرتے۔ اگر کہیں خوشی نظر آتی تھی تو فرانس کے پولیٹیکل ایجنٹ کے یہاں، کیونکہ سلطان کے نمایندوں نے آکر فرانس کی ملکی چالوں کی کامیابی کی خوب تعریفیں کیں؛ شاید اس سے یہ مطلب ہوگا کہ اُن کی مدد معاش میں ترقی ہو جائے گی۔ یا آئندہ اپنے اپنے عہدوں پر بحال رہ جائیں گے۔ عوام میں، جیسا کہ اب ہمیں معلوم ہوا ہے۔ ایک طرح کا غصہ تھا، مگر اُنکی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا تھا۔ رہ گئے مسلمان، اُن میں خوف کے علاوہ غصہ بھی تھا کہ اُنکو دھوکا دیا گیا۔ اُنھیں الفاظ "حکومت سلطانی" سے سخت نفرت ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سلطان کوئی

چیز نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ فرانس ہے - وہ بین الاقوامی گورکھ دھندے کو "فرانس کے انصاف" پر ترجیح دیتے ہیں - معاہدہ کی بیخ و بنیاد "بین الاقوامی ہے" اور مجلس آئین و قوانین مختلف سلطنتوں کے ارکان سے مشتمل ہونے والی ہے - انکی تعداد ۲۶ ہو گی؛ ان میں سے گیارہ یا تیرہ آدمی وہ ہونگے جو فرانس کے نمکخوار ہوں گے، اور باقی منتظم اور مندوب سب فرانس کے منتخب کردہ!

یہ گورنمنٹ کسی طرح بین الاقوامی نہیں کہلا سکتی - اس معاہدہ کو فرانس، اسپین، انگلستان اور مراکش نے تو فوراً مان لیا اور اٹلی اور امریکہ کے نمایندوں نے بھی تسلیم کر لیا، مگر آخری تینوں سلطنتیں اسپر دستخط کرنے کے خلاف ہی رہیں - باشندگان انگلستان نے اس سے چنداں اعتنا بھی نہ کیا؛ بہرحال معاہدہ مکمل ہو گیا : مگر سوال یہ ہے کہ کیا اقتصاداً معاملہ اس سے بھی زیادہ بگڑ سکتا ہے؟ طنجہ کے معاہدہ کو صرف اسی نظر سے دیکھ کر بیشتر انگریزوں نے صبر کر لیا، لیکن وہ اہم معاملہ کو نظرانداز کر رہے ہیں، یعنی طنجہ کی حیثیت فوجی ضروریات کے لحاظ سے - ۱۹۰۴ء میں جو ہمارا معاہدہ فرانس کے ساتھ ہوا تھا اُس میں طنجہ کا کہیں ذکر نہیں ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے نمایندوں نے اس بین الاقوامی رقبہ نیز فرانسیسی مراکش پر فرانس کی فوقیت کو تسلیم کر لیا ہے - معاہدہ ورسلیز کے موافق جرمنی اور آسٹریا کے جہازات تجارتی تجارت کی غرض سے یہاں نہیں آ سکتے؛ لیکن اسوقت یہ کیفیت ہے کہ سوائے فرانس کے تمام سلطنتیں یہ چاہتی ہیں کہ جرمنی اور آسٹریا کے تاجر پھر یہاں آ جائیں لیکن باوجود اسکے یہ معاہدہ نہیں بدلا جا سکتا - یہ ہے رقبۂ طنجہ کے بین الاقوامی ہونے کی تمام حقیقت!

معاہدہ تو مکمل ہو چکا، اس لیے ہمیں اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرنی چاہیے، اور اسپر غور کرنا چاہیے کہ جو تفوق ایک سلطنت کو یہاں حاصل ہو چکا ہے اُس کا اثر کیونکر زائل کیا جائے - اگر لیگ آف نیشنس اب تک اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ اس چھوٹے سے رقبہ کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لے - یا اُس کا اقتدار اتنا نہیں ہوا ہے کہ وہ امور متنازع کا تصفیہ کر سکے تو ہم کو خود اپنی عاقبت اندیشانہ پالیسی پر بھروسہ کرنا چاہیے - مراکشی مسلمانوں میں بڑی تعداد مالکیوں کی ہے، تاہم وہ سلطان قسطنطنیہ کو اپنے سلطان پر بھی فوقیت دیتے ہیں، اور قسطنطنیہ کو مرکزی حکومت گاہ سمجھتے ہیں - چند مرتبہ سلطان مراکش نے اپنے آپ کو امیرالمومنین بھی کہلایا ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ اُسکو اس کا حق حاصل نہیں ہے، اور دنیا کے بیس کروڑ سنی مسلمانوں میں اُسکی کوئی وقعت نہیں

ہوسکتی۔ چونکہ ترک خلیفہ کو جلا وطن کر چکے ہیں اس لیے فرانس اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کی تعداد کثیر کی رائے سے مراکشی سلطان یوسف کو امیرالمومنین قرار دلوادے۔ یہ سازش ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے کامیاب ہوجائے، لیکن اس کا انجام یہ ہوگا کہ فرانس کا جو کچھ اثر و اقتدار مسلمانوں میں ہے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوجائیگا، کیونکہ سلطان یوسف کو خود اُنکی رعایا کافر و مرتد سمجھ رہی ہے۔ سُنّی مسلمانوں کے نزدیک خلیفہ دینی و دنیوی حکومت کا مجموعہ ہونا چاہیے؛ یہی دنیوی حکومت تھی کہ جس کی وجہ سے سلطان سلیم نے خاندان آل عثمان میں خلافت کو منتقل کرلیا۔ فرانس کی تدابیر کو بارآور ہونے اور اسکے امکانات پر غور کرنے سے پہلے ہر شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ موجودہ سلطان مراکش کو کونسی دنیوی حکومت حاصل ہے؟ شاہ حجاز کے دعوے کی تائید کرتے ہوے ہمیں بہت ہوشیاری سے کام لینا چاہیے، کیونکہ یہ شخص بھی عیسائیوں کا غلام اور تنخواہ دار سمجھا جاتا ہے۔ رہ گیا یہ امر کہ وہ مسلمانوں کے دو مقدس ترین شہروں پر قابض ہے، اس کا مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں، کیونکہ مسلمانوں کی تعداد کثیر اس سے خوش نہیں ہے[1]۔

پچھلی صدی میں مسیحی سلطنتیں مسلمانوں کے بہت سے ملکوں پر قبضہ کرچکی ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کی رائیں عیسائیوں کے متعلق جیسی کچھ ہونی چاہییں ظاہر ہے... اہالی مراکش نسبتہً انگلستان کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہماری نسبت جو حسنِ ظن اُنکو ہے اُسکی قدر کریں، اُسکو صحیح کرکے دکھلا دیں، اور اُنکی مشکلات میں اُنکے ساتھ ہمدردانہ پیش آئیں۔ کیا ہم یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ وقت پڑے پر وہ ہمارے مددگار رہوں گے؟

ہم کو، خواہ یہ سودا کتنا ہی گراں کیوں نہ پڑے، اسپین کو علاقہ ریف واقع ساحل بحر روم سے بغیر کسی ضمانت کے نہیں نکلنے دینا چاہیے اور طنجہ میں سوائے فرانس کے کسی کو نہیں رہنے دینا چاہیے۔ خود نقشہ پر نگاہ ڈالیے تو ایک ہی نظر میں معلوم ہوجائیگا کہ شمالی و غربی افریقہ میں کتنا علاقہ اور کتنے آدمی فرانس کے زیر نگیں ہیں۔ اگر اُسے ذو جلشی کرنا پڑے تو اُسے ہر طرح کی مدد مل سکتی ہے۔ انگلستان کے باشندوں سے ان واقعات کا چھپانا بیکار ہے، کیونکہ فرانس اپنے ارادہ کو پکارے گلے اور اکثر ظاہر کرتا رہتا ہے۔ ہم کو ایک فرانسیسی کا یہ قول ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ "یورپین پالیسی میں انگلستان اور فرانس کا اتفاق رائے ہوسکتا ہے، لیکن ایشیا

---

[1] اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ حضرت حسین بیگ بہتی جو وہ گوشہ عرب ہی سے تشریف لے جا چکے۔ (مترجم)

اور افریقیہ میں دونوں کے مفاد ایک دوسرے سے اتنے متضاد ہیں کہ اس کا امکان ہی نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کبھی حقیقی اتفاق ہو جائے گا"۔

جو ترکیب کہ ہم کو مغربی ساحل بحر روم پر اپنے اغراض و مقاصد کی حفاظت کے لیے چلنی چاہیے اُس کا نقشہ تیار ہے۔ ہم کو فوراً کارروائی شروع کر دینا چاہیے؛ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے اور ہمیں پچھتانا پڑے۔ طنجہ اور اُس کا ملحقہ ساحل دنیائے قدیم کے پرانے مقامات میں سے ایک ہے۔ وہ ہمیشہ سے اہم رہتا آیا ہے اور ہمیشہ اہم رہے گا۔ فقط

یہاں مسٹر کننگ کا مضمون ختم ہوتا ہے۔ اس کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ وہ فرانس سے سخت ناراض ہیں، نہ اس لیے کہ اُس نے سلطان مراکش کو شاہ شطرنج بنا رکھا ہے، بلکہ اس لیے کہ انگلستان کا وہاں عمل دخل نہیں ہونے دیتا، نہ تجارت کرنے دیتا ہے۔ امیر غازی ایدہ اللہ سے وہ ہمدردی دکھلاتے ہیں، نہ اس لیے کہ وہ حق پر لڑ رہے ہیں، بلکہ اس واسطے کہ انجام کار فرانس کا اقتدار بڑھے گا۔ بظاہر وہ اسپین کو ملزم گردانتے ہیں، مگر یہ بھی نہیں چاہتے کہ اُس کا قدم بالکل اُکھڑ جائے۔ سلطان مراکش سے تو اُنکو بے حد ہمدردی ہے مگر "نہ بحب علی بل ببغض معاویہ"۔ وہ چاہتے ہیں کہ انگلستان بلطائف الحیل اُنکو اپنا بنالے اور وہ انگلستان کو اپنا سمجھنے لگیں۔ مشورہ تو نہایت معقول ہے، مگر شاید ہندوستان والوں کو حضرت سعدی علیہ الرحمہ کی وہ حکایت نہ بھولی گی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "چو دیدم عاقبت خود گرگ بودی"۔

جہاں تک مسلمانان ہند کا تعلق ہے یہاں امیر غازی ایدہ اللہ سے سرد مہری رہی ہے؛ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے (اور یہ موقع تفصیلی بحث کا نہیں ہے) تو امیر غازی کی خدانا کردہ ناکامی اور بعون اللہ کامیابی پر مسلمانان دنیا کے اکثر حصہ کی موت و حیات منحصر ہے۔ خلافت کے لیے خوب خوب مرثیے پڑھے گئے اور وہ وہ ماتم ہوے کہ "زمیں ساری ہلا کے اُٹھے" لیکن وہ ہانڈی کا اُبال جو ختم ہوتا ہے تو ہر جگہ اوس پڑی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ دو وجوہ ہوں۔ اوّل تو ہندوستان سے ریف کا بُعد۔ مگر حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تو یہ ہے کہ مسلمان، خواہ کہیں کے ہوں، ایک دوسرے کے بھائی اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہیں۔ غالباً یہ اصول کہ "چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار"۔ غلط ہو گیا۔ یاد رکھیے کہ جس وقت لفظ "کاش" انسان کی

زبان سے نکلتا ہے اُسکے بعد ہر تدبیر ناکام ہی رہتی ہے۔ خدا کرے کہ ریف اور مراکش کے معاملہ میں وہ وقت آپ کے اوپر نہ آئے کہ آپ یہ کہیں کہ "کاش" ہم نے اس سے پہلے امیر غازی سے ہمدردی دکھائی ہوتی۔ الحذر! الحذر!!

دوسری وجہ ممکن ہے کہ یہ ہو کہ مسلمانان ہندوستان کو یہ نہ معلوم ہو کہ اسپین کے کفار نے وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں خودستا ہوں، خوب جانتا ہوں کہ "چو زن پتان خود مالد حظوظ نفس کے یابد"۔ اس کا خیال نہ کیجیے کہ میں اپنی کتاب کا اشتہار دیتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ "کارساز ما بفکر ما"۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان اسپین والوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا، میری کتاب مولدین ملاحظہ فرمایئے تو آپ کو معلوم ہو کہ وہ کونسا ظلم تھا جو اُن پر نہیں ہوا، وہ کونسی رسوائی تھی کہ باقی چھوڑ دی گئی۔ آپ کے بھائیوں کو بجبر عیسائی بنایا گیا، مسلمان ماؤں کی گودوں سے مسلمان بچوں کو چھینا گیا کہ عیسائی بنائے جائیں گے۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری ہوئی، مسلمان مردوں کو بے رحمی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ واللہ کہ اُن مصائب کے زبان پر لانے سے روح کانپتی ہے، اُن مصائب کو یاد کرکے بدن سے شعلے نکلتے ہیں۔ یہ مشورۂ ایزدی ہرگز نہ بھولیے کہ "فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب"۔ اگر آپ میں کچھ بھی حمیت ہے تو دامے، درمے، قدمے اُس شخص کی مدد کیجیے جو آپ کی عزت قائم رکھنے کے لیے یکہ و تنہا قریباً ایک ربع صدی سے ان ظالم اسپین والوں سے لڑ رہا ہے۔

میری آخری صدا (خدا کرے کہ وہ صدا بصحرا نہ ہو) یہ ہے کہ:-

اتنا تو نہ چھپ کے لے کفن کا
گھبرا کے نقاب زندگانی

محمد خلیل الرحمن

(مترجم اخبار الاندلس وغیرہ)

اخبار الاندلس۔ مشہور امریکن مورخ اسکاٹ کی کتاب کا ترجمہ تین مبسوط جلدوں میں ہے۔ اسپین کا مجموعہ تاریخ تین ہزار صفحوں کے قریب ہے قیمت ۲۵
مولدین۔ ایک امریکن عالم ہنری چارلس کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ قیمت ۱۲
دونوں کتابیں دفتر الناظر سے مل سکتی ہیں۔ ایڈیٹر

غوث الاعظم

مکرم و محترم جناب مرزا محمد عسکری بی اے سکریٹری انجمن اُردو لکھنؤ نے یہ مضمون انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے لیا ہے، جو اقوام اسلامی کے جغرافیہ و انساب و سیر وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر ہوتسما کی ادارت میں شائع ہو رہی ہے۔ صاحب ممدوح نے اضافۂ حواشی کے علاوہ متن میں بھی ضروری موقعوں پر الفاظ اور جملے بڑھا دیے ہیں جنکو ممتاز کرنے کے لیے قوسین سے محدود کر دیا ہے۔ انجمن اُردو نے بھی اسی قسم کی ایک کتاب کی ترتیب و اشاعت اپنے نظام کار میں شامل کی ہے جو ادب اُردو میں یقیناً ایک نہایت ہی مفید اور قیمتی اضافہ ہوگا۔

ایڈیٹر

(حضرت شیخ) عبد القادر جیلی (جیلانی یا گیلانی) محی الدین ابو محمد بن ابی صالح زنگی دوست[1] مشہور واعظ اور صوفی، جنکے نام سے سلسلۂ قادریہ مشہور ہے، ۴۷۱ھ ہجری مطابق ۱۰۷۸ء میں پیدا ہوئے اور ۵۶۱ھ[2] ہجری مطابق ۱۱۶۶ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کی متعدد سوانح عمریاں موجود ہیں جن میں روایات ضعیفہ کثرت سے پائی جاتی ہیں مگر صحیح واقعات بھی مل سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کا شجرۂ نسب آپ کے پدر بزرگوار کی جانب سے (حضرت امام) حسن (علیہ وعلیٰ آبائہ الصلوٰۃ والسلام) دخترزادۂ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہونچایا جاتا ہے۔ حالانکہ آپ کے پدر بزرگوار کا عجمی نام اور خود (حضرت) شیخ کا بغداد میں "عجمی" کے لقب سے مشہور ہونا اسکے منافی پڑتا ہے[3]۔

---

[1] معتبر کتب عربی میں، جن میں حضرت شیخ کے حالات درج ہیں، "جنگی دوست" ہے۔

[2] بعض کتابوں میں آپ کی پیدایش کی تاریخ لفظ "عاشق" (۴۷۱) اور وفات لفظ "معشوق الٰہی" (۵۶۲) سے نکلتی ہے۔ اس حساب سے بھی آپ کی عمر ۹۱ سال ہوتی ہے۔

[3] امام یافعی نے "مرآۃ الجنان" (نسخۂ قلمی ۳۰۷/۲) اور خواجہ محمد پارسا نے "فصل الخطاب" (نسخۂ قلمی ص۲۴۲) میں آپکا شجرۂ نسب حضرت امام حسن علیہ السلام تک پہونچایا ہے۔ اسی طرح زبیدی نے "شرح قاموس" میں لفظ "بشتیر" کے تحت میں بحوالۂ امام ذہبی آپکو "حسنی" لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ اور ائمۂ فن آپ کی سیادت کے قائل تھے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رفاعیوں نے دشمنی یا رشک و حسد سے آپ کو سید ماننے سے انکار کر دیا۔ اور ممکن ہے کہ آپ کے زمانہ میں بھی لوگ اسی رشک کی وجہ سے اور آپ کے پدر بزرگوار کے "جنگی دوست" لقب سے آپ کو "عجمی" کہتے ہوں۔ جو لوگ آپ کے نسب سے انکار کرتے ہیں اور آپ کو سید نہیں مانتے وہ بھی کوئی قوی دلایل اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکتے۔

فی الواقع شجرۂ مذکورہ آپ کے پوتے قاضی ابوصالح نصر کا تیار کردہ ہے جن تک اکثر روایاتِ غیر صحیح جو (حضرت) شیخ کی جانب منسوب ہیں پہونچائی جاسکتی ہیں۔ آپ کی والدۂ ماجدہ فاطمہ بنت عبداللہ الصومعی تھیں۔ اور یہ دونوں (حضرات) اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُس گانوں کا نام جس میں آپ کی ولادت ہوئی نیف (بالکسر یا بالفتح) ہے جو بحر کاسپین کے جنوب ضلع گیلان میں واقع ہے۔ (حضرت) شیخ اٹھارہ برس کی عمر میں بغرضِ تعلیم بغداد تشریف لائے جہاں آپ کی والدۂ ماجدہ ابتداءً آپ کے اخراجات کی متکفل تھیں۔ آپ نے صرف و نحو کی تعلیم امام تبریزی (متوفی ۵۰۲ھ) سے اور فقہ حنبلی (اور بعض کے نزدیک فقہِ شافعی) متعدد شیوخ سے حاصل کی۔ اور اپنی تصانیف میں آپ ہبۃ اللہ بن مبارک اور ابونصر محمد بن البناء سے بکثرت روایت کرتے ہیں۔ آپ کے حالاتِ زندگی مابین ۴۸۸ھ اور ۵۲۱ھ بہت کم معلوم ہیں سوائے اسکے کہ آپ نے اس عرصہ میں فریضۂ حج سے فراغت حاصل کی اور نکاح کیا اس وجہ سے کہ آپ کی اُنچاس اولاد میں سے ایک کی ولادت ۵۰۸ھ میں واقع ہوئی تھی بعض مورخین لکھتے ہیں کہ آپ امام ابوحنیفہؒ کے مزار کے متولی تھے۔ آپ نے طریقۂ سلوک و تصوف (حضرت) ابوالخیر محمد بن مسلم الدباس[۵۴] سے حاصل کیا۔ جنکا پایۂ بزرگی اس قدر بلند ہے کہ شعرانی کی فہرست میں اُن کا نام داخل ہے۔ انھیں بزرگ کی نظرِ توجہ کے اثر سے (حضرت) شیخ پر فقر و تصوف غالب ہوگیا۔ اس طرح کہ آپ اُنکے پاس ایک مرتبہ ملنے آئے تھے اور چونکہ اس موقع پر کسی نے ایک باز پکڑا تھا اسی وجہ سے ومیری کے نزدیک آپ کا لقب "باز الاشہب" ہوگیا[۵۵]۔ (شیخ) دباس کے طریقۂ تعلیم میں سخت مشکلات اور تکالیف

---

۵۴ اکثر کتابوں میں بجائے "محمد" کے "حماد" لکھا ہے۔

۵۵ تعجب ہے پروفیسر مارگولیوتھ ایسے عربی داں بلکہ عربی نژاد محقق نے اس مقام پر فاش غلطی کی اور سخت دھوکا کھایا ہے۔ انگریزی کی اصل عبارت بالکل وہی ہے جیسا کہ ترجمہ میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی دوسرے شخص کے باز پکڑنے اور حضرت غوث الاعظم کو باز اشہب کا لقب ملنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ صحیح واقعہ یہ ہے کہ جب غوث الاعظمؒ شیخ دباس کی خدمت میں بغرضِ ارادت حاضر ہوئے تو شیخ نے فرمایا کہ "میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں نے ایک باز شکار کیا ہے، اور شاید وہ باز تمھیں ہو" یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ (دیکھیے صفحہ آیندہ)

سے بہا منا تھا اور اُنکے دیگر صوفی مشرب مُریدوں اور شاگردوں کو ایک نفقیہ کی شرکت اپنے سلسلۂ طریقت و درس میں نہایت گراں معلوم ہوتی تھی۔ بہرحال (حضرت) شیخ بہت تھوڑے ہی عرصہ میں اس قابل ہوگئے اور مراحل سلوک اس قدر طے کر لیے کہ آپ کو خرقۂ تصوف قاضی ابوسعید مبارک المخرمی کے دستِ مبارک سے عطا ہوا جو اُسوقت فقہ حنبلی کے مشہور امام اور بغداد میں باب الازج کے قریب ایک مدرسہ میں درس دیتے تھے جہاں (حضرت) شیخ بھی بغرض استفادہ حاضر ہوتے تھے۔ ۵۲۱ھ میں شیخ یوسف الہمدانی (۴۴۰ھ لغایت ۵۳۵ھ) کی صلاح سے (حضرت) شیخ نے اپنا سلسلۂ وعظ علانیہ طور پر شروع کر دیا۔ جہاں گو ابتدا میں سامعین کی تعداد مختصراً... ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ اتنی بڑھ گئی کہ آپ بغداد میں باب الحلبا کے قریب وعظ و نصیحت کی پُرجوش و فصیح تقریریں فرماتے۔ اور مشتاقان سخن کی کثرت کی وجہ سے اکثر آپ کو باب مذکور کے باہر نکل جانا پڑتا تھا۔ اسی جگہ آپ کے واسطے ایک رباط تعمیر کی گئی۔ اور ۵۲۸ھ میں باشندگان شہر کی فراخ حوصلگی سے المخرمی کا یہ مدرسہ اس قدر وسیع کر دیا گیا کہ آس پاس کے مکانات بھی اُس میں شامل کر لیے گئے۔ اور (حضرت) شیخ اس کے مدرس اعلیٰ (امام) قرار دیے گئے۔ اس مدرسہ کے درس کی نوعیت تقریباً وہی تھی جیسا کہ جمال الدین الجوزی (ابن جوزی) کے درس کی تھی جس کا حال ابن جبیر نے نہایت تفصیل و وضاحت سے قلمبند کیا ہے۔ جمعہ کے دن صبح کو اور دوشنبہ کے دن شام کو (حضرت) شیخ اسی مدرسہ میں وعظ بیان فرماتے اور یکشنبہ

ھ دمیری کی کتاب الحیوان جلد اول صفحہ ۹ میں درج ہے اور قرینہ کہتا ہے کہ اُسی سے پروفیسر موصوف نے نقل کیا ہوگا۔ گو یہ اسکے کہ خود شیخ دیاس نے "خواب میں" باز پکڑا اور لکھ گئے کہ کسی دوسرے شخص نے "فی الواقع" باز پکڑا تھا۔ اور یہی وجہ اس لقب کی ہوئی۔ یہ مبارک لقب جو پیر نے جوش محبت میں دیا تھا آپ کو اس قدر پسند آیا کہ اپنے ایک مشہور قصیدہ میں جس کا مطلع ہے

سقانی الحب کاسات الوصال　　فقلت لخمرتی نحوی تعالی

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

انا البازی واشہب کل شیخ

ومن ذا فی الرجال اعطی مثالی

کے دن صبح کو حضرت کی خانقاہ میں محفل وعظ منعقد ہوتی تھی۔ آپ کے حلقہ مریدین وتلامذہ میں بہت سے مشہور اولیاء اللہ ہوئے مگر بعض تے مثل آپ کے سوانح نگار سمعانی کے، دیگر علوم میں کمال دستگاہ حاصل کی۔ مشہور ہے کہ (حضرت) شیخ کے وعظ ونصائح اتنے پُرجوش وبا اثر ہوتے تھے کہ اکثر یہود ونصاریٰ دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے اور اکثر مسلمان صوفیِ صافی ہوگئے۔ اکثر تحف وہدایا جو زیادہ تر نذر ونیاز کی صورت میں ہوتے تھے مقامات دور دراز سے جہاں آپ کی شہرت پہونچ گئی تھی (حضرت) شیخ کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے جو تلامذہ اور ارادت مندوں کی مہمان نوازی کے لیے وقف تھے۔ اسی طرح سوالات فقہیہ استفتے کی صورت میں دُور دُور سے بکثرت آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے جنکا جواب فی البدیہہ آپ ارشاد فرماتے۔ اکثر خلفا اور وزرا بھی آپ کے ارادت کیشوں اور معتقدوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

(حضرت) شیخ کی تصنیفات جن میں زیادہ تر آپ کے خطبے اور مواعظ ہیں سب مذہبی رنگ میں ہیں۔ آپ کی وہ تصانیف جن کا ہم کو علم ہے حسب ذیل ہیں:-

(۱) "الغنیہ لطالب طریق الحق"۔ ایک مذہبی اور اخلاقی رسالہ ہے (مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۸ھ)

(۲) "الفتح الربانی"۔ باسٹھ خطبوں کا مجموعہ۔ جو ۵۴۵-۵۴۶ھ میں دیے گئے تھے مع تتمہ (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ) بعض قلمی نسخوں میں اس کا نام "ستین مجالس" ہے۔

(۳) "فتوح الغیب" اٹھتر خطبوں کا مجموعہ مختلف مضامین پر مشتمل ہے جسکو (حضرت) شیخ کے صاحبزادہ (شیخ) عبد الرزاق نے جمع کیا تھا۔ اسکے آخر میں آپ کے وصایا، آپ کا شجرۂ پدری و مادری حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ آپ کے تعلق کا ثبوت، آپ کے مذہبی اعتقادات اور آپ کی بعض نظمیں درج ہیں۔ (حاشیہ بہجۃ الاسرار مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۴ھ)

(۴) "حزب بشائر الخیرات" ایک صوفیانہ دعا ہے۔ (مطبوعہ اسکندریہ ۱۳۰۴ھ)

(۵) "جلاء الخاطر" (متذکرۂ حاجی خلیفہ) خطب کا مجموعہ ہے جن میں پہلے خطبہ کی تاریخ وہی ہے جو نمبر (۲) کے خطبہ ۵۹ کی اور آخری خطبہ کی وہ ہے جو نمبر (۲) کے خطبہ نمبر ۵۷ کی ہے۔ شاید یہ اُسی کتاب کا دوسرا نام ہو۔

(۶) "المواہب الرحمانیہ والفتوح الربانیہ فی مراتب الاخلاق السنیۃ والمقامات العرفانیۃ"

جس کا ذکر روضۃ الجنات صفحہ ۴۴۱ میں ہے۔ شاید یہ وہی کتاب ہو جو مذکورۂ بالا نمبر ۲ یا ۳ ہے۔

(۷) "مواقیت الحکم" (بتذکرۂ حاجی خلیفہ)

(۸) "الفیوضات الربانیہ فی الاوراد القادریہ" - مجموعۂ ادعیہ (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۳ھ)

(۹) مجموعۂ خطب مشمولۂ بہجۃ الاسرار و دیگر رسالجات ۔ (اس کا ناتمام قلمی نسخہ انڈیا آفس کی فہرست میں نمبری ۶۲۲ ہے - فارسی مورخین اس کا ذکر عام طور پر "ملفوظات قادری" کے نام سے کرتے ہیں)

تمام تصانیف مذکورۂ بالا میں (حضرت) شیخ من حیث المصنف ایک زبردست فقیہ اور ایک پُر زور راستباز اور فصیح و اعظ نظر آتے ہیں۔ الغنیہ میں بہت سے اعلیٰ درجے کے خطبے شامل ہیں اور اسلام کے تہتر فرقوں کے حالات بھی درج ہیں جو دس ابواب پر منقسم ہے۔ اس میں اکثر مشہور نحویوں کا ذکر ہے مثلاً مبرد اور قدمائے مفسرین اور اولیاء اللہ کے حالات بھی مندرج ہیں۔ اس کتاب سے (حضرت) شیخ کے مذہبی اعتقادات ایک پورے پیرو شریعت کے ایسے معلوم ہوتے ہیں اور طرز بیان من اولہٖ الیٰ آخرہ متانت سے خالی نہیں۔ البتہ بعض آیاتِ قرآنی کی تفسیر و توضیح میں متصوفانہ تاویل سے کام لیا گیا ہے اور پوشیدہ معنی بیان فرمائے ہیں۔ اسکے ساتھ بعض اوراد کا بھی ذکر ہے جن کو پچاس پچاس یا سو سو مرتبہ پڑھنے کی تاکید ہے۔

کتاب نمبر (۲) مذکورۂ بالا میں بعض خطب ایسے ہیں جو ادب اسلامی میں بے نظیر ہیں۔ ان میں مذہبی رواداری اور انسان دوستی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کا دل چاہتا ہے کہ تمام بنی نوع انسانی پر دوزخ کے دروازے بند اور بہشت کے دروازے کھول دیے جائیں۔ اصطلاحات صوفیہ بہت شاذ و نادر استعمال ہوئے ہیں اور مطالب ایسے عام فہم طریقہ سے بیان فرمائے ہیں کہ معمولی قابلیت کے پڑھنے والے بھی اُس سے اچھی طرح بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ بھی مشہور ہے کہ (حضرت) شیخ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں اُس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ خطب کا لب لباب اور عام مفہوم یہ ہے کہ ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے جویائے حق کو لازم ہے کہ دنیوی عیش و آرام، لذات و نعمات کو خیرباد کہے بعد کو جب اس قابل ہو جائے کہ دوسروں کو اپنے دائرۂ ارادت میں لے سکے تو پھر عود کرے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی کہ ہر چیز خواہ اس عالم سے تعلق رکھتی ہو یا دوسرے عالم سے، وہ درمیان طالب و مطلوب کے

ایک حجاب ہے اور طالب کا مقصد اصلی فنا فی المطلوب ہونا چاہیے، بہت خوبی اور شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے۔ سامعین یا قارئین وعظ کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے اموال سے اولیاء اللہ کی خدمت کریں اور اُنکو اپنے اہل خاندان پر ترجیح دیں۔ خطبوں میں خود خطیب اپنی طرف اشارہ بہت کم کرتا ہے اور جہاں کہیں ہے وہ بھی زیادہ تفاخر کے لہجہ میں نہیں۔ مثلاً جس جگہ اپنے تئیں "اہل عالم کی کسوٹی" فرمایا ہے تو مراد اُس سے صرف اتنی ہے کہ میں اہل حق اور اہل باطل یا سچے اور مصنوعی جویائے حق میں بخوبی تمیز و تفریق کر سکتا ہوں۔ مگر اسکے ساتھ اسپر بھی زور دیا گیا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں فرمان الٰہی کے مطابق کہتا ہوں۔

(حضرت) شیخ کے حالات جو آپ کے مریدین عبد اللہ بن محمد البغدادی اور عبد المحسن البصری اور عبد اللہ بن نصر الصدیقی نے لکھے ہیں (جن کا نام "انوار الناظر" ہے اور بہجۃ الاسرار کے صفحہ ۱۰۹ پر مذکور ہیں) بالفعل ہم کو نہیں مل سکتے۔ سمعانی نے اپنی لغت (کتاب الانساب) میں (حضرت) شیخ کا نام "جیل" لکھ کر اُسکے آگے کچھ جگہ چھوڑ دی ہے۔ آپ کے حالات سمعانی کے صاحبزادہ نے بھی کچھ قلمبند کیے ہیں۔ جن میں تہذیب و متانت تو مندرج ہے مگر ارادت سے خالی ہیں۔ پھر آپ کے کچھ حالات موفق الدین عبد اللہ المقدسی نے بھی جمع کیے ہیں جو (حضرت) شیخ کی آخر عمر میں ۵۰ دن تک آپ کی خدمت میں برابر حاضر رہے۔ ان کا بیان ہے کہ اہل بغداد (حضرت) شیخ کی بڑی عزت کرتے اور بہت مانتے تھے اور کشف و کرامات کے بھی قائل تھے مگر میں نے کوئی کشف و کرامت (حضرت) شیخ کی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ مقدسی مذکور اور ایک شخص اور زمانۂ مذکور میں (حضرت) شیخ کے تنہا تلامذہ تھے۔ محی الدین ابن عربی (ولادت ۵۶۰ھ) نے بھی اپنی تصانیف میں (حضرت) شیخ کا اکثر جگہ ذکر کیا ہے۔ کہیں لکھتے ہیں کہ "وہ عادل ہیں" "اپنے زمانہ کے قطب ہیں"۔ (فتوحات مکیہ جلد اول صفحہ ۲۹۳)۔ "امام طریقت ہیں" "اہل عالم کے مستند قاضی ہیں" (ایضاً جلد دوم صفحہ ۲۴) "فرقۂ ملامتیہ سے تھے" (جلد سوم صفحہ ۳۴) کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ (حضرت) شیخ بطن نادر میں مصروف حمد تھے۔ اور یہ کہ اُن کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ سوا خدا کے سب سے بالاتر ہیں۔ صاحب بہجۃ الاسرار (متوفی ۷۱۳ھ) نے (حضرت) شیخ کی اکثر کرامات کا ذکر کیا ہے اور ایک زبردست سلسلۂ شواہد پیش کیا ہے۔ بعض وجہ سے ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ)

کا قول ہے کہ شواہد مذکور کافی طور سے اطمینان بخش ہیں۔ مگر بعض کے نزدیک کتاب مذکور قابل اطمینان نہیں۔ مثلاً ذہبی اُن کو "مصنوعی قصوں" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ابن الوردی نے (تاریخ" جلد دوم۔ صفحات ۱۰۰ و ۱۰۱ میں) اُسکی نقل کی ہے۔ بعض جملے اس قسم کے بھی آپ کی طرف منسوب ہیں جو تفاخر آمیز ہونے کی وجہ سے بعض کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بہجۃ الاسرار میں اُن اشخاص کی پوری فہرست دی ہے جنھوں نے (حضرت) شیخ کو فرماتے ہوئے سُنا "قدمی ہذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ" (میرا پاؤں ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے) اسی طرح یہ جملہ بھی آپ کی طرف منسوب ہے کہ ستر ابواب علم مجھ پر کشادہ ہیں جن میں سے ہر ایک اتنا وسیع ہے جتنا زمین و آسمان کے درمیان کا فاصلہ۔ متقدمین متاخرین (حضرت) شیخ کے (مثلاً صاحب رسالہ "مخازن قادریہ" فارسی۔ قلمی نسخہ برٹش میوزیم نمبری ۲۴۸) ایک طرف تو جملہ مقدم الذکر کی عمومیت کو محدود کرنا چاہتے ہیں مگر دوسری طرف اسکے بھی قائل ہیں کہ (حضرت) شیخ اس قسم کے ادعا کے ہر طرح مجاز ہیں اور نیکدل مصنفین مثل دہیری کے اس قسم کے جملوں سے صرف (حضرت) شیخ کی فضیلت استنباط کرتے ہیں (دمیری جلد اول صفحہ ۳۲۰) معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جملے (حضرت) شیخ کی مستند تصانیف میں نہیں پائے جاتے۔ البتہ اس قبیل کی باتیں اُن نظموں میں ملتی ہیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں۔ اور آپ کے پیرووں اور مریدوں کے وفور جوش و اعتقاد کی دلیل ہیں۔ ان لوگوں میں آپ کی شہرت اور محبت خود پیغمبر اسلام (علیہ الصلوۃ والسلام) سے بھی بڑھ کے پائی جاتی ہے۔ آپ "سلطان الاولیا" کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور کبھی بھی آپ کا نام نہیں لیا جاتا جب تک اُسکے ساتھ ذیل کے لقب نہیں شامل کیے جاتے: مشاہد اللہ، امر اللہ، فضل اللہ، امان اللہ، نور اللہ، قطب اللہ، سیف اللہ، فرمان اللہ، برہان اللہ، آیات اللہ، غوث اللہ، غوث الاعظم۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس شہرت و نمود کو آپ کے صاحبزادوں نے ترقی دی، جن میں سے گیارہ کے نام بہجۃ الاسرار میں اس طرح گنوائے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ (حضرات) اپنے پدر بزرگوار کے قدم بہ قدم چلتے تھے (۱) شیخ عیسیٰ متوفی ۵۷۳ھ مصر میں۔ (۲) شیخ عبداللہ متوفی ۵۸۹ھ بغداد میں (۳) شیخ ابراہیم متوفی ۵۹۲ھ واسط میں (۴) شیخ عبدالوہاب متوفی ۵۹۳ھ بغداد میں (۵) و (۶) شیخ یحییٰ و محمد متوفی ۶۰۰ھ بغداد میں (۷) شیخ عبدالرزاق متوفی ۶۰۳ھ بغداد میں۔

(۸) شیخ موسیٰ متوفی ۶۱۸ھ دمشق میں (۹) شیخ عبدالعزیز۔ جو سنجار کے ایک گاؤں میں رحلت کر گئے تھے جہاں ۶۲۰ھ میں انتقال کیا (۱۰) شیخ عبدالرحمٰن متوفی ۵۸۷ھ (۱۱) شیخ عبدالجبار متوفی ۵۷۵ھ۔ بعض ارباب تاریخ اس فہرست میں کچھ اور نام بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ان میں سے شیخ عبدالوہاب اپنے پدر بزرگوار کے قائم مقام اور جانشین ہوے۔ پھر انکے بعد انکے صاحبزادے شیخ عبدالسلام (۵۴۸ھ تا ۶۱۱ھ) اور انکے بعد انکے برادر عم زاد شیخ ابو صالح نصر بن عبدالرزاق (۵۶۴ھ لغایت ۶۳۳ھ) ہوے۔ خلیفہ ناصر بامراللہ کے زمانۂ حکومت میں (حضرت) شیخ کی اولاد اور متوسلین کے کچھ لوگ تھوڑے عرصہ کے لیے بغداد سے جلاوطن کیے گئے اور بعض حضرات تاتاریوں کے مشہور حملہ میں شہید ہوے مگر سلسلۂ قادریہ کا مستقل مقام اور مرکز ہمیشہ بغداد ہی رہا۔

فہرست اسناد (حضرت) شیخ کی سوانح عمریوں کی ایک فہرست جرمن مستشرق اہلوارد نے دی ہے۔ جن میں سے کتب ذیل شایع ہو چکی ہیں:— (۱) شطنوفی "بہجۃ الاسرار" (مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۰۴ھ) (۲) محمد بن یحییٰ تادفی "قلائد الجواہر" (قاہرہ ۱۳۰۳ھ) (۳) محمد الدلاعی "نتیجۃ التحقیق" (مطبوعہ فیز ۱۳۰۹ھ) جس کا ترجمہ "وئیر" کا رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۳ء میں چھپ گیا ہے۔ انکے علاوہ "غبطۃ الناظر" جو ابن حجر کی طرف منسوب ہے مگر اہلوارد کی فہرست میں داخل نہیں۔ اسکوڈ اکٹر ڈینزن راس نے کلکتہ میں ۱۹۰۳ء میں ایڈٹ کیا تھا۔ شاید بہترین موجودہ سوانح (حضرت) شیخ کے ذہبی کی "تاریخ الاسلام" میں ملیں گے۔ جس کا ماخذ ابن النجار ہے اور رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۷ء کے صفحات ۱۲۶ الخ میں شایع ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانہ میں شیخ سنوسی نے بھی کچھ حالات (حضرت) شیخ کے تحریر کیے ہیں۔ اگر کسی کو (حضرت) شیخ یا سلسلۂ قادریہ کے متعلق یورپی تحریروں سے فائدہ اُٹھانا ہو تو کتب ذیل مطالعہ کرے: (۱) ال رن "مرابوز اے خوان" (پیرس ۱۸۸۴ء) (۲) لے شاتیلیر "کانفریریز مسلمانی دو حجاز" (پیرس ۱۸۸۶ء) (۳) دیپون اور کاپولانی "کانفریریز ریلیجوسے مسلمانی" (الجیرس ۱۸۹۷ء) (۴) قرادیووز "غزالی" (پیرس ۱۹۰۲ء)

محمد عسکری

افغانیہ

(ڈراما)

بابر	مغل بادشاہ	آدو	ملک احمد کا دوسرا بھائی
ملک احمد	یوسف زئی جرگہ کا سردار	الف	" کا تیسرا بھائی
شاہ منصور	ملک احمد کا پہلا بھائی	ب	" کا چوتھا بھائی
بی بی مبارکہ	شاہ منصور کی لڑکی	خوش دل خاں	دلازاک قوم کا سردار
رونہ	بی بی مبارکہ کی انا		

جہانگیر مرزا - شریم طغائی - عبدالرزاق مرزا - بابا اوغوکی - سید قاسم امراے بابری

تاریخی نوٹ :- بابر بادشاہ کا آفتاب اقبال بلندی پر ہے۔ الغ بیگ کی وفات (سنہ ۹۰۸ھ) کے بعد کابل کا حکمراں محمد مقیم بابر سے سنہ ۹۱۰ھ میں شکست کھاکر پہاڑوں میں چلا جاتا ہے اور یوسف زئی پشاور و سوات کی طرف کابل سے ہجرت کرکے آبستے ہیں۔ کابل پر بابر کا تسلط ہوجاتا ہے۔

پہلا سین

کابل - شاہی محل - خوش دل خاں دلازاک بابر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جاتا ہے۔ خوش دل خاں حاضر ہوتا ہے دورسے آداب بجالا کر دست بستہ کھڑا ہوجاتا ہے۔

بابر - "تمھارا ہی نام خوش دل ہے اور دلازاک کے تمھیں سردار ہو؟"

خوش دل خاں - "بادشاہ کا اقبال ترقی پر ہے۔ اسی غلام کا نام خوش دل ہے اور دلازاک قوم کی طرف سے حاضر ہوا ہے۔"

بابر - "تم لوگوں کی آخر کیا خواہش ہے - میرے کئی ایک امیروں نے تمھارا اور تمھاری قوم کا ذکر کیا ہے کہ تم لوگ بڑے بہادر ہو مگر یوسف زئیوں سے تمھاری قدیم دشمنی چلی آتی ہے۔"

خوش دل خاں - "یوسف زئی ایک دھوکا دینے والی جاہل قوم ہے - اُس میں وفاداری کا مادہ نہیں، اور غرور سے سرتاپا بھری ہوئی ہے - انکا سردار ملک احمد ایک نہایت مدمغ آدمی ہے اور بادشاہ کے سلام کو ابھی تک حاضر بھی نہیں ہوا -

وہ سمجھتا ہے کہ اُنکی قوم اور اُسکے دست و بازو بادشاہی عظمت و جلال کا مقابلہ کرنے کو کافی ہیں۔

بابر۔" یوسف زئی ایک بہادر قوم ضرور ہے مگر بہت مغرور ہے۔ ملک احمد کے باپ سلطان شاہ اور اسکے بھائی سلیمان شاہ کا حال ابدولت نے سنا ہے کہ کس طرح الغ بیگ نے باوجودیکہ سلیمان کا داماد تھا اُسے قتل کرکے کابل پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی الغ بیگ کے داماد و جانشین محمد مقیم سے ہم نے اس ملک کو پاک کیا اور یوسف زئیوں کے غلبہ سے کابل کو نجات دلادی۔"

خوش دل۔" جہاں پناہ۔ میں اور میری قوم بادشاہ کے قدموں تلے سرفروشی کو حاضر ہے اور ستر ہزار شاہرخی نذرانہ پیش کرنے پر راضی ہے۔"

بابر۔" ابدولت تمہاری وفاداری اور دلازاکوں کی شجاعت کی قدر کریں گے اور ملک احمد کو قتل کرکے اُسکے وجود سے اس ملک کو پاک کردیں گے۔ اب تم جاؤ۔ دوبارہ جب ہم طلب کریں تو حاضر ہونا۔"

(خوش دل خاں کے جانے کے بعد یوں اپنے دل سے کلام کرتا ہے)" ملک احمد کو میں بلاتا ہوں مگر مصلحت یہ ہے کہ دوستانہ طریق پر بلایا جائے ورنہ نہیں آئیگا اور خود اُسکے کوہستانی گھونسلہ میں جاکر لڑائی لڑنی ہوگی۔"

(ایک دوستانہ خط ملک احمد کے نام لکھتا ہے)

دوسرا سین

وادی سوات۔ وادی سوات میں ملک احمد کا سادہ مکان۔ ملک احمد اپنی بیوی بچوں میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے۔

شاہ منصور (باہر سے آکر)" بھائی جان۔ شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر کا دیکھیے یہ ایک خط لایا ہے" (خط دیتا ہے)

ملک احمد۔" بابر کا؟ خدا خیر کرے۔ آجکل دلازاک اُسکے دربار میں بہت گھسے ہوئے ہیں اور بادشاہ ہماری اور اُنکی پرانی دشمنی سے ناواقف ہے" (خط کھول کر پڑھتا ہے۔ چہرے پر بشاشت کے آثار بڑھتے جاتے ہیں اور خوشی سے رنگ چمکنے لگتا ہے۔ پھر بھائی سے مخاطب ہوکر کہتا ہے)" الحمد للہ۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی اندیشہ ناک بات نہ ہو۔ یہ تو بہت محبت کا خط ہے اور ہمیں کابل بلایا ہے۔ ہم پانچوں بھائی چلیں گے اور بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوں گے۔"

شاہ منصور۔" نہیں میری رائے نہیں۔ خوش دل خاں دلازاکی کو آپ جانتے ہیں۔ آج کل دربار میں اُسکی رسائی ہے۔ اور کچھ اچھی خبریں نہیں آرہی ہیں۔"

ملک احمد۔" نہیں۔ نہیں۔ تمہارا یہ وہم ہے۔ بادشاہ کے دل میں اگر کینہ ہوتا تو ہمارے مُلک پر چڑھائی کرتا اُسے ہماری حالت معلوم ہے۔ اگر ہم اُن پہاڑوں پر ہوں تو ایسے دوستانہ لہجہ میں خط لکھنے اور کابل آنے کی دعوت نہ دیتا۔ ہم اُسکے حملہ کی تاب نہیں لا سکتے ہیں۔"

شاہ منصور۔ "میری رائے نہیں۔ دل میں کھٹکا سا معلوم ہوتا ہے۔"

(اتنے میں اور تینوں بھائی آجاتے ہیں اور سب منع کرتے ہیں مگر ملک احمد کی سادہ طبیعت کسی مکر فریب کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتی)

ملک احمد۔ "میں تمھارے وسواس کو وہم و اندیشہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ بادشاہ سے ملنے کے بعد تمھیں سب معلوم ہو جائے گا۔"

شاہ منصور۔ "خیر جو آپ کی مرضی ہو ہم سب حاضر ہیں۔ مگر ہمارے دل میں جو کھٹکا ہے وہ کم نہیں ہوتا۔ مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ ہم چاروں بھائی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم سب ہمراہ چلیں گے۔"

ملک احمد۔ "ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

(کابل جانے کی تیاریاں ہوتی ہیں)

تیسرا سین

کابل شہر۔ ملک احمد مع چاروں بھائیوں کے کابل پہونچتا ہے اور ایک مکان میں جو بابر نے انکے لیے تجویز کیا تھا قیام پذیر ہوتا ہے۔

شاہ منصور (ملک احمد سے) "لیجیے بھائی جان۔ آخر میرا اندیشہ صحیح نکلا۔ آج مجھے ایک پرانے دوست کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ بادشاہ کی نیت خراب ہے اور ہمیں کیوں بلایا ہے۔"

ملک احمد۔ "کیا؟ کیا واہیات باتیں کرتے ہو؟"

(دوسرے بھائی بھی آجاتے ہیں اور وہ بھی اپنی اپنی اطلاع دیتے ہیں اور شاہ منصور کے بیان کے موافق بیان کرتے ہیں)

ملک احمد۔ "تو کیا واقعی بابر کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا ہے؟ مجھے اُسکی ذات سے یہ توقع نہ تھی۔ وہ ایسا بُزدل نہیں تھا۔"

شاہ منصور۔ "اب بہتر یہ ہے کہ جلد کوئی انتظام کیا جائے ورنہ اچانک کوئی بات ہو جائے گی اور پھر کوئی تدبیر نہ ہو سکے گی۔"

(دوسرے بھائی شاہ منصور کے کان میں کچھ کہتے ہیں۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے جس پر سب اتفاق کرتے ہیں)

شاہ منصور (ملک احمد سے) "بھائی جان۔ ایک تدبیر ہم لوگوں نے سوچی ہے۔ آج شب کو ہم چاروں اپنی اپنی پگڑیوں کے سرے ایک دوسرے سے باندھ کر ایک رسّی سی بنائیں اور آپ کو اُسکی مدد سے فصیل سے نیچے اُتار دیں۔ پھر ہم سب بھی شہر کے کسی گوشہ میں چھپ رہیں۔ موقعہ ملتے ہی فوراً نکل جائیں گے۔"

ملک احمد۔ "واہ! کیا تدبیر سوچی ہے! بابر کا ارادہ تو ابھی تک ظاہر نہیں ہوا۔ لیکن آپ صاحبوں کی تدبیر معلوم ہو گئی۔ جو مجھے بابر کے ارادہ سے بھی پہلے موت کے گھاٹ اُتار دیگی۔ تم سمجھتے ہو ان سربفلک دیواروں سے اس طرح نکل جانا آسان

کیا کوئی پہرہ والا نہیں ہے - کیا دیواریں اتنی نیچی ہیں؟ میں اپنی جان کو اس جوکھم میں نہیں ڈالتا - کل دربار میں طلبی ہے - جاؤں گا - خدا مالک ہے - جو کچھ ہوگا ہوگا - منصور - تم اور دو بھائی کہیں چلے جاؤ اور میرے ساتھ جانے کے لیے صرف آدو کو چھوڑ دو۔"

شاہ منصور "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کو اس طرح موت کے مُنہ میں جانے دیں اور خود جان بچا کر چلے جائیں"

ملک احمد "نہیں - میرا کہنا مانو - میرا دل مطمئن ہے - خدائے جل و علا پر بھروسہ ہے - تم تینوں اسی شہر میں چھپے رہو اور جب موقعہ پاؤ نکل جاؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہمارا خاندان برباد ہو جائے اور کوئی گھر میں ملک تاج الدین کا نام لیوا بھی نہ رہے - تمھیں ریش پدر کی قسم میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

(ملک احمد کے بڑے اصرار پر اُسکے بھائی تعمیل حکم کرتے ہیں اور کہیں چلے جاتے ہیں اور صرف چھوٹا بھائی ساتھ رہ جاتا ہے)

چوتھا سین

نوٹ: - خوش دل خاں دلازاک بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہتا ہے کہ ملک احمد کو باتیں کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے - یہ جانتا تھا کہ ملک احمد کی زبان میں جادو ہے - اگر اس نے کلام کیا تو پھر کامیابی محال ہے - اس لیے بادشاہ کے کان بھر کر یہاں تک آمادہ کر دیا کہ ملک احمد کو کلام کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے - اور قتل کر ڈالا جائے

[شاہی دربار - بابر بادشاہ تخت پر جلوہ فرما ہے - اور تمام درباری دو رویہ ادب سے کھڑے ہیں - بادشاہ کے سامنے تیر و کمان رکھی ہوئی ہیں -]

ملک احمد حاضر ہو کر دُور سے آداب بجا لاتا ہے - بادشاہ اُسے دیکھ کر تیر کمان پر ہاتھ ڈالتا ہے - یہ دیکھ کر ملک احمد اپنے دل سے کہتا ہے "دشمنوں نے اتنے کان بھر دیے ہیں! بات کرنے کا موقعہ ہی کیا نہ ملے گا - دو باتیں مجھ سے ہو جائیں، اسکے بعد جو کچھ ہوتا ہو تا - اے خدا میرے دل کو ہمت اور زبان کو یارا دے اور اس ناسمجھ بادشاہ کو ہدایت فرما (پھر چشم زدن میں کچھ سوچ کر) اپنے جلیتہ کی گھنڈیاں کھولدیتا ہے اور بادشاہ کے سامنے سینہ کھول کر خاموش آ کھڑا ہوتا ہے -

بابر (ملک احمد کی اس حرکت سے حیرت زدہ ہو کر) "ملک احمد یہ کیا حال ہے - کیا اپنی جان عزیز نہیں رکھتے جو اس طرح سینہ برہنہ کر کے میرے تیر کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہو؟"

ملک احمد (اسی طرح بے جھجک خاموش کھڑے رہ کر) "جہاں پناہ یہ مجھ سے تو پوچھیں - میرے

اس فعل کی لم نہ دریافت فرمائیں اور جو مرضیِ مبارک میں آئے کریں۔ اس غلام کے نصیب کہاں تھے جو یہ نعمت ملتی۔"

بابر۔ "نہیں۔ میرے سوال کا جواب دو۔ یہ جواب میں نہیں سنتا۔ تم جو اس طرح بے جھجک سینہ کھول کر میرے تیر کے سامنے کھڑے ہو گئے تو اسکی کیا وجہ ہے؟"

ملک احمد۔ "جہاں پناہ سے یہ غلام کچھ زیادہ نہیں عرض کر سکتا۔ صرف یہ متمنی ہے کہ اگر مرضیِ مبارک یہی ہے تو جاں نثار حاضر ہے۔"

بابر۔ "نہیں۔ تمھارے اس فعل کی وجہ معلوم ہونی چاہیے اور جب تک تم صاف جواب نہ دوگے یہ قضیہ ختم نہیں ہو سکتا۔"

ملک احمد۔ "جہاں پناہ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں جس کی صولت سے بڑے بڑے قاہر وجابر کانپ رہے ہیں۔ جس نے زمانہ سے ظلم و تعدی کی بنیاد اُکھاڑ کر پھینکدی اور انصاف کا پایہ مضبوط کیا۔ فخر آل تیمور! و فخر اہل زمانہ! جسکے مقابلہ کی طاقت روے زمین کا کوئی بادشاہ نہیں رکھتا۔ معدلت شاہنشاہی کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے۔ اور فوج ظفر موج کی قہرمانی اسکندر و داریوش اعظم کے نام کو بھلا رہی ہے۔ اس بڑے مجمع میں جہاں پناہ کا نشانہ دیکھنے کے لیے سب کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ میرا یہ چلتہ و بیز زیادہ ہے۔ اس لیے اندیشہ ہوا کہ مباوا تیر اُچٹ نہ جائے اور نشانہ خطا نہ ہو جائے اور تمام تماشائی یہ نہ سمجھیں کہ بادشاہ کا نشانہ ٹھیک نہیں پڑا۔ اس خیال سے اس غلام نے اپنا سینہ ننگا کر دیا ہے کہ تیر کی راہ میں کوئی شے حائل نہ ہو۔

نہ بود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی"

بابر۔ "تمھارا جواب بہت اچھا اور تمھاری زبان نہایت شیریں ہے۔ بدولت ایسے شخص پہ ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہتے۔" (یہ کہکر تیر کمان رکھدیتا ہے۔ اور پھر ملک احمد سے پوچھتا ہے) "ہاں۔ بہلول لودی کس قسم کا آدمی ہے؟"

ملک احمد۔ "بہلول فرس بخش ہے۔"

بابر۔ "اور اُس کا لڑکا سکندر لودی؟"

ملک احمد۔ "وہ خلعت بخش ہے۔"

بابر۔ "اچھا، بابر کیسا ہے؟"

ملک احمد۔ "وہ سر بخش ہے۔"

بابر (اس جواب سے بہت خوش ہوتا ہے، اور ایک شاہانہ انداز سے کہتا ہے) "جاؤ ہم نے تمھاری سر بخشی کی۔ (پھر ملک احمد کا ہاتھ پکڑ کر) اور چلو۔ ہمارے ساتھ چلو۔" (یہ کہکر ملک احمد کو اپنے ہمراہ محل شاہی کے ایک بیش کمرہ میں لے جاتا ہے)

پانچواں سین

محل شاہی - ایک عالیشان جلسۂ مے نوشی کا انتظام - بابر، ملک احمد، اُس کا بھائی - اور دیگر اسباب مینوشی - ساقی و صراحی -

بابر (اپنے ہاتھ سے ملک احمد کو جام شراب بھر کر دیتا ہے) "یہ لو ملک احمد - ہمارے ہاتھ سے شراب پیو - (پھر اُس میں سے خود کچھ پی کر) اچھا اس میں سے ایک گھونٹ ہم پیے لیتے ہیں اب تم لو"

ملک احمد (آداب بجا لا کر) "جہاں پناہ کی ذرہ نوازی ہے - لیکن کہاں یہ ذرہ کہاں یہ آفتاب - کہاں یہ عاجز اور کہاں یہ عاجز نوازی" (یہ کہکر پی لیتا ہے)

بابر "ملک احمد - تم بہت خوب آدمی ہو - ہم تم سے مل کر بہت محظوظ ہوئے - تم خلوت کے یار اور جلوت کے بڑے ہوشیار ہو - (پھر ایک گلاس بھرتا ہے اور کچھ پی کر اُسکے حوالہ کرتا ہے) لو یہ ایک گلاس اور پیو"

ملک احمد (آداب بجا لا کر پیالہ چڑھا جاتا ہے) "بادشاہ کے یہ نوازش و اکرام دیکھ کر یہ فقیر اپنی قسمت پر نازاں ہے اور شک میں پڑ جاتا ہے کہ الٰہی یہ خواب ہے کہ بیداری"

بابر (پھر ایک گلاس بھرتا ہے اور قدرے پی کر ملک احمد کو دیتا ہے) "لو یہ اور پیو"

ملک احمد (پیالہ لیکر اور خالی کر کے) "یہ بادشاہ کے الطاف ہیں - ان الطاف و مکرمت کا بادشاہ روے زمین پر کوئی نہ ہوگا"

بابر (پھر خود شراب پینا شروع کرتا ہے اور جب عالم سرخوشی طاری ہوتا ہے تو کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک گردش کر کے ملک احمد کو اپنا لباس اُتار کر دیتا ہے) "ملک احمد یہ اس عالم مسرت و انبساط کی تقریب میں تمھیں خلعت دیا جاتا ہے - اسے پہنو - اسی وقت پہنو"

ملک احمد (خود اپنا لباس اُتار کر اپنے بھائی آدو کو دیتا ہے اور بادشاہ کا لباس نہایت ادب سے ہزاروں آداب بجا لا کر پہن لیتا ہے - ملک احمد کا بھائی آدو جو فن موسیقی میں صاحب کمال ہے ستار بجاتا رہتا ہے جس سے سب پر ایک کیفیت طاری رہتی ہے) "جہاں پناہ کی یہ غلام نوازی اس ذرۂ بے مقدار کی بساط سے زیادہ ہے - ہمارے بادشاہ کو خدا سلامت رکھے"

(تھوڑی دیر یہ جلسہ اور رہتا ہے پھر برخاست ہو جاتا ہے اور ملک احمد بادشاہ سے اجازت حاصل کر کے امن و امان کے ساتھ اپنے وطن کا رخ کرتا ہے)

چھٹا سین

کوہستان یوسف زئی - ملک احمد کا مکان

تاریخی نوٹ :- بادشاہ ملک احمد کو دوبارہ طلب کرتا ہے لیکن وہ بجاے اپنے شاہ منصور کو بھیجتا ہے

جسے بابر واپس کر دیتا ہے اور ملک احمد کے نہ آنے سے ناخوش ہوتا ہے۔

شاہ منصور:"بھائی جان۔ بادشاہ آپ کے نہ جانے ناخوش ہو گیا۔ مگر کچھ پروا نہیں۔ ناخوش ہو گیا ہو تو ہو جائے۔ اُسکے پاس جانا خطرہ سے خالی نہ تھا ان بادشاہوں کی حالت یہ ہے کہ"گاہے بسلامے برنجند وگاہے بدشنامے خلعت دہند" دربار میں ولاوروں نے پھر بابر کو بھڑکا دیا ہے اور اب وہ خفا بھی ہو گیا ہے۔ اندیشہ ہے کہ جلد اس طرف کا رخ کرے گا"۔

ملک احمد:"ہم اُسکے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ افسوس کہ یوسف زئی برباد ہو جائیں گے مگر ہمیں اپنی جان کی حفاظت کے لیے پہاڑوں کے اندر ایک قلعہ بنانا چاہیے۔ تھورا پہاڑ ہمارے وطن کی بہترین جائے امن و امان ہیں۔ ہمیں اس قلعہ کی تعمیر مناسب ہوگی"۔

شاہ منصور:"آپ کی رائے درست ہے۔ ان میدانوں کو چھوڑ کر اب ہمیں پہاڑوں میں رہنا ضرور ہے"۔

(تھورا پہاڑ پر قلعہ تیار کر کے ملک احمد اور اُسکے خاندان کے چھوٹے بڑے سب چلے جاتے ہیں اور بابر کے حملوں سے محفوظ رہ کر آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔)

ساتواں سین

دیارون میں بادشاہ کا کیمپ

خوش دل خاں:"جہاں پناہ نے ان متکبر و خودسر یوسف زئیوں کو خوب سزا دی۔ پہاڑی چوہوں کی طرح اب وہ اپنے بلوں میں جا چھپے ہیں اور عساکر شاہنشاہی کے سامنے نہیں آسکتے"۔

بابر:"اس مغرور جرگہ کی ہم نے تمام اراضی برباد کرادی۔ اور اُنھیں گھر سے نکال باہر کیا۔ مگر ملک احمد ابھی ہاتھ نہیں آیا ہے"۔

خوش دل خاں:"ملک احمد ایک حیلہ باز لومڑی کی طرح ہے۔ اُسے باتیں بنانا بہت آتی ہیں۔ انھیں باتوں نے ایک مرتبہ اُس کی جان بچا لی۔ اب پھر وہ کوئی تدبیر سوچ رہا ہوگا۔ ایسے شخص کا کامل استیصال ہو جانا چاہیے"۔

بابر:"خوش دل۔ تم نے ملک احمد کے متعلق صحیح رائے نہیں ظاہر کی اور اپنی قومی دشمنی کی باتیں کرتے ہو۔ میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا اور تمھاری باتوں پر اب زیادہ اعتماد نہیں کرتا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں یہ ملک احمد کیسا شخص ہے۔ تم جاؤ اب میں عبدالرزاق مرزا و سید قاسم سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

خوش دل خاں فوراً آداب بجا لا کر باہر چلا جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد عبدالرزاق مرزا

و سید قاسم حاضر ہوتے ہیں۔

بابر۔ "میں اس شخص ملک احمد کے خانگی حالات سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ کل عید قرباں ہے آؤ بھیس بدل کر اسکے قلعہ میں چلیں اور شرم طلنائی تم دونوں اور بابا اوغولی۔ بس یہ لوگ کافی ہیں۔ ہم سب قلندروں کے بھیس میں رہیں گے۔ تھوراپہاڑ یہاں سے صرف ایک دن کے راستہ پر ہے۔ کسی کو ہمارے یہاں سے غائب ہونے کا علم بھی نہ ہوسکے گا۔"

عبدالرزاق مرزا اور سید قاسم نے سرتسلیم خم کیا اور باہر چلے گئے۔

بابر (اپنے دل سے) "ملک احمد بڑا شیریں زباں ہے اور بادشاہوں کی مجلس کے آداب خوب جانتا ہے میں نے اس شخص کو بلایا تھا گر خواہ مخواہ اُسکے دل میں خوف پیدا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ ایسے آدمی کو اپنے پاس رکھ کر کام لوں۔ اس میں تمام قابلیتیں موجود ہیں۔ اب بھیس بدل کر اس کے قلعہ میں جاتا ہوں اور تمام حالات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ کہ یہ لوگ کیسے ہیں، انکے بیوی بچے کہاں ہیں، اور کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

آٹھواں سین

تھوراپہاڑ میں ملک احمد کا قلعہ۔ عید قرباں کی چہل پہل ہنگامہ میں چند قلندر نظر آتے ہیں۔ وہ ملک احمد کے مکان کی پشت پر دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں۔

ایک قلندر۔ (مکان دیکھ کر) "یہ مکان کی پشت ہے کوئی آنے جانے والا نظر آئے تو اُس سے کچھ حال دریافت کیا جائے۔ رات کی یہ تاریکی اچھی ہے مگر روشنی کی کثرت کسی قدر طبیعت کو بے چین کر رہی ہے"

دوسرا قلندر "نہیں اسی مجمع میں کھڑے رہیں تو اچھا ہے۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔ اور اگر کوئی نوکر چاکر آیا تو اُس سے بات چیت بھی کرسکیں گے"

پہلا قلندر "تم نے ٹھیک کہا۔ مکان کے احاطہ کے اُس طرف پشت پڑتی ہے ملک احمد و شاہ منصور وغیرہ ادھر نہیں آئیں گے۔ اور نہ اُن کی ادھر نظر پڑے گی"

تیسرا قلندر "یہ دیکھو ایک نوکر جا رہا ہے۔ آپ لوگ یہیں ٹھہریں میں اس سے بات کرکے آتا ہوں"

پہلا قلندر (جو بابر تھا) "نہیں تم مت جاؤ میں خود جاؤں گا" (نوکر کے پاس جاتا ہے) "بابا۔ یا اللہ"

نوکر "کیا ہے سائیں جی۔ کیا تمھیں کچھ نہیں ملا؟"

قلندر "بابا سب کچھ ملا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ مکان کس کا ہے؟"

نوکر "یہ مکان شاہ منصور کا ہے"

قلندر "انکے بال بچے بھی ہیں؟"

نوکر "ہاں کیوں نہیں۔ سب یہیں ہیں۔ مگر تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

قلندر:- "میں نے یوں ہی پوچھا کہ آخر یہ ہنگامہ کس امیر کے یہاں ہے"۔

نوکر چلا جاتا ہے اور قلندر اپنے ہمراہیوں کے پاس واپس آتا ہے اور کہتا ہے کہ "یہ کچھ جلدی میں تھا اس لیے زیادہ حال نہیں معلوم ہو سکا۔ آؤ۔ اس خیمہ کی طرف چلیں۔ وہاں شاہ منصور کا زنانہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نوکر آیا تو اور کچھ حال معلوم ہو جائے گا"۔

سب قلندر، ایک ہی قلندرانہ صدا لگاتے ہوئے جھومتے جھامتے ڈیرہ کے قریب آ گئے کہ اتنے میں ایک نوکر پاس سے گذرتا ہوا نظر آیا اسے دیکھتے ہی وہی پہلا قلندر آگے بڑھا اور سلام کرکے پوچھنے لگا "بابا۔ یہ ڈیرہ کس کا ہے؟"

نوکر:- "شاہ منصور کے بیوی بچے یہاں ہیں عید قرباں کا تماشہ دیکھ رہے ہیں"۔

قلندر:- "کیا شاہ منصور کے لڑکے ہی لڑکے ہیں یا کوئی لڑکی بھی ہے؟"

نوکر:- "ہاں ایک لڑکی بھی ہے۔ بی بی مبارکہ اُسے کہتے ہیں"۔

نوکر چلا جاتا ہے۔ اتنے میں بی بی مبارکہ کی نظر اس قلندر پر پڑتی ہے اور وہ دو روٹیوں پر کچھ بھنا ہوا گوشت رکھ کر قلندر کے پاس نوکر کے ہاتھ بھیجتی ہے۔

قلندر:- "بابا یہ کس نے بھیجا ہے؟"

نوکر:- "شاہ منصور کی لڑکی بی بی مبارکہ نے بھیجا ہے"۔

قلندر:- "وہ کہاں ہیں؟"

نوکر:- "وہ دیکھو تمھارے سامنے عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی ہیں"۔ نوکر چلا جاتا ہے۔

قلندر۔ (یعنی بابر بادشاہ) اس ماہ طلعت کو دیکھتے ہی ہکا بکا سا ہو جاتا ہے اور ایک خادمہ سے جو ادھر سے گذرتی ہے آگے بڑھ کر سوال کرتا ہے۔

"یہ کس کی لڑکی ہے؟"

خادمہ:- "یہ شاہ منصور کی لڑکی بی بی مبارکہ ہے"۔

قلندر:- "اس کا مزاج کیسا ہے کس طبیعت کی لڑکی ہے؟"

خادمہ:- "جیسا اُس کا حسن بے نظیر ہے اُسی طرح اُس کا حسن سیرت لاجواب ہے۔ وہ ایک پاک نفس، صالحہ، حق پسند اور نہایت درجہ نیک طبیعت لڑکی ہے"۔

قلندر:- "عمر کیا ہے؟"

خادمہ:- "ابھی خاصی جوان ہے"۔

قلندر:- "کیا ابھی تک اسکی منگنی نہیں ہوئی؟"

خادمہ:- "پیام بہت جگہ سے آئے ہیں مگر نسبت کہیں ابھی تک نہیں ٹھہری"۔ (خادمہ چلی جاتی ہے)

(بابر یہ سب معلوم کرکے اپنے ہمراہیوں کے پاس جاتا ہے اور مکان کے پیچھے دو پتھروں کے بیچ میں اُن دو روٹیوں اور گوشت کو چھپا دیتا ہے)

قلندر:" آؤ اب چلیں۔ سب حال معلوم ہو گیا۔"
(سب قلندر اُسی طرح صدائیں لگاتے چلے جاتے ہیں)

نواں سین

کیمپ دیاردن

بابر بادشاہ (اپنے دل سے) "یہ حضرت عشق کا دوسرا حملہ ہے۔ ایک مرتبہ بابوری کی محبت نے کوہ و بیابان کی خوب سیر کرائی۔ اب دیکھیں اس افغانیہ کا عشق کیا رنگ لاتا ہے۔ کہیں ماہورے پہاڑ میری آوارہ گردی کے بولان گاہ نہ بنجائیں۔ کہیں دیاردن کا یہ کیمپ اس دیوانگی کی یادگار نہ قائم کرے۔ ملک احمد کو میں ایک خط لکھتا ہوں وہ بہت غیور شخص ہے۔ گر اچھے الفاظ میں اور عمدہ انداز سے لکھوں گا۔ اُسکی قوم کو میرے ہاتھ سے نقصان پہونچا ہے۔ شاید وہ اور شاہ منصور اس وجہ سے خفا ہوں گے۔ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ راضی ہونگے یا نہیں۔ مگر ناامیدی کی بات کونسی ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے خط لکھوں گا۔ دیکھوں کیا اثر ہوتا ہے۔"

غرضکہ ملک احمد کے نام خود ایک خط لکھتا ہے جس میں بی بی مبارکہ شاہ منصور کی بیٹی کے لیے اپنا پیام بھیجتا ہے اور بابا اوغولی کو دیتا ہے کہ لیکر جائیں۔

بابا اوغولی:" اس غلام سے جو کچھ ہوسکے گا، دریغ نہ کرے گا۔ اگر دونوں بھائی راضی نہ ہوے تو میں اُنکی قوم کو سمجھاؤں گا۔"

بابر:" ہاں ایسی کوشش کرو کہ کامیاب آؤ۔"
(اوغولی باہر جاتا ہے)

دسواں سین

قلعہ ماہورا۔ شاہ منصور کا مکان

شاہ منصور (ملک احمد سے) "بابر نے یہ پیام بھیجا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ اس شخص سے جس قدر ہمیں سابقہ پڑا کچھ اچھی رائے اس کے متعلق قائم نہیں ہوئی۔"

ملک احمد:" نہیں، بابر اتنا بُرا تو نہیں ہے۔ مگر ان مغلوں کو ہم اپنی لڑکی نہیں دینا چاہتے۔ الغ بیگ اور سلطان [illegible] (خاندان مرزا) کو لڑکیاں دی تھیں اُنھوں نے کیا کیا۔ حضرت شیخ عثمان نے ہمارے چچا شاہ سلیمان کے پاس خان مرزا کو بیٹھا دیکھکر کہا بھی تھا کہ اسکی آنکھ مجھے یزیدی آنکھ کی طرح نظر آتی ہے۔ اسے لڑکی مت دو۔ جس طرح یزید نے خاندان نبوت کو قتل کیا یہ بھی تمھارے ساتھ ایسا ہی کرے گا۔ مگر شاہ سلیمان نے نہ مانا اور لڑکی دیدی۔ نتیجہ وہی ہوا جو حضرت شیخ فرما چکے تھے۔ تمام یوسف زئیوں کو دھوکہ سے کابل بُلا کر مرزا نے سلیمان اور اُسکے سات سو ہمراہیوں کو قتل کر ڈالا۔ کابل کے قریب سیاہ سنگ جہاں

یہ قتل عام ہوا اب بھی اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔"

شاہ منصور۔" آپ صحیح فرماتے ہیں۔ اس ہنگامہ میں خود آپ کی جان بھی جا رہی تھی۔ اگر خدا اس کمبخت مرزا کے دل میں رحم نہ ڈالتا تو آپ بھی شہید ہو گئے ہوتے۔"

ملک احمد۔" الغ بیگ نے ہماری لڑکی لی اور سنہ ۹۰۶ھ سے سنہ ۹۰۹ھ تک ہماری قوم پر طرح طرح کی آفتیں ڈھائیں۔ حتیٰ کہ ہم لوگ پشاور اور سوات میں ان ظالموں سے پناہ لینے کے لیے ہجرت کر آئے اب یہ بابر بادشاہ نے محمد مقیم سے کابل لے لیا۔ اور سنہ ۹۱۰ھ میں اُس کا قلع قمع کر کے خود کابل پر قابض ہو گیا۔ اب یہ حضرت بھی ہماری لڑکی مانگ رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

شاہ منصور۔" نہیں۔ ہم اپنی کوئی لڑکی ان مغلوں کو اب نہیں دیں گے۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ بابا اوغولی کو بلا کر میں کہے دیتا ہوں کہ ہمارے یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے" (بابا اوغولی داخل ہوتا ہے) "بابا۔ آپ کو غلط خبر ملی ہے۔ ہمارے ہاں کوئی لڑکی نہیں ہے۔"

بابا اوغولی (حیرت زدہ ہو کر) "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کو خبر غلط ملی ہو۔ اور بلا تحقیق اُس نے پیام بھجوایا ہو۔"

شاہ منصور۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ آپ کے بادشاہ کو ضرور غلط خبر ملی ہے۔"

بابا اوغولی۔" اچھا تو میں بادشاہ کی خدمت میں یہیں سے معروضہ بھیجتا ہوں اور آپ کا جواب کہلا بھیجتا ہوں۔

(ملک احمد و شاہ منصور چلے جاتے ہیں اور بابا اوغولی بابر کو خط لکھتا ہے جس کے جواب میں دوسرے دن بابر کا ایک اور خط ملک احمد و منصور کے نام آتا ہے۔)

بابا اوغولی (اپنے دل میں) "یہ خط میں ان دونوں بھائیوں کو ابھی دیتا ہوں مگر عجیب اُلٹی کھوپڑی کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس بدگمانی کی بھی کوئی حد ہے۔" (ملک احمد و شاہ منصور داخل ہوتے ہیں) "لیجیے صاحب! بادشاہ کا یہ دوسرا خط آیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔"

ملک احمد (خط کھول کر پڑھتا ہے اور شاہ منصور کے ہاتھ میں دیتا ہے) "بادشاہ نے بہت اچھے الفاظ میں یہ خط لکھا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ یہاں کیسے تشریف لائے۔"

شاہ منصور (حیرت سے) "عجیب بات ہے۔ واقعی بابر عجیب شخص ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں خود قلندروں کے بھیس میں تمھارے گھر پر آیا تھا۔ تمھاری لڑکی

نے دو روٹیاں اور گوشت دیا تھا جو اسی مکان
کے پشت پر دو پتھروں کی آڑ میں چھپا کر رکھ دیا ہے
آیئے چلیں یہ روٹیاں دیکھیں کہاں ہیں اور
مبارکہ سے بھی اس واقعہ کو دریافت کریں۔"

(بابا اغولی جاتا ہے اور یہ دونوں بھائی مشورہ
کرتے ہیں۔ مبارکہ کو بلاتے ہیں)

شاہ منصور: "تم نے کسی فقیر کو بکر ہیرے کے روز روٹیاں
اور گوشت دیا تھا؟"

بی بی مبارکہ: "جی ہاں ابا جان۔ دو تین فقیر
میرے ڈیرہ کے سامنے بہت محتاج سے نظر آتے
تھے۔ انھیں دو روٹیاں میں نے بھیجی تھیں۔"

شاہ منصور: "تم جانتی ہو وہ فقیر کون تھا؟"

بی بی مبارکہ: "کوئی فقیر ہوگا۔ مجھے کیا معلوم۔"

شاہ منصور: "وہ ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ تھا
اور ہمارے گھر کا حال دریافت کرنے آیا تھا۔
اُس نے وہ دونوں روٹیاں دو پتھروں کے
بیچ میں چھپا دی ہیں۔ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ
آیا اُس نے جھوٹ لکھا ہے یا سچ۔ (اپنے مکان کے
پس پشت جا کر وہ تلاش کرتا ہے اور ایک مقام پر
دو پتھروں کے بیچ میں دو روٹیاں اور گوشت
رکھا ہوا ملتا ہے)

شاہ منصور: (ملک احمد سے) "بھائی جان۔ بابر
نے سچ لکھا ہے۔ وہ بیشک یہاں آیا تھا اور مبارکہ
کو دیکھ گیا۔ لڑکی سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔"

ملک احمد: "مگر یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بادشاہ و
رعایا کا کوئی کفو یا میل نہیں۔ کہاں وہ کہاں ہم۔"

اتنے میں بابا اغولی پھر آتا ہے۔

بابا اغولی: "آپ دونوں صاحبوں نے اپنا لبّا
تصفیہ کر لیا ہوگا۔ ایسا پیام بھلا کہاں آتا ہے؟
خود بادشاہ کی خواہش ہے! آلِ تیمور سے بڑھ کر
آج کل دنیا میں کون ہے؟ یہ آپ لوگوں کے
نصیب ہیں کہ بابر بادشاہ اتنی مراعات سے پیش
آ رہا ہے اور ایک ایسی درخواست کر رہا ہے جو
اسلامی نقطۂ نظر سے کچھ بیجا نہیں ہے۔"

شاہ منصور: "بابا اغولی۔ ہم کیسے بادشاہ سے
نسبت کر سکتے ہیں؟ وہ اتنا بلند مرتبہ ہے کہ اُسکے
دامن تک ہمارا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا۔ چہ جائیکہ
اُس سے نسبت ناتہ کیا جائے۔ جو برابر کے
لوگوں میں ہوا کرتا ہے۔"

ملک احمد: "مغلوں میں دو شخصوں کو ہم نے لڑکیاں
دی تھیں۔ یہ دونوں نسبتیں نہایت نامبارک
ثابت ہوئیں۔ اب پھر یہ سبق ہم دہرانا نہیں چاہتے۔"

بابا اغولی: "آپ صاحبوں نے بابر بادشاہ کو
سمجھا نہیں۔ خان مرزا اور الغ بیگ سے آپ
اس کا مقابلہ کرتے ہیں" چہ نسبت خاک را با
عالم پاک" آپ کو انکار نہ کرنا چاہیے۔ اپنے

خیال سے نہیں تو کم سے کم اپنی قوم کے خیال سے اس پیوند کو منظور کر لیجیے۔"

اتنے میں دو تین بڈھے بڈھے یوسف زئی سردار اندر آ جاتے ہیں جنھیں بابا ادغولی نے پہلے ہموار کر رکھا تھا اور وہ سب ملک احمد اور شاہ منصور کو سمجھاتے ہیں کہ "اپنی قوم پر رحم کھاؤ تم نے ہمیشہ آڑے وقت میں قوم کی مدد کی ہے اور قوم کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ یہ وقت بڑا نازک ہے۔ اگر بابر کو غصہ آیا تو پھر کسی کی خیر نہیں۔ لڑکی دیکر ہم سب کو اُسکے غصہ سے امن میں رکھو۔"

ملک احمد (ان بڈھے یوسف زئیوں کا کلام سُن کر) "آپ لوگوں کے لیے میری جان حاضر ہے اگر قوم کی بھلائی کا معاملہ ہے تو خیر ہم دونوں راضی ہیں۔"

گیارہواں سین

قلعہ باجوڑ۔ بی بی مبارکہ کا کمرہ۔ ملک احمد۔ شاہ منصور۔ و بی بی مبارکہ۔

شاہ منصور: "مبارکہ۔ بابر بادشاہ نے تمھارے لیے پیام دیا ہے۔ بھائی جان اور میں دونوں اس نسبت سے راضی نہیں تھے مگر قوم کے لیے رضامندی دینی پڑی۔ اب تم بھائی جان سے سُن لو کہ کیا کرنا چاہیے۔"

ملک احمد: "دیکھو بیٹی۔ تم ایک عظیم الشان بادشاہ کی بیوی بنکر جا رہی ہو۔ اپنے فرائض مت بھولنا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ گو تم بیوی ہو مگر بادشاہوں سے کس طرح ملنا چاہیے؟ ہمیشہ اس درجہ کا ادب و لحاظ مدنظر رکھنا۔ اُسکی خدمت اپنے ہاتھ سے کرنا اور اُس کا ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی خود انجام دینا۔ اور سب پر مقدم یہ ہے کہ اپنی قوم کے لیے معافی نامہ لینا۔ اگر تمھاری قوم پر یہ مصیبت نہ آتی تو ہم کبھی تمھیں مغلوں میں نہ دیتے اس لیے جو اصلی غرض ہے وہ سب سے پہلے حاصل کرنی چاہیے۔ تم خود سمجھدار ہو۔ میرا اس قدر اشارہ کافی ہے۔"

بی بی مبارکہ: "یوسف زئیوں کے لیے میری جان حاضر ہے۔ جو کچھ چچا جان آپ فرما رہے ہیں میں انشاءاللہ تعالیٰ ویسا ہی کروں گی۔"

(باجوں اور شادیانوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور ایک نوکر آکر اطلاع دیتا ہے)

نوکر: "سرکار۔ بادشاہ نے یہ خوان اور تحفے بھیجے ہیں اور تمام یہ جلوس باجے گاجے کے ساتھ آ رہا ہے۔"

(تمام تحفے سامنے لاکر رکھے جاتے ہیں۔ اس میں دولھن کے لیے بیش قیمت زیورات ہیں اور بابر کی خود ایک تلوار ہے۔ اتنے میں شاہ منصور کے

زنانہ کی عورتیں آتی ہیں)

شاہ منصور (عورتوں سے) "یہ دولھا نے تحفے بھیجے ہیں۔ اب لڑکی کو دولھن بناؤ۔ تاکہ ہم سب ڈورتک رخصت کر آئیں"

(غرض کہ بی بی مبارکہ دولھن بنائی جاتی ہے عقد ہوتا ہے۔ ایک شاہی پالکی میں وہ بٹھائی جاتی ہیں اور بڑے جلوس کے ساتھ روانہ ہوتی ہے ملک احمد و شاہ منصور، تمانہ سے سب تمورہ (؟) پر آتے ہیں۔ دریا کو چلدرہ کے پاس عبور کرتے ہیں۔ پہاڑیوں کے بیچ میں سے ایک تنگ پگڈنڈی جاتی ہے۔ اس راستہ پر موضع تلاش سے گذرتے ہوئے تیری (؟) کے پشت تک جاتے ہیں جہاں بادشاہی اُمرا استقبال کے لیے کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہاں سے باپ اور چچا دونوں لوٹ جاتے ہیں اور دولھن شاہی جلوس کے ساتھ کیمپ دیاروں میں داخل ہوتی ہے)

بارھواں سین

کیمپ دیاروں کے وسط میں ایک خیمہ

مبارکہ "انّا۔ بادشاہ کہاں ہیں؟"

روتہ (مبارکہ کی انّا ہے) "بادشاہ سلامت اپنے ڈیروں میں ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ جمعہ کے دن آئیں گے"

مبارکہ "میرا اکیلے اس مجمع میں جی گھبراتا ہے اچھی انّا۔ میرے پاس سے تم جانا نہیں"

روتہ "نہیں بیٹی۔ میں کہاں جاؤں گی۔ اب میرا دانہ پانی سب تمھارے پاس ہے۔ یہیں جیوں گی یہیں مروں گی"

مبارکہ "جب بادشاہ اس ڈیرے کی طرف آئیں تو میری انّا، مجھے پہلے سے خبر کر دینا۔ میں نہیں چاہتی کہ بیخبری میں وہ آجائیں"

روتہ "اچھا بیٹی۔ میں اس کا انتظام رکھوں گی اور لوگوں کو بٹھا دوں گی۔ پرسوں ہی تو جمعہ ہے۔ میں ابھی سے سب چیزوں کا انتظام کرتی ہوں"

مبارکہ "انّا یہ کون عورتیں آرہی ہیں؟"

روتہ "بیٹی۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ بادشاہ کے بڑے بڑے امیروں کی بیویاں ہیں۔ تم سے ملنے آرہی ہیں تم چپکی بیٹھی رہنا۔ کسی سے کوئی بات نہ کرنا"

اُمرائے شاہی کی بیبیاں یکے بعد دیگرے آتی جاتی ہیں مگر مبارکہ کسی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ چُپ سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے۔

ایک "بہن۔ یہ لڑکی کیسی خاموش سی ہے کسی سے بات ہی نہیں کرتی"

دوسری "اسکے حسن کو تو دیکھو۔ میں نے تو آج تک اس حسن و جمال کی کوئی عورت نہیں دیکھی"

تیسری "حُسن و جمال سب ہی مگر منہ سے تو بولتی ہی نہیں۔ معلوم نہیں بادشاہ سے بھی بولیں گی یا نہیں"

دوسری ۔" ہاں اُن سے کیوں نہ پوچھیں گی (مسکراکر)
دولہا سے کہیں پردہ رہ سکتا ہے ۔"

چوتھی ۔" بہن عجب چُپ سی دُلھن ہے ۔ مجھے اس میں کوئی بھید معلوم ہوتا ہے ۔"

تیسری ۔" بھید کی بھلا کونسی بات ہے ۔ بیچاری نئی دُلھن ہے ۔ سُسرال میں آئی ہے ۔ جہاں سب نئی صورتیں ہیں ۔ تم چاہتی ہو کہ ایک ہی دن میں چٹاک پٹاک باتیں کرنے لگے ۔"

(غرضکہ اس طرح کی باتیں کرکے سب عورتیں چلی جاتی ہیں اور بالآخر جمعہ کا دن آتا ہے اور باجوں نقاروں اور شاہی جلوس کا ہنگامہ نظر آتا ہے)

مبارکہ (روشنہ سے) " انا ۔ یہ جلوس کیسا ہے ؟"

روشنہ ۔" میں نے نوکروں سے پوچھا تھا معلوم ہوا بادشاہ سلامت جمعہ مسجد جا رہے ہیں ۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے اس طرف آئیں گے ۔"

مبارکہ ۔" انا ۔ تم نے انتظام کر دیا ہے کہ جس وقت بادشاہ ادھر کا رخ کریں مجھے اطلاع ہو جائے ۔"

روشنہ ۔" ہاں بیٹی ۔ میں نے سب طرح کا انتظام کر دیا ہے ۔ انشاءاللہ گھڑی گھڑی کی خبر ہوتی رہیگی"

(اتنے میں نماز جمعہ کے بعد جلوس کا رخ اس طرف نظر آتا ہے اور انا جلدی سے آکر بی بی مبارکہ سے کہتی ہے) " بیٹی ۔ بادشاہ سلامت آرہے ہیں ۔"

(مبارکہ جلدی سے اٹھ کر صحن میں کھڑی ہو جاتی ہے ۔ بادشاہ سلامت داخل ہوتے ہیں ۔ مبارکہ آداب بجا لاتی ہے ۔ اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی رہتی ہے ۔ اُس کا چہرہ نقاب سے ڈھکا رہتا ہے)

بابر (دالان میں آکر اور مسند پر بیٹھکر) " افغانیہ ۔ ادھر آؤ ۔ یہاں بیٹھو ۔"

مبارکہ (سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے اور منہ سے کچھ نہیں کہتی ۔ بابر پھر کہتا ہے) " افغانیہ ۔ بیٹھ جاؤ ۔" (مبارکہ بابر کے قریب جاکر ادب سے جُھک جاتی ہے لیکن بیٹھتی نہیں ۔ بادشاہ برقع پر ہاتھ ڈال کر چہرہ سے نقاب اُلٹ دیتا ہے اور مبارکہ کا حسن دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے)

بابر ۔" افغانیہ ۔ بیٹھتیں کیوں نہیں ۔ بیٹھ جاؤ ۔"

مبارکہ (ہاتھ باندھے ہوئے نہایت ادب سے جُھک کر) " ایک التجا ہے اگر حکم ہو تو عرض کروں ؟"

بابر ۔" ہاں ہاں ۔ کہو ۔"

مبارکہ (اپنے دوپٹے کے دونوں دامنوں کو ہاتھ میں لیکر) " حضور یہ سمجھیں کہ کُل یوسف زئی قوم میرے اس دامن میں ہے ۔ میری خاطر حضور اُنکی خطا بخش دیں ۔"

بادشاہ ۔" یوسف زئیوں کی تمام خطائیں تمہارے سامنے معاف کرتا ہوں اور اُن سب کو تمہارے دامن کی پناہ میں دیتا ہوں ۔ یوسف زئیوں سے

اب کوئی کینہ میرے دل میں نہ رہے گا۔
(مبارکہ یہ عنایت آمیز الفاظ سُن کر پھر آداب بجالاتی ہے اور بادشاہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔

عصر کی نماز کے لیے جب بادشاہ باہر جاتا ہے تو بی بی مبارکہ تسک بڑھ کر باہر کے جوتے اُٹھا کر سامنے رکھدیتی ہے۔ جوتے پہن کر بابر مسکراتا ہوا کہتا ہے)
"میں تم سے اور تمھاری قوم سے بہت خوش ہوں تمھاری خاطر میں نے اُن سب کی خطائیں معاف کر دیں۔ (پھر مسکرا کر) ہم جانتے ہیں ملک کے چھوٹے یہ سب گُن تمھیں سکھائے ہوں گے" (یہ کہکر بابر نماز کے لیے باہر چلا جاتا ہے اور بی بی مبارکہ خیمہ کے اندر اپنی نماز کی تیاریاں کرتی ہیں۔)

خاتمہ

چند روز بعد دیاروں سے کیمپ برخاست کر دیا جاتا ہے اور باجور اور لمانگی کے راستہ سے بابر کابل میں داخل ہوتا ہے۔ اس فداے قوم بی بی مبارکہ کا ذکر گلبدن بیگم نے اکثر کیا ہے انکی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور اکبر کے ابتدائی زمانہ میں عزو وقار کے ساتھ اُنھوں نے اپنی زندگی کے آخری دن ختم کر کے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے بھائی میر جمال، بابر۔ ہمایوں، اور اکبر تینوں کے عہد میں بڑے بڑے عُہدوں پر فائز رہے۔

حامد علی خاں زائد ناظم رائچور

شکریہ

اگست نمبر کے بعد سے الناظر کی توسیع اشاعت کا ذکر کرنے کا موقع نہ ملا۔ اس اثنا میں جن احباب نے نئے خریدار بنائے اُن کے اسماے گرامی حسب ذیل ہیں:-

منشی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی وکیل	۲	خریدار
مسٹر عبد الشکور بریلوی ایم اے	۳	"
مسٹر فدا حسین واثق صدیقی	۷	"
خواجہ منظور حسین (علیگ)	۲	"
مولوی مقبول احمد مقیم ہری نگر	۱	"
مولوی سید ہاشمی فریدآبادی	۱	"
قاضی انتظار علی خاں عباسی بی اے	۱	خریدار
سید محمد ہادی دہلوی بڑودہ	۱	"
مسٹر صفدر علی بی اے انجینیر بمبئی	۱	"
مسٹر منظور محمود قدوائی رامپور	۱	"
منشی امیر احمد علوی بی اے	۵	"
پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم اے	۲	"

سب احباب دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

ظفر الملک

فاتح مصر

(مولانا اسلم جیراجپوری کی ایک تازہ تالیف)

مولانا اسلم فن تاریخ میں اس قدر درجہ کمال حاصل کر چکے ہیں اور اُن کی بے نظیر تاریخ الامۃ کو ایک قلیل اس قدر شہرت و قبولیت نصیب ہو چکی ہے کہ اُنکی کسی جدید تالیف کو پبلک سے روشناس کرانے کے لیے طویل تمہید کی حاجت نہیں۔ مولانا کا طرز بیان دل آویز ہے اور اُن کی تحریر اس قدر دلچسپ ہوتی ہے کہ تاریخ میں ناول کا سا لطف آتا ہے۔

اُن کی جدید ترین تالیف "سیرۃ عمرو بن عاص" جو ابھی حال میں شایع ہوئی ہے، مورخانہ موشگافیوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ فاتح مصر کی سوانح عمری اس قدر دلکش انداز سے بیان کی گئی ہے اور انکی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اس کد و کاوش سے فراہم کیے ہیں کہ انکی داد نہ دینا سخت ناانصافی ہے۔ لیکن مولانا نے اس کتاب میں ایک بڑا غضب ڈھایا ہے کہ اپنے ہیرو کے باپ کی بابت ارشاد فرماتے ہیں کہ کلام مجید نے اُسکے مقطوع النسل ہونے کی پیشین گوئی کی تھی!!

صفحہ ۴ پر تحریر فرماتے ہین کہ عمرو بن عاص کے والد عاص بن وائل اپنے قبیلہ کے سردار تھے اور آنحضرت و صحابہ کو ایذائیں دیتے تھے "جب قاسم و عبد اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں بیٹے مکہ میں گذر گئے تو اُنھوں نے ہی کہا تھا کہ محمد ابتر یعنی مقطوع النسل ہیں جس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ ہجرت نبوی کے ایک مہینے کے بعد ۸۵ سال کی عمر میں مکہ میں انتقال کر گئے"

جس سورت کا مولانا نے اشارہ کیا ہے اُس کی آخری آیت ہے "ان شانئک ھو الابتر" اگر "ابتر" کے معنی مقطوع النسل لیے جائیں جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے تو آیت کے معنی یہ ہوے کہ "تیرا دشمن مقطوع النسل ہے"۔ اور اگر "دشمن" سے اشارہ عاص ابن وائل کی طرف ہو جیسا کہ مولانا کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عاص کی بابت کلام مجید کی وعید

(عیاذاً باللہ) غلط تھی۔

افسوس ہے کہ تاریخ اسلام کے پروفیسر نے سیر کی کم رتبہ کتابوں سے یہ روایت عاص کی بابت اخذ کرلی اور احادیث و تفاسیر سے اسکی تحقیق نہیں کی۔ اگر وہ تفاسیر کی طرف رجوع کرتے تو اُن کو معلوم ہو جاتا کہ اس سورت کا مکہ میں نازل ہونا مختلف فیہ ہے۔ بلکہ ائمۂ فن سورۂ کوثر کو مدنی بتاتے ہیں۔ چونکہ عاص مولانا ہی کی تحقیق کے مطابق ہجرت سے صرف ایک مہینہ کے بعد انتقال کر گیا تھا لہذا اس سورت میں اُن دشمن سے اُسکی طرف اشارہ ہونا ممکن ہی نہ تھا۔

امام مسلم، ابوداؤد، اور نسائی کا جو مرتبہ علم حدیث میں ہے وہ شاید مولانا نے کبھی سنا ہوگا وہ تینوں حضرات بالاتفاق .... حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ

"ایک وقت رسول اللہ ہمارے درمیان مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ ناگاہ آپ پر وحی کی بیہوشی طاری ہوئی۔ پھر مسکراتے ہوئے سر مبارک اُٹھایا۔ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کس چیز سے آپ مسکرائے۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی۔ پھر اُس کی تلاوت فرمایا (بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ انا اعطیناک الکوثر۔ فصل لربک وانحر۔ ان شانئک ھو الابتر) الی آخر الروایۃ"

انس بن مالک صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ہمارے درمیان مسجد میں تشریف رکھتے تھے" مولانا مورخ ہیں اور شاید جانتے ہوں گے کہ انس بن مالک کا وجود جماعت صحابہ میں ہجرت سے پیشتر نہ تھا۔ لہذا یہ سورت یقیناً مدینہ میں نازل ہوئی جبکہ مسجد نبوی تعمیر ہو چکی تھی۔ اور عاص بن وائل کی ہڈیاں بھی باقی نہ تھیں۔

نزول کا وقت تو معلوم ہو گیا۔ اب شان نزول سنیئے: البزار، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جنگ بدر کے بعد کعب بن اشرف یہودی مکہ میں گیا تو قریش کے مشرکوں نے اُس سے کہنا شروع کیا کہ تو اس ملک کا سردار و عالم ہے۔ ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم لوگ حاجیوں کی مدارات کرتے ہیں، آب زمزم پلاتے ہیں، اور خانہ کعبہ کے خادم ہیں۔ ہم اچھے ہیں کہ یہ "صابی ابتر" اپنی قوم سے خارج اچھا ہے؟ یہودی کہنے لگا کہ تم اچھے ہو۔ تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ "ان شانئک ھو الابتر"

غرض ایک کثیر جماعت محدثین کی دعوٰی کرتی ہے کہ یہ سورت مدنی ہے اور اسکو عاص بن

وائل سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی تو اس میں "دشمن" سے اشارہ ابولہب کی طرف ہے۔ جیسا کہ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ "ابولہب نے رسول اللہ کے صاحبزادوں کے انتقال پر خوشی ظاہر کی اور آپ کو ابتر کہا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ" (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر)۔

علاوہ اس کے "ابتر" کے لغوی معنی "مقطوع النسل" نہیں ہیں بلکہ "ابتر" "دُم بریدہ"، "پراگندہ" یا اُس ذلیل و خوار شخص کو کہتے ہیں جس کا کوئی نیکی سے نام نہ لیتا ہو۔ لہٰذا بفرض محال اگر اس سورت میں عاص بن وائل ہی کی طرف اشارہ ہو تو مولانا کو "ابتر" کے معنی "مقطوع النسل" نہیں لکھنا چاہیئے تھے بلکہ اس کا ترجمہ "ذلیل و خوار" کرنا مناسب تھا۔ تاکہ مذہب اسلام کی بنیاد متزلزل نہ ہو جاتی!!

قطع نظر ان تمام دلائل کے مفسرین کو اتفاق ہے کہ اس آیت میں کسی خاص دشمن پر طعن نہیں ہے بلکہ یہ وعید عام ہے تمام دشمنان رسول کے لیے۔ یعنی جو نبی عربی کو ایذا دیگا وہ "ابتر" ہوگا۔ (ایسا ذلیل کہ اُس کا نام کوئی نیکی سے نہ لیگا) حیرت ہے کہ مولانا باوجود اپنے علم و فضل کے ایسی فاش غلطی کے کیونکر مرتکب ہوے۔ اگر فاتح مصر کے مناقب و فضائل میں اُنکے باپ کی بابت کلام مجید کے ساکت ہونے سے کوئی نقص رہ جاتا ہے تو (علیٰ رغم انف مورخ) عمرو بن عاص اس نعمت عظمیٰ سے یقیناً محروم تھے اور سورۂ کوثر یا "تبت یدا" انکے والد ماجد کی شان میں ہرگز نہیں نازل ہوئی۔

دوسرا ستم مولانا نے اس کتاب میں یہ کیا ہے کہ صفحہ ۷۹ پر "صفات عمرو بن عاص" کے ضمن میں ایک عنوان "تقویٰ" کا بھی قائم کیا ہے۔ اور اُس میں ایک راوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "میں نے اُن سے بڑھ کر راہ حق پر مستقیم، دوستوں میں محترم، اور ظاہر و باطن میں یکساں کسی کو نہیں پایا۔" مولانا نے اس روایت پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی اور نہ کسی جگہ اسکے خلاف اپنی رائے ظاہر کی۔ لہٰذا قیاس ہو سکتا ہے کہ مولانا بھی عمرو بن عاص کو "راہ حق پر مستقیم" اور "ظاہر و باطن میں یکساں" تصور فرماتے ہیں۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر اس مقام پر مختصر طور سے

فاتح مصر کے چند واقعات زندگی کا جو مولانا کو بھی تسلیم ہیں حوالہ دیا جائے۔ اور اُس وقت غور کیا جائے کہ اس "حاطب اللیل" راوی کا قول عمرو بن عاص کے تقویٰ کی بابت کس حد تک درست ہے؟

فاتح مصر کی زندگی میں سب سے زیادہ نازک وقت اُنکے تقویٰ کے امتحان کا وہ تھا کہ حضرت امیر اور جناب معاویہ کے درمیان صلح کرانے کے لیے دو حَکَم مقرر کیے گئے اور ۱۳ صفر ۳۷ھ کی منحوس تاریخ کو وہ ثالثی نامہ تحریر کیا گیا جس کے رو سے حضرت ابو موسیٰ اشعری منجانب حضرت علیؓ کے اور عمرو بن عاص منجانب جناب معاویہ کے حَکَم تھے۔ اور فریقین سے عہد لیا گیا کہ یہ دونوں پنچ جو فیصلہ کریں وہ سب کو منظور ہوگا۔ مولانا...... صفحہ ۱۰۰ پر تسلیم کرتے ہیں کہ فاتح مصر نے "ابو موسیٰ سے جو چاہا لکھوا لیا"۔ اور صفحہ ۹۰ پر اس روایت متواترہ سے انکار کرتے ہیں کہ اعلان فیصلہ کے وقت ابو موسیٰ نے علی و معاویہ دونوں کو معزول کیا اور عمرو بن عاص نے علی کی معزولی سے متفق ہو کر معاویہ کو اُن کی جگہ قائم کر دیا۔ اور اس انکار کی دلیل یہ قائم کرتے ہیں کہ "شہادتیں قلمبند ہوئی تھیں تو فیصلۂ زبانی کے کیا معنی۔ علاوہ بریں عمرو بن عاص کچھ نادان نہ تھے کہ اس قسم کی مخالفت کرتے جس سے اُنکے فریق کا کوئی نفع نہ تھا!!

اس دلیل کی کمزوری پر بحث کرنا راقم الحروف کو منظور نہیں کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ باوجود شہادتیں قلمبند ہونے اور فیصلہ تحریر کیے جانے کے اعلان فیصلہ کا ہمیشہ زبانی ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ فریقین مقدمہ اور اُنکے تمام ہوا خواہ ہمیشہ عالم و فاضل اور تاریخ کے پروفیسر نہیں ہوا کرتے ہیں مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ فاتح مصر نے اگر اپنے فریق کا فائدہ پیش نظر رکھا تو یہ اعلیٰ درجہ کی ڈپلومیسی تھی۔ مگر اس میں اور دیانت میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ اگر فاتح مصر راہ حق پر مستقیم تھے تو اپنے فریق کا فائدہ پیش نظر رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو برائے وصل کردن آمدی۔ نے برائے فصل کردن آمدی۔ دونوں کو معزول کرنا چاہیے تھا جیسا کہ صلحنامہ میں طے ہو چکا تھا!!

ابو موسیٰ کی بابت مولانا کا فتویٰ ہے کہ "انھوں نے دیانت کے ساتھ کام کیا۔ جو رائے انھوں نے دی وہی اُس وقت ایک بڑے گروہ کی رائے تھی۔ وہ اس فتنہ سے کنارہ کش تھا"۔ کیا عمرو بن عاص کی بابت بھی ایسا ہی فتویٰ دینا کہ بکر دوم سے صادر ہو سکتا ہے؟ کیا انھوں نے بھی دیانت و امانت کے ساتھ "ابو موسیٰ سے جو چاہا لکھوا لیا"؟

ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیے۔ صفحہ ۸۴ پر مولانا جنگ صفین کے تذکرہ میں فرماتے ہیں:
"متواتر سخت معرکوں کے بعد عراقی فوجیں غالب آگئیں۔ قریب تھا کہ شامیوں کو شکست دیدیں۔ اُسوقت عمرو بن عاص نے یہ مشورہ دیا کہ لوگ نیزوں پر قرآن اُٹھالیں اور پکاریں کہ اسی کے رو سے ہمارا اور تمھارا فیصلہ ہے۔ اہل عراق نے جب مصاحف دیکھے تو جنگ سے رُک گئے اور کہا کہ ہم کو کتاب اللہ کا فیصلہ منظور ہے۔" یہ تدبیر فاتح مصر کو دماغی قابلیتوں میں کیا ثابت کرسکتی ہے۔ مگر مولانا اپنے راوی سے پوچھیں کہ کیا ظاہر و باطن یکساں ہونے کے یہی معنی ہیں؟

ایک حکایت اور سنیئے۔ جب خلیفۂ دوم کو مولانا کے ہیرو کے حساب جانچنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے محمد بن مسلمہ کو محاسبہ کے لیئے مصر بھیجا اور محاسب نے فاتح مصر سے مال تقسیم کرلیا اس موقع پر محاسب اور فاتح مصر جو گفتگو ہوئی وہ مولانا نے صفحہ ۶۹ پر اس طرح تحریر فرمائی ہے
"یہ زمانہ جس میں ابن حنتمہ (حضرت عمر) ہمارے ساتھ ایسی سخت گیری کا برتاؤ کرتا ہے بُرا زمانہ ہے۔ میرے باپ عاص نے ہمیشہ ریشمی لباس پہنے اور دیبا کے سنجاف لگائے۔ ابن مسلمہ نے کہا کہ بس بس۔ اگر ابن حنتمہ کا یہ زمانہ جسکو تم کوستے ہو نہ ہوتا تو تم عرب میں بکریاں چراتے ہوتے۔ عمرو بن عاص نے کہا کہ یہ آپس کی باتیں ہیں۔ کہیں ان کا تذکرہ امیر المومنین سے نہ کردینا۔ بولے کہ ہرگز نہیں۔"

مولانا فاتح مصر کی تعریف جس قدر چاہیں کریں اُنکو یہی مناسب ہے۔ اب کیوں نہ ہوں باتوں میں طرفدار انھیں کے۔ پروردہ اُنھیں کے ہیں نمکخوار اُنھیں کے۔ لیکن یہ گفتگو جو مولانا نے نقل کی ہے (اگر خدا نخواستہ صحیح ہو) تو اس سے فاتح مصر کا ظاہر و باطن یکساں ہونے کا کیسا بیّن ثبوت ملتا ہے!! اور اُن کا "دوستوں میں محترم" ہونا اس روایت سے روز روشن کی طرح آشکارا ہے۔ "راہ حق پر مستقیم" ہونے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ ایام جاہلیت کے عیش و آرام یاد کیے جائیں اور باپ کے ریشمی لباس پر فخر کیا جائے جس کو اسلام نے حریت اور مساوات کی تعلیم کے لیے حرام کردیا!! اگر مولانا اپنی بیش قیمت تالیف کو ایسی لغو روایات سے آلودہ نہ کرتے تو عمرو بن عاص کی عظمت میں کیا فرق آسکتا تھا؟

لیکن باوجود ان لغزشوں کے مولانا اسلم کی یہ جدید تالیف ادب اُردو میں ایک گرانبہا

اضافہ ہے - مرا بہ سادہ دلیہاے من تو اں بخشید - خطا گرفتہ ام و چشم آفریں دارم - مولانا سے ایک اور شکایت ہے کہ اُنھوں نے کاپی کی تصحیح کا مناسب انتظام نہیں کیا اور کوئی غلطنامہ بھی کتاب کے ساتھ شامل نہیں کیا - بعض جگہ عبارت خبط ہوگئی ہے - مثلاً " وہ اسوقت عمان میں چلے تھے" (صفحہ ۱۷) یا " صالحیہ اور قصاصین کے بہت آئے" (صفحہ ۳۲) بعض جگہ سنہ غلط ہوگیا ہے مثلاً " اس حصہ کو سلسلہ میں عبداللہ نے فتح کیا" (صفحہ ۵۸) - ایک مقام پر کاتب نے " اہالیان" کا لفظ لکھا ہے (صفحہ ۲۶) وغیرہ وغیرہ -

المختصر اس تالیف میں جس قدر نقائص یا خامیاں نظر آئیں وہ اوپر درج کردی گئیں - انکے علاوہ کتاب میں سب محاسن ہی محاسن ہیں اور اسکی خوبیوں کا پلہ برائیوں سے بہت زیادہ وزنی ہے - خدا کتاب کو قبولیت نصیب کرے - قیمت صرف عہ ہے اور " مولانا اسلم جیراجپوری جامعہ ملیہ علی گڈھ" کے پتہ سے مل سکتی ہے -

" الف - ع "

تعزیت

موت اگرچہ بے پناہ ہے اور بچے بوڑھے تک کسی کی بھی ہو، خوش آیند نہیں ہوتی - مگر نوجوانوں کی موت سے دل بہت متاثر ہوتا ہے اور پھر جب کوئی ایسا نوجوان دنیا سے اُٹھ جاتا ہے جس سے کسی خاندان یا قوم کی بہت سی توقعات قائم ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں درد و غم کا اظہار کیا جائے - جعفر حسین مرحوم کے بعد ہی دو نوجوانوں کی وفات سے میرے کمزور قلب کو بہت صدمہ پہونچا - عزیزی سجاد علی انصاری کیل بارہ بنکی مرحوم کی نظم و نثر سے اوراق الناظر کو کبھی زینت نہیں ہوئی مگر جو لوگ اُن سے واقف تھے اور جنکو ملک کے متعدد رسائل میں انکا پاکیزہ کلام اور نثر مضامین دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ سب یقیناً انکی ذہانت اور شوخی طبع کو برسوں یاد رکھیں گے - عزیز نے دق میں مبتلا ہوکر اس دنیا سے رحلت کی - تازہ اطلاع یہ ملی ہے کہ مولوی ابو الحسنات ندوی رفیق دار المصنفین نے بھی حال ہی میں شدید علالت کے بعد انتقال کیا - مرحوم کو الناظر میں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں ملا مگر معارف میں وہ تقریباً ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے اور ان تحریروں سے وسیع خدمت علمی کی توقعات قائم ہوگئی تھیں - اللہ تعالیٰ دونوں نوجوانوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں - اور ورثا دلی تعزیت قبول کریں -

ظفر الملک

سیر المصنفین

الناظر کی تازہ اشاعت سے یہ اطلاع باعث مسرت ہے کہ ایک معروف اہل قلم مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے (علیگ) نے مصنفین اُردو کا ایک کامل تذکرہ مرتب کرلیا ہے۔ کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کا جو انتخاب الناظر میں شایع ہوا ہے اس پر ابھی کوئی تبصرہ کرنا شاید قبل از وقت سمجھا جائے، مگر اس خیال سے کہ اسکے متعلق بعض مشورے اگر کوئی اہمیت رکھتے ہوں تو کتاب کی اشاعت سے پہلے انکی طرف توجہ اور انسداد بہر حال اشاعت کے بعد رسمی تنقید و تبصرہ سے زیادہ سود مند ہوگا۔

مصنفین اُردو کا کوئی تذکرہ اتبک مدون نہیں ہوا اور اس قسم کی تالیف مشکلات سے خالی نہیں۔ شعرائے اُردو کے تذکرہ میں بھی صرف دو تالیفیں دیکھی جاتی ہیں۔ ایک تو آب حیات مولفہ شمس العلما محمد حسین آزاد، دوسری خمخانۂ جاوید مرتبۂ پنڈت سری رام منصف۔ آب حیات اپنی اولیت اور زیادہ تر طرز بیان کی دلفریبی کے سبب بہت زیادہ مقبول ہے۔ خمخانہ میں نے بالاستیعاب پڑھی نہیں، سرسری نظر میں مجھے یہ اُردو کے بیشمار موزوں گو اشخاص کی سائیکلو پیڈیا نہیں بلکہ ڈائرکٹری سی دکھائی دی۔ مولف نے دور اوّل سے مرزا غالب تک کے حالات میں جہاں تک مجھے یاد آتا ہے آب حیات ہی کو ماخذ قرار دیا ہے۔ تنہا صاحب نے بھی اُسی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی ہے۔ درحقیقت اس موضوع پر مواد کی کیابی کے باعث ایک اُردو تذکرہ نگار کو اس ہر دلعزیز پیش رَو سے استفادہ کرنا بہت حد تک ضروری ہے مگر

پنہاں ہے دام سخت قریب آشیانہ کے

سطور ذیل میں اسی خطرہ سے متنبہ کرنا مقصود ہے۔

پروفیسر آزاد کی قادرانہ انشا پردازی، اُسکی دلآویزی اور تاثیر مسلم اس سے بڑھ کر میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ انکا کلام نثر وزن شعری کے اعتبار سے ناموزوں ہونے کے باوجود اعلی درجہ کی شاعری کیا، ساحری ہے۔ تحقیق کا اسم اعظم ہی اس سحر کو باطل کرتا ہے۔ انکی تصنیف یا تخئیل کو تاریخی حقایق کی اہمیت دینا ایسا ہی ہے جیسے ہومر کی الیڈ اور مہابھارت یا الف لیلہ کے

بعض تاریخ نما افسانوں کو تاریخ قرار دینا یہ داز تخیل اور شاعرانہ رنگ آمیزی کی گنجایش ہی کی رعایت سے تصانیفِ آزاد اسناد کے حوالوں سے آزاد ہیں۔ اگر آب حیات میں پانسو برس پیشتر کے شعرائے اُردو اور وقائع سے متلق کتابوں کے حوالے نہیں دیے جاسکتے تھے تو روایتوں کے حوالے ضرور ممکن تھے۔ سخندان فارس میں ہر ایک تذکرہ اور واقعہ صرف کتابی سندوں پر مبنی ہونا چاہیئے تھا مگر یہ تالیف بھی ایسے حوالوں کی رہین منت نہیں۔ بالخصوص ایسے مقامات میں بھی جہاں پروفیسر نے اس قسم کے سنسنی پیدا کردینے والے دعوے کیے ہیں، دلائل و شواہد کی ضرورت نہیں دیکھی ؛۔

"ریگستان عرب سے ایک آندھی اُٹھی اُسکے پیچھے گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا .... خلاصہ یہ کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیرِ اسلام کی قربانی ہوگیا .... عالیشان آتش خانے ڈھائے گئے۔ دینی و دنیاوی کتابیں ورق ورق اُڑیں اور جل کر خاک درخاک ہوگئیں۔ اُس وقت میں یہی پارسی بھائی وہاں سے بھاگے اور جانوں کے ساتھ ایمانوں کو بھی بچا لائے .... تحقیق کی آنکھیں رو رہی ہیں اُس گئے وقت پر جو کسی طرح نہیں آسکتا .... ان خانہ بربادوں کے ہاں بھی تاریخ، اخلاق، افسانے، نظم و نثر سب کچھ ہوں گے۔ کیا ان کی عبارتوں کا بھی یہی سیدھا سادہ بے تکلف رنگ تھا۔ افسوس افسوس آج اُس عہد کو کہاں سے لائیں اور جو کچھ تھا ہوگیا کیونکر پائیں کہ دوستوں کو دکھائیں اور کچھ فائدہ اٹھائیں!"

اللہ اکبر! کس قدر درد انگیز و دل آویز نوحہ ہے جیسے پچھلے پہر کی کوئل کی کوک! لیکن

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سُود تھا

واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین مُسکیہ میں سے ایک کو بھی حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ سبحانک هذا بهتان عظیم! "پارسی علوم اور اسلام" کے عنوان سے ایک طویل الذیل مضمون جامعہ علیگڈھ میں فروری سے اپریل ۱۹۲۳ء تک مسلسل شایع کرکے ان بہتانات کی مدلل تردید کرچکا ہوں۔ پھر بھی اس سحر بیان کی کس کس سحر آفرینی کا چارہ کیجیئے۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم؟

جہانگیر کے دامن شہرت پر آزاد کے قلم نے جو گلکاری کی ہے اُسکے دھونے کے لیے مولانا شبلی مرحوم کو ایک مستقل مضمون "جہانگیر اور تزک جہانگیری" لکھنا پڑا جس میں فرط ملال یا حقارت سے انکا نام نہیں

لیتے، بلکہ "ہندوستان کے سب سے بڑے انشاپرداز" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اور نیرنگ خیال سے انکی عبارت نقل کرکے فرماتے ہیں "آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے؟" پھر توزک سے اسے سراسر جھوٹ ثابت کرتے ہیں[۵۱]۔

آزاد نے آب حیات میں جو زہر گھولا ہے اُس میں سے بعض اجزا کا تجزیہ بعض لائق کیمیاگروں نے کر دکھایا ہے۔ چنانچہ میر تقی پر خود پرستی، بد دماغی، بدگوئی کا طوفان باندھنے کے لیے آزاد نے خود میر صاحب کے لکھے ہوئے جس قلمی تذکرہ (نکات الشعرا) کی سند پیش کی ہے۔ بدقسمتی سے وہ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کو ہاتھ آگیا۔ اور اس سے حقیقت برعکس ثابت ہوئی۔ اور میر صاحب کی طرف جو ناملائم کلمات منسوب کیئے گئے تھے وہ بے اصل ہی نہیں، عکس کامل پائے گئے[حاشیہ]۔ امیر خسرو کی پہیلیوں، مکرنیوں، دوہروں، اور دوسرے بولوں کے دل خوش کن لطائف کے سلسلہ میں چمو ساقن والے لطیفے اس لیے بے بنیاد ٹھہرے کہ خسرو کا زمانہ تنباکو سے قطعاً ناآشنا تھا۔ الغرض آزاد کی سندوں پر بھی بلا تحقیق و تصدیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ راسخ عظیم آبادی کا دیوان دیکھنے کا دعوٰی کیا گیا ہے، پھر راسخ کے بیسیوں مقطعوں میں میر سے تلمذ کے اعلان کے باوجود اُسے اپنے پیرو مرزا سودا کا شاگرد بتایا جاتا ہے[۵۲]۔

روایاتِ آزاد کے ان عیوب سقط و طعن، تدلیس، وضع، کذب کے باوجود تنہا صاحب کا "تیسرے دور" کے تحت میں مولانا شبلی کے تذکرہ میں ضمناً یہ فرمانا کہ

"آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت و جدت وغیرہ سے پُر ہیں" [۵۳]

کہاں تک بجا ہو سکتا ہے؟ "جدت وغیرہ" تو مسلّم ہے، باقی اوصاف اہل نظر کی "تحقیق و تدقیق و درایت" کے محتاج ہیں۔

موجودہ حالات میں ہر سیرت نگارِ مصنفین اُردو کا فرض ہے کہ (۱) اپنی سیرت میں آزاد سے

---

۵۱ ملاحظہ ہو مضمون مذکور مندرجہ مقالات شبلی۔ یہ مضمون علیحدہ رسالہ کی حیثیت سے بھی شائع ہوا ہے۔ صفحہ ۱-۲

۵۲ مخزن سلسلۂ قدیم۔ ضروری اقتباس میں نے "راسخ عظیم آبادی" کی تمہید میں درج کیا ہے۔ الناظر مارچ ۱۹۱۶ء

حاشیہ ملاحظہ ہو۔ نکات الشعرا اب چھپ کر شائع بھی ہوگئی ہے۔

۵۳ مضمون ایضاً صفحہ ۲-۳۔

استفادہ کرنے میں کامل احتیاط ملحوظ رکھے (۲) اپنی بے لاگ تحقیق و تلاش کے بعد جا بجا آزاد کی غلطیوں کے ازالہ کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ دے۔ (۳) جہاں آزاد کا موازنہ من حیث مصنف حالی شبلی وغیرہ سے کیا جائے وہاں انکی دونوں حیثیتیں علٰحدہ علٰحدہ نمایاں کی جائیں۔ ایک تو انشا پردازانہ دوسرے مورخانہ و محققانہ۔ ان دونوں مختلف حیثیتوں سے وہ جن جن صفوں کے لائق ٹھہریں اُن میں انکو موزوں کرسیاں دی جائیں۔

ایک گذارش اور ہے۔ اس تیسرے دَور کے تحت میں صفحہ ۶۴ (الناظر) میں تنہا صاحب مولانا شرر کی نسبت فرماتے ہیں:۔

"مگر تاریخی ناول فرضی افسانے ہیں اور دو چار باتوں کے سوا قصہ کی تمام جزئیات تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں"۔

میری رائے میں شرر پر سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ اُنکے ناولوں کے متعلق اس قسم کا خیال عام ہے۔ یہ بھی مولانا کی اس فرو گذاشت کا نتیجہ ہے کہ وہ صرف تاریخی ناولوں ہی میں نہیں بلکہ اپنے علمی و تاریخی مضامین و تصانیف میں بھی ماخذوں کے حوالے دینے کے عادی نہیں۔ حالانکہ اگر بامعان نظر دیکھا جائے تو اُنکے اکثر تاریخی ناولوں کی جزئیات یہاں تک کہ اکثر مناظر بھی بالکل تاریخی و واقعی ملیں گے۔ انکے ہیرو اور ہیروئن بھی زیادہ تر تاریخی و حقیقی افراد ہیں۔ افسانہ کی خاطر انکی رنگ آمیزی اتنی ہلکی ہوتی ہے جتنا آٹے میں نمک یا شربت میں چاشنی۔ شاید بعض ناول اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوں تو ہوں۔ البتہ تنہا صاحب کی یہ رائے حکیم محمد علی مرحوم کے تاریخی ناولوں پر پوری صادق آتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا میرا یہ استقراء اکثریت کی بنا پر ہے۔ اگر تنہا صاحب نے مولانا شرر کے بعض تاریخی ناولوں کو جانچ کر یہ رائے قائم کی ہے جب بھی اُنھیں اپنا قضیہ کُلّی سے جزئی میں منتقل کرنا پڑے گا۔

میری سمجھ میں مولانا شرر کے علمی کارنامے اُنھیں یہ استحقاق بھی بخشتے ہیں کہ انھیں صرف افسانہ نگاروں کی بزم میں حکیم محمد علی مرحوم اور پنڈت رتن ناتھ آنجہانی کے بغل میں جگہ دے کر انکی اہانت نہ کی جائے، بلکہ مورخوں کی مجلس میں اُنھیں مولانا شبلی مرحوم کے پہلو میں بٹھایا جائے۔ اگر وہ تصانیف تاریخی کی تعداد، حجم اور زور بیان میں شبلی کو نہیں پہونچتے تو بعض دوسرے محاسن میں اُن سے

برتر رتبہ رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس اجمال کی تفصیل ایک طویل داستان ہے جس کا نہ یہ موقع ہے نہ فرصت۔ بہتر ہوتا کہ تنہا صاحب سیر المصنفین کے کچھ اور اجزا یوں ہی الناظر میں شایع فرماکر کافی بحث و نظر اور مشورہ کا موقع اہل نظر کو دیتے۔ اور ان کی اس تالیف کے نظری مسائل حتی الامکان نکھر جاتے اور یہ تالیف اُردو کے حق میں ایک حقیقی کامیابی اور نعمت ہوتی۔ وکفا بہ فخرا۔

محمد مُسلم

حکایات پنجاب

"ٹیلز آف دی پنجاب" کے نام سے ایک کتاب انگریزی میں شایع ہوئی تھی جس میں وہ کہانیاں جو عام طور پر پنجاب میں رائج ہونگی درج ہیں۔ اب میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ (بو بازار کلکتہ) نے اس کا ترجمہ شایع کرایا ہے۔ قیمت عہ ہے۔ ترجمہ سید عبداللہ ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے کیا اور مشن کالج لاہور کے پروفیسر لالہ ہرچند سیٹھی صاحب ایم ایس سی نے نظر ثانی کے وقت اُس میں ترمیم فرمائی۔ اس اہتمام کے بعد یہ کتاب شایع ہوکر ریویو کے لیے آئی ہے۔ کہانیاں حسب معمول دلچسپ ہیں اور کتاب کی عبارت بھی بچوں کے لایق ہے مگر ہمیں اس میں تامل ہے کہ اس قسم کی کہانیاں جن میں خلاف فطرت واقعات درج ہوں اس زمانہ میں بچوں کو پڑھانا بھی چاہیے۔ اگر صرف دلچسپی کے لحاظ سے اِنکی اشاعت کی گئی ہے تو اُردو میں بفضلہ تعالیٰ اسکی کمی نہیں۔ ایک طلسم ہوشربا کی داستان سے ایسی ایسی ہزاروں کہانیوں کی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ایک محترم عزیز نے عرصہ ہوا طلسم ہوشربا کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کا خیال کیا تھا۔ اور اس میں شبہہ نہیں کہ اُس کا انگریزی ترجمہ کسی لائق ادیب کے قلم سے تیار ہوکر شایع ہو جائے تو انگلستان، امریکہ اور برطانوی آبادیات میں اسکی کثیر اشاعت کی توقع ہو سکتی ہے۔ میکملن کمپنی اور دوسری سرمایہ دار کمپنیوں کو اس طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ اس سودے میں منفعت زیادہ ہے۔ غریب ہندوستانیوں کے بچوں کی تو پرورش ہی ایسی جہالت میں ہوتی ہے کہ وہ بچپن سے خلاف فطرت واقعات سننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اب انکو مدرسوں میں بھی اگر اس قسم کی کتابوں سے دوچار ہونا پڑا تو جو کچھ دماغی ترقی موجودہ حالات میں ممکن ہے اُسکا بھی سدباب ہو جائیگا۔ ہمارے کالجوں کے لائق پروفیسر صاحبان اگر توجہ فرمائیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے بہت سے واقعات قصہ کے پیرایہ میں لکھے جائیں جنکا مطالعہ ہندو مسلمان بچوں میں اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے میں معین ہوسکے کہ ساری تعلیم و تربیت کا یہی مقصد ہے۔

مُسلم جوانمرد سے خطاب

اس بطریقِ اہلِ دل حق کی ہو جلوہ گستری
دوشِ خلیل سے ہٹا زلفِ بتانِ آذری

کھول خدا کے واسطے چشمِ حقیقت آشنا
بزمِ جہاں کی تا بکے سیر کرے گا سرسری

تو ہے خلیلِ آذری، شعلوں کو گلستاں بنا
تو ہے عصائے موسوی، توڑ دے سحرِ سامری

تیری نظر سے ہے نہاں مرتبہ اپنی ذات کا
دہر میں تو وہ جنس ہے جسکا خدا ہے مشتری

خلق ترے رسولؐ کا، وجہِ قیامِ کائنات
صبر ترے حسینؑ کا تکملۂ پیمبری

اے کہ ترے دماغ پر لرزشِ پرتوِ صفا
اے کہ ترے ضمیر میں کاوشِ نور گستری

دیکھ تو دل کو کھول کر، دفن ہے تیرے قلب میں
رازِ جمالِ مصطفٰے، سرِ جبینِ حیدری

یہ دلِ سرد تا کجا؟ اپنی سرشت کو تو دیکھ
تیری رگوں میں ہے نہاں برقِ گدازِ بوذری

چھوڑ یہ خامکاریاں، تیشے سے کام لیکے دیکھ
خفتہ ہے قلبِ سنگ میں رقصِ شرارِ دلبری

پھر سے دلِ شکستہ میں پھونک دے ولولوں کی رُوح
پھینک گلیمِ خستگی، چھوڑ فسردہ خاطری

گردِ زوال میں دکھا رقص کواکبِ عروج
بختِ سیاہ کو بنا آئینۂ قلندری

شانۂ جمال کے عوض، زینتِ روئے حق بنے
شرع سے یوں سنوار دے زلفِ درازِ کافری

سینۂ شر کو دے جلا پرتوِ نورِ امن سے
چہرۂ رہزنی پہ ڈال عکسِ جبینِ رہبری

آتشِ دل کو تیز کر، سوزِ دروں سے دے ہوا
موجِ نسیم میں بدل "بادِ سمومِ خودسری"

خاک بسر ہے آج کیوں، یاد کر اپنی رفعتیں
کل ترے نقشِ پا میں تھی شانِ کلاہِ قیصری

آج یہ تجھکو کیا ہوا، کل ترے رخ کے روبرو
زنگ تھی مثلِ آئنہ آبروئے سکندری

منزلِ ماہ و مہر تھی کل تری محفلِ شباب
ماند ہیں آج کیوں ترے نقش و نگارِ دلبری

بزم کا رنگ دیکھ کر سازِ عمل کو یوں ملا
نغموں کو تیرے تال دے گردشِ چرخِ چنبری

مسلمِ خفتہ دیکھ تو، سینۂ ذوالفقار میں
کب سے ہے محوِ خواب نازِ روحِ جلالِ حیدری

تیغ زن و رجز سرا، عرصۂ جنگ میں در آ
طبل و غا سے پھر جگا زمزمۂ دلاوری!

خاک پہ دیکھ گر نہ جائے جوش کے دل کا ہے لہو
نظم نہیں یہ درس ہے، پڑھ نہ اسے تو سرسری

"دل"

کیا کہوں کس لیئے فریاد و فغاں کرتا ہوں اہل عالم پہ عیاں سوز نہاں کرتا ہوں
حال پوشیدہ جو ہے اُسکو عیاں کرتا ہوں سب جگر تھام لیں میں دل کا بیاں کرتا ہوں
لوگ سن سن کے تڑپ اُٹھیں وہ تاثیر بھی ہے
نظم بھی ہے۔ دل پر درد کی تصویر بھی ہے

پارۂ گوشت ہے۔ پہلو میں جگہ تیری ہے شکل و صورت کا یہ انداز کہ مخروطی ہے
ظرف کا حال کہوں کیا کہ بہت عالی ہے ٹوٹ جانے پہ بھی دلکش ہی صدا آتی ہے
باعث زیست ہے کمبخت دھڑکنا تیرا
مرغ بسمل کا پھڑکنا ہے پھڑکنا تیرا
کبھی پیمانہ ہے اے دل کبھی ساغر تو ہے تو کبھی موم ہے اے دل۔ کبھی پتھر تو ہے
نور عرفاں کی تجلی کا مگر در تو ہے تن بدن پھونک جو دیتا ہے وہی گھر تو ہے
سب سمجھتے ہیں حرم بھی تجھے۔ بتخانہ بھی
کبھی آباد بھی تو ہے۔ کبھی ویرانہ بھی
کیا کہے کوئی کہ سب کہتے ہیں کیا کیا تجھکو کوئی کہتا ہے کلی اور کوئی غنچہ تجھکو
دیکھنے والے سمجھتے ہیں تماشا تجھکو داغ الفت نے بنایا گل لالہ تجھکو
لوگ کہتے ہیں کہ کیا خوب بہار آئی ہے
جس کو دیکھو تری حسرت کا تماشائی ہے
کیا کہوں اے مرے دل تجھکو کہ کیا کیا تو ہے شیشہ کہتے ہیں تجھے آئینہ سا تو ہے
حسن والوں کے لیے ایک کھلونا تو ہے سامنے آنکھ پھرے وہ تماشا تو ہے
تجھ سے ظاہر ہوئی ہر ایک کی رعنائی بھی

تو ہی کمبخت بنا باعثِ زیبائی بھی

تو جو صد چاک ہوا۔ شانہ کی صورت پائی — زلفِ جاناں ہوئی سو جاں سے تری شیدائی
سر چڑھایا تجھے اُس بُت نے بصد رعنائی — تیرے ہوتے ہوئے اغیار نے منہ کی کھائی

تو نے اپنے کو مٹایا تو ترا نام ہوا
ابتدا کیا تھی مگر دیکھ یہ انجام ہوا

مجھ کو تسلیم ہے اے دل تری غمخواری بھی — اور ہنگامِ مصیبت کی وفاداری بھی
اپنے بیگانے کی بے وجہ وہ بیزاری بھی — مئے الفت سے مگر وہ تری سرشاری بھی

رازداں ہو کے مرے راز کو افشا نہ کیا
تو نے سب کچھ کیا اے دل مرے کیا کیا نہ کیا

صاف ظاہر ہے کہ کوئی تجھے آزار بھی ہے — کہتے ہیں سب مرضِ عشق کا بیمار بھی ہے
کام کا بھی ہے مگر ساتھ ہی بیکار بھی ہے — ہے قوی بھی تو بہت اور بہت زار بھی ہے

کتنے غم تجھ میں ہیں میں کیا کہوں وسعت تیری
پھر بھی مایوس نہیں واہ ری ہمت تیری

لوگ ناداں جسے کہتے ہیں وہ عاقل تو ہے — جس سے آسان ہو مشکل وہی مشکل تو ہے
جس نے بسمل کیا قاتل کو وہ بسمل تو ہے — زندگی کا ہے سبب کون؟ مرے دل تو ہے

سوز تھا پہلے سراپا مگر اب ساز ہے تو
اسکو کچھ میں ہی سمجھتا ہوں عجب راز ہے تو

میرے دل کیا کہوں بُرجِ مہِ عرفاں تو ہے — خانۂ دیں ہے تو ہی خانۂ ایماں تو ہے
گھر ہے اللہ کا منزل گہِ یزداں تو ہے — جس نے حیرت میں پھنسایا ہے وہ ساماں تو ہے

تو طپاں بھی ہے مگر جلوہ گہِ نور بھی ہے
برق بھی اے دل باسط ہے تو ہی طور بھی ہے

باسط۔ بسوانی

سفر حجاز کی مختصر روداد

چھٹی منزل

علی الصباح جو آنکھ کھلی تو ہوائے سرد چل رہی تھی۔ گویا بارگاہ رحمۃ للعالمین کی طرف سے زائرین مدینۂ منورہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے نسیم سحر مقرر ہوئی تھی۔ جیسے جیسے اُجالا ہوتا جاتا تھا، گنبد خضراء کے نظارہ کی امیدیں مبدل بہ اشتیاق ہوتی جاتی تھیں۔ آہ انتظار کی اُس گھڑی کا سماں دکھانا اور اس کا نقشہ کھینچنا امکان میں نہیں ہے جب ہر چند ساعت کے بعد زیارت روضۂ اطہر کی تمنامیں آنکھیں بار بار حد نظر کی طرف دوڑائی جاتیں اور پھر اس خیال سے دل بیتاب کو تسلی دی جاتی کہ ابھی فاصلہ بہت ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا۔ آفتاب ہر روز نکلتا تھا اور نہایت آب وتاب سے چمکتا تھا۔ مگر اُسکی نمود کا جیسا انتظار آج کیا گیا اور اُسکی روشنی کا جس طرح آج استقبال کیا گیا یہ بالکل نئی بات تھی۔ اب ہر اُس شے پر جو دور سے نظر کے مقابل آجاتی گمان ہونے لگتا کہ گوہر مراد یہی ہے اور جب وہ شے قریب آجاتی اور معلوم ہوتا کہ کوئی درخت، ٹیکری یا پتھروں کا ڈھیر ہے تو مایوس نہ ہونے والی آنکھیں پھر کسی دوسری شے پر نگاہِ اُمید جمادیتیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسی حالت میں گذر گیا۔ بالآخر دور سے مسجد شریف کے میناروں کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور میں شغدف سے کود کر درود شریف اور دیگر ادعیہ پڑھتا ہوا پابرہنہ شغدف کے قریب قریب مگر گنبد خضراء کی تمنائے زیارت میں سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے چلتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد یہ دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی ہیں نے توقف کرکے ضروری دعائیں پڑھیں اور پھر روانہ ہوا۔ مکہ معظمہ کے قریب جس قسم کی پہاڑیاں ہیں بعینہٖ ویسا ہی پرپیچ وخم یہ بقیہ راستہ نظر آیا کہ ہر موڑ کے بعد خیال ہوتا تھا کہ اب مدینۃ الرسول کی زیارت نصیب ہوگی۔ ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ کم عرصہ تک چلنے کے بعد جب ایک مقام پر ریل کی پٹری عبور کی تو معلوم ہوا کہ اب منزل مقصود بالکل قریب ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد باغیچوں اور اُجڑی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور کہیں کہیں عبا پوش انسان بھی ملنے لگے۔ آگے بڑھے تو اِن عبا پوش اصحاب کا ایک معقول مجمع نظر آیا۔ جنھوں نے نہایت خندہ پیشانی

اور خوش خلقی سے استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب مزوروں کے کارکن ہیں۔ سلام و مصافحہ کے بعد اپنے مزور صاحب کو دریافت کیا تو ایک صاحب نے اپنے تئیں اُن کا کارندہ بتایا۔ دوپہر کے قریب مدینہ منورہ کی فصیل سے ملحق ایک میدان میں جسکو مناخہ کہتے ہیں شغدف اُتارا گیا۔ اور مجھے یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ میر عبدالعزیز صاحب اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے اونٹ ہمراہ نہیں ہیں۔ پہلے تو کچھ دور تک میں نے اُنکو تلاش کیا مگر جب اُن کا پتہ نہ چلا تو میں نے اپنا شغدف مع سامان کے وہیں جمال کے پاس چھوڑا۔ اور اُن صاحب کے ہمراہ مولوی عبدالباقی صاحب فرنگی محلی سے جا کر ملا۔ جنھوں نے نہایت شفقت و کرم سے میرا استقبال کیا۔ اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنے مکان میں ٹھہرانے کا وعدہ فرمایا۔ مناخہ واپس آکر اپنا سامان اُٹھوا لایا۔ اور غسل کر کے مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ نماز ظہر کا وقت تھا اس لیے پہلے نماز ادا کی پھر روضۂ اقدس پر حاضری سے مشرف ہوا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ۔ اس وقت کی شادمانی و انبساط کا بیان ناممکن ہے۔ میں اپنی خوش بختی پر باغ باغ تھا اور رویاں رویاں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اس لطف عمیم پر شکر گزار کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو دربار رسالت میں جبہہ سائی کا افتخار بخشا گیا۔

حضورؐ کا روضۂ اطہر مسجد نبوی کے اندر شمالی و مشرقی کونہ پر واقع ہے۔ نماز کے بعد مزور صاحب کے عامل نے مجھے اور دیگر زائرین کو پہلے کچھ فاصلہ پر قبلہ رُخ کھڑا کیا اور ایک دعا پڑھی۔ سب لوگ اُس کی تکرار آہستہ یا بآواز کرتے رہے۔ بعد ازاں رُخ بدل کر روضۂ اطہر کی جانب متوجہ ہوئے اور بارگاہ والا میں سلام پڑھا۔ سلام پڑھ کر روضۂ اطہر کی جالی کے قریب حاضر ہوئے جس میں تین گول سوراخ اس اندازہ سے رکھے گئے ہیں کہ روضۂ اطہر کے غلاف پر جہاں سنہرے حروف میں حضور انورؐ کا اسم گرامی منقوش ہے ایک سوراخ اس مقام کے مقابل ہے اور بقیہ دو سوراخ ذرا ہٹ کر حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسمائے گرامی کے مقابل واقع ہیں۔ اکثر لوگ ان سوراخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر مصافحہ کرتے ہیں۔ اسوقت ہجوم بہت تھا۔ کیونکہ قافلہ کی تمام ٹکڑیاں اپنے اپنے مزورین کے ہمراہ سلام خوانی و زیارت کے لیے جمع تھیں۔ آستانۂ عالی پر صرف چند ساعت کے لیے قیام ہو سکتا تھا۔ لہٰذا جلدی جلدی لوگوں نے مصافحہ کیا۔ درود و سلام پڑھا یا دعائیں مانگیں اور گھوم کر شمالی جانب گئے جہاں دیوار پر ایک روشندان ہے جس کی راہ سے بتایا گیا کہ جبریل امین علیہ السلام

حجرۂ عائشہؓ یا مسجد نبویؐ میں حاضر ہو کر وحی سناتے تھے۔ یہاں بھی ایک دعا پڑھوائی گئی۔ پھر پائین روضۂ مبارک کی طرف بڑھے اور ایک دوسری جالی کے قریب کھڑے ہو کر جسکے اندر جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمۂ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مزار بتایا گیا، سلام پڑھا۔ حضرت فاطمہ زہراؓ کی جاے دفن کے متعلق ارباب سیر میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ جنۃ البقیع میں قبۂ اہلبیت کے نیچے آپ دفن کی گئیں تھیں اور بعض کے نزدیک حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پائین روضہ آپ دفن ہوئیں۔ اس اختلاف کا یہ نتیجہ ہے کہ دونوں جگہ آپ کے نشانات مزار بنے ہوے ہیں جہاں زائرین حاضر ہو کر نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔ صحن مسجد میں حضرت فاطمہؓ کی کیاری بنی ہوئی ہے اور اُسی سے ملحق ایک کنواں ہے جسکے پانی کو آب کوثر کا لقب ملا ہے۔

مزور صاحب کے عامل سید زین العابدین نے ہم لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ عشا کے سوا ہر نماز کے بعد وہ یا اُنکا کوئی مددگار روضۂ اطہر کے قریب سلام پڑھوانے کے لیے موجود رہے گا۔ اس لیے سب لوگ نماز پڑھ کر یکجا ہو جاتے اور سلام پڑھتے۔ مجھے لکھنؤ سے روانگی کے وقت ہدایت ہوئی تھی کہ روضۂ اطہر کے قرب میں مودب رہوں اور با واز بلند صلوٰۃ وسلام نہ پڑھوں، مگر جو طریقہ یہاں رائج ہے وہ اسکے بالکل منافی تھا۔ بلکہ نماز کے بعد جب زائرین کی مختلف ٹکڑیاں جمع ہوتی تھیں تو اُن کے صلوٰۃ وسلام سے مسجد گونج اُٹھتی تھی۔ بہر حال میں حتی المقدور اہتمام کے ساتھ اس ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ البتہ ہجوم کی وجہ سے مجھے کسی قدر وحشت ہوتی تھی اور میں قافلہ کی واپسی کا بیصبری سے انتظار کر رہا تھا کہ سکون کے ساتھ روضۂ اطہر پر حاضری سے سعادت اندوز ہو سکوں۔ عصر کے بعد پھر مناخہ گیا۔ میر عبد العزیز صاحب معہ دیگر ہمراہیوں کے اُسی وقت پہونچے اور اپنا سامان وغیرہ دیکھ بھال رہے تھے۔ میں سب کو ہمراہ لے آیا۔ اور نماز مغرب کے بعد مولوی سید احمد صاحب ایجنٹ علی جان کمپنی سے ملا اور حوالہ کا کاغذ دکھا کر روپیہ لیا۔

دوسرے روز جنۃ البقیع میں حاضر ہو کر سب ہمراہیوں کے ساتھ بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ پڑھا۔ تیسرے دن سب ساتھیوں نے طے کیا تھا کہ سید زین العابدین کی معیت میں جبل احد پر جا کر سید الشہدا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھیں گے مگر میں نہ جا سکا۔ ساتھیوں کی واپسی سے قبل میں ڈاکخانہ گیا اور وہاں سے خطوط لایا۔ اور چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ اُسی روز ڈاک

جانے والی ہے اس لیے جلدی جلدی وطن کے خطوط لکھے اور عصر سے پہلے پوسٹ (ڈاک خانہ) کے حوالہ کیے۔ منگل کو قافلہ پہونچا اور سنیچر کو واپسی کی اطلاع دی گئی تھی۔ میں چونکہ پہلے ہی سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس قافلہ کا ساتھ چھوڑ دوں گا اور مدینہ منورہ میں اُس وقت تک حاضر رہوں گا کہ حج کے لیے وہاں سے آخری قافلہ روانہ ہو۔ اس لیے بے فکر تھا۔ مگر احباب اور ساتھیوں کو واپس جانا تھا اس لیے وہ لوگ جلد جلد زیارتوں سے فراغت کر کے تبرکات اور سفر کے لیے اشیاء خوردنی وغیرہ کی خریداری میں مصروف تھے۔ جمعہ کو بعد نماز مغرب جنۃ البقیع میں فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا۔ عم مکرم منشی اطہر علی صاحب مرحوم ومغفور کی قبر یہیں ہے۔ پہلی بار چونکہ نشان دریافت نہیں کیا تھا اس لیے باوجود تلاش نہ ملی۔ اب کی مولوی عبد الباقی صاحب سے پوچھ کر آیا تو مل گئی قبۂ اہلبیت کے بالکل پشت پر واقع ہے۔ وہاں فاتحہ پڑھ کر کچھ دیر قبر کو دیکھتا رہا۔ قبر کی مرمت اور کتبہ میں سیاہی بھرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے چاہا کہ میں خود اس کا انتظام کر دوں، پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے عزیز از جان انور علی سلمہٗ بھی بعد ادائے حج یہاں پہونچیں گے اس خدمت کے وہی زیادہ مستحق ہیں۔

قافلہ کی واپسی کا وقت قریب آیا تو ہمارے مقوم، ترجمان اور جمال سب کی خواہش پر میں نے ایک تحریر اپنے معلم کے نام اس مضمون کی لکھ دی کہ ان اصحاب کے طرز عمل سے شاکی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ میں نے بہ رضا ورغبت اپنا اونٹ چھوڑ دیا ہے اور شقدف رکھ لیا ہے جو بعد واپسی مکہ معظمہ میں داخل کر دیا جائے گا۔ تمام ساتھی صبح کو شاخہ روانہ ہو گئے تھے میں بعد عصر وہاں اس اس غرض سے گیا کہ قافلہ روانہ ہو گیا ہو گا اپنا شقدف مکان پر اُٹھوالاؤں۔ مگر شقدف نہ ملا جس کی اطلاع سید زین العابدین کو کر دی۔ اُنھوں نے اطمینان دلایا کہ شقدف مل جائے گا۔

جب تک قافلہ اور ہمراہی موجود رہے مسجد نبوی میں ہجوم کی وجہ سے اطمینان کی حاضری نہ ہو سکی اور ہمراہیوں کی وجہ سے مدینۂ منورہ کے مقیم اصحاب میں سے سوا مولوی سید احمد صاحب اور حافظ شبراتی صاحب کے کسی سے نہ مل سکا۔ مولوی صاحب تو گویا زائرین کے لیے بمنزلہ بنک کے ہیں اس لیے اُن سے ملے بغیر چارہ نہ تھا۔ حافظ صاحب قدیم تعلقات کی بنا پر پہلے ہی روز آکر ملے اور روز ملتے رہتے۔

قافلہ جا چکا تو حافظ شبراتی صاحب کی وساطت سے مولوی ضیاء الدین سیالکوٹی سے نیاز حاصل ہوا جو مسجد نبوی کے قریب ہی ایک رباط میں مقیم ہیں۔ رباط سے مراد وہ موقوفہ مکانات ہیں جو صاحبان خیر کی طرف سے ساکین، مسافرین اور درویشوں کے لیے بنا دیے گئے ہیں۔ مولوی ضیاء الدین صاحب ایک نوعمر بزرگ ہیں جو وطن سے ہجرت کر کے یہاں مقیم ہیں۔ ہندوستان کے حالات سے آپ کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعہ سے جملہ ممالک اسلامیہ کے حالات سے آپ باخبر ہیں اس لیے آپ سے مل کر میں بہت محظوظ ہوا۔ دوسرے روز مولوی عبد الباقی صاحب کے ہمراہ حضرت شیخ احمد شمس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ کی عظمت و بزرگی بہت مشہور ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ سے زائد کسی شخص کی عظمت نہیں کی جاتی حتیٰ کہ عہد ترکیہ سے والی مدینہ کے سوا صرف آپ ہی کو اس بات کا شرف حاصل ہے کہ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی جالی کھلوا کر روضۂ اطہر کے قریب حاضر ہو سکتے ہیں۔ تمام عرب اور بدوی قبائل آپ کا اس درجہ احترام کرتے ہیں کہ جب آپ اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ حج کرنے کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو راہ میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ آپ کا قافلہ پانچوں وقت نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے راہ میں ٹھہرتا ہے۔ نیز یہ کہ عام راستوں کے علاوہ آپ کا قافلہ جس راستہ سے جانا چاہے جاتا ہے۔

حضرت شمس مغربی الاصل ہیں اور شاذلی (قادری) سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی عمر اسّی برس کے قریب ہوگی اور ضعف اتنا ہو گیا ہے کہ آپ کا مکان اگرچہ مسجد نبویؐ سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے مگر سوائے جمعہ کے آپ عام طور پر کسی روز مسجد نبویؐ میں حاضر نہیں ہوتے۔ مجھے آپ کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا، اور چونکہ آپ کی ہمرکابی میں مکہ معظمہ واپس جانا چاہتا تھا اس لیے اسکی اجازت بھی حاصل کرنا تھی۔

میں ہندوستان میں بھی بعض بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مگر حضرت شمس کے حسن اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ آپ مکان کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ صدر دروازہ پر اطلاع کرنے کے بعد ایک خادمہ نے ہم لوگوں کو اندر لیجا کر مجلس میں بٹھایا اور کہا کہ شیخ تشریف لاتے ہیں۔ چند لمحوں میں شیخ تشریف لائے تو پہلے نہایت تپاک سے مصافحہ فرمایا اور مزاج پرسی فرمائی۔ اُسکے بعد ایک چھینکہ پر سے کھجوریں اتارنے اور باصرار کھلائے گئے۔ پھر چاء پلائی گئی۔ اور جب اثناء گفتگو میں مولوی

عبدالباقی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو یہ سن کر بہت مسرت کا اظہار فرمایا کہ میں حضرت محمد بن حنفیہ رضؓ کی اولاد میں سے ہوں۔ اور میری اس درخواست پر کہ مجھے ہمرکابی کی عزت بخشی جائے نہ صرف بخوشی اسے منظور فرمایا بلکہ وعدہ فرمایا کہ جب قصد روانگی ہوگا تو آپ کو اطلاع دیدی جائیگی۔ حضرت شیخ کے نصف چہرہ پر ایک سفید رومال پڑا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کی گفتگو جو یوں ہی آہستہ ہوتی ہے بمشکل سمجھ میں آتی ہے۔ اثنائے گفتگو میں میں نے عرض کیا کہ آپ میری ہندوستانی نہیں سمجھتے اور میں آپ کی عربی نہیں سمجھتا البتہ لسان قلب سے اگر گفتگو ہو تو یہ دشواری رفع ہوجائے۔ اس جملہ سے بہت محظوظ ہوئے اور دیر تک مختلف امور کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ رخصت حاصل کرتے وقت میں نے پھر حاضری کی اجازت چاہی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ اوقات میں ہرج ہوگا تو بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا کہ نہیں جب چاہو بے تکلف آؤ۔ چنانچہ اسکے بعد ایک بار تنہا اور ایکبار مولوی ضیاءالدین صاحب کے ہمراہ حاضری کی نوبت آئی اور ہر دفعہ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ چلتے وقت دروازہ تک پہونچانے آتے۔

میرے ساتھی میر عبدالعزیز صاحب قنوج میں عطر کا بیوپار کرتے ہیں۔ وہ بہت سی شیشیاں اپنے ہمراہ لائے تھے اور چلتے وقت میرے سپرد کر گئے تھے کہ کچھ روضۂ اطہر پر اور مسجد نبوی میں خاص خاص مقامات پر صرف کی جائیں اور بقیہ تقسیم کردی جائیں۔ میں نے انکی جانب سے جہاں اور بزرگوں کو دیں وہاں دو شیشیاں حضرت شمس کی خدمت میں بھی پیش کیں۔ خوش ہوکر قبول فرمائیں اور دیر تک مجھے اور میر صاحب کو دعائیں دیتے رہے۔

قافلہ کی روانگی کے بعد مسجد نبوی میں ہجوم کم ہوگیا۔ صرف نماز کے اوقات میں مجمع ہوجاتا تھا۔ اس لیے مجھ کو اب اطمینان سے نماز کے بعد ٹھہر کر تلاوت کرنے اور درود شریف پڑھنے کا موقع ملا۔ نیز سید زین العابدین کی وساطت سے خوجوں کے سردار سے اس بات کی بھی اجازت حاصل ہوگئی کہ رات کو بھی مسجد نبوی میں حاضر رہ سکوں۔ نماز عشا کے بعد ہی حرم نبوی کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں اور جن چند آدمیوں کو رات کی حاضری کی اجازت ہوتی ہے انکے سوا کوئی رہنے نہیں پاتا۔ ایسے تمام لوگ سنگین مکبر کے نیچے جمع ہوجاتے ہیں جو منبر شریف سے تھوڑے فاصلہ پر قدآدم بلند بنا ہوا ہے۔ ہمارے قافلہ میں جنوبی امریکہ کے ایک یمنی تاجر بھی تھے جنھوں نے زر کثیر صرف کرکے اپنے اور اپنے

ساتھیوں کے اونٹ مدینہ منورہ میں روک لیے تھے۔ انھیں میں حکیم محمد قاسم سورتی بھی تھے جنھوں نے ازراہِ ہمدردیِ اسلامی ترآہ میں رحمت شاہ کا علاج کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں مجھے انکی خدمت میں نیاز حاصل ہوگیا تھا۔ شب دوشنبہ کو جب میں نے پہلی بار حرم نبویؐ میں حاضری شبانہ کا کا ارادہ کیا اور نمازِ عشا کے بعد حسب ہدایت کبر کے نیچے جاکر بیٹھ گیا تو وہ سیٹھ مع حکیم صاحب اور چند دیگر رفقا کے وہیں نظر آئے۔ اِنکے علاوہ ایک بدوی عرب بھی تھا۔ غرضکہ ہم سب نصف درجن آدمی تھے۔ مسجد نبویؐ کے دروازے بند ہوگئے تو ایک خوجہ صاحب نے مجھے اپنے ہمراہ لیکر حرم شریف کے مغربی دروازہ سے متصل وضوخانہ اور استنجے خانہ دکھایا۔ اس اثنا میں اکثر جگہ سے روشنی رخصت ہوگئی تھی صرف کہیں کہیں ایک ایک بتی رہ گئی تھی۔ روضۂ مطہر کے اندر بھی صرف چند مومی بتیاں رہ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب خوجے بھی چلے گئے۔ جن میں سے بعض صحن مسجد میں بستر بچھا کر لیٹ رہے۔ صرف دو ایک مشغولِ عبادت تھے رہ گئے۔ اب حرم نبویؐ میں کامل سکون ہوگیا۔ جس کے ہم علامان رسولؐ مشتاق تھے اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق بارگاہ رسالت پناہیؐ کے قریب کوئی گوشہ منتخب کرلیا۔ کہ یہی ہماری کامرانیوں اور دلی مرادوں کا مقام عروج تھا۔ دوسروں کا حال مجھے کیا معلوم مگر میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کی وہ تمام ساعتیں جو کسی قسم کی مسرت وانبساط میں گذری ہوں اس رات کے مقابلہ میں بے تکلف قربان کردی جاسکتی تھیں۔ اور میں حیران تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا کیسے شکریہ ادا کروں کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو بارگاہ رسالت پناہیؐ میں یہ سرافرازی نصیب ہوئی شب کا حصۂ وافر اسی عالم سکون میں بسر ہوا۔ اور غلس کے وقت حرم نبویؐ کا دروازہ کھلتے ہی جب نمازیوں کی آمد شروع ہوگئی تو میں بائیں جانب کے دالان میں جاکر تھوڑے وقفہ کے لیے لیٹ رہا۔ اور نماز فجر ادا کرکے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتا ہوا اپنے مقام پر واپس آیا۔

دوداد سفر میرے اندازہ سے کہیں زیادہ پھیلی۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ اور درمیان میں کبھی میری عدیم الفرصتی کے باعث اور زیادہ تر اوراق الناظر میں گنجایش نہ نکلنے کے سبب سے شایع بھی نہ ہوئی۔ خدا کی مرضی ہے تو اب ماہ بماہ کچھ صفحے ضرور درج ہونگے تاکہ سنہ ۲۲ء کی پہلی ششماہی میں حتی الامکان ختم ہوسکے۔ ظفر الملک

نظرے خوش گذرے

خدا کا شکر ہے کہ سال کا آخری پرچہ ختم سال سے پہلے ہی شایع ہو رہا ہے - اور اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے توسیع کے اجرا کی وجہ سے میری ذمہ داریوں میں کافی اضافہ ہو جانے کے باوجود آیندہ سال الناظر کی اشاعت میں یہ بدنظمی نہ ہونے پائے گی - کم سے کم سال رواں میں میری طبیعت پر جو افسردگی ناموافق اسباب اور طرح طرح کی پیچیدگیوں کے رونما ہونے کے باعث کارفرما رہی اُس کا اثر بحمد اللہ کہ احباب کی ہمت افزائی نیز امداد زمانہ سے بہت کچھ زائل ہو گیا ہے اور اس بنا پر جہاں تک کہ میری ناچیز کوشش کا تعلق ہے اُمید ہے کہ اُس میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی - واللہ المستعان -

---

ہردوئی کے صادق حسین صاحب کے متعلق اُنکی تحریر کے بعض جملوں کی وجہ سے خیال ہوا تھا کہ اُنھوں نے مزاحاً اپنے تئیں فلسفہ کا گریجوئیٹ ظاہر کیا - اب مجھی سلطان حیدر صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ واقعی فلسفہ کے گریجوئیٹ ہیں - اگر یہ دوسری تحریر مذاق سے نہیں لکھی گئی تو صادق حسین صاحب کی خوش مذاقی ناقابلِ رشک ہے -

---

عزیز صاحب کو تسلیم ہے کہ دل کی بستی تمام لوٹ گئی میں پورا محاورہ نہیں بندھا اور اُن سے فروگذاشت ہوگئی -
سید اظہر علی صاحب آزاد کے جو فارسی اشعار گذشتہ نمبر میں صفحہ ۴۷ پر شایع ہوئے تھے اُنکو پڑھکر ایک مخلص نے توجہ دلائی ہے کہ آخری شعر میں "رفت" کی "ت" گر گئی ہے - آزاد صاحب کیا فرماتے ہیں ؟

انجمن اُردو کے شعبۂ تصنیف و تالیف کا نظام کار مولوی بذل الرحمٰن صاحب ناظم شعبہ کے باہر چلے جانے کی وجہ سے اس دفعہ فراہم نہ ہوا - آیندہ دیکھا جائیگا - اب انجمن کا سال تمام ہونے پر ہے اور جنوری میں اُس کا سالانہ جلسہ ہوگا - اس موقع پر یہ تجویز ہوئی ہے کہ جلسہ کے ساتھ ایک نمایش کی جائے جس میں اُردو کی نادر قلمی کتابیں، اساتذہ و مصنفین کے مسودات اور مرقعے، خطاطی اور صحافت کے نمونے اور سنہ ۱۹۲۴ء کی جدید مطبوعات وغیرہ فراہم کی جائیں - اگرچہ وقت تنگ ہے تاہم امید ہے کہ اینداکرنے کے لیے کافی سامان لکھنؤ میں اور خاص خاص مقامات سے فراہم ہو جائے گا - جو احباب سنہ ۲۴ء کے مطبوعات یا نمایش کے متعلق اور کوئی چیز بھیجنا چاہیں ۲۰ جنوری سے قبل ارسال فرمائیں - بحفاظت واپسی کا میں ذمہ دار ہوں - نمایش کے متعلقہ انتظامات کے لیے انجمن نے جو مجلس قائم کی ہے اُسکے معتمدین مسٹر مسعود الحسن رضوی ایم اے لکچرار اُردو یونیورسٹی اور شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری مقرر ہوئے ہیں - ۲۴ - [illegible] سنہ ۲۴ء

عزیز مکرم جناب منشی ... مولوی ... کا مضمون ... وہ بہت طویل تھا اس لیے ... [illegible] ... مناسب معلوم ہوا - احباب ... [illegible]

گوتم بودھ

سری کرشن کی وفات کو مدتیں گذریں۔ بھگوت گیتا کی تعلیم فراموش ہوگئی۔ مہابھارت کی لڑائی قصہ کہانی بن گئی۔ ہندوستان کی شاہنشاہی جسکے لیے دریودھن اور راجہ جودھشٹر نے اٹھارہ چھاؤنی فوج آٹھ دن میں کٹوادی نہ فاتح کے پاس ہے نہ مفتوح کے قبضہ میں۔ شمالی ہند سولہ سلطنتوں میں تقسیم ہے جنکے علاوہ چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں بھی بہت ہیں۔ جنوب میں ڈراوڈن قوم کی جداگانہ حکومتیں قائم ہیں۔ مغربی سرحد پر کیانیوں کا اختر اقبال ترقی پہ ہے۔ پنجاب کو مملکتِ فارس کا ایک صوبہ بنانے کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ بابل میں بخت نصر کا جاہ و جلال نقطۂ نصف النہار پر ہے۔ یروشلیم تباہ ہوچکا اور شوکت سلیمانی کے وارث اپنی مٹی ہوئی عظمت پر آنسو بہا رہے ہیں۔ فراعنۂ مصر جو کسی وقت خدائی کے دعویدار تھے فاتح بیت المقدس کی شوکت سے لرزہ براندام ہیں۔ رومتہ الکبریٰ کا عالم طفلی ابھی شباب تک نہیں پہونچا۔ وہ دن دور ہے کہ یونان کے دانشمندوں کو غلام بنائے اور دجلہ و فرات پر دُرفش کاویانی سے مقابل ہو۔ یونان علم و فضل میں گوے سبقت لے گیا لیکن وہ منزل کمال ابھی بہت آگے ہے کہ اُس کا ایک شہزادہ سلطنتِ ایران کو تباہ کرے اور شہنشاہی عالم کی خطرناک ہوس کا شکار ہو۔

شریعت زردشت فارس کا قومی مذہب ہے۔ آگ صرف قبلہ نہیں بلکہ معبودِ برحق ہے۔ ستارہ پرستی بابل اور اُسکے مقبوضات میں رائج ہے۔ آفتاب مظہر قدرت نہیں بلکہ قادر مطلق ہے۔ روما اور یونان کا مذہب عجائب پرستی، عظمت شجاعت، اور سنگین مورتوں کے سامنے سر جھکانا ہے۔ بنی اسرائیل کا مقدس شہر ویران و سنسان ہے اور ملک شام میں توحید کا چراغ جلانے والے ایک حاکم جابر کی قید میں گرفتار ہیں۔

ہندوستان میں بنارس اور ٹکشلا[1] کی درس گاہیں وید کا سبق پڑھاتی ہیں لیکن ویشن۔

[1] ٹکسلا قدیم زمانہ میں ایک مشہور شہر تھا۔ مدت تک پنجاب و کشمیر کا دارالسلطنت رہا۔ اب اُسکے کھنڈروں کے کچھ نشانات راولپنڈی کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ۱۲

شودر اور اچھوت ذاتوں کے لیے اُن کے دروازے بند ہیں۔ ویدانت پر عمل موقوف اور کرم کھنڈ کا سکہ رائج ہے۔ برہمنوں کا فرمان وید کے رسوم سے بالاتر ہے۔ تمام شمالی ہندوستان ذات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ نفس کشی اور ریاضت صرف برہمنوں کے لیے مخصوص ہے لیکن اُنکو اس شغل بیکاری کے لیے فرصت نہیں۔ لڑنا مرنا چھتری کا دھرم ہے لیکن مقصود یہ ہے کہ وہ دشمنوں کو دفع کرکے برہمنوں کو عیش و عشرت سے دل بہلانے کا موقع دیں۔ ویش سوداگری کریں اور دولت کمائیں تاکہ برہمنوں کو اپنی فیاضی و گہرپاشی سے مالامال کرسکیں۔ شودر خدمت کریں اور اونچی ذاتوں کو آرام پہونچائیں تاکہ اگلے جنم میں کسی برہمن یا چھتری کے گھر پیدا ہوں

ویش و شودر نہ اپنے نیک اعمال سے نجات حاصل کرسکتے ہیں اور نہ اُنکو عبادت و ریاضت کی اجازت ہے۔ برہمنوں کی شفاعت سے دنیوی فوائد اُنکو مل سکتے ہیں۔ لیکن سفارش قبول ہونے کے لیے بڑی بڑی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے ایک بار بنارس میں مچھلی اور گوشت کا سڑکوں پر انبار کیا جاتا ہے اور دیگوں میں شراب بھری جاتی ہے۔ ایک دفعہ راجگڑھ میں آدھی رات تک قبولیتِ دعا کے لیے تمام خلقت شراب نوشی میں مصروف رہتی ہے۔ راجہ بنارس کے محل میں سولہ ہزار خوبصورت ناچنے والیاں پرورش پاتی ہیں۔ پروہتوں کے گھر میں بھیڑ، بکری اور سوٗر ذبح کیے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہاتھی، گھوڑے، سانڈ اور طیور کے علاوہ انسانوں کی بھی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ تب آسمانی حاکموں کا غصہ فرو ہوتا ہے۔

اس عیاشی۔ خونریزی اور مذہبی تاریکی کے عہد میں بنارس سے ڈیڑھ سو میل شمال کی طرف نیپال کی ترائی میں ایک رحم و انصاف کا اوتار جنم لیتا ہے جو اپنے پُراثر روحانی وعظ سے قربانی ممنوع قرار دیکر اور ذات کی زنجیریں توڑکر مذاہب عالم کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کردیتا ہے اور جسکی غلامی کو آج شائستہ دُنیا کی آبادی کا تقریبًا ایک چوتھائی حصہ اپنی نجات

لہ جتکا۔ جلد ۳۔ نمبر ۳۱۴ (یہ کتاب سنگھالی زبان سے پالی میں ۴۳۰ء میں ترجمہ کی گئی۔ اور اسکا انگریزی ترجمہ چھ جلدوں میں کیمبرج یونیورسٹی پریس نے شایع کیا ہے۔ اس کتاب میں ۵۵۰ قصے ہیں۔ جن میں سے چند کا حوالہ اس مضمون میں دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ا جلد ۱۔ نمبر ۱۱۳، ۲۲۰، ۱۲۰۹ و ۱۳۲ و جلد ۲ نمبر ۴۹۵

سرمدی کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

ہندوستان کے شمالی حصہ میں جو چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں تھیں اُن میں سے ایک کا دارالسلطنت کپل وستو، نیپال کے دامن کوہ میں واقع تھا۔ اس شہر کا رئیس راجہ شدھودن چھتری ذات کی ایک شاخ شاکیہ کا ممبر تھا۔ شرق میں گیارہ میل کے فاصلہ پر کولین ذات کا راج تھا اور وہاں کے راجہ کی دو لڑکیاں راجہ شدھودن کے محل میں تھیں لیکن نعمت اولاد سے اُسوقت تک محروم رہی تھیں۔ خدا کی قدرت سے ۵۴ سال کی عمر میں بڑی رانی کی تقدیر جاگی اور ایک ایسے فخرِ ملک و قوم فرزند کی ماں بننے کا شرف اُسکو حاصل ہوا کہ آج تک "مہامایا دیوی" کے نام سے وہ خوش نصیب زندہ ہے۔

اُس زمانہ میں عام رواج تھا کہ لڑکیوں کی پہلی اولاد میکے میں ہوا کرتی تھی اور ایام ولادت جب قریب آتے تھے تو بیوی اپنے باپ کے گھر چلی جاتی تھی۔ اسی اصول پر مہامایا بھی کپل وستو سے اپنے دیس کو روانہ ہوئی۔ راستہ میں لمبنی گاؤں کے قریب ایک باغ میں آسائش کے لیے فروکش تھی کہ یکایک دردِ زہ شروع ہوا اور وہ مولودِ مسعود عالم وجود میں آیا جسکی نورانی برکت اور روحانی عظمت کے سامنے بڑے بڑے متکبر تاجداروں نے سرِ نیاز خم کیا اور تقریباً تین سو برس کے بعد اُسکے ایک بندۂ بے درم مہاراجہ اشوک نے اس مقدس مقام پر ایک سنگین کتبہ نصب کرایا جو زمانۂ حال میں پڑھا گیا اور جس نے ڈھائی ہزار برس کے بعد اُس متبرک زمین کا یقینی نشان دیا جسکو پہلی بار گوتم بودھ کے مبارک قدم چھونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

امتدادِ زمانہ سے ولادت کی صحیح تاریخ مشتبہ ہوگئی تھی۔ حتی کہ ۱۸۵۴ء تک آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ولسن صاحب مہاتما گوتم کو ایک فرضی اور خیالی انسان تصور فرماتے تھے اور محققین اُسکی پیدائش ۸۰۰ء قبل مسیح بتاتے تھے لیکن مہاراجہ اشوک کے ایک کتبہ سے یہ بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا کہ مہاتما کا سالِ ولادت[1] پانچ سو باسٹھ برس قبل مسیح تھا۔

[1] امپیریل گزٹیر۔ جلد ۲ صفحہ ۴۲، ۴۳، ۵۴ و ۵۵ مطبوعہ ۱۹۰۸ء۔ اس کتبہ میں درج ہے کہ یہ ۲۵۶ برس بعد وفات گوتم اور ۳۸ سال بعد تخت نشینی اشوک کے نصب کیا گیا۔ اشوک کا سال جلوس ۲۶۴ قبل مسیح معلوم ہے اور گوتم کی عمر عام طور پر ۸۰ سال کی ہوئی تھی۔ لہذا (۲۵۶ + ۸۰ + ۲۶۴ - ۳۸ = ۵۶۲)

ایک عقیدت کیش سوانح نگار لکھتا ہے کہ "مایا دیوی لمبنی کے باغ میں گلگشت کر رہی تھی یکایک ایک درخت دیوی کو سجدہ کرنے کے لیے جھکا - رانی نے ہاتھ بڑھا کر اُسکی ایک شاخ تھام لی اور آسمان کی طرف سر اُٹھا کر دعا میں مصروف ہوئی - اُسی وقت مہاتما ظاہر ہوئے - راجہ اندرا اور برھما نے اپنی گود میں لیا - کنول کا پھول زمین سے اُگا اور اس مقدس مولود کا گہوارہ بنا - پانی کے سرد و گرم چشمے صاحبزادہ کو غسل دینے کے لیے اُبل پڑے - آسمان سے چھتری سایہ کرنے کو نازل ہوئی - کُل مخلوقات کے اجسام میں مسرت و سرور کی برقی لہر دوڑ گئی - تمام عالم خوشبوسے معطر ہو گیا - غصہ، نفرت جہالت، غرور، اور حسد وغیرہ کمینہ خصلتیں ہر شخص کے دل سے دُور ہو گئیں اور ہر طرف سے ناچ گانے کی صدائیں آنے لگیں"۔

آج مادہ پرست دنیا کہے گی کہ یہ شاعرانہ خیالات ہیں یا محبت کے متوالے کی بڑ - بانیانِ مذاہب کی ولادت کے متعلق خوش عقیدہ پیرو ایسے ہی قصے بنا لیا کرتے ہیں - لیکن مورخ دیکھتا ہے کہ اس روایت سے بھی گوتم کی ولادت بمقام لمبنی باغ واقع ہونے کی تائید ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ ایام معہود سے کچھ پیشتر یہ واقعہ ظہور میں آیا تھا جبکہ رانی نہ اپنے باپ کے گھر تک پہونچ چکی تھی اور نہ اپنے شوہر کے محل میں تھی -

کپل واستو میں یہ خوشخبری پہونچی تو راجہ کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی لیکن شادی و غم چولی دامن کی طرح ساتھ ساتھ ہیں - جہاں نقارے بجتے ہیں وہاں ماتم بھی ہوتا ہے - ساتویں دن مایا دیوی کا انتقال ہو گیا اور مجلسِ نشاط کی جگہ صفِ ماتم بچھ گئی -

ہندوستان میں اُس وقت علم نجوم کا بہت زور تھا - کسی پنڈت نے ستاروں کی چال سے نتیجہ نکالا کہ یہ لڑکا ایک دن زندگی کی مصیبتیں دیکھ کر تارک الدنیا ہو جائیگا اور جنگل میں قیام اختیار کرے گا - راجہ اس خبر سے بہت آزردہ ہوا اور نیت کی کہ اپنے عزیز بیٹے کو اس طرح پردہ میں رکھے کہ دنیا کی کوئی تکلیف اور پریشانی اُسکے سامنے نہ آئے - اور جوگ اختیار کرنے کی رغبت نہ پیدا ہو - مہربان باپ محبت کی ترنگ میں بھول گیا کہ پیشانی کی تحریر مٹ نہیں سکتی - جو ہونی ہے وہ ہو کر رہے گی اور اُسکو ٹالنے کی کوئی تدبیر نہیں! دانشمند نجومیوں سے آیندہ کی خبر دریافت کرنے کو اسی لیے منع کرتے ہیں کہ اگر اُن کا قول صحیح بھی ہو اور جس نتیجہ پر وہ اپنے قواعد کے مطابق پہونچے ہیں

واقعی ظہور میں بھی آئے تو اُسکی بُرائیاں دُور کرنے کی کوئی ترکیب نہیں۔!!

بہرحال۔ گوتم کی پرورش اُسکی خالہ پراج پتی کے زیرِ نگرانی راج محل کے اندر کی گئی اور سوائے چند خاص خادموں کے کسی کو شہزادہ کے دیدار کی اجازت نہ تھی۔

ابتدائی تعلیم و تربیت کیونکر ہوئی اور علوم و فنون کا باقاعدہ درس دیا گیا یا نہیں۔ اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکا۔ عقیدتمندوں کو تو اس عنوان پر کچھ تحریر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ اُنکے خیال کے مطابق مہاتما اس دنیا میں تشریف لانے سے قبل تمام علوم میں درجۂ کمال حاصل کرچکے تھے۔ اور اپنی خوشی سے راجہ شدھودن کے گھر رونق افروز ہوئے تھے لیکن ظاہربین تعجب کریں گے کہ قصرِ شاہی کے اندر شہزادہ کو فنون سپہ گری میں اس قدر دستگاہ کیونکر حاصل ہوئی کہ عنفوانِ شباب کے وقت جب کپل واستو کی رعایا نے شکایت کی کہ ہمارا راج کمار ضروری فنونِ حرب سے بیگانہ رکھا جاتا ہے، وہ دشمنوں کے حملہ سے ہم کو کس طرح بچائے گا۔ تو شہزادہ نے سرکاری احاطہ کے اندر شورش کرنے والوں کو شہسواری اور تیراندازی کے وہ جوہر دکھلائے کہ سب عش عش کرنے لگے، اور اعتراضات کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ اور یہ بھی حیرت ہوگی کہ سنسکرت کے ادب میں گوتم نے اس قدر استعداد کیسے حاصل کی کہ ترکِ دنیا کا عہد کرنے کے بعد ہی مگدھ کے پنڈتوں سے فلسفہ کا درس لینے لگے۔

اگر نوعمری میں گوتم کو باقاعدہ تعلیم نہیں دی گئی تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُنکے والدین ایسے عالم و فاضل تھے کہ اُنکے شرفِ صحبت سے تمام ضروری علوم و فنون شہزادہ کو بغیر کسی معلم کی مدد کے حاصل ہوگئے اور یہی زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

القصہ جب شاہزادہ کی عمر ۱۸ یا ۱۹ سال کی ہوئی تو راجہ شدھودن نے اپنے فرزند کو شادی کی بیڑی پہنانا چاہی تاکہ دنیا سے تعلق قائم رکھنے کی زنجیروں میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوجائے۔

گرد و نواح میں چھتریوں کے جو خاندان بستے تھے اور جن سے شاکیہ قوم شادی بیاہ کرسکتی تھی اُنکی کنواری لڑکیاں اور ناکتخدا بہنیں ایک تقریب کے حیلہ سے کپل واستو کے شاہی محل میں جمع کی گئیں اور درباریوں کی تحریک پر اُسکو اختیار دیا گیا کہ اس پرستان میں سے اپنے لیے

ایک شادی وغم کا رفیق انتخاب کرلے۔

یہ نازنینیں اور انکے عزیز رشتہ دار کئی دن راجہ کے مہمان رہے لیکن گوتم نے نہ توان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی اور نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ اُنکے جمع کرنے کا مقصود شہزادہ کے لیے دولھن تجویز کرنا ہے۔

تقریب ختم ہوئی تو گوتم نے دستور کے مطابق ہر ایک مہمان کو رخصت کرتے وقت اپنے ہاتھ سے سوغاتیں تقسیم کی۔ کسی کو زیور دیا کسی کو جواہر، کسی کو موتیوں کا ہار اور کسی کو سونے چاندی کے بیش قیمت تحفے۔ مگر جب گوتمی کی نتار جسودھرا کی باری آئی جو اُسکے ماموں کی لڑکی تھی تو اُسکو کوئی قیمتی یادگار نہیں دی۔ صرف ایک پھول نذر کیا اور الوداع کہا۔

حاضرین مجلس کچھ نہ سمجھے، مگر دوسرے روز راجہ شدھودن نے کولین راجہ کے پاس اپنے لڑکے کی نسبت کا پیام بھیجا تو معلوم ہوا کہ روشن ضمیر جسودھرا کو اس خواستگاری کا پہلے ہی سے یقین تھا۔

میان عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبیں راہم خبر نیست

نیز کا معتقد راجہ۔ گوتم کو قصر شاہی سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا اس لیے راج کماری کا ڈولا کپل واستو آیا اور مراسم ضروری ہیں بجالائے گئے۔

شادی ہوئی تو گوتم و جسودھرا اپنے وقت کے سری کرشن اور رادھا بن گئے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں غرق اور دنیا کی تمام فکروں سے بیخبر تھے!!

اسی عشرت و کلامرانی میں دن، ہفتے، مہینے، بلکہ دس سال گذر گئے۔ اور نہ راجہ اندر اپنے اکھاڑے سے باہر نکلے نہ دنیوی زندگی کا کوئی عبرتناک منظر اُنکے سامنے آیا۔

بیسویں صدی کی آزادی اور مطلق العنانی کی گرم بازاری میں مشکل سے یقین آتا ہے کہ گوتم ۲۹ سال کی عمر تک راج محل کی چاردیواری میں کیونکر قید رکھا گیا۔ لیکن ابھی کل کی بات ہے کہ قسطنطنیہ کے ترکی شہزادے تخت نشینی کی ساعت تک قصر سلطانی میں محبوس رکھے جاتے تھے اور بیشتر اسی تنہائی میں بڈھے ہو کر مرجاتے تھے لیکن سرکاری احاطے کے باہر قدم نہیں نکال سکتے تھے۔ بودھ کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ۲۰ سال کی عمر تک شاہزادہ راج محل سے باہر نہیں نکلا۔ اور اس

روایت پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

بالآخر۔ کارکنان قضا و قدر نے جو مبارک ساعت گوتم کی زندگی میں حیرت انگیز تغیر پیدا کرنے کی مقرر کی تھی وہ آگئی اور راجہ شدھودن کی کل دور اندیشیاں بیکار ثابت ہوئیں۔

برسات کا موسم تھا اور جسو دھرا کی طبیعت کچھ سست تھی۔ راجکمار کا دل بیٹھے بیٹھے گھبرایا [illegible]نے کو گاڑی تیار کرائی اور رتھ بان کو حکم دیا کہ سواری شہر کی طرف لے چلو۔ قلعۂ شاہی کے با[illegible]م نکالنا راجہ شدھودن کے صریح احکام کے خلاف تھا لیکن رتھ بان کے دل کی باگ خدا کے ہاتھ میں تھی۔ راجکمار کو آزردہ کرنے کی اسے ہمت نہ ہوئی اور یادھاری شہر کی طرف چلی۔

بازار کے قریب پہونچے تو ایک نہایت ضعیف بڈھا نظر آیا جسکی کمر جھکی ہوئی تھی بال سفید تھے ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اور دو قدم چلنے سے بھی اسکی سانس پھولتی تھی۔ راجکمار کو اسکی حالت دیکھکر ترس آیا۔ گاڑی رکوائی اور بڈھے کی دلجوئی کرنے لگا۔ رتھ بان نے کہا کہ اس شخص کی ضعیفی اور کمزوری باعث حیرت نہیں۔ یہ وقت تو ہر انسان پر گذرتا ہے جو پوری عمر تک زندہ رہے۔ شہزادہ نے تعجب سے پوچھا کہ کیا ہمارا اتنا بھی کسی وقت ایسے ہی کمزور ہو جائیں گے؟ رتھ بان نے کہا کیوں ضرور۔ بلکہ حضور بھی! شہزادہ خاموش رہ گیا۔ اُسکے دل پر پہلی چوٹ لگی۔ اور گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ سواری چند قدم گئی تھی کہ ایک بیمار ملا جو سفید داغ یا کوڑھ کی بیماری میں (باختلاف روایات) مبتلا تھا۔ اسکی خوفناک صورت اور قابل رحم بیکسی دیکھکر شہزادہ نے مریض کو اپنے پاس بلایا۔ رتھ بان نے گزارش کی کہ حضور اُسکے بدن پر ہاتھ نہ لگائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ اس مرض متعدی سے دشمنوں کو گزند پہونچے۔ شہزادہ نے حسرت اور حیرت سے دریافت کیا کہ اس غریب کو ایسی سخت تکلیف کیوں ہے؟ جواب ملا کہ یہ اُسکے کرموں کا پھل ہے۔ دُکھ اور بیماری ہر آدمی کے ساتھ ہے۔ پوچھا کہ شہر میں کوئی اور بھی بیمار ہے؟ جواب سنا کہ دنیا میں بیماروں کی تعداد بہت ہے اور ایسے آدمی تو کم ہوں گے جنکو کبھی کوئی آزار نہ ہوا ہو۔ یہ دوسری چوٹ تھی جو شہزادے کے نازک دل پر لگی۔ اور سواری آگے چلی۔

یکایک ایک مجمع نظر آیا چار آدمی اپنے کاندھوں پر نعش لیے جا رہے ہیں اور اُنکے پیچھے پیچھے بہت لوگ روتے جاتے ہیں۔ شہزادہ کو تعجب ہوا۔ دریافت کیا کہ کاندھوں پر کپڑے سے ڈھکی ہوئی

کیا چیز ہے؟ اور اس جماعت کے رونے کا کیا سبب ہے۔ رتھ بان عرض پرداز ہوا کہ کوئی ہے اُس کی لاش اول منزل لیے جاتے ہیں۔ اور سارے اُسکے عزیز روتے ہیں۔ شہزادہ نے ابھی تک موت کا نام نہ سنا تھا متحیر ہوا کہ "مرنا" کیا ہوتا ہے۔ اور اُس پر رونے کی کیا وجہ ہے؟ سمجھایا کہ دنیا میں جو ذی روح پیدا ہوتا ہے وہ ایک دن مرتا ہے۔ اور سب رشتہ داروں کو اکیلا اُسی عالم کو واپس جاتا ہے جہاں سے آیا تھا۔ دنیا والے جو اُس سے محبت رکھتے تھے اُس سے نفع پاتے تھے روتے دھوتے ہیں، اسلیے کہ اب دوبارہ اُسکے دیکھنے کی آس نہیں۔ یہ وہ جدائی ہے جسکے بعد وصال نہیں۔ وہ سفر ہے جسکے بعد واپسی نہیں۔ وہ غربت ہے جس میں کوئی ساتھ دے سکتا۔ وہ بوجھ ہے جسکو کوئی ہلکا نہیں کر سکتا۔ وہ غم ہے جسکی کوئی تسلی نہیں اور وہ مصیبت ہے جس کا کوئی چارہ نہیں۔!!

یہ چوٹ بہت سخت تھی۔ شہزادہ اس غم کی تاب نہ لاسکا اور سوچنے لگا کہ جب اس عالم کو ایک دن چھوڑنا ہے تو دُنیا والوں سے محبت کرنا ہی بیکار ہے۔

خدا کی شان! اُسی وقت ایک جوگی سامنے آیا جو باوجود سن رسیدہ ہونے کے کمزور نہ تھا آنکھوں سے بجلیاں کوندتی تھیں اور چہرہ پر نور برستا تھا۔ شہزادہ نے سوال کیا کہ اس آدمی اور بوڑھاپے کا کیوں اثر نہیں ہے؟ رتھ بان نے کہا کہ یہ فقیر ہے اس نے دنیا سے قطع تعلق کرلیا ہے لہٰذا اسکو موت کا غم ہے نہ بیماری کا دُکھ۔ یہ مرتے دم تک ایسا ہی خوش اور مضبوط بنا رہے گا۔

اس گفتگو میں گاڑی ندی تک پہونچ چکی تھی۔ شہزادہ سواری سے اُترا۔ دریا میں غسل کیا اور دل میں یہ خیال پختہ کرنے لگا کہ دنیا مصائب کا گھر ہے اسکو چھوڑ دینا چاہیے۔ کئی گھنٹے غور و فکر میں مصروف رہا۔ صبح سے دوپہر ہوئی اور وہ بھی ڈھل گئی۔ تیسرے پہر کو واپسی کی سواری منگائی۔ جس وقت گاڑی پر قدم رکھ رہا تھا راج محل سے ایک قاصد یہ نوید لایا کہ شکو سے بطن میں فرزند ارجمند پیدا ہوا۔ راجکمار نے کہا کہ "یہ ایک نئی اور مضبوط زنجیر ہے جو توڑنا پڑے گی"۔

جب محل کے قریب پہونچا تو ہر طرف مبارک سلامت کی دھوم تھی۔ اعزہ اور خدام مبارکباد کے لیے آئے۔ راجکمار کی ایک رشتہ دار لڑکی نے شادیانہ کا گیت گایا اور اُسکی خوش گلو